وقار و عظمتِ خیبر وقارِ قومِ افغاں ہے
عروجِ ہند کا نکتہ اسی اِک در میں پنہاں ہے

مارچ - اپریل سنہ ۱۹۴۰ء

عملۂ ادارت

صدر مجلس ادارت :-

پروفیسر احمد علی صادق قریشی ایم - اے - بی ٹی - ایل - ایل - بی

حصۂ اُردو

نگران - پروفیسر مفتی محمدؐ حبیب ایم - اے

مدیرین - شیخ منیر الدین بی - اے (آنرز) سال ششم

عبد الرؤف شگفتہؔ - سال سوم

حصۂ پشتو

نگران - پروفیسر مولوی عبد الرحیم - منشی فاضل - مولوی فاضل

مدیرین - شوکت اللہ اکبرؔ - سال سوم

عبد الرشید اصغر - سال دوم

حصۂ انگریزی

نگران - پروفیسر محمدؐ موسیٰ خان کلیمؔ - ایم - اے

مدیرین - بشیر الدین بی - اے (آنرز) سال ششم

علی محمدؐ - سال سوم

شرح چندہ سالانہ

طلباء ---------- دو روپے   اولڈ بوائز ---------- تین روپے معہ محصول ڈاک

پروفیسر احمد علی صادق نے فیروز پرنٹنگ ورکس ۱۱۹ سرکلر روڈ لاہور میں چھپوا کر اسلامیہ کالج پشاور سے شائع کیا۔

خیبر

دار العلوم اسلامیہ سرحد

نگران ——— پروفیسر ایم حبیب ایم اے
ایڈیٹر ——— ایس۔ ڈی۔ منیر

فہرست مضامین

شذرات

خیبر کی اس اشاعت کے شذرات بھی حسب معمول ادارۂ طلبہ میں ہی سے کوئی لکھتا مگر یہ یاد آکر کہ آپ میں سے اکثر یونیورسٹی طلباء امتحان کے بعد موجودہ حیثیت سے پھر نہ آئیں گے۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ چلتے چلتے آپ سے ایک بات کروں۔ اس لئے کہ "رسم وداع" ہر فقرہ دل میں چبھ کر رہ جاتا ہے اور میری اس وقت کی بات آپ کو کالج کی زندگی کی یاد دلاتی رہے گی ——!

کہتے ہیں کہ شاعری جذبات کے اظہار کا نام ہے —— صحیح! —— مگر جب جذبات کا اس قدر ہجوم ہو جائے کہ اظہار کی نوبت ہی نہ آئے اور زبان بند ہو جائے —— اس کو کیا کہیں گے؟ —— اسی جذبے کے ماتحت میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ہجوم جذبات نے میری زبان بند کر دی —— نہ کچھ کہہ سکتا ہوں اور نہ کچھ لکھ سکتا ہوں۔ بس آپ کے ذوق لطیف سے ہی التجا ہے کہ وہ میرے احساسات کا اندازہ لگالے اور میری خاموشی ہی میری زبان بن جائے کیونکہ ؎ از مقامے حرف می گویم کہ دم نامحرم است۔

بس یہ ہی ادھیڑ بن ہے جس میں میں مبتلا ہوں ؎ "چو یار رخت سفر بست من چہ کار کنم"۔ جائیے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

انسان فطرتاً "حال" سے غیر مطمئن اور "موجودہ" سے بیزار اور "ماضی" اور "گزشتہ" سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ہر وقت اس کے لب پر یہی صدا ہوتی ہے کہ ؎

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہی کی یاد میری زندگی ہے!

اس کے نزدیک جو لطف "تھا" میں ہے وہ "ہے" میں نہیں۔ ظاہری بات ہے کہ مڑ کر دیکھنا ہمیشہ خوشگوار ہوتا ہے اور "دور کے ڈھول سہانے" معلوم ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر اور تجربہ کی رو سے میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں۔ کہ یہ ہی کالج کی زندگی جو آج کل آپ کی نظر میں الجھنوں کا مجموعہ اور کاوشوں کا نشیمن ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد یہی فردوس خیال ثابت ہوگی۔ یہ ہی اساتذہ جو آجکل آپ کے نزدیک زاہد خشک ہیں اور واعظ بے عمل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ زندگی کی مسافت میں ہر ہر قدم پر آپ کے خضر راہ ثابت ہوں گے۔ کالج کی زندگی میں ہر فروگذاشت پر آپ کو اس لئے آگاہ کیا جاتا ہے کہ کالج سے باہر آپ کوئی فروگذاشت نہ کریں۔ کالج کی زندگی میں آپ پر پابندیاں اس لئے عائد کی جاتی ہیں۔ کہ بیرونی دنیا کی پابندیاں آزادیاں معلوم ہوں اور آپ خندہ پیشانی سے ان کا مقابلہ کر سکیں —— یہ ہی کالج کے در و دیوار جو آجکل "دیوار زندان" سے زیادہ مہیب معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو اپنی طرف کھینچیں گے اور آپ دعا کریں گے اور تمنا کریں گے کہ کاش میں اسی "جیل خانہ" میں پھر بند کر دیا جاؤں کیونکہ اتنی وسیع دنیا میرے لئے تنگ ہے اور کالج کی میل بھر کی دنیا اتھاہ ہے۔ مگر یہ تمنا۔ تمنا ہی رہے گی کیونکہ کسی کے ہاتھ میں بھی ایسی گھڑی بنانے کی طاقت

جمال الدین افغانیؒ

(آنریبل ملک خدابخش صاحب سپیکر فرانٹیئر لیجسلیٹو اسمبلی کی تقریر جو انہوں نے "جمال الدین افغانی ڈے" کی تقریب پر کالج میں فرمائی)

کسی تاریخی ہستی کی مرکزی کیفیت کا اندازہ اس ماحول سے کیا جاسکتا ہے جس میں اس نے پرورش پائی ہو۔ جس وقت جمال الدین افغانی عالم وجود میں آئے۔ یورپ کے سر پر استعمار کا بھوت سوار تھا۔ جوع الارض اقوام یورپ کو دیوانہ بنائے ہوئی تھی۔ ابھی تک یورپ کے وسائل ترقی کچھ زیادہ نہیں تھے۔ لیکن حرص اہالیان یورپ کو اپنے وطن میں آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ براعظم ایشیا یورپ کے استعمار کی شکارگاہ بنا ہوا تھا۔ ٹیپو سلطان کی کوششیں، ہنائے وطن و برادران ملت کی بے وفائی اور خودغرضی کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے ناکام ہوچکی تھیں۔

ہمارے ترکش کے "خدنگ آخریں" کا گلا اپنوں ہی کے ہاتھوں سے گھونٹا جاچکا تھا۔ اس زمانہ میں ٹیپو سلطان کے دماغ نے بین الاقوامی اتحاد کا نظریہ پیدا کرکے ہندوستان اور دیگر ممالک کو ایک سلسلہ میں مربوط کرنا چاہا۔ لیکن تقاضائے حالات نے اس نظریہ کو نہ صرف کامیاب نہ ہونے دیا۔ بلکہ سرزمین ہندوستان کو اقوام یورپ کے واسطے ایک قسم کا خوان یغما بنا دیا۔ ملک جاپان کا وجود اس زمانہ میں عدم کے برابر تھا۔ چین افیون کی گولی کھا کر لمبی تان کر سو رہا تھا۔ سید جمال الدین افغانی کی پیدائش کے سال ہی میں یا اس سے ایک آدھ سال پہلے براستہ سندھ برطانیہ کے سپوتوں نے افغانستان پر حملہ کرکے کچھ وقت کے لئے کابل کو اپنا زیر نگیں کرلیا تھا۔ اور امیر دوست محمد خان والیٔ افغانستان کو قید کرکے ہندوستان کے کسی گوشۂ عافیت میں بٹھلا دیا تھا۔ ایران شاہان قاچار کی ظالمانہ ایڑی کے نیچے دم توڑ رہا تھا۔ یورپ کے دانشمندوں نے ٹرکی کو نہ صرف "مرد بیمار" بنا کر بلکہ حالت نزع میں ڈال کر اپنے منصوبوں کی تکمیل کی داغ بیل ڈال تھی۔ عرب میں احیائے مذہبی کی تحریک ناکام ہوکر ختم ہوچکی تھی۔ غرضیکہ ایشیا ہر طرح سے استعمار یورپ کی ہوا و ہوس کا جولانگاہ بنا ہوا تھا۔

قدرت نے جمال الدین افغانی کو حساس دل عطا کیا تھا۔ جو تعلیم اُسے نصیب ہوئی۔ اس سے شاید زیادہ وسیع پیمانہ پر اس کے معاصرین اس قسم کی تعلیم سے فیضیاب ہوچکے تھے۔ لیکن جہاں اس کے معاصرین علمی اصطلاحات اور مذاکرات کے تنگ دائرہ میں گردش کرتے رہے۔ وہاں جمال الدین افغانی نے عین عالم شباب میں ایشیا کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ اور فوراً تشخیص مرض میں کامیاب ہوکر تجویز علاج میں مشغول ہوگیا۔ اس نے ایک ہی لمحہ میں تاڑ لیا کہ ایشیا استبداد و افتراق اندرونی کا شکار ہونے کے باعث استعمار یورپ کے رحم پر ہے۔ اور اس کی مخلصی کی صرف یہی صورت ہوسکتی ہے کہ اندرونی استبداد و افتراق سے ایشیا کو نجات دلا کر ایشیائی ممالک کو ایسے رشتۂ اتحاد میں مربوط کردیا جائے۔ کہ یورپین استعمار کی مدافعت کا سامان ہوسکے۔ یہی اس کی زندگی کی مرکزی حقیقت تھی۔ اور اسی ایک مرکزی حقیقت کے نقطہ کے گرد وہ مدت العمر جد و جہد کرتا رہا۔

عنفوان شباب ہی میں وہ براستہ ہندوستان حج کے ارادہ سے نکلا۔ دانایان سیاست نے اس کی روشن جبین سے

نہیں جو زندگی کے گذرے ہوئے گھنٹے بجا سکے۔

آج کل تو آپ کی سنجیدہ نظری کا زمانہ ہی نہیں اور بقول شخصے ؎ ہرچہ بینید۔ بعنوان تماشا بینید۔ مگر عنقریب آپ عملی دُنیا میں قدم رکھنے والے ہیں۔ جہاں پر "عنوان تماشا" کی بجائے آنکھوں پر سنجیدگی کی عینک لگانی پڑے گی۔ اور ہمیں امید ہے کہ یہاں کے تجربے آپ کے کام آئیں گے یہاں کی انتظامی پابندیاں آپ کی ساری زندگی کو منظم کردیں گی اور آپ کالج سے منجھ کر نکلیں گے اور آپ کی علمی روشنی دُنیا کو منور کردے گی۔

مجھے آپ کو آگاہ کرنا تھا۔ کرلیا۔ آپ کا جانا ہمارے لئے بھی باعث تکلیف ہے مگر اس کے ساتھ ہی ہم اپنے دل میں "سکون مضطرب" بھی محسوس کرتے ہیں۔ یعنی آپ کے جانے کا رنج اور آپ کی کامیابی اور عملی زندگی میں قدم رکھنے کی خوشی۔ یہ ہی دُنیا کا دستور ہے۔ اور خاصکر کالج میں تو ہر سال ہمیں یہ ہی دُہرانا پڑتا ہے ؎

فروغ شمع جو اَب ہے رہیگا صبحِ محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

کالج کی زندگی میں اس مرتبہ سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضور نظام تاجدار دکن کی دریادلی نے اس کالج کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا۔ اعلیحضرت کی بخشش کا سمندر کچھ اس درجہ بے پناہ ہے کہ چھوٹا بڑا۔ غریب امیر سب ہی اس سے سیراب ہوتے ہیں۔ سراکبر حیدری دو ایک دن میں اس سابقہ نیو ہاسٹل اور موجودہ "عثمانیہ ہاسٹل" کی نقاب کُشائی کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ ہمارے پاس سوائے شکریئے کے چند الفاظ کے اور کیا ہے جو مہمان محترم کے پیش کرسکیں۔ زہے قسمت کہ حضور نظام کے احسان کا بار ہم نے اُٹھایا۔ اور زہے نصیب کہ سراکبر حیدری جیسی برگزیدہ ہستی نے اس کالج کے "غریب خانہ" کو مشرف کیا +

مفتی محمد حبیب

اس کے عمیق خیالات کو کسی حد تک تاڑ لیا۔ لیکن یہ باہمت نوجوان اس وقت کے ہندوستان میں سے صحیح سالم بچ نکلا۔ اور حرمین شریفین میں جا پہنچا۔ وہاں اُس نے مسلمانوں کے ظاہری اجتماع کے اندر حقیقی انتشار کا نقشہ دیکھا تحسبھم جمیعاً و قلوبھم شتی (دیکھنے والا انہیں ایک جا خیال کرتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اُن کے دل پراگندہ ہیں) اُس کی تشخیص پایۂ تصدیق کو پہنچ گئی۔ کہ ایشیا کا حقیقی مرض اُن کا افتراق باہمی ہے +

امیر دوست محمد خان کی وفات پر افغانستان کی خانہ جنگی نے سید جمال الدین کو بے حد افسوہ کر رکھا تھا۔ ہندوستان بہت حد تک برطانیہ کی حکومت کے ساتھ صبر و شکر کے جذبات وابستہ کر چکا تھا۔ چین و جاپان کوئی جد و جہد کرنے کے قابل نہ تھے۔ ایشیا کے سکون اور جمود کا علاج صرف ممالک اسلامیہ کی بیداری۔ اندرونی استبداد سے آزادی اور یورپین استعمار کے مقابلے میں متحدہ جد و جہد کے ذریعہ سے ہی ممکن تھا۔ چنانچہ جمال الدین افغانی اپنی زندگی کی اس مرکزی حقیقت کو لیکر عالم اسلامی کی سیاحت کے لئے چلا۔ دوستوں کی بے وفائی، دشمنوں کے ظلم و ستم سلاطین کی خود غرضانہ حکمت عملیاں ایسی تفصیلات ہیں۔ جن میں پڑنے کی فی الحال کچھ ضرورت نہیں۔ بہرحال یہ سب باتیں اس کے واسطے سنگ راہ نہیں۔

مصر اگرچہ ترکوں کے زیر سیادت تھا۔ لیکن برطانیہ نے اس میں اپنے قدم جما لئے تھے۔ اور یہی وہ ملک ہے۔ جسے جمال الدین نے سب سے اوّل اپنے پروگرام کے نفاذ کے لئے منتخب کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک مصر سے لیور (LEVER) کا کام لے کر ممالک اسلامیہ کو اٹھانا چاہتا تھا۔ مصر میں اس نے اپنی زندگی بطور ایک پروفیسر کے شروع کی۔ حضرات علماءٌ نہ صرف اجتہادی کیفیت سے عاری ہو چکے تھے۔ بلکہ ترقی کے ہر راستے کو مسدود کر کے مسلمانوں کے دماغوں کو ہمیشہ کے لئے مفلوج کر دینے کے درپے تھے۔ جامع ازہر میں فلکیات اور جغرافیہ کے درس دینے میں جمال الدین نے خاص شہرت حاصل کی۔ لیکن جب ایک دفعہ وہ درسگاہ میں کرۂ ارض ساتھ لے گیا۔ تو اس بدعت کو دیکھ کر تکفیر کا طوفان برپا کر دیا گیا۔ ایسے ایک واقعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اس افغان نوجوان کو کس قدر مشکلات کا سامنا ایک اجنبی ملک میں کرنا پڑا ہوگا +

مصر میں وہ کافی عرصہ رہا۔ اور اس کے طویل قیام سے مصر میں وہ بیداری پیدا ہوئی۔ جو بالآخر اہلیان مصر کو جیتابانہ آزادی کے راستہ پر گامزن ہونے کے لئے تیار کرنے کا باعث ہوئی۔ جمال الدین کا وجود مصر میں خطرناک تصور کیا گیا۔ اور اُسے مصر سے خارج کر دیا گیا۔ ممالک اسلامی میں اُسے جانے سے روک دیا گیا۔ اور اس کی نظر بندی کے لئے ملک ہندوستان کو تجویز کیا گیا۔ جو یورپین اقوام کی رائے میں اس قدر پست تھا کہ جمال الدین کی موجودگی بھی اُسے حرکت میں نہ لا سکتی تھی۔ جمال الدین نے حیدر آباد دکن کو اپنے قیام کے لئے پسند کیا۔ لیکن دشمن کو یہ خطرہ لاحق ہوا۔ کہ کہیں حیدر آباد میں احیائے ملت اسلامیہ کا سلسلہ جاری نہ کر دیا جائے۔ اس واسطے ہندوستان کے محفوظ ترین مقام کلکتہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ اُس نے دیکھا کہ ہندوستان نہ صرف یورپ کا سیاسی غلام ہے۔ بلکہ یہاں کے مسلمان اُس الحاد کے سیلاب میں بہے جا رہے ہیں جو یورپ سے آکر اُن کے دماغوں پر حملہ کر رہا ہے۔ اس نے یہاں فارسی زبان میں ایک کتاب موسومہ رد نیچریہ تصنیف کی +

مصر میں سکون ہو جانے کے بعد سید جمال الدین کو پھر آزادی نصیب ہوئی۔ وہی پرانا سودا دماغ میں لے کر ممالک

اسلامیہ کی سیر و سیاحت میں از سر نو مشغول ہوا۔ اور ٹرکی میں ایک حد تک اس نے رسوخ پیدا بھی کر لیا لیکن اس وقت کے شیخ الاسلام نے پھر مذہبی فتنہ کی آگ بھڑکاتے ہوئے اس وقت کے سلطان کے لئے بے حد مشکلات پیدا کر دیں۔ سلطان نے بادلِ ناخواستہ جمال الدین کو ٹرکی کی حدود سے نکل جانے کی نصیحت کی۔ جمال الدین چلا گیا لیکن ایسا بیج بو گیا۔ جو انجام کار آزادی کے تناور درخت کی صورت میں نمودار ہوا۔

ایران کی سیر و سیاحت کے قصے زبان زد خلائق ہیں۔ یہاں جمال الدین کو بڑی دقتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مرتبہ ایک مقدس خانقاہ میں پناہ گزین ہوا۔ لیکن استبداد کی قوت نے خانقاہ کے تقدس کی پروا نہ کرتے ہوئے نہ صرف اُسے گرفتار کر لیا۔ بلکہ نہایت توہین آمیز طریقہ سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے ملک بدر کر دیا گیا۔ یہی ایران نہ صرف اندرونی استبداد میں مبتلا تھا بلکہ اس کی اقتصادی بدحالی نہایت ہی خوفناک شکل اختیار کر چکی تھی۔ شاہ قاچار ایک برطانوی کمپنی کو نہایت ارزاں قیمت پر زمینداروں سے تمباکو خرید کر کے نہایت ہی گراں نرخ پر اہالیان ایران کے پاس پہنچنے کا واحد اجارہ دے چکا تھا۔ جمال الدین افغانی کی رائے میں شاہ قاچار کی یہ حرکت ایرانی اقتصادیات اور خوشحالی کے لئے پیغام موت تھی۔ سید جمال الدین نے کچھ اس طرح سے علما کو اپنا ہم آہنگ کر لیا۔ کہ ان کے متفقہ فتویٰ نے ظالم قاچار کے لئے عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اور اُسے تاوان دے کر یہ اجارہ منسوخ کرنا پڑا۔

جمال الدین پر لیبا اوقات ایسی سختیاں کی جاتی تھیں۔ کہ اس کے واسطے اسلامی ممالک میں کسی تحریک کا شروع کرنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ لیکن اس کی ہمت اُسے آرام سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ اس کا دل سرتا سر بے قراری کا مجسمہ تھا۔ یورپ کے ہر ایک ملک میں اُس نے یورپ کے استعمار کے برخلاف آواز اٹھائی۔ اس کی آواز میں قدرت نے ایک خاص اثر رکھا تھا۔ کہ وہ سخت سے سخت دل کو بھی مرعوب کر لیتا تھا۔ وہ کافی عرصہ فرانس میں مقیم رہا۔ اور نہایت ہی کامیابی کے ساتھ ایک اخبار "العروۃ الوثقیٰ" کی ادارت کرتا رہا۔ یہ ایک ایسا آرگن تھا جس کی زد ممالک اسلامیہ کے جابر سلاطین کے محلوں میں زلزلہ طاری کر دیتی تھی۔ اور یورپ کی جوع الارض کے برخلاف صدا بلند کرنے سے بھی باز نہیں رہتی تھی۔ مختلف ممالک کے سفیروں اور نمائندوں سے اس کی ملاقات رہا کرتی تھی۔ وہ اپنا نقطۂ خیال بہت ہی جرأت اور آزادی کے ساتھ ہر ایک یورپین نمائندے کے سامنے پیش کیا کرتا تھا۔ فرانسیسی فلاسفر رنیاں جیسے محقق اس کا علمی سکہ تسلیم کرتے تھے۔ غرضکہ جہاں وہ رہا اپنے مرکزی خیالات کی اشاعت ہی اس کا مقصد رہا۔

جب وہ انگلستان میں جا کر مقیم ہوا۔ تو اس کی موجودگی برطانوی مدبرین کے لئے ایک عقدۂ لاینحل ہو گئی۔ ایران کے استبداد کے برخلاف اس نے برطانیہ کے اندر طلاطم خیز پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ لندن کے مضافات میں اس نے ایک اخبار بھی جاری کر دیا۔ جو برطانیہ کی نظر میں ایران کے لئے خطرہ کا الارم تھا۔ اس وقت کی حکومت برطانوی نے اُس پریس کو مطلع کیا جہاں یہ اخبار چھپتا تھا کہ اگر اس نے اس اخبار کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھا تو اُسے سرکاری اشتہارات وغیرہ کا کام نہیں دیا جائے گا۔ برطانوی مدبرین جمال الدین افغانی کی موجودگی کا فائدہ بھی اُٹھانا چاہتے تھے۔ لیکن ممالک اسلامیہ کی آزادی کے متعلق اس کے خیالات کچھ اس درجہ انتہا پسندانہ تھے۔ کہ یورپین مدبر اس سے خوف زدہ رہا کرتے تھے

اُس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات ٹرکی میں گزارے اور یہاں اُس نے سلطان عبدالحمید کے نظریۂ پان اسلامیزم

کو اپنے مقاصد کی اشاعت کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ سلطنت ایران یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ کہ سید جمال الدین افغانی جیسا شخص دُنیا میں آزاد پھرتا رہے۔ اور سلاطین کے قصرِ استبداد میں تزلزل پیدا کرنے کے واسطے اپنی تحریک کو جاری رکھے۔

ایرانی حکومت سید جمال الدین پر بے پناہ مظالم توڑ چکی تھی۔ ایشیا اور افریقہ کے چپے چپے پر سید جمال الدین کے فدائی موجود تھے۔ شاہ قاچار ایران قتل کیا گیا۔ سید جمال الدین کے بعض فدائی گرفتار ہو کر سزایاب ہوئے۔ سلطنت ایران نے سید پر بھی قتل کی سازش کا شبہ کیا۔ اور بار بار سلطنت ٹرکی سے سید کی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ حوالگی تو نہ ہوئی لیکن مطالبہ بدستور جاری رہا۔ آخر کار وہ وقت آپہنچا کہ سید کی حیاتِ مستعار ختم ہو۔ چنانچہ ۱۸۹۷ء میں سید جمال الدین کا انتقال ہوا دُنیا حیران ہے کہ کس طرح افغانستان کے ایک گمنام گوشہ میں پیدا ہو کر ایک شخص ایشیا کی آزادی کا پیغام ممالک اسلامیہ میں مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اور یورپین اقوام سے نہ ڈرتے ہوئے جرأت اور بیباکی کے ساتھ چپے چپے پر سُناتا رہا۔ اور یورپ کے اندر رہ کر ایشیا کو یورپ کے برخلاف اکساتا رہا۔

سید جمال الدین افغانی کی تحریک کی کامیابی یا ناکامی پر رائے زنی کرنا مؤرخین کا کام ہے۔ لیکن ممالک اسلامی میں اُس نے وہ رُوح پھونک دی جو انجام کار ان ممالک کو آزاد کر کے رہی۔ آج ایران یورپین دست بُرد سے محفوظ ہے۔ اور آزاد رہ کر تہذیب و تمدن کے راستے پر گامزن ہے۔ ٹرکی کا "مردِ بیمار" اس درجہ با اقتدار ہے کہ اس موجودہ جنگ میں رُوس۔ انگلستان۔ فرانس اور دیگر یورپین ممالک کے درمیان ٹرکی کی دوستی حاصل کرنے کے لئے رقابت پیدا ہو گئی ہے۔ سید جمال الدین کی رُوح نے زاغلول پاشا کے ذریعے مصر کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا۔ افغانستان جسے سید جمال الدین کی جائے پیدائش ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہ بھی اس سال "جمال الدین افغانی ڈے" منا رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان اس تحریک کی دل و جان سے قدر کرتا ہے۔ جو سید جمال الدین افغانی کی زندگی کی مرکزی حقیقت تھی۔

افغانستان سید جمال الدین کی نشان پا کی تلاش کرنا چاہتا ہے۔ جہاں جمال الدین افغانی نے اس راستہ کو چھوڑا ہے وہاں سے نشان پا سے ہدایت حاصل کرتے ہوئے افغانستان غالباً آگے جانا چاہتا ہے۔ اگر افغانستان کا یہی مقصد ہے۔ تو یہ فال نیک ہے۔ کہ وہ "جمال الدین افغانی ڈے" منا رہا ہے۔ افغانستان کے اتباع میں اس کالج میں بھی آج یہ رسم ادا کی جا رہی ہے۔ اس کالج کے اساتذہ اور طلباء کا بھی یہی نصب العین ہونا چاہیئے۔ کہ وہ جمال الدین افغانی کی زندگی کی مرکزی حقیقت پر غور کریں۔ استبداد اندرونی اور استعمار بیرونی سے ہندوستان کو نجات دلائیں۔ اگر یہ مقصد نہیں ہے تو "جمال الدین افغانی ڈے" منانا ایک بے معنی رسم ہے۔

سید جمال الدین افغانی نے قوم کے مرض کو درست طور پر تشخیص کیا۔ اور جدوجہد کی تکلیفیں برداشت کیں۔ ہمت کو برقرار رکھا۔ اور اس مرض کے ازالہ کی کوشش کی۔ جمال الدین افغانی کے خیالات اور جدوجہد کا نقشہ علامہ اقبال کے الفاظ میں اس طرح کھینچا گیا ہے

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے — شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات

سید جمال الدین افغانی ڈے منانے والے خبردار رہیں کہ وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل جمال الدین افغانی کا پیغام ہے اس پیغام کو وہ سنیں اس پر غور کریں اور عمل بھی کریں

قضا و قدر

(سید جمال الدین افغانی کے ایک مضمون کا ترجمہ)

اللہ تعالیٰ کے قانونِ حکمت کا مقتضا یہ ہے کہ انسان کے اعمالِ ظاہری اس کے عقائدِ قلبیہ کا نتیجہ ہوں اور اس لئے اعمال کی صلاحیت اور فساد عقیدہ کی نوعیت پر موقوف ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی عقیدہ انسان میں ایک ایسی ذہنیت پیدا کر دیتا ہے جس کے تسلسل میں اور بہت سے جذبات و عقائد ظہور میں آتے ہیں۔ اور ہر ایک جذبہ یا عقیدہ مختلف قسم کے اعمال اور افعال کے ظہور کا موجب ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب نیکی کا کوئی اصول یا تحصیل کمال کا کوئی قانونِ اساسی تعلیم و تلقین یا تبلیغ کے ذریعہ کسی جماعت کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو سامعین کے دلوں میں ایک قسم کا اشتباہ پیدا ہوتا ہے یا اگر اس حقیقت یا حقائق کے پیش کرتے وقت مخاطب کے نفس میں پہلے سے کوئی باطل عقیدہ موجود ہے تو اندریں حالت حق اور باطل میں تمیز کرنا اس مخاطب کے لئے دشوار ہو جاتا ہے۔ ان دونو حالتوں میں مطلوبہ اثر ظہور میں نہیں آتا۔ بلکہ بعض اوقات غلط فہمی یا خبثِ نفس یا نقصِ استعداد دوسرے عقائدِ فاسدہ کے ظہور میں آنے کا باعث ہو کر ان کا نتیجہ اعمالِ غیر صالحہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن خود اعتقاد رکھنے والے کو شبہ یا باطل کی آمیزش کا علم نہیں ہوتا ہے۔ اور وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اس آمیزش اور اختلاطِ عقیدہ کا اس کے اعمال پر کیا اثر پڑے گا یا پڑ رہا ہے۔ جو ظاہر بین ہیں وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ غیر مطلوب بلکہ برعکس اثرات کا ظہور میں آنا اسی اصول یا قانونِ اساسی پر یقین رکھنے کا نتیجہ ہے لیکن ایک مبصر جانتا ہے کہ حقیقت یہ نہیں بلکہ یہ سب کچھ مابعد کی آمیزش و اختلاط اور حق و باطل کے باہمی التباس کا کرشمہ ہے۔ چنانچہ اکثر ادیان اور مذاہب کے بعض بنیادی عقائد اور اصولی تعلیمات میں تحریف کا واقع ہونا اسی قسم کی غلط فہمیوں، نقصِ استعداد یا کسی عقیدۂ باطلہ کی آمیزش و اختلاط کا نتیجہ ہے۔ مختلف قسم کی بدعتوں کے ظہور میں آنے کا موجب عموماً یہی تحریفِ اصول اور اختلاطِ عقائد ہے۔ اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ فطرتِ سلیم مسخ ہو جاتی ہے۔ طرح طرح کے قبائحِ اعمال اور رذائلِ اخلاق اس سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔۔ جس کا مآل کسی قوم کی ہلاکت اور ابدی خسران ہوتا ہے والعیاذ باللہ تعالےٰ۔ بے خبر لوگ ان اعمال اور اخلاق کو دیکھ کر اس مذہب پر زبانِ طعن و تشنیع دراز کرتے ہیں جس کی وہ قوم نام لیوا ہے اور ان کے مذہب کے ایک سچے مفید ترین عقیدہ کو ان تمام خرابیوں کی جڑ قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ علت اور معلول کے سلسلہ کی درمیانی کڑیاں ان کی کوتہ بین نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں +

مسئلہ تقدیر بھی اسی قبیل سے ہے جو دینِ اسلام کا ایک اصولی عقیدہ ہے لیکن یورپ کے ملحدین نے اس کی بابت ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اور مسلمانوں کے تنزل و انحطاط کا سب سے بڑا سبب اسی عقیدہ کو خیال کرتے ہیں۔ بقول ان کے یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جو دلوں سے ہمت اور اولوالعزمی کی روح نکال دیتا ہے اور اس کی بجائے پست ہمتی، سستی و کاہلی اور بیکاری ان میں سرایت کر جاتی ہے۔ اور اسی لئے جس قوم کا یہ عقیدہ ہو (تقدیر پر ایمان رکھتی ہو) وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر مسلمانوں

ہی کو لے لیجئے - جو نفرا و تنگدستی میں مبتلا ہیں اور علوم و فنون اور سیاسیات میں ان کا درجہ صفر کا ہے - ان کے فساد اخلاق کی یہ حالت ہے کہ جھوٹ - نفاق - خیانت - مکر و فریب اور کینہ و عداوت ان کا طغرائے امتیاز ہے - تفرق اور اختلاف ان کے لئے نقد وقت ہے اور اپنے حال اور مستقبل کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں جانتے - وہ اپنا نفع و نقصان سمجھنے سے قاصر ہیں - جانوروں کی طرح صرف کھانے پینے پر قانع ہیں - کوئی بلند نصب العین ان کے سامنے نہیں - اور نہ ہی وہ تحصیل کمال کو در خور اعتنا سمجھتے ہیں - علاوہ ازیں اگر ان کے لئے ممکن ہو تو اپنے مسلمان بھائی کو ضرر پہنچانے میں کوتاہی نہیں کرتے - وہ آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور طاقتور قومیں برابر ان کو نگلتی چلی جا رہی ہیں - وہ ہر مصیبت کو بغیر کسی قسم کی مدافعت اور مزاحمت کے قبول کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں - اور وہ اس پر خوش ہیں کہ کوئی ٹوٹا پھوٹا مکان ان کو سر چھپانے کے لئے مل جائے - ان کے امرا اور اغنیا لہو و لعب میں دن رات مشغول رہتے ہیں - اور خواہشات نفسانی کا پورا کرنا ان کا سب سے بڑا پیش نظر مقصد ہے - اسراف اور فضول خرچی کے لئے ہر وقت تیار - لیکن فرائض کی بجا آوری سے قطعاً غافل ہیں - وہ اپنے ڈھب کے مصارف پر لاکھوں روپے خرچ کرنے تک سے دریغ نہیں کریں گے - لیکن قومی مفاد کے لئے ایک پھوٹی کوڑی دینے میں بھی تامل کریں گے - وہ اپنی قوم اور ملت کے اغراض اور منافع کو اپنی ذاتی خواہشات پر قربان کر دینے سے ذرہ بھر نہیں شرماتے - والیان ریاست اور اصحاب حکومت ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اور حریف کی ہلاکت اور استیصال پر ہر وقت آمادہ رہتے ہیں - جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی اس کمزوری سے ایک تیسری اجنبی طاقت فائدہ اٹھا کر بغیر کسی مزید اہتمام کے ان دونوں کے ملکوں پر قبضہ کر کے ان کو اپنے ممالک محروسہ میں شامل کر لیتی ہے - بزدلی اور خوف ان کے دلوں پر چھایا رہتا ہے اور اسی لئے ان میں کسی دشمن کے حملوں کو روکنے اور اس کی مدافعت کے لئے کھڑا ہونے کی جرأت نہیں ہوتی - وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے پڑوس میں حکومتیں پھلنے پھولنے میں دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہیں یہاں تک کہ بعض ایسی قومیں جو خود ان کی حکومت کے زیر نگین ہیں میدان ترقی میں ان کو گامزن نظر آتی ہیں - لیکن رشک اور منافست کا ان میں ذرہ بھی احساس پیدا نہیں ہوتا - عام مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ان کے ہم مذہب بھائیوں پر مصیبت نازل ہو تو وہ ان کے تخفیف مصائب میں ہرگز ان کی مدد نہیں کرتے اور اپنے فرح کی چیز مانا غنیمت سمجھتے ہیں ان میں کوئی تنظیم نہیں اور نہ ان کے ہاں کوئی بڑی بڑی انجمنیں پائی جاتی ہیں - جو امور ملیہ کا انصرام اپنے ہاتھوں میں لئے ہوتے ہوں اور جو غریبوں کی دستگیری کا کام انجام دیں یا ان کے حقوق کی حفاظت کریں +

الغرض اسی طرح وہ (یعنی اہل یورپ اور ان کے مقلدین) مسلمانوں کی مذمت کرتے چلے جاتے ہیں اور ان تمام خرابیوں کی جڑ ان کے نزدیک تقدیر پر ایمان لانا ہے - یہ لوگ نہایت وثوق کے ساتھ پیش گوئی کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کا یہی عقیدہ رہا تو وہ کبھی اپنی حیثیت کو دنیا میں قائم نہیں رکھ سکیں گے اور نہ ان کی عزت کا نشان بلند ہو گا - ان کی مجد و سیادت کو ایک قصۂ پارینہ سمجھنا چاہیئے اور ان کی قوم یقیناً جلد یا بہ دیر صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہیگی" -

اہل یورپ کا خیال ہے کہ مسئلہ تقدیر کو ماننے اور جبر کا عقیدہ رکھنے میں کچھ بھی فرق نہیں - وہ کہتے ہیں کہ مسلمان جو قضا و قدر کے قائل ہیں وہ اپنے آپ کو ایک پر کی طرح سمجھتے ہیں جس کو ہوا کے جھونکے ادھر ادھر پھینکتے اور الٹتے پلٹتے رہتے ہیں اور جب کسی قوم کے دل و دماغ میں یہ عقیدہ سما جائے کہ ان کو اپنے اقوال و اعمال اور اپنی کسی حرکت اور سکون میں اختیار حاصل نہیں اور وہ ان تمام باتوں میں مجبور اور دست و پابستہ ہیں اور ان کا ہر ایک کام کسی دوسرے کے ارادہ و اختیار کے

کے ماتحت انجام پاتا ہے اور اس کے ارادہ و اختیار اور تصرف کو بدلنے میں اُن کا کچھ بھی دخل نہیں تو کچھ شک نہیں کہ اس قوم کے افراد کی تمام قوتیں عاطل معطل اور بے کار ہو جائیں گی۔ اور جو ادراکات اور قوی کام کرنے کے لئے ان میں ودیعت رکھے گئے ہیں ان کے جمود اور سکون کی وجہ سے وہ ان ادراکات اور قویٰ کے نتائج اور ثمرات سے محروم رہیں گے۔ جد وجہد سعی و عمل۔ اور اکتساب کے جذبات ایک ایک ہو کر ان سے رخصت ہو جائیں گے اور اس قوم کا انجام یقینی ہلاکت اور صفحۂ ہستی سے مٹ جانا ہے"۔

عقیدۂ قضا و قدر کے متعلق اہل فرنگ کے یہ خیالات ہیں جن کا سطور بالا میں اقتباس دیا گیا ہے اور مشرق کے بہت سے ضعیف العقلوں نے اُن کے ان خیالات کو اخذ کر لیا ہے۔

بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ خیالات (یعنی مسلمانوں کے ان تمام اعمال کو مسئلہ تقدیر سے منسوب کرنا) محض بے بنیاد غلط اور بہتان ہیں مسلمانوں میں جتنے بھی مشہور فرقے پائے جاتے ہیں مثلاً شیعہ۔ سُنی۔ زیدیہ۔ اسماعیلیہ۔ وہابی۔ معتزلہ اور خارجی کوئی بھی ان میں سے جبر محض کا قائل نہیں جو اپنے آپ کو بالکل مجبور اور بے اختیار خیال کرتا ہو بلکہ ہر ایک ان میں سے یہ کہتا ہے کہ انسان کے اعمال کے بارے میں ایک حد تک اختیار دیا گیا ہے جس کو وہ کسب کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور جو ان کے نزدیک انسان کو ثواب یا عذاب کا مستحق بناتا ہے۔ قیامت کی جوابدہی اسی اختیار کی بنا پر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے شریعت کا نازل ہونا اور اپنے بندوں کو امر و نہی سے مخاطب کرنا اسی اختیار کے وجود اور تسلیم پر مبنی ہے (بصورت دیگر پیغمبروں کا آنا۔ شریعتوں کا نازل ہونا۔ اور امر و نہی سے لوگوں کو مخاطب کرنا عبث اور باطل ہوتا جو ایک بدیہی بات ہے اور جس کا کوئی بھی قائل نہیں) اور یہی حکمت اور عدل کا مقتضاء ہے۔

بے شک مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت بھی گذری ہے جو انسان کو کلیتہً مسلوب الاختیار خیال کرتی ہے اور جس کے نزدیک پتے کے ہلنے اور انسان کی حرکت اور عمل میں کچھ بھی فرق نہیں بلکہ دونوں کسی دوسری طاقت کے کار فرما ہونے کا نتیجہ ہیں۔ لیکن عام مسلمان اس عقیدہ کو غلط سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کے پیش کردہ دلائل کو سوفسطائیت سے زاید وقعت نہیں دیتے۔ اس فرقہ جبریہ کا وجود صرف پہلی چند صدیوں میں پایا جاتا ہے لیکن چوتھی صدی ہجری کے بعد اس کا نام تک باقی نہیں رہا اور اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ مسئلہ تقدیر پر ایمان لانا عقیدۂ جبریہ کے مرادف ہرگز نہیں۔

قضا و قدر کا عقیدہ دلائل قطعیہ سے ثابت ہے بلکہ عین فطرت کے مطابق ہے ہر ایک ذی عقل سمجھ سکتا ہے کہ جو اثر یا نتیجہ ظہور میں آتا ہے انسان کی نظر صرف اس کے اس سبب یا علت تک محدود رہتی ہے جس کو اس اثر یا نتیجہ کے ساتھ اتصال حاصل ہے یا بالفاظ دیگر جو اس کے بہت قریب ہے۔ لیکن اگر اسباب اور مسببات یا علت اور معلول کے سلسلہ کو کچھ وسعت دی جائے تو اس سبب قریب کے علاوہ باقی تمام کڑیاں اس کی نظر سے محجوب ہوں گی جن کا علم صرف اُسی ذات پاک کو ہو سکتا ہے جس نے یہ تمام سلسلہ بنایا۔ اور جو اس عظیم الشان نظام کا مُوجد اور مُبدع ہے۔ بایں ہمہ تم جانتے ہو کہ ہر ایک کڑی کو مؤثر ہونے اور مابعد کا نتیجہ پیدا کرنے میں یقیناً دخل ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ انسان کا ارادہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو ادراک کا نتیجہ ہے یعنی ادراک اس کا سبب مؤثر ہے۔ اصحاب علم جانتے ہیں کہ ادراک اس انفعال اور تاثر کا نتیجہ ہے جو نسل انسانی میں حواس اور مشاعر کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے (سائیکالوجی کا یہ ایک مسلّمہ اصول ہے) چونکہ

حواس اور مشاعر کو ادراک امور کا سبب مانا گیا ہے اور حواس کا تاثر و انفعال (یا بالفاظ دیگر قوت احساس) اشیاء خارجیہ سے تعلق رکھتا ہے مثلاً آنکھ کا تعلق دیکھنے کی چیزوں سے ہے تو کان کا آواز سے۔ اور ناک کا سونگھنے سے وعلیٰ ہذالقیاس۔ اس لئے کائنات عالم اور اشیائے خارجیہ کا انسانی فکر و تخیل اور اس کے ادراک اور ارادہ پر بالواسطہ اثر انداز ہونا ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس کو ایک بچہ بھی سمجھ و اور بھی سمجھ سکتا ہے چہ جائیکہ کوئی عقلمند اس کی صحت میں شک یا اس کا انکار کرے اور جب کائنات خارجیہ کا اثر انسان کی فکر اور ارادہ پر تسلیم کر لیا گیا جن کا نظام اس کے یعنی انسان کے حدود اختیار اور اس کی قدرت سے باہر ہے اور جس کا سبب الاسباب اور علت العلل یقیناً وہی مقدس ذات ہے جو اس تمام سلسلہ اور اس نظام کا مُبدع اور مُوجد ہے اور جس نے ان تمام کائنات کو اپنے ارادہ اور مشیت کے موافق اپنی حکمت الغہ کے مقتضا پر پیدا کیا اور وہی اس تمام کائنات کا خالق اور اس نظام کا چلانے والا ہے۔ تو کیا اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد بھی کوئی عقلمند انسان مسلمانوں کے عقیدۂ قضاء و قدر کی بابت کلام کر سکتا ہے +

اور اگر ہم فرض کر لیں کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ہستی تک کا منکر ہے لیکن پھر بھی وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے ہرگز انکار نہیں کر سکتا کہ عوامل طبعیہ یعنی نیچر کی پوشیدہ طاقتوں کا انسان کے افکار و خیالات اور اس کے ارادہ پر ضرور اثر پڑتا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ ان قوانین قدرت اور وقائع خارجیہ کے تاثرات سے اپنے آپ کو آزاد رکھ سکے۔ چونکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے۔ جس کا ہر ایسا ذی عقل اعتراف کرے گا جو حق اور باطل میں تمیز کر سکتا ہے اس لئے بعض یورپین فلاسفر اور ماہرات سیاست قضاء و قدر کے تسلط کو ماننے پر مجبور ہوئے ہیں اور تقدیر کے متعلق ان کا عقیدہ بعینہ اسلام کی تعلیم کے موافق ہے لیکن ان کی رائیں نقل کر کے ان سے استشہاد کرنا ہمیں چنداں ضروری معلوم نہیں ہوتا +

تاریخ کا ایک شعبہ ایسا بھی ہے جس کا درجہ محض واقعات کے بیان کرنے سے بالاتر ہے جس کو فلسفۂ تاریخ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس میں مختلف اقوام عالم کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر بحث کی جاتی ہے۔ مثلاً یہ دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آخر وہ کون سے حوادث تھے۔ جنہوں نے ایک ترقی یافتہ اور متمدن قوم کے اخلاق و عادات۔ افکار و خیالات۔ بلکہ احساسات اور وجدانات میں ایک خاص تغیر پیدا کیا جس کا نتیجہ اس قوم کے تنزل و انحطاط اور بالآخر فنا اور زوال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور وہ کون سے اسباب داخلی و خارجی ہیں جن کی وجہ سے وہ برسر عروج و اقتدار تھی۔ یہ شعبہ تاریخی لٹریچر کا نہایت اہم اور مفید جزو ہے۔ اس کو پڑھ کر قضاء و قدر کے تصرفات اور اس کی نیرنگیوں کا انسان کو علم حاصل ہوتا ہے اور اگر اس کی چشم بصیرت مطموس نہ ہو تو وہ نہایت واضح طور پر اس حقیقت کو جلوہ گر دیکھ سکتا ہے کہ تمام قوائے بشریہ کا فعل و انفعال اور انسانی جد و جہد کا بار آور ہونا یا ناکام ثابت ہونا سراسر مدبر کائنات کے قبضۂ قدرت میں ہے یا بقول ملاحدہ و دہریہ نیچر کا عمل ہے (بہرحال دونو کا مآل ایک ہے۔ صرف تعبیر کا فرق ہے) اگر بالفرض انسان کا ادراک اس کا ارادہ اور اس کی قوائے عاملہ کی جد و جہد بیرونی اثرات سے آزاد ہوتی تو کچھ شک نہیں کہ کسی قوم کے مجد و سیادت کو زوال نہ ہوتا۔ اور نہ کسی کی سلطنت پارہ پارہ ہوتی۔ (کوئی قوم بالارادہ اپنے تفوق اور برتری کو کھونا نہیں چاہتی) الغرض فلسفۂ تاریخ پر نظر غائر ڈالنے سے مسئلہ تقدیر پر آدمی کا ایمان محکم ہوتا ہے اور واقعات کے آئینہ میں صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ عقیدہ سراسر حقیقت پر مبنی ہے +

قضاء و قدر پر اعتقاد رکھنے کے ساتھ اگر جبر کا عقیدہ شامل نہ ہو (جس کو اپنی کوتہ فہمی سے لوگوں نے شامل کر لیا ہے اور جس کی آمیزش سے یہ تمام خرابیاں پیدا ہوئی ہیں) تو اس کے ماننے سے انسان میں جرأت و اقدام اور شجاعت کی صفت پیدا ہوتی

ہے اور وہ خوشی سے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے ایسے وقت میں میدان میں اُتر پڑتا ہے جبکہ شیر بھی لرزہ براندام ہوتے ہیں۔ اس عقیدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی ایسے گھمسان کے معرکوں میں ثابت قدم رہتا ہے جہاں بڑے مردانِ کار آزمودہ کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ اس عقیدہ کی بدولت ہر ایک قسم کی تکلیف برداشت کرنے کا مادہ انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ جُود و سخا اس کے جزوِ طبیعت بن جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ کسی عزیز سے عزیز چیز کو برمحل خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ اپنی جان عزیز تک کو راہ حق میں قربان کر دیتا ہے۔ ان تمام صفات عالیہ کا ظہور میں آنا ان عقائد کا نتیجہ ہے کہ آدمی کے لئے موت کا وقت مقدر ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو روزی دینے کی ضمانت فرمائی ہے۔ اور تمام تصرفات اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی مشیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ایسی حالت میں اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر اور دین کی حمایت میں اگر آدمی مر جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے فرائض کی بجا آوری میں انسان کی جان چلی جائے تو کیا ہرج ہے۔ اسی طرح اگر کوئی اس کی اوامر کی تنفیذ اور اُمّتِ مرحومہ کا مجد و سیادت قائم کرنے کے لئے اپنا مال خرچ کر ڈالے یا اپنی جان عزیز تک دے دے تو اس سے بہتر کونسا مصرف ہو سکتا ہے ؟۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں مسلمانوں کے اس عقیدہ کی ان الفاظ میں تعریف فرمائی ہے الّذین قال لھم النّاس انّ النّاس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا و قالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل الخ۔ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے خلافت راشدہ کے عہد میں ممالک مختلفہ کو فتح کیا اور دنیا کی متمدن سلطنتوں کو مٹا کر اُن کی بجائے ایک نئی تہذیب اور ایک نیا تمدن قائم کیا اور یہ سب کچھ اتنے قلیل عرصہ میں اور ایسے وسیع پیمانہ پر ہوا کہ دُنیا دیکھ کر دنگ رہ گئی باوجودیکہ ان کی تعداد اور ان کا سامان بہت کم تھا کسریٰ اور قیصر کی عظیم الشان سلطنتیں ان کے سامنے نہ ٹھہر سکیں۔ نظر بظاہر اسباب یہ واقعات خارق عادت معلوم ہوتے ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تہ میں تقدیر کا عقیدہ کارفرما تھا۔ اسی اعتقاد کی بدولت ایک قلیل جماعت پامردی کے ساتھ ایک لشکر جرار کا مقابلہ کرتی اور اس پر فتح پاتی ہے۔ یہی عقیدہ تھا جس نے عہد سلف کے مسلمانوں کو اپنی جانیں اور اپنے مال اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر قربان کرنے پر آمادہ کیا۔ اور ان کے دلوں میں ایک ایسی قناعت پیدا کی جس نے ان کو فقر و فاقہ کے خوف سے بے نیاز کر دیا۔ اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا اور اس کو اپنی تمام ضروریات کا کفیل سمجھنا (جو حسبنا اللہ ونعم الوکیل کا مفہوم ہے) ان کے لئے ہر ایک طرح کی تکلیف اور مصیبت رفع ہونے کی ضمانت تھی۔ اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنے کو وہ ایک ایسا حصنِ حصین خیال کرتے تھے۔ جو تمام حوادثِ روزگار سے ان کو محفوظ رکھنے کے لئے کافی تھا۔ ان کی عورتیں معرکہ کارزار میں ان کے ساتھ رہ کر ان کو پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کی خدمت بجا لاتی تھیں۔ لیکن عقیدۂ تقدیر نے ان میں ایک ایسی ذہنیت پیدا کر دی تھی کہ ممکن نہ تھا کہ ان کے دلوں میں کسی قسم کا خوف جاگزین ہو۔ اسی اعتقاد نے مسلمانوں میں شجاعت اور بسالت کی وہ رُوح پھونک دی تھی۔ کہ بڑے بڑے جرار لشکروں کو ہزیمت دینے کے لئے صرف ان کا رُعب کافی تھا +

بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر تاریخ عالم کی ورق گردانی کی جائے تو اجتماع بشری کی ابتدا یا بالفاظ دیگر آغاز تمدن سے لے کر آج تک کوئی ایسا جلیل القدر فاتح یا عظیم المرتبت سپہ سالار نظر نہیں آئے گا۔ جس نے ایک متوسط طبقہ میں پیدا ہو کر اپنی عالی ہمتی اور اولوالعزمی سے اعلیٰ ترین مراتب تک ترقی کی ہو اور تمام مشکلات پر غالب آ کر اپنے کارناموں سے دُنیا کو محو حیرت کر دیا ہو۔ اور وہ قضا و قدر پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ اور جس کی فتوحات اور کامیابیوں کا باعث یہی عقیدہ نہ ہو۔ اپنے محل موقع پر جانِ عزیز کی بے قدری کا راز اسی عقیدہ میں مضمر ہے کہ ماشاء اللہ کان و مالم یشاء لم یکن۔ جس کا ترجمہ فارسی کے ایک شاعر نے نہایت خوبی

کے ساتھ اس شعر میں کیا ہے ؎

دو روز حذر کردن از مرگ روا نیست — روزیکہ قضا باشد و روزے کہ قضا نیست
روزیکہ قضا باشد کوشش نہ کند سود — روزیکہ قضا نیست در و مرگ روا نیست

تاریخ سے ثابت ہے کہ ملوک ایران میں سے کیخسرو کی عظیم الشان فتوحات کا موجب قضا و قدر کا عقیدہ تھا جس کی بدولت وہ کسی خطرناک سے خطرناک موقعہ پر بھی نہیں گھبراتا تھا۔ اور اس کی عزیمت راسخ میں کسی قسم کا فتور ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ سکندر اعظم بھی تقدیر کا معتقد تھا اور چنگیز خان بھی۔ نپولین اعظم میں جرأت اور اقدام کی خاصیت اسی عقیدہ نے پیدا کی تھی۔ خلاصہ یہ کہ اس سے پاکیزہ تر اور قابل تعریف کونسا عقیدہ ہو سکتا ہے۔ جو نفوس انسانیہ سے بزدلی جیسی رذیل خصلت کو دور کردے۔ جو حصول کمال کا سب سے بڑا مانع ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض یا اکثر جاہل مسلمانوں نے اپنی کوتہ فہمی کی وجہ سے جبر کا اعتقاد بھی اس کے ساتھ شامل کر لیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ موجودہ تنزل اور انحطاط کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہو۔ لیکن علمائے راسخین سے ہمیں امید ہے کہ وہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا ازالہ فرما کر مسئلہ تقدیر کے صحیح مفہوم کو ان کے ذہن نشین فرمائیں گے۔ جیسے کہ ہم نے تمہید میں وضاحت سے بیان کیا ہے اکثر اوقات اہل بدعت کی تحریفات اور جہلا کے غلط عقائد کی آمیزش سے اصل حقیقت مستور ہو کر رہ جاتی ہے اور جو خرابیاں اس آمیزش حق و باطل سے رونما ہوتی ہیں ان کو اصل عقیدہ کے نتائج خیال کیا جاتا ہے۔ علماء کا فرض ہے کہ وہ حقیقت سے بے نقاب کرنے میں تساہل نہ کریں۔ حجۃ الاسلام امام غزالی رح اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح اور آپ کے شاگرد ابن القیم رح نے اپنی تصنیفات میں اس مسئلہ پر پوری روشنی ڈالی ہے اور اس بات کی تصریح کی ہے کہ شریعت غرّا نے جو اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے اور قضا و قدر پر ایمان رکھنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ہم بطالت اور کاہلی کی زندگی بسر کریں یا مسئلہ تقدیر کے دامن میں پناہ گزین ہو کر فرائض اسلام کی بجا آوری سے گریز کریں۔ ایسا کرنا یقیناً ضلالت ہے (ابن القیم رح نے اسی مسئلہ پر ایک مستقل تصنیف یادگار چھوڑی ہے جس میں ہمچو غلط فہمیوں کا دلائل قطعیہ سے ازالہ فرمایا ہے۔ جس کا حجم پانسو صفحات کے قریب ہے۔ یہ کتاب اور اس کا اردو ترجمہ ہمارے مکتبہ علوم مشرقیہ میں موجود ہے) +

الغرض مسئلہ تقدیر کو مسلمانوں کے تنزل و انحطاط کا اصلی سبب خیال کرنا غلط ہے۔ اور اعدائے اسلام و مسلمین کا ایک مسموم پراپاگنڈہ ہے۔ مسلمانوں کے تنزل و ادبار کے اسباب درحقیقت اور ہیں جن کو بسط اور تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے لئے یہاں گنجائش نہیں۔ مختصراً اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ دورِ اسلام کے آغاز میں غیر معمولی اور خارق عادت فتوحات نے مسلمانوں پر منشی اثر ڈالا تھا۔ اور وہ اپنے غلبہ و تفوق کے نشہ میں مخمور ہو گئے تھے۔ یکایک ان پر دو عظیم ترین مصیبتیں نازل ہوئیں۔ مشرق کی طرف سے چنگیز خان اور اس کی اولاد و احفاد نے حملہ آور ہو کر تمام اسلامی ممالک کو پامال کیا۔ مغرب سے یورپین اقوام متحد اور متفق ہو کر ان پر چڑھ دوڑیں۔ جن کا ذکر تاریخ میں حروب صلیبیہ کے عنوان سے موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ نشے کی حالت میں کسی ناگہانی صدمہ کا پیش آنا انسان کو مبہوت بنا دیتا ہے اور اس لئے اس کو کوئی طریق کار نہیں سوجھتا۔ ان ہولناک واقعات کے بعد ان میں طوائف الملوکی ہو گئی اور عنان حکومت نااہلوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ انہی ملوک و امراء کا وجود مسلمانوں کے اخلاق و معاشرت کے لئے مہلک جراثیم ثابت ہوا۔ اور یہیں سے ان کی شقاوت کا آغاز ہوا۔ ان کی ہمتیں پست پڑ گئیں اور ان کی رائے

میں منتقل ہو گیا۔ ان میں سے اکثر کا مطمح نظر ذاتی خوشحالی تھی۔ جس کے لئے وہ دوسروں کو ذلیل و تباہ کرنا معیوب نہیں سمجھتے تھے اور جن کی حالت کا آخری نقشہ آج تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔

لیکن مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کا صفحہ ہستی سے مٹنا اس وقت تک محال ہے جب تک کہ اسلام کے عقاید شریفہ ان کے دلوں میں جاگزین ہیں۔ اور احکام و تعلیمات اسلام کا نقشہ ان کے اذہان میں قائم ہے۔ ان پر اگرچہ نفسانیت طاری بھی ہو۔ یا ان کی ذہنیت میں کوئی خرابی پیدا ہو لیکن جب تک عقائد حقہ میں خلل نہیں آیا اس وقت تک ان کے حق میں زوال مطلق کا فتویٰ صادر نہیں کیا جا سکتا۔ ان سب خرابیوں کو ان کی قوت ایمانیہ جلدی یا بدیر دُور کرنے کے لئے کافی ہوگی۔ اور بھٹک جانے کے باوجود وہ پھر صراط مستقیم پر چلنے لگیں گے۔ ایسا ہونا بعید از قیاس نہیں۔ اور تاریخی واقعات اس کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ حروب صلیبیہ کے دہشت انگیز حوادث اور حملۂ چنگیزیہ کے بعد بھی ترکان آل عثمان نے ایک زبردست سلطنت قائم کی جتیٰ کہ دول یورپ نے ان کے حکمران (سلطان سلیم) کو سلطان اکبر تسلیم کیا۔ اور اگرچہ بعد میں ایسے واقعات ظہور میں آئے جن کا انجام کچھ اچھا نظر نہیں آتا تھا لیکن اس حالت میں بھی ارباب بصیرت کے اذہان میں ایک حرکت فکریہ پیدا ہوئی۔ جو روز بروز ترقی پذیر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اللہ تعالےٰ اپنے فضل و کرم سے اس میں برکت عنایت فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

(المترجم عبد الرحیم)

جذبۂ دل

فیضِ ساقی ہے کہ مدہوش ہوئے جاتے ہیں
شیخ بھی رندِ بلانوش ہوئے جاتے ہیں

کس نے یہ آج سرِ طور دکھایا جلوہ
تھامئے تھامئے بیہوش ہوئے جاتے ہیں

ہے تجلی کا یہ عالم کہ منور کونین
اور حیا اتنی کہ روپوش ہوئے جاتے ہیں

یاد کس بھولنے والے کی سمائی دل میں
دو جہاں مجھکو فراموش ہوئے جاتے ہیں

دل میں اللہ رے ہے کس گلِ خوبی کا خیال
میرے اشعار بھی گلپوش ہوئے جاتے ہیں

ہے غلامی محمدؐ ہی کا صدقہ خواجہ!
ذرے خورشید کے ہمدوش ہوئے جاتے ہیں

خواجہ محمد یوسف سیکنڈ ایر (ایگریکلچر)

اکبر کا ایک شعر

(از شبلی افغانی)

بدقسمتی سے موجودہ تعلیم۔ طرزِ تمدن "اور نیشنلزم" کی نئی تفسیر نے ہمیں صراطِ مستقیم سے اتنا دُور جا پھینکا ہے کہ ہم اپنی حقیقی منزل کا تصور تک ذہن و دماغ سے محو کر چکے ہیں اور ہماری تمام زندگی میرزا غالب کے اس شعر کا مرقع ہے ؎

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کیساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو مَیں

خود فریبی اور تغافل نے ہمیں ایسے قعرِ مذلت میں گرایا ہے کہ ہماری آئندہ نسلوں کو واقف کار کرنے کے لئے "پیغامات" کی بجائے "پیغامبروں" کی ضرورت ہو گی۔ مغربی تہذیب، تعلیم کی تباہ کاریاں دیکھتے ہوئے بھی ہم اِسے دین و دُنیا کی نعمت سمجھ رہے ہیں۔ اور سب سے زیادہ قابلِ تاسف امر تو یہ ہے کہ وہ غیور اور شجاع افغان جو اپنی تہذیب و تمدن کے متعلق اتنے راسخ العقیدہ تھے کہ حکومتیں بدلیں۔ مذاہب بدلے اور زمانے نے بھی نئے نئے رنگ بدلے۔ لیکن افغان کے لباس اور اس کے تمدن میں کوئی تبدیلی نہ آسکتی تھی۔ اور پھر افغان جو صدیوں ہندوستان میں اسلامی تہذیب و تعلیم کے علمبردار رہے۔ آج وہی افغان اپنا دوشالہ پھینک کر مغربی ٹاٹ اوڑھ چکے ہیں۔ اور اس پر اس قدر نازاں و شاداں ہیں کہ گویا دونو جہان کی دولت مالِ غنیمت میں ہاتھ آئی ہے۔ ان کی گفتار۔ رفتار اور کردار سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں سے دیگر لباس میں ایک لُنگی افغانیت کا پتہ دے رہی تھی۔ سو وہ بھی ماشاء اللہ انگریزی ٹوپی کی نذر ہو گئی۔ ہندوستان بھر میں افغان اور بنگالی اس قومی خصوصیت کے لئے ممتاز تھے کہ وہ آپس میں سوائے اپنی مادری زبان کے اور کسی زبان میں گفتگو نہیں کرتے۔ لیکن موجودہ نسل میں یہ تخصیص بھی عنقا ہو رہی ہے۔ اور اب تو باہمی خط و کتابت بھی سوائے انگریزی کے اور کسی زبان میں ناممکن ہو رہی ہے کیونکہ پشتو یا اُردو میں خط و کتابت ان کے نزدیک گنوارپن اور جہالت ہے۔ اور فخر یہ اس امر پر ناز کرتے ہیں کہ وہ اپنی مادری (پشتو) یا قومی (اُردو) زبان سے زیادہ انگریزی میں اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔ کیوں نہ ہو شب و روز ان کے مخاطب جو انگریز ہوتے ہیں اور بہ اُنہیں عمر جو انگلستان یا امریکہ میں بسر کرنی ہوئی ✦

تحصیلِ علم ہر مسلمان کا مقدس فرض ہے اور انگریزی نہیں بلکہ دنیا بھر کی زبانیں سیکھنے میں مسلمان کے لئے کوئی امر مانع نہیں۔ لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ وہ اپنی مادری اور قومی یا مذہبی زبانیں فراموش کر بیٹھیں۔ اور ان میں گفتگو یا تحریر باعثِ ننگ سمجھیں۔ آپ ذرا اپنی حاکم قوم کو دیکھیں اور بتائیں کہ کیا اب تک کسی انگریز نے اپنا قومی لباس ترک کیا ہے۔ یا کہیں دو انگریزوں کو سوائے انگریزی کے کسی اور زبان میں گفتگو یا خط و کتابت کرتے دیکھا ہے۔ لباس اور زبان تو ایک طرف رہی۔ انگریز دُنیا کے جس حصے میں بھی ہو۔ وہ صرف وہی چیز استعمال کرے گا جو

اس نے وطن کی ساخت سے ہو جتنی کہ مچھلی جیسی چیز بھی وہ اپنے وطن ہی کی کھائے گا۔ اور یہی چیز ایک آزاد اور غلام یا حاکم اور محکوم قوم میں مابہ الامتیاز ہے۔ علاوہ ازیں انگریزی زبان کا رُعب یا جادُو ہمارے دل و دماغ پر اس قدر مستولی ہو چکا ہے کہ گویا گناہ یا بُرائی کا انگریزی میں نام لینا ہی اس کا کفارہ ہے۔ مثلاً آپ کو اگر کوئی پشتو یا اُردو میں کہے کہ آپ ناچنا جانتے ہیں۔ تو آپ فوراً آپے سے باہر ہو کر پُوچھنے والے سے دست و گریبان ہو جائیں گے۔ لیکن اگر وہ ناچ کی جگہ (DANCE) کہہ دے تو آپ پھُولے نہ سمائیں گے اور اپنے تئیں تہذیب کا مجسمہ قرار دیں گے۔ اگر آپ کو کوئی کہہ دے کہ آپ قمار باز ہیں تو شاید ازالہ حیثیت عرفی تک نوبت پہنچے لیکن اگر قمار بازی کی جگہ (RACES یا BRIDGE) کہہ دیا جائے تو آپ دل ہی دل میں پوچھنے والے کے ممنون ہوں گے۔ اگر کسی نے آپ کو شرابخور کہہ دیا تو مذہبی حملے کے نام سے اُس کا خون مباح سمجھیں گے لیکن اگر یہی (DRINK) میں مبدل ہو جائے تو آپ فخر و مباہات سے بن پئے مست ہو جائیں گے۔

اسی طرح اگر کسی نے کسی سرائے یا نانبائی کے ہاں ٹھہرنے کا ذکر کیا تو آپ اُسے ذلیل و بد مذاق سمجھیں گے۔ لیکن اگر اُس نے کسی سرائے کو انگریزی میں (REST HOUSE) اور نانبائی کی دوکان کو ہوٹل (HOTEL) کا نام دے دیا۔ تو آپ بخوشی اس کا ساتھ دیں گے۔ غرض یہ غلامانہ ذہنیت، یہ غیر اسلامی خصائص اور یہ ننگ افغانی عادات آج اس طرح ہمارے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہیں کہ ہم دیکھتے ہوئے اندھے۔ سُنتے ہوئے بہرے اور لکھے پڑھے جُہلا ہیں آج اپنی علمیت، تہذیب اور روشن خیالی کی سب سے بڑی اور مستحکم دلیل ہمارے پاس صرف یہی ہے کہ ہم انگریزی لباس پہننے میں ماہر ہیں۔ اور چاہے گفتگو پشتو میں ہو یا اُردو میں۔ ہم اس میں پچاس فی صدی انگریزی الفاظ ضرور بولیں گے۔

میں صرف یہی عرض کروں گا کہ ہر نوجوان سرحدی آج اپنے خدا اور ضمیر سے یہ عہد کرے کہ وہ :-

(۱) اپنے لباس و تمدن میں قومی تخصیص ضرور قائم رکھے گا ✦

(۲) چاہے گفتگو پشتو میں ہو یا اُردو میں بالکل خالص زبان استعمال کرے گا ✦

(۳) آپس میں خط و کتابت صرف پشتو یا اُردو میں کرے گا ✦

(۴) لفافہ پر پتہ صرف اُردو میں تحریر کرے گا۔ یہ یاد رہے کہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں اُردو خوان موجود ہیں اور ترویج اُردو کا یہ سب سے آسان طریقہ اور خدمت ہے ✦

جو نوجوان خود اعتمادی کی نعمت سے محروم ہیں یا قوت ارادی سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ وہ صرف یہ کہہ کر دل کو تسلی دیتے ہیں کہ آج سب دُنیا یہی کچھ کر رہی ہے، تو میں کیوں نرالی وضع اختیار کروں۔ یہ بعینہ اسی قسم کی دلیل ہے کہ جب کسی شخص کو جیلخانے کا خوف دلا کر ارتکاب جرم سے روکا جائے اور وہ یہ جواب دے کہ جہاں جیلخانے میں ہزاروں لاکھوں انسان پہلے موجود ہیں وہاں ایک میں بھی سہی اس لئے میں اُن کو اور اپنے سب نوجوان بھائیوں کو لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کا وہ پیغام دیتا ہوں جو میرے مضمون کا ماحصل ہے اور وہ یہ ہے ؎

اس پہ کیا ناز کہ بدلا ہے زمانے نے تمہیں
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں!

"شبلی افغانی"

اکبر کا ایک شعر

(شبلی افغانی)

بدقسمتی سے موجودہ تعلیم۔ طرزِ تمدن "اور نیشنل ازم" کی نئی تفسیر نے ہمیں صراطِ مستقیم سے اتنا دُور جا پھینکا ہے کہ ہم اپنی حقیقی منزل کا تصور تک ذہن و دماغ سے محو کر چکے ہیں اور ہماری تمام زندگی میرزا غالب کے اس شعر کا مرقع ہے ؂

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کیساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خود فریبی اور تغافل نے ہمیں ایسے قعرِ مذلت میں گرایا ہے کہ ہماری آئندہ نسلوں کو دفن کار کرنے کے لئے "پیغامات" کی بجائے "پیغامبروں" کی ضرورت ہوگی۔ مغربی تہذیب و تعلیم کی تباہ کاریاں دیکھتے ہوئے بھی ہم اسے دین و دُنیا کی نعمت سمجھ رہے ہیں۔ اور سب سے زیادہ قابلِ تاسف امر تو یہ ہے کہ وہ غیور اور شجاع افغان جو اپنی تہذیب و تمدن کے متعلق اتنے راسخ العقیدہ تھے کہ حکومتیں بدلیں۔ مذاہب بدلے اور زمانے نے بھی نئے نئے رنگ بدلے۔ لیکن افغان کے لباس اور اس کے تمدن میں کوئی تبدیلی نہ آسکتی تھی۔ اور پھر افغان جو صدیوں ہندوستان میں اسلامی تہذیب و تعلیم کے علمبردار رہے۔ آج وہی افغان اپنا دوشالہ پھینک کر مغربی ٹاٹ اوڑھ چکے ہیں۔ اور اس پر اس قدر نازاں و شاداں ہیں کہ گویا دونو جہان کی دولت مالِ غنیمت میں ہاتھ آئی ہے۔ ان کی گفتار۔ رفتار اور کردار سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں سے دیگر لباس میں ایک لُنگی افغانیت کا پتہ دے رہی تھی۔ سو وہ بھی ماشاء اللہ انگریزی ٹوپی کی نذر ہو گئی۔ ہندوستان بھر میں افغان اور بنگالی اس قومی خصوصیت کے لئے ممتاز تھے کہ وہ آپس میں سوائے اپنی مادری زبان کے اور کسی زبان میں گفتگو نہیں کرتے۔ لیکن موجودہ نسل میں یہ تخصیص بھی عُنقا ہو رہی ہے۔ اور اب تو باہمی خط و کتابت بھی سوائے انگریزی کے اور کسی زبان میں ناممکن ہو رہی ہے کیونکہ پشتو یا اُردو میں خط و کتابت ان کے نزدیک گنوارپن اور جہالت ہے۔ اور فخریہ اس امر پر ناز کرتے ہیں کہ وہ اپنی مادری (پشتو) یا قومی (اُردو) زبان سے زیادہ انگریزی میں اظہارِ خیال کرسکتے ہیں۔ کیوں نہ ہو شب و روز ان کے مخاطب جو انگریز ہوتے ہیں اور یوں اُنہیں عمر جو انگلستان یا امریکہ میں بسر کرنی ہوئی۔

تحصیل علم ہر مسلمان کا مقدس فرض ہے اور انگریزی نہیں بلکہ دنیا بھر کی زبانیں سیکھنے میں مسلمان کے لئے کوئی امر مانع نہیں۔ لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ وہ اپنی مادری اور قومی یا مذہبی زبانیں فراموش کر بیٹھیں۔ اور ان میں گفتگو یا تحریر باعثِ ننگ سمجھیں۔ آپ ذرا اپنی حاکم قوم کو دیکھیں اور بتائیں کہ کیا اب تک کسی انگریز نے اپنا قومی لباس ترک کیا ہے۔ یا کہیں دو انگریزوں کو سوائے انگریزی کے کسی اور زبان میں گفتگو یا خط و کتابت کرتے دیکھا ہے۔ لباس اور زبان تو ایک طرف رہی۔ انگریز دُنیا کے جس حصّے میں بھی ہو۔ وہ صرف وہی چیز استعمال کرے گا جو

اس۔کے وطن کی ساخت۔ جو حتیٰ کہ مچھلی جیسی چیز بھی وہ اپنے وطن ہی کی کھائے گا۔ اور یہی چیز ایک آزاد اور غلام یا حاکم اور محکوم قوم میں مابہ الامتیاز ہے۔ علاوہ بریں انگریزی زبان کا رُعب یا جادُو ہمارے دل و دماغ پر اس قدر مستولی ہو چکا ہے کہ گویا ہر گناہ یا بُرائی کا انگریزی میں نام لینا ہی اس کا کفارہ ہے۔ مثلاً آپ کو اگر کوئی پشتو یا اُردو میں کہے کہ آپ ناچنا جانتے ہیں۔ تو آپ فوراً آپے سے باہر ہو کر پُوچھنے والے سے دست و گریبان ہو جائیں گے۔ لیکن اگر وہ ناچ کی جگہ (DANCE) کہہ دے تو آپ پھُولے نہ سمائیں گے اور اپنے تئیں تہذیب کا مجسمہ قرار دیں گے۔ اگر آپ کو کوئی کہدے کہ آپ قمار باز ہیں تو شاید ازالہ حیثیت عرفی تک نوبت پہنچے۔ لیکن اگر قمار بازی کی جگہ (RACES یا BRIDGE) کہدیا جائے تو آپ دل ہی دل میں پوچھنے والے کے ممنون ہوں گے۔ اگر کسی نے آپ کو شرابخور کہہ یا تو مذہبی جملے کے نام سے اُس کا خون مباح سمجھیں گے لیکن اگر یہی (DRINK) میں مبدل ہو جائے تو آپ فخر و مباہات سے بن پیئے مست ہو جائیں گے۔

اسی طرح اگر کسی نے کسی سرائے یا نانبائی کے ہاں ٹھہرنے کا ذکر کیا تو آپ اُسے ذلیل و بدمذاق سمجھیں گے۔ لیکن اگر اُس نے کسی سرائے کو انگریزی میں (REST HOUSE) اور نانبائی کی دوکان کو ہوٹل (HOTEL) کا نام دے دیا۔ تو آپ بخوشی اس کا ساتھ دیں گے۔ غرض یہ غلامانہ ذہنیت، یہ غیر اسلامی خصائص اور یہ ننگ افغانی عادات آج اس طرح ہمارے رگ و پے میں سرائیت کر گئی ہیں کہ ہم دیکھتے ہوتے اندھے۔ سُنتے ہوئے بہرے اور لکھے پڑھے جُہلا ہیں آج اپنی علمیت، تہذیب اور روشن خیالی کی سب سے بڑی اور مستحکم دلیل ہمارے پاس صرف یہی ہے کہ ہم انگریزی لباس پہننے میں ماہر ہیں۔ اور چاہے گفتگو پشتو میں ہو یا اُردو میں۔ ہم اس میں پچاس فی صدی انگریزی الفاظ ضرور بولیں گے۔

میں صرف یہی عرض کروں گا کہ ہر نوجوان سرحدی آج اپنے خدا اور ضمیر سے یہ عہد کرے کہ وہ :۔

(۱) اپنے لباس و تمدن میں قومی تخصیص ضرور قائم رکھے گا ؎

(۲) چاہے گفتگو پشتو میں ہو یا اُردو میں بالکل خالص زبان استعمال کرے گا ؎

(۳) آپس میں خط و کتابت صرف پشتو یا اُردو میں کرے گا ؎

(۴) لفافہ پر پتہ صرف اُردو میں تحریر کرے گا۔ یہ یاد رہے کہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں اُردو خوان موجود ہیں اور ترویج اُردو کا یہ سب سے آسان طریقہ اور خدمت ہے ؎

جو نوجوان خود اعتمادی کی نعمت سے محروم ہیں یا قوت ارادی سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ وہ صرف یہ کہہ کر دل کو تسلی دیتے ہیں کہ آج سب دُنیا یہی کچھ کر رہی ہے، تو میں کیوں نرالی وضع اختیار کروں۔ یہ بعینہٖ اسی قسم کی دلیل ہے کہ جب کسی شخص کو جلیانے کا خوف دلا کر ارتکاب جُرم سے روکا جائے اور وہ یہ جواب دے کہ جہاں جلیانے میں ہزاروں لاکھوں انسان پہلے موجود ہیں وہاں ایک مَیں بھی سہی۔ اس لئے مَیں اُن کو اور اپنے سب نوجوان بھائیوں کو لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کا وہ پیغام دیتا ہوں جو میرے مضمون کا ماحصل ہے اور وہ یہ ہے ؎

اس پہ کیا ناز کہ بدلا ہے زمانے نے تمہیں

مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں!

"شبلی افغانی"

سلیم حامد بہت ہونہار تھا۔ اس کی عمر کوئی اٹھارہ برس کی تھی۔ وہ جماعت دہم میں پڑھ رہا تھا۔ اس کے اساتذہ کا خیال تھا کہ اگر اسے اپنے جوہر دکھانے کا موقع دیا گیا۔ تو وہ بہت چمکے گا۔ اور اپنی زندگی کو شاندار بنا لیگا اپنی جماعت میں اُسے ممتاز حیثیت حاصل تھی ÷

میں اور وہ اوائل عمر ہی سے شیر و شکر تھے۔ دن کا بیشتر حصہ ہم اکٹھے رہتے تھے۔ اور مختلف امور پر بحث کیا کرتے تھے۔ وہ بچپن کی شادی کے برخلاف تھا۔ اور موجودہ سوشل اصول و قواعد کو حد درجہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ انسان کو اس وقت تک شادی نہیں کرنی چاہیئے جب تک اس کے جسمانی اور دماغی قویٰ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ جائیں۔ اور اُسے اقتصادی خوش حالی میسر نہ ہو۔ ان خیالات کے باوجود اس کی بدبختی کا اندازہ کیجئے۔ کہ بچپن ہی سے اس کی منگنی ہو چکی تھی

اس کی والدہ اُسے بیاہنے کی خواہشمند تھی۔ وہ جب کبھی مدرسہ سے آتا تھا۔ اور اپنی ماں سے ملتا تھا۔ تو وہ اُسے کہتی۔ "پیارے سلیم! میری آرزو ہے۔ کہ تیری خوشیاں جیتے جی دیکھتی جاؤں۔ میری مسرت کی انتہا نہ رہے گی۔ جب میں تیری رفیقۂ حیات کو اپنے گھر میں دیکھوں گی۔ کیا تو نہیں چاہتا کہ تیری امی جان کی یہ آرزو پوری ہو" سلیم ان باتوں سے بگڑتا تھا۔ اور اپنی ناراضگی کا اظہار کرتا تھا۔ ——————

اس کی بہنیں بھی مدت سے اسی آرزو کو دل میں چھپائے ہوئے تھیں۔ اور وہ اپنے والد کو سلیم کی شادی کا کہتی تھیں۔ سلیم کا والد جو اپنی عمر کی آخری منزلیں طے کر رہا تھا۔ اُس کی والدہ اور بہنوں کی رائے سے متفق تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اپنے فرزند ارجمند کی شادی کر کے ایک بہت بڑے مذہبی فریضہ سے سبکدوش ہو جائے۔

اب میٹرک کا امتحان ہو چکا تھا۔ اور نتیجہ نکلنے والا تھا کہ سلیم کے سسرال کے دباؤ اور اس کے اعزہ و اقارب کی آرزو کے اثر سے اس کی شادی کی تیاریاں شروع ہونے لگیں اُسے والدین کی آرزو کے آگے جھکنا پڑا۔ سلیم کی کامیابی کے شادیانوں کے ساتھ اس کی شادی کے شادیانے بھی بجنے شروع ہو گئے۔ اور چند دنوں کے اندر اندر وہ ہونہار طالب علم "شادی شدہ" ہو گیا —— خاندانی مجبوری کے پیش نظر اسے تعلیم کو بند کرنا پڑا۔ اور اُس نے اپنے شہر کے میونسپل آفس میں ایک کلارک کی حیثیت سے نوکری اختیار کر لی ÷

میں علی گڈھ سے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری لے کر اپنے شہر واپس آیا۔ ضروری امور سے فراغت پا کر سلیم سے ملا۔ اسے شادی کئے ہوئے سات برس ہو چکے تھے۔ اس کا والد اسے داغ مفارقت دے کر کب کا انتقال

کرچکا تھا ـــــ اس کا رنگ زرد تھا۔ چہرہ پر چھائیوں کے داغ ہویدا تھے۔ جو اس کی دماغی اور جسمانی مصائب کا زبانِ حال سے اقرار کر رہے تھے۔ مجھے اس سے مل کر خوشی بھی ہوئی اور رنج بھی۔ خوشی اس لئے کہ وہ میرا بچپن کا دوست اور ہم جماعت تھا۔ اور رنج اس لئے کہ وہ بُری حالت میں تھا۔ ایام تعلیم کے زمانہ میں یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ کہ اس قابلیت کے پُتلے کی زندگی ایسی تلخ اور حالت ایسی ابتر ہوگی۔ اس نے مجھے بتایا۔ کہ اس کی والدہ نے اس کی عورت سے لڑ جھگڑ کر اُسے گھر سے نکال دیا ہے۔ جو اس کی والدہ کے حق مہر میں تھا۔ اس کی "آرزومند" والدہ اور بہنوں نے چار سال سے اس سے قطع تعلق کیا ہوا ہے۔ اس وقت وہ ملازمت سے چالیس روپے ماہوار کماتا تھا۔ اور چونکہ وہ صاحب اولاد تھا۔ اس کا گزارہ مشکل سے ہوتا تھا +

میں کاروباری سلسلہ میں چند سال تک وطن سے باہر رہا۔ اور جب مدّت کے بعد گھر آیا۔ تو سلیم سے ملاقات کرنے کے لئے اس کے دفتر میں گیا۔ وہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ کسی قصور کی بنا پر اُسے ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ میں بہزار دقت پوچھتے پوچھتے اس کے مکان پر پہنچا۔ صبح کا وقت تھا۔ وہ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بال بچوں سمیت بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے مکان اور خاندان کی حالت دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ اور آنسو تھم نہ سکے ـــــ اس وقت اس کے گرد پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک کا بھی پُوری طرح تن ڈھکا ہوا نہ تھا۔ کرتہ تھا تو سلوار نہ تھی۔ اور اگر سلوار تھی تو سر ڈھانکنے کا کپڑا نہ تھا۔ وہ اس وقت چھابڑی فروشی کا کام کرتا تھا۔ اور آمدنی کی قلت کی وجہ سے نہ تو اپنے بال بچوں کو پال سکتا تھا۔ اور نہ ان کی تعلیم کا بندوبست کر سکتا تھا ـــــ اس نے مجھے بتایا کہ بسا اوقات انہیں فاقہ کرنا پڑتا ہے ـــــ مجھ سے جو ہو سکا۔ میں نے اس کی مدد کی اور وہاں سے گھر کو روانہ ہوا۔ میرے خیالات پریشان تھے۔ اور طبیعت نہایت اُداس تھی ـــــ

سلیم کی ملاقات سے آکر یہ فقرات میں نے سپرد قلم کئے۔ تاکہ میرے ملکی اور قومی نوجوانوں کے لئے عبرت کا باعث بن سکیں ـــــ

غلام مصطفٰے صفدر تھرڈ ایر

کسی کی یاد

نشاط و حسن کے سرمایہ دار بے تمثیل
مری امیدوں کی دنیا کے تاجدار جمیل

نسیم صبح کی اٹکھیلیوں کی تجھکو قسم
شمیم تازہ کی خوش فعلیوں کی تجھکو قسم

تجھے قسم ہے انہیں مست آبشاروں کی
کہ جن پہ پڑتی ہیں پرچھائیاں ستاروں کی

جلو میں جن کی کبھی شادماں میرا دل تھا
جہاں حیات کو لطف حیات حاصل تھا

دلا نہ مجھ کو وہاں کی لطافتوں کی یاد
کہ میرے غم سے تیری روح بھی نہ ہو ناشاد

ہیں اب بھی یاد مجھے وہ بہار کی راتیں
وہ لطف عہد گزشتہ وہ پیار کی باتیں

وہ صبح و شام شب و روز کی ملاقاتیں
وہ فرش باغ پہ لطف و سرور کی باتیں

وہ تیری شوخ اداؤں کی فتنہ سامانی
قدم قدم پہ تبسم کی کیف بارانی

وہ نرگسی تیری مست بہار سی آنکھیں
وہ پرخمار مگر ہوشیار سی آنکھیں

خموش راتوں میں تیرا وہ گریۂ پیہم
بلندیوں پہ تیرا اُف وہ نغمۂ پرغم

وہ دیکھنا ترا حسرت بھری نگاہوں سے
دل و جگر کا مسلنا وہ سرد آہوں سے

غرور حسن سے تیور چڑھا کے ہٹ جانا
کبھی وفور عنایات سے لپٹ جانا

وہ لطف وعید ملاقات یاد ہے ابتک
خدا گواہ کہ ہر بات یاد ہے اب تک

غم فراق میں ہوتی ہے جب خوشی برباد
بہت ستاتی ہے جب دل کو دوست تیری یاد

ترے خیال میں بے اختیار روتا ہوں
تری تلاش میں کھویا ہوا سا ہوتا ہوں

سید محمد علی ظہیر خاں گورکھپوری
متعلم بی۔ اے

کوئل سے خطاب

او سبز رو اور نو وارد پرندے! میں نے تیری آواز سن لی ہے۔ میں جب تیری آواز سن پاتا ہوں۔ تو باغ باغ ہو جاتا ہوں ؎
.... اے کوئل! کیا میں تجھے پرندہ سمجھوں یا صرف ایک گھومتی ہوئی آواز............

(۲)

سبزۂ زمردیں پر لیٹا ہوا، میں تیری دو رنگی آواز سن سکتا ہوں۔ یہ صدا پہاڑیوں پر سے گذرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے .... ابھی یہ میرے نزدیک سنائی دیتی ہے اور چشم زدن میں کوسوں دور۔

(۳)

اگرچہ تو وادیوں میں صرف شعاع آفتاب اور گلہائے بہار کی نغمہ سرائی کرتی ہے۔ لیکن تو.......... ہاں تو ہی میرے مہجور و مضطرب دل میں، خیالی لمحات کی یاد تازہ کر دیتی ہے!

(۴)

اے رنگین موسم بہار کے پیارے پرندے! تجھے ۳ بار خوش آمدید ہو.......... اب تک تو میرے نزدیک پرندہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک ...... غیر مرئی ہستی ہے....... ایک غیر محسوس وجود ہے۔ ایک مجسم آواز اور...... سراپا راز........!

(۵)

کیا تو وہی تو نہیں جس کی خوش کن آواز میں زمانۂ طفولیت میں سنا کرتا تھا؟ اور تیری خوش الحانی سے متأثر ہو کر میں ہر طرف تیری تلاش میں سرگرداں رہتا۔ یا تو جھاڑیوں میں تیرے پیچھے خاک چھانتا۔ یا درختوں پر میری متجسس نگاہیں تیری جستجو میں آوارہ ہو جاتیں۔ یا فضا کے وسیع میدان میں تیری تلاش کرنے لگ جاتیں..............

(۶)

تیری جستجو اور طلب میں میں نے اکثر بادیہ پیمائی اور صحرا نوردی کی۔ گلزاروں اور مرغزاروں میں بھی تیری تلاش کرتا رہا۔ لیکن تو امیدِ موہوم ہی رہی یا محبت!.......... جس کے دیکھنے کی آرزو تو ہمیشہ سے ہو، لیکن بایں ہمہ.... نظر کبھی نہ آئے!!

(۷)

درحقیقت تیری ترنم ریز اور پراسرار صدا اب بھی میرے لئے فردوس گوش کا کام کرتی ہے......... صحن گلشن میں دراز ہو کر..... بچپن کے معصوم ایام کی طرح۔ اب بھی میں تیری آواز....... وہی "صدائے بازگشت"...... وہی مسحور کن اور پرکیف گونج...... دوبارہ سن سکتا ہوں؛ حتیٰ کہ مجھے وہ سنہری لمحات..... پھر سے حاصل ہو جائیں ؎

(۸)

او مبارک رو پرندے! معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کرۂ زمین..... جس پر ہم چلتے پھرتے ہیں....... ایک ایسی اعلیٰ اور ارفع جگہ کی صورت میں تبدیل ہو جائے۔ جو تیرے رہنے کے عین موزوں اور مناسب ہو...... ؎ (حسن ابن سعید۔ زراعت) سال سوم

رازِ زندگی

(۱)

فصلِ گل آخر ہی مضراب سازِ زندگی
چھیڑتا ہے دِل کو پھر سوز و گدازِ زندگی!
ہوش سے دیکھیں ذرا نظارۂ بازارِ چمن
گل کھلا! مرجھا گیا!! بس یہ ہے رازِ زندگی!

(۲)

اس سے پوچھو جو ہوا لذت کشِ ذوقِ فنا
زندگی کے راز سے بس اک وہی ہے آشنا
گو تخیل ہے مرا ناقص مگر پھر بھی نصیر
زندگی فرقت کی اک بے چین شب ہے اور کیا

ایم اے نصیر۔ متعلم ایم اے

حقیقت

ناامیدی نے آہ بھرتے ہوئے امید سے پوچھا! "بتا۔ تیرا مسکن کدھر ہے۔ خوش نصیب"۔ امید نے جواب دیا! "ناامید کے خوابوں میں"۔

مفلسی نے آنسو بہاتے ہوئے دولت سے پوچھا! "بتا۔ تیرا مستقل قیام کہاں ہے۔ خوش بخت"۔ دولت نے جواب دیا۔ "مفلس کے تصور میں"۔

بدصورتی نے حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے حسن سے پوچھا! "بتا۔ تیرا سچا پرستار کون ہے۔ دلفریب"۔ حسن نے جواب دیا! "بدصورت"۔

بندہ نے خدا سے دریافت کیا۔ "یارب تیری ہستی کا راز کہاں پوشیدہ ہے"۔ جواب ملا! "میری "محبت" میں"۔

"نرگس"

میاں فجو نے بندوق چلائی

میاں فجو عجیب شخصیت کے مالک ہیں۔ بات بات پر جھوٹ بولنا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ اور دُنیا کے ہر فن میں اپنے آپ کو مستند استاد سمجھتے ہیں۔ اصلی نام تو معلوم نہیں۔ لیکن آپ کی ہی زبانی معلوم ہوا تھا۔ کہ آپ کو والدین بچپن ہی سے ادبا" فجو کے نام سے پکارتے تھے۔

ایک دن ہم آپ کے حضور میں بیٹھے تھے۔ ارد گرد چیلے چانٹوں کا جمگھٹا تھا آپ آلتی پالتی مارے منہ پر اپنی مخصوص مسکراہٹ لئے ہمارے ساتھ محو گفتگو تھے۔ اپنی طرف سے وہ نہایت ضروری مسائل پر بحث فرما رہے تھے۔ اگرچہ ہم اپنی جگہ ان باتوں کو مجنونانہ حرکات سے زیادہ وقعت نہیں دے رہے تھے تاہم ہمہ تن گوش تھے۔ باتوں باتوں میں کہیں شکار کا ذکر چھڑ آگیا۔ تو میاں فجو مونچھوں پہ تاؤ دیکر فرمانے لگے "شکار۔ واللہ کیا کہا۔ کوئی زمانہ تھا کہ میں کسی کو شکار میں اپنا ثانی نہیں سمجھتا تھا۔ اور خصوصاً بندوق کا شکار! میں تو سائے کو دیکھ کر بھی نشانہ لگا سکتا ہوں"۔

یہ تو ہمیں معلوم ہی تھا کہ باتیں کرنے۔ افیون کھانے اور جھوٹ بولنے میں آپ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ لیکن آج جو شکار کا سُنا تو ہم دنگ رہ گئے۔ "آپ! اور شکار"۔ ہم میں سے ایک ساتھی نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں بھیا۔ کیا تم یقین نہیں کرتے ــــ" آپ نے فرمایا۔ "میں چالیس سال فوج میں ایک ممتاز عہدہ پر مامور رہا ہوں"۔ (شاید عہدہ کا نام بھول گئے تھے۔) اور ساتھ ہی اپنے چہرہ مبارک پر فخریہ ہاتھ پھیرا۔ جو پینتالیس سال سے کسی صورت میں زیادہ کا نظر نہیں آتا تھا۔ "تو پھر جناب ہمیں بھی تو کبھی شکار کو لے چلئے۔ ہم بھی تو سیر دیکھیں"۔

"ہاں۔ کبھی فرصت میں"۔ آپ نے ذرا دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "ہاں۔ حضور۔ ضرور۔ ضرور"۔ میں نے دوست کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

بڑی مشکل سے میاں فجو آئندہ منگل کو ہمارے ساتھ شکار کو جانے پر راضی ہوئے۔

منگل کی صبح حمید چند دوستوں کو لے کر میرے گھر آنازل ہُوا۔ اور ہم میاں فجو کے گھر کو روانہ ہوئے۔ گھر پہنچے تو حضور کو چولھے کے پاس افیون کے نشے میں جھولتے دیکھا۔ نزدیک جاکر زور سے جھنجوڑا۔ اور عرض کی کہ حضور ابھی تک آپ سوئے پڑے ہیں۔ "او! نہیں میاں ذرا نفل پڑھتے پڑھتے آنکھ لگ گئی تھی۔ ویسے تو میں جاگ رہا ہوں"۔ آپ نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ "تو پھر شکار جانے کا کس وقت ارادہ ہے"۔ ہم نے وعدہ یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں خدا کی قسم بات اصل میں یہ ہے کہ مجھے خیال ہی نہ رہا۔ اور تیاری بھی نہ کرسکا۔ دیکھو میری بندوق ــ ہاں۔ وہ تو ایک آدمی مانگ کر لے گیا ہے۔ کمبخت کہیں کا"۔ "تو ہماری بندوقیں جو حاضر ہیں" ہم نے جواب دیا۔

خدا خدا کرکے آپ اُٹھے۔ دو رکعت نماز پڑھی اور ہمارے ساتھ چل کھڑے ہوئے۔

ہمیں مُرغابیوں کے لئے ایک ندی پر دو میل دُور جانا تھا۔ راستے میں میاں فجو رہ رہ کر ہمیں اپنی محترمہ بندوق

کے افسانے سُنا رہے تھے ۔ اور اپنی چالیس سالہ فوجی زندگی کے واقعات ایک ایک کرکے بیان فرما رہے تھے ۔ گو قدم ذرا سُست تھے لیکن زبان قینچی کی طرح تیز چل رہی تھی ۔ ایک جگہ جنگلی کبوتروں کا ایک جھنڈ دیکھا اور ہم نے میاں فجو کو فائر کرنے کی دعوت دی ۔ لیکن آپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "بھیّا میں تو صرف مُرغابیوں پر ہی نشانہ باندھوں گا" جوں جوں ندی نزدیک آ رہی تھی ۔ میاں فجو کے چہرہ کا رنگ بدل رہا تھا ۔ اور دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہو رہی تھی +

آخر ندی پر پہنچ ہی گئے ۔ مُرغابیوں کا ایک بڑا جھنڈ ندی میں چیخ پکار کر رہا تھا ۔ ہم نے فجو کو بندوق بھر کر دی ۔ اور آگے کیا ۔ فجو نے پچاس دفعہ درود شریف اور پچاس دفعہ قل شریف پڑھ کر بندوق بغل میں دابی ۔ اور نالی مرغابیوں کی طرف کرکے تین چکر لگائے ۔ لیکن وہ کم بخت یا تو ایسی مشغول تھیں کہ انہوں نے پرواہ تک نہ کی ۔ یا میاں فجو کے نشانہ سے واقف تھیں ۔ کہ اس سے بچ کر جانا ان کے لئے ناممکن تھا ۔ کم بخت ایک بھی نہ اُڑی ۔ مجبوراً میاں فجو نے بندوق زمین پر رکھ دو نو ہاتھوں کو زور سے ملا ۔ اور بسم اللہ پڑھ کر بندوق اٹھائی ۔ ندی کی جانب منہ کرکے بندوق کا کندہ چھاتی کے درمیان رکھ کر آنکھیں بند کیں ۔ اور ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر فائر کر دیا ۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی ہم نے جو نظر اُٹھا کر دیکھا تو ندی سے تقریباً ۱۰۰ گز کے فاصلہ پر داہنی جانب ایک کتا خون میں لت پت زور زور سے بھونکتا ہوا بھاگ رہا تھا ۔ اور فجو کی طرف جو نگاہ کی ۔ تو اُنہیں پاؤں ندی کی طرف کئے بندوق کو سینہ پر رکھے آنکھیں بند کرکے ریت پر آرام فرماتا ہوا پایا +

(عبدالسلام فرسٹ ایر)

انجامِ زندگی

انسان کا انجام ــــــ موت! اس کے آہنی پنجے ــــــ کس قدر زبردست ــــــ قبر کا تصور ــــــ کس قدر خوفناک ــــــ دُنیا ــــــ سب دھوکا ــــــ فریب ــــــ چال ۔ مکر ــــــ دُنیا کی محبت ــــــ جھوٹی ــــــ دُنیا ــــــ بے وفا اور فانی ــــــ زندگی ــــــ صرف دو روزہ ــــــ مال اور دولت ــــــ عزیز اور دوست ــــــ سب دم کے ساتھی ــــــ اس کے بعد انسان ــــــ بے بس و بے کس ــــــ آہ ! ــــــ نہ کوئی ساتھی ــــــ نہ رفیق ــــــ انسان ــــــ اکیلا بالکل اکیلا ــــــ اس کا آخری مقام ــــــ قبر ــــــ آخری ساتھی ــــــ قبر کا اندھیرا ــــــ آخری پوشاک ــــــ کفن ــــــ بالکل سادہ اور سفید کفن ــــــ موت ــــــ سخت بے رحم ــــــ سنگدل ــــــ ظالم موت ــــــ کی گرفت ــــــ زبردست ــــــ قبر کی تاریکی ــــــ دُنیا کی سب تاریکیوں سے تاریک تر ــــــ
آہ ! یہ انسان کا آخری ــــــ اور سب سے آخری ــــــ انجام ــــــ اس کے بعد اِک نئے دَور کا آغاز"

یہ انجام ! ۔ یہ آغاز ! ۔ اک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے ۔ خواب ہے دیوانے کا

اخترؔ

نالۂ مزدور

صفحۂ گیتی پہ میرا آشیاں کوئی نہیں،
میرا گھر وہ ہے کہ جس گھر کا نشاں کوئی نہیں

میرا دل دُنیا کی خوں آشامیوں سے سیر ہے
میری دُنیا تیرہ و تاریک ہے اندھیر ہے

ایک دم بھر بھی یہ غم مجھ سے جدا ہوتا نہیں
"نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہوتا نہیں"

میری گردن میں پڑا ہے اِک غلامی کا کمند
روندتے ہیں روز و شب سرمایہ داروں کے سمند

رات کو بازار میں تختوں پہ سو جاتا ہوں میں!
صبح کو دنیائے رنج و غم میں کھو جاتا ہوں میں

عیش سے آرام سے مخمور ہے سرمایہ دار
اس کے گلشن میں سدا رہتی ہے ساون کی بہار

وہ بلائے رنج و غم سے بے خبر ہے شاد ہے
دہر پُر آشوب کی ہر قید سے آزاد ہے

ہاں! مگر میں ہوں کہ مزدوری سے چکنا چور ہوں
کہتے ہیں مزدور مجھ کو آہ! میں مزدور ہوں!!

صفدر گیلانی فرسٹ ایر

جب میں گاؤں کے قریب پہنچا تو تاجدارِ مشرق کی الوداعی شعاعیں گرجے کی بلند چوٹی پر پڑ رہی تھیں۔ شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ زندگی کی پُر شور دنیا پر چھاتا جا رہا تھا۔ سکوت کی دیوی اپنے بال پریشان کئے خراماں خراماں زندگی کو اپنے گھیرے میں لے رہی تھی۔ پرندے دن بھر کی ہمت شکن دوڑ دھوپ کے بعد اپنے اپنے آشیانوں کی طرف مائل پرواز تھے۔ دُور مشرق کی طرف چاند آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔ ندی کا پانی اس غمگین دیوتا کے قدم لینے کے لئے بے تابی سے مچل رہا تھا +

قریب ہی ندی سے کچھ فاصلے پر سینکڑوں آرزؤں اور تمناؤں کا وہ مدفن تھا جسے عرف عام میں قبرستان کہتے ہیں۔ قریب تھا کہ قبرستان کی پُرسکوت غمگین وادی سے میں آگے بڑھ جاؤں۔ کہ ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ میری آنکھیں اس طرف مُڑ گئیں۔ اور گڑی کی گڑی رہ گئیں۔ دیکھا کہ معصومیت کے دو ننھے ننھے شاہکار ایک قبر پر بیٹھے سسک سسک کر رو رہے ہیں۔ زندگی کی فریب کاریوں کے شکار اپنی بے لبسی پر بیٹھے آنسو بہا رہے ہیں موت! آہ موت نے ان کی زندگی کو تلخ بنا دیا تھا۔ میں بڑھا اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "معصوم بچو! تم کون ہو؟" میرا اتنا کہنا تھا کہ سُلگتی ہوئی چنگاری بھڑک اُٹھی۔ ان کی سسکیاں بنتے ہوئے گرم گرم آنسوؤں میں تبدیل ہو گئیں۔ بڑی مشکل کے بعد کہیں یہ طوفان تھما۔ تو ان میں سے ایک نے جو ذرا سیانا تھا کہا:۔

"ہم خدا کو ڈھونڈھ رہے ہیں۔ ہماری ماں نے جو یہاں مدفون ہے بتایا تھا کہ ہمارا باپ سمندر پار لڑائی میں گیا ہُوا ہے۔ اس بات کو مدت گذر گئی ہے۔ ہماری ماں باپ کے غم میں ہمیشہ آنسو بہاتی رہی۔ حتیٰ کہ غم نے اُسے بیمار کر دیا۔ اور آخر کار یہی آنسو اسے قبر میں لے گئے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا۔ کہ اگر میں مر جاؤں تو تمہارا باپ لڑائی کے بعد تمہارے پاس ضرور آئے گا۔ اگر وہ نہ آیا تو پھر تمہارا خبر گیر خدا ہو گا۔ ہمارا باپ لوگ کہتے ہیں کہ لڑائی میں مارا گیا ہے۔ اب ہم خدا کو ڈھونڈھ رہے ہیں۔ تمام دن خدا کی تلاش میں مارے مارے پھرے۔ اب مایوس ہو کر واپس اپنی ماں کے پاس لوٹ آئے ہیں۔ اچھے آدمی تم ہی بتاؤ خدا کہاں ہے؟"

میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ جن کے قطروں میں مجھے زندگی عُریاں نظر آئی۔ آہ! ظالم موت۔ انہیں کس کے سپرد کر گئی!!

"ف۔ ح"

اقبالؒ کا پیغام
نوجوانوں کے نام

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پہ
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پہ

حکیم ملت علامہ اقبال کا انقلابی پیام اگرچہ عالمگیر تھا۔ مگر اس کی رُوح افزا اور حیات آگیں نظروں کے مخاطب مسلمانانِ عالم بالعموم اور نوجوانانِ قوم بالخصوص تھے کیونکہ مسلمانوں ہی میں اس کے کلام اور پیام کے سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی زیادہ صلاحیت موجود ہے۔ اوروں کے لئے یہ پیغام ایک انوکھی چیز ہے۔ مگر مسلمانوں کا تو یہ بھولا ہوا سبق ہے۔ اسی سبق پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ تھا کہ رُوم و فارس کی وسیع سلطنتیں ان کے زیرنگین ہوگئیں۔ جدھر گئے اور جہاں پہنچے۔ اپنی شجاعت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اور آج تک تاریخ کے اوراق ان کے زندہ جاوید کارناموں اور بے نظیر کارنامہ وں کے شاہد ہیں۔ یہی وہ سبق ہے جسے فراموش کرکے مسلمانانِ عالم زبوں حالی اور پستی کے قعرِ مذلت میں گرے ہوئے ہیں۔ اور آج غربت و افلاس۔ غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

نوجوانوں کو خطاب کرنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ ان میں فطرتاً ذوقِ عمل کے علاوہ جوش اور ولولہ موجود ہے۔ محنت و مشقت کی صلاحیت ہے۔ جو لائحہ عمل اقبال پیش کرتا ہے۔ اس کو بروئے کار لانے کی طاقت اور ہمت صرف انہی کے خون میں موجزن ہے اقبال جس قصرِ رفیع کی تعمیر کا طالب ہے۔ اس کی استعداد انہی کے مضبوط اور آہنی بازوؤں میں موجود ہے جن کٹھن اور دشوار گذار منازل کو طے کرنے کے بغیر عروسِ مقصد سے ہمکنار ہونا نصیب نہیں ہوسکتا۔ ان سختیوں کو جھیلنے کی تاب صرف انہی کے فولادی دلوں اور سنگین ارادوں میں ہے۔ اگر ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت صحیح بنیادوں پر رکھی جائے۔ تو اقوامِ عالم کے رہبر اور مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔ انہی کے زورِ بازو سے تیرہ سو برس گذشتہ کی شان و شوکت جو تمام دُنیا کو انگشت بدنداں کرگئی تھی۔ از سرِ نو زندہ کی جا سکتی ہے۔ مگر موجودہ تعلیم کے مضر اور زہر آلود اثرات کو نوجوانوں کے دل و دماغ پر قابض دیکھ کر وہ بے اختیار چیخ اُٹھتے ہیں۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

تعلیم بجائے اس کے کہ نوجوانوں کو کشمکشِ حیات میں غلبہ حاصل کرنے کی تدبیریں بتاتی اہم اور ضروری امور کی گتھیاں سلجھانے کا ذوقِ سلیم پیدا کرتی، مشکلات و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی رُوح ودیعت کرتی۔ فطری خاموش سوتوں

کو حرکت دے کر اُن سے علم و عرفان کے چشمے بہاتی۔ پوشیدہ صلاحیتوں کو نشوونما دیتی۔ دماغوں کو فرحت اور کشادگی بخشتی۔ دُور اندیشی اور وُسعت نظر کی تخم ریزی کرتی۔ اور نوجوان اپنی زندگی میں کامیاب اور کامران ہوتے۔ اس کا اثر بالکل برعکس ہو رہا ہے۔ مصائب اور تکالیف کے تصور ہی سے حرکت قلب بند ہونے لگتی ہے۔ ہاتھ لرز جاتے ہیں۔ رنگ فق ہو جاتا ہے۔ قویٰ جواب دے کر مُردہ ہو جاتے ہیں۔ اسی تعلیم نے ہمارے قلوب میں ظلمت کی ایک تہ بٹھا دی ہے۔ فطرت کے اسرار و رموز جو ہر دیدۂ بینا کے لئے وا ہیں نوجوانوں کے لئے مسدود ہو گئے ہیں۔ چنانچہ علامۂ مرحوم ضرب کلیم میں فرماتے ہیں:-

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہین بخشا جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش

اور اخیر میں فرماتے ہیں ؎

مدرسے نے تیری آنکھوں سے چھپایا جن کو خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

علامہ اقبالؒ مدرسہ اور درسگاہوں کی قدر و منزلت سے بخوبی واقف ہیں۔ اور اس امر کا بھی انہیں احساس ہے کہ اگر مدارس اصلی اور صحیح معنوں میں درسگاہیں ہوں۔ تو ان کے ذریعہ سے تہذیب و تمدن کی رُوح پرور شعاعیں اطراف عالم میں پھیلائی جا سکتی ہیں۔ مُردہ قلوب میں بیداری اور احساس عمل پیدا کر کے قوموں کی بگڑی حالت سنواری جا سکتی ہے۔ پست اقوام کی پست ذہنیتوں میں رفعت و بلندی پیدا کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ مدرسہ اور تعلیم کا مقصد لارڈ میکالے کے الفاظ میں" انگریزی قالب میں ڈھال کر" تہذیب و تمدن سے محروم کرنا نہو ؎

علم و فن را اے جوان شوخ و شنگ مغز می باید نہ ملبوس فرنگ
اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست
فکر چالاکے اگر داری بس است طبع درّاکے اگر داری بس است

طالب علموں کی زندگی میں ایک سکون اور جمود دیکھ کر شاعر انقلاب کے دل حساس میں بے پناہ جذبات کی ایک لہر اُٹھتی ہے وہ متمنی ہے کہ یہ طلسم سکوت ٹوٹ کر حرکت اور تپش کی صورت اختیار کرے۔ نوجوان جن کے کندھوں پر ملک و ملت کی ذمہ داری کا بار گراں پڑنے والا ہے۔ سخت کوش اور سخت جُو ہوں۔ ان کے مُردہ عروق میں انقلاب و سیمابیت تفحص و تلاش پیہم عمل اور لامتناہی سعی کا جذبہ پیدا ہو۔ خیالات میں وسعت اور افکار میں بلند پروازی کی جھلک ہو۔ ان کی تعلیم چند مخصوص کتابوں کے اوراق تک محدود نہ ہو۔ بلکہ وہ حکمت و دانش کے جواہر جہاں سے بھی میسر ہو سکیں۔ حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہوں۔ طلباء کو ہر سُنی سنائی بات پر بُز اخفش کی طرح سر ہلا کر مہر تصدیق ثبت نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ ہر چیز کا جائزہ عقل کی روشنی میں لے کر مرد ایجاد و اختراع کے میدان میں گامزن ہونا چاہیئے ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

اقبال طلباء کو صرف سائنس اور فلسفہ کی موشگافیوں میں اُلجھانے کے متمنی نہیں۔ بلکہ تعلیم جدید کے ساتھ مذہبی

تعلیم کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ مذہب کی اصلی روح اور پاکیزگی سے کما حقہٗ واقف نہ ہونے کی وجہ سے ہی نوجوان فسونِ افرنگ کے پُرفریب دام میں آکر مذہب سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس کی ضرورت اور اہمیت کو نہ سمجھتے ہوئے کورانہ تقلید کی بھول بھلیوں میں سرگرداں۔ اور صراطِ مستقیم سے ہٹ کر دہریت اور الحاد کی پگڈنڈیوں پر پریشان بھٹکتے پھرتے ہیں۔ موجودہ تعلیم کے مضر جراثیم نوجوانوں میں سُرعت سے سرایت کر کے خودی کے شجرِ طیب کی جڑوں پر تبر کا کام کرتے ہیں۔ افکار میں بے ربط آزادی پیدا کر کے عقیدہ اور یقین کے حصنِ حصین میں ایک زلزلہ پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پرانی چیز کو چاہے وہ گوہرِ نایاب ہی کیوں نہ ہو بغیر سوچے سمجھے فرسودہ خیال کر کے ہر نئی چیز کے آستانہ پر سرِ نیاز جھک جاتا ہے۔ لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم بجائے ترقی اور خوشحالی کے نکبت اور ادبار کے عمیق گڑھے میں گرے جا رہے ہیں ؎

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر — لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما — لیکر آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ تعلیم جدید کا حاصل کرنا ہماری مشکلات کا کامیاب حل نہیں۔ ہمارے رِستے ہوئے ناسوروں کے لئے صرف یہ تعلیم مداوا نہیں بن سکتی۔ انہیں یقین ہے کہ تعلیم جدید سے قبل پختہ ایمانی۔ ذوقِ عمل۔ خودی یا انفرادیت کا احساس ضرور ہونا چاہئے۔ ممکن ہے کہ مغربی نوجوانوں کے لئے یہ تعلیم مفید ہو مگر نونہالانِ چمنِ محمدی کی آبیاری اس سے ہرگز نہیں ہو سکتی کیونکہ ع

"شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور"

اور اس مخصوص جہاں کی نوعیت یہ ہے:۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

مرحوم نے جگہ جگہ تعلیم جدید کی موجودہ بگڑی صورت اور تہذیب جدید کی ہولناکیوں کا ذکر نہایت رقت انگیز اور عبرت خیز پیرایہ میں کیا ہے۔ اور اس راز کی پردہ کشائی کی ہے کہ مشرقی اقوام کے لئے بالعموم اور نوجوانوں کے لئے بالخصوص ترقی اور بلندی کے دروازے اس وقت تک بند رہیں گے۔ جب تک کہ اُن میں فکر و تامل کی عادت پیدا نہ ہو۔ اور جب تک عقل و خرد کی کسوٹی پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہر چیز کو پرکھا نہ جائے۔ اگر مسلم نوجوانوں میں یہ چیز پیدا ہو گئی۔ تو وہ خرابیاں یکسر کافور ہو جائیں گی۔ جو اب مُسلم قوم کے لئے مستقل روگ بنی ہوئی ہیں۔ اگر اُمتِ مسلمہ کی احیاء اور نشاۃ ثانیہ کا کوئی ذریعہ ہے تو اسلامی تعلیمات کی پیروی اور کورانہ تقلید سے بیزاری۔ اس اندھی تقلید کو جس کے ہم بدقسمتی سے شکار ہیں خودکشی کا مترادف ٹھہراتے ہیں ؎

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی

ایک جگہ اور کورانہ تقلید سے باز رہنے کی تلقین یوں کی ہے ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہِ دیگراں رفتن حرام است

اگر از دستِ تو کارِ نادر آید!
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

وہ مغربی تہذیب کے قائل نہیں۔ بلکہ اس سے بیحد نالاں ہیں۔ اور نوجوانوں کو بھی اس کے چنگل سے بچنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ اگر مادی ترقی کے ساتھ روحانیت کا عنصر لطیف نہ ہو جو اصل زندگی کا جوہر اور بقاء حیات کی تعبیر ہے تو یہ ترقی ہیچ ہے۔ روح اگر مُردہ ہے تو جسم بیکار محض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب فرنگ کے تمام دُنیا کو انگشت بدندان کرنے کے باوجود وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں ع

جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت

اور اسی لئے ایک صدائے ربانی بن کر آخیر دم تک یہی تعلیم دیتے رہے کہ ع

مومنِ خود کافر افرنگ شو

مختصر یہ کہ ان کی زندگی سحر مغرب اور افسونِ فرنگ کے خلاف ایک مسلسل جہاد تھی۔ یہ ان کی مقدس زندگی کا ایک ایسا بلند کارنامہ ہے۔ جس کو اہل نظر بخوبی سمجھتے ہیں۔ اور صداقت پر مبنی ہونے کی بنا پر شدت سے حمایت کرتے ہیں۔ مگر یہی نکتہ ہے جو ہمارے مغرب زدہ نوجوانوں کے لئے بالکل انوکھی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس بصیرت اور فہم فراست کا تک اقبال خود ہے۔ اس تک ہر نوجوان کی رسائی کا متمنی ہے ؎

جوانوں کو میری آہِ سحر دے | پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
الٰہی آرزو میری یہی ہے | میرا نورِ بصیرت عام کر دے

ساقی نامہ میں وہ ساقی سے شراب کہنہ کا طالب ہے۔ جو دُور جام پر جام لنڈھاتا ہے۔ اور احباب کو دعوت دیتا ہے اس شراب معرفت کی مستی اور سرخوشی سے رازہائے فطرت اس پر کُھل جاتے ہیں۔ رموزِ کائنات کے پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ اس کا فیاض دل خزانہ کو قافلہ میں لٹا دینے کی دُعا مانگتا ہے۔ نوجوانوں میں سوزِ عشق پیدا کر کے ذوقِ عمل پیدا کرنے کا خواہشمند ہے۔ ان میں دلِ مرتضیٰ۔ سوزِ صدیق دیکھنے کا متمنی ہے۔ ایک غیر فانی تپش اور لگن ان میں ودیعت کرنے کا آرزومند ہے۔ جو آگ اس کے سینے میں شعلہ فشاں ہے۔ اس آگ کی چنگاریاں نوجوانوں کے قلوب میں دیکھ کر تمام بزم کو آتش سوزاں دیکھنا چاہتا ہے ؎

ترے آسمانوں کی تاروں کی خیر | زمینوں کی شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے | مرا عشق۔ میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں | مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز | مرے خلوت و انجمن کا گداز
اُمنگیں مری۔ آرزوئیں مری | امیدیں مری جستجوئیں مری،
مرا دل مری رزم گاہِ حیات | گمانوں کا لشکر، یقین کا ثبات
مرے قافلہ میں لٹا دے اُسے | لٹا دے ٹھکانے لگا دے اُسے

حکیمِ مشرق اور نباضِ ملت علامہ اقبال چاہتے ہیں کہ میدانِ عمل میں کودنے سے قبل نوجوانوں کے قلوب آرزوؤں اور جستجوؤں سے لبریز ہوں۔ تاکہ ان تک رسائی کے لئے وہ ہمیشہ سرگرمِ عمل رہیں۔ ان کا ہر قدم کسی معین نصب العین کی جانب خاص آرزو کے ماتحت اٹھے۔ ایک تمنا کی تکمیل کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھر کر قانع نہ رہیں۔ بلکہ ہمیشہ نت نئی امیدیں اور بوقلموں آرزوئیں دل کی پہنائیوں میں جاگزین ہوں۔ ان کے نزدیک زندگی آرزوؤں کا دوسرا نام ہے۔ جب آرزوئیں ختم ہو جاتی ہیں۔ موت اپنی بھیانک شکل کے ساتھ نمودار ہو کر انسانی زندگی کو روپوش کر دیتی ہے۔ لہذا بقائے حیات کے لئے امیدوں اور آرزوؤں کا ہجوم لابدی ہے ؎

زندگی در آرزو پوشیدہ است — اصل او در آرزو پوشیدہ است

زندگانی را بقا از آرزوست — کاروانش را درا از آرزوست

طاقتِ پرواز بخشد خاک را

خضر گردد موسیٰ ادراک را

جو آرزوؤں سے عاری اور جستجوؤں سے مبرا ہیں۔ ان کی حیثیت اقبال مرحوم کے نزدیک اُن مردہ لاشوں کی ہے۔ جو گنگا کی موجوں میں تیرتی نظر آتی ہیں۔ اور بس! صحیح تعلیم و تربیت کی بھٹی میں چڑھنے کے بعد اُن میں بصیرت اور احساسِ خودی پیدا کرنے کے آرزومند ہیں۔ اس نعمتِ غیر مترقبہ سے مالا مال ہونے کے بعد ان کو میدانِ عمل و جہد کی جانب دعوت دیتے ہیں۔ کیونکہ جہاں اسلام میں جذبۂ ایمان اور پختہ یقین کی ضرورت ہے۔ وہاں پیہم عمل اور مسلسل کوشش بھی لازمی ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو مُردہ اقوام کو تحت الثریٰ سے اُٹھا کر ثریا کی بلندی تک پہنچا دیتی ہیں۔ یہی وہ ہتھیار ہیں جن سے مسلح ہو کر اقوامِ عالم کارزارِ حیات میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ ان کو سطحیات اور فضول زبانی جمع خرچیوں سے چڑ ہے۔ وہ تو صرف یقینِ محکم اور عمل پیہم کے مداح اور مبلغ ہیں۔ جو اُن سے بیگانہ کرے۔ وہ ان کی نکتہ رس نگاہوں میں پرکاہ کی بھی وقعت نہیں رکھتا ؎

یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار

شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

الغرض اگر ہم میں یہی اوصاف پیدا ہو گئے۔ تو حکیمِ ملت مرحوم کا مقصد حل ہو گیا۔ اور اگر ہم نے ان کے پیام کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی بجائے ترنم اور خوش الحانی سے گانا شروع کر دیا یا انکا دیگر شعراء کے کلام میں امتیاز نہ کیا۔ تو اس کفرانِ نعمت کے لئے فردائے قیامت ان کی پاک رُوح کے سامنے ہماری گردنیں فرطِ ندامت سے جُھک جائیں گی۔ ضرورت ہے کہ ہم مرحوم کے اس شعر کو لبیک کہہ کر اپنی منزلِ مقصود کی جانب جادہ پیما ہوں ؎

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم!

اپنی ہستی سے عیاں شعلہ سینائی کر

عبدالصمد بلوچستانی

سال دوم

محشرستانِ آرزو

برق پرور ہے فلک اور خار پرور ہے زمیں
ان کو بدلوں اور نیا اِک امتحاں پیدا کروں

خلوتِ شب میں بتا کر میں حقیقت سوز کی
محفلِ انجم میں اپنے رازداں پیدا کروں

خود بخود پھر درد کے درماں مری جانب بڑھیں
ساری دُنیا سے الگ طرزِ فغاں پیدا کروں،

کاش! ہو اِس بارگہ میں تابِ گویائی مجھے!!
میرے اللہ! میں کہاں سے وہ زباں پیدا کروں

تنگ ہے میرے جنوں پر وسعتِ ارض و سما
کیوں نہ پھر اپنے زمین و آسماں پیدا کروں

ہے چمن میں برق کا ہر دم خطر! لیکن نصیرؔ
پہلوئے گل چھوڑ کر کیا آشیاں پیدا کروں

ایم اے نصیر

انسانی زندگی

گھاس سے ڈھکے ہوئے ٹیلوں پہ خاموشی اور سکون کا تسلط ہے۔ ایک نوجوان مرد اور ایک حسین دوشیزہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ چہل قدمی کر رہے ہیں۔ وہ ٹیلے کی بلندی پہ پہنچکر ٹھیر جاتے ہیں:۔

ریاض:۔ "شیریں تم چلتے چلتے تھک گئی ہوگی۔ آؤ ذرا یہاں بیٹھ کر دم لے لیں۔ گھاس کی ہریاول میں دعوت دے رہی ہے۔ مجھے تو گھاس یہ کہتے سنائی دیتی ہے۔ "میں اس لئے سبز ہوں کہ شیریں کی آنکھوں کو سرور پہنچے میں اسلئے ٹھنڈی ہوں کہ شیریں کے پاؤں کو ٹھنڈک پہنچے" آؤ یہاں بیٹھ جائیں۔ اس وقت میں اور تم اس بلند ٹیلے پہ تنہا ہیں دُور تک ہری ہری ڈھلوانیں غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی پیلی دھوپ میں ریشم کی چادر وں کی طرح چمک رہی ہیں۔ شیریں! میں آج اپنے دل میں بھی وہ شاندار سکون محسوس کر رہا ہوں جو شام کے ساتھ ساتھ ان درختوں کی بلندیوں پر چھایا جا رہا ہے۔ تم میرے قریب ہو۔ میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ چھو سکتا ہوں۔ اور یہی میری آرزوؤں کی انتہا ہے۔ جب تم میرے قریب ہوتی ہو۔ تو میرا تخیل جاگ اُٹھتا ہے۔ میرے دماغ میں ایک بجلی سی کوند جاتی ہے۔ اور زندگی دفعتاً خوشنما معلوم ہونے لگتی ہے۔ محبت کا ادنیٰ ترین معجزہ معمولی سے معمولی انسان کی رُوح میں بھی شعریت پیدا کر دیتا ہے جس سے اس کی نظر گہری ہو جاتی ہے۔ اور ہزاروں خوبصورتیاں جو اس کے گرد بکھری پڑی ہوتی ہیں اور جنہیں وہ پہلے نہ دیکھ سکتا تھا نظر آنے لگ جاتی ہے۔ محبت سے گویا ایک نئی بینائی ایک نئی روشنی کی جھلک زندگی میں پیدا ہو جاتی ہے۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے نا شیریں"

شیریں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ۔ ریاض کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اثبات میں سر ہلا دیتی ہے۔

ریاض:۔ "شیریں! تمہاری ان آنکھوں کے راز میں نہیں سمجھ سکتا اس وقت تو میں خوش ہوں کہ ان میں شفقت ہے، پیار ہے۔ لیکن بعض اوقات بیٹھے بیٹھے ان میں ایک عجیب گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے اُفق سے دُور دراز واقعات دیکھ رہی ہو۔ اور ان واقعات میں میرا کوئی حصہ نہیں۔ اس وقت میں اپنے آپ کو سخت تنہا محسوس کرنے لگ جاتا ہوں۔ وعدہ کرو شیریں! کہ تم خیال میں بھی کبھی مجھ سے جُدا نہ ہوگی"

شیریں:۔ "تم ہمیشہ مجھے اسی طرح چاہو گے نا؟"

ریاض:۔ "یہ ایک ایسا عجیب سوال ہے جو ہر عورت ہر مرد سے پوچھتی ہے اور ہر مرد ہر عورت سے۔ ہم ہزاروں دفعہ ایک دُوسرے سے پوچھ چکے ہیں۔ "تمہیں مجھ سے محبت ہے نا؟" ہر دفعہ اس سوال میں اور اس سوال کے جواب میں ایک نئی تازگی معلوم ہوتی ہے۔ تمہیں "ہاں" کہلوا کر مزا آتا ہے۔ اور مجھے "ہاں" کہہ کر تسکین ہوتی ہے۔ شیریں! میری محبت زمین و زماں سے بالاتر ہے۔ وہ ابدیت جو زندگی میں ہے۔ جو کائنات کی ہستی میں ہے میری محبت میں ہے"

سورج غروب ہو چکا ہے پھٹے ہوئے رنگین بادل جو نارنگی کے چھلکوں کی طرح آسمان پر بکھرے ہوئے تھے۔ تاریک ہوتے جا رہے ہیں۔ درختوں پر ایک نیلی سی سیاہی طاری ہو رہی ہے۔ چودھویں کا چاند چاندی کے قرص کی طرح افق میں سے نکلتا

محشرستانِ آرزو

برق پرور ہے فلک اور خار پرور ہے زمین
ان کو بدلوں اور نیا اک آشیاں پیدا کروں

خلوتِ شب ہاں بتا کر میں حقیقت سوز کی
محفلِ انجم میں اپنے رازداں پیدا کروں

خود بخود پھر درد کے درماں مری جانب بڑھیں
ساری دنیا سے الگ طرزِ فغاں پیدا کروں،

کاش! ہو اس بارگہ میں تابِ گویائی مجھے!!
میرے اللہ! میں کہاں سے وہ زباں پیدا کروں

تنگ ہے میرے جنوں پر وسعتِ ارض و سما
کیوں نہ پھر اپنے زمین و آسماں پیدا کروں

ہے چمن میں برق کا ہر دم خطر! لیکن نصیر
پہلوئے گل چھوڑ کر کیا آشیاں پیدا کروں

ایم اے نصیر

اِنسانی زندگی

گھاس سے ڈھکے ہوئے ٹیلوں پر خاموشی اور سکون کا تسلط ہے۔ ایک نوجوان مرد اور ایک حسین دوشیزہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ چہل قدمی کر رہے ہیں۔ وہ ٹیلے کی بلندی پر پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں:-

ریاض:- "شیریں تم چلتے چلتے تھک گئی ہوگی۔ آؤ ذرا یہاں بیٹھ کر دم لے لیں۔ گھاس کی ہریاول میں موت رہی ہے۔ مجھے تو گھاس یہ کہتے سنائی دیتی ہے "میں اس لئے سبز ہوں کہ شیریں کی آنکھوں کو سرور پہنچے میں اسلئے ٹھنڈی ہوں کہ شیریں کے پاؤں کو ٹھنڈک پہنچے۔" آؤ یہاں بیٹھ جائیں۔ اس وقت میں اور تم اس بلند ٹیلے پر تنہا ہیں دُور تک بھری ہری ڈھلوانیں غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی پیلی دھوپ میں ریشم کی چادروں کی طرح چمک رہی ہیں۔ شیریں! میں آج اپنے دل میں بھی وہ شاندار سکون محسوس کر رہا ہوں جو شام کے ساتھ ساتھ ان درختوں کی بلندیوں پر چھاتا جا رہا ہے۔ تم میرے قریب ہو۔ میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ چھو سکتا ہوں۔ اور یہی میری آرزوؤں کی انتہا ہے۔ جب تم میرے قریب ہوتی ہو۔ تو میرا تخیل جاگ اٹھتا ہے۔ میرے دماغ میں ایک بجلی سی کوند جاتی ہے۔ اور زندگی دفعتاً خوشنما معلوم ہونے لگتی ہے۔ محبت کا ادنیٰ ترین معجزہ معمولی سے معمولی انسان کی رُوح میں بھی شعریت پیدا کر دیتا ہے جس سے اس کی نظر گہری ہو جاتی ہے۔ اور ہزاروں خوبصورتیاں جو اس کے گرد بکھری پڑی ہوتی ہیں اور جنہیں وہ پہلے نہ دیکھ سکتا تھا نظر آنے لگ جاتی ہیں۔ محبت سے گویا ایک نئی بینائی ایک نئی روشنی کی جھلک زندگی میں پیدا ہو جاتی ہے۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے نا شیریں"

شیریں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ۔ ریاض کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اثبات میں سر ہلا دیتی ہے۔

ریاض:- "شیریں! تمہاری ان آنکھوں کے راز میں نہیں سمجھ سکتا۔ اس وقت تو میں خوش ہوں کہ ان میں شفقت ہے، پیار ہے۔ لیکن بعض اوقات بیٹھے بیٹھے ان میں ایک عجیب گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے اُفق سے دُور دراز واقعات دیکھ رہی ہو۔ اور ان واقعات میں میرا کوئی حصہ نہیں۔ اس وقت میں اپنے آپ کو سخت تنہا محسوس کرنے لگ جاتا ہوں۔ وعدہ کرو شیریں! کہ تم خیال میں بھی کبھی مجھ سے جُدا نہ ہوگی۔"

شیریں:- "تم ہمیشہ مجھے اسی طرح چاہو گے نا؟"

ریاض:- "یہ ایک ایسا عجیب سوال ہے جو ہر عورت ہر مرد سے پوچھتی ہے اور ہر مرد ہر عورت سے۔ ہم ہزاروں دفعہ ایک دُوسرے سے پوچھ چکے ہیں۔ "تمہیں مجھ سے محبت ہے نا؟" ہر دفعہ اس سوال میں اور اس سوال کے جواب میں ایک نئی تازگی معلوم ہوتی ہے۔ تمہیں "ہاں" کہلوا کر مزا آتا ہے۔ اور مجھے "ہاں" کہہ کر تسکین ہوتی ہے۔ شیریں! میری محبت زمین و زماں سے بالاتر ہے۔ وہ ابدیت جو زندگی میں ہے۔ جو کائنات کی ہستی میں ہے میری محبت میں ہے۔"

سورج غروب ہو چکا ہے پھٹے ہوئے رنگین بادل جو نارنگی کے چھلکوں کی طرح آسمان پر بکھرے ہوئے تھے۔ تاریک ہوتے جا رہے ہیں۔ درختوں پر ایک نیلی سی سیاہی طاری ہو رہی ہے۔ چودھویں کا چاند چاندی کے قرص کی طرح افق میں سے نکلتا

ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

"دیکھو شیریں! میری محبت کی گواہی دینے کے لئے وہ چاند نکل رہا ہے۔ دُنیا کی حسین ترین شے! (مُسکراتے ہوئے) سوائے تمہارے!

ہوا میں کچھ ایسا سحر ہے کہ چاند اپنی گواہی دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چاندنی لرزتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ہوا میں ہلکا سا ترنم پیدا ہوتا ہے۔ جیسے دُور کہیں چاندی کے گھنگرو ہلکے ہلکے بج رہے ہوں۔

چاند۔ (درختوں کی سیاہ چوٹیوں پر سے جھانکتے ہوئے)۔ "اس کرۂ زمین کی پیدائش سے آج تک ہزاروں نر مادہ میرے سایہ تلے پھرتے نظر آئے۔ کچھ انسان حیوان میرے لئے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ ہزارہا محبت کے پیمان میری چاندنی میں باندھے گئے بعض دفعہ مجھے گواہ بنایا گیا اور بعض دفعہ میری خوبصورتی کی تعریف میں نظمیں گائی گئیں۔ میری پھیکی سی روشنی کو جادو سے تعبیر کیا گیا۔ محبت زا، محبت افزا کہا گیا۔ باہمی محبت کے جوش میں مجھ میں نئی نئی خوبصورتیاں تلاش کی گئیں۔ نظمیں تو ایجاد کی گئیں۔ درحقیقت میں ایک ویران خشک اور بے انتہا سرد کرّہ ہوں۔ ہمیشہ کی بے معنی گردش سے اکتا گیا ہوں۔ "نہ مجھ میں حُسن ہے نہ زندگی۔ میری چاندنی عاریتی ہے۔ میرے چہرے پر ہزاروں بدنما داغ ہیں۔ غلط بین انسان۔ جسے تو حسن کہتا ہے وہ تیرا اپنا ہی زعم باطل ہے۔ تیرا خود ساختہ افسون ہے۔ اگر تو ہر شے کی حقیقت کو قریب سے دیکھ سکے۔ تو یہ حسن کا افسون ٹوٹ جائے۔ جب تک دُوری ہے۔ تب تک حسن۔ اچھا ہے جو تو دُور ہی رہے اور تیرا یہ دھوکہ ہمیشہ قائم رہے۔ ایسے جھوٹے بنیاد دھوکوں سے تو تو نے اپنی درد بھری مختصر زندگی کو خوشنما بنایا ہوا ہے۔ اور تیرے یہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے محبت کے پیمان! اگر تیری ہستی۔ اے انسان قابل رحم نہ ہوتی تو تہائت مضحکہ انگیز ہوتی۔ آج تو مجھے گواہ بناتے ہوئے اس مادہ کے ساتھ محبت کے عہد باندھ رہا ہے۔ تو کل اس سنجیدگی سے دوسری مادہ کے ساتھ۔ غالباً انہی الفاظ میں مجھے اپنی محبت کا گواہ بنانا چاہے گا۔ کل نہ سہی۔ پرسوں نہ سہی دو سال بعد۔ اور عجیب بات یہ کہ دونو دفعہ تجھے اپنی محبت میں کامل یقین ہو گا۔ کمزور، بے سمجھ انسان! ہے تو وقت کا اسیر اور خواب بقا کے دیکھ رہا ہے۔ حقیقت سے نا آشنا خوابوں سے دل بہلا رہا ہے!

ریاض۔ "تم کیا سوچ رہی ہو شیریں۔ پھر خیالات میں کھو گئیں؟"

شیریں۔ "مجھے اس وقت وہ رات یاد آ رہی ہے جب ہم نے اکٹھے چاندنی میں "تاج محل" کی سیر کی تھی۔"

ریاض۔ آہ۔ چاند اور تاج۔ گویا دولہا دولہن! (شیریں کے کان میں شرارتی انداز سے) گویا میں اور تم!

"شیریں مجھے یقین ہے کہ چاند کو ضرور "تاج" سے محبت ہو گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تاج چاندنی میں اس قدر خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ دلہن حسین ترین اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ دولہا کے پاس جا رہی ہو۔ تم نے دیکھا نہیں کہ چاند نکلنے پر کس طرح تاج کا گنبد دلہن کے رخساروں کی طرح دوشیزگی کی حیا میں ڈوب جاتا ہے؟ جیسے کوئی حسینہ آنکھیں نیچی کئے مسکرا رہی ہو۔ لیکن چاند جب تاج کے مرمریں بدن کو آہستہ آہستہ چومنا شروع کرتا ہے اور اپنی سیمیں قبا اُسے اُڑھا دیتا ہے تو وہ حیا ایک پوشیدہ مسرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ تاج فرط خوشی سے بیتاب ہو کر آخر چاندنی کی گود میں سو جاتا ہے۔ اس دلہن کی طرح جو مہینہ بھر دُلہا کے انتظار میں بے قرار رہی ہو۔ اور آخرکار دولہا کی آمد پر اس کی آغوش محبت میں راحت کی نیند سو رہی ہو!

شیریں۔ تاج نہ صرف اس محبت کی یادگار ہے جو شاہ جہان کو ممتاز محل سے تھی۔ بلکہ تمام انسانی محبتوں کا جیتا جاگتا

شبیہ ہے۔ انسانی کوشش نے محبت کی ناپائداری کو حسن اور صنعت کے ذریعہ پائدار بنانا چاہا ہے۔ مثلاً اس شاعر کے جو اپنی مرحوم محبوبہ کو اپنے اشعار میں دائمی زندگی بخش رہا ہو۔ وقت انسانی جذبات کا دشمن ہے اور تاج گویا انسان کی وقت کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔"

اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ ستارے اپنے معین وقت پر اپنا معین سفر طے کرنے کے لئے کانپتے ہوئے نکل رہے ہیں۔ اور چاند کو اپنا قافلہ سالار بنائے تھکے ہوئے رہرووں کی طرح خاموش اپنی نامعلوم منزل کی طرف رواں ہیں۔ وقت کی حکمرانی ہے ساری کائنات اسیرِ وقت ہے۔ انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جو تنہا وقت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے ستاروں کے قافلے تھمتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ارض و سما پر ایک سناٹا چھا جاتا ہے۔ گویا کائنات کی نبض چلتے چلتے رک گئی ہے۔

وقت (گونجتی ہوئی آواز میں جیسے دنیا کے تمام بزرگ زرین گھڑیال اکٹھے بج رہے ہوں) میں وہ عظیم طاقت ہوں جس کا سورج۔ چاند۔ زمین اور سارے اجرام فلکی پر قبضہ ہے۔ ساری کائنات میرے زیر اثر ہے۔ نہ میری ابتدا ہے نہ انتہا۔ تو ایک خاک کی مٹھی ہے اے انسان! تیرے حسن اور تیری محبت کی میرے سامنے کیا ہستی۔ حسن یوں مٹ جاتا ہے جیسے ریت پر لکھی ہوئی تحریر۔ محبت یوں جاتی رہتی ہے جیسے بھولا ہوا خواب۔ کہاں گئے اے انسان وہ تیرے عظیم الشان شہر اور تیری حسین عمارات! تیرے بابل اور نینوا۔ پمپیائی اور روم! کہاں گئے وہ پیٹرارک اور ڈانٹے۔ مجنوں اور فرہاد کے افسانہائے عشق! انہیں زمین کھا گئی اور انہیں وقت نے مٹا دیا۔ ان کے کھنڈر باقی ہیں۔ اور ان کے قصے کہانیاں! عبرت حاصل کر اے مغرور انسان! تو تاج پر نازاں ہے۔ ٹھیر۔ وہ تاج جو ہند کے گرد آلود میدانوں میں ایک دیوؤں اور پریوں کے جادو سے بنائے ہوئے محل کی طرح چمک رہا ہے۔ جسے تو حسن و محبت کا شاہکار کہتا ہے ایک دن ایسا آئے گا کہ زمین کی تاریک انتڑیوں سے ایک گڑگڑاتا ہوا بھونچال پیدا ہوگا۔ جو تاج کے موتی جیسے گنبد اور اس کے پاکیزہ میناروں کو زمین پر پٹخ دے گا۔ پتھر پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ وہ نازک پچی کاریاں جو مشرق کی بہترین صنعت کا نمونہ ہیں ٹوٹے ہوئے دانتوں کی طرح بکھری پڑی ہوں گی۔ وہ لاثانی قبریں جن کی خوبصورتی کا سحر موت کو بھلا دیتا ہے خاک کا تودہ بنی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ سینکڑوں سال بعد کوئی تجھ جیسا سیاح اپنی معشوقہ کو "تاج محل" کے کھنڈرات دکھا رہا ہو۔ اور اسے ایک کھوپری نظر آ جائے۔ جو شاہجہان کی ہو یا شاید ممتاز محل کی۔ اور جسے وہ اپنے عجائب خانوں کی زینت بنائے۔"

شیریں نے بیٹھے بیٹھے ایک نگاہِ غلط انداز ریاض کی طرف ڈالی۔

ریاض۔ "جب تم مجھے اس نشیلے انداز سے دیکھتی ہو تو میں بے بس ہو جاتا ہوں۔ تمہاری بے پناہ آنکھیں! تمہارے رس بھرے نیم وا لب! تمہارا غنچہ جیسا دہن! وہ لوگ یقیناً اندھے ہیں۔ جو خداؤں اور بتوں کی تلاش اور پرستش کرتے ہیں۔ اگر کوئی شے قابل پرستش ہے تو وہ انسانی جسم ہے۔ وہ حسن جو فطرت میں جابجا بکھرا پڑا ہے تمام کا تمام سمٹ کر انسانی قالب میں سما گیا ہے وہ سکون اور چمک جو ستاروں میں ہے۔ انسانی آنکھوں میں موجود ہے۔ پھول کھلنے کے معجزنما عمل کی تکمیل انسانی مسکراہٹ میں ہے۔ بادلوں کی جنبش۔ درختوں کی بلند شاخوں کا ہوا میں جھومنا کسی مستِ شباب رقاصہ کے جسم لرزاں میں سرایت کر گیا ہے۔ انگوروں کے رس بھرے خوشے۔ گول گول رنگین سیب چکنے چکنے تنے ان سب کے حسن کا انتہائی کمال انسانی جسم کی گدازیت میں ہے۔ انسانی رفتار میں کبھی چیتے کی لچک ہے اور کبھی ہرن کی رعنائی۔ اور اس وقت شیریں تمہارے چہرے پر کبوتر کی

معصومیت ہے۔ غرضیکہ انسانی حسن ہمارے کمالات کی خوبصورتی کا کشید کیا ہوا جوہر ہے۔"

کہتے ہیں کہ زمین کا ایک چپہ بھی ایسا نہیں جو کسی انسان کی قبر نہ بن چکا ہو۔ کیا عجب ہے کہ اس مخملی گھاس کے تلے جیسے ریاض اور شیریں نے جواں صحت مند جسم اپنا بستر بنائے ہوئے ہیں چند گلی سڑی ہڈیاں ہوں۔ جو کبھی "جسم" کہلاتی تھیں اور جنہیں کبھی "حسین" اور "قابل پرستش" کہا گیا تھا۔ اگر زمین سبزے اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی نہ ہو۔ تو خدا جانے کیسے کیسے عبرتناک نظارے نظر آئیں! اور کیا کیا گود میں معلوم نہیں کیا کیا موجود ہے! زمین کی سطح ریاض اور شیریں کے بدنوں کی گرماہٹ محسوس کر رہی ہے۔ انسانی جسم کی تعریف سن کر موت کی حرص بڑھ رہی ہے۔ وہاں نہر گرمچھ کے منہ کی طرح وا ہے۔ انسانوں کے رونے کی آوازیں ہوا میں معلق معلوم ہوتی ہیں۔

موت ۔" وہ چمکتی ہوئی آنکھیں جو تیرے لئے محبت کی تفسیر ہیں۔ کل ہڈیوں کے خالی حلقے ہوں گی۔ وہ گورے بدن جو آج تیرے احساسات میں بجلیاں دوڑا رہے ہیں کل رینگتے ہوئے کیڑوں کی خوراک ہوں گے جس طرح گدھ مویشیوں کے مرنے کے منتظر رہتے ہیں اسی طرح میں تاک میں رہتی ہوں کہ انسان پیدا ہو۔ جوں جوں وہ جوان اور خوبصورت ہوتا جاتا ہے۔ میری بھوک تیز ہوتی جاتی ہے۔ جس دن تیری خوشی درجۂ کمال تک پہنچ جائے گی۔ مجھ سے اور صبر نہ ہو سکے گا۔ یہ جسم جو آج تجھے دیوانہ بنائے ہوئے ہے۔ بیماری سے گھلنا شروع ہو جائے گا........"

شریر ہوا شیریں کے گھونگھریالے بال بکھیر رہی ہے۔ جن میں ریاض سفید خودرو پھول لگا دیتا ہے۔ گویا شیریں کہکشاں پہنے ہوئے ہے!

تیری بے بس آنکھیں دیکھ رہی ہوں گی اور اس کی ہر خوبصورتی زائل ہو رہی ہو گی۔ حتیٰ کہ تپ کی آگ میں جل جل کر پیلے چمڑے سے ڈھکا ہوا ایک ہڈیوں کا ڈھانچ رہ جائے گا۔ پھر ایک دن تو دیکھ رہا ہو گا۔ کہ بیمار کے چہرے پر ایک ہلکی سی مغموم مسکراہٹ دکھائی دے گی۔ دم اکھڑنے لگے گا۔ اور نبضیں تھمتے تھمتے تھم جائیں گی۔ پیشتر اس کے کہ تو اس واقعہ کی اہمیت کو سمجھ سکے ایک بھیانک لاش تیرے سامنے پڑی ہو گی۔ تیرے الوداعی پیغام زبان تک نہ آ سکیں گے۔

چند دن تجھے خالی بستر دیکھ کر تنہائی کا دردناک احساس ہو گا۔ تو قبر کے پتھر پر رائیگاں آنسو بہائے گا۔ پھول چڑھائیگا۔ شمع جلائے گا۔ کچھ مدت غم کی شدت ہی تیرے لئے باعث تسلی ہو گی۔ غالب کو فنا ہوتے دیکھ کر تو چاہیگا کہ تخیل میں محبت کی یاد کو غیر فانی بنا دے۔ لیکن یہ بھی تجھے نصیب نہ ہو گا۔ وقت آہستہ آہستہ تیری خلاف مرضی ایک نشہ کی طرح تجھ پر اثر کرنا شروع کر دیگا۔ غم خود بخود غلط ہوتا جائے گا۔ حتیٰ کہ ایک دن تو کسی نئی شیریں کو گود میں لئے بیٹھا ہو گا۔ پھر وہی محبت اور موت کا چکر۔ میں ہوں فاتح اور تیری محبت فانی!

ریاض اور شیریں پر ایک ایسی بلیغ خاموشی طاری ہے جو الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ دونو جوان ہیں اور نشۂ زندگی میں سرشار۔ وہ نشو و نما کی لہر جو موسم بہار میں درختوں کی رگوں میں بہتی ہے ان کے خون میں موجود ہے۔ فقط جینے اور سانس لینے کے احساس میں ہی ناقابل بیان خوشی معلوم ہوتی ہے۔ ایک سبز پتہ جس وفور مسرت سے ہوا میں لہلہاتا ہے کیوں نہ وہی ذوق ہستی انسان میں ہو؟ گھاس کی ہری ہری کونپلیں زمین میں سے پھوٹ کر نکل رہی ہیں۔ ان میں فطرت کی لازوال تازگی ہے اور وہ سکون ہے جس کے لئے انسان ترستا ہے پھول ناآشنائے غم ہیں اور کمالِ زندگی کے آئینہ دار۔ کیوں نہ انسانی زندگی میں فطرت جیسا کمال ہستی، فطرت جیسا دائمی سکون ہو؟

زندگی - "میں وہ زندگی کی رَو ہوں جو پتھر میں ہے۔ جو اُگتی ہوئی گھاس میں ہے جو پھول میں ہے۔ جو حیوانات میں ہے اور جس کی تکمیل انسان ہے۔ میں درد بھری ہوں۔ میں خوشی سے لبریز ہوں۔ کبھی میں بہتے بہتے تھک جاتی ہوں لیکن پھر بہنے لگ جاتی ہوں۔ انسانی تخیل میری بہترین پیدائش ہے۔ وہ تخیل جس نے ہستی۔ موت۔ وقت اور محبت کے عظیم الشان رازوں کو پیدا کیا ہے اور جنہیں خود ہی وہ سلجھا سکتا ہے۔ میں غم اور مسرت سے بالاتر ہوں۔ زندگی کا مقصد انسانی تخیل کی پختگی اور وسعت ہے۔ وہ عقل کی پختگی جس میں ناؤ نوش کی تخفیف نہیں۔ وہ محبت کی وسعت جو درد اور مسرت سے بالاتر ہے۔"

ریاض اور شیریں اُٹھتے ہیں اور ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے آہستہ آہستہ ٹیلے کی ڈھلوان پر سے اُترتے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں۔ فطرت پر وہی ازلی خاموشی اور سکون طاری ہو جاتا ہے۔

(ا - ح)

اکبر الہ آبادی *

یوں تو ہر انسان کے جذبات اور خیالات کی تخلیق اور نوعیت بڑی حد تک حالات گرد وپیش کی ممنون ہوتی ہے لیکن حقیقی شاعر کا احساس دل نہ صرف اپنے ماحول کے تأثرات سے اثر پذیر ہوتا ہے بلکہ ان اثبات اور اثرات کے غیر مرئی اسباب کی صحیح اور حسین وجمیل تصویر بھی دلکش الفاظ میں کھینچ دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ سعی کرتا ہے کہ اس کی تیار کردہ تصویر صحیح عکس ہو اس حُسن کامل کا جس کی ترتیب اس کا اپنا جمال پرست دماغ کرتا رہتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر شاعر یا تو ماحول کے اثرات قبول کر کے اپنے عمدہ ترجمانی کرنے لگتا ہے یا اس کی خامیوں سے متاثر ہو کر اس کے ناخوشگوار پہلوؤں کے خلاف اعلان جنگ کر دیتا ہے اور جب تک ایک نئی دنیا پیدا نہیں کر لیتا آرام نہیں لیتا۔ ماحول ہی سے اس کا جادۂ عمل تیار ہوتا ہے۔ اور ماحول ہی اس کے لئے زادِ راہ اور اسباب و ذرائع مہیا کرتا ہے پس لازم ہے کہ کسی شاعر کے کلام وپیام کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے سے پہلے اس کے ماحول کا مطالعہ کیا جائے۔

۱۸۵۷ء کا سانحۂ عظیم ہندوستان کی فکری دُنیا میں ایک دُور رس انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔ جو لوگ عہد مغلیہ کے دورِ انحطاط کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا شکار ہو کر اپنے دل و دماغ کو نذرِ بادہ و ساقی کر چکے تھے۔ جن کی خودی و خود اعتمادی کی حس موت کی آغوش میں پہنچ چکی تھی اور جو عیش و طرب کے شبستانوں میں گہری نیند سو رہے تھے جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگا دیئے گئے آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھے۔ انگڑائیاں لیتے ہوئے اپنے گردو پیش نگاہ ڈالی تو محسوس کیا کہ ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا۔ ساری کائنات کو بدلا ہوا پایا۔ دلوں سے حرارت دماغوں سے الوالعزمی اور اعضاء سے ذوقِ عمل کی طاقتیں سلب ہو چکی تھیں اس لئے سب یاس وحرمان کی مجسم تصویر بن گئے اور مستقبل تاریک نظر آنے لگا لیکن فطرت کو یہ منظور نہ تھا کہ انسانی تنزل حد سے گزر جائے۔ چنانچہ اس عالم میں چند انجام بین ہستیاں پیدا ہوئیں جنہوں نے واقعات پر غور کرنا شروع کیا۔ خیالی اور فرضی باتوں کا ماتم چھوڑا حقیقی پستی اور زبوں حالی پر خون کے آنسو بہائے۔ اور اپنی ہمت اور سعی سے لوگوں کے خیالات کو مایوسی کے گہرے سمندر سے نکال کر ساحل امید تک پہنچانے کی پیہم کوششیں کیں۔ یہ صاحب دل لوگ آزاد۔ حالی اور

* آل انڈیا ریڈیو کے لئے لکھا گیا۔ اور پشاور ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا۔ اب بہ اجازت افسر اسٹیشن شائع کیا جاتا ہے۔

شبلی تھے انہوں نے دیکھا کہ ایک قریب المرگ تہذیب کا ایک زندہ تمدن سے تصادم ہے۔ نئی روشنی آنکھوں کو چندھیا رہی ہے۔ دلوں کو مرعوب اور دماغوں کو ناکارہ بنا رہی ہے۔ اغیار نے قوم کے عقل و خرد پر تسلط جما لیا ہے مغربیت کا سیلاب مشرقی روحانیت کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہا ہے۔ گو جدید حملے کا مقابلہ جدید آلات سے نہ کیا گیا۔ تو زمانہ کا بے درد ہاتھ مشرقی تہذیب و تمدن کو حرف غلط کی طرح مٹا کے رکھ دیگا۔ چنانچہ جس طرف ہوا کا رُخ دیکھا اسی طرف چل کھڑے ہوئے حسن و عشق کی داستانوں کی بجائے قومی خیالات نظم ہونے لگے۔ اور اصلاح قوم کی فکر ہونے لگی۔ حالی اور ان کے رفقاء نے محسوس کیا کہ زندہ قوم کے خصائص اختیار کرنے ہی میں زندگی کا راز مضمر ہے۔ اور ان سے دُور رہنے میں موت یقینی ہے چنانچہ ان کی شاعری اور سرسید مغفور کی تحریک علی گڑھ کے زیر اثر کاروانِ قوم کا قدم مغربی تعلیم اور قومی اخلاق کی طرف اُٹھنے لگا۔ مشرقی جمود کے پرستاروں کی مخالفت بے سود ثابت ہوئی اور زمانے کا ہاتھ نقوش کہن کو مٹاتا چلا گیا۔ قومیت جدید کے دُھندے سے آثار نظر آنے لگے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کسی ہمہ گیر تحریک کے اثرات قبول کرتے وقت "خُذ ما صفا و دَعْ ما کدر" کے اصول کی پوری طرح پابندی نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ نئی تہذیب کا جادُو کارگر ہوا۔ لوگ نئے خیالات۔ نئی وضع قطع۔ نئے رسم و رواج۔ نئے آداب۔ نئی طرز معاشرت۔ نئے تمدن کی طرف کھنچتے چلے گئے اور عقائد و خیالات میں تزلزل پیدا ہوا اپنے علوم و فنون مجموعۂ اوہام معلوم ہونے لگے۔ ہر شعبۂ حیات ایک نئے رنگ میں رنگین نظر آنے لگا۔ نئی تہذیب کی اولین یلغار بجد کامیاب ثابت ہوئی۔ لیکن جب معنوع دلوں کو کچھ سانس لینے کی فرصت ملی اور انہوں نے گھر کو سنبھالا تو صفایا ہی صفایا نظر آیا۔ فوراً پلٹنے لگے۔ رفتار ترقی کم ہو گئی۔ نگاہیں نیچی ہونے لگیں۔ ندامت کا احساس ہونے لگا۔ عجلت اور نقالی کا افسوس ہوا۔ ردّ عمل کا دَور دورہ ہوا اور کورانہ تقلید کے خلاف آواز بلند ہونے کا وقت آ گیا۔ ایسی فضا میں قدرت نے ہندوستانی تمدن کی حفاظت کا فرض اکبرؔ کے سپرد کیا۔ جو پرانی تہذیب کی آواز اور جدید تمدن کے زبردست نقاد ثابت ہوئے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے ذہنی تلاطم اور سیاسی زلزلہ سے بارہ برس قبل میر اکبر حسین رضوی الہ آباد کے ایک سید گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دادا آصف الدولہ کے عہد کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے۔ والد سید تفضل حسین بھی اچھے عالم تھے۔ مذہب اور مشرقی تمدن کی محبت اکبرؔ کو وراثت میں ملی۔ خاندان کچھ زیادہ مرفہ الحال نہ تھا۔ اس لئے ابتدائی تعلیم پرانے مکتبوں میں ہوئی۔ اور عربی فارسی کے مروجہ نصاب کی تکمیل تک ہی محدود رہی۔ انگریزی تعلیم ابتدا میں حاصل نہ ہو سکی۔ ممکن ہے کہ انگریزی تعلیم پا کر ان کا نقطۂ نگاہ بدل جاتا۔ اور وہ اس جوش و خروش سے تقلید مغرب کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہ کر سکتے۔ سنہ ۱۸۵۹ء میں نقل نویس مقرر ہوئے۔ اس کام میں دل نہ لگ سکا۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان دے کر نائب تحصیلدار ہو گئے لیکن یہاں بھی ان کی تشنگیٔ ذوق کا سامان میسر نہ ہوا۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور آٹھ برس تک وکالت کرتے رہے۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں پھر سرکاری ملازمت کا خیال آیا۔ اور بالترتیب سب جج۔ جج عدالت خفیفہ اور ڈسٹرکٹ و سیشن جج مقرر ہوئے۔ بالآخر سنہ ۱۹۰۳ء میں ملازمت سے فارغ ہو کر علمی زندگی میں مصروف ہو گئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو نامزد ہوئے۔ سرکار سے خطاب ملا۔ جس کے متعلق فرماتے ہیں ؎

شاعرانہ داد یہ اچھی دی مجھ کو چرخ نے — تیغ ابرو کا تھا عاشق "خاں بہادر" کر دیا

سنہ ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا:۔

اکبرؔ مبدائے فطرت سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے تھے بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کیا۔ ہم عصروں کی طرح ان کی شاعری کی ابتدا بھی غزل گوئی سے ہوئی۔ ابتدائی کلام میں رنگ قدیم غالب تھا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مشق سخن کے ساتھ

ساتھ کلام میں پختگی درد اور اثر پیدا ہوتا گیا۔ زمانۂ نومشقی کے تصنع اور داستانِ حسن و عشق کی جگہ بے تکلفی۔ اظہار جذبات اور جدت کلام نے لے لی۔ اور رفتہ رفتہ تصوف۔ اخلاق اور حکمت کے مضامین بھی بندھنے لگے۔ روحانی فلسفیانہ اور اخلاقی رنگ غالب آنے لگا۔ دنیا کی ناپائیداری اور جاہ و منزلت کی بے ثباتی کے مضامین جگہ پاتے لگے اور بالآخر اکبر نغز سخن کے صناع کامل کی حیثیت میں نمودار ہوئے۔

ان کی غزلیات میں سلاست بھی ہے اور روانی بھی روزمرہ اور بندش الفاظ کی قابل تحسین مثالیں بھی موجود ہیں۔ اور اعلیٰ تخیل اور نادر تشبیہوں کی دلکش تصویریں بھی لیکن جس صنف کلام پر ان کی شہرت کا زیادہ تر انحصار ہے وہ ان کی ظرافت۔ بذلہ سنجی لطیف طنز اور مخصوص طرز سخن ہے۔

ظرافت کی ہلکی سی جھلک ان کی ابتدائی غزلیات میں بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہے مگر "اودھ پنچ" کی نامہ نگاری نے ان کو ظریفانہ تنقید کی طرف زیادہ مائل کر دیا۔ اس وقت ہندوستان میں مغربیت کا ایک بے پناہ طوفان آیا ہوا تھا جس کا مقابلہ کیا جاسکنا تھا نہ مقابلہ مشرقی آداب و اخلاق رخصت ہو رہے تھے۔ اتفاق و یکجہتی ضبط و خودداری۔ صداقت و حق پرستی۔ قناعت و ایثار کے جذبات کی جگہ مکر و نفاق نفس پروری و تعیش پرستی فریب و ریا اور حرص و طمع کی گرم بازاری تھی۔ قومی قلب میں انتشار تھا اور ملکی حواس میں اختلال۔

اس فضا میں اکبر کو اپنا نصب العین حاصل کرنا تھا۔ خواجہ حالی فاتح قوم کے عمدہ اخلاق کی تحصیل کے ذریعہ زوال پذیر ماحول کو جدید وضع پر اٹھانا چاہتے تھے۔ مولانا شبلی مشرق و مغرب کے بہترین خصائص و نکات کو یکجا کر کے ایک نیا تعلیمی نظام قائم کرنا چاہتے تھے لیکن اکبر مشرقی اخلاق ہی کو سنوارنے اور اسی کے ذریعہ قومی بیماریوں کا علاج کرنے کے خواہشمند تھے۔ اکبر نے ہندوستانی سوسائٹی کا حلیہ بگڑا ہوا پایا۔ اور دیکھا کہ مرض اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اگر اس کے ازالہ کے لئے فوری اور مؤثر تدابیر اختیار نہ کی گئیں تو جلد لاعلاج ہو جائے گا۔ حالی اور شبلی کا سنجیدہ طریق علاج کامیاب ہوتا نظر نہ آیا۔ اس لئے انہوں نے اپنے لئے نئی راہ نکالی اور مغرب پرستی کا خاکہ اڑانے لگے اور تہذیب جدید کے مریضوں کو تنقید کی تلخ دوا ظرافت کے شکر میں لپیٹ کر دینے لگے لیکن اکبر کے کلام کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ ان کی ہجو شخصی نہیں بلکہ جامع اور وسیع ہے۔ افراد کی نہیں بلکہ رائے خیال اور نکتۂ نظر کی ہے۔ منافقت بے حمیتی۔ خود غرضی، ریاکاری پر انہیں غصہ آتا ہے۔ اور مشرقی روحانیت کو مغربی مادیت کے تباہ کن اثرات سے بچانے کی کوشش میں ان کے قلم سے بے ساختہ ایسے اشعار نکل جاتے ہیں ؎

مشرقی کو ہے ذوق روحانی — مغربی میں ہے میل جسمانی
کہا منصور نے خدا ہوں میں — ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست — "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"

عام مشرقی شعرا کی طرح مکارم اخلاق اور احکام مذہب کی رسمی تبلیغ اور طویل وعظ نہیں کرتے۔ بلکہ مزاج زمانہ کو پہچان کر نوجوانوں کو تصویر کا دوسرا رخ دکھا دیتے ہیں اور اس لطیف انداز سے کہ وہ اس پر بے اختیار ہنسنے لگ جاتے ہیں اور ہنسی کے بعد محسوس کرتے ہیں کہ یہ خود ہنسی کی تصویر تھی ؎

آج بنگلے میں مرے آئی تھی آواز اذاں! — جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے
مصیبت میں بھی اب یاد خدا آتی نہیں ان کو — دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں
مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں — یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

تاکید عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے — پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی
سب ہو چکے ہیں اس بت کافر ادا کے ساتھ — رہ جائیں گے رسول ہی بس اب خدا کے ساتھ

تعلیم جدید کو مشرقی روحانیت اور آداب کے خلاف ایک خطرناک حربہ تصور کرتے ہیں اور فرماتے ہیں :-

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں، — کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں۔
تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے — جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

اکبر اپنے مخصوص رنگ میں زندگی کے ہر شعبہ پر اظہار خیالات کر گئے ہیں۔ انہیں مشرق کے ساتھ سچی محبت ہے وہ حُب وطن اور تحفظ دین و مذہب کے واعظ ہیں۔ وہ قارئین کو اپنی چیزوں پر نازاں ہونا سکھاتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ قوم کا ہر فرد ماضی سے واقف ہو۔ حال کی تنقید کر سکے۔ اور مستقبل کی نسبت اچھی امید رکھے۔ انہی خیالات کی بنا پر شیخ عبدالقادر نے مخزن کے دور اوّل میں ان کو "لسان العصر" کا خطاب دیا۔ جو ان کے سرکاری خطاب کی نسبت زیادہ مقبول اور زیادہ موزوں ثابت ہوا۔

اکبر نہ صرف بے مثال شاعر اور سوسائٹی کے زبردست نقاد ہیں۔ بلکہ بلند مرتبہ صوفی صافی بھی ہیں اور ظرافت میں یکتائے روزگار بھی اپنے مزاحیہ رنگ کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم ہوئے خوش طبعی اور ظرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شروع میں ظرافت صرف ظرافت رہی۔ چنانچہ ان کی زندہ دلی کے نمونے ملاحظہ ہوں ؎

بتائیں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا — پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں — فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا لکھوں — گفتنی درج گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی
جس نے دل کو لے لیا ہے دل لگی کیواسطے — کیا تعجب ہے کہ تفریحاً ہماری جان لے

دوزخ کے داخلہ میں نہیں ان کو عذر کچھ
فوٹو کوئی لگا دے جو اُن کا بہشت میں

اکبر نے جدید اور لطیف تشبیہات کا استعمال کیا۔ انگریزی کے نئے اور غیر مستعمل الفاظ کو اشعار میں جگہ دی معمولی الفاظ کو نئے طریقہ پر استعمال کیا۔ خاص اصطلاحات وضع کیں۔ مثلاً مغربی تعلیم کی دلفریبی کے لئے "مس"۔ پرانے رنگ کے مسلمان کیلئے "شیخ"۔ جدید تعلیم کے دلدادہ کے لئے "سید"۔ مسلمانوں کی قدیم شان و شوکت کے لئے "اونٹ"۔ اور اسی طرح کلیسا۔ مسجد۔ مندر۔ بت۔ کالج۔ بابو۔ نیٹو۔ مسمریٹ۔ بدھو۔ گزٹ۔ ڈاروِن۔ ڈنر۔ کونسل۔ کیمپ۔ مولوی کو مخصوص معنوں میں استعمال کیا۔ قدیم استادوں کے زبان زد خلائق اشعار کو خفیف تغیر الفاظ سے اپنا بنا لیا۔ مثلاً

کرلیا بہ بحشتائے بر حال قوم — صلوٰۃ است رائج دراِلشیاں نہ صوم

رشتہ در گردنم افگندہ پیٹ — می بردہر جا کہ میز است و پلیٹ

ہیٹ را نہ بر سر من جائے دستار عزیز — مرد تا مسٹر نو اندشد چرا قبلہ شود

آخر عمر میں بیٹے اور بیوی کے انتقال کے باعث دل شکستہ ہو گئے۔ اور اُن کے اشعار میں کچھ حزن و یاس کے خیالات نظر آنے لگے۔ کہتے ہیں:-

وقتِ طلوع دیکھا وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

اکبرؔ "باطن کو ظاہر پر فوقیت دیتے ہیں۔ مادیت اور مغرب پرستی کو مذہب و اخلاق کا دشمن قرار دیتے ہیں۔ مولویت سے بیزار ہیں۔ بدمذاقی۔ کورانہ تقلید۔ اور تنگ نظری کے خلاف جنگ آزما ہیں اور اپنے رنگ میں منفرد ہیں"۔ ان کی قدر و منزلت کا صحیح اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں۔ جو کلیاتِ اکبر کی تینوں جلدوں کا بغور مطالعہ کر چکے ہوں۔

اکبر کو لسان العصر کہہ دینا ہی کافی نہیں۔ کیونکہ ان کی دُوررس نگاہ اپنے زمانہ سے بہت آگے دیکھتی ہے اور ان کا ذہن رس دماغ مستقبل کا خاکہ بھی تیار کر لیتا ہے۔ "ان کی ظرافت کی تہ میں عمیق معنی ہیں" وہ اپنے مطالب کو مروّجہ زبان اور وقتی تمثیل و استعارہ میں پیش کرتے ہیں لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو ان میں ابدی مسائلِ حیات کا حل نظر آتا ہے۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

دریغا کہ رختِ سفر بست اکبرؔ ۔۔۔ خیالش عجب بود روشن دلیلے
سرِ ذرۂ طورِ معنی کلیمے ۔۔۔ بہ بتخانۂ دورِ حاضر خلیلے
گہے گریۂ او چو ابرِ بہارے ۔۔۔ گہے خندۂ او چو تیغِ اصیلے
نوائے سحرگاہِ او کارواں را ۔۔۔ اذانے درائے پیامِ رحیلے
زدِ لعل را بندۂ لات و عزّیٰ ۔۔۔ بجانہا کشائندہ سلسبیلے

دماغش ادب خوردۂ عشق و مستی
دلش پرورش دادۂ جبرئیلے

ا۔ع۔ص۔

حسین رقاصہ

(سر رابندرناتھ ٹیگور کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ)

مہاتما بدھ کا ایک نوجوان اور خوبصورت پیرو شہر متھرا کی شہر پناہ کے خاموش دامن میں خاک کے بستر پر نیند میں مدہوش پڑا تھا۔ شہر کی چہل پہل کے . . ہو اس کی برقی روشنی بھی معدوم ہو چکی تھی۔ مکانات کے دروازے بند ہو چکے تھے اور ستاروں کی ہلکی اور مدھم روشنی کو اگست کی ابر آلود فضا نے اور بھی دھیما کر رکھا تھا . . . .

اچانک نوجوان پجاری کے عریاں سینے سے کسی کا نازک پاؤں جس میں گھنگروؤں کی جھنکار تھی ٹکرایا...... وہ چونک اٹھا اور اس کی معصوم اور پاکیزہ نگاہیں ایک لالٹین کی مدھم روشنی پر پڑیں جو ایک عورت کے ہاتھ میں تھا........

وہ ایک رقاصہ تھی جس کی ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی پر چمکدار موتی اس طرح جڑے ہوئے تھے جیسے فلک زمردیں پر تارے یا ساون کی اندھیری رات میں برق شب تاب۔ وہ جوانی کے نشے میں سرشار تھی۔ اس نے لالٹین کو جھکا کر دیکھا۔ تو اسکی مخمور نگاہیں ایک معصوم مگر نوجوان انسان پر پڑیں..

"کمسن پجاری۔ مجھے معاف کر دو" اس عورت نے عاجزانہ انداز میں کہا۔ "یہ بستر خاک آپ جیسے پاک انسانوں کیلئے موزوں نہیں"..... "رحمدل عورت اپنے کام سے سروکار رکھ کسی موزوں وقت میں تمہارے پاس آجاؤں گا" پجاری نے بے پروائی سے جواب دیا........

معاً رات کی کالی ناگن نے بجلی کی چمک میں اپنے خونخوار دانت دکھائے ....

سڑک کے دو رویہ درختوں کی نرم و نازک شاخیں موسم بہار کے پھولوں کی کثرت کی وجہ سے جھکی ہوئی تھیں۔ بہار کی تازہ اور مخمور ہوائیں دور سے بانسری کی سریلی مگر دھیمی سُر لا رہی تھی۔ گاؤں والے جنگل کو پھولوں کا تیوہار منانے جا چکے تھے چودھویں رات کا چاند آسمان سے خاموش شہر کے بھیانک سایوں کو حسرت آمیز نگاہ سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ بدھ کا وہی کمسن چیلا شہر کی ایک تنگ اور گمنام گلی کو تیزی سے طے کر رہا تھا۔ اس کے سر کے اوپر آم کے جھنڈ سے کوئل اپنا درد بھرا راگ سنانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی پجاری گلیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد شہر کے بڑے دروازے سے نکلا اور فصیل کے دامن میں کھڑا ہو گیا..........

وہاں ایک عورت کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ جس کے جسم پر متعدی مرض کے پھوڑے اور ناسور بکثرت موجود تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے شہر سے گھسیٹ کر باہر لایا گیا ہے........ نوجوان انسان اس کے پاس آ کر رک گیا اور اس کے پیپ بھرے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اسکے بظاہر بے جان سر کو اٹھا کر اپنے زانو پر رکھا۔ اس کے خشک ہونٹوں کو پانی سے تر کیا اور اس کے جسم کے زخموں پر مرہم لگایا.....

"کیا میں آپ سے یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتی ہوں کہ آپ کون ہیں؟" اس عورت نے اپنی ممنونِ احسان نگاہیں اس شخص کے حسین چہرے پر گاڑ دیں۔ "آخر وہ وقت آگیا جس میں ملنے کا میں نے وعدہ کیا تھا" کمسن پجاری نے سنجیدگی سے جواب دیا ✦

سردار بہادر خان

په پښتو خبرې مونږ ته شرم ښکاري + تردې حده قومیت څو نږه مړ دے
څوک چې پلمن اوزبه بري نه دي افغانه + چه هم دغه د قومي ترقي جرړه دے

رساله

خیبر

مدیر:- شوکت الله اکبر۔ ایم۔ پي
نائب مدیر:- عبد الرشید اصغر د دویم کال

هر هندوستاني
له پکار دي چه خپله
صوبجاتي ژبه کښې د
غریبو خلقو په هولو د پاره
مضامین لیکل شروع
کړي۔ دا دوئی په اصلي
معنو کښې خدمت دی
(ټیګور)

کوم سړی
چه په خپله ژبه کښې
د لوستلو او لیکلو قابل
نه وي هغه بله ژبه
کښې هیڅ کله په صحیح معنو
کښې لیکل لوستل نه
شي زده کولی.
(برنارډ شاه)

فهرست مضامین

شذرات!

اګرچه ځینو شذراتو له یکار دو چه په کوز لو ځینو مشتمل وي دَ دار العلوم د لویو او لو تعلیمو بحث وي
یا دَ دي دهري دُنیا په ترقي او تبدیلي نظر اچولي شوي وي لیکن موږ به دومره وو ایو چه دَ دي ځینو دَ لیکلو دَ
یاره د لوړ قلم خاوندان (دَ انګریزي حصّه) شته دي بلبدا چه په سه مه نه راځي. نامه ئي نه راځي،
زه به دا غوره وګنړم چه دا ځل تا سو سره د ځیلي خوږي پښتو په ادبي پهلو یو خو خبرې وکړم۔

قبل دَ دي چه زه دَ پښتو دَ ادبیاتو په یو خو ندانک جز رنړا وغورزوم. موږ له دا کتل یکار دي چه
ادبیات څه شئ دي. او دَ لوړ لوړ لیکونکو دي متعلق څه رائي ده؟ هډسن وائي (*Hudson*) چه
ادبیات هغه دي چه دَ کوم په لوستلو روح ته انبساط او بدن ته فرحت حاصلیږي او دي دَ پاره هر هغه
تحریر چه دَ سړي ئي په لوستلو غم غلط شي ادبیات بولي شي بعض وائي چه نه ادبیات په حقیقت کښ دَ ده نه
قوم دَ روحیاتو او ذهني حالت یوه مکمله او صحیح نقشه وي چه دَ هغه تمام تول سوانح او ملي شعائر ترې معلومیږي
زه په صرف دومره وایم چه ادبیات دَ یو قام دَ خیالاتو معیار او اجتماعي لوړتیا نیاني یا په بلو الفاظو کښ دَ یو قام
ادبیات دَ هغو د احساساتو او دَ فکرونو دَ تحریر مجموعه دي. او څرنګ چه دَ یو قام عادات اطوار رنګ رنګ او
دَ ژبي اکثر لغات د بل نه مختلف دي. هم دغه رنګ دَ هر قام ادبیات جُدا او بیل دي۔

اکثر ادیبانو او مفکرو دا خیال دي چه شاعري دَ انساني خیالاتو او جذباتو سرچینه ده او په فکر عمیق او
نظر دقیق سره مشاهده کولو نه پس دي نتیجې ته رارسیدلي دي چه هري ژبي نشو و نما د شاعري نه شوي
ده او بعد دَ هغې په رو رو ترقي سره هغه درجه تکمیل ته رسیدلي ده. دا به تا سو ته معلومه وي چه پښتون
یو ننګیالي او جنګیالي قام دي. غیرت ئي په خټه کښ اخلي شوي دي. او جنګ ئي دَ پلار نیکه نه میراث مندے
دي. په مذهب لکه چه پتنګ په شمع سني وي دي حل بل دي دَ نعره تکبیر آوریده او جهاد ته تیار ئي سم وي
د وطن او قام په مینه کښ تر هم څوک تیر نشته لکه چه دوی وائي. او سودلي هم ده سه

ځونږ به وینو د آباد شي ګلستان د وطن۔

او چونکه شاعري د يو توريالي او جنګيالي قام د جذباتو سمه ترجماني کولی شي. دې دپاره د پښتو ادبيات اکثر په منظوم کتابونو مشتمل دي. او نثر نسخې د نظم په مقابله کښ کمې ښکاري چونکه پښتون فطرتاً شاعر دي او د وطن لوړو ځوړو کږو وږو ورته په ځمه جنګ او شاعرانه مزاج ورکړي دي لکه د خان خوشحال د ژوند حال نه به تاسو ته ښکاره دي چه هغه څرنګ يو صاحب سيف وقلم وو او د او قلم زور او د شاعري مواد هغه د کوم ځاي نه پيدا کړي دو که غور وکړي نو تاسو ته به معلومه شي لکه چه خان څرنګ به ښه شان سره د دي اظهار کړي دي ؎

د غالو پړي يا خبري لوري په لور توري ښکري   زړه مه نه خوري له ځايه غرځي دي کښه

بله خبره چه د پښتون په دا خاصيت چه فطرتاً شاعر دي زيات نه زړه اغور زوي د خان خوشحال د دې شعر نه ښه معلوميږي ولي چه خان په غر او سمه دواړو ګرزيدلي د پښتو د هرې قبيلې نه ښه خبر وو او د هر خيل د خوی بوی ئې ښه مشاهده کړي وه ؎ د خوشحال سره که کښيني يو څو کاله

دا د غره خټک به واړه شاعران شي

اګرچه ما د اصل مقصد نه لږ ګريز وکړه اوس به زه بيا د پښتو ژبې د ادبيات هغه لوړ خاصيت ته غوږ ونيو وکړم او تاسو سره به د پښتو په **ټپو** يو څو خبرې وکړم. ټپې يا اشعار بزميه اګرچه رزميه ټپې هم شته ليکن عام طور سره دا بزميه ډېر شهرت لري چونکه شعر د طبيعت ترجماني او د ضمير غږ دي دې د پاره ټپې د پښتون مذهبي سياسي او اجتماعي ژوندون باندې ډېر اغور زوي. او ورسره ورسره دا ادبياتو هم يو غوره جز دي. بله دا چه که چرې څوک ما نه پښتنه وکړي چه پښتو (ژبه) څه ته وايه شي؟ نو زه به موقف د مرګ تر دې وواېم چه د متلونو او ټپو مجموعه پښتو بولی شي ټپې د حسن باتو د ترجماني کولو نه علاوه د پښتونوالي روح ښکاره کوي او په داسې موزونيت سره وړله ترتيب ورکړي شوي دي چه لوستونکي ته ئې ډېره مينه مهيا کيږي. راځئ چه او ګورو يو دميني په اورسني شوی عاشق خپلې محبوبې ته څرنګ ښه وائی ؎

خال د عقيق مخ د رفيق دي   ګران ئې تحقيق دې انديښنې يکښ کومه.
سترګي را واړوه د ګل سوکي   د خولې مې کوکې د مجنون پشان بڅيه

د پښتو ټپو ته مونږ په یو سبب بیلیډز (Ballads) هم ویلی شو ولې چه څرنګه د بیلیډز د لیکونکو پته نشته هم دغه شان د ټپو د جوړونکو درک نه لګي او نه د چا میراث دي مګر څونکه بیلیډز قصّې وي څو مونږ ټپې قصّې نه دي او عام طور سره عشقي اجتماعي فلسفي وطني اخلاقي او احساسي خبرو سره تعلق لري بله دا چه بیلیډز د یو زمانې وي او د هغه زمانې قصّې نظارې دي ټپې لکه چه مونږ وینو څرنګه چه زمانه څو رنګ خوري خلق ئې بدلیږي څونږ ټپې هم تغیر خوري لکه ــ

پتنګه خاورې دې پس شوې | شمع له جوړه شو په ښیښو کښې مکانونه
ته مړ له ماله خبر نه شوې | لکه سګريټ زه سرتاپا لوخړه شومه

مُدیر

د لاکهو روپو خبره

(له قلمه د شاکرالله مهمند)

(۱) د سپرلي موسم وه. په سمه او ویرانه کښې د هر رنګ ګلونه موندی شو. شنه سبزه غوړیدلې وه داسې معلومیدله چه چا فرش زمردین خور کړی وه. د صحرا دوندګان د خپل لاثاني چمن په منځ کښې سرشار ګرزیدل. د اناریه ونو کښې چا سره رنګ چراغونه بل کړي وه. د ټولو نه زیاد دلیلې ګلونه په خپل رنګ باندې ډیره خیوره شکاره کوله. او د نورو همسایه همجنسو د پاره باعث رشک و. غرض یو عجیبه سما وه.

(۲) عالم واړه په خپل کارونو کښې مشغول وه. ټولي په ټولي په تلل. د ښهر نه بهر یو لوئی میدان کښې یو فقیر ناست وه. ډیر خوش رنګه او پاکیزه معلومیدو. خلق ترې ډیر چا پیره جمع شوي وه. د هر یو دغه خواهش وه. چه څه ورسره خبري اوکړم. لیکن هغه خاموش ناست وه. خلق هم دغه سی چلیدل.

(۳) په دې دوران کښې شهزاده په نیت د ښکار راوبهر شو. چه د خلقو دا هجوم ئې په نظر شو. ورله نزدې ورغلو. ټول عالم په سلام شو. او لاري ورکړه. چه وي اوکتل. نو په میدان کښې یو سفید ږیږي فقیر ناست وه. چه دی ئې اولیدو. نو هغه هم څنګ ته روان شو. دی ورته تپوس اوکړو. چه تحفه کوئ او څه غواړي. هغه ووي چه هیڅ نه غواړم. خو تاسره به یو خبره په یو لاکهو روپو کوم. دی زړه کښې ډیر حیران شو. چه دی به څرنګه خبره کوي. فوراً ئې حکم اوکړو. چه څلور لاکه روپي راوړي. چه ما نه څلور خبري اوکړي. روپي راغلې. فقیر له ئې ورکړي. فقیر په خوشحالي سره واخستې. او د لاندې څلور خبري ئې ورته اوکړي.

(الف) هر کله چه په سفر ځې نو ځان سره ملګري بیایه.

(ب) د ورځې خوب کوه. او د شپې بیدار اوسه

(ج) حرص یعني بې صبري مه کوه۔

(خ) سوچ او فکر په پوخه ډول مه کوه

دی شهزاده دا ټولې خبرې واورېدې۔ او ځان سره یې نوټ کړې۔ او واپس ښهر په ته روان شو
ولې چه د ښکار وخت یې تقریباً په خبرو کښ وا ووړیدو۔ او نور هم به ډیرې تعدی سره د مغرب
د ملو تیار کوله۔

(۴) د شهزاده د ښهر په ته رسیدو نه اول دا حکم جاري شوي وه۔ چه شهزاده دي د دویم حکم پوره
د دروازې نه بهر تېرکاوشي۔ دی ډیر خفا او دلګیر شو۔ چه داسې لویه ګناه خو م هم نه د کړې
خو خیر خپل قسمت شاکر شو۔ او ځان سره یې ویل۔ ؎

چه د قسمت سره به څه سیالي ځما شي
چه غنم کرم زوزان هلته پیدا شي

په دی شعرونه ئې ځان مشغوله ووله۔ چه ناڅاپه یو سړي ورته وویل۔ چه ای جهان پناه دا ټول شتا
د پلار د وزیر شیطاني ده۔ هغه ورته واي۔ کمچرې دی داسې روپۍ الوزه دي نو خزانه به تشه کړي۔ او
مزید به یا د سلطنت نظام خراب چلوه۔ نو بادشاه خو اول حکم کړی دی۔ لیکن دویم حکم باندې غور کوي
خو اخر به غصه شي۔ چه دا ظالم ورته به غولې کښ تلې دې دا هم هو ښیاران وايي (چه بنده د بنده شیطان
دي او بنده د بنده رحمان دي۔ شهزاده دا واریدل۔ او چپ شو۔ ځکه چه هیڅ یې نه شو کولی۔

غرض دا چه شپه یې بهر تېره کړه۔ سحر شو۔ نور د مشرقه سر را بهر کړو۔ ښهر په خلق ټول بیدار وو
او خفا وه۔ چه اوس به شهزاده ته څه حکم ورکوي۔ شهزاده هم د بستر غم نه سراوچت کړو۔ او د حکم انتظار
کښ وه۔

(۵) یو ایلچي د ښهر په نه راغلو۔ او شهزاده ته یې د پلار پیغام ورکړو۔ شهزاده واخستو او دی لوستلو۔ نو
پکښ داوه۔ چه ما ته د دوس[۱۲] کالو د پاره جلاوطن کړې۔ اول خو ډیر خفا شو۔ لیکن زړه یې کلک کړو۔
ځکه چه خومره اندیښې کوي نو هومره د سړي هوش وحواس خرابېږي۔ لکه چه یو شاعر هم وايي ؎

په پریشانۍ او اندیښنو خاطر خراب شي ؞ جمعیت مومي خاطر له توکله۔

نو دۀ هم ملا اوتړله - او د سفر جامې واغستې - او روان شو - او ځان سره يې د ملګرتيا د پاره يو " پيشو " غوره کړه - منزل يې کولو غرض دا چه د خپل پلار د بادشاهۍ نه ووتو - نو يو ځنګل کښ داخل شو - يو لويه ونه چه ورسره چينه هم وه - دا رام د پاره ورستون شو - اس يې ځان ته تړ پريخو وو - او خپله سوري ته اوده شو - پيشو هم يو خوا ليځ اګرزيده -

(۶) په دغه ونه کښ يو ښامار او کارغه اوسيدل - دواړه يې خپلو کښ ډير يارانه وه - چونکه دغه ځائې د مسافرو پړاؤ وه - چه څوک به اوده شو - دې ښامار به اوخوړو - او بيا به کارغه به ترې سترګې وويستې - دغه دواړو يې کار او روزګار وه -

دواړو يې دا عادت شوې وه نو په هيڅ رنګه ترې نه هيريدلو - لکه چه مشهوره ده (چه هر څه برو - خو عادت نه برو)

دواړه يې بيا حسب معمول راکوز شو - ښامار د اشهزاده او چيچلو - او کارغه يې د سترګو ويستو په فکر کښ شو - چه يې په سترګو کښيناستو - نو د پيشو ورته نظر شو - چه اوهو ځما مالک خو دې موذي اوخوړو - نو په مزه مزه ورغله او د کارغه يې د ځيو اونيوه - کارغه پوه شو - چه اوس مې ماته دې - نو مار ته يې اشاره اوکړه - چه هله دا سړې جوندې کړه - مار راغلو او چه کوم ځائې خوړلې وو نو په هغه ځائې خوله کښېښوه او ټول زهر يې راښکل شهزاده بيا جوندې شو - فوراً اوچت شو - توره يې راواخستله او دا موذي يې مړ کړو -

بيا هغه ځائې روان شو - چه ډير منزل نه پس په يو ښهر ته ورننه شو - چه تر څه حده لاړو - يو بوډې يې ترنظره شوه - چه اول ئې اوخندل - او بيا اوژړل - ده حيران شو - چه دا څه معامله ده - ورته يې اواز اوکړه - چه اې بوډې موري دا اودې ژړل ولي - او دا اودې خندل ولي - دې ورته وئې چه اې زويه تپوس مه کوه کنه لکه

جهان به ټول په وينو سور کړم

کړم د خوګ زړګې نه پرته کړه لاسونه

شهزاده نور هم ډير حيران شو - او د جواب د پاره زر طلبګير شو - نو بوډۍ ورته ګويا شوه - چه دا اودې خندل خکه - چه نن مې د زوې واده دے - او فوراً چه مې اوژړل نو ددې وجه دا ده - چه ځوئې به مې يو څو ورځو پس

مړي ـ دی ورته تپوس اوکړو ـ چه څوک به مړی ـ اخر وجه هم شته اوکنه ـ دی ورته وویل ـ

(۸) څو ورځې ده دَ بادشاه لور بیماره ده ـ نو دَ خوګیدارۍ دَ پاره یو سړي هم یش هغې له ورځي ـ چه سحر شي ـ

نو هغه سړی مړ وي ـ او بیا ئې بادشاه دَ ګور کفن بندوبست کوي ـ چونکه اوس دَ خوئې نمبر دي ـ نو خود

به مري ـ دی دَ پاره دَ م ـ چړل ـ

(۹) دَ ورته وویل چه بوډي مه خفه کیږه ـ زه به ستا دَ خوئې په ځای لاړ شم ـ دې ورته وویل چه نه

نه مه ځه ـ نه به هم دَ چا راډیي بي ـ خو اخر بوډۍ ئې راضي کړه ـ او وئیل چه شپه دَ ده لاړشه زړه

کښ وی ـ چه دَ بد ورځو ... زه نجرمه دی ـ خو بیا وي ـ چه ځما ګرز بیدل هم عبث دي ـ دَ دی جوند نه ما له

مرګ بهتر دي ـ ځکه لاړ به شم ـ یا خو به مړ شم ـ او یا به حال معلوم کړم ـ لکه چه وائي

چه یا به وطن خپل کړم ـ یا به سر وربان کیږم ـ والله که وطن پریږدم ـ لیکن دا به دی په بل رنګه کښي

ویله ـ چه یا به جانان خپل کړم ـ یا به سر .... کیږم .... پریږدم

ــــ ځما به خپل نصیب خراب وي ـ څه دَ لضیب دعوې به چا سره کومه ـ !

(۱۰) په مقرره ورځ دَ ځان دَ ورځي ډیر خوب اوکړو ـ او ورغلو ـ په پهره بانډې ودریدو ـ ډیر سوچ کښي پروت

وه ـ چه څه به کیږي ـ ټول عالم خاموش شو ـ تاریکي دَ نور وشیونه ډیره زیاده وو ـ هر څیز ورته

بلا ښکاریده ـ او دا خیال به ورته راتلو ـ چه دا څه به وي ـ چه په هغې به زه مړم دی دَ خیال په تال

ورنکیدو ـ چه شهزادګۍ ورته آواز اوکړو ـ چه ای ځوانه څه کهیل درځي ـ دَ وویل چه شطرنج کولی

شم ـ دی ورغلو ـ او چه دی کتو ـ نو زړه کښي حیران شو ـ چه ای "قادره" دا خو ډیره بې بها لعل دي

دی خو دَ مرګ لائق نه دي ـ دي خو معلومیږي چه دَ بادشاهانو ځمن کښي لوئې شوی دي ـ په

دا فکر کښي مبتلا د سره په شطرنج مشغوله شوه ـ چه ترمړیده وخت دی اوکړو ـ نو دی بانډې جوش

راغلو ـ او دَ خوب سپاهیانو وربانډې حمله اوکړه ـ په یو ځای پریوته شهزاده نیم اوده او نیم ویښ

دو ـ چه ناګاه نظر په یو لوئې اژدها بانډې پریوته چه دَ ده په طرف په تیزی سره را روانه وو ـ او

لګ وخت نه پس دی هم به خوړلی وي ـ لیکن دَ فوراً اوچت او دنګل ـ توری ته ئې لاس کړو ـ

او دا ظالم ئې مړ کړه ـ چه ټول ښهر ئې تباه کړي وو ـ یقین ئې خاص کړو چه دا هم دغه شي وو ـ

چې خلق به یې مړه کول. بیا ئې په خپل شان سره په خپل ځای اوده شه چې سحر شو نو بادشاه وزیرانو ته کور کلي تیار کړي وو. خلق یې له لاش د پیتلو د پاره راغله. چې د ځوي په دې شو ردی بیدا شو. او سینه نن روست دا بهر شو. ټول حیران شو. چې دننه لاړل نو ما د ډېرې ډېرې پروت وه.

(۱۱) شهزادګۍ پلار ته اودی. چې نو ځاوند به کوم. نو دا به ښه وي. چې دا ځوان اوکړم او انشاء الله ځه ادس جوړ یمه. پلار ئې راضي شو. او د ددې واده په ډېر ساز باز سره اوشو. لکه —

(چې شاه د هغوي چې شو ګرې ورته کوینه)

دوئ ډېر په عیش عشرت کښې عمر تېرولو. چې د جلاوطن عمرې تېر شو. او د خپل وطن د تللو تیاري اوکړه. ځکه مور او پلار یې یاد شوی وه. بادشاه به ډېر عزت سره رخصت کړه.

(۱۲) چې د پلار بادشاهي ته اورسېدل. نو ډېر خوشحال شو. فقیرانو یې په خیراتو نعمانه کړل. بیا وروستو شهزاده د دربار نه ډېر ناوخت راغلو. چې دې کتل نو شهزادګۍ سره یو هلك پروت وه. ډېر په قهر شو. او توره یې رابهر کړه. چې دا څوك دي. چې ځما په محل کښې داسې بې خوفه اوده دي خود "فقیر" خبره ورته یاده شو. صبر یې اوکړه. او بیا ئې سوچ اوکړه. شهزادګۍ یې بیداره کړه تپوس یې تری نه اوکړو. چې دا څوك دي. هغې ووې چې دا م ورور دي. دا ډېر شکر اوکړو. چې ډېر ښه شو. ورنه هر څه بخراب وه.

دی نو پس یې په خیر بادشاهي کوله —

که به ځما په دعا کیږي. رب دی مسلم د غلامي نه ازاد کړینه

بس والسلام

شاکر الله

د بدۍ په عوض کښې نيکي

(د خلافت عباسيه يوه تاريخي واقعه)

يوه ورځ خيزران چه د خليفه مهدي (چه د خلافت عباسيه دريم حکمران وو) د ميني بي بي وه په شاهي محل کښې ډيره په فرحت ناسته وه . او د بادشاهي کورنۍ نورې بيبيانې هم په دغه مجلس کښې موجودې وې د دې خندا مشغولې په ساعت کښې يوه وينځه راغله او خيزران ته يې په غوږ کښې وويل چه په ډيوډۍ کښې يوه عاجزه ښځه راغلې ده . او ملکه عالم سره ليدل کتل غواړي . ما ترې د نوم او د مطلب پوښتنه وکړه ليکن نه خو خپل نوم راته ښيي او نه مطلب بيانوي . وايي چه مخامخ به عرض کوم . د ملکه خيزران په ښي طرف بي بي زينب ناسته وه . دا بي بي د حضرت عبدالله بن عباس د مسي سليمان لور وه . او د عباسيو په خاندان کښې يوه عقلمنه ښځه وه . او د دې مشوره به هر يو کار کښې اخستے شوه . ملکه خيزران هم د مشورې طلب کولو د پاره هغې ته مخ راواړه ولو بي بي زينب ورته وويل . را دې شي . ممکنه ده چه څه ښه خبري راوړې دي."

خيزران وينځې ته اشاره وکړه . هغه په منډه لاړه او هغه ښځه يې راوسته . اګر که دا ښځه په صورت ډيره ښايسته وه او په څېره کښې يې د شرافت او د امارت نخښې خرګندې وې . ليکن جامې يې خيرې پړې او شليدلې وې . د راتلو سره يې ادب او تعظيم سره سلام وکړو او بيا دا رنګه ګويا شوه چه زه د بني اميه د اخري بادشاه مروان بن محمد لور يم او زما نوم "مزنه" دې" دے لا نور څه هم ويل غوښتل ليکن ملکه خيزران فقط د دې خبرې په اوريدو چه دا بني اميه اولاد ده . (د بني اميه او د بني عباس خيل مينځ کښې پښتني دښمني وه) له ډيره قهره سور انګار شوه . او ورته يې وويل چه "څه ورکه شه . له سترګو م نه پناه شه . خواره شې . هغه وخت دې هير کړو چه ځمونږ د تره ابراهيم بن محمد نعش بې کفنه بې دفن کولو پروت وو . او ځمونږ د کورنۍ زړې ښځې د جرګې په طور تاسو ته د رغلې چه ته خپل پلار ته د اسپارښتنه وکړه چه هغه ته کفن ورکړې شي . او د هغه د ښخولو اجازت وکړي ليکن ما هيڅ رحم ونکړو . او مونږ د له خپل محل نه په بې عزتۍ سره را اوويستو . ښه شوه چه نن ته هم در په در خوارې په سر ګرزے او څوک دې په پيسې هم نه ګڼي."

مونږ ته ستاسو ښځې خبرې واوریدې لیکن اثر ئې شا فراکړي وو - په رعب کښې ئې نه غله او دا هم خطا نه شوه
ځینې شوه او په ډېرې سنجیدګۍ سره ئې ورته ووئیل چه "خورې! دومره تندي نه ده بکاره - څه منم چه ما بد
کړي دي چه ستا څه عزت مې ونکړو - لیکن ما د خپلو کړو توان سزا بیا موندله - نن تا ته خدائے پاک بادشاهي
درکړې ده او ته ملکهٔ عالم بللې شې - دا د الله تعالیٰ د نعمتونو ډېره لویه ناشکري دي - کچرته هم ما سره
هغه سلوک وکړې چه ما له تا سره کړی وو - د شکر نعمت تقاضا خو دا ده چه ته د یو عزتدار په خواري او
غریبۍ باندې رحم وکړې - پیغمبر صاحب صلعم فرمائلي دي چه کچرته یو سړی چه یو وخت کښې معزز وو د زمانې په
ګردش سره ذلیل شي نو تاسو ته پکار دي چه د هغه لاس اونیسئ او د هغه عزت وکړئ" دا ئې ووئیل او په پړنه
د ډیوډهۍ په طرف روانه شوه - لیکن په خیزران باندې د دې خبرو ډېر اثر پریوتی وو - زر را پاسیده او ورپسې
ئې منډه کړه - لاس ئې ونیوله او دا ئې غوښتل چه په محبت سره دا په غیږ کښې ونیسي - مونږ لاس ترې
خلاص کړو او ورته ئې ووئیل چه ما په غیږ کښې مه نیسه - څما د جیبرو بد بوئي به ستا دماغ پریشانه کړي
خیزران وینځو ته اشاره وکړه - هغوئ را د وکړا او مونږ ئې په ډېر تعظیم سره ... ته بوتله - غسل ئې ورکړو
او ښې قیمتي جامې ئې ور واغوستلې او بیائې د ملکه خیزران په خدمت کښې حاضره کړه - خیزران په ډېره مینه
سره له دې سره بغلګیر شوه - د دواړو له سترګو د محبت اوښې را وڅڅیدې - او بیائې په مسند شاهي باندې څان
سره څنګ کښېنوله او ورته ئې ووئیل چه خورې! اروغلې به خورې؟ مونږ سترګې کښته کړې او ورو غوندې
ووئیل چه عیان را چه بیان - دسترخوان را وغوښتلې شو او قسم قسم خوراکونه وتلول شو - لنډه دا چه
د دوئي دې خوړو نه دواړه د دوه خوئیندې وې او شان په خبرو شوې - ملکه خیزران پښتنه وکړه چه خورې!
تن صباخو ستاسو خبرګیرنه کوي مونږ ورته ووئیل چه بادشاهي لاړه - دولت مو برباد شو - په خاندان
کښې چه د خون رنګ سړي وو - هغه ټول قتل شو یا وتښتیده - خپل خپلوان او دوستان آشنایان
ټول د سپه ساعت ملګري دي - اوس د خدائے پاک آسره ده نو" د خیزران زړه راډک شه - سترګو
کښې ئې اوښې راغلې او په ډېره مینه سره ئې ورته ووئیل چه خورې! راځه چه زه تا ته شاهي محلات وښیم
او کوم یو محل چه ستا ډېر خوښ شي هغه ستا شه - دواړه پاسیدې - او شاهي محلاتو کښې ئې ګشت ونکولو -
مونږ د خپلې خوښې یو محل نه کوته ونیوله خیزران هغه محل سره د ټول سازوسامان او د وینځو او د

مَیری په هغه تنګۍ دے ته حواله کړو. او ورته ئې ووئیل چه له نن ورځې نه ځما سکه خور شوے. په دے محل کښې آرام سره اوسه. او که څه حاجت وي نو بې تکلیفه ئې ما ته اظهار کوه. مونږ به په اخلاص سره شکریه ادا کړه او دوا ړه یو د بل نه رخصت شوے.

خیزران چه خپل محل ته راوړسیده نو زړه کښې ئې ووئیل چه هیڅ شک نشته. یو وخت و چه مونږه هم ځما په شان ملکه وه او ټول سلطنت کښې ددے تصرف و. ولیکن اوس دا د یو یو ځکړے ډوډۍ د پاره هم محتاجه ده. دے خیال کولو سره خیزران خپل زړه کښې یو مسرت محسوس کړو چه شکر دی ځما هغه ادنی خیال له ما زغونه رزنړ ژړه وړتوار دے سره ام د خویند ویه شان سلوک کړو. په هغه ساعت ئې خپله خاصه خادمه راوبلله او د زر ځلور لکه اشرفۍ ئې د هغې په لاس ورواستولے. ددے مینځ کښې خلیفه مهدي هم له دربار نه کور ته راغې. خیزران ورته د مونږه د راتلو بیان شروع کړو. چه دا ئې ورته ووئیل چه ما دے سلام وانه خستو او دام وَرته سیکږم کړه. نو لا ئې مخ کښې بیان نه وو کړے. چه خلیفه مهدي په دې قدر اوریدو سره ډیر غصه شه او ورته ئې ووئیل چه افسوس! صد افسوس! تا ته خدائے پاک یوه ډیره ښه موقعه درکړې وه. تا ته مناسب وو چه د خدائے پاک د نعمتونو شکر ګذارۍ د پاره به تا د مونږه هغه سلوک بالکل هیر کړے وو او له دے سره به دِ د خویندو په شان سلوک کړے وو. نو ځه به ډیر خوشحال وم. افسوس دی چه تا هغه زرین موقعه له خپله لاسه وابیته. خیزران ورته ووئیل چه ملګو لا خپله قصه ختم کړې نه ده. او بیائې ټول حال ورته بیان کړ. خلیفه مهدي ډیر خوشحال شه. او ورته ئې ووئیل چه آفرین دوی په تا باندې. دشمن سره هم داسے سلوک پکار دي'' یو خادم ته ئې آواز وکړو او په هغه ساعت ئې د اشرفو یو څو تهیلۍ او قیمتي پوشاکونه او جواهرات ورولیږل. او سوال جواب ئې ورته وکړو چه زړه خوږم غواړي چه هم په دے وخت کښې زه پخپله درشم او ستا ملاقات حاصل کړم لیکن زه نه غواړم چه ستا د آرام په کوټۍ کښې خلل واچوم. مونږه ته چه د خلیفه دا پیغام ورکړې شه نو ډیره راپاسیده او سلام ته ورغله. د خلیفه مهدي د عنایت امین سلوک ئې په ډیر اخلاص سره شکریه ادا کړه. یو ساعت ئې خبرے اترے وکړے. بیا خپل محل ته لاړه او څو ورځې پورے چه خیزران او مهدي ژوندي وو ددے ډیر لوئے عزت وو. د مهدي له مرګ نه پس د هغه ځامنو هادي او هارون الرشید

هم د دے څه کم عزت نه کولو او له دے سره به یې بعینه هغه سلوک کولو چه د عباسي خاندان
او د بني هاشم له بیبیانو سره به کیدو۔

بدی را بدی سهل باشد جزا
اگر مردی احسن الی من اساء
(سعدی رح) ـ

اسمٰعیل محمودی

سید جمال الدین افغاني

سید جمال الدین صاحب د پښتونخوا په لویو غرونو کښې د کنړ په دره کښې په اسعد اباد کلي
کښې چه بیت شرف هم ورته وایه شي په ۱۸۳۶ء کښې پیدا شه۔ د دوي د والد ماجد نوم صفدر حسین
وو۔ او د اصل نه سیدان وو۔ د قام په مینځ د دې خاندان ډیر قدر او عزت وو۔ او په سنه سترګه به ورته
کتې شو د خوا وشا قام قبیلې هم د دوي د حکم نه غاړه نه غړولو۔ او په داشان د سید صفدر حسین
د ډیر علمي قابلیت او ځیني خصوصیت په وجه د قام په مینځ سنه قدر او منزلت وو۔ سید صفدر د دنیاوي
لحاظ سره (یعنې مال جایداد) سنه غوړه وو۔ او ډیر په سنه شان سره به یې د دنیاوي ژوند په خوشحالي
سر ته رسولي۔ د سید صفدر صاحب د علمي قابلیت او قومي رسوخ غږ چه امیر دوست محمد خان ته ورسید
نو هغه فی الحال سید مذکور په ۱۸۴۴ء کښې خپلې دار الخلافې کابل ته راوغوښت او د هغه یې سنه قدر
و منزلت یې وکړو۔ خپل عنایات یې پرې خرګند کړل او د ژوند مازیګري یې پرې بیا ګچه غوړه کړو۔ سید
صفدر چه کابل ته راغی نو دلې هغه سره بغیر د خپل فرزند د بل څیز فکر نه وو او س هغه

خپل ټول کوششونه او تدبیرونه دَدې لوخښتن ثمر په پرورش او ښه تعلیم و تبلول او ود دې
کوششونو نتیجه دا شوه چې سیّد جمال الدّین دَ افغانستان علیه الرحمه کالو په عمر کښې دتعلیم په کالی آراسته
پیراسته شو. تفسیر ئې زده کړو. فقه کښې ئې دسترس وشو. په حدیث پوره ښه شوه. او علاوه
دَدې په سیاست فلسفه ریاضي او منطق کښې هم دَحاجت نه زیات مهارت حاصل کړو. او چه
دَدې علوم په لوستنه کښې ئې ښه ژر وتړه وموند لو زړه ئې دَمغربي علوم زده کړي ته وچت شو
او هندوستان ته راغی دلته هغه نه صرف تعلیم او تجربه حاصل کړه بلکه دَ دنیا په لویه جوړه ئې
هم ځان پوره کړو. انګریزي تمدّن ئې له سترګو تیر کړو. او دهندي مسلمانانو مذهبي او اخلاقي
حالات ئې سنه واقفیّت حاصل کړو. او دَمغربي تحصیل علوم نه روستو په ۱۸۵۷ء کښې سید
صاحب دحج اراده وکړه او مکّه معظمّه ته لاړ دلې ډیره موده قیام وکړو. اوس ئې زړه بوځل بیا دَ
وطن په لوری اوچت شو ولې چه دَپښتو نخواغرونه که هرڅومره سوړ او بربنډ لغړ دي لیکن
بیا هم دَ یو پښتون ته ډیر ښې لګي احمد شاه بابا چه دَوطن په مینه ویلي دي ؎

که هر څو مرد د دنیا ملکونه ډیر شي
ځما هیر نه شي دا ستا ښکلي باغونه
دَ دهلي تخت هیرومه چه را یاد کړم
زما د ښکلي پښتونخوا غرونو سرونه

څه وخت چه سید صاحب کابل ته بیرته راغی نو چه امیر دوست محمّد خان ئې دعلمي قابلیّت او
سفر وسیاحت غږ واورید پوره ښه جلیل القدر رتبه ئې ورکړه او په امور سلطنت کښې ئې صلاح کار
شو مګر زماني کله دَپښتونو ښه بدیا ته پریښوده په لږه موده کښې دَهرات لغاوت راپورته شو. امیر
دوست محمّد خان دَ دې غلبلې نه روستو ډیره موده ژوندي نه وو او چه له دنیا په ماتې شو
تخت تریاتی شو نو امیر شیر علي خپل مشر ورور محمّد افضل قید کړو او بخپله دَ بادشاهي ښا لیتا ئې په
لاس واخسته افضل خان دخپل زوی عبدالرحمن په مدد بیا راخلاص شو. ولې ډیر زر مړ شه
او اوس محمد اعظم دَتخت کابل مالک شو. مګر نا قابلیتا په وجه شیر علي دَتخت په اخستو کښې بیا

کامیاب شو. او س محمد اعظم و عبد الرحمن د کابل پښتي و ښکلی محمد اعظم ایران ته لاړ او عبد الرحمن سمرقند ته پښتي سپکي کړي. چونکه په افغانستان کښ سید صاحب محمد اعظم او عبد الرحمن سره ملګرتیا کړي وه دی د دی د پاره د ددې د تلو نه روستو د سید صاحب زړه په کابل په میړ تون وو. او چونکه ازاد طبیعت و خوشامندي ترینه کیدی ی د کابل نه ئي د تلو اراده وکړه او د حج په بهانه د امیر شیر علي نه په سنه ۱۸۶۹ء کښ رخصت شو هندوستان ته دوباره راغي انګریزي حکومت ډیر ښه شان سره هر کلی ورکړو. او ورسره وزیره ئي. سي. ائي. ډپي هم ولګول چونکه داخل د سید صاحب زړه غه نو ننا ل نه وو. ولي چه ده ته عام ملاقات او لوړو لوړو خلقو سره د تبادله خیال اجازت نه وو دی د پاره سید صاحب د مباشت د قیام نه پس هندوستان نه مصر ته لاړ. مګر د مصر حکومت هم د سید صاحب ډیره حصار نیا خوښه نه کړه او د خلوبت ورځو قیام نه پس قسطنطنیه ته لاړ. اګرچه د سید صاحب قیام په مصر کښ ډیر لږ وو لیکن بیا هم د ده د علمي قابلیت او په ټول مصر کښ لګیدلي وو. او د لرې برې ټول عالمان او پوهنده خلق ئي ملاقات له رامات شوی وو. طالب علمان ورله راغلي شول او د هغوي په اسند عا سید صاحب ورته یو څو لیکچرونه وکړل.

سید صاحب چه قسطنطنیه ته ورسید نو ځه ګوري چه په ټول ملک کښ لړ کړي ځانخاني ده. سلطان عبد العزیز د حکومت واګي تقریباً د روسي سفیر په لاس ورکړي دي. انګریزي وزیراعظم ګلیډسټون او جرمني وزیراعظم پرنس بسمارک د ترکو عیسائي رعایا په غلبله پورته کړي ده. مسلمانانو ته بې پرسولي دي او انجام داچه وس ئي د سي نو په مسلمان ساړه نه خوري. د سررشته تعلیم هم دا شان حال وو. ولي چه د عام تعلیم اجازت نه وو. عام خلقو د مغربي تهذیب د اثرلاند خپل رنګ ډنګ وضع قطع هیره کړی وه. او نه ئي په دین ښه کار لرو او نه دنیا په دوئي ښه کار لرو. یعنې دوئي دین ته په بې اعتنائي کتل او دنیا دوئي ته په بې اعتنائي کتل. مثل دی چه د لوند وخاورو لړی او به بهانه وي خلق خوشحه عیش و تنعم په مینه مست وو چه سلطان عبد العزیز ئي هم د ی طرف ته مایل ولید د زړه غوټئ د خلقو بیا وسپړیدي شوي. او د حکومت د سر برا خلقو چه زړه د عیش و ارام بوټي ته غوړه شو.

سلطان عبد العزیز د روسي سفیر د اقتدار لاند تر دی حده پورې راغلی وو چه د هغه په صلاح ئي د

وړاندې څو ځاې دخپل وراره خپل زوې عزیزالدین ته حواله کولو نیت وکړو او د قوم زړو نه یې لځان تورکړو ځاې ځاې خلق د غلبلو جنډې په لاس راولاړ شو او دس خودسرې ادرود چه پر خپل ګلبد و مرکیدې څه اسان کار نه دو - په امیان کښې د سید صاحب د علمي قابلیت او سیاسي تجربې شهرت په درست عالم کښې شوي وو - او د خلقو زړونه یې په مینه کښې مسخر کړي وو - د دې خبرو غور علي پاشا وزیراعظم ته هم ورسید هغه ورسره ملاقات وکړو - او چه سید صاحب د قیام په قسطنطنیه کښې شپږ میاشتې هم نه وې شوي چه دی د سررشته تعلیم عضو یعنی ممبر مقرر شو چونکه د سید صاحب رجحان هم زیات طورسره دې طرف ته وو خپل منصبي فرائض یې بیا شان سره اداکړه چه خلق یې په واه واه کښې کړه - او حاسدان مولیان یې په اه اه کښې کړه - څرنګه چه ما ویلې دي - تعلیم په ترکو کښې عام نه دو - او خلق په دې زړا ودي لل کل وو سید جمال الدین صاحب د دې مرض د تدارک د پاره د عام تعلیم تجویز پیش کړو - ولې چه هغه ته خوښه معلوم وو چه د هر ملک او قوم حیات و ممات علم او جهل سره وابسته دي کوم قوم چه علم حکمت او کمال لري د هغو د سیاست او حکومت نغاره په څلور دانګ عالم کښې غږیږي - او کوم بد نصیب قوم چه د وحشت او جهالت په بیابان کښې ګمراه ګرځي - همیشه بدسر وهلي بروهلي وي - د حریت او شرافت شاهراه ته په هیچرې ونه رسیږي او دس دلته د سید صاحب هغه لوړه مینه چه هغه اهل اسلام سره لره معلومیږي مګر چونکه په هغه زمانه کښې سلطان عبدالعزیز د شیخ الاسلام په اثر کښې راغلی وو - او د هغه په کام به یې کام اخستو د سید صاحب دې تجویز عملي پهلو اختیار نه کړې شو - نو د سید صاحب هغه اسلامي مینه او اسلامي جوش په سینه د ننه پاتې شو -

په سن سنه ۱۸۷۰ء کښې د دارالفنون سیکرټري سید صاحب ته استدعا وکړه - چه چونکه تمام صنعت او هنر ته شاګرې ده ارام ته محنه د کادې د پاره تاسو په ترکي ژبه کښې یو عبرتناک تقریر وکړې او د تمام خیالات د صنعت سره د مینې په لوړ راوړدي - اګرچه سید صاحب ورته په ژبه کښې د مهارت نه لرو په سبب د ډیرغه انکار وکړو - لیکن کامیاب نه شو - او د تقریر کولو وعده یې او کړه - چونکه د سید صاحب مینې د هر سړي په زړه کښې کورجوړ کړې وو - او سیاسي زمړي هم د سید صاحب په قدر کښې ګوزیدي - د سید صاحب د تقریر غږ په درست ښهر کښې خور شو - او د لرې برې خلق په ایوان دارالفنون کښې راغونډ

شول۔ دَ حکومت دَ وزرانه واخله دَ معمولي کلرک پورې اُوريدونکي جمع شوي وو چې ته په دې ښهر کښې مېان، مُلا، ليکونکي، لوستونکي، اديب او شاعر نه وو پاتې شوي۔ هرځاې په وقت مقرره دارالفنون ته ځان رارسولي وو۔ سيد صاحب خپل تقرير په ښه شان سره سرته ورسولو او د سامعين نه ئې ښه تحسين واوريد مگر دا دي تا سو ته معلومه وي چې سيد صاحب ازلي حريت پسند طبيعت لرو او دَ تمام دَ آزادي خيالات هر وخت دَ دوئي په زړه کښې موجزن وو او هم په دا سېد صاحب دَ خپل خيالاتو اظهار په دا تقرير دکړو ځان ځاني ئې کوزه وغورزوله او دَ قوم آزادي غوښتې راپورته کړو۔ نتيجه دا شوه چې خلق ټول دَ آزادي خواهشمند شول۔ دا استنبل دَ نر تو به که شول۔

دَ سيد صاحب تقرير ښه داسې تقرير نه وو چې اُوريدونکو سره به هير شوي وي بلکه ښه داسې جوا هر پرې وي چې دَ دماغ په وساطت دَ زړه په خزانه کښې ساتلو قابل وي۔ دې تقرير دَ خلقو په زړونو کښې ډيره کړه۔ او هر کس دَ استنبل ديت نه بيزار شو۔ شيخ الاسلام خو لا دَ وړاندې نه سيد صاحب ته نه شو کتې چې تقرير ئې واوريد وخلقو ميته ئې ولېده نو لا ئې په زړه اور بل شو۔ او دَ سيد صاحب تقرير ئې دَ حريت پسندئ په دائره کښې دَ ملك او مذهب دَ پاره مضر وگڼلو او دَ باب عالي په ذريعه ئې سيد صاحب ته دَ ترکو پرېښو نصيحت وکړو۔

چونکه چې وړاندې خپل سيد صاحب دَ مصر ښه سيل نه وو کړي دې دَ پاره داځل سيد صاحب دَ مصر دَ سيل اراده وکړه۔ او په ۱۸۷۱ء کښې له قسطنطنيه نه مصر ته لاړ۔ دلته ئې رياض پاشا سره ملاقات وشو هغه دَ سيد صاحب دَ علمي ادبي او سياسي قابليت ډير قدر وکړو۔ او يو ښه ځاي دَ استوگني دَ پاره ورکړو۔ علاوه دَ دې ئې ښه وظيفه هم ورته مقرر کړه او سيد صاحب پوځل بيا په مصر کښې سکونت پذير شو۔ عالمان ئې لاس نيوي له او طالب علمان زده کړې له گروه دَ گروه راروان شول سيد صاحب طالب العلمانو ته علاوه دَ حکمت فلسفې او رياضي نه علم کلام هم په ښه شان سره ښودلو او خپل شاگردان ئې په ادبي او سياسي رنگ کښې رنگ کړل چونکه سيد صاحب يو روښن خيال او حريت پسند عالم وو۔ دې دَ پاره هغه دَ مصر په سياست کښې ښه دلچسپي اخسته او دائي خيال وو چې

مصر دې د بل حکومت نه غیر صالح کار او ښه منظم دي۔

ید ا مقصد کښې د کامیابۍ د پاره سیّد صاحب د فرانسي مشرقي انجمن زیرنګرانۍ یو ښه مدلل او با اثر تقریر وکړو۔ خلق یې د مصر آزادۍ د پاره وپارول۔ چونکه سیّد صاحب د انګریزانو مداخلت نه هم په مصر کښې په ښه سترګه نه کتل۔ دې د پاره هغه په دا باره کښې ښه ښه مضامین او لوړ لوړ خیالات په اخبارات کښې ورکړل او مصري خلق یې په ښه بده خبر کړل اګرچه په هغه زمانه کښې د انګلستان وزیر اعظم ګلیډ سټون هم د سیّد صاحب په مقابله کښې قلم پورته کړي وو۔ لیکن کوم مینه چه د سیّد صاحب د مضامین په لیستلو کښې وه هغه چرته کتلی شوه۔

د اسماعیل پاشا په دوران کښې اګرچه مصر هم د انګریزي اقتدار لاندې وو لیکن بیا هم ټول ملکي او مالي اختیارات د مصري حکومت په لاس وو۔ په ۱۸۷۹ء کښې چه اسماعیل پاشا جلا کړې شو۔ او توفیق پاشا عثمان حکومت په لاس واخست نو د انګریزانو اوبه په سوري شوې مالي اختیارات یې په لاس راخستل او چه ښه اثر یې په وغورزولو نو د سیّد صاحب د بهر کولو خیال یې ورته په دماغ کښې واچولو او آخر د سید صاحب د وېنګو حکم مصري حکومت صادر کړو او سید صاحب ۱۸۷۹ء کښې هندوستان ته راغلو او حیدرآباد دکن کښې مقیم شو۔ اګرچه سید صاحب د مصر نه راغلو لیکن هغه اور چه هغه کړی وو۔ سوړ نه شو۔ کله نه کله به یې لمبه وهله۔

سیّد صاحب چه هندوستان ته راغلو نو دلته هم په قلار کښې نه ناست ادځیل مذهبي خدمت یې پرېنخود۔ دلته هغه څو علمي او ادبي رسالې جاري کړې۔ او اسلامي دنیا یې له ښه بدې ښه خبر کړه۔ سید صاحب لا په خپل خدمات کښې سر نهیت نیولي وو۔ چه په مصر کښې داعرابي پاشا غلبله پورته شوه او انګریزي حکومت پیدا ویره چه د سیّد صاحب آزادي په هندوستان کښې څه خلل پیدا نه کړي۔ کلکتې ته یې د نظربند په حیثیت د بیولو او ترڅو چه دا غلبله په مصر کښې وه۔ سید صاحب په کلکته کښې ووچه په مصر کښې امن شو نو سید صاحب ته مکمله آزادي ورکړې شوه۔ اوس هغه خپل عنان اراد ت د مغرب په جانب واړول او د یورپ د سیل نیت یې وکړه۔ لندن ته لاړ او هلته یې لوې لوې ادبیانو خوش بیان شاعرانو او اولوالعزم سیاست دانو سره ملاقات وشو۔ تجربه یې یوه په دوه شو۔ او دهغې ځایې خلق یې هم

په لیدو خوشحال وخندان شو. د انقلاب فارس لیکونکي براون سره یې ملاقات وشو. لکه براون
لیکلي دي. "چه د سید جمال الدین افغاني په سترګو کښې څه داسې زیات اثر وو. چه څه وخت څه موږ
سره په لندن کښې ملاقاتي شومه نو ما د هغه سترګو ته کتې نه شو." په لندن کښې د څو ورځو قیام نه
روستو سید صاحب پیرس ته لاړ هلته یې خپل زوړ دوست مفتي محمد عبده مصري سره ملاقات وشو.
دلته د دوست ورته د مصر د انجمني عروة الوثقى له طرفه د عروة الوثقى اخبار نشر کولو صلاح
ورکړه او ورته یې وویل چه پیرس کښې به موږ د اسلامي دنیا د اتحاد تعلیم وتدریب ورکوو. سید صاحب
نور الاشاعت سته د هغه د قبول ژرونه مقصد څو هم هدی ووداوو. اخبار یې د خیالاتو په بوره ازادۍ سره
نشر کول شروع کړل او چونکه د نشر ځای یې ازاد ملک وو دی د باره سید صاحب په سبه شان سره
د خیالاتو اظهار شروع کړو. په لیدو یې خلق تل ګل شو او هر حکومت یې ترخیله وسې پورې د ښد ولو
کوشش شروع کړو. او لا انګلستان یې چه یې په نشر کیدو وه چه د بل نمبر نشر کولو اجازت ورنکړې
شو او عروة الوثقى بند شو. د دې نه روستو بیا هم سید صاحب خپل قلم له ارام ورنکړو. او
بیا به یې خپل مضامین په فرانسیسي اخباراتو کښې نشر کول او عام طور سره به یې روسي انګریزي
ترکي، او مصري سیاساتو باندې بحث مباحثه کوله.

د سید صاحب علمي او سیاسي قابلیت په یورپ کښې څه دمره اثر غور زولی وو. چه دمره
علمي او سیاسي زمره د ده په لیاقت قایل وه د ده مذهبي جوش ا ته د اهل اسلام مبنې هم
سړي په شک کښې غورزولی وو. د پارلیمنټ ممبران په انګلستان کښې هم څه حیران وو او د
مهدي اخر الزمان ګمان به یې په کولو دي شک په اصلي مقصد باندې پوهید و د باره
لارډ سالسبري او لارډ چرچل سید صاحب ته په دا موضوع باندې خبرې کولو د باره لندن
ته راتلو استدعا وکړه. سید صاحب لندن ته لاړ د خپلو خیالاتو اظهار یې په سه شان
وکړو. او په هغوئي یې دا واضح کړه چه نه زه مهدي اخر الزمان یم او نه دا خیالات لرم او
بیرته پیرس ته راغله.

متل دي چه د نفتیر چرته سبه یې هلته یې شپه یې چونکه د سید صاحب په پیرس کښې

په ډېر قدر و منزلت وو هغه هلته دري څلور کاله مقيم وو - چه څه وخت د سيد صاحب زړه د يورپ د سېل نه موړ شو نو بيائې د اسلامي ملکو نو مينه راولاړه شوه او د يمن د تللو اراده ئې وکړه - د سيد صاحب د تللو غوښتلو دمخه داور په دې ټول جهان کښې خور شو او چه دا خبر شاه کجکلاه ناصرالدين قاچار ته ورسيد - نو هغه في الحال سيد صاحب ته د تار په ذريعه د طهران راتللو دعوت ورکړو - سيد صاحب ته چه دعوت نامه ورسيده نو د ايران اراده ئې وکړه چه اصفهان ته را ورسيد نو د هغه ځائ اميرانو ډېر قدر وکړو - او سيد صاحب شو ورځې پس طهران ته لاړ - شاه کجکلاه سره ملاقي شو - شاه ناصرالدين خولا وړنې د ده د علمي قابليت قائل وو په لېد ولا زيات خوشحال شو - او سيد صاحب ئې د ايران د بهر معاملو وزير مقرر کړو - چونکه سيد صاحب د نيا سنه لېدلې وو او د هر حکومت د کورنو او بهرنو معاملو نه خبر وو دې د پاره ئې خپل منصبي فرائض په ښه شان سره پوره کول -

د سيد صاحب د علمي قابليت او سياسي لياقت و تجربې د مرا شهرت شوې چه د عالمانو به هر وخت وسره جرګه وه او د سلطنت اميرانو او نورو کار رکډ رانو به په مشکل سره راتلل فيصله کول غرض دا چه د سيد صاحب صحبت به هر وخت ګرم وو - او خبره دې حد ته ورسيده که چه ناصرالدين د سيد صاحب له جانب خار پارې شو - او سيد صاحب شهرت ئې هغه زړه مينه چه د ناصرالدين سيد صاحب سره ولا - د زړه نه ونځله - څه وخت چه سيد صاحب د هغه په نيت پوه شو نو د هوا خورې په اراده ئې د باهر تللو اجازت وغوښت او د سلطنت روس وړبنې دار الخلافې ته لاړ هلته هم د سيد صاحب ښه استقبال وشو - د ماسکو خلقو په سترګو واخستو او بيا له هغه ځا په سينټ پيټرز برګ ته لاړ - چه خپل قدر ئې ولېد نو سترګې ئې پرانستې شوې او د هغوې په استدعا پنځه کاله پورې هلته پاتې شو - سيد صاحب لا د روس په سياحت زړه نه وو سوړ کړې چه د پيرس د نمائش غوږ ئې په غوږ راغې - او په سنه ۱۸۸۹ء کښې دوې هم تشريف يوړو - په مراجعت کښې د ميونيخ (دار السلطنت بويريا) په مقام سيد صاحب ناصرالدين سره بيا ټکراو شو - او هغه سيد صاحب بيا ايران ته په تللو مجبور کړو - اګر چه سيد صاحب داخل په ډېر قدر سره بوتلې

شو. لیکن صدر اعظم او دغه هوشیاري د سید صاحب د قدر و منزلت نه کار کتي شو. او هول په (اثر) کښې وو. چه په څه نه څه وجه بادشاه طبیعت د سید صاحب نه خپه کړي. اګرچه د دې قیام سید صاحب خپل نیکات شاه عبدالعظیم ته ورسو. لیکن د حاسد انو حسد هلته هم ورسید او سید صاحب په بې حرمتي سره د ایران د سرحد نه بهر کړي شو.

اګرچه سید صاحب به دیر قدر ایران ته راستي شو. لیکن په پره بې توجهي او ناقدري د ایران نه د هغوي تیا په حالت بیرون کړي شو. وائي چه د لوي خلقو زړه هم لوی وي. او دا ضرب المثل داسې مه کوه په چا چري وبه شي پړتا " اخر ربښتیا شو. ناصر الدین د حکومت او ژوند دوا لړونه لاس و نخل. سید صاحب د ایران و ملکو نه پس بصره ته لاړ او چه صحت ئې ښه شو نو د یورپ تلو اراده ئې بیا وکړه. او انګلستان ته لاړ اګرچه سید صاحب وړاندې هم څو ځله انګلستان ته تلی وو. او خپل قدر ئې د خلقو زړه کښې اچولي وو. لیکن دا ځل خلق ئې د اول نه ډیر اشتیاق لرو. لوئي لوئي جلسې وکړې شوې - سید صاحب په سنه شان سره سیاسي تقریر وکړل چه اکثر حصه ئې د ایران طرز حکومت او سیاست باندې مشتمله وه.

سید صاحب لا د دې بحث مباحثو په مینه مست وو چه سید صاحب له د سلطان عبدالحمید له طرف د رستم پاشا چه د ترکو په لندن کښې سفیر وو په وساطت خط راغلو او ترکو راتلو استدعائي ورته وکړه لیکن سید صاحب غلي وو لیکن چه بیا خط راغي نو سید صاحب په تلو مجبور شو. او په سنه ۱۸۹۲ء کښې قسطنطنیه ته لاړ. اګرچه د سید صاحب دلته د قیام اراده نه وه. لیکن چه شاهي نظر التفات ئې ولید نو د قیام اراده ئې وکړه او باقي ژوند ئې دلته ورسولو سید صاحب تر ځلور کالو پورې خپل کوشش نه د ترکو په خدمت کښې صرف کړه او علمي و سیاسي فائده باندې زیات کړه لیکن - که دنیا ځائي د خوشحالي وو.

د خدائي دوستانو به پانو تل تر تل وُنه

سید جمال الدین صاحب د امید ونو په ډک زړه په سنه ۱۸۹۷ء کښې د شپیتو کالو په عمر کښې د سرطان رنځ دلاس د دنیا نه بقا ته لاړ. د سید صاحب د مرګ خبر د ترکو په کوټ کوټ کښې لکه د سیل داو

خور شو۔ او په جنازه ئې عالمان فاضلان ادیبان شاعران او اراکین سلطنت داغنی شول علاوه د دې د ترکو به قوم لوړ او معتبر سړي چرته نه وو پاتې شوي ټول ئې په جنازه جمع شوي وو او داد پښتون د غرونو غمي لې د باسفورس په غاړه دفن کړو۔ دا لال د پښتنو د کان وو لکه وائي ؎

داهم ورد بې داهم نر دې یو نسا ئسته نکلی ډکر دي
پښتون د بابلِ نازېږي کډې نن سوئي تهتر دي۔

سیّد جمال الدین افغاني دازل نه حریت پسند وو او د تام د ازادې میندي به ترکو نوکښ دمړ ګرمه وه چه لکه وائي کیرما پیر شپه په الره دیکه ید هر موضوع به ئې بحث کولو۔ اِحتنام نه ئې به قومي ازادي وو۔ سید صاحب یو روشن خیال زیرک وو۔ او رجحان طبع ئې قدرتي طور سره د سیاسیاتو طرف ته وو۔ سید صاحب صرف عالم او سیاستدان سړي نه وو۔ بلکه منذهبي لحاظ سره یو زیرک او بختور سړي وو۔ څوک چه به یو ځل د صحبت نه ئې فیضیاب شو تر عمره عمره به ئې منونکي وو غرض دا چه ؎

ښاد خائیست ګلونه ډېر دي !
جولي مړ ننګر زره به کوم کوم تهولومه
قلم به مات دوات به وچ شي !
که مړ ښکاره کړه ښاد خوږ زړه پرهار وو
خه شو که خاوري شولي خاوري
یاد د ژوندي دي پښتنانه به ئې ژوندي کړینه

له قلمه د شوکت الله اکبر نوښهروي

(ماخوذ از حیات جمالی)

یو سحر د خیبر په خوا کښ

(له قلمه د میان سید رسول)

د خیبر د غوا سماده، توره شپه الهره سحر شو
بیا د نور د ولې بهیرې راښکاره په جهان نمر شو

د خیبر د خوا سحر دے که جهان زما د زړه دے
که نه دا زړه غلطیږم، یو جنت م په نظر شو

تورے زلفې په شا کړې، خنده رُو به لیلیٰ راغله
که نه نمر په غرونو ښکاري، په مجنون باندے خندر شو

دا د سرو زرو داره دي، چه دا څمه غرون په سر اخوستل
که نه دلبر د وینو ښکاري، د عاشق ښکاره ځګر شو

سپین ټکي د غرو نو سره شول وا ورېدلی د غرونه
که فریب دا د نظر دے، چرته پیښ په جادوګر شو

چه دا څمه ښکاري په دشت کښ ځائي په ځائي نړیکي لوګي دي
انځري دي، تورسکاره دي، خوشلیں لي سپین پټکي دي

رانه ښکاري ښکاره شپه وه په د دشت کښ د کاروان
سحر تلي کوچي کړې چه ملا کړے اذان

رته خه منظوم اولیں بیا په زړه م چپه راغے
بیام ستر کو کښ تاره شو تلي تان تلي دوران

د خیبر سورا په غرونو، اے څو نیزه امید ونو
د لښتون د زړه سرونو تا سو فخر د افغان

په تندي د تا خو ښکاري د غازیانو شهیدانو
هغه وینه چه ښکلي ئي د جنت حورے غلمان

یدے خاورو کښ پراته دي نښانون د سپین دیټ
یدے غرونو کښ چوړلیږي لا اذان د مسلمان

قافله هیش راغلی، قافله دي همیش تلے
په دے لارو یدے غرونو د خیبر په کوهستان

سکندر وو که تیمور وو، که بابر وو که محمود وو
که نادر وو، که غوري وو که ابدالي د میدان

د خیبر غرونو ته یاد دے، هر چا د لته تازه کړي
د رزمونو، د بزمونو عجیبه رنګین داستان

یدے کاڼو یدے بوټو یدے جابو یدے خاورو
د سرو د وینو لیو دے قتل کا ٢ د ٢ د جهان

لکه ستورے پراکیږي د لته تورے د غازیانو
لکه تندر رو ویدلي د لته غښتي د افغان

بڼ ئے خاور کښې پرانه دي رنګ په وینو باور اوکړه
دِګلاب په شان مخون، دِغزال په شان چشمان

خون لړلي سره مخون، دِ پرخلمي دلته اوده دي
په حسرت چه ورله ګوري دِ شپه ستورې د اسمان

دا څوکا نړي، دا څوبوټي، دا څوجامے دا څوغړون
دا انتقام دِ سوَد او زمان دے دا بویاب هندوستان

دَ دغو غړونو خوا کښې دِ سحر بدے سا کښې!
حما منرګي بیا څروني، بدے دشت پسے صحرا کښې!

په نظرم یو منظر دے، دِ راتلونکي واقعا تو!
هستَي نه دلته رښتیا شي، دجهان خوني خوبون

زړه پرېکړم هستي، نه چه ددے خاور وبه لمن کښې!
بیا روان دِ وینو نشي، په زور شور کښې سیلابون

ربّ دِ خیر کړي هستَي نه چه معرکه دِ دا روښن تن!
بیا څوک دلته کښې تازه کړي بیا څوک ګرم کړي جنګون

هستي نه دلته به جنګ شي، بیني دیوان سرلا په غضب کښې
هستي نه دلته کښې دَل کړي دِ حلمو نساټینه سرون

هستَي نه چه دلته ګوري، پو څو ورځے پس اسمان کښې
دِ مرغانو نه ځائي بورته په هوا کښې جهازون

هستَي نه دلته غزا شي دِ تو پو تو، دِ تپنګو سو!
هستَي نه دلته غوږ زیږي دِ هرچا به سرېمون

هستَي نه دلته ریا شي، هستي نه دلته تپکا شي!
هستي نه دلته چلیږي په کړاساري منښیون

هستي نه دلته غوبل شي، هستَي نه دا وطن دل شي!
هستَي نه دا رزم ګاه شي چرچا بیره دی توزون

هسَي نه دلته خړ یا دي، هستَي نه دلته شړ نګا دي!
سپینه تورسے دي پر کیږي دِ سرو وینو دی رودون

هستَي نه چه یے غرونو بیا یاران دِ تښن را شي
دجهان تول په بل رنګ شي په بل رنګ شي نظامون

هستَي نه دلته کښې ختم دَ دِ زوړ جهان ژوند نه شي
هستَي نه دلته پیدا شي نوے ژوند، نوی ارمون

هستَي نه چه نوے بزم دلته ساز په نوي رنګ شي
هلکان په مدرسو کښې نوی لوَلي نسا دیجون

نوے جام، نوے ساقي شي، نوي را دي شرابون
نوے چنګ، نوے مطرب شي نوی ساز شي ربابون

حما شوخ نظر وینې، دِ جهان دِ نظر پېټه
پو فتنه چه په اغوش کښې سل فتنے لری زبون

پو څو ورځے پس ګوره نه په دلته کښې بیا غزوي
نه به دا سَي قلاري وي دا میدان به محشر وي

دِ نقدیر پرده کښې ښکاري، پو خوني منظر خیبر کښې
څوک خبر دي، مسا څه دِ دَ خیبر په سپین سحر کښې

(میا سید رسول رسا)

دا څه دُنیا وینما!

دا څه شورش، دا څه ګردش، دا څه دُنیا وینما! نوې تهذیب کښې نور څه نشته سینما وینما!

که تجارت دی، که صنعت دی، یا خواري مزدوري یو جواري ده، د یو سود دي، زر زنا لا وینما

جمهوریت دی، حکومت څو نور خو راسې د بل د بادشاه راځي نه بد راځي نه ټول سزا وینما

هسې په خله خو مساوات دي خو عمل کښې نه دي غریب هر ځای کښې د خواري نه په ژړا وینما!

د فرنګي تعلیم کړلي بوټي نشته شول اختر! ښا لُسته ځوانان، برېنډه، لږه، بیکار تباه وینما!

ځواني مینه محبت نشته احساس نشته دے زوزاد د بلا رنه مور، د رور ځدا ځدا وینما

د تېنو زمانه کښې ښیادم شو مشین! تیل خوراک شو تیل به خوري، تیل غذا وینما

د حیا به مخ د خوشحالي خندا سرخي نشته دے په غازه سره رخسار سنګار د دلربا وینما

انصاف او عدل چرته نشته دي لوبه او باسه د حکومت زور په غریبا او په ګدا وینما

د مزدورانو، غریبانو، د خوارانو د نسبه!
مخلوق د ننګ شو ټول په جنګ شو، شور غوغا وینما

(میان سید رسول)

یو برقعه پوش ډاکو

(ترجمه له انګریزي)

د نومبر په میاشتې کښې د خای په ورځ ماښام وخت کښې ډاکټر ډانیل ته م ووچه صاحبه! اوس یو ډېر لایولس هغه برقعه پوش ډاکو نیولی نه دي. او ځما خیال دی چه اوس ده دا کارونه پرېښودل او چرته یوه جونګړه کښې په ناست دي. مزې به کوي. حرام يې د برکتلی دي»

ډاکټر ډانیل دی ورځو کښې د یو طبي کتاب تصنیف کولو کښې مشغول وو. او زه د ما سپخین وخت کښې د لندن یو هسپتال ته دی ده یاره تلی وم چه د ده یاره یو څو یادا شتونو د هغه هسپتال په کتب خانه کښې ولیکم. راتلو کښې م یو اخبار لاري کښې اخستی وو. د هغه اخبار یوې سرخي ته م کوته ونیوله او دا خبره م د کړه.

ډاکټر ډانیل د شا یو ګلاس را واخستو. یو کوټ يې وکړو او بیا يې ووېل. عجیبه خبره ده چه ته ددې تر اسرار هستی چه اخبارا تو وال ورته برقعه پوش ډاکو وائي ذکر کوے ګټیاي. خیر هر څه چه دي. زه هم تن ماښام دالے دی بانډ عوز کوم ګټیایم. ربښتیا خبره خو دا ده چه یو عیار سړی ذی» ما ورته ووېل. "صاحبه! عیار خو دی ته نه وائي. یو ښاندار هوټل ته داخل شي. یو تن ته طمانچه ونیسي او څیز تر ینه واخلي. دا بهادري نه ده! او بیا یو مے میاشتے کښې د ے ځله لاندې بانډ هم داسې ي وکړه او صفا بچ شه. دا عقلمندي نه ده؟» ما چه ده ته عقلمند ووېل ځما خیال دی چه په دے کښې هېڅ هم مبالغه نه وه. ولی چه دغه نا معلوم ډاکو به فقط د ریښمو یوه برقعه په مخ اچوله چه هغه به د سپینو زرو په شان زلګیده. لیکن د دے برقعے په وجه سړی به د ده شخصیت یو داسے رنګ اختیار کړو چه هیچا به بیا پیژاندې نه شو. هو. دا ضرور چه پولس ته به د ده قدرې زیات حال معلوم وو. او اخبارا تو وَ نه کړو.

خیر ډاکټر ډانیل د شراب جام میز باند کېښود. لاس نې ي ډاکټري جبه کښې ننه ایستل. او بیا ي ووېل چه ګډ ته سړي دا او دا يې چه دوه او دوه څلور دي نو دا خبره به ظاهر کښې ډېره معمولي معلومېږي. لیکن حقیقت دا دی چه........ ناسا پېږي خبره بدله کړه. چه" هغه د یادښتي مونږه یو څو میلمنو ته ډډ وۍ کړي

وه؟ زه موسکی شوم او ورته مې ووېل چه صاحب! دا خو د ډېرو لوډو خبره نه ده. ځکه دا ده په ملازمت کښې دده میاشتې تېرې شوې دي لېکن دې په شپه او ورځ د خپل کتاب په تصنیف کښې مشغول وو. او هیڅ پاسره یې بېدل کړل نه کول. او دا د تعجب خبره ده چه په دې تېره هفته کښې د مې تقریبه بر خو دوستان را دعوت کړل. یارانې یې وکړه بیایې ما ته وکړل او داسې ګویا شه چه "د زړه نو له حاله خو خدائے پاک نه خبر دې لېکن ځما په خیال کښې تا ته له دې پارټۍ نه پس هم خوشحالي حاصله شوې ده. او د دې وجه دا ده چه په هغې کښې کارډووا هم شامله شوې وه. ولې چه دا یوه سبا نسته جنۍ وه او زه پوهېږم چه هغې ستا په زړه اثر غورزولې دې." دا خبره خو پېره دروغ ده. ولې چه دا ځما خوښه نه شوې وه. په حیثیت د یوې ګډېدونکې جنۍ دا ټول یورپ کښې مشهوره وه او د "مارکوپس هوټل" والو د ناچ د مظاهرې دپاره لندن ته رابللې وه. او کومه ورځ چه ځونږ به مېنځ کښې دا خبرې کېدې هم په دې تاریخ د دې آخري ناچ به مارکوپس هوټل کښې مقرر شوې وو.

ډاکټر صاحب خبرو خبرو کښې او ووېل چه د مارکوپس هوټل ناچ خو ملتوي شه. ګم ازکم دا چه کارډووا به هغه کښې شامله نه شي. ما ووېل چه ښه! دا خبر ښتیا دې؟ دا خو د دې آخري تماشه وه. ډاکټر صاحب د دې په ښنے جواب مختصر الفاظو کښې راکړو چه نن صبا د ګرامنو نو زمانه نه ده. او بیا یې ما ته اشاره وکړه چه ما پسې راځه. زه ورپسې شوم او مونږ دواړه یوې پورتنۍ کمرې ته ورو ختو. څه ګورم چه بستره کښې یو بالښت باندې کارډووا سر لګولې دي. بې هوشه پرته ده. خولې یې وازه ده. او نرې نرې ساه اخلي. سرته یې یوه خدمتګاره چه نرس ورته وائي ناسته ده. زه ډېر حېران ودرېدم او خوله مې د چرشو هغې نرس علي غونده ډاکټرته ووېل چه حالت کښې هیڅ تبدیلي راغلې نه ده. ډاکټر صاحب متعجب شه او ګوتې یې د کارډووا په نبض باندې کېښودې. بیا روان شه او هغې نرس ته یې هدایت اوکړو چه یو ساعت پس بیا هم د ستر کنین انجکشن ورکړه. او د هغې له نتیجې مې خبر کړه. زما په زړه کښې قسم قسم سوالونه پیدا کېدل. زړه کښې مې ووېل چه یا خدایا! دا کارډووا دلته کښې څرنګه راغله؟ او د بې هوشۍ سبب به یې څه وي؟ او د ډاکټر رافیل څرنګه مېنځ کښې را پرېوته. لېکن دا ټول سوالونه مې په زړه کښې وساتل او په خوله مې هیڅ هم ونه وېل. یو منټ پس ډاکټر رافیل په خپله ووېل چه "کپتان وېل به د ډرنګ ساعت کښې راشي او شاید چه څه خبر هم راولي" زړه کښې مې ووېل چه دا نوم خو ما چرته اورېدلے وو. او بیا راته یاد شه چه د ډاکټر صاحب په پارټۍ کښې یو سړی

راغلی وو. چه د هغه نوم سټيفن ويل وو. او داسی معلوميده چه کاروړو وا سره د ده خاص تعلق دی ځکه
يا رملی کښ ځای په ځای دا خبره کيده چه بر دوه ورځے کښ به د دې بنګله او خاوند شي. زما په نظر کښ دي
ډېر ښه سړي راتلو او ما دی ډېر خوش قسمته ګڼړلو. ډاکټر بيا خبره شروع کړه چه نن ما بيام کپتان ويل په
خپل موټر کښ کاروړو وا ار اوسته. کاروړو وا په لنډن کښ يو ډيرے عونډ کوے کښ ډيره وه. د ښځو او د شپږو
بجو مېنځ کښ چه دی هالته ورسيده نو دا يو ځے بيهوشه پرته وه او هغه ښکاره ئې چرته باهر ته وتلې وه
مسټر ويل چيل ډاکټر ته ټيليفون وکړه. ليکن هيڅ ځواب ورنه کړو. نو ما دوباره يې ځما ډېر علاج کړه. دا يقين
دې چه د ښځې حالت خراب دی او کوم وخت چه ما وليده دا بالکل بيهوشه پرته وه" ما تپوس وکړو چه
وجه ئې څه ده؟ او حالت ئې ډېر خطرناک خو نه دی؟ ده ويل چه حال خوئې ډېر خراب دی. ليکن که
خدائے پاک ته منظوره وه موږ به يې علاج په ډېر کوشش سره وکړو او اميد دی چه زر به ښه شي. ګمان م دا دی
چه چا د بيهوشۍ دارو ورکړی دی. ما دا هم معلومه کړه چه د هغې د وائی نوم په ډاکټرۍ کښ بولو کښ "پري
نهراکسين" ليکلی دی. په سيال حالت کښ بالکل د شرابو په شان معلوميږي. ليکن که د سړی په څرمنې
د هغې داغ ولګي. نو هغه داغ بيا نه منځا وکيږي. د دی په شونډو هم ما د دی قسم يو داغ وليده او ما ته ټول
حال معلوم شه" ما ورته وويل چه ستاسی څه خيال دی؟ دا کار چا کړی دی. ؟ راپيل وويل چه کپتان
ويل ما ته ويلي وه چه کوم وخت زه ور غلم نو يو نوکر کښ م يو سړي تر نظر شه. خو ما نه پيژاند وه. او د پيژاندلو
م کوشش هم ونه کړو او چيله حاله خبر نه وم" اوس چه دا په هوش شي نو اميد دی چه ټول حال به ووائي.
ليکن کيدی شي که هيڅ هم حال ونه وائي. ممکن ده چه دے ځيله دا دارو خوړلے دی. کپتان ويل ما سره وعده
کړې ده چه زه به د هغه نا معلوم سړي تحقيق وکړم." د دی مېنځ کښ کپتان ويل هم راغی او د ده په څهره
کښ د پريشانۍ نښې ښکارندے ليدے شوے. د کاروړو وا په بابت کښ يې له ډاکټر نه تپوس وکړو. ډاکټر
ورته وويل چه اوس پوره خو يې حالت کښ څه فرق راغلی نه دی ليکن حالت يې بد شوی هم نه دی. څه
پته دِ ولګوله؟ کپتان ويل ورته ځواب ورکړو چه تر هيڅه را ته معلوم نه شو. د هغه مکان له ګاونډ وم
هم تحقيق وکړو. ليکن هغوی هم څوک تلو راتلو کښ نه دی ليدلی. مشکل دا دا چه ګيرته زه هغه سړي
بيا ووينم نو به يې نه پيژنم. ما رکويس هوټل والو ته م خبر ورکړو چه نن ما بيام کاروړو وا د تلی نه شي.

نو تفصیل به ئې قصداً پرېښود."

ډاکټر صاحب د دې په ځواب کښې دا ووئېل چه ډېر ښه دې وکړل. لیکن کېدې نه شي چه دا د چا
ته نقصان کار دې نو بيا نو به پولیس ته خبر ورکول ضرور دي. پولیس ته خبر نه ورکول کښې ډېر لوئې نقصان
دې. نو ښکاري چه کار ډېر اووږد نه شي. لیکن زما خیال دې چه د دې حالت ډېر خراب دې سو او زه امید
لرم چه سحر ما ته به دا موږ ته ټول حال اووائي.

کپتان ویل ډېر غمجن معلومیږه او دائې ووئېل "خدائې دې وکړي چه ټول حقیقت ډېر زر معلوم شي."
ډاکټر رانیل بيا په خبره ورشه چه تاسې ته به دا خبره معلومه نه وي چه هغه وخت چه ما له کپتان ویل نه دا وارئیل
چه ده پوهه وکښ يو اجنبي غونډ سړې لیدلې ده. نو زما مازغو کښې دا راغله چه دا اجنبي سړې چرته هغه
برغه پوښ نه دې. ممکنه ده دا خیال زما غلط دي" دې مینځ کښې تاسا په ور لرې شه او بو د نګ غونډ
سړې راننوت سچه په عمر تقریباً د پنځو سوکالو معلومیږه. ډاکټر ته مخاطب شه چه زما خیال دې ډاکټر
رانیل ستاسې نوم دي؟ رانیل سر خوز ولو او بې پروائي سره ئې ووئیل چه زه دی وخت کښې وزګار نه یم
هغه سړې بيا ووئې چه زه خو د ډېر ضروري کار د پاره راغلې یم. ډاکټر رانیل ورته په تندي سره ځواب
ورکړو چه ما تا ته ووئیل چه زه وزګار نه یم. هغه سړې سرتبیت کړ. معافي ئې وغوښتله چه زما هېڅ څنې نه
وو چه زه د لته راغلم. لیکن د ده نه پوهه ځني ده چه د هغې نوم کار ډېر وانې او هغې سره زما دښنې ده. زه هغې سره
لیدل غواړم. کپتان ویل تاسا پر اټوپ کړه او هغه سړې ته ئې ووئیل چه پرون د پنځو او د شپږو بجو مینځ کښې
ته د هغې کړې له ور غلې وې. هغه ووئیل چه زه خو اوس په دې ساعت لندن ته راغلم او چه د هغې کره
ته ور غلم نو څوک ستکاري بي را ته ووئیل چه هغه خونا جوړه ده. او د ډاکټر رانیل زیر علاج ده. نو دې خوا راغلم
د پرون له حاله خو هیڅ خبر نه یم" رانیل ورته ووئې زه ډېر افسوس کوم چه زه تا نه پیژنم. ممکنه ده ستا به
هغې سره دښنې وي. په هر حال ښه به دې کجرته ته خپل نوم او پته لیکلې ما ته راکړي. دائې ورته ووئیل او
ورې ورته لرې کړه. هغه سړې باهر ته ووتو. او په وتو وتو کښې ئې دا ووئیل چه دا خو ډېره ضروري خبره نه ده
زه به بيا تا ته ټیلیفون وکړم. هغه سړې چه لاړو نو ډاکټر رانیل کپتان ویل ته متوجه شو. او ورته ئې
د ویل چه کجرته کار ډېر اووا لږ کوښش به شو (او زه امید کوم چه زر به ښه شي) نو زه به تا ته ټیلیفون کښم

وایم. څما خیال دی چه نه به مارکوپس هوټل کښې ډېره ئې؟ دی نرس ډاکټر پوډنه بالاخانۍ ته وختو او
دیرش ساعت پس چه واپس راغی نو ما ته ئې ووئیل چه زه غواړم نن شپه مارکوپس هوټل ته لاړ شو. دنن شپې ناچ
به ډېر دلچسپ وي. زه متعجب شوم چه په دې کښې د ده څه مطلب دی. لیکن د ده د حکم په تعمیل کښې م ئې دوئیم
منټ کښې موټر راوستلو. چه هوټل ته ورسیدو نو دی تیغ د استقبال کرې ته لاړ او د کپتان ویل پوښتنه ئې وکړه.
هغه کلارک جواب ورکړو چه دی خبر دو. د دې چه فوراً ئې ورته ووئیل چه غالباً تاسې نوم ډاکټر رانیل دی. کپتان ویل
تاسې سره په فون کښې خبرې کړې وې. تاسې دلته کښېنئ. زه د ده منټه کښې هغه راولم. کپتان ویل راتلو او ډاکټر د
په باب پوښتنه وکړه. ډاکټر رانیل ورته ووئیل چه اوس لوړ خولا د ب او بو کښې ده. لیکن زه امید کوم چه صباحي
پورې به ئې طبیعت بحال شي.

کپتان ویل ورته ووئیل. "ډاکټر صاحب! د هغه برقعه پوش ډاکو خیال تر اوسه پورې څما په ماغزو کښې ناست
دی. تاسې به راته کښې کارډوانه د بې هوشۍ دارو ورکولو کښې به د ده څه مدعا وه؟ - په ناچ کهر کښې خلق
ډلې ډلې کېږدېدلې. تاسا په کپتان ویل لوکس ته اشاره وکړه چه ډاکټر صاحب! دا خو هغه سړی نه دی چه تن تاسې ته
راغلی دو او کارډوا سره ئې د ملاقات کولو تاسې ته درخواست کړی و؟ ډاکټر رانیل: سنبه! دا هم هغه سړی دی!
څما خیال دی چه مونږ غلطي کړې ده. مونږ ته بکار وو چه پولس ته مو خبر ورکړې وائې - ماخو د کارډوا د خاطره
دے خبرې ډېر تاکید ونکړو - لیکن حذلئ ده نه کړی کچرته تن شپه کښې څه پیښ شي نو څما د پاره به ډېر لوئ تکلیف وي
په دې وخت کښې مونږ د تمه بو. کچرته نن شپه کښې برقعه پوش ډاکو څه قسم شرارت کول غواړي نو زه امید کوم بلکه
یقین لرم چه له مونږ نه به خلاص نه شي." کپتان ویل ووئیل چه شبده که نه - او بیا د خپلو دوستانو سره شامل شه -
زه او ډاکټر رانیل هم تماشه کولو کښې مشغول شو. ولې چه د دې وخت کښې ناچ شروع شوی وو. او ساز و نغرې ډېل ماته
به د کارډوا هغه تصویر رایاد پدو چه دا په کټ کښې بې هوشه پرته وه. او بوه نرس ئې سرته ناسته وه. او د دې وجه غالباً
دا وه چه اکثر خلق ناچ کهر ته په دې خیال راغلي وو چه نن به د کارډوا ناچ وي. خبر نه وو چه دا خو هسپتال کښې ناجوړه
پرته ده او د دے په ځائې به بوه بله جنۍ ناچ کوي. بو نیم ساعت پس د ناچ کهر څوا او ښا کښې بجلیانې مړې شوے او تکه توره
تیاره شوه. له دې نه به زړونو کښې یو شک پیدا شه او هر سړي خپل زړه کښې سوچ کولو چه د دے به څه وجه وي؟ د وئ
په دے سوچ کښې وو چه د هال ډیوے هم مړې شوے او د مخه له هیبته چپه چپائی شوه. په دې کښې یوے ښځې کړے

او بیا چپ شوه. ناسا په هغه تیاره کښې چا تاپه چل کړه. او نو دنو ري يو خوا او بل خوا ورشني وغورځوله. بيا ئې ډزا کیږ، ام د هغه سړي په لاس کښې طمانچه هم ولیده. يو وړوکوي غوندې آواز م تر غوږ شو چې برقع پوش ډاکو راښوتی دی". په دې وخت کښې يو ډيوه څنګله غارې نه د هېرو جميل د شلوار. د غلې ښځې دي جړا وکړئ د شو کول. او بيا ئې يکدم د يو دو تيمې ښځې غاړې ته لاس ور او نيږدې کړه. او د هغې هر غلو لړې ئې ترينه واخيستوله. هغه ښځه مونږ نه وړه د څنګ دلورې نا ستې وه. د دې د پاره ما د هغه سړي لاس د تاج په شخله کښې په نښه وجهه ولیده. د ډاپ رڼا روشنی بنده شوه. او تیاره کښې ود ود کسو د پېږو زوه نښت پښې م تر غوږ شوه. ډاکټر رافیل ورمنډه کړه او زه هم ورپسې په صفحه کښې ووه د دې تجونه برانه وو. هغه خبر شو چې ورانګرېږو. خو خان مو سنبهالولو نو دے مېنځ کښې ډيوې بيابله شوه. برقع پوش په وخولا تیاره وه چې پېښې وې وا ښخه او هغه بل کس به ورته باندې ستونستم پروت وو. چې دا پاسېده نو يو ه غلط خو چپ چاپ ولاړه وو. او بيا ئې ووئيل چې هغه شیطان کم خوالا په؟ (دا آواز د کپتان ویل وو) که تاسې يو منټ انتظار کولی نو مونږ به هغه د سورلې لاندې کړی وو." زه يوه نه شوم چې ډاکټر رافیل څه ځواب ورکړے وے چې په هال کښې زبردست شور ووه. او خلق يو بل نه مخ کښې کيده چې له هال نه ووځي لیکن حقیقت دا وو چې برقع پوش ډاکو خپل کار کړی وو.

کپتان ویل مونږ سره د ډاکټر رافیل تر کوره پورې لاړ. رافیل د خپلې لائبرېرۍ ورلورے کړو. مونږ ته ئې ووئيل چې تاسې دلته کښینئ. زه څو منټه کښې واپس راځم. چې ما ستر ګې پورته کړې نو د انګلستان مخ کښې هم هغه ډنګ سړی ولاړ وو چې خپل نوم ئې بيکلو نه ئې انکار کړی وو. او بيا ئې مونږ سره خبرې شروع کړې چې زه خو بيا راغلم او دا م يوڅ پېښ کړی دی چې کار ډېر ووا او نه د ئېم تو هغه پورې به د دے سنبهرنه لاړ نه شم. ډاکټر رافیل راغئ تو هغه ته ئې ووئيل چې زه يو خو ورځو د پاره د دے سنبهرنه ځم. او شايد بد وي. چې يو ځل کار ډېر ووا سره کوم. ډاکټر رافیل ورته ووئيل چې ته يو ورځ له دوه ورځو له پاتې کيدی نه شې؟ هغه ووئيل چې نه. زه به نن د شپې په ګاډي کښې ضرور ځم. ډاکټر رافیل ورته ووئي صبر وکړه. ته يوه ګهنټه روستو مارکوپس هوټل کښې نه وے؟ او کپتان ويل ته ئې مخ راوړو لو چې تا ئې تا ليدلی وو. کپتان ویل په اثبات کښې ځواب ورکړ. هغه اجنبي ووئيل که زه هلته موجود وم نو ستا ئې پرځه! ډاکټر رافیل او خندل او ورته ئې ووئيل چې زه به تا ته يوه دلچسپه خبره واورم. نن شپه مارکوپس هوټل کښې يو سړي چې هغه نه برقع پوش وائي کاميابي سره بيا لوټ مار کړې او دا د ده څلورم حمله ده. هغه سړي ووئيل چې د دے خبرې کار ډېر ووا

سره څه تعلق دی؟ ډاکټر رائیل وویل "ممکنه ده چه د دې واقعې کاروونو سره تعلق دی. داخو تا ته معلومه
ده چه کاروونو ته چا د بېهوشۍ دارو ورکړی دی. دا کیدې شي چه دا برقعه پوش د دې له دستانو وي. او هغه په خپل
ژبه کښې مقرره کړې وي. چه زه به ما کوټې ته داخل کښې دا که غور زدم. ولې چه دا مونږ ته د ده د پاره پوره نادره او
زړین موقعه وه. نو ده به کاروونو ته ویلي وي چه تاسو خوم حال د ده بیلو لیکن بل هیڅ ته دا حال مه دایه. هغې به
دا ته ویلي دي چه له ما نه دا امید مکوه چه زه به ستا پر ده پټې وکړم. نو به دې پوره شو؟" هغه سړي سر وخوځاوه
او ډاکټر رائیل خپله خبره جاري وساتله "د کاروونو دا عادت دي چه د پنځو او د شپږو د بجو ترمینځ د ښار له
بو کلاس څښي. چونکه هغه سړي به خیال زړه کښې دا فیصله کړې وي چه د دې زبان بندي کول بکار دي. نو ده به
د ښار بو کلاس کښې هغه د واکې چه ډاکټري نوم ي "ایرې نهراکسین" دې پوځو قطرې ملا کړې دي. او دا به
پر پوره شو به هم نه وي. لیکن بیا به د ده به زړه کښې دا ویره پیدا شوې دي چه ممکنه ده د دوائي مقدار له ما نه
زیات شوی دي. او مهلک اثر پیدا کړي. صبا ته به ما باندې د قتل الزام راشي. نو د دې خبرې هم بند ترپ بکار وي.
نه پوره شو؟" نو هغه بیا سر وخوځاوه. ډاکټر رائیل بیا وویل. "فرض کړه چه هغه سړي هم دلته موجود دی. او
دا معلومول غواړي. چه کاروونو به څو ګهنټې پس په هوش کښې راشي او په دې کښې د ده دا مطلب دی چه
پرو مني لا دې نه چه کاروونو د بیان ورکولو شي دی له دې ځایه نه پنبے وباسي" دای وویل او ګهنټي ي وکړه
و د بیرې شه او نرس را ننوته. رائیل ورته وویل چه مونږ تیار یو. او بیا هغه اجنبي ته مخاطب شه چه ستا به زړه کښې
به ضرور دا خیال راغلی دي چه ما دا څرنګه معلومه کړه چه کاروونو ته د بېهوشۍ دارو ورکوونکي هغه برقعه پوش
دي. نو په دې به د زړه پوره کړم. د ایرې نهراکسین دا خاصیت دی چه د انسان په جسم ولګي نو هغه ځای باندې
سور داغ مخښنه پریږدي. چه د هغې لرې کول ډېر مشکل وي. نن په هوټل کښې کوم وخت چه برقعه پوش ډاکو خپل
لاس را اوچت کړ او د ده د تیلې شخړه له غاړې نه ي د مرغلرو حمیل وښکلو نو ما ولیده چه د هغه پر ګوته باندې یو سور داغ
دی. د دې چا په نظر کښې به دا یوه معمولي خبره وه لیکن ما د ډاکټرۍ په برکت سره دا معلومه کړه چه دا د "ایرې
نهراکسین" داغ دی او هم دغه قسم داغ د یو سړي په لاس باندې هم په دې کمره کښې ما لیدلی وو."

تماسا به وړلږ شه. څه ګورم چه کاروونو د نرس په اوږو باندې تکیه کړې دی او مخامخ ولاړه ده
رائیل موسکی شه چه زه به ډېر خوشحالي سره د دې خبرې اظهار کوم چه هر کله مونږ هوټل ته روانیدو

هغه نه دے. خلور گهنټې اول کار دوه دا په هوش شوي وه او ماته ي ټول حقيقت بيان کړي وو. ما د اخبار په ذريعه پښتنو رسالو. او هيڅ ته م حال نه ويلو. صرف پوليس ته م خبر ورکړ. او س م کار دوه وا دي دا ده پاره راوغوښتل چه دا هغه سړي وپيژني. دا ي ووېل او هغه اجنبي سړي ته مخ را واړوه چه سارجنټ صاحب! د اجنبي قيدي سنبهال کړه. دا ده خولا خبره په خوله کښ وه چه هغه تنګ سړي له جيب نه هتکړي را وايستې او کپتان بل ي پهښنګ ته لو. چه ده ده لاس ي واخيستل تو ډير ورو ي خيال. د مرغلرو يوه لړۍ. پوحوړه جړاو کنګڼ او د سپينو زرو په رنګ د ريښمو يوه بوتۍ د هغه د جيبو نه را وايستل او مخامخ ميز باندي کيښودل.

ډاکټر راميل کپتان ويل ته مخاطب شه. ستا خيال وو چه کچرته ي په خپله کار دوه وا دي لاځے ته راوټم. تو هيڅوک به په ما باندې ارتکاب جرم شبه و نه کړي. او کچرته ستا به دے کچه کوته باند د معمولي غونه د غه نه و دے نو دير ه ممکنه وه چه ستا دا فريب به بالکل کامياب شوے وے. ځياي وخند ل او سارجنټ ته ي ووېل. ته تا هم خپل فرض په ډير ښے طريقے سره پوره کړ. ليکن چه دا سړي تهانړي ته روان کړے نو به دے خبرے ي شه پوره کړه چه "ايري تهراکسين" يو خطرناک څيز دي.

محمد اسحق د کلاچي

دخند اګلونه

(۱) وائي چه يو زميندار ي بهوره ورځ د کر د پاره پټي ته تلو. خو د باران د لاس به نامراده بيرته راتلو يوه ورځي غوايان خو پټي ته وشړل او پخپله تخم ي واخست او په کنده کنده روان شو. دخدائ شان وو. چه څه وخت دي پټي ته ورسيده شو اسمان بيا اوګړېد و. ده او وي چه زه د مه چوره خو کوم له نه خو م تر زندنۍ له خم.

(۲) يو کور ته يو ميلمه نه سپوره دوه ډوډي کيښوده. کورکښ ي غوا ولاړه وه ميلمه نيوس او کړه چه دا غوا

حسن خپل، دواړه لاسونه د ډېر محبت نه د مور د غاړې نه تاو کړه. او وې ویل، موري! یو ورځ ماته پلار ویلي وو چه ښځې ډېرې کمزورې دله او توهم پرستې وي که څه هم لږ غوندې خیال د دوي په زړه کښ راشي نو هغې نه ډېر اهمیت ورکوي. حالانکه داسې کول نه دي پکار. ولې چه بعضې مصیبتونه او تکلیفونه د خدای د طرف نه راځي او انساني طاقت د هغې د رفع کولو نه قاصر دي. موري که یده نه مني نو زه پښتنه کولی شم چه کم خیال ته دومره پریشانه کړې یې!

مور د حسن مخ ښکول کړه او دې ویل. وړوکي حسن شپږ میاشتې اوشوې چه ستا پلار میدان کارزار ته تللی دي په دې موده کښ د هغه صرف دوه خطه د خیر خیریت راغلي دي. نن دریم میاشت ده چه د هغوي خیریت نامه نه ده راغلې. خدای خبر چه د هغه به څه حالت وي. دا خیال دي چه زه یې پریشانه کړې یم.

حسن .... موري! هغه صرف دا او ویل چه یو فوجي جرنیل کوټه کښ داخل شو. هغه معززې بي بي ته د ممتاز بیګم په نوم اواز اوکړو. د هغه اواز ډېر دردناک وو.

جرنیل - محترمې بي بي! زه د یو ډېر رنجیده او منحوس خبر د اورولو د پاره ستا په خدمت کښ حاضر شوی یم......

دې نه پس جرنیل چپ شه -

ممتاز بیګم - محترم جرنیل! ماته زر او وایه چه د حسن د پلار څه حال دي؟

جرنیل - اوه، افسوس، چه د کم ناخوشګوار او دلخراش نوعیت اطلاع د پاره زه د وزارت حربیه د طرف نه حاضر شوی یم. هغه دا دی چه لفټیننټ ممتاز پرون په میدان کارزار کښ د خپل شجاعت پوره ثبوت ورکړو او......شهید شو -

د جرنیل دا ویل وو چه ممتاز بیګم بې هوشه په مزکه پریوتله. جرنیل زر طبي امداد طلب کړه.

لږ ساعت پس چه ممتاز بیګم په هوش شوه نو حسن چه تر اوسه پورې حیران و پریشان ولاړ وو. مور ته یې او ویل چه مه ګبراوېږه. زما پلار بهادر وو. وطن پرور وو. غیور وو. هغوي د خپل غیرت ثبوت ورکړو. د کافرانو او د ازادۍ وطن د دشمنانو برخلاف یې جهاد اوکړو. او د خدای په لار کښ یې خپل خوږ ځان په ډېر بهادرۍ او دلیرۍ سره قربان کړو. هغه ژوندي دي او قیامت پورې به ژوندي وي. زمونږ نسلونه به د هغه نوم په عزت و احترام سره اخلي او د هغه په قبر به ګلونه ږدي. موري قرآن پاک کښ راغلي

دی چه شهید شوي دي څومره په شان خوري سکي. او باڼ زندګي تېروي او ته چه جاري لږ دغه باڼ روح ته تکلیف ورکوي.

ځما زړګیه او ولې بچیه ته درست وائې لېکن افسوس چه ته ځوان يې او په میدان کارزار کښې د دښمن مظلوم پلار د وینو بدله د وحشیانو یونانیانو نه اغستلې وې. ستا ترمخه یونانیانو په سر پرتیږه ته لکه د شیر په شان په فوج کښې ورګډ شوې وې. د دښمن صفونه دې ماتول او فتح کامیابي ستا تر مونږه خکولو له او دوره یونانیانو ګلونه لوستل. کاش چه ځما د خواهش پوره کولو د پاره نن ځما بهادر ځوی عاطف ژوندی وي.

حسن چه د مور دا خبرې واورېدې نو په جوش کښې راغی. د لبونی زمري په شان اوچت شو او وې ویل چه خیر او شو چه نن ځما دور عاطف نشته او زه کم عمر یم. قسم دې ځما په هغه خدای چه مونږ کښې اسمانونه یې پیدا کړي دي. چه عزت ورکونکي دي او ذلت ورکونکي دي. قسم دې ځما په دین د مصطفیٰ چا چه ګمراه خلقو ته تبلیغ لاره او خوره او په یو ساعت کښې یې قیصران د تخت سلطنت مالکان کړل. قسم دې ځما د مجاهدینو په هغه ټوره چه د باطل مقابله کښې د تیکو ندرا او زي او د دنیا نقشه بدله کړي چه په میدان کارزار کښې به د خپل مظلوم پلار د خون بدله اخلم او ملک و ملت به د یونانیانو د ښکاریانو نه بچ کوم.

حسن د جوش نه زلک وهلو او دغه په زګوټونو د وینو سند زمزمونه وو. او د سترګو نه یې سټلی ختلې. هغه مور ته نږدې شو او وې ویل چه مورې چه ما ته د میدان جنګ ته تللو اجازت راکړه. او س ماله په دې کور کښې اوسېدل حرام دي.

عمزده بي بي خپله خوله د حسن په خولصورت مخ باندې کېښوده او وې ویل بچیه حسن ته لا اوس ماشوم یې د توپک د تورې بوجه نه شې زغملې.

حسن او ویل مورې دا ته څه وائې؟ په منږه کړی ته لاړو او د کړي نه یې توره توپک را واغستل او په سپاهانه انداز کښې اوچت کړل بهر ته راغی او په خپل دواړو لاسونو یې توره د تیکی نه بهر کړه او وې ویل چه قسم م د پیرب وي چه دا توره به تیکی ته نه ځي دا به اوس په میدان کارزار کښې د یونانیانو په سرونو باندې د قضا د تندر په شان پرتیږي. هغه د لرې نه مور ته سلام او کړو او باهر

نه او نه غلبیدو. دَ دې نه پس دَ هغه هیڅ پته او نه لګېده چې چرته لاړه.
جنګ ختم شو. ترکو نو بیا لوټ بونه هیر یدونکي شکست ورکړو. ترک سمر نا کښې راننوزي دَ خوشحالی
سرو دونه غګیږي دَ فوځ په مخ کښې یو نوځوان روان دې دَ شکل و شباهت نه معلومیږي چې دَ
دغه فوځ جرنیل دې. ترکانو دَ خوشحالی نعرې وهلې. دَ بومکان په چت باندې یوې بي بي ماسته ده.
تور لباس یې اغوستې دو. فوځ کښې بې اختیاره دَ خوشحالی نه چغه شوه. **معصوم غازي**
حسن بے. **زنده باد**. معلوم شوه چې دَ فوځ مخکښې راتلونکی نوجوان **حسن** دې چې قوم
ورله دَ هغه دَ خدماتو په صله کښې **دَ حسن بے خطاب** ورکړې دې.

ترجمه

شمس الحق دَ دویم کال نوشهروي

(د قلمه د سید شمس الدین خان مجروح)

اے حلیمه! د وطن دا ته پکار یې
ز دایل د مغرب ګکرې کوره غوره
کوره تیر نه شي له خپله نام و ننګه
د راتلونکي نسل پلاره دایم ته نه
رحمت کښه، بود باد سه مدام ته نه
د ژوندون ساته ویره شوله ګرانه
په دنیا کښې اول توره بیا قلم دي
د دوستانو سره ګل شه او ګل د سه
ښانه ده خاوره شي به دې خیره معموره

کړنن خوې یې، د راتلونکي نسل پلار یې
تربیته نه خیږونه وا خله د زړه سره
چې پیاله وا نخلې تښنه له فرنګه!
د خپل پلار نیکه به نوم دې کوړ سانه
د هغې دین ساته نظر کښې وسنو قام ته
کوره نه شي جد وجهد کښې ستوما نه
چا چې کړه راتلینګ دا د واړه کاړکې هم کړي
د دښمن سره اغزي غند تل وسه
نکړ تیز او قلم تیز او تیره توره

عام وتن کښی له هرځا ځني بې سرشه
زړتي هم کوزه نشته په لباس کښی!
د افراط دا اوسي تهذيب بلا ده!
هم تفريط نشته څمونږه په آئين کښی!

دجبل په کاروبار ځني خبرشه
دعرفان بيبنه مشعل واخله لاس کښی
چه دنيا په دې غضب ن مبتلا ده
منع دې رهبانيت څمونږ دين کښی،

ځان دې سانه لهغه له دې چه خاله
چه وا نوړي له ځادې دا عند الله

(از رساله کابل)

دَ دُنيا په مخ

(له قلمه دَ هد ايت الله)

(۱) دُنيا کښی داسې بني آدم هم شته چه دَ بوبل غوښه خوري. دَ چين بُلبُل قتلوي چه په نصاب يادشي. د رورونيه سکې چه مشهور شي. دَ ځاکناه جوندون اخلي. چه بهادري ده.

دَ دُنيا په مخ آدمي قصبان هم شته!

(۲) داسې هم شته چه دُنيا کښی اوسيار دي. څمونږ دَ سرا ومال محافظ دي. دی غرض دَ پاره پوليس ساتي. اَو دے دَ پاره جيل خانې جوړوي. دوي موږ ته ځان ته اوسيار روائي. اوځمونږ شاهان دي. مګر معنوي ځکه شاهان دي چه دَ زړګونو وينه څکلې شي. ځکه زور اوردي چه بے ګناه وينه بهوي. ددوي دَ ابو پښان ښکې. چه وينه دَ ابو په شان او ښکې. کولے جوړيګي چه سرے غلبيل شي. بم جوړيګي چه ملکونه تباه شي. دوک مارکوزي چه جهاز ډوب شي.

دَ دُنيا په شراب مست او ښيار ان هم شته!

(۳) په ناز پاللي داسې هم دي چه در په درخا ورے په سر دي دَ کولوشه ګما ردي. اودَ دوي سروي پردې وطن دي او په دوي دَ مرګ سختئ وي اوځ ميدان دي. اودَ دوي وينه پرے لګه سيلاب

جهيکي۔

دَ دُنيا په مخ په ويښو رنګ مظلومان هم شته.

(۴) ورپيدې خيال دُنيا کښې ګرزي چې ګل دے او ګلزار دے چمن دَ دوی دنيا کښې دے او دوي چمن دنيا کښې دے۔ دَ خيال نړال وي دَ دوي پرے ځانګل وي دوي دا نه کوري چې نور دُنيا هم شته۔ يا دنيا کښې نور هم څه شته۔

دَ دُنيا په مخ دَ دُنيا سودايان هم شته.

(۵) دُنيا دَ نازخانې نه ده۔ په خپل مخ داسې خوبان هم ساتي چې پرے دَ مظلومانو زړونه سوري کوي قدم په ناز داسې اخلي چې څه رنګ به دَ عاشق زړه قلم شي دُنيا دَ ظالمان کورده اودَ مظلومان هم کور دے۔ دُنيا دَ حُسن سودا کوي۔ مګر دَ حُسن سوداګر نه ده۔

دنيا سره دَ حُسن سامان هم شته!

(۶) دنيا کې دَ ناز دَ خريدار هم نکه ده۔ چې دَ زړه په ويښو مست وي۔ دَ دوی دنيا کښې صرف حُسن دي۔ او حُسن دَ دوي دنيا ده۔ دَ دوي خيال کښې دنيا ټوله دَ حُسن عاشقه ده حُسن په قتلونو نه مړيږي او مقتولان په شهادت نه مړيږي۔ الغرض دَ حُسن ميدان دَ کربلا ميدان دے

دَ دُنيا دَ حسن حُسن پرستان هم شته!

(۷) دَ دُنيا ګټ کښې داسې هم شته۔ چې دُنيا کښې بے دُنيا وي۔ دُنيا کښې اوسي او دَ دُنيا نه پردي دُنيا ته په سترګو ګوري او ليدل يې نه غواړي۔ لوګے او سندي پرے تيريږي۔ دَ دوی سترګو کښې سترګے وي۔ او دَ خدائے سترګے وي۔ دَ دوي دُنيا کښې خدائے وي۔ او خدائے دَ دوي دنيا وي۔

دې دُنيا کښې دَ خدائے بندګان هم شته!

Mirgi—Is a difficult term to define, so comprehensive it is. May be applied good-humouredly to one who crops up where his presence is not particularly desired.

* * *

A Solecism a day keeps the Grammarian Away :

Two young men were travelling in a train. They talked much, and talked in English In the hand of each was a copy of the renowned book 'Angrezi Bol Chal.'

'Have you got exchange for a five-rupee note ?' asked one of them presently.

'Yes, perhaps. Why do you require it ?'

'I want to pay for this magazine' and he pointed to one in the hand of a vendor outside. 'He wants a rupee for it.'

'No, don't have it. He is discharging you more than the real price.'

We later found that both were cousins and descendents, in the indirect line, of the late Mrs. Melaprop.

ABDUL RASHEED ABRAHAM.
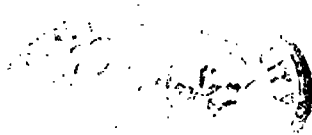
to grant you peace in this world as in the next. And go on saying 'Amen' until the bore slips away.

★ ★ ★

So far we could see a crescent moon only in the sky or on flags. It has remained as high as the heavens or, at least, as high as the mast. But times have changed—what was high is low, and what was low is high now, and thus 'old order hath changed yielding place to new, and God fulfils Himself in many ways.' One such fulfilment has been provided through the agency of our College. Go and walk along the hedge of the swimming bath. Seek and ye shall find a crescent, a beautiful semi-circular crescent lying in the dust in company of flowers and what is more curious, teapots, cups, trays, spades, diamonds, clubs, hearts, and the like, earthly bodies. Flowers have grown in it and grass around it and it seems it has been lying there for ages.

The sight of such a crescent reminds one only too painfully of the Muslim glory that was and is no more. This crescent in the dust symbolises the downfall of Islam. May not also the flowers that now sprout from within it, symbolise a reawakening and a new life for that great faith.

★ ★ ★

War goes on and prices are soaring up on all sides No shop dealer or businessman is there to whom you go twice in the week and he tells you not that the price of this thing has gone up by 10 per cent and of that by 5 per cent. One could appreciate their reasons for it. But now every body, affected or not by the war in Europe, is busy raising his charges.

So much so that the washermen too have increased their rates. I wondered. At last one day I arraiged my washerman. 'Why do you ask for higher rates now?' I asked him.

"Sir," he replied, "it is all due to the 'lam' (war). The prices of our raw-materials have gone up, what can we do."

I still wondered. 'But your raw material is supplied by us,' I said.

This was a disconcerting news to his vague mind. 'Sir, I don't know, but so it is. And so it must be.'

★ ★ ★

Some definitions :

Senior—Is a student whose love and loyalty towards his college is great. The college benefits more from him than he from the college. Men may come and men may go but he is here for ever.

Classic—Is a brown, worm-eaten volume in your shelf on which at least an inch of dust has settled.

Mashrot—In him selflessness and sacrifice are uppermost. No function, party or gathering in the college but he would offer, required or not, himself as a steward.

On the New Year's Day, a long and broad sheet of paper in gay colours was seen early pasted on the New Hostel Notice Board. A closer view told that it was the New Year's Honours List, "issued with the Imperial authority and under the Royal Seal" (which was a thumb print) of the Senior Monitor. Some extracts from it might be of interest.—It began :

His Imperial Majesty 'Ascham III. . .King of New Hostel, Emperor of Bearer's Cells, Baths and Latrines beyond the Rooms. . .is hereby pleased, this first day of the year of our Lord Nineteen forty, in consultation with his Royal Cabinet, to inflict the following honours upon. . .the chosen few of his subjects, who by virtue of their ignoble services to the state and self, and conspicuous abnormality in themselves, have most fitly deserved to be honoured thus. . .

A long list of titles with the names of their recipients followed. Some of the more interesting titles were : K.C.O.M. (Knight Commander of the Order of Mashrots); G.C.S.I. (Grand Cross of Dyspepsia and Indigestion); S.O.C.C. (Star of the Order of Gallantry and Chivalry); C.O.G. (Companion of the Order of Ghotoos); M.P.P.T. (Mirgi of the Ping-Pong Table); E.S.E. (Eternal Spare Eaters): Medal-i-Gana Bajana; Shams-us-Saltanat; C.B. (Chilm Bahadur) and C.C.M. (Chal Chaloon Matwali).

We take this opportunity of congratulating all who have been honoured thus.

The progress of civilisation has led to one thing if to nothing else : a horrible increase in the number of bores in society. Somebody comes to you, conveniently seats himself in a chair even if you don't offer it, begins to give you the benefit of his talk or, if you can be so cruelly unresponsive, at least, the pleasure of his company. Courtesy won't allow you to ask him to go out, etiquette demands that you should listen to him, good manners require that you should not study while the bore is with you. So what are you to do ? You cannot go out, you cannot take up a book, you cannot indulge in your own thoughts. The case seems hopeless.

But they say where there is a will, there is a way. Men of genius have found out remedies. Let me offer you one prescription; it may serve you whenever you suffer from a bore.

When the bore settles himself on a chair, begin to polish your shoes and go on until you exhaust all your pairs and have even repolished some. However take care to exclude the bore's shoes. If the mild odour of polish has failed to unhinge him, begin pouring oil and spirit into your stove and if he enquires 'are you going to cook something,' answer 'no, I just want to warm my room up.' If this weapon also fails, you had better begin shaving and prolong the process until you are assured of having struck at the very root of hair, and of having saved a week's shavings. If even the dirty sight of shaving does not succeed in dislodging him, your last weapon is to dust and sweep your room. Surely this will wake the bore to the value of his presence and the pains of getting his leave. However if this too fail, make an ablution and pray aloud to God to rid you of all curses and pestilences, and

unambitious. Serve it would humanity undoubtedly but it has a weakness—it loves to be in the company of men and women, and it wants to show to the world its glorious parts of which it is truly proud. It has therefore chosen to remain of short stature—so short indeed that you must, if you want to know the time, come to its very foot where it may see you and you may see it. So if you have sometimes to take the trouble of coming to the Science Laboratories or the Cricket Lawn, the two places it has fixed on as the most convenient for an interview, you should not foam and fret. It will reward your watches

When this year we received the College Diary in its burning red and glittering gold cover, I had to pause a moment satisfying my sense of beauty before I peered inside. However now not my aesthetic but 'mathematic' sense was delighted, for the worthy compiler had, after giving a list of the staff, proceeded to arrange their names in all possible permutations and combinations. Intermediate students should benefit much from such a practical illustration and would be well-advised to use the diary as a supplement to Dil's Algebra. Was it an exclusive love of the permanent. or was it a zeal for economy, one cannot say, that the student-officers' names were only gingerly allowed to intrude. Indeed students 'come' and students 'go' and every year brings a new stock, why spend so much space and ink for their temporary sake. Only the 'remain-for-evers' be included, for it may save the next year's compositors' wages.

One of our English professors recently noticed that whereas previously it was the custom with the day scholars to come late by some minutes for the first period, now the hostellers outdid them. He waited for some days to see if matters would improve. At last one morning he bade one stop at the door.

"Why," he asked in scholastic anger, "why do you daily come late to the class ? Can't you start earlier ?"

"Excuse me, Sir," said the panting student and with another apology began to unlace his shoes.

"What do you mean?" demanded the professor.

"Simply this, Sir," replied he, continuing the unlacing." We don't start late, we start even earlier now, but we must walk on the ground, and the pathways from our hostel leading to the college have been, of late, so thickly carpeted with concrete that with each step we are verily buried into the ground. We try to hurry up but we are ever the worse for it." And saying this he emptied his shoe of a basketful of concrete.

"This is strange," the professor was pleased to say half-comically. "But how has this carpetting come into being."

There was a silence and the professor was going to resume calling the roll when a voice said, "The cobblers recommended it, Sir."

Once my hostess was a beautiful young damsel. My guide was on leave one day, when I made up my mind to visit Mapusa. I crossed the gulf of Panjim by a steamer. Fortunately I met a gentleman from the Punjab aboard the ship. We were talking and longing for our native dishes, when a young damsel who had been sitting beside us, began to look at us. It was discovered, later on that she had followed whatever we said in our native language. She asked me if we were from North India, and were longing for our native dishes. She could talk in English as well. Later on we came to know that her brother was a P. W. Inspector in the North Western Railway. She invited us to a dinner of our native dishes, saying that she could prepare Pulao (spiced rice), Zarda (saffroned rice) Prathas and other dainty dishes. In spite of our persistent refusal we were taken to her bungalow in a couple of hours. My friend had to leave as he had an appointment in Aldona, so he left us. Now I was alone, a foreigner among strangers. I tried my level best to take my leave, but it was not she who was my hostess, but her whole family who insisted on my staying on. She prepared all delicious dishes with her own hands and sat by me at the table. She left no stone unturned towards the entertainment of a little known guest. It was not she only who was proud of her guest, but her whole family. I wanted to take leave of them, but they were not willing to let me go; every day I begged for leave and they put it off. On the fifth day, my guide met me on the harbour and I left to the displeasure of my hostess.

I would like to add that there is no corruption, no treachery, no theft in Goa. Most of the houses are without locks. My room in a hotel, lying on the main road of Nova-Goa, was always left unlocked, although it was well furnished. The day I alighted at that hotel I asked the Manager for a lock, when he said to me "this is not British India, where one is not safe even with locks. No locks are needed here, this is the abode of Peace founded by Vasco-da-gama."

ABDUR RAHMAN MALIK.

FROM THE COLLEGE CLOCK TOWER

Our College Clock-Tower is, let me inform you, quite different and distinct from the innumerable clock-towers all over the world. It is unique and unparalleled. This may sound a bold statement but nevertheless it is true. You would naturally ask what makes our beloved clock-tower stand out so conspicuously out of the rest. Excuse me if I correct you; it does not **stand out** but it **sits down** amongst all of its tribe. Other clock-towers rise so high into the sky that you may read the time while furlongs or even miles away so that often you do not know where the clock-tower stands or what it looks like. Our clock-tower is not so unsociable or

without a guide, as there were very few English-knowing people there. So I hired the services of a young man, Mr. Francis, who guided me throughout my stay in Portuguese India.

I met different people in different cities of different grades, studied them and shared my experiences with them. The language spoken by the natives is Kokni, which resembles Telegu and Tamil to some extent, but the official language and the language of the ruling nation is Portuguese; they do not like English. As to their religion, all of the natives are Roman Catholic Christians. You can hardly find any church belonging to the Protestants. All are ascetics; they love one another and are hospitable. They are happy and are metaphorically speaking lotus eaters. They like the Hindus, welcome the Muslims and accommodate the followers of any other faith. They believe they are sons of the same father, Adam—they take great pains to ensure others' pleasure; they are saints. There is no exaggeration if I call them true disciples of Christ. They are ignorant of cheating. You mock at them, make fool of them, they won't mind. Anger among them have been overpowered by their ascetic faith. I remember when I was at Panjim, a town where natural beauty abounds, that afternoon sight of the beach with most beautiful human faces, in latest western fashion was very charming. There were men and ladies, young and old, all busy in their enjoyment, free from the cares and anxieties of the world; all danced to the natural soft music, which was produced by the movement of the sea breezes. The breakers at the shore also appeared to be musical.

In order to gain information of their social life I visited various hotels, restaurants and families. One thing common among them, one of their necessities like food for the nourishment of the body was wine. Men, women, young or old, rich or poor, all partook of wine in the evening—it was a dilemma for me. I could not understand it; for in spite of their taking liquors, they were pious. and escetical and led innocent lives.

It will not be out of place to mention an interview I had with an official of the rank of Chief Commissioner. It was morning when I along with my guide went out to see the Chief Commissioner. I was very fond of chatting to Portuguese people. I enquired of one of the policemen on duty at the Republica Square for the Chief Commissioner's office. He accompanied us to the office, and the Chief Commissioner granted me an interview. Before I began to talk, after the customary salutation, I was invited to partake of tea, fruits and cigarettes and our discussion began. It lasted for fifty minutes. When I came out of his office, to my surprise the policeman who had guided us was at the door. He enquired if he could do any other service. I thanked him, and invited him to tea at my hotel. The policeman who had been so beneficent to me at once became red with anger. He rejected my request and told me that he being a Portuguese was not addicted to bribery. I told him that it was not a bribe, but I desired to have tea with a saint like him. He did not agree, yet he accepted my invitation for some other time. I invited him to tea the next day; we had two hours' discussion. Next morning I received an invitation to dinner from that very gentleman. I sat among his family members at the dinner table. Their delicious dishes and delicate table talk, were wonderful !

The normal time that a steamer takes to reach Goa under favourable circumstances is thirty-six hours. Unfortunately, thirty-two hours had elapsed, when we reached Ratnagiri, where most of the passengers disembarked and the cargo was unloaded. The steamer restarted. It had not gone far, when it was caught by a heavy storm. The people on deck found themselves in a ridiculous condition; they were being rolled forward and backward by the swing of the ship. Destruction began to stare us in the face; terrible despair began to settle upon us. A few of us went to the captain with the request that he should signal for succour. Our request was rejected, yet he anchored in a place where the water was not very deep. We waited and waited long not less than thirty hours, in the rough sea. The ocean became calm again and our ship moved. I remember how I went short of my rations especially cigarettes, as the whole stock in the stall had been practically consumed, and I had reluctantly to borrow cigarettes from my neighbour.

Next evening a dim light appeared. This assured us that we were near the expected harbour. It was eight o'clock in the evening when the steamer whistled its arrival to the people on land. A motor launch of Goanese officials approached us soon, but we were not permitted to land, as it was too late and the Medical officer and the Custom Appraiser were unable to inspect us. What could we do? We had to wait for a full night. In the morning the Goanese officials inspected us and our goods and gave us permission to land.

My luggage was disinfected, and was forwarded to the customs authorities. The customs officer in broken English, enquired of me whether my luggage was duty free. They are truthful and they demand truth from others; they are gentlemen and regard others as gentlemen; they are sincere and want others to be sincere; they will believe you even though you may not believe them; they regard others as brothers.

I had one box with my luggage, which was packed with brand new articles that I had bought from Bombay. I informed the officer on duty that these things I had to take back to British India in a month or two. According to the law, I should either have paid the duty or deposited the articles with them until my return. I agreed to take the latter course, and deposited the box in their godowns. I waited for the receipt of my box. As they did not deliver any, I was obliged to ask for it. The officer told me that there was no receipt and that I could go. I again asked for it and informed him of the practice in British India that whatever is deposited with the authorities, a receipt is always issued for it. On hearing this he at once got up from the chair in an angry mood and said, "Don't you trust me, my office and the Portuguese Government?" He told me that my luggage would be lying there safe and sound and that I could take it back at any time. What else could I do? I agreed; I could not protest; it was a foreign government.

I went to the Marma-goa harbour railway station and purchased a ticket for Margao one of the neighbouring districts of their capital Nova-goa.

I alighted at the Hotel de-Republica, which was the finest modern hotel there. Here I learnt that I could not enjoy my visit to that place

Although there was nothing objectionable in the letter, yet there was a mention of love which we had borne and cherished for each other. Perhaps that brought tears to my eyes.

Mazhar broke the silence by saying "Happily or unhappily this (pointing towards the letter) came into my hands. I opened it and read it and then handed it over to her. It made her shed copious tears. She continued to sob and I feared lest it might break her heart. I asked her whether she did in fact love you, but she continued sobbing. At last she confessed that she had been in love with you before her marriage and that her love was the cause of her being given away in marriage so soon. I gave her whatever consolation my words could give. And now I have come to you straight on this same errand.

"I regret profoundly and heartily having unconsciously married a girl who had a genuine love for some one else. Still more unfortunate is the fact that she appears to have been forced by her parents to marry against her will. I would have never done this gross injustice to your love, had I known of it before. But I repeat that I was ignorant of it. We have been put into this quagmire at the hands of the demon custom. I have begun to take interest in your life. I will never forget you and will be writing to you now and then. You would realize, that I am quite innocent in the matter. And I am sure that it is as much in your interest as it is essential for the happiness of her you loved that you should not write to her any more. For my part, I promise that I will not bear any ill-will or grudge against her or you for this past love." I hung down my head and said in a very low but audible voice, "It is in the interest of all concerned to hush it up and never to say a word more about it. My lips will be sealed about this part of life. I will never take any step that goes to mar her happiness."

The drizzle had stopped. The sky was clear; but still there were clouds moving about. Birds had come out of their nests and were wheeling round in the sky. We made for the hostel. My younger brother was standing in the door and was looking for us. Mazhar thanked me for my hospitality and I bade him good-bye.

M. A. H.

Through the Portuguese India

Yama was in an angry mood; a voyage, especially coastal, was risky. The steamer was expected in a couple of days, I booked a cabin in advance. We sailed in the steamer "Parbhawati." Most of us cast a longing glance over the Princess Docks, which were over-crowded with lovely faces, that waved farewell to their departing friends.

the husband of the girl I had once loved with all my heart. I had seen him for the first time at his marriage.

I did all that was possible to make him feel quite at home and entertained him as best as I could for her sake. After a good deal of talk about the College and current political topics, he expressed a desire to go round the College. I placed myself immediately at his service. Something in me was forcing me to let slip no opportunity of entertaining him. I led him along different roads of the College, and named the different buildings and places we passed by. "This is Osmania Hostel, that is Principal's bungalow, over there is college cricket ground and so on."

But my guest seemed to be quite indifferent and it struck me as if he had no interest in whatever I was mentioning. He was completely lost in thought. Having completed our round, we were returning to my room when Mazhar asked me to sit down with him for a few minutes in a lawn, a few steps from the road. I agreed readily and we made for it. There Mazhar looked me in the face and at the same time put his hand into the inner pocket of his coat. I was in a state of suspense. He took out a letter from his pocket and handed it over to me. On the sight of it I turned pale. I felt as if I was shivering all through my body and the blood in my veins had frozen. I could not help betraying my inmost feelings. Mazhar turned his eyes away from me. Perhaps he noticed the state of agony in which I was. He said to me with a faint smile on his lips "This is your letter I suppose. Is it not your hand? Don't you recognise it?" I was silent. I felt as if I had committed a great crime and was being required to confess it. Again there was a volley of questions. He went on asking questions vehemently and looking upon me in a sympathetic manner as if pitying my sad condition. He stopped asking questions and making inquiries. For a few moments there was complete silence. It was too late for me now to deny that the letter was mine. There were tears in my eyes.

We were sitting on green grass among flower-beds. A butterfly was flitting from one flower to another. The weather was very pleasant. It began to drizzle. But we remained sitting. It was my letter, addressed to my love and ran as follows :—

My dear Iris,

Now that you have been married to another person despite your love for me, I think it my duty to write to you. Your parents did not act in accordance with your wishes and desires, nor did they have any regard for your future happiness. It is a tragedy for us both to have to tread such divergent paths in life. Yet society wanted it. We were helpless in this respect. Cursed be society and its detestable ways! We could not do anything but to resign to Fate.

The object of my writing to you is that you should forget me completely, and that my memories should not haunt your mind any longer. I have no desire in any way to stand in the path of your future happiness.

Prove yourself to be a true and dutiful wife. This is my last request. Adieu!

Yours Ever,
M. A. H.

as 'Hypo.' Here the unreacted silver salts are dissolved. This process is known as 'Fixing.' After 'fixing,' the plate can be taken out in the ordinary light. It is washed again with water and dried in a shady place. Here you will find a strange phenomenon in the negative. The white objects would appear black and vice-versa. Thus a man with white trousers would appear to be wearing black ones.

After retouching the plate, which can only be learnt after a good deal of practice, prints are made from the image of the negative over a paper coated with light sensitive materials. The negative and the paper are placed in contact with one another and then exposed to light. The selection of the right grade of the printing paper for a particular negative in hand demands considerable practical experience. Afterwards the print is fixed in the same way as the negative. By this process the image is again reversed and thus we obtain a true copy of the object. The finished image is black and white in colours. Some people prefer other colours. For this purpose the print is washed with other chemicals to obtain the desired shade.

Nowadays tri-colour protography is gaining popularity and the scenes produced by this process are in themselves a source of inspiration. Here the object is seen in its natural colours which lend a tone of reality to the photograph. Many a picture thus produced is so enchantingly rich in colours and full of subtle and delicate effect that a mere glance at them thrills ones imagination and the onlooker himself becomes a part of the picture admiring the exactness of the process and wondering whether anything more amazing can still be added to this line.

KHWAJA NASIR AHMAD.

"Cursed be the social wants that sin against the strength of youth"

TENNYSON.

It was a morning in March. The sky was overcast with clouds. I was reading a very interesting novel and was wholly absorbed in it. I was wondering whether it would be a tragedy or a comedy.

Suddenly there was a knock at the door. I turned my eyes towards the door for an instant and again went on. There was another knock—I put the book on the table and opened the door. It was Mazhar. I was not expecting a visitor and was rather surprised to see him. Mazhar was a graduate of Allahabad University. He was pretty fair in complexion and had very refined manners. He was very smartly dressed and spoke English quite fluently. He occupied a very important place in my heart as he was

Journal of Photography in 1868 and 1871 respectively. In 1880, George Eastman succeeded in bringing the new type of plate in the market.

The manufacture of photographic sensitive materials is a very specialised industry. Approximately 40,000 people are employed in it throughout the world, about 20,000 being engaged in the manufacture of materials sensitive to light, the remainder in the manufacture of cameras and in the wholesale distribution of the products to the retailers. The manufacture of photographic goods is carried on with specially designed machinery. Over 5 000,000 lbs. of cotton are used each year for the manufacture of films and over three tons of pure silver are used each week.

Photographic plates, films or papers are coated with an emulsion containing light-sensitive silver salts. The preparation of this emulsion requires high technique and it is carried out under the supervision of experts. Firms of repute always engage a number of chemists to discover new ways and means to improve their products.

The photographic plate or film is placed in the camera with the emulsion side turned towards the lens. It is then exposed for a moment to the action of light. For snapshots it is always better to keep the sun at one's back, but sometimes anti-light pictures also produce good effect. The matter of exposure requires some practical experience as it is dependent upon the time and place where an object is photographed. It is only after a number of photographs have been taken under varied conditions that one learns correct exposure. Another factor which deserves careful attention is the background of the object. It should be fairly uniform and preferably out of focus for then the object stands out quite distinct and clear. If the object is a human face then it is better to study it properly before pressing the button of your camera. A wise photographer will make the object feel at home and would study it from various angles before exposing the plate. For, human face is a very delicate object and even a slight expression of strangeness would spoil the picture. When it is seen from different angles it presents different models, some of them pleasing and others not. Try to study your friend's face and you will find that each twist of his head gives you a different model. In portraiture, it is advisable from the artistic viewpoint that the object should appear 'camera unconscious.' How distracting it is to find every picture in your album staring at you !

After proper exposure, which can only be learnt by practical experience, the plate is taken to a dark room and there it is developed in red light. But the Panchromatic plates are sensitive even to these rays, therefore they are developed either in perfect darkness or in a very dim green light. Of all the developers, I find the following to be the most satisfactory, as it can be readily prepared at home and gives good results under varying conditions of exposure. It consists of one part of diamidophenol hydto-chloride mixed with three parts of sodium sulphate. To it sufficient water is added to obtain a clear solution. The negative is immersed in it with the emulsion side upwards. After a short while, the latent image begins to appear over it. When the negative has properly darkened, it is taken out of the developer, washed with water and then transferred into another dish containing a solution of Sodium Thiosulphate, commonly known

fact that the movements performed in infinitesimally small fraction of time, of the order of 1|300,000 part of a second, have been successfully recorded. For example, the winking of an eye, the bursting of a bubble, the flight of a bullet through the nozzle of a gun and the flash of lightning have been photographed successfully. So it would not be too much to say that no motion, however swift it may be, can escape the eye of the camera. But this is only one aspect of modern photography. Let us consider its other achievements.

The size of the object or its distance from the camera are no longer reckoned to be factors of any great importance. With a telephoto lens attached to our camera we need not worry how distant the object is. Thus, objects at a distance of seven miles have been successfully photographed with a remarkable degree of accuracy and detail. It may be argued that fog or haze prevailing in the space might interfere with the picture. Well! the question is quite reasonable and an inquisitive mind should naturally seek a plausible answer to it. The objects which we see emit light-waves composed of the colours of spectra. The mist or fog acts as a barrier to the rays of colours except the red. The infra red rays have the wonderful property of penetrating the prevailing haze and so they reach the camera eye. Here a red filter attached in front of the lens filters away all rays (except the red) which act upon the photographic plate to give the image of the object. This is known as Infra-red Photography. In fact it is only the camera eye behind a red filter which discerns so many things obscure from our naked eye. Only such things have made aerial photography a success. Thus we see that modern photography has conquered distance. And what about the size ? The Microphotography reveals nature at its best. Here the tiny living organisms have been magnified tens of thousands of times and a record of the various states of their development made which is in fact a boon to the Biologist. But it has not over-looked the Chemist. To him it gives a clue of the structure of compounds whose crystals exposed to X-rays are seen through the camera eye. It brings with it the secrets of the unfathomed depths of the sea. In fact Photography has many diversified uses and multiple applications.

It was in 1727, that a German Professor of Medicine Johann Heinch Schultze discovered that silver nitrate when exposed to sunlight turns dark. Like so many other great discoveries, it remained quite unnoticed for more than half a century, until in 1792, Thomas Wedgwood, an English Chemist, suggested the use to which the discovery could be put. Fate, however, condemned him to a short life and he died at the age of 34 of an incurable disease. Thomas Wedgwood was followed by many other experimenters who also contributed something towards this subject. Among them William Henry Fox Talbot who invented the Colloiden process is worthy of mention. Doubtless this process was a milestone in the history of photography; but it was inconvenient also, because for each picture the photographer had to prepare a fresh plate. As there was no other alternative, the photographer of that time had to be content with it. It was used for full 20 years until the advent of gelatine dry plates which revolutionized the whole photographic industry. It is usual to attribute the invention of gelatine dry plates to Dr. R. L. Maddox and W. H. Harrison. Their papers appeared in the British

course, he was experimenting whether Newton was right in propounding his famous theory of gravitation. But whereas Newton could not experiment upon himself this man, to show that he was greater than Newton even, took the duty of sacrificing himself upon the altar of science. He had to remain in 'bed' for two months and was daily entertained with fruits and flowers! The theory of gravitation has duly passed into a law for the alma mater since that day. One of his relatives, it was reported to me, ascribed this "lunatic" step to his abnormal dose of 'charas' or 'bung' or both. He takes great pride in being called a Napoleon. He has made many un-Napoleanic adventures. He is always trying to increase his height. When a tall man stands by him, he will stand on his toes to show that he is equally tall. Once he hazarded his life for his height craze. It was suggested to him that by hanging his body in a loop from a tree he would add several inches to his actual height. This experiment was unfortunately cut short by the untimely arrival of a friend who had the audacity to cut the rope. He feels elated when the famous proverb that tall men are fools and short ones wise is repeated in his presence. He is extremely careful about his health. He reads all the rag-tag on health that he can lay his hands on. But strangely enough he never takes exercise. He believes that by reading hygienic literature, without taking any exercise, you can improve your health. A marvellous discovery for "bookworms"!

Many are familiar with the tall slim figure of Mr. S. He has 'gandum-goon' (wheatish) complexion. Many think him too proud and therefore avoid him. But his friends know him better, and stick to him. He is voluble in familiar and friendly society but dumb in the presence of a stranger. He is frank with his friends. Once he was going on a walk with some friends. A 'firstie' passed by without greetings. He sprang forward, stood in front of the 'firstie' and said at the top of his voice, "Permit me, sir, to salute you!" The firstie went away crestfallen. Perhaps our friend was practising the lesson in courtesy he had learnt some time in the hall. He has Utopian ideas which he wants to spread in the world. He wants to demolish aristocracy but thinks of marrying an aristocrat lady. Perhaps he wants to bring a new aristocratic class into the world—a wild hope!

SOJOURNER.'

PHOTOGRAPHY

Modern Photography has achieved such a high degree of perfection that it would be a bold speculation to anticipate further modifications or improvements. It has become an accomplished art. Highly powerful lenses and extremely sensitive plates have greatly enhanced the utility of a camera; so much so that it can be used practically in any light or weather condition. With the aid of ultra Rapid Photography we are in a position to record the swiftest possible movements. It may appear surprising; yet it is a

H is the superman of our social circle. A true Nietsche and a practical one, he combines the rare qualities of the will-to-power and superhumanity. A Gandhi in mind, a Hitler in outlook, he acts the dictator to everyone. He would go on inundating his friends with his advice about dogs and cats and perhaps, sugar canes. It is unhappy to record that these gems of advice are lavished to no purpose for, when one acts upon them, he forgets his own self and proves a miserable failure. Last year he experimented upon me. I was a monitor. He advised me to do this and to avoid that. When I posed the dictator (as directed) in the dining hall, I displeased many and was involved in quarrels with not a few. From that day, I respect his advice but do not put it into practice.

Unfortunately he is a chemist too. Once he was experimenting with Hydrochloric Acid in his room. Perhaps he was on the eve of making an addition to human knowledge. After the lapse of a few hours we found him lying senseless with the room filled with the obnoxious fumes of the acid. Through a mischance the world was deprived of the benefits of a great discovery—a discovery which would have thrown Faraday's into the background. He is a dramatist, a novelist, a scientist, and an agriculturist. He wears simple clothes. It is commonly believed that a man at the end of his college career comes out a complete 'Farangi' but our friend has outrageously falsified this dictum.

Who does not know the Bolshevik? He is always discoursing on the application of justice and truth to every-day life. He is an idealist and brings his idealism into practical life. A strict follower of Karl Marx, he wants to put into practice his theories. His Jewish descent is a source of perennial trouble to the Hitler of the second Hostel and may one day result in his expulsion from the Khyber Colony. Unlike a Bolshevik he has started a Zionist movement in the college to fight 'Hitler.' Hitler too is repelling him with **ruse contra ruse.**

It is his devout wish that if he could attain to power, he would take the proverbial 'cat' of the 'dambaro largai' and break it over the heads of the dissenters or 'munafiqs' as he calls them. It is strange to note that he would break the rod rather than the heads of those who receive its shock. He has a strange liking for the 'dambaro largai'. He winces against injustice and oppression. He was a great reactionary once and the leader of the oppressed (he calls them 'depressed') classes. It is a wonder how he shook off that disease. Perhaps it has dislodged itself from his head to his heart. He himself occasionally wonders at his metamorphosis from a statesman to a passionate lover. It is a problem for the medical profession on which hangs the fate of not only Europe but the whole world. If the dictators in Europe suffer from the same mania of reaction against democracy, we might hope to see them normal men again only if they fall in love. It has been boldly asserted that Hitler's mania can be cured by marriage, which must be forced upon him if the Allies win the war.

The colony of Newfoundland wonders at the shambling gait of this second Napoleon. They falsely attribute it, in quite a Brutus-like spirit, to his 'great fall.' "What a fall was there, my countrymen!" all cried as he came springing through the air from the upper storey to terra-firma. Of

HOCKEY.—As many as nine out of the Hockey Eleven are fresh recruits, mostly from the first year class. Some of them had not got over their "stage fright" when the University tournaments came on. Now, however, they seem to be settling down and we hope that the team as a whole will give a good account of itself next autumn. Habibullah of our team was selected for the Frontier XI which represented the province in the All-India Hockey Championship at Bombay.

★ ★ ★

CRICKET.—Since cricket is not played in Frontier schools, those who come to join us after their matriculation are absolutely 'raw.' Their training naturally involves a good deal of exertion on the part of the Superintendent and the Captain. With all this, our team made a good start by beating the Khalsa College, Amritsar. But want of experience stood in their way of further progress towards the University finals. Hamid is making Herculean efforts to produce a good team and we wish him all success.

★ ★ ★

ATHLETICS.—Last year our old rivals of the Edwards College had beaten us hollow in the Inter-College Sports Competition; but this year we succeeded in winning the Relay Race shield rather easily. In our annual meet with the King's Regiment, we reversed our defeat of the last year into a convincing "win."

—★—

H_2CS....

Dear reader! Do not be startled. I am not going to enter into dry calculations of either mathematics or organic chemistry. Our store of mathematical knowledge is already staggeringly large. There have been Newtons and Liebnitz's and Einsteins. I am not going to bedim their refulgence by going beyond their mathematical researches. They have already made mathematics too difficult. Those students to whom mathematics has ever been a bug-bear will be at one with me in insisting that no further researches should be made in this branch of science.

I am also not going to add to the baffling formulae of organic chemistry. To a chemist the title signifies Carbon, Sulphur and two Hydrogen atoms but in reality they do not stand for any such things. That leaves us, without doubt, in the belief that we are not going to have 'closed chains.' I have had enough of these 'closed' and 'open' chains to be troubled by them any more.

The chain in the title stands for a chain of friends who were attracted to each other by their peculiar qualities. The qualities they have in common do not concern us. Their characteristic virtues, however, are enumerated below :—

Then, you are on the way to become a sportsman.

As a spectator :

1. Do you refuse to cheer good play of your opponents ?
2. Do you boo the umpire when he gives a decision you don't like ?
3. Do you want to see your side win if it does not deserve to ?
4. Do you quarrel with spectators for backing the other side ?

Then you are no sportsman. Try to become one.

SPORTS NOTES

We have no long list of "wins" to our credit in the sphere of sports this year. But we need not be apologetic on that score. As chance would have it, most of our best players passed out of the College after the last University Examinations, and teams had to be recruited from new-comers. These raw men had to be trained and practised as 'players' within a period of two months; and the new captains and Superintendents did their best to turn out fairly presentable teams. If in spite of our efforts, we have not been able to register 'wins' in the major games, we need not be unduly pessimistic over our "failure." "We did our best, and that is all that one can do."

The Principal continues to take keen interest in the physical well-being of all students. He has taken steps to ensure that as many students as possible take part in regular games, and that sporting activities are continued throughout the year. We are no longer going to be content with just one show-team in each game, but are determined never again to fall victims to the conspiracy of circumstances as this year.

Above all, emphasis will continue to be laid on the cultivation of a spirit of true "sportsmanship." While we shall welcome good players from schools, we shall do nothing in any way likely to encourage the deplorable tendency towards "professionalism" visible in some quarters. We hope that the institution of inter-hostel tournaments will bring out even the most confirmed "crammers" out of their 'purdahs' and induce them to participate in these competitions for the honour of their hostels.

★ ★ ★

FOOTBALL.—The captain Sher Zaman left us in the middle of the term to take up a post in the Police force of the province. He has been succeeded by Wadud. We hope that his efforts will produce better results on the field of sport than they seem to have done on the academic side.

sound coming from? Over the table, under the table, under my bed, behind the book-shelves,—nowhere could I find anybody. But the sound was ceaselessly coming and no doubt it was in my room. At last when I had almost given up the quest, I found that somebody under the box, which was lying just in the centre of the room, was responsible for all this hue and cry. I raised the box and to my astonishment found my shoe lying under it.

I decided to place my shoes at their respective places, but this was also tiresome. One lay in one corner, another under the table, a third one on the box,—under my bed, on the carpet, in the almirah—everywhere shoes lay scattered. "Had I a servant" I thought to myself, "I would be saved all this trouble." But unluckily I couldn't find a servant at that hour.

I had done with my garments and my shoes, so I thought of arranging other misplaced articles too. This again took lot of time. My socks lay in the pockets of coats and trousers, in my bed, under my pillow, on the window sill. My books, oh! they were scattered all over, there was not a single place where they had not stationed themselves. To arrange my chairs and tables, was again an uphill task. They lay exactly in the centre of the room, one over the other. One of my suitcases was lying near the door, another on the table, and the third rested on one side in a corner.

"No less than a lumber room" I thought as small bits of paper danced about the floor. Socks, handkerchiefs, garments, books, shoes, dirty clothes, blankets, pillows, tennis rackets, hockey sticks, all lay helplessly on the floor, together. Gods alone could tend to such a chaos.

'RAHIM.'

ARE YOU A SPORTSMAN ?

As a player :

1. Do you play the Game for the Game's sake ?
2. Do you play for your team and not for yourself ?
3. Do you carry out your captain's orders without question and criticism?
4. Do you accept the Umpire's decision absolutely?
5. Do you win without swank and lose without grousing ?
6. Would you rather lose than do anything which you are not sure is fair ?

of tungstan, which received current from a distant power house by means of chemically smelted and electrically refined copper wires.

Thus in our life we are indebted to chemistry in a number of ways, for the air we breathe, the water and other liquids we drink, the food we eat, the medicines we use, the clothes and shoes we wear, the articles we handle, and the various processes we employ.

PARSHOTAM LAL SHARMA,
B.Sc. Student.

MY ROOM

"Shut up, or I'll smash your brains out." Horrified at the sound I pricked my ears, pulled my blanket over my head and began to listen. The nearness of danger frightened me terribly. I trembled like a leaf.

Who could it be, to come into my room at such a late hour ? Had the intruder any bad intentions ? Did he want to murder me or murder some one else in my room? Many such questions rose in my mind but I could find no satisfactory answer to them.

Slowly I began to regain my senses. "There is no harm in seeing who the intruder is," I thought to myself.

Noiselessly I peeped through a fold of the blanket, and was startled out of my wits when I beheld a most miraculous scene. My short coat was all red with anger. My uniform coat, too, was in a fit of rage. With piercing eyes, they were staring at each other. I lay quiet wondering what would come next. The two old enemies were just at the point of running at each other's throats, when my grey-bearded old over-coat stepped up.

"What's the quarrel about, young chaps ?" it questioned.

"The rascal," my short coat, was saying, "has been making advances to my wife the 'pant.' And on my protesting against this disgraceful behaviour of his he is picking up a quarrel with me." The situation was crystal clear. My carelessness had brought these long parted enemies face to face that night. They lay like two warriors on the carpet, surrounded by my shirts, pyjamas, tennis rackets, hockey sticks, shoes and books.

I thanked God that the shirts had not quarrelled over the pyjamas as yet. I rose, picked up my garments and hung them at their proper places.

But this didn't avert the crisis; the god of rest was asleep. Hardly had I done with my garments, when the sound of a pathetic moan fell on my ears. It seemed as if some one was in great pain. I cursed my lot, "Shall I have no rest to-night?" I rose again to see what mystery awaited revelation. But now another problem stared me in the face. Where was the

heat treatment, the Bessemer and open hearth processes of the manufacture of steel of the springs, and the marvellous alloys which render the movement immune to cold and heat.

I stepped from the bed, whose fibres had been chemically treated and dyed with synthetic dyes, and the quilt whose calico had undergone the chemical process of mordanting.

With slippers of artificial leather I went to the kitchen and brought some water for shaving, and shaved with a scientifically prepared soap and razor. After this I went to the bathroom, and filled the tub with water, which had been purified at Bara by the chemical processes of distillation, and decantation, and carried for many miles through lead pipes made under chemical control. The cleansing action of soap, the antiseptic dentifrice and the tooth brush of bakelite afforded chemical luxuries.

The day had scarcely started but I was already indebted to chemistry in a number of ways.

When after taking my bath, I returned to my room and looked round it, I had before my eyes paints used in the pictures on the wall, the decorations, the mirror before which I combed and dressed, the clothes and shoes I wore, and all these told of long centuries of chemical progress.

Next I came downstairs and sat down to breakfast. The table linen and China dishes told the fascinating stories of the chemist's art, and the chapatis of wheat reminded me of the fertilizers used by the scientists for the production of better crops. After tea I entered my study, picked up my books made of chemically manufactured paper printed with chemically prepared ink, from plates electrolytically deposited from a chemical bath; bound and stamped with machinery, the various parts of which had been produced by chemical process.

As I went towards my cycle, I beheld in it a number of chemical triumphs. I paddled my cycle and went to the college over a pavement of concrete and portland cement, a chemical product. The bricks of the college building reminded me of the ceramic industry working on chemical basis. Placing my cycle in a cycle-stand I entered the class, and sat down on a desk whose metal and woodwork paid tribute to the chemist's art. I began to take down notes of the lecture upon a chemically manufactured paper with a pencil whose lead had undergone several chemical processes.

After the college hours, I paddled my cycle again and came back to my house. The odour of the perfume used by ladies in the street, and their rosy cheeks showed their indebtedness to chemistry for all their embellishments.

In the evening I went to the cinema, and while the picture was moving I was thinking of the art of photography, and its various stages, exposure, developing and fixing, etc., which made the moving picture entertainment possible.

As I came back to my house, and entered my room, I pressed a switch, flooding the room with light from gas filled bulb containing filaments

And why should not this blessing, the ladder to success, be given celebrity ? Full of so many virtues, why should it not be taught and learnt in educational institutions ? It is really unfortunate, to find not a single society or organisation of the votaries of lying on the surface of this 'luke-warm bullet,' while thousands are springing up like mushrooms for other purposes. Neither the Government nor the "Artistic liars" themselves have paid attention to this duty of extreme importance. It is a pity, of course ! Yet they need not worry, for there is still time to organise themselves and popularise this fine Art by holding meetings and conferences. As it is not easy to learn this art, without undergoing a laborious process, much less to gain a mastery over it, it is desirable that training schools and colleges should be opened in every nook and corner of the world to produce "Bachelors of Lying." Its study should be more systematised. Trained and universally recognised liars should be appointed to coach the budding liars, who aspire to "make their lives sublime." This noble task should be specially commenced in India as soon as possible, because she lags behind in point of modern enlightenment and prosperity. Propaganda, exaggeration, tricks and various other kinds of lying should be imparted to the aspiring young ones to win the best results with the least amount of effort. Those who can escape detection, by telling lies, with ease and grace should be awarded certificates and diplomas. Special concessions and encouragement should be given to those, who, specialise in this Art as professional liars. At any rate it needs the special attention of all those, who believe in its miraculous achievements.

Comrades, up ! up ! and begin the noble process of Organization in right earnest. Muster under the banner of "lying", if you want salvation and prosperity in this short span of life. Fight for the removal of truth, which places obstructions in the way of progress and advancement. It matters little, if you lose your dear lives in this struggle, for you are fighting for principles, which are vital and of utmost importance to humanity. Bear in mind, that you would never fail in the achievement of your object, because, "they never fail, who fall in a good cause," and if your strenuous endeavours result in your death, surely you will ever shine in the firmament of the people's memory for your heroic stand for the Prince of Liars.

M. A. SAMAD.

Chemistry in Every-day Life

I went to sleep with a Chemistry book in my hand. I dreamed of Chemistry laboratories. And when I got up in the morning I found Chemistry pervading the whole atmosphere. The glass panes through which the rays of the Sun entered the room were the product of a chemical art, the glass industry. The dial of the watch which attracted my attention next reminded me of the chemical processes by which the dial had been obtained from an oxide of zirconium: the vision of the fiery furnaces,

bark by means of water, when mixed with flax or wool can also serve the purpose of jute.

Shipping :—On our market we have only two shipping companies : the Scindia Steam, India's premier concern, and the Bombay Steam.

There can be no doubt, in any case, about the advantages to be gained from the European war. It is not necessary to go into details but higher freight charges have already been levied for coastal trade, space will be fully occupied and the resultant effect can only be beneficial.

ANAND SWARUP NANDWANI.

IN PRAISE OF LIARS !

It pains me to find that prophets, saints, sages and other God-fearing men have unanimously condemned liars and held them pernicious to human society. The verdict of these good men condemning the liars to eternal doom and worldly failure, has not been clear to me, even after years of cool thinking. It does not hold water when I cast a glance on the modes of living, and the words and deeds of the present-day politicians, administrators, high officials and those at the helm of world affairs.

With full conviction I say that our failures in the educational career and the public-life are mostly due to our inefficiency in the art of lying. Of course, I call it an 'Art.' Those who are capable of delivering emotional speeches, and sentimental orations with a tinge of lie and exaggeration top the list of speakers, and thus triumph over those simple-folk, who are straightforward and truthful, I mean, the unskilled in this art. To-day those countries win the day, whose Radio-announcers have been thoroughly trained in the art of lying and can give wild and fantastic lies a believable shape. It is a matter of personal experience to all of us that school chaps who know some rudimentary processes of this Art, can easily save themselves from the cruel clutches of the "Masterjee." Only those mincompoops fall easy prey to the 'lashes,' who are devoid of ready-made replies to the thundering queries of the teacher. Thus the clever-liars, who are experts in putting on appearances—a long face, drawn lips, wrinkled cheeks, a pull-down mood—have always an advantage over the plain-spoken fools of the former type. Surely in this way the liars can gain access to "the good books" of the teachers.

None can gain favour in the eyes of high officials and authorities—professors, doctors, engineers—without having a complete and thorough knowledge of 'Flattery,' 'the civilized lie.' It is a tough task for those, who obey the dictates of their conscience, to obtain promotion to higher positions through recommendations. They are despised instead of being held in high esteem.

its own as a result of the rumble of the belligerent drums. The largest exporting countries of textile products have already curtailed their activities and have diverted their attention to the production of ammunition. Moreover the actual hostilities around their countries have stopped their normal course of business. But India which is out of the war zone for the time being can carry on her business as usual. With the stoppage of imports from other countries, the Indian Textile Industry can afford to increase its production to the maximum capacity. The entire home market of India will be at its disposal. To crown all, many of the markets in the Middle East and East and South Africa may also have to import cloth from India to fill the gap. At the same time the imports of superior cotton from countries like America may not be possible. African cotton will find its way to India but to a greater extent India will have to depend on its own cotton.

Iron and Steel:—28,39,779 tons of iron-ore were produced by the principal mining companies in Behar and the Eastern States agencies as compared with the net produce of 28,37,998 tons in 1937. The production by the Burmah Corporation Ltd. suffered a great set-back and the produce fell from 25,426 tons in 1937 to 18,050 tons in 1939. Though production in India has practically increased, the net increase is more than offset by the decrease suffered by Burmah. As regards the manufacturing abilities of India it is difficult to make a forecast definitely. Suffice it to say that Tata Steels' capabilities will be fully tested and are likely to baffle the misgivings of the most doleful Jeremiah.

Rubber :—About 1,25,000 acres in South India, chiefly in Travancore, are given over to rubber plantation. Many factories have been started in Bengal, Bombay and United Provinces, but the biggest industrial factories for tyres, foot-wear and industrial rubber products are to be found in Bengal. In the pre-war time the stubborn competitors in rubber industry were the countries of Equatorial region which cannot now export to India cheaply on account of the submarine danger. Therefore India has a good opportunity of increasing her production of shoes and tyres, particularly tyres for bicycles and bullock-carts. The Allies can also exploit India's resources of rubber for armament purposes to her advantage.

Jute :—Although there is a heavy demand for jute sand-bags in the belligerent countries for air raid precautions, the future of Indian jute is problematical. India is the greatest jute producing country in the world and enjoys a complete monopoly in this sphere. But on account of the fear of submarine warfare, India's export to Australia, America, Japan and South American countries will dwindle away. Moreover various countries of Europe are busy in discovering a suitable substitute for jute. Probably the most important of all the substitutes is the rosella hemp fibre from Java which is becoming increasingly popular and the mills manufacturing bags with this fibre are at present worked at full load. The rosella bags are said to be better and cheaper than jute bags and are in good demand. The output is estimated at 2 to 3 million bags and there is every likelihood of the capacity of the existing mills being increased.

A patent for a process for breaking up willow bark has been taken out in Germany. The fibre produced by the Tannic acid extracted from the peeled

intellectually, and physically. It aspires to convert each one of its members into an embodiment of all civic virtues—honesty, integrity, courage and tolerance. It desires to work like the heart in the body of the province, receiving young blood and sending it out to every vein, artery and limb—imbued with its own power and spirit. But great achievements are seldom the product of the moment; they are usually the consummation of a series of efforts on the part of men with a set plan and resolute power. Let our success, small or great, spur us on to still greater efforts. Our work of this year must form only a rung in the ladder leading to still loftier heights.

The Patron of the Union, Dr. O. H. Malik, deserves the sincerest thanks of the Union for the kind and sympathetic interest which he has been taking in the affairs of the Union throughout the session. But for his persistent efforts, the Union Hall would still have stood an unfinished, roofless structure.

—★—

WAR & INDUSTRY

Man is born in other's pain and dies in his own and so is the case with the industrial world of today. Though it is nauseating to make capital out of human suffering, alluring prospects wash off man's callousness. In the last Great War, Japan stole a march over India in industrial competition and our poor country was left stranded on account of its inherent weaknesses. The present European conflagration will be hailed by those economists who foresee India's amelioration in the worsened international situation.

Since the last war India has made a great headway in the race of industrialisation and the time seems ripe to apply the anodyne of war to assuage India's economic ills. Economically India stands to gain in three directions. Firstly, the mitigation of foreign competition and the increased purchases of finished commodities on the Allies' account will give a fillip to industrial expansion. Secondly, the legitimate rise in internal prices will stimulate more production and thereby produce beneficial effects upon the agriculturists and the producers. Lastly, the increased burden on land which is a formidable hurdle in India's agricultural progress will be lightened with the opening of new avenues of employment. It must not be thought, however, that India's future is going to be one of unalloyed gain for industry generally or for individuals. The fate of many industries which are flourishing at the moment will be sealed if the war takes a protracted course. Outstanding benefits accruing to India will come from the improvement of her purchasing power as a result of an increase in our export values and as the inevitable outcome of more employment from the expansion of industry. The altered circumstances will influence industry as follows :—

Textile Industry :—The textile industry—and with it cloth market all over India—which was feeling a burden of heavy stock will come into

This was the first competition of its kind ever held in the N. W. F. Province Considering the proximity of university examinations, the number of entries received was quite satisfactory. Some of the very best speakers from Lahore Colleges took part in the debate and the general standard of speeches delivered was quite high. The trophy was won by the Forman Christian College, Lahore, which was so ably represented by Messrs. Rajbans Krishen and Muhammad Akbar Shah (the latter an old boy of ours). Mr. Rajbans Krishen won the first prize and Mr. Muhammad Afzal of the Islamia College, Lahore, the second prize. The Honourable Malik Khuda Baksh, Speaker of the Frontier Legislative Assembly, Sardar Mohammad Aurangzeb Khan, Leader of the Opposition in the N.-W. F. P. Assembly and Mr. Abdul Qayum Khan, M. L. A. (Central) acted as judges; and Dr. Khan Sahib, ex-Premier gave away the prizes. By instituting this competition the Union has not only paid in its own humble way a well-deserved tribute to the memory of the great founder, but brought young men of different parts of India together at the foot of the historic Khyber Pass, and provided an opportunity to them to know one another more intimately.

The starting of a regular ELOCUTION CLASS was another departure made by the Union from its usual routine of work. The training imparted in the class has already produced commendable results. Our junior speakers, Sh. Ihsan-ul-Wadud and Roedad Khan have won the trophy for the best team in the inter-college debate held at the Government College Lahore, under the auspices of the Young Speakers' Union.

The Union celebrated the "JAMAL-UD-DIN-AFGHANI DAY" with great success. Prominent among those who spoke on various aspects of the life and work of the world-renowned socio-political leader were Khan Abdul Ghaffar Khan, Hon'ble Malik Khuda Bakhsh and S. Mohammad Aurangzeb Khan. Sayyid Jamal-ud-Din was a protagonist of Pan-Islamism —a movement for the consolidation of the Muslims of the world and for the creation of a sense of brotherhood and community of interest in them. He was in, Prof. Browne's words, "a man of enormous force of character, prodigious learning, untiring activity, dauntless courage, extraordinary eloquence both in speech and writing and an appearance equally striking and majestic. He was at once philosopher, writer, orator and journalist, but above all politician, and was regarded by his admirers as a great patriot and by his antagonists as a dangerous agitator."

Thanks to the kindly and sympathetic interest taken by K. B. Haji Saadullah Khan, Honorary Secretary of the College and our patron Dr. O. H. Malik, the magnificent UNION HALL is nearing completion. A beautiful plaster-of-Paris ceiling is being provided to ensure good acoustics and arrangements are being made to supply reflected instead of direct light. Furniture is being ordered. We can now look forward to an early realization of this old dream of ours, when we shall have a magnificent building of our own, provided with committee and common rooms, lobbies and bathrooms. When completed and properly furnished, the hall promises to be perhaps the most imposing edifice of its kind in the whole of North India.

The Union has done a useful year's work. But still a great deal remains. Its aim is to produce young men perfect in every way—morally,

(b) Every intellectual worker should consider it his duty to do some manual work in his leisure hours.

(c) For the political salvation of India, the Mussalmans should make common cause with the Congress at this juncture.

(d) The Congress High Command has betrayed the cause of Indian Revolution.

(e) Men having failed to preserve peace, women should adopt the role of peace-makers.

(f) Capitalism and not democracy is at stake in this war.

(g) Every Indian should be a nationalist first and Hindu or Muslim afterwards.

(h) For the welfare of he North-West Frontier Province, it is essential that the tribal territories should be completely incorporated into the settled districts.

(i) The settlement of the communal problem and the adjustment of the various conflicting interests must be a condition precedent to the attainment of independence by India.

The Union has this year extended the sphere of its action. With a view to discovering and encouraging the hidden talent of public speaking in the province, it held on the 11th of February last a DECLAMATION CONTEST open to all High Schools in the province. The success achieved by this innovation surpassed all expectations, and the competition proved something of a revelation, as it brought into light the existence of a wealth of speaking talent in the Frontier schools which had not been anticipated before. As many as sixteen teams from various parts of the province took part in the contest. The general standard of debate was unexpectedly high, and the judges (Dr. Khan Sahib ex-premier, K. S. Shah Alam Khan Director of Public Instruction and Dr. O. H. Malik, Principal) paid a tribute to the speaking powers of many of the competitors. The silver trophy, which has been generously presented by Khan Bahadur Haji Saadullah Khan M.L.A., Honorary Secretary of the Dar-ul-Ulum, was won by the Charsadda Government High School team, while the prize for the best individual performance went to a competitor from Government High School, Mansehra. We share the hope expressed by Dr. Khan Sahib that our province need have no fears about its future administrators, if its schools can produce such good speakers.

A still greater achievement of the session was the successful holding of an ALL-INDIA SPEAKING COMPETITION on the 28th February, in honour of the memory of the late Nawab Sir Sahibzada Abdul Qayum, Life Honorary Secretary of the Dar-ul-Ulum. We cannot forget the deep debt of gratitude which this province owes to the great Sir Abdul Qayum who worked so indefatigably for the intellectual, moral, and political emancipation of this land of the Pathans. As a token of our humble tribute to the founder of the Dar-ul-Ulum, our Union decided to hold a speaking contest open to all colleges and universities of India, and Major S. M. Khurshid was good enough to donate a beautiful silver trophy for the winning team.

THE AMATEUR DRAMATIC CLUB. From the time, the Dramatic Club was carved out of the rib of the Khyber Athenaeum, it became active but its activity was of a rather secretive type. Its president, Prof. Q. Inayat Ullah, whenever interviewed for information, simply said that he meant to spring a surprise some time in March; but that in the meantime, he wanted to keep us in suspense. Suspense and surprise—the two well-known devices of experienced stagers!

The one-act play—Shivering Shocks—which was actually staged on the occasion of the Annual Prize-giving on March 14 before a distinguished gathering, including H. E. the Governor, exceeded all expectations and proved a thundering success. Rowley worked wonders and Dallas was absolutely at home and natural. We congratulate Prof. Q. Inayat Ullah and his associates on the great success which has crowned their efforts, and hope that their next performance will be a still bigger hit.

We are sorry to hear that Qazi Sahib, who was one of the founders of the club and had produced several successful plays before its amalgamation with the Athenaeum, has resigned its presidentship. We hope that his successor Dr. Imdad Husain who, as Rowley, has given such wonderful demonstration of his talents will succeed in taking the club to still higher altitudes of glory.

KHYBER UNION

Khyber Union is the premier students' association in the Dar-ul-Ulum Primarily a debating society, it has been growing in strength and widening its sphere of influence until now it has come to occupy a prominent place in the life of the College, and is the most representative body of the student community. A seat on the Union cabinet is a much-coveted honour. The Union holds its own elections every year, and they are as a rule keenly contested. By participating in the election of office-bearers the members learn at first hand the value of the vote and the importance of exercising it properly, and get acquainted with this important aspect of a democratic organisation.

The Union provides its members with every facility for acquiring the art of public speaking. It holds debates on subjects of topical interest and encourages its youthful members to take an active part in the proceedings. It invites well-known speakers to come and deliver addresses from its platform, so that the members may have opportunities of not only profiting by the mature thoughts of the speakers but also of listening to really good speeches and learning from them the art of public speech.

The Union has had a very busy session. Debates have been held regularly, and subjects like the following have been discussed:—

(a) India should join the war on the side of the Democracies unconditionally.

reports of these trips, we are not in a position to say how far the members were benefited by a change of scenes and environment.

Recently, the Society has held its annual meeting, which was addressed by no less a person that Rao Bahadur B. Vishwa Nath, Director of the Imperial Institute of Agricultural Research. The distinguished lecturer spoke of modern scientific researches which were being carried on at the central research Institute and of the promising results which have already been achieved. The work of the institute has helped, in his words, "to increase crop yields, to lower costs of production, to improve the commercial quality and nutritive value of agricultural products and to improve breeds of milch cattle—all of which are conducive to the prosperity of the farmer." The most outstanding discovery of recent times to which he referred was that which made it possible to introduce a change in the heredity of plants and to produce superior plants with greater vigour and ability to withstand drought and disease. Prof. M Mushtaq Ahmad thanked the speaker for his interesting and instructive lecture; and the function closed with a tea on the staff club lawn.

★ ★ ★

MAJLIS-I-ISLAMIYAT has been doing very useful work throughout the winter term. It has under the guidance of the College Dean, provided opportunities for Frontier young men to come into contact with renowned students of religion and to profit by their views on some of the most vital problems of life. Under the auspices of this society, the Hon'ble Malik Khuda Bakhsh, Speaker of the Frontier Legislative Assembly, addressed the whole college on 25th February. His subject was "Religion and the Muslim Youth". He described to his youthful audience the Islamic conception of life and character and stressed the responsibilities of young sons of Islam studying in an Islamic College. He emphasized the fact that a true Muslim can neither ignore the physical side of his life nor the spiritual.

An outstanding event of the term has been the visit of the great scholar, historian and theologean, Maulana Syed Sulaiman Nadvi. He delivered two very informative and inspiring lectures on the 10th and 11th of March, and exhorted the audience to cast their lives into true Islamic moulds, to realize the importance and necessity of mutual co-operation, and to make the Muslim creed (the Kalima-i-Tayyiba) the ideal of all their aims, ambitions and deeds. Both the lectures attracted large audiences not only from the Dar-ul-Ulum but from the city, the cantonments and the adjoining villages as well. Syed Sahib's stay at the college brought the members of the staff and the students into personal touch with him, and as such did lot of good to all.

The Dean Sahib is thinking of celebrating the next "Id-i-Milad-un-Nabi" on a grand scale, when well-known religious workers and leaders of thought will be invited to come and deliver a series of lectures on the various aspects of the life of the great prophet of Islam (may the peace and blessings of God be upon him).

reports of these trips, we are not in a position to say how far the members were benefited by a change of scenes and environment.

Recently, the Society has held its annual meeting, which was addressed by no less a person that Rao Bahadur B. Vishwa Nath, Director of the Imperial Institute of Agricultural Research. The distinguished lecturer spoke of modern scientific researches which were being carried on at the central research Institute and of the promising results which have already been achieved. The work of the institute has helped, in his words, to increase crop yields, to lower costs of production, to improve the commercial quality and nutritive value of agricultural products and to improve breeds of milch cattle—all of which are conducive to the prosperity of the farmer." The most outstanding discovery of recent times to which he referred was that which made it possible to introduce a change in the heredity of plants and to produce superior plants with greater vigour and ability to withstand drought and disease. Prof. M. Mushtaq Ahmad thanked the speaker for his interesting and instructive lecture; and the function closed with a tea on the staff club lawn.

MAJLIS-I-ISLAMIYAT has been doing very useful work throughout the winter term. It has under the guidance of the College Dean, provided opportunities for Frontier young men to come into contact with renowned students of religion and to profit by their views on some of the most vital problems of life. Under the auspices of this society, the Hon'ble Malik Khuda Bakhsh, Speaker of the Frontier Legislative Assembly, addressed the whole college on 25th February. His subject was "Religion and the Muslim Youth". He described to his youthful audience the Islamic conception of life and character and stressed the responsibilities of young sons of Islam studying in an Islamic College. He emphasized the fact that a true Muslim can neither ignore the physical side of his life nor the spiritual.

An outstanding event of the term has been the visit of the great scholar, historian and theologean, Maulana Syed Sulaiman Nadvi. He delivered two very informative and inspiring lectures on the 10th and 11th of March, and exhorted the audience to cast their lives into true Islamic moulds, to realize the importance and necessity of mutual co-operation, and to make the Muslim creed (the Kalima-i-Tayyiba) the ideal of all their aims, ambitions and deeds. Both the lectures attracted large audiences not only from the Dar-ul-Ulum but from the city, the cantonments and the adjoining villages as well. Syed Sahib's stay at the college brought the members of the staff and the students into personal touch with him, and as such did lot of good to all.

The Dean Sahib is thinking of celebrating the next "Id-i-Milad-un-Nabi" on a grand scale, when well-known religious workers and leaders of thought will be invited to come and deliver a series of lectures on the various aspects of the life of the great prophet of Islam (may the peace and blessings of God be upon him).

Urdu:—1st prize—Safdar Gilani, I Year.

2nd prize—M. Ikram-ul-Haq Saghir, I Year.

Pushtu:—1st prize—Mohammad Yusuf, I Year.

2nd prize—Shaukatullah, III Year.

★ ★ ★

THE SARHAD MATHEMATICAL SOCIETY continues to do valuable work with little beating of drums. Its library of Mathematical books has been further enlarged, and books to the value of about Rs. 400 have been added during the year. The President, Prof. Hafiz Mohd. Osman delivered an interesting lecture on 'Pythagoras' and Prof. Zia-ud-Din spoke on "Statistics and the Calculus of Differences." The Annual Day of the Society was celebrated last week, when the chief guest, Prof. A. Hameed of the Lahore Government College, delivered a learned talk on "Muslims and the Science of Mathematics." He gave a masterly survey of the valuable contribution which Muslims of various parts of the world have been making for many centuries to the rise and development of this science and, in the end, referred particularly to the great work that is being done in India by a handful of distinguished Muslims, including Dr. O. H. Malik, in the cause of Mathematics. The venerable Hafiz Sahib thanked the lecturer for his illuminating address, after which all repaired to the Staff Club Lawn for tea.

★ ★ ★

THE FRONTIER SCIENTIFIC SOCIETY opened its winter term with a lecture by one of the foremost physicists of America, Prof. H. A. Millikan, Nobel Laureate in Physics and Director of the Californian Institute of Technology, who is touring the world in connection with his investigations on cosmic rays. Dr. Millikan has earned world-wide reputation for his accurate demonstration of the indivisibility of the electron, and his 'oil drop' method for determining the properties of the electron is a well-known experiment now conducted in every Physics laboratory in the world. He spoke on "Cosmic Rays."

In another meeting, Prof. Mohd. Ahmad delivered a very interesting lecture on "Social Insects." Later Prof. Abdul Muttalib Jaffery gave a very informative talk on "The Atmospheric Phenomena of Light." The Society is holding its annual meeting some time in the second week of April.

Under the inspiration of the Principal, a scheme has been drawn up for the encouragement of scientific hobbies like photography, Radio-mechanics, glass-silvering, soap-making and scientific collections; and each group of enthusiasts has been entrusted to the care of a professor interested in the hobby concerned. We hope valuable results will be obtained in the near future.

★ ★ ★

THE SARHAD AGRICULTURAL SOCIETY had a fairly busy autumn term; but with the advent of the new year there came a lull over its activities. Most of the members went out on educational tours to Lyallpur and other places of agricultural interest. Since we have received no

And now, I ask you all to rise and to drink with me the health of the staff and the students, both past and present, of the Islamia College and to the prosperity of this institution.

COLLEGE SOCIETIES

The winter term, of which we have to take note in the present issue has, as usual, been the busiest time of the year for College Societies.

THE KHYBER UNION especially has been so vigorously throbbing with energy that we have found it desirable to publish a separate note about its activities elsewhere. Here we shall briefly review the work done by the other Societies during the term.

★ ★ ★

THE KHYBER ATHENAEUM has gained greater popularity and attracted a larger number of students into its folds. It has broken with its past traditions and instead of remaining a society of the 'high-brows,' it has become a source of entertainment for the average student. On the 4th February 1940, it presented a stage-performance called the 'Radio Set' which was greatly enjoyed by the audience. The performance can be best described as a mixture of music, dancing and humour. A special feature of the show was a novel contrivance by which dancers could present the rhythm of their movements to the audience without being visible themselves. A good deal of the success of the performance was due to the co-operation of the Station Director of the All-India Radio and the proprietor of the Imperial Electric Stores, who lent the use of the A.I.R. orchestra and various necessary appliances. We hope that now that the Dramatic Club has been separated from the Athenaeum the latter will once again concentrate its attention on a serious study of literature and art.

★ ★ ★

THE ORIENTAL SOCIETY has also shown signs of life since we published our somewhat disparaging remarks about it in the last issue of the "Khyber." A debate was held on the 10th February, 1940 on the following proposition : "that in the opinion of this house, the adoption of the Latin Script will be in the best interest of Urdu as the lingua franca of India." Among others, Messrs. S. M. Timur and M. Ashraf made very thought-provoking speeches.

The annual poetic symposium was held on March 3 under the presidency of Sardar Abdur Rabb "Nishtar." It was attended by a number of well-known poets from Peshawar, Kohat and other places, the more prominent being Messrs. Agha, Azhar, Barlas, Barq, Hamza, Kaifi, Sarosh, Shaida and Zia Jafari. Most of these poets recited their masterpieces and elicited tributes of praise from the audience. In the competition which was confined to students, prizes were awarded to the following for writing poems of outstanding merit :—

Hyderabad, and I know that without the active support of our distinguished guest we would not have been so successful in our mission. We, the Pathans of the North-West Frontier Province, never forget a friendly act, and as long as the Dar-ul-Ulum exists, the names of His Exalted Highness Sir Mir Usman Ali Khan Bahadur and Nawab Sir Akbar Hyder Nawaz Jung Bahadur will also be enshrined in it.

I pray that both His Exalted Highness and our honoured guest of tonight may be spared for the service of their nation and country for a long time, and I also pray that their association with us and with this institution may daily grow in strength.

Ladies and gentlemen, I will now ask you to rise and drink to the health of the Right Hon'ble Sir Akbar Hydari, Prime Minister of Hyderabad.

SIR A. HYDARI'S REPLY

I had made up my mind, before coming to Peshawar, not to deliver any speeches beyond replying to your Address of yesterday. You have not kept to our pact and have forced me to break my own resolution, specially as you have thrown on me the responsibility of replying to the toast which you have been kind enough to propose. I thank you cordially for that toast and wish to say, on behalf of all my party and of myself, how deeply we all appreciate your kindness and hospitality and the trouble you have taken to make our stay both interesting and instructive. Every one of us is grateful to you for the care you have lavished on us and all of us will be taking back the fondest recollections of our visit to Peshawar and the neighbouring regions where the genial welcome of the Mohmand and Afridi and other tribesmen has been a source of genuine pleasure to us all.

I said I had made up my mind not to speak but I cannot help saying that the contacts made yesterday and to-day will, I hope, be the prelude to future contacts. Nothing has impressed me more during this brief stay than the feelings of regard which you entertain for His Exalted Highness and his State and I assure you that, just as the distance of 2,000 miles between us does not affect your sentiments towards us in Hyderabad, in the same way that distance in no way impairs the sentiments of affection and identity which we in Hyderabad entertain towards you all. I am certain, too, that just as distance has no effect on our relations in the same way time will be of no consequence, for those relations have a basis which will remain and have always remained unaffected by considerations of time or space.

You have been kind enough to refer to me as the Ambassador of His Exalted Highness. Permit me here to say, as a servant of His Exalted Highness who has the distinguished title of 'Faithful Ally of the British Government,' that gathered as we are to-night,—Hindus, Muslims and Christians,—this gathering signifies our essential unity, both in the north and in the south, under the British Crown, to whose living symbol we drank our loyal toast at the very commencement and within whose Commonwealth of nations we of India are included.

two thousand miles away. This "Osmania" Hostel will now symbolise this close connection between the two.

The importance of your position in the Indian polity needs no emphasis. You are the link in the great chain, forged by a common faith which binds the Muslims of India to the Muslims of Morocco, Turkey, Algeria, Tunis, Egypt, Palestine, Syria, Mesopotamia Arabia, Iran, Afghanistan, and the millions of Muslims in Russia and China. At the same time, you are the sons of India, proud of holding the great mountain passes in custody for the security of the land to which we all belong, the guardians of its gateway and the custodians of the inviolability of its frontiers. Let this College teach its sons to harmonise this dual roll, each of equal importance, let them thus be worthy interpreters, on the one hand, of true Muslim traditions, learning, culture and art to our brethren of different faiths in India so that they may understand us better and in so understanding us respect our pride and, on the other let them be no less worthy interpreters of the soul of India to the Muslim peoples and States beyond its borders

And now, Gentlemen, I have the honour to unveil the tablet dedicated to His Exalted Highness and wish the Islamia College and the Osmania Hostel a long record of proud endeavour and faithful service.

K. B. SAADULLAH KHAN'S SPEECH AT THE BANQUET

Ladies and Gentlemen,

Tonight's function has a unique importance in the history of this Dar-ul Ulum for it has brought to us in the person of the Right Hon'ble Sir Akbar Hydari a distinguished ambassador of the most distinguished Ruler of Indian India—His Exalted Highness the Nizam of Hyderabad and Berar. If His Exalted Highness is one of the brightest ornaments of the Muslim community whose name shines forth throughout the world for princely liberality, I can say without exaggeration that the Right Hon'ble Sir Akbar Hydari is one of the brightest ornaments of Indian Statesmanship. The British Government could not have made a more handsome acknowledgment of Sir Akbar Hydari's political sagacity which he displayed so wonderfully at the Round Table Conference than by appointing him a Privy Councillor, one of the trusted advisors of His Majesty the King Emperor. We consider Hyderabad extremely fortunate that it should have in Sir Akbar the occupant of its highest administrative and executive post and it shows the wisdom of His Exalted Highness that he should have him as his first counsellor and Prime Minister. Under the guidance of these two eminent persons, the prosperity and progress of Hyderabad are assured.

We have already publicly expressed our gratitude to His Exalted Highness the Nizam for the generous help he has given to this College, and I consider it my good fortune that it should be during my humble stewardship of the Dar-ul-Ulum that it should have secured the patronage of that illustrious ruler. I was one of the deputation that toured the Muslim States of India, and, I assure you, ladies and gentlemen, that in no other State did we receive a warmer welcome and a greater encouragement than in

We would now ask you, Sir, to unveil the tablet of the "OSMANIA HOSTEL."

SIR AKBAR HYDARI'S REPLY

When I met your deputation in Hyderabad last year, I little knew that it would lead to my visiting Peshawar again after 40 years. I was here last in the year 1900 when I also made my way in the slow conveyance available in those days, to the Khyber Pass. It was no small pleasure for me to think of renewing my acquaintance with this city, and I, therefore, readily accepted the kind invitation of His Excellency the Governor and yourselves. Now that I am in your midst my pleasure is mixed with the consciousness of the privilege conferred upon me in being asked to unveil, on behalf of His Exalted Highness the Nizam of Hyderabad and Berar, the tablet designed to associate this Hostel of the Islamia College with his distinguished name.

A span of nearly half a century, though long in the life of an individual, can hardly be said to count in the history of an ancient city. Yet, the interval has worked many perceptible changes in Peshawar. For one, the Islamia College did not exist when I first came here; for another, you were not then the seat of Government of an autonomous Province.

Your reference to the site, not far from here, of a University which flourished in early Buddhist times recalls those historic associations in which these regions abound. Spoken of by Ptolemy, they were once subject to the influence of Greek culture, brought to India by Alexander, that great missionary of Greek influence in the East; ceded, then, three hundred years before the birth of Christ, to Chandragupta, they came to be included in Asoka's Empire and that of the Kushans and remained under the spell of Buddhism for centuries. With the advent of Sabuktagin came the first direct influence of Islam, and, three centuries later, the Mongols under Chengiz Khan established their supremacy. It was three centuries afterwards that a wave of Afghan immigration spread over your district and then came successively the Empire of the Great Moghul, of which you formed part, Nadir Shah, Ranjit Singh and, ultimately, the British. Your country has thus been a crucible of change, and your mountains and valleys have seen the advent and the rise and fall, since the beginning of Time, of different races and religions and diverse civilisations. In such surroundings, with the site of a University of Buddhist times not far from here and the memory of Panini, the father of Indian Grammar, who once lived in these parts, there is true inspiration for a House of Learning such as you have built. I am certain it will contribute to the life and progress of your Province and will produce a youth which will distinguish itself in the arts of peace just as it has always won renown in the science of war.

I cannot help alluding here to the intimate connection between us. For nearly two centuries and perhaps more, the Pathans have added to the diversity of His Exalted Highness's dominions. They not only form part of His Exalted Highness' Armed Forces but are also peacefully settled both in the towns and in the remotest villages where they are bound by ties of religion to some of their fellow subjects in the heart of the Deccan nearly

scarcely remind you, Sir, that not far from us is the site of a famous University which flourished in early Buddhist times. Nothing remains of that ancient university except a few ruins and mounds, but we are thankful to say that the spirit of learning which it symbolised still lives and is enshrined in the buildings that you see standing before you

The transformation of which you are a witness to-day is the result of the fulfilment of a dream of the late Nawab Sir Sahibzada Abdul Qaiyum and the late Sir George Roos Keppel over a quarter of a century ago. What was a small and humble beginning has grown to such dimensions that it can already claim, with every justification, the status of a full-fledged University which would have come into being, had it not been for the financial disabilities of the Muslim community in general. The people of the North-West Frontier have never been the favourites of Fortune, but, realising the importance of the role which this institution was destined to play, they rose fully to the occasion and despite their meagre financial resources raised a sum of several lakhs of rupees to help its founders to establish and maintain it. Its expansion has been so rapid and extensive that, nothwithstanding liberal monetary assistance from the Government, there was no alternative for us but to send out a deputation to tour the leading Muslim States of India with a view to invoking their generosity in the cause of Muslim education in this Province.

We take this opportunity of gratefully acknowleding the generous response of Muslim Princes to our appeal for help, and to no other ruler is our gratitude deeper than to His Exalted Highness the Nizam of Hyderabad and Berar whose unstinted munificence in the cause of learning is a household word throughout India. In fact, his liberal patronage of learning reminds us of the glorious achievements of the House of Abbas in Baghdad. His Exalted Highness has not only made a cash donation of a lakh of rupees to our funds but has also invested a sum of fifty thousand rupees in promissory notes in our name the income of which would be a substantial contribution to our annual budget.

We are deeply grateful to His Exalted Highness for granting our humble request to name our new hostel after him and for permitting you to unveil the tablet bearing his distinguished name. The ceremony of to-day, we assure you, Sir, forges a link between us and the illustrious House of Asif Jah, a link which we devoutly hope would become stronger with the lapse of time. It was only in the fitness of things that you should have come to us as the emissary of His Exalted Highness for it was mainly due to your support and encouragement that the efforts of our deputation were crowned with success. To you, Sir, from the fulness of our hearts we tender our sincere thanks. We sincerely hope that this function marks the beginning of an ever-lasting connection between this Dar-ul-Ulum and the premier Muslim State of India. We look forward to the patronage and assistance of Hyderabad in fulfilling our great dream of raising this Institution to the status of a University, and we trust that we will receive the same liberal measure of support from you as we did last time. In the end we pray that His Exalted Highness may enjoy long life and prosperity and that our association with his noble House and his State may continue unbroken for ever.

of the site of the College, alluded to the intimate connections that have existed for centuries between Hyderabad and the Pathans, and emphasised the importance of the position of the Frontier province in the Indian polity. He stressed the dual role which the young sons of the Dar-ul-Ulum were destined to play in the future history of India; as worthy interpreters not only of true *Muslim* traditions, learning, culture and art to their fellow countrymen, but of the soul of India to the Muslim peoples and States beyond the borders. Then he unveiled the tablet by pressing a button, the audience rising to their feet. The President of the Khyber Union then offered him life membership of the Union, which he accepted.

Sir Akbar Hydari and party then inspected the Osmania Hostel and were taken round the Oriental Library, the mosque and the College before going to the Cricket Lawns where a big garden party was given in their honour by the President (H. H. the Mehtar of Chitral) and members of the Council of Management. His Excellency Sir George Cunningham was among the most prominent guests present. Sir Akbar and party paid a visit to the historic Khyber Pass on the 11th and were entertained to a sumptuous tribal lunch in the Afridi hills. Major Iskandar Mirza, Political Agent of the Khyber, showed the party round and introduced to them the leading tribal Maliks who had come to greet the honoured guest. The same evening a grand banquet was held at the Rooskeppel Hall. K. B. Haji Saadullah Khan's speech proposing Sir Akbar's toast and the latter's reply are printed elsewhere.

Next day, the party went through the Kohat Pass and inspected the Afridi Arms Factory in the tribal territory, where they were welcomed by the chief Maliks of the area. Later they were entertained to a big lunch by K. B. Sh. Mahbub Ali Khan, Deputy Commissioner, Kohat, who introduced to them the leading members of the local gentry and took them round the city.

The party left the same evening for Taxila to inspect the archaeological excavations and the museum on their way back.

ADDRESS PRESENTED TO THE RIGHT HON'BLE SIR AKBAR HYDARI, NAWAB HYDAR NAWAZ JUNG BAHADUR, Kt., P.C., D.C.L., LL.D., PRESIDENT OF THE EXECUTIVE COUNCIL OF HIS EXALTED HIGHNESS THE NIZAM'S GOVERNMENT

We, the members of the Council of Management of the Dar-ul-Ulum-i-Islamia-i-Sarhad, beg to offer you a most cordial welcome on your first visit to the premier educational institution of the North-West Frontier Province. We are aware of the fact that this is not your first visit to this historic land of the Pathans; for long before the advent of modern transport facilities, you made your way in a primitive tonga over rough and dusty roads to the Khyber Pass. You would have, doubtless, passed the present site of the DAR-UL-ULUM which in those days must have been a desolate wilderness, strewn over with the graves of warriors who fought and fell in battles at the foot of the Khyber hills. To-day, as you see, the desolation has been transformed into a smiling garden and a home of learning which is the meeting-ground of the cultures of the East and the West. We need

OSMANIA HOSTEL

SIR AKBAR HYDARI'S VISIT

About this time last year a deputation of the Dar-ul-Ulum Council of Management, headed by the Honorary Secretary K. B. Haji Saadullah Khan toured the principal Muslim States of India to collect funds for the College. Their appeal for assistance met with ready response. His Exalted Highness the Nizam of Hyderabad and Berar, whose name has become proverbial for its constant association with generous financial support to the cause of education, graciously made a donation of Rs. 1,00,000 in cash and Rs. 50,000 in State securities. In their gratitude, the Council of Management resolved to perpetuate the bond of affection which had thus been forged between the great House of Asif Jah and his humble brethren-in-faith of the Frontier, by calling the new hostel after His Exalted Highness's illustrious name; and a submission to that effect was made to the noble ruler of Deccan. The requisite permission was kindly granted by a special "firman," and the Council of Management's further prayer asking for the deputation of the Rt. Hon. Sir Akbar Hydari to come and perform the unveiling ceremony of the tablet over the Osmania Hostel was also accepted.

Accordingly, Sir Akbar Hydari accompanied by Khan Fazl Muhammad Khan, Commissioner of Education, and staff arrived at Peshawar on march 9. He was given a warm and enthusiastic reception at the Cantt. railway station, from where he drove to the Government House. Next morning, he was taken to the Mohmand Border via Michni, Shabkadar and Abazai, and met a number of leading Mohmand Maliks and Khans of the ilaqa on his way to Umarzai where he was the guest of honour at a grand lunch given by K. B. Haji Saadullah Khan, Honorary Secretary of the Dar-ul-Ulum.

The "Unveiling Ceremony' was performed the same afternoon in the presence of the largest gathering that had ever assembled at the College. Under a huge and tastefully decorated shamiana were seated, besides the members of the Council of Management, the staff and students of the College, hundreds of distinguished guests, European and Indian, official and non-official. Prominent among those who had come from beyond the Frontier districts, were Sir Sikander Hyat Khan, the Punjab Premier, the Bishop of Lahore and Prince Jahanzeb. The proceedings opened with a recitation from the Holy Quran, after which K. B. Haji Saadullah Khan presented the address on behalf of the Council of Management, welcoming Sir Akbar Hydari, narrating briefly the history of the development of the Dar-ul-Ulum and paying a sincere tribute of gratitude to H. E. H. the Nizam, and requesting Sir Akbar to unveil the tablet designed to associate the new hostel of the Dar-ul-Ulum with the distinguished name of His Exalted Highness. In his reply Sir Akbar Hydari referred to the historic associations

Now the most important thing to keep in mind is that it is the individual who has to reform himself. No reform societies or laws can change the social fabric. It is the individual. Do not forget the simple proposition. Individuals make society. It is the character of the majority of the individuals which is to determine the character of the society. You may have ideal rules and regulations, but if those who have to work it are not up to the mark, the result will be nill. You have to begin with yourself from to-day if you wish India to be free—not free in the political sense—free from slavery to the demon of selfishness, dishonesty, impurity and hatred. First free yourself from this great slavery, the slavery of Nafs-i-Ammara (The Ego, the Self). First act on BUGHZUN LILLAH WA HUBBUN LILLAH (opposition for the sake of God and love for the sake of God) and then you will find that all happiness and power of the world will glide into your hands. The life of simplicity and efficiency, clean thoughts and clean habits, a loving heart and honest dealing with the world are greater assets than Rolls Royce cars, palaces and Shylock's tons of money. Materialism has allured us too much towards pomp and display; and we are tempted to make insincere attempts to cover our weaknesses. This defect should be continuously present to our minds at all times.

In the end, I pray to the living God that he may direct you to the right path and give you strength and courage to deny yourselves the glamorous reward of material gains at the expense of those high standards, the standards of

Absolute unselfishness;

Absolute honesty;

Absolute purity; and

Absolute love.

AMEN.

—□—
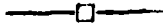
live'! Consider the rights of neighbours according to Islam. Their claims are such that it was even mooted whether they may not also become heirs. Similarly the existence of a joint Hindu family system amongst the Hindus was an institution for helping the weak. Modern selfishness has ruined all those methods of alleviating misery and trouble. It is no longer ZAWIL AQRIBA WAL YATAMA WAL MASAKEEN A WABNIS SABEEL (Give to near relations, orphans, poor and the travellers). It is now "Self." Beware of "Self." It is ruining the world and therefore ruining every "self" living in it. There is a vicious circle.

Then think of HONESTY I will give you an incident which shows what kind of honesty human beings like ourselves have practised in the past. Hazrat Ali was going into the accounts of the Treasury (Bait-ul-Mal). Some friends came and began to talk. He put out the lamp. They asked why. He said "the oil belongs to Government. It can't be put to my private use." Again one day Caliph Omar went home and found that his wife had some money. He enquired how she had got it. She said that she had been saving a few annas from the daily pay given to the Caliph from the Treasury. He sent an order to the Treasury that his daily pay be reduced by the amount which his wife had been saving every day. He said he did not need it. Those were men like us who could put absolute honesty into practice. Why can't we? The answer is, because the materialistic philosophy of the west teaches us to swell our gains at the expense and misery of others.

Have you ever thought, what part LOVE plays in bringing peace and harmony into the world. How dear a loving father or mother is. A loving couple makes the house a heaven on earth. God is love. It is love in us which raises us up to Him. Tennyson has put it very nicely "God in man is one with man in God." I would refer you to the story of Subuktageen who got a kingdom because he was loving to a deer. He had caught its calf. Seeing tears in the eyes of the mother-deer he let it go. This is history. Love for your brother men is the sine qua non for the harmonious working of a nation. At every step in the holy Qoran you are taught to love. You have to love your God and your relations and your children. You have to look after the poor and the needy. You have to assist the decrepit and the weak. Is it not the height of love that a Muslim should not be allowed to say even "Oh" if his parents are cruel to him. I have found great happiness in it. Remember the Jew who used to throw dust on the holy Prophet. One day the holy prophet was going in the street and the Jew did not throw dust on him. The holy Prophet turned to his companion and said "our friend must be ill that he has not remembered us." The holy Prophet went into the house and inquired after the health of the Jew. The Jew was so much overwhelmed by love that he became a staunch Muslim.

PURITY is another characteristic which is the condition precedent for establishing a happy social environment. The outstanding instance of absolute purity is the incident of Caliph Omar's son. He was punished by has father for making overtures to a woman. He died under the cat.

I wish to warn you against this propensity on the threshold of your future career. India is a poor country. We cannot afford luxurious living and loose morals. India is already divided. We should not cherish that love of lucre and pleasure and that dire lack of respect for God and His Commandments, which turns human beings into animals and makes them act as animals to one another.

There is already not much to say for the life of India. Take business, for instance. Go into a liquidation court. You will find how educated people commit legal dacoities and ruin people. Companies are floated. Poor ignorant shareholders succumb to persuasions. The companies go into bankruptcy and the shareholders have to give up their life earnings to pay for the enjoyment of a few villains of the piece. There is no business honesty. Capital is there. Banks are full of it. But who is going to advance money, for there is very scant hope of getting it back. Curiously, the inclination is to help the dishonest debtor, to demoralise him, and to make capital shy, and thus by repercussion economically to ruin the very man who is sought to be helped.

Turn to services. You will find instances of corruption and unscrupulousness in them. I cannot forget the remark of a responsible officer "Thank God I am not a widow or a minor in this country." He made this remark when dealing with a widow's case.

Just let us consider for a few minutes the affairs of our own families. Selfishness and dishonesty is the pervading spirit.

Last but not the least, turn to communal and political matters. Intolerance and dishonesty is the watchword. Violence is the article of Faith. Hatred is the foundation.

We can, therefore, safely deduce the proposition that 'God-control' is the only answer to this perplexing riddle. But what is God control ? Merely saying that one believes in God is not enough. There are very few real atheists in the world. It is obedience to God in our lives which really matters. In every religious book you will find Him saying that He guides you. "YAHDE MAIEEN YASHA" (I guide you) says the Koran. The first thing to do is to ask Him for guidance and to turn to Him in our everyday life.

The next thing to remember is to see that we model our lives according to principles which have been accepted by all religions as the GUIDING STARS of human life, the principles which are admittedly the dictates of God. You have not only to accept them but to weave them into the scheme of your life.

UNSELFISHNESS I will take first. If you take the religion of Islam, you will find in the life of the Prophet (be peace on him) one of the greatst unselfish persons ever born on earth. The same you will find in Jesus Christ and revered persons of other religions. Have you forgotten the story of how when once the Holy Prophet came to know that there was a golden coin in the house, he ordered it to be given to the poor at once. If we would only be unselfish and if we would only believe in 'live and let

Convocation Address

Delivered by

The Hon'ble Khan Bahadur Kazi Mir Ahmad, B.A., LL.B.

Judge, Court of Judicial Commissioners, N.W.F.P.

You students are going out into the world. You are entering the great struggle of life through which we have been. It is essential that you should lead a life which should make you happy and make also those happy who are around you.

For this purpose it is necessary that you should have that character which every religion in the world and every code of morals has regarded to be conducive to happiness and peace—the character of an honest, unselfish, pure and loving person. It is not denied now that although in education and science Europe has attained an unparalleled height, there is no peace and harmony in that continent, either in individual homes, or in nations as a whole. There is a feverish anxiety for getting more wealth, for conquering more lands and for having more enjoyment. There is naturally a corresponding indifference towards all human virtues—honesty, truthfulness, mercy, charity, helping the weak, etc.

Now you must consider what is the secret underlying this paradox. Normally we should expect that so much knowledge and material comfort should have absolutely dispelled all worries and anxieties. There should be all milk and honey, and people should have the feelings of Tennyson's Lotos Eaters.

To my mind, the secret is that the existence of that Divine power which millions of human beings recognize under different names and through different religions as the deciding factor in all that happens in this world, has all along been ignored. His, I mean, God's very existence is denied. High principles which are His commandments, are also supposed to be sentiments which should be restricted to churches, mosques and temples. Have not we heard people say "My religion is my own." The result is the law of the jungle, "the survival of the fittest." Man has more or less begun to devour man.

We in India could not avoid the general influence of what we call "modern," but I would call, the "material," civilization. We also are heading for broken homes and broken hearts. We are also craving for the day when we all should be in what they call "The smart set" and should live the life of pleasure uncontrolled by God—the life of wine, woman and song.

training colleges and to join at their own expense. In this way the number has in some years slightly increased; but these others also being non-Punjabis have had to pay Rs. 550 each over and above the heavy college fees. The total output has not, however, come up to the actual needs. Naturally, there is no unemployment among Frontier-men holding the B.T. degree. If provision is made for training our young graduates within the province, a much larger number of properly trained teachers can be turned out every year, and at no greater expense.

★ ★ ★

Refresher Courses.

In addition to the starting of an LL.B. and a B.T. class, the Principal has recommended the institution of "Refresher" courses in subjects like Drawing, Science, Geography, etc. The need and demand for training in Drawing can easily be gauged from the fact that while Drawing is a compulsory subject for all middle and high schools, there exists no provision for training drawing masters in the province, with the result that many of those supposed to be teachers of drawing do not know the subject themselves. When last year the Education Department held a Drawing Masters' examination as many as 45 candidates appeared for it. But since most of them had not had any previous training, more than 80 per cent of them failed to obtain the certificate. Surely, these tell-tale figures lead to only one conclusion. The utility of Refresher courses has been recognised all over the world and they are regularly held in Europe and America, and in other parts of India. They infuse new blood into the profession, improve the general standards of teaching, and prevent members of the department from deteriorating professionally. Teachers of Science and Geography working in rural areas out of touch with modern developments in various branches of their subjects, are likely to get rusty. To brush up their knowledge and to keep them abreast of the times, they should be given the advantage of listening to experts who have made a special study of their subjects and are, by virtue of their high academic attainments and practical teaching experience, eminently fitted to impart their superior and up-to-date knowledge.

★ ★ ★

Geography.

Most of the Matriculates who desire to prosecute their studies further join one or other of the Frontier Colleges. Our College makes provisions for the teaching of almost all the subjects prescribed by the Punjab University for the Intermediate and B.A. Classes. But one very important subject, which sometimes attracts students outside, is Geography. It is a compulsory subject for a number of Public Service Competitions, and competition being at present the only avenue for entrance into higher services, many students want to study it. The Principal has strongly recommended the starting of Geography for the Intermediate Classes; and we hope that classes in that subject will be formed next autumn.

into close association with one another, but will at the same time enable the province as a whole to take a big step forward towards shaking off dependence on other provinces in matters of higher education.

★ ★ ★

LL.B. Classes

From 20 to 25 graduates of this Province go every year to Lahore, Aligarh and other places to take up the study of law. On their return, they either set up practice at the Bar, or compete for such posts in government service as Sub-Judge or take up work in business or in other ways. In each of these capacities, their study of law proves of great use to them. They cannot sit idle and swell the ranks of the unemployed. The possession of an LL. B. degree is essential for appointment to Sub-Judgeship. Even as clerks in various courts and offices and as managers and secretaries in business concerns, they are likely to be more useful than graduates without legal training. For these reasons, young men do proceed to a course in Law; and if equally efficient but cheaper training can be provided for them within the province, there is every likelihood of their taking advantage of it in preference to more expensive education elsewhere.

★ ★ ★

B.T.

The moral and material prosperity of a people is largely dependent on the type of education imparted to its children. The importance of entrusting the education of rising generations to really competent hands cannot therefore be exaggerated. The Government is right in refusing to take "untrained" men into service in government schools and in discouraging their employment in Board and aided institutions by withholding grants-in-aid for teachers who have not had proper "training." The demand for properly trained and certificated teachers continues unabated. Education being an ever-growing department of national work and the number of students being always on the increase, there is no likelihood of this demand growing less insistent in the future.

But since there exist at present no arrangements for the training of Anglo-Vernacular teachers in this province, young men who have a desire to make education their profession have to go to Lahore, Aligarh and other places for being "trained." But the "training" colleges everywhere are already full to their utmost capacity; and Frontier young men find it very difficult to obtain admission to them. For a number of years, the N.-W.F.P. Government have managed to secure a few seats at Lahore and Aligarh for candidates from this province. But in doing so, they have had to pay to the Training College authorities for each candidate accepted as a N.-W.F.P. Government stipendiary a sum of Rs. 550 besides a stipend of Rs. 25 p.m., i.e., Rs. 850 per student. Even after that, the number of Frontier-men thus admitted has been extremely small, usually two and never above four. The funds at the disposal of the Government not permitting a larger number being sent up for training, and the number thus produced being too small for provincial requirements, the Government have been encouraging other candidates to take the admission tests of these

that those who were shortly to leave the dear, old alma mater would take away sweet memories of the happy days they had spent at the Dar-ul-Ulum, and ever look back to the College with pride and love. Nothing would ever break the ties of regard and affection that bound them to their professors and college-friends. The Principal then addressed the young men who were going out into the world and told them what high expectations were entertained of them by their college and what duties they owed to their God, country, nation and the alma mater. He wished them all the best of luck, and expressed a strong hope that by their conduct and character in the struggle of life they would bring honour and good name to the college.

The customary concert of the "farewell night" was this year replaced by a variety performance arranged by the College Dramatic Society. The show was thoroughly enjoyed by all. Amin and Barkat received well-deserved praise for the excellent quality of their music, and Kashif won the admiration of everybody for the skill and grace of his dances. We congratulate the president and directors of the Club for the success that crowned their efforts and hope that we shall have many more entertainments of a similar type.

★ ★ ★

Expansion Programme

Every year a considerable number of Frontier young men have to go outside the province in search of higher education. This annual exodus forms a far from negligible drain on the resources of our economically backward province and involves a good deal of avoidable expense on the part of the parents. Moreover, many of those who leave the province for places like Lahore are drawn from the simple surroundings of a Frontier village or town and are unaccustomed to the life and ways of big cities. They are consequently liable to succumb rather easily to the temptations with which large centres of "fashionable" society abound. They have few opportunities of coming into intimate contact with the life and people of other parts of their own province. No facilities are available to them to apply their "theories" and "principles" to conditions prevailing in the N. W. F. Province. Hence, on their return, they are apt to prove to that extent less useful citizens of the land of their birth.

The opening of M. A. and agriculture classes within the province has succeeded in reducing to some extent the number of those wanting to go elsewhere for the degrees of Master of Arts and Bachelor of Science in Agriculture. If proper facilities are provided here for imparting instruction in some of the other popular branches of post-graduate study also, the size of this exodus can be reduced still further. Besides M.A., the subjects which attract a large number of our graduates away from us are Law and Education. It is for reasons like these that Dr. Malik has submitted to the Council of Management of the Dar-ul-Ulum a proposal to start B.T. and LL.B. classes at the Islamia College. If the Council accept this eminently reasonable suggestion of the Principal, as we earnestly hope they will, they will not only be saving the parents a large amount of unnecessary expenditure and bringing students from different parts of the province together

through various stages of evolution before coming to assume its present shape. The Hon'ble Khan Bahadur Kazi Mir Ahmad, who presided, thanked the learned lecturer for his interesting and informative address.

★ ★ ★

The Khyber Hiking Club.

The President, Prof. Zia-ud-Din, has the hiking spirit in his blood. No wonder therefore that the club has been functioning successfully even during the busiest part of the academic year. We have referred to its "Treasure Hunting Contest" already. During the present term, the Club has held a 10-mile walking competition open to all and a 5-mile one confined to competitors drawn from High Schools only. Being the first of its kind in the history of our sport, the event aroused considerable interest. The trophy was eventually won by Anwar Ali Sadiq, our ex-captain of Football, Swimming and Water Polo teams and the only triple-colour-holder of the College. The club has published an attractive programme of hiking trips to Swat and Kashmir.

★ ★ ★

Coaching Classes.

In order to widen the mental horizon of our students and to assist such of them as may be thinking of sitting for one or other of the Public Service Commission examinations, a series of bi-weekly lectures has been started and talks are being given by members of the staff on general knowledge, Everyday Science, Economical problems, literature and topics of the day.

★ ★ ★

Speaking Competitions.

The Khyber Union has this year instituted two speaking competitions: one for all the High Schools of the Province and the other for all the colleges and universities of India. Khan Bahadur Haji Saadullah Khan has kindly donated a silver trophy for the former and Major S. M. Khurshid one for the latter. Our sincerest thanks are due to both these donors for their liberality. A report of the successful holding of the two competitions appears elsewhere.

★ ★ ★

Farewell Party.

On March 23, the staff and "non-University" students gave a grand garden party in honour of the outgoing members of the VI, IV and II Year Classes. The farewell address, which was read by Muhammad Asghar of the V Year Class, expressed regret at the impending departure of old friends, wished them god-speed and fervently hoped that they would all worthily uphold the ideals imbibed in the Dar-ul-Ulum. Muhammad Zaman of the VI Year replied on behalf of the university candidates and thanked the hosts for their blessings and hearty send-off. He assured them

"The hallmark of a thinker has always been a passion for truth. To-day this passion is being diverted to falsehood and propaganda. Philosophy and history have been twisted to suit the particular needs of an individual. Science is coming in for severe criticism and with justice, for scientific progress has out-stripped moral progress. The study of science, instead of being directed towards the benefit of humanity, is being mobilised for the destruction of mankind and little else. Religion has been and is being scoffed at in some countries; derisive tirades are not only pointed against other religions but their very own religion is being trodden under foot."

Sir George Cunningham then referred to the lesson of character and leadership which the students learned in a college or university and said many of those whom he was addressing would shortly be leaders of various aspects of life in this province. He asked what would they lead it to? Would they lead it to the kind of ideal which is unhappily in vogue to-day? Or would they lead it on the path of truth and to the kind of ideal set before them in their universities. Turning to followers, he asked would they desire to be followed by people who have no initiative and no soul of their own?

Concluding Sir George said that there could be no question about the ideals for which British rule in India stood. His country and their country, his religion and their religion must rise or fall together.

Khan Bahadur Haji Saadullah Khan, Honorary Secretary of the College, paid a warm tribute to Sir George Cunningham for the sympathetic interest he had been taking in the College practically from the time of its foundation a quarter of a century ago. The Khan Bahadur Sahib assured His Excellency that the Pathans were a brave people and that they never forgot the smallest kindness done to them. They were friends of right and justice and whenever an opportunity came they would rise as one man to defend the cause which they made their own.

Then followed a one-Act play "The Shivering Shocks" staged by the Amateur Dramatic Club. His Excellency and other guests were greatly impressed by the standard of acting displayed by the members of the Club. A reference to the play is made under the head "College Societies."

★ ★ ★

The University Extension Lecture.

On the 17th March, we had the privilege of listening to a learned discourse on "The Origin and Development of Arabic Script" by Principal Muhammad Shafi of the Oriental College, Lahore. The speaker is a scholar of wide fame and has devoted a whole life-time to the study of Arabic language and literature. With the help of the Epidiascope and slides made from rare manuscripts, he traced the rise and growth of the Arabic script and brought home to the audience how the modern script had passed

themselves the glamorous reward of material gain at the expense of the high standards of unselfishness, honesty, purity and love." K. B Haji Saadullah Khan, Honorary Secretary of the Dar-ul-Ulum, thanked the president for his inspiring message and expressed a hope that both the graduates and under-graduates would live upto the high ideals placed before them by the learned Kazi Sahib. The full convocation address is printed elsewhere.

★ ★ ★

Prize Distribution.

We had once again the pleasure of welcoming in our midst His Excellency Sir George Cunningham, our old friend and Patron, on March 14, when he presided over the annual Prize-giving. Besides the members of the Council of Management, the staff and students of the Dar-ul-Ulum, a number of distinguished visitors from the City and Cantonments also attended the function.

A student opened the proceedings with a recitation from the Holy Quran. The Principal Dr. O. H. Malik read out a very interesting report on the working of the College during the period of his stewardship. It recorded all-round progress, and particularly mentioned the new features which had been introduced during the past few months. It also enumerated the proposals that were afoot to make provision at the Dar-ul Ulum for the study of Law, Teaching, Theology and Yunani Medicine and Geography, to open classes for training mechanics, wiremen, electricians, etc., and to encourage such useful hobbies as photography, book-binding, soap-making, painting and radio-mechanics. The full reports of the Principal and of the Headmaster are printed elsewhere in this issue.

His Excellency then gave away prizes and certificates of merit for academic distinction and 'colours' for proficiency in games and sports. Among the recipients of prizes were three 'malis' who had been adjudged to have kept their parts of the College estate in particularly good condition.

His Excellency rose to speak amidst loud and enthusiastic cheers He said that he always enjoyed his visits to the Islamia College, that he was greatly interested in its welfare and would continue to take keen personal interest in the Dar-ul-Ulum not only so long as he was in India but even afterwards in his retirement and in fact, to the day of his death. He was glad to hear from the Principal's report that high standards were being maintained at the College and good progress was being made all round.

Reverting to the present international situation, His Excellency said that "the present struggle is between moral forces; between the moral right and the moral wrong. Not only our bodies but our souls are at stake." Sir George asked his youthful audience to place themselves for some time in the position of students in England and to think for a moment whether they would like to see all things of value, which they had learned and imbibed from their alma mater, in jeopardy. "Culture, literature, science, philosophy and history are a few of those things for which you and your College stands and these things are in danger of being destroyed to-day."

to the hall being named after him. The site for the proposed Central Dining Hall, which is to perpetuate the memory of Sir George Roos-Keppel, was also shown to His Excellency, and he approved of the idea of having the mosque, the library, the Union Hall and the Dining Hall symmetrically built on four sides of a square and forming the centre of all student activity. Later he had tea with the Principal and had a lengthy talk with the members of the Council of Management, and promised to present to the College gardens some flowering shrubs from the Government House.

★ ★ ★

The Sunday Sermon Scheme.

Three very thought-provoking sermons were delivered during the winter term as part of the Sunday Sermon Scheme. Prof. S. M. Timur spoke on "Retribution," Prof. M. A. Latif on "the Collapse of International Morality" and Maulana Syed Sulaiman Nadvi on "The Ideals of Young Islam". Sermons such as these very often stimulate interest in moral virtues emphasized by the learned speakers; and create a desire in the minds of the youthful audience to devote at least a fraction of their time to a serious consideration of problems of nobler and higher value. And whatever tends to lead young men towards living richer and fuller lives is worthy of admiration.

★ ★ ★

The Physical Education Board.

The Physical Education Board is continuing to do useful work. Another lecture, illustrated by magic lantern slides, was given under its auspices on the 27th February. This time the speaker was our popular Medical Adviser and old friend, Col. Dimond; and he spoke on "Tuberculosis." During the course of a very instructive talk, he traced the history of the disease, and explained how it had spread to all parts of the world. He cited facts and figures to show what a heavy toll of life it took every year, especially in India, and how important it was to reduce the death rate due to this terrible scourge. Finally he enumerated the symptoms of the disease, and stressed the fact that by proper and timely care, Tuberculosis could both be avoided and treated. He appealed to the educated young men of the Frontier to co-operate with him in his Anti-tuberculosis Crusade. We have no doubt that our readers will do their very best to help in rooting out Tuberculosis from their villages and towns.

★ ★ ★

Convocation.

The annual convocation for the conferring of degrees was held in the Roos-Keppel Hall on Thursday, the 14th March. The Hon'ble K. B. Kazi Mir Ahmad, Judge, Court of the Judicial Commissioners, N.W.F. P., admitted candidates who had passed B.A. (Hons.), B.A. and B.Sc. examinations to their respective degrees, and delivered a Convocation Address of great educative value. He advised the young graduates to free themselves from slavery of all kinds and to have the courage to "deny
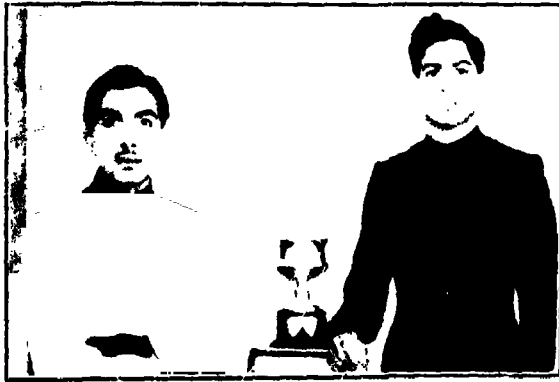
COLLEGE NOTES

The "Beautification Campaign."

The "Beautification Campaign" has gone on with unabated vigour throughout the term, and to-day the whole college presents a very different look. New flower-beds have been planted and old hedges have been restored or renovated. New walks have been opened up. Unsightly bushes have been replaced by more beautiful varieties. Old grounds have been weeded and new lawns have been laid out. Rows upon rows of flowerpots and palms have been placed round the college buildings. Every part of the vast college estate has received attention and has either felt the "magic touch" or is going to feel it soon. With the arrival of the Spring, the citrus trees along the roads have burst into bloom, and the sweet fragrance of the lovely orange blossoms has turned the whole atmosphere into a veritable "perfumery" The presence of long patches of beautiful flowers of all imaginable shapes and hues round about the orange trees has invested the whole scene with a celestial charm of its own. Even the most confirmed "book-worms" may be seen nowadays going out for a stroll along the balmy roads lined by sweet-scented "karna."

★ ★ ★

H. E. The Governor's Visit.

His Excellency Sir George Cunningham, Patron of the Dar-ul-Ulum, paid a visit to the College shortly after his return from leave. The Honorary Secretary K. B. Haji Saadullah Khan and the Principal Dr. O. H. Malik took him round the College buildings, Science laboratories, the Agriculture Farm and the College Dairy. His Excellency, who has always taken a generous interest in the welfare of the institution was greatly impressed with every thing he saw, and discussed fully and sympathetically the possibilities of future expansion. The Principal laid before him a comprehensive programme of development and explained the utility and feasibility of such plans as the starting of B.T., LL.B. and more M.A. classes, introduction of Geography as a College subject, institution of refresher courses in various subjects, extension of the Agriculture Farm, construction of a central dining hall for all boarders, the establishment of fruit and vegetable gardens, and the introduction of poultry farming and sheep-breeding. His Excellency made certain useful suggestions and advised the Council of Management to submit a detailed scheme which would receive careful and sympathetic treatment from his government. He also inspected the new hall which is being built for the Khyber Union. The President and Secretary of the Khyber Union welcomed him on behalf of the students as an old friend of the Dar-ul-Ulum and begged permission to associate his name permanently with their hall as a mark of respect and appreciation for his sincere support to the cause of education in general and of their Alma Mater in particular. His Excellency thanked them for their kind thought and gave his consent

Thus when I go away, and am, nobody can say, how far away from the thrilling and throbbing life of my college, I shall still feel a reflection, an echo of the joys that I had here which might well console, inspire and strengthen me. The college, I shall then say, was a small world indeed—a world which knew no care, no worry, no long sorrows. A friend said to me some time back that one ought not to be pessimistic or sentimental about such separations. Little he knew my feelings. The college was not merely an educational centre for me, it was my home, my playground, my civilizing influence, my all, for six years. And now I shall have to leave it, and for what ? I shall quit a bed of roses and step on to a bed of thorns. I go forward to uncertainty, the dismal search for living, the cares and worries of the world and perhaps to an unrelieved darkness. I leave behind carelessness, unrepressed laughter and unchecked gaiety. I dive into a miry sea of old, care-worn, dreary faces and have to emerge from a clear pond of young and merry ones. There was a life which none can recall and recapture later. My loss is not small.

If ever we come back again to the college on a chance visit, we will not find it to be **our** college, the college of **our** days, the college **we** lived in. 'The eyes that shone' will have 'dimmed and gone,' as it were, and nobody would even recognise us. The trees, the fields, the buildings are there but no 'familiar faces' which illumined these inanimate objects. Thus there will be a feeling of double loss, and all that we loved and were attracted by before, will seem repellent. The world of a college changes fast, faster than ivy, which yearly puts on new leaves. So if one feels sorry and forsaken at his departure from the college, no wonder and no blame.

However, my comrades who are to accompany me out of the college ! let us muster up our energies and live cheerfully and joyfully the little time we have here. Let us manfully face the approaching ordeal, when we shall bid adieu to our alma mater and step out into the vast, unheeding and wriggling world.

So, my dear, dear old college ! I take cheerful leave of you. I know you are feelingless : Men may come and men may go for aught you care. But I don't mind. I loved you while I was here and will continue loving you wherever I am. My sincerest and my humblest prayers are with you.

God bless you ! Amen.

Good-bye.

A. RASHID IBRAHIM.

and respected, even the servants who have served me and enlisted my sympathies—all will be gone from me, and leave me the sicker in my heart. I shall see no more the green trees and the multi-coloured flowers which made my college look a veritable paradise nor smell the faint entrancing odour of orange buds which flitted into my room from the roadside in the spring; I shall no longer roam about in the spacious and velvety fields here and breathe their fresh morning air; no more shall I walk on the road to Jamrud or on the railway line to Landi Kotal, and view the burning reds and the dismal greys of the sky in front of me, beyond the barren yet awe-inspiring hills of the Khyber Pass; no longer shall I saunter about on the college roads lined with its magnificent brown buildings nor see the college compound studded with charming sky-blue pugrees and black-blue uniforms; I may not again pray in the lovely college mosque and enjoy gazing at the fine sprinkle of its fountain. The meetings of the innumerable college societies in which I occasionally spoke and which I invariably attended, the dinners, tea and garden parties which I joined and the hockey and football matches—which I watched, especially those with our rivals, the Edwardes College, will be things of the past—sweet memories. My room and my hostel and their associations; our Common-Room with its mighty din; our Dining-Hall with its loud tete-a-tete all around—the radio still pouring on its no less loud songs—; our bearers and bihishtics; our Royal Family in the Upper Wing with its day-long gup, and fun, and raillery, our moonlight walks and singing; our mild jokes and innocent romances; the changing season and months—the trip, to the Kababi in winter and the ice cream and mango parties in summer;—all, all will pass way, ephemeral things as they are but they shall leave indelible stamp upon my mind.

Can I ever forget my professors whose instruction and company has been the healthiest influence on my life? The generous and most affable temper of our Principal, the jovial loud talk of Hafiz Sahib and kindly smiles of Qureshi Sahib will ever remain imprinted on my memory. The enviable hours I have had the honour of spending with our learned Sheikh Sahib and their sobering and illuminating effect; the happy afternoons and seminary periods spent with Prof. Latif and our frequent interruptions of his lectures which he would take most good-humouredly; the parties at Dean Sahib's when often I managed to drift his discourses on theology into the sphere of gastronomy and his unfailing interest in both;—these and more, I shall ever cherish in my heart. I may go away from the scene but these happy memories, I am sure, will constantly brighten up my future life.

Can I also forget the most welcome company of my friends and their peculiar manners and idiosyncracies which I so liked and loved. There was Bashir with everything mechanical about him—the reading, the writing, the greeting and even the walking—, his house-wife capacities were what I liked even more than his uprightness. Zaman who would often manage to make too much of an imaginary grievance was, in spite of it, a most happy companion with his raillery and wit and constant tussle with Hashim. And Hashim too, simple soul, was a nice company—so good-natured and malleable he was. The two Munirs, S. D. and F. B., were the lights of many of my otherwise dark hours. There were many more also, I am proud to say, who were the source of much comfort and pleasure to me during my stay at College. I shall ever remember them.

of the impending separation. But how long. Close we may our eyes to the sullen realities, do they ever spare us ? I naturally counted the days of the period yet intervening between us and the examination, and was thus only too painfully reminded again and again that I was now but a guest of the college and that soon I would be a stranger.

I made every effort to forget this; I even ceased thinking of my examination which was so closely linked with my final departure from the dear old college; I tried to drink, as deep as I could of my life here; I threw myself heart and soul into my studies and into the enjoyment of the various pleasant college features, whichever offered itself. And these helped me much in veiling the future.

But what of the students and professors. Their attitude I must confess, is very unchivalrous at such times. They too look upon us as upon guests and even sometimes consider us as good as gone. The more ambitious amongst the younger students envy us and want us to vacate the coveted seats in the societies or on the playgrounds, for them. We are no longer students but mere intruders: the tutors pay more attention to those who are yet to remain in the college for some time; the superintendents of games concentrate their efforts on less temporary hands; and the bearers dread more the would-be chiefs. Even the friends we had made become more sparing in their show of intimacy and divert their affections in more lasting directions. All this is but natural, I admit, and often even unconscious. No real offence or closure may be meant. But it is enough to sting us. College affections, we know, only extend to our term of life here but why should we be made to realise this before the appointed hour. Our own teachers only, however, provide us an anchorage in this sea of mild selfishness. They devote now greater attention to us than ever, and are more generous and kind. The trees, the flowers, the green grass and the placid buildings also give a relief: they don't seem to say, "You are soon to go away;" they are as welcome sights as ever.

Now that this feeling that 'the college is no longer ours and we are no longer of the college' hangs heavy on us in spite of ourselves, we realize what college is to students, and has been to us. We often grumbled at the unending cycle of examinations and their terrors, but now they sink into insignificance as we view back our past career here, of happiness, carelessness, comfort and peace. I wish I had known it earlier and swallowed even more of the college. I have done pretty well in studies and have served many societies and have made many friendships, but I wish I had done even more.

Now that I am shortly to go away I realize fully what I'm going forward to and what I am leaving behind. Even before I have left

Fond memory brings the light

Of other days around me,

and makes me conscious of my great loss.

I shall leave behind the old familiar faces, and the old familiar sights. The friends I have known and loved, the professors I have admired

but most of his compeers have the art of concealing their cowardice under a well conceived bluff. Falstaff, Dogberry and Touch-Stone belong to this honourable group of bluffing theatricalities. Even Shakespearean kings have some cowardice which they hide under their imperial magniloquence.

A friend of mine was detected misappropriating the Sola hat of his pappa; and when he was impeached for his audacity he dismissed the whole painful episode by saying: "fathers are such poor stuff." Of course, fathers are not very desirable when they help our friends to discover the real owner of our clothes which give us a theatrical charm.

Excuse me a cynical remark if I say that our modern age is awfully helpful to our borrowed plumes. One need not tell you the sad business of purchasing second-hand hats and suits. Man is a pedantic animal.

Readers might laugh on these theatricalities with impunity. But there are theatricalities among readers and listeners too. Once a professor surprised a diligent student by asking him: "Do you understand Sordello." The student who wanted to create an impression of his mock-dignity blurted out 'Yes Sir.' The next question, as a natural corollary was 'Can you explain it?' There was just an innocent blush and the boy acknowledged his defeat by saying: "Sir, it is not explained in Munshi Ram's note."

I fear I am getting on your nerves. I should make a retreat before you say: "But you play an invincible bore."

GHULAM JILANI ASGHAR.
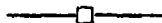
MY SWAN-SONG

The Christmas had come and passed, and with it had passed the year 1939. The New Year dawned upon us as all previous new years had and though there was great hue and cry in the papers and elsewhere that a new era, a new period of human history, had set in, such a feeling I thought, must be a purely subjective one, for I observed or noticed nothing new, nothing unusual around me—the same old life and the same old people were before my eyes. But I was yet to see. As soon as our January examination had passed and we had enjoyed a sufficiently long interval of rest, we became aware of the monster of the University Examination that loomed large ahead. But this was not much : we had become used to such visitations. However, this time along with a sense of the long labour and the terrible ordeal that awaited us, another feeling—the feeling that we had but a very limited lease of college life left to us now—crept most inevitably and surely upon us, sickening our hearts and paralysing our energies. It was now that I realized that a new year, a new era, indeed, had set in in my life.

For some time one 'activity' or another, some party, meeting or athletic function occupied me and saved me temporarily the bitter thoughts

"terrible, terrible. But there is One above. . . ." she replied, "Yes, he's just changing his socks. He will be down in a minute." But there are very few domestic Mrs. Gladstones, otherwise all poor husbands will find themselves in the limelight of popularity.

Last year an old M. L. A. was caught red-handed. He was wearing a well-tailored suit. He had all the outward graces of an English-knowing gentleman, but when a visitor addressed him in English he found himself in an awkward predicament He gave expression to feelings, meant to be indicative of his born antipathy to all things foreign. The audacious gentleman, who had addressed the venerable member, always remembered afterwards that his old gentleman belonged to that "Parliamentary Species" who expressed their opinions by raising a hand or giving a sanctimonious nod.

You will accuse me of intellectual myopia if I leave out "educational theatricalities." Once, a professor who had the moderate dimensions of Dr. Johnson, attempted to speak in the same elephantine style. He was successful in making "little fishes talk like whales." In the end when the period was over he just asked in the customary way; "do you follow." A boy stood up and made a low complaint against the difficult language of the learned professor. The professor dismissed the whole thing by making a condescending confession, "O, I talk like great Dr. Johnson." It is needless to say that actually the professor had only the dimensions of the big Doctor.

Another professor used to awe his poor students by indulging in the clap-trap of Piccadilly and Downing Street. When his pupils asked him to explain the meanings of some hybrid phrase, he related to them his romantic voyage to America. I still remember my school days when our History teacher gave us an elaborate account of Queen Elizabeth's grand amour de convenance, when he was asked about the Spanish Armada.

Perhaps, Charles Lamb was a literary 'theatricality.' He will tell you that he is talking about 'The Old China,' or 'Bachelor's Complaint' and in the end you will feel that all the time he had been talking about his financial embarrassments or about the madness of his crack-brained sister. Coleridge tells you that he is talking about the 'Frost at Midnight,' but contrary to all sacred hopes, his German metaphysics and his Omnipotent Opium creeps in imperceptibly. And when you ask : 'Mr. Coleridge you have led us away from what you promised !' He replies :

> "The inmates of my cottage, all at rest,
>
> Have left me to that solitude, which suits
>
> Abstruser musing."

And even again if you chaff at his treatment he gags your mouth with his high-sounding, pseudo-poetic 'pantisocracy' and 'esemplastic.'

This art of assuming an undue advantage is not limited only to a Browning, a Coleridge or a Lamb, even the most ordinary laymen have this tendency. Hamlet thought that 'one may bluff and bluff and be a coward,'

Leaving his heroes aside, I will mention some of the daring "theatricalities" that always trouble us, poor, matter-of-fact mortals with their borrowed plumes. Poets, politicians, professors, students, in short men of all crafts and colours have their make-up which gives them a grandiose show of magnificence.

An old girl once called Browning "an exuberant financier." Browning had an over-worked tendency of appearing in duck white suits, with all the foppishness of a two penny dandy. Perhaps he liked to put on an appearance of defiance to his readers who hounded him to tell them the meanings of his hieroglyphical 'sordello' Byron was also one of these time-honoured 'theatricalities.' And when the English society disliked his Byronic make-believe grandeur, he ran away to die at Missolonghi.

Politicians have always occupied a conspicuous place in this 'Pantheon' of accredited theatricalities. Dizzy, the old octogenarian child kept up his brilliant kerchiefs to the last. Imagine a tottering Jew, with all his womanish draperies, rising into prominence in the Victorian society! But he made a good show. Gladstone, despite the mysterious sacredness about him, could not receive those vociferous cheers which were lavished on his Jew opponent. It is said about Dizzy, that he cut a very sorry figure in the first "elocutionary contest" held in the Parliamentary Chambers, but soon he won his spurs by displaying his theatrical greatness. Lytton Strachey tells us that he had flawless trousers and spotless gloves, perhaps trousers and gloves play a noticeabe part in our greatness! Of course, that is why the Victorians called trousers—'Indispensible.'

One of our prominent religious leaders displayed a feat of intellectual ingenuity at the time of the death of his father who was also a great political leader. The son accompanied the funeral procession in his father's big coat which hung ridiculously loosely on his small shoulders. He was carrying his father's stick, and even imitated his father's solemn low voice when he delivered the funeral speech. He burst out into a rodomontade of hysterical weeping in the peroration, thus fully imitating the elocutionary devices of Mark Antony. Most of the audience thought that the Pappa's big woollen mantle had fallen on his son. But I differ from this ungenerous opinion. I think the father's posthumous spirit embodied in the coat and the stick was working in the son. Hamlet hoped that "a great man's memory may outlive his life half a year." But Hamlet usually made wrong generalizations, and this is one of the wrong prophecies which he uttered during a fit of lunacy. The old father is still living in his worthy son. Whenever I see his old coat and his stick, I am reminded of the old leader who used to utter great political lies on the public platform. If lies are hereditary, then his son is a very apt descendant of his father. People say, 'it is a stupid child who knows less than his father.' Of course! but not so stupid as a child who knows fewer lies than his father. To tell a plausible lie is one of the classical virtues of a good 'theatricality.'

Mrs. Gladstone acted wisely when she emphasised the theatrical grandeur of her lord. When a female friend was lamenting the terrible state of affairs in Ireland or somewhere, and winding up her lament with

To a lay man, and to some others also who do not belong to this reprehensible category, style is ornament, a decoration, a beauty added to an otherwise simple theme. It is a complicated way of saying something simple. For example Sir Thomas Browne instead of saying "But it is time to go to bed", says in his Cyrus Garden:—

"But the Quincunx of Heaven runs low and it is time to close the five ports of knowledge. We are unwilling to spin out our waking thoughts into the phantasms of sleep which often continueth praecogitations making cables of cob webs and wildernesses of handsome groves———" and so on for a whole page.

Now this certainly is an ornamental and an elaborate style characteristic of its author. There could be no better example of the hackneyed dictum of Buffon, "style is the man himself." The ornament here is not something added from the outside but a fundamental part of the author's way of thinking. True style says Remy de Gourmont is as personal as the colour of one's eyes or the sound of one's voice. In any writer of any note we seem to hear the inflexions of his living voice in his style. To write as Flaubert understood it, is to exist, to be one's self. To have a style is to speak in the midst of the common language a peculiar dialect, unique and inimitable, yet so constituted as to be at once the language of all and the language of an individual. Style says Middleton Murray, is, in this absolute sense, a complete fusion of the personal and the universal. It is not an ornament, it is not an exercise not a caper, nor complication of any sort; it is the sense of one's self, the knowledge of what one wants to say and the saying of it in the most fitting words. It is when we approach style in this manner that it becomes synonymous with Form. Form must be the form of the mind. Not a way of saying things but of thinking them.

Let us then not separate the element of style in good writing—well remember Swift's **The Tale of a Tub** "Last week I saw a woman flayed and you will hardly believe how much it altered her person for the worse."

I. H.

———□———

THEATRICALITIES

Carlyle was rightly given the title of the "Sage of Chelsea" for, often in a paroxysm of occasional prophethood, he could talk very wisely. In spite of his moderately good vocabulary, he was always seriously prone to "neologise." He has stuffed his heroes with such personal idiosyncrasies. "Theatricalities" is one of those characteristic neologisms. His heroes are not men of straw, and not merely human dwarfs clad in giantish robes. To speak more precisely, his heroes are not only superficially great, but they have some intrinsic greatness,

There is nothing really obscure in all this. What it amounts to is that matters separate from form are not known in poetry or the other arts. A mathematical or medical formula can be conveyed in any language. It does not matter how one expresses a scientific truth so long as one gets it into the minds of those who want it. Scientific truth is general; poetic thought is particular or perhaps individual. One can not explain the meaning of a poem any more than one can describe an individual person. A poem, like a human being, possesses 'individual uniqueness'.

This identity of content and form gives to a work of art its unity and is, as Bradley says, of the very essence of all art, so far as it is art. "Just as there is in music no sound on one side and a meaning on the other, but expressive sound; just as in painting there is not a meaning plus paint but a meaning in paint or significant paint, so in a poem the true content and the true form neither exist nor can be imagined apart." Form is a means to an end and not an end itself.

So we arrive at this conclusion; When we are in the midst of the poetic experience or of the aesthetic experience, it is irrelevent to make distinctions of theme or style. That does not mean that these two aspects are not notionally separable in an analytical mood. When we are out of the poetic experience we may by analysis decompose this unity and think of theme or style separately as we think for instance of the material of a billiard ball and its form. Regarded in this way what are the themes of literature? Aldous Huxley in one of his essays says that art deals mostly with the obvious. There are some great obvious truths of life, like, the love of the parents for their children, the enjoyment of the countryside, the love of one's own home and country, the shortness of life, the uncertainty of joy and so forth. These truths have eternal and universal significance and form the themes of literature. But the popular artist states these truths with hopeless incompetence, making them exceedingly distasteful even painful to the sensitive reader. The fact that mothers love their children is, as pointed out, one of the great obvious truths of life. "But when this great obvious truth is affirmed," says Huxley, "in a nauseatingly treachly mammy song in a series of soulful closeups, in a post-Welcoxian lyric or a page of magazine-story prose, the sensitive can only wince and avert their faces, blushing with a kind of vicarious shame for the whole of humanity." Thus although the theme is great it is given a deplorably nauseating expression. Similarly if we take a modern Hollywood film its theme may be the same as that of Othello, i.e. sexual jealousy, but how cheap and vulgar the treatment usually is as compared to Shakespeare's. A French critic has estimated that there are only thirty six possible situations for novels and plays but one can go even further and say that there are only four. Man taken as the centre can have relation with himself, with other men, with the other sex and with the infinite, God or Nature. A piece of literature must take one of these for its theme. How limited the themes but how various actually are the literatures of the world! If man did not have style as a means of achieving variety, every thing would be said in the first hundred years of literature and how boringly it would be said!

But what is this style that gives to the theme its remarkableness, its uniqueness.

as a whole, then it has no poetical value, and any consideration of it is irrelevent for our purposes.

But the terms theme or substance and style or form can be used, and are frequently used, as forming an antithesis **inside** the poem. Substance is within the poem and its opposite form is also within the poem. Here substance would mean the subject matter, the so-called ideas of the poem and form the technical aspect of those ideas. This contention implies that there are in a poem two parts, factors, or components, a substance and a form and that you can conceive them distinctly and separately so that when you are speaking of the one you are not speaking of the other. Otherwise how can you ask the question in which of them does the value lie? But really in a poem there are no such factors or components and therefore it is strictly nonsense to ask in which of them the value lies. **Paradise Lost** is form and matter but how distinguish between them inside the poem. The story of **Paradise Lost** may be separated from the poem but if so there remains no longer the poem as Milton wrote it. The effect on the mind is quite different. What are we then to think but that the matter has passed into the form or that there is identification of matter and form. The poem does not convey a certain ornamental translation of something you know separately. It conveys the story, thought, spirit, music, figures and so on all together. Poetry is in one sense all form. And all form is expression. One must note that the same thing may be said of all the fine arts. What they convey to the mind is not properly the artistic treatment of the subject but the subject so translated into form that the mind does not want anything else.

To say that poetry is form, does not mean that poetry is meaningless or wanting in substance. It only means that what poetry or any fine art **means** cannot be put in any other form but that of the original. Take for example Hamlet's "To be or not to be that is the question." Can one say that it means the same as: "What is just now occupying my attention is the comparative disadvantages of continuing to live or putting an end to myself."

Shakespeare's line gives us the exact state of Hamlet's mind in a crisis, while the so called meaning of it in our words entirely misrepresents Hamlet at that moment of his existence. The Hamlet that we know could not have talked this journalese.

Of course there are different kinds of poetry and there is a difference of scale, or rather a difference of degree, in the quality of life put into the poem. The poetic meaning of the passage in Milton "Fame is no plant that grows on mortal soil", is different from that of "Looks toward Namancos and Bayona's hold." In the immeasurable dignity of the first passage it is the thought that tells; in the second the superficial beauty of sound. One may take these two quotations as showing what is meant by "poetic matter." In the first passage however one can no more separate form and matter than in the second. The thought on true fame does not constitute a moral or philosophical or religious theme that can be conveyed to the mind without poetry. It is nothing except as Milton expressed it.

which anyone can tell as he likes in his own way. The form is Milton's way of telling it. That seems obvious enough. His very words are the form then?

From another point of view, however, which is just as common, it is the scheme or the argument that is the form and the poet's very words are the matter with which it is filled. The form is not that with which you are immediately presented or that which fills your ears when the poem is recited—it is the abstract original scheme from which the poet began, which may be detected by examination of the poem and by abstraction from every thing except this outline. Now it is the form and not the matter that is given in the arguments to the several books. The terms have, thus, exchanged meanings. The confusion between these two senses is probably recognised by everyone who has tried to criticize any poetical work at all and is felt as a danger to be guarded against in the use of critical language.

Let us try, now, to resolve in another way this antithesis of theme and style. In the first place then, let us take subject or theme in one particular sense; let us understand by it that which we have in view, when looking at the title of an unread poem, we say that the poet has chosen this or that for his subject. The subject of **Paradise Lost** would be the story of the Fall of Man, as that story exists in the general imagination of a Bible-reading people. The subject of Shelley's stanzas **To a Skylark**, would be the ideas which arise in the mind of an educated person, when without knowing the poem he hears the word "Skylark." Now the subject in this sense is not as such inside the poem but outside it. The contents of the stanzas **To a Skylark** are not the ideas suggested by the word 'Skylark' to the average man; they belong to Shelley just as much as the language. The subject or theme, therefore, is not the matter of the poem at all; and its opposite is not the form of the poem but the whole poem. This being so, it is surely obvious that the poetic value cannot be in the subject, but lies entirely in its opposite—the poem. How can the subject determine the value when on one and the same subject poems may be written of all degrees of merit and demerit; when a perfect poem may be composed on a subject so slight as a pet sparrow and a worthless poem on a subject so stupendous as the omnipresence of the Deity?

So far then the "formalist" appears to be right. But he goes too far, according to Bradley, if he maintains that the subject is indifferent and that all subjects are the same to poetry. And he does not prove his point by observing that a good poem might be written on a pin's head and a bad one on the Fall of Man. The truth shows that the subject settles nothing—but not that it counts for nothing. The Fall of Man is really a more favourable subject than a pin's head. The fall of Man, that is to say, offers poetic effects wider in range and more penetrating in its appeal. The theme in Wordsworth's words, has potentialities of being "manifestly and palpably material to us as enjoying and suffering beings." The theme has a human significance.

So far, then, we have arrived at this: If by Theme or subject we mean something that is outside the poem and is contrasted to the poem

RESTATEMENTS: THEME OR STYLE

(Acknowledged to the All-India Radio, Lahore)

A French writer relates that a few years ago a man whose name was Fauchois gave a lecture at the Odeon on the French dramatist Racine, in the course of which he made some disparaging remark about his dullness, lack of invention and the rest of it. This caused an immediate riot, a fight took place all over the house; several people were arrested and imprisoned and the rest of the series of lectures took place with hundreds of gendarmes and detectives scattered all over the place. These people interrupted because the classical ideal was a real thing to them and Racine was the great classic. That is what I call a real vital interest in literature. So let it not be imagined that heads can only be broken over religion or politics or women!

The critical controversy over Theme and Style, has, I am sorry to disappoint you, not assumed such bloody and picturesque dimensions as this on Classical and Romantic. The pith of our controversy can be stated in the following little anecdote:

Degas, a French painter and a writer of occasional sonnets, on one occasion found that his inspiration had run dry. In his distress he went to his friend Mallarme. "I can't understand it", he said, "my poem won't come out and yet I am full of excellent ideas." "My dear Degas", was Mallarme's reply, "poetry is not written with ideas; it is written with words."

The controversy, that is to say, is between the relative importance in literature of ideas or words, content or form, subject or treatment, Theme or Style. Most controversies of literary criticism arise because of the extremely fluid and elastic nature of literary terms. Words like 'romantic,' 'classic,' 'nature,' 'form' and 'style' are protean, thought-confounding words and most of the time the controversialists do not know what they are talking about.

When we talk of the form of a poem what do we mean? We talk of the form of a poem, we talk of its matter. As soon as we begin to examine into the meaning of these terms they not only elude us but they even exchange their meanings, as may be demonstrated. What, for example, is the matter of **Paradise Lost,** as contrasted with its form? Naturally one answers that the matter is the whole history, the subject treated, all the action of the poem that admits of being looked at, or described, in other words than those of Milton. The form, then, will be Milton's own rendering of the poem; the poetical rendering of the matter, which he presents in a different form in the arguments, the prose summaries which he wrote for the particular books. The matter of **Paradise Lost** is the story

I never could imagine human nature stoop so low. It's jorring. It shatters my faith in humanity. It puts me to shame—Me! who believes in the highest possibilities of human nature—Me! whose creed is "Beauty is truth, truth, beauty."—Oh! Sol, you don't know what pangs I feel when I see this highest truth throttled by human nature.

Soleno—But the fault is yours. All these months I persuaded you to behave humanly. Convince the Academy chief of your innocence. You never cared. Your idealism turned your head. Now you must suffer.

Ferdinand—Suffer what? indifference!—ignominy,—dark scandal! I care a twopence for all these. My malady lies elsewhere. Neither the secretary nor the chief can shake it off from me. It's deep. O! soul deep. I am losing faith in Humanity—in Beauty—in Truth. I cannot afford that If that's gone what else remains, Sol! What is life without faith in Beauty. in Truth—in the higher possibilities of humanity.

Soleno—That's really ideal! But to build up that ideal we must look into life's realities. What ideals will stand without these? Look around yourself, can you find that support? Miss Burton couldn't be a genuine one, I fear.

Ferdinand—How say you that? She is a beauty, she cannot be false, she cannot belie her nature. (Stands up and faces the portrait on the mantle-piece). Yes! she cannot be false. So innocent a face to have so vicious a mind! That's impossible. But ha! look at her eyes—a terrible look is in them—(draws back) her lips—O! a horrible smile's there—(draws back a little more) her tresses—heaven forbid! Snakes, snakes—they devour me (takes Soleno's stick and strikes at the portrait) there, there you curly snakes (the picture is torn) that beauty? Where's that beauty. Gone! changed to ugliness! No, that cannot be. Beauty is eternal. This was a picture—a horrible picture—Let me see the original—The original—let me see the original!

He runs madly out of the room. Soleno following him cries in anger "cursed society! now have it". Roderic stands perplexed and sings—

This is famous London town
Town of scandal and renown.

(A sharp knock at the door. Roderic moves towards it—Enter Jones, the art critic, Nichol and Davidson)

Jones—Where's thy master, old man.

Roderic—Gone to see the original, sir!

M. M. KALEEM.

SCENE IV

(Young artist's living room—11 a.m.—Ferdinand sits in a chair calm and pensive. He has a newspaper in one hand. Old Roderic stands by the door with his head drooping).

Ferdinand—So I. . . . the tailor has filed a suit. Couldn't you stop him, Roderic? You said he was an old friend of yours.

Roderic—What does friendship count! Money is the thing, master. I did my best to stop him. "Your money is safe, Drummond! Don't go that length—" say I. "Nothing can be safe with a scoundrel, old man. Your master is a scoundrel. The world has marked him out. Here's a paper, just peep into it and you will see all"—says he and hands over this paper to me. Plain man as I am, I could'nt see what all that meant and brought you that paper. Now, I care a hang for what the world says. I only wish I could pay them bills and stop their damned tongues.

Ferdinand—Bills or no bills, the world will not change its mind. Give the dog a bad name and hang him! that's our society's motto. Then newspaper men ! what else have they to do but spread scandal. That's a paying job, Roderic. But I know not why human beings should bow before the idols of gold and silver. Is'nt beauty enough? Will not truth suffice?

Roderic—That's above my hoary head, master. I am a plain man. I know that truth is truth when you get your two meals properly. When you starve truth takes wings and flies heavenward. But worry not, master! Hav'nt you heard boys singing:

This is famous London town
Town of Scandal and renown
Listen all but do not trust
Lest your conscience may go rust.

Life's sweet and sour cannot be separated. No rose without a thorn, says the wise man. You have had the thorn prick, master; the rose isn't far off.

(At this Soleno enters the room. A top hat in one hand, a long cane in the other. Draws a chair and sits beside Ferdinand. Without a word Ferdinand holds out that newspaper to him. He takes it and opens).

Soleno—Anything new, Ferdi!

Ferdinand—Old wine in new bottles! Society's parasites playing the harlequins to amuse their godess. A godess with elephant's ears and ant's eyes; a godess who can laugh at a murder and weep over life's most trifling theme. Murderers, adulterers, drunkards, gamblers and cut-thoats can be her angels if only they can hide their dark doings or if only they can cover them up with silver and gold. This godess sits laughing at her harlequins' feats again. Open page three and read that note on the scoundrel's art. 'Twill amuse you. (Soleno opens and reads slowly)

Nancy tell me what's at the bottom of this affair ? They say she was hired into a conspiracy.

Mrs. Samson—How am I to know that ? Jack ! don't blame the poor girl. She isn't that stuff. She has been with us for the last two years and I know her for a perfect gentlewoman.

Nichol—But she is poor And you know money can buy poor angels even.

Mrs. Samson—You think too low of a woman. Jack.

Nichol—Dash it ! You know all and you hide it from me. Nancy (he draws near and puts his right arm round her) mine own Nancy! Can you grow so indifferent to me ? I never expected that, darling! (Mrs. Samson smiles and leans her head against his breast).

Mrs. Samson—(Slowly) But, dear Jack, why are you so keen about it. I know it all. But I cannot disclose a woman's secret.

Nichol—Secret or no secret ! I want to know the truth (presses her to his bosom).

Mrs. Samson—Oh ! It is a sweet mischief Jack. Miss Burton was bribed by some one. Your scoundrel is innocent. It was all a conspriacy. She is poor; she did it for money's sake. (She looks sheepishly into his eyes and smiles).

Nichol—But who bribed her ? That's what I want to know (She draws away).

Mrs. Samson—That I can't tell. You wanted the truth, you have it. The rest is beside the point.

Nichol—It is half the truth I must have the whole of it. (He leans against the farther arm of the sofa and looks at her sadly). Well ! Nancy you keep secrets now. . . . very well ! treat me as you like (at this Mrs. Samson draws near and places her head on his bossom).

Mrs. Samson—No ! My own Jack ! Don't be annoyed ! Shall I keep secrets from you whom I have given my all. . . . Jacobs and his circle bribed Joan !

Nichol— Jacobs ! Jacobs ! (at this Miss Burton enters. She has a bewildered look).

Miss Burton—Well ! Did he really say—"This innocent face to have so vicious a mind. It's impossible."—Whose portrait was it ? Oh ! tell me, tell me whose picture could it be !

(Mrs. Samson jumps up and catching hold of Miss Burton's arm leads her out of the room. At the door she looks back and winks at Nichol who stands up and goes out saying—"We have to bow to Jone's poetry, after all ! How joyfully will he receive this news !"

talks to so often. Mental derangement, perhaps. Poor soul ! he has been awfully maltreated. (Looks at Miss Burton who grows pale).

Mrs. Samson—Maltreated ! How do you say that ? I think he hasn't yet been served well. The Secretary has saved him, else society must have torn him to pieces.

Nichol—That's unjust ! If he is really affected in the brain it is horrible. Society has its moods that come and go. It will change its mind about him, though, I am afraid, too late. Falsehood cannot live long; nor puritanical sense go on for ever. (Miss Burton looks worried).

Mrs. Samson—You seem to be so very much prophetic to-day. Society's judgment cannot be questioned ! When it rises to strike there's nothing to check it. Your artist is a scoundrel. He must be crushed under heel. That's society's decision and it will stick to it. Men usually be-little the crimes of their own sex and thus weaken the strong hand of retribution. Art is more the woman's domain; she cannot tolerate a black sheep there.

Nichol—Excuse me ! Woman is the more volatile. Her sphere seldom retains the same colour for long. She builds one moment and destroys another. That is so because she is never sure of herself. The beauty in her strives to express itself but her creative instinct is too weak to meet that demand. In woman's domain a scoundrel to-day can be an angel tomorrow.

Mrs. Samson—That's looking amiss ! Woman doesn't condemn unheard, for she is not very sensitive of that so-called self-respect of which man brags so often. She strikes when nothing else avails.

Miss Burton—But is he gone mad ? What's his madness like ?

Nichol—Soleno, his friend, told me that he is often heard to say—"That's impossible! I cannot believe it. Such innocent a face to have so vicious a mind. . . . I can't believe it."

Miss Burton—That's a strange malady. Whose portrait could it be?

Nichol—I can't say. A woman's, presumably ! (At this Miss Burton rises to go—Has puzzled looks and drooping head—Takes a few steps towards the door and looks back—"Mrs. Samson ! Should I go ?" —again moves to the door; looks back again—"You know it all, madame! —Should I go, then"—Mrs. Samson goes up to her, whispers something and leads her out of the room. She returns after a while and walks up to Nichol who is smiling).

Mrs. Samson—Oh ! What a horror ! You were driving her mad. Poor girl! she couldn't bear the shock and I fear worse is to come. What a frail creature a woman is ! Soul alive, she is a hell of emotions. Soul dead, she can face the very hell. How came you here with that scoundrel in mind, Jack.

Nichol—Be not cruel ! The man's no scoundrel. This Miss Burton of yours is a witch. I fear she will drag you to hell some day. Now,

I may not. But the world will not forgive you. The historians of fine arts will condemn Frovinsky and Sons for this base treatment of an helpless artist.

Frovinsky—It is not my fault, young friend! You have ruined yourself through that sad affair with Miss Burton. The society has taken its revenge; it has turned its back upon your art. What am I to do? A plain businessman, I deal in popular pictures. Yours were popular a year ago; now you are condemned. How can I hang them; nobody buys a scoundrel's art.

Ferdinand—I am a scoundrel, then....Very well! You can go. Go, sell the angel's art. I am a man; I will paint for men alone. (Frovinsky rises and seeing the other two quiet and still moves out of the door. The two friends keep silent for a while, then Ferdinand gets up and places the portrait on the mantle-piece and is heard to say)—"It's impossible I cannot believe it!....This innocent face to have so vicious a mind!"

Soleno—Alas! you artists have strange notions. (Pats the artist on the shoulder and goes out).

SCENE III

(9 p.m.—a drawing room in a hotel. Miss Burton and Mrs. Samson reclining in a sofa. Miss Burton lighting a cigarette. A knock at the door).

Mrs. Samson—Yes! Come in, please! (The door opens and the big-bellied Mr. Nichol enters. Both the ladies rise—Mrs. Samson extends a hand) Hallo! Mr. Nichol! How do you do? (They shake hands). Here is Miss Burton. You know each other, perhaps. Don't you?

Miss Burton—We do! (all smile). We were together at the spring races. And, then, we have met many a time since. (Nichol smiles at her and nods—all take seats).

Mrs. Samson—Oh! your mention of the spring races has reminded me of old Sir Oliver Dunderhead. Poor soul! now he lies well buried. A jolly man he was. He took me round the country-side so often. His chestnut mare was beautiful to ride. Oh! I cannot forget his hospitality.

Miss Burton—I was also introduced to him that spring. That young painter was with me and said "there's Sir Oliver Dunderhead. Would you like to see him? He is a great lover of art." I consented and we paced up to him. He had a very genial smile. None could remain a stranger with him for long.

Mrs. Samson—Oh! yes. But, by the way, where's that young artist these days? Somebody said he was leaving England. Leave he must. He has stayed rather too long! You saw nothing of him again, Joan? (Laughs heartily but the other lady looks abashed).

Miss Burton—No! God forbid.

Nichol—I met his friend, Soleno, the other day and he told me that the artist was in a very bad way. He has a portrait with him which he

Ferdinand—Let the world do its worst. We are here to reconstruct life after our own hearts' desire. Men cannot ignore us. Our personality may be eclipsed for a day or two; it is bound to impress itself on the face of eternity. For we detach the eternal from the ephemeral and give it the stamp of our mind. Scandalise us as much as the world can, it cannot lessen a jot of our influence.

Soleno—Away with this idealism! I speak of the present and my gentleman lives in the future. Look at things as they stand. Reconstruct them if you can. Now when you are marked down for a scoundrel, who will care for your art. Have'nt you read the spirit of the time in these eight months of ignominy, ridicule and helplessness. If this goes on how are you to live?

Ferdinand—As Byron lived in Italy—as great Goethe lived in Germany. So! why should we worry about that which God has to look after. If we can do our part well, can He not do His own? I am not at all worried on that account. My dilemma is, how on earth could beauty play so foul a part. (He stands up and faces the portrait on the mantle-piece). Oh! what does it mean? Isn't she beautiful? Who can deny that. Look at her eyes!......eyes (stares) eyes; why they have hateful looks!——No! look at her lips......(stares) they are twitching, what's that? There's no smile on them. That's terrible (raises his hand for shelter and cries out) O! save me! save me from this demonish figure—— Save me! (Soleno who has been looking at all this calmly jumps to his feet).

Soleno—What's that, boy! Are you mad? Look this way (catches him by the shoulder and turns him round and then seeing a strange horror in his face) you silly lad! you will go mad if you look at that picture again. It must be removed from this place. (Goes to the mantle-piece and takes up the picture) O! the horror of it! Miss Burton, most monstrous! Who could paint her so bright, give her such an angelic face? I must smash it into pieces. (Snatches his long cane to strike at it. Ferdinand who has recovered by this time moves forward and catches one end of the big frame).

Ferdinand—Please don't! It is'nt her fault. She must have been duped into this conspiracy. Innocent soul she knew nothing of the wound she was inflicting. Money is all—we can buy the rest.

Soleno—(leaving the picture) you artists have strange notions. (enters Roderic)

Roderic—Monsieur Frovinsky has come to see you, master!

Ferdinand—Show him in! (Frovinsky, the picture dealer, comes in and is seated in a chair). I received your foolish note and gave it the treatment it merited. There it lies (pointing to the ground) trampled under feet. You think if you do not advance me money I will starve. I may;

marks. I have left stirring out of door. This wide world's against us. For what you might ask ? For silly tomfoolery !

Ferdinand—(nodding his head) I see it all—I see it all every well! Rod! this world is a hard place. Money is everything. You can buy all else.

Roderic—Hard or soft one has to end one's days. Money can bridle the tongue of these knaves—these tailors and washermen all. They are vultures without bills. 'Money or no money, that's the question.

Ferdinand—(smiles coolly) Worry not, old man! Let Frovinsky come and you will get a handful. (enters Soleno, a middle-aged man with big moustaches. He has a top hat in one hand, a long cane in the other. Roderic bows to him and goes out. The two friends look at each other coolly and seat themselves in the chairs beside the fire-place.)

Soleno—What's up Ferdi? you look a bit excited.

Ferdinand—Do I? That's only a passing emotion.

Soleno—But what made it pass at all?

Ferdinand—The same old tale. Our cultured society's tribute to her artist. A sweet reward, Sol !

Soleno—And you are contented with it!

Ferdinand—What else can I do!

Soleno—Nothing better than clearing your position. Have you seen the secretary ? What does he think ?

Ferdinand—Yes! I have. He had a doubtful look and throughout our interview kept a reserve that was most painful. Had he hinted at the affair I must have told him all, of course, all! For he is the one man I want to satisfy. I should have told him that as an artist I want to experience every phase of existence. I want to live every moment of my life. I wish to know the secrets of a womans' heart, to see how those secrets influence her person when they are revealed. He is himself an artist, Sol ! he must have experienced all this. He could realize my position very well. Only an artist can! The rest of the world has different standards. It breaks you up if you don't fit into its scheme of things. But I couldn't say a word. His austerity was not encouraging.

Soleno—You artists have strange notions. A man of fifty, how could he talk to you like boys. You should have sensed the right moment and poured out your heart.

Ferdinand—An artist never imposes himself on others. How could I impose myself on my patron.

Soleno—Then you will keep tending these artistic scruples and the world will do its worst.

of emotions; a philosopher is an artist—the artist of ideas. A sense of adjustment and propriety is innate in them all.

Nichol—That's all poetry ! It will not convince Dan ! the philosopher. If you are at all interested in this topic, handle it on the concrete side. I mean, let us try to ascertain the fact about this incident. If it turns out to be false let us bow to Mr. Jones's poetry, otherwise Dan's logic wins the field.

Davidson—But how can we ! Who can trace these dark-corner incidents? And if we could where lies the need for it? The world will care a hang for our discovery. Nothing can change its mind.

Jones—Change or no change ! Why worry about that ! Pay back this indifferent world in its own coin. But let us sift truth from falsehood. That, too, is a great sport.

Davidson—All right ! We will. Mrs. Samson might give some clue. Nicky can easily get that out of her. She is his sweety ! ha ha ha (chuckles).

(They rise, Mr. Jones shakes hands with both and leaves the room.)

SCENE II

(A small stuffy room in a third class restaurant. A mattress by the western wall, three ordinary chairs beside the fire-place. A portrait on the mantle-piece. Young Ferdinand, with a set face, pacing to and fro in the room. His hands folded behind; his head drooping. Now and then he looks at the portrait on the mantle-piece, smiles and is heard to say)—"oh! that's impossible! I cannot believe it.......This innocent face to have so vicious a mind........I cannot believe it!" (He goes up to the portrait and looks at it keenly—stands aghast! cries out)—Why, the figure changes ! How's that ? What do these distorted lips mean ?—These flashing eyes taking on a hateful look?—These pink checks turning pale ? Oh ! it blackens ! It is growing abominable—nay terrible ! (steps a little back and raises his right arm to hide his face)—(enters Roderic, the old servant, with a letter. Ferdinand turns round—Roderic looks at him in wonder).

Roderic—What's the matter, master ! Are you ill ?

Ferdinand—No! I am all right. That was only a passing emotion. What news do you bring? Is Frovinsky coming?

Roderic—Here's the note that Shylock has sent. (Hands it over. Ferdinand opens to read it—his face is all the time a mirror of his feelings—he throws the letter down, tramples it under his feet and cries in anger).

Ferdinand.—What the hell does it mean? Am I doomed for ever ? No, this Jewish dog won't treat me like this any more. I cannot tolerate his remarks.

Roderic—Not his remarks alone ! This wide world's against us, master. The tailor, the grocer, the washerman—all, all pass cutting re-

give one instance that would blemish his conduct? O! Mr. Davidson! it is all concoction. You know human weaknesses. What will rivalry not do? A young artist rising in public esteem so rapidly. So highly spoken of by the Secretary-general of the Royal Academy. That was intolerable! Why should the Secretary patronise a foreigner. If it goes on like that, who knows what position this upstart will come to occupy. End it here, they said. Nip him in the bud. And out sprang a surprize. Miss Burton was hired to flay this man alive.

Davidson—Abominable! you cannot say so! You are condemning Miss Burton, an innocent soul; nay, condemning the whole tribe of London artists. To save a doubtful foreigner you are condemning all the artists at home.

Jones—Not all! I condemn only the vicious few. I call them vicious because I feel they have been blinded by envy—the darkest vice! And this Miss Burton! you call her an innocent soul! England cannot be proud of such daughters. They are a regular pest for our society. These silly girls, with painted cheeks,—oh! you don't know them.

(At this Mr. Nichol—a big-bellied square man with a pipe in his mouth—enters. He has a familiar look about him. Nods at Jones, the art critic and takes a chair.)

Davidson—Here Nicky! we were talking of that Miss Burton affair. (looks him in the face) Oh! you seem so hilarious to-day. How's that? But listen! Mr. Jones totally disbelieves that story!

Nichol—Does he? hon! hon! hon! hon! hon! (chuckles).

Davidson—Yes! He thinks it's all a conspiracy; and that Miss Burton has been **hired** into it.

Nichol—Hired...Hum!...I see! Hired! I had a talk with Mrs. Samson this morning. When I hinted at that black affair she laughed. O! Dan! she laughed most awkwardly. I thought she was laughing at me. I looked around to make sure that there wasn't anything wrong with my dress and all. Seeing that she burst into laughter again. It seemed a significant laughter, Dan!

Jones—There it is! Now guess for yourselves, what could this laughter mean. A sure hint at conspiracy.

Davidson—You think all the world is conspiring against that egg of an artist. That's pure prejudice! An artist is after all a man. He can err, and err abominably too. His senses are much keener than anybody else's. Who knows this keenness of senses may have driven him mad.

Jones—he he he! (cackles). An artist is a man with senses fully alive, I admit. But he has at the same time that golden sense of proportion, that fine touch of the appropriate that he cannot stoop to molestation. Molestation means losing the balance. A true artist cannot. He has always that sanity about him that adjusts his mind even in the most trying moments. A prophet is an artist—the artist of deeds; a poet is an artist—the artist

THE ORIGINAL

(A one-act play)

Ferdinand	...	... A young Spanish painter.
Soleno ...	...	... Ferdinand's friend and lover of his art.
Roderic ...	...	... Ferdinand's faithful old servant.
Davidson } Nichol }	...	... Londoners.
Jones ...	...	... An Art Critic.
Frovinsky	...	... A dealer in Pictures.
Miss Burton	...	... A pert girl.
Mrs. Samson	...	... Hotel manager's wife.
London S. E.		1939 ending.

SCENE I

(A room in hotel "Le Grande"—Davidson and Jones sit beside a table opposite each other. A cup half-ful of wine lies on the table, another is in Davidson's hand. Jones is lighting a cigarette).

Davidson—I hate this young artist of yours ! (Raises the cup to his lips).

Jones—But how's that ? You don't know him even !

Davidson—Don't know him ! Why, the whole town is full of this sad tale about him. He has been shamefully exposed. These foreign artists who run away from their homeland and seek shelter in London are all mighty scoundrels. (Raises the cup again to his lips).

Jones—That's cruel ! You cannot be so unjust to artists. Please bear in mind that Ferdinand is an artist.

Davidson—Strange logic ! You mean an artist should have no scruple. He should outrage society and then shield himself behind art. Art is no sanction for knavery.

Jones—Certainly not ! It is a sanction against knavery. An artist's mind is too delicate to allow him to indulge in evil. He might see beauy in evil, as he sees it in all objects of nature, and treasure it in his own art. He immortalizes the beautiful by detaching it from the ugly elements of evil.

Davidson—That's no argument ! You seem to believe that he comes in contact with evil and remains uninfluenced. That's impossible ! But let us leave ethics aside and talk a little more humanly. How can you explain the conduct of your friend Ferdinand ?

Jones—Suffice it to say that it is above board. He has been here for the last four years. We heard nothing ill of him. Did you? Can you

But this does not mean that love will not bring any reward. In fact, love demands nothing and gets everything. Love knows how to give and how to accept with gratitude and pleasure.

This way of love is obviously what the world needs to-day in its family life and in its international relations. But it steers clear of human attainment. We accept it (individually) when we choose to bring our lives into line with the Divine Will. When we begin to practise self-surrender or submission to Divine Will, at that moment, this life of love begins in us

What a man loves determines what he is. Many people think that they love, while they actually love themselves. Each of us can be easily deceived on this point, unless we are really determined to know ourselves. Real love in a man's life leaves no room for jealousy, or fear; it is patient and kind; it entertains no competitive spirit but is content to make its contribution and finds immense pleasure in doing so. A true lover cannot feel personally hurt; he does not seek for approval In a word love constitutes an oasis in the dreary desert of life.

What then are we giving ourselves to ? Are we existing with no sense of direction and no absorbing life purpose; drifting along with the traditional standards ? There is no dignity about a life like this. Animals eat, sleep and work. Man is created for things higher and nobler. Hence we should all endeavour to find a cause big enough to stir us to action and absorb all our resources of love and energy; and to love that cause in such a way as to lose our own identity in it.

M. ASGHAR.

We are all born with a will to power and a will to love. We are impelled by some unseen power within us to dedicate ourselves to those people and causes which we love. These are fundamental tendencies of our nature. They are vitally substantial; and our lives are fashioned by them. If we ignore the tendency to love, we become self-centred, sceptical, unimaginative, critical, dissatisfied and, perhaps, peevish and morose. Some people are afraid of loving because they are not confident about their control of emotions; but love something we must, for if we fail to do so, we begin to love ourselves. But it is the way we love and the direction of our love which determines character.

There are two kinds of love. There is an acquisitive love and a self-sacrificing love, though strictly speaking the former is not love at all. We feel both these reactions of acquisition and self-sacrifice in all situations of love. All normal human beings have an acquisitive side, and a generous side, but usually the acquisitive side is the stronger. In it lies the root cause of domestic quarrels, communal strifes, party hatred, national disintegration and international wars. So the "getting" principle, as it is called, is often the principle of destruction; and the "giving" principle is the principle of freedom and life. These are the two principles of life and we are all practising one or the other of them in our financial affairs, our home life and our sex life.

The character of our love is not governed by outside circumstances or any external agency; it depends on the nature of our inner-self. "Circumstances" and outside factors are purely incidental. If we are inwardly good and true we can trust ourselves in every situation.

Real love then in whatever relationship it may exist, is fundamentally the same. It is an ennobling agent, a purifying factor impelling us to give ourselves to others and to sacrifice our personal ambitions. It lifts us higher and higher and we find ourselves emerging into a fuller and freer life.

"Love ever gives, forgives, outlives,
Love ever stands with open hands,
And while it lives, it gives;
For this is love's prerogative,
To give, and give, and give."

Since the chief tendency of love is self-sacrifice, its chief function is to be creative. Its results are never negative. If a relationship exists merely for pleasure or physical gratification, it is not love but plain lust and carnal desire. Indeed one good criterion of the virtue of an action or relationship is whether it contributes towards greater inner harmony and peace and the building up of character. The roots of love are in the depths of human character and man's spirit of self-sacrifice. To love a person is to give oneself over to that person. To love God is to give one's will over to God without reservation. To have love for a cause, is to give oneself to it, be prepared to die for it without expecting a reward.

or sometimes with dim knowledge, in spite of his wishes to the contrary, and that, therefore, being a victim he is much more to be pitied than to be hated.

How many of us have not experienced a conflict between two contending forces, and how often have we not in our lucid intervals, despised ourselves for having submitted to an evil force! Such a conflict, however, need not be taken to mean that its presence proves the presence of a choice between good and evil, and that if after a conflict a person chooses evil, he is accountable for the consequences of his action. My contention is that the so-called choice is only outward, as it has been made in response to latent predisposing tendencies, over which control could not be obtained. This does not mean that a 'misdoer' should be allowed to follow his whims, or that his 'misdoings' should not be controlled, but that, while the evil which impels a person to commit a wrong should be hated, the hatred should not be extended to the victim of the evil—the misdoer. This attitude towards misdoing, I may point out, does not dispense with punishment. Only the nature of the punishment is changed. The punishment is not intended to do harm to the misdoer, and does not spring from a feeling of revenge, but from sympathy for the "misdoer," and is in most cases inflicted in the interest of the man and society. In extreme cases even the killing of a person is justified, provided the motive is pure and is without a tinge of revenge, hatred or ill-will.

As the patient reader will have seen, I do not agree with the sentiments expressed in the introductory paragraph though I can sympathise with the person, who has, in a moment of sinking hope, poured out so much concentrated venom. I hold the view that hatred is an unhealthy attitude of mind, as it undermines the good in us, and brings us nothing but unhappiness. A generous and sympathetic attitude towards all, on the other hand, promotes our spiritual growth and purifies our soul.

S. M. IDRIS.

Love--the Pivot of Life

People in India generally hesitate to talk about love in public, partly because of a natural reticence inherent in us all on matters of sex and partly because of a good deal of muddled thinking that has been transmitted to us on the subject. The spirit of love manifests itself in many ways, in different relationships of life. There is the love of the child for his mother, and of the parents for the child; the love between friends; the love or devotion for a cause; the love of a youth for a girl, the love of a husband for his wife and so on. Each of these has a different significance and yet all derive their motive force and inspiration from the same spring, which determines the character of our different relationships in life.

causes that shape character, the control over his actions is lost, and he commits a wrong, sometimes despite his convictions to the contrary. The unthinking and the unsympathetic will say: Surely, if a person commits a wrong knowingly he must be held accountable for the consequences for his actions. It is this attitude towards sin or misdoing which is my object to argue against, and my principal argument is that the sinners or "misdoers" are to be treated as moral patients, and are therefore much more to be pitied than condemned. Their "misdoings," in my judgment, should make us solicitous about their moral well-being; for, aren't they suffering from a moral disease, even as we all suffer from diseases of the body? But we do not condemn or hate people for their diseases of the body. Rather, such people excite sympathy and pity, and with exalted natures, even love. I, therefore, cannot understand why a less sympathetic attitude should be adopted towards the morally and spiritually diseased.

It may be contended that by absolving human-beings from the responsibility of their "misdoings" I am preaching a dangerous principle, which is likely to put a premium on wrong-doing. But such a contention will not stand the test of logic; for, just as sympathy for the physically weak does not mean putting a premium on diseases, even so sympathy for the "misdoer" does not mean toleration of the "misdoing." On the contrary, it means our utter dislike for the physical diseases and our determination to eradicate them. I submit, therefore, that our approach to the problem of moral and spiritual diseases should at least be as sympathetic as our approach to that of physical diseases. It is my considered opinion that if the pros and cons of good and evil are clearly before one's mind, and there are no pre-conditioning causes of evil, of which one is either not aware, or over which it is impossible to obtain complete control, the good will be chosen and the evil rejected. What is needed is to find the pre-disposing causes, to subdue, control and ultimately eradicate them. After such remedial measures—of course if they are possible—the possibility of wrong-doing will be removed. But another question that arises here is : Can any one manage to treat a moral and spiritual patient in such a way that the imperceptible evil forces which impel him to commit a wrong are completely controlled, if not entirely eradicated ? On this question I have exercised my mind to almost a maddening point, but have not, so far, succeeded to find a clear and unambiguous reply to it. For, the thought has often occurred to me whether or not God intended man to be what he is—an admixture of good and evil, of reason and unreason, and I may go so far as to say—sanity and insanity. I wonder whether the ultimate cause of all man's actions is not the Will of God. Let the reader beware—I do not say that all actions, whether good or bad, are God's Will. I only wonder! And who but the unthinking, and the fortunate few who can accept everything without questioning, can escape from such wondering!

It may be asked, as to how I connect the theme of the opening paragraph, with the arguments set forth in the succeeding paragraphs. The connection, I trust, is sufficiently obvious, if the reader remembers, the main argument of the article, viz., that a sinner is the unwilling agent of forces over which he has no control; that he commits wrong either unknowingly;

a diseased mind can never be at peace. As a disease of the mind, hatred is destructive of all that is good in us; and on the other hand it neither reforms, nor, in most cases, harms the person hated. The person who hates, thus, suffers a double loss: he loses the person hated and what is worse, corrupts his own soul. That is why Iqbal says :—

سینہ را کارگاہِ کینہ مساز   بہرکہ در آبگینِ خویش مریز

To my mind hatred and revengefulness are the result of unreason. When a person hates and is in a revengeful mood, his rational faculty is either suspended, or is not given a free scope to exert itself. Hatred, if it lasts for long, may mar the rational faculty permanently. If, therefore, hatred becomes a more or less permanent trait of man's nature, it may subdue reason more or less permanently; and since without reason actions cannot be properly controlled, hatred may lead to dangerous consequences and may reduce a man to the level of beasts. The person hating will thus suffer and lose much more than the person hated. Therefore, even from the selfish point of view, it is more in one's interest not to hate than to hate. Again, we have all tasted the bitterness of hatred : but how many of us have enjoyed the blissfulness of forgiveness? We have tried hatred too long, and after a painful experience, have come to the conclusion that it is not a satisfactory reaction towards other peoples' "misdoings." Let us now experiment with forgiveness; may be it is the panacea for all our suffering!

True, it does happen very often that our new-budding hopes are crushed by the "misdoing" of others, but the reaction need not be hatred. May be that the person, whom we, in blind fury, begin to hate, is actually deserving of our sympathy and even pity. Unless we know for certain that the 'misdoer' is entirely responsible for the 'misdoing', we should not pass a judgment against him. After all there was and is much in Christ's saying "Judge not that Ye may not be judged. Unfortunately we judge people with undue haste, and that too by the standard that we have set for them. If they do not come up to that standard, we begin to hate them and pass on them a judgment which is a reflection of our own subjective condition and is in utter disregard of the subjective condition of the persons judged. Such a judgment, ignoring as it does the mental make-up of the "misdoers" is manifestly unjust.

Another point to be considered in this connection is: Does a wrong-doing or a sin issue from a person's innerself, as a result of psychological, physiological and other causes which the sinner or the wrong-doer cannot control, or is it a deliberate and calculated process over which he has a complete control, and for which he may be held directly responsible? Now, my position in this respect is that a sin or a wrong is committed involuntarily; that it is the result of forces over which the wrong-doer has no control, even if the knowledge of the sinfulness of the act or thought is there. What does this view of sin or wrong lead us to? To this: if a person sins, or is guilty of a great or petty misdoing, he is an instrument, a victim, I may say—of forces, of the presence of which he may or may not be conscious, and he sins as naturally as the rain comes down from above or as water finds its own level. Either the sinner knows not what he does, or due to he innate forces, issuing from hereditary, environmental and other

manner than the Great Poet-Philosopher of the East. He says:

زنده‌ای مشتاق شو خلاق شو — همچو ما گیرندهٔ آفاق شو
در شکن آن را که ناید سازگار — از ضمیر خود دگر عالم بیار
بندهٔ آزاد را آید گران ! — زیستن اندر جهان دیگران
هر که او را قوت تخلیق نیست — پیش ما جز کافر و زندیق نیست
مرد حق برنده چو شمشیر باش — خود جهان خویش را تقدیر باش

May we live upto it and may our youth succeed in the sacred task lying ahead of them. Ameen!
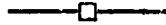
THE WHY

OF

"Thou shalt not hate"

"And therefore," he went on, "therefore, Sir, beware of your own actions, and of your children. If by any folly or baseness, such as I have seen in every human-being whom I ever met as yet upon this accursed stage of fools, you shall crush my new-budding hope that there is something some-where which will make me what I know that I ought to be—if you shall crush that, I say, by any misdoing of yours you had better have been the murderer of my first-born; with such a hate—a hate which Jews alone can feel—will I hate you and yours."

When I was asked by the Editor of the "Khyber" to write an article for the Magazine, I experienced the usual difficulty of finding a suitable theme. Had I not come across the paragraph, which serves as an introduction to, and also as the reader will see, a text for this article, I would, I am afraid, have failed to comply with the Editor's wishes.

I must confess I have not chosen a suitable theme for a College Magazine. My only justification for choosing such a controversial and "unromantic" subject is that it may give expression to the unspoken thoughts of not a few of the readers. How many of the readers, I wonder, must have felt the agony of soul which finds expression in the words quoted above, as a result of "any misdoing" of their friends and near and dear ones! How many of us have had our "new-budding hopes" crushed, and how many of us have had our "honey" turned to "vinegar". But the question is: need the crushing of our hopes, by the "misdoing" of those whom we trust, on whom we rely, and whom we revere, make us hate them when we see them in their true colours? Is hatred or revenge a moral and healthy attitude of mind ? Should hatred and, its off-spring, revenge be the re-action to the "misdoing" of friends or even of foes? I beg the reader to search his heart and find out if hatred, as a reaction to "misdoing" of others has ever given him a moment's peace. Hatred, he will discover, is in-compatible with a peaceful mind, because it is a disease of the mind, and

fits of eudcation at the hands of Hindu, Muslim, Sikh and Christian teachers alike, it passes my comprehension why in after life, when judgment becomes more mature and intellectual development greater, they should be the victims of baneful communalism. An educated young man's service should be a service of love, forbearance and toleration, and his politics of a healthy and constructive nature.

S. Abdur Rabb "Nishtar" B.A., LL.B., M.L.A., Advocate, Peshawar.

You have asked me to give you a message for your magazine meant for the youth of our country. I cannot do better than draw their attention to their duty, a duty which the old generation is incapable of performing. I mean the creation of a new world order. Now-a-days we find an incessant demand for it in the East as well as in the West. Every one feels that the present structure of our society requires complete overhauling. Will this be done? The answer to this question can be given by the youth and the youth only. But such a tremendous task requires a strong character based on the golden principle of "Fear of God and fearlessness of every thing else."

قلب خود را خالی از اندیشه کن　　　رو بحق باش و شیری پیشه کن

If once we begin to act upon this principle I am absolutely sure that success will be at our door? The unfortunate thing is that for generations we have been acting to the contrary. We are afraid of every thing else but God. This is the source of all the evils and weaknesses of our society. The misuse of the saying زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز is responsible for the fact that we are unable to face any aggression. We are carried away by every gust like straw, and like a reed we are tossed hither and thither by every breeze. Let us change our mental outlook because without it we cannot improve our destiny.

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم (القرآن)

رمز باریکی بحرفی مضمر است　　　تو اگر دیگر شوی او دیگر است
شبنمی افتندگی تقدیر تست　　　قلزمی پایندگی تقدیر تست

We can never improve the present state of affairs if we slavishly adapt ourselves to the status quo. The crying need of the day is that if we feel that the present system of human society is wrong, we should change it and fight against it.

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

This is the line of action chalked out by the late Sir Iqbal for our youth. No poet has described our purpose of life in a more beautiful

Diwan Bhanju Ram Gandhi, B.A., LL.B., M. L. A., ex-Finance Minister, N.-W. F. P. Government.

India's need of the hour is to get her right to equality and independence recognised. We while having faith in the destiny of the motherland, should strive to that end with the sword of 'non-violence' in one hand, and the bludgeon of 'truth' in the other. It is an uphill task and our youths alone are capable of doing it, because the fruit-bearing tree of liberty needs, besides ceaseless care at the hands of the elders, the sweat and labour of the youth to grow to its fullest height. To my young friends, I have to say only this much that they should prepare themselves for carrying the torch, the strength to bear which would very soon be found wanting in the old.

R. B. Mehr Chand Khanna, M. L. A., Peshawar.

I quite realise that I am writing on a subject to-day which is both important and engrossing. It is a subject on which eminent scholars have written volumes. I know my shortcomings but I do not wish to shirk my duty.

The growth of education in India, and for the matter of that in the N.-W. F. P., has been fairly rapid. In spite of that, we find, that unemployment and discontentment are on the increase. Real education should tend towards the economic betterment of the country and its advancement on sound, healthy, and progressive lines. India's youth should be the envy of foreign countries. Such unfortunately is not the case. It is our duty to explore the causes and find a remedy.

The first and the foremost cause that suggests to me is that the students do not carefully plan their future. The fault may not be entirely theirs. Their parents share a greater responsibility in that direction but the fact remains. The mere passing of an exam. or the securing of a Degree does not lead us anywhere. It results more in stagnation and deterioration. The needs increase without bringing in a corresponding return. The modern youth, it is but essential, should divert his energies more in the direction of technical education—Industry and Agriculture—than of mere Arts. He should carefully choose a career and explore new fields so that the country may shake off the shackles of industrial slavery.

The modern youth has given a fair account of himself in the past, but with the changing times, the country rightly expects far more in the direction of physical, moral and spiritual training, all of which—including of course, the intellectual side—should form the very basis of University Education.

Another important factor may be the narrow or restricted outlook on the part of the modern youth. Being in most cases, brought up in a denominational institution, his angle of vision has perforce become biassed or partial. He easily forgets that he is an Indian, owes a sacred duty to the motherland, and that the rise or fall of communities are inter-dependent and inter-connected. To think in terms of "A Community" or "B Sect" is sowing the seeds of bickering and discord. When in schools and colleges, they can live, play, and discuss together, when they can receive the bene-

be in the vanguard of any movement meant for their moral and material advancement, and shall not lag behind others whenever the time for sacrifice and service comes. They should not, therefore, look upon their education as a means for finding lucrative careers, but for becoming **True National Servants,** after completing their studies. They should not disdain to work amongst the dumb masses, but should consider it their duty to spend their time and money on their uplift. Their education should equip them not for obtaining fat-salaried jobs, but for true service of the people, who have subscribed to the exchequer of the government for their education. Hitherto the part played by the young educated men, in the national struggle has not been one of which one can feel proud. It is their duty to promote inter-communal and inter-provincial harmony, and establish cordial and happy relations between different sections of the Indian people.

My next request to them is to drastically reduce their own needs and cost of living. The sooner they give up the blind imitation of Western ways of life, the better for our poor masses. They should habitually use hand spun and hand-woven Khaddar (Khamta) produced in their own homes, or villages or in their own province. In no case should they use foreign articles, if possible.

In the end I would request them to develop their character and observe the principles of truth and non-violence in their thoughts, words, and deeds.

Khan Abdul Qayyum Khan Barrister-at-Law, M.L.A. (Central).

Here are a few words to the youth of the North West Frontier Province. These words are from one who dearly loves the Province, and its young men in whom all our future hopes are centred. These words come straight from my heart and I have not the least doubt they will find their way to the hearts of our young men.

You are acquiring knowledge in that beautiful seat of learning, the Dar-ul-Ulum-i-Islamia-i-Sarhad. But the development of your character must go hand in hand with the acquisition of knowledge. Character is the thing that matters in this world. It is character which marks off individuals and nations. Of what earthly use is knowledge if real requisites of life, namely, courage, integrity, bravery, truthfulness, loyalty to God and men, and patriotism are lacking.

You have in your persons all these qualities which your country needs. Your ancestors have played a great part in the history of India. I believe, that you are destined to play an even greater part, if you will be only true to the traditions of the great Pathan race.

Learn to stand against all manner of oppression. Be proud of your province and your country. Your country is still far from being free. Work for its emancipation, and its greater glory, whenever you enter life. For no man has any right to call himself a man unless he is free. There is also the black spectre of poverty stalking in this fair land of ours. Fight it, overcome it and master it by banishing poverty from the land. This is all I can say. This is all I need say just now. May God bless you all!

vice which he shall, by acting up to this ideal, be doing not only to himself, but to the country and the nation at large. This is an ideal which is not at all a new one. It is as old as the world itself, but a wrong and perverse conception of civilisation has led the modern youth to forsake this ideal, and, in the words of Wordsworth, try "to look like a running brook," or else think himself lost.

"Everybody for himself, and none for others" is becoming the governing spirit of the age, and the grand ideal—"the way of sacrifice is the way of light"—is losing ground. If there be any young man or woman who cherishes an idea to serve the country and the nation, he or she should try to revert to the last-mentioned motto, and make it the guiding principle of his or her life. Such nations as are dominating the world are accused of being actuated by selfish motives, but ultimately if they or any other nation want to work for the greatest good of the greatest number, then they shall have no choice except to adopt the ideal of sacrifice as the first principle of their lives. Let the Indian youth look not only to the West for guidance, but also keep in view the traditions which he has inherited from the past, not the immediate past, but the past when, in the real sense of the term, light came from the East.

These two ideals cannot be achieved, or, even if achieved, are not calculated to make the lives of the modern youth successful unless the youth persuades himself to take pleasure in service—attempt to regenerate those who have gone down or are going down in the scale of humanity on account of economic or moral degradation. The time and energy spent in social service is the best investment which the modern youth can make in the cause of the advancement of the country and the nation.

I cannot conclude this message without reminding the modern youth of what Longfellow has said :—

"Art is long and time is fleeting."

Nothing really useful or durable can be achieved unless one learns the lesson of taking the time by the forelock, and keeps before his mind's eye the simple saying that "every day is a little life, and all life is but a day repeated."

Let the modern youth try to keep always in view the four points mentioned above, and then not only their success in life is assured, but the salvation of the country and the nation will also be near at hand.

Kazi Ataullah Khan, B.A., LL.B., M. L. A., ex-Education Minister, N.-W. F. P. Government.

The educated young men of this Province should constantly bear in mind the fact that their education, culture, development of mind, and brain are not the result of individual efforts on the part of either their parents, or a few public men, but that the humblest farmer and the poorest labourer has contributed his mite to the rearing up of these magnificent and costly buildings of the many institutions in which they have acquired their education. The unfortunate masses of this Province who are steeped in ignorance and superstition therefore expect that they (the educated youth) shall

personal attribute, which we call character. It may lead to financial gains, economic advantages, and social privileges. But these are merely the accidental and non-essential consequences of education.

Some of you will become the country's future leaders. How are you preparing yourselves for your great tasks? You certainly have many advantages in those sylvan surroundings. The "unfolding" of the mind should not be difficult amid what Plato calls "fair sights and sounds." The future is for you. "Caesar," said Pascal, "was too old to amuse himself with conquering the world. That amusement was right for Augustus or Alexander; they were young men whom it is difficult to stop." But as a great English poet has reminded us, there are conquests to be made and victories to be gained in other fields than war.

The future is dark and no one can foresee what the world has in store for us. But one thing is certain. It will be a harsher and more difficult world, bristling with intricate problems in the realms of government, politics, and economics. It will demand informed and disciplined intelligence; it will demand character and courage; it will above all demand a spirit of toleration, a sense of proportion, and an imagination alive to complex human issues. We shall require men of education, men of wide and liberal sympathies.

Some of you will recollect those Gilbertian lines sung by Giuseppe:—

"Oh, philosophers may sing

Of the troubles of a King;

Yet the duties are delightful and the privileges great."

But privileges carry responsibilities with them. Just as Giuseppe thought that a man who held the magnificent position of a king should do something to justify it, so you, with all the advantages and privileges education will bestow upon you, should learn to shoulder your responsibilities with courage, and in a spirit of toleration, your body and mind well disciplined.

Khan Fazl Muhammad Khan, M.A. (Oxon), Commissioner of Education, H. E. H. the Nizam's Government.

If our youth want a bright future for their country and for themselves, they must learn the lesson of due consideration for and sincere co-operation with others, and in working for the common good they must throw their self in the background.

The Hon'ble Malik Khuda Bakhsh Khan, B.A. LL.B., Speaker, N.-W. F. Province Legislative Assembly, Peshawar.

I desire to convey to the modern youth of the N.-W. F. Province something which is quite simple, and not in any way the outcome of any research in the field of politics, or anything like that. The modern youth is in the grip of an artificial mode of life, and if he can extricate himself from it, and has before him the ideal of 'plain living and high thinking' he shall no doubt make sacrifice of his notions as regards dignity and convenience, but will, on othe other hand, be amply rewarded by the substantial ser-

thing. Be honest to yourself and to others and consider whether what you speak or what you do is really the thing you should speak or do according to your conscience and your religion. Much of the bickering and unhappiness will disappear if we were to dispassionately judge matters and have the courage of calling a spade a spade.

Next I would advise you not to accept any 'creed', whether political or non-political, while you are a student. The life of a student in a school or college is dedicated to study. You know that the word student is derived from study. You have, therefore, to study everything. It is the duty of the College staff and the College Management to bring before you whatever you are going to meet in your future life and give you an experience of those things in an experimental form. This does not mean that you should necessarily agree with or adopt whatever is spoken to you or brought before you. You should reserve the adoption of particular course of life to the period when you shall be entering life and when you shall have to bear the consequences of what you are doing.

Lastly, you should remember the one great historical fact which no one in the world can question. It is that the Holy Quran brought to the world a system of life, a discipline, and a polity which was unprecedented in the history of man. This book came through an illiterate but highest placed human being in the world (peace be on him). It galvanised at least one hemisphere; for it spread the Islamic civilisation from Gibralter to Pekin. You know more about it than I do, because I am sure many of you have read the history of Islam. Now is this not enough justification for my requesting you to get a copy of the Holy Quran and to read it from one end to the other with meanings and to understand its principles thoroughly? With it you might read the life of the Holy Prophet (be peace upon him) who was chosen by God to be the vehicle of this great book. You would then be able to gauge the essentials of Islam. I wish I could convince you that it is mainly due to the absence of your devotion and my devotion to the Holy Quran that we are nowadays lost. Once the sense of toleration, strict unity and rigorous discipline is created in us and the urge to spread civilisation and humane activities appears, we will feel happy for ever.

W. R. Owain Jones Esq., Member, the Punjab and N.-W. F. Province Joint Public Service Commission, Lahore.

My old friend, your editor, has asked me to give you my views on the duties and responsibilities of modern youth. I gladly accede to his request, but at the same time, I feel it a presumption on my part to mount the rostrum. For it is not so long ago that I considered myself one of you. It is said, however, that wisdom grows with age and I consequently feel less diffident than I would have done a few years ago to undertake this responsible task.

Education is something more than the accumulation of knowledge. It has been variously defined, but I think we are all agreed that it should prepare one to take his place usefully in human society. It should consist in training the mind to think critically and in developing that undefinable

MESSAGES

TO

The Frontier Youth.

[Instead of letting the "lives of great men" of a past generation remind us of how "we can make our lives sublime", we have succeeded in persuading some of the great men of today to give us the benefit of their vast knowledge and mature experience in their own words. We are deeply indebted to them for their kind response to our appeal. Our readers will, we are sure, gladly welcome the views of their "elders" and like to know what expectations are being entertained of the Frontier youth of to-day.]

Khan Bahadur Haji Saadullah Khan, M.L.A., Honorary Secretary, Islamia College, Peshawar.

Young sons of the Frontier. The world is passing through critical times. Old systems of thought are crumbling down. New ideals of conduct are being set up. Peoples and countries are being subjugated and exploited. Maps are being recast. The fate of nations is hanging in the balance. Life and property is in danger. There is gloom and confusion on all sides.

The only haven of safety in the stormy ocean of modern life is the fold of Islam. The only ray of hope in this world of darkness is the sacred light of the religion of peace. Turn, therefore, to the faith which taught the world the lesson of liberty, equality and fraternity. Seek refuge in the lap of the creed that has given mankind the message of broad-minded toleration.

Make the best use of your opportunities at the college and get ready for the struggle of life that awaits you outside. Take the hall-mark of the Darul-ulum training with you, and demonstrate to the world your capacity to think of service before self. You owe a multiple duty to your God, your country and your nation Fulfil it to the best of your ability.

The name and honour of the great institution to which you belong is in your hands. Prove by your word and deed that you are worthy and loyal sons of your alma mater.

The Hon'ble Khan Bahadur Kazi Mir Ahmad, Judge, Court of Judicial Commissioners, N.-W. F. Province.

The one thing which you should avoid is to be carried away by sentiment and to lose the faculty of applying reason to your activities whether they be inside the college or outside it. The world is too much fascinated by the glamour of sentimental speeches and emotional appeals nowadays and therein lies the trap. Everyday we notice that the masses are applying less and less logic to what they think and what they do. I would ask you to think twice before you do any act or speak any-

All the solutions suggested above, well-advised as they are, could be useful and effective only if we turned our backs on materialistic and utilitarian view of things and let more and more of our upper mind to control and sway us. No political, social or economic organisation can stand or last unless some noble ideals are at its back. If any thing can save what remains of the western civilisation, the force of ideals can.

But the term "ideal" must be qualified, and in two ways. Firstly, ideals should be noble and based on religion. Hitler also has his ideals, and very lofty ones. He wants to recombine the German nation and create a Greater Germany even if at the cost of other smaller nations. But is this a noble ideal, that is, noble as looked at from the point of view of religion and humanity. Certainly not. Religion would never allow causeless cruelty, and selfish disregard, of others. Therefore for ideals to be engrafted on religion is a most important consideration. Once they are divorced from morals and the religious code, hey are of no value, and may even prove harmful. Secondly an ideal should not remain merely an ideal. It must be translated into practice. Theories are no doubt good but only when they provide a substantial foundation for the erection of an edifice.

It may be contended that though it may be very well to sermonise thus, yet regarded from a practical point of view, this idealism and lofty Utopianism is but hollow words. How can nations, as wholes, listen to it and reform, since it is nations and not individuals who go to war. Our message is to the individual and not any farther. After all what is a nation— a group of individuals. It is their likes and dislikes that constitute her code of manners and morals, and it is their ideals which are her ideals. Indeed to talk to a nation or people at large is more often than not useless. It is impossible to disturb the surface of the sea by throwing a stone into it—the effort is not commensurate with the aim. And that is why the reformers who begin largely end narrowly. However, it may be possible easily to excite and awaken one individual and then another if only their hearts are still alive within them. Often an individual says to himself, 'What if I do not join in this; after all what one in a world of so many matters?' This is a very false notion. It is the duty of every man to join in the good cause, to cherish noble ideals, to practise them. Even if the world be no better by his co-operation, he will have a moral and spiritual satisfaction for himself.

It is neither possible nor necessary to detail out the nature of ideals here. Every religious man and woman knows them too well. All the true religions of the world uphold and press repeatedly some noble truths and ideas. These we are to pick up and hold dear and practise. If you promise with yourselves before God to-day that you shall do so, and as far as possible, request others to do the same, be assured that the end of the world's miseries and the cure of the disease of modern times is not far-off. And soon, full soon, the Golden Age will dawn.

when Hitlers, Mussolinis and Stalins are ranging abroad. Some lethargic and phlegmatic politicians think that the best policy under the circumstances is **laissez faire.** This is the attitude of the spent-up old man. How can the world afford the **status quo** to remain when there are wars and germs of more wars already in view. Considering the hopelessness of the situation and the inefficacy of all other remedies, some people are glad to propose war as the ultimate solution of the miseries of modern world. This is a proposal cynical enough, and except for obvious economic reasons it has no justification. War cannot lead to peace though many have been deluded into this belief. The history of previous wars and especially of the Great War which was said to be a 'war to end war' would disillusion all out of this belief. Wars lead only to destruction, and revenge. Did not Milton say :

"What can war but endless war still breed?"

After surveying thus the possible roots and remedies of war—none of which, we have seen, is really the whole root or remedy by striking at which we may solve the whole problem, one is left puzzled and dismayed. What, if not these, is the cause of the evil and its cure? Can we ever hope to find it ?

Yes, we can. And if we have not found it so far, it is because we have been looking for it without, and not within. We paid attention to the surface, the outside of man, his society and world and forgot to peer into his inside where the secret, the disease lay. The cause of all these wars lies not only in the increased armament, or intensified rationalism and the like, but mainly and mostly in the perverted and misguided mind of the people fighting—the wrong convictions and the undesirable beliefs. The man in battle has been told that he and his country are being, illegitimately and wilfully, denied their rights or attacked, and it is his duty to respond to the nation's call. And so he does, firmly convinced of the justice of his cause. Were it not for this belief, would men march off so willingly and gladly to the war front. Now both parties are always convinced of their right. Naturally one of them must be in the wrong. It is seldom, as in 'Antigone,' that both are in the right. It is our duty, the duty of the world to awaken the wrong party to its error. To end war and secure peace, destruction of men is neither good nor easy way, as is the destruction of their mentality. 'War is the domain of moral force,' as Foch said and though materials and arms do count, morale and the belief in the justice of one's cause are far more important.

To awaken fighting men, in their excitement and anger, to such considerations is no child's play. To achieve this end a background will have to be prepared. The world and men have fallen into the pit of materialism—all their words and actions are guided sheerly by considerations of material profit and loss, here on this mortal earth. They have no farther view left now. Spirituality, ideals, morals, the next world, have, it seems, become things of the past, or at least, articles conveniently placed aside on shelves just for ornamentation's sake. This quest for material advantages must stop somewhere—it must not colour and command all our dealings and ideas. God and religious thought must have a portion, and considering the corrupting influences of the time, a very large portion, of our minds.

When one views this deplorable state of affairs, the inconsistencies, the conflicting statements, speech counter speech, flarings and glarings of statesmen, and the final outcome WAR, one can only close one's eyes in dismay. Is there any hope, any salvation for mankind ? So dark and disconcerting is the present picture that one cannot but wonder what kind of life, if any, is ahead !

This demoralisation and degeneration of the world has provided food for serious thought to not a few. All who can feel and think have tried to discover the cause of, and find a remedy for, the world's malady. Many believe with Hitler and the Germans that the root of the present war lay in the ignoble Treaty of Versailles and this is largely true since the selfish, revengeful and cruel terms of that Treaty could only, far from contributing towards a permanent peace, originate and develop a reaction and give birth to a Hitler. But was this the only cause? If so, why all wars before the Great War ? Why the Italo-Abyssinian war, why the Spanish war, why the Sino-Japanese? Some hold that the progress of modern science, which has led to the discovery of newer and more destructive methods and weapons of annihilation is mainly responsible for war. This view, too, is partially justified since science has facilitated the production of increased and improved armaments which the nations having stored in immense quantities, want now to utilize. But we might ask, why the nations took to employing science thus destructively instead of constructively ? Some others are again of the belief that the growth of modern nationalism is the germ of all evil. And indeed this narrow nationalism does lead to a selfishness, pride, desire for self-sufficiency and power and finally, conflict. But what has given nationalism an incentive and why has inter-nationalism failed? The answer to all these questions is one and we shall presently come to it.

The remedies suggested for the present disease of the world are, as an old adage says, as many as there are human tongues. There is, we shall admit, a grain of truth in all; but no more. None can claim to solve wholly and entirely the problem. The principal of collective security and co-operation between various peoples of the world was one of the earliest solutions and thus the League of Nations came into being. But its twenty years of existence are enough to show what a useless and impotent body it has been Similarly the much-advocated theories of a World State—a Confederacy of All Nations—, or of a Federation of European powers are bound to fail the test of experience. Expert economists declare that the only cure of diseased humanity now lies in establishing a new social order, namely, the abolition of imperialism and capitalism and the recreation of a reformed society with no class differences. This is all very good but before we can achieve this we are to strike at the roots of capitalism and exploitation, which lie much deeper than the surface of society. A few voices also suggest greater and greater contact between nation and nation and people and people, as this will conduce to a good will and sympathy and understanding amongst them which may reduce the chances of war. Experience, however, disapproves of this solution also. For years we have been holding international Scout-rallies, Olympic contests, academic and scientific conferences, economic and other meetings, yet with what result? Mr. Gandhi also has put forward a solution for the world disease in his characteristic manner. Why not adopt non-violence, he innocently asks. It is a funny enough proposal at a time

the order of the day and there is no breathing-place for the weak. Democracy is going to pieces and despotism and chaos are again rising to the surface. The conditions of the present times remind us only too painfully of ages pre-historic. Can we say that there has been 'progress' ?

The present war has affected, as all modern wars must affect, not only the countries and people actually participating in the struggle, but the whole world. In every corner of the world there is audible an echo, however faint, of the clanging arms and shrieking shells of Europe. International trade has suffered terribly, a most pathetic depression has set in, prices are soaring up, living has become dearer and existence itself has become a veritable curse. Far-flung nations, if not fighting, are under mortal fear of war and are, therefore, squeezing and exhausting themselves to get ready for defence. India also has to bear the brunt of British wartime activity. Real peace is nowhere : in every soul there are misgivings and forebodings that the world is approaching its ultimate doom. Even the quiet homes of learning and instruction have been disturbed, and if nothing more, black-outs, first-aid classes and the like are driving home to the students the uncertainty and nervousness of the times. As yet the Indian student does not view war with any horror; indeed he feels a certain thrill, a dramatic suspense about it. It is because he feels himself like the gods of Olympus, far off from the field of activity. But well may he do to rouse himself now and look the matters into the face. He may not have to rue his lofty unconcern when the water would have passed his shoulders !

We had long heard the saying, 'Everything is fair in (love and) war' but if ever this was true literally, it is now. History informs us that in all wars fought till now, whoever the contending parties, some moral code, some principles of fighting, at least, were observed. The antagonists did have a respect for conventions, words of honour, treaties of peace—some scruples indeed. They killed and tried to defeat and crush their opponents but at the same time they did observe some rules of chivalry. Now, in our civilised times, however, all decency, all pretence at morals, all scruples have vanished The international law is conveniently forgotten. Treaties are but scraps of paper, and, what are words of honour ? The fondest doctrines religion, even fundamental beliefs can be sacrificed if expediency and diplomacy so demand. Herr Hitler, the soul of Anti-Commintern Pact can swallow the Pact and glibly greet M. Stalin. In fact nothing is impossible to-day—the greatest evil can be perpetrated, the fiercest enemies can join hands. And the present-day code of morality not only allows this, it also allows any amount of deception, hypocrisy, espionage, black-mailing and trickery. Lying is taught as an art and practised on a large scale; special ministers are appointed to concoct and spread lies under the innocent guise of 'propaganda.' 'Practise first and then preach' is a thing of the past; the present version is 'Preach and practise not.' Shout at the top of your voice that you are the upholder of democracy and the right of self-determination but forget it quietly when it affects yourself. Proclaim to the world that you stand for the liberation of the masses and for no territorial conquest, yet run over your neighbour when it suits you. Say you live for your people and country and would die for their love, and then conveniently exploit them to achieve what selfish and inhuman ends you please, and to attain what false glory you like.
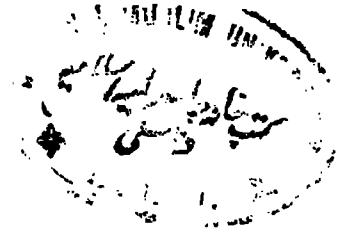
THE KHYBER

No. 2] PESHAWAR, APRIL 1940. [Vol. XXV

The World Disease

We are living to-day in a most critical and uncertain period of human history. Daily the dark and dismal headlines of papers force the unhappy reality upon us even if we would try to close our eyes to it. Famines, pestilences, floods, earthquakes—all 'come in battalions' but these fade before the direst of human calamities, WAR, and its train of bloodshed, ruin, exploitation, economic depression, starvation and misery.

In spite of the world's belief in the blessings of peace and in spite of the noble efforts and hopes of the pacifists, war goes on and on; and it not only goes on, but spreads and spreads. Japan was yet ravaging China when Germany overran Poland. England and France stepped in next and now Russia and Finland are also ablaze. Nobody can tell where this ignominious fire will stop, and whether it will stop at all, nor what extinguisher can be efficacious enough to put it down. It seems that it will exhaust itself in due time and then and only then end. But can we safely await that time? "Civilized" Europe has gone mad; can we see its madness through? All around us is gloom and horror, and the rage and rapacity of 'advanced' nations only fills us with an intense sense of shame and helplessness.

Daily, hourly, we hear of losses,—of men, of material—in air, on land, at sea and under water and considering their enormity we wonder if the world can supply, human and non-human matter at such rapid rate, for any length of time, to be reduced to nothingness. Men destroy men and money destroys money: that is the philosophy of war. A shot from a submarine worth pounds in thousands wrecks a ship worth pounds in millions. And thus the progress of science and civilisation and the process of reconstruction manifests itself. Is the clock going forward? Man is the noblest creation, we were told: he could excel other creatures in anything; he is now excelling the wolf in eating up his own kind. The lust for power and the passion for possession are uppermost as in primitive times. Might is again

THE KHYBER

ISLAMIA COLLEGE, PESHAWAR

Contents

خیبر

دار العلوم اسلامیہ سرحد

نگران ـــــــ پروفیسر ایم حبیب ایم۔اے
ایڈیٹر ـــــــ ایس۔ ڈی منیر

جلد ۲۴	مئی۔ جون سنہ ۱۹۴۰ء	نمبر ۴

پروفیسر احمد علی صادق نے فیروز پرنٹنگ ورکس ۱۱۹ سرکلر روڈ لاہور میں چھپوا کر اسلامیہ کالج پشاور سے شائع کیا۔

جب اور اب

سنا تو بہت ہے مگر اکثر نظر سے بھی گزرا ہے۔ کہ اگلے وقتوں کے لوگوں کی زندگی نہایت پرسکون اور پُر امن تھی۔ عمریں گذر جاتی تھیں۔ اور شاذ ہی کوئی ایسی غیر معمولی بات رونما ہوتی تھی۔ جس سے ان کی زندگی میں کوئی خلل واقع ہو۔ وضع کی پابندی ان پر ختم تھی۔ جو وضع ان کی جوانی میں تھی وہی بڑھاپے میں بھی رہی۔ اور مرتے دم تک انہوں نے وضع کو نہ چھوڑا۔ آندھی ہو مینہ ہو۔ مگر شام کی چہل قدمی کبھی ناغہ نہیں ہوئی۔ جہاں بچپن سے ان کی نشست چلی آئی ہے۔ مرتے دم تک وہیں رہی۔ ادھر کی دنیا ادھر ہو گئی۔ مگر انہوں نے اپنی وضع نہ چھوڑی۔ مستقل مزاجی اور خودداری اسی کا نام ہے۔ بزرگوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بر سنگ گردش نروید نبات۔

جو ایک جگہ جم کر بیٹھے وہی اپنی شخصیت قائم کر سکتا ہے اور بقول کسے شخصیت ہی دنیا کی بہترین خوبی ہے۔

دنیا کی موجودہ معاشرتی ترقی کو اگر تنزل نہیں کہا جا سکتا۔ تو کم از کم ترقیٔ معکوس ضرور کہا جا سکتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ سو برس پہلے جو ہنر تھے وہ اب عیب ہو گئے اور جو دستار فضیلت تھی۔ وہ صرف پگڑی ہی نہیں۔ بلکہ پگیا کہلانے لگی۔ آجکل وضع کے پابند کو لکیر کا فقیر کہا جاتا ہے۔

معاشرت اور تمدن کے اعتبار سے موجودہ زمانے میں افضل وہی ہے۔ جو گرگٹ کی طرح رنگ بدلے۔ جس کا گھر کا لباس کچھ اور ہو۔ کام کا کچھ اور اور تفریح و سیر کا کچھ اور۔ اور جو مختلف معیار کے لوگوں سے مختلف وضع میں ملے۔

پہلے زمانے کے لوگ انجن سے تشبیہہ دئے جا سکتے تھے۔ جو اپنے ساتھ ساری گاڑی کو کھینچتا ہے۔ لیکن آجکل کے لوگ گاڑی کے ڈبوں سے ملتے جلتے ہیں۔ کہ جو انجن آیا انہیں جوت کر لے گیا۔ ڈبے کو خبر نہیں کہ اس کا منہ کدھر ہے۔ نہ اس کا سیدھا ہے نہ الٹا۔ جس طرف انجن کا منہ اسی طرف اس کا۔ ذاتی رائے اور خودداری اتنی بھی نہیں کہ کم از کم دو منٹ ٹھیر کر یہی سوچ سکے کہ مجھے جانا کدھر ہے اور جا کدھر رہا ہوں۔

ماضی سے بے بہرہ۔ حال سے آنکھیں بند کئے ہوئے۔ مستقبل سے بے فکر چلے جا رہے ہیں۔ منہ اٹھائے ————
کیا یہ ہی تھی غایت تخلیق بر

اسی تغیر و تبدل اور متلون مزاجی کے جراثیم افراد سے گزر کر قوموں میں بھی سرایت کر گئے ہیں۔ جو انقلابات صدیوں میں بھی رونما نہیں ہوتے تھے وہ مہینوں اور ہفتوں میں ہو رہے ہیں۔ زندگی کا کوئی شعبہ بھی مطمئن اور مستقل نہیں ہے۔ سطح زمین کا جغرافیہ ہر لحظہ بدل رہا ہے۔ ابھی کچھ تھا ابھی کچھ ہے اور آئندہ لمحے کی کسے خبر۔

سکون و اطمینان خواہ دماغی ہو یا قلبی جسمانی ہو یا معاشرتی یکسر مفقود ہے اور یہ ہی سکون و اطمینان ایک ایسی چیز ہے جس کے حصول کے لئے دنیا کیا کچھ نہیں کرتی۔

آجکل دنیا کی حالت کو دیکھیں۔ تمام دنیا میں عموماً اور یورپ میں خصوصاً امن چین جنس نایاب ہے۔ اتنی وسیع دنیا میں ایک دل بھی چین کی زندگی نہیں بسر کر رہا۔ آدھی دنیا لڑائی میں جسمانی حصہ لے رہی ہے۔ اور باقی آدھی ذہنی طور پر شامل ہے۔

بڑی سلطنتوں کی "جوع الارض" نے چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کی نیند حرام اور زندگی تلخ کر دی ہے۔ عدل۔ انصاف اور رواداری کی بجائے خونخوار اور وحشیانہ بربیت کا دور دورہ ہے۔ ہوس کی زیادتی اور سکون کا فقدان بھی کیا اندھا دھند چیز ہے

مفتی

یادِ اقبال

نہیں اُٹھتی کوئی پُر درد صدا تیرے بعد — ہوگیا قافلہ محرومِ درا تیرے بعد

جس کی فریاد سے نیندوں میں خلل پڑ جائے — نہیں ایسا کوئی آشفتہ نوا تیرے بعد

نظر آتے ہیں بدن زندگیوں کے مدفن — پھر یہاں کون کرے حشر بپا تیرے بعد

فلسفہ خاک بسر ہے ترے اُٹھ جانے پر — شاعری ہے ہمہ تن آہ و بکا تیرے بعد

نہ رہا عقل و جنوں میں وہ توازن قائم — علم پھر عشق سے بیگانہ ہُوا تیرے بعد

غلطی پر جو کوئی ٹوکنے والا نہ رہا — کھو گئے یونہی میں علما تیرے بعد

ان کے پردوں سے گزر سکتی ہے اب کس کی نظر؟ — مطمئن پھرتے ہیں اربابِ ریا تیرے بعد

ہے کوئی محوِ کلیسا۔ کوئی وارفتۂ دیر — محرمِ رازِ حرم مل نہ سکا تیرے بعد

یہ بھی ہے تیری نواؤں کا اثر جس کے سبب — قبلۂ "مرد" رہبرِ فرزانہ "ہُوا تیرے بعد

یہ صداقت کا کرشمہ ہے کہ تیرا پیغام — جذب و تاثیر میں کچھ اور بڑھا تیرے بعد

تیرے ہوتے جسے کہہ دیتے تھے شاعر کا خیال

قوم کا قبلۂ مقصود بنا تیرے بعد

اسد ملتانی

فکرِ اقبال کا مجموعی اثر

عام طور پر سوال کیا جاتا ہے کہ اقبال کی تعلیم کا وہ کونسا پہلو ہے جس نے مسلمانوں کی ذہنیت پر سب سے زیادہ اثر ڈالا میں سمجھتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں اس کا جواب یہ ہوگا۔ کہ اقبال نے اپنی رنگین شاعری اور محکم فلسفہ سے صرف ایک خدمت کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان کی تعلیمات سے قوم کو اسلام سے محبت ہوگئی ہے۔ اور مسلمان اسلام کے روشن مستقبل کے متعلق اعتماد کی دولت سے مالا مال ہوگئے ہیں اس کے متعلق علامہ نے قوم کو ذوقِ یقین سے آشنا کیا۔ جو تمام عمل کی بنیاد ہے۔ یہ وہ اکسیر سعادت ہے جس سے مٹی دھاتیں اکسیر احمر بن جاتی ہیں۔ اس کے معجزانہ اثر سے آب سیال پر نقش قائم ہوسکتے ہیں۔ پتھروں سے چشمے ابل ابل کر نکل آتے ہیں قمر کا جسم نورانی پارہ پارہ ہوجاتا ہے اور سب سے آخر یہ کہ غلامی کی زنجیریں کٹ جاتی ہیں اور محکومی کی آہنین زندانوں کے قفل خود بخود کھل جاتے ہیں۔

اقبال کی ہندوستان کی سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی کہ نوجوان ملک کو یہ یقین دلا دیا کہ اسلام بطور ایک سیاسی اور روحانی نظریہ کے موجودہ دور میں نہ صرف زندہ رہ سکتا ہے بلکہ یہی کائنات اور انسانیت کا ایک صالح اور ترقی پذیر ضابطہ عمل اور عقیدہ ہے میرے نزدیک حضرت علامہ کا عظیم ترین کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے اس کفر و الحاد اور مادیت کے دور میں اسلام کے مذہب اور تمدن سے والہانہ شیفتگی پیدا کی اور نئی نسلوں کے تذبذب اور تشکیک میں ڈوبے ہوئے دلوں میں عشقِ رسولؐ کے جذباتِ صادقہ کی تولید کی۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ گزشتہ صدی میں یورپ کے استیلائے عام کے سامنے کمزور ایشیائیوں کی فطرت مغلوب ہوکر سر جھکا لیا۔ کیونکہ سیاسی قوت کے زیر سایہ پلے ہوئے تمدن میں ایک ایسا جادو ہوتا ہے کہ اس کی طلسم کاریاں مفتوح اقوام کی فطرت تک کو بدل دیتی ہیں۔

یہ وہ نازک وقت تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کے سامنے بعض نہایت اہم سوال تھے جن کا حل اور جن کی تعبیر اسلام کی تقدیر کے لئے بعید ضروری تھی مغلوب قوموں کے لئے غالباً اس سے زیادہ نازک گھڑی آزمائش اور امتحان کی نہیں ہوتی۔ کہ ان کو اپنے غالب حریف کے ساتھ مردانہ وار تیغ و سنان اور خنجر و شمشیر کے ساتھ جنگ آزما ہونا پڑے بلکہ اس کی لڑائی خود مذہب اور تہذیب، معاشرت اور تمدن کے وسیع میدانوں تک پہنچ جائے۔

یورپ نے مشرقی مذہب اور تہذیب پر جو حملہ کیا۔ وہ سیاسی حملہ سے بہت زیادہ تباہ کن اور ہلاکت آفریں تھا۔ مغربی علوم و فنون کی چمک دمک، نئی نئی ایجادات۔ سائنس کی حیرت انگیز معلومات نے ایشیا والوں کو اس درجہ مبہوت کر دیا تھا۔ کہ انہیں اپنی تہذیب بلکہ مذہب کے متعلق ایک طرح کی بدگمانی سی پیدا ہوگئی۔ اور انسانی زندگی کے ہر شعبے میں مغرب کے تصوروں میں جاذبیت اور کشش نظر آنے لگی۔ یہ مرعوبیت اور شکست کا احساس اس درجہ بڑھ گیا کہ نہ صرف سیاسی طور پر بلکہ مذہبی اور ذہنی طور پر بھی ایشیائی اپنے آپ کو کمتر و حقیر خیال کرنے لگے

اقبال کی اسلامی فطرت کو اس ذہنی غلامی کا بہت صدمہ ہوا۔ انہوں نے اس DEFEATISM کے خلاف آواز بلند کی چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے تصوف کے خلاف اعلانِ جہاد کیا۔ اس لئے کہ تصوف اپنی بلند ترین خصوصیات کے باوجود اپنے اندر "شکست" اور "فنا" کے جراثیم رکھتا ہے۔ علی الخصوص جبکہ ادبار و تنزل اور پستی نے ہمارے تصوف کو محض بے عملی بالخصوص گداگری اور

بے آمیز اخلاص عمل کا مترادف بنا دیا تھا۔ اقبال نے اس تصوف کے پردے میں "یقین" اور "اعتماد نفس" کا سب سے بڑا دشمن چھپا ہوا پایا۔ جو مذہب کی کمین گاہوں میں بیٹھ کر عمل اور تنازع للبقا کی شاہراہ پر شب خون مارا کرتا ہے۔

جب گھر کے اس مخالف کا خاتمہ ہو گیا تو اقبال آگے بڑھے اور نہایت پامردی اور ہمت کے ساتھ یورپ کی عقل پرستی INTELLECTUALISM پر ضرب لگائی۔ اگرچہ ہمارے لٹریچر میں عقل کے مقابلہ میں عشق کو ہمیشہ بلند مسند ملتی رہی۔ لیکن انیسویں صدی میں ہماری جدید سوسائٹی کے بانی سر سید احمد خاں نے دین میں عقل پرستی پر مبالغہ آمیز اصرار کرتے ہوئے یورپ کے استدلالی مذہب کو اسلام پر چسپاں کرنے کی کوشش کی۔ جو حضرات سر سید احمد خاں کی تصانیف سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کو موجودہ سائنس کے نظریوں سے تطبیق دینے کے لئے معجزات بلکہ وحی و الہام کی بعض بنیادی حقیقتوں سے بھی انکار کر دیا تھا۔ یہ دراصل انگلستان میں عہد وکٹوریہ کے مادہ پرستوں کا سرمایۂ فکر تھا۔ جس سے ہمارے تجدید مذہبی کے اس رہنما نے فیض حاصل کیا۔

سر سید احمد خاں کے اس رجحان کی سب سے زیادہ مخالفت اقبال نے کی جنہوں نے عقل اور عقلیت کو سراب اور ایمان اور ایقان کو حقیقت کا درجہ دیا۔ یہی وہ ایمان ہے جسے وہ عشق کے لفظ سے بار بار تعبیر کرتے ہیں۔ اور اپنے اس یقین کو ثابت کرنے کے لئے جدید علمائے یورپ مثلاً برگسان وغیرہ سے تصدیق لاتے ہیں۔ تاکہ رومی اور دیگر حکمائے اسلام سے ناواقف لوگ حکمائے مغرب ہی کی سند سے سرچشمۂ صداقت تک پہنچ سکیں۔

سر سید احمد خاں مغربی خیالات سے اس درجہ متاثر اور مرعوب تھے کہ انہوں نے انجیل اور قرآن کی باہمی مماثلت کی بنیاد پر مذاہب کے لئے ایک ایسی COMPROMISE یعنی مصالحت کی کوشش کی۔ جو یقیناً اسلام کی صداقت اور اس کے مستقبل پر بہت بری طرح اثر انداز ہو سکتی تھی۔

فلسفہ مذہبی کے سلسلہ میں اقبال کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے نوجوانان ملک کے دل میں اسلام اور خالص اسلام کی بے آمیز حرمت و عزت کا جذبہ پیدا کیا۔ اور جو مایوسی اور ناامیدی اس بارے میں تھی کہ اسلام اپنے اصلی رنگ میں تمدن حاضرہ اور فلسفہ جدید کے مقابلہ میں نہیں ٹھیر سکتا۔ دلوں سے بالکل محو ہو گئی۔ اور اس کے عوض قلوب اس احساس کے ساتھ مالا مال ہو گئے ہیں۔ کہ ان الدین عند اللہ الاسلام

ایک مرتبہ علامہ اقبال کے پاس کچھ طلبہ STUDENT COMMUNITY کے نام پیغام لینے کے لئے آئے۔ میں نے اپنی مختصر اور چند ملاقاتوں کے دوران میں کبھی حضرت علامہ کو اتنا غیظ و غضب میں نہیں پایا جتنا اس موقع پر۔ انہوں نے لڑکوں کی اس خواہش کا جواب ان الفاظ میں دیا۔ کہ I RECOGNISE NO COMMUNITY BUT ISLAM

ظاہر ہے کہ اسلام کے وجود اور اس کی صداقت پر محکم یقین اسی ATTITUDE سے پیدا ہو سکتا تھا۔ نہ کہ اس تصور سے جو سر سید احمد خاں نے پیدا کیا۔

گذشتہ صدی کے ایک اور مصلح مذہبی نے بھی سر سید مرحوم کی طرح عقل پرستی کو جدید فکر اسلامی کی بنیاد قرار دینے کی کوشش کی لیکن اس سے بھی زیادہ انہوں نے یہ کہا کہ "جہاد کو محض علمی اور اخلاقی نوعیت تک محدود کیا" یہ بھی درحقیقت یورپ سے مرعوبیت کا مظاہرہ تھا۔ ورنہ جیسا کہ مولانا ابو اعلیٰ مودودی نے الجہاد فی الاسلام میں لکھا ہے۔ جہاد عالم انسانیت

کا اتنا پاکیزہ مقصد اور بلند مشن ہے کہ وہ سوائے اعلائے کلمۃ الحق کے اپنے اندر کوئی سیاسی اور ملکی مفہوم نہیں رکھتا۔ گذشتہ صدی کے مسلمان اسلام کی اعلیٰ ترین تعلیمات کو یورپ کے تصورات سے ہم آہنگ بنا کر خوش نما بنانے کا جو عمل کیا کرتے تھے۔ اس کی اس سے افسوسناک تر مثال نہیں مل سکتی"۔

علامہ اقبال نے جہاد کو نیچر اور فطرت کا آئین مسلّم قرار دیتے ہوئے یہ حقیقت واضح کی کہ جب خود کائنات کے مصنفانہ نظام میں جدوجہد اور کشمکش کا یہ عمل موجود ہے تو اقوام اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے کیوں سعی و عمل، جہاد اور آویزش کے وسائل کو استعمال نہ کریں۔ اس معاملہ میں علامہ نے نٹشے کے اقوال اور فلسفہ کو بہت توجہ اور اصرار سے پھیلایا تا کہ اقوام مشرق آنکھیں کھول کر دیکھ لیں اور خوب سن لیں کہ متمدن اور غالب یورپ قوت اور غلبہ حاصل کرنے کے بارے میں کیا خیالات رکھتا ہے۔

بہرحال نفی جہاد اور ابطال جہاد کے خلاف سب سے پر زور احتجاج علامہ اقبال نے کیا۔ جنہوں نے نفی جہاد کو "رہبانیت" کے مترادف قرار دیتے ہوئے "علمی جہاد" کو غلامی اور محکومی کا ہم معنی ثابت کیا۔

اسلام کا ایک مسلّم عقیدہ ہے کہ نبوت ختم ہو چکی ہے۔ لیکن فیوض نبوت کے تسلسل اور اجرا کے لئے ہر صدی میں قدرت ایک ایسے مجدّد کو پیدا کرتی رہے گی۔ جو ترقی پذیر معاشرت انسانی کے جدید سے جدید مسائل کو اسلام کے اصول کی روشنی میں حل کرے گا اور اس طریق پر خدا کا آخری مذہب سکون و جمود سے پاک ہو کر ترقی اور ارتقا کی منازل طے کرتا رہے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں علمائے اسلام میں تقلید اور اسلاف پرستی سے بعض ایسے عناصر پیدا ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے انہوں نے اسلام میں اجتہاد کا دروازہ تقریباً بند کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ دور انحطاط کے علماء میں ایسے نفوس کا فقدان بھی ایک ثابت شدہ امر ہو چکا تھا۔ جن میں تجدد اور اجتہاد کی قابلیتیں موجود ہوں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اس جمود سے اسلام کو بہت نقصان پہنچا۔ علامہ اقبال نے اس معاملہ میں علمائے اسلام کی مخالفت کرتے ہوئے اسلام میں اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت نہایت زور دار الفاظ میں بیان کی۔ اسی طرح اقبال نے اپنی عمر کے آخری دور میں مغربی تہذیب اور عقیدہ وطنیت کے خلاف نہایت پر زور جہاد کیا اور میں خیال کرتا ہوں۔ کہ مغربی زندگی اور وطنیت کے متعلق ان کے تصورات شاید ان کے دماغ اور فکر کے آخری پختہ ترین نتائج میں سے تھے۔

میں اس موقع پر نہایت افسوس کے ساتھ عرض کروں گا۔ کہ ہندوستان کے بعض ایسے حضرات جنہیں غلامی کی زنجیروں سے محبت ہے۔ علامہ اقبال کے اس پاکیزہ تخیل کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ گروہ اقبال کی "وطنیت دشمنی" کو سہارا بنا کر اپنی اور دیگر برادران وطن کی محکومی کو اور مستحکم کرنا چاہتا ہے اور اسی کو وجہ جواز بنا کر خود کو یہ فریب دے رہا ہے۔ کہ اقبال کا نظریہ اغیار کے تسلط کا روادار ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ اقبال ایسے عالی فکر حریت نواز کے ساتھ کوئی ناانصافی اور دشمنی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اقبال کے نزدیک لفظ "مسلم" "مرد آزاد" کا ہم معنی ہے اور وہ نہ صرف سیاسی غلامی کا دشمن ہے۔ بلکہ ذہنی، تمدنی، معاشرتی بلکہ فکری عبودیت کا بھی قائل نہیں۔

علامہ اقبال جس رنگ میں وطنیت کے مخالف ہیں۔ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ اسلام دنیا میں قومیت کا ایسا عقیدہ لایا۔ جس کی بنا روحانیت پر ہے اور ظاہر ہے کہ نسل انسانی کو ایک رشتہ میں پرونے کے لئے اس سے وسیع تر بنیاد کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ خون، نسل، وطن۔ اپنی ساری وسعتوں کے باوجود آخر محدود ذرائع اتحاد ہیں۔ ان سے برادریاں، جماعتیں اور قومیں تو بن سکتی ہیں۔ لیکن عالمگیر انسانی اخوت نہیں بن سکتی۔ خون، نسل اور وطن کی بنیاد پر بنی ہوئی قوم پارہ پارہ ہو کر اور گھٹ گھٹ کر ایک نہایت ہی معمولی گروہ اور ایک معمولی رقبہ زمین تک محدود ہو سکتی ہے۔ لیکن روحانی رشتہ اتنا وسیع، اتنا عالمگیر اور اتنا بے قید ہے کہ تمام فضائے عالم اور پہنائے زمین پر محیط ہو سکتا

ہے۔ اس کے علاوہ خود حضرت علامہ نے پیامِ مشرق کے دیباچہ میں فرمایا ہے کہ "میں اس کشمکش کا جو مفہوم لیتا ہوں وہ اصلاً اخلاقی ہے نہ کہ سیاسی"۔ پس ایسے حالات میں جو لوگ اقبال کو وطن کی آزادی کا مخالف ثابت کرنے کے باوجود اپنے کو ان کا پیرو کار اور شیدائی خیال کرتے ہیں۔ فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔

یہ ہے حضرت علامہ کی تعلیمات کا ایک عام فہم خلاصہ۔ ہمارے آخری دور کے سب سے بڑے مفکر نے ہمیں اسلام کی روشن تقدیر کا یقین دلادیا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب ہم (مسلمانوں سے ہی نہیں بلکہ) اسلام سے بھی مایوس ہو چکے تھے۔ انہوں نے نوجوانوں کے دل میں از سرِ نو اسلام کی محبت اور اس کے مسائل کے ساتھ بے نظیر شغف پیدا کر دیا۔ ان کی تعلیم حزن اور یاس سے پاک اور امید اور اعتماد سے لبریز ہے۔ ان کے نزدیک زندگی ایک اچھی چیز ہے اور اس کو آرزو، کوشش اور امید سے خوشنما بنایا جا سکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اقبال کو جس چیز سے نفرت ہے وہ شک اور گمان ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی ساری تعلیم صرف ان ہی دو امراض کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ وہ یقین اور ایمان کے پرستار ہیں اور دین اور دنیا کی فلاح کو اسی پر منحصر خیال کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فیاضِ قدرت نے اقبال کے عرفان سے لبریز دل کو یقین کی جو دولت عطا کی تھی یہ اسی کا کرشمہ ہے جس نے ان کے "برہمن زادہ" ہونے کے باوجود انہیں تبریز و روم کے اسرار کا رمز آشنا بنا دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ سیالکوٹ کے ایک گمنام گھر سے اٹھا کر اکبر گورگانی کے قلعہ کے مغرب میں شہنشاہ عالمگیر کی مسجد کے آغوش میں دفن ہونے کی سعادت دی۔ جس کے لئے سینکڑوں تاجدارانِ ماضی اور فرمانروایانِ حال ستم زدہ حسرت بن کر اپنی خاموش قبروں میں سو چکے ہوں گے۔ خدا اس عارف باللہ کی قبر کو عنبریں کرے۔

سید محمد عبداللہ

سلطان ٹیپو کی وصیت

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول	لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز	ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں	محفل گداز! گرمیِ محفل نہ کر قبول
صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے	جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

اقبالؒ

آزاد ملاح*

مشرق کے دریچہ سے جب سورج صبح سویرے جھانکتا ہے
دریا سے اٹھتی موجوں پہ اک رنگیں سایہ کانپتا ہے

سورج کی روپہلی کرنیں میری پیشانی کو چومتی ہیں
آزاد ہوا کے جھونکوں میں نورانی پریاں جھومتی ہیں

جس کشتی میں شب گزری ہے موجوں کے تھپیڑے کھاتی ہے
لہروں کی زد سے بچتی ہے ساحل سے جا ٹکراتی ہے

دریا کی لہروں کے نغمے کچھ ایسے سننے میں آتے ہیں
کہ جیسے میری بےفکری کی نیندوں سے ٹکراتے ہیں

کیا وقت سہانا ہوتا ہے یہ فطرت کے نظاروں کا
ہر موج لئے ہوتی ہے پرتو رخصت ہوتے تاروں کا

میں ایسے میں جاگ اٹھتا ہوں اٹھ کر انگڑائی لیتا ہوں
منظر پہ نگاہیں پڑتی ہیں ہنستے ہوئے کشتی کھیتا ہوں

لہروں کے نغمے سنتا ہوں دریا کو گیت سناتا ہوں
فطرت کی پرستش کرتا ہوں آزاد ترانے گاتا ہوں

میں خود فطرت کا حصہ ہوں آزاد ہوا میں پلتا ہوں
میں طغیانی پہ ہنستا ہوں میں طوفانوں سے لڑتا ہوں

منجدھار میں جب لہروں کے طوفاں کشتی سے ٹکراتے ہیں
یہ اونچے اونچے پربت میری ہمت سے شرماتے ہیں

بادل برسے بجلی چمکے طغیانی یا طوفان آئے
ناممکن ہے ماتھے پہ بل ہمت میں فرق اک آن آئے

جب بادل گھر کر آتے ہیں میں خوابوں میں کھو جاتا ہوں
کشتی کو بہاؤ پر چھوڑ کے میں سستاتا ہوں سو جاتا ہوں

یہ کشتی میری دنیا ہے میں دنیا کا پابند نہیں
ہر چیز میسر ہے مجھ کو سستا کہ حاجت مند نہیں

جب تک ہیں توانا یہ بازو میں کشتی کھیتے جاؤں گا
ہر روز نئے منظر ہوں گے آزادی کے گن گاؤں گا

دن رات اسی میں بیتے ہیں دن رات اسی میں بیتیں گے
سب کھیل ہیں یہ آزادی کے کیا ہاریں گے کیا جیتیں گے

بچپن میں فسانے سنتا تھا کس شوق سے ایک جزیرے کے
"پریوں کے جھرمٹ کے جھرمٹ سیلاب زدہ کشتی گھیرے"

اک روز مری کشتی یوں ہی سیلاب زدہ کہلائے گی
دنیا کے لئے میری ہستی اک افسانہ بن جائے گی

نذیر میرزا برلاس

* یہ نظم بزم السنۂ مشرقیہ کے سالانہ مشاعرہ میں پڑھی گئی۔

مریخ کا ریڈیو سٹیشن

ہم تین اعشاریہ دو پانچ اور ایک اعشاریہ صفر چھ میٹر پر مریخ کے مرکزی ریڈیو سٹیشن سے بول رہے ہیں۔ اب آپ ہماری ایلفاو یونیورسٹی کے پروفیسر پینٹاٹوس سے ایک تقریر سنیں گے جس کا عنوان ہے "زمین اور اس کے باشندے"۔ پروفیسر پینٹاٹوس سامعین! کچھ عرصہ ہوا میں نے اس سلسلے کی پہلی کڑی پر تقریر کرتے ہوئے آپ کے سامنے زمین کے تاریخی اور جغرافیائی حالات بیان کئے تھے۔ میری آج کی تقریر کا موضوع "جنگ" ہے۔ اس موضوع کی اہمیت آپ کی نظروں میں اور بھی بڑھ جائے گی جب آپ ہمارے محکمہ دوربینی کی رپورٹ پر غور کریں گے جو ۸ مئی سنہ ۱۹۴۰ء کے روز موصول ہوئی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ زمین کے باشندوں نے دنیا کی حدبندی کر کے اُسے مختلف حصوں میں تقسیم کر لیا ہوا ہے۔ جسے وہ "ملک" کہتے ہیں۔ کوئی ملک جرمنی کہلاتا ہے اور کوئی انگلستان۔ کوئی فرانس اور کوئی ہندوستان۔ یہ حدبندی محض من مانی ہے اور اگر اس کے اثرات پر غور کیا جائے تو نہایت مُضر اور احمقانہ۔ اس حدبندی کی وجہ سے ہر ملک کے باشندوں میں ایک جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ جسے وہ "حب الوطنی" یا "نیشنلزم" کہتے ہیں۔ ہمارے سننے والے اپنی اصطلاح میں اس بے معنی خبط کو بڑے پیمانے کی خود غرضی یا مجموعی لالچ کہیں گے۔ ایک ہی قسم کے انسان۔ ایک ہی طرح کی بود و باش رکھنے والے۔ ایک ہی خوراک کھانے والے اور بعض اوقات آپس میں رشتہ داری رکھنے والے۔ آپس میں تفرقے پیدا کر لیتے ہیں اور کوئی انگریز کہلانے لگتا ہے۔ تو کوئی جرمن۔ خود ساختہ جغرافیائی حدود سے گویا انسان کی نوعیت میں فرق پیدا ہو جاتا ہے! اگر کسی گدھے کی گردن میں تختی لکھ کر ڈال دی گئی ہے کہ وہ گھوڑا ہے اور کسی کی گردن میں۔ کہ وہ بھیڑ ہے اس کے گدھے پن میں تو کوئی فرق نہیں آسکتا۔ گدھا گدھا ہی رہتا ہے یہی مثال انسانوں کی ہے۔

زمین کی تاریخ میں بعض ایسے دور آتے ہیں کہ جب ان مختلف ملکوں کے باشندوں میں یہ خود غرضی کا جنون نہایت خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سیاستدان۔ پادری۔ مُلّا اور سرمایہ دار اس جذبہ کی آگ کو اور بھی بھڑکاتے ہیں اور مختلف ملکوں کے لوگ اپنے اپنے لیڈروں اور جھنڈوں کے گرد جمع ہو کر دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔ آج کل زمین کے باشندے ایک اسی قسم کے دور میں سے گزر رہے ہیں۔

۸ مئی کے روز ہمارے محکمہ دوربینی کے ماہرین نے دیکھا کہ یورپ کے درمیانی حصہ میں بڑی تعداد میں انسان اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اور کئی قسم کی خوفناک مشینیں کچھ زمین پر اور کچھ ہوا میں جمع کر رہے ہیں۔ ہمارے سننے والوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ان مشینوں کا مقصد انسان کی خدمت اور آسائش نہیں بلکہ ان کی تباہی اور بربادی ہے زمین والوں کو اپنی سائنس کی ترقی پر بڑا ناز ہے۔ لیکن بدقسمتی سے انسانی عقل و فہم نے اس حد تک ترقی نہیں کی جتنی سائنس نے کی ہے۔ انسان کے جذبات پہلے کی طرح حیوانی ہی ہیں۔ چنانچہ سائنس ان ظالمانہ اور وحشیانہ خواہشات کو پورا کرنے کا ایک آلہ بن گئی ہے۔ زمین کے سائنس دانوں نے اپنی ایجادوں کے ذریعے انسان کو ہولناک بربادی کے ہتھیار بہم پہنچا دیئے ہیں۔ جیسے کسی بچے کو دیا سلائی دے دی جائے یا سکول کے لڑکوں کو بارود کے گولے۔ سائنس طاقت ہے لیکن اس طاقت کا صحیح استعمال وحشی انسانوں نے نہیں سیکھا۔ نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ جو ہوائی جہاز تیز نقل و حرکت کے لئے ایجاد ہوئے تھے وہ اب ایک

دوسرے پر گولہ باری کے کام آرہے ہیں۔ ہمارے سرکاری ریڈیو پر برلن۔ لنڈن اور پیرس سے جو خبریں پہنچتی ہیں انہیں سن کر ہم دنگ رہ جاتے ہیں کہ ہزار ہا سال کی تہذیب اور تمدن کے بعد زمین والے بڑے فخر کے ساتھ اس قسم کی خبریں نشر کرتے ہیں۔ "آج ہمارے میسرشمٹ قسم کے ہوائی جہازوں نے بلجیم کے فلاں شہر پر اس قدر بم گرائے کہ ایک عمارت بھی نہ بچ سکی۔ تمام شہر میں آگ لگ گئی اور تمام شہری ہلاک ہو گئے"...... "آج آر۔اے۔ایف کے دستے نے دشمن کے ایک تباہ کن جہاز پر بم گرائے جو عین نشانے پر بیٹھے اور تمام جہازی غرق ہو گئے" بم باری۔ آگ۔ غرقابی تباہی۔ بربادی! بس یہی ان فخریہ خبروں کا خلاصہ ہے۔ تباہ کن جہاز جیسی اصطلاح صرف انسان ہی گھڑ سکتے ہیں جہاز جیسی کارآمد مشین جو ہواؤں اور سمندروں کو عبور کرنے کے لئے ایجاد ہوئی تھی۔ انسانی اختراع پسندی سے اب تباہ کن کہلائی جانے لگی ہے ۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم انہی ریڈیو سٹیشنوں سے اس قسم کی تباہی اور بربادی کی شیطانی خبروں کا بلیٹن سننے کے فوراً بعد باخ (BACH) اور بےتھوون (BEETHOVEN) کی پاکیزہ اور روح افزا موسیقی سنتے ہیں۔ یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کہ وہی بنی نوع انسان جو ایسی خونخوار جنگ کے موجد ہیں۔ ایسی سماوی موسیقی کے پرستار بھی ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک ہمیں علم ہے خدا کی خدائی میں انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جو اس طرح بے وجہ جنگجو واقع ہوا ہے۔ دوسرے جانور گاہے گاہے اور اکّے دکّے ایک دوسرے سے لڑ بیٹھتے ہیں لیکن عموماً خوراک کے لئے اور کبھی محض تفریحاً لیکن اس قسم کی وسیع پیمانہ کی بے وجہ جنگ کا بانی صرف انسان ہی ہے۔ جنگ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے انسانوں نے کئی ایک بہانے تراش رکھے ہیں لیکن ان سب دلیلوں کی بنا خود غرضی۔ حسد اور لالچ ہے۔ ہمارے سننے والوں کو غالباً یاد ہوگا کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کی وجہ جرمنی نے یہ بتلائی تھی کہ انہیں (PLACE IN THE SUN) پاؤں پھیلانے کی جگہ یا ایسے ممالک چاہئیں جہاں وہ دھوپ سینک سکیں! گویا دھوپ اور ہوا جیسی آزاد اور عالمگیر چیزیں بھی زمین پر ملکیت کے حلقے میں آگئی ہیں۔ اُدھر سے اتحادیوں کا دعوےٰ تھا کہ وہ اس لئے لڑ رہے ہیں کہ یہ جنگ ہمیشہ کے لئے جنگوں کا خاتمہ کر دے لیکن تجربہ سے معلوم ہو گیا ہے کہ جنگ سے کبھی جنگ کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ جس جنگ کا خاتمہ ایک غیر منصفانہ صلح سے کیا جائے۔ اس سے ایک انتقامی جنگ پھر لازم آجاتی ہے۔ یورپ کی قوموں کی حرص کبھی اپنے ممالک سے پوری نہیں ہونے کی۔ انہیں ایشیا اور افریقہ کے مقابلۃً غیر تہذیب یافتہ ممالک چاہئیں جن پر حکمرانی کر کے وہ ہر قسم کے منافع حاصل کر سکیں۔ اس حرص کا نام یورپ کی قوموں نے مسئلہ "نوآبادیات" رکھا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں آج کل یورپ کی قوموں کے دو گروہ بنے ہوئے ہیں۔ نوآبادیات رکھنے والے اور نوآبادیات نہ رکھنے والے۔ جن کے پاس نوآبادیات ہیں وہ ان پر ہمیشہ کے لئے قبضہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اور جو اس نعمت سے محروم ہیں وہ (PLACE IN THE SUN) چاہتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ مال غنیمت میں حصہ چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ ان دنوں ایک ڈاکوؤں کا اڈا بنا ہوا ہے۔ جس ڈاکو کے پاس تباہ کن مشینوں کا ذخیرہ سب سے زیادہ ہوگا وہ جیت جائے گا۔ اور ہاری ہوئی قومیں بیس پچاس یا سو سال بعد پھر طاقت حاصل کر کے انتقامی جنگ لڑیں گی اور یہ سلسلہ لامتناہی قائم رہے گا بشرطیکہ سائنس کی امداد سے یورپ کی قومیں تب تک ایک دوسرے کو بالکل نیست و نابود نہ کر دیں۔

اصل میں زمین کے باشندوں کی ذہنیت ہی جنگی ہو گئی ہے۔ جب بارود گولے کی جنگ نہ ہو رہی ہو وہ آپس میں یا تو لفظوں کی جنگ میں مصروف رہتے ہیں یا اقتصادی جنگ میں جسے وہ جہد للبقا یا (STRUGGLE FOR EXISTENCE)

کہتے ہیں یعنی جب انہیں سچ مچ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کا موقع نہیں ملتا تو وہ اقتصادی معاملات میں ایک دوسرے کا گلا کاٹ کر جی بہلانے لگتے ہیں۔ (CUT THROAT COMPETITION) یا سفاکانہ رقابت جیسی اصطلاح اس کیفیت پر دال ہے بغیر کسی قسم کی جنگ کے زندگی انہیں بے مزہ اور بے معنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ہزاروں پیغمبر انسانوں کی اصلاح کے لئے آئے جنہوں نے صلح اور امن کا پیغام دینے کی کوشش کی۔ خاص کر یورپ والوں کے لئے تو حضرت عیسیٰ "شہزادۂ امن" بن کر آئے لیکن سب رائگاں۔ انسان کے تمام مذاہب تمام فلسفے تمام فنونِ لطیفہ بے سود ہیں کیونکہ انہوں نے اُن کے ذریعے اب تک صلح کی زندگی کا فن نہیں سیکھا۔ در حقیقت انسان جیسا گمراہ اور وحشی جانور سارے عالم میں کہیں نہیں پایا جاتا۔
جن سننے والوں کے دل میں انسان کی سرگذشت سن کر اس عجیب و غریب مخلوق کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی ہو وہ سرکاری چڑیا گھر میں ایک نر اور مادہ کو دیکھ سکتے ہیں۔ جو کہ حال ہی میں وہاں لائے گئے ہیں۔ آداب عرض۔"

امداد حسین

رموزِ عشق

چمن والوں کو جو بجلی تپاں معلوم ہوتی ہے　　وہی مجھ کو بنائے آشیاں معلوم ہوتی ہے

ہوس کی کم نگاہی کو خزاں معلوم ہوتی ہے　　مجھے رازِ حیاتِ گلستاں معلوم ہوتی ہے

نگاہِ نیم باز! اس پر پریشاں زلف کی گھاتیں　　مری بربادیوں کی داستاں معلوم ہوتی ہے

جنوں کا قافلہ تو کر چکا طے منزلیں کب کی　　خرد مرعوبِ گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

جو دیکھا آشیاں میرا تڑپ کر آ گری اس پہ　　اسی میں برق کو جائے اماں معلوم ہوتی ہے

مری رگ رگ امینِ سوزِ الفت ہے! بتاؤں کیا؟　　خلش دردِ محبت کی کہاں معلوم ہوتی ہے

فلک گرداں ہیں۔ گردش میں ہیں مہر و ماہ و اختر بھی!　　یہ میری حسرتوں کی چیستاں معلوم ہوتی ہے

یہ منزل پہ پہنچ کر بھی رہا آوارۂ منزل　　مجھے رہرو کی منزل بھی رواں معلوم ہوتی ہے

ڈبو خود ہاتھ سے کشتی کہ یہ ہی رازِ الفت ہے
ملے ساحل بھنور کی تہ میں یہ اعجازِ الفت ہے

[illegible]

ہم کہاں ملینگے!

ہم طالب علم ہیں۔ دنیائے علم کے متجسس جستجوئے دانش میں سرگرداں۔ بحرِ علم میں ڈوب ڈوب کر ابھرنے والے شناور ہم دنیا میں بھی ہیں۔ اور دنیا سے دور بھی۔ ہمیں خود معلوم نہیں کہ ہم کہاں ہیں ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
اپنی کوئی خبر نہیں آتی

عقل والوں۔ دنیا داروں۔ کو ہم سے کیا کام۔ انہیں پیٹ کے دھندوں سے کہاں فرصت کہ ہم جیسوں کو خیال میں بھی جگہ دے سکیں لیکن اگر کساد بازاری کے وقت کبھی غلطی سے ہمارا خیال آجائے اور غم غلط کرنے کے لئے ہی ہم سے ملاقات کی خواہش پیدا ہو۔ تو ہمیں ڈھونڈیں۔ اور یقیناً ہم مل جائیں گے۔ لیکن کہاں۔ ہوسٹل میں۔ اپنے کمروں میں دبکے ہوئے۔ خیالات کی دنیا کو اپنے دماغ میں اوندھا انڈیلا کر خدا تعالےٰ سے کامیابیٔ امتحان کی دعا مانگتے ہوئے۔ کتاب آنکھوں پر۔ آنکھیں کتاب پر اور فکرِ امتحان میں دنیا و ما فیہا سے بے خبر۔ خواب میں تصورات کی دنیا بساتے ہوئے۔ گریٹا گاربو کے حسن بھری نگاہیں، جون کرافورڈ کی چشمِ مست مارلین ڈیٹرچ کے آتش زا مونٹ کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے اپنا بوٹ پالش کرتے ہوئے۔ قمیض میں بٹن لگاتے ہوئے یا کسی کی تصویر کو سہم کر دیکھتے ہوئے کبھی نظریں دروازہ پر کبھی تصویر پر۔ اور پھر کسی کے ناگہاں کمرہ میں نازل ہونے پر اس تصویر کو میز پوش کے نیچے چھپاتے ہوئے۔

کھانے کے وقت ڈائننگ ہال میں۔ بچوں سے چھیاں زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد کی مثال میز پر رکابی بجاتے ہوئے ہل من مزید کا نعرہ لگاتے ہوئے بہروں کو سخت سست کہتے ہوئے۔ اپنی پلیٹ کے حدود اربعہ پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے۔ ایک ہاتھ میں پانی کا گلاس دوسرے میں روٹی کا ٹکڑا۔ نظریں تمام کمرہ کا جائزہ لیتی ہوئیں۔ کھانے کے بعد پیٹ پر ہاتھ پھیر کر گرتے پڑتے اپنے کمرے میں آکر ڈھیر ہوتے ہوئے۔

امتحان کے دنوں میں مجسم شرافت۔ خدا سے لَو لگائے۔ کتابیں بغل میں دبائے کسی آرام دہ کونے کے متلاشی۔ اچھی سی جگہ ملنے پر اپنی دری پر اوندھے منہ لیٹ کر کتاب آگے رکھ کر اونگھتے ہوئے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد آہستہ آہستہ سجدوں کی مشق کرتے ہوئے اور شاہراہ کابل پر جانے والے قافلوں کے لئے سامان تضحیک مہیا کرتے ہوئے نامراد افسردہ دل وقتی "قیمتی محنت" میں مصروف اوقات کالج میں کوائف کالج کی بحث میں مصروف۔ اپنے آشناؤں کے حلقے میں گھرے ہوئے ایک ٹانگ پر بوجھ ڈال کر کھڑے کسی ممتحن یا کسی پروفیسر کو کوستے ہوئے۔ اپنے "لقمانی" دلائل پیش کرتے ہوئے رفتارِ زمانہ پر تقریر کرتے ہوئے۔ آنکھیں کبھی زمین پر کبھی اپنے مخاطب کے چہرہ پر۔

کالج کے کمروں میں۔ پروفیسر صاحب کی دھواں دھار تقریر سے مرعوب۔ تصویر حیرت بنے۔ آنکھیں ظاہراً پروفیسر صاحب کی طرف لیکن درحقیقت اُن کے سوٹ۔ ٹائی اور بال بنانے کی طرز پر نکتہ چیں۔ دل خدا کی طرف یا خدا کی مخلوق کی طرف دماغ موضوع لکچر سے کوسوں دور ہر لمحہ یہ تعجب کہ اے خالقِ دو جہاں! یہ کیسی ہستی بنا کر تو نے سامنے کھڑی کر دی کہ بھاپ اور بجلی

کی امداد کے بغیر مسلسل بحرالفاظ پرڈریڈناٹ کی طرح رواں ہے۔ کاش کہ کوئی آبدوز کشتی اس طرف آنکلے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے
بے قراری بڑھتی جاتی ہے۔ وقت کی سست رفتاری کو کوستے ہوئے منتظر، اضطراب اور بے چینی کے شکار لیکویاں ہمہ تکیم سنتے ہوئے
اپنی جماعت کے کمرے میں بیٹھے ہوئے اکاؤنٹ آفس میں دیکھے، ہیں۔ اور گھبرائے ہوئے اپنے روپیوں کو گن کر جیب میں ڈال کر جیب
پر ہاتھ رکھتے ہوئے۔ ایڑیاں اٹھا کر کلرک صاحب یا بو صاحب رہا جو چیز بھی پیش نظر ہو کو دیکھ کر آہ بھرتے ہوئے واپس آتے پھر روپے گنتے
گن کر دوسری جیب میں ڈالکر دوسرا ہاتھ جیب پر رکھ کر پھر جرأت حضوری کرتے ہوئے۔ ڈرتے ڈرتے سامنے ہو ہی جاتے ہوئے
کلرک صاحب کی جابرانہ نگاہیں جبیں کے شکن اور چہرہ کی جلالت سے مرعوب ہو کر جیب سے نوٹوں کی بجائے گھبراہٹ میں کسی دشمنِ
ایمان۔ رہزنِ ہوش کی تصویر یا خط بابو صاحب کے پیش کرتے ہوئے اور بابو صاحب کے غضبناک نعرۂ فلک شگاف سے گھبرا کر پیچھے ہٹنے
کی کوشش میں دوسرے قریبی بابو صاحب کی گود میں دھیر ہوتے ہوئے۔ اور آخر معذرت کرتے ہوئے عقل ٹھکانے لاتے ہوئے۔
حوضِ شناوری میں اپنے شاندار جسمانی اُتار چڑھاؤ۔ مینڈک کی طرح پھولے ہوئے پیٹ کو سکیڑتے ہوئے اور چھاتی ابھارتے
ہوئے ہمیں دیکھ۔ پانی میں غوطہ لگاتے ہوئے اور پھر سطحِ آب پر مرغابی کی طرح ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر رواں۔
ہم طالب علم ہیں۔ ہمیں ڈھونڈو۔ تو ہم مل جائیں گے لیکن گرمیوں کے تین مہینوں میں نہیں۔ یہ وقت ہم آبادی اور شہروں سے
دور کہیں پہاڑوں کی غاروں میں بسر کرتے ہیں۔ سردیوں کے آغاز میں ٹڈی دل کی طرح آبادی کا رُخ کرتے ہیں۔ ان مقامات میں سے
کسی میں بھی نہ ملیں تو پھر ہمیں ڈھونڈو کسی جیل خانہ میں۔ پاگل خانہ میں۔ شفا خانہ میں، وہاں بھی نہ ملیں تو پھر کسی قبرستان میں اور وہاں
بھی ناکامی ہو تو خدا تعالےٰ کے حضور میں معبودِ حقیقی سے حضرتِ اقبال کی زبان میں محو کلام۔

روزِ حساب پیش ہو جب میرا دفترِ عمل
خود بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

محمد اصغر (سال ششم)

رباعیات

(۲)

جب وہ جانِ بہار آتا ہے — اپنے اوپر بھی پیار آتا ہے
اس کے جانے پہ ناصحا مت پوچھ — جانے کیسے قرار آتا ہے

زندگی خود تباہ کر لیتا ہوں — دل کا دامن سیاہ کر لیتا ہوں
لاج رکھنے کو ترے عفو کرم کی واللہ — گاہے گاہے گناہ کر لیتا ہوں

[illegible]

کھویا گیا

گم ہوگیا جاتا رہا — جاتا رہا کھویا گیا
بے تاب ہوں بے چین ہوں — یارب مجھے کیا ہوگیا
کیوں دل مرا کھویا گیا

ہمدرد تھا ہمراز تھا — مونس تھا اور دمساز تھا
کہنے کو اک دل تھا مگر — میری متاعِ ناز تھا
اب دل کہیں کھویا گیا

کوئی چرا کر لے گیا — دل کو اڑا کر لے گیا
زلفوں میں کوئی نازنین — شاید چھپا کر لے گیا
اب دل کہیں کھویا گیا

یہ کیا قیامت آگئی — اُف کیسی آفت آگئی
کیا ہوگیا محشر بپا — یہ کیا مصیبت آگئی
اُف دل کہیں کھویا گیا

بے لطف جینا ہوگیا — جینے سے مرنا ہی بھلا
سرمایۂ عشرت تھا دل — جب دل نہ ہو جینا ہی کیا
اُف دل کہیں کھویا گیا

اے آفتابِ زرفشاں — کچھ تو بتا مجھ کو نشاں
کس نے چھپایا دل مرا — تاریک ہے مجھ پر جہاں
اُف دل کہیں کھویا گیا

گم گشتہ دل میرا اگر — ہو پاس تیرے اے قمر
دے دے مجھے بہرِ خدا — ممنون رہوں گا عمر بھر
اُف دل کہیں کھویا گیا

دیدہ و خدارا دل مرا — نازوں کا پالا دل مرا
تارو تمہارے پاس ہے — تم نے چھپایا دل مرا
اُف دل کہیں کھویا گیا

اے کالے کالے بادلو — دیدہ و نہاں گر تم میں ہو
وہ دل میرا کھویا ہوا — میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں جو
اُف دل کہیں کھویا گیا

اے بلبلِ رنگین نوا — اے طائرِ نغمہ سرا
میرے دلِ گم گشتہ کا — تو ہی بتا دے کچھ پتا
اُف دل کہیں کھویا گیا

ہوں ڈھونڈتا گلزار میں — وادی میں اور کہسار میں
اب ڈھونڈنے جاتا ہوں میں — خاکِ درِ دلدار میں

اُف دل کہیں کھویا گیا

اے خوبصورت نازنیں - اے شمعرو - آئینہ جبیں
اے بے وفا بیدادگر - تو نے چرایا تو نہیں
جو دل مرا کھویا گیا

لوگو خدا کے واسطے - دل میرا لاکر دو مجھے
ہوں بیقرار و مضطرب - کچھ تو تسلی دو مجھے
اُف دل کہیں کھویا گیا

وہ معدنِ مہر و وفا - وہ کشتۂ جور و جفا
خواجہ کا وہ بیتاب دل - گم ہو گیا - جاتا رہا
اُف دل کہیں کھویا گیا

خواجہ محمد یوسف
(سال دوم)

بوٹ پالش

قصہ خوانی بازار کے ایک بالاخانے میں اپنے خیالات میں مستغرق دیناو فیہا سے بے خبر بیٹھا تھا۔ گاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ لڑکوں کا غل۔ برتنوں کی جھنکار۔ چھابڑی والوں کی آوازیں میرے خیالات میں خلل انداز ہونے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ کہ یکایک "بوٹ پالش" کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز میں ہر روز سنا کرتا تھا۔ گھر میں بیٹھے ہوئے بازار میں چلتے ہوئے۔ کلب میں ٹینس کھیلتے وقت دفتر میں کاغذوں پر جھکے ہوئے یہ آواز روزانہ میرے کانوں میں آیا کرتی تھی۔ اس آواز سے میں کچھ مانوس سا ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے کبھی یہ کوشش نہ کی کہ اس آواز کے مالک سے گفتگو کروں۔ آج معلوم نہیں کیا خیال آیا کہ میں نے پالش والے کو اندر بلا لیا۔ "کیا آپ بوٹ پالش کرائیں گے۔ جناب" اس نے کہا۔ اور بے اختیار میرے منہ سے "ہاں" کا لفظ نکلا۔ اور دوسرے لمحے میں اس کے ہاتھ میرے پاؤں تک پہنچ چکے تھے۔ وہ کوئی بیس سال کا نوجوان تھا۔ کشادہ چہرہ گھونگر والے بال بڑی بڑی آنکھیں جن سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ "بلڈی کے تمہارا کیا نام ہے" میں نے سرسری طور پر اس سے پوچھا "مائی نیم از رشید" اس نے بلا تکلف انگریزی میں جواب دیا۔ کہیں سے الفاظ رٹ لئے ہونگے۔ میں نے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے الفاظ سن کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور کہنے لگا۔ "جناب کچھ شک نہیں۔ کہ آپ اس وقت کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ اور میں نیچے بیٹھا آپ کے بوٹ پالش کر رہا ہوں۔ لیکن یقین جانیے کہ ایک زمانہ میں مجھے بھی اتنی ہی عزت حاصل تھی جتنی کہ اب آپ کو ہے"۔ یہ جواب پھر اس نے انگریزی میں دیا۔ ایک پالش کرنے والے سے ایسی صاف انگریزی سننے کا میرا پہلا اتفاق تھا۔ اس کی باتوں سے میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ اس نے کہا میں بھی ایک اچھے خاندان کا فرد تھا۔ لیکن افسوس قسمت خراب تھی۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی والدہ داغ مفارقت دے گئیں۔ اور جب انٹرنس پاس کیا تو والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ آہ اس وقت جب زندگی کے میدان میں ابھی میرا پہلا ہی قدم پڑا تھا دنیا مجھے یتیم کے نام سے پکارنے لگی۔ تعلیم کا بے حد شوق تھا۔ لیکن آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ناچار جائداد فروخت کر کے پڑھائی جاری رکھی۔ اور ایف۔ اے پاس کیا۔ نوکری کی تلاش کی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ خیال آیا کیوں نہ

بی۔اے کروں اور آئندہ زندگی آرام سے گزاروں۔ پر افسوس کہ تمام امیدیں بیکار رہیں۔ تمام جائداد فروخت ہو چکی تھی۔ جیب میں ایک پائی تک موجود نہ تھی۔ کئی دن سے فاقہ تھا لیکن آہ! اس غربت کے زمانہ میں بھی میں محلات کے خواب دیکھ رہا تھا۔ میں ایک بوسیدہ سوٹ میں ملبوس پھٹے پرانے بوٹ پہنے کھڑا تھا اور خوشی کے آنسو میرے رخساروں پر چمک رہے تھے۔ امید وار، ہائے، میری آئندہ زندگی کا سہارا۔ میری خیالی سنہری زندگی کا ذریعہ آہ! میری مشقتوں کا پھل ایک کاغذ کی صورت میں میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے بی۔اے کی ڈگری مل چکی تھی۔ لیکن افسوس پیٹ بھرنے کو جیب میں ایک پیسہ تک نہ تھا۔ جگہ جگہ نوکری کے لئے ٹھوکریں کھائیں۔ بڑے بڑے افسروں کے بنگلوں کا طواف کیا۔ تمام دفتروں میں درخواستیں دیں لیکن افسوس جہاں جاتا افسر دیر تک سر کھپانے کے بعد صرف ان الفاظ میں جواب دیتے۔ "نو ویکنسی" مجھ جیسے ہٹے کٹے بی۔اے پاس نوجوان کو دفتر میں چپڑاسی کی نوکری بھی نہ ملی۔ آخر تنگ آکر پالش کا بکس اٹھایا۔ چند دن شرم و حیا نے روکا۔ لیکن آخر کہاں تک .... میں اس کی داستان سننے میں ایسا محو تھا کہ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ وہ کب کا بوٹ پالش کر کے پیسے لے جا چکا تھا۔ یکایک حمید کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "اٹھو بھئی۔ دفتر چلیں۔ کتنا ظلم ہے دس بجے سے چار بجے تک دفتر میں قلم گھستے رہیں اور تب کہیں مہینہ میں ساٹھ۔ ستر روپے ملتے ہیں۔" حمید کے ان الفاظ سے میرا خیال پالش والے کی طرف دوڑ گیا۔ بوٹوں پر نگاہ ڈالی تو وہ خوب چمک رہے تھے۔ گویا پالش والے کی قسمت پر ہنس رہے تھے۔ یہ ہے دنیا۔

عبدالسلام
(سال دوم)

آئینِ جواں مردی

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی　　کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو　　کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ　　کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ　　ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اقبال رح

گنج عرفان

(۱)

مرید ــــــ آقا! میں تجلی گاہ عرفان میں کس طرح باریاب ہو سکتا ہوں۔ "خانہ زار مجاز" سے "بہن زار حقیقت" تک کس طرح رسائی ہو سکتی ہے تاکہ میں کسی پیکر نورانیت سے ظلمت خانۂ دل کو منور کر سکوں اور کسی کے نطق مقدس کو زر دوش گوش بنا سکوں۔

عارف ــــ فطرت کی حسین ترین خاموشیوں میں ــــ رہبانیت کے پرستار! عزلت گزینی کے پرسکوں لمحوں کی تلاش کر۔ دنیائے ہاؤ ہو سے دور طمانیت قلب حاصل کر۔ پھر تو اس انداز تکلم کی تاب لاسکے گا۔

مرید ــــ کیا وہ "مبدا عرفانیات" انسانی دسترس سے دور ہے ....؟

عارف ــــ نہیں وہ تیرے نہاں خانۂ دل میں مقیم ہے ... اے جویائے حقیقت! تو رموز قدس کا ادا شناس ہو سکتا ہے۔ تیرے کان اس کے مقدس تکلم کے محرم ہو سکتے ہیں! ۔ اپنی ہستی کو اس میں گم کر دے اور ماحول سے قطعاً بے خبر ہو جا...!

بیخودی مایۂ عــرفانِ خودی ہے یعنی
محرمِ جلوۂ اســرار ہے نامحرمِ ہوش

مرید ــــــ میں کس طرح اس کے مقدس الفاظ سن سکتا ہوں۔ اے سالک راہ! کیا اپنی ہستی کو فراموش کر دوں؟ عقدۂ عالم سے نکل جاؤں۔ بے خودی کیونکر میری راہبر ہو سکے گی ــــ؟؟

عارف ــــ جب تو عالم رنگ و بو سے بے نیاز ہو جائیگا۔ اور ــــ فیضانِ بیخودی سے فیضیاب! ــــ تو ایک ابدی قوت سامعہ ــــ ایک لازوال قوتِ باصرہ ــــ اور ایک جاوداں قوتِ ناطقہ ــــ تجھے بخش دی جائے گی۔ جو تیری حیاتِ خفتہ کو حرکت میں لائے گی۔ اور روح خوابیدہ کو بیدار کر دیگی۔

جا پاکیزگی اور معصومیت کی دیویاں تیرا انتظار کر رہی ہیں۔

(۲)

زندگی ایک مرض ہے اور دنیا اس کے جراثیم سے معمور! ــــ جسے وفادار دوست میسّر آگیا اس نے اس مرض کی دوا پالی ــــ جستجو کئے جا مگر وضع خودداری اور شانِ عجز کو نہ مٹا!

خواجہ انور سال ششم

ایک خواب

غالباً ۲۲ اپریل کی رات تھی۔ میں اپنے بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس رات نامعلوم کیوں طرح طرح کے خیالات میرے دماغ میں آرہے تھے۔ پریشانیاں مجھے ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ خیالات کی اس کشمکش میں میری آنکھ لگ گئی۔ عالمِ خواب میں میں نے اپنے آپ کو ایک وسیع اور سرسبز و شاداب میدان میں کھڑے پایا۔ کچھ فاصلے پر آگ کے شعلے اٹھتے نظر آنے لگے۔ اور آن کی آن میں دھوئیں کے تاریک بادل فضا میں چاروں طرف پھیل گئے۔ میرا دم رکنے لگا۔ لیکن ایک نامعلوم کشش مجھے اس مقام کی طرف لے جانے لگی۔ جہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ جوں جوں اس مقام سے نزدیک ہوتا گیا۔ میری پریشانی بڑھتی گئی۔ حتےٰ کہ جب میں دھوئیں کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ تو ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ صرف کان اور آنکھیں ابھی تک مصروف کار تھیں۔ یکایک میری نظر ایک باغ پر پڑی جس کے درختوں پر پھلوں اور پھولوں کی بجائے روپے پیسے اُگے ہوئے تھے۔ اس باغ کے درمیان میں سے ایک ندی گزرتی دکھائی دی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ اس ندی میں بجائے پانی کے خون بہ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد چند آدمی درختوں سے روپے توڑتے دکھائی دئے یہ لوگ نقرئی میوے اور پھول جمع کر کے ایک سمت چل دئے اور کچھ دور چل کر یکا یک ایک دیو صورت انسانی شکل کے سامنے ڈھیر کرنے لگے۔ اسی قسم کی بہت سی ہیبت ناک شکلیں دکھائی دینے لگیں جن کے سامنے روپے اور چاندی سونے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہ خوفناک انسان زرّیں لباس میں ملبوس تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جام شراب تھے اور ان کے سامنے نازنین رقاصائیں رقص کر رہی تھیں۔ دوسری طرف نگاہ جو کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ چند ننگ دھڑنگ انسان جن کے بدن پر سوائے بوسیدہ چیتھڑوں کے اور کچھ نہ تھا۔ ہاتھوں میں درانتیاں لئے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے۔ یہ لوگ اپنی گھاس پھوس کی جھونپڑیوں سے جو دور فاصلے پر نظر آتی تھیں لڑائی کے میدان میں دوڑے آ رہے تھے۔ آناً فاناً کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے اس میدان میں خون کا دریا بہنے لگا۔ اتنے میں چند مربی انسان بندوقیں لئے آ پہنچے اور ان درانتی والے جنگجوؤں کو منتشر کرنے لگے۔ وہ لوگ بھی جو گل چینی میں مصروف تھے۔ امن قائم رکھنے والوں کی امداد کو آ پہنچے۔ انہوں نے درانتی والوں کی جھونپڑیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ درانتی والے روتے پیٹتے حسرت و ارمان سے پُر دل لئے ہوئے واپس چلے گئے۔ ان دل ہلا دینے والے مناظر کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ ابھی روح فرسا واقعات میرے قلب و دماغ میں موجود ہی تھے کہ کان میں ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی دعا مانگ رہا ہو۔ اس طرف مڑا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک عمر رسیدہ دیوی جس کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ سر جھکائے بیٹھی ہے اور بار بار اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں کہ "یا اللہ اس باغ پر ہمیشہ ایسی ہی بہار رہے"۔ میں آہستہ سے اس کے قریب گیا اور اسے اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔

میں۔ بے چین دیوی تو کون ہے؟

دیوی۔ مجھے نا اتفاقی کہتے ہیں۔

میں۔ دیوی تو اس باغ میں بقائے بہار کی دعا کیوں مانگ رہی ہے؟

دیوی۔ بیٹا یہی باغ میری حیات کا سرمایہ ہے۔ یہی میری زندگی کی پونجی ہے۔ اسی غلیظ دھوئیں میں میں سانس لیتے

کر جیتی ہوں۔ یہی ایک خطہ رہ گیا ہے جہاں میں زندگی کی آخری گھڑیاں خوشی سے گزار سکتی ہے۔

میں - دیوی یہ کونسا خطہ ہے؟

دیوی۔ بیٹا یہ وہی بدنصیب خطہ ہے جہاں تم بھی رہتے ہو اور میں بھی۔ میں تمہاری قوم کی احسان مند ہوں کیونکہ تمہارے سوا دنیا کے لوگوں نے مجھے رہنے کی کہیں جگہ نہیں دی۔ میرے بسنے کے لئے صرف یہی مقام باقی رہ گیا ہے۔

میں - دیوی! یہ سیاہ رنگ والے برہنہ انسان کیوں ایک دوسرے کا خون کر رہے ہیں؟ یہ باغ میں خون کی ندی کیوں بہ رہی ہے؟ یہ ردیوں کے ڈھیروں کے مالک کون ہیں؟ یہ آگ یہ دھواں یہ عقیدہ رنگ......؟

میرے پیہم سوالات سنکر دیوی کی آنکھیں ندامت سے نیچی ہو گئیں۔

دیوی۔ جا بیٹا! آرام کر۔ تجھے ان باتوں سے کیا کام۔

میں - دیوی - للہ۔ بتاوے۔ میں مضطرب ہوں۔ بے چین ہوں بے قرار ہوں۔ بغیر دریافت کئے جاؤں گا نہیں۔

دیوی۔ یہ سیاہ فام لوگ میری ہی وجہ سے ایک دوسرے کا خون کر رہے ہیں۔ میں ہی خون کی ندی کا سبب ہوں۔ یہ آگ میں نے ہی لگائی ہے۔

ابھی اس نے اپنی باتیں ختم نہ کی تھیں کہ میری نظر تین چادروں پہ جا پڑی۔ جن میں سے ایک پر موٹے حروف میں لفظ "مذہب" لکھا ہوا تھا۔ اور دوسری پر "قوم" اور تیسری پر "روایات"۔ میں نے دیوی سے اس کا مطلب دریافت کیا۔ تو اس نے جواب دیا۔

دیوی۔ یہی تین چادریں میرا آسرا رہ گئی ہیں۔ یہی میرا ہتھیار ہیں۔ کبھی میں ایک چادر اوڑھ لیتی ہوں کبھی دوسری اور کبھی تیسری اور ان لوگوں کا ایک دوسرے سے خون کراتی ہوں۔

میں - دیوی! اس کشت و خون سے کیا حاصل؟

دیوی۔ (آہ بھر کر) بیٹا یہ ــــــ یہ نہ پوچھ۔

صفدر گیلانی سال دوم

"ملا رموزی"

تمام ہندوستانی عموماً اور مسلمانان ہند خصوصاً مُردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے صاحب کمال اور یکتائے روزگار پیدا ہوتے رہیں لیکن جب تک وہ زندہ رہتے ہیں ہندوستانی ان کے کمالات سے ناآشنا رہتے ہیں۔ اور وہ کس مپرسی کی زندگی بسر کرتے رہتے ہیں۔ مگر جونہی وہ موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ تو ان کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ اور سمجھنے لگتے ہیں۔ کہ انہوں نے ان مقتدر ہستیوں سے کس قدر بے اعتنائی برتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ ہم ہندوستانیوں نے حضرت اقبال مرحوم جیسی جامع الصفات ہستی کو ان کی وفات کے بعد پہچانا۔ ہمارا قومی اور ملکی فرض ہے۔ کہ ہم اس قدیم اور قابل نفرت عادت کو چھوڑیں اور اپنے قابل قدر ہنماؤں اور ادبا کی قدر و عزت ان کی زندگی ہی میں کریں۔

مدیران خیبر کی طرف سے بار بار طلبہ سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ کہ خیبر کی اشاعت کے لئے مزاحیہ مضامین لکھیں۔ مگر جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے۔ بہت کم مزاحیہ مضامین خیبر کے صفحات پر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمارے طالبعلم بھائی ظرافت نگار ادبا کے کلام سے یکسر ناواقف و ناآشنا ہیں۔ آج کی صحبت میں ہم اردو زبان کے بہترین ظرافت نگار حضرت ملا رموزی سے (جو بحمدہ زندہ سلامت ہیں) ناظرین کو متعارف کراتے ہیں۔ تاکہ ہماری "زندہ پرستی" کا ثبوت بھی مل جائے اور "ظرافت نگاری" کے امیدواروں کے لئے سرچشمۂ مزاح و ظرافت کا سراغ بھی میسر آ جائے۔ ہمیں ان کی زندگی سے بحث کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ ان کی ادبی اور مزاحی خصائص کو ہدیہ قارئین کرنا ہے۔

اردو دان طبقے میں کم ہی ایسے ہوں گے۔ جو ملا رموزی کے نام نامی سے واقف نہ ہوں۔ آپ اردو کے بہترین ظرافت نگار ہیں۔ آپ سے ظرافت کو ایسا تعلق ہو گیا ہے۔ کہ آپ کا اسم گرامی سنتے ہی لبوں پر تبسم کی جھلک نمودار ہو جاتی ہے۔ زبان اردو پر آپ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے۔ کہ اس کے دامن کو ظریفانہ جواہر ریزوں سے بھر دیا ہے۔ پہلے پہل آپ نے گلابی اردو کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ اور اس میں وہ کمال حاصل کیا کہ جو آج تک مشہور آفاق ہے۔ گلابی اردو کے لئے آپ نے ایک خاص قسم کی زبان ایجاد کی اور دانستہ وہ طرز تحریر اختیار کی جو مولوی عربی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت استعمال کرتے ہیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔ کہ اس طرز کے آپ ہی موجد و مخترع ہیں اور غالباً آپ ہی اس کے خاتم ہونگے۔ جس شخص نے بھی آپ کا تتبع کیا۔ ناکام رہا۔ آپ کے طرز تحریر کے بیسیوں نقال پیدا ہوئے مگر کسی کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ آپ نے بظاہر مزاحیہ الفاظ میں جس خوبی کے ساتھ مذہبی اور سیاسی معاملات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

آپ نے عام فہم سادہ اردو میں بھی ظرافت نگاری کی ہے۔ اور اس طرز تحریر میں بھی اپنے کمال کا سکہ بٹھا چکے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کو اخبار نویسی کا تجربہ بھی حاصل ہے۔ جس میں سلاست روانی اور متانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہوتی ہے۔

ملا صاحب کے ظریفانہ مضامین میں بھی یہ بات قابل ستائش ہے۔ کہ وہ اصلاح کی غرض سے لکھے جاتے ہیں تنقید ذاتی بغض و عناد کی وجہ سے نہیں بلکہ قدامت پرستی جہل، اور اوہام پرستی کو دور کرنے اور ہندی مسلمان کے تمدنی نظام کو سنوارنے کے لئے کی جاتی ہے اس لحاظ سے اگر آپ کو اردو زبان کا چارلس ڈکنس (CHARLES DICKENS) کہا جائے تو بجا ہے آپ کو زمانۂ حال کے نوجوانوں، کالج کے لڑکوں، پروفیسروں اور نئی تہذیب کے دلدادوں سے کوئی ذاتی رنجش نہیں مگر چونکہ آپ اس طبقہ کے لوگوں کی اصلاح کو

زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔اس لئے ان کے متعلق آپ کا قلم خوب چلتا ہے۔ اور سادہ لوح اس سے یہ اندازہ لگا لیتے ہیں۔کہ آپ اس طبقہ کے دشمن ہیں۔

ایک اور خوبی ملا صاحب کے مضامین میں یہ ہے۔کہ انہیں پڑھتے وقت آنکھوں کے سامنے نفسِ مضمون کا ایک نقشہ سا کھنچ جاتا ہے۔جب وہ ریل کے سفر پر قلم اٹھاتے ہیں۔تو پڑھنے والا محسوس کرنے لگتا ہے۔کہ وہ خود تیسرے درجے کے ڈبہ میں سفر کر رہا ہے مسافروں کا ہجوم ہے۔جلیم کے کش پر کش لگ رہے ہیں ہر سٹیشن پر نئے مسافر سامان سمیت ریل کے ڈبہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اور مسافر شور و شغب میں مصروف ہیں۔جب وہ شکار کا نقشہ کھینچتے ہیں۔تو پڑھنے والا اپنے آپ کو شکاریوں کا ہمرکاب تصور کرنے لگتا ہے وسعتِ نظر اور ہمہ گیری میں انہیں وہ کمال حاصل ہے۔کہ گھر بیٹھے ہر طبقہ کے لوگوں کے مفصل حالات نہایت وضاحت سے بیان کر دیتے ہیں۔جس وقت آپ نے شادی نہیں کی تھی۔اس وقت بھی خانگی امور پر ایسی صحیح روشنی ڈالتے تھے۔کہ پڑھنے والے کو یقین ہو جاتا تھا۔کہ آپ گرہستی زندگی کے واقعات سے بخوبی واقف ہیں۔گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالتے مگر سفر کی تمام تکالیف کو من وعن بیان کر دیتے ہیں۔اور اس پر طرہ یہ ہے۔کہ جس قسم کا مضمون ہو اسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔جن لوگوں سے واسطہ ہو انہی کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں۔غرضیکہ ملا صاحب کے مضامین کے مطالعہ کے بعد ان کی فطرت شناسی اور وسعتِ نظر کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔

ملا صاحب کے کلام میں جو بات بہت پسند ہے۔وہ اُن کے الفاظ واشارات ہیں۔عام الفاظ کو خاص معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔مثلاً اپنی زوجہ کے لئے وہ جابہ جگہ "وہ" "اُن" "ننھے میاں کی والدہ" اور "نیکبخت" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔جو معانی کے ساتھ ساتھ ظرافت کی چاشنی بھی رکھتے ہیں۔

ایک جگہ بیت الخلاء کا لفظ استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔تو آپ لکھتے ہیں۔"جب ہم صبح اپنے گھر کے میونسپل بورڈ کی طرف گئے"۔یہاں میونسپل بورڈ کے لفظ کے استعمال سے ادب شناس حضرات ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ایک دوسری جگہ پر ایک آزاد اور بیباکانہ گفتگو کرنے والی عورت کے لئے لکھتے ہیں "آپ سے شرماتی ہیں۔ ورنہ وہ تو اس قدر ابو الکلام آزاد واقع ہوئی ہیں۔کہ رات بھر خانگی معاملات پر گفتگو کرتی رہتی ہیں"۔ ملاحظہ فرمایئے ایک لفظ ابو الکلام آزاد میں فصاحت۔بلاغت۔آزادی کے کتنے دریا بے پایاں مضمر ہیں۔

آپ کے مضامین میں صنعت گریز بھی کثرت سے مستعمل ہوتی ہے۔اصل مضمون سے بعض اوقات دور چلے جاتے ہیں مگر جس طرف کو نکلتے ہیں معلومات کا ذخیرہ فراہم کرتے چلے جاتے ہیں۔اور مضمون بدمزہ نہیں ہوتا۔بلکہ اس میں دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔

الغرض ملا رموزی کے مضامین مطالعہ کے قابل ہیں۔اور یہ حقیقت ہے کہ ان میں نصیحت، علمیت، ادب اور ظرافت کی کثرت ہے۔

غلام مصطفیٰ صفدر

بلّی

جنگ نہ ہوئی اللہ کا غضب ہوا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر وقت اسی کا خیال اور ہر لمحہ اسی کی فکر۔ مشہور مثل ہے۔ گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ میری جو شامت آئی تو ایک دن عشا کے وقت بازار قصہ خوانی کی طرف چل پڑا۔ جس طرح ایک متقی انسان منشیات سے پرہیز کرتا ہے اسی طرح میں بھی اخبار بینی سے گریز کرتا ہوں۔ اسے قسمت کا لکھا سمجھئے کہ اس دن اخبارات کی ایجنسیوں میں بھیڑ بھاڑ دیکھ کر ایک اخبار میں نے بھی خرید لیا۔ گھر آ کر اسے کھولا تو جلی قلم سے یہ عنوان لکھا پایا۔ "انڈین نیشنل کانگرس اور حکومت میں مصالحت کی توقع" اتنا ہی پڑھنا تھا کہ سر چکرانے لگا۔ چونکہ اخبار بینی کا عادی نہیں تھا اس لئے "باقی پھر" کے مقولے پر عمل کر کے اخبار سرہانے رکھ کے سو گیا

قصہ خوانی میں پھر رہا ہوں۔ اور عجیب و غریب شکلیں نظر آ رہی ہیں۔ دو سروں والے انسان۔ ایسے آدمی جن کی آنکھیں ماتھے میں تھیں ایسے آدمی جن کی ناک ہاتھی کے خرطوم کی طرح لمبی تھی۔ ایسے صاحب جن کے جسم کا نچلا حصہ بے حد موٹا اور اوپر کا حصہ نہایت دبلا بالکل اسی طرح غیر متناسب جسم تھا جس طرح کسی تیسری جماعت کے بچے کا جواب مضمون۔ بازار قصہ خوانی اس وقت بالکل بین الملی عجائب گھر معلوم ہوتا تھا سب سے زیادہ متحیر کن منظر ایک آدمی کا تھا جس کا قد بیس فٹ سے کم نہ تھا۔ نو فٹ کا آدمی تو سنتے آئے تھے۔ لیکن یہ نئی چیز تھا میں نے فوراً اپنے سر کو سہلایا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ لیکن معلوم ہوا کہ امر واقع ہے۔ میں نے جو جائزہ لینے کے لئے سر اٹھا کر اس کی شبیہ مبارک کو دیکھا تو اس کی ٹوپی کی ساخت اور بھی مضحکہ خیز نظر آئی۔ میری اس ہنسی کو شاید وہ برداشت نہ کر سکا۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور میں فوراً وہاں سے بھاگا اور لوگوں کے ہجوم میں چھپ گیا۔ اچانک میری نظر ایک اخبار پر پڑی جس کا عنوان پڑھ کر رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ "کانگرس اور حکومت میں مصالحت۔ ہندوستان میں فوجی بھرتی۔ ہر ہندوستانی نوجوان کو فوجی ٹریننگ دی جائیگی۔ اور بوقت ضرورت اسے میدان جنگ میں لایا جائے گا۔"

یورپ کے میدانِ جنگ میں ہندوستانی دستے نبرد آزما ہیں۔ اور خوب دادِ شجاعت دے رہے ہیں میں بھی ایک کونے میں دبکا آنکھیں بند کئے بے تحاشا گولیاں چلا رہا ہوں۔ گولہ باری کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ چاروں طرف دھواں ہی دھواں ہے۔ ہمارے گرداگرد جو ریت کی بوریوں کی دیواریں بنی ہوئی ہیں۔ اُن میں گولیاں آ آ کر جذب ہو جاتی ہیں۔ اتنے میں غنیم بدبخت نے عین اسی جگہ جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ ایک گولہ پھینکا...... ریت کی کئی بوریاں یکے بعد دیگرے میرے اوپر گریں...... بدن پر ہزاروں من بوجھ پڑ گیا...... حرکت قلب بند ہونے لگی...... کانوں میں سائیں سائیں کی آواز آنے لگی...... پسینے میں تربتر ہو گیا۔ آدھا جسم تو بالکل سن ہو گیا تھا لیکن شائد دنیا میں کچھ سانس لینے باقی تھے کہ آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ چارپائی پر تو کچھ بھی نہیں البتہ کچھ فاصلے پر ایک بلی بیٹھی اپنا منہ صاف کر رہی ہے۔ غور کرنے سے پتہ چلا کہ انہی بلی صاحبہ نے ہماری چارپائی کو شاہراہِ عام سمجھ کر دیوار سے بے دھڑک چھلانگ لگا دی تھی۔ اور اب بیٹھی ہماری حرکات کا حیرت و استعجاب سے مطالعہ کر رہی ہیں۔ .... چونکہ شب برات تھی۔ گولے اب بھی چھوٹ رہے تھے۔

عابد الرحمن۔ سال دوم

فهرست مضامین

دَ یوُ بَد وحمیّت

(دَاسلام دَنوم اِحترام اوعزّت)

والی چه احمد نوم ئے یو عرب په یو نخلستان اوسید و - د خیل ټبر او د قبیلے مشر وو
دے د پاره د عربو د اصطلاح په مطابق ده ته هم شیخ ویلو - د حاتم په شان سخاوت، زلمی توب
او میلمستیا کښی مشهور وه - د ده یو سپین عربی آس وو چه هغه د خپل ښائست او د تیز رفتارئ په وجه
سره په ټول ره آنکه د نیا کښی مشهور وه - ډیرو خلقو پرے وسی اوکړی - اولوئے لوئے قیمتونه
ئے ورته پیش کړه - لیکن شیخ د هغه خرڅول منظور نه کړه
د عربو په یو بله قبیله کښی د هغه قبیلے د سردار لور وه - چه د هغی د حسن او د جمال سندرے د
هر لوئے ورو کی په خوله وے - د هرے قبیلے د سردارانو ځامنو داغوښتل چه د ا ځوان، د کور
شمع خانه وے - لیکن دے به هیڅانه غاړه نه کیښوده - آخر ئے دا شرط مقرر کړه - چه هر هغه
ځوان چه دا آس له شیخ احمد نه راولی - نو هغه به د ځه خپل خاوند او منم
قاسم نوم ئی یو رئیس زاده وو - هغه خان سره ډیرے روپئ واخستے او شیخ ته ورغلو - شیخ
د هغه ډیر عزت او دار مدار اوکړه - لیکن څه وخت چه ده ورته د خپل مطلب اظهار اوکړو
نو هغه ورته اوویل - چه زه هر یو خدمت ته تیار یم - لیکن دا آس له خپل ځانه جدا کول
نشم برداشت کولے قاسم نامراده را واپس شو لیکن په زړه کښی ئی دا اراده وکړه چه دا
آس په څه چل قبضه کول پکار دی -
د شیخ احمد دا عادت وو - چه د مازدیګر په وخت کښی به په دے آس سور شو او سیل د پاره به
بهر ته لاړ - یو ورځ شیخ احمد ماښام مینځ کښی واپس سیل نه راتلو - څه ګوری چه لاره کښی
یو سړے په زمکه پروت دی - شړی ئی اغوستے ده او ورو رو فریاد کوی - شیخ د انسانی همدردی
په وجهی سره ورته نزدے شه - او تپوس ئی ترنه اوکړو - چه څه چل دی - هغه اوویل چه
ناجوړه یم - ستا به لویه مهربانی وی که ما دے نزدے کلی ته اورسوے -

شیخ زړله اس نه کوز شو - دے ئی پداس سور کړه - او پخپله ئی واګے اونیولے او مخ کښ روان شه
یو څو قدمه لاړل نو دی سړی ورته اوویل - چه ځما خو شړئ هلته کښ هیره شوه -
شیخ دده په چل پوه نه شو - زړے ئے دو کړه - چه شړئ راواخلی - چه راستون شه نو څه ګوری
چه هغه سړی خو د اس واګے نیولے دی زغلوی ئے - ور پسی نارے کړے - چه سړیه! که اس
بوزے نو بوزه - خو یو خبره هم واوره - او هغه داده چه که چرته چا درنه تپوس اوکړه - چه دا اس
در ته څنګه ملاؤ شو - نو دا مه وایه - چه دا اس هم په چل او دهوکه سره اخستی دی -
ګینی دا به د اسلام په خائسته نوم باندی یو بد صورته داغ وی -
قاسم چه دا خبره واوریده نو یکدم ئی د اس واګے راخکلے - اس نه کوز شو - او اس ئی په بیرته
شیخ ته حواله کړه - او ورته ئی اووے - چه زه ستا د دے نصیحت ډیر ممنون یم - او اګر که ځما
دی اس ته ډیر حاجت وو - لیکن که خدائے ته منظوره وی - نو زه به هیچرے دا سے کار
اونه کړم - چه هغه به د اسلام په خائسته نوم باندی داغ راولی -
(ترجمه له ګولډن ډیډز آف اسلام)
عبدالرؤف دوم کال

دَموجوده تعلیم فایدی او نقصانات

ده فیرنګیانو د راتلو نه ورمبے د تعلیم څه ډیر خوند نه وو - اکثر خلق که به هندوان وو - نو تاکری
به ئی زده کوله - او په هغه ژبه کښ به ئی کاروبار کولو - او که به مسلمانان وو - نو هغوئی به خپل ځامن
په جماعت کښ کینه ول - او ملا صاحب به ورته نمونځ او ده قرآنِ پاک سبق خوده - حساب
کتاب به ئی اکثر په هندوانو لیکلو - د تعلیم ډیره چرچه نه وه -
لیکن چه څه وخت فیرنګیان راغلل - او د بادشاهی بنیاد ئی کیخود - نو دوئی انګریزی تعلیم او د
اوردو ژبے تعلیم شروع کړو - ځو بعض عالمانو دے تعلیم مخالفت شروع کړو - او خلقو
ته به ئی ویل - چه دا تعلیم د دین برخلاف دے - نو نتیجه ئی دا شوه - چه څوک مخالفان شو

اوخوک ئے په طرف وو۔ سر سید احمد خان د دے اخیری تپولی نه وو۔ د هغه داخواهش وو۔ چه هندوستانیان د دے تعلیم مخالفت نه کوی ۔ولی چه هغه هښیار سړے وو۔ اوپوهیده چه هر څه هم پد یکښ دی ۔ اوویل ئی چه ټول خلق په ترقی کښی دی۔ اومونږ په تنزل کښی یو۔ ولی چه سائنس پدے ژبه کښی لیکلے دی۔ فلاسفی په دے کښی ده ۔ اودصنعت وحرفت کتابونه پد یکښی تصنیف شوی دی۔ نوولی دِ مونږ هم دا ژبه زده نه کړو
سر سید احمد خان مرحوم دخلقو نه چنده غونډه کړه ۔ چا به ورته کافر وی، اوچا ورته منافق۔ لیکن هغه دد ے خبرو پروا اونه ساتله۔ اوخپل مطلب ئی په موتی کښی کالج نیولے وو۔ چنانچه دعلی ګړغونډ کالج چه مسلمان په هغی فخر کوی۔ دهغه دلاس یادګار دی ۔
هم په داشان دانګریزئی کتابونه ئی په اردو کښی ترجمه کړه ۔ هغه یو اخبار د دے ژبی او اود دی تعلیم په موافقت کښی اوولیست ۔چه دهغه نوم تهذیب الاخلاق وو اونور به هم دیر ښه ښه مضامین هغه اخبار کښی شائع کیدل ۔
دخلقو خیال ئی تعلیم طرفته کړه ۔ اوخلق دی طرفته متوجهی شو۔ دنوے دنیا دنوے خیالاتو خلق پیداشو۔ نوے نوے اوسچید ه مسئلے ئی یادے کړے ګویا خلق دتیرے ورنړاته شو۔ لیکن دا رنړادومره تیزه وه چه دیر خلق ئی ړانده کړه
داد موجوده تعلیم تاریخ دی ۔ اوس به ئے فائدواونقصاناتو باندے هم ټک دیر بحث اوکړو رومبئ فائده خوداده چه خلق ئی ده جهالت دتیرے نه دتعلیم رنړاته راوویستل۔ دویمه دا چه خلق دد ے تعلیم په برکت د سائنس نه خبر شو۔ دریمه داچه خلقو دانګریزانو د تهذیب وتمدن او طرز معاشرت باند هم پوه شو ۔
څلورمه داچه خلق دنورے دنیانه هم خبر شو اوپنځمه داچه هندوستانیانو دښے زندګی بسر کولو طریقه دهغوئی نه زده کړه ۔ شپږمه داچه دعمارت بناکولو، اودهوادار مکانانو جوړولوچل ئی دهغوئی نه زده کړے ۔ اوومه دا چه دد ے تعلیم په برکت سره دنوے نوے خیالاتو خلق پیداشو۔ اوښه ښه سیاسی لیډران لکه مولانا ابوالکلام، مولانا محمد علی

مهاتما گاندهي او عبد الغفار خان غوند سړي ئې پيدا کړل - اتمه دا فائده شوه - چه خاص کر ئې پښتانه تر يو حده پورے مهذب کړه - او د جنګ جدل نه ئې واړول - او د هغوئې نه ئې هغه عادتونه ورك کړل - چه په پوتي خبره بانده به خونونه کيدل د د مبارزو نه ئې واړول - نهمه دا فائده ده - چه خلقو نه ئې د زميندارئ چل او ښود - لسمه دا چه ښه ښه سپيکران راکښې پيدا کړل - دا لس د موجوده تعليم غټې غټې فائدے دي -

ليکن نقصانونه ئے هم هيرول نه دي پکار - رومبي نقصان ئے دا دے چه هندوستانيان او خاص کر بعض مسلمانان ئې د مذهب نه بے پروا کړه - نمونځ نيشته د قرآن تلاوت نيشته - روژه، ذکوٰة، حج، قربانئ نشته - او که وي نو بعضې به وي - ولے چه شولکښې به چرته يو وي - مشر او کشر پورے به توقے او مسخرے کوي - بزرګو پورے به خاندي د مور پلار ادب ترينه لاړ - دويمه دا چه پښتنو او غيرت ئے درے کړه - حيا او شرم پکښې نيشته - د مشرانو په مخکښې به بيړه او بريت خرئي - بيهوده خبرے به کوي - او شرمېږي به نه - دريم نقصان ئې دا دے - چه خلق ئې فضول خرچه کړل - خلور م فيشن ئې ډير کړو - پوډر راومېږي - سر واړه وي - بوسکې او بنجيني جامے - چه دا ځمونږ رسول صلی الله عليه وسلم منع کړي دي - هغه اغوندي - احاديث پورے خاندي -

پنځم نقصان ئې دا دے - چه بيکاري ئې ډيره کړه - او کورنئ د غه حالت دي - چه نن بي اے او ايم اے - په نوکرو پسے منډے وهي - چه نوکري نه وي - نو بيا ورله په خپل کار کولو شرم ورځي - په جامه به د ورځه نه پرېکدي - شپږم نقصان ئے دا دے - چه د پلار نيکه د بهادرئ او خوانمردئ جوهر ئې لاړ - او بزدلان شو - اومه ئې دا چه د غلامئ سبق رانه ښئ او غلامئ طوق ئې رانه په غاړه کښې اچولي دي - نازك بدن ئې رانه جوړ کړه -

د لته رانه يو بيت ياد شو -

راغله عجبه په مونږه زمانه	نادره شو په مثال د زنانه
بولۍ قميص برابر پرتوګ به ئې پېزار وي	ښه به ئې جوړ کړي ستو کے سروي مستانه

دغه ئی فائدی - او دغه ئی نقصانات - غرض داچه فائدی ئې لکه او نقصانات ئې ډیر
اوغټ دی - اکثر خلق ئې د پردے برخلاف کړه - او د مذهب دلاری نه ئې په بله
کړل - نو اوس ځما په خیال د داسی تعلیم نه څه فائده ؟ خو هغه د خرلګی ده - او مونږ ته ښکله
کړے ده - ښه به داوی - بلکه ضروری ده - چه ورسره دینی او مذهبی تعلیم هم باقاعده
ورکولے شی - نو هم به مو دین ښه شی - او هم به مو دنیا ښه شی - او که داموجوده حال
وی نو نه به د دین یو او نه به د سا دین یو -

(فدا محمد دویم کال)

پښتون ته خطاب

له قلمه د شوکت الله ایچ - پی

پښتو د پرپښوه شید ائی په بل زبان شوے ولی
مداح د غیر شولی پښتو نه په جولان شوے ولی

همت د دادی چه په ژبه د پښتو شرمیږی
دنا غدا په ځای په لاره کښی طوفان شوے ولی

نه شوی د دین نه د دنیا خوار ذلیل کرزی تل
حدیث دی پرېښود له قرآنه روګردان شوے ولی

رسم و رواج کړلی تاراج مهاراج لنا خوری بیاج
حال دی ابتر لکه شجر د بیابان شوے ولی

ته وی سردار ته وی زردار په هر طرف پښتونه
ولاړ په مخکښی د مهاراج د زرخواهان شوے ولی

اغیارو خوار ولاړ به تا نه په اسلام و مدام
ولاړ په مخکښی د مهاراج ډیر پریشان شوے ولی

نه دی لیاقت نه دی دولت کبر کړی خوار پښتونه
وی با همت بے همته هراسان شوے ولی

ځان کړه مزرے تل زور به ښکار د خیلو خپو کوه
لکه کیدے په پس خورده پسے روان شوے ولی

شوکت الله نه په سر د قام لکه اغیار ستی شه
وخت دی لاشته دی اوس بیا یه په سوران شوے ولی

نادیده رنج گنج میسر نمے شود

د سعدی رحمة الله علیه ددی پاسنئی مصرعی معنے دادی - چه تر څو پوری یو سړی رنج و مصیبت او تکلیفونه نۀوی لیدلی - نو هغه خزانه او مال او دولت نه شی حاصلولے مطلب دادی - چه اول به تکلیفونه تیروے سختی به زغمی - او دهغی نه پس به د آرام او خوشحالئ مخ وینے - څماد اخیال دی - چه دیو معمولی عقل فکر واله سړے هم که پدے غور اوکړی - نو صفا به ورته معلومه شی چه دا اصول یا خیال څمونږ د روزانه ژوندون د تجربو خلاصه ده - یا نچوړ دی - هر سړی پدی پوهیږی - چه بے محنت او بے تکلیف په دی دنیا کښی هیڅ یو کار نشی کیدی - ے

اول زحمت او بیا راحت دی ‌ ‌ ‌ ‌ زحمت چه نه وی راحت څوک لیدلے شینه

نن په دی اصول یا قانون باندی مفصل بحث کول دی - اګر چه دا څه ډیر لا پیچیده او ګرانه مسئله نه ده چه په باریکو باریکو نکتو د بحث اوکړے شی - ولے خیر د مضمون په خاطر به زه دا خبره دیو څو مثالونو نه ثابت کړے شم - چه دا قانون یو مپلے شوی او د قدرت قانون دی او په دی کښی رد و بدل نه شی کیدے -

د ټولونه اول که زه یو معمولی غوند مثال واخلم - نو ډیره بده به نه وی - تاسو او مونږ هره ورځ د غنمو ډوډی خورو - خو مونږ هیڅوک د ډوډئ اصلیت ته غور نه دے کړے خو چه مخکښی راشی نو او یے خورو - او که دچا یاد دی - نو ډوډئ نه پس الحمد لله او وائی کنی نو څه ډوډئ او خوړے شوه - که څوک د ډوډئ په اصلیت غور او شی - نو سړے به حیران پاتی شی - چه د غه ډوډئ چه مونږ یو څه منټه کښی او خوړه - ددی په تیاریدو څومره محنت شوی وو - یعنی اول زمیندار کا خپله مزکه او به کړی وه - بیا ئے ورته کتل - چه وتړ کښی شوه - نو ایوے په کښی اوکړه - دویم ځل ئے بیا واړوله - دریم ځل ئے

بیا یو ځے پکښې اوکړے ۔ بیا ئے ماله کړه ۔ چه ښه میده شی ۔ بیا ئے پکښې د غنمو کرا وکړو
او یو ځل ئے بیا وار وله ۔ بیا ئے او به کړه ۔ بیا ئے د فصل او لوا و د نورو خبرو خیال وخت
په وخت ساتلو ۔ پوره شپږ میاشتې ئے ورسره خواری اوکړه ۔ نو فصل تیار شو ۔ بیا ئے
د هار پشکال په غرمو کښې نو ونه غوبلونه او کړل ۔ بیا ئے غنم پاک کړل ۔ او د دی تکلیفونو
او مصیبتونو نه پس هغه له د محنت میوه په لاس راغله ۔ څه پیسے ئې ورسره راغلے
او د کال شپږ و میاشتو روزی ورکړه پیدا شوه ۔ غنم د زمیندار د کوره بازار ته لاړل ۔ هلته
په جوندوا و میچنو اوړه شول ۔ بیا چهانړ شول ۔ وا خلے شول ۔ په سوړ تنور کښې ۔ یاد تور ے
تبئ د یا سه پاخه شول ۔ او د دی د ومره جنجالونو نه پس څمونږ په مخکښې د ډوډئ یا د
پراټی په شکل کښې راغلل ۔
یعنی اته نه میاشتې د زمیندار او د نورو خلقو د شپه او ورځ د محنتونو او تکلیفونو نه پس مونږ
د دے قابل شو ۔ چه د غنمو په شان د یو بهترین خوراک د خوړلو قابل شو ۔ دا ټوله د محنت
تکلیف او مشقت تیرولو لازمی نتیجه وه ۔
د دی نه پس به مونږ یوبل مثال واخلو ۔ معصوم هلک چه د مور نه پیدا شی ۔ نو څه زنګه
په بد حالت او بده ورځ وی ۔ کچه او مے غوښې وی ۔ مور او پلار ورسره ۔ خواری شروع
کړی ۔ شپه او ورځ په ځان تکلیفونه تیروی ۔ د نکار نکې سختئ برداشت کوی ۔ نو څه موده
پس هلك د دی قابل شی ۔ چه په مدرسه کښې کینی ۔ او س هلك خپل هم محنت
شروع کړی ۔ او مور پلار ئے هم هر قسم سختئ په ځان تیروی ۔ هلك چه هښیار وی ۔
او مور پلار ئې خوش قسمته وی ۔ نو یوه ورځ داسی راشی چه دا هلك د دنیا کامیابی حاصل
کړی ۔ اعلیٰ تعلیم اوکړی ۔ چرته څه ځائ بیا مومی ۔ او د خپل مور پلار او د خپل محنت ۔ مشقت
او تکلیفونو په وجه هم پخپله ارام او مزے کوی ۔ او هم ورسره نور خلق په راحت کښې روی
دا ولے ؟ .... دا خالی د محنت ۔ مصیبت او تکالیف پورته کولو په وجه ۔ که چرے مور
ئی داول ورځ نه داویلے وی ۔ چه څه مونږ ځله ځان په بلا اخته کوو ۔ چه دا

چینجۍ د پانو او بیا د ده نه طمع کوو ـ نو نتیجه ئې معلومه وه ـ د پښتو یو شعر دی ـ ؎

اول تکلیف پسې راحت دی ... دانه چه خاورې شي هله ګل تو کوینه

دا اردو یو مشهور شعر دې ـ ؎

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے ... کہ دانہ خاک میں ملکر گل گلزار بنتا ہے

یعنی مطلب دا دے چه که په جهان کښې راحت، ارام، مرتبه او خوشحالي غواړې ـ نو اول ځان خاورې کړه ـ تکلیفونه په ځان تیر کړه ـ د دنیا هر مصیبت ته غاړه کیږده ـ نو پس د هغې به چه ته څه غواړې ـ هغه به بیا مومې ـ د مثال په طور تاسو د یو ګل د تخم دوه دانې واخلئ یوه دانه چرته صندوق کښې د عطرو په ډبې کښې ښه سنبالا کیږدئ ـ او بله دانه د خاورو لاندې کړئ ـ او اوبه ورکوئ ـ شپږ میاشتې پس د دواړو دانو حالت اوګورئ ـ د صندوق واله به کونړو خوړلې وي ـ یا به د غه شان پرته وي ـ وې د مزکې والې دانې په ځائې به یو اعلیٰ ټلک شین بوټے ولاړ وي ـ ښائسته خوشرنګه ګلونه به ئې نیولي وي ـ ښه خوشبوئي به ترې او د سړي طبیعت به ورته خوشحالیږي ـ دا ولې؟ ځکه چه د دې غریبې تکلیفونو ته ځان ټینګ کړو د خاورو لاندې په ګرمه مزکه کښې په توره تیاره کښې د خاورو سره خاورې شوه ـ نو خدائې پاک ئې دا قرباني قبوله کړه ـ او دا اول نه په زرچنده زیات حالت او وجود ئې ورکړو ـ تاسو چه باغ ته لاړ شئ او رنګا رنګ ګلونه وینئ ـ او خوشبوئي اخلئ ـ دا ټوله د محنت او مشقت نتیجه ده ـ

د دې نه پس که مونږ د دنیا تاریخ رااخله کړو ـ نو په هر هر قدم به مونږ ته دا ثابته شي چه هر څومره مشهور او لوئې سړي چه تیر شوي دي ـ هغو دا ورځ د محنتونو تکلیفونو او مصیبتونو د تیرولو نه پس موندلې دی ـ

نپولین بونا پارټ یو معمولي سړے وو ـ خو چه اراده ئې اوکړه ـ مصیبتونه ئې برداشت کړل ـ سختئ ئې تیرې کړې ـ نو د نپولین اعظم خطاب ورته ورکړے شو ـ د هغه بد ډیرو کو خاوره هم نه وي پاتې شوې ـ وې نوم ئې هغه شان په عزت لګیدلي شي

بابر یو معمولی سپاهی وو - دډیرو تکلیفونو او مصیبتونو نه پس ئے سردار کړو - بیا ئے
په هندوستان اریو ځائے بل ځائے حملے شروع کړے - ډیر ځله ئی ماتے اوخوړے
او ډیر ځله د مرګ نه بچ شو - خو همت ئی پرے نه خودو - مصیبتونو او تکلیفونو ته ئے
ځان ټینګ کړو - نو آخر ئی د هندوستان غوندے د جنت نشان ملک په لاس ورغی
او داد سرو زرو مرغئ ځپل ټبر یعنی مغلیه خاندان ته پریښودو - چه هغوئی پرے
شپږ اووه سوه کاله مزے اوکړے -
او د ومره لرے ولے ځو - په موجوده زمانه کښی خو چه هر څوک مره لوئی سړے وی - نو د هغو
د ژوند ابتدا په ډیره معمولی طریقه شوی ده - نه چا پیژندل - او نه ئی چانه پته وه
خو چه هغوئی اراده اوکړه - محنت ئے شروع کړو - مصیبتونه او تکلیفونه ئے په ځان
تیر کړل - رنګارنګ سختئ ئے اولیدے - د سرو یني ئی خپوا و د خپوویني ئی سرته لاړے
نو خدائے پاک یا قانون قدرت ورته د هغو تکلیفونو میوه ورکړه - او دادی نن مونږ
وینو - چه یو د روس مالک دی - بل د اټلی - بل د جرمنی - بل د هسپانیه - او دغه
شان اکثر د لویو لویو قومونو او ملکونو تاجداران او واحد مالکان دی - او که هر
څومره تیره شی - خو د دوئی نومونه به ژوندی وی - دا ولے؟ ځکه چه

ع دانه چه خاورے شی ګل هله تهو کوینه ؛

دغه حال زمونږ د ټولو پیغمبرانو علیهم السلام وو - دا دم علیه السلام نه واخلئ تر آقائے
نامدار محمّد مصطفےٰ صل الله علیه وسلم پورے چه څومره مشهور پیغمبران او رسولان
تیر شوی دی - دوئی ټولو په رنګارنګ طریقو اول سره تکلیفونه - مصیبتونه او سختئ تیرے کړے
وے - او دهغی نه پس ورله خدائے پاک دومره لوئے مرتبے ورکړے وی - خصوصاً پیغمبر
رسول کریم صل الله علیه وسلم د ژوند حالت چه سړے اوګوری نو غنی سے زیاتے زیاتے شی
د مکے معظمے کفارو هر هغه تکلیف چه د بنی آدم په خیال کښی راتلے شی - انحضرت صلعم ته
رسولے دی - یه کانړو ئے په هغوئی ګذاره نه کړی وو - په لارو کښی ئے هغوئی ته اغزی کړلی وو

کندکی بدئ دهغوئ په جسم مبارك اچوله - ورکره به هغوئ دکثو چار ماری کوله - غرض داچه هیڅ ئی نه وو پورے شودی - وے انحضرت صلعم به دخولے مبارکے نه اف نه ویستو دا هر څه به ئی زغمل - او خدای پاك ته به ئی زاری کوله - چه خدایه دوئ ته هدایت اوکړے چه یو سو کاله په یو ځ انحضرت صلعم په ځان دتکلیفونه او مصیبتونه تیر کړل نو خدائی پاك پس دهغی نه پیغمبر کړو - بیا دوئ سره دخپلو یو څو کسو ملګرو چه په دوئ ئے ایمان راوړے وو سر دوباره دکفارو ظلمونو او سختونه ځان تیلیك کړو - څه موده ئے سته سخت تکلیفونه او مصیبتونه تیر کړل - نو دراحت زمانه ئی راغله - او په لږه موده کښ د یر ځایونه ئے واخستل - هم ددے پاکو هستو دتکلیفونو او د محنت نتیجه وه - چه لږه موده پس اسلام په ټوله دنیا کښ خور شو - هو چرته د اسلام جنډه پورته شوه - او د مسلمانانو په پښو کښ د دنیا تمام مال و دولت - ارام خوشحالی رغړیده - هم ددی مصیبتونو او تکلیفونو تیرولو وجه ده - چه رسول کریم صلی اللّٰه علیه وسلم دخدای پاك محبوب ترین پیغمبر او په ټولو پیغمبرانو کښ افضل ترین د دواړو جهانو سردار او په ورځ دقیامت دکل مخلوقات شفیع اوګرزیدو - په قیامت کښ به ټول مشهور پیغمبر د خلقو د شفاعت نه ځان په شنك کوی - ځکه چه هغوئی به د یر مصیبت او تکلیف په وخت کښ د صبر او تحمل لمن پریښوده - وے حضور رسول کریم صلی اللّٰه علیه وسلم تر اخره پورے په صبر قائم وو - او هر مصیبت او تکلیف به ئے په ورین ځ تیرولو - نو شفیع المذنبین - رحمة اللعلمین - او سردار دو عالم خطاب ئے بیاموندو -

دغه شان د دنیا هر څو مره متقی - پرهیز ګار او نیك خلق چه وی - هغوئ شپه او ورځ په عبادت او ریاضت کښ لګیاوی - سحر دوخته پاسی - اکثر ټوله ټوله شپه ویښ وی نمونځونه کوی - فلونه کوی - تهجد کوی - ذکر کوی - وظیفے وائی - دقران شریف تلاوت کوی - په ځان زنګار نګ سختے تیروی - دنفس او شیطان سره مقابله کوی - خپل خواهشات او نفسانی ارمانونه ارمانونه دباؤ کوی - ارام نه کوی - سیلونه نه کوی - عیش عشرت نه کوی - او دا هر څه هغوئ ولی کوی ؟ پدے وجه چه د دی تکلیف - محنت - او مصیبت میوه هغوئ ته هغه

جهان کښې ورکړې شي . او نتیجه ئې څه وي ؟ دا چه دا یو څو ورځې ژوندون خو په تکلیف تیر کړي
وے د هغې باقي دنیا هر قسم ارام او خوشحالي ئې نصیب شي ـ
وائي چه څه وخت خدای پاک جنت او دوزخ دواړه پیدا کړل . نو جبرائیل ؑ ته ئې اوفرمائیل چه
ورشه د جنتونو سیل اوکړه ـ جبرائیل ؑ چه لاړ وسیل ئې اوکړو . نو خدائې پاک ته ئې اووی
چه دا خو ډیر اعلی ځائې دی ـ که د دے راحت ارام او خوشحالي نه څوك خبر شو . نو د دنیا هر
سړے به هم دیته راځي ـ ممکنه نه ده ـ چه بل چرته لاړ شي ـ بیا خدای پاك ورته اوفرمائیل
چه ورشه اوس د جنت لاره اوګوره چه څنګه ده ـ چه جبرائیل ؑ لاړ او د جنت د لارې هغه
تکلیفونه سختئ او مصیبتونه ئې اولیدل . نو غوږ ونه ئې اونیول ـ او په منډه خدای پاك ته راغے
چه خدایه پاکه . که د جنت دا لاره وي ـ نو امید نه دی چه د دنیا یو سړے هم جنت ته لاړ
شي . خو ستا په فضل او په کرم که څوك راځي نو راب شي ـ
یعني مطلب د دې قصے دا دی ـ چه په دنیا کښې د هر یو سړي دا خواهش وي . چه زه
د مرګ نه پس جنت ته لاړ شے ـ یعني جنت د هر سړي ـ د ژوند انتهائې مقصد دی .
خو دی مقصد ته رسیدل ډیر زیات ګران دي ـ او ګران نه دي خو که سړے د دنیا
رنګا رنګ مصیبتونه او تکلیفونه په ځان تیر کړي ـ ځان سختئ ته اونیسي ـ د دے ژوند
دا یو څو ورځې راحت ـ ارام او عیش و عشرت د هغې جهان د همیشه پاتیکیدونکې راحت
د پاره قربان کړي ـ نفس شیطان او خواهشات د دنیا لرې کړي . او په دې شعر عمل اوکړي
چه بغیر د تکلیف مصیبت او څه قسم قربانې ورکولو نه راحت او ارام نه شي موندے ـ نو دا دی
پوره پوره یقین او ساتي ـ چه خدائے پاك به د دے تکلیفونو او مصیبتونو هغه له په کروړ چنده لا
د دینه هم سوا بدله ورکړي ـ یعني د همیش همیش د پاره به ئې جنت او د جنت راحت او ارام
نصیب کړي ـ په اخر کښې به زه یو څو نور عام مثالونه بیان کړم ـ چه هغه به هم د دے قانون
یا اصول تشریح اوکړي ـ سره زر هله سره زر شي ـ چه په تو څو ځله په اور و نو کښې اوتیر ابولو
کښې او سوزولے شي ـ ذرے ذرے او میده میده شي ـ او رنګا رنګ تخرمے په اوشي نو هیله

پاسه شي او قیمت پیدا کړي - بیا هم دا زرچه بیشماره تورتکلیفونه به ځان تیرکړي - نو
دهغې نه پس د ښائسته ښځې د پوزې چاړګل - دغوږ والۍ - دلاس بنګړي دسینې هار
بادسپین تندې تیلک شي - دغه شان او سپینه چه په اور و تو او سوزولے شي - او
او ټکیږي ځوځو ځله چه اوراو به او وینې - او د لوهار درانه درانه ډېکونه اوخوري - نو دهغې
نه پس فولاد شي - قیمت ئے هم سوا شي - قدر ئې هم زیات شي - او فائدې ئے هم
کښې نو عام او سپینه او فولاد اصل کښې یو دي - که یو سړے دا او وائي چه زه محنت نه کوم
تکلیف نه پورته کوم - مصیبت نه تیروم - او د راحت آرام او خوشحالۍ غواړم - نو دا به داسې
وي لکه چه سړے د ډاګرے نه کټورې غواړي - کښې نو یو ورځ د سړے ازمائښت اوکړي
چوته ځنګل کښې دکیني او داد او وائي چه ماله دې دلته هر څه راشي - نوګورئ چه څه
حال ئے کیږي -

په آخر کښې به زه دا اردو یو شعر اولیکم او بیا به دا مضمون ختم کړم - وائي چه - ۵

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا   سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا -

یعنې د مشقت - محنت او سختۍ تیرولو نه بغیر څوک مرتبه او نوم نه شي پیدا کولے. لکه
د عقیق کانړے چه بیشماره ځله په څرخونو او سولے شي - دګار نګ نخرے به او شي
پریکړے شي - او ښه تکلیف تیرکړي - نو دهغې نه پس د باد شاه یاد محبوب د ګوتے غمې شي
او دومره لویه ورځ بیاموي -

خلاصه مطلب او لنډه خبره دا ده چه د دوډۍ نه واخلې - نو جنته پورې - یعنې
دیو ورکوټي خوشحالۍ او آرام نه تر یو لوئے خوشحالۍ او راحت پورې هریو کار
هره یوه خوشحالي - هریو آرام - هریو راحت - هله بیاموند ے شي - چه اول ورته
دهغې په مناسب تکلیف - مصیبت - مشقت - او سختي تیره کړي -

یعنې "نادیده رنج گنج میسر نمی شود"

(ارباب محمد فیروز دخلورم کال)

دَ پښتنو دَ کلوتړ وندون اُو دَ هغې اِصلاح

په کلوکښ د پښتنو ژوند ډیر سخت دی - هر یوه کهړی د دوئ د مرګ یره وی - د ماښام نه پس هیڅوک له کور نه بهر نه راوځي - په خپل کور کښ هم پښتانه په امن کښ نه وی - هر وخت ورسره د دښمن یره وی - د اضروری ده - چه د شپې به په تېرکښ یو کس تول شپه بیدار وی - او د کور څوکیداری به کوی - پس له دی ټولو خبرو به دوئ دیو بل کره ورا وړی - او خپل رور ترېور - عزیز - د کور حالت د کندی د کلی سرې به وجنی - نتیجه دا چه د مقتول رونړه ترېوران به پرے دعوه اوکړی - قاتل به پانسی شی او کند به خپلو پالی شوو ته پریږدی بیا د دښمنی تر دولس پېړو پوری جاری وی - د مقتول وارثان د قاتل وارثانو نه مرکونه کوی - او د قاتل وارثان د مقتول د وارثانو نه مرکونه کوی - پښتون به سحر وختی پټی ته روان شی - داو یو یه وار به خپل شریك وال سره شور اوکړی - نتیجه به ټو پکو نو تما بچوته اورسی - دوه دری مرګه به دیو طرفه اوشی او دوه دری مرګه له بل طرفه - بل په پښتنو د چایو میراتو ډیر رواج شوی دی - کور به ور کره د نورے منګکان زغلی - او ښځی به ئی زو ئے پالورنه چاینك او پیالی ورکړی وی - چه څه بابا له د پټی نه چائے یوسه - دی به تر هغه پوری تیك نه کوی - چه تر سو چائے نه وی ور رسیدلی - دا څو بر د پښتنو نن صبا حالت دی - پښتون چه ماښام له پټی نه راشی - د اکثر څو یکښ خپلی حجرے نه وی - د کندی حجرے له به ورشی - په کټ کښ به شالی والی پریوزی - چه لګ په سود شی - نو چلم نو کے به اولګی - او بیا به مجلس ساز کړی - د کوره به خبر نه وی - د بال بچه به خبر نه وی - په حجره کښ به مصلحت اوشی - او د چاکره به ډاکه واچوی - د چاکنډر به اوکړی - او که د کور مالك پیرغ شه - نو په هغه ځائ به هغه هم سور کړی - په بازار کښ به د چایو په دوکان یو څو کسه راجمع شی - یو به بل ته وائ غل مه خوره - بل به وائ ته غل مه خوره - په دی کښ به چا قوان

اوچلیکي - په یو ساعت کښې به څه هسپتال ته اورسیږي . دڅه تاڼږي ته - که چرته هسپتال نزدې وي - خو بیه شوه - کنې نو په لاره به ئې فیصله اوشي - چه واده کږدن ورکړه اوشي - نو هندونه به په سود دروپي راواخلي - دغه به تر زیکه بیاني اولیکي . اودې به پیږ دمې - بجلسونه رااوغواړي - دټول کلي دوډي به پراوکړي - غرض داچه هرڅه به په یوه کږدن واده بائیلي - بیا به دپلي پرلټ نه ناست وي - یو کال به کلبه خرڅه کړي بل کال به کورکانړه کړي - اوپه دې به وخت تیروي . اوچه هرڅه ختم شي - نو غلي اوډلکي خو ترچا وري نه دي . دغه به ئې کسب وي مخیلي دشمني خو پرېږده - دپیسو دپاره به روز ترپور وجنې - اودا به خیله توره کنړي - داصلاح طریقه :-

(۱) یو خو چه په کلوکښې دتولونه اول دبانغانو دتعلیم څه انتظام اوکړې شي - ګورنمنټ دخپل بجټ کښې یو لوئې رقم ددې کار دپاره اوباسي (۲) بل ددیهات سدهار او دانجمن امداد باهمي سوسائټیانو له توره هم ترقي ورکړې شي - او ددوئې کار دمنظم کړې شي - خلق د هندوانو د سود نه خلاص شي (۳) بل دې دچا یو په تولو لولو دو کانو نو باندې لوئې ټیکس اولګوي - چه هغوئې ددې بوجه برداشت نه کړې شي - اوفیل شي . ولې چه اکثر فسادونه ددې دکانو نو نه اوچتیږي (۴) ګورنمنټ د په هر یو کلي کښې ریډیو اولګوي - اوسفري هسپتالونو له د ترقي ورکړې شي :- (صفدر علي کیلاني ددویم کال)

اشعار عبرت (له قلمه دشوکت الله ایچ - پي)

قومونه ټول په اتفاق پسنوون تاراج وینمه
لکه چاکړي په هرحال دسیټه مهاراج وینمه

نه ئې تعلیم شته نه کوشش دَ ژنده کولو کړي
چائیدادې ډیر او کم طاقت ئې دخراج وینمه

دَغم بنادي خرخونه زیات له خیل طاقت کوي
ځکه په غاړه ئې زنځیر دسود بیاج وینمه

شور کړي له دوده په پوله ټل په او بو
تا ټل دَ دوړدا دَ سرکار نه ستا علاج وینمه

زه څه یم

له خزان دَ سیېره باده وُچه وُنه دَ بوستان یم
مات جرس بې پراوُ پروت یم ناخبر له کاروان یم

له قفس دَ غلامۍ نه په کچُوُ ګلو پرواز کړم
بې همت، ناتوان نه یم له نفاق سرګردان یم

دَ غزا په کار پوهېګم زه افغان زوی دَ خالدُ یم
چه خپل سر ګرزی تلی کښ خبردار شه هغه ځوان یم

که ژوندے یم خو غازی یم که چا مړ کړم شهید شوم
زهٔ دَ توری په شرنګ خوښ یم زه غم خور دخپل ایمان یم

جګر سوز یم جهان سوز یم اُور یم بل په زړهٔ دغم دَے
پتنګ ځان سېزی په شمع زه دَخپل قام قربان یم

کله مَد کړی کله جذر کله موج وهی کمرته
زه به څه وېره دَتا کړم چه پخپله لوئ طوفان یم

غیرت هم زده جرأت هم زده دَ همت محنت هیره یم
خودداری او ننګ هم زده خودَ پوُ آواز ارمان یم

په فلک دَقطب ستورے دَ راه رَوُ راهبری کړم
په صحراء او په ځنګل کښ که په دشت و بیابان یم

دَمفتوُن فسون به څه کړم دمجنون جنون نه غواړم
دخپل قوم په محبت کښ زه طول عمر بندیوان یم

محمد اشرف مفتون (اسلامیه کالج)

هله به خبر شي چه تار وجبي له ور شي!

(له قلمه د لال پادشاه د پیر پیائی)

دنیا کښې خو ډیر قامونه دي. او بې شماره ئې نومونه دي. څوک زمیندار دي. څوک څوکیدار دي.
څوک ملازمت کوي. او څوک د هنر کسب کوي. په کسب ګرو کښې څوک استاد ستائیلي شي او څوک بدنصیب
نامراد ستائیلي شي. خاص کر د پښتنو په مینځ کښې بدنصیب کسب ګر چه حلاله ګټي او حلاله خوري -
لیکن بیا هم د خلقو د خولې نه وزي جولاه دې. که چرته مجلس وي نو به جولاه به ګومېږي - که
چرته تپوله نه وي نو د جولاه غریب په غوښو به لګیا وي. او خپل وخت به تېروي. غرض دا چه
کوم شهرت شیخ چلي د اردو په افسانو او قصائیو کښې موندلې دې. هم هغه یا د هغې نه زیات
دې بدنصیب جولاه په پښتو او د پښتنو په مینځ موندلې دې.

وائي چه یو بادشاه د وارد د هغه کسب بغیر د خوراک سڅاک او تو تو لتالو نه بل څه نه وو. او د دې
تو تو لتالو خوند به د غریب جولاه په سر اخستې شو. یعنې شپه او ورځ به په جولاه ګانو پورې خندلې
وه. خیر د جولاه ګانو او به هم دور ځ جاړ اوتې او مجبوراً خپل پیر له د صلاح د پاره راغله. پیر لې د دې
خبرې ذمه واخسته مریدان ئې رخصت کړه او پخپله د فکر په تال خیال له وال شو.

او څه ساعت پس ئې د بادشاه په لور د تلو نیت وکړه. پیر صاحب بادشاه له راغلو او ګویا شه. بادشاه
قربان د شم که اجازت وي نو داسې خایسته او مهینې جامې به در ته جوړې کړمه چه د هیڅ مهینې ورځې
به هم حرامي سړي ته نه ښکاري. نه بادشاه ډیر خوشحال شو. او اجازت ئې ورکړه. جولاه ورته یو خاص
ورځ وښودله چه په فلاني ورځ به جامې تیارې شي. او په فلانۍ ورځ به ئې بادشاه سلامت ته د ما
برکومه هغه ورځ را اورسیده. او بادشاه خپلې جامې ښودلو د پاره یو لوی دربار منعقد کړو. جولاه
هم شکور پلاس چه لوئې رومال به اچولې شوې وو راغلو. او په دربار کښې په زوره ګویا شه. بخیر بادشاه
محفل کښې او جولاه ورسې غسل خانې ته لاړه بادشاه وار په وار یو زړکې وباسي او جولاه د رومال د

لاندې نه دشکور نه خه را اخلي رچه بادشاهي نه وینې) او بادشاه ته داسې ښائي چه دا نږدې کي دي. اوزه درته اغوندم. الغرض پیر صاحب بربنډ لغړ کړو. بادشاه ښه پوهيد ولیکن د ویرې جولاه نه تپوس نه شي کولی. ولې چه هغه وړنبي ویلي وو چه څوحاجي بوداسې کمال لري. چه حرامي سړي به ئې نه وینې. بادشاه صاحب بربنډ لغړ ئې د غسل خانې نه دربار ته را روان کړو. چه کوم سړي بادشاه ته کوري نو ادل خوغلي غنږ به خنداشي. او بیان ځان سره فکر وکړي. ولې چه بادشاه ته داویلي شي چه بربنډ ولې راغې اوکه وائي نو هغوي ثابتیږي دې د پاره هر سړي چپ دي او ړوغنډ بادشاه له د جامو مبارکي ورکړې هم دغه رنګ بادشاه محفل او جولاه روستو روستو بادشاه د تخت خواته ورسیږ او کیناست. پیر صاحب دوه مرکو پاشه هلته به خبر شي چه تار وجتې له ورشي " او لاړه غائب شه.

"رُباعي"

داخو ته ئې چه مدام به په بوحال يې
بنده کله شرشاهي کله سیر"
داخو نه ئې چه مدام دَزه په یادیم
څوکله نه په یادشې کله هیر

"رُباعي"

زه یوسف چه دَخپل ځان نوم خبرو
لتول به م دَبل عیب وهنر!
ماچه ځان ته فکر او کړه را معلوم شوه
زه دَوا ړو گنهګار دم. نوم خبر

"رُباعي"

هسے افسوس عُمرَم تيرشه په غفلت کښ
دَغه پاتے به شي تير هسے حسرت کښ
زه يوسف دا نلک اوډم چه رحيم دے
ځلی نه پرېږدي دي هسے په جنت کښ

ارمان!

(۱) ياالهي ياالهي بي لَتانه يادرس
نښته نښته نښته نښته چرته کس!
ارماني يم چه ځواني م شوه برباد
(۲) اوس منګولی مرديم زه لکه ملس
(۳) چه طولي دمعرفت په کښ نه اوسي!
ځه پکارشه دوجود حما قفس!
دَګناه دُ بيمرض طبيب م نشته!
(۴) نه کافي شافي عافي يُ مالدبس!
ګناهونه لکه قند مانه سبکا رنګي!
(۵) ځکه کرزم لکه مچ تر ے پيش وپس!

يوسف دَخوار لسم

بُلند نظري

زه په خپلو پښو ولاړ وړه وکۍ سبه يم
نه چه اخلم سهارا لکه دَ تاک !(خوشحال خان)

لدی داسے غلامۍ نه مرګ بهتر دئ
چه پيے ناسته پاسته وي دَ بل په واک!
چه توکل په پاک الله باندِ ښوک اوکړي
په ميدان کښ دَعمل وي چاغ چوباک!
په ميدان کښ دَعمل چه وړستو نه شم
خه دَ فيل اوپاس کيد وښته دي پاک!
چه دَ غيرو خوشامندے کړي ذليل شي!
شي دَ خپلو مح کښ دي خس وخاشاک!

[illegible]

دَ خیبر پهٔ لمن کښ ؛

نن هغه خلمی پیدا اشوے دَ کالج مسته هواکښ — چه وطن باغ عدن کړي دَ خیبر غرونو په خواکښ

په گفتار غنچه دهن وي پاکیزه د زړه مسکن وي — وي ماهر په هر یو فن کښ تل عاشق دَ خپل وطن وي

داویران گلشن نه غلا په بلبلا نو نه آباد کړے — تشنه زړهٔ نهٔ دَ سرحد دَ ځوانانو نه سیراب کړے

دَ صیاد دام کښ پرېکګی خلا صید وسُمُون نه ښکاري — دَ شاهین زور وړله ورکړي چه صیاد دَ تِر نه بیزاري

په دے تورهٔ تاریکے کښ نن مشعل هغه پیدا اشو — چه خائنت دَ علمیت نه پتنګان تِرنه شین اشوے

د دے تورغرونو لمن کښ نن پیدا هسے یو ځوان شي — چه مشرق نه تر مغرب په توم رڼا نه دَ افغان کړي

دَ لولاکُ سرو دخواهان وي تل پابند دَ پاکِ قرآن وي — دَ سرحد هسے یو کل وي چه تر کلند په کل جهان وي

(سیّد سُلیمان دَ اوّل کال)

دَ بزم السنهٔ مشرقیه اِنعامي مشاعره

په دیم تاریخ دَ مارچ سنه ۱۹۴۲ء دَ بزم السّنه مشرقیه سالانه جلسه منعقد کاشو ه دَ دفعے په لائحه عمل کښ انعامي مشاعرهٔ هم یو جزو وو۔ ډیر بلند پایه شاعران دَ اردو او دَ پښتو په دے جلسه کښ با هر نه راغلی وو۔ او خپل منتخب کلام ئې حاضرین محظوظ کړهٔ یے۔

انعامي مشاعرهٔ اردو او پښتو دواړو ژبو کښ تجویز کړی شوي وه لیکن ډیر افسوس دے چه دَ پښتو په مشاعرهٔ کښ ایلاخلو ر تنه شامل شو۔ (اردو مشاعرهٔ کښ دَ شاعرانو تعداد دو چند نه هم زیات وو) او دَ تعجب خبره دا چه په اردو مشاعرهٔ کښ کوم یو طالب علم چه دَ اوّل انعام مستحق شو هغه یو پښتون دے۔ دَ پښتنو په کالج کښ دَ پښتنو طالب علمانو له طرفه خپلی مادري ژبے سره داقسم سلوک څهٔ ډیره ښه مظاهره نه ده۔

لنډه دا چه دَ پښتو په مشاعرهٔ کښ بالترتیب میان محمد یوسف دَ اوّل کال او شوکت الله دَ دویم کال بالترتیب اوّل

دویم انعام ولخستو. مونږ دواړو ته دَ دوئي په کامیابي مبارکباد ورکوو۔ او امید لرو چه پښتانه شاعر طبع طالب علمان به بیا له خپلې ژبې سره دانَسم دَ بې پروائي سلوک نه کوي۔ دَ هرې ژبې ادبیات توابند اوکښ هم بیدے شعر شاعري سره ترقي کړې ده۔ خصوصاً هغه شاعري چه دَ قومي مني باتو اظهار دي یا دَ قدرتي مناظرو په کښ خاکه راکښلې شوې وي۔ دَ منظوم ادبیاتو یو قابل قدر حصه وي۔

لاندې هغه دواړه نظمونه په ترتیب سره چاپ شوی دي چه په نظر دَ منصفانو کښ دَ اول او دَ دویم انعام حقدار دي ـ

(نګران دَ خیبر او دَ بزم)

زه مُسلمان یم بې له خدائے دَ چا پروا نه لرم

زه مُسلمان یم بے له خدائ دَ چا پروا نه لرم

بغیر له یو الله واحد معبود سیوا نه لرم

ځما فطرت داد ے چه بے له خوفه اعلان کومه!

دسمندر غوندی دعشق په اور ګزران کومه!

پروا لام نشه که د سر په کښ نثاوان کومه!

سینه کښ نور م شي تعلیم چه دَ جانان کومه!

ځما دهغه بر سنګلی قران دے بل پیشوا نه لرم!

زه مسلمان یم بې له خدائي دَ چا پروا نه لرم!

دے دَ شاهانو شهنشاه هغه دلبر دی ځما!

ملک يې عرب اعلی نسب آقا سرور دی ځما!

لوبے دَ سر راز دہ کوي فوجي افسر دی حُما
تاریخ گواہ لرم په وینو چه دفتر دی حُما

که زه همت اوکړم خوك وائي چه خیرخواه نه لرم
زه مسلمان یم بے له خدائي دَچا پرواه نه لرم

حُما همت ته منحصر تلی وقار وینم زه
لکه خلیل اور ده نمرود خلقه گلزار وینم زه

بحر له نیل موسئ کلیم فرعون مردار وینم زه
دَه اصحابو به د وفتح په هر وار وینم زه

دَتوکل په پروتلل لکه هوا نه لرم
زه مسلمان یم بے له خدائ دَچا پرواه نه لرم

هغه شهید یم که په وینو لبسیدل را یاد کړم
لکه پتنگ دَ دین په شمع سوزیدل را یاد کړم
دشمن دزاج دے که دَ بازو کرزیدل را یاد کړم
که په ناموس دَ وطن تن قربانیدل را یاد کړم

تلی عزت که غواړم بیا خواست ناروا نه کړم
زه مسلمان یم بی له خدای دَچا پرواه نه لرم

وختی سحر که دَ بلبل سوز و گداز کړم پیدا
چرے تو عرش که دَ مظلوم دَ آه پرواز کړم پیدا
چه خوك پرنه شي خبر هغه دَعشق راز کړم پیدا
په کفرستان کښ دَ توحید بلند آواز کړم پیدا

بیا نا امید له کرم زړه بے نوا نه لرم
زه مسلمان یم بی له خدای دَچا پرواه نه لرم

(میان محمد یوسف دَ اول کال)

بلبلانو په کيف دَ ګل نن سرشار وينم!

(شوکت الله اکبر)

دَ سپرلي وږمو چمن کړي دَ لمن لوړې جوړې
دَ سپرلي په وږمو باغ دَ لمن خنې ونغار وينم

دَ سپرلي نسيم چليږي هر شجر په تازه کيږي
غرا وسمه زرغونيږي سبزه نما ښايسته نوبهار وينم

ګلستان کښ لوبې بيا وهي بلبلان په ګلزاري
سره ګلونه دي چه خاندي اوچت ډګر په ګلزار وينم

دَ بلبلو سندرې سرې دي ځاې په ځاې ناري سوري دي
سيه عجيبې ننداري دي دَ ګلونو بازار وينم

بوړا وينم په ګل خور دي دَ بلبلو باغ کښ شور دي
زاغ کمبخت له غمه تور دي شګفته لاله زار وينم

سوراړه دَ خيبر غرونه عجيبه کوي خندونه
دَ قدرت دَ لاس کارونه نوي نوي ښکار وينم

دَ خيبر دَ غره په سوکو ګلونو ولېښ ښکاريږي
چه تر څو نظر مزل کړي شګفته لاله زار وينم

جهان نوي بوستان نوي نوي نوي وږمې راغلي
نوي رنګ نوي نکهت دي نوي نوي رنګار وينم

چرته ګل هلته خار وينم چرته يار هلته ديار دي
دَ هجران په مېن کښ وصلت دي دَ منصور سره دار وينم

که هر څو ښکلي موسم دي بلبل ويړ نرګس مستي کا
دَ وفا پانه يي چه نشته بې وفا دَ ګلزار وينم

موج حیات

(له قلمه د محمد سلیم خان خټک)

د دې ناوړه کارې د نړۍ په اوږدو ورځو اولنډو شپو یا په لنډو ورځو او اوږدو شپو کښې داوسیدونکو ژوند دی۔ که سپرلي وي که خزان که اوړي وي که مني غم وي که ښادي۔ د ژوند ورځې تیریږي۔ لکه څرنګ چه د ریل ګاډۍ د مسافر انتظار نه کوي هم دغه شان دنیاوي ژوند د رنج والم څه پروانه لري لکه ؎

اوس که ځان وهم که خاوري پسر نولم

په هیڅ رنګه بیرته نه راځي وار تیر شو (علی خان)

د سمندر د رباب په غاړه پرتي سپیڅ د نمر خبري اوریدي۔ چه د سمندر اوږده په میان په ډیر نازوادا سره کیدلی۔ په دا میان کښې سیپۍ اووي۔ چه تاسو دواړه د ژوند مقصد ته نه يئ رسیدلي۔ ماته اوګورئ چه د سمندر ناخته کیدونکي کښ مکش کښې م مرغلره په خوله کښې سنبال کړئ غاړي ته راورسیدم۔ سیپۍ څه نور ویل غوښتل چه سمندر موسکي شو او سیپۍ دیو نرمي چپې سره بیا داوبو ویخ ته ښکته شوه ژوند څه دی؟ پدالنډ ژوند کښې مونږ له خفګان ګوبله نه دئ پکار ؎

ولي هسي شوي له غمه ځما دله

عمر باد غوندي تیریږي دریغه دریغه

٭٭٭٭٭٭٭٭٭

outcome of Nietzsches' "Will to Power" and his concept of the "Superman." The thought, which the **All-India Muslim League has** taken upon itself to propagate and work out--the thought, namely. **that the Muslims in India form a Separate Nation and must have a separate Homeland for themselves** has emanated from Prof. Dr. Syed Zafarul Hassan's brain. Here are but a few instances that are set forth by way of suggestions to those who would like to think over the subject of Philosophy for themselves. For the rest, we point out to the readers the learned Address of Professor Dr. Syed Zafarul Hassan (to the Philosophical Society, Aligarh, 1931) wherein has very rightly been emphasized the need for the study of Philosophy.

M IHSANULLAH KHAN.

empirical and rational nature. Philosophers are therefore apt to be **more successful in life** than any other academic man; their sucess in life being essentially the outcome of the right handling of men and their affairs. Hence it is, that a proper training in various disciplines of Philosophy is greatly conducive to success in the different departments of life. The study of Psychology is of immense use in Education, Medicine, Trade, Administration, Justice, etc. A knowledge of Mob-Psychology, coupled with the understanding of Political Philosophy, is particularly useful for statesmen and politicians of a high order. A thorough training in Logic is of much help to a Pleader and a Judge in arguing a case and discovering fallacies in arguments. Similarly, Metaphysics and Logic will greatly help a Theologian to meet the adverse criticism of the sceptic and the atheist against God and Religion. In the same way, the study of Psychology and of Moral Philosophy is of immense importance for Maulvies and teachers. Firstly, because they are required to **Know** men and, secondly, because they are required to guide them to the **goal of men.** In the first case they need Psychology, in the second, Moral Philosophy. For the police officers, as also for the judges and the law-givers, the knowledge of **criminal** Psychology, is indispensible. We have been so far discussing only those advantages of Philosophy that accrue man as an **individual.**

Let us now take into consideration its advantages to Man as a **specie**—to **mankind.** In other words, we have to estimate the contribution of Philosophy to the **Culture** and all the higher pursuits in general, of Mankind. All sciences originate in, and ultimately return to, Philosophy. It is in this sense that Philosophy is called the **Mother of all Sciences.** Psychology, Astronomy, Mathematics, Physics Chemistry, Medicine, etc. were all once part and parcel of Philosophy. It took them a long and assiduous course of development and evolution to become independent Sciences. Even as full-fledged Sciences they have still to look upto Philosophy for inspiration. The notions, for example, of the **"quantitative explanation of the physical changes"** (Descartes), **"force"** (Leibnitz), of **"Continuity"** and **"Evolution"** (Kant) and several others, have all originally sprung from Philosophy. Similarly, **all great movements** calculated to bring about world-wide changes, are ultimately traceable to one or the other system of Philosophy. **"Communism"** and **"Bolshevism"** can be traced to Hegel and Hegelians. The thought of **"Eternal peace"** and of **"League of Nations"** is first furnished to us by Kant. The **"French Revolution"** is the work of Rousseaus' "Return to Nature." **Fascism and Nazism,** with their consequent ideology of **Dictatorship,** are the

know the **ultimate** nature thereof, which will **explain this whole.** Looked at from this angle of vision, philosophy is the **completest knowledge of the completest reality,** and is "the profoundest knowledge of the profoundest objects." The sciences, on the other hand, are a **partial and incomplete knowledge** of only **part-realities.** Obviously, as an end in itself, **"Philosophy is incomparably more valuable than any other branch of study—indeed more valuable than all of them put together"** (Prof. Dr. Syed Zafar-ul-Hasan). Strictly speaking, all branches of knowledge and all sciences are there for the sake of philosophy—are subservient to it. Taken by themselves, they may possess any amount of utilitatian value, they may even have a value as Ends in themselves; but when compared to Philosophy, they have only a value as **means** to an End which is Philosophy. They are there "to study the universe piecemeal in order later to utilize the results thus obtained for constructing a true picture of Reality as a Whole" (Prof. Hasan). In a word, they are there to supply material and data for Philosophy, of which data Philosophy is then to make a system—consistent view of the whole:—

Now we pass on to the advantages of Philosophy in the ordinary sense of the term—in the sense of advantage as **a means** to other Ends.

The study of Philosophy, before all, develops the power of thinking or the **rational faculties** in us. This is exactly what distinguishes man from animals.

Further, the nature of the sublime and fundamental problems with which it deals, raises us above the petty concerns of life and elevates our **character.** The study of moral Philosophy in particular contributes enormously towards the development of human character. The study of the Philosophy of Fine Art, (Aesthetics) develops in us a sense of taste as well as an insight into the nature of the **Beautiful** and the **Ugly** and enables us to enjoy beauty in all artistic productions. The study of the Philosophy of Religion gives us a clearer notion of the concept of God, the highest of all the human Ideals, and broadens our outlook on life and makes us **magnanimous and forgiving;**—all these being the **spiritual advantages** of the highest order, which no other science can offer to the extent to which Philosophy does.

Philosophy has, besides these, many **practical and worldly advantages.** It promotes our **understanding of men** both in their

themselves—are intrinsically good. But even in the domain of these intrinsic values themselves there are degrees, the higher values and the lower values. As between virtue and pleasure (both practical values) the former is clearly a higher value as compared to the latter. Similarly Knowledge is a higher value than Art, morality than knowledge and Religion than morality,—indeed it is the highest of all. What is now true of these intrinsic values as between themselves, is equally true in the various spheres of "knowledge" itself. All knowledge, of whatever kind it may be, is a value as an end in itself—is an intrinsic value. Nevertheless, the knowledge of one thing is a higher intrinsic value than the knowledge of another. It is here that we come to the real issue.

Philosophy is knowledge and knowledge is always a knowledge of something, of reality. So are all other Sciences, whether natural or human. Consequently, philosophy and all other sciences must be on a par with one another;—each being a case of "Knowledge" which is "an End in itself." Yet there is a difference between the knowledge that sciences bring us and the knowledge that is furnished by philosophy. The knowledge that results from philosophy is a much higher value than the knowledge that the sciences provide. The sciences treat of reality piecemeal. They divide the Universe into parts and aspects, each part being treated by itself and in complete isolation from the other parts. The physical sciences, for instance, deal with the physical world (the inorganic or lifeless matter), Biology with the organic world (the living things), Psychology with the mental world (the human mind). Now as far as we know our world, it is either organic, inorganic or mental. Thus these three kinds of sciences would cover the entire universe, the entire reality. Which is then the place left for philosophy? Of what other reality or Universe does it give us the knowledge. It gives us the knowledge, unlike other sciences, not of parts and aspects of the universe. The Universe is **not** an aggregate of disintegrated and separable parts which can be united and separated at will. It is a **whole,** a **unity,** from which the parts are inseparable. The knowledge of the part-reality, of matter for example, is incomplete unless its relation to life and Mind is traced. There must therefore be a branch of knowledge which comprehends and considers the Universe **as a whole**—a whole, in which all its parts are inter-connected. This is philosophy. Philosophy, therefore, is the Science of the **whole** reality, of the **whole** Universe. It enquires: what is this whole, what is this Universe and seeks to

need of philosophy stands unrivalled in the domain of academic pursuits. So far we have been discussing the positive side of philosophy.

Speaking negatively, we have now to meet one of the most popular, though a very unjust and unfair, **objection** against philosophy. It is commonly urged that philosophers are dreamers and visionaries and are far remote from the realities of the world. This means that the object of philosophy is a mere dream-object, is a fleeting and passing brain-wave, is a creation of one's own brain. But this is absolutely baseless and betrays a thorough ignorance of the subject of philosophy For the Man and the Universe, of which the study is Philosophy, the man on the one hand and the universe on the other—the Universe with its inanimate objects, its vegetable and animal kingdom, its solar system and all the actual and possible realities therein, are facts which cannot with fairness be called dream-objects or passing fancy. They are hard and stubborn realities and you cannot escape them. Whether you like it or not, you cannot help thinking over these realities—you cannot help philosophising. Thus Philosophy is not a cry in the wilderness or roaming in the region of dreams and visions;—like all other sciences the hard facts of life and of the Universe form its data.

But what the critic really means by the objection is not so much that philosophy has merely to deal with dreams and visions, as it is that its study has **no practical advantage** or **Value in life.** It is now to this side of the objection that we shall turn and see how far it is justified or otherwise. It would naturally lead us to the analysis of the concepts "Advantage" or "Value". A thing is of advantage or value to me either because it brings me another advantage or value, or because it is advantageous or valuable in its own right. We earn money, because it affords us pleasure; but we seek pleasure, because it is valuable by virtue of its own nature. Thus money is valuable ony as a means to an end which is pleasure; whereas pleasure is valuable as an end in itself—is intrinsically good. Hence it is, that we have two notions of "advantage" or "value": "advantage" or "value" as a **means** to some end, and "advantage" or "value" as an **end in itself.** We shall now see how far the study of philosophy has an advantage or value both as an end itself or as a means to some other end.

Pleasure, Virtue, Art, Knowledge, Morality and Religion have each a value in its own right. They are valuable as ends in

Now all these questions deal with the most fundamental problems that a human being can be interested in. Once I have known them, I have known **all**—have known the complete truth and need nothing more. If knowledge of the ultimate reality were possible, nothing better could be desired. It would throw a light on, and explain, the whole reality and would thus teach me all I care to know.—All would be enlightenment, clearness and distinctness; and no trace of darkness, ignorance, confusion and error or falsehood would be left. I shall have dived deep into the very root of the cosmos and will be in direct communion with the very basis of all reality, be it God or anything else. My action too will therefore be the best and conceivably the most appropriate of all conduct;—and that **necessarily** so, for all would be done at the behest of the most perfect and consequently of the wisest and most moral being with whom I am in direct contact. Evidently, nothing better could be wished than to have a knowledge of the best reality, followed by the best of the conduct in line with it. All material advantages, gains, comforts, etc., dwindle into insignificance in the presence of an attainment so perfect.

If, however, a conclusive answer to the questions mentioned above is impossible and the knowledge of the ultimate reality not attainable, the enquiry at least sets **limits** to the human knowledge;—I know that not everything is knowable, I comprehend that there is something which is incomprehensible. Thus even if I am ignorant, my ignorance is an intelligent and sensible ignorance, and as such is not blind ignorance. What is thus incomprehensible and beyond the limits of human knowledge, becomes a matter of **faith,** of a **rational** faith for us. If we are not able to **know** reality (ultimate reality—Truth) we can at least approach it from the **other side** of our nature, i.e., from the fundamental human consciousness—æsthetical, moral and religious consciousness. We are thus led to a **belief** about its nature and so come to a Weltanschaung, a view of the Universe (Kant). Hence it is, that we get a consciousness of certain **"Ideals,"** a consciousness of the ideal of **"Beauty,"** of **"Goodness"** and of **"Holiness".** These ideals go beyond the experienced phenomena and offer us standards by which it can be judged. Hence Philosophy opens up a new field of vision before us, a field of certain Ideals, which we are constantly to strive after. If not actually attained, these Ideals have nevertheless a **regulative and disciplinary function** which, indeed, is no mean advantage. Thus in every case—whether we have knowledge or no-knowledge of the **ultimate reality or of ultimate End or purpose of human life**—the

On the Need of Philosophy

Philosophy, as the etymology of the word itself signifies, is **Love of Wisdom.** In its completion it is the **Doctrine of Wisdom.** What do we understand by wisdom? What is a wise man? The wise man is one who **knows**—knows the truth, and **acts** in conformity with what he considers to be true. Thus wisdom is that **state** of mind in which a complete **understanding** of things or situations is combined with the most appropriate **Action.** Hence there are two sides of Philosophy, **Theoretical Philosophy** and **Practical Philosophy.** The object of **Theoretical Philosophy** is the study of **Man** and of the **Universe** and of the **Relation of Man to Universe.** This exhausts the entire reality—all actual and possible reality. Obviously, the task of Theoretical Philosophy is the Knowledge of the **Whole** reality, of reality in general, in the abstract. But philosophical enquiry cannot stop at this;—it must of necessity pass from the abstract, the general, the whole, to the concrete, the particular, the part, which is at the **basis** of the whole. This is the very nature of all philosophical enquiry. Hence it is, that the problem of the knowledge of reality, passes from the knowledge of reality in general to the knowledge of **the** reality, of the **best** reality, of the **perfect** reality, of the **absolute and Ultimate** reality. To put it in simpler words, theoretical philosophy starts with a search for the knowledge of the whole reality, but finally it attempts to know the part—reality which is at the **basis** of the whole reality and which **explains** this whole.

The object of Practical Philosophy, on the other hand, is to investigate into the ultimate **End or Purpose** of human life;—it enquires what one ought to do, what is the best, the most appropriate sort of action? Taken together, the task of these two sides of Philosophy is to ask: What is my essential nature—what am I, whence do I come, whither do I proceed; what is this Universe; is the ultimate nature of it (me including) all matter, all life, all mind: is it all chaos, a blind process, or is it a Divine Ordinance and a designed process, etc., and what is my place, my function in, and relation to, this Universe? Further, what is my ultimate goal in this life, what ought I to do in conformity with what I have known to be true; and what should **I hope for** in the hereafter, in return for what I have done in this life?

out the least qualms of conscience, with what consequences, we all know so well. Man's sinful conduct towards woman in this country has acted as a boomerang. In degrading our woman folk we have only degenerated ourselves. It is a trite saying that a man is known by the company he keeps. One cannot expect a high-souled manhood amidst a down-trodden womanhood. It will not be an exaggeration to say that the present degenerate and decadent condition of our country is, to a very large extent, due to our having denied their legitimate rights to our mothers, sisters, wives and daughters. They have been kept in abyssmal ignorance about things happening around them, through illiteracy; they have been exploited economically, and have been otherwise oppressed and suppressed in a manner which makes one shudder. I cannot understand how man could and can fall so low! But then, there are men and men! Thank God, however, a change in the status of woman in this unhappy land is perceptible. Man's conscience has been stirred, and the womanhood of this country is coming into its own. The rights of woman are being gradually recognised, and she is now given an opportunity to unfold her hitherto dormant self. It is at this juncture, when woman is passing through a period of transition, that I strike a note of warning. Let not the woman of India imitate the womanhood of the West. Women especially need such a warning as they are, by nature, apish. Let the manhood of India come to the help of the womanhood, while the latter is negotiating a very difficult corner on her road of progress. Men in this country have to remember that it is they who are opening before woman's eyes new vistas of life, and it is to them that women are consciously or unconsciously looking up for guidance. Men's responsibility is, therefore, very great, for, while on the one hand they have to lead women along the road of progress, on the other, they have to steer clear of the shoals and pitfalls of Western civilization. Men should not, in particular, lose proper control over women, for that seems to be nature's purpose, and should, in co-operation with women, so regulate and control their course of conduct (without undue interference of course) as to ensure harmony between the sexes. They should in no case give women an artificial status, which is not suited to their genius, and which they often abuse. In plain language man should adopt a strong but considerate attitude towards women, who after all need protection. They can appreciate consideration from a strong man. A weak and wavering type of man is not the idol that women worship; nor do they worship mere brutal strength.

S. M. IDRIS.

for in both these pursuits, the mother's and the wife's duties cannot be properly discharged.

The impact of the western civilization on ours has created new problems for us. These problems need to be tackled with extreme caution. It should be our endeavour, as far as possible, to avoid the mistakes committed by the west. We should not imitate the West blindly, as unfortunately, we are doing at present. We should accept from the West everything that is calculated to promote our physical and spiritual welfare and should reject those values which are likely to defeat nature's purpose. One of such values that we have to reject is the existing relation between the sexes in the West. In the West a woman's status is an artificial one. It is not the result of her own evolution, but is propped up by man. Woman is dimly conscious of the fact that her present position is not her natural one and that it is dependent on man; but she does not care. She uses, or to be more precise, abuses it as if she had attained it as a result of her own evolution. Small wonder, therefore, if, instead of becoming man's help-mate, she has become his competitor. She forgets that man can, if he so will, take away from her what he has given her out of his generosity. One wonders what would have been her attitude to man, if, with her present nature, she had changed places with man. She would, perhaps, ride rough shod over man, as she does now, where she happens to be in a position of authority over him. Weak natures, as the reader probably knows, are too fond of making a show of their authority. This trait of character is common between weak men and women.

This much about the state of affairs in the West. What about the East, particularly about India? The position in India is quite the reverse of that of the West. In India woman has, on the whole, been treated inhumanly. Man has taken from her her liberty of action, her independence in those spheres of life where nature's purpose was that she should be free and independent. From a human-being she has been reduced to a chattel. This state of affairs is even more deplorable than that of the West, for it is an evidence of woman's exploitation by man, while in the West it is a question of misplaced generosity. In exploiting the weakness of women, the Eastern people have unmistakably demonstrated their lack of sense of justice and fairness, and also, I may say, their weakness of character. To a truly strong character the exploitation of the weak is a dastardly and ignoble course; we Indians have to admit with shame that we have been carrying on this exploitation for ages with-

The object of this article is not to bring woman into contempt, for that, indeed, would be a very immoral attitude on my part. I only wish the readers to overcome their prejudices and to see things in their true perspective. It is after we are able to wipe off false values that we can establish new and true ones. It is after removing the popular misconceptions about the "fair-sex" that we can estimate her true worth, and it is after finding her true worth that we can determine her proper position in the scheme of life. When the powder and the paint that hide her from the eye are removed, we shall be able to see the true woman, and it is that true woman who is to play the role assigned to her by nature. That role, let me add, is not an insignificant one. To be a mother, a sister or a wife is not a small part. It is as great a part, if not greater, as that played by the father, the brother and the husband. But while these parts are to be played, we must always bear in mind what nature intended the respective parts of men and women to be. God intended man to be man and woman to be woman and therefore designed them differently. He gave man more physical strength, more intellectual vigour and more power of endurance. He assigned to woman, a shorter stature, less intellectual vigour and less power of endurance. A good social structure, therefore, will be that in which nature's purpose will be carried out. The carrying out of that purpose, however, does not mean the exploitation of woman because the interests of man are complementary to the interests of woman, just as the one is the complement of the other. "Nature's purpose" does not mean depriving woman of her legitimate rights. Confining a woman within the four walls of a house, for instance, was never nature's purpose. In fact such a thing is in flagrant disregard of God's will. Again depriving a woman of her right to develop her physical, mental and spiritual capacities to the fullest is nothing but sheer injustice. This was never nature's purpose. In the same way depriving man of what was and is his, is not nature's purpose, and giving woman something which nature never gave her, is defiance of God's laws.

In the world as we see it, in the West as well as in the East, there has been no natural adjustment between the sexes. In the West woman has poked her nose in spheres which should have been the sole preserve of man, and has given up her own proper sphere. The sportswoman, the Parliamentarian, the factory girl—to mention only a few—forget that their occupations are ill-suited to their duties as mothers, wives and daughters. Nature neither intended woman to play foot-ball, nor to attend the tiresome sessions of Parliament,

from time to time to trace and to comprehend the Prime Cause. It is he who has evolved principles of morality, and woman has done nothing, but half consciously and half unconsciously accepted his opinion. It cannot, therefore, be logically said that the imitator is more religious than the exponent—the creator, I may say. The fact is that woman is not alive to eternal values to the same extent as man. She is much too frivolous for serious religious thinking. The thinking part is therefore done for her by man, and after he enunciates new principles, she takes them for granted, in most cases without understanding them, and invests them with a maze of her own superstitions. More often than not she loses sight of the principles, and clings to the superstitions with the same tenacity as she does to her fineries and her powder and lip-stick. There is as little truth and content in her religious belief as in her ordinary conversation. If you scratch a woman, in order to discover the basis of her religion, you will find that she has never thought over the matter at all: So, to call a woman religious, is to deny the entire history of religious thought.

Woman, the reader (prejudiced though he may be in favour of women) will readily agree is woefully lacking in creative genius. Cast a cursory glance over any department of knowledge, and you will find that woman's contribution to it is next to nothing. We may come occasionally across a Madam Curie or Montessori, but these are the rarest of exceptions, and hence prove the rule. The contention that they have never been given an opportunity to cultivate and develop their minds is unconvincing, for, in countries in which they do enjoy equal opportunities with men their creative output is negligible. On the other hand if it is argued that woman's mental and intellectual stagnation and cramping is the result of centuries of oppression, the argument may appear plausible at first sight, but would prove unconvincing when carefully tested. For the blame for woman's present inferiority cannot be fixed entirely on man. Taken in the aggregate man must certainly have been superior to woman, otherwise he could not have been able to obtain so complete an ascendency over woman, for time out of mind as he has actually done. The speriority in physical strength cannot be quoted as the sole cause of woman's inferiority and subjugation.

Having considered—though very briefly—some of the misconceptions about the "fair-sex" and having dealt the subject in terms which are not quite flattering to that sex, let me make it clear that woman is not something to be treated lightly or with contempt.

woman would not attribute generosity to her. Woman can be as hard-hearted as man (if not more) when the conditions in which her "gentleness" is to be tested are made exactly similar to those of man. And this is only logical; for, don't we know from our experience that weak and cowardly people are more hard-hearted, if and when they can have things their own way, than strong and dauntless people?

Yet another misconception about the "fair-sex" is that woman is more faithful than man. I know that in challenging the popular opinion in this respect I am running the risk of being dubbed a misogamist. But let me assure the readers that while I do challenge public opinion, I am not a misogamist. I am only putting to test the "value" that has been established, and am trying to find out its content. I claim that the so-called loyalty or faithfulness of woman is based on fear; that the moral sense in woman is not so developed as in man and that therefore if the fear is removed a woman will become and does become much more faithless than a man. It does not mean that man is infallible, and that he seldom becomes disloyal. It only means that if man, in spite of his independence, in spite of the fact that he may have no fear of being taken to task for disloyalty or being detected, can still remain loyal, it is because he is governed by the moral principle in him. Woman on the other hand, as I have remarked above, is governed by fear, and as contra-distinguished from the positive morality of man, woman's is only passive. If woman is given the same amount of independence as man enjoys and is reasonably sure that her disloyalty will go unpunished, then she will not remain loyal; for, her moral sense is too weak and too undefined to control her.

It is also commonly believed that woman is more religious by nature than man. Nothing can be further from truth than this, for woman has always looked up to man for religious guidance. If woman were really more religious by nature than man she ought to have made some contribution towards religious thought. But one will search the pages of the History of Religion in vain for any conspicuous contribution of religious ideas by woman. This is only natural, for women are not in the habit of indulging in hard thinking. They are fond of gossip and are taken up with self-embellishment. How can women then have more interest in religion than men? I need no arguments to prove that hard and consistent thinking is peculiar to man. It is he who thinks over the problems of creation of life, of cause and effect, and it is he who has attempted

he does it without emotion. To change the metaphor, he is performing a surgical operation, or he is pricking the bubbles of opinion. whose sole content is air. No one loses by searching criticism of old values, many of which are false, while all are likely to gain by transvaluing false values

The foregoing paragraphs deal with only a part of the values relating to man and woman. The more important question is to assign to them their correct role in the scheme of life. This, I must confess, is a difficult problem to solve. But nothing is to be gained and much is likely to be lost by refusing to face the problem in the present very critical stage of the Indian society in general and the Muslim community in particular.

Before embarking on this very difficult task of adjusting the relations between the sexes I must remove some other misconceptions about the so-called "fair-sex." One of such misconceptions is that woman is more soft-hearted than man. Let us see how far this supposition can stand the search-light of reason. The question is: Is softness synonymous with weakness? The only sensible reply to this quetion is "No." Now, my contention is that what we consider to be the soft-heartedness of a woman is merely a manifestation of weakness. True softheartedness is that which springs from the innermost recesses of one's being—from rocks as it were—; it must be of a permanent nature and should not be as transitory as a hypocrite's tears. In the case of a woman the softening influence is temporary. She can become soft-hearted and hard-hearted in unbelieveably short periods of time, even as she can shed crocodile tears almost at will. Her "softness" is more often than not the result of self-pity; it is subjective never objective. The fact of the matter is that a woman is by nature incapable of sympathising with others objectively. On the other hand, man, commonly designated the Rougher-sex," is soft-hearted in the real sense of the term. His sympathies are wide and deep; he can approach a subject not only subjectively, but aslo objectively, and therefore, when he shows kindness it is always of a truer variety—it is the result of large-heartedness. Now, large-heartedness or generosity and women are contradictions in terms. A woman is very narrow-minded, and is always on the look out to point an accusing finger at other people's defects. She can never show any generosity in ignoring the failings of others. This characteristic of women is not at all compatible, with soft-heartedness; for lack of generosity and soft-heartedness go ill together; and I dare say that even the staunchest supporters of

with false feathers; but though not very sensible in the solution of intricate problems, she is sensible enough to hide from man the consciousness of her physical ugliness. Those, however, who make a psychological approach to the question and I include myself in that category, cannot fail to discover woman's inferiority complex. Has the reader ever questioned himself as to why a woman is so fond of embellishments, of fineries, of brilliant showy colours, of powder and lip-stick? If he has not, let him do so now. He will not be long in discovering—of course if has any insight into human nature—that a woman stoops to all these devices of beautification on account of her innate feeling of being "unfair." It is the demand of her nature to show herself off, not in her own colours, but in others which she considers more attractive than her own. Thus without knowing it she proclaims her physical inferiority, and to a critical observer the working of her innerself must be crystal clear. But how many of us, men, are critical and dispassionate observers in the case of women! We remain blissfully unconscious of the implications of these decorations, and caught in the mashes of sex feeling, lose our sense of proportion while judging them. Our judgments about woman's "fairness" are therefore divorced from truth, inasmuch as they are due more to a sex urge than to a correct estimate of woman's "grace."

Man, on the other hand, is so conscious of his comeliness that he always tries to set it off by simple dress, devoid of all decorations and powder. He is fair without embellishments! The woman knows all this; she knows that man is handsomer, that he is nobler, and that he has raised her to a higher pedestal than she deserved. But she keeps quiet! She has never called man fair, because she does not wish to break her monopoly. She has never composed verses about man's "fairness" while she unhesitatingly accepts from him praises to which she knows she is not entitled. She is so ungenerous and greedy by nature that she denies to man what is his due, and accepts from him, with her powdered face, what he gives her by mistake. This, however, is natural. The princes give, the beggars take. The princes do not care if they give more than one deserves. Let the beggars with the alms that they have received from the princes, show themselves off as fairy-queens and let the princes in their simple hunting dress smile—a half-amused and half-contemptuous smile.

Is my tone acrimonious? Let the reader not misjudge me. I write without fear or favour. An iconoclast is bound to become unpopular with idolators; but in breaking idols, he has no malice—

reason is the greatest, he uses it the least. Strange though it may seem, it is yet a fact that it is in ordinary matters, which do not count much n shaping life that we give free play to our reason, and it is in the most intricate problems of life that we accept not reason but opinion as our guide. We call it faith; but we never question what this faith is, and why it is. We never inquire that what we call faith may merely be the shirking of our responsibility as rational beings to probe into the meaning of things. We forget that faith, unsupported by reason, may degenerate into mere groping in the dark after ghosts and shadows.

Let the reader take note that I am not giving a sermon against faith. I am only pointing out the dangers of faith which issues from, or is based on mere opinion. We never care to enquire as to how far we are swayed by opinion, and how we allow ourselves to ride on its tide. We never care to find the basis and the content of the opinion on which we build our values. Inevitably, if the opinion is wrong is contentless and irrational, our values, emerging as they do from such opinion are also wrong and irrational. And once values, right, are wrong, are established, and people begin to swear by them, it takes a stout heart, an unconventional nature, in a word, an iconoclast to smash them, and in the words of Nietsche, transvalue them. Some of such values which man has set up are about the so-called fair-sex, and I am to show that man in his infinite folly, in his unfathomable ignorance, committed the greatest blunder in investing woman with a halo which does not properly belong to her. In his infatuation he called Eve's daughter the "fair-sex." I do not know who was the first man who blundered in this way. Perhaps he was a lunatic! But I cannot understand how other men caught the contagion and idolised woman, who, I claim, far from being fair, is actually uglier than man. I must beg the readers' forgiveness for taking him by surprise. He did not, perhaps, anticipate that it is man and not woman, whom I regard as the fair-sex, and as he will see I do not establish my case on mere opinion, but on solid arguments.

To repeat, I say, that woman is not the fair-sex—I mean from the physical point of view—,that man is handsomer than woman, and that he, out of his generosity and folly, rendered unto her, what was and is undoubtedly his. Woman knows it. She is conscious of her inferiority—of her ugliness—but is silent. She knows, that her pride of place is due to man's generosity; and that she is pluming herself

third. Yet exposition, situation and discussion are the test of Shaw as a play-wright.

His plays entertain the audience and produce laughter, but with no loss to dignity. Shaw, however, has been led to confine himself to stories of high life in most of his plays, by an inner necessity, which he himself has not been able fully to grasp.

Many of his dramas degenerate into endless, dull and frivolous dialogue, which confiscates the beauty of his plays. His characters are unyielding to the philosophy of others. Very few stir us with human sympathy. But very remarkably he displays the sources of an original though limited art in making characters play an equal part in the unravelling of the plot.

Rarely tedious, his plays have a particular life of their own. Humour and the gift of telling words are the things to keep his philosophy fresh and living.

As a play-wright Shaw has passed the meridian of his career, but the development of his mind has yet an amazing store of novelties for his readers.

A. RAUF,
IV Year.

The Fair Sex X-rayed*

I must, at the very outset, warn those who are attracted by the title of this article that though they will find in it much that is interesting, they will be doomed to disappointment if they expect anything entertaining about what I consider to be the weaker sex. They will find as they read the article that I am out to invert their established values, or to assign to these values their proper place. My attitude, in short, is that of an iconoclast, since I am about to break the idols that men, in their ignorance, have worshipped, and to present the relations of the sexes in their true perspective.

Man is called a rational animal; but it must be admitted that in those spheres of his life in which the need for the exercise of

*The other side of the picture will be placed before the readers in the next issue.—Ed.

Shaw is regarded as a phenomenon and like all other phenomena he remains in ultimate analysis a mystery. Like other philosophers of to-day he is accused of proving that 'black is white.' But considering his strange and singular beliefs, he is above all such baseless criticism.

That Mr. Shaw is only a play-wright, cannot be denied. He himself claims that he is only a writer of historical and moral plays in which he has given the world a new set of moral and social values. But he is never a moralist even to the depth of his pocket. Gems from the domain of aesthetics also shine brilliantly in his plays.

Shaw has tried to found his dramas on what he regards as "genuinely scientific natural history" and since nothing can be more alien to scientific history than romance, his plays are almost all devoid of sentiment. In "The Man of Destiny" we are introduced to Napoleon and a 'most delightful and tasty girl' but to our great dismay we find nowhere a 'flow of jipsy-jollity and human passions.' Again in "Man and Superman" Shaw appears as his real self. He talks of sentiment, of love and of other passions but at the same time brings in the "apparition of piety" in the person of Ramsden who mars the flagrant beauty of the play. This distinguishes his plays not only from Shakespeare but also from Samuel Butler, Shaw's spiritual father.

The fundamental points in a Shavian play are that his characters are intellectual, that they are not living, and that he does not probe deep into the human heart. His characters in "Man and Superman" are beyond the comprehension of an ordinary reader. He always makes his characters utter things unusual—the deep, dark philosophy of human life.

Shakespeare introduces ghosts, spirits and other portentous factors, but Shaw converts all the characters in some of his plays into super-human forms.

Shaw has ranged through many countries in his plays. This variation in scenes has become one of the causes of his popularity on the Continent and in America.

The most important elements in a drama are—an exposition in the first act, a situation in the second and the 'denoument' in the

Shaw—the Literary Wizard

Shaw is a versatile genius. He is a dramatist, a novelist, a philosopher, a Fabian Socialist, a literary critic, and a reformer. He is known to the critics not only as a prince of heretics but also as a past master of paradox.

The whole force and triumph of Mr. Bernard Shaw lies in the fact that he is a thoroughly consistent man. One may find flaws in his self-devised principles, but there is hardly any room to criticize their application. After a life-long meditation he has espoused a definite and unchanging belief. He is not a 'weather-cock' or a 'time-server' to be moulded into every cast. He has climbed into a fixed star and the earth whizzes below him like a zoetrope.

His chief characteristic is his originality in the sense that he has not taken his ideals ready-made from the conventional standards of good and evil; but has read his own meaning into life and given his own values to things. Shaw is original not only in his morality but also in his observation of life.

Another prominent characteristic of George Bernard Shaw's writing is his fearless intellectual criticism. The principles of his criticism and even the objects to which he applies them are indeed very similar to those of Samuel Butler. And yet Bernard Shaw has a temperament of his own. He possesses to the highest degree inventiveness, wit and humour. He knows how to animate and perpetuate ideas.

Shaw has selected comedy as the instrument of criticizing the social, political and economic abuses of his country. His opinions of world economics and arts have combined to make him a serious comedian. He has reconciled comedy and serious thought successfully. This has made him a puzzle to most of his readers and it is on this account that he has seemed greater than he is.

Shaw can also be taken as a realist who tries to find the essence of truth from under the cloak of romance and 'respectability.'

A large number of his characters are instinct with the life of intelligence and are but the mouth-piece of the author.

both for the rebel and humanity at large. Several frustrations come in. First, youth begins to mock at the idea of noble descent. It tramples over the notions of the purity of blood and in its zeal to root out such 'dangerous notions' strikes unconsciously at the stem of nobility itself. A lower scale of values is accepted because it vindicates their position. We find our youth running away to marry any street girl without any moral qualm. To him inherited nobility of character means nothing. Second, the pride of the official aristocracy breeds in him an inferiority complex. If he possesses a soft heart he at once bows to the least deserving authority and becomes a cringing worm. But on the other hand, when the heart has a drachm of blood in it, insolence and disobedience colour all the activities of life. Respect is considered to be a symptom of weakness and obstinacy a sign of strength. A defiant temper is praised and youthful grousing appreciated. To-day we find that in the questioning attitude of our youth there is much of inquisitiveness and none of the spirit of enquiry.

The third aristocracy seems to have cultivated the cult of the coterie. Each intellectual circle keeps out all those that scratch its ideology and taste. The youth expects that the gods of taste, who strut about in their foreign robes, should sometimes give up their Patriarchal office and play true gods. They should create something in the field of literature or science as their teachers abroad have done. But somehow we see that these gods with feet of clay cannot tread the path their masters go and therefore, create doubts in the minds of the youth. 'Is this learning of the West worth anything'? they ask. 'Should we mimic the West eternally and starve our souls.' And with these doubts in mind, a section of our youth marches back to the lure of the happy middle ages and is stranded on the way. This is one side of the frustration. The other side becomes visible when we find the modern youth, in its zeal to westernize, holding up to ridicule all that is its own; may it be the beard of his father or the loose, flowing garments of his mother, because these stand in the way of his rapid Europeanization. No wonder that our youth of to-day is a disrespectful, inquisitive, insolent ape who finds the article of "take" swaying the minds of men and, therefore, rebels against them so monstrously.

M. M. K.

soil can possibly shake off their sinister effects. Even those who came here with thoroughly democratic traditions have had to bid farewell to their old notions. The 1940 version of this malady has a touch of modernity about it. While the old version classified men on economic basis mostly and assigned each of the castes its duties, the modern version goes much farther and brings in many new distinctions—tribal, official, intellectual. There are social circles within social circles. A man is, for instance, first a Pathan, then a Durrani and then a Saddozai. As a Pathan he thinks himself above non-Pathans, as a Durrani above other Pathans and as a Saddozai above other Durranis. Again, there is the official class. This class, as a whole, thinks itself to be a privileged body and keeps all others at an arm's length. They affect a reserve that is insultingly repulsive. An air of importance is assumed which seems to say 'keep silent, you insignificant folk. You cannot realize the difficulty of being great.' The alien system of government whose creation it is, feels it necessary to exalt this body at the expense of less vocal but perhaps more truly loyal subject and thereby sows the seed of discontent.

Still again, there is the intellectual elite of society, mostly products of the educational institutions of the West, who always flaunt their learning and treat the alumni of Indian universities with conscious condescension. They impose themselves on the youth of the country in many ways. Here they will find fault with your pronunciation and point out the defects of your literary taste, there you will be discourteously told that you are hopelessly ignorant of modern scientific thought. These gods of taste and learning will dictate to you from the high altitudes of the mount of knowledge. They will seldom take the trouble of looking through your mind and guiding you honestly. Taste you must cultivate, scientific thought you must imbibe, no matter whether it is in keeping with your mind and the circumstances of your life or not. So the modern youth, that has feasted so long on theories of equality and democracy in his books, stands face to face with three barriers. The barrier of **blood** which engenders a superiority of **birth**; the barrier of **office** which gives birth to a superiority of **status** and the barrier of **brain** that fosters the idea of the superiority of **intellect.** Three aristocracies have come into being, the aristocracy of birth, the aristocracy of office and the aristocracy of intellect, and all the three jeer at youth. It could have compromised with the aristocracy of intellect had it been only genuine. The other two are too shamefully false to be put up with. Youth rebels against them all. The result is disastrous

avoid the daggers which rent his heart. Did not Cleopatra and Cæsar know that

> Sceptre and crown must tumble down
> And in the dust be equal made,
> With poor crooked scythe and spade?

Who can be so blind as to say they did not? What, then, was Cleopatra's beauty for? And wherefore the display of Cæsar's power?

Man knows that he has to taste of the cup of death. There is an end to pain and pleasure, which we call life. The Duke as well as a dustman has to cease to be one day. Let life be luxuriant or lack-lustre, it has to reach its goal of death. The Sun will rise and set for ages to come but man will walk under it no more. The moon will make days of the darkest nights but man will behold the change no longer. The day of man's life has to change into a night which will never see light again. And man knows it very well. But in spite of that he is busy to accumulate worldly wealth and power. He flies to the devil's den and goes under the dark deep. His science is busy finding out new means to assist him in his desperate enterprises. His great god gun is ready to open its mouth and lay the world waste. His clouds of machine-guns are saturated to pour the rain of lethal balls. His tanks and trawlers are rending the heart of the soil and the sea. His aeroplanes fly in the air and his submarines touch the ooze. After all what are his guns, tanks, trawlers and magnet mines for? Wherefore his aeroplanes and his huge bombs? What end after all has he in view? May I know:

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی؟

M. AFZAL.

The New Caste System

The modern Indian society, with all its knowledge of democratic institutions, is suffering from that great malady which is so complacently called "class distinction." Time-honoured customs and centuries old usages have left such indelible impression on the culture and civilisation of India that no intellect nourished on this

display but are never to be used. The hopelessness in international affairs is the work of men like you and me, and it is because these men said one thing and meant quite another that we have been brought to the brink of ruin. And as I ask you to reassert in your practical life religious and moral values I warn you not to spurn at and reject reason in a sudden access of enthusiasm for faith. I believe in the value of faith; it does move mountains. But I also think that faith without reason is blind and has been the cause of much hideous suffering and persecution in the past. "We must not obey," says Aristotle, "those who urge us, because we are human and mortal, to think human and mortal thoughts: in so far as we may, we should practise immortality, and omit no effort to live in accordance with the best that is in us."

M. A. LATIF.

May I Know?

Cleopatra was a beautiful queen. Think of the two pearls of her eyes, her dagger-like eye-brows, and of her ruby lips. Imagine the dark fleecy cloud of her curly tresses waving over the moon of her forehead, and her rose-like radiant cheeks. Just picture her gestures, her motions and her smiles which even gods could not forbear.

Cæsar was a great warrior. He killed thousands of men—men who could think and talk like him, who like him, possessed hearts and heads, and in whose veins blood ran just as in his. But he put them to the sword, as if there was no sword hanging over his own head.

Ah me! what boots us our boasted power,
Our golden treasure and our purple state;
They cannot ward the inevitable hour,
Nor stay the fearful violence of Fate.

All the beauty and brilliance of Cleopatra could not stand against the venom of the viper which, in a moment turned her into food for worms. All the pomp and power of Cæsar could not

Lord Acton, "corrupts. Absolute power absolutely corrupts." The dictator tries to iron out all men and their actions into a dull, soulless uniformity, and by silencing opposition and throttling criticism he condemns his people to stagnation and their future to complete cultural sterility. Great creative and revolutionary thinkers, poets and prophets are impossible in a state which forces its members to believe and act in the way the dictator wants them to believe and act. There can be nothing but a short shrift in the totalitarian state for a person like Voltaire who is said to have remarked to a man that though he loathed his opinion yet he would go to the gallows to see that it was not suppressed.

Dictatorship is also opposed to the spirit of religion which, like democracy, stresses the importance of the individual and individual salvation. It realises the infinite preciousness of the human creature and in the mood of Sophocles, the great Greek dramatist, it sings: "Many a wonder lives and moves, but the wonder of all is man." And what is more, religion has a universal affection for humanity and a vast pity for the dispossessed of the earth, the weak and the oppressed. Where shall we look for these things in dictatorship? The difference between dictatorship and democracy from the point of view of the individual, as Mr. Wells has so brilliantly put it, is "one between a deadening servitude and a continual, participating enlargement of responsible life.

And so I leave it there. What is, you would ask, my panacea for the ills of a suffering humanity?" Alas, I cannot find any such universal balm, but as you will have seen I have been at pains to bring out to you the perilous consequences which ensue from the neglect of religious and moral values, and the abdication of individual responsibility. The price of liberty is eternal vigilance. The world as it is today horrifies me and though I suffer acute anguish at times as one value after another of civilised life is attacked and destroyed, and though I often give way to a black despair, yet I continue to nourish the unconquerable hope that were we to return to religion, were we to guide our lives not by dogma but the spirit of religion which is one of tolerance, justice, truth, charity and good-will, I am sure we would come out of the abyss of moral and spiritual degeneration into which we have plunged ourselves. Don't listen to the man who tells you that you should not let your principles and ideals bear too closely upon your daily actions. He is asking you to treat your ideals in the same way as a connoisseur of art treats beautiful curious and other objects of art. They are kept in glass-cases for

gious and moral loyalties. It is the prison and the concentration camp. Pastor Nimoeller's persecution is a case in point.

Thus we find that religious scepticism has combined with unemployment to produce an environment which has infected international relations with universal rottenness.

This brings me to the question of democracy and dictatorship. I need not apologize for dragging politics into a discourse which purports to be moral. I am not one of those who believe that religion and politics ought to be kept strictly apart. I need scarcely remind you that this belief is contrary to the spirit of Islam, and it is precisely because politics are being kept apart from religion that we are the agonised spectators of modern barbarism. Political systems, like other products of man's mind, are the reflection of his soul or personality (call it what you will) and this soul or personality is strongly moulded by the beliefs which he cherishes and the morality to which he subscribes. Democracy, in its ideal form, is, in the hackenyed words of Abraham Lincoln, "the government of the people, by the people, for the people." It is a system of government which places its confidence in the rationality of man, in his capacity to govern himself, to judge for himself what is good and what is bad. Its emphasis is on the individual and individual responsibility. Its creed is that the state exists for the individual and that all men are equal before the law. It demands the minimum social, moral and political uniformity and allows men great scope for the maximum development of his individuality. In his memorable essay "On Liberty," John Stuart Mill has an eloquent passage which ought to be cherished by all democrats:—

"It is not ," he wrote, "by wearing down into uniformity all that is individual in themselves, but by cultivating it, and calling it forth, within the limits imposed by the rights and interests of others, that human beings become a noble and beautiful object of contemplation; and as the works partake the character of those who do them, by the same process human life also becomes rich, diversified, and animating, furnishing more abundant aliment to high thoughts and elevating feelings, and strengthening the tie which binds every individual to the race, by making the race infinitely better worth belonging to."

However enlightened it may be, dictatorship is, on the contrary, an act of the usurpation of absolute power. "Power," said

created a huge mass of positive knowledge and which sternly refuses to accept anything a priori, anything which is purely a matter of faith or belief unless it is observable and verifiable by the evidence of the senses. Its impact on religion has been nothing short of disastrous. The whole imposing structure of Christian dogma (since Christianity was the first faith to feel the shock of its impact) has crumbled to pieces. Some brave spirits, notably Dean Inge, have made heroic attempts to square the facts of science with the dogmas of religion, with what success I am not in a position to judge, but it is significant that Darwin's theory of evolution which so profoundly shocked the world because it ascribed the origin and birth of man not to Adam and Eve but to an ape and finally to the jelly-fish and the amoeba was accepted by the church as progress. Still more disconcerting was the conception of the universe which Science held until quite recently. The world, according to this conception, was a vast machine and Science impressed upon man the consciousness of his complete insignificance in this vast universe with its endless gyrations of atoms. This sense of his insignificance was further reinforced by the latest offsprings of Science, psychology and psycho-analysis which tracing everything to secret impulses lurking in man's unconscious mind over which he had no control produced a strong feeling of fatalism. Consequently the vast number of unemployed youth who exist in every European country depressed by forced idleness and overcome by the ennui of inanition and the sheer aimlessness, the blank futility of life, enthusiastically respounded to the perfervid oratory of adventurers of fortune like Hitler and Mussolini, and rallied in swarms under their banners. Their lives which were so drab and colourless began to assume a romantic significance, the sluggish stream of blood in their veins and arteries quickened into a joyful movement, their hearts which seemed to them so curiously dead and dried up leaped with a new uprush of thrilling vitality. Here at least, they felt, was something definite, something worth living and worth dying for, a dynamic creed, even if it was based on a racial myth and the subtle exploitation of their grievance against life. Uniforms and marches, banners and drums, songs and slogans were all so exciting, and since they had ceased to care for an outworn religion and its God, the deep messianic urge, the craving to be comforted and led which is so innate in mankind found for them a suitable avatar in Hitler or Mussolini, the deified individuals. And thus arose a new mentality which has given us the unique syllogism: "Hitler is lonely; so is God; Hitler is like God." And what is the alternative for those who refuse to kow-tow to these human gods, who deny their godhead and who reaffirm their old reli-

satisfaction of desire." In other words, morality resolves the conflicts between the natural and the social man, and thus makes a harmonious communal existence possible. Immoral conduct is, therefore, anti-social and in self-defence, society has, evolved three methods of dealing with it. It inspires in the minds of its members the fear of eternal damnation. Secondly, it subjects the offender to strong social disapproval amounting at times to ostracism. Thirdly, it inflicts penalties, mild or severe, according to the nature of the offence committed. These three methods have so far effectively checked the disintegration of society which would ensue in their absence, and we find that those societies where these methods are fully operative enjoy greater social harmony and solidarity than those whose religious or moral conscience is not highly developed.

It is a matter of common observation that despite the break-up of international morality we in our private and domestic lives still behave in a fairly decent, moral way. Conscience may be, as some people think, a convenient name or pretext for "enlightened self-interest," but none the less we know that unless our interests are too openly threatened or violated we actively pursue and promote the values of civilised life. It may be, as some philosophers maintain, that there is an ingrained element of malice in human nature and we take a sadistic pleasure in inflicting misery and suffering on others, but who will deny that this "two-legged reptile, crafty and venomous," as Byron called man, is also capable of extraordinary feats of heroism, self-sacrifice, devotion and human kindliness. Yet when we turn our gaze from the sphere of private relations to the much larger sphere of international relations we are struck by the absence of decency and tolerance. The cynic, you begin to think, was right who defined an ambassador as one who is paid to tell lies on behalf of his country, and the nation as "a society united by a common error as to its origin and a common aversion to its neighbours." Diplomacy, it is agreed, stands for corrupt practices, for lies, hypocrisy and deliberate deception. Is it any wonder if international relations are approximating more and more closely to the life of the jungle which aknowledges no other law than the will of the strong and no higher force than mere brute force? This yawning gulf between private and public morality is the most outstanding as also the most painful fact of the contemporary situation and its existence is to be attributed solely to the decline in the religious consciousness of mankind.

The factors that have brought about this decline are many. First and foremost among them is the advent of science which has

mic, moral and political. It would take me too far afield if I were to discuss all these causes here. For a detailed and comprehensive exposition I would refer you to Mr. Huzley's "Ends and Means," Mr. Wells' "The Fate of Homo Sapiens," Mr. Clarence Streit's "Union Now" and Mr. Curry's "The Case for Federal Union." They are all in their own way remarkable books, and besides giving you plenty of useful information they would also provide you with much solid food for thought.

Morality to my mind is the same in its relation to religion as the body is to the soul. It is essentially the practical side of religion, and it is noteworthy that all world religions, particularly Islam and Christianity, lay constant and unwearied emphasis on 'good works.' Under the sway of our obsessions and prejudices, we are too prone to consign people belonging to other religions to hell fire in the next world and to persecution in this, and we conveniently forget the extraordinary charity and tolerance which inspired the following lines from the Quran:—

"To every one have We given a law and a way........And if God had pleased, He would have made you all (all mankind) one people (people of one religion). But He hath done otherwise, that He might try you in that which He hath severally given unto you: wherefore press forward in good works. Unto God shall ye return and He will tell you that concerning which ye disagree." Such is the noble simplicity of the message of Islam.

Accordingly when you find in any society or nation the paucity or absence of 'good works', and a great laxity of morals, it is a sure sign that the spirit of religion as far as it is to be found in that particular society or nation is in a state of decay. Morality has therefore a purely practical justification—it is that part of religion which governs the conduct of man as a unit of society. "Our relations with our Creator," said the late Syed Amir Ali, "are matters of conscience; our relations with our fellow-beings must be matters of positive rules; and what higher sanction—to use a legal expression—can be attached to the enforcement of the relative duties of man to man than the sanction of religion." "The practical need of morals," says another brilliant modern thinker—Bertrand Russell, arises from the conflict of desires, whether of different people or of the same person at different times or even at one time. A man desires to drink and also be fit for his work next morning. We think him immoral if he adopts the course which gives him the smaller total

Before I ask you to consider with me the causes which have brought about the lapse of our civilisation into moral barbarism, I would read out to you two or three utterances which epitomise the barbarism I am speaking of.

"Mankind," says Hitler in "Mein Kampf," "has grown great in eternal struggles; mankind will perish in eternal peace." "Mein Kampf" is, as you know the autobiography of Hitler, and is more or less the official Bible of Germany. In fact, a few years ago the Parish Council of Dettingen in Wurttemburg decided to present all married couples with a copy of "Mein Kampf" and for all I know this practice may have spread in other parts of Germany by now. In a similar vein Mussolini writing about Fascism says: "War alone carries all human energies to the maximum of tension and sets the seal of nobility on the people who have the courage to face it." And lest you should think that Mussolini is a great lover of liberty, this is what he has to say of it; "The body of Liberty is dead and her corpse already putrescent." A moment ago, I quoted Mr. Aldous Huxley who refers to the worship of the deified individual. Confirmation of this statement comes from a responsible German official, a certain Dr. Franck, who has propounded a syllogism whose soundness or otherwise I leave to your judgment. He says: "Hitler is lonely; so is God; Hitler is like God."

You have had enough of quotations which I would not have inflicted upon you had they not been to me, as they must be to you, such heresies as flout all the moral and religious standards which we uphold. I cannot, as some people do, treat these utterances of Hitler, Mussolini and their henchmen as the ravings of mad men. They are utterances on which whole systems of political philosophy called National Socialism or Naziism and Fascism have been built. And it is in no partisan spirit that I quote them to you. I have, no wish to take up propagandist cudgels on behalf of Great Britain or any other nation. Great Britain's record in international politics is by no means irreproachable. My sole desire is to defend what I, according to my lights, consider to be the right and true modes of thought and conduct.

We have seen how desperately chaotic is the present state of the world and how fast we have retrogressed into moral or spiritual barbarism. What has brought about this retrogression, this unprecedented collapse of civilised existence? The question is so complex that no single cause will provide an adequate explanation. A full account will have to include causes as diverse as psychological, econo-

masqueraded in the cloak of morality, for tyrants usually found or manufactured some plausible moral excuse or other for waging war or suppressing liberty. To-day, these diverse evils stalk about the world naked and unashamed. For instance, when Russia invades Finland and is asked by the League of Nations to cease hostilities it declares with perfect sangfroid and cool effrontery that it is not fighting any war at all.

Thus it is that in the face of moral anarchy sensitive minds in Europe and elsewhere are seized with despair and stricken with a bleak disillusionment and pessimism. Two years ago when the dread spectre of war was yet in the offing, Mr. Aldous Huxley was so alarmed by developments in Europe that he had to divert his energy from the sphere of artistic creation to write that extremely penetrating and thoughtful book which he has called "a practical cookery book of reform" and which has impressed me so deeply: I mean "ENDS AND MEANS." Looking at contemporary facts, he notes a marked regression in charity, a sharp decline in men's regard for truth and "a great retreat from monotheism to idolatry." The worship of God," he says, "has been abandoned in favour of the worship of such local divinities as the nation, the class and even the deified individual." Another great writer with whose name most of you are familiar—Mr. H. G. Wells—whose buoyancy of spirits, one would have thought, was irrepressible and whose optimism as green as the bay-tree, has at last made a heart-broken confession in a recent book with the significant title—"THE FATE OF HOMO SAPIENS." This is what he says:

"......the spectacle of evil in the world during the past half-dozen years—the wanton destruction of homes, the ruthless hounding out of decent folk into exile, the bombings of open cities, the cold-blooded massacres, and mutilation of children and defenceless gentle people, the rapes and filthy humiliations and above all, the return of deliberate and organised torture, mental torment and fear to a world from which such things had seemed well-nigh banished—has come near to breaking my spirit altogether.......for my generation there have been many things so unforgettable and disappointments so bitter that for us laughter has become almost a brutality."

Similar statements and confessions are coming almost daily from other distinguished men who recoil with horror and dismay from contemplating, what Mr. Joad has called, the new Dark Ages of mankind, the ages of moral and spiritual barbarism.

For good or ill, we have accepted, however half-heartedly, the civilisation of the West, and we are bound to experience the same upheaval which is being experienced by the West itself. We cannot but be overwhelmed by these forces of barbarism once they have approached our shores. Long years of foreign rule and internal disunity have sapped our power of resistance, and where other nations may go down before these forces with some sort of struggle, we who have neither physical nor moral energy will succumb to them without even twitching a muscle of our body.

What is the common heritage that is being threatened today? It includes all those values without which a truly civilised life is impossible—I mean, truth, beauty, goodness, happiness, liberty, justice, and love. I prefer an existence which guarantees the pursuit and attainment of these values to an existence which does not. I prefer a quiet life which gives me sufficient leisure for study, for the appreciation of art and natural beauty, and for calm contemplation. I also prefer the company of cultured friends with whom I can exchange views on things as different as cabbages and kings. I prefer all these things to a life which is perpetually tormented by the demon of busy-ness, a life, to quote the words of Matthew Arnold, with "its sick hurry, its divided aims." If I am left secure in the enjoyment of the things I prefer, with an assurance of a reasonable income, I ask nothing more of life. But I find that these things are becoming increasingly impossible in Europe, and in some parts of it the values for which they stand have already been partially or completely destroyed. Europe is to-day a warning and an eye-opener for us, and unless we heed the warning, unless we open our eyes, we too will go the way Europe is going without being able to retrace our steps.

All European writers and thinkers, whether great or small, assert with distressing unanimity that the Christian civilisation is passing through an acute crisis which it might not be able to survive. The rise of dictatorship, the suppression of liberties, individual as well as national, the contempt for the sanctity of treaties and the violation of pledges solemnly given, racial persecution, aggressive nationalism, organised lying are the chief symptoms of this crisis. I do not say that these are new evils. Indeed, they have existed in the past, but they differ from those in the past in two important respects. First, owing to restricted means of communication the evils in the past were local in their operation and incidence and affected other parts of the world less than they do now. Secondly, they always

of an idea the plentiful gifts nature has bestowed on you, providing your country with the unity, the dynamic force, the discipline and the leadership which it needs.

* * * * *

Prof. A. B. A. Haleem, M.A., Pro-Vice-Chancellor, Muslim University, Aligarh.

You must develop a strong sense of loyalty and devotion to the great faith in which you have been nurtured, to the great land that has given you birth, and to this seat of learning which has provided you with your mental equipment, and you must make these three loyalties the guiding principles of your life in the difficult and critical times ahead

The Collapse of International Morality*

The other day when I announced my intention to give you a moral discourse, one of you advanced towards me with an impish smile and said: "Don't you think, Sir, that it is rather incongruous for a young man to preach a **moral** sermon?" This remark, casual as it was and I presume not meant to be taken seriously, made me think for a moment. It reflected the common opinion that the essential pre-requisites of moral sermons are a venerable bearing, grey hairs, and a profoundly contemplative look. I should not be surprised if most of you hold that opinion and think that before attempting to usurp the mantle of the College Dean or Professor Timur I should have waited until Time had brought me the gifts of a greater maturity of mind, a broader outlook and a more extensive range of experience. But I assure you, gentlemen, that I would have avoided if I could my appearance on this stage today, if it had not been for a painfully growing conviction that the time we live in is out of joint, and that you and I who happen to pursue knowledge in this home of learning have to realise and meet the ominous threat which is held out to our common heritage of civilised existence by the forces of barbarism let loose in Europe today. We cannot pretend that these forces are too remote from us to be bothered about.

*Originally delivered at a meeting held under the auspices of Majlis-i-Diniyat.—Ed.

their determined ends. And what end can be higher and nobler and more challenging to the spirit of youth than this, of striving to establish a better, more humane, more just social order which will evoke the highest creative and co-operative impulses in all men and women and reject injustice, exploitation and repression as products of a barbaric social and economic system?

* * * * *

Dr. Zakir Husain, M.A., Ph.D., Principal, Jamia-i-Millia-i-Islamia, Delhi.

There is hardly any free country in the world to-day that does not keep its eyes on the frontiers, because in a peaceful world every people must be on their guard. We in India, too, must be watchful. But somehow it is not of possible enemies and invasions only that we think when we think of our frontier. We think of the Pathans, of their past and of their future, their achievements and their destiny. The frontier is for us not a boundary line to be defended but a mystery to be solved.

Some look upon this mystery of the Pushtu speaking people with fear. A Pathan myself and an Indian, I cannot be one of them. So much of the Indian historical tradition is bound up with the Pathan race, our cultural relationship has been so intimate and enduring, Indians, and Pathans belong to each other so entirely, that there can be no question of severance, of each seeking fulfilment in his own way. We have a common destiny, and we must face it together. So long as we are confident of this, it is unreasonable to presume that the self-assertion of the Pathans would be against the common interest. We should rather welcome it, because of the enormous energy it will liberate.

But there is this great danger, which I do not hesitate to warn you of. Your self-assertion, your liberated energy, your boundless vigour may lack objectives or be directed to wrong ones. It may expend itself in enterprises that acquire exaggerated significance in a society afflicted with peace, security and moral inertia. Or it may get lost in paltry, selfish and futile ambitions seeking satisfaction and not glory. Your self-assertion must consist in the realisation of a social ideal; your self-expression must be the service of a cause. The social ideals of Islam and your political traditions are there to give form and direction to your self-assertion and self-expression; you have only to make the resolve. I hope and pray that you will make the resolve; that you will devote to the service

the attention of the Frontier Youth to one or two important points which they will do well to ponder over in their thoughtful moments.

The world, as well as this great country of ours, is faced with a great crisis and, even though every generation is inclined to exaggerate its achievements as well as its tribulations it can be safely said that it is one of the major crises of human history. Many civilisations have grown up and perished in the past but never has an upheaval occurred on such an extensive scale as at present, nor has the power of man for good and evil been so great as it is to-day. In the past, one could have consoled oneself with the thought that man is after all the plaything of forces over which he has no control and, therefore, he must resign himself to his fate. Now, however, the impressive discoveries and inventions of Science have placed in his hands enormous powers which he can utilise for his salvation or undoing, and it is obvious that he has so far used them more for exploitation than service, more for destruction than for construction, more for repression than for release of man's creative vision and impulses. Better and more effective **organisation** has resulted not in increased freedom or abundance or happiness but in intensifying the conflict between groups and riveting the chains of injustice and oppression more securely on the weaker sections of the people. Against this formidable menace to freedom and justice there is a small but ever increasing number of people in all countries who are crusading for the establishment of a better social order based on the principles of justice, co-operation and liberty. In this conflict no one can afford to remain unconcerned or neutral; whoever fails to fight for social justice, directly or indirectly strengthens the forces of darkness and obscurantism. There is but one imperative call which comes to the Youth of the Frontier Province, even as it comes to the youth of all races and countries and religions: **Will** you fight for the triumph of social justice and press all your talents and capacities and idealism and sacrifice into the service of this great cause, the greatest cause for which men have ever striven and suffered? Or, will you be content to follow a policy of drift, of struggling only for your petty, selfish purposes, oblivious to the cries of downtrodden humanity which is deprived not only of the life breath of culture but also of the barest essentials of livelihood?

To the Frontier Youth this call comes with a special force and poignancy because they belong religiously and racially to a people who have stood for social democracy and justice between man and man, who have not prized their life high in the pursuit of

honour and privilege of addressing the students of that institution. I carried with me an impression that your college was a unique and remarkable institution.

You ask me to tell you how you should make yourself useful citizens. My advice to you is that you should observe and maintain the highest sense of honour and integrity, and serve your people selflessly in every way you can. Make your people self-respecting, self-confident and self-reliant.

To-day your province is in the grip of outside influences and internal divisions and it is an irony of fate that those who opposed the progress and constitutional advance of your province are still able to exercise sufficient influence and prevent the creation of solidarity of Mussalmans in your province.

Islam expects every Muslim to do his duty. You, my young friends, show the way by your own example, lead your province and go forward united on a single platform, under one flag and to speak with one voice.

I wish you God's speed.

* * * * *

Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari, Hydar Nawaz Jang Bahadur, Kt., P.C., D.C.L., LL.D., President, Executive Council, H.E.H. the Nizam's Government.

Young Men of the Frontier. The age in which you live is the most critical period of our history. You are on the threshold of great changes, changes without parallel in every respect. Remember it is only those who have set before themselves some great and noble ideal that can face the future with courage My advice is, "be a true Muslim and a patriotic Indian." I will repeat here for you Iqbal's:—

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا　　مقام رنگ و بو کا راز پا جا
برنگ بحر ساحل آشنا رہ　　کف ساحل سے دامن کھینچتا جا

* * * * *

K. G. Saiyidain Esquire, M.A., M.Ed., Director of Education, Jammu and Kashmir.

Giving a "message" implies a certain pontificial attitude which I happily lack. I shall, therefore, content myself with inviting

Feroz-ud-Din Pahlwan of the Physics Department has started a wrestling "ikhara." The P.T.'s are seen every morning giving "non-players" mass drill. The Superintendents of various games are daily present on various play grounds to see to the proper training and exercise of as many of the students as possible. Master Sandhe Khan who has been so well-known to generations of past students has kindly offered to coach the football team as a labour of love. All this is as it should be. The physical part of education should receive as much attention as the intellectual and the moral.

Messages to the Frontier Youth

[With a view to bringing the Frontier youth of to-day into direct contact with the currents of thought of the "living present," we requested some of the foremost sons of the province to give our readers the benefit of their vast knowledge of human affairs and to explain to them what expectations were entertained of them by the older generation. Most of the gentlemen thus approached made a generous response and we were enabled through their kindness to present to our readers in our last issue a number of messages addressed to them regarding their rights and duties. As was confidently expected, the young sons of the Frontier have greatly appreciated the spirit and contents of these messages. Encouraged by the success of the experiment and the reaction of the students to the inspiring words of their elders, we have decided to continue this series.

This time we have the honour of presenting to our readers messages received from beyond the confines of the N.-W. F. Province —in fact from some of the greatest leaders of political and educational thought in India. We are deeply indebted to these gentlemen for their kind response to our appeal, and are sure that their messages will find a ready echo in the hearts of the Frontier youth.]

Mahatma M. K. Gandhi.

How I wish every boy of the Islamia College will become a messenger of peace between the warring sections of the nation!

* * * * *

Mr. M. A. Jinnah, Qaid-i-Azam, President, All-India Muslim League.

I was in Peshawar in September-October '36. It was my first visit and I visited Peshawar Islamia College then and had the

up the subject encourages us to hope that Geography will quickly become one of the most popular subjects. It is already one of the most important from the point of view of competitive examinations, for many of which it is a compulsory subject. Under the influence of modern scientific inventions, the barriers of time and space are being fast removed. The peoples of different parts of the world are being brought together as never before. Geography is no longer synonymous with a text book containing a mere collection of names of towns, rivers and mountains. It is a regular science which has made great progress during the past few years. It aims at giving a scientific and rational explanation for various natural phenomena and treats of Earth as the abode of man.

Study Circles

The Department of English has started "Study Circles" with the object of infusing into the minds of students a genuine interest in the study of books for the pleasure of reading. Each class has been placed under the charge of a professor, and has been split up into groups of about a dozen students each. Each of the members **"studies"** a book suggested by the Professor-in-charge, and the group meets in the room of one of the members once every two or three weeks A paper is read on one of the books studied and a discussion ensues, in which all take part. The Professor-in-charge leaves all this to be done by the students themselves. He occasionally looks in to help and guide, but is not always present at the meetings. It is common knowledge that once a book is prescribed as a "text-book" for an examination, it loses all its charm; and that reading confined to text-books alone is perfunctory and worth little. The establishment of Study Circles meets both these objections. It introduces the students to books which they take real delight in reading, and the reading of which strengthens and deepens their love of independent study. Incidentally, it conduces to improve the general academic atmosphere of the place.

Games and Sports

In furtherance of the Principal's new scheme of "Play-for-all," a vigorous campaign has been set on foot to make all the students of the Dar-ul-Ulum "sport-minded." All new-comers have been questioned about their previous games records and advised to join one or other of the games clubs of the College. A Hot Weather Inter-Hostel Tournament is being played very successfully, and a great deal of enthusiasm is being created for physical culture. Mr.

curricular activity. Soap of various qualities has been prepared and it is expected that the spirit of research with which the work has been undertaken and pursued will lead to much better results. We look forward to a time when all the bathrooms on the College compound will be provided with soap of purely local manufacture. The Department have an ambitious programme in view, and propose to take up the manufacture of germicides, polishes, inks, paints and perfumes. We understand that the department of Physics is also starting classes in Photography and radio-mechanics.

Coaching Classes

A good deal of useful work has been done by the Coaching Class; and lectures have been delivered on such important subjects as "Present-day Economic Problems," "Idea of the Wireless," "Arabic Literature," "Evolution," and "General Knowledge." The board incharge of the class propose to intensify their activities still further, and we are sure that many more promising youngmen will benefit from these next autumn. Public Service Commissioners have frequently stressed the necessity of regular "preparation" for competitive examinations held by them; and we are sure that lectures such as those delivered in this class will go a long way to broaden the mental horizon of our students and make them better-fitted for the struggle that lies ahead of them in the world.

B.T.

We are glad to be able to announce that a B.T. class is after all being started in our College. The Punjab University has already granted us affiliation and the Government has approved of the extension of college activities in this direction. The value of such a class has always been recognised; and the unending stream of applications that has been pouring in for admission is a positive proof of the genuineness of the demand for taking such a step. Arrangements have been made for the appointment of additional staff, and it is expected that our first B.T. class will be opened in the third week of September.

Geography

Another keenly-felt need has been met by the starting of Geography as one of the elective subjects in the Intermediate classes. With the permission of the University, the new 1st Year class has been given the option of selecting Geography as one of the subjects of study. The fact that as many as 15 students have already taken

We sent up five candidates for the M.A. examination in Mathematics, and all of them have been declared successful—two in the first class and three in the second, Muhammad Zaman securing the fourth place in the University. The old theory of the aversion of Muslim students for Mathematics stands exploded once again.

Four candidates sat for the M.A. examination in English and three came out successful (one in the second division). The pass percentage of 75 may not sound as impressive as 100% of Mathematics; but remembering that Mathematics is Mathematics and English English, the result is very creditable indeed. The department of English was under-staffed for a considerable part of the year, and if in spite of that handicap they have succeeded in showing results, which can compare very fabourably with those of the best and the oldest colleges of the University, they rightly deserve the thanks of all well-wishers of the institution.

32 students took the B.A. examination, and of these 26 were declared successful, thus obtaining a pass percentage of 81.2 as against 59.3 of the University as a whole. One of the successful candidates stands third in the University. Of the 64 who appeared for the Intermediate (Arts) Examinations, only ten failed, giving a pass per centage of 84.4 as against 57.8 of the University. Not a single candidate of the 18 who went up for the F.Sc. (medical) has failed. In the F.Sc. (non-medical), a pass percentage of 66.6 has been obtained against the University percentage of 60.6.

The Dar-ul-Ulum has easily retained its position as the premier educational institution of the province. It has passed not only the largest number of candidates of any college in the province, but has obtained a far higher pass percentage as well.

Hobbies

One of the new features introduced during the year as a part of the general expansion scheme is the encouragement of hobbies. The Department of Chemistry appear to have done the best work in this connection. A regular class of six enthusiasts has been regularly working under the guidance of Professors Mirza Anwer Beg and Nur Ahmed Khan. They have been studying the soap-making industry from the point of view of not only a scientist but a practical economist. A really intelligent interest has been aroused in the students for this extra-

to **"Examinations"**; and are not May and June dedicated to **"Results** of Examinations"? No wonder that in such circumstances, many of the College Societies failed to hold their usual meetings, and many of the playing-fields lost their usual attraction. All of us know what kill-joys these examinations are. But even after they have run their course, they leave behind them a legacy of partings and departures. The atmosphere remains gloomy and sullen for several weeks. Would it be wrong to call the months of April, May and June the Season of Examinations?

True, the advent of April is heralded by All-Fools' Day, when "Not to be fooled" is the sole thought of everyone as he leaves his bed early in the morning. True also, that quite a number of "wise-heads" fall easy victims to the wily ruses of their friends and provide a source of mirth for all. But how long does this joy last? Only for a few hours or at the most for a day. The spectre of the Examination is there all the time raising its dreadful head behind all frivolous jollity.

New Admissions

As usual, the last week of May and the first few days of June saw many new faces crowding round the College building. Big and small, tall and short, "suits" and "Chadars"—all had come to seek admission into that haven of bliss, the First Year class. The Admission Board interviewed the new-comers and their parents and guardians, discussed with them the choice of a career and the selection of a suitable combination of subjects, stressed the need and value of games and sports, and allotted seats in the hostels.

The number of those who have been admitted has already exceeded 160 and promises to rise still higher and in fact to beat all previous records. This year, the percentage of First-Divisioners is higher than ever before. Some of the new-comers give unmistakable signs of growing into good players. We hope the P.T.'s and Games Superintendents will succeed in moulding these budding sportsmen into really good footballers and cricketers and hockey and tennis players.

University Results

The Principal's solicitude for the weaker students of each class and his anxiety to see the First Division men kept up to the mark have borne fruit, and we have this year obtained remarkably good "results"—perhaps the best in the history of the College.

We sent up five candidates for the M.A. examination in Mathematics, and all of them have been declared successful—two in the first class and three in the second, Muhammad Zaman securing the fourth place in the University. The old theory of the aversion of Muslim students for Mathematics stands exploded once again.

Four candidates sat for the M.A. examination in English and three came out successful (one in the second division). The pass percentage of 75 may not sound as impressive as 100% of Mathematics; but remembering that Mathematics is Mathematics and English English, the result is very creditable indeed. The department of English was under-staffed for a considerable part of the year, and if in spite of that handicap they have succeeded in showing results, which can compare very fabourably with those of the best and the oldest colleges of the University, they rightly deserve the thanks of all well-wishers of the institution.

32 students took the B.A. examination, and of these 26 were declared successful, thus obtaining a pass percentage of 81.2 as against 59.3 of the University as a whole. One of the successful candidates stands third in the University. Of the 64 who appeared for the Intermediate (Arts) Examinations, only ten failed, giving a pass per centage of 84.4 as against 57.8 of the University. Not a single candidate of the 18 who went up for the F.Sc. (medical) has failed. In the F.Sc. (non-medical), a pass percentage of 66.6 has been obtained against the University percentage of 60.6.

The Dar-ul-Ulum has easily retained its position as the premier educational institution of the province. It has passed not only the largest number of candidates of any college in the province, but has obtained a far higher pass percentage as well.

Hobbies

One of the new features introduced during the year as a part of the general expansion scheme is the encouragement of hobbies. The Department of Chemistry appear to have done the best work in this connection. A regular class of six enthusiasts has been regularly working under the guidance of Professors Mirza Anwer Beg and Nur Ahmed Khan. They have been studying the soap-making industry from the point of view of not only a scientist but a practical economist. A really intelligent interest has been aroused in the students for this extra-

to **"Examinations"**; and are not May and June dedicated to **"Results** of Examinations"? No wonder that in such circumstances, many of the College Societies failed to hold their usual meetings, and many of the playing-fields lost their usual attraction. All of us know what kill-joys these examinations are. But even after they have run their course, they leave behind them a legacy of partings and departures. The atmosphere remains gloomy and sullen for several weeks. Would it be wrong to call the months of April, May and June the Season of Examinations?

True, the advent of April is heralded by All-Fools' Day, when "Not to be fooled" is the sole thought of everyone as he leaves his bed early in the morning. True also, that quite a number of "wise-heads" fall easy victims to the wily ruses of their friends and provide a source of mirth for all. But how long does this joy last? Only for a few hours or at the most for a day. The spectre of the Examination is there all the time raising its dreadful head behind all frivolous jollity.

New Admissions

As usual, the last week of May and the first few days of June saw many new faces crowding round the College building. Big and small, tall and short, "suits" and "Chadars"—all had come to seek admission into that haven of bliss, the First Year class. The Admission Board interviewed the new-comers and their parents and guardians, discussed with them the choice of a career and the selection of a suitable combination of subjects, stressed the need and value of games and sports, and allotted seats in the hostels.

The number of those who have been admitted has already exceeded 160 and promises to rise still higher and in fact to beat all previous records. This year, the percentage of First-Divisioners is higher than ever before. Some of the new-comers give unmistakable signs of growing into good players. We hope the P.T.'s and Games Superintendents will succeed in moulding these budding sportsmen into really good footballers and cricketers and hockey and tennis players.

University Results

The Principal's solicitude for the weaker students of each class and his anxiety to see the First Division men kept up to the mark have borne fruit: and we have this year obtained remarkably good "results"—perhaps the best in the history of the College.

THE KHYBER

No. 3-4] PESHAWAR, MAY—JUNE 1940. [Vol. XXV

Notes and Comments

The Examination Season

To keep pace with the all-round progress that has been going on so rapidly in the various spheres of activity of the Dar-ul-Ulum, it was proposed to try the experiment of bringing out the "Khyber" more frequently than before. Converting it into a "monthly" was out of the question. The experience of our veteran predecessors warned us against embarking on any such adventure with a light heart. We consequently decided to publish an issue once in two months. But even this could not be reconciled with the college calendar. The working months of the academic year being nine, how could a two-monthly term divide the whole period exactly "without leaving a remainder?" Hence, we had to fall back on Mother Nature's distribution of the year and to bring out "seasonal" issues of the magazine. The Autumn, the Winter and the Spring numbers have already been published, and the Summer number is now being issued.

But when we sat down to write our notes on the College, Society and Games activities and found the grim shadow of examinations darkening every thing, we began to feel that perhaps a better name for this issue would be "The Examination Number." For was not the latter half of March given over to "preparation for the **Examination;**" were not the whole of April and a part of May devoted

THE KHYBER

ISLAMIA COLLEGE, PESHAWAR

Contents

خیبر

دارالعلوم اسلامیہ سرحد

نگران — پروفیسر عشرت حسین ایم۔ اے۔ (آئی۔ ای۔ ایس) ریڈر

مدیرین — نذیر میرزا برلاس ایم۔ اے۔ متعلم بی۔ ٹی۔ عبدالرؤف شگفتہ

جلد ۲۴ — نمبر ۱

افتتاحیہ

خیبر کی اس اشاعت میں یہی مقصد پیشِ نظر ہے کہ مضامین اور نظموں میں یکرنگی نہ آنے پائے۔ نہ ہی ہم اسے متین مضامین کا مرقع بنا کر دوسرے اردو رسائل کی کورانہ تقلید کر بیٹھیں۔ اور نہ ہی مزاحیہ مواد کی افراط سے اسے ہنسی کا گول گپّا بنا دیں۔ اسی اصول کی بنا پر نہ صرف سنجیدہ مضامین اس اشاعت کی زینت ہیں بلکہ ادبِ لطیف کے چند نمونے بھی دیدہ زیب ہیں۔ کہیں کہیں ظرافت کی پھلجڑیاں بھی خوب پھول بکھیر رہی ہیں۔

نظم کا حصہ تو تقریباً سارا ہی تغزل کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ لیکن اس گلدستۂ تغزل کی رعنائیوں کو اگر میرزا برلاس کی نظم "گلگردش" چار چاند لگانے دیتی ہے تو اختر صاحب کی غزل کا ایک ایک شعر طبیعت میں ہیجان پیدا کئے دیتا ہے اسی غزل کا ایک شعر ہے

ناصبوری کی عطا اور کی تلقین شکیب !
کام فرزانے کا وہ لیتے ہیں دیوانے سے

خواجہ صاحب کی غزل "انجام محبت" میں خیالات کی پختگی قابل ستائش ہے۔ جس بحر میں غزل لکھی گئی ہے وہ بھی ذرا ہمّت طلب ہے۔ لیکن انہوں نے اسے خوب نبھایا۔ مرزا صاحب کی دوسری غزل حسین ارادے اپنی ساخت میں میر مرحوم کی جھلک لئے نظر آتی ہے۔ اس کے پاکیزہ خیالات کانوں سے گزر۔ دماغ سے اتر بس دل میں چھپے جاتے ہیں۔ لیکن وہ دنیا سے اپنی بیزاری کو کوشش کے باوجود نہ چھپا سکے۔ اور کہہ اٹھے ؎

گناہوں کی دنیا سے اکتا چلے ہیں
کہیں چل کے اک اور بستی بسائیں

نصیر صاحب کی غزل "تجلی" ایک نہایت لطیف رنگ میں ڈوبی ہے۔ روز کے مشاہدات کو جس مضمون میں انہوں نے باندھا ہے وہ نہایت ہی قابل ستائش ہے۔

حصۂ نظم کے برعکس نثر کے حصے میں ہم آہنگی کا التزام نہیں رکھا گیا۔ غلام جیلانی صاحب کے ڈرامائی افسانے "گناہ" میں جہاں ظرافت کے پھول کھلے ہیں۔ وہاں ہاسٹل لائف کا بھی ایک دلکش پیرائے میں نقشہ کھینچا ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ انگریزی کے الفاظ اور عربی فارسی کے جملے کچھ اس خوبصورتی سے استعمال کئے گئے ہیں کہ بس مضمون کی جان معلوم ہوتے ہیں۔ "فریب" جو ادبِ لطیف کا ایک نمونہ ہے۔ عبدالرحیم صاحب بلوچ چیتائی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس میں خامیاں ضرور ہیں۔ لیکن وہ عامیانہ پن کہیں بھی نہیں جو آجکل ادب لطیف کے زور

پکڑ جانے سے اہل قلم میں سرایت کر چکا ہے

حسن ابن سعید صاحب کا تحقیقی مقالہ "سیکنڈ ہاسٹل" کیا ہے؟ صفحۂ قرطاس پر ظرافت اور تنوع خیالی کا ایک مہکتا ہوا لالہ زار ہے اس مضمون کی ASSOCIATIONS اگرچہ پرانی ہو چکی ہیں لیکن پھر بھی ان سے احتظاظ طبع کا رنگ جانے نہیں پایا۔ اور نہیں تو بی۔ ٹی اور ایس۔ اے۔ وی کے طلبا کیلئے یہ مضمون ایک اچھے خاصے جغرافیہ کا کام دیگا۔ لیکن یقین نہیں آتا کہ نثر کے اس قصیدۂ مدحیہ کو جو بلاشبہ سیکنڈ ہاسٹل کا ایک کارٹون ہے بی۔ ٹی کے طلبا چپ سادھ لیں گے۔ اگلی اشاعت میں ضرور سیکنڈ ہاسٹل کا کوئی نمائندہ اس کا ترکی بہ ترکی جواب دے گا۔ ماسٹر سندھے خانصاحب کا مضمون اس رسالے میں اپنی نوعیت کا واحد مضمون ہے۔ ہم ان کے نہایت ممنون ہیں کہ اس قسم کے مضامین لکھنے کی داغ بیل انہی کے ہاتھوں پڑی۔ امید ہے اس سے کالج کی ATHLETIC LIFE میں ایک نئے باب کا افتتاح ہوگا۔ ماسٹر صاحب سے درخواست ہے کہ وہ "خیبر" کی آئندہ اشاعتوں کو اپنے مضمون کی دوسری قسطوں سے محروم نہ رکھیں۔

"شاعر اور ندی" ادب لطیف کا ایک ٹکڑا ہے۔ جس میں سلیم اختر صاحب نے شاعر کی زبانی لب دریا کے مناظر سے ایک دلکش تصویر کے ذریعے قدرت کے راز معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ تو تھا نظموں اور مضمونوں کی حقیقت کا انکشاف۔ اب لگے ہاتھوں ہماری ایک دو باتیں بھی کان دھر کے سن لیجئے

جو افسانے ہم تک پہنچتے ہیں ان میں سے متعدد افسانوں کا پلاٹ یا تو مسروقہ ہوتا ہے یا پھر عشق پیچاں کی بیل کی طرح کچھ ایسا پیچیدہ کہ ہماری عقل اس کی پیچیدگیوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ انہیں ہمیں مجبوراً ردّی کی ٹوکری میں جگہ دینی پڑتی ہے۔ اسی ضمن میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہوسناکیوں نے جہاں ادب کی ترقی کی بہت سی راہیں مسدود کر رکھی ہیں۔ وہاں افسانہ نویسی کی مختصر سی کائنات میں حقیقت نگاری کو نمایاں جگہ دے دی ہے۔ جنگ کو ایک سال سے کچھ اوپر ہونے کو آیا ہے۔ دیدۂ بینا کیلئے نت نئے ہزاروں ایسے واقعات ہوا کرتے ہیں جن پر تخیل کے تار و پود کی سوزن کاری سے کئی معیاری افسانے لکھے جا سکتے ہیں۔ اخباروں میں اور ریڈیو پر بسا اوقات دشمن اپنی بہادری کے کارناموں اور حریف کی لغزشوں اور ناکامیوں کو مثالوں سے واضح کرتا رہتا ہے۔ بس یہی مثالیں تمہارے افسانے کا مواد ہونا چاہئیں۔ انہی پر پلاٹ کا انحصار ہے۔ ہاں افسانہ لکھنے کو رنگینئ تحریر۔ وسعتِ تخیل اور مشاہدہ بھی ضروری ہیں ؏

عبدالرؤف شگفتہ

گُل فروش

یہ نازنیں کہ جسے قاصدِ بہار کہیں
جہاں حسینہ کہ فطرت کا شاہکار کہیں

پیامِ آمدِ فصلِ بہار دیتی ہے
جنوں نصیب دلوں کی دعائیں لیتی ہے

اسے چمن کے ہر اک پھول سے محبت ہے
اسے بہار کی رعنائیوں سے اُلفت ہے

گلوں میں پھرتی ہے یوں جیسے تیتری کوئی
چمن کی سیر کرے یا حسیں پری کوئی

جو پھول چنتے ہوئے نغمے گنگناتی ہے
یہ شاید اپنی جوانی کے گیت گاتی ہے

شباب نے اسے اک تمکنت سکھا دی ہے
غریب ہی سہی "پھولوں کی شاہزادی" ہے

جہان والوں کا حسنِ سلوک دیکھا ہے
اسے زمانے کی بیرحمیوں سے شکوہ ہے

گزر رہے ہیں شب و روز دستکاری سے
شباب کاٹ رہی ہے یہ کتنی خواری سے

خودی کا درس ہے افسانۂ حیات اس کا
جواب پیدا کرے گی نہ کائنات اس کا

اسے زمانے کی نیرنگیوں کا ہوش نہیں
مری نظر میں یہ دیوی ہے گلفروش نہیں

ستم ظریفیٔ فطرت کو آج شرماؤں
جو اس نے ہار گندھے ہیں اسی کو پہناؤں

نذیر میرزا برلاس۔ ایم۔ اے۔
متعلم بی۔ ٹی

افسانوی رنگ میں ڈرامہ

گناہ!

ہم ہوسٹل کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے گپیں ہانک رہے تھے۔ کارل مارکس کا نظریہ اشتراکیت بشپ بارکلے کا مادیت سے انکار۔ مارشل کی اقتصادی تھیوری۔ مونالزا کی صناعی خوبیاں۔ غرضیکہ زمانے بھر کے متضادات پر ایک ہی سانس میں تبصرہ کر ڈالا۔

جاوید نے ایک بدنما سی انگڑائی لی

شاکر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ "یار کیا یہ آلوؤں کی عنایت ہے۔ جا سور ہو۔ خمیری روٹی تمہارے نازک احساسات پر چھاپہ مار رہی ہے۔

شفیق جو ابتک خاموش بیٹھا ہوا دل ہی دل میں لیونارڈو سے پکاسو تک کے شاہکاروں پر تبصرہ کر رہا تھا۔ بولا۔ "جاوید تم نے تو سابقہ سال دال نخود کے حق میں ووٹ دی تھی۔ کہئے یار لوگوں کی شلغم اور شاکر کے کچالو کتنے کامیاب رہے۔ بھائی موجودہ انتخاب میں جیتے وہ گا جو کنویسنگ کرے گا۔ ہم نے شلغم کے حق میں وہ قصیدہ مدحیہ لکھا کہ استاد رودکی کی روح تڑپ گئی۔

یہ لاہور ہے۔ ہم لاہور سے بول رہے ہیں۔ ابھی ابھی ملکہ پکھراج آپکو ایک فلمی گیت سنا رہی تھیں۔ اب طمنچہ جان سے ایک غزل سُنیئے۔ جس کا مطلع ہے

دل ناداں تجھے ہُوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

ہم حیران تھے کہ خدایا یہ لاہور والے کیا واہی تباہی بکنے لگے۔ ہمارے دلوں کو تو کچھ بھی نہیں ہُوا۔ ٹمپریچر بھی وہی ہے۔ ٹھیک اسی سابقہ رفتار پر دھڑک رہا ہے۔ خیر طمنچہ جان کے دل سے ہمیں کیا واسطہ۔ باقی رہا دوا کا سوال سو عرض ہے کہ انٹی فلوجسٹین کا ایک پھایا یا اسلون کی مالش نہایت مفید اور مجرب ہے۔

اتنے میں داؤد نے اپنی کفر شکن چلم کا ایک بڑا کش لگایا اور فضا میں دھوئیں کے قلعے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ "یار آج تو یہ دل تک اُتر گئی۔ سلام ہو موجد کی روح پر اور یار لوگوں کے پھیپھڑوں پر"۔ ہم حیران تھے کہ چلم نہ ہوئی عشق کا عارضہ ہُوا۔ جو روایتی طور پر ہر کالجیٹ کے سینے تک اُتر جاتا ہے اور بسا اوقات تو اس کے بے درد کچوکے بیچارے نوجوان کی جان کے لاگو ہو جاتے ہیں۔ غرضکہ چلم کی مدح اور ذم میں کچھ دیر تک نوک جھوک ہوتی رہی۔ استنے میں جاوید نے ایک اور انگڑائی لی۔ لیکن اب اس کی آنکھوں میں شرارت جھلک رہی تھی۔

"یار جانے بھی دو۔ کھسیانی بلی کی طرح بیچاری جلیم کا کھمبہ کیوں نوچ رہے ہو۔ اس بے زبان نے کونسا جرم کیا کہ اس کے گرد ہو گئے۔ آؤ کوئی کام کی بات کریں۔"

شفیق جو موقع کی تاڑ میں تھا لپکا اور جاوید پر دو تین چست فقرے برسبیل ارتجال کہہ ڈالے۔ "کہیئے بھائی جلیمی کوئی پھر الہام ہوا۔ یا کوئی فلسفے کی موشگافی سوجھی۔ آپ تو ہوئے نا فلسفی اور ہم سیدھے سادے رجسٹری شدہ مسلمان۔ شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ۔" "بھئی خوب سمجھے" جاوید نے کھسیانا ہو کر کہا۔ "میں تم سے ایک سوال کرنے والا تھا۔ فلسفہ ولسفہ تو ہے نہیں۔ سیدھی سادھی خدا لگتی باتیں ہیں۔ تم انہیں کچھ سمجھو۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ گناہ کیا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ کبھی گناہ بھی کیا"

"نعوذ باللہ من ھذا الکلام۔ یہ بیٹھے بٹھائے آپکو کیا سوجھی۔ بلی کے خواب میں چھیچھڑے۔ ہاں دال نخود کو گناہ سمجھتا ہوں اور کچالوؤں کو گناہِ کبیرہ۔ اس کے بغیر تو جیتے جاگتے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا۔"

"یار شفیق تمہیں تو دل لگی ہی سوجھتی ہے۔ کبھی پتے کی بھی کہی؟ میں گناہ کے متعلق استفسار کر رہا ہوں اور آپ دال نخود کو لے بیٹھے۔

"تو پھر کیا کہوں۔ تمہارا مطلب یہ ہے کہ جواب کو علمائی رنگ میں پیش کروں اچھا سنو۔

الجوابُ صحیحٌ۔ واللہ اعلمُ بالصواب"

سردار بھوجن سنگھ جو خاموش بیٹھے ہوئے پنجاب کی حکومت کی خوابیں دیکھ رہے تھے اس عربی دانی پر چیں بہ جبیں ہو گئے۔ جھٹ پگڑی سنبھال سیدھے ہو بیٹھے۔ "تم مسلے بھی عجیب آدمی ہو۔ یہ اعلم واللہ بالکتاب کیا ہوتا ہے۔ پھر کہتے ہو کہ ہندوستان میں اردو ہندی کا شور شرابا ہو گیا۔ تم ما در بھومی کو آرام کب لینے دیتے ہو۔ ابھی کوئی ہندو بہن بھائی اٹھ کر "پربھو" "برھشت" اور اسی انڈین میکر کے کئی بول کہہ دے تو کون جمہ وار (ذمہ دار)

شفیق اپنی ہار مان گیا اور جھٹ حزب الاختلاف کے لیڈر کی طرح کہہ دیا "میں اپنے الفاظ اور اپنی عربی واپس لیتا ہوں۔ آپ اپنی ہندی کو وصول پائیں"۔

غرضیکہ حالات کی نزاکت پر قابو پا لیا گیا۔ اور ہندو مسلمان فساد ہوتے ہوتے رک گیا پر پریس کے نمائندوں کو مایوس لوٹنا پڑا۔

جاوید نے جونہی دیکھا کہ حالات کچھ سکون پذیر ہو چکے ہیں تو پھر اپنے سوال کو دھرایا۔ "اچھا بھائی شفیق اب برسبیل استدلال گناہ کے فلسفہ پر روشنی ڈالیں۔ اس ظرافت کو چھوڑیئے اور اس مسئلہ پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کریں۔"

"بھائی گناہ کرنا اور ٹھنڈا دل۔ ہمیں تو قدرت سے دل نہیں چنگاری ودیعت ہوئی ہے۔"

"پھر وہی۔ کوئی کام کی بات بھی کیا کرو۔"
شفیق جھٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور حلیم پہ ایک چبھتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے طنز یہ طور پر یہ شعر گنگنانے لگا ؎

تعریف اس خدا کی جس نے حقہ بنایا　　　　کیا خوبرو بنایا کیا خوشنما بنایا

اب کیا تھا جاوید جل گیا۔ لیکن کس کس کے گلے پڑتا۔ شفیق کو چھوڑ کر تسکین کی طرف مخاطب ہوا۔ "بھائی تسکین کیا آپ فلسفہ گناہ پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں"

تسکین جاوید کو زیادہ تنگ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے سنجیدہ سی شکل بنالی اور لگا اپنی فلسفہ دانی کا ثبوت دینے۔ "بھائی جاوید! میں تو فلسفہ تلذذ کا قائل ہوں۔ گناہ اور ثواب کی کشمکش دائمی ہے۔ بلکہ اس کو ضروری سمجھتا ہوں۔ زندگی ایک تجربہ گاہ ہے۔ چنانچہ اس تجربہ میں ہمیں ہر منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ جو گناہ کو مکروہ سمجھکر ترک کر دیتا ہے وہ ثواب کی اہمیت سے کما حقہٗ واقف نہیں ہوتا۔ ایسا ہی جس نے رات کی تاریکی کو نہ دیکھا ہو وہ دن کی روشنی کا اندازہ لگانے سے قاصر ہے۔ ہم زندگی میں گناہ صرف اس لئے نہیں کرتے کہ ہمیں لذت گناہ کا احساس ہو۔ بلکہ اسلئے کہ گناہ کی قباحت کو نیکی کی پاکیزگی کے پہلو بہ پہلو رکھ کر ان کا موازنہ کر سکیں۔ میں اس گناہ کو جو انسان اپنی ذات سے کرتا ہے گناہ نہیں سمجھتا بلکہ ذاتی کردار کی ایک معمولی خامی سمجھتا ہوں۔ شاید آپ کے نزدیک گناہ کا نظریہ مختلف ہو۔ ذرا آپ بھی بیان تو کر دیں۔"

جاوید خوش ہوا۔ اسلئے نہیں کہ اس کے سوال کا صحیح حل بتایا گیا بلکہ اسلئے کہ اس کے سوال کو درخور اعتنا سمجھا گیا۔

"بھائی تسکین آپکا نظریہ کسی حد تک صحیح ہے۔ لیکن آپ نے گناہ کی مکمل تعریف نہیں کی۔ دراصل گناہ صرف افراط و تفریط کا نام ہے۔ انسان اگر خدا کے حقوق میں افراط و تفریط کرتا ہے تو تب بھی گناہگار۔ اور اگر حقوق العباد میں کچھ کمی بیشی کرتا ہے تب بھی گناہگار۔ چنانچہ تحدیدات سے باہر قدم بڑھانا گناہ اور ان کے اندر رہنا ثواب نیکی یا حُسنِ کردار۔"

ہم سب بیٹھے ہوئے اس فلسفہ دانی کو سنتے رہے۔ شاکر سے نہ رہا گیا۔ جھٹ ایک فقرہ چُست کیا۔ "تھے آئے کہیں کے فلاسفر۔ منشی جی کی تگمی" اور "باباآ" "داداجا" پڑھ لیا اور لگے ڈینگیں مارنے۔ ہمیں کیا پڑی کہ مفت میں خدا کے کاموں میں دخل در معقولات دیں۔ خدا کے ساتھ افراط و تفریط۔ توبہ۔ نعوذ بھلی۔ ہم خدا کی ریاست پر ڈاکے تھوڑے ڈالتے ہیں اور نہ ہی اٹھائی گیرے ہیں کہ خدا کی کوئی چیز اٹھا چلتے بنیں۔ یہ آدھ آدھ پاؤ کی دو روٹیاں یہ ٹھیکہ کا من و سلویٰ۔ اور ہفتے میں دو بار پلاؤ اور گرمیوں میں چٹنی۔ یہ ہیں حقوق العباد اور ہم تم سب شریک۔ کسی نے کسٹرڈ کی پلیٹ اٹھالی ہوگی۔ تبھی تو۔ یہ افراط و تفریط یہ گناہ اور ثواب کی بحث چھیڑ دی۔"

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　　　یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے

خدا جانے اس عرصہ میں بوڑھی مس جیجہ جان چچا غالب کے کتنے شعروں پر ہاتھ صاف کر گئی اور ہم ابھی تک گناہ و ثواب کی بے نمک کھچڑی پکاتے رہے۔

....گڑگڑ۔ گڑگڑ۔ گڑگڑ..... ہیں یہ ریڈیو کو کیا ہو گیا۔ روس جرمنی۔ سکینڈے نیویا سویڈن۔ جاپان۔ وار دھا کی پناہ۔ بھاگو۔ دوڑو۔ روس افغانستان اور بلوچستان کی سرحد پار کر کے لنڈی کوتل سے ہوتا ہوا نوشہرہ پہنچ گیا.... ہوائی حملہ کی تیاریاں.... کانگرس کی طیارہ شکن توپوں نے دو ٹینک اور دو جرمن سمندری جہاز گرا لئے ....مسلم لیگ نے افغانستان کے راستے امریکہ پر حملہ کر دیا۔ روزویلٹ پیپا بنا لٹک رہا ہے۔ اہا ہا۔ اہا اہا..... ہم حیران تھے کہ خدایا تیری پناہ۔ کتنے ریڈیو ڈائرکٹر اپنے دماغوں سے مستعفی ہو چکے ہیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ غلطی سے "اول شبیر" ریڈیو کی ناب، کو تمام سٹیشنوں کی سیر کرا رہا ہے۔ جرمن کروزرز اور روس کی ناگہانی آمد کا خوف دور ہوا تو پھر وہی گناہ اور ثواب کی بحث گرم ہو گئی۔

جاوید نے چلم کا ایک کش لگایا اور گڑگڑاہٹ سے مغربی محاذ کا نقشہ کھینچ دیا۔ "تو اچھا بھائی تسکین میں بتا رہا تھا کہ گناہ دراصل افراط و تفریط کا نام ہے۔ مثلاً اگر آپ بھوک سے زیادہ روٹی کھاتے ہیں تو معدہ سے گناہ کرتے ہیں۔ اگر حد سے زیادہ اپنے جذبات کو تلقین ضبط (REPRESSiON) کرتے ہیں تو آپ اپنے دماغی مدرکات سے گناہ کرتے ہیں۔ کیونکہ پھر وہ خواہش جو کہ ظاہر نہیں ہوتی آپ کے شعوری حلقوں پہ مرتسم ہو جاتی ہے۔ اور آپکی ذہنی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر آپ کوئی فعل بد کرتے ہیں تو اپنے جسمانی اور ذہنی قویٰ سے گناہ کرتے ہیں۔ اور ضروری ہے کہ ان فعل بد کی زد میں کوئی غیر آدمی آتا ہو۔ اس صورت اسطہ یا بلاواسطہ حقوق العباد کو نقصان پہنچنے کا ڈر ہے۔ یا ایک سیدھی سادھی مثال لے لیجئے کہ آپ اگر اس ریڈیو کو نقصان پہنچاتے ہیں تو دوسرے طلباء کو ان کے سامان مسرت سے محروم کرتے ہیں اور کالج کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یا بلاواسطہ اس صورت بالذات اپنے آپکو نقصان پہنچاتے ہو صرف گناہ گناہ میں ہی نہیں بلکہ حد سے زیادہ طہارت اور پاکیزگی میں بھی گناہ جس طرح کاسونادا (CASSANOVA) گناہگار ہے۔ اسی طرح پاسکل (PASCAL) بھی۔ ایک زندگی کی نفی حقیقتوں میں افراط پیدا کرتا ہے۔ دوسرا نیکی کو اتنا بڑھاتا ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کو نظر انداز کر دیتا ہے"۔

لیکن ہمیں گناہ کو حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ اور نہ ہی گناہگار کو حقیر سمجھنا چاہیئے۔ اسے سوسائٹی سے الگ کر کے زنداں کی الم خیز تاریکیوں میں نہیں پھینک دینا چاہیئے۔ بلکہ اس سے ہمدردانہ سلوک کرنا چاہیئے تاکہ وہ خود گناہ کی قباحت اور ہمارے حسن سلوک کا موازنہ کر کے خود ہی گناہ کو ترک کر دے۔ کبھی آپنے سینٹ فرانسس آف اسیسی (ST FRANCiS OF ASSASSi) کا نام سنا۔ اس کا سلوک گناہگاروں کے ساتھ صرف ہمدردانہ ہی نہیں تھا بلکہ ترحمانہ بھی۔ میں عفو گناہ کا قائل ہوں۔ کیونکہ گناہگار اس کی آنچ سے سونے کی طرح روشن ہو کر نکلتا ہے۔ اور نیک آدمی

کیونکہ گناہ کی لذت سے آشنا نہیں ہوتا۔ اس نے تقویٰ شکن نظروں سے گھور کے۔ اور بادۂ نور سے ہاتھ نہیں رنگے ہوتے اس لئے وہ عادتاً ایک مشین کی طرح ایک خاص ہیئت میں چلتا رہتا ہے۔ نیک آدمی اس پرزہ کی طرح ہے جو صرف ایک ہی جگہ کام دے سکتا ہے۔ لیکن گناہگار اس کمانی کی طرح ہے جو مشین کے ہر حصے میں بخوبی کام دے سکتی ہے۔

"بہت خوب۔ واللہ فلسفہ کا گلا گھونٹ دیا" شفیق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کانٹ اور مغربی فلاسفہ کے علم الاخلاق میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ کاش آپ کے نظریات سے برٹرینڈ رسل BERTRAND RUSSELL واقف ہوتا۔" شاکر نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "بھلا بھائی جاوید اگر کوئی لڈو کا کل تمہاری غرقی کی پلیٹ پہ ہاتھ صاف کر جائے تو یہ افراط ہوئی یا تفریط"

"السلام علیکم"۔۔۔ جونہی گردن اٹھا کر نئے صاحب کا حلیہ دریافت کرنے کی کوشش کی تو وعلیکم السلام گلے میں چپک کر رہ گیا۔ دیکھا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب کھڑے افسرانہ نگاہوں سے گھور رہے ہیں "یہ سٹڈی آورز STUDY HOURS میں شور کیسا۔ اور ریڈیو ابھی تک کیوں بج رہا ہے؟"

جل تو جلال تو۔۔۔ آئی بلا کو ٹال تو۔۔۔ ہم حیران تھے کہ کوئی ایسا پیٹنٹ جھوٹ گھڑیں جو کام آجائے۔

جھٹ شاکر بول اٹھا جناب عالی۔ قاسم کوی دربار رنجیت سنگھ اور گوئٹے کا مقابلہ کر رہے تھے باتوں باتوں میں جھڑپ ہو گئی اور شاید شور بھی ہو گیا ہو۔"

"خوب۔ لیکن گوئٹے اور ریڈیو میں کونسا تعلق ہے"

اب تو تمام ترکی تمام شد ہو گئی۔ شفیق کی عربی دانی اور سردار بھوجن سنگھ کی سنسکرت نوازی آڑے نہ آسکی۔

صبح جو اٹھے تو بورڈ پر ایک پارہ کاغذ چسپاں تھا۔ اور اس پہ رات کے حاضرین کے اسمائے گرامی کے مقابل ایک روپیہ فی کس جرمانہ درج تھا۔

ہم نے جاوید کے گرد حلقہ بنا لیا۔ اور لگے اس سے سوال کرنے "کہ اب کہو تفریط کس کی اور افراط کا ہے کی گناہگار کون ہے اور گناہ کیا ہے"؟

غلام جیلانی اصغر

فریب

نہیں، نہیں! میں یقین نہیں کرسکتا
یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ مدہوش کن، ستاروں کی طرح درخشاں، نیلگوں آنکھیں؛ جو دُور افق کے قریب
کسی جھیل کے گہرے نیلے پانی کی مانند چمک رہی ہیں، ہمیشہ کیلئے بند ہو جائیں۔
یہ سیاہ زلفیں، جو چاندنی میں لرزتے ہوئے سایوں کی طرح فضا میں لہرا رہی ہیں اپنی رعنائی سے بیگانہ ہو جائیں۔
یہ رس بھرے ہونٹ جس میں رومان تڑپ رہے ہیں مُرجھا جائیں۔
یہ لطیف رنگینیوں سے لبریز جسم، جس میں زندگی اُونگھ رہی ہے ہمیشہ کیلئے سرد ہو جاتے۔
نہیں نہیں میں یقین نہیں کرسکتا
کہ حُسن شعلہ فشاں حُسن، ایک ابدی نیند سو جائے۔

"مسافر"

تجلی!

گذرتے جاتے ہیں اور مسکرائے جاتے ہیں
وہ ہر قدم پہ بہاریں لُٹائے جاتے ہیں

وہی دو لمحے جو گزرے تھے تیری محفل میں
مری حیات کو رنگیں بنائے جاتے ہیں

ٹپک رہے ہیں جبینِ نیاز سے سجدے
ترے قدم کے نشاں یاد آئے جاتے ہیں

جگر کے داغ کی شمعیں جلا جلا کے ہم
رسومِ اہلِ محبت نبھائے جاتے ہیں

ترا "جمال" ہے میرے "خیال" کا پرتو
مرے خیال بھی مجھ سے چھپائے جاتے ہیں

لحد میں بھی مری الفت کی آزمائش ہے
وہ میری قبر پہ آنسو بہائے جاتے ہیں

وہ نغمے۔ جن سے تھی رونق کبھی گلستاں کی
قفس کی تیلیوں میں کب سنائے جاتے ہیں

گذر رہی ہے قیامت وفا کے سر پر سے
بنا کے خود ہی وہ ہمکو مٹائے جاتے ہیں

ہیں راز داں مرے دل کی جھکی ہوئی نظریں
وہ داستاں میری مجھ سے چھپائے جاتے ہیں

نصیر ہم غمِ الفت کے بے پناہ صدمے
کسی کے حسن کا صدقہ اٹھائے جاتے ہیں

ایم۔ اے نصیر۔ ایم۔ اے (فائنل)

اے امید! تو ہی ایک سہارا ہے حرماں نصیب دنیا کا۔
تیری دھیمی اور ٹمٹماتی ہوئی روشنی، خستہ حال لٹے ہوئے کارواں کا آخری دیا ہے
تیرا گذر ہے نہ صرف حسرت و یاس کی بستی سے، بلکہ مسجد و دیر و کلیسا میں اور میکدے میں
زاہد و رند تیرے نام کی مالا جپتے ہیں
حوادثات زمانہ سے تنگ آ کر جب کنج عزلت کا مکیں بنتا ہوں
میرا تخیل جب دنور غم سے بلند و پستی سے نا آشنا ہوتا ہے
اے طائر امید۔ مجھے اس وقت بھی تیرے روح پرور نغموں کا خیال رہتا ہے۔
تیرے سیمابی پروں کی پھڑپھڑاہٹ باد مخالف کو موافق بنا دیتی ہے۔
وہ ہوا۔ جو میرے دل کی بند کلی کیلئے نسیم جانفزا کا حکم رکھتی ہے
لیلائے شب کی آمد سے دنیا ادھر گونج اٹھی
اُدھر میری حرماں نصیبی نیند سے جاگ اٹھی
میں رنج و الم کا مرقع ہوتا ہوں، جنگل کے گھنے حصوں میں۔ دنیا سے بیزار۔
ظلمتِ شب تاریکی روح کو دوبالا کر دیتی ہے۔
اے مہتاب امید! اس وقت جبکہ ظلمت ہر طرف سے بلائیں لیتی نظر آتی ہے
تیری نقرئی کرنیں درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر
ظلمت کے پردوں کو چیرتی ہوئیں
دل کی تاریکیوں کو روشن کر دیتی ہیں

میرا وطن ــ مغرب کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ چکا ہے۔
رہ و رسم آزادی سب مٹ چلے ہیں۔
مجھے ایسے وطن سے نفرت ہے۔ جہاں غلامی کا علم بلند ہے۔
اے رشتۂ امید! مجھے ایسے وطن کو لے چل

جو حرّیت و آزادی کے نشے میں سرشار ہو
جس کا ہر فرد اس کی لاج رکھنے کو پروانہ وار ہو۔

میری محدود دنیا کی عمیق گھاٹیوں میں اے امید تو اس طرح روشن ہے۔
جس طرح شب کی سرمگیں آنکھوں میں ماہتاب کا نور درخشاں ہوتا ہے۔
یا جس طرح رات کے سیاہ لبوں پر دست قدرت نے مقیش کتر کر چھڑک دیا ہو
اے امید مجھے اپنی گود میں لے لے۔
مجھے تیری محبت کی ضرورت ہے
تیری محبت کی تحصیل میں میری مسرتوں کی تکمیل ہے۔
میرا وطن پھر آزادی کا مسکن ہوگا۔
میری روح میں مسرت کا بحر بیکراں موجزن ہوگا۔

اے طائر امید! اپنے سیمابی پروں سے اب ہوا کا رخ پھیر۔
کہ انتظار کی حد ہو چکی!!

عبدالرؤف شگفتہ

کس نے یہ آہ لیا نام محبت ہائے
ہو گیا خوں دل ناکام محبت ہائے

آہ! تو اور ہو بدنام محبت ہائے
کشتۂ خنجر الزام محبت ہائے

میری تقدیر میں تھی آہ یہ رسوائی بھی
تجھ پہ ہو تہمت الزام محبت ہائے

ایک دلدوز سی روداد ہے ناکامی کی
پوچھئے آہ! نہ انجام محبت ہائے

مجھکو رکھا نہ کہیں کا دل بیتا بنے آہ
کہدیا آنکھوں نے پیغام محبت ہائے

آہ وہ چاندنی راتوں کی ملاقاتیں آہ
یاد آتے ہیں وہ ایام محبت ہائے

یہ جگر دوز صدا آہ یہ دلدوز فغاں
رو رہا ہے کوئی ناکام محبت ہائے

اصلاحی مقالہ — خاص "خیبر" کیلئے

سیکنڈ ہوسٹل

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیئے   ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے۔

جو حیثیت "سیکنڈ ہوسٹل" کو دارالعلوم اسلامیہ سرحد میں حاصل ہے۔ شاید ہی کسی ہوسٹل کو ایک رہائشی درسگاہ میں میسر ہو۔ یہ ہوسٹل اسقدر اہم، ضروری، تاریخی اور قابل ذکر ہے کہ جس زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے کسی نہ کسی خصوصیت کا حامل ضرور نظر آئے گا۔ کچھ اس کی تاریخی وجغرافیائی اہمیت کی وجہ سے، کچھ اپنی طبیعت کی افتاد کے باعث اور غالباً کچھ "اصلاحی" نکتۂ خیال کے سبب سے، دارالعلوم کے واحد ترجمان اور آرگن میں اس کا "ذکر خیر" چنداں بیجا نہ ہوگا۔

نام اور وجہ تسمیہ۔ سیکنڈ ہوسٹل کا اصلی حقیقی اور ابتدائی نام "چیمسفورڈ ہوسٹل" ہے۔ یہ کیوں؟ نام خود ہی اس بات کی تشریح کرتا ہے۔ رہا عرف، یعنی سیکنڈ ہوسٹل — اس کی تاریخ تسمیہ میرے احاطۂ علم سے باہر ہے۔ ہاں اس قدر ظاہر ہے کہ کالج کے "ہوسٹل روڈ" پر اس کا نمبر دوسرا ہے۔ اور غالباً یہی اس کے عمومی نام (NICK NAME) کی بڑی وجہ ہے۔

حدودِ اربعہ۔ سیکنڈ ہوسٹل کی محل وقوع نہایت اہم اور مرکزیت کا درجہ رکھتی ہے۔ کالج کے قریب، مسجد کے قریب تر ٹینس لان LAWN کے متصل اور دیگر "بازیچۂ اطفال" کے میدانوں اور مرغزاروں کے وسط میں سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اس کے شمال میں خاکی رنگ کا مختصر سا خطہ ہے۔ جس کے آگے فٹ بال گراؤنڈ ہے۔ فٹ بال گراؤنڈ سے پرے ریٹنوں کا آوا نظر پڑتا ہے اور پھر گیہوں کے لہلہاتے کھیت ہیں۔ مشرقی جانب "میتھمیٹکس بلاک" جو ارتقا کی انتہائی منازل طے کرتا ہوا آجکل کالج کے سر پر چڑھا ہے اور جس کی جگہ انگلش لائبریری وغیرہ نے لے لی ہے) اور ٹینس گراؤنڈ ہیں۔ جنوب میں پھر ٹینس لان (TENNIS LAWN) ہیں۔ اور دُور پرے کالج کا مرحوم بجلی گھر جو دارالعلوم کے سگان برحق کی غوغا آرائی کا واحد اڈہ یا اکھاڑہ ہے۔ اس نامراد پاور ہاؤس کے جنوب مشرقی کونے میں جامع دارالعلوم کی شاندار عمارت ہے۔

ہوسٹل کے مغرب میں ایک نالہ بہتا ہے۔ اس کے مغربی ساحل (ساحل ماڑ بار) پر فرسٹ ہوسٹل اور مشرقی کنارے (یعنی ساحل کارومنڈل) پر ہمارا سیکنڈ ہوسٹل واقع ہے۔ نالہ دائمی بھی ہے اور سیلابی بھی! جب کبھی سیلاب آتا ہے تو پانی گرد ونواح کے رقبہ کو زیر آب کر دیتا ہے۔ آب رواں کے رنگ سے ظاہر ہے کہ یہ نالہ دریائے باڑہ کا معاون یا اس کی کوئی شاخ ہے۔ (مصنف بوجہ جغرافیائی بے بضاعتی کے اس کے منبع، سنگم اور دہانہ کے متعلق کچھ عرض

کرنے سے قاصر ہے)۔ جب پانی چڑھتا ہے تو رات کے سکوت اور سناٹے میں ہر دو ہوسٹلوں کے ساحلی باشندے اس کی صبر آزما اور خواب شکن "موسیقی" سے بدرجۂ اتم محفوظ ہوتے ہیں۔ اس نالہ کا بڑا فائدہ آب پاشی اور سیرابی ہے۔ بوجہ تیز رفتاری کے جہاز رانی کے ناقابل ہے۔ نہانے کیلئے شاذ ہی استعمال میں آتا ہے۔ البتہ "فسٹ اپریل" کے دن اگر کالج کا ایک آدھ خوش قسمت فرزند اس میں تیراکی یا "فن شناوری" کی مشق کرتا نظر آجائے تو تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ اس نالے کا مخصوص فائدہ ہے۔ جو کالج کی روایات (TRADITIAN) سے وابستہ چلا آتا ہے۔

سطح اور آب و ہوا ہوسٹل کی اندرونی سطح ہموار اور سرسبز ہے۔ صحنِ ہوسٹل چمنستانِ خوشرنگ کا گہوارہ اور گلہائے رنگا رنگ کا نشیمن ہے۔ آب و ہوا خوشگوار، معتدل اور رومان انگیز ہے۔ یہاں کا ماحول اگر کسی کو بھا جائے تو یہاں سے جانے کا نام نہیں لیتا۔ بلکہ وہیں کا ہوکر رہ جاتا ہے۔

اندرونی خط و خال ہوسٹل کے اندر، ہر چہار طرف کمرے قطار در قطار، ہوسٹل کمپونڈ کی طرف منہ کئے کھڑے ہیں۔ بڑا دروازہ جنوبی سمت کھلتا ہے۔ کمروں کے آگے برآمدہ ہے جس کی وسعت اتنی ہے کہ ایک چارپائی طولاً بچھائی جاسکتی ہے۔ برآمدہ سے آگے بڑھیں تو صحن ہوسٹل ہے۔ اور یہی جگہ ہوسٹل کی تمام سرگرمیوں ACTIVITIES کا مرکز ہے۔ "چند صدیاں" پہلے یہ محض گھانس پھونس کا لہلہاتا چمن تھا۔ مگر موجودہ عہد حکومت میں ہوسٹل میں جہاں اور خوش آیند انقلابات آئے۔ وہاں اس مرغزار یا چراگاہ میں بھی تغیر کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ اینٹو سطی روش کے دو طرفہ پھولوں کی کیاریاں اپنے خوبصورت پودوں کی تراوت اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے مشام جاں کو تازہ اور فضائے ہوسٹل کو معطر کرنے کے شغلِ پسندیدہ میں مصروف ہیں۔

ہوسٹل کے عین مرکز میں ایک عدیم النظیر اور فقید المثال کھمبا ہے۔ اس کا اسفل ترین حصہ اینٹ اور چونے کے ایک مجسمہ میں گم ہے۔ درمیانی حصہ لوہے کا بنا ہوا ہے۔ اور بالائی سرا لکڑی کا ایک لمبوترا سا۔ بھدا، بھونڈا اور بدنما سونٹا ہے۔ ہوسٹل میں ایک اجنبی کی تمام تر توجہات کا مرکز کوئی چیز ہوسکتی ہے تو یہ سہ رنگا اور عجوبۂ روزگار کھمبا ہے، باوجود انتہائی کاوش دماغ کے اس کا منتہائے مطلب THE PURPOSE OF ERECTION ہماری ذہنی صلاحیتوں اور دقت نظر کا رہون منت ہونے سے ہمیشہ مبرا ہی رہا ہے۔ یہ زمانہ ماقبل التاریخ کی نادر روزگار یادگار غالباً اگلے وقتوں میں بطور "گیس بردار" کے استعمال کیجاتی ہوگی۔ تاہم سب سے زیادہ انوکھی بات یہ ہے کہ اس کے لوہے کو اب تک زنگ نہیں لگا اور باد حوادث کے جھونکے اس کے استقلال اور عزم استادگی میں ذرہ بھر فرق بھی رونما کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہم اس کا مفہوم زیادہ توضیح کے ساتھ بیان کرسکنے کی صلاحیت خود میں نہیں پاتے۔ مثل مشہور ہے کھسیانی بلی کھمبا نوچے! — غرض کھمبا کیا ہے۔ ع۔ اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا!

ہوسٹل کے ہر چہار کونوں میں غسلخانے اور پاخانے ہیں۔ پاخانے پہلے پہل دن کے وقت بند رہتے تھے۔

کیونکہ ہوسٹل کے باہر بھی بیت الخلا کا وجود باقی تھا۔ مگر جب سے ادھر تخفیف ہوئی یہاں کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے زمانۂ ماضی میں فینائل کی کمی کے باعث بیت الخلاء کا لیونڈر تمام ہوسٹل کے دماغوں کو معطر کیا کرتا تھا۔ الحمد للہ کہ اب اس نسیم جانفزا کی مہک سے طلبہ کے دماغ قدرے محفوظ ہو گئے ہیں۔ کالج کے ان بیرونی بیت الخلاؤں کی اندرونی دیواروں پر نہایت عجیب وغریب نقشے بنے ہوئے تھے۔ جنہیں دیکھکر بیرونی اصحاب دارالعلوم اسلامیہ کے فرزندان توحید کے فن مصوری اور نقشہ کشی کی داد دئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ ساتھ ہی تشریح طلب امور کی مزید توضیح کیلئے نہایت فصیح وبلیغ عبارات اور پاکیزہ وبرجستہ اشعار درو دیوار بیت الخلا پر کندہ ومنقوش تھے جن سے ان کے مصنفین، مفکرین اور شعراء کے کرام حضرات کے ذوق ادب اور مذاق شعر کا پورا پورا نقشہ آنکھوں تلے کھنچکر رہ جاتا تھا۔ فن بت تراشی کے ایسے نادر و نایاب نمونے غالباً کسی اور جگہ کم ملتے ہونگے۔ اور ہمیں اپنے ایسے اہل قلم اور صاحبدل حضرات پر بجا فخر و ناز تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ پہلے پہل ہوسٹل کے غسلخانوں کی حالت بیت الخلاؤں سے بہتر نہیں تھی۔ موخر الذکر کے فرش وغیرہ پر تو فینائل کا چھڑکاؤ ہوا ہی کرتا تھا۔ لیکن اس عمل صالح کی چنداں اہمیت اول الذکر میں محسوس نہیں کیجاتی تھی۔ ہر غسلخانے میں دو عدد چاٹیاں یا پانی کے بڑے بڑے "مٹکے" ہیں جو ہمیشہ پانی سے بھرے رہتے ہیں۔ پانی نکالنے کیلئے ڈول یا کسی دوسرے برتن کی ضرورت کا احساس ابھی تک اللہ کے کسی بندے کو نہیں ہوا تھا۔ غلیظ اور پلید کوزے یا لوٹے مٹکے میں ڈبو کر کے پانی بے تکلفی سے نکال لیا جاتا تھا اور استنجا یا وضو کرنے کے کام آتا تھا۔ چونکہ بیت الخلا میں ڈھیلے سرے سے مفقود تھے۔ اہالیان ہوسٹل بجائے قضائے حاجت کی جگہ بھی پانی سے استنجا نہ کرتے تو کیا کرتے ؟ — مٹکوں کی بیرونی سطح سرسبز اور لیسدار تھی۔ غسلخانوں کا فرش سمینٹ کا بنا ہوا ہے۔ لیکن یہ بھی بجائے ہموار اور ستھرا ہونے کے لیسدار اور پھسلانے والا تھا۔ پانی کے برتنوں کی بیرونی ہیئت کذائی اور نئے نباتات کے خودرو پودوں کے اُگ آنے کیوجہ سے تھی۔ لیکن فرش کا یہ حلیہ کسی نامعلوم مادۂ حیات کی ریزش کا لازمی نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ ایک بڑے کالج کے ذمہ دار طلبہ سے یہ توقع رکھنا تو ہرگز قابل برداشت نہیں کہ وہ بیت الخلا کا کام غسلخانوں سے لیتے ہوئے اپنے ہم عصروں اور دیگر اصحاب کی زندگی کو معرض خطر میں ڈالنے کا موجب بنیں گے۔ ہمیں سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل جناب پی۔ ٹی صاحب کی ذات بابرکات پہ ہزار فخر و ناز ہے جنکی سعی پیہم اور ان تھک کوششوں نے ان تمام "خوبیوں" کو ایک ایک کرکے دور کیا۔ اور انکے وجود سے ہوسٹل کو نجات دلائی۔ ہمیں ان کے اصلاحی پروگرام پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ ہے۔ اور اگر افسران بالا سے مزید تعاون کی توقع ہوئی تو وہ سیکنڈ ہوسٹل کو ہر لحاظ سے دارالعلوم کے تمام ہوسٹلوں سے انشاء اللہ عمدہ اور پہلے درجہ کا کر دکھائیں گے۔ ہوسٹل کے اس "بڑھاپے" اور ضعیف العمری کے باوجود جو سادگی اور صفائی اس میں پائی جاتی ہے وہ ہمارے ہر دلعزیز سپرنٹنڈنٹ کی لگاتار اور مسلسل جد وجہد کا ثمر ہے !

ہوسٹل کے جنوب مغربی کونے میں ایک پول کھڑا ہے۔ جس کے متوازی ڈنڈے کیساتھ ایک رسی بندھی ہے۔ اس رسی کا نچلا سرا ایک بڑی سی ناشپاتی نما بوری کے منہ کیساتھ بندھا ہے۔ بوری سفید رنگ کے کھردرے کپڑے کی بنی ہوئی ہے جس کے اندر لکڑی کا برادہ یا کپاس بھری ہوتی ہے۔ "نسٹ ایر" کے ایام میں باشندگان ہوسٹل کیلئے یہ تھیلی ایک معمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن دن گزرنے پر تجربہ اور مشاہدہ سکھا دیتے ہیں کہ یہ عاجز کس مپرسی اور مظلوم بوری جناب پی۔ ٹی صاحب کے تنومند اور مضبوط ہاتھوں کے توی اور "البرز شکن" مکوں کا تختہ مشق بنتی ہے۔ اس نرالے پول اور "ناکردہ گناہ" بوری مکا بازی کا اکھاڑہ ہے جس کے ارد گرد سفید رسیاں بندھی ہوتی ہیں۔ جب کبھی مکا بازی (BOXING) کا میچ ہوتا ہے۔ خوب چہل پہل اور گہما گہمی رہتی ہے یہ خصوصیت اور کسی ہوسٹل میں نہیں!

احاطۂ ہوسٹل میں بجائے ایک کے دو باورچی خانے ہیں جس کی وجہ عنقریب بیان کیجائیگی۔ انکا مفصل تذکرہ اور اندرونی کیفیات کا ذکر پھر کبھی سہی ورنہ طوالت کیوجہ سے "دامان خیال ہوسٹل" ہاتھ سے چھوٹ جائیگا۔ ہوسٹل کا ڈائیننگ ہال "کمروں کی شمالی قطار کے وسط میں واقع ہے۔ جسے دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ ایام گذشتہ میں ان دو حصوں کے درمیان ایک سیاہ رنگ کا پردہ حائل ہوتا تھا۔ جواب کَعَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ ہے اور ہوسٹل میں رہنے والی دو قوموں میں (جنکا ذکر عنقریب آنیوالا ہے) پردہ داری اور دوئی کی وہ دیرینہ رسم جاتی رہی ہے — کمرے کافی ہیں۔ کچھ بڑے بعض چھوٹے، چند درمیانے! ڈائیننگ ہال کے ہر دو جانب ایک ایک کمرہ ایسا پایا جاتا ہے جس کا طول تو اچھا خاصا ہے البتہ عرض گز بھر سے کچھ اوپر ہوگا۔ ان دو کمروں کی یہ کیفیت انہیں قبر نما بنانے میں کافی ممد ثابت ہوئی ہے۔ اور ان میں رہتے بھی اکثر مردہ دل قسم کے لوگ ہیں — راقم الحروف کو ایک ایسے کمرے میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے (اور ہو رہا ہے) انکی اندرونی ساخت اور فرش کی بناوٹ سے ظاہر ہے کہ گئے گزرے وقتوں میں یہ کمرے بھی غسلخانے تھے۔ جو بعد ازاں کسی نامعلوم وجہ سے کمروں کی صورت اختیار کر گئے۔ اپنے اس "ارتقا یافتہ غسلخانے" میں ہمنے کئی بار خواب میں یہاں کے رہنے والے لوگوں کے ننگ دھڑنگ بھوت نہاتے اور ناچتے دیکھے ہیں۔ واللہ اعلم!

العرض ہوسٹل کی اندرونی طرز تعمیر اور عجائبات کی ان خصوصیات کو دیکھکر بے اختیار زبان سے نکلتا ہے کہ

ع۔ زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہیئے!

پیداوار - یہ زیادہ تر برساتی مینڈکوں، مچھروں، بھونروں، جھینگروں، کیڑوں، مکوڑوں، سانپوں، بچھوؤں، چھچھوندروں، چھپکلیوں اور کنکھجوروں پر مشتمل ہے۔ بعض پروفیسر صاحبان کا خیال ہے کہ یہاں "شوم شغال" بھی بہت پائے جاتے ہیں۔ بہرحال اس طرف ابھی بہت تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہے۔ نباتاتی اور معدنی پیداوار کچھ خاص قابل ذکر نہیں!

باشندے - سیکنڈ ہوسٹل ایک "انٹرنیشنل" (یعنی انتر جاتی جگڑ بند) ہوسٹل ہے۔ اور پچھلے سات سال تک یہ فخر صرف اسے ہی حاصل رہا ہے۔ بعض فرقہ پرست قسم کے لوگ اسے کبھی "ہندو ہوسٹل" بھی کہدیا کرتے ہیں۔ بہرکیف ہوسٹل دو حصوں (WINGS) میں منقسم ہے۔ مشرقی حصہ میں ہندو جاتی کے سپوت بستے ہیں۔ پرنتو مغربی علاقہ

ؔ معلوم رہے [illegible] ہوسٹل [illegible] سے [illegible] ہیں [illegible] بنی۔ [illegible] اس [illegible] تک [illegible] ہے۔ [illegible]

مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے۔ چونکہ ہندو وارڈ میں سکھ ٹولہ بھی شامل ہے اور دو حصوں کی یہ تقسیم کچھ بہت سخت اور لازمی (HARD AND FAST) نہیں۔ ہوسٹل میں بین الاقوامی فضا کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی اور لازمی امر ہے۔ یہاں کے باشندے آپس میں شیر و شکر گھل مل کر رہنے والے بڑے روادار اور وسیع الظرف ہیں۔ پشاور و صوبہ جات کے از منہ سے آبادی کا غالب حصہ ہنگو کے خوانین کا عنصر رہا ہے۔ آجکل نئی تقسیم کی رو سے آبادی مختلف مقامات سے آئے ہوئے "جلاوطنوں" پر مشتمل ہے۔ غرض ہوسٹل کیا ہے۔ رنگ برنگی پھولوں کا ایک عجیب النوع گلدستہ ہے۔ ایک دارالعلوم کی تعلیم UNIVERSITY EDUCATION کے جو فوائد لازمی طور پر یہاں سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ شاید ہی کسی اور ہوسٹل سے ہو سکتے ہوں لیکن اس آزادیٔ افکار سے ایک نتیجہ ضرور مرتب ہوا ہے۔ یعنی اگر عشاء کے بعد کسی مقیم ہوسٹل کو مسجد میں نماز باجماعت پڑھتے دیر ہو جائے تو اس پر ہوسٹل کے دروازے بدستور بند ہی رہتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت اوقات مطالعہ یا (STUDY HOURS) شروع ہو چکے ہوتے ہیں۔

باشندگان ہوسٹل امن پسند، صلح جو اور صلح کل ہیں۔ آپس میں محبت اور پیار سے رہتے ہیں۔ یہی محبت اور پریم بعض اوقات شکر رنجی کا موجب بنتا ہے۔ جس کی وجہ سے معدودے چند جوتیاں جنبش میں آجاتی ہیں۔ تاہم معاملہ دور دراز تک پہنچنے نہیں پاتا۔ اور بسا اوقات "پنچایت" خود فیصلہ کرا دیتی ہے۔ وحشیانہ کشتی جو تم بیزار کے ناخوشگوار حادثات شاذ ہی رونما ہوتے ہیں۔

سیکنڈ ہوسٹل گزشتہ چند ہی ایام میں کافی بدل چکا ہے۔ تاہم ابھی مزید تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس کے بہی خواہ دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

ع۔ خزاں کے بعد شاید اس چمن میں پھر بہار آئے!

آخر میں ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہوسٹل مذکور دارالعلوم کے ارتقاء پذیر عناصر میں سے ایک اہم عنصر ہے۔ اس کی بابت جو کچھ سطور مافوق میں اشارہ کیا گیا ہے۔ محض محبت اور بے اختیاری شوق کے جذبات کے ماتحت عرض کیا گیا ہے۔ اس میں شکایت اور نفرت و حقارت کا ایک شائبہ تک بھی موجود نہیں۔ ؎

کہہ گئیں راز محبت پردہ داری ہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں! ......

"حسن ابن سعید"
(سٹوڈینٹ آف ایگریکلچر)

تاثّرات

تم کو ہماری چاہ نہیں، ہم کو تمہاری چاہ ہے
ناز و نیاز میں اسی طور سے کچھ نباہ ہے

خشک ہوئی ہے چشمِ تر، پھکتا ہے سینہ و جگر
ضبط ہمارا ضبط ہے، آہ ہماری آہ ہے

تیرے خرامِ ناز سے، تیرے خیالِ خام سے
دنیائے رنگ و بو بسی، دنیائے دل تباہ ہے

ہوش میں آ گئے تھے ہم، ہوش سے جا چکے ہیں ہم
وہ بھی تری نگاہ تھی، یہ بھی تری نگاہ ہے

سجدۂ خانۂ خدا، سجدۂ سنگ بتکدہ
کونسا وہ ثواب ہے؟ کونسا یہ گناہ ہے؟

ذوقِ نظارہ خود بخود محوِ نظارہ ہو گیا
کس کی حریمِ ناز ہے؟ کس کی یہ جلوہ گاہ ہے؟

عشقِ خجستہ پا سنبھل، دیکھ کے راہ اپنی چل
سجدوں کے گل بکھیر دے، حسن کی بارگاہ ہے!

احسنِ خستہ گرچہ ہے فقر منش نحیف حال
عشق کی کائنات کا بندۂ بادشاہ ہے!!

منظور احسن۔ بی۔ اے۔ (آنرز)

تندرستی ہزار نعمت ہے

یوں تو یہ ضرب المثل ہر کہ ومہ کے زبان زد ہے لیکن اس کی حقیقت کو سمجھنے کا بہت کم ہی لوگوں کو اتفاق ہوا ہوگا۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اگر دنیا کی تمام نعمتیں، ایک طرف رکھ دی جائیں اور دوسری طرف صرف تندرستی ہو اور پھر اہل الرائے اصحاب کو کسی ایک کے انتخاب کا موقعہ دیا جائے تو ان میں سے ہر ایک تندرستی کو ترجیح دیگا۔ کیونکہ تندرستی سی بیش بہا نعمت چیز اور کیا ہوسکتی ہے۔ انسانیت کی تکمیل اس وقت ہی ہوسکتی ہے جب انسان کا جسم اور روح دونوں تندرست ہوں اور یہ تب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب سوسائٹی کا ہر فرد اپنے اندر قوت عمل پیدا کرلے۔ دونوں میں سے ایک کی کمی انسان کو درجۂ انسانیت سے گرا دیتی ہے کشاکش حیات میں یہ بات آئے دن دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک تندرست اور توانا انسان برائیوں سے دامن کو بچا بچا کے رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جسم بنانے کو اسے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔ اسلئے اسے چاق وچوبند رکھنے کی وہ ہمہ تن کوشش کرتا ہے۔ برعکس اس کے ایک نحیف جسم انسان کا برائیوں میں پھنس جانیکا ہمیشہ کھٹکا رہتا ہے۔ آج اس خیال سے کہ کل کو وہ توبہ کرلیگا کسی فعل بد کا مرتکب ہوتا ہے۔ لیکن اسے اس امر کا احساس ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ اس طرح اپنے جسم کو تباہی کے گڑھے کی جانب دھکیل رہا ہے۔ جس کا خمیازہ نہ صرف اسے ہی اٹھانا پڑیگا۔ بلکہ اس کی قوم اور اسکی نسل بھی اس کے اثر بد سے نہیں بچ سکیں گی۔

مختلف قوموں کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جبتک کسی قوم کی جسمانی اور اخلاقی حالت اچھی رہی۔ وہ قوم نہ صرف آزادی کی گود میں کھیلی۔ بلکہ اور نحیف قوموں پر بھی اسی کا راج رہا۔ لیکن جونہی اس قوم کے اشخاص کی صحت جواب دینے لگی وہ قوم دیکھتے ہی دیکھتے تنزل کے گڑھے میں جا گری۔ اس مثال سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ قوم کی جسمانی حالت اس کے افراد کی جسمانی تنومندی اور طاقت کی مرہون منت ہے۔ کیونکہ قوم کی تشکیل افراد سے ہوا کرتی ہے۔ افراد کی انفرادی طاقت کے یکجا ہونے سے قوم کا طاقتور ہونا ایک لازمی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص کے اپنی صحت سے لاپرواہی برتنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ برسوں کے ایسے اثرات کے بعد ملک اور قوم کی حالت متغیر ہوجاتی ہے۔ طاقت اور مرفع الحالی کی جگہ غربت و افلاس بلائیں لینے لگتی ہے اور ارتقا کی منزلیں تنزل میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔

کسی چیز کے تعمیری مدارج یا کسی قوم کی تشکیلی منازل طے کرنے کو بہت زمانہ درکار ہوتا ہے۔ لیکن ایک بنی بنائی عمارت یا ایک ترقی یافتہ قوم کے منہدم کرنے کو تھوڑا سا ہی وقت چاہیئے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی کھلی مثال ہمیں صوبہ سرحد میں ہی مل سکتی ہے۔ سنہ ۱۸۹۷ء میں اس صوبے کے طلباء کی صحت نہایت ہی اچھی ہوا کرتی تھی۔ اس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ اس زمانے میں سرحدی لوگوں کی صحت ضرب المثل ہوچکی تھی لیکن آج سنہ ۱۹۴۱ء میں

حالت نہایت ہی مایوس کن ہے نہ صرف طلبار کی جسمانی حالت خراب ہے، بلکہ عوام میں بھی صحت کا معیار بہت گر گیا ہے ۔ ۱۹۲۲ء میں
نعینداردہ کالج لائلپور کے طلبا یونیورسٹی فٹ بال میچ کھیلنے کیلئے جب پشاور آئے تو ہمارے طلبا کو دیکھکر مجھ سے یہ کہتے ہوئے نہ رکے
کہ پشاور پہنچنے سے پیشتر ہمیں یہ فکر لاحق ہو رہی تھی کہ پشاور کے تمام طلبا ہم سے کئی گنا جسیم اور طاقتور ہونگے۔ لیکن یہاں آکر ہمنے
رنگ بالکل بدلا ہوا پایا۔ انہی دنوں پنڈت مالویہ اور ملک لال خان بھی کالج کی سیر کو آئے۔ بس یہی جھٹ پٹے کا وقت ہوگا کالج
دیکھنے میں انہیں کچھ ایسا لطف آیا کہ عش عش کر اٹھے۔ کالج کے محل وقوع اور آب و ہوا کو انہوں نے بار بار سراہا۔ لیکن اتفاق سے
جس کالج ہاسٹل کو وہ دیکھنے گئے وہاں چند معمولی قد و قامت کے طلبار کو ہی دیکھنے پائے۔ انہوں نے اس امر پر نہایت افسوس
ظاہر کیا کہ ایسے صحت افزا مقام پر ایسے نحیف جسم طلبا دیکھنے میں آئیں۔ تاہم مجھے اس امر کا اب بھی یقین ہے کہ اگر یہ تمام طلبا کو
دیکھ پاتے تو وہ ایسے ریمارکس ہمارے کالج کے متعلق کبھی پاس نہ کرتے۔ رفتار زمانہ اس امر کی مقتضی ہے کہ بزرگان و جوانان
قوم ملک کے اس تنزل سے سبق حاصل کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح شروع میں انگریزی تعلیم کے پرہیز نے انہیں نقصان پہنچایا۔
اسی طرح صحت کے متعلق جو تصور ابتک باقی ہے وہ بھی ہاتھ سے کھو بیٹھیں۔ اب میں مضمون کے باقی حصے میں اس امر کی تشریح
کرونگا کہ صحت جسمانی کے حصول کیلئے کن اسباب کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اور کن کن بے قاعدگیوں سے صحت جسمانی کا
ستیاناس ہوتا ہے۔

ہر ایک طالب علم کا فرض ہے کہ جو جسمانی حالت اسے والدین سے ورثے میں ملی ہے اس میں ایک گونہ اضافہ کرنے کی
کوشش کرے۔ ذہنی اور دماغی تربیت کیلئے جس طرح ابتدائی جماعتوں سے لیکر اعلے پیمانے کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔
بعینہٖ اسی طرح ورزش اور کھیل جسمانی تربیت کے جزو لاینفک ہیں۔ تعلیم کی اعلیٰ ڈگریاں لینے کو تو برسوں مغز خوری کیجائے
لیکن جسم کی تندرستی میں غفلت اختیار کیجائے۔ جسمانی تندرستی کا فکر لامحالہ ہر شخص کو ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس کے حصول میں
بیقاعدگی کرتا ہے۔ اس مقصد کیلئے روزانہ ورزش نہایت ضروری ہے۔ اور لبسا اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جسمانی
صحت ورزش کے علاوہ اور ذرائع سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر والدین کی بدنی تندرستی ان کی اولاد کو بھی ویسا ہی
تنومند اور مضبوط بنا دیتی ہے۔ جو طلبا تعلیم کے ابتدا ہی سے ورزش سے بھاگتے ہیں۔ وہ جسم کو آئندہ کسی طور اچھی حالت میں نہیں
رکھ سکتے۔ اور پھر آجکل کی تعلیم تو خصوصاً اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے تک نہ صرف جسمانی بلکہ دماغی قویٰ کے بخیئے ادھیڑ کر
رکھ دیتی ہے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے نکلے ہوئے طلبار کی جسمانی کمزوری نکبت کو دیکھکر ملک کے رہنماؤں نے
بیسیوں ترکیبیں نکالیں۔ لیکن قوم میں قبولیت کا عنصر مفقود ہونے کیوجہ سے یہ سب دھری کی دھری رہ گئیں۔ ہندو رہنماؤں کی آنکھوں
میں ان کی جسمانی کمزوری ابتک ایک کھٹکتا خار ہے۔ وہ بار بار اپنی قوم کو یہی کہتے آتے ہیں کہ اگر دماغی ترقی میں تم آسمان کے
تارے ہی کیوں نہ بنجاؤ۔ جبتک نوجوانان قوم کی صحت جسمانی نہ سدھر جائے گی۔ تم اپنے خاندان۔ اپنی قوم اور اپنے وطن کی خدمت
نہیں کر سکتے۔ ان کا اس ناقوس بیداری کے بجانے سے اتنا ضرور ہوا کہ ہندو نوجوان ہر جگہ جسمانی ارتقا کی طرف متوجہ

ہو رہے ہیں۔ لیکن افسوس کہ مسلمان نوجوان اس بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ تاریخ اس حقیقت کا بار بار اعادہ کر رہی ہے کہ جبتک کسی قوم سے مشقت اور محنت کی عادت نہ چلی گئی وہ برسر اقتدار رہی۔ اور جب اس پر کاہلی اور آرام طلبی چھا گئی۔ وہ قوم بالکل تباہ ہو گئی۔ یہی حالت ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کی ہو رہی ہے۔ اگر اس کا تدارک جلد نہ کیا گیا تو مسلمانوں کے جسمانی ارتقاء کا بحیثیت مجموعی وہی حال ہوگا جو کہ ہمیں تعلیم جدید کے دیر سے شروع کرنے پر بھگتنا پڑا۔

عصر حاضر کے رنگین مزاج نوجوانوں کے نزدیک خوبصورتی صرف ویزلینوں۔ لونڈروں اور دوسرے مصنوعی طریقوں سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے حالانکہ ایک نوجوان کی خوبصورتی اس کی صحت میں مضمر ہے۔ روزمرہ کی اس عارضی خوشنمائی سے کوئی چنداں فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ بناؤ سنگار صنف نازک کا ہی خاصہ ہوا کرتا ہے۔ ایک نوجوان کی خوبصورتی اس کے خون کی رفتار پر منحصر ہوا کرتی ہے جو اس کی رگوں میں گردش کرتا ہے۔ خواہ وہ سیاہ جلد کے اندر ہو یا سفید جلد کے اندر رنگت کا سیاہ یا سفید ہونا خوبصورتی کا معیار ہرگز نہیں ہو سکتا۔

زمانہ تعلیم میں طالب علم اگر کوئی باقاعدگی اپنے اندر پیدا نہ کر سکے تو وہ اس لاپرواہی کا نتیجہ اس وقت بھگتے گا جب وہ کل کو بچوں کا باپ ہو جائیگا۔ اس سے یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے بچوں کو صحت اور تندرستی کی کماحقہ تعلیم دے سکے۔ اس قسم کے لوگ اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔ اوروں کے آگے تو پند و نصائح کے پل باندھتے ہیں۔ لیکن خود ان میں سے ایک پر کاربند نہیں ہوتے۔ یہی حال ہمارے ان نوجوان مقرروں کا ہوتا ہے جو کتابوں اور رسالوں کو کیڑے کی طرح چاٹ کر ایک فصیح و بلیغ تقریر تیار کرتے ہیں۔ اور تحسین و آفرین کے نعروں سے داد لیتے ہیں۔ ان کی مثال بعینہ اس کی مصداق ہے کہ اوروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت۔ بقول شاعر

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و ممبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کارے دیگر می کنند

کسی مقرر کا بھرے مجمع میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا اور خود اپنے دل میں ان پر یقین نہ رکھنا عوام کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ جبتک نوجوانوں میں عمل کی سپرٹ پیدا نہ ہو قومی ترقی ناممکن ہے۔ زبانی جمع خرچ مفید ثابت ہونے کی بجائے الٹا نقصان پہنچاتے ہیں ذیل کی حکایت یہ ظاہر کرتی ہے کہ کس طرح ایک باعمل انسان کی نصیحت پر اثر ہوا کرتی ہے:۔

ایک شخص اپنے لڑکے کو جو ابھی نابالغ تھا کسی فقیر کے پاس اس غرض سے لے گیا کہ شاید وہ فقیر صاحب کی نصیحت سے تمباکو نوشی کی بری عادت چھوڑ دے۔ فقیر نے کہا ایک ہفتہ کے بعد آنا میں انشاء اللہ اس سے تمباکو پینا چھڑوا دونگا۔ چنانچہ ہفتہ گزرنے پر وہ اس کے پاس اپنا لڑکا لے گیا۔ فقیر نے تمباکو نوشی کے برے نتائج اس بچے کے ایسے ذہن نشین کرائے کہ اسنے اسی وقت اس بری عادت سے توبہ کر لی۔ اس لڑکے کے باپ نے دوسرے دن فقیر سے یہ پوچھا کہ آپ نے پہلے ہی روز نصیحت کیوں نہ کی۔ فقیر نے جواب دیا اس وقت تک چونکہ میں خود اس عادت بد میں گرفتار تھا۔ مجھے اسے نصیحت کرنے میں

قدسے شرم محسوس ہوتی تھی۔ اسی اصول کے تحت ہمیں چاہیئے۔ خود اچھے اخلاق کا نمونہ بنیں اور پھر کہیں جاکر اوروں کو بھی وعظ و نصیحت کرنے کے اہل ہوں :-

ماسٹر سنڈے خان

حسین ارادے

انوکھی تمنّائیں دل میں بسائیں
نئی مورتوں سے یہ مندر سجائیں

یہ ٹھنڈی ہوائیں یہ اودی گھٹائیں
بہت آج اُکسا رہی ہیں فضائیں

گناہوں کی دُنیا سے اُکتا چلے ہیں
کہیں چل کے اِک اور بستی بسائیں

ہر اک جا پہ تذکرے ہو رہے ہیں
مجھے لے اُڑی ہیں جنوں کی ہوائیں

کسی دن خودی میں الاپے تھے نغمے
ابھی گونجتی ہیں اُنہی کی صدائیں

ہماری کہانی بڑی مختصر ہے
جو سننا نہ چاہیں اُنہیں کیا سنائیں

نذیر میرزا برلاس

غریب کسان

تین چوتھائی رات گزر چکی تھی۔ ساری کائنات پر ایک گہرا سکوت طاری تھا۔ گلابی جاڑے کی آخری ہوائیں برف سے ڈھکی زمین سے مس ہوکر کچھ ایسی تیز و تند ہوگئی تھیں کہ سرزنی کے مارے خون منجمد ہو رہا تھا۔ چاندنی میں کھیت پر برف کی دودھیا چادر ایک جھیل کا فریب دے رہی تھی۔ جس پر ہوا کی بیساختہ اٹکھیلیوں سے لہریں پیدا ہو ہو کر ایسے معدوم ہو جاتی تھیں جس طرح کسی دوشیزہ کے مرمریں پاؤں کی پیہم ٹھوکروں سے سطح آب پر ایک تلاطم سا بپا ہو گیا ہو۔ نوروز پیال سے چکنے بستر پر کروٹیں بدل بدل کر کھیت کی رکھوالی کر رہا تھا۔ اس کی مفلوک الحالی ایک مہیب دیو کی طرح اسے ڈرا رہی تھی۔ اس کا بیٹا شمروز جوان ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی تک اس کی شادی نہ ہوئی تھی اور ہوتی بھی کیسے جبکہ وہ خود نانِ شبینہ تک کا محتاج تھا۔ ابھی کل ہی اس کی لڑکی سکینہ کنگنوں کیلئے رو رہی تھی لیکن نوروز جانتا تھا کہ سکینہ کی آرزو کبھی بھی شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکتی۔

غریب کسانوں پر کیا گزرتی ہے۔ اس کا اندازہ کرنا ہمارے لئے تقریباً ناممکن ہے۔ آبادیوں سے دور ویرانوں میں وہ موسموں کے تغیر اور زمانے کے حوادثات کی آماجگاہ بنتے ہیں۔ انکی امیدیں بندھتی ہیں اور بندھ بندھ کر ٹوٹتی ہیں اور ٹوٹ ٹوٹ کر درد میں تبدیل ہوتی ہیں۔ ان کی بیتاب تمنائیں بیقرار پہلو میں اضطراب پیدا کرتی ہیں لیکن کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ نوروز کو اچانک باہر پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ فوراً جونہی باہر نکلا تو اسے اپنے لڑکے شمروز نے آگے بڑھتے ہوئے نہایت غمگین لہجے میں کہا۔ "سکینہ سخت بیمار ہے" شمروز نے گھبراہٹ کے لہجے میں کیا کیا تکلیف ہے" نوروز نے پوچھا۔ "کہتی ہے پسلیوں میں سخت درد ہو رہا ہے" شمروز نے جواب دیا۔ اچھا تم صبح تک یہیں ٹھہرو۔ میں گھر جاتا ہوں۔ نوروز نے متفکرانہ انداز سے کہا اور گھر کو چل دیا۔

(۲)

سکینہ چارپائی پر پڑی بخار سے انگارے کی طرح تپ رہی تھی۔ نوروز کیا کر سکتا تھا سکینہ کو خدا کے سہارے چھوڑ کر سر جھکائے اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ پو پھٹنے کے قریب تھی۔ سکینہ نے ایک ہی مرتبہ آنکھیں کھولیں اور اپنے ماں باپ کو دیکھا جو اپنی بیکسی اور سکینہ کی دردناک حالت پر آنسو بہا رہے تھے اور پھر ہمیشہ کیلئے بند کر دیں ..... ان فنا کے شیشوں میں سے صرف ایک مرتعش شعاع نکلی اور پھر ہمیشہ کیلئے ظلمتِ مرگ میں زائل ہو گئی۔

آہ! اے فطرت کے دست تظلم سے برباد شدہ پیکر رنگیں کیا تیرا پیکر حسن خاموش اور ساکت ہو جانے کیلئے بنا تھا۔ اے چیستانِ ہستی کون جانتا ہے کہ تیری اس حیاتِ مختصر کے کیا معنی تھے کسے معلوم تھا کہ تو اس فنا زارِ عالم میں

کیا پیام لیکر آئی تھی!۔

نوروز سکینہ کی افسوسناک موت پر آنسو بہارہا تھا کہ اسے باہر شمروز کے شور کی آواز سنائی دی۔ یہ گھبرا کر باہر نکلا تو دیکھا کہ نمبردار صاحب بمعہ دو پیادوں کے غصے میں لال پیلے آنکھیں نکالے کھڑے ہیں۔

کیوں بے نوروز تجھے اس نالائق کو انسانیت نہیں سکھائی" نمبردار نے تحکمانہ لہجے میں کہا حضور نا سمجھی سے گستاخی ہوگئی ہوگی اب کی معاف فرمایئے۔ آئندہ خیال کریگا" نوروز نے التجا کر کہا۔ اچھا باتیں پھر بنانا اب یہ بتا کہ لگان دیگا یا نہیں؟" نمبردار نے نوروز کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا" ابھی ابھی میری لڑکی انتقال کر گئی ہے اس کی تجہیز و تکفین تک کیلئے پھوٹی کوڑی پاس نہیں لگان کیسے ادا کر سکتا ہوں حضور۔ پیسہ ہاتھ میں آنے پر کوڑی کوڑی چکادونگا نوروز نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

شمروز نے بہن کی موت کی خبر سنی تو اس پر غم واندوہ کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"یہ بڑا خبیث سیدھے ہاتھوں لگان نہیں دینے کا" نمبردار نے غصہ سے دانت پیستے ہوئے کہا۔ نوروز سوچ رہا تھا کہ اے خدا کیا تیری دنیا میں ایسے ظالم بھی بستے ہیں۔ شمروز کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔ "منہ کو لگام دو ورنہ ابھی گدی سے زبان کھینچ لونگا" اس نے غصہ سے بے قابو ہو کر کہا۔

دیکھتے کیا ہو اسے گستاخی کی ایسی سزا دو کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے" نمبردار نے پیادوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا دیکھتے ہی شمروز پر ڈنڈوں کی بارش ہونے لگی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن دو کے مقابلے میں ایک اور وہ بھی نہتہ کیا کر سکتا تھا۔ نوروز بچانے کیلئے بڑھا تو اس پر بھی ڈنڈے برسنے لگے۔

دونوں کے سر پھٹ گئے۔ خون کے فوارے پھوٹ نکلے۔ باپ بیٹا ایک دلدوز چیخ کے ساتھ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ شمروز کی عورت چیخیں سنکر باہر نکلی تو اس سے یہ روح فرسا منظر نہ دیکھا جا سکا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور دھڑام سے زمین پر گر گئی۔

عنایت اللہ نوشہروی۔ سالِ چہارم

شاعر اور ندّی

دُنیا کتنی رنگین کتنی پرکشش اور کتنی پُرفریب ہے! شاید اسی لئے نہیں ... نہیں یقیناً اسی لئے آفتاب کا منور چہرہ غم جدائی سے پیلا ہو رہا ہے، وہ اس حسین دنیا کا آخری دیدار کن حسرت بھری، تھرتھراتی نظروں سے کر رہا ہے۔ کیا اسے دنیا سے محبت ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ کس کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے؟ ......

اُف یہ کیسی پُرسوز آواز ہے۔ یہ ندی کیوں .... ؟ شاعر اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا اپنے دل سے باتیں کر رہا تھا شام کا سہانا وقت تھا، پرندے خوشی خوشی اپنے اپنے آشیانوں کو جا رہے تھے۔ لیکن کتنے نادان کتنے بے خبر اور کتنے سادہ ہیں! انہیں کیا معلوم صیاد تاک میں بیٹھا ہے۔ انہیں کیا خبر کہ ان کے نازک پر پنجۂ صیاد میں بے سود پھڑپھڑائیں گے اور پھر... قفس ..... دُور بہت دُور کوئل درد بھرے لہجے میں کسی گذرے ہوئے افسانے کو دہرا رہی تھی۔ ندی کی بیتاب لہریں ایک پُرسوز نغمہ الاپ رہی تھیں۔ شاعر انہیں سن کر بے قرار ہوگیا۔ وہ اب خاموش تھا۔ اس کے ساتھ ساری فضا بھی خاموش تھی، ہاں کبھی کبھی کوئل کی درد بھری آواز پردۂ خاموشی کو چیرتی ہوئی شاعر کے نازک دل کو آ کر لگتی اور وہ مضطر اور بے قرار ہو جاتا .....

شاعر ندی کے قریب آ چکا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ کبھی کبھی پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا، پھر سر جھکا لیتا۔ ندی کی لہریں اٹھ اٹھ کے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھیں جیسے کسی کا انتظار ہو۔ ایک لہر اٹھی اس نے شاعر کو دیکھ پایا۔ اس نے دوسری لہر سے سرگوشی کی وہ چونکی اس نے تیسری سے سر سے سر ملا کر کچھ کہا۔ سب ندی کو خبر ہوگئی اور لہریں آپس میں سر ملا ملا کر سرگوشیاں کرنے لگیں۔ شاعر نے ان کا اضطراب دیکھا اور ندی سے کہا

شاعر:۔ معاف کرنا۔ میرے آنے سے تمہیں تکلیف ہوئی

ندّی:۔ نہیں نہیں کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔

شاعر:۔ ایک بات پوچھوں بتاؤ گی ؟

ندی:۔ . . . .

شاعر:۔ تم خاموش کیوں ہوگئیں؟ میں درخواست کرتا کہ میری بات کا جواب دو۔

ندی:۔ کہو

شاعر:۔ تم اس قدر پُردرد گیت کیوں گاتی ہو۔ کیا کسی کی جستجو ہے؟ مجھ سے راز مت چھپانا۔ سچ سچ کہنا۔ تمہیں میری بیقراری کی قسم سچ سچ کہنا۔

ندی:۔ تم کون ہو؟ کیوں پریشان ہو۔ تمہیں غم زدوں سے ہمدردی کیوں ہے۔ ہاں میں سمجھ گئی تم شاعر ہو نا ؟ ۔

میرا افسانہ سننا چاہتے ہو۔ اچھا سنو۔ میں سنگدلوں کے دیس سے آئی ہوں۔ لیکن میں سنگدل نہیں۔ مجھے جستجو ہے کس کی؟ یہ معلوم نہیں میں ورد سے بیتاب ہوں لیکن نہیں جانتی کیوں؟ ہاں دیکھو میرا ہمراز آتا ہے۔ اسے آنے دو پھر سناؤنگی۔

شاعر نے پلٹ کر دیکھا۔ دور پہاڑ کی چوٹی پر چاند نمودار ہوا۔ اس نے آدھی نقاب الٹ رکھی تھی۔ ندی چاند کو چاند ندی کو دیکھکر مسکرایا۔ چاند نے پوری نقاب الٹ دی۔ کالے کالے بادلوں نے چاند کے گرد ہالہ کرلیا۔ اس کے سینہ پر ایک داغ نمایاں تھا چاند مسکایا۔ یکایک منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور فوراً نقاب کھینچ لی۔ شاعر پھر ندی کی طرف متوجہ ہوا۔

شاعر:- کیا یہ تمہارا ہمراز ہے؟

ندی:- ہاں۔

شاعر:- پریشان کیوں ہوگیا؟

ندی:- شاید تمہیں دیکھ کر

شاعر:- کیوں؟

ندی:- اسے آجانے دو۔ خود بتا دے گا۔ چاند پہاڑ سے بہت اونچا ہوچکا تھا اور اس کی ہلکی ہلکی شعاعیں ندی پر پڑنے لگی تھیں ندی کے رخسار خوشی سے سرخ ہو رہے تھے۔ اب چاند پورا کا پورا ندی کے سینے میں آچھپا تھا ندی جھوم رہی تھی۔ چاند نے ذرا سا پردہ ہٹایا اور ندی سے پوچھا۔

چاند:- یہ کون ہیں؟

ندی:- شاعر

چاند:- کیوں آئے ہیں

ندی:- درد دل رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ میرا ہمراز بننا چاہتا ہے۔ میرا افسانہ سننا چاہتا ہے

چاند:- انہیں ہرگز نہ بتانا

شاعر:- کیوں

چاند جلدی جلدی اپنے داغ کو چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور ندی پر آنکھیں گاڑ دیں۔ ندی سہم گئی۔ پھر بے توجہی سے کہنے لگا۔

چاند:- انہیں راز ہرگز ہرگز نہ بتانا۔ میں شاعر لوگوں سے واقف ہوں۔ یہ راز کو افشا کر دیتے ہیں۔ مجھے رسوا کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ تم انکے فریب میں نہ آنا۔ رسوا کردیں گے۔

شاعر کے دل پر مایوسی کی گھٹائیں چھاگئیں۔ اس نے آہ سرد بھر کر سر جھکا لیا۔ ننھے ننھے ستارے ایک دوسرے کو آنکھ مار مار کر اشارے کرنے لگے۔ وہ خوش تھے۔ آنکھوں میں شوخی بھری تھی۔ وہ بہت خوش تھے نہ جانے کیوں!

بہت دیر تک خاموشی رہی۔ سخت خاموشی۔ شاعر اٹھا۔ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ اتنے میں صدائے اللہ اکبر آئی۔ سب کائنات لرز گئی۔ چاند کا چہرہ فق ہوگیا۔ تاروں نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔ شاعر چونکا۔ کانپا۔ لڑکھڑایا۔ سنبھلا اور یہ کہتا ہوا آواز کی طرف چلنے لگا۔

"سب تیری ہی جستجو کرتے ہیں"

محمد سلیم اختر فسٹ ایئر

جورِ احباب کا شکوہ کروں بیگانے سے؟
جستجو خاک ہو کعبے کی صنم خانے سے!

آتشِ عشق سے تا سوزِ رقابت نہ جلے
شمع کا راز نہ کہدے کوئی پروانے سے

گو کہ مدہوش ہیں، پر دل پہ ہے قابو اپنا
اُٹھ کے کعبے کو چلے جائینگے بتخانے سے

شمع خود جل کے سبق دیتی ہے جانسوزی کا
خلق ناحق کا گلہ کرتی ہے پروانے سے

دیکھئے اجڑے یہ کب بزمِ صبوحی اپنی
جھومتے نکلے تھے کل شیخ جی میخانے سے

جام اپنا تو ہے مہبطِ کئی خمخانوں کا
چھلکی ہو گی کسی کم ظرف کے پیمانے سے"

ناصبوری کی عطا اور کی تلقینِ شکیب!
کام فرزانے کا لیتے ہیں وہ دیوانے سے

ذرّہ ذرّہ ہے بنا جلوہ گہہ حسنِ قدیم
کیا غرض ہمکو ہو کعبے سے یا بتخانے سے

"صفتِ عود ہمہ سوختن و گرم رویست"
کیا ہو پروانے کو غم شمع کے بجھ جانے سے

ہم کو ہے نشۂ بے رنگ سے مطلب اختؔر
چشمِ ساقی سے، نہ شیشے سے، نہ پیمانے سے

عبدالمجید اختؔر
سال سوم

جستجو

جب مجھے اپنے عزیز و اقارب نہلا دھلا کر قبر کی خاموش تاریکی میں اکیلا چھوڑ گئے تو تھوڑے ہی وقفے کے بعد دو فرشتے مہیب شکلوں والے میرے بچپن کے خیال سے بھی زیادہ مہیب بھاری بھاری گرز اٹھائے ہوئے آنازل ہوئے۔ انکی ڈراونی شکلیں دیکھکر میرے وہ تمام خیالات رفوچکر ہوگئے جو کہ میں اپنی دنیا میں سوچا کرتا تھا کہ میں خدا سے کہونگا کہ اگر تو مجھ گنہگار کو بخشے تو پھر تو رحمٰن بھی ہے رحیم بھی ہے اور اگر صرف اپنے نیک بندوں کو بخشے تو پھر کونسی مہربانی ہوئی۔

ان فرشتوں نے چند سوالات پوچھنے کے بعد اپنے وزنی گرزوں کو بلند کیا۔ ان کے اٹھانے کے وقت ایسی آواز آئی کہ آندھی اور سخت آندھی آرہی ہے اور دنیا کے نظام کو بدل دینا چاہتی ہے۔ انہوں نے گرزوں کو بلند کرکے مجھ پر آنکھیں ڈالی ہی تھیں کہ اضطراب میں میرے منہ سے یہ التجا نکل گئی کہ اے خدائے ذوالجلال والاکرام تو مجھ پر رحم کر میرا تو صرف اتنا ہی قصور ہے کہ میں نے دنیا میں محبت ...... بس بس یہ لغو بکواس سنکر ہم تھک گئے اپنی محبت کو ٹھوس شکل میں پیش کر! جا تجھے سات دن کی مہلت ہے۔ یکایک میں نے اپنے آپکو اس رنگیلی دنیا میں پایا میں حیران و پریشان تھا کہ کیا کروں کدھر جاؤں، آخر اپنی تلاش شروع کی، انگلستان کی مہ جبینوں کی نیلی آنکھوں میں جنمیں آسمان کا رنگ چھلکتا تھا اپنی محبت کو ڈھونڈا۔ مگر وہ اس چیز سے مبرّا تھیں۔ پیرس کی نوخیز لڑکیوں کے عشوہ و انداز میں جنہیں دیکھکر زاہد صد سالہ بھی توبہ توڑ لے دیکھا۔ مگر وہ خود اسی دُرِّ نایاب کیلئے مضطرب نظر آتی تھیں۔ مصری دوشیزاؤں کے سیاہ ناگن جیسے بالوں میں تلاش کیا مگر وہ خود اس موتی کو اپنے بالوں کی زینت بنانا چاہتی تھیں۔ ایران کے فتنہ انگیز حسن میں بھی جھک جھک کر دیکھا لیکن اس میں وہ شیرینی کہاں ۔ تھک کر ہار گیا۔ اپنے وطن عزیز ہندوستان کو آیا۔ چند گھنٹے ہی میری تقدیر کے فیصلے کیلئے باقی تھے گرتا پڑتا جا رہا تھا کہ شور و غوغا کی آواز کان میں پڑی۔ کھڑکی سے جو جھانک کر دیکھا تو چند دیہاتی لڑکیاں ایک لڑکی کے گرد بیٹھی تھیں۔ وہ لڑکی کیا تھی ایک سندر مورت تھی جسکی سادگی پر عشوۂ ترکانہ دار بیا رے۔ وہ لڑکی نہیں حسن کی دیوی غزالی آنکھوں میں کاجل لگائے سج دھج کر چہرے کو نیچے کئے ہوئے بیٹھی تھی۔ اسکی نازک و صبیح پیشانی پر صندل کا قشقہ ایسا بھلا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک نازک گلاب کے پھول پر تنبری۔ لڑکیاں اس سے اٹھکیلیاں کرتیں تو اس کی نازک پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ دل میں خوش تھی کہ مجھے بیاہ دیوے ہیں۔ لیکن شرم بھی سادگی میں شامل تھی۔

چند منٹوں کیلئے میں اپنی حالت بھول گیا۔ اتنے ہی میں خبر آئی کہ وہ مر گیا۔ وہ کون ؟ اضطراب میں لڑکی کے منہ سے نکل گیا۔ جواب ملا تیرا خاوند۔ وہ دلہن ہوگئی۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر رو نہ سکتی تھی۔ اسی کشمکش میں اس کی سرمیلی آنکھوں کے کناروں پر آنسو۔ آنسو نہیں آنے والے میٹھے دنوں کی میٹھی یاد کے موتی ۔ چھلکے اور شرماتے ہوئے گرے۔ میں اسی تاک میں تھا انکو ہاتھوں ہاتھ لیا اور خدا کے حضور میں پیش کیا۔ خدا نے کہا جاؤ تجھ پر جنت کے دروازے کھلے ہیں ؛

مصطفٰے کمال جوہر

سیکنڈ ایر

په ښتنو خبری مونږ نه شرم ښکاری
نزدی حده قومیت ځموږه مردے
خپل وطن او ژبه پری نه دی افغانه
چه هم دغه د قومی ترقی جرده

خیبر

طالب علم ایډیټر :- شوکت الله اکبر

نګران :- مولنا عبدالرحیم صاحب ایم-اے- ایچ- پی

جلد ۲۸ نمبر ۱

فهرست مضامین

کورنۍ خبرې

دکرمو هغه ورځې چهټیانې چه مونږ ورلره قسما قسم مسودې جوړې کړې وې او عجیبه عجیبه خیالات موذهن نشین کړي وو لکه دخوب لیدلو وو چه تیر شو څرنګ سبه تېره ده ے په تصور مې خان بادشاه کړو چه سرېم پورته کړو ملنګ ددوي وو څمونږ دارالعلوم یوځل بیا په خپلو اونسیدونکو رونق ید پیر شو او طالب علمان لکه دسپرلي د مارغانو د کالج په چمن راغونډ شول او د کالج هغه سبا ئستنه سرکونه چه عارضي طور سره شاړ شوي وو اوس بیا ودان شو - دهار پشکال باد ونو وهلي باغونه بیا سرسبز او په کلونو اباد ښکاري په لید وئ سترګو کښ نور او په زړه کښ سرور راځي او د سړکونو د غاړې د ناړنجو بوټي داسې نظاره ورکوي لکه چه پیاده فوج د چا سلامۍ ته ولاړ وي -
غرضیکه سنحکال څمونږ کالج د نورو کالونو په نسبت په ډیرو خبرو کښ نوې نوې معلومیږي ډیرې لوړې خبرې چه د هغې غور څمونږ په غوږ داول نه راغلي وو اوس د قول نه په عملي جامه کښ را ښکاره شوے د ټولونه وړښې د بي - ټي اوالیس - اسے وې د کلاسونو بر انستې دي چه ددوئ په برکت مونږ هغه زاړه دوستان او ځوانې رفیقان چه ډیرو یکښې په عملي دنیا کښ قدم هم ایخې وو یو ځل بیا د طالب العلمانو په حیثیت کښ ولیدلو -
بله تبدیلي چه هلکان په دزړه په مینه خوښ دي د کالج دګرانټ او ځلوزم هاسټل د سکول بټهلر او عبد القیوم منزل سره تبادله ده او شکر دي چه دګرانټ او ځلوزم هاسټل او سید ونکي د تهکال پایان او تهکال بالا د پیغور نه خلاص شو او اوس مونږ دا په فخر سره ویلي شو چه اوس به د هوري سوساټي جلسه په کامیابي سره کیږي او د حاضر ینو تعداد به هم کافي وي -
اګرچه سنحکال دخیابردې پرچې نه بیا ډیر په بې غوري وکتلي شو لیکن بیا هم

دانګه د پاره مونږ دخپل نوو راتلونکو یعنی د بی ۔ ټی او ایس ۔ اے ۔ وی د طالب علمانو پیره طمع لرو چه هغوی به ځمونږ خوصله افزائی کوی او خپل ځان به یوه طرفه نه ګڼړی ۔
کالج ته نوی راغلی اساتذه کرام موهم هیر نه دی مونږ هغوئی ټولو ته د زړه د خلاصه هر کله وائی والو او امید کوو چه دوئی به هم خپله پوره پوره همدردی مونږ سره ساتی ۔
په اخرکښ مونږ دخیبر یونین نوی عهده دارانو ته مبارکباد وړکوو او د الله تعالیٰ نه دعا غواړو چه د پروسکنی کال غوندی دسکنی کال هم په کامیابی او شان سره تیر شی ۔
مدیر شوکت الله اکبر

پښتون ته خطاب

یوکړی خند اخلو دِنیا په جهالت پښتون — بل چه ته پروت ئے دهسے رنګے په غفلت پښتون
اول د توری دِنیا زوک وو په تمام عالم کښ — اوس چه غلام ئی کړی اقوام د رنه نفرت پښتون
اول هلال به ستا د ملک په منارو ریسد و — اس ستا په سر باندی صلیب ښکاری او جت پښتون
هم اتفاق د رنه عنقا شو هم ردی هم لتا — زور هسے رنګے دی په تا باندی ذلت پښتون
هم کړی ته غلا او هم دا کے شته هر یو کار د رکښ به — لا سر دی ټیټ نه دی په هسے ندامت پښتون
چه په بل راشی مصیبت ته په ده خواه سره وی — څه کړی امید ته د الله نه د رحمت پښتون ؟
مرګ نه روان شی د خپل رورولی پښتو سره کوم — چه ئے غلام د بل په دی نه کړی غیرت پښتون ؟
ملک دی دِنیا کښے ئے ته مړے په بل کوینه — ددی نه هم شته زیات دنیا کښ خجالت پښتون ؟
هم یا مفلس هم نادار هم کدا ګوتا وینم — نو خپل وطن کښ غواړی زیات څه ذلالت پښتون
دغلامئ شراب هسے رنګ مخمور کړے ته — چه ستا نه هیر ازادی شو لو لذت پښتون
لا به ترکومه ستا حالت وی تر دو د دا هسے — دنیا اوکوره لګ په ستړګو د عبرت پښتون
هغه جوهر پخوانی بیا کړه په خپل ځان کښ پیدا — کړه اپید ابو بل خالد او کړه همت پښتون

هله غیرت به کړي پېښتانه هم به پښتنو وګڼي ... د ازادۍ نښان چه ملک کښې کړي او حق پښتون

د غلامۍ د هزار کاله ژوند نه د یو ورځې بهتر ... که وي ژوند ورته په ازادۍ کښې لو ساعت پښتون

هله زخمونه د مجروح زړه د اختر به شي روغ

که په ټول هند شي دوباره ستا سلطنت پښتون

اختر منیر مجروح د څلورم کال (زراعت)

لور خور که غوامېخه؟

پښتون ته د مال د پاره د ومره پرېوتلي ... د غوامېخو په شان خوځوې لونړه خوندخېلي

(۱) په کلي کښې د بلند خان نوم ډیر مشهور وو - خوا وشاه هر ځائې د ده اثرا ورسوخ وو - خو د مالي حال د طرف نه ئې دومره ښه نه وو - شل دیرش جیبه په مزکه ئې وه - او په کور کښې یو د ې وو - یوه ئې بوډۍ ئې مور وه یو ئې ښځه او پنځه ئې ځامن لونړه وو - په دې دومره معمولي آمدن کښې د اتو تنو ګذاره ډیره ګرانه وه - خو بلند خان بخت ښه وو - چه خدائې ورلره ساتند ویه ښځه ورکړې وه - دې نیک بختي بد د مرۍ د مرۍ خیال ساتله - هر شې به ئې په انداز ه اندازه لګوو - ځکه چه هغې ته دا معلومه وه - چه تنشه جامه راباندې پرته ده - که چرې دې وخت کښې مونږ ځان تنګ لنډ نه کړو - نو صبا ته به موږ پوزې لنګ شي - او بیا که سپي قیني کوو نو هم به په تن پټ او په ګېډه ماړه نه شو - هم دا وجه وه - چه په دې لږ آمدن کښې به هم بلند خان سپین سپین روبې کرزیدو -

(۲) د بلند خان مشرځوئې روئید ا دخان ځلمې وو - په ا تلسم[۱۸] کال کښې ئې خپله وو - په نسم جماعت کښې ئې سبق وې - مور سره ئې خیال پید ا شوې وو - چه بچي ئې ځلمو ته شو ې دې - بس په زړه ئې د ا ارمان دې - چه په سور پالنګ ئې خښته او وینم - او خکلې د ولې ئې کور ته رانسه باسم - مور غوښتې به ئې ډیر کوشش کوو

چه دا مراد ئے دسره شي . خو خاوند ئے ډیر تریخ وو . دا تر ډیره یریدو . ځکه چه به ترے دے تپوس کوو . نو هغه به په رټه سپوره اووے . چه رویند اد خان لاماشوم دے . چه وخت ئے راشي . نو ځه به یې پخپله مخکښ شم . ښځې غریبے به ډیر کوشش کوو . خو د خاوند په غوږ کو به نه لګیده . اخر د غریبي نه صبر اونه شو . یوه ورځ ئې په یره یره خاوند ته بیا اووے .

ښځه . د رویند اد خان پلاره ! زه د کله را سي لګیا یم . چه رویند اد بچے مې ځلمے شو شوندے ئے شنے شو . سبق ئے ډیر اووے . ځکه کښې غم ورله پکار دے . دا ارمان به زه قبر ته ځان سره اوړم . چه د رویند اد واده مې اونه لید ه .

د خاوند په لاس کښې چلم وو . تر ټرقوے کول . چه دا خبره ئے واوریده . نو د قهره تک سور شو .

خاوند . بے حیا ښځے ! هر وخت ځما غوږ کونه خوړے . څو ځله مې منع کړے ئی . چه ماته بیا دا خبره اونه کے . رویند اد لا د واده کولو نه دے . زه ورله هسے نو سر ے نه بند یوانول غواړم . خو ته دا سے بے حیا که بخته ئې . چه هم هغه سے تر ټورد ے ځلولے دی . په ترے خبره نه شوے . دا به ښه وی چه اودے زه یم ؟ یره خو چا ډیر ورشتیا ویلے دی . چه اصیل لره اشاره اوکم اصل لره کوټک .

ښځه . سړیه ! ډیر مې صبر اوکړو . نور رانه نه شي کیدے . د کله را سے در ته لګیا یم . خو تا له تشے ر ټے سپورے درزي . ما ته سپے سړے هم نه ګڼړلے دخپل ځ سر ئے . ځه چه د په زړه رازي . کئے . دا د ر سره خیال نشته چه هلک ځلمے شو . د واده کولو حاجت ئے دے . هغه ترسبا خود شرمه خوله نه شي سپړولے چه په پرانسے خوله اووائي . چه ماله واده اوکئ . چه نه مې منے . نو خو یوزه ده په ستړګو کښې ازغے یم خو خدائے دے ماله مرګ راولي . چه زه هم خلاصه شم اونه هم . (دا ئي اووے او په ژړا شوه . ښځو له ژړا ډیره زر ورزي)

په فرانسیسئ ژبه کښې یو متل دے . چه هر کله چه د ښځې په مخ دا ښکو جال خورشي

نو سړے غریب بیا هیڅ لیدے نه شی" - خاوند چه ښځه په ژړا اولیده - نو زړه ئے خوږ شو - په خپلو رټو سپور خپیمانه شو - سړے خکته کړو او په سوچ شو - چه څه اوکړم - څه ساعت پس ئے سر راپورته کړو او وئے وئے

خاوند - ځږنه کور هم درته معلوم دے - کنه هوائی خبرے کوے ؟

ښځے چه دا خبره واوریده - نو د خوشحالئے نه والوته - او په ډیر جوش سره ئے اووے -

ښځه - هو کورما ته معلوم دے - د پولیل خان نه غټ سړے په دے کلی کښ څوک دے ؟ د عزت خاوند دے - د مال ئے شمیر نیشته - د کلی مشر دے - د هغه مشره لور مالیدلے ده - خدائیکو په کوټه کښ غمی دے - خائسته ده - رڼقه ده - قرآن شریف ئے په ترجمه ویلے دی - خط لوستی او لیکلے شی - په کتو ے سمسئ او په ګنډلو کشیده کښ ډیره مړنے ده - بس که ستا صلاح وی - نو زه به ئے سپوس اوکړم -

خاوند - ربه ډیره سنجیده ګئ سره) خبره خو د خه ده - خو دا هم درته پته شته چه پولیل خان حمونږ ه جوګه نه دے ؟ خلور ښځه سوه جریبه مزکه ئے ده - کافی جائید اد ئے دے - هغوئ خو به ورو مبے رضا هم نه شی - او فرض که که رضا هم شی - نو بیا څه به غواړی هم - ته په خپل زړه کښ خیال اوکه - چه څه به غواړی ؟ ځان کښ دومره طاقت وینے ؟ څه په خپلو جامو کښ خو به ئے ډو لے ته نه اچوی -

ښځه - سړیه ! همت اوکه تو خدائے به وسیله پیدا کړی - ځما خو پوره یقین دے چه پولیل خان ډیر ښه سړے دے - او ښځه ئے هم ډیره نیکه ده - هغوئ به حمونږ نه سره پیسه هم وانخلی - په خپلو جامو کښ به ئے راکړه راولیګی - بلکه که حمونږ غریبی ورته معلومه شی - نو مونږ سره به څه ډیر امداد هم اوکړی -

خاوند - خه ده - که چرته دا سې وي - نو ته ورکړه د تپوس د پاره ورشه -
ښځه - ډېره ښه ده - خه به بیګاله ورشم که خیری ؛-

ښښښ (۳) ښښښ

شپې له چه د ماسختن بانګونه ئې اوو - نو درویند ادمو پروني په سوکه کشوئې خوځې ئې خان سره روان که - په یو لاس کښې ئې ورله لالټین ورکړو چه په تیاره کښې ډ قره اونه وهي - او په بل لاس کښې ئې ورله ډانګ ورکړو چه سپے ئې اونه چیچي - څنګ ځی ته مخامخ د پولیل خان کور وو - په حجره کښې خاموشه خاموشي وه - تابه وے چه ټول د م شوي دي - خو د پولیل خان سپي په دروازه کښې غپل - چه د لالټین رڼا ئې اولیده - نو لا په غپاری شو - ھلک نکړه وو - سپے او بریدو - او دواړه ورننوتل - په کوټه کښې د و مره لوګے وه چه ساه نه شوه اخستې - دا لوګي په غاړه د پولیل خان ښځه ناسته وه - په یو انغري کتوئ ځټ ځټ کول - او په بل طبیخ پروت وو - او د کور میرمن ورله په خانګ کښې د جوارو ډوډۍ جوړوله - پورته په کټ کښې پولیل خان ناست وو - په بالښت ئې تکیه وهلې وه - او چلم ئې ډ زوو - په بل کټ کښې ماشومان ادلیځ پرېیحے وو -

چه سلیسیرو کړ یار ئې واریده - نو د کور میرمنې سر راپورته کړو - چه د بلند خان ښځه ئې اولیده - نو زر راپاسیده - لاس ئې ورله ورکه - د پولیل خان لور راغله او په خپو ئې پریوته - د ے ئې لاس خکل کړو - او دعا ئې ورته اوکړه او بیا په کټ کښې کیناسته -

دکور میرمن - خه خورے ! وایه کنه څنګه د لار وو دکه کړه ؟
میلمنه - خورے ! خو د دنیا میرا ئې غمونه ډېر دونه دي - د دے نه ځلاميکو - د دنیا ونج و پار دے تکیا یو کوئے - کله یو غم وي کله بل غم -
دکور میرمن - خورے ! غم مه خوره ! وخت اله تېر به ورکوه - خپل کار ترے او باسه

خه! روئید ادخان جوړ دے؟ سبق خو به وائی؟

میلمنه - هو - خدائی د جوند اودښے ډیرے که - جوړ دے - ښم جماعت کښ سبق وائی - په داخلو نیسو نو او په کاپو کتابونو موزړه اوچوده - نورے پیسے او بوټه نه لاهو کوو - څوان ځلے دئے - دواده کویدن ددے ورله کوو -

دکورمیرمن - ډیره خه ده - شکر دئے - خدائے د ورله ډیر جوند ورکړی جینئی مو ورله کتلے ده؟

میلمنه - نه کنه خورے! جینکئ خو ډیرے دی - خو څه اوړنه رائیشته ښځه خو به ورله کوزنه نه داولم نیکه اشرافه دلوئے کور جینئ به ورله کوم - (په غولی کښ وزنه روشان وائی) خورے زه ناله، هم ددے مطلب د پاره راغلے یم - نوزناته څه ویل دایلو بحوته غوږ پے ورکول دی - نه بخیله ښه پوهیګے -

دکورمیرمن - (یو ساعت سکوه شوه بیا وائی) خله ده - زه ئے پلار سره په دے کښ صلاح کوم - نوناله به جواب درکړم (پولیل خان او ښځه ئے بهرته وزی - خله سات خس خس کوی بیا کوتے ته دا ننوزی او وائی)

خورے! ستا مراد د سره شو - مونږ خپله لوزناته او بخله - ته به دد مړه کوے چه فقط یو کالے د ښلو د پوبه جوړه ئے - باقی مونږ به خپله لور په خپلو جامو کښ درلیکو - د جمعے په ورځ ډوئے پسے راشئے -

میلمنه د ډیرے خوشحالئ والوته - یو څو خبرے اترے نورے او شوے - د ډیرو نورو ښځو غوځے هم او خوړے شوے - او څه ساعت پس د بلند خان ښځه کوزنه والپس راغله - خاوند ته ئے زیرے ورکړو - او دواده تیارے شروع شو -

(۴)

جمعه راغله - جینئ کور کره ډیر کرمه کرمائی جوړه شوه - د جامو پروق پروق وو - ناوے جوړیده پے ورله سرمنکزوو - پدے کښ ډوئے راغله

اوچغې شوے چه ناوے زر دې وے نه واچوئے - وائی چه وو واده آسان دے
خو ټپک ټوک ئې گران دے " - په دے نازک وخت کښې د ناوې مور ناړامې
راوانخسته - اووے چه زه خپله لور د خاوړو په تول نه شم ورکولے - د
ناوے نه لاس اوونیځې - اوس ټول اریان دریان ولاړ دي - چه دا دے
څه اوکړه - دهلک مور خاوند ته وے -

دهلک مور - وائی ربه توبه! دا څومره بے حیا او زوره اوره بنځه ده - په آخر وخت
ئې خپے اوخوړ وے - اوس پوے نه راکوی - وائی چه څه زه وایم هغه به پوره
کوے - کنې نو دا پتهو مو په سوړی او تړے - لاس مو ورته لاندې دے - څه
چل اوکو -

خاوند - (په وار خطائے سره) بیره! اوکه چه څه هغه وائی" سل په لاکے پورے دا
بوه پې د بنگړو" - نور هم خه چوړ شوے یو - دا ناوان د په کښې هم وی -
خو دا م درته اووے - چه بیا به رانه د پلار په کور خپه نه گدی -

د جینئ مور د هلک مور ته اووے - چه اته سوه روپئ نغد سے جغدے غوږ
د سلو روپو کالی - لس جوړه مزکے لور پسے اولیکئ - د څلویښتو روپو لوخی
شل سیره مصری - د پے چائے ....

دهلک په مور سر اوگرزیده - خو اوس د مزکے او آسمان ترمینځ زور په وړ
د خلاصیدو لار نه وه - آخر په سودو نوئے روپے راواخستلې - هر څه شو د
اوشو - جینئ خوږه کړے شوه - او په ولی کور ته راوړے شوه

(۵)

دواده په خوښ د بلند خان دیواله او ونه - هر یو ټک پک ناست وو - قهر
بمئ په ناوے سره وو - ناوے غریبه چوړک بانګ وخت پاسیده - په درد
میښخنی به ئے اوړولے - د ښخنی نه به سو سکیده - خو به دو دو ښوتپے غوځلے
به ئے کولے - بیا به ئے ځلئے جارو کوو - بیا به ئې اور بلوو - او په وپے اوچلئے

به ئې پخوسلے ۔ بيا به ئې دکټولونه اسبابونه مونډول ۔ باقي ورز به په کټوے ښځې کښېنولو او په جامو وينځلو تېره شوه ۔ په دے کښې به دغريبې زاره ښځه شوه ۔ زړه به ئې اوچوده خوسره ددے په دهغې هيڅ نه شو منلے ۔ او په کور کښې به ورته ډېر يو باؤ بلا دو ۔ هغوي به ورته بدوے او پېغور به ئې کتل ۔ يو څو ورځې خو ناوے صبر کوو ۔ خوا خر او به دوو ځه وا وړيد ے ۔ يوه ورځ ډېره دخوده اووته ۔ او په ډانلړ پيللے ئې اووے ۔

ناوے ۔ کاکې ! ځما خو په خدمتونزاره اوچوده ۔ خو منلے نه شي ۔ دو ينځې په شان چليګم ۔ دسپي په چپ کښې واله پر دو ښځے اکولے شي ۔ آخر خدائے نه هم ته يره پکار ده ۔

دکور مېرمن د ډېرے مودے نه په که پکه ناسته وه ۔ راسره شوه :۔

خواښے ۔ چُپ شه لشکې ! ته په کوم مخ لادا خبرے کوے ۔ ته ځمونږ وينځه نه ئې نو ځمونږه مور ئې څه ؟ ستا مور پلار خود ے خدائے په سوداګرستي کړي ته ئې روپوسره تللے راکړے ئې ۔ ته خو دغوا ميخو په شان په مونږ خرڅه شوے ۔

دناوے غريبې زړه پرق اوچوده ۔ په جړا شوه او مور پلار ته ئې لوړيد لے لوړيدلے خيرے شروع کړے ۔

دا ځمونږ دپښتنو د معاشرتي جوند يو تلک تورمخ دے ۔ کاش که دوي خپلے لونړه خوبند ے دغواميخو په شان خرڅولونه شرم اوکړي !!! کاش !!

عبدالرازق فاروق افغاني داول کال :۔

ـــــــــــــــــــــــــ

دَ فلک گردش

(بې وفا دوستان)

سزاوار ده کوم ګناه شوم — چه له هرچا نه جدا شوم
پروت یم تل زه په خلوت کښې — پوهې بیګاه نه په صبا شوم
کوم وخت لاس کښې چه مې زر وو — خان غریب ځما په در وو
نوم مې خور په شان د نور وو — ټول جهان مې سیالی کړ وو
که محفل کښې مې یاران وو — ځما د حسن ښکاریان وو
تش ځما دید ته دیاره — شپه او ورځ به په ارمان وو
که ماوې فلانکی بهادر دی — هغوی به وې د جهان نر دی
که ماوې فلانکی خوخر دی — هغوی به وې چه غټ کافر دی
که ماوې دغه ریښتیا دا — ځما هاں سره به هاں وه
هر مجلس کښې مې تعریف وو — هر محفل کښې مې ثنا وه
ټول وطن کښې مې نوم خور وو — هر سړی به ځما ورور وه
په عشرت کښې هم سرمستنه — ورد نکل به مې که اور وه
د فلک گردش د لاسه ... — زه پائمال او ډیر بدحال شوم
فقیری و کچکول په لاس کښې — زه محتاج او ډیر کنګال شوم
که یاران که آشنایان وو .. — وار له نن مانه په ځنګ دی
په مجلس کښې که زه کښېنم — تش په ناسته مې هم تنګ دی
نن زه خوار او ډیر زبون شوم — زه بېزار له دې ژوندون شوم
یار آشنا نه په بېلتون شوم — در په در لکه مجنون شوم
په ژړا مې خلق خاندی .. — په فریاد مې توقې کاندی
هر څوک وائی لېونی دے .. — که دوستان او که خپلوان دی

که زه غواړم ورنږدې شومې — هر یو تښتي له ورایه
په جهان کښ زما پښان ته — بې نوا مه کړې خوک خدایه
که خوشحال یم که زهیر یم — زه شاکر په خپل تقدیر یم

محتاجي د بل به څه کړم
چه زه ستا د در فقیر یم

سید سلیمان د پیښور

د بالغانو تعلیم او پښتانه

(له قلمه د صاحبزاده محمد ادریس پروفیسر د اسلامیه کالج)

ما د یر ځله په دې خبره فکر کړې دې - چه څه وجه ده چه ځمونږ قوم د نورو قومونو نه رستو دې - څه وجه ده - چه نور قومونه روز په روز ترقي کوي - او ځمونږ قوم ځکته ځکته روان دې - د قومونو د ترقئ او د زوال ډیرې وجې کیدې شي - خو ځه په دې نتیجه رسیدلې یم - چه ځمونږ د زوال وجه جهالت دَ - بې علمي ده - مونږ که د دنیا نورو قومونو ته اوګورو - نو مونږ ته به ښکاره شي - چه د هغئ په مقابله کښ ځمونږ حالت د ړندو کنړو دې - مونږ هغه بد قسمته قوم یو - چه د عقل سترګې مو به پټې وي - د سر په سترګو وینو خو د عقل په سترګو په تپوړاند ه یو - ضرورت د دې خبرې دې - چه د عقل د سترګو علاج او کړو - ځکه چه ترسو پورې دا علاج نوی شومې - نو تر هغې پورې د ترقئ کمیځ امید نشي کیدې -

د نیا ډیره ګړندئ روانه ده - ځمونږ زړونه هم نورو قومونو سره سیالي غواړئ خو سوال دا دې - چه په موجوده حالت کښ مونږ د دنیا د ترقي یافته قومونو سره سیالي کولې هم شوا وکه نه - هغه صفتونه چه مونږ به د سیاله سره سیال کي - په مونږ کښ لا نه دي پیدا شوي - او نه پیدا کیدې شي - چه ترڅو پورې ځمونږ قوم

نجهالت په تيرو کښې پروت وی۔
د دے د پاره زه خپل د غفلت په خوب اوده قوم ته دا وايم ۔ چه بيدار شه ۔ سترګے اُغړوه
او د نورو قومونو نه عبرت واخله ۔ مونږ د نورو قومونو نه د ترقي په ميدان کښې دومره
وُستو پاتے يو ۔ چه ترڅو پورے ۔ ورځ او شپه په ځان يو نه ګو ۔ نو تر دغه پورے به
دغه شے وستو پاتے يو ۔ او په مونږ باندِ به دا مثال ټهيک راځی ۔ چه ګنګی مل دِ
څوک دے ۔ نو وے د ټهولو نه وُستو ؛ ۔۔
پښتانه ځان ته يو غيرتي قوم وائي ۔ دے کښې هيڅ شک نشته ۔ چه دوئ غيرتيان
دی ۔ خو غيرت په څو قسمه وی ۔ غيرت په ځائ هم کيدے شی ۔ او بے ځايه هم
په پيران باندِ جائيداد بيلل هم غيرت دی ۔ او د قوم د پاره سرورکول هم ۔ فرق
صرف دا دے ۔ چه په قوم ځان قربانول په ځائے غيرت دے ۔ او په پيران جائيداد
دوره کول بے ځايه ۔ ز دا شان بے ځايه غيرت په ځائے که مونږ دا غيرت اګو ۔ چه مونږ
به په هم شان د نورو قومونو سيال کيګو ۔ که په علم کښې وی ۔ که په هنر کښې ۔ که په
سنعا کښې وی ۔ او که په بهادری کښې ۔ نو دا به په ځائے غيرت وی ۔ بيا به مونږ د نورو قومونو
په نظر کښې هم غيرتيان ښکاره شو ۔ او د غيرت نتيجه به هم څمونږ د پاره فائده مند
ثابته شی ۔ د دے د پاره زه خپلو پښتنو رونړو او خويندو ته دا عرض کوم ۔ چه په څه شان
وی ۔ نو د قوم تمام زړغزے به د علم په ذريعے د نورو قومونو سيال جوړ شی ۔
دلته کښې به د پيرو کسانو په زړه کښې دا خيال پيدا شی ۔ چه زړو واسو نړو ته د درپو
درانکو خوبو نه څه فائده ده ۔ يا څه فائده کيدے شی ۔ د دے په جواب کښې زه دا وايم
چه د علم حاصلو د پاره نه لوئے عمر ته کتل پکار دی ۔ نه وړوکی ته ۔ بے علمی او جهالت
څمونږ د ټول قوم مرض دے ۔ په دے وجه که لوئے وی ۔ او که واړه ۔ د ټهولو علاج ضروری
دے ۔ دے کښې هيڅ شک نيشته ۔ چه مونږ پير وستو شوی يو ۔ خواص هم هيڅ
نه دی تلی ۔ پختون يو جوند ے قوم دے ۔ دوئ په سياسی ميدان کښې هم د ټهولو نه
وستو دو ۔ خو چه غيرت ئے اګه ۔ نو هندوستان د نورو صوبو نه په لګه موده کښې مخکے شو

دغه شان دَ ئ دعلم په میدان کښې هم مخکې کیدے شي ۔ صرف د یځے اراده سوال دے ۔ پښتون هسے هم ضدی دے ۔ که دعلم حاصلولو ضد ئے اکه ۔ نو تر هغې پورے به ساه نه اخلي ۔ چه تر څو پورے یو کس هم بے علمه باقي نه وي ۔
د پیرو کسانو په زړونو کښې به دا خیال پیدا شي ۔ چه واړه خو به مدرسو ته لاړ شي ۔ او سبق به او وائي ۔ خو ځاکه به څه کئ ۔ د هغې د تعلیم به څه انتظام کیږي ۔ د دومره مدرسے او استاذان به چرته نه راځي ۔ چه د ټول قوم د بے علمو د پاره کافي شي ۔ دا سوال ډیر معقول سوال دے ۔ ځکه چه زمونږ قوم ډیر غریب دے ۔ مونږ سخه د دومره مال نیشتے ۔ چه د دوړو د پاره بیلے مدرسے جوړے کو ۔ او استاذان اسانو ۔ او د بالغانو د پاره بیل انتظام اکو ۔ بیا هم دا خبره دومره ګرانه نه ده ۔ چه څومره خکاریږي ۔ د بالغانو تعلیم د پاره نه د نورو مدرسو ضرورت شته ۔ او نه د تنخواه دارو استاذانو ۔ که څه ضرورت دے نو هغه د همت ۔ د قوم پروری ۔ او د قوم پرستي ضرورت دے ۔ که چرے د کلو استاذان صاحبان او نور تعلیمیافته کسان دا اراده اکي ۔ چه مونږ خپل فارغ وخت د بالغانو تعلیم د پاره وقف کوو ۔ که چرے د هغې په سینه کښې یو درد مند زړه وي او هغې کښې د قوم پرستي یو بسرکے وي ۔ نو دا ظاهره ګران کار ډیر اسانید ے شي ۔ په ځائے دَ دے ۔ چه استاذان او نور تعلیمیافته صاحبان خپل وخت د حجرے په بے مطلبه فضولو خبرو ضائع کی ۔ هغه وخت د حجرے خلقو ته لیکل لوستل خودلو کښې خرچ کی ۔ نو د قوم څومره خدمت کیدے شي ۔ دے کښې د مدرسے او د استاذ خرڅ خو د منړه ازی ۔ باقي صرف د قاعدو ۔ د سیاهۍ او د کاغذ تختي خرڅ شه ۔ نو دا دومره زیات خرڅ نه دے ۔ چه دیو زمیندار د طاقت نه بهر وي ۔ ځکه چه په دے شیزونو د چائے ۔ تمباکو په لسمه حصه خرڅ هم نه کیږي ۔ دیو څو وختو چائے ۔ تماکو نه سهي کنه د علم حاصلولو د پاره خو خلق لوئے لوئے تکلیفونه کوي ۔ که دیر څو وختو چائے په قضا شي ۔ نو څه لویه خبره ده ۔ بیا هم که چرے دا سے غریبانان خلق وي ۔ او ضرور بهٔ وي ۔ چه هغې د دومره لګه خرڅ هم نه شي زغملے ۔ نو د کلي تپے د سفید پوشانو دا

خلاقی ـ او اسلامي فرض دے ـ چه په یو نیك کار کښ ځلورشپږ اني خرڅ کي ـ
د بالغانو د تعلیم په باب کښ ـ د قوم هغه مشران ـ چه هغوئ قومي خدمت د خپل ژوندون
مقصد جوړ کړے دے ـ د یو څه کولے شي ـ هغوئ له پکار دي ـ چه د خپل وخت کافي حصه
د بالغانو په تعلیم ورکولو کښ خرڅ کي ـ زه دے مشرانو ته دا عرض کول غواړم ـ چه
هر قومي تحریك ـ چه په هغے کښ د بے علمو کثرت وي ـ قائم نه شي پاتے کیدے
د داسې تحریك مثال د هغے دیوال دے ـ چه بنیاد ئے په شګو ایښے شوے وي
په دے وجه د سیاسي مشرانو دا فرض دی ـ چه هغوئ د بالغانو تعلیم ته ډیر فکر او کي
هغوئ له پکار دي ـ چه د قوم پرستو او همدردو خلقو ټولي جوړې کي ـ او د هغوئ په ذمه خاص
خاص کلي کي ـ چه د هغے بالغان به تعلیمیافته کول ضروري وي ـ په تشو نورو با جو قومونه
نه جوړے جوړ شوي دي ـ او نه جوړ یدے شي ـ قومونه په ښو قومونه جوړیګي ـ د دے
دپاره ورزار شپه په ځان یو کول پکار دي ـ کم قومونه چه کار کول غواړي ـ نو هغوئ
ړومبے د بنیادونو مضبوطولو کوشش کوي ـ په دے وجه زه دا امید لرم ـ چه خمونږ
د قوم مشران به هم د قومي تعمیر بنیاد ـ د عوامو د تعلیم په مضبوط بنیا د کیدي
دلته کښ زه دا مناسب کړم ـ چه په اسلامیه کالج کښ د بالغانو د تعلیم دپاره چه څو ځله
ډیر کوشش شوي دے ـ د هغے ذکر اکړم ـ د خیبر لوستونکو ته به دا معلومه وي ـ چه
اُرم کال راسے په کالج کښ د بالغانو د تعلیم دپاره یو جماعت جاري شوے دے ـ هغه وخت
خمونږ دا خیال وه ـ چه د قوم په ځوانانو کښ به قومي احساس وي ـ او هغوئ به په ډیره
خوشحالئ دے کار خیر ته لاس واچوئ ـ او د کالج مالیان بیره ګان او نور بے علمه کسان
به تعلیم په جامه اراسته کي ـ ولے افسوس دے ـ چه خمونږ په ځوانانو کښ هغه حس
چه کم باند قومونه ژوندي کیګي ـ اُوده ثابت شه ـ او ډیر کم کسان د قوم د خدمت
دپاره تیار شو ـ خمونږ خیال وو ـ چه د غه ځوانان به د کالج د بے علمانو نه ابتدا اُکی
او بیا به د ملك په ګټ ګټ کښ د علم مشال بل کی ـ خو هغې مثال د فارسئ د مصرع
... خفته را خفته کے کند بیدار ـ په مصداق شو ـ زه دے او د و ځوانانو ته بیا پیام بیداري

ورکوم ۔ اوورته درخواست کوم ۔ چه دقوم د علم د تلوتنده ماته کی ۔ که دوئ دومره هم نشي کولے ۔ نو دوئ نه دقوم پروردي امید کول عبث دي ۔

د بالغانو د تعلیم احساس ټولو قومونو ته شوے دے ۔ امید دے ۔ چه ناسو کښې به ډیر وکسانو په هوی جن کښې (د مهاتما گاندی اخبار) دیو چینې مضمونو نه د بالغانو د تعلیم په باره کښې لستي وي ۔ دچین خلق هم ځمونږ په شان بے علمه وو ۔ او اس هم نو ډیره حده پوري وي ۔ خو دوه ملک کښې قومي بیداري پیدا شوه ۔ او د ملك مشرانو ته دا احساس اُشه ۔ چه تر څو پورے وړو زاکو ټولو تعلیم نه وي کړے ۔ نو تر هغې پورے د ملك ترقي ممکنه نه ده ۔ د دے غرض د پاره ئے د بالغانو او د نابالغانو د وارو تعلیم شروع که ۔ د دے تحریك ابتدا په دے شان اوشوه ۔ چه یو چیني قوم پرست ـ چه هغه اخبار نویس هم وو ۔ د اخبارد نو خرڅوونکو هلکانو ته لیکل لوستل خول شروع کړل دے هلکانو چه بډکم سبق ازده که ۔ نو هغه ازده کړے سبق ئے میندو خویندو ته اخو مینو خویندو به ئے بیا دغه سبق نورو خپلوخپلوانو اوکوانډیانو زنانو ته اُخو ۔ د دے ماشومانو هلکانو په ذریعه تعلیم په خزو کښې خور شله ۔ په دے وجه د دے قسم د تعلیم نوم په چین کښې "د ماشومانو اُستاذانو" تحریك مشهور شه ۔ د دے تحریك بو قسم دا دے ۔ چه ماشومان په مدرسه کښې سبق اووائي ۔ نو په کور و نو خواره شي او زنانو ته خپل سبق په زور وز یر اُوائي ۔ په دے ذنك د هغې خپل سبق هم زوت شي او زنانه هم سبق زده کی ۔ د دے طریقے یو فائده دا ده ۔ چه ماشومان د زنانو د کور په کارو بار کښې مداخلت نه کوي ۔ ښځے خپل کار کوي او هلك ورته خپل سبق وائي ۔ یا چه ښځے ډیرے مشغولے وي ۔ نو هلك تر هغې پورے ہے کوي ۔ چه څو پورے ښځے نه وي ازکاري شوے ۔ بله دا خبره ده ۔ چه ځمونږ د ملك په شان د چین ښځے هم د لویو سړو ډیره ازاده ناسته پاسته نه کوي ۔ که استاذان چړے ځوانان سړي وے ۔ نو بیا به د ښځو تعلیم ناممکن شوے وو ۔ که چرے ځمونږ د ملك زنانه هم د چینیانو چل شروع کی ۔ نو د جهالت پرده کښې به لوئے لوئے سوري اُشي ۔ او اخر تکړے ټکړے به شي

دوئي د داخيان نه کوي - چه په دوئي باند دسبق وخت تېر شوے دے - دعلم حاصلو
دپاره دوونئ نه زوړ عمر نه کوري - او نه ورپړو ورو لا ئي ځوانه د دوئي په تعليم دتول تېر
بهترئ منحصره ده - په کم کورکښ چه مور هښياره او تعليم يافته وي - دهغې کوم
جوندون دبنياد موجوندون وي - چه کم ځائے کښ ښځے جاهلے وي - نو هغه کوم
دوزخ وي -
په اخرکښ زه بيا خپل قوم ته داعرض کوم - چه بيدار شي - او دعلم په دنړ ځان
رونړ کړي -
محمد ادريس پروفيسر -

دنيکئ بدله!

نيکي کول په دنيا کښ يو بهترين کار دے - داوښيارانو قول دے - چه نيکي اوکړه او
درياب ته ئي وارنه وه - په حقيقت سره که غور اوکړے شي - نو سړے به په دے نتيجه
اورسي - چه دنيا نيکي نو يو نموره لري - بعض خلق وائي - چه نيکي لنګه شي بدي راوړي
خو داخيال دهغوئ ترډيره حده پورے غلط دے - ممکن ده - چه يو څو مثالونه
داسې موجود وي - ليکن رائے عامه داده - چه نيکي هيڅ کله ضائع نه زي - ان چه ځنګ
هم دنيکي قائل دي - چنانچه يو قصه داسے رانقل کيږي - چه پخوا زمانه کښ يو بادشاه
وه - چه ډير شوم او بخيل وو - يو ځوئے ئے وو - چه ډير نيک ره او سخي وه - دسخاوت
تعريف ئي دارو - چه هغه به د درياب مهيا نوته اوره اچول - او دهغوئ پالنه به
ئي کوله - يو ورځ بادشاه خبر شه - او په دے تاوان ډير خفه شه - او شهزاده
ئي ملک بدرکه - شهزاده مايوسئ سره دغربت په نيت روان شه - او څه موده
پس يو ښار ته اورسيد - چه هلته په يو سوداګر پيش شه - دے هم د
افلاس د وجه دنوکري په تلاش کښ وو - او سوداګر ته هم ديو نوکر حاجت وو
چنانچه دنوکري شرائط ئي طے کړل - شرائط داوو - سوداګر ورته وي - چه کال

کښې به هم درته بوخدمت پېښيږي - هغه به ته کوې - باقي ټول کال وزګار ګرزه - شهزاد
په سوسترګو دا شرط قبول کړو - د سوداګر دا کار وو - چه نوکر به ئې اوساته - نو
کال پس به ئې خدمت ته وړاندې که - خدمت دا وو - چه غوا به ئې د ښار نه بهر حلاله
کړه - او د هغې څرمن کښې به ئې نوکر بند که - او او به ئې ګنډ ه - په دې کښې به يو مارغه
راغې - او هغه څرمن سره د سړي به ئې اوچته کړه - او په يو غنډي به ئې چه بې
انتهاد ګکه وه - کيښوده - چه په ښچه به ئې او وهله - نو سړې به تر نه راووت -
سوداګر به لاړا او د غونډئ د ويخ نه به ئې نوکر ته اواز ورکه - چه هر څومره لعل وجواهر
د دې غنډ ئې په سر موجود دی - لاندې ئې را جار وکه - چنانچه نوکر به د حکم تعميل
اوکه - او ټول لعل وجواهر به ئې خکته سوداګر ته راګوزار کړه - پس د هغې نه به نوکر
دراګوزيدو ښيښنه اوکړه - نو سوداګر به جواب ورکه چه راګوزيده ناممکن دی
ستا نور پرې روز په دې ارمان مره شوی دی - چار و ناچار نوکر به مرلګ ترغاړه
کيښوده او يوڅو ورځې پس به مړ شه - سوداګر به مالا مال کور ته را روان شه - او د
ځنګښې د پاره به ئې د نوکر تلاش کوو - کال تير شه - او د شهزاده د خدمت وخت راغې
شهزاده ئې د ښار نه بهر بوته - او حسب معمول عمل ئې ورسره اوکه - هو کله چه
مارغه څرمن اوچته کړه - او په غره ئې کيښوده - نو به ښچه ئې او وهله - او شهزاده
تر نه راووت - سوداګر د غره ويخ ته لاړ - او شهزاده ته ئې اواز ورکه - چه څه مومې نو را
جار وئې کړه - شهزاده د حکم تعميل اوکه - او پس د هغې نه ئې د راګوزيدو درخواست
اوکه - جواب ورته حسب معمول ورکړې شو - شهزاده خيال اوکه - چه هسې هم
مرلګ دې - را شه لاندې د دې درياب ته او دانګه او قسمت ازمائي اوکړه - نيت ئې اوکه او
را ويې نګل - هغه مهيان چه ده ئې پالنه کړې وه - د يو جاله په صورت کښې د ده د بچاو
د پاره جمع شول - او د ئې بچ که - د مهيانو بادشاه په ځان سوړکه - شهزاده او وې -
چه ما اوس خشکۍ ته اوباسې - چنانچه خشکۍ ته اوباسلې شو - اتفاق دا سې او شه - چه
دې بيا د سوداګر ښار ته راغې او په سوداګر پېښ شه - سوداګر نه پيژاندو - د هغه

خوشقین وو ـ چه مړ به وی ـ چنانچه ورته ئی اووے ـ چه نوکری نه کوی؟ دی وی ولی نه کوم د نوکری شرائط طے کړے شو ـ کال تیر شو ـ او د عمل وخت راغے ـ د سبا د نه بعد خواهلاله کړے شوه ـ او شهزاده ته به د مے کښ د نوتود پاره اوویل شو ـ شهزاده لا علمی ظاهره کړه ـ او سوداګر ته ئی د نمونے پیش کولو د پاره درخواست اوکه ـ سوداګر نمونه پیش کړه ـ او پخپله په کښی ننوت ـ شهزاده موقع بیا مونده ـ خرمن ئی غونډه کړه ـ او وی ګنډله ـ مارغه راغے ـ او خرمن ئی سره د سوداګر اوچته کړه ـ دغنډی په سری چه په بنجه اووهله ـ نو سوداګر نړد را اووت ـ شهزاده د غنډی د و پنځه اواز وکه ـ چه خه موی دا ټول را جار وکه ـ سوداګر د حکم تعمیل اوکه ـ او بیائی درا کوزیدو د پاره درخواست اوکه ـ شهزاده ورته اووے ـ چه ډیر ځوانان دی تباه کړے دی ـ ولته به بنده ئی ـ ته هم اوس د امزه اوڅکه ـ سوداګر چار و ناچار د خدائی له کړو صبر کړه ـ د سوداګر څخه خبره شوه ـ هغه هم د سوداګر د ظلمونو نه ډیره تنګه وه ـ مناسب ئی دا اوګنړله ـ چه شهزاده سره واده اوکړی ـ شهزاده سره واده شوه ـ سوداګر درمه مال جمع کړے وو ـ چه د بادشاهانو خزانے ئی مخکښ هیڅ وی ـ شهزاده یو قسم بادشاه شو ـ او سخاوت ئی شروع کړه ـ د شهزاده پلار چه دا شهرت واوریده ـ نو د دوستی خیال ئی پیدا شه ـ او شهزاده سره ئی لیدل اوغوښتل ـ شهزاده ئی سلام ته لاړ او په تعظیم شه ـ او ټوله قصه ئی ورته بیان کړه ـ چه دا هر څه د معمولی نیکئ جزا ده ـ کنی زه خو نا هم ملک بدر کړے ووم ـ او سوداګر هم د مارغانو خوراک کړے ووم خدائی ته منظوره نه وه ـ او هغه مهیان ئی ځما مدد ته را ولیګل ـ چه ما سره ما ډیره معمولی نیکی کړے وه ـ پلار ئی ډیر خوشحاله شو ـ او د ځوئے په سخاوت ئی افرین اووے ـ

چنانچه ثابته شوه ـ چه د نیکئ ثمره ورکیدے شی ـ چانه ذرا و چانه پس :-

دنیکئ کونه بند ده په دنیا کښ   د ترقئ راز د انسان په کښ مضمر دے

دنیکئ میوه خوګه ده هم جزا کښ   هر مومن ځکه د دے کاره مخبر دے

فضل حلیم دریم کال ـ

یو غزل

(له قلمه دشاکرالله مهمند)

په گلشن باندې بیا راغلو خزان
آس په ګلو به ږیکی تور زاغان

د مراد جولئ به بیا کړمه تړلې
که تر نه شم د بقا په لور روان

چه استوګنه د انسان به هلته او شي
چه تړلې شي په کور کښې چارپایان

چه په خپله د بیوه خولی له ورددرومی
خله بیا پرې کړمه وی غریب چوپان

چه په سینه ګیره خیال کاندی دجونو
د هغې سرې نه څوک به وی نادان

لکه خاورے داو بو په مخکښې درومی
د دنیا نه هسې تله کاندی یاران

مرتبه د یوسف په بره شوه بلنده
چه قبول د زلیخې ئې کړو زندان

په زخمونو باند مالګه م دوړیکی
څه چه تا ویـنم رقیب سره خندان

معشوقه چه د عاشق په رضا درومی
بیا خبر نه وی د ځان او د جهان . . .

چه د عشق میرګی پرِ ناست وی جوړ به نشي
که را جمع کړې د ملك ملایان

آئینه م د ړه هسی رنګ صفاده
نن دا ره په کښې کوم د درست جهان

که د پلار او که نیکه و و هغه څه شو
وا ړه بیامو ند و خپل ځائے په ګورستان

نه د هغه پلار ئې حوے هم ئې نوسی ئې
داسی حشر به راځی هم ستا په ځان

لله څه سبه خو هم پکار دی په دنیا کښې
داسی نه چه به جوند ے ئې جاودان

اے شاکره پټ جړاکړه د عالمه
چه خبر در باند نه شی رقیبان

"لاحول ولاقوة"

(مزاحيه)

دکالج پرانستي کيدو او څمونږ دکلونه دراتلو څلورمه شپه وه ـ لا هغسې دکلي خيال دهلکانو درپه نه او تے نه او ـ دشپې داوکدو تراوږے کولونه پس مونږ داسي ستړي شو چه کټ کښې پريوتو سره ددنيا ومافيها نه ناخبره شو ـ

لا ستړګے مونږ وي ورغلے ـ يعني څما دا خيال وه چه کني زه اوس په خوب ننوتے اوم چه ناصاپه په ځاسته کښې څائے په ځائے ږ زغهار شو ـ دخوبه فوراً په هيبت کښې بيدار شوم ـ اول خوم خيال او چه کني روس حمله کړے ده ـ ليکن بيا خيال راغے چه دمونږ ګذارونه خوبه داسے نه وي ـ ولے چه دا ږغهار ځائے په ځائے داسے معلوميده ـ چه ددروازو د ماتولونه رازي ـ

بس دهيبته رابانذي لرزه اولګيده ـ ولے چه ماخيال اوکه ـ چه چرته غله ځاسته نه راننوتي دي ـ اوورونه ماتوي ـ اګرچه ګرمي پيره سخته وه ـ خوزړه مې برستن په ځان راواچوله ـ او ځان مې ښه اونغښته ـ چه پيره کني که نورخلق غله لوټي نو اودلوټي خوزه خوبه پټ شم ـ هم هغه متل رابانذې ثابت کيدو ـ چه "ګډه چه شرمېږ او وېنې نو سترګې پټې کړي چه زه کني ماخوبه نه وينې"

ليکن زه دومره خوش قسمته چرته ووم ـ چه د دے حملې نه پټ شوے وے ـ ملکه ساعت کښې څما په کمره هم درزهار جوړ شو ـ اوداسي معلوميده چه تنبې ماتيږي ليکن ماغوږونو کښې ګوتکلے ورکړي ـ او خپے مې غونډې کړي ـ ليکن بيا هم څما په غوږونو کښې دورود ماتولو اوازونه راتله ـ پو درز اواز په زوره او شو ـ او څما کمره لړې شوه ـ او دخپو کښار مې ترغوږه شو ـ ماکښې چه څه وېنه پاتے وه هغه هم وچه شوه بيا هم ماخپلے ګوتے په غوږونو کښې نورے هم په زوره اوسنډلے ـ چه زه که څه وړي نو بوبه سي ـ خوزه خوبه پټ شم ـ او په دے مې هم زړه جمع وو ـ چه څما کمره کښې د؟

څه ؟- "یو څو کتابونه د زراعت" په هغې مو نږ سبق نه پوهیږو - نو غله به څه پوه شي" - او کاپي هم داسې خالي نشته - چه څه دی هغې کښې یا خود سپلمۍ د ملغ د پښې شکل جوړ دے - یاد سره - هغه به څه کوی -

په دے کښې ماته یو آواز غوندې اوشو - او زه ئے او خوزولم - لیکن ما هم په خلوره جماعت کښې د دوه مکرر او د میړو قصه ویلې وه " - خان مې داسې کړو - چه که گوئی مرده است" -

بیا د کمرے ور بند شو - او په زهار زورو کمرو طرفته لاړو - ما هم د غوږونو نه کوتے راوویستې - او مخ مې رو رو د بړستن نه بهر کړو - کتابونو طرفته مې روکاته نو ما ته معلومیده - گویا چا ورسره چیړ‌ې هم نه وو - چه په سترگو مې نظر پرېوت - نو یو نوے منظر مې په نظر راغے - څه گورم چه د یو پلیټ د پاسه یو دوه سپینې کیچه غوندې رونې پرتې دی - فوراً خندا راغله - او د خولې مې اووتل "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ" دا پیشمنې دے! ماوی که غله راغلي وو - لکه ساه راکښې اوشوه -

چه د پلیټانه مې روډی او چتې کړے - نو څه گورم - چه د دهاتي د سره هم د الوکانو غټې غټې یو سپینه شیږ نو نے په کښې پرتې دی - روډی خوراک نه کیږو ناستم - لیکن چه د الوکانو دے غټو غټو ډکروته مې کاته نو خلق مې ازغی ازغی کیدو - چه دا به لا څنگه تیرېږی لیکن څه مې کړے وے مساته روژه وه - بیا خو مې تول ورځ څه خوړے نه شو -

خیر نوړۍ مجوړه کړه - خو الوکان څه داسې په اسانه به ماتیده - چه زه نوړۍ د روډۍ مې نوالو پلیټ کښې بل خوا او زغلې - یعنې په پلیټ کښې د نوړۍ او د الوکانو په مینځ د پانۍ پت جنگ شروع شو - چه ډیر غصه راغله - نو د الوکانو په یو ډکره مې زور اوکړو - لیکن د هغه غصه څمانه کمه وه څه - فوراً ئے د پلیټ نه خکته او دنگل - چه په بله ډکره مې زور اوکړو - نو هغې د روښۍ هم زیاته غصه اوکړه - او څماجولئې نه ئې را توپ کړو - او قمیص ئې راته ذیږ پیږ کړو -

آخر ما بانداد اوکړو - او الوکان مې په خپل ځائے پریخو - د خوراک په چارټ باندې هم ډیره غصه راغله - چه په دی کښې هم په هفته کښې شپږ - اووه ، وختله الوکان لیکلی دی

اوبیره کانوته هم ډیرغصه شوم ۔ چه دوی الوکان وړی وړی ډکړے کړلے نشی چه جوړجوړ ئی پاخه کړی ۔ خیرهغه ړومبئ روزه داسی پوئے شه ۔ چه ماپه ګهره ژنیولا :-

اخترمنیر مجروح دځلورم کال (زراعت)

دَبی ثباتئ خاکه

وره غوټه وه سوګوشی سوره ګوله — موښږ تراوسه دادنیاوه نه لیدله
دغه وخت بوراپه دوئ ولوګیده نو — شود مینکو بوئی روان ئی ترکاکله
باد موسوکړے شانه دواړو لره زلفے — زیرلبائی خندااوکړالیوتربله
کړوهار په غاړه ئی شبنم د مرغلرو — بلبلان ئی ثناخوان شوځما دلـه
په خند اشو ویل ئی څه خائسته ځائے دے — ارمان راغلی ورنه نه وود اولـه
ناګاه ګل چین قیچی په لاس ورته نزدے شه — هسکه غږئی ددغه دواړوئی پریکړلـه
څه ساعت دغاړے هار وو بیاشو خاورے — هغه خاوره ئی بل ګل ته واچولـه

حقیقت ئی ددنیاناته بیان کړو
دا چلونه دچاړ ړونه ووای دلـه

(دادل کال یوطالبعلم)

وطنه زاروطنه

له قلمه دجناب سید حسن خان "حسن" دکابل

غمونه ستامی شوه په زړه باندی انباروطنه! — وطنه زاروطنه!
ستاپه کړاوکښ می وجود شه تبول بیماروطنه! — وطنه زاروطنه!
دستاله غصه وغم — دستاله درد الم — لیمه مې ړک شولدنم — زړګی مې غوڅ شه قلم
له ستړګو وینی توی یوم ژاړم ګوکار وطنه! — وطنه زاروطنه!

تە وی ښېښتن دلوئ نام   ستا دعزت احترام   خلقو صبا او ماښام   کاوه به تا ته سلام
نن دې بې پتە ستا اولاد په هر دیار وطنه!   وطنه زار وطنه!

ستا خواږه دي بسیار   ستا ضرورت بې شمار   که ته ملائیکه د کار   وَنه تری په زیار
پاتې به نور هم پیر نه شي له خپل قطار وطنه!   وطنه زار وطنه!

مړي کفن نه لري   ژوندي چین نه لري   تار و سوزن نه لري   خپل اغوستن نه لري
داجنې په کالو ستا پول وسنګار وطنه!   وطنه زار وطنه!

داستا اولاد دي جاهل   عیش وعشرت ته مائل   دستا افراد دي کاهل   نه شي مراد تری حاصل
اثر پری نه کاندي که هر څو کړم چغار وطنه!   وطنه زار وطنه!

نه وی شرق دسر تاج   اخیست دي باج وخراج   نن ضرورت احتیاج   درنه خراب که رواج
دیښو شوی لاندي دایشیا دسر دستار وطنه!   وطنه زار وطنه!

ستر کې دي پورته که جان   وګوره حال دزمان   وار په مخلوق دجهان   مشغول د علم وعرفان
حامن دستا اخته په چرس او په قمار وطنه!   وطنه زار وطنه!

تنانه تلي اقوام   په محکښ ځوایام   که غواړي دعفه مقام   لر په سرعت ولځه کام
عزم وهمت په محکښ نښته خند وخار وطنه!   وطنه زار وطنه!

ستا محبت په ضمیر   واجب دشاه وفقیر   ستا ودانی ته تعمیل   فرض دصغیر وکبیر
خاوندسانه له پردی استعمار وطنه!   وطنه زار وطنه!

دستا ښاغلی رهبر   دی نادر شاه مظفر   ستا په خدمت کښ   ئی قربان کړی خپل سر
قدر دانی او کنړه ددا سې شهریار وطنه!   وطنه زار وطنه!

ستا احتیاج وضرور   کړم ناعلاج ورنځور   دعندلیب په دستور   وانه قو پادشه منظور
نه "سید حسن" ژړاه شیون مې د شعار وطنه!   وطنه زار وطنه!

IN MEMORIAM

Abdul Manan Wazir

II Year a Promising and

Talented Youth Expired

on 3rd August, 1940.

Deeply Mourned by All.
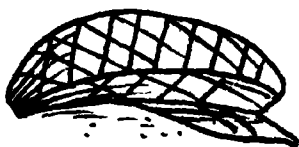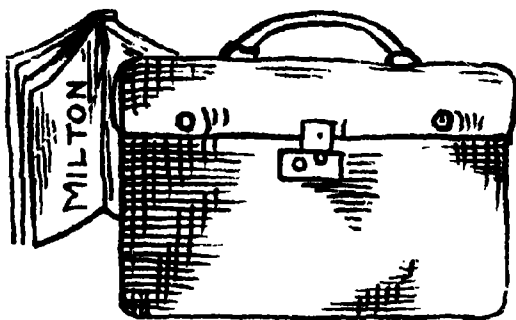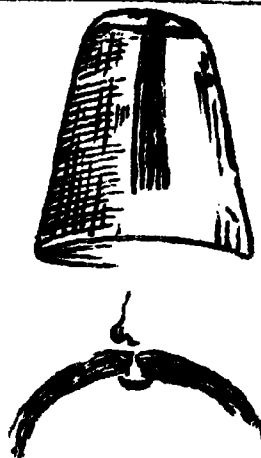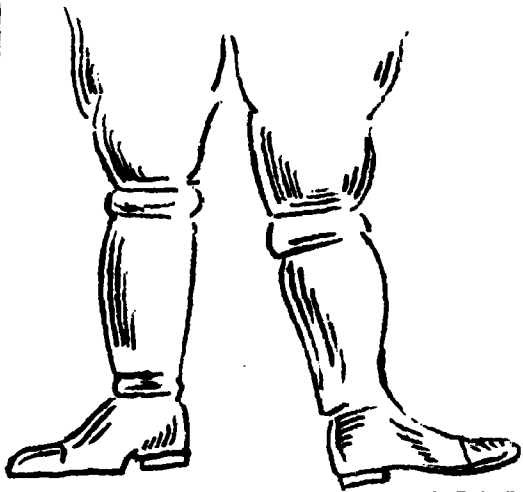
WHO'S WHO
MILTON
G. J. Asghar.

(7) "I Had A Nightmare" by M. L., I Year.

"....I have a big family and it is with great difficulty that I have **my both ends meet.** To make the matters worse, my wife is a woman who would find faults with everything. She is a happy-go-lucky woman and always wants me to try my fortune elsewhere ......she took out her sandle and began to give blows on my bald head so as to remove the hair which had not so far been the target of nature......."

(We piously hope that all this is, as you say, "a nightmare"— and not an actual picture of domestic bliss. If you are single you should beware, if married, repent and think out ways and means of becoming a widower. If, however, you are already a widower, we are quite sure nothing will make you change your state.—Ed.).

(We thought that the age of prehistoric monsters was over! Your 'rhythmical prose' is as freakish as your appearance. Cut out the rhythm next time.—Ed.).

(4) 'On Becoming an Ideal Ghotoo" by A. J., II Year.

"This pell mell state of affairs, I believe owes its existence, inter-alia, more to the ambiguous nature of the term Ghotoo than to anything else. It is held offensively by the common parlance and more so an invidious task to justify its identity and allot it a space in one of the leading dictionaries."

(Something is rotten in the 'pell mell" state of your brain: It is an 'invidious task' to unravel the identity of your thought in the 'ambiguous nature' of your article. Try again.—Ed.).

(5) "Fencing" by G. M., II Year (Medical).

"A strange sight it was! The **Ustad** with his long sandy beard, undistinguishable from his moustaches, strangely uptilted nose, so that one could peer directly into his internal nostrils which were almost choked with nose excretion..."

(We do hope by **Ustad** you don't mean **professor!** Your morbid realism is perhaps the result of your having taken up 'medical.' Luxuriate in something other than 'nose excretion'—pah!—Ed.).

(6) "On Kings and Cabbages" or "Professors Treated with More Realism" by A. R. G., IV Year.

"....I have always loved my teachers for their intellectual beauty, but only a few can withstand the ordeal of physical grandeur. Professors are good in their own way; if they are seen from a wrong corner or at the improper occasion they step out of all aesthetic boundaries."

(There is promise in your article but we are afraid the professors may not think it proper to be viewed from the 'wrong corner' and particularly at 'the improper occasion.' Focus your 'realism' at something more 'aesthetic,' say yourself.—Ed.).

There is a kind of writer of whom Dryden wrote:

Drink, swear, and roar, forbear no lewd delight
Fit for thy bulk, do anything but write.
Eat opium, mingle arsenic in thy drink,
Still mayest live, avoiding pen and ink.

But you are not one of this sort. There is hope for you. You can write with impunity. If you persist long enough, who knows through the purging effect of the W.P.B., you may one day sit on the editorial chair.

(1) H. K. B. IV Year.

"These two parties still divide the world,
Of those that have and those that want....

....We cannot with one stroke of pen (nor with two, we assure you—Ed.) overhaul the present state of affairs." (Then why waste so much ink and paper—Ed.)...Prosperity shall reign supreme and poverty shall be consigned to the limbo of oblivion never to reappear.....(We do not know so much about the disappearance of poverty but we are quite sure **your** articles will be 'consigned to the limbo of oblivion never to appear' even in the W.P.B. if you are so darned serious!—Ed.).

(2) S. G. Z., B.Sc. (Agr.).

"Vitamin E: its absence leads to sterility—in male...., in female....while failure of egg production or infertility of eggs in birds......(Are you a married man?—Ed.)

(3) A Piece of Rhythmical Prose by H...ibne...S (The bonafide Zemindar)

"Examination,
I call upon thee!!!
I have lost all my pith and power; I have been deprived of my eye-sight.
My ears are gone; my heart beats rapidly.
My colour is yellow; my bone is **mallow.**
When I sit I look like a monkey,
When I stand I seem to be a donkey.
Examination don't disappoint me!"

romance with the background of the French Revolution: Love made precarious by adventures and hair breadth escapes. Romantic but in a wholesome ve.n. No hysteria.

The Red House Mystery by A. A. Milne. For those who relish creepy horror and hair raising crime with a dash of the detective to bring the evil doers to perdition in the end.

Available in the Penguin series.

For the Senior Students:

The Fountain by Charles Morgan. A post-war study of love, serious, philosophic and profound. One of the finest books ever written. A long one.

The Short Stories of Guy de Maupassant. Bitter ironical short stories by the greatest French master of that generation. For those who do their reading in 'instalments' and yet want that the book should hold them.

Ends & Means by Aldous Huxley. An encyclopaedic survey of the modern world by one of the most serious and disillusioned minds of to-day. 'A cookery book of reform.' Those with robust appetites need only try.

I. H.

W. P. B.

"The paths of glory lead but to the grave," so sang the poet. But the immortality of print can only be achieved by young contributors through the W.P.B. If you succeed in being served up 'piecemeal' (with proper sauce, of course) a time might come when you will be roasted 'whole' and put before a famished public. Therefore don't despair, poor rejected suitors! Perseverence can win many a hard heart.

This is what an academic critic would call art for art's sake.

There is a popular adage that great prophets are never honoured in their own country. It does not matter if you do not know him, but he knows you. I have felt several times that Carlyle's heroes are only superficially great. They are not born great. But my hero is a real blue blood. His father won famous nicknames for his versatility. My hero, the lawful descendent and, inheritor of his father's foolishness, is great to his last razor. Once he gave a long lecture on his pedigree. He has tried to prove himself a direct descendent of Don Quixote, the old Spanish Knight-errant. He seems like a Knight except for his Knightly entourage; but when he enters with his professional and poetical 'finesse' about him he reminds me of the Spanish Knight attacking the windmills.

ABDUR RAHIM GHEBA,
IV Year.

Book Page

There is the classic howler about a student who said that he had read **Robert Louis Stevenson** by Thomas Hardy and another one who asked his teacher after the latter had been eloquently discoursing on Keats, "Sir, what **are** Keats."

One of the major faults of the Indian system of education is the undue emphasis laid on 'courses' and examinations. Very few students know what and how to read for pleasure. On this page we shall try to suggest some books for those students, young and old, who would like to throw the bogey of the examination into the background and enter with us the land of 'golden tongued romance.'

For the Junior or Intermediate Students:

Three Men in a Boat by Jerome. K. Jerome. One of the calssics of humorous writing. Especially recommended to those gloomy souls who are perpetually examination-ridden.

A Gentleman of France by Stanley J. Weyman. A thrilling

My hero has all the qualities of Carlyle's heroes. As Dante 'embodied musically the Religion of the Middle Ages'; so my hero embodies "razorically" all the nonsense of his age. When he enters the hostel before dawn equipped with his paraphernalia, many timid souls begin to quiver. Germany with all its 'ballistics' and camouflaged guns is not so terrible, as he with a razor which was sharpened last summer.

I have great admiration for his thaumaturgic gifts because with a few simple deft touches he can change a man into a different species. His time-worn Colgate, his ancestral razors, and touch-me not pair of scissors draw very beautiful geometrical lines on the face of his poor victim.

Once a student who had the good luck of getting only half a dozen cuts remarked to him, "Well, master were you ever in the Survey Department?" He shook his head and yawned a big 'no' in the boy's face. "Then where did you learn these straight lines and dots?" "Just through practice" was the natural reply.

He is a walking newspaper carrying news from one room to another. One day he entered my room at 5 in the morning and shook me out of my bed. Before I could come to myself, he had lathered my face and was ploughing his way on my face with his thick edged weapon. "Have you heard the recent news Baboo Sahib: Germany is on her way to India; and Mishter Gandhi is going to jump into the war." Before I could ask about further news, like a blatant demagogue he let loose more political revelations. In the meanwhile I felt excruciating pain on my left cheek. Good God, he seemed to be performing a major operation. But he dismissed the whole matter by telling me that it was just a little scratch that would heal up before he has finished.

He has always practised classical restraint in his art. He can make you a Baboo within fifteen minutes. Once he made a daring experiment on the present writer and metamorphosed him into something supernatural. Clip-clap and off. "O beautiful, you just look like a standard Baboo." I reviewed myself in the big mirror. "What have you done?" "Sir! I have made you a Baboo." I could not take off my cap for one week because I was afraid to display my "babooism" in shameless nakedness.

Like my three illustrious predecessors in this chair, I too am entertaining the optimistic hope of being the first president to lay the last brick of our new Union Hall. Like Tennyson's famous brook, the construction of the hall seems to go on for ever. But we are quite confident that we shall have the proud privilege of holding our meetings in that splendid hall before long.

Before I close I must express my grateful thanks to all these members of the staff, who have been of immense help to us. I must also request our worthy Patron, our Treasurer and the members of the staff to give me and my Ministry the benefit of their sage counsel and hearty co-operation. It is my pleasant duty also to thank all those guests who have taken the trouble of coming to our installation ceremony. I thank once more the honourable members of the house for their enthusiastic support and assure them of my sincere devotion to duty. As a president I belong to no party. I shall work to the utmost of my capacity to make this Union a success. It shall be a matter of great pride for me if I find, when I vacate this Chair, that the prestige of the Union stands higher than when I occupied it.

MOHD. ASGHAR.

"The Hero As Barber"

'The Hero as Divinity, the Hero as Prophet, are productions of bygone ages; not to be repeated in the new.' Carlyle was of course right in such a moderate confession. In this age of wish-me-good-day we have 'manufactured' a new type of hero who does not speak in the magniloquent vein of Carlyle's heroes but he is not one of the 'inanities' or 'theatricalities' as Carlyle (thank God he is not living) would have called him.

Old anthropologists, such as Frazer, fail to notice the peculiar significance which we attach to a barber in this era of ever-clean faces. I am told (the Editor-in-Chief is responsible for the veracity of this 'lie') that in all totalitarian States the barber is given a very important place in the political sphere. I don't know the reason for that. Presumably it is under some militaristic plan.

'Barbers are the unacknowledged legislators of the world.'

denly be engulfed in a similar turmoil. In times like these the responsibility of the present generation, particularly its youth, is great. We might have to make momentous decisions and fashion the destiny of our country, we might have to make sacrifices. But a word of caution here to the revolutionary, to the hot-headed youth, whose blood might boil at once at the bare mention of slogans like, "fight for freedom," "Independence," "sacrifices," "destiny of India." While admitting that it is the youth of a country that can determine the destiny of a nation, it must also be emphasized that problems of national or international importance are not solved by the thunderous resolutions of the fiery collegians in their debating halls. Blood and thunder speeches thumped out from College platforms are not going to solve any political problems. We may talk big of the sacrifices that we are going to make or are capable of making but to come to brass tacks, what actually can a raw youth of 18 or 20 sacrifice—apart of course from the hard-earned money of his very unrevolutionary parents! Those who sacrifice have something to sacrifice. This, among others, is the strongest argument against the participation of youth in active politics. Ours is a period of preparation, of acquiring knowledge, of developing our characters and our bodies, so that if ever the call for service or sacrifice comes, and come it must, we may by then be the sacred repositaries of courage, determination and vision.

We have a busy session ahead of us. The All-India Debate, it is proposed, should be held earlier than usual, say sometime in January, so that we may be able to attract more teams for our handsome trophy this year. In March, the bogey of the University examinations is too near to allow many speakers to indulge in the luxury of debating. Then we have the trophy for schools, so generously given by K. B. Haji Saadullah Khan. For this again, we hope we shall have the usual keen contest among school boys, who might one day become the stars of our college debating firmament. We must also thank Mr. Mohd. Salim, E.A.C., who has promised to offer a trophy for the best student speaker in the province, in commemoration of his father Abdul Majid Khan, the late M.L.A. We intend to hold, as usual, three prize debates open only to our college, which may give our speakers encouragement as well as training. As has been the tradition of this Union, well-known speakers and public men, will be invited, whenever convenient, to give us the benefit of their wide experience and to serve as models of good speaking.

may try to emulate and surpass. It must, of course, be said to the credit of these outside speakers, that they come from institutions and towns, where education, in the homes as well as schools and colleges, has been more common and along more enlightened lines, over a much longer period, than in our province. We are still in the process of conquering this handicap and any victories that we achieve, therefore, are all the more creditable for a comparatively young Union like ours. The college authorities, and particularly our English staff, are making every effort to guide and train us in good speaking. The Elocution classes, that have been recently started, aim to give expert technical training in phonetics as well as in the making and delivering of speeches.

It might be unpleasant for some of us to admit that our pronunciation is faulty and that there is great scope for improvement in that direction. But not until we get conscious of this shortcoming of ours, can there be any hope of our making really fine debaters. Not all of us, I admit can aspire to an Oxford accent, but certainly we can try, with the help of our elocution teachers to remove some of the more glaring phonetic lapses from our speech.

During my tenure of office I look forward not only to the improvement in the manner of delivering speeches but also to the matter of those speeches. It is no mere truism to say that the world is passing through one of the most critical periods of its long history. At no other period in the life of man was there greater need for clear thinking and wide-eyed discrimination. Not philosophy but science has put everything in doubt. Morals, politics, social institutions, arts, religions, all are in the melting pot, all are subjects of fierce debates. A philosophy of nihilistic doubt and meaninglessness is in the air. To all serious thoughtful minds comes the tragic realization, "There is nothing left remarkable beneath the visiting moon." Gradual disillusionment and a ruthless devaluation of all values has led the present generation to a Godless, Loveless universe. In a world that is so emptied of values, men are dangerously prone to suggestion, to propaganda. Hence the hard, ferocious theologies of nationalistic and revolutionary idolatory. Hence Hitler and Mussolini and the hell of ruthlessness that is let loose on Europe. Hence also the necessity for circumspection, for clear and bold thinking. There are ominous rumblings of the thunder of war, in Near East and who knows this complacent land of ours may sud-

Presidential Address

Gentlemen,

It is with deep feelings of thankfulness and gratitude that I address you, the honourable members of this house, for having elected me the President of the Union. I am profoundly conscious of the great honour you have done me in elevating me to this office of great responsbility and dignity. For this, I thank you, gentlemen, with all my heart.

As I look back on the brief but hectic days of our electioneering campaign, there is one unusual feature of it, that strongly reinforces the pride that I take in my success. Never before, as far as I am aware, has the electorate been so unanimous in their enthusiastic and spontaneous support of a President-elect, as they have been of me. This fact is peculiarly gratifying to me, when I think of my relatively quiet and unambitious standing of only one year in this institution. I refer to this distinctive feature of the election, not only because it flatters me, as flatter it does, but because it is a symbol of the impartial and truly democratic nature of the Union and its voters. The Khyber Union, I am proud to say, elects its office-bearers not because they are simply figureheads of a party in power, but because they have merit. I thank you again, gentlemen, for reposing your confidence in me. I assure you that I shall try to the utmost of my power and capacity, to deserve this confidence by preserving the great democratic traditions of this Union, and enhancing its prestige in the world of serious and dignified debating.

The purpose of this Union, if I may remind you, is to provide opportunities for practice in public speaking and to promote corporate and social life among the students of the college. During its relatively brief span of life, this Union has already produced speakers and debaters of marked distinction but if it is to come into serious competition with the older college Unions of Lahore and other University towns, we shall have to engender among ourselves a still greater keenness and enthusiasm for correct, forceful and eloquent speaking. The All-India Debates, which we hold every year, bring to our platform fine speakers of all-India fame, whom we

Trophy tournament. Sher, another old captain of our cricket club and a University blue, was included in the team.

* * * *

Athletics.

Rashid is the new Captain. Prof. Latif the Superintendent, as enthusiastic as ever, is doing his utmost to bring in burly athletes against Edwardes College. We hope to recover the trophy this time. Anwar it is hoped will create one or two new records.

* * * *

Tennis.

Chuni our tennis wizard has come back again. In Provincial Championships he went as far as the final both at Hazara and at Peshawar. Unfortunately he could not become Frontier's No. 1. However with his coming into the college pair we are almost sure of winning back Col. Keen Cup from the Edwardians.

* * * *

Scouting.

About the Rover Scouts we have heard nothing so far except that Mr. Ramzan has been appointed as a Rover leader!

* * * *

Hiking.

Our Principal Dr. Malik himself a great hiker started this club last year. During summer vacation the club had a very successful trip to Kashmir with Prof. Zia-ud-Din. It was a twenty days trip and we returned on the 22nd of July to our homes in the plains carrying with us remembrance of comradeship and endurance under difficulties and of the eternal snows of Amar Nath and the great mountains which surround our country, a perpetual challenge to youth and adventure.

We have been promised trips to Swat and Kabul after University examinations by Prof. Zia-ud-Din, the President of the club.

We elsewhere publish a more detailed report of our Kashmir trip by the President.

ALI MOHD.

time and patience to train the new 'finds.' In the good old days of our college the problem was whom to exclude from the team; during the last two or three years the problem was as to whom to include. Once again we have an army of footballers, the Captain and the Superintendent find it difficult whom to exclude from the team.

* * * *

Football.

Prof. Muttalib is the new Superintendent and Anwar is once again Captain. During his last captaincy he took us as far as the final of the University. We have already had an easy victory against the Gordonians with nine goals to nil. Against Edwardians we had a tough fight. But we defeated them with two goals to one.

* * * *

Hockey.

Habibullah is Captain. He has got in his army old veterans like Saif and Aziz. They play regular matches and we have high hopes attached with this team. We hope to go far in the University matches.

* * * *

Cricket.

The cricketers have Dr. Imdad Husain as their Superintendent, and Hamid Tajik as their Captain. The opening of the B.T. classes was lucky for the club in bringing back last year's Captain. Then we have the Kaka brothers, Balbir and Jagjit as well as Nisar and Shereen. The team has played and won some good matches. Hamid, Balbir and Jagjit went for University trials to Lahore and performed extremely well with the bat and the ball. But for the favouritism in picking up the University team, we are sure our boys were good enough for the University Eleven. This was amply proved when Hamid in one innings and Balbir in the other, were the highest scorers in the Ranji Trophy match at Peshawar between the N.W.F. and the N.I.C.A. We look forward most optimistically to our first University match against the Lyallpur College.

It was a matter of great pride for us that our old cricket Captain, Latif, captained the Provincial team this year in the Ranji

Day Scholar's Association.

A. N. Bedi, IV Year and Ghaus Mohd., IV Year are respectively, the Vice-President and the Secretary of the Association. It was creditable on the part of the Day Scholars to win the Hot Weather Inter-Hostel matches. We expect another great trial of strength in the Winter League Matches.

* * * *

The Scientific Society.

The Society has once again been put in the capable hands of Professor Mirza Anwer Beg. We cherish every hope that he will infuse a new life in it and that the Society will give a good account of itself this year. It has already started its interesting activities and we had a very instructive as well as interesting talk on A. R. P. by Dr. T. M. Khan. The honourable president entertained the audience by frightening them with explosions and then demonstrating the use of the gas-mask.

The most interesting feature introduced by the Society is the starting of hobby classes in the college which will be of immense use and benefit to the students.

ALTAF HUSAIN.

* * * *

ROUND THE PLAYGROUNDS.

The autumn term, though generally very dull as far as lecture rooms and debating halls are concerned, provides for the greatest activity and interest in the playgrounds. Every afternoon the beautiful cricket and tennis lawns, the football and hockey grounds and the athletic turf are speckled with smart, active sportsmen who give the college a lively and healthy appearance. The morning mass-drill, after a temporary lull during the month of Ramzan, brings even the book worms out of their rooms to breathe the fresh air for about half an hour. As the various university and inter-collegiate contests are approaching, the Superintendents and Captains of all games are busy giving their teams regular practice. Many of our old veterans have rejoined us, still it requires a lot of

nued this year. We had the privilege of listening to Moulana Syed Sulaiman Nadvi last year and the distinguished visitor of this year who has already intimated his kind acceptance of our invitation, is no less a person than Moulana Abul Ula Maudoodi. It is expected that he will address the students some time in January.

In the last meeting of the society on October 27, a learned discourse in the "Sermons' Scheme," was given by Syed Adeel Akhtar, Principal, Madrisa-tul-Wa'azeen, Lucknow. The subject of the lecture was

تدبر فی القرآن

In addition to the usual theology classes we have now afternoon classes in which the more enthusiastic students are taught to specialize in Hadees and Tafseer. Another new feature of the Society is the Saturday evening class to promote the serious and thoughtful study of the Holy Quran in the light of modern knowledge. It is a matter of great pride for the Society that such distinguished personages as Qazi Meer Ahmad Sahib and Mr. M. A. Soofi, are showing a keen interest in these classes. Our thanks are particularly due to Qazi Sahib, the patron of this class, for participating in these discussions and stimulating further interest. It is an index of the work of our College Dean, that he should try to promote such intelligent interest and study of our Holy Book.

* * * *

Oriental Society.

Following are the office-bearers of the Society.

Vice-President—M. A. Nasir, VI Year.

Secretary—S. Sulaiman, II Year.

Asstt. Secretary—Salah-ud-Din, II Year.

The Society proposes to hold a big Mushaira in Urdu and Pashto, at which the well-known poets of the Province will also be invited and prizes will be given. It is also proposed to hold "Farshi Mushaira," a poetical symposium in the true Oriental manner, where all present sit on a carpet instead of chairs.

So much so that some of them made a mention even of their having been 'Secretary of the Tutorial Group 1934-35', 'Secretary of the Hostel Literary League 1937-38' and 'President of the Hostel Dramatic Club 1939-40' which, no doubt, made a serious appeal to the hearts of not a few.

*   *   *   *

Khyber Union.

Mr. Mohd. Asghar, VI Year was elected as President with an overwhelming majority and deserved the homage paid to him by his voters. The Vice-President, Mr. Mohd. Afzal, IV Year was elected in very much the same way as the President. The only election for which there was a keen contest was that of Secretaryship. Mr. Altaf Husain, IV Year, though elected, had only a majority of 27 votes, while in all other cases the majority was no less than 100.

We congratulate heartily the newly elected Ministry. It has a very crowded session ahead, and we hope that the President with the help of the Cabinet would prove equal to the great task.

[The Presidential address is printed elsewhere in this issue.]

Khyber Athaeneum.

Mr. Mohay-ud-Din, VI Year, has been elected as the Vice-President and Mr. Ijaz Hussain as the Secretary. They have already demonstrated their efficiency and co-operation. They have chalked out a busy programme for the session by arranging a series of lectures to be given by many learned scholars. Provision has been made for the entertainment of its members by holding a few "Socials" during the session. Mian Fazle Rehman is to be congratulated on his expert sense of showmanship.

*   *   *   *

Majlis-i-Islamiyat.

In an election held on October 9, 1940, Mushtaq Ahmad, II Year was elected the Secretary. The practice of the past year of inviting the learned theologians of India to this college, is being conti-

exhibited considerable virtuosity and though we were promised that he would make us dream, the audience was obviously in no dreaming mood.

"Kamra No. 5" by Imtiaz Ali Taj was a great success, partly because it was in Hindustani and partly because it aimed, like all light comedies with a blend of farce in them, at entertainment pure and simple. Professor M. F. Rahman acquitted himself admirably as the harassed doctor of the lunatic asylum. The difficult role of the Insurance Agent was sustained with distinction by Burhan, while Barkat (Actor), Mushtaq (Hakim) and Inayatullah (Editor) also deserve the need of praise.

Our best wishes to the Islamia College Dramatic Club!

M. A. LATIF

*   *   *   *

College Elections.

The thrill of the University matches was great, but that of the College elections was greater. The students had been looking forward to the happy days of Annual Elections throughout the summer vacation, and were comparing notes as regards the relative merits of the aspiring and the deserving candidates long before the opening of the college. At last the long-looked-for days came with their usual excitement and bustle.

The candidates, as usual, were much too cautious and on their guard against missing saluting any of the firstees and thus incur his displeasure and lose a vote. An amazing degree of party discipline and organisation was witnessed this year. Localism or the regional consideration was conspicuous by its absence. Those whose hobby it was to make a collection of the various handbills of different candidates met with greater success and were exceedingly encouraged this year. There were no less than 11 candidates for the Cabinet membership of the Khyber Union. Next year, we expect a still larger number of the first year availing of this golden opportunity of making themselves important and preparing a ground for the progressive realization of their hopes and aspirations in the college.

An interesting feature of the election this year was the fantastic array of qualifications on the hand-bills of many a candidate.

Class I, in the premier institution of Northern India. We heartily congratulate Prof. Latif for having been chosen against such stiff competition. But we cannot help recording the great loss that we have suffered in losing a professor of Mr. Latif's ability and personal charm. We wish Professor Latif the best of luck and hope that he will not fail to visit his old college now and then.

G. J. ASGHAR.

* * * *

A Mixed Dramatic Grill.

After nearly two months' strenuous training, Dr. Imdad Husain and his Dramatic Club staged two one-act plays in English and Hindustani respectively. It behoves the critic to be indulgent in his appraisal of amateur theatricals, and this notice will, I hope, be found to err more on the side of generosity than carping criticism or cynical understatement.

The English play—"The Last War" by Neil Grant—was literally food for serious thought but it seems to have proved a little too much for the mental digestion of the audience which consisting mostly of students, failed to see the point behind the allegorical representation of a theme of such immediate relevance to our distracted world as war. Those of us who were disposed to assimilate the play found our enjoyment utterly ruined by the exasperating chatter of small school boys. Why were they even allowed to come near the hall? This is a question that I have been asking myself in vain ever since. I hope Dr. Imdad Husain has learnt his painful lesson, though at the cost of what might have been a moving play. What a pity!

The lion's share of the honours should go to Dr. Imdad Husain himself. He gave a faultless rendering of the bewildered, worn-out, disillusioned cockney soldier, and his make-up was all that could be desired. Among the students, Rahim (Serpent) and Shirin (Angel) rose well above the level of mediocrity, and both spoke their lines extremely well. The Horse (Abdul Ali) neighed realistically enough but I wish his memory had not been prodded so often by the prompter.

The play was followed by an agreeable musical interlude when Manzoor Ahsan entertained the audience with a violin recital. He

and we are sure many a slacker had a 'stinker' from his people as a result of Mid Term test reports.

*   *   *   *

Elocution Class.

Among the many new schemes for improving the standard of this college, we have had the Elocution Classes, started last year. It is more and more being realized that good pronunciation of this very difficult language, English, is an invaluable asset to a student's personality. In our age of hasty judgments, people are usually judged by their pronunciation. The advent of some new members of the staff has made the student-world pronunciation-conscious. Professors Timur, Imdad Husain, M. A. Latif and A. L. Farooqi have been trying to train up all those enthusiastic students who aim to become good speakers and debaters. It is a healthy sign for the College Union that it has established a liaison with the Elocution classes.

*   *   *   *

The Staff.

It has been a session of surprises so far as the staff is concerned. Prof. Ahmad Ali Sadiq Quraishi has gone on three months leave to see if the climate of Kalat suits him. We miss him from our midst but wish him every success in his new job. We had hardly recovered from this surprise when the news came that our two new acquisitions, professors Makhdoomi and Farooqi had been offered the Headmastership of the Central Model School, Lahore and the Principalship of the Anglo-Arabic College, Delhi, respectively. Both these gentlemen had endeared themselves to us in a surprisingly short time and we shall be genuinely sorry to lose them. But as they are going to better jobs, we cannot blame them for leaving us. We hope they will have as pleasant memories of this college, as we shall have of them.

As we were going to the press the news came that we had been deprived by fate (in the shape of the Government College, Lahore) of one of our best and smartest teachers, Prof. M. A. Latif. It is a matter of pride for our institution that an old boy and a professor of our college has been chosen for this prize job of P.E.S.

is one of the patrons of the college. A grand Tea party was given in his honour in the Principal's lawn. Many distinguished personages of the province were present at the occasion. The Begum was entertained by the ladies of the college. The Nawab went round the college and viewed it with great appreciation.

*   *   *   *

Lecture on Air Raid Precaution.

Mr. Tollinton gave an informative talk on A R. P. on November 16. The lecture was well attended and the significant nature of the subject greatly interested the boys.

*   *   *   *

Lecture on Diatetics.

Dr. Abdul Majid, M.B., B.S., a distinguished medical expert gave a lecture on 'Diatetics.' His human and comprehensive grasp of the subject rendered it quite interesting. The question of 'what to eat' is not so puzzling as the problem of 'how to eat'. But the learned doctor gave certain practical hints which can be very useful. This lecture is one of that ambitious series which has been recently started. The question of general health is gaining considerable importance in the college.

*   *   *   *

The Tutorial System.

At the instigation of the Principal there have been some modifications of the Tutorial System. To establish a closer contact between the Tutors and their wards, the tutors have been instructed to meet each member of their group at least once a month at their own residence and by tactful encouragement of mutual familiarity, it is expected that the tutor will be able to know more of his ward, his finances, his home environment, his ambition in life and so on. These meetings, of course, will be in addition to those held on Sunday mornings. Some Tutors have already taken their groups out on excursions and some more are planning picnics and outings.

The parents and the guardians of the wards are being kept informed about the progress of the students in studies and games

To tackle this difficult question a Committee has been appointed under the presidentship of Kamal Yar Jang of Hyderabad, Deccan. We are not in a position to say anything about the rest of its tour but as far as its activities in our college were concerned we can give a fair idea. The Committee took its evidence from several professors of our college, including Prof. Timur, the Dean Sahib, Hafiz Osman and others, on the 19th of October. The Committee had already issued an inordinately long questionnaire and in their evidence struck perhaps a bit too closely to it. Prof. Timur, who as we all know, has some very clear cut notions on education, wanted to drag the Committee into a discussion of general principles which it is said, they refused to do. We hope anyhow that the Committee was able to get some useful information from our institution.

* * * *

Lt.-Colonel Campbell's Visit.

Lt.-Colonel W. F. Campbell, Adviser to His Excellency the Governor paid a visit to the College. The Principal Dr. O. H. Malik took him round the college buildings, science laboratories and playgrounds. He greatly admired the general cleanliness and watched our college teams playing in their respective grounds.

* * * *

Mr. Wheatley's Lecture on Phonetics.

Mr. Wheatley, a well-known phonetician and one time a professor of Elocution paid a visit to our college and gave an illuminating and amusing lecture on "The Essentials of Good Speaking." As our Elocution teachers have already whipped up an enthusiasm in the college about matters of pronunciation, Mr. Wheatley's lecture was well received. Those of our professors who 'know' said that although Mr. Wheatley's own accent was at places slightly 'cockney', he proved himself to be a good reciter and mimic. His rendering of the Seven Ages Speech from "As You Like It" was particularly good.

* * * *

H. H. the Nawab of Rampur's Visit.

H. H. the Nawab of Rampur accompanied by H. H. the Begum visited the college on the 23rd October. The worthy Nawab

the feeling which attacks every new-comer. Any how we wish them good speed and may they prove worthy sons of the college!

B. T.

Many extensions have been made in the college activities. The demand for properly trained teachers which had continued unabated for a long time, can now be satisfied in our own province. The first B.T. and S.A.V. classes have been opened. An additional staff is appointed to work out the scheme successfully. It is a matter of great satisfaction that the indefatigable energies of the Principal and the sincere co-operation of the staff have culminated in the carrying out of a very ambitious scheme.

The Kamal Yar Jung Educational Committee.

The long years of intellectual slavery have so perfectly drugged our moral and national sensibilities that we have never been able to avoid the seemingly imminent destruction. For the cultural and educational growth of any country, it is necessary that a perfect scheme should be prepared before any line of action is chosen. Sir Syed Ahmad Khan who could diagnose the disease of the Muslim community worked out an educational scheme for imparting western education to Muslim youth. At that time there was no idea of importing 'westernization' lock, stock and barrel, but now we have reached a critical point which is bewilderingly difficult. We ask in wonder what should be the aim of education? What should be the educational curriculum which can save us and our Islamic culture from the sinister shadow of self-destructive materialism? But there comes no reply except the vociferous demand for a complete reorientation. Reorientation, yes, good; but what sort of reorientation? And alas there is no reply except the multiplication of diverse schemes which are either begotten of stagnated theology or blind nationalism. Our educationists lose themselves and their heads too, in a heap of chimeras and impracticable schemes.

We can certainly add coals to a fire but lighting of a new fire is always a serious business. We who are already moving through the eddies and swirls of a vague national idea have got into a new fit. The crux of all higher education is to deprovincialise it. But if we impart education on the basis of communal distinction, I am afraid, we are cutting the roots of a tree whose branches we are trying to preserve. Any such attempt would be suicidal to our national solidarity.

College Notes

The curtain is up and once more we are surrounded by the same academic atmosphere with its austerity and grave silence. We went out in an holidaying mood, and we have come back, if not graver, at least burdened with some responsibility. Before we could exonerate ourselves from the possible charge of boyish levity, the mid-winter tests met us half way. In the vacations, we had been reading lessons from the 'vernal wood' or hearing 'sermons in the running-brook', or at least eating mangoes in some shady orchard; but this Wordsworthian pretext for idleness is no more a useful instrument to escape the examinations which are so indispensible. The lackadaisical happy-go-lucky chap who might have looked at his books—'a mighty bloodless substitute for life'—with indifference during the vacation is again full of academic sing-song and H_2O policy.

'We dissect to murder' and we read to fail.

* * * *

College Admissions.

As in the month of May some "suits" and "Chadars" had come to seek admission, similarly when the college reopened on the 1st October we had more new-comers for the III Year class and M.A. This time our college has been able to attract many intelligent academicians and sportsmen. It has become almost an editorial tradition to play literary pranks with those who run away from their homes and come to the college to 'lose their souls in the blissful smotherings'; but this time we accord them a more agreeable welcome. This time a new-comer who had just escaped 'from the pelting of the pitiless storm' made a very virulent speech against the humorous charge of some of the boys and after a very masterly display of oratory heaved a sigh like Hassan the camel-driver,

'And curs'd the hour, and curs'd the luckless day,
When first from Shiraz walls they bent their way.

Some of you would call it nostalgia. It is not so. Presumably it is

Charivaria

Professors Makhdoomi and Farooqi came to this province, to look at the Khyber Pass. Since they can't see it now, they are going back.

* * * *

The college authorities are very loth to provide water to Prof. Latif at Burj Hari Singh because they are afraid of causing serious unemployment conditions among the ass-community.*

* * * *

Dr. Imdad Husain's new house is reaching completion. It is whispered that it will give him more favourable conditions for composing an "Elegy on the College Churchyard," than he has hitherto possessed.

* * * *

Professor Ashraf's impression of the college is that it has low roofs and still lower doors. We refer him to Mirza Anwar Beg.

* * * *

Why are staff tennis lawns so worn out and patchy? Due to the friction caused by the old balls.

* * * *

Master Sandhe Khan, we hear, has declined to preside at the lecture which Sh. Timur proposes to give on "Non-Violence in Football or If you are kicked on one shin offer the other."

* * * *

No indignant father whipped out his revolver on seeing our last dramatic show with the 'mixed' cast. Some call it progress, others lack of self-respect.

* * * *

Dr. Malik is indefatigable—like his horse.

I. H.

---

*NOTE.—The actual member of this community, referred to here, is a female of serviceable middle age. Prof. Latif, we hear, is auctioning it to the highest bidder, before leaving.—Ed.

only by the students in the universities and colleges who will be the future leaders of the nation. In every sphere of life our country is to create new things, make discoveries and add to the world heritage of literature and art. Creativeness is the sign of life.

It is a misfortune that up till now all students' federations in this country have been affiliated to one or the other of the political organisations. I consider that my conception of a students' union or a federation be put forth. When all is said, a students' union can have only an academic attitude to all such problems which confront the youth of to-day. By an academic attitude I mean an attitude in which we try our best to evaluate the various processes going on around us, the various claims put forward by the different political and social organisations of our country and then to pronounce an unbiassed judgment upon them. Beyond that we cannot go. We can only acquaint ourselves as best we can with the struggle that our country men are carrying on for a change in Indian life. It is an irony of fate that under the prevailing conditions Indian students cannot render any practical help. I think that it falls to our political leaders to change the conditions if they want to be sure of the students' support.

Educational conferences in this country are not as frequent as they ought to be. Students' movement in every country is the index of the awakened spirit in the youth. These movements should get the maximum amount of encouragement because "self-conscious youth will not only act but will also dream; will not only destroy, but will also build. It will succeed where even you may fail—it will create for you a new India and a free India—out of the Failures, Trials, and experiences of the past."*

ALI MOHD.,
IV Year.

*You are cordially invited to read the Editorial carefully.—Ed.

a convenient weapon to combat the college authorities. Complete democracy in an educational institution is not possible because this implies an equality between the ruler and the ruled. Without discipline I would consider my education incomplete. The teachers are in the place of parents to us, who look after our physical, moral and spiritual well-being. Our resorting to strikes like industrial workers in a factory means the rejection of this relationship. This does not mean suppression of opinion and expression but it does mean a little bit of check on the freedom of our actions. Curbing the students' all round growth is not a wise policy. Nationalism must be cultivated because it is a virtue, but the students should not enter active politics; they should remain only interested observers. Zeal in young man is an admirable thing but it should not turn into 'hot-headed enthusiasm' as the old men call it.

Mr. Gandhi in his reply to the Rangoon students said, "If you want to become patriots, real patriots and protectors of the weak, espousers of the cause of the poor and the oppressed, purify your hearts first." This message and advice is equally good for us in India. Piety and learning must go together. The strength of soul and character counts in every department of life, much more so in the lives of those students who are to be the future administrators of this country. To-day our entire environment is polluted and it is really difficult to keep ourselves out of this pollution. Learning is not possible unless we possess a pious soul. In fact indifference to piety is attended with heinous vices that make man unhappy and miserable.

Students in India represent an eternal youth, and idealism. The mission of youth is to create a new world order. Everywhere there is a cry for a way out of this present muddle, ideas of a world federation of nations are in the air but no country can place a better example before the war-sick world than India. Our country is a museum of many communities. Communal problem has assumed vast proportions. It is high time for the old reactionary leaders to retire so that the young may put their heads together and find a solution for the problem which could not be settled by them in half a century.

India's aim to-day is two-fold; firstly, to strive for its own political, social and economic emancipation and secondly, to contribute to world civilization and culture. This can be brought about

In India nationalism has roused the creative faculties and it is in the best traditions of India's history to check modern aggression and claim its due and proud position in the comity of nations.

We are writhing under foreign domination, our minds in the universities are constantly moulded to suit the prevailing conditions and a slavish mentality is nourished in us. In spite of all this the consciousness of this yoke and an innate craving for freedom—which is the song of the soul—is there. It is the happy sign of the time because the only criterion of our fitness for freedom is the will to be free:

جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں ۔

The students of this country are to be the standard-bearers of the struggle for freedom. When we leave our colleges and universities we will be called upon to enter public-life and lead the masses of country. One thing is common to many students. During their academic career they entertain noble impulses but on the completion of studies these get dried up. The apparent reason for this is the problem of bread and butter which looms large before every one. This has got to be faced in spite of difficulties.

It is a matter of common observation that sexual perversions are not unusual amongst our students. Every educationist can understand the play of sex in the development of an individual's personality. "Sex is a physical as well as an emotional and intellectual activity. When it takes the form of a physical addiction, it is then that sex is evil. Addiction cannot be destroyed by satiation but tends if indulged to something more than a mere habit," says Alduous Huxley in **Ends and Means.** Under these circumstances is it not essential that sex education should be imparted to the young students when they reach the age of 16 or 17 years? I think that by sublimating the sex of the young, sexual perversion might be prevented. The conquest of lust is of vital importance for the individual. Without it the piety and the inner strength cannot be possible. Sex urge is a fine and noble thing. There is nothing to be ashamed of. But sex should not be allowed to rule over us. We cannot be true workers in the struggle for the attainment of independence unless we make the highest endeavour of our lives to overcome it.

The spirit of trade-unionism is daily increasing its sway over the students in the universities. Of late they have found in strikes

As a matter of fact I feel convinced that it is only the educated unemployed who can be the cause of an Indian Revolution. So many times has it been proved by the curbing of the revolutionary activities of the masses, more especially of the Indian youth, at the hands of Mr. Gandhi and his henchmen. Students need no more be pawns in the hands of political leaders and should, by realizing their own strength, throw in their lot to fill the wide gap between the favoured few and the starving millions of this vast sub-continent.

The attitude of the youth towards religion is greatly shocking. It is but essential that an atmosphere of secepticism should pervade especially in the present day collapse of international morality. Most of us are already drifting in the stream of modern irreligiousness and some are in a hesitating mood. Being young and raw we can always be led astray by the atheistic current of the west, where religion is always a changing thing like the dogmas of science. "Religion will not regain its old power until it can face a change in the same spirit as does science,"—This is the western conception of religion. The sinister 'isms' of modern times have blinded us to the ultimate reality and this is a sure and helpless drift towards the final destruction, though the world has already reached the very brink of it. "Man frequently wills his own hurt, his own injury, his own debasement, his own destruction."

Now when the world is undergoing an ordeal never seen before, nationalism is condemned in good faith from all quarters because it has failed to give to humanity what is most desired—peace. I would be the last person to defend the narrow aggressive nationalism of western totalitarian or democratic countries. To them country is the greatest of all new gods:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے۔

But nationalism, in so far as it stands for a nation's own development and freedom without interferring with others, has nothing in it to be despised. As a matter of painful historical fact the garb of nationalism has been used to commit the most heinous crimes against mankind. But this should not make us discard nationalism as something hostile to human nature. Our young students in the universities have to guard against a vain cry of internationalism. Culture and art is a common heritage of the nations but it would be the retardation of these to bring forth a monotonous unity in them. I believe that *it is only through diversity that unity manifests itself.*

Bradley who assumed a sit-on-the-fence attitude during the debate rises and makes a speech in Professor Moulton's Inductive method of criticism. He also said something about his own method which I can hardly recount.

Shakespeare chuckled like his own Jacques and said "there is the rub."

The German critics were given no opportunity to speak, because Shakespeare, quite contrary to his habit, admitted his ignorance of German language.

Suddenly the invisible orchestra breaks into a mad jazz. The face of Shakespeare began to assume a preternatural transformation. The spirits began to vanish one by one. The orchestra gave an organ note, and lo the room was as empty as before:

> We are such stuff
> As dreams are made on, and our little life
> Is rounded with a sleep.

JEE-JAY ASGHAR.

Whither Indian Students ?

It is desirable to lift our eyes for a moment from the grim realities of the present, which are harassing humanity, and attempt to scan the future that looms before the students of this country. We have now reached a stage when students are to play a more important part, in the struggle of our country, against reactionary forces. There are certain difficulties which are facing the students of various universities and colleges in India. The very first thing they are to go into, and find a solution for, is the present higher education which has culminated in nothing but wide spread unemployment and has crippled the physical and mental health of those who had the misfortune to go through it. It is said that 'education is not a panacea for all our ills and is not always the bringer of happiness' but it remains to be proved whether such higher education is justified when there is so much of wastage.

Carlyle sits down, lest the high dignataries of State send him to prison, as Warwickshire Squire persecuted Shakespeare for deer-stealing.

A young American critic who was sitting silent all the time, finds an opportunity for pushing in his psychological thesis. He speaks: "I think Master Shakespeare had a tendency to Kleptomania. If he had lived in the age of Freud and Adler, they would have proved his obsession for stealing. He pillaged poor Townshend, North and all those who fell in his way. In order to escape the police he ran away to London to steal in the name of art. In the end I would advise 'Mr. Bard', 'the myriad-minded Shakespeare' to get psycho-analysed."

The elder critics could never bear such a critical heresy. Even Shakespeare who had been hearing all this with great prophetic resignation burst into a tirade of Falstaffian abuses:

"Away, you starveling, you elfskin, you dried neat's tongue, bulls pizzle, you stockfish,—O for breath to utter what is like thee!—you tailor's yard, you sheath, you bow case, you Vile standing tuck, you superfluous letter, Z. . . . ."

All the critics thank 'Shakespeare the greatest of Intellects', for defending himself so neatly and so strongly. The American professor is asked to offer an unconditional apology or to leave the house. The matter is settled and the impudent professor is sent out.

Shakespeare thanks them for taking such a parliamentary action against the man who had tried to analyse his little mind.

"Well," Shakespeare gets up with a certain want of manner, "I want to ask you certain questions. Why do you say that Hamlet had certain fits of sanity during his lunacy and vice versa? I am told that Mr. Lytton Stratchey has tried to inflict the ennui of a retired Anglo-Indian officer on my head. It is all a lie. I was always an energetic fella' with terrible good digestion. I have digested a lot of murders and rapes without much physical fatigue. Another of you has tried to read Oedipus Complex into my Denmark Prince. He was a good prince, only I wanted him to murder his uncle and mother. This is all what you have made a fuss about."

me in your liking (suddenly he fails into a mood of his habitual soliloquy) 'To a nunnery go!' "

ALL.—(with surprised looks) What, another soliloquy? It is going to be a good pastime for instructors of Elocution and college professors (with apologies to the Elocution class and my teachers) who sing these 'tunes' to their wives in their curtain lectures.

(Shakespeare comes to his self again)

"Gentlemen excuse me for these occasional aberrations to which I am so seriously prone. These fits of insanity are like tragic interludes in my life. The service and loyalty I owe to your criticism is great. Only I have left to say, more is my due, than more than all can pay."

Carlyle rises to answer the address (He is Victorian to his last button. The prophethood which was so generously inflicted upon him by his admirers is writ large on his face.) He begins:

"Sir, Italy produced the one world-voice; we English had the honour of producing the other, and you are that voice." (Cheers) "Here I say, is an English King, whom no time or chance, Parliament or combination of parliaments can dethrone! This King is Shakespeare." (The critics murmer something to one another. One of them tells the other that this speech is highly inflammatory. This comes under the law, because Shakespeare never belonged to the Hanovarian line).

The Sage of Chelsea is inflamed. He begins to pour at a terrific speed all sorts of ejaculations, personifications and metaphorical tirades. At last he is pacified through the good office of Sir Leslie Stephen and Coleridge. He resumes his speech.

"Indian Empire or no Indian Empire; we cannot do without Shakespeare! Indian Empire will go at any rate, some day; but this Shakespeare does not go, he lasts for ever unto us; we cannot give up our Shakespeare. (The non-official group gives hearty cheers, but Lord Macaulay resents such an un-British sentiment of renouncing the Indian Empire. He moves a vote of censure against Carlyle for thinking seditiously).

'the innocent sleep,
Sleep that knits up the ravell'd sleeve of care.'

Bradley: "Yes a capital feat. Professor Pollard's contributions in this connection are admirable. He fights wonderfully with Shakespeare's pirates whom Shakespeare could'nt fight during his life time."

A Critical Heretic: "Alas! Shakespeare was such a coward. He could never kill Claudius in the third Act because he could not gather up sufficient courage. 'O infirmity, thy name is genius!' "

While the critics were busy in such a polemical debate, Shakespeare disturbed by the noise yawned in the Elizabethan fashion and began to harangue loudly:

"Sleep no more:
Macbeth does murder sleep, the innocent sleep."

The critics, who were busy in a dialectical mood heard this heavenly voice, and all of them unconsciously spoke out.

He wakes,
Do you see this? Look on him, look his lips,
Look there, look there.

All the critics bow down and then retire to their seats which they were occupying. Shakespeare smiles in a self-laudatory manner. There is a nebulous halo of prophetic-madness round his bald head. His beard long and unkempt, because he could'nt meet a barber before his recent resuscitation. He raises his head with great literary affectation and addresses the congregation of the spirits.

"Gentlemen, men must endure
Their going hence even as their coming hither,
Ripeness in all."

"Without any further strictures on the human futility I must tell you that if I want the glib and oily art, to speak and purpose not. Since recently some unchaste action and dishonoured steps of some of the critics have deprived me of your grace and favour. But even for want of that, for which I am richer. A still soliciting eye, and such a tongue, that I am glad I have not, though not to have it, hath lost

All of a sudden there is a supernatural light in the room. An invisible orchestra begins to play music.

'I come Graymalkin
Paddock calls anon;
Fair is foul, and foul is fair
Hover through the fog and filthy air.'

Shakespeare is startled. He sits alert in the sofa and begins to talk loudly: "O these filthy witches; my weird sisters. How it is that my characters have come to life? I only meant them to make an agreeable prophecy to Macbeth. Why do they come here from 'the undiscovered country from whose bourne no traveller returns' to raise such an infernal Pandemonium?"

The spirits begin to dance a modern waltz in accompaniment with a Gilbert and Sullivan tune and sing in chorus:

'The weird sisters, hand in hand
Posters of the sea and land
Thus do go, about, about
Thrice to thine, and thrice to mine
And thrice again, to make up nine
Peace, the Charm's wound up.'

Shakespeare like a frightened girl hears all this 'elocution contest'. Soon he is brought to his normal self when he hears the flutter of wings. He heaves a sigh of relief and falls in the mood of soliloquy, 'to be or not to be; and bear the slings and arrows of outrageous fortune.' (He goes to sleep during the soliloquy.)

In the meanwhile ghosts of Shakespearean critics headed by Bradley enter the room. They find Shakespeare sleeping, but taking it a mere feigning begin to talk loudly.

Carlyle: "Let us not disturb Shakespeare—'Shakespeare, wide, placid, far-seeing, as the sun!"

Coleridge: "O the great Bard! 'After life's fitful fever he sleeps well.' How he loved sleep. Master Bradley did you read the correct text of his famous apostrophe to sleep. Folio gives the better text:

In the end it must be acknowledged that every one of us enjoyed the trip "fully" and both during moments of enjoyment and difficulty our students exhibited a remarkable spirit of restraint. Wherever they went they left behind an impression of high culture and correct training. They availed themselves fully of the educative opportunities afforded by the trip. I am especially grateful to them for their consideration to me.

ZIA-UD-DIN.

"Shakespeare Meets his critics"

(An extravaganza)

[The appalling outpourings of Shakespearean criticism are enough to benumb the wits of any student who undertakes to face it seriously. The present skit is a representation of the dream which I had when I went to sleep with Bradley's **Shakespearean Tragedy** on my breast.]

A room is dimly lighted. In the left corner sits Shakespeare dressed in the traditional manner. His looks are Hamlet-like, introspective; his eyes are vacillating from one object to another. It seems that the modern furniture which is so different from the Elizabethan, is respdnsible for his mental agony. He heaves a learned sigh and begins to hum in an appropriately dramatic manner these lugubrious lines:

'The time is out of joint. O cursed spite
That ever I was born to set it right.'

He retains the melancholy introspective looks. (Perhaps suffering from constipation.) In the meanwhile his self has undergone a sudden change. He chuckles like a trained actor with the sneer of Eddie Cantor.

"Ugh, ugh! my good Jove they have deified me for those foolish Jeremiads of Hamlet and the magniloquent buffooneries of my royal sires."

stayed in Major Hadows' guest house which was hired by Chacha.

Next day we visited Hadows' carpet factory, Karan Singh woollen mills and Khadi-bandar's hand-looms. On the 17th we visited the State silk factory where all the processes of preparing silk yarn from cacoon's were shown and explained to us. Next day we proceeded to Gulmarg which is a favourite resort of Englishmen as Pahalgam is those of Indians. The 'bus took us to Tangmarg at an altitude of 7,000 feet. From there we proceeded, some on horse back and some on foot, through the pine forest to Gulmarg. From there we went to Khillenmarg, 3 miles further at an altitude of 11,000 feet. After lunch we returned and reached Srinagar while it was still time for a bit of shopping. The dealers of eatables found in us very good customers and hailed us whenever we passed by. But those who dealt in other goods found us indifferent and difficult customers. Once Akhtar met a wood carver who was selling a tray under the cover of night to hide the blemishes of the piece. The man wanted Re. 1-4-0 but Akhtar offered annas 12 to which he agreed too readily. Akhtar withdrew his offer and renewed it with annas 10. This diminishing process was continued until the tray was purchased for annas 8.

The next morning we left Srinagar and took leave from Chacha who had been so useful to us. The driver of the 'bus was a surly and wild Sikh with whom it was difficult to deal. By evening we reached Murree and deciding to stay there for two nights we left the 'bus. In the morning we went to Pindi point and as we were sitting at a beauty spot enjoying the scenery we saw a relative of Prof. Anwar Beg who was living within a stone's throw. Immediately we went to see Mirza Sahib and we were all happy to meet and he invited us cordially to tea in the afternoon. After a few skirmishes of ceremony we accepted the invitation and took our leave. Then some went to do skating in a hall and the others to watch the sport. In the afternoon we went to Mirza Sahib and over a cup of tea he told us about his adventures with British kiddies who, the little imps, invaded his orchard. We in our turn told him how we had walked and ate and enjoyed. After tea we went to Kashmir point and saw all that we could do at Murree.

On the morning of the 21st we left for 'Pindi and reached there in time for the 10 o'clock 'bus bound for Peshawar. At Hasanabdal the party broke up and people proceeded to their respective destinations.

road to Amar Nath was broken at places for the first two miles and during the 3rd mile we had to walk on snow with water flowing beneath. By 10 we were at the Amar Nath cave. The cave is visited by thousands of Hindu pilgrims at the time of the full moon in August, when the water dripping from the roof of the cave freezes into pillars and is worshipped by the pilgrims as Shiva. The pigeons living in the cave are also regarded sacred and are considered "Shiv's Parbatis." At the time of our visit the dripping water was not condensing into ice.

After a little bit of skating on the snow we left while the Hindus who had come over there were bathing in the ice-cold water to fulfil an essential condition of their pilgrimage. We were back to Panchtorni by 11 o'clock and after lunch started for Wanjan. It was still early in the day and we thought we could reach Chandanwari the same evening. By 3 o'clock we reached the highest point and amid a shelter made by rain-coats we lighted the stove and tea was ready after a struggle of 1½ hours. Now it was late and we thought of breaking the journey at Wanjan. But Bairam who had taken a short cut reached Wanjan at 3 o'clock and sent the luggage further on. When we reached Wanjan at about 6 o'clock we found it a busy place full of tents of pilgrims who had now poured in to reach Amar Nath in time for the full moon. We searched for our tents but were told by a Hindu gentleman that they had been sent down to Chandanwari. Hastily we pressed forward only too glad to be saved from spending a night at 12,000 feet. By dusk we were all in our tents at Chandanwari drinking warm milk to recoup our energy after a hike of 25 miles. The next day's job was easy enough and we reached Pahalgam at 11 and pitched our tents in Chacha's plot.

On the 15th we had to leave for Srinagar. A 'bus was arranged to take us first to Achchabal and Verinag and then to Srinagar. After leaving Pahalgam by 8 o'clock we halted at Islamabad to purchase Gabbas. Five miles' drive brought us to Achchabal. The garden here is magnificent and superior to Nishat and Shalamar in that the water emerges from a spring within the garden and the supply is perpetual. We visited the trout hatchery but Jehangir's Hamam was closed to visitors. After lunch we returned to Islamabad and went on the Jammu road for 25 miles. We reached Verinag, the source of the river Jhelum by 2 o'clock. We stayed in the Verinag garden for 3 hours. By evening we reached Srinagar and

store for us. At one o'clock we were up again revived with rest and the tea. Immediately we came to the terribly steep ascent of Pissu: a rise of 1,500 feet in 1½ mile. Sweating thoroughly with the blaze of the afternoon sun in the back and resting awhile, I could hear voices saying, "Our parents have sent us to Kashmir, the earthly Paradise, and we are here toiling up this ascent." After an hour and a half we cleared the 'Pissu Ghati' and the cries of Pissu Conquered could be heard now.

After this the scenery changed entirely: the thick pine forests gave place to grassy meadows filled with sweet scents and blossoming profusely with wild flowers of numerous varieties. The stream was foaming and roaring in the rapids of a gorge 1,500 feet deep, the flanks of which were studded with straggling 'Bhoj pattar' trees. On either sides of us rose lofty, precipitous mountains well above the snow line. In a balmy atmosphere with the sun shut off by the clouds our fatigue vanished and we pressed forth merrily, till late in the afternoon we sighted the Shishnag lake. It is an expanse of pure water 3 miles in circumference with a rich azure colour. At 5 we reached Wanjan with the slim Ali in the lead and fell to the meal which was ready for us. Though we were physically tired after having climbed 5,000 feet in 16 miles, but were all satisfied that the labours of the day were quite justified by the wonderful sights we had seen. Our environs were sublime and only seeing, as they say, is believing.

Next day we started after breakfast and in the kaleidoscopic changes of our surroundings we travelled for 3 miles up an ascent attaining 14,000 feet. Snow was lying in profusion and lively members ate it with 'gur' thus enjoying natural ice-cream. Then we glided down a descent of 5 miles to Panchtorni. By noon we reached there and put up in a shed which had been cleaned by some previous visitor. Imagine with what an appetite when we reached there and also imagine our horror on finding that what Bairam was all the way calling a fully cooked meal, was no more than raw meat. But buz went the stove and tea was ready before we were settled and two cups of tea for each of us and a heap of rusks satisfied our appetite for the nonce. Meanwhile Bairam started his work but the soft wood gave very little heat and it was almost evening when we got a meal.

For the next day four more riding horses were arranged to make the ascents to Amar Nath and back to Wanjan easy. The

for the hair of Prophet Mohammad, (Peace be on him), Nasim Bagh; the favourite camping ground for visitors, and Shalamar and Nishat, the famous Mughal gardens.

Next day we saw the museum and went down the river Jhelum to see the seven bridges and the weir. At Zaina Kadal, the fourth bridge, we saw the ancient Jumma mosque with its huge one-piece wooden pillars. Then we attended the convocation at the Partab College and listened to the illuminating address delivered by Sir Tej Bahadur Sapru.

Next day was a Sunday and we spent the entire day in the Mughal gardens among the throng of visitors and the flowing fountains. We visited Harvan, Nishat and Shalamar in turn and spent a happy hour or two at each place.

On the 7th of July after having exhausted all the beauty spots and attractions of Srinagar we left in a 'bus for Pahalgam, at a distance of 60 miles on an altitude of 7,000 feet. There we stayed in a hotel called 'Plaza'. Pahalgam is a lovely place with its extensive meadowy plateaus and its bracing pine-laden air. The two Liddar streams impart life to the landscape. We stopped at Pahalgam for three days and enjoyed many a ride on the ponies in first rate avenues towards Kolahai and Bai Saran. At Bai Saran we stayed for about 3 hours and enjoyed life to its fullest extent: we took snap-shots, sang together in chorus, played a 'kabbadi' match and rolled on the velvety grass as if mad with joy.

At Pahalgam we met Chacha Yunus, an old boy of the College, and took tea with him one afternoon.

The trip to Amar Nath was a bit of serious hiking with its problems of pack ponies, provisions and tents. We engaged six pack ponies to carry our beddings, etc. and one riding pony for cases of emergency. We got a generous amount of meat and a few chickens. A trunk was filled with rusks and a bag of flour. We sent the servant with provisions and tents one day in advance, so that he may have everything ready for us at our next halting place.

On the morning of the 11th July we marched forth, a party of 11 young and strong men, in high spirits in the best possible weather. The road to Chandanwari, the first stage, rises, but slowly, along a branch of the Liddar. By 11 o'clock we reached Chandanwari covering a distance of 8 miles and rising 2,000 feet above Pahalgam. Here we rested and took a light lunch of tea and rusks as a heavy meal would have made us unfit for the ascents yet in

A Trip to Kashmir

Account of a trip to Kashmir in July in which the following members of the Hiking club took part :—

Akhtar Ali Shah, Burhan-ud-Din, Ali Mohd., Sarbiland, Abdul Hakim, Arjan Das, Sardar Hussain, Mushtaq Hussain, Mukamal Shah, Faiz Mohd. with Bairam as the servant.

In the afternoon of 3rd July I had to face eight hungry youngmen at my house at Abbottabad. Their hunger was, however, soon satisfied when they took their tea and regained their spirits sufficiently to go out to see the interesting places of Abbottabad. A heavy rain caught them and they were back by the evening with wet rain-coats. After dinner, they went to a circus which was stationed at such a short distance from my house that its band exercised an irresistible attraction on them. Shortly after they had gone, the remaining two members of the party arrived, thus completing a party of ten students, the servant and myself.

Next morning at 7-30 we started towards Srinagar in a 'bus with a skilful driver. Most of us enjoyed the scenery but some were overpowered by giddiness due to the circuitous road, Ali being the worst victim. At Ghari Habibullah, which is 34 miles from Abbottabad, we had a wash in the Kunkar, called "Nain Sukh" or the soother of the eyes, by Nur Jehan. At Ram Kot we entered the Kashmir State and paid the road toll and after crossing another mountain we arrived at Muzafarabad. At Domel, 55 miles from Abbottabad, we made a long halt to pay the State toll and took our lunch. From Domel the road goes along the bank of the river Jhelum upto Baramula for about 75 miles with high mountains on either side.

It is a real pleasure to travel along the road from Baramula to Srinagar as it forms the most beautiful avenue of tall poplars. We reached Srinagar at 5-30 and engaged a house-boat named "Shining Flower" for our stay in Srinagar.

The first thing we did next morning was to climb the Shankracharia hill with its small ancient temple at the top. It gives a clear view of Srinagar, the Dal and the Mughal gardens lying on its skirts. In the afternoon we engaged two shikaras (light boats) and rowed into the Dal making the entire circuit. We visited Hazratbal known

If scientists carry out their threats and stop work for a period of twenty years man may have a little time in which to accustom himself to his new and ever-changing environment. But as even scientists have to live, eat, dress and support families, this is not likely, for with them no work means no pay, and a strike would bring no sympathy or trade union relief.

One alternative then remains—that is, for the scientist to take off his cap and gown or his overalls, and enter business in place of the businessman who has made such a mess of things. Let the chemist and the physcist, the economist, the psychologist and the botanist leave their laboratories and enter the office and the workshop. Let those who understand and appreciate science administer its benefits in the right proportion to man's receptivity. Let him oust the spoilers and put into motion and control the machinery he has made and given to an unappreciative world. Let him operate the power he has created and harness the forces he has liberated for the greatest common good of all humanity instead of for the chosen few.

Man is a creative animal, creation is activity. If man cannot satisfy his creative instinct he becomes degenerate. Despite all fears to the contrary, however, we seem to have absorbed the necessity for human progress and the day may not be far distant when all our partisans—our capitalists, our socialists and communists, our artists and poets, dreamers and realists—will unite themselves under the banner of ascertained fact until such times when their beliefs and illusions and doubts shall be sorted out and fully replaced by scientific truth. In that only lies the salvation of humanity. Our present intolerance, carelessness and indifference will lead us only to destruction by the continued misapplication of that which has been innocently developed for the greatest common good.

M. MUSHTAQ AHMAD.

Science Our Only Salvation.

That the scientist is our only salvation sounds like a paradox. Yet it is a fact Hitherto most of our efforts have been directed to bettering the lot of what we already had. We always had implements of destruction The science of war with its long range guns and poison gas, was only a development. We always had communication. The radio and telegraph was only a development. We always had something for the cure of ills. Surgery, anaesthesia again were only developments. With few exceptions, such as, for example, the principle of magnetic induction, from which so much has been developed in facilitating communication, we have developed rather than discovered. Meanwhile we have to grant that there would be no science at all, were it not for the fact that their progress has been built upon one ascertained fact following a previously ascertained fact. The inspirational factor is here a minus quantity.

Imagine how we should all benefit if science could establish, scientifically, that warfare is a futile and useless activity. Imagine what would it be like to live in a world in which science had established the fact that crime, hate, lust, greed and fear are inhuman and easily eliminated. Would it not be a delightful world to live in when science has developed sociology and eugenics as it has already developed chemistry and mechanics?

Under the present conditions it is a far off dream. Our first battle is to rescue science from the clutches of its exploiters. Upto the present it has fallen into the wrong hands and the developments which have been made have directly benefited only a favoured few. Scientists are notoriously poor men and unworldly to a degree. Indeed nearly all of the men who have been responsible for the most revolutionary developments in various branches of science are, if not very poor, at least poorer than any average businessman would never let himself become, except through trade depression. In the hands of men not fitted to handle the forces entrusted to their care, science has failed in its intent to benefit humanity, and has only made us unhappy, destructive and poor. Exploitation must be supplanted by skilled and judicious administration.

In other walks of life we can see the seed of similar advancement, particularly in agriculture, wherein science has made possible the tremendous increase in the food-producing resources of countries by fertilisation and production of new varieties. To my mind the demand for a wider place in the sun, by countries like Germany, Italy and Japan based on the complaint that the homeland is too narrow, that the people are undergoing social strangulation because surplus population has no place to emigrate, that an unproductive soil cannot feed, clothe and shelter in decency the swarming masses, is unjustified.

Before any swords were unsheathed, it should have been ascertained whether a nation that is complaining of inadequate resources, which it must compensate by tresspass upon the resources of others, is making adequate use of the resources that it has, whether the native soil which is alleged to be too poor to support even at a low level of comfort the millions who press upon it, might not really be capable of supporting three times as many millions at a level of comfort twice as high. By the science of agriculture the food producing capacity of the world has risen far above what would require to maintain every living inhabitant of the earth in more than comfort, and for such a reason many have been led to decry Malthus, and to comment on his inability to foresee the enormous expansion of the means of production since his time.

In commerce science has built fortunes for manufacturers out of waste products.

But in spite of all this man's life is too scientific to be happy. He adopts the aid of complicated labour-saving machinery, and yet lacks the knowledge to make it work for his ultimate good. He produces enough food to more than feed every one on earth, and yet can't regulate the distribution and so save thousands a year from death by starvation. He has his car and does not know where to go with it. He has radio and only gets bored, forgetting, too, that therein lies one of the greatest potential sources of education.

We still have our slums. We still see thousands of women and children die from preventable diseases every year. We still have our great army of unemployed wandering hopelessly and hungry in all our big cities. We still have pain and disease and death. In the face of all this it is a hard task to plead the defence of the discoveries of science.

Science is a long tale of destruction, of misuse, of unjustifiable exploitation. In the hands of its discoverers and creators it has become a double-edged sword which, though it may defend with one edge, will destroy with the other. We have liberated forces we do not understand. We have acted like children playing with a steam turbine. It has been intensely interesting—a wonderful game—but how to control the wheels we have set in motion is the question.

Let me quote the words of a scientific man of world-wide repute, the late E. E. Slosson. He said "The last few years have made it manifest that in our civilisation the mechanical forces have got ahead of the moral forces. Man is mounted upon a bigger horse than he can ride. The physical forces have evidently been developed so far beyond the political and social forces as to constitute a menace to civilisation. Science has endowed man with the powers of supermen, but his mind remains human, all human. He is like a pauper come into a fortune, a labourer who has been made the boss of the shop, a private promoted to the command of a regiment, a slave made the master of slaves. Man has had no training for the huge responsibilities now thrust upon him. This new command of time and space, this mastery of unknown forces, this entrance into untried fields. . .all these are too much for the modern man."

The Case for Defence.

Now let us look at the other side of the picture and take up the case for defence. The greatest benefit to humanity has come from the science of healing, the one science in which there is no repercussion, and even this branch to a great extent developed out of our war and destruction. A hundred years ago more soldiers' graves were filled by disease than by the gun and the sword. So that men might be spared to kill and be killed, governments supported researches which eventually led to the almost complete extermination of such dreaded diseases as tetanus, cholera, typhus, dysentery, malaria and plague. In the wiping out of disease this past century of scientific research has accomplished more than twenty centuries of groping. Surgery has been brought to a high state of perfection, and anaesthetics have removed for ever the horrors of the old time operating theatres. Many of the diseases which once meant certain death can now be cured in a very short space of time and with little inconvenience to the sufferer.

tempting bonuses to persuade women to bear more and more children, as is happening in Germany and Italy, for the more people modern war is likely to kill and maim the more are wanted to take their place as cannon fodder.

To substantiate this, let us look at the mortality figures of previous wars. It is recorded that in all the great wars between 1790 and 1913 the numbers of men killed only slightly exceeded five and a half millions—in a space of 123 years. While in the four years of the great war 10,873,577 men laid down their lives. Such is one of the phases of the advancement of science.

Everything about us has been changed by scientific improvements, by cheap luxuries, by organised vice. But nothing has been done to change human nature; and, poor man, still a contemporary of the peoples of Babylon, from the point of view of time, stands confused and helpless at the mercy of a change of environment which he fails to understand. It is asking too much of human nature to expect it to adjust itself in the space of a few generations to conditions which are foreign and sometimes, unnatural. On the other hand humanity has misapplied our greatest discoveries by allowing commercialism to make dead sea fruit of the seed and flowering of Science. Scientific mass-production, machinery, high-pressure salesmanship and distribution has brought about a state of economic chaos such as has never been equalled, with the result that people starve in the midst of plenty, and gluts of foodstuffs and manufactured products are "cornered" while whole nations face famine and destitution. Yet the world contrary to some opinions, is capable of supporting in comfort many times its present population.

Bertrand Russell in one of his recent public speeches said "I have come to have very profound and deep-rooted doubts whether Science as practised at present by the human race will ever do anything to make the world a better and happier place to live in or will ever stop contributing to our general misery." To suggest that Science may possibly destroy the inhabitants of this planet is not to propound an improbability. We have so far been successful enough in harnessing forces composed of elements we understand and can handle. But these powers also comprise forces we do not understand and we cannot tell what may happen when some laboratory worker will create a Frankenstein which will get out of control and run amok.

The question at issue is: can humanity stand the strain? Is not science defeating its own ends? Are we to look ahead to a universal chaos or to a world transformed and made beautiful for all who inhabit it?

Scientists have often asked these questions of each other and some have gone so far as to suggest a stop-work movement for a number of years so that humanity may have time to adjust itself to the discoveries being made in every sphere of human activity.

We have reached a stage when we must ask, has science been a benefit to humanity or a curse? Shall we look forward to the time when the world will become habitable for all its children, and every land flowing with milk and honey, or shall we anticipate chaos and confusion or even the release of forces which may not only shatter this tiny planet of ours, but also throw the whole universe out of joint?

Science set out to be of service to mankind, to make the great forces of nature slaves for the service of man. But in serving man it had brought into use powers and forces which have destroyed as much as they have helped.

All progress is destructive as well as constructive and science is no exception.

Which is now predominant—destruction or construction? Let us briefly review the destructive side.

Science the Destroyer.

It cannot be disputed that science has done more for the development of war than all the cynicism of the diplomats, than all the greed of the financiers of the great capitals and all the blunderings of self-seeking politicians. Modern war has brought greater slaughter and destruction than was ever dreamt of before. It was science that invented the long-range guns like Big Bertha, the torpedo bombs, incendiary bombs, delayed action bombs, submarines, flying fortresses, magnetic mines, depth charges, the armour-piercing bullet, poison gases and flame throwers. Science has even eliminated the necessity for a high physical standard among soldiers and so indirectly gives the race a helping hand on the road to decadence. To keep up the supply the wagers of war must offer every inducement and

some proverbially loud laughter, on the tip of some familiarly caustic tongue, or as likely as not, in the sanctuary of your own young heart.

I. H.

Will Science destroy Humanity ?

Science tries to reach back to beginnings but it can never reach the beginning. For if we picture a scientific beginning, that is something simple in the way of matter and energy and mind, it is always open to some one to ask, but what was there before that? If the answer be: there was nothing before that except Itself, then we are saying that we can picture what is Everlasting, which is far too daring a thing to say. If the answer be that before what we can picture there was a simpler something that we cannot picture, then we are confessing that we have not got back to the beginning. Thus science, as science does not speak about the beginning, nor about the end either. Science is nothing but statement of truth found out. When well digested it is nothing but good sense and reason.

As in so many of our cultural subjects, we must go back to the ancient Greeks for the origins of Science. They in their wisdom looked upon it as study of the forces of nature with a view to utilising them for the greatest benefit of humanity.

From those times to the present day is a far cry to us, who reckon time in ratio to the human span of life, and the progress of science was, until about a century ago slow and laboured. Indeed during the past hundred years more progress has been made scientifically than in the previous twenty centuries, but to science twenty centuries is only an evening gone. In the face of all there is to be known about the universe, the scientist is but a child. We have claimed that we are only now seeing the first faint glimmer of the light. Perhaps it would be truer to say that what we see is but the faint glow of the reflection of that light. Nevertheless it is true that the scientific discoveries of the past century or two have entirely revolutionised the environment of the human race.

about the importance of **subject** in writing. The merit of any piece of writing does not depend upon the greatness of its subject. It is not necessary that good articles can only be written on subjects like Truth and Justice, the Moral Uplift of India, the Reform of Humanity and the like. A good article can be written on the common sparrow and a bad one on Justifying the ways of God to Man. It is the treatment or the approach to a subject that counts, the style and not so much the subject. For a college magazine particularly serious subjects, written about in a pontificial manner, produce dull unreadable articles. For moral and social improvement a reader can go to other sources than a college magazine. A college magazine worth its name must be (pray mark!) a good mirror of the activities of the college, a record of its day to day life. Instead of preoccupying themselves with the problems of life and death, the contributors of a college magazine should observe the life around them in a critical and if possible a humorous manner. They should express their gaiety, their lightheartedness and their joy of living in their writings, rather than moan and lament like senile old men. There is nothing like humour, we assure you, to lighten the burden of life, even of a war-ridden life like ours. Laughter is a true disinfectant for all sentimentalities and pedantries and hypocrisies. Laugh, debunk and prick the bubbles of humbug around you, is our advice. Live wholesomely, richly and fearlessly and echo it in your writings. Make a Rabelais and a Shakespeare your guide and not the finicky, life-fearing, grovelling Mrs. Grundy.

The atricles of a college magazine must have above all, that elusive thing called 'local colour'—the unmistakable individual quality of one particular institution that belongs to no other. Islamia College, Peshawar has a distinctive life of its own. It should be the occupation of the contributors to the KHYBER, to feel that life, that soul of the institution and give it a 'local habitation and a name' in their articles. In what exactly that soul lies, what is the recipe of it, we cannot tell you. It lies, who knows, in the minarets and the domes of the mosque silhoutted against the sleeping Khyber hills; in the haunting smell of the lemon blossoms in spring; in the playing fields with their stress of young muscles; in hostels with their indolent 'chilms' spreading their aroma around; in the endlessly droning lectures of the professors, day in and day out. Who can tell where it lies this elusive subtle soul! It is for you to hunt it out, whether it be hidden in the beard of your teacher or poised on top of a famous moustache, under the hoofs of a well-known horse, in

That howsoever people fast and pray
The flesh is frail, and so the soul undone:
What men call gallantry and gods adultery
Is much more common where the climate's sultry"

Similarly most so-called spirituality lies in a defeatist escape from life, a kind of kill-joy-ism. We don't mean to suggest that there is no genuine morality or genuine spirituality. There is, but that brand is so rare that it cannot with any feeling of conviction form the basis of an article by an under-graduate of 20. What we want to discourage is hypocrisy, sham, humbug. Certainly there are other things besides morality and spirituality which the young feel more genuinely and keenly. And one of these, I hear you say, is love. Yes, certainly love, but again not the brand that one comes across so frequently in magazines, particularly Urdu magazines. A treacly, whining kind of anaemic feeling, that is not the result of any passionate personal feeling but the second hand essence of some third rate vulgar love story. Their experience is merely "Platonic" but they have read of some lover "sighing like furnace, with a woeful ballad made to his mistress's eyebrow." Of course it is quite excusable for young adolescents, particularly in our repressed surroundings, to be struck with the epidemic of such calf love, but to revel in it and spread the contagion of it among healthier sorts is nothing short of criminal. Again, dear reader, don't run away with the idea that we are dry as dust worshippers of cold reason, whose soul has not been uplifted with the miracle of romantic love. Far from it.

We "could a tale unfold whose lightest word
Would harrow up thy soul; freeze thy young blood;
Make thy two eyes, like stars start from their spheres."

and so on. But as the ghost in Hamlet adds "this eternal blazon must not be to ears of flesh and blood." Moreover through sheer respect for the editorial chair we refrain from such wistful reminiscences.

We notice at this stage signs of exasperation on your handsome face, reader. Literature, politics, religion, morality is taboo, you ask, then what on earth is one to write upon? We sympathise with your difficulties; we even pity you. But we must also warn you that you are labouring under a common misconception

to call a spade at least a spade. A modern sensibility is, or ought to be, sincere, if necessary, brutally sincere. It must moreover be ironical, humorous, rational, sceptical. witty complex and profound. It ought not merely to accept, but question and wonder and reject. It must destroy to build anew. It is in a mood like this that we approach the hard editorial chair and sit in front of the piled heap of nonsense, not merely accepting but questioning and wondering and mostly rejecting

For a previous number of the magazine the contributions were invited in the following words: "Articles on subjects of literary, educational, historical, social, moral or spiritual interest...will be welcome." This notice holds good but with certain important qualifications. 'Literary' articles are good if they are not shamelessly 'lifted' and plagiarised from other books Much of literary criticism, unfortunately is just a playing about with cliches and platitudes. If there is nothing fresh or personal about a literary article it had better not be written. Some similar qualifications must apply also to articles which purport to be 'educational, historical or social.' The trouble is that in an article that intends to be serious, the writer can very conveniently hide his lack of originality behind stock phrases and common-place ideas. What is uttered solemnly and pedantically as truth or fact, is no more than a pale copy of somebody else's truth, somebody else's fact. Serious writing at least with the young, encourages this kind of intellectual dishonesty.

Articles of moral or spiritual interest we regard with equal suspicion. Morality and spirituality in India are more often vague mysterious goddesses, hiding behind their shimmering veils, the ugly features of man's two worst enemies—Grundyism and Charlatanism. They are cloaks for ignorance and superstition and hence the mortal enemies of true knowledge. What many people consider morality is a convenient sanction for what is narrowly selfish, or at best the result of fear. It is frequently forgotten that much of our so-called morality is geographical and merely the outcome of a particular kind of climate and environment. Byron in Don Juan says wittily, but truly:

> " 'Tis a sad thing, I cannot choose but say,
> And all the fault of that indecent sun,.
> Who cannot leave alone our helpless clay,
> But will keep baking, broiling, burning on,

THE KHYBER

No. 5] PESHAWAR, JANUARY 1941. [Vol. XXV

EDITORIAL

Prof. Ahmad Ali Qureshi has left us (we hope temporarily) to court princely favours at Kalat. We wish him the best of luck in this romantic venture and take the reins of editorial office in hand with feelings which can most aptly be described as 'mixed.' That editorship is no bed of roses, or a bed of any sort at all, that the responsibilities it imposes on human shoulders are onerous if not obnoxious, has been the refrain of many an editorial. In fact some martyred editors have gone so far as to claim that Shakespeare if not Prince Hamlet had had some editorship thrust upon him in some life or the other. How else, they argue, can one explain the authentic note of anguish in such phrases as "to grunt and sweat under a weary life." Volumes could be written to support this tempting hypothesis. But through sheer sense of dignity, we refrain. It is so easy to whine, so comfortable to moan. To moan and whine is to be ridiculous, romantic. And we are not romantic.

"What are you then?" may the reader ask at this point with pardonable curiosity. "Wait dear reader", we answer in our most gracious manner. That is exactly what we are going to reveal to you.

If we believed in hoodwinking the reader in the modernistic jargon we would answer superiorly that we are the "modern sensibility." But we are honest, at least we wish to be, we wish

THE KHYBER

ISLAMIA COLLEGE, PESHAWAR

Contents

وقار و عظمت خیبر وقارِ قومِ افغاں ہے
عروجِ ہند کا نکتہ اسی اک در میں پنہاں ہے

مئی ۱۹۴۵

خیبر

دار العلوم اسلامیہ، سرحد پشاور

مدیر: سید عبدالرحمٰن شاہ سال چہارم — نگران: پروفیسر محمد موسیٰ خان کلیم افغانی — نائب مدیر: محمد احسن سال دوم

جلد ۲	مئی ۱۹۴۵ء	نمبر ۲

خیبر

شذرات

کالج کی کھڑکی بھی کتنی نظر نواز ہے۔ کل تک بقسن (PENSON) اس میں سے زندگی کی مختلف تصویریں دیکھا کرتا تھا، آج ہم نئے رُخ دیکھ رہے ہیں۔ دلچسپی کا سامان اس میں ہمیشہ سے رہا ہے۔ تب کتابوں کا شوق تھا اب عینکوں کا عشق ہے، تب صحت کی طرف دھیان تھا اب نفاست پر زور ہے؛ تب سادہ اور اُجلا لباس پسند تھا اب عرف "اپ ٹو ڈیٹ" رہنما مرغوب ہے، تب سیر و شکار تفریح تھے اب سینما اور بال روم میں دل بہلایا جاتا ہے، کچھ زیادہ فرق تو نہیں، یونہی ذرا زندگی کے لطیف پہلو پر توجہ زیادہ ہے۔ اور کیوں نہ ہو آخر تہذیب نے قدم آگے بڑھایا ہے، انسان کو ترقی ہوئی ہے۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ شجر ممنوعہ زندگی کے ہر موڑ پر ہے۔ آدمی اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے لیکن توڑنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ حوّا کی بیٹی ساتھ ہو تو یہ مشکل حل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اب اسے ہر موڑ پر ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ اب کہیں بھی شجر ممنوعہ نہیں رہے گا۔ غالب اور عرفی کے ہاں حسن و عشق کی داستانیں مشکل اور تشریح طلب نہیں۔ اب شاعر کے واردات قلب کو اپنے ہی واردات کی روشنی میں دیکھ لیا جائے گا۔ لیلےٰ و مجنوں ہم سبق ہو چلے ہیں۔ اب دیوار دبستان پر الف لکھنے کی بجائے عکس رُخ دوست گول کمرے کی زینت بنے گا۔

لیکن کالج کی کھڑکی سے ہمیں جو دوسرا منظر دکھائی دے رہا ہے وہ پہلے سے کہیں زیادہ اہم اور دلچسپ ہے نوجوان زندگی کا حلیہ بدلنے اُٹھے ہیں۔ کلہاڑی اور کدال بیکار نہیں۔ ہ افراط سونے کے نبّ الافاڈٹن پن سنبھالے امارت کا چہرہ انہیں داغدار نظر آیا ہے۔ وہ اس پر سیاہی پھیر دینا چاہتے ہیں۔ فاقہ مست مزدور کی رگوں میں سرد خون کی بھی کمی دکھائی دی ہے۔ وہ اسی سنہری نب سے اُن میں اُبلتی ہوئی سُرخی پھیر دینا چاہتے ہیں۔ کدال اور کلہاڑی کی کیا ضرورت! نرم و نازک بازوؤں سے ان کا کیا تعلق ہے۔ فضا میں قہقہے گونج رہے ہیں۔ اور ان کے پیچھے سے کوئی یہ گنگناتا ہوا سنائی دیتا ہے ؎

نہ خنجر اُٹھے گا نہ تلوار ان سے　　یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں

مگر نوجوان ہیں کہ صفحۂ قرطاس پر آنے والے سنہری دَور کے خاکے بنائے چلے جا رہے ہیں۔ گویا ان کا کام خاکے ہی بنانا ہے۔ ان خاکوں میں رنگ بھرنے والے اور آئیں گے، ان رنگوں کو حرارت دینے والے اور، اس حرارت کو حرکت میں بدلنے والے اور، اس حرکت کو تصادم میں لانے والے اور۔ خاکے، رنگ، حرارت، تصادم۔

پانچ زینے ہیں۔ اور اس کھڑکی سے نظر آنے والے نوجوان پہلے ہی زینے پر پہنچ کر وجد میں آرہے ہیں۔ مگر ان کا قصور بھی تو نہیں۔ آجکل تماکہ کشی کا موسم ہے۔ ملک میں فاقہ کشی اسی تماکہ کشی ہی سے تو دور ہوگی۔ اور پھر ۱۰ قیراط سونے کا نب ان کا بوجھ کیوں نہ سہار سکتا۔ واٹرمین کے اس نب میں کتنی طاقت ہے۔ انگلستان کا لوہا اور کوئلہ اس کی پشت پر ہے۔ اسی لئے تو کدال اور کلہاڑی کی ضرورت محسوس تک نہیں ہوتی۔

ہاں تو ان افسانوی خاکوں میں رنگ بھرنے کی نوبت بھی آئے گی کیا؟ رنگ کہاں سے آئیگا؟ جرمنی جنگ ہار رہا ہے۔ اور ہندوستان سب کچھ بلڈ بینک (BLOOD BANK) میں جمع کرا رہا ہے۔ نہ اُسے ہمت نہ اسے فرصت۔ جاپانی رنگ ویسے ہی پھیکا نکلا، نہ یہاں جم سکا نہ وہاں۔ بہتر تھا کہ کھلونے ہی بناتا رہتا۔ روس کدال اور کلہاڑی کا قائل ہے، وہ کیوں رنگ بنانے لگا۔ وہ تو رنگ کے ساتھ نسل کو بھی مٹانے اُٹھا ہے۔ تو پھر رنگ کہاں سے آئیگا۔ علامہ اقبالؒ کہا کرتے تھے ع باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

مگر کھڑکی سے نظر آنے والے نوجوان اس دقیانوسی قسم کے تکلیف دہ رنگ کو پسند نہیں کر سکتے۔ تہذیب کے ماءاللحم نے ان کے جگر کا فعل ٹھیک کر دیا ہے۔

بند کر دو کھڑکی!

نہیں تو ایک نظر اور بھی۔ وہ دیکھو پھول کھل رہے ہیں۔ کتنے رنگین ہیں یہ پھول، شاید چہروں کی رنگت بھی انہوں نے اُڑا لی ہے۔ قیاص چہروں نے "اپنا کریم" اور سنو پر اکتفا کر لیا ہے۔ یہ گاؤن پہنے ہوئے لوگ کیوں سر جھکائے چلے جا رہے ہیں؟ بغیر گاؤن کے لوگ تو سینے تانے، گردنیں اکڑائے پھر رہے ہیں۔ گاؤن والے شائد فکر فردا میں ڈوبے ہیں یا فکرِ معاش میں، اس لئے سر اوپر نہیں اٹھا سکتے۔ اور یہ دوسرے ذکر و فکر دونوں کے بوجھ سے آزاد ہیں۔ اور آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ اس لئے گردن نہیں جھکا سکتے۔ اور جھکائیں بھی تو کیوں؟ اب ذکر و فکر میں دھرا ہی کیا ہے۔ زمانہ ترقی کر گیا ہے۔ مشینوں نے ذہن کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ سیاست دانوں نے ضمیر کی خلش مٹا دی ہے۔ مغرب تیزی سے دوڑ رہا ہے۔ اور مشرق کھڑا پوچھ رہا ہے کہ یہ راستہ کہاں جاتا ہے۔ یہ صحن کالج سے گزرتا ہوا، دفتروں کی میز کرسیوں پر رُکتا ہوا، ہسپتالوں سے ہوتا ہوا، کلبوں اور تماشہ گاہوں سے بل کاٹتا ہوا۔ مندر اور مسجد سے دور، گھریلو سکون اور اطمینان سے پرے، اسمبلی ہال کے پاس سے، . . . . یہ راستہ کہاں جاتا ہے؟

چھوڑو بھی، بند کر دو کھڑکی!

م۔م۔ک

انہدام

جامعہ نگر (دہلی)

وہ دنیا کی نفرت بھری نگاہوں سے جان بچانا چاہتا تھا۔ جو اس کے لئے برستے ہوئے تیروں سے کم نہ تھیں وہ بازار سے گذر رہا تھا۔ بلکہ اس حال میں گذارا جا رہا تھا۔ جب اجنبی نگاہوں سے اس کی نظریں ٹکراتی تھیں۔ تو دل میں ایک دردانگیز جذبہ اُسے سر جھکانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ ان تیروں کی تاب اس میں نہ تھی۔ اور آخر جب اسے اس کمرہ کے اندر داخل ہونے کے لئے دھکیل دیا گیا۔ تو اُس کی آنکھوں کے سامنے بالکل ایک نئی زندگی تھی۔ جس کا اُسے پہلے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ اس زندگی سے وہ قطعی بیگانہ تھا۔ اور اپنے آپ کو اس سے کوسوں دُور سمجھتا تھا۔ لیکن آج پہلی بار اسے وہی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا جس سے اُسے سخت نفرت تھی ــــ اُس کی آنکھوں نے اس تنگ اندھیرے کمرہ میں انوکھا منظر دیکھا۔ جس کی اونگھتی اور تھکی ہوئی فضاؤں میں بعض تھکے لوگ اونگھ رہے تھے۔ اور ان کے چہروں پر ایک عجیب قسم کی خواب آمیز تھکاوٹ ایک انوکھی ہیبت سی نمایاں تھی۔ پھٹے پرانے اور غلیظ لباس میں لپٹے زرد ڈھانچے بیٹھے تھے۔ اور خدا جانے اُن کے دل کن سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے۔ وہ شاید انسانی صفات سے عاری تھے۔ اور شاید اسی وجہ سے وہ کسی ایسے کام پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔ جس کا عمل یہ ہے۔ یا کسی اُلٹے سے ماحول کے اثر نے ان کی دماغی طاقتوں کو کسی اُلٹے دھارے پر بہا دیا ہوگا۔ جس کا یہ انجام کسی آغاز سے متعلق تو ضرور ہوگا اور یہ آغاز اُن کی کوئی کارستانی ہی ہو گی ــــ قید یونہی تو نہیں ہو سکتی ــــ چند بلند قہقہوں نے اُسے اچانک نظریں پھیرنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں ایک اور ہی منظر تھا۔ چند بے فکرے عالم سے بے نیاز اپنی تاش کی دنیا میں محو، بے اختیار قہقہے بلند کر رہے تھے۔ بعض بڑی داڑھیوں میں بہیانک سے چہرے شرارت آمیز نظریں لئے ہوئے تھے۔ ہر معمولی سی بات ان کے لئے سامانِ قہقہہ تھی ــ اور یہ بے ہنگم قہقہے، جیسے کسی سنگلاخ زمین پر کوئی ٹوٹی ہوئی گاڑی گھسٹتی جا رہی ہو۔ اُسے اس جگہ سے پہلے ہی نفرت تھی۔ اور اُس کی اچٹتی نگاہیں بھی اُس کے نفرت کے جذبات کو مزید اُبھارنے کے لئے کافی تھیں۔ اور یہی نفرت خیز جذبے دل میں لئے ایک کونے میں بیٹھ رہا۔ اُس کا رنج و غم ہر لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا ایک گھائل پرند گرفتاری کی حالت میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا ہو۔

کس قدر غم انگیز تھیں یہ گھڑیاں ــــ جس بات کا اُسے وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہی پیش آئی۔ اور اُس دنیا نے جس نے حقائق سے اپنی آنکھیں موندی ہوئی تھیں۔ اُسے آرام و سکون کے ماحول سے اُٹھا کر کس گندی دنیا میں پھینک دیا۔ ہاں اسی گندی دنیا میں جو اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اور جسے وہ سوسائٹی کا گندا اور متعفن حصہ سمجھتا تھا۔ جس کی بدبُو سے ساری دنیا بھاگنا چاہتی ہے۔ اور وہ بھی اسی دنیا کا ایک فرد ہوتے ہوئے ہمیشہ بھاگا کرتا تھا۔ لیکن آج وہ ان بدبُوؤں میں گھرا ہوا تھا ــــ نہیں ــــ بلکہ اس کا وجود خود بدبُو بنا دیا گیا تھا۔ اس لئے دنیا والے اس سے بھی بھاگنے لگے تھے۔ اس سے نفرت کرنے لگے اور اسے

حقیر جانتے ہوئے نگاہوں کے نفرت آلود تیر برسانے لگے۔ لیکن کیا وہ واقعی سوسائٹی کا ایک متعفن حصہ تھا۔ یا اُسے خواہ مخواہ اس سٹرانڈ میں شامل کر دیا گیا تھا۔ حقیقت میں وہ اس مقام سے بہت دور تھا۔ وہ کس طرح اپنے آپ کو اس تعفن میں شامل کرنے لگتا۔ جبکہ سارے حقائق اس کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب تھے اُسے ہر بات کا علم تھا۔ لیکن باوجود علم ہونے کے اُسے یہ حق نہیں دیا گیا تھا۔ کہ وہ ساری سچی باتیں پیش کر دے اگر اُسے زبان ہلانے کا حق حاصل بھی ہوتا تو بھی اُسے جھوٹا سمجھ کر نظر انداز کر دینا ایک معمولی بات تھی ــــ یہ خواہ مخواہ جھوٹا سمجھنا بے انصافی نہیں کیا؟ لیکن بے انصافی جتلائے کون؟ اُف دنیائے انصاف کی موندی ہوئی آنکھیں۔ جن کے سامنے حقائق کی روشنی نہیں۔ بلکہ افترا کا اندھیرا ہوتا ہے! سینے سے ایک اُٹھتی ہوئی آہ کے ساتھ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُس کا دماغ گھوم رہا تھا۔ اور دل میں ان اونچے اونچے لوگوں کے خلاف نفرت کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ ان ہی خیالات میں محو تھا کہ ایک آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"کیسے آنا ہوا جناب؟ کس فکر میں ڈوبے ہیں آپ! اس کی نظروں کے سامنے دو سُرخ آنکھیں گھوم رہی تھیں اُسے ان آنکھوں میں شرارت دبی محسوس ہوئی۔ اور اس چہرے پر مصنوعی ہمدردی۔ اس نے فوراً نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اور خاموش ہو گیا۔

"کچھ فرمائیے نا جناب! ناراض کیوں ہونے لگے ہیں آپ" اس نے پھر مڑ کر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی۔ اُسے پھر وہی احساس ہوا۔ مگر خاموش ہی رہا۔ اتنے میں دو تین اور آ بیٹھے۔ اور ایک نے آتے ہی بھنویں ہلاتے ہوئے کہا۔ "کہئے نا کیسے آنا ہوا جناب کا۔" "یہ خاموش صورت تو کچھ شریفانہ معلوم ہوتی ہے۔" دوسرا بولا۔ عجیب تضحیک آمیز لہجے تھے۔ وہ اس گھیرے میں کچھ گھبرا سا گیا۔ اور ہر ایک کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ کہ یہ سب کس لئے جمع ہو گئے ہیں ـــ "ارے کچھ سنائیے بھی کس جرم کی پاداش میں"؟ ایک نے کہا

"اجی جرم ورم کیا ہوگا۔ کوئی معمولی بات ہوگی۔"

"اونہ ـــ نرے ہی ہو ـــ بھلا بلا جرم بھی کبھی کسی کو اس کوٹھی کا وصال نصیب ہوا کرتا ہے"۔ پہلے نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "ارے چپ بھی رہو"۔ ایک اور نے ٹوکا۔ "کچھ کہنے بھی دو بیچارے کو" پھر اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ "جناب کا نام"؟ اس کا دماغ ابھی تک حیرت کی اُلجھنوں میں گرفتار تھا۔ اُسے کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ آخری سوال کی نرمی نے اس کی ہمت افزائی کی۔ اور بولا۔ "نام.... کریم"۔ "بڑا کرم کیا جو نام بتایا آپ نے"۔ پوچھنے والے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو۔ اب یہ بتائیے کہ آپ کو کس لئے یہاں ڈال دیا گیا ہے"؟ گھبرائے ہوئے کریم نے اپنی کمزوریوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "بس چوری کے........ الزام میں!" ہاہا۔ ابھی فقرہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا۔ کہ بے ہنگم قہقہوں کا شور گونج اُٹھا۔ اور وہ حیرت ناک اور خوفزدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"اچھا تو چوری کی آپ نے"۔ ایک نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "تو آپ رہے ہمارے ساتھی!"

"اجی گھبرائیے نہیں"۔ ایک اور کہنے لگا۔ "کوئی بڑا جرم تو نہیں۔ بس تنگدستی نے ہی آپ کو اس مصیبت میں پھنسایا ہوگا۔ اور آپ نے اپنی معاش کی تلاش میں لگے ہاتھوں چوری کر لی ہوگی۔ بھلا جرم کیسا ہوا۔"

"یہی کچھ مجھے بھی پیش آیا تھا" اور اب تو یہاں روٹی ملتی ہے۔ اور اگر باہر نہ ملی تو پھر سہی۔ کیوں جی"؟ پھر چند قہقہے اُٹھے۔ اور جب شور کچھ دبنے لگا۔ تو کریم نے تردیدی لہجے میں کچھ کہنے کی جرأت کی۔

"جی — نہیں .... میں بازار کی ایک دکان .... تھا ......"

"ارے تو کیا ہؤا۔ کسی امیر گھر سے نہیں تو کوئی بھاری دکان ہی سہی"۔ ایک نے اُسے آدھے فقرے پہ ہی ٹوک دیا۔

اجی آپ گھبراتے کیوں جا رہے ہیں۔ نئی جگہ ہے اس لئے؟ خیر تو آپ عادی ہو جائیں گے۔ ہم جو رہے آپ کے ساتھی۔ اور آپ ہوئے ہمارے"۔

"جی ہاں ضرور۔ ہمارے ساتھی بھی۔ اور .... میرا مطلب ہے شاگرد بھی"۔

ہنستے ہنستے اب سب اُٹھنے لگے — نئے کھلونے سے کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ یہ نوگرفتار اس ماحول سے بیگانہ تھا۔ اور یہ بیگانگی ہی ان کے لئے وجہ تضحیک تھی۔ اور اس ہنسی مذاق میں وہ اس کو نئے ماحول سے مانوس کر رہے تھے۔

عجیب بات تھی۔ اُس نے اس نقار خانے میں طوطی کی طرح آواز بلند کرنا چاہی۔ لیکن کون تھا سننے والا؟ وہ اپنے ڈر کو کس طرح نمایاں کرتا۔ وہ تو ساری دنیا کو اپنی ہی عینک سے دیکھنے کے عادی تھے — واقعی یہ انوکھی دنیا تھی۔ جس سے وہ قطعی طور پر واقف نہ تھا۔ وہ تو کسی اور ہی ماحول کا پروردہ تھا۔ زندگی کے یہ چھپے گوشے پہلی بار اس کے سامنے بے نقاب ہوئے تھے۔ جیسے اُس کا اُلجھنوں بھرا دماغ سمجھنے سے قاصر تھا۔ ان ہی خیالات میں ڈوبے ہوئے اس کی نظریں دُور سلاخوں سے باہر ایک چیل پر جا پڑیں۔ اچانک تیر کی طرح جھپٹی اور آبادی کے مکانوں میں ڈوب گئی۔ چند منٹوں کے بعد ایک ننھی سی جان پنجوں میں لئے اُبھری۔ اور اُڑتے اُڑتے دُور گھنے درختوں کی اوٹ میں چھپ گئی۔ "آہ یہ ظالم دنیا"! ... سرد آہ کے ساتھ اُس کا سر جھک گیا۔ اس کے دماغ میں اپنی مرغی کے چوزے ناچ رہے تھے۔

اس کے اعضا تکان سے چور تھے۔ اور آہستہ آہستہ دماغ پر ایک میٹھا سا پردہ چھاتا جا رہا تھا۔ پلکیں جھکتی جا رہی تھیں۔ نور کا منبع تاریکی میں منہ چھپا کر آرام کے لئے بیتاب تھا۔ تھوڑی دیر میں ساری طاقتیں کسی نرم و گداز جگہ میں گھستی محسوس ہو رہی تھیں۔ لیکن ابھی دنیا سے عارضی نجات کی ابتدا ہی تھی۔ کہ کسی بچہ کی آشنا آواز نے اُسے چونکا دیا۔ اُس نے اپنی خواب آلود آنکھیں کھولیں۔ تو سامنے اس کی بیوی اپنے بچے کو گود میں لئے اُسی کی طرف تک رہی تھی۔ غم زدہ حسن کی ایک خاموش تصویر تھی۔ اس کے دل میں ایک میٹھا لرزتا جذبہ اُٹھا۔ اور اس کے قریب آ رہا۔ دنیا میں بھی ایک پاک روح تھی جو اس کے درد میں شریک تھی۔ اور جس کی وہ خود کسی جذبے سے مجبور ہو کر خاموش پرستش کرتا تھا۔ اس کا بچہ اس کی محبت کا ایک ہی ثمر شیریں تھا۔ بلبل کی طرح جس کے نغمے اُس کے سونے گھر میں گونجنے لگے تھے۔ جیسے بہار رنگین آ گئی ہو — سلاخوں سے اس نے ہاتھ باہر نکالے اور پیار کیا۔ ننھا کچھ حیران سا تھا۔ گویا پوچھ رہا تھا۔ کہ "ابا یہاں کیوں ہیں"؟ لیکن بہتے آنسو اس کی معصومانہ حیرت کا خاموش جواب تھے — دیر تک ڈھلکتے ہوئے کانپتے

آنسوؤں سے وہ اپنے دلی حالات منتقل کرتے رہے۔ ایک غم آمیز سکوت طاری تھا۔ اور یہی کیفیت طاری ہی رہی۔ گویا سطح سمندر کے نیچے موجیں تو مچل رہی ہیں۔ لیکن کوئی رکاوٹ انہیں بلند ہونے نہیں دیتی۔

"کیا کرو گی اب؟" آخر کریم نے دکھے دل سے پوچھا۔ اور اس نے سسکتے لہجے میں جواب دیا "جو قسمت میں ہوگا . . . ." کریم ضبط کا دامن تھام کر خاموش رہا۔ اور پھر وہی سکوت تھا۔

"دنیا بے گناہوں کو سزا دیتی ہے" خاموش سطح پر پھر چند موجوں نے شور پیدا کیا۔ "دولتمند کے گناہ دولت چھپا لیتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ کوئی دوسرا گناہگار قرار دیا جا کر در در بھری زندگی گذارنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔" اس کی لمبی پلکوں پر سے آنسو پھسل کر، بے آواز نیچے خاک میں گم ہو رہے تھے۔ اور اس کی کانپتی ہوئی آواز فضاؤں میں مزید غم افزائی کر رہی تھی — "کوئی اور کام ہوتا جس میں عزت تو برباد نہ ہوتی . . . . بھاڑ میں جائیں ایسی دکان کی محرریاں . . . . . جو عزت پر بے رحم و گمان ہاتھ ڈال دیتی ہیں . . . . . زندگی خوار کر دیتی ہیں . . . . . اب کون سہارا ہوگا میرا؟ . . . . . کوئی نہیں . . . . اُف میرا مددگار کوئی نہیں؟ . . . . . اس سطح زمین کے اوپر . . . . . اس نیلی چھت کے نیچے . . . . ہاں شاید کوئی نہیں . . . . . اور . . . . اور . . . . . میرے ننھے . . . . تو کیا . . . . . کریگا . . . . اب . . . . کون . . . . ؟" سسکیوں میں اُس کی آواز اُلجھ رہی تھی۔ اسی حالت میں ننھے کو گود میں اُٹھا کسی کی نظروں سے بچتی، بل کھاتے ہوئے رستے کی موڑوں میں روپوش ہو گئی۔ کریم نے نظریں ہٹائیں۔ لیکن ایک جذبۂ بے اختیار اسے بھی ساتھ ہی بھاگ جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ مگر یوں محسوس ہوتا تھا گویا امڈتا ہوا بے جوش سلاخوں سے ٹکرا کر واپس لوٹ رہا ہے — خدا جانے اس غم آفرین لہجے میں کیوں اتنا سوز تھا۔ کہ سخت دل بھی پسیج گئے تھے۔ اس نے سارے ماحول کو سراپا افسردگی میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

سورج کی تیز و شوخ کرنیں سلاخوں سے گزر کر تاریک کمرہ کو روشن کرنے لگیں۔ کئی کسمسا کر آنکھیں ملتے بیدار ہو رہے تھے۔ اور کئی زرد ڈھانچے ابھی تک غلیظ کملوں میں لپٹے محو خواب تھے۔ اور ان کے ہلکے خراٹے ان کی زندگی کے آخری سانس محسوس ہوتے تھے — کریم بھی بیدار ہوا۔ اور اب تو اس کا بلبل خوب چہچہا رہا تھا۔

"دیکھو تو یار! اب تو خوب چہچہا رہا ہے ہمارا بلبل"

"تو کیوں . . . . . نہ چہچہائے" ایک نے جمائی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن جب پہلے پہل پنجرے میں بند کیا تھا۔ تو کس قدر اداس اور خاموش ہوا کرتا تھا"

"تو اس وقت نیا قیدی تھا۔ اور اب تو قفس کو اس طویل مدت کے بعد گھونسلا ہی تصور کرنے لگا ہے"

کریم اپنے میلے کپڑے درست کرتا اُٹھا۔ ایک خواب آلود انگڑائی لی۔

"ارے کریموں!" اُسکے دوست بلا رہے تھے "ادھر آؤ تو۔ ذرا دل بہلائیں۔ ابھی کاندھے پہ بیلچہ اُٹھا، سارا دن مشقت کرنا ہوگی"

سب کونے میں اکٹھے ہوئے۔ اور تاش کی دنیا میں ڈوبنے لگے۔ پھر وہی منظر تھا۔ ایک ہلکی سی ضرب ان اکڑے ہوئے تاروں میں بے ہنگم شور پیدا کر دیتی ــ "ارے کریموں! شکست کیوں ہو"؟

"اجی شکست کہاں؟ بازی نہ جیتی تو بات رہی" ــــ اور مقابل کے ایک نے زور سے پتا پھینکتے ہوئے کہا "ارے تم کہاں ہم جیتیں گے" ــــ اور کریم نے پُرمعنی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا ــ "او تو۔ جیتیں گے آپ! تو جیت دیکھئے"

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔

"ارے ــــ ایک پتا کہاں غائب ہے ــــ کون چور ہے؟ بتاؤ تو سب اپنے پتّے ــــ اور یہ تم کیا چھپا رہے ہو"؟

"اماں ــــ ہم تمہارے چور تو تھوڑے ہی ہیں"۔ کریم تیزی سے پتا نکال کر گھٹنوں میں دبانے لگا۔

بس۔ تمہارے ہی پاس تو ہے"۔ وہ تیزی سے اُٹھا۔ اس کے ہاتھ سے زبردستی پتا چھین کر کہنے لگا ــــ "ہے یا نہیں بیگم"۔ پتا دیکھتے ہی کمرے کی فضاؤں میں اونچے اونچے قہقہوں کا شور گونج اٹھا۔

"چالاک ہے اب ہمارا شاگرد"۔ ایک نے زور سے تھپکی دیتے ہوئے اُسے کہا۔ ہنسی تھی۔ ایک مسلسل ہنسی۔ اتنے میں لوہے کا دروازہ چیختے ہوئے کھلا ــــ ایک افسر کے ہاتھ میں چند کاغذات تھے۔ سب متجسس نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ پتّے ہاتھوں سے خود بخود لڑھک رہے تھے ــــ کریم کے نام چند احکامات تھے "کہ اب اچانک چند دلائل کے مل جانے کی وجہ سے کریم بےقصور ثابت ہو گیا ہے۔ اس لئے آج شام اُسے رہا کر دیا جائیگا"

ہا ہا۔ کریم زور سے ہنسا۔ دنیا دیکھے آج۔ آج ایک سال کی سزائے بامشقت کے بعد بےقصور ثابت ہو گیا ہوں ــــ اور آج شام آزاد ہو جاؤں گا ــــ ہا ہا۔ ہی ہی ہی ــــ"

ابھی ابھی اس کا جسم لوہے کی زنجیروں سے جدا ہوا تھا۔ اور اب پھر اس کی کلائیوں کے گرد موٹی کڑیاں لپٹی ہوئی تھیں ــــ وہ نہایت بیباکی سے بازار کے عین وسط سے گزر رہا تھا۔ گویا کوئی قابلِ ستائش کام سرانجام دیا ہو ــــ پرندہ قفس سے مانوس ہو چکا تھا۔ اُسے طویل عرصہ کے بعد گھونسلا تصور کرنے لگا تھا۔ بھلا جدائی اُسے کب گوارا تھی۔ کسی بھاری جیب کو ہلکا کرنے کی کوشش اُسے پھر اپنی ہی محفل کی طرف لئے جا رہی تھی۔ اور جانے اس کے لئے آج یہی بات کیوں باعثِ مسرت تھی۔ وہ گزر رہا تھا۔ بےغم و فکر۔ اور سڑک کے کنارے ایک نحیف و نزار عورت سر جھکائے، ہاتھ پھیلائے ایک صدائے پُردرد بلند کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کے کھنڈر کسی اُجڑے حسن دیرینہ کا پتہ دے رہے تھے۔ اور اس کے پاس ہی کمزور و ناتوان بچہ یوں رو رہا تھا۔ گویا کسی خزاں زدہ درخت کی سوکھی ٹہنی پر ایک مغموم پرندہ اپنی غمگین صداؤں سے دلخراشی کر رہا ہو۔ لیکن وہ اسی طرح بےباکی سے گزر رہا تھا۔ بلا فکر و غم ــــ اُسے تو کچھ یاد ہی نہیں تھا۔ اس کی دماغی حسیات پر گویا ایک موٹا سا پردہ پڑا تھا۔ آہ! ایک خوبصورت عمارتِ سیرت کا کس قدر لرزہ خیز انہدام تھا ــــ"

(محمد احسن۔ سال دوم)

مجوّزہ نظامِ تعلیم[1]

ملکی تاریخ، قومی روایات، مذہبی اعتقادات، معاشرتی کیفیات اور جغرافیائی حالات کا مجموعی اثر افراد قوم کو جس سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ اس کا نام تہذیب ہے۔ ہر قوم اپنی ہی تہذیب کو بہترین تہذیب سمجھتی ہے۔ اور ہر ممکن ذریعے سے اس کی اہم اور امتیازی خصوصیات کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن مختلف تہذیبوں کے درمیان وقتاً فوقتاً تصادم بھی ہو جاتا ہے۔ جب ایک قوم کسی دوسری قوم کے غلبہ و تسلط میں آ جاتی ہے تو مفتوح قوم پہلے تو فاتح قوم کی تہذیب کا ہر طرح سے مقابلہ کرتی ہے۔ اور اپنی روایتی تہذیب کے تمام نمایاں پہلوؤں کو قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کی محکومی کے بعد اپنی تمام مساعی کو ناکام ہوتے دیکھ کر اس پر ایک مایوسی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اور وہ خود اپنی تہذیب و تمدن سے بیزار ہونے لگتی ہے پھر آہستہ آہستہ اپنی تمام روش اور مستحسن خصوصیات کو ترک کر کے نئی تہذیب کے تاریک ترین پہلوؤں کو اختیار کر لیتی ہے اور اسے ایک عظیم الشان اور قابلِ فخر کارنامہ شمار کرنے لگتی ہے۔ لیکن کچھ مدت کے تلخ تجربے کے بعد اسے دونوں تہذیبوں کے محاسن و معائب پر نظرِ غائر ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور بالآخر نظر آنے لگتا ہے کہ اپنی تہذیب بھی خوبیوں سے خالی نہ تھی۔ اور اجنبی تہذیب کے دلکش نظارے قریب نگاہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے قوم نئی تہذیب کی کورانہ تقلید سے باز آ کر عہدِ گزشتہ کی طرف لوٹنے لگتی ہے۔ لیکن زمانہ حال کا اثر اتنا گہرا ہو چکا ہوتا ہے کہ اس کا مٹنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ دونوں تہذیبوں کے باہمی اختلاط اور امتزاج سے ایک نئی قسم کا تمدن ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جو ایک طرف تو دونوں کی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف بہ حیثیت مجموعی دونوں سے مختلف۔

کچھ اسی قسم کا اثر مغربی تہذیب و تمدن کے تصادم کا ہندوستانی تعلیم پر ہوا۔ انگریزی عملداری سے پہلے ہندوستان میں عام تعلیم مولویوں اور پنڈتوں کے ہاتھوں میں تھی۔ جو عموماً مسجدوں اور مندروں میں تعلیم دیا کرتے تھے۔ ان کے مکتبوں اور پاٹھ شالاؤں میں جماعت بندی نہیں ہوتی تھی۔ نہ کوئی رجسٹر ہوتے تھے اور نہ حاضری لی جاتی تھی۔ ہر طالب علم بذاتِ خود ایک جماعت ہوتا تھا۔ اور اسے اس کی قابلیت اور استعداد کے مطابق سبق دیا جاتا تھا۔ مکتب سے ابتدائی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد ہونہار طالب علم خاص خاص علوم کی تکمیل کے لئے مشہور علماء کے پاس جا کر کسبِ فیض کیا کرتے تھے۔ سند تکمیلِ علومِ مروجہ کی تحصیل میں کافی عرصہ صرف کر لینے اور فاضل استاد کے اعلیٰ معیار کے امتحان میں پورا اترنے پر ملا کرتی تھی۔

انگریز اپنے ہمراہ ایک نئے قسم کا تمدن اور ایک نیا نظامِ تعلیم لائے۔ ابتدا میں ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں نے اجنبی نظام کی پُرزور مخالفت کی اور اپنے مشرقی طرزِ تعلیم کی پابندی پر مُصر رہے جن طبقوں نے مغربی علوم کی تحصیل مغربی زبان کے ذریعہ مغربی طریقے سے شروع کی تھی۔ ان کی حوصلہ افزائی حکومت

---

[1] [illegible] سے نشر کیا گیا۔ اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب کی اجازت سے شائع کیا جا رہا ہے۔

کی طرف سے ہوتی نظر آئی۔ تو کچھ عرصہ کے بعد مغربی معاشرت کی اندھا دھند نقل کی جانے لگی۔ اور جب اس کے بعض پہلو ضرر رساں ثابت ہوئے تو ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ مغرب اور مشرق کی تہذیبوں کی یہ کشمکش اب تک ہندوستان میں جاری ہے۔ اور اس کی جو آخری صورت ہوگی۔ اسکی نسبت کوئی قطعی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔

حکمران قوم نے بھی ابتدا میں کچھ احتیاط سے قدم اٹھایا اور شروع شروع میں عربی اور سنسکرت کے مدارس سے ہی کام لینے کی کوشش کی۔ لیکن جب فارسی کو سرکاری عدالتی زبان کے درجے سے ہٹا دیا گیا۔ تو حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھ گیا۔ اور ہوا کا رُخ صاف طور سے نظر آنے لگا۔ اس کے بعد مغربی علوم و فنون کو انگریزی زبان میں پڑھائے جانے کا بندوبست کیا گیا۔ ۱۸۵۴ء میں موجودہ طرز تعلیم کی بنیاد رکھی گئی۔ تھوڑے عرصہ کے اندر تین سرکاری یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں۔ اور بہت سے انگریزی سکول اور کالج کھل گئے۔ بظاہر اس وقت کے حاکموں کا مقصد یہ تھا کہ ارباب حکومت کی زبان جاننے والے لوگ دفتروں اور عدالتوں میں کام کرنے کے لئے کافی تعداد میں اور کم خرچ پر مل جائیں۔ مدارس کی نگرانی اور انتظام کے لئے ۱۸۸۲ء میں ہنٹر کمیشن کا تقرر ہوا۔ اس کی سفارش پر گورنمنٹ ہند نے پہلی مرتبہ ابتدائی تعلیم کے مصارف کے لئے روپیہ مہیا کرنے کا فرض اپنے ذمہ لیا۔ لیکن ثانوی اور اعلےٰ تعلیم کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ صرف ایک سرکاری ہائی سکول ہر ضلع میں جاری کیا جائے۔ اور صرف ایک سرکاری کالج ہر صوبے میں۔ مزید سکول اور کالج غیر سرکاری سرمایہ سے کھولے جائیں۔ ۱۹۰۴ء میں پھر ایک مرتبہ حکومت نے اپنی اس پالیسی کا اعلان کیا کہ ابتدائی تعلیم کی ترقی و توسیع کے تمام اخراجات خزانہ سرکاری سے ادا کئے جائیں گے لیکن اس کے بعد بھی ابتدائی تعلیم عام نہ ہوسکی۔ رفتار ترقی بھی بے حد سست رہی۔ مسٹر گوکھلے نے ۱۹۱۰ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں یہ تحریک پیش کی۔ کہ ہندوستانی حکومت بھی دوسرے مہذب ممالک کی طرح اپنی رعایا کی آنے والی نسلوں کے ہر فرد واحد کو کم از کم پرائمری کے درجے تک تعلیم دینا اپنا فرض سمجھے۔ اور ابتدائی تعلیم کو عام اور لازمی اور مفت کر دینے کی ایک ہمہ گیر تجویز تیار کرکے اس پر بلا تاخیر عملدرآمد کرنے کی غرض سے ساڑھے پانچ کروڑ روپے کی زائد رقم محفوظ کرلے۔ یہ قرار داد منظور تو نہ ہوسکی۔ لیکن اس کی وجہ سے ابتدائی تعلیم کی اہمیت ماہران تعلیم کے محدود حلقے سے نکل کر عوام الناس کے سامنے آگئی۔ اور حکومت سے بار بار اسے عام کر دینے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ ۱۹۱۲ء کے دربار میں اور پھر ۱۹۱۳ء میں حکومت کی طرف سے ابتدائی تعلیم کی توسیع کے وعدے کئے گئے۔ لیکن جب تک ۱۹۱۹ء کا جدید آئین نفاذ پذیر نہ ہوا۔ ابتدائی تعلیم کو جبری بنا دینے کا کوئی انتظام نہ ہوسکا۔

۱۹۲۱ء میں نئی سیاسی اصلاحات کے ماتحت مجالس واضع قوانین کے وزرائے تعلیم نے اپنے اپنے صوبہ کے لئے لازمی ابتدائی تعلیم کے قانون منظور کرائے۔ لیکن ان پر عمل کسی صوبہ میں بھی مکمل طور سے اب تک نہیں ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب تک ۸۵ فیصدی کے قریب ہندوستانی غیر تعلیم یافتہ ہیں ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رو سے صوبجات کو زائد اختیارات مل گئے ہیں۔ لیکن یہ

اختیارات صحیح طور سے استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ جب تک صحیح قسم کے لوگ منتخب ہو کر مجالس آئین ساز میں نہ آ جائیں۔ تا کہ ان میں سے قابلیت اور صلاحیت رکھنے والے وزیر مقرر ہو سکیں۔ ان مجالس کے لئے صحیح نمائندوں کا انتخاب ووٹروں کے ہاتھ میں ہے۔ ووٹر اگر خود ناخواندہ اور حالات گردوپیش سے بے خبر ہوں تو وہ نمائندوں کے انتخاب میں یقیناً غلطی کر بیٹھیں گے۔ اسی لئے دنیا بھر کے متمدن ممالک میں ووٹروں کا تعلیمیافتہ ہونا جمہوری حکومت کی کامیابی کے لئے نہایت ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ اب ہندوستان کے ساتھ لڑائی کے بعد آزادی کے وعدے کئے گئے ہیں۔ اس لئے اسمبلیوں کے اختیارات میں مزید توسیع ہوگی۔ اور رائے دہندگان کی ذمہ واری اور بڑھ جائیگی۔ اس لئے یقیناً ابتدائی تعلیم کے عام اور لازمی کر دینے کا وقت آ گیا ہے۔

۱۹۳۷ء میں نئی اصلاحات کا نفاذ ہوا۔ اور ۱۹۳۸ء میں حکومت ہند نے ایک مرکزی مشاورتی بورڈ عام تعلیم کی اصلاح و ترقی کے لئے مناسب تجاویز پیش کرنے کے لئے قائم کیا۔ اس بورڈ نے کئی کمیٹیاں اس غرض سے مقرر کیں کہ وہ تعلیم کے مندرجہ ذیل شعبوں کے متعلق اپنی رائے پیش کریں (۱) ابتدائی بنیادی تعلیم (۲) تعلیم بالغاں (۳) بچوں کی صحت (۴) مدارس کی تعمیر (۵) مجلسی خدمت (۶) معلمین کا انتخاب تربیت و ملازمت (۷) افسران معائنہ کنندہ کا انتخاب و تقرر (۸) صنعتی تجارتی اور فنی تعلیم۔ ان سب کمیٹیوں کی رپورٹیں مرکزی بورڈ کے سامنے پیش ہوئیں۔ اور بورڈ نے ان کمیٹیوں کی تجاویز کا خلاصہ اور ان کے متعلق اپنی سفارشیں POST-WAR EDUCATIONAL DEVELOPMENT IN INDIA کے نام سے ایک کتاب کی صورت میں شائع کی ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں تعلیمی اصلاح و ترقی کے لئے ایسی ہمہ گیر تجاویز پہلے کبھی پیش نہیں کی گئیں۔ بورڈ کی محنت اور وسعت نظر اور تجاویز کی جامعیت واقعی قابل داد ہیں۔ بورڈ کی سفارشوں کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) چھ سے چودہ برس تک کے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مفت اور لازمی بنیادی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ تعلیم مادری زبان میں دی جائے۔ اور اس کی بنیاد بچوں کے عملی میلان طبع کو مدنظر رکھکر "کام کرو اور سیکھو" کے اصول پر قائم کی جائے۔ چھ برس سے کم عمر کے بچوں کے لئے نرسری مدارس قائم کئے جائیں۔ جن میں تعلیم دینے والی استانیاں ہوں (۲) ہائی سکولوں میں داخلہ ۱۱ سال کی عمر میں ہو۔ اور میعاد تعلیم چھ سال ہو۔ لیکن ان سکولوں میں صرف وہی طالب علم داخل کئے جائیں جو اوسط سے زیادہ قابلیت رکھتے ہوں۔ ہائی سکول دو قسم کے ہوں اکیڈمک یعنی خالص علمی اور ٹیکنیکل یعنی صنعتی۔ تا کہ بچوں میں جس قسم کی صلاحیت ہو۔ اسی قسم کے سکول میں داخل ہو سکیں (۳) یونیورسٹی میں داخلہ کی شرائط میں ترمیم کی جائے۔ اور صرف وہی طلبا کالجوں میں داخل کئے جائیں۔ جو یونیورسٹی تعلیم سے استفادہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ غریب لیکن مستحق طلبا کی امداد وظائف دے کر کی جائے۔ انٹرمیڈیٹ جماعتیں منسوخ کر دی جائیں۔ اور ڈگری حاصل کرنے کے لئے مدت تعلیم تین سال ہو۔ ڈگری یافتہ طلبا کے لئے علمی اور عملی تحقیقات کا خاص بندوبست کیا جائے (۴) جنگ کے بعد ہونے والی صنعتی اور تجارتی ترقی کے پیش نظر ان بچوں کو جن کا رجحان طبع عملی کام کی طرف ہو۔ صنعتی تجارتی اور

زراعتی تعلیم دینے کا انتظام وسیع پیمانے پر کیا جائے۔ مدت تعلیم ابتدائی صنعتی یا حرفتی یا تجارتی سکولوں میں دو سال۔ ٹیکنیکل ہائی سکولوں میں چھ سال اور ڈپلوما حاصل کرنے کے لئے مزید تین سال ہو۔ اور کام کے عملی پہلو کو زیادہ توجہ اور اہمیت دی جائے (۵) تعلیم بالغاں کو اتنی ہی اہمیت دی جائے جتنی بنیادی تعلیم کو۔ تمام بالغ آبادی کو حقیقی معنوں میں تعلیمیافتہ بنانے کی مہم بہت بڑے پیمانے پر شروع کی جائے۔ ضروری ہو تو غیر سرکاری اداروں اور یونیورسٹیوں کے طلبات اس کام میں امداد لی جائے۔ اور ریڈیو۔ سینما۔ گراموفون وغیرہ کا استعمال کیا جائے۔ کتب خانے جاری کئے جائیں۔ اور موزوں قسم کی کتابیں، رسالے اور اخبارات شائع کئے جائیں۔ (۶) ہر قسم کے مدارس کے لئے معلمین کا انتخاب نہایت احتیاط سے کیا جائے۔ ان کی تنخواہوں میں معقول اضافے کئے جائیں۔ ان کی تربیت کے لئے نئے ٹریننگ کالج اور سکول کھولے جائیں۔ جن میں تعلیم مفت ہو۔ اور غریب طلبا کو وظائف دئے جائیں (۷) طالب علموں کی تندرستی اور صحیح نشوونما کی حفاظت کے لئے طبی معائنوں اور علاج کا ایک سلسلہ جاری کیا جائے۔ صحت اور صفائی، غذا اور پوشاک اور ورزش اور تفریح کے متعلق مناسب تجاویز اختیار کی جائیں۔ (۸) جن بچوں میں کوئی خاص جسمانی کمزوری یا دماغی نقص ہو ان کی تعلیم کا خاص بندوبست کیا جائے (۹) لڑکوں اور لڑکیوں کے دلوں میں ہمدردی۔ فیاضی، امداد باہمی، اور مجلسی فرائض کے خیالات وجذبات کی نشوونما کرنے کے لئے مناسب تفریحی اور سماجی مشاغل مہیا کئے جائیں۔ بچوں کی عمر کے مطابق کھیل کود۔ کھیتی باڑی، سکاؤٹنگ، ڈراما، امداد باہمی، اصلاح دیہات وغیرہ جیسے مشاغل کو منظم طریقہ پر وسعت دی جائے۔ (۱۰) ملازمت تلاش کرنے والوں کی امداد کے لئے خاص ادارے قائم کئے جائیں۔ (۱۱) ہر قسم کی تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے لئے قابل، مخلص اور ہمدرد افسر منتخب کئے جائیں۔ اور ان کی امداد کے لئے سکول بورڈ اور ڈسٹرکٹ سکول کمیٹیاں مقرر کی جائیں ؛

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اس دلکش اور حسین تصویر کا جو بورڈ نے اپنے مجوزہ نظام تعلیم کی پیش کی ہے بعض سیاستدان جو اس قسم کے بلند بانگ وعدوں کی ایفا ہوتے دیکھنے کے خوگر نہیں۔ اسے محض فریب نظر سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ جن کی رائے میں گذشتہ سو ڈیڑھ سو برس کے دوران میں تعلیم کی رفتار ترقی نہایت مایوس کن رہی ہے۔ یکدم کروڑوں انسانوں کو خواندہ بنا دینے کی تجاویز کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جن ماہران تعلیم کو تعلیمی معاملات میں ہمیشہ حکومت کے بخل اور بے اعتنائی کی شکایت رہی ہے۔ وہ کروڑوں روپے تعلیم پر خرچ کر دینے کی تجویز کو محض ایک ایسا دلخوش کن خواب تصور کرتے ہیں جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ برعکس اس کے مبصرین ان تجاویز کا دلی خلوص سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور انہیں جلد سے جلد عملی جامہ پہنائے جانے کے خواہشمند ہیں۔ لیکن فی الحال یہ تجاویز صرف ایک خاکے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نقشہ کی تکمیل کے لئے ان میں ضروری تفصیلات کے اندراج کی ضرورت ہے اس لئے تمام سب کمیٹیوں کی رپورٹوں کی بھی اتنے ہی وسیع پیمانے پر اشاعت ہونی چاہیئے۔ جتنی خود بورڈ کی رپورٹ کی ہو رہی ہے ؛

تجاویز زیر نظر میں کافی اصلاح اور ترمیم کی گنجائش ہے۔ اول تو اربوں روپے کے خرچ کا جو اندازہ لگایا گیا ہے۔ وہ ہندوستان جیسے غریب ملک کے لئے بہت ہیبت ناک نظر آتا ہے۔ زیادہ احتیاط سے تخمینہ لگانے اور تجاویز میں جزوی ردّ و بدل کرنے سے اس میں کمی ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی کروڑوں انسانوں کی تعلیم کے لئے کروڑوں روپے ہی درکار ہوں گے۔ اگر لڑائی پر خرچ کرنے کے لئے کروڑوں روپے پیدا کئے جا سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ زمانۂ امن میں انہی موجودہ وسائل سے اتنے یا اس سے بھی زیادہ روپے مہیا نہ ہو سکیں۔ کام کی اہمیت، نوعیت اور وسعت اس کی متقاضی ہے کہ اس کے لئے جتنی قربانی کرنی پڑے اس سے دریغ نہ کیا جائے۔ کیونکہ صحیح قسم کی عام تعلیم پر ہی قومی اور ملکی ترقی کا دارومدار ہے۔ البتہ جو لوگ ہندوستان کو جلد سے جلد بام عروج پر پہنچا ہوا دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں ان کو چالیس برس کا زمانہ بہت طویل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تجاویز پر عملدرآمد کرنے کی سکیم میں جزوی ترمیم کرنے اور ابتدائی کام ابھی سے یعنی دوران جنگ ہی میں شروع کر دینے سے اس عرصے میں کافی کمی ہو سکتی ہے۔ اور یقیناً ہونی چاہیئے۔ کیونکہ جنگ کے بعد کا زمانہ شدید بین الاقوامی مقابلے کا زمانہ ہوگا۔ ہندوستان کو اس کے لئے ابھی سے تیار ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ صدیوں تک پسماندہ اقوام کے زمرہ میں دوسروں کا دست نگر بن کر رہنا پڑیگا۔

بورڈ نے چند امور کی طرف کافی توجہ نہیں کی۔ مثلاً امتحانوں جیسے اہم تعلیمی مسئلہ کو عام طور سے حل کرنے کی کوشش تک نہیں کی گئی۔ بلکہ اسے زمانہ آئندہ کے لئے اٹھا رکھا گیا ہے۔ حالانکہ موجودہ تعلیم کی ایک بہت بڑی کمزوری اس کا نظام امتحان ہی ہے۔ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی تفصیلات سے کوئی بحث نہیں کی گئی۔ حالانکہ اسے عام تعلیم کا جزو ضروری قرار دینا چاہیئے تھا۔ مستحق طلبا کو وظائف دینے کی اور ہائی سکولوں میں صرف قابل طالب علموں کے داخلہ کی سفارش کی گئی ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ انتخاب کن اصولوں کے ماتحت ہوں گے۔ خصوصاً مختلف سکولوں کے لئے کسی مشترک طریق امتحان کی سفارش نہیں کی گئی۔ ذریعۂ تعلیم کے مسئلہ کو واضح طور سے سلجھانے کی کوشش نہیں کی گئی بنیادی تعلیم مادری زبان میں ہوگی۔ ہائی سکولوں میں ہندوستانی ذریعۂ تعلیم ہوگا۔ اور یونیورسٹی میں انگریزی ہائی سکولوں سے یونیورسٹی میں جانے والے طلبا کے لئے جو مشکل زبان کی اس طرح پیدا ہو جائیگی اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا۔ اور نہ کوئی حل بتایا گیا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ کہ ان کی تعلیم بھی لڑکوں جیسی ہوگی۔ حالانکہ لڑکیوں کی تعلیم کا سوال مسلمہ طور سے زیادہ اہم اور نازک ہے۔ بظاہر ادنےٰ سے لے کر اعلےٰ مدارج تعلیم تک لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک جیسی تعلیم دینے کی تجویز ہے۔ حالانکہ سالہا سال کا تجربہ اس نظریہ کو غلط ثابت کر چکا ہے۔ اعلےٰ تعلیم کے لئے یونیورسٹیوں کی ضرورت کا احساس ہونے کے باوجود نئی یونیورسٹیاں کھولنے کی کوئی تجویز پیش نہیں کی گئی۔ نہ ہندوستان کے مستحق منتہی طلبا کو وظائف دے کر ممالک غیر میں مزید تعلیم یا تحقیقات کی غرض سے بھیجنے کا کہیں ذکر کیا گیا ہے۔ ملازمت کے ادارے قائم کرنے سے پہلے مدارس کے ساتھ ساتھ مناسب پیشہ منتخب

کرنے کے مشاورتی مرکز جاری کئے جانے چاہئیں۔ تین سال سے چھ سال تک کے بچوں کے لئے نرسری سکولوں کا اجرا مختلف وسیع پیمانے پر تجویز کیا گیا ہے۔ اس کی اغلباً ضرورت نہیں ہوگی۔ بورڈ نے اپنی تجاویز موجودہ سیاسی نظام کو مدنظر رکھ کر تیار کی ہیں۔ اگر اس میں تبدیلیاں ہوگئیں خصوصاً مرکز میں۔ تو ان تجاویز میں بھی اس کے مطابق تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ بہرحال رپورٹ بڑے کام کی چیز ہے۔ اور بورڈ نے اسے شائع کرکے ایک لائق تحسین کام کیا ہے۔

احمد علی صادق

افسانے کا پلاٹ

آپ ہی بتایئے کہ اگر آپ کسی مرحوم دوست۔۔۔۔۔ مرحوم سے میرا مطلب خدانخواستہ وہ مرحوم نہیں جو عام اصطلاح میں استعمال ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے قبل شدہ سے۔ ہاں تو آپ کسی مرحوم دوست کے کمرے میں جائیں۔ اور اس کو لکھتا ہوا دیکھ کر پوچھیں۔ کہ بھئی کیا لکھ رہے ہو؟ اور وہ کہے کہ افسانہ۔۔۔۔ تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی۔۔۔۔۔۔ ہے تاڑ اتربکیٹ افسلٹ۔ بھلا اس کو کیا حق ہے افسانہ لکھنے کا دراںحالیکہ ہم خود افسانہ نہیں لکھتے۔ تو ایسے ہی ایک دوست بڑی دیر سے ہماری چھاتی پر مونگ دل رہے تھے۔ اور ہیں۔

مگر کہاں تک۔ آخر ایک دن ہم کو بھی غصہ آ ہی گیا۔ بس اسی وقت کمرے میں آئے۔ کوٹ اتار کر کرسی پر رکھا کیونکہ مابدولت کے کمرے سے کھونٹیاں غائب ہیں۔ اور قمیض کی آستینیں چڑھا کر قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ گئے افسانہ لکھنے۔

اب مشکل یہ آ پڑی کہ لکھیں تو کیا لکھیں۔ اور کیسے لکھیں۔ بہت دماغ مارا۔۔۔۔۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ پھر خیال آیا کہ افسانوی ماحول پیدا کرنا چاہئے۔ بس جھٹ جاکر بوٹینیکل گارڈن کی مرمت کی طوطی ہمنز کو بلا کر کمرہ جھڑوایا۔ نئی چادر بستر پر بچھائی اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ گویا ہم نے افسانوی ماحول بنا ہی لیا۔ پھر بھی بری طرح شکست ہوئی۔۔۔۔ ہم بھی کوئی اتنی جلدی ہار مان جانے والی ہستی تو تھے۔۔۔ ۔۔۔ نہ تو بہ نعوذ باللہ نہیں ہیں۔ آخر ہمارا دماغ یا تدبیر وقت پر کام آیا۔ اور اس نے ایک طریقہ نکال ہی لیا۔۔۔۔ یعنی کسی کا افسانہ چرا لیا جائے۔

اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ چرایا جائے تو کہاں سے اور کیسے۔۔۔۔۔ اور پھر چرانا تو گناہ ہے۔۔۔۔۔ ہاں ہاں گناہ ہی تو ہے۔۔۔۔۔ مگر آپ کہیں گے کہ یہ گناہ کیا بلا ہے۔ تو لیجئے میں آپ کو بتاتا ہوں۔۔۔۔ گناہ ہے ثواب کا الٹ۔۔۔۔۔ آپ اب بھی نہیں سمجھے۔ اچھا تو میں آپ کو مثال کے ذریعے سمجھاتا ہوں اور مثال بھی ماشاءاللہ ایسی کہ بس آپ کے دل کی۔

اچھا تو فرض کیجئے۔۔۔۔۔ نہیں آپ گھبرائیے گا نہیں۔۔۔۔ یہ حساب کا سوال بالکل نہیں ہے۔

ہاں تو پھر فرض کیجیے۔ کہ ایک ٹانگہ چل رہا ہے۔ یعنی جا رہا ہے۔ . . . . میرا مطلب ہے کہ ایک گھوڑا اس کو کھینچ رہا ہے۔ اور آپ بھی چلا رہے ہیں . . . . . اپنی دو ٹانگوں کو ہرگز نہیں . . . . . سائیکل کو۔ اور اُس ٹانگے میں ایک خوبصورت عورت بیٹھی ہے۔ اب آپ دو طریقوں سے سوچ سکتے ہیں۔ اول اس طرح کہ "کاش یہ میری بیوی ہوتی . . . . . یعنی میں اس سے شادی کر لوں۔ اور . . . . . اور . . . . ."

ہاں تو یہ اچھا خیال ہے۔ یعنی نیک بات ہے۔ یا بالفاظ دیگر ثواب ہے۔

اور بصورت دیگر آپ اس طرح سوچ سکتے ہیں۔ کہ آپ شادی کو بیچ سے غائب کر دیں . . . . . تو یہ بُرا خیال ہے۔ گویا بری بات ہے۔ یعنی گناہ ہے۔

یہ رہا ثواب اور گناہ کا فلسفہ . . . . . مگر یہ میں کہاں سے کہاں آ گیا . . . . . . مجھے تو افسانہ لکھنا ہے۔ یعنی چرانا ہے . . . . . مگر پھر چرانا تو گناہ ہے۔ اور افسانے چرانا اخلاقی گناہ . . . . . تو گویا نہیں چرانا چاہیئے . . . . . اچھا تو یونہی سہی۔ ایک دفعہ پھر کوشش کر دیکھتے ہیں۔ شاید کوئی افسانہ بھولے بھٹکے سے ہمارے دماغ میں بھی آ نکلے۔

مگر لوگ تو افسانہ لکھنے سے پہلے پلاٹ تیار کرتے ہیں . . . . . اس واسطے . . . . . پہلے . . . . . پلاٹ پیدا کرنا چاہیئے . . . . . ہاں پلاٹ . . . . . میرا مطلب گھاس کے پلاٹ سے ہرگز نہیں . . . . . میرا مطلب ہے افسانے کے پلاٹ سے . . . . . ہوں . . . . . تو پلاٹ . . . . . آ رے پلاٹ . . . . . پیارے پلاٹ . . . . . راج دلارے پلاٹ . . . . . میرے پلاٹ . . . . . اوہو یہ تو اچھی خاصی نظم بن گئی۔ اور مجھے چاہیئے افسانہ . . . . . یعنی افسانے کا پلاٹ . . . . . ہاں ہاں پلاٹ . . . . . وہ مارا مل گیا۔ ہوں . . . . . .

اچھا تو ایک لڑکا ہو . . . . . کالج میں پڑھتا ہو . . . . . مگر کس کلاس میں ؟ . . . . تو چلو بی۔ ٹی میں پڑھتا ہو . . . . . مگر یہ بی ٹی والے تو لڑکے نہیں رہتے۔ وہ تو اچھے خاصے استاد یعنی ماسٹر بن گئے ہوتے ہیں . . . . . . تو چلو بی۔ اے میں پڑھتا ہو . . . . . مگر یہ بھی مجھے کچھ اچھا . . . . . تو ٹھیک . . . . یعنی وہ لڑکا ایف۔ اے میں پڑھتا ہو۔ مگر کس سال میں ! . . . . . فسٹ ایر بہتر رہے گا . . . . . اوہو نہیں . . . . پھر بھول گیا افسانے کے ہیرو کو تو بے وقوف نہیں ہونا چاہیئے۔ اور یہ فسٹ ایر تو کچھ زیادہ عقلمند نہیں ہوتے . . . . . آپ مانیں نہ مانیں۔ میرا تو اس پر پورا پورا ایمان ہے . . . . . مگر جب میرا اس بات پر ایمان ہے تو آپ کا بھی ہونا چاہیئے . . . . . ضرور ہونا چاہیئے۔ تو فیصلہ یہ ہوا کہ آپ کو بھی وہ قصہ ضرور ضرور سُننا چاہیئے۔ جس کو دیکھ اور سن کر میں اس بات پر ایمان لایا ہوں۔

اچھا تو وہ قصہ یوں ہے کہ ہم ایک دن کالج کی شمالی سرحد پر . . . . . شمالی تو آپ جانتے ہی ہیں نا . . . . یعنی شمال کی طرف والی . . . . . شمال . . . . . . میرا مطلب ہے کہ اگر آپ کالج کے گھنٹہ گھر پر چڑھ کر مسجد کی طرف منہ کریں تو جو طرف آپ کے بائیں ہاتھ کو ہوگی۔ ہاں تو اس طرف . . . . . یعنی اس سرحد پر ہم گشت کر رہے تھے۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ پرانی ہاکی کے میدان سے ذرا فاصلے پر دو لڑکے . . . . . میرا مطلب ہے

دو فسٹ ایر کھڑے ہیں۔ اور یوں گوہر افشانی فرما رہے ہیں۔

ا۔ یار! یہ ڈیفنس (DEFENCE) بھی بڑی ضروری چیز ہے۔ اگر خدانخواستہ کہیں جاپان درۂ خیبر کے راستے ہندوستان پر حملہ کر دے تو ہم کہاں جائیں گے؟

ب۔ چھوڑو دوست! تمہیں کالج والے اتنے ہی بھولے نظر آتے ہیں۔ جناب عالی! انہوں نے ڈیفنس کا پورا پورا انتظام کر رکھا ہے ...... خشکی کا بھی اور ہوائی بھی۔

ا۔ اچھا! یہ بات ہے ...... مگر میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔

ب۔ یہ تو جناب (اپنے سر کی طرف اشارہ کر کے) دماغ والوں کا کام ہے۔ ورنہ ڈیفنس (DEFENCE) کا پہچاننا کوئی معمولی کام تھوڑا ہے ...... اچھا تو وہ دیکھتے ہو نا ...... وہ (انگلی سے مرحوم اینٹوں کے بھٹے کی سرزمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ مورچہ نما قلعہ ہے۔ اگر دشمن کا خشکی سے خطرہ ہوا تو کالج کی تمام آبادی کو اس درمیان والی جگہ پر لے جا کر اس خندق میں پانی چھوڑ دیا جائیگا۔ اور U.T.C کی "خاص" بندوقیں دکھلا دکھلا کر دشمن کو بھگا دیا جائے گا ......

ا۔ ہوں ...... اچھا ......

ب۔ یہ تو چھوڑو ...... ابھی ہوائی حملہ سے بچاؤ کا انتظام دیکھو ...... وہ (گرے ہوئے بھٹے کے دودکش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ...... وہ ...... ہاں ہاں۔ وہی۔ یہ اینٹی ایئر کرافٹ گن (TI-AIR-CRAFT) کا سرا ہے۔

ا۔ کمال ہے یار ......

اب تو آپ کو ایمان لانا ہی پڑا نا ...... ہاں تو مطلب اصل میں یہ ہے کہ اُس لڑکے کو فسٹ ایر نہیں ہونا چاہیئے ...... مگر یہ کس لڑکے کو ...... ہیرو کو ...... افسانے کے ہیرو کو ...... افسانہ ...... پلاٹ ...... ہاں تو وہ کیا پلاٹ میں نے سوچا تھا؟ ...... ہاں ہاں وہی ...... ہاں وہی تو ...... مگر کونسا وہی ...... بڑے منحوس ہیں یہ فسٹ ایر۔ بس نام لیتے ہی افسانے کا پلاٹ بھول گیا ...... غضب خدا کا سارے کا سارا پلاٹ ......"

(نجیب اللہ خاں)

آہنی ارادے

"کمینے۔ حرام خور"۔ ٹھیکیدار کی کرخت آواز فضا میں گونجی۔ شربت نے سر اُٹھایا۔ سامنے ٹھیکیدار کو تیزی سے بوڑھے رحیم کی طرف بڑھتے دیکھا۔ "تم لوگ حرام کھانے کے عادی ہو گئے ہو ...... بس ذرا نظر ہٹی اور چوروں کی طرح چھپ کر بیٹھ گئے ...... حرام خور۔ اگر اتنے ہی آرام طلب تھے تو گھر میں آرام سے بیٹھے رہتے۔ بھورے رنگ کی داڑھی میں اُس کے سفید دانت چمکے۔ وہ غضب ناک درندے کی طرح دوسروں

کی طرف لپکا "تم سب کیوں رُک گئے ہو۔ کام کرو۔ کمبختو!" اور وہ سب سر جھکا کر پھر اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

شربت غصّے سے کانپنے لگا "حرامزادہ۔ ظالم" وہ بڑبڑایا۔ اور غصّے سے دانت بھینچ لئے۔ اُس کے سینے میں سمندر کی طوفانی لہروں کی طرح مدّ و جزر پیدا ہو گیا۔ جی چاہا کہ پھاوڑا اُٹھا کر سڑک کی بجائے ٹھیکیدار کے سر پر دے مارے۔ ہانپتا ہوُا رحیم پھر کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ صبح سے وہ ڈیڑھ دو دفعہ قے کر چکا تھا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ساری سڑک۔ سارے مزدور۔ ٹھیکیدار اور اُس کے سر پر سایہ کرنے والا شہتوت کا بھاری درخت۔ سڑک پکانے کا انجن سب اُس کے گرد گھومنے لگے ہیں۔ کئی ساتھیوں نے سویرے ہی اس کی یہ حالت دیکھ کر منع بھی کیا تھا۔ کہ آج کام نہ کرو۔ مگر وہ کام کیسے نہ کرتا۔ بچا دے کو کھانا کہاں سے ملتا۔ اُس کے ساتھیوں کے پاس بھی تو اتنی گنجائش نہیں تھی۔ کہ وہ کسی دوسرے انسان کو کھانا کھلا سکیں۔ وہ بڑی مشکل سے کام کر رہا تھا۔ اور لمحے لمحے بعد سستانے کے لیے رُک جاتا تھا۔ اور پھر ٹھیکیدار کی مغلظ گالیاں اُسے کام جاری رکھنے پر مجبور کر دیتیں۔ مگر ان سب باتوں کو سب سننے والوں سے زیادہ شربت محسوس کر رہا تھا۔ خدا نے اُسے بے حد حساس دل دیا تھا۔ اپنی تو کیا اپنے ساتھیوں کی بھی معمولی سی تکلیف اُسے پریشان کر دیتی تھی۔

وہ اپنے گاؤں کے مدرسے میں چار جماعتوں تک پڑھتا بھی رہا تھا۔ اور اس کا خیال تھا۔ کہ اور کچھ نہیں۔ تو دیہات کے مدرسے میں اُسے چوکیدار یا چپڑاسی کی جگہ تو مل ہی جائیگی۔ گاؤں کے لئے چار جماعتیں کچھ کم تعلیم نہیں۔ مگر اُس کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہو سکی۔ جب سکول کا ہیڈ ماسٹر اپنے ساتھ شہر ہی سے ایک چپڑاسی لے آیا تو اس کو دکھ سا ہوُا۔ اس کا باپ تو ہر روز اُسے یہ کہہ کر سکول بھیجا کرتا۔ کہ جب وہ چوتھی جماعت پاس کر لیگا۔ تو سرکار اُسے کوئی اچھی نوکری دے دیگی۔ اور اب وہ سکول کا چپڑاسی تک نہ بن سکا۔ اُس نے ارادہ کر لیا تھا۔ کہ اگر اس کے کوئی لڑکا ہوُا۔ تو وہ اُسے کبھی سکول نہیں بھیجے گا۔ سکول میں وقت ضائع کرنے کی بجائے وہ باپ کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائے گا۔ وہ خود بھی تو چھٹی کے دن باپ کے ساتھ کتنا کام کر لیا کرتا تھا۔ یہ لوگ خواہ مخواہ بچوں کو سکول بھیج کر ان کی عمر ضائع کرتے ہیں۔ یہ اور اسی طرح کے ہزاروں خیالات اس کے ذہن پر چھائے رہتے۔

تھوڑی سی جو زمین تھی وہ باپ کے مرتے ہی قرضوں کے عوض نیلام ہو گئی۔ اور وہ اب قلّاش انسان تھا۔ اس پر بھی ایک بیوی اور بچی کا اُسے پیٹ پالنا پڑتا۔ ان معصوم بھوکے پیٹوں کی صدائیں اُسے ہر وقت پریشان رکھتیں۔

انہی دنوں جنگ چھڑ چکی تھی۔ اور گاؤں کے کئی نوجوان فوج میں بھرتی ہو کر چلے گئے تھے۔ اُس نے بھی کئی دفعہ ارادہ کیا۔ مگر زینب کے آنسو اور التجائیں اُسے ہمیشہ اپنے اس ارادے کی تکمیل سے روک دیتیں جنگ اگر ایک طرف انسانی بربادی کا باعث ہے۔ تو دوسری طرف کئی بھوکے انسانوں کی روزی کا ذریعہ بھی بن جاتی ہیں۔ شہر میں مزدوری بڑھ گئی تھی۔ کئی لوگ اسی غرض سے دیہات چھوڑ کر شہر کی طرف جا رہے

تھے۔ وہ بھی اسی ارادے سے شہر چلا آیا۔ شہر میں روز اُسے ڈیڑھ روپیہ ملتا تھا۔ جس میں سے شام کو بڑی مشکل سے آٹھ آنے بچ سکتے تھے۔ اور وہ انہیں جمع کرکے مہینے بعد گھر بھیج دیتا۔

ایک دن اس کا ایک ساتھی عبداللہ دوڑتا ہوا آیا۔ اور اس نے اُن سب کو یہ خوشخبری سنائی کہ ایک ٹھیکیدار کو لنڈی کوتل میں سڑک بنانے کے لئے مزدوروں کی ضرورت ہے۔ اور وہ بجائے ڈیڑھ روپے کے پونے دو روپے روز دیگا۔ چار آنے زیادہ! خوشی سے سب کی باچھیں کھل گئیں۔ اور وہ سب جانے کو راضی ہو گئے۔ شربت سوچنے لگا "اگر میں یہ چار آنے روز بچاتا رہا تو میرے پاس مہینے میں ساڑھے سات روپے زیادہ بچیں گے۔ اور پھر دیہات اور شہر کے خرچ میں بھی کافی فرق ہوتا ہے۔ وہ اپنے یہ خیالی محل اور زیادہ بلند کرنے لگا "اگر اس طرح میں ہر مہینے کچھ نہ کچھ بچاتا رہوں تو زینب کے لئے کچھ چاندی کے زیور بھی بنوا لوں گا۔ بیچاری کتنی نیک بیوی ہے۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے۔ خدا نے کبھی ایسا موقع نہیں نصیب کیا۔ کہ میں اس کے لئے کوئی ایک آدھ زیور ہی بنوا سکتا"۔ محل اور اونچے ہوئے۔ "اور ننھی تاج کتنی خوش ہوگی۔ جب ہر مہینے میں اُس کے لئے کوئی نہ کوئی نیا کپڑا بھیجوں گا"۔ اور اُسے سامنے خلا میں یوں نظر آیا جیسے اس کی بچی لال، نیلے پیلے اور سفید کئی قسم کے بے شمار۔ قوس قزح کے رنگوں سے بھی زیادہ خوبصورت کپڑے پہنے پہاڑی بکری کی طرح گاؤں میں دوڑتی پھر رہی ہے۔ اور گاؤں کی دوسری لڑکیاں اُسے حیرت سے تک رہی ہیں۔ چنانچہ وہ اسی طرح کے بے شمار خواب دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ دوسرے دن وہ اپنے چوبیس ساتھیوں سمیت ٹھیکیدار کے ساتھ لنڈی کوتل چلا گیا۔

مگر یہاں آکر ان تمام خوابوں کی تعبیر اُلٹی نکلی۔ وہ تمام خیالی محل زمین پر آرہے۔ دنیا کتنی مکار ہے۔ کتنی فریبی ہے۔ وہ تلملا اُٹھا۔ سب مزدور پریشان تھے۔ پونے دو روپے تو انہیں روزانہ مل جاتے تھے۔ مگر وہ کھوٹے سکے ثابت ہوئے۔ کیونکہ آبادی سے دُور اس جنگل میں آٹا اور ضروریات کی ساری چیزوں کی فراہمی ٹھیکیدار کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ انہیں کئی گنا زیادہ قیمت پر فروخت کرتا تھا۔ بس اُسی کی حکومت تھی۔ وہی اُن داتا تھا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ اور ان کی تقریباً تمام دن کی کمائی شام تک صرف ان کی اپنی روزانہ ضروریات پر ختم ہو جاتی تھی۔ اور پھر اس پر ٹھیکیدار کی فاحش گالیاں۔ اور اس کے ساتھ ہی کبھی کبھی لات گھونسے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج کا وحشیانہ منظر دیکھ کر تو شربت کا جی چاہتا تھا۔ کہ دوڑ کر ٹھیکیدار کا گلا دبا دے۔ وہ خود بھی کئی دفعہ گالیاں سُن چکا تھا۔ مگر اُسے اتنا غصہ کبھی بھی نہیں آیا تھا۔

دوپہر کو جب ایک گھنٹے کی چھٹی ہوئی تو سب مزدور اپنے خیموں کی طرف چل دئے۔ بوڑھے رحیم کی حالت اور زیادہ خراب ہو رہی تھی۔ وہ سب ایک جگہ جمع ہوگئے۔ کسی نے کچھ نہیں کھایا۔ سب خاموش تھے۔ جیسے ڈر سے گئے ہوں۔ شربت چلا اُٹھا۔ ہم میں غیرت نہیں ہم خود بے شرم ہوگئے ہیں۔ ورنہ اس ذلیل کتے کی کیا مجال ہے کہ ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کرے۔ ہم کہتے ہیں۔ ہم پٹھان ہیں بڑی غیرت والے۔ ہم سمجھتے تھے کہ کوئی ہمارے ساتھ اونچی بات تک نہیں کر سکتا۔ اور آج دن بھر ہمیں ماں بہن کی گالیاں دی جاتی ہیں۔ اور ہم بے حس پتھروں کی طرح کھڑے سنتے رہتے ہیں۔ وہ کمینہ ہمیں مارنے پر اُتر آتا ہے۔

اور ہم سب بے غیرتوں کی طرح اُسے دیکھتے رہتے ہیں۔ قسم خدا کی جب میں اُسے کُتّے کی طرح بھونکتے دیکھتا ہوں تو جی یہی چاہتا ہے کہ سڑک کے بھاری بھاری پتھر اُٹھا کر اس کا سر پھوڑ دوں"۔

"واللہ ہم سب کا یہی جی چاہتا ہے" قریب بیٹھا ہوا ایک جوان بول اُٹھا۔

"تو پھر خاموش کیوں بیٹھے رہتے ہو۔ آؤ اب اگر وہ ذرا بھی کوئی ایسی حرکت کرے۔ تو اُسے بتا دیں کہ غریب کا انتقام بے حد خطرناک ہوتا ہے"۔

"مگر جانتے بھی ہو۔ اس کا انجام کیا ہوگا"۔ بوڑھا رحمٰن بول اُٹھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی "وہ امیر ہے۔ بڑا آدمی ہے۔ اس کی پُشت پر دولت کی مضبوط دیوار کھڑی ہے۔ اگر اُسے ذرا بھی نقصان پہنچا تو تمہاری زندگیاں تباہ کر دی جائیں گی۔ تمہیں جیلوں میں ٹھونس دیا جائیگا۔ بیوی بچے بھوکوں مرینگے"۔

"مگر ہم پٹھان ہیں۔ رحمان بابا۔ اور پٹھان نے اپنی عزت کے مقابلے میں زندگی اور اولاد کی کبھی بھی پرواہ نہیں کی"۔ شربت نہایت جوش سے بولا۔

"ہاں ہمیں عزت سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں"۔ وہ سب یکزبان ہو کر چلّا اُٹھے۔

"پھر سوچ لو"۔ بوڑھا رحمٰن یہ کہہ کر چلا گیا۔

مگر کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا۔ وہ سب بڑبڑاتے ہوئے منتشر ہو گئے۔ شربت وہاں سے اُٹھ کر خیموں سے دُور میدان میں ایک درخت کے سایہ میں جا بیٹھا۔ گرمی زیادہ تھی۔ تیز لُو چل رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا "یہ ٹھیکیدار کتنا ظالم اور کمینہ انسان ہے۔ ہم سب کو کتنا دھوکا دے کر یہاں لے آیا۔ اور پھر ہم پر کتنی سختی کرتا ہے۔ جیسے اس چھوٹی سی رقم سے اس نے ہماری زندگیاں خرید لی ہوں...... غریب ہونا بھی ظلم ہے"۔ اور دُور میدان میں اُٹھتے ہوئے بگولے کو دیکھ کر وہ سوچنے لگا۔ غریب کی زندگی بالکل اس بگولے کی طرح ہے جو کبھی ایک مرکز کے گرد نہیں گھومتا۔ اب یہاں ہے تو تھوڑی دیر بعد...."۔ "تمہارا خط آیا ہے شربت"۔ پیچھے سے عبداللہ کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ عبداللہ کا ہاتھ میں ایک پوسٹ کارڈ لئے کھڑا تھا۔ یہ اس کی بیوی کی طرف سے تھا "جب سے تم لنڈی کوتل گئے ہو نہ تم نے کوئی خط لکھا۔ اور نہ ہی خرچ کے لئے کچھ بھیجا۔ خدانخواستہ وہاں جا کر بیمار تو نہیں ہو گئے۔ میں ہر وقت تمہارے لئے فکرمند رہتی ہوں۔ اور پھر پیسے کی کمی نے اور بھی پریشان کر رکھا ہے۔ اگر کام نہیں ہے تو تم وہاں سے چلے کیوں نہیں آتے...... تم نے تو پچھلے خط میں مجھے لکھا تھا۔ کہ آئندہ ماہ میں تمہیں بہت سی رقم بھیجونگا"۔ اور آگے لکھا تھا: "ننھی تاج کو کئی دن سے بخار ہوتا ہے۔ اور تمہیں یاد کر کے رو پڑتی ہے"۔ خط پڑھ کر اُسکی طبیعت اور زیادہ پریشان ہو گئی۔ ایک دفعہ تو اس کے جی میں آئی۔ کہ ابھی گھر چلا جائے۔ مگر پھر ساتھیوں کا خیال آگیا کہ نہیں اگر میرے متعلق ذرا بھی شبہ ہو گیا۔ تو وہ کیا کہیں گے۔ کتنا بزدل انسان ہے۔ ہمیں اُکسا کر خود بھاگ گیا ہے۔ "نہیں میں ٹھیکیدار سے بدلہ لے کر چھوڑوں گا۔ مجھے اپنے اس ارادے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی"۔ اور زور سے چلتی ہوئی ہوا سے اُسے ایسی آوازیں سنائی دیں۔ گویا رحمان بابا چلّا چلّا کر کہہ رہا ہے۔ "پھر سوچ لو۔ پھر سوچ لو"۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور تیزی سے اپنے ساتھیوں کی طرف چلا۔

وہ اسے دیکھ کر پھر اکٹھے ہو گئے۔ اُن کا جوش دیکھ کر شربت کے دل سے اپنی بیوی اور بچی کا خیال بالکل نکل گیا۔ اور وہ پھر جوش سے چلّانے لگا "آج ہم اس سے اپنی ان تمام مصیبتوں کا بدلہ لے کر رہیں گے۔"

"آؤ جا کر ابھی اُسے ٹھکانے لگا دیں" ایک مزدور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں۔ یوں نہیں۔ ممکن ہے اس طرح اُسے بچا لیا جائے۔ پہلے سب اپنے کام پر چلو۔ اور بدستور کام شروع کر دو۔ میں اپنا کام بڑی سُستی سے کروں گا۔ اگر اس نے مجھے کچھ کہا۔ تو میں اس سے اُلجھ پڑوں گا۔ اور پھر تم اس پر اور اس کے باقی ساتھیوں پر ٹوٹ پڑنا۔"

گھنٹہ بھر کے وقفے میں ٹھیکیدار کے خلاف مزدوروں کی باغیانہ سازش تیار ہو گئی۔

وہ سب اُس تپتی دھوپ میں سڑک پر کام کر رہے تھے۔ پسینے کے قطرے اُن کے جسموں پر آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ مگر اُنہیں اس گرمی کی پرواہ تک نہیں تھی۔ وہ سب اُس وقت کسی اور ہی چیز کے انتظار میں تھے۔ اور سامنے ہی ٹھیکیدار درخت کی چھاؤں تلے بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا "اُلّو کے پٹھے! کام کیوں نہیں کرتے" ٹھیکیدار چلّایا۔ مگر شربت نظریں دوسری طرف کئے اس کی بات اَن سُنی کر کے بدستور کھڑا رہا۔ ٹھیکیدار غصّے سے کانپتا ہوا اس کی طرف دوڑا۔ سب مزدور تیار ہو گئے۔ اور اپنے رہنما کے اشارے کا انتظار کرنے لگے۔

"اُلّو کے پٹھے۔ یوں بُت بنے کیوں کھڑے ہو۔ اور ٹھیکیدار نے بوٹ سے اس کے ایک ٹھوکر لگائی۔ وہ سب بالکل تیار ہو گئے۔ شربت کی گردن کی رگیں کھچ گئیں۔ اس کی آنکھیں گویا باہر نکلنے لگیں۔ اُس کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ مگر .... اچانک اُس کی نظر سامنے اُٹھ گئی۔ ایک بھکارن اپنی چھوٹی سی بچی کو ساتھ لئے ٹھیکیدار کے منشی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اس سے نہایت عاجزی سے بھیک مانگ رہی تھی۔ اور ایک لمحے میں اُسے اپنی بیوی اور ننھی تاج کے مستقبل کا خیال آ گیا۔ اور جیسے یکلخت اُس کی تمام رگوں سے خون خشک ہو گیا ہو۔ ٹھیکیدار کی ایک اور لات لگی۔ اور اس کا بے حس ہاتھ اپنی جگہ پر آ رہا۔ وہ ایک معصوم قیدی کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ اور اس کے ساتھی حیرت اور خوف سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

از
انور میر

انوکھی نیند

سر بفلک پہاڑ کے دامن میں ..... ندی کے کنارے ..... سبزہ کے مخملیں فرش پر۔ وہ دنیا اور مافیہا سے بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کسی الھڑ دوشیزہ کی طرح اٹھکھیلیاں کرتی چل رہی تھی ..... ندی کا پانی نقرئی سانپ کی طرح پیچ و خم کھاتا سبز کناروں کی آغوش میں مچل رہا تھا۔

ایک بوڑھا کسان کاندھے پر ہل اُٹھائے بیلوں کو ہانکتے اس طرف سے گزرا۔ عمر رسیدہ کسان کی نظر اُس پہ پڑی۔ اور شفقت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ رُک کر یوں گویا ہوا: "آہ جوانی کی نیند! میں بھی کبھی جوان تھا۔ اپنا وقت فضول کاموں میں گنوا دیتا۔ کھانے پینے اور سو رہنے کو ہی مدعائے زندگی سمجھتا..... ہائے جوانی!..... میرے بچے اُٹھ دیکھ کتنا سہانا سماں ہے۔ یہ سونے کا وقت نہیں۔ یہ تو بھاگنے دوڑنے کا زمانہ ہے۔ جوانی کی مٹھاس سدا نہیں رہتی۔ یہ ایک سراب ہے۔ دھوکہ۔ اس دھوکے میں نہ آ۔ ورنہ پچھتائے گا۔ اُٹھ جوان اُٹھ...... لیکن جوان دنیا و ما فیہا سے بے خبر خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ بوڑھا کسان افسوس سے سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک جوان مگر بظاہر بوڑھا۔ عینک لگائے۔ چھڑی کو ہوا میں گھماتا۔ خیالات میں غرق اس طرف سے گزرا۔ فلسفی کی نظر سونے والے پر پڑی۔ دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ اور اپنے آپ سے یوں کہنے لگا۔ یہ شخص یہاں کیوں پڑا ہے۔ کیا یہ بھی کوئی فلاسفر ہے؟ جس نے رات آسمان کی چھت کے نیچے کسی اہم مسئلے کو حل کرنے میں گذار دی۔ اور یہیں پڑ رہا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ شخص بھی دنیا کو کسی نئے نظریے سے آشنا کرتا۔ مگر یہ وقت تو سونے کا نہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ آسمان پہ بادل چھائے ہیں۔ برسات کا موسم ہے۔ ندی کا پانی سبزہ زار کے دامن میں محو خرام ہے اور یہ سو رہا ہے۔ بلبل اور فاختہ بول رہے ہیں اور یہ سو رہا ہے۔ کائنات کا ہر ذرّہ ایک خاموش پیامی بن رہا ہے اور یہ سو رہا ہے۔ نہیں! نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور کوئی سُست، کاہل الوجود شخص ہے۔ فلسفی ایسے وقت نہیں سویا کرتے۔ وہ کسی وقت نہیں سویا کرتے۔ رات کو، دن کو، نیند میں بھی ان کے ذہن کام کرتے رہتے ہیں یہ فلسفی نہیں ہو سکتا۔۔۔ فلسفی اور سویا رہے؟ یہ کہتے ہوئے وہ بھی آگے بڑھ گیا۔

فلسفی کے جانے کے بعد ایک سپاہی گھوڑے پر سوار وہاں سے گزرا۔ بہادر سپاہی کی نظر اس پر پڑی۔ گھوڑے کو روک کر یوں کہنے لگا۔ خوابِ خرگوش کے مزے لینے والے اُٹھ! یہ سونے کا وقت نہیں جوانانِ وطن کو اس وقت میدانِ کارزار میں ہونا چاہیئے۔ اُٹھ اور دیکھ مادرِ وطن کو دشمنانِ وطن غلام بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ دیکھ مادرِ وطن کی چھاتی۔ دشمنوں کے گھوڑوں کے ٹاپوں کے نیچے روندی جا رہی ہے دیکھ! لاکھوں تو نہالانِ وطن دشمنوں کی خون آشام تلواروں کی نذر ہو گئے ہیں۔ ہزاروں عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہو چکے ہیں۔ اُٹھ مادرِ وطن تجھ سے اپنا حق مانگتی ہے۔ ہاں اُٹھ! اور ایک بہادر بیٹے کی طرح اس کے ناموس پر قربان ہو جا۔ نوجوان بدستور پڑا سو رہا تھا۔ سپاہی اس کو بزدل نامرد کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد فضا نسوانی قہقہوں سے گونج اُٹھی۔ چند البڑ دوشیزائیں سبزہ کو پامال کرتی، اُچھلتی کودتی، اٹھلاتی اُس طرف آئیں۔

"ہائے ری، مرد!" ایک نے کہا

"اری کہاں"؟ دوسری نے پوچھا۔

"وہ دیکھو سامنے" پہلی نے جواب دیا۔
"سو رہا ہے"
"کتنا حسین ہے"
"مگر تم سے کم"
"چپ رہ"
"جیسے کیوپڈ دیوتا سو رہے ہوں"
"تو جگا دو نا اپنے کیوپڈ دیوتا کو"
خوبصورت دوشیزہ آگے بڑھی۔ اور جوان کے سرہانے کھڑے ہو کر کہنے لگی۔ "خوبصورت جوان اُٹھ" سونے کا وقت نہیں ..... برسات کا موسم۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے۔ ندی کے پانی کی شیریں راگنی۔ گویا ابدی محبت کا میٹھا راگ گایا جا رہا ہے۔ عشق کا دیوتا۔ کتنے میٹھے سروں میں اپنا بربط بجا رہا ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ پیغام محبت سُنا رہا ہے۔ اُٹھ حسین جوان اُٹھ .....
کسی کے پاؤں کی ایک ٹھوکر اسے جگا سکتی ہے۔
گھوڑے بیچ کر سو رہا ہے شاید
...... خوبصورت دوشیزہ اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کے چہرے پر سے بکھرے ہوئے بال ہٹانے لگی۔
ہائے اس کے ہاتھ پاؤں تو بالکل سرد ہیں ..... اور دل کی دھڑکن بھی بند ہے۔ خوبصورت دوشیزہ چیخ مار کر گر پڑی۔
.... لیکن ہندی نوجوان اسی طرح محو خواب رہا۔

محمد صدیق حسن قریشی۔ سال اول

حجام کی دوکان

(مشرق و مغرب کا امتزاج)

اب تو خود میری حیثیت اتنی بلند ہو چکی ہے کہ جب چاہوں حجام کو اپنے مکان پر بُلوا کر بال کٹوا لوں۔ بچپن میں بھی حجام کو مکان پر بلوا لینا مشکل نہ تھا۔ چاہتا تو ابا جان سے کہتا۔ اور وہ طالب چپڑاسی سے فرماتے۔ اور طالب کو اگر اپنا جوتا ڈھونڈنے میں زیادہ وقت نہ لگتا تو آدھ گھنٹے کے اندر اندر حجام کو اپنے ساتھ لے آتا۔ لیکن حجاموں کی دکانوں میں میرے لئے ہمیشہ ایک ایسی لازوال کشش رہی ہے کہ نہ کبھی بچپن میں حجام کو بلوایا اور نہ اب بلواتا ہوں۔ بعض دوست مجھ سے کہتے ہیں کہ حجام کی دکان پر جانے سے بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور میری شان کے شایاں بھی یہی ہے کہ حجام میرے ہاں آئے۔ نہ کہ میں

حجام کے ہاں جاؤں۔ لیکن میرے نزدیک حجام کی دوکان کی دلچسپیوں کے مقابلہ میں اپنی ذاتی شان کا خیال بالکل ہیچ ہے ؛

حجام کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح ان کی دکانیں بھی۔ بعض اصلی حجام ہوتے ہیں اور بعض نقلی یعنی بعض میں حجاموں کی تمام خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ اور بعض میں صرف چند۔ اول الذکر حجاموں میں ہندوستان کے وہ تمام حجام ہیں۔ جو ہندوستانیوں کے بال کاٹتے ہیں۔ اور موخر الذکر قسم میں انگلستان کے تمام حجام اور ہندوستان کے وہ حجام جو انگریزوں، ٹامیوں اور نیم انگریزوں کے بال کاٹتے ہیں ؛

اصلی حجام اور نقلی حجام میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ نقلی حجام محض حجامت بناتا ہے۔ اور اصلی حجام ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتا جاتا ہے۔ ایک دوست جو انگلستان کی ہر شے کے بے حد مداح ہیں۔ ایک روز انگلستان کے حجاموں کی تعریف میں فرمانے لگے۔ کہ وہاں ہندوستان کی طرح کے باتونی حجام نہیں ملیں گے۔ آپ دکان میں جائیے، سلام کریں گے یا موسم کی خوبی بیان کریں گے۔ لیکن اس کے بعد پورے انہماک سے حجامت بنانے میں لگ جائیں گے۔ اور ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالیں گے۔ اس پر ہم نے عرض کیا کہ صاحب آپ کو ایسے حجام پسند ہوں تو ہوں۔ لیکن اپنی تو یہ رائے ہے کہ وہ حجام ہی کیا جو باتیں نہ کرے ؟ ایسے البتہ حجام کے شجرۂ نسب کی اگر تحقیق کی جائے تو یقیناً معلوم ہوگا۔ کہ اس کے باپ دادا جو کچھ بھی ہوں حجام نہیں ہوں گے۔ اس کے برعکس ہندوستانی حجام کی یہ حالت ہے کہ ؏

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہمارے یہی مغرب زدہ دوست ایک مرتبہ ہمیں مال روڈ پر ایک انگریزی وضع کی دکان پر لے گئے۔ کہنے لگے، چلو یہاں چلتے ہیں۔ یہاں کے حجام زیادہ باتیں نہیں کرتے۔ ہم نے کہا چلو دیکھ لیں گے۔ اگر خالص حجام ہوئے تو ضرور باتیں کریں گے۔ ہمارے دوست صورت اور سیرت دونوں سے مکمل انگریز معلوم ہوتے ہیں۔ اندر گئے تو بڑے حجام نے آگے بڑھ کر گڈ مارننگ کہا۔ اور پوچھا "صاحب! ہیئر کٹ؟" اور ہمارے دوست نے خالص انگریزی انداز میں جواب دیا "یس ہیئر کٹ" اور ایک حجامتی کرسی پر بیٹھ گئے۔ حجام نے خاموشی سے بجلی کی مشین سے اُن کے بال کاٹنے شروع کر دیئے۔ ہمارے حصے میں ایک چھوٹا حجام آیا جو پتلون نہیں بلکہ قمیض پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ ایک بے نیازی سے ہماری طرف بڑھا۔ اور قدرے متعجب لہجے میں کہنے لگا "کیوں جی! آپ بھی یہیں حجامت بنوائیں گے؟" ہمیں "یہیں" پر غصہ تو بہت آیا۔ لیکن ساتھ ہی خوشی بھی ہوئی کہ حجام تو اصلی ہے۔ اس کا باپ ضرور کہیں دیہات میں لوگوں کی بغلیں، داڑھیاں اور سر، سب کچھ اُسترے ہی سے مونڈتا ہوگا۔ ہم نے جواب دیا "جی ہاں۔ ہم بھی یہیں حجامت بنوائیں گے"؛ چنانچہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور حجام میاں نے ایک مشین نکالی۔ جس کا یا تو بجلی سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ یا بجلی سے اور بجلی کے بغیر دونوں طرح سے استعمال ہو سکتی تھی۔ بہرحال اس وقت وہ بجلی سے نہیں۔ بلکہ خود حجام میاں کے ہاتھوں کے زور سے چلنے لگی۔ ہمارے سیاہی مائل گندمی رنگ کے لئے کچھ یہی موزون معلوم ہوا۔ اور ہم نے اپنی شخصیت کے مغربی پہلو کو چھپائے رکھنا مناسب سمجھا۔ اب اس بات کا انتظار

کہ حجام کب بات چیت شروع کرے۔ لیکن تین چار منٹ یونہی خاموشی میں گزر گئے۔ شروع شروع میں قینچیوں کی آواز دلچسپ معلوم ہوتی رہی۔ لیکن بہت جلد اس سے اکتا گئے۔ صبر نہ ہو سکا اور ہم نے حجام میاں سے گفتگو چھیڑنے کے لئے کہا۔ "بھئی! آج تمہارا گلا کچھ خراب معلوم ہوتا ہے۔" متعجب ہو کر کہنے لگا۔ "حجور! گلا"؟ ہم نے کہا۔ "ہاں گلا۔ یا زبان استرے سے کٹ گئی ہے۔ کچھ تو ہے کہ خاموش ہو۔" اس نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ لیکن ایک پُر معنی طریق سے بڑے حجام کی طرف دیکھا۔ یعنی اس کے رُعب سے خاموش ہوں۔ ع ورنہ کیا بات کر نہیں آتی ؟

ہم نے کہا۔ "واہ اتنی سی بات ہے ؟ تو ہم کسی دُور کی کرسی پر جا بیٹھیں گے۔ جہاں سے تمہاری آواز تمہارے استاد کے کانوں تک نہیں پہنچ سکے گی۔" ہمارا یہ کہنا ہی تھا کہ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔

اور وہ ہمیں اپنے ساتھ دکان کے ایک ایسے دور افتادہ حصے میں لے گیا۔ جو سب حجامتی سامان سے تو مزین تھا۔ لیکن وہاں بجلی کا دخل بالکل نہ تھا۔ کہنے لگا۔ "حجور! یہاں پنکھا نہیں ہے۔" ہم نے جواب دیا۔ "کوئی حرج نہیں۔ اپنی زبان سے ہمیں پنکھا کرتے رہو۔" اس نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ لیکن پھر اُستاد کا خیال کر کے ذرا جھینپ گیا۔ لیکن صرف دو لمحوں کے لئے۔ جونہی استاد کا خوف کم ہوا تو باتیں شروع کر دیں۔ اب ہمیں یقین ہو گیا۔ کہ یہ حجام ہی کا بیٹا پوتا۔ گفتگو شروع تو اسی طرح سے ہوئی جیسے انگلستان میں ہوتی ہے یعنی یہ کہنے سے کہ حجور! اب کے گرمی بہت زیادہ نہیں ہوئی۔ پنکھے کے بغیر ہی گذارہ ہو جاتا ہے۔" لیکن اس ابتدائی فقرے کے بعد تمام شہر کی خبروں پر اور ہمارے بالوں کی سیاہی اور سختی پر تبصرہ ہوا۔ مال روڈ کا جغرافیہ دہرایا گیا۔ بنگالی مٹھائی فروش کی دکان سے لے کر بڑے کتب فروشوں کی دکانوں تک کا ذکر ہوا سکھوں اور مسلمانوں کی لڑائی، ہندوؤں اور سکھوں کی لڑائی، شیعہ اور سُنی کی لڑائی، کالج کے لڑکوں اور پولیس کی لڑائی، غرض ہر وہ لڑائی جو کبھی ہوئی تھی یا ہو سکتی تھی۔ گفتگو کی لپیٹ میں آ گئی۔ حجام میاں کا شجرۂ نسب بھی معلوم ہوا۔ باپ بڑے شہر کے حجام، دادا چھوٹے شہر کے حجام، پڑدادا اور باقی تمام بزرگ دیہات کے حجام۔ ہم سے بھی رہا نہ گیا۔ ہم نے بھی اپنا شجرۂ نسب بتلا دیا۔ خود پروفیسر، والد پروفیسر، دادا ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر، پڑدادا مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر، پڑدادا کے والد ہائی سکول کے استاد۔ پڑدادا کے دادا مڈل سکول کے استاد، اور ان سے پہلے کے تمام بزرگ دیہات کی مسجدوں کے ملا۔ حجام میاں بہت متاثر ہوئے۔ اور ہمیں بڑے ادب سے کبھی میاں جی! کبھی مولوی جی اور کبھی منشی جی کہنا شروع کر دیا۔ کیونکہ پنجاب میں ہر پڑھانے والا چاہے وہ مسجد میں پڑھاتا ہو یا پرائمری سکول میں، چاہے ہائی سکول میں پڑھاتا ہو یا کالج میں، میاں، منشی یا مولوی ہی کہلاتا ہے۔ گفتگو کا سلسلہ لمبا ہوتا گیا۔ حجام میاں کی آواز بلند ہوتی گئی اور ساتھ ہی مشین کی رفتار مدھم پڑتی گئی۔ حتیٰ کہ بڑے حجام اور ہمارے صاحب بہادر دوست دونوں ہمارے پاس آ کھڑے ہوئے۔

بڑے حجام نے آتے ہی ایک چپت چھوٹے حجام کے رسید کی۔ اور اس فصاحت سے بے نقط سنانی شروع کر دیں۔ کہ ہم پر صاف ظاہر ہو گیا۔ کہ وہ بھی سولیٹنٹ سے حجام ہی چلے آتے ہیں صرف لباس انگریزی

اختیار کر رکھا ہے۔ خیر اُنہوں نے ہمارے بال کاٹنے کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ اور چھوٹے حجام کو ایک انگریز کی داڑھی مونڈنے کے لئے باہر بھیج دیا۔ ادھر ہم کچھ پٹھانہ ہونے کی وجہ سے اور کچھ بڑے حجام کے رعب سے پسینے میں شرابور ہوگئے۔ لیکن بڑے حجام نے بال کاٹنے کا عمل دو ہی منٹ میں ختم کر دیا اور ہم نے جان بچی لاکھوں پائے کہ کر ایک ہی جست میں دکان کو پھلانگ جانا چاہا۔ لیکن دکان کے چمکیلے فرش پر ایسے پھسلے کہ اگر ہمارے دوست ہمیں تھام نہ لیتے تو یقیناً ہمارا سر زمین پر نہیں۔ بلکہ اسی چمکیلے فرش سے جا لگتا۔ اور سب جانتے ہیں کہ یہ چمکیلے فرش محض چمکیلے ہی نہیں ہوتے۔ بلکہ بیحد سخت بھی ہوتے ہیں ؎

دکان سے باہر آکر یاد آیا کہ حجام کو اجرت بھی دی جاتی ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ ہمارے دوست نے اپنی اور ہماری دونوں کی حجامت کی اجرت مبلغ دو روپے ادا کر دی ہے۔

ہم گھر سے صرف چار آنے جیب میں ڈال کر حجامت بنوانے نکلے تھے ؎

بشیر الدین

نمائش

خیبر انجمنِ آرٹ سیکشن کی دوسری سالانہ نمائش ۳۱ مارچ اور یکم اپریل ۱۹۴۵ء کو خیبر یونین ہال میں ہوئی ؎

اس نمائش میں مصوری، زنانہ دستکاری، سوزن کاری، فوٹو گرافی اور کھلونوں کے تقریباً پانسو نمونے شامل تھے۔ انعامی مقابلہ کے لئے پہلے ہی سے دو اشتہار سارے صوبے میں تقسیم کئے گئے تھے ایک درجن سے زیادہ سکولوں اور کئی درجن پیشہ ور فن کاروں اور شائقین نے اس میں حصہ لیا۔ لیڈی کننگھم ملاحظہ کو تشریف لائی تھیں۔

ہر صنف کے لئے ججوں کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اور انہی کے فیصلے پر انعام دئے گئے۔ مندرجہ ذیل بہی خواہانِ کالج نے نہایت فراخدلی سے انعامات کے مصارف برداشت کئے۔ ہم ان کے بیحد ممنون ہیں :-

(۱) جناب ملک خدا بخش صاحب ایڈووکیٹ جنرل صوبہ سرحد
(۲) جناب ارباب خانان خاں صاحب آف تہکال
(۳) جناب ارباب نور محمد خاں صاحب آف لنڈی
(۴) جناب ارباب مدت خاں صاحب آف تہکال
(۵) جناب ارباب طہماس خاں صاحب آف تہکال
(۶) جناب خاں محمد اسلم خاں خٹک ڈائرکٹر آف انڈسٹریز
(۷) جناب مرزا فضل رحمان خاں صاحب رجسٹرار جوڈیشل کمشنر کورٹ
(۸) جناب خواجہ محمد اشرف صاحب بی۔اے۔ سررشتۂ تعلیم صوبہ سرحد
(۹) جناب محمد یونس خان صاحب سیکرٹری میونسپل کمیٹی پشاور
(۱۰) جناب ملک خدا علی صاحب بی۔اے (۱۱) جناب میاں سید رسول صاحب اسسٹنٹ پبلسٹی آفیسر؛

(باقی)

خیبر

نګران :- پروفیسر نفیس الدین ۔ ایم ۔ اے ۔ ایل ایل بی

مدیر :- نصرالله خان نصر دریم کال

نائب مدیر :- ارباب مختار احمد دریم کال

جلد ۲۸ | نمبر ۲

فهرست د مضمونو

مورنۍ ژبه

سه نعری دهم نعری زم نه آوردے
خدائے دې په داسې یار ئے هور ادلګوینه

تر او سه یورے چه چاسره هم دَ مورنۍ ژبے دَخدمت کولو خیال پیدا شویدے. او په دے خیال قلم اوچت کړیدے. یا ئې دَ پښتو اخبارونه او رسالے چه چهاپ شوی دی. صفوئ چه بل ئې بیانه موی. نو دا مضمون خو ترېچا اوبه نه دی. چه به دَ خدائے انصاف دار و. ویلښ شئ. اُوده پراته یئ. دَ ژبې خدمت ته ملا او تړئ. دَ ژبې لوئ سناسولوئ ده! اوکه یو ورځ په بل ئې عنوان باندې قلم کذع کړی. مګر هغه دَ ګشتم ګشتم ابجعلی لونبان تمه ده. بیابیا او په کوالو مرالو دا مضمون چهیړی. او پښتو خلې ته دا دَ اَلصَّلوٰۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمْ چغې په زوره زوره وهي.

دلے دا یار دَ احمد شاه ابدالی نمسے نه دسے ئې هغه ورته میراث کښې بادشاهی نه دَ پیچې ئې. دَ اودهه لوا بالو سره خوئ هم لوړ لوړ تعلق پاتې شوے دے. دَ پزوخت به دی. دَ به هیله چرته سر دا پورته کړی. سر به کړئ. او په زوره او په قهر به چغه کړی. وائ به "ئې دی، ظالمه لاخوی کښے هم نه وُه پته کړے. تا بیا چغے جوړے کړے"

طلئ. سه خانه ښادی دِ اومبارک شه
لوائې ستاوه اوس دِ بیا خدائے نصیب کړینه.

کم عقل ادیب زاباصی او د پښتون په غوږ کښې چغې وهي. دلے دومره نه پوهیږی. چه هغه غوږ کښې خو ورته جان بل John Bull چه په چهاؤنړۍ کښې یو لوے مشهور ډاکټر راغلے دے هغه ورته پکښې دَ لکا شاټ هغه نرم نرم پشمونه دومره ور ستلی دی. چه په هغه غوږ دَ آواز او ری په هیڅ دمای خو ورته اودهه. دلے ده به ورته هم هغې شاګر نادان ایډیټر راپاسی. چرته خوش نویس راګیر کړی په نویس بوده یو لوے خوشخط نویس اوکې. ډنډوره اوا وائ "خیبر له مضمونونه پکار دی. تعلیمیافته پښتونو دغه دے چه خیبر ته مضمونونه، غزلونه، نظمونه، تنقیدونه، ترتلونه ۲۰ ے، چاربیتے دا اولیږئ او دَ مورنۍ ژبې دَ خیبر معیار اوچت کړئ. او دا اوکړئ او هغه اوکړئ..

غرض دا چه مزکه آسمان ورته یو ځای کړی دی. مګر ته دا کم عقل دومره نه پوهیږی چه لخرچاته سوینډ ګلے ؟ هغه چا غوک وینا نصیحت کوی چه دَ هغه په غوږو خوګی سئ. پښتونو ...... او بیا تعلیمیافته پښتون. خیبر له مضمون اولیکی...

ولی پهغه وخت کښې چه هغه لوے قلم راغلے دے. هغه لنی. ئې ؟ یا فونالیتی ریکارډ ونه لنی آوردیدے ئې ؟ زه مره دا زړه خلقو قصې دی. تراوسئ ترې ئې جوړه کړه. دَ پښتو خدمت........ علم او ادب.:... کیږی به...... دَ نویس نه مخ وارئ. سکرټ بل کړی...... شیبلے ته کړی او روان شی.

نودے سالنامې په باره کښې دغه شکوه کول نه خو دا ئې

خو لوړ خو هم اخوکول دی کنه. هغه. دا منم. چه شلمې
ددی اکمال یو غښتلی جز دی. موخالص مخلص هم دا خو کمال
نه دی کنه. اوس مونږ خو دی ټول څوک دَ ملټن ځای
اونیسو. څوک دَ شیلی. څوک دَ گوئټے. څوک دَ اقبال او څوک
دَ ټیگور. ولی دَ ایچ. جی. ویلز. روسو. ټالسټاے. علامه شبلیؒ
او دَ سر سیّدؒ ځای نیولو له به فرښتې دَ آسمان نه راکوزیږی لو
چه په پښتو پښتو کښې به دَ ددوئ ځای څوک نیسی. دا پښتے
او چنول آخر دَ چا په دلو دی چه څوک مونږ په سر دَ لوبیا ورته
ملاو دلے نه ترږو. ځای دَ دے چه دَ چلی کوکی اېږ موهیشه
دی طرف ته کړے دی. مخامخ ولی نه ورځو. پداسی خوښدلګو
کړ پوړشی.

دی واری خو بیا هم مونږ دَ لوړو ځلو ځای خوش قسمت یو
دی ځلے دَ نثر مقدار هم مونږ سره دَ نظم نه څه کم نه دٌه. بلکه
داځل خو مو بخت داسی راوبخ شوے چه مونږ ته په نثر کښې
هم دَ څه خاص حصے اغیستلو ضرورت پیښ شو. او دَ خوشحالئ
نه خو لا دلته چودو. چه ټول دا سره دَ هغه یاد مواد وو
چه کښې مو سپه او خراب نشو معلوموله. چه خدائے څه نړے
داخلو او کوم پرینبدو. هغه کومه حصه چه پاتی شوی ده. دَ هغی
دَ نه چهاپ کیدلو وجه دا نه ده. چه گنی هغه خرابه وه. نه.....
بلکه داځل خو څونږ هغه دَ رپنډ گذارو وو. چه په کومو مولا
پریوت. هغه مو تری را اوچت کړی دی او هغه چهاپ شوی
اُمید دے چه هغه ادیبان صاحبان چه دَ کومو مونږ دا خدمت
تو سر کړے نه دے. هغوئ به څونږ دا خطا معاف کړی
خدائیکو چه دا ځل خو که لږ لږ دی. لږ په مونږ هم هغسې
... چه وائی. چه پوځنا ور پیرتیات او کے شوے

دٌه. نو چار اړست او په لوا خوری او نارو. یو خوائی ورته
چنړو کینبودی اول خوا ته تکه شنه کیا. هغه غریب په دی
دو ؤکښې حیران شو چه خدایه څه او خورم. کله به ئی یو
طرف ته مخ واړؤ او کله بل طرف ته. تر دی چه هغه هلته دا
فیصله ونکړے شوه. چه څه او خوری. او آخر د لوګی مړ شو.
دَ نثر په حصه کښې داځل مضمونونه ډیر وو. انسانے
سوانح عمرئ او ترجمې یکښې په لوئ تعداد کښې دی. او ډرامې.
او تنقیدونه او تو ټی مقالے وغیره خو هسې پکښې وی نه. او که
څه وی. نو هغه په نیشت حساب وی. نه...... دا خو هم
دَ ادب څوا کې دی کنه. هر یو شاخ ته لاس اچول پکار دی
دَ نظم حصه هم ښه دپانئ وه. شاعرانو صاحبانو دَ چیل
کلام ډیر ښې نمونې مونږ ته راکړی دی. مونږ دَ ټولو دَ تکلیف
ډیره شکریه اداکوو. خصوصاً دَ جلال الدین دَ غزل خو ډیر
تعریف کوو. ولی په دے غزل مونږ اعتراض هم دے. چه هغوئ
دَ غزل په آخر کښې یو لفظ استعمال کړید. چه سایت دے
او که څه بل څه دے. خو اوس راته ښه یاد نه دے. هغه ئے
په یو مجهول Ambiguous طرز کښې استعمال کړے
دے. دا تری پته نه لګی چه تخلص دے او که په لغوی معنی
کښې استعمال شویدے. ځکه چه بعض وخت به هغه ته خلقو
جلال الدین سایت نوم هم اغیستله. ددی فلسفی تشریح
پکار ده.

خیر معیاد بهرحال دی ځله انشاء الله ښه وو. که څونږ
قلم دوست رونړو دا دَ مورنئ ژبې دَ مالیاری ذوق په
دی اندازه هم برقرار او ساتلو نو انشاء الله چه دا ونه به
ډیره نه میوه اونیسی او څونږ دَ ټولو خولی به خوږی

کړي. د لې سُست کیدل نه دی پکار. ځکه چه بیا لازمه ده چه اټوبه ئې اُلټه دی

سه   از مکافاتِ عمل غافل مشو   گندم از گندم بروید جو ز جو

له قلمه

د مختار احمد خلیل - د دریم کال!

عبدالحمید مُهمند

عبدالحمید د اصل مُهمند د سربند کلی اوسیدُنکے د یو مشهور دینا پیرِه کوی. بیلے ماشوخیلو نه وُه. بلکه چه چپله ئے وئیلی دی

سه   چه د عشق طاعون رنځ د حمید ل شه
    زر به خبر به هدیرو شي د ماشو

د تاریخي پیدائیش متعلق ئې موږ ته څه یقیني علم نشته. البته دا معلومیږي چه دے د محمد شاه په زمانه کښې تیر شویدے لکه چه وائی

سه   که د ښکلیو د دربار کاه گدائی موم
    هئ تو به د محمد شاه له سلطنته

عبدالحمید یو ډیر نازک خیال شاعر تیر شویدے او په شُهرت کښې خوشحال خان او رحمان بابا پسې درجه لري. د دیوان د مطالعې نه ئې معلومیږي چه دده هم لکه د خوشحال خان ملو سره نه لګیدو ولې چه وائی. سه

به تمام جهان قرار قرار کړے ده   په حمید د غم مغل را اوختاته

دده د مرګ موږ ته څه پته نه لګي. البته ددومره معلومیږي چه پنځه پنځوس کالو ته رسیدلے وُه. سه

لا هغې چه لوهیدلے په شمېر یم   رسیدلے د پنځاه و پنځ ترحد یم

د عبدالحمید خیالات ډیر نازک لیکن ژبه ئې صفا نه ده. په ده د فارسي ادب ډیر اثر شویدے. عشقیه او اخلاقي

عشقیه کلام:- ده ډیري عشقیه غزلې لیکلی دی. په عشق کښې دومره ډوبے زړی. چه د ننګ و ناموس هم پرواه نکوی. سه   د حمید له نام و ننګه سره څه دی
    چه ئې یار شو د لالچو مشتاق کړلو ان شوخ

متعلق وائی سه   هسے ډوب لاړم د مینے په ګرداب کښې
    چه مجنون را ته ښکاریږي سرسری

د محبت متعلق وائی سه محبت په نیش و قال نشی حاصله
    څوک به څوک په رنځ ازغلی تر بدلینبنا

اوهم د دغه وجه ده چه عاشق ته وائی.

سه   عاشقي به دِ آخر تر بنهري سپک کړي
    که دریاب تړکوه تافه تول دِتا وی

د حمید د مینې ګمراهی ددی شعره معلومیږی

سه   چه م یار له خوبه ویښ نکړی لسیمه
    ګورو الوزه. رد. رو به تالطف

شاعر هم د رقیب نه ګیله من دے. لکه چه وائی.

سه   څه به څو کړم د رقیبه د خوطمعه
    نه دی ښه چاسره کړی دے کروه

اخلاقي وينا: شاعر دَ تکبر بد وائي او عجز و انکسار داسي ستائي: (الف)

سه ١ خودي لږي کړه لږ زړه که عاشقي کړې
نشته بې له دي زواله بل کمال

٢. دلته ځان دَ کيا کم کنړو حميده .
که هودي تر فرښتو خوارې مقام لوړ

(ب) **وفا:** حميد وفا ليسي ډير اوکو ځيدو. ليکن بيائي نمونڅ هم هله وجهه نه چه د دنيا او د دنيا او دَ دنيا د دوستانو دَ بيوفائي شکوه کوي سه مرګے سه دے په دنيا کښې
نه چه څوک شي بے وفا

٢. لکه څوک چه کېږدي خوارې له زانړه
هسے شان شوه دَ وفا تمنا بيچ

دَ دنيا متعلق وائي سه له سوائي سومند شوي هيڅوک نه دی
جو فروش گندم نماده دا دُنيا

د دنيا بے بقائي داسي بيانوي، سه

دانيمګړې . هيچ چا نڅ پوره کړے
تر بوليښنا زيا ته نه ده بقا هيڅ

(ج) **حرص و صبر:** شاعر دَ حرص بد والے په الفاظو بيانوي

سه (١) اضطراب دحرص کړه له زړګی لږي
قناعت کوي لنګر ددی جهان را

(٢) نه به ته سرکش نفس په بډ موړ کړې
نه به شي زهر قاتل دَ حيا دوا

دَ صبر و قناعت تلقين داسي کوي سه

(١) قناعت دَ حميد زړه له غمه خلاص کړو
باد اثر نه که په شمع دَ فانوس
قناعت له ډيره غمه سړی خلاص کړو اخوي په خرابه نشي خراج

(د) **سعي:** بزرګي په نام و نسب نه ده. بلکه په ځپل کوشش ده

سه چارے واړه په حسب په نسب نه دي
تو بنده بلا له زاد شه ډير اصيل

(ه) **تدبير و تقدير:** شاعر دَ تدبير قائل نه دے

سه عاقبت به دَ تقدير ترجمني ورشي
که اغزي کوي دَ تدبير دَ ځانه شپول

په عشق کښې هم تدبير کار نه کوي:-

سه ١ ماهم زده چه عاشقي لوره بلا ده
باري تير له دي تدبيره کړم تقدير

٢. عاشقي په مصلحت کولے نشي
او نه ځان ابوحے نشي په تدبير

تشبيهات: شاعر کله کله ډير نازکې استعارې استعمالوي

سه (١) لکه ګل دَ باد له مخه پاڼې پاڼې تار پتار شي
آه و فرياد مې خاطر هسے له ټوک ټوک

(٢) ته چه مخ د مهر واړه دی اغيار ته
په کودی کښي له غيرته شم نيمه زه

متلونه: شاعر کله کله متلونه هم استعمالوي . متل دے چه کانړے به پوست نشي او غليم به دوست نشي نو شاعر وائي سه

واقعي نه کانړے پوست نه غليم دوست شي
په بندګئ دَ نقش مغليږي مرد که

متل دے چه چوته ډب وي هلته ادب وي . نو شاعر وائي

سه ير نولے تهد بزړه مهر ځوئي ته لويه
چه څه سنه وائي چوته ډب وی هلته ادب

پند: حميد ځائے ځائے پند او نصيحت هم کوي لکه چه په ځائے کښې وائي سه دَ بهترو په ځائے مه ښينه کمترو
دَ ريښمنو په نرخ مه پلوره وړئي

حیین والئ ـ علم په دانائ چه پوه شي چه نادان یئ ـ
سه چه انراد په نا پوهئ شی بهری پوهٔ
چه دپوهی لاف گزاف کړي نهٔ ی پوه ـ
بويل علم کښ ئې سه په پیدې کښ دخوائ چاري اوشي
مګر اے زړی بو دی په سر ديړی
پښتانه تنګ وتپا نه ډیر دقدر په نظر کوري ـ او که
رښتیا والئ لوپښتو لوم هم ددغه تنګ اوپت دے ـ زیر بحث
شعر د پت متعلق والئ سه
پروت په وینو کښ لت پت شی په پت کښ
نه د سرو زرو په تخت باندے بے پت له
سید الرؤف ـ بي ـ ایس سی ـ بي ټي ایم ـ پي ـ او
ګورنمنټ هائ سکول کوک ـ ضلع کوهاټ

شاعرته

(۱) ترانے دغم شی پورته ستا د زړه له هر تاره
اے مغموم معصوم شاعره له غمو نو بے قراره
سوزګداز د محبت دے ستا د ژوند په اساس کښی
ترنم د مینے غم دے ستا دغم په ترانه کښی
دا فریاد د سوی روح دے د نغمے په بهانه کښی
دا فریاد د محبت چه کا بیهات کړی بے قراره
اے مغموم معصوم شاعره له غمو نو بے قراره !

(۲) شکسته د زړه رباب شی ستا ټیکړے ترانشی
سوے لوے اُف په تند رستا ټیکړے آشیانه شی
لا نزدے تر شنډو نه وی چه دِ ماتّه پیمانه شی
ستا کلئ په رحید شی نا اشنا دی له بهاره
اے مغموم معصوم شاعره له غمو نو بے قراره

(۳) ستاد عشق دغم نغمه کښی ستا د سوی زړه فغان دے
ستا فغان ناکام اروان دے ستا ارمان دغم داستان دے
ستا داستان د درد جهان دے هغه داد چه بے درمان دے
هغه درد په سوی زړه کښی چه کلے کړي له نګاره !
اے مغموم معصوم شاعره له غمو نو بے قراره

(۴) د آرزو د شپے تیاره دِ د سحر تلاش کښی ګرځی
دا دعا د سوی زړه دِ د اثر تلاش کښی ګرځی
ستا محبت د پاکے مینے د یود ر تلاش کښی ګرځی
هغه درد هغه دردش چه نا آشنا کړی له قراره
اے مغموم معصوم شاعره له غمو نو بے قراره

(۵) په کعبه د خاموشئ کښی ته د مینے عبادت کړے
د خاموش نظر په ژبه تقاضے د محبت کړے
لو عجیبه خاموشی دی ګویائ هم په حیرت کړے
د محشر انداز پیدا کړے د چپیاله هره تاره
اے مغموم معصوم شاعره له غمو نو بے قراره

(۶) ستا د اوښکے غم لړلے چه قدرت ورته ناز کړی
فرښتے په لوګینو کښی د حیرت جهان په ساز کړی
د الفت خاموشه اوښکے چه معصوم رنګین اعجاز کړی
د فطرت په زړه کښی سرکیے په سودا کړی ګرفتاره
اے مغموم معصوم شاعره له غمو نو بے قراره

(۷) چه نغمے دَ نم شروع کړے داحساس رباب کړے پورته
کائنات کښې چار چاپیره یو رنګین سیلاب کړے پورته
دَ فطرت ادا ښکاره کړے ترنه هر نقاب کړے پورته
دَ فطرت معصوم رازدان یې تا ته هر اسرار اشکاره
اے معصوم معصوم شاعره له غمونو بے قراره
ته دَ خدائے نه هم آګاه یې هم خبر یې له خدائے نه
ستا معصوم نظر طواف کړي تل دَ عرش اوله کرسئے نه

له قلمه :. دَ محمد یونس خلیل دَ اول کال

دَروغ

دَ هر چا خپله خپله طبعه ده . او بیله بیله مشغولا . ستا وخت په ګپ شپ باندے تیریږی . دَ هغه په سندرو او چنګ رباب . دَ چا مشغولا مالیارې ده . دچا کتاب ویل او څوک په کرکټ وخت تیریږی . خو زما مشغولا څه وه ؟ (خاندئ به نه) خلقو ته دروغ ویل . خو کومے دوځ پورې دروغ ــ نا! هر لویه هرګز نه . صرف خپل دوستانو ته . خو بے تعلیمه دوست ته . تو به ..... څومره عجیب عجیب دروغ !

اوس هم پرے شرم رازی . خو الحمدلله چه اول څومره دروغژن وم . اوس هومره رښتیا ګویه شوم .

دَ میټرک امتحان نزدے وُو . په کتاب ویلو م سر ګنګس شو . په ناسته م خپے اودے شوے . دماغ م استعفی ورکړه . ماوے پاسه اوګرځه او دماغ تازه کړه . کتاب م لا ایښے نه وُو . چه بیا کښې م دَ دوکو تالی ملګرے یوشپون راغلو . او ناګهانه زما په کتابونو او رسالو بحث شو . او وخبره یې هم نه اوریدو ــ "هنوز ګنج مدایافت" بنه نو اوس څه اوکړم؟ دَ خوش قسمتئ نه دغه سپین ږیری میلمه دَ خولے شریفے قلف پرانستے شو ــ او ــ دَ ګنړ ملا وو . ویلے خانه دَدے جنګ ختم اوشو . ماوے بابا معلومیږی چه جنګ به جرمن ګټلي . هغه دَ سیلئ په اصولو اوس یو داسې مشین جوړ کړے دے . چه پیچ یې تاو کړے . نو یو داسې طوفانی سیلئ ترنه راوالوزی چه دَ دښمن غوځونه اوچت په آسمان کښې لکه دَ بزغلو کتګ وی . او هغه به میاشت یې یو داسې مشین نوا جوړه کړے ده . چه یو خوا کښې وا ښه اچوی او بل خوا ترینه شوده اوزی . نو جرمنیان لهول شوده سکی .

بیا کښې شپونکی هم دَ خاموشئ روژه ماته کړه . او وئیل دا دَ نخو کتاب به څو شپږے ماه اوویل به اته آنے . او هر هفته یو زل ضرور چاپ کیږی . بیا ئے ویل دا غټ کتاب به څو کیږی . ماوے به اوه روپئ دیارلس آنے دریے پیسے . هغه ویل لاحول ولاقوة . څه خو ئے خدائ که په روپئ هم واخلم . که ډیر زوړ دی نو ــ (کتاب به لاس کښې تلی) بس ددے نیم پاوه دے شی . نو د اوه آنو شو . واخله چلی دے چه دا ښائسته کتاب . پیتے ئے ډیر او وادے . څنګه نخه چه دِ ذره غواړی هغه یکښې ..... او هغه بیا یه اته آنے ..... او هغه بل دا مړ کړانه چه نه ئے بیه دَ کار ده . او نه یکښې تخمه شته . ما وے

ته څه خبر يئ ـ داخو ډکشنري ده په کښې خوئے هغه ته لے
اوسنده ليکلې دی ـ چه د هوا مار غان پرې راپريوزي ـ په
کښې د حضرت مولانا کنړ ملا صاحب قدس سره بيړه مبارکه
اوخوزيده ـ خو په شوم چه خفه ئے اووئيل ـ ما د بابا خه مو
اوفرمائيل ـ هغه وئيل چه په اشتهار کښې څه دی چه ستا لاس
کښې دے ـ (د حجرا نيځ کيس پيپر وه) ما وئيل بابا خبرد نه دی
وائي چه په خوکيا نړد کښې يوسړي نه د غونيکه يو ټوپۍ پاتے
وه ـ دا ټوپۍ به د هغه پلار نيکه بالکل نه کوزوله ـ او د هغوئي
پښانه ته دا اشرف المخلوق به هم بغير الله لوزيده ـ خو دامتبرکه
سليمانی ټوپۍ به ئے بالکل د سر نه بغير بل چرته نه ايخوده محققين
په متفق دی چه د غيبوی نه بغير دی کښې بل څه نه وو پاتے
هغه ملبه وړه هغه ته پيب ـ بد قسمتنه توت ته ختلے ده ـ هغه
خولے ترنه راپريوته او په منځ غلو د ټکړي شوه ـ مولانا
صاحب پرې دعا اولسته ـ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ـ ما وئيل
کافر ټوپار ملا صاحب خود مے ما هم پرې يو شعر د ياره
د نورٌ علیٰ نور اُدېلو سه "وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے"
دوئيم داچه والیسرائے دوه نيم لکه روپئ د پير په ورځ
دولس بجے دا انجکشن د شيشو د ياره منظور کړے ـ کومو
کلو پورے چه د الوتکو چينو ته نږدے دی ـ هغه ټولو خلقو
له به داسے ستني وهي ـ چه بالکل کا نړه شي ـ او د الوتکو
غږونکا هر ورله دماغ نه خرابه وی ـ ملا صاحب وئيل د
کافرو ملک دے ـ عجيبه عجيبه خبرے پکښې کيږي ـ ما وئيل
ملا صاحب ته هم پکښې ئے ـ

بل داچه د جمې په سړک ټانګه روانه وه ـ کوليس پکښې
نه وو ـ او ورئے واغست ـ او کوچوان سره د سور لو

شته لوخړه شو ـ هغه وئيل داخو بالکل دروغ دی ـ
ما د واده ـ راشه اوګوره دادی ليکلي ئے دی ـ اکا ئے ما
ورد پاند کړو او يو ے کوځې ته م کوته اوښوده) چاپ
کاغذ کښې هم څوک دروغ ليکي؟ (بے ځما)
په دخت کښې ميرباز راغلو او آوازئے کړو ـ پيش ماموه!
روره دے راغلو (بيرون راغلے وه) ما وئيل "د ښتيا وے".
هغه وئيل خدائ چه ما وے راشه په دے قرآن قسم اوکړه
د ډکشنري م ورد پاند ے کړه) ټولو په خپ خپ اومنل
هغه ميران شو ـ مولانا مبارک له ئ هم مزه ورکړه ـ سبه
په شانِ مولويت سره په کټ کښې نغد کيناست ـ او
پس د سر خوزولو نه ميرباز ته په عالمانه طريقه کښې
شروع شه ـ "بچے .... " ميرباز وے چپ!
بچے خو به م هم نه لے ـ هغه خو موچپ کړه ـ خو مولانا
صاحب بيا ګراموفون شه ـ هغه روره! هم ستا د ياره
وائيم ـ نامه تيک اخله ـ فضل محمود وايه (په ف ئے
داسے زور کړو ما د ګڼي لکه د ګيډنړۍ پرق اوچود) د غلطے
نامے پريلو ئے عذاب دے ـ (په ف هم هسے زور) فيغمبر
عليه السلام فرمائيلي دی ــ ماخو خوله کښې روماله ورکړو
او باهر ته م منډه کړه ـ خو شپون ورله په هسکه غږ انګه
شابلشے ورکړو ـ لوئے شے بابا ـ د بيل بيړي دې چارشم

ســـه

فضل حميد د اول کال

قلمی دُنیا

مختار احمد د دیرتیم کال

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (هر ټولی په خپله ټېلهٔ خوشحاله دی)
دا د قدرت یو حکیمانه اصول دے چه د هر کسب خلق ئې په
خپل کسب دومره خوشحاله کړی او مشغوله کړی دی
چه هغوی په دغه حقله خپل عقل زغلول یو قسم دماغی ګناه
ګڼړی . او هغه کسب خپل ټبر د اثر په وجه یا د کور
حالت د اثر په وجه په ډیری خوشحالئ او دزړه په مینه
اختیار کړی . او خپلی ډلے ته د خپلے پوهے د حیثیت مطابق
ورکړه شروع کړی . او هم دغه راز دے چه پرے دی دنیا
دا عظیم الشان نظام قایم دے . بلکه دا ټول کاروبار پرے ښېلے
شوے او منظم دے . او که دا د زړه شوق د مینځ نه لرے
کړے . نو انسان چه اوس ورته حیوان د کلهون ویلے شی
ضروری ده . چه بیا به هغه زور انفرادیت ته او ګرځی
هر یو نه به د جماعت غړ جوړ شی . او هغه د خپلوی د تعلق
تار چه دے یکښ پیلے شویدے . دغه به او شلیږی .
اوس خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ط (انسان پیدا کړه
او بیائی ګویا کړو) د ټای تسمه ګویائی ده . یو په ژبه . یو په قلم
اول په اشاره . دا دری څیزه دی . چه انسان پرے د هر هغه
څه چه دده په زړه کښ وی . یو بل هم جنس ته بنود نه کولے
شی . دا میوئنی ډله به تر و الخلو . ځکه چه د سره موږ غرض دے
او دغه نوری دوه به ورسره ضمناً ذکر کړو . نو د و دهلو
پښتان د خداوند تعالیٰ دغه ذکر شوی راز په قلمی دنیا کښ هم
ډیر زبردست کار کړے دے . او څونګه اوس به دا تار
او چلېږی .
دا حقیقت نن هر چا ته څرګند دے . چه د انسان د علم
ذخیره اوس ډیره زیاته شوی ده . سائینس د ایجاد
په نیلی سور دے . ډیر پراونه ئې پری غوخ کړه . او
لګیا دے غوخوی . مګر تر اوسه پوری چه سائینس څومره
لتون کړی ده . که سړی پری یو تدبر نظر او کړی .
چه پره د انسان به د ټولو نه د اوچتی پایې ایجاد څه وی؟
نو ځما تر پامه خو دا راشی چه دا څیز "قلم" دے . ځکه چه
نور څیزونه بنو پرېکړه . که مونږه صرف "دنیا" دا بیلو
نو دنیا خو دیو ژبی هغه کمله ترقی نه ده کړه . ژبه
خو هله کامله شی چه ځان قلم ته او سپاری . قلم د ژبی
اصلی ملاتړ دے . یو عربی متل دے مَنْ كَتَبَ قَرَّ وَمَنْ
حَفِظَ فَرَّ (لیک لقاده او یاد هواده) د ژبی لوئی او
ژوندون صرف په قلم سره وی . او د دی ایجاد
د لوئی یو غټ ثبوت دا هم دے چه خدائے پری
قسم خوری . نٓ . وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (قسم دے د
په قلم او په تحریر) نو ظاهره شوه چه قلم د انسان د ټولو
نه زیات حیرانونکے ایجاد دے . د لی د دی پلی خلق هم
د هغه حکیمانه راز په وجه په دی کسب اختیار و لو نه
خاص سوچونه او غرماز غه نه ستړی کوی . خو د
ملحول یا د څه خاص اثر په وجه اختیار کړی . او
بیائی پری قدرتی زړه دومره خوب شی . چه پری

خوشحاله نه بلکه تر ډیره حده مغروره وي . او په
بادشاهئ بیا نه ترې هم مغرور هم نه وي . بلکه د دنیا
همه اوچتو نه ورته ځان اوچت ښکاري . او داسې
خیال کوي چه د دنیا همه کسبونه او علمونه هم د
ده ئې پیدا وښت او ده په لاس کښې د چو چینړۍ سته
دے . تر دې چه کله نه کله خود قلم خاوند د چشمو په
سودې کښې ښه ووي . چه شرور خلاص شو دے . او
تور ئې د ځان نه بے ځا نه کړي ده . تا سو به اکثر تقریرونو
او تحریرونو کښې په دې بحث اوریدلے او لوستلے وي .
چه قلم له توره طاقتور دے . دائې یو سړې او ډیل
چه دا هندوستان کښې شل ګزه توپ وهلے دے . نو یو بل
یادګیرے ناساپه راپاسیه . او دې ډیل . چه دائې ګز او
دائې میدان . دنیا کښې خلق لوئې لوئې دعوې کوي
دے هغه پوره کول ډیر ګران دي . د ډیرو کسبونو
خاوندان د خپل خپل کسب په وجه په ښکر تیکے ګیدلے کړي
ولې که د قلم خاوند خط شکسته کړي . نو دے به دې
دعوه کښې تر ډیره حده رښتونے هم دے .

هر یو ایجاد چه انسان کړیدے . نو د هغه ایجاد فائدونو یا
نه زیاتو د ایجاد کونکي تر خپله کسب پورې محدود وي .
هوائي جهاز اوس واقعې د انسان ور ستنے حیرانونکے
ایجاد دے . ولې ددې ایجاد فائده ښو دومره ده .
چه انسان پرے د لوړو سودرلو نه زر سفر نو خه کړي
اولیس . یا که فرض که ایډیسن ټیلیفون ایجاد کړو . نو
ددې ایجاد فائده هم تر تنړی خبر رسانئې پورې ده
ولې قلم ښو یو داسې ایجاد دے چه دهغو د ځلور
ګنجه دُنیا نه کرښه تاؤ کړے ده . دنیا کښې داسې څه
دي . چه هغه قلم د ځان تابع کولے شي . بعض وښت
خو دومره اوچت والوزي چه د لوح محفوظ نه څه حصه
را اولښتئ او پخپله کرښه کښې بند ی کړي .

که څوک دا اوائي چه داسې خو د انسان ایجاد "دینا" یا
ژبه هم ده . ځکه چه دا ذالبیان یو حصه ده . نه بلکه
دا خو د قلم نه زیاته وسیع ده . نو بیا د قلم خاص لوئې په
څه شوه ؟ دا صحیح ده . ولې دا خو د تفسیا تو مسئله ده
چه کوم وښت لا انسان د ارتقاء یا Evolution
په درښتئ پوړئ باندې وُه . چه ژبه لا نه وه جوړه
نو په سړي به چه څه خاص تکلیف راغے . نو د بیکسئ په
وښت کښې به د بدني حرکاتو gestures
سره دده د خولې نه یو "هُو" هُم اوووت . ځکه چه
فطرتاً هر حیوان د ځان د ساتنې Self-preservation
د پاره هر ممکن کوشش کوي . نو دده همجنس به چه
داهُو واوُریده . نو رامنډې به ئې کړه . او دده لاس ځینې
مخ ، سر ، خوله ، سترګي هر څه به ئې په یو اوتو
حالت کښې بیا مونده . او او به ئې لیده . چه یو ځناور
پرې حمله کړي ده . نو که څه امداد به ئې ورسره کولے
شو . نو او به ئې کړو . ولے چه بیا به دغه هم جنس هُم
هغسې لاس ځینې خوزول او لیده . او هغه هُو به ئې
واوُریده . نو که ځناور به ئې لا نه وو لیدلے . نو هم به پوه
شو چه هغه دښمني ځیز پرې بیا جوړ حمله کړي ده .
نو روستو د داسې آوازونو چه ورسره به اشاری
excitement هم وے . معنی پیدا شوے . یعني د

الفاظو بنیاد کیښودے شو ۔ او چه څومره انسان دَ
ارتقاء په اړخیتو پوړو ختلو ۔ دَ اشارو ضرورت
دورو کمیدو ۔ کوتاه پدی چه بیا الفاظو په خپله
هم خپله معنه ادا کولے شوه ۔ ددی نه پس الفاظ
روورو غونډ پیدل ۔ چه تری ژبې جوړې شوے ۔
ولے دا ژبه جوړول خو صرف دَ انسان صفت نه دے
کنه ۔ نور حیوانان هم ځان له خپله یو خاص ژبه
جوړه کړې وی ۔ چه هغوئ پری هم خپل همجنس ته
دَ خپل زړه حال ښکاره کولے شی ۔ ولے تعجب خو
سړی له دا خبره ورولی ۔ چه یو هوائ څیز ۔ دَ خولې
هوا نه یو خاص شکل څرنګ جوړیدی! او هغه بیا تر
څومره ساتلے شی!!

اول ژبه یا وینا دومره لوئ ایجاد ځکه نشی کیدے
چه مونږ وینو ۔ چه دَ کومو قومونو ترقی صرف تر وینا
پورې محدوده دی هغوئ د دُنیا سره چرې هم
نه دی رابنتلی ۔ اګر که دهغه قوم ملا بند دَ پیشتو زړو
او وولی له غشو ډک وی ۔ او کوډئ ۔ لیښتیا نه
دَ جرمن قوم نه یا دَ هر یو مغربي قوم نه په لور زنبئ
کښ کم دی څه؟ لاشائیں ترے زیات وی ۔ ولی غریبانان
چرته ویخ کښ پراته دی ۔ ولی؟ ځکه چه قلم نه لری هم
دغه رنګ انګریزان په هغه زمانه کښ کومې ته چه دوئ
The days of Chivalry وائی ۔ څه دَ اوس نه کم
بهادران وو څه ۔ ولی په هغه زمانه کښ هغوی چا پیژندل
هم نه ۔ چا به ورته وحشیان وے ۔ چا ځناور او چا ځناورګان
ژبې نه وه څه؟ خبری به ئے نشوے کولے څه؟ نه داهر څه

وو ۔ ولے کے صرف دَ قلم وُه ۔ قلم نه وُه ۔ او که
وُه ۔ هغه په نیشت حساب وُه ۔ او علیٰ هذا القیاس
حقیقت دا دے ۔ کوم وخت چه دَ خدا ئے دا
لوئ نعمت دَ یو قوم په لاس کښ راشی ۔ نو بیا ورته
تودی ملاتیته کړی وی او دمے پرے سوے دوان
وی ۔ ولی چه د تودی کړ ارخو زیات نه زیاتو
ستړه وی ۔ ولی چه قلم راپاسی نو دمے ترے کوښه
تاوئ .... تاوئ آخر چه کائنات ورته
سر په کوښه کیږدی ۔ نو کله هُم دداسی څیز
پکار ده ۔ او بیا فخر هُم په داسی څیز پکار دے
په شال شملے یا په غټ کټ وجود په څوک څه
فخر کوی ۔ او څه به وه سره او ښائی ۔

قلم گوید که من شاهِ جهانم
قلم کش را بدولت مے رسانم

او ښکے!

دَ ذره نم م کړه او اسیلا دَ او ښکو — کړی بار اسره سیالی حباب دَ او ښکو
دَ فلک دَ لاسه حرکت ژړیکم — زیاتوی ئے هر دم کرداب دَ او ښکو
څه دَ یار دَ فلسفه باند یو نه شوم — چه خندا کښ را کوی جواب دَ او ښکو
دَ شر ابو غوند سترګې دے ګواه دی — څه به تا ته څه کوم حساب دَ او ښکو
دَ آشنا مینه کښتئ پکښ چلیږی — دومره سترګو چار دریاب دَ او ښکو

دَ عزیز زړه تو یږی او ښکے دَ وینو
چه لوز نه لری سترګې تاب دَ او ښکو

عبدالعزیز خان عزیز
دَ خلودرم کال

دُنیا

څه ډنګه په ښکلې دا دُنیا ماته ښکاریدله. کله چې زه ډیر لرې په یوه خوشې بیدیا کښې پروت ومه چې هلته صرف یو څو کسه دَ دُنیا دَ هوس ومکر نه ناخبره. دَ مینې ډک زړونو سره موجود وو. چې هلته نه بُغض وو نه غیبت نه مکر نه ریا. نه کبر نه ظلم. نه حاکم نه محکوم. نه غریب او نه مالدار. نه دروغ او نه ګوکه.

چې هلته زړونو کښې دَ مینې یو خوږ درد وو. هر څه کښې سادګی وه. نزاکت وو نفاست وو چې هلته روح پاک وو. زړه پاک وو. تن پاک وو اوبدی چا نه پیژندے. صرف دَ یو الله دَ حکم لاندې په دے ښکلې بیدیا کښې پراته وو. اخوا دیخوا مو کتلے او دَ قدرت ډیر ګار ډنګ ننداره مو سنائیلے.

ولے داسی نه ده ـــــ

څه دَ بیدیا هغه ښکلې بیدیا نه لرے په یو داسے ځائی کښې پروت یم. چې دَ هغه ځائی دَ خلقو زړونه دَ بُغض او کینے نه ډک. دَ یو بل ستونو پړ یکولو ته تیار دی. دا هغه ځائی دے چې کوم ځائے غریب دَ سپی نه هم بد تر ګڼړلے شی.

دا هغه ځائے دے چې هلته غریبانان دَ مالدار دَ مانړو کښې کټے او دَ وړاندے شماری. او پاس پاس ورته ګوری. چې ایے ربه دا هم ستا مخلوق دے. هم دغه شان ولاړ ځپل وخت ضایع کوی. او اکثر هلته تږے روان شی. چې دَ پاسه پړے او به یا دَ میوو پوستکی رائی غورزدی.

بیاروان دَ مزیدارو مزیدارو میوو او دَ مټهیا نو دکانونو ته ګوری. هر څیز ته ئے زړه کیږی. ولے پیسے ئے وانخلی. او زړه له یے صبر ورکړی. چې زه خیر دے دا دَ مالدارو خوراک دے. که دوکان پوری لنړ تیرشی نو دوکاندار ئی او کنزی. او که چرته مالدار سره ئے لاس اولګید نو هغه ورته دَ مودیلار نه تیرشی.

دا ولے. ولے دا دَ خدائے پیدا نه دی. دوئی دا نه خوښی چې مونږ دِ ښه اغوستن اوکړو. ښه خوراک دِ اوخورو. خوشحالونو کښې دِ اوسو. په موټرونو کښې دِ سورلی اوکړو

دا غل چې مخکښې روان دے. دَ بیرو په شرنګار کښې شومیدلے. هر څوک چې ورته ګوری لعنت پرے وائی. ولے هغه غل له یکار دی چې په دوئی لعنت اووائی. هغه غلا دَ ولے نه کړی وی.

مخکښې او ګورئی هغه ماشوم دخپل مالک څخه سره مدرسی ته لبسته اوړی. غریب دَ یخنئی نه رپیدی نړول وجود ئے په لړزان دے. ولے هغه ورکوټی

مالک ته اوکوړئ - چه سر نه ترخپو لوړی په دړپځ
کښې پټ دے - هغه مدرسی ته نوت - او غریب
ماشوم تږے را روان شو - ولے دا ماشوم سبق
لستی وئیلے - دا د ده نه ده خوښه - چه مونږ هم
سبق اوو ایم -

زه هم داکړمے جامے واغوندم -
داهغه څمونږ دنیا ده -

عبدالرحمن کیف
د دریم کال

دَ محبّت نیک انجام

سلیم په کالج کښې سبق وئیلو - دَ خندا او خوشحالئ
نه ډک ښوله او دَ مینې نه ډک زړه لرلو - په سبق
کښې هم ډیر تکړه وه - سلیم په محبت نه منلو وئیل
به ئے چه دا دی حکومت دَ انسان په خیالاتو باندے
کیدے شی - ولے په زړه ئے څه اثر نشی کولے لیکن
رو رو سلیم هم دَ دخت تیریدو سره دَ خپلی تولے سره
چه نوم ئے زینب وه ډیره مینه پیدا شوه - دے
انقلاب دَ سلیم ژوندون دَ عقیدی پانړه په بل
طرف واړه وله - سلیم خوښتل چه کمو ستوزو څما
په زړه - په خیالاتو او په جذباتو کښې انقلاب راوستے
دے - او څما دَ ژوندون نظریه ئې بدله کړی ده
هغه ستوزے دِ هم څما په غم کښې سړے دی - او دَ
کشش په کلی تهٔ را ښکه - لیکن او به سر ته راوُونه ښی
او دَ یوسوز نه ډک اسویلی سړ ئے دا خبره دَ خولی
نه دا او وته چه کاش دَ لوی لیښنے پیغلی ستوزے هم
دَ چا په محبّت کښې سری کیدلیشی - او عنابی رنګ
اغستے شی -
دَ سلیم په خیالاتو کښې دے کیفیت یو لوئ انقلاب

پیدا کړو - او یو خوږ غم ئې ملګرے شو - چه په کښې
دَ ځان نه هم خبر نه وُه - دَ یونیورسټئ امتحان
رانزدے شو - په داسی حالاتو کښې سبق وئیل ورته لو
لوئ کار
ښکاریدو -
لیکن دَ
والدین دَ
لحاظئ ځان
تیار
کړو - او
امتحان ئے
ورکړو -
سلیم امتحان
نه پس دَ
کلی لاړو لغته
باوجود دَ
خبرو خیالاتو
او کوشش

څه او ته
(بلنیک ورس)

دَ سپرلی په ورځو شپو کښې
چه ته لوے غزه لمن کښې
دَ کور کور دے وونے خواته
دَ ښائسته چینے په غاړه
وخت زیږی مازیګری کښې
څه منیځ بیره ته فاصلے نه
دَ شپیلئ خواکه سُرونه
توره غږو لو تمبا ډُلے
دَ هوا مستو چپو چپله
کیسے چا پیره خوار ولے
نور خاموشه خاموشی وے
بل څوک نه وے څه او ته وے

نه سلیم ته پته او نه لګیدهٔ - چه زینب هم ده سره
محبت کوی - سلیم یو پښتون تعلیمیافته ځلمے وُه -
او دا ئے خیال وُه - چه د قدرت د اصولو په مطابق
هر یو څیز کښې د دومره کشش وی - چه بل څیز
ځان ته راښکلے شی - او هم په دے خیال سلیم زینب
سره به د محبت ډکے خبرے کولے - لیکن هغې به
خبری آوریدو سره د اوړو آخلو یا د ډوډئ پخولو
او یا د اوبو راوړلو په بهانه به تری پاسیدهٔ - او هغه
به حیران پاتے شو - سلیم ته د ژوندون د تکلیفونو
نه لوده ورېځ ښکاریدهٔ - د امتحان نتیجه اووته
او سلیم* په خه نمبرونو کامیاب شو - پلار ئې غوښتل
چه سلیم دِ ډاکټری پاس کولو د پاره لاهور ته
لاړ شی - حتیٰ چه میډیکل کالج کښې داخل شو -
او د ترقئ په روښې لوړ پړئے قدم کیښود - هر کله
چه سلیم به خپل تصوّر کښې د زینب حُسن او د
پټکلتوب راوستل او د تورو زُلفو په مینځ کښې هغه
سترګے به ئې را یاد شوے نو ډیر به زهیریده -
د سلیم په ژوند کښې یو ورځ داسې هم راغله چه
ورته د ډاکټرئ سند ملاو شو - او یو ځل بیا
سره د ډیرو حُبِ بالو خپل کلی ته راغلو - د سلیم
راتګ نه یو څو ورځے پس په کلی کښې هیضه ګډه
شوه - پلار ئې سخوځتی قے او کړو - او هم په هغه
ماښیځیّ دے دنیا نه همیشه د پاره رخصت شو
د دې نه پس مور ئې هم ناجوړه شوه - او باوجود د
ډیرو علاجه خه موده پس د مرګ په خوب اوده
شوه - د شیطان په لمسون خوګل تره ئے دُشمن شو
هغه وصیّت نامه چه په کوم کښې ئې پلار مال و جائیداد
څوئ پسے لیکلې وُه - په خه چل ئے قبضه کړه سلیم
بانلے مزکه آسمان یو شول - د عدالت دروازه ئې
په خپل مات زړه سره په زوره اوټکوله - لیکن
افسوس بل طرف نه د بیسو دومره زور وُه چه
چا دده په منت زارو هیڅ غوږ او نه کړو - سلیم
حیران شو چه ځما خه خیال وُه - او خه را ته پیښ شو
او لا مخکښې دِ خدائې خیر کړی - لاچار ستو رږئے
زینب او چاچی ته را وا ړولے - لیکن رښتیا دی -
چه په یو پښتون کور کښې د لوی ځځُ یا د جینئ قد
هم هغه هومره کیګی - څومره چه د لوړ ټکودی
ځکه چه د لوړ ټکو هم عام طور سره هغه سړے مالک
وی چه څوک ئې په زیاته بیه اخلی - او هم د غسے
یوه پښتنه جینئ د لوی شئ په حیثیت په هغه
کور کښې قدم ایښودو ته مجبوره کیږلے شی - چه د
کم کور سړے د جینئ د وروله د پاره زیاتے پیسے
ورکړی - د دے ټولو مصیبتونو د سلیم زړه
تقریباً او خوږ و - او عقل و هوش ئې بیا له -
نتیجه ئے دا شوه - چه یو نامعلوم ارادې سره
د سټیشن لاړئے وا غسته او چه په ځان پوهیدو
نو فرانټیر میل په لوړ رفتار سره خکته روان
وُه - سلیم ځان سره او وئیل چه د دُنیا د مصیبتونو
په رونړ تندی مقابله کول د انسانیت یو اعلیٰ

مقصد دې چې آیینده ژوندون جوړولو د پاره پخپله
موضئ د ډاکټر په حیثیت سمندپار لاړ - او
دوه کاله پس د میجر په عهده واپس هندوستان
ته راغلو. او په بمبئ کښې په ملټرۍ هسپتال
کښې هم په دې حیثیت سره مقرر شو

د سلیم تګ نه پس د زینب ژوند کښې هم کافي نه
زیات انقلاب پیدا شو. ځکه چې د سلیم د
محبت نه ډکې سترګې - بنګلې لښتې او د محبت نه ډکې
خبرې یادېدې. لوی لوی احساس او جذبه په
په ذړه کښې پیدا کیدو - په ډیر افسوس به ئې
وئیل - چې کاش ما هغه بنګلې سترګې نه وې لیدې او
نه پیژندی -

د سلیم په غیر موجودګئ کښې زینب د هغه د محبت
په رنځ پړوته. هر قسم حکیمي او ډاکټري علاج
اوشو. ولې د زینب علاج د سلیم په دیدن وه
ولې کاش چې ډیر ډیر وستو ورته د دې د اصلیت
معلوم شو. اکثر به بې هوشئ کښې سلیم به ئې یادولو
د زینب پلار چې دا حال اولیده چې هغه د بلیټون
په مرض ګرفتاره ده نو د سلیم په تلاش کښې لږ
نزدې ډیر منډې رامنډې او وهلې - لیکن بې فائدې
او بله وجه دا وه - چې هغه ته ځان ډیر کمینه اسیک
او بې شرمه ښکاره شو - چې د مړ دود په مال
په ناجایزه طریقې سره قبضه کړې ده - د دې خیال
به ورته کافي تکلیف رسولو - چې هم په دغه وجه
سلیم بې وطنه شو -

د زینب حالت ورځ تر ورځه خرابیدو - حتی دا چې
یو میاشت داسې د ټولو اخبارالو په ذریعه د سلیم
ته ره دا اعلان اوکړو - چې زه پخپلو کاروائیو باندې
ډیر خفه یم - او تا نه د ذړه د اخلاص معافي غواړم
خپل مال او جایداد سنبهالو لو د پاره که ته هر چیرته
ئې راشه - زینب هم ستا په وجه د ذړه په رنځ اخته
ده -

لوړه ځ سحر د چیو په وخت کښې چې سلیم ته لوکړ
اخبار راوړو - او دا خپل اعلان ئې پکښې اولوستو
نو د محبت اور ئې په سینه کښې بیا تازه شو - هغه
وخت ئې د وطن لار واخسته - او په دریمه ورځ
کلي ته را اورسیدو - د سلیم په لیدو سره د زینب
پلار فوراً ورمنډه کړه او سلیم ته ور تر غاړه
وتو - سلیم د زینب کټ ته ورنزدې شو - او هغې
چې څه وخت په سرو سترګو سلیم ته اوکتل - نو
د خوشحالئ نه ئې د محبت نه ډکې اوښکې له سترګو
روانې شوې - سلیم د هغې سترګو کښې د حقیقي
محبت یو مکمل عکس اولید - محبت نه ډکو سترګو
یو بل ته په یو داسې نظر اوکتل - چې د هغې حال
صرف ذړه او سترګې پیژني - یو میاشت پس دا ګمان هم
نه کیدو - چې چې زینب هم د قبر په غاړه ولاړه وه - د
نه پس سلیم او زینب د همیشه د پاره یو ځائې شول
او محبت د دوئ دا ټولنې ژوندون ته په خوشحالئ سره
ډک کړو او وئیلو -

ارباب عبدالقدوس
د دریم کال

سپرلے

دَ سپرلي اُوربزې داغلې تورې لاسو کښې پرتیکي
ټې برېوتو له تخته په دو دو یاندې زغلیکي

په غوږ دانګو په تېوپونو په کاږکوړ اوربزې داغلې
نزې باد ورسره داغې ساسکي ساسکي راودېکي

څه پوُنه دَ باران اوشوه زمکې هم خوشبوداپېغوړه
بُڼ ئې تهال په آسمان جوړشو جوړې پې ئې پرڅوک زنګیکي

طوطیان والوته مستئې کښې زانړوچوړ کړه قطاروته
آسمان ټول شو هیرو وبرې ساسکي کلونه سیکي

بورا بیا په زبیرکوسرشو لوغړن په عشق کښې داغې
په ګل ګل باندې بنړیکي خپل آشنا لیپې تا ویکي

زړ نرګس له خوبه پاسیذ سترِ نیغ کړه حق حیران شو
بیالاله دړیوې کړې یې دَ صحرا منځ کښې زلیکي

ګلاب پرېوتو ناصبره صبا زیړې ورله راؤړه
دې مسکې شو په خندا شو په مستئې کښې بیا زنګیکي

کوئل بیا شو بیقراره، لیونې په چغو سر شو
بلبل بیا په واویلا شو دَ سوز ډک رباب ټنګیکي

غر نه شنه شو صحرا شنه شو ـ شنه شو داړه چمنونه
دَدې شنو جامو دَ پاسه مرغلرې دي پرتیکي

هر یو خیز خمار آلود شو هر یو بوټې دَ مستئ نه
په مزه مزه خوزیکي په یو بل باندې غوزیکي

رنګارنګ مخونه ویم یو تر بل نه ښایسته دي
دَ ګلاب په سره پیاله کښې سپین کوهرا تبزلیکي

داخوشبوئ دَ کومې راغله چرته عطر دي توئ شوي
نه خطا شوم عطر نه دي عطر دي ته نه رسیکي

پاڼه پاڼه په ګډا ده ساڼکه ساڼکه په تېوپونو
ګل په ګل باندې سرانیچې دَهوا په تهال زنګیکي

دَ قفس بلبل ته وایه بهار څه دے راته خایه
والئ په هر وخت بهار دے چه آزاد سرې ګرزیکي

دَ صیاد په دام اسیریم په ما تل خزان دے
دَ ظالم په لاس چاړه ده دَ غریب په ستږ چلیکي

څوک صوفو کښې آرام نه کړي څوک په مزکه غزیدلے
څوک کیکو نه سپوته اچئ څوک د لوکې نه لغړیکي

پردلے واکے یم په خولے دي په پردلے چوکه زغلیکم
څه په دړ دړ دم کښې ډوب یم له خولې دینیم بهیکي

دَ خزان سپیره بادونه دَ بختنئ چنئ کړې تیرې
ځکه هدا اغزې دَ ګلو په لمنو کښې پتهیکي

ته هُم پاسه زحمت تیر کړه دَ دُشمن سینه کړو سیرې
بیړئې اوشلوه له څپونه بیا ته ګوره چه څه کیکي

دا وطن به وطن نه وی چه دَ یل په دام اسیر وی
بیا سپرلے دَدی وطن هُم څه سپرلے نه معلومیکي

عبدالرحمن کیف
د دشتایم کال

ښه اوو ایه داخه دی؟

(۱) پوهسے شے م ولیده چه قالین دے په میدان ... گرمئ له دے دالان
کوم ته پرتوك دی دواړه کارتری اخله پهړ آن. ... رسئ ده دَ دهقان!
بیترئے بالنسبت برستن ده کارتری اخله نور بیشماره ... غوښ کیدۀ په قراره
ښتون سره ورردی ده. لو لیه ده لس تیاره ... ضروور دا تالیاره
شاگرده که ئے اخلے. پنځه پاره ئے دام دے ... خبر پرے خاص و عام دے

(۲) پوهسی شے م ولیده چه جوړ شوے دَ بچو دے ... دَاوسپنو بچو دے
سورلی دَباد دَپاسه سوارتل ئے په دیو دے ... خفه په لواړه تلودے
شاگردم دے لیدلے شاگرد ښه تر ینه خبردے ... دَخویه نه کچودے
خفه چه د اُستاد شي په اُستاذ سور دے بیا نزدے ... شاگرده تیار خردے
داهسے بے غیرته په گرمئ کښ ئے زکام دے ... خبر پرے خاص و عام دے

(۳) پوهسے شے م اولید چه روان دی تل په خکته ... را اوښایه ئے ته پته
ویریږی نه د بادو دَ باران نه ده آفته ... نهنګ واهی په لته
سامان په خپله ملا اوړی دے دَ زرو منوزیات ... نور دیرئے کمالات
ورکئ خوارو امیرله په سل زرمنه زکات ... دالتول دده صفات دے
شاگرده که ئے کیر کړے لس جوړ م دے تمام دے ... خبر پرے خاص و عام دے

(۴) پوهسے شے م اولید چه بندی ئے په شل ځایه ... شاگرده اوس ئے وایه
پولنبه دخادئ ده. خه معلومه دا دَ ورایه ... په پتو ستوکوئ ځایه
پولن خوندے غوائے دے بے لوړه نه حئ ځانه ... شاگرده پهلوانه
اوحپت ئے په اوکه کړه. په دوه مخه ئے وابیښانه ... جرجرکوی دَ ځانه
واهه په دواړه مخه ئے خو خپه تر نه اِمام دے ... خبر پرے خاص و عام دے

ارباب محمد اشرف دَ بر تهکال

دَ صباغم

انسان فطرتاً آرام او دَ عیش ژوندون خوښوي او په دس سوو ځان دَ هر قسمه جسماني او دماغي مشقت نه ساتي. رلے کهونږ دَ انسان دَ ژوند مره ژوندون او د زوړ تاریخ مطالعه اوکړو. نو مونږ ته به معلومه شي چه انسان کله کله دَ عیش او دَ آرام ژوندون ته خیرباد وُئیلی دی. دَ رقص و سرود محفل ئے پریخودے او په خپله ئے دَ پړتیدونکو توړو دَ سوري لاندے سینه گټلا کړے ده. داسې یوه نقشه بائیرن (Byron) په خپل نظم The Eve of Waterloo کښې په ډیر الفاظو کښې راښکلے ده.

تاریخ دَ انسان د داسې نورو ډیرو کارکنو او دنګ پک پروت دے. چه دَ هغے مطالعه مونږ ته دا سبق راکوي. چه انسان له خدائے څومره طاقت ورکړے

دے. دَ جرنیل هانیبال Hannibal دَ الپس غرو سر کول. دَ فرانس او دَ روس هغه انقلابات دا موجوده جنگ وغیره وغیره دا ټول کارنامے دَ یادي؟ هم دَ فطرتي عیش پسند انسان. اوس دا کتل بیکار دي. چه فطرتي عیش پسند انسان ولے داسې لویو لویو قربانو ته تیاره بر دی. کم تیبز دے خپل مال. بال بچ. کور او ر. عیش او دَ آرام زندګی قربانو لو باندې مجبوره دی. خو به دی چه مونږ د دې سوال دَ جواب نه اول په یو څو مثالونو باندې غور اوکړو.

یو قابل طالب علم چه هغه خپل فرض پیژنی. هغه شپه ورځ کار کوي. او خپل خوب او آرام د مطالعے په خاطر قرباني کوي. ولے دا معلومه خبره ده. چه دَ دَ وارو تکلیفو نو محرک دَ امتحان پاس کولو خیال دے.

غزل

عشق له لیونیه ښتا دلاسه درپه دَ یمه
بیت پناه بادشاه یمه ظاهر کښې گدا کو یمه

عشق ځما ایمان دے ځه ایمان فرشته ئے پښتو لرم
پروت که یم خانقاه که په مسجد که په مندر یمه

شک کښې یم د ځان چه ځه ګمان لګیان دیځاو کړم
ځه که جام دَ جم یا آئینه دَ سکندر یمه

شک له شک د سنئې له رسوائی بے قرارئي نه یم
شک ځه پد نیا کښې همیشه له شک نظر یمه

ځه به دَ بیل فنا قضا دَ نه تعریف کوم
دا قدر خبر یم چه له هر څه بے خبر یمه

نه یم چه ځه یمه چه ځه نه یم هغه یمه ځه
بیا هم ستا په خیال کښې جوړ په هندو سور کافر یمه

نور به ترے ځه طمعه دَ مهر و وفا جلال کړے
د نهٔ ښایت دَ چه لَ او دے مره ور یمه

جلال الدین جلال

پوزمینلد یې فصل کړلو او د هغې د هر قسمه پالنه کښې ولې شیه او ورځ سرګردانه او فکرمند وی؟ د صبا د غم په وجه.

غرض دا چه انسان د حیل د حال آرام او راحت ته هغه وخت خیال ورکوي کله چه د مستقبل سره ترون نه وی او مستقبل کښې د خپل ژوندون بدلون نه وینی. ځکه د مستقبل د خرابیدو دا حال منحصر نه دے. لوانسان

به هیڅ کله دا دومره مصائب او تکالیف نه برداشت کولے. انسان د حال آرام او عیش د مستقبل په خاطر قربانی کوی. او څوک چه په حال کښې د مستقبل غم او فکر نه کوی. نو د هغوی حال اکثر خراب او زبون وی. بل ته محتاج د بل محنتکش وی. د دوی مثال په میدان کښې د یو پروت خسنړی وی. چه هوائے په کښو اوړی. پهضه خوا ئے اوړی دا حال د کم همته او اوده قومونو هم دے. چه همیش د بل لوړے ته ئې خوله وازه نیولې وی.

تیاره لوري جوړوی. د قوم مستقبل د افرادو په لاس کښې وی. څو پورے چه د قوم په افرادو کښې اتحاد عمل نه وی. د دوی یو خاص نصب العین نه وی. او په دوی کښې د قومی مفادو په خاطر د ذاتی مفادو قربانولو جذبه نه وی تر هغې د قوم ماشوره ورانه وی. او خوار او ذلیل وی. مګر څه وخت چه هر فرد قوم متحد الخیال او متحد العمل شی نو یاد دی تر هغه ناممکن خیال ناممکنه ده چه په دماغ کښې راشی. کاش چه مونږ هم د صبا غم او کړو کله به "نن" "نن" هر څه هر څه د "نن" "نن" "نن" دے "نن" "پرون" "صبا" "پرون" شی. "پرون" هم د "نن" نه جوړیږی. او "صبا" به هم "نن" شی. د صبا غم "نن" پکار دے. چه "پرون" مو هم شاندار شی او "صبا" هم.

ارباب محمد سعید داؤد زی
د خلودم کال

مصرعے

(۱) جانان م سره وطن کیخود — په تار د زلفو یه کفن ئې کنډله
(۲) زړه م ماتم شر راته ژاړی — اوس اته غواړي د پرد و سینو خولونه
(۳) که محبت ستا عبادت دے — څه به مو غوکښې بمونځ د جنت ونه
(۴) ځما په سترګو کښې د غم ګل شی — که ستا په مینه ئې بل جانانه اره وُنه
(۵) که په تره یاران مونږ نه څو — ما به چولۍ د داونښکو ډکه کړه ونه
(۶) غمې دا اوګوره تکه یاره — ستا د تنګی خطونه جیب کښې کړ ونه
(۷) په مخ م صمواهر ظالمه — د ا د ښکو ډکی ستو ګے چا واړ ونه
(۸) په تصور م ځان بادشا کړو — چه سر م په ته کړ د منګ د دوه ځاونه
(۹) غم د له تانه وفادار دے — ته کله کله غم د تل دا سره وینه
(۱۰) جهان به قوانې وینو سو کړ م — که م د خو بدو زړکی نه پوه کړل لاسونه
(۱۱) پوځلے بیا په د لار راشه — ستا په زړه د یلونو پر یوتل کړ د ونه
(۱۲) ملک الموت ستا م ملغله — یو م ځوانی بیا م پر پر دی ار ملونه
(۱۳) عزرائیل هسې نوم بد نام کړه — زه د جانان بیلتون د ژړ مبے وژلے یمه
(۱۴) د ستنې سره کښې م ځم زه سرکنکو — چه کاف تر کاف د دنیا او سپږی ګلونه
(۱۵) په تور لحد کښې به لمري کړم — څه د دنیا نه ارمانی راغلے یمه

تهمند شبیب
سکال
د دیر

The League contention is that the Hindus and the Muslims are two separate and distinct peoples and they have remained so, despite the fact that fates have thrown them into one country for so many centuries. Their fusion into one nation is impossible as they each draws its inspiration from its own religion, culture, history and traditions. Those opposed to this view, however, insist on India being one and indivisible, and point to the advisability of India playing her role in the comity of nations as a single united country of a democratic type. They occasionally express the fear that the division of India into two or more units may lead to civil wars in times to come. Mr. Raj Gopal Achariya, however, thinks differently. He says that Muslims should also have the right of self-determination. this right was also conceded by the British Parliament through the famous Cripps proposals in 1942. To this the British still adhere. The Congress also agreed to give the new units the right of secession. And a great many Hindus have come round to Mr. Raja Gopal Achariya's view. Unfortunately the great expectations of a settlement from the Gandhi-Jinnah meetings and correspondence did not materialise. It is to be fervently hoped that wiser counsels will prevail and a reasonable and just settlement arrived at and the human right of self-determination accorded to all peoples of India.

SAIFUL ISLAM,
III Year

♤

STOP PRESS

PRINCIPAL

Mr. I. D. Scott has proceeded home on leave for six months, and Prof. S. M. Timur is officiating in his place. We wish the former and Mrs. Scott and children bon voyage and a happy holiday, and hope that Shaikh Sahib will have a successful career as the head of the institution he has now served for more than thirty years.

ROLL OF HONOUR

Another of our old boys has laid down his life in the cause of freedom. Death from wounds received in action has just been announced of Major Meraj-ud-Din, son of K. B. Maulvi Sad-ud-Din Khan (ex-Governor, Trustee and Honorary Secretary of the Darululum). We offer our most heartfelt condolence to Khan Bahadur Sahib and the bereaved family in their sad loss.

The End

It was a plant, a small plant, with small and beautiful leaves. I used to watch it daily.

One day I found a tiny new bud growing from under its soft leaves.

Days passed and the new bud continued to grow. Nature was nursing it under a green veil. It was not yet able to protect itself but soon became tired of the dull, monotonous life inside that thick green veil. It tried to break it open, tried and tried and tried once more and lo! the veil was burst asunder. It saw the outside world and of course liked it.

It began to play with zephyrs, and opened its lips to whisper to them.

The next day it was laughing. It continued to laugh. But after a day it began to wither up. Gradually its petals were blown away by the same zephyrs, and scattered over the winds. They dropped to the ground, were trampled under foot and turned into dust.

We have short time to stay, as you
We have as short a spring
As quick a growth to meet decay,
As you, or any thing."

A. RAHMAN "KAIF."

♤

Pakistan

Opinions differ about the exact origin of the scheme which is popularly called "Pakistan". Some say that Mr. Rahmat Ali an Indian Student who spent a number of years in England was the originator of the plan; others state that it owes its inception to the foresight of Sir Syed Ahmed Khan; but a great may people believe that the real credit for the underlying idea goes to Allama Iqbal, the greatest poet and Philosopher of Muslim India. Iqbal, in his presidential address delivered at the all India Muslim League Session held in 1930, expressed the opinion that self-determination was the essential basis of all freedom and demanded for Indian Muslims the right of self-determination. It was dismissed at the time as a mere poetic dream. But now the true significance of that poetic dream has after all been realized, and the magic word of Pakistan is on the lips of everybody.

Qaid-i-Azam, Mohammed Ali Jinnah, President of the All-India Muslim League has taken up the idea in right earnest and has converted it into the united demand of Muslim India. Without Pakistan, he says, there can be no salvation for India; and the Muslim League will not accept any form of freedom which does not concede Pakistan. Pakistan, as the very name implies, stands for the establishment of independent sovereign state or states in areas where the Muslims form a majority of population. According to the Muslim League, the only solution of India's political difficulties lies in the achievement of Pakistan. This point of view postulates a two-nation theory and is based on the belief that Hindus and Muslims can grow to the fullest stature of their nationhood only under conditions in which their genius, culture, tradition and religion can have free play. Under Pakistan Muslims will realise their ideal of free and independent national existence and will take their rightful place among the leading nations of the world. The League demands the constitution of Provinces where the Muslim population exceeds the non-Muslim i.e. the N.W.F.P. the Punjab, Sind, Assam and Bengal, into an independent sovereign state.

If you happen to get into what is commonly called Government service, remember that the correct designation of that kind of employment is *public* service. You are there to serve the people and not to rule over them. You should be honest and loyal to the best-interests of the public whose servant you are and who pays you for your work. Let each of your actions be directed to one and one end only—good of the people; and " people " includes the masses and not the privileged classes alone. Follow one criterion in whatever you do—merit of the case and not *sifarish* or considerations of filthy lucre. You will be responsible to God and man for all your actions. So, act as God would like you to act towards His creatures. The worthiest public servant he who *serves* his fellow-men to the best of his abilities Position—high or low—in the service makes no difference for him. Be he a minister of the state or a humble peon, his *one* aim is service and service of the people.

MUHD. KHALIL,
II Year (Agr.).

Dawn

The stillness of the dark night did not bring solace to his restless and troubled mind. It continued to fret and fume. The clocks of the neighbour-hood struck three and his feet suddenly stopped. For a moment he wanted to return home, but that could not be. He had come out in search of food. He knew a few morsels of bread would save her life. How could he go back empty-handed? He paused a little. His brain was in a whirl. Why should he alone suffer, while his equals were enjoying themselves. Why should he and his dear ones only be haunted by the spectre of starvation?

* * * *

The memories of his younger days were revived. He heard once again the voice of the venerable old gentleman who had preached socialism from his college—platform. He experienced the thrill of the message once again. Why should he beg for food? Was he not entitled to his share of every thing? Would he be wrong if he snatched it by force? Why was he denied his rights? Why was he deprived of bread?

* * * *

Then he saw himself sitting beside his old mother who was saying, " Amjad, my days are numbered and my long felt desire is to see you bring a bride." How happy his mother was when he got married! But after some time she fell ill again. " Nutritious diet and regular treatment could save her ", said the doctors. At that time he had no money for medicine and now he has no money for bread.

* * * *

He shouted, " Azra, you cannot die. I will not let you die. You have done no harm to the world. I am not going to beg. I shall snatch bread from these hoarders of bread."

Amjad began to run without knowing from whom he was going to snatch food on—that dark night.....................

* * * *

" Where are you going ", a voice shouted from behind and a hand touched his shoulder.

" Have you got a piece of Roti? But, I will not beg. I shall snatch it away from you. My Azra is dying for a few morsels. Give me whatever food you have ".

The constable took him to be a drunkard wandering in the streets and disturbing the sleep of others. He hand-cuffed him and said, 'come along. I will take you where rich people distribute Roti to the poor."

At dawn he was in the prison-house still looking for food for his dying Azra.

A. R. CHAUHAN.

The . . . . est

The finest mausoleum in the world is the Taj Mahal, Agra. It Cost £2.000,000.

The highest building in the world is the Empire State Building, New York (1.248 ft.) The highest in Europe is the Eiffel Tower Paris (984 ft.) The Palace of Soviets, Moscow will when completed be 1300 ft. high.

The longest bridge in the world is the bridge which connects San Francisco and Oakland (California). Its total length is 8¼ miles and it cost about £15,000,000.

The highest Cathedral spire in the world is Ulm (Germany) 540 ft. The highest in England is Salisbury Cathedral spire (405 ft.)

The longest wall in the world is the Great Wall of China (over 1,000 miles long) built in 214 B.C.

The largest palace in the world is the Vatican, the Pope's Residence near Rome.

The highest mountain in the world is Mt. Everest (India, 29,141 ft.) while the highest in Europe is Mt. Blanc (15,782 ft.)

The longest ship canal in the world is the Gota (Sweden, 115 miles.)

The largest public park in the world is the yellow-stone National Park. U S.A. (3,350 sq miles).

The greatest desert in the world is the Sahara-i-Azam, Africa (Area 3,000,000 sq. Miles).

The longest river in the world is the Mississippi-Missouri (N. America). 4,200 miles but the largest in volume is the Amazon (S. America).

The largest island in the world (Excluding Australia) is Greenland (827,000 sq. miles).

The longest railway tunnel is Simplon which connects Switzerland with Italy. It is about 12¼ miles long

The largest Continent is Asia (17¼ millions sq. miles or nearly one third of the land surface of the globe).

The largest enclosed sheet of water is the Caspian Sea (170,000 sq. miles). But the largest 'lake' is Lake Superior (N. America, 31,200 sq. miles).

The largest Ocean in the world is the Pacific Ocean (64,000,000 sq. miles).

The largest library in the world is in the British Museum, London (4,000,000 Vol.).

The largest bell in the world is the Tsar Kolokol (Moscow, 180 tons) but it has, never been rung. The largest in actual use is also in Moscow and weighs 128 tons.

The highest town in the world is La Paz (Bolivia) situated at the top of a mountain 11,800 ft. above sea-level.

The largest railway station in the world is Victoria (S. R. London, 25 Acres).

The longest railway platform in the world is Sonepur (B. and E.I.R. India, about 905 yards).

SAJJAD KHWAJA.

♤

Service

You can render real good service to your country in whatever station of life you may be. It is the man that counts and not the job. Spirit is more important than position.

sixth imam, Jafar-as-Sadiq of al-Madina, his teachers. Like his Egyptian and Greek fore-runners Jabir Ibn Hayyan acted on the assumption that base metals such as tin, lead, iron and copper could be transmuted into gold and silver by means of a mysterious substance, to the search for which he devoted his energies. He recognised the importance of experimentation more clearly than any other early al-chemist and made note-worthy advances in both theory and practice of chemistry. Some 200 years after his death, as a street was re-built in al Kufa, his laboratory was found and in it a mortar and a large piece of gold were unearthed. He discovered H_2SO_4 and HNO_3, CH_3COOH and aqua regia which is a mixture of Hcl and HNO_3. He wrote several works on chemistry. There are 22 works surviving that bear his name. Many of these works were translated into various European languages. Jabir also enjoyed the distinction of preparing lead carbonate and separating Arsenic and Antimony from their sulphides. He explained the preparation of steel, the polishing of metals, the dyeing of cloth and leather and the distillation of vinegar into CON. CH_3COOH. Other Muslim chemists discovered that Hg & S combined to form cinnabar. Ibn Musa and Jabir wrote original works on Spherical trigonometry. In Zoology Mohammad Damiri (1405 A.D.) wrote on the life of animals. Zakriya Qazvini has also given a fair description of animals, plants and stones. Khazini of Merv (1200) has in his valuable work entitled, the Balance of wisdom written on the specific wt. of alloys and the density of HO_2. Jazari (1206 A.D.) wrote an important work on the mechanics and manufacture of clocks. Rizvan has furnished a description of a water clock. Muslims are also credited with having invented wind mills, gun powder and compress.

NOOR AHMAD KHAN.

♤

Was it a Dream?

Mohan and I went to the college notice board. The latest notice invited applications from those desirous of proceeding to America and England for higher technical studies. What an opportunity of seeing the world and serving the motherland in the post-war reconstruction of her economic structure!

We both applied, and were required to appear for an interview. As luck would have it, I was selected and Mohan was rejected. What a pity! We who had been class-fellows and chums for several years had to part company. Mohan wished me bon voyage, and I sailed for the New World with a heart full of hopes and dreams.

We were a fairly large party of students from various parts of India, and life in the ship was generally enjoyable except for a certain amount of sea-sickness in the beginning. At New York we had to report ourselves at the office of the Indian Ambassador who had made all necessary arrangements for our admission to various technical institutions and for our board and lodging. We were chaperoned by officials of the Indian embassy, and started our studies in right earnest.

Everything was different in America—people, government, buildings, houses, shops, railroads, factories, schools, colleges, professors, universities—in fact everything. I saw 'sky-scrapers' with my own eyes, and travelled in aerial as well as underground railways The American life was full of bustle and hurry. There could not be any lazing about. One day while I was trying to cross a highway, cars came from different directions at a crashing speed, and one struck me down. I was taken to a hospital in unconscious condition. After some time, I regained consciousness. I opened my eyes and found myself .... wonder of wonders! in Rahim Shah ward.

PREM NATH KHERA.

London 1930). This book distinguishes mediastinitis from Pleurisy and recognises the contagion of Phthisis and the spreading of diseases by water and soil. It gives a scientific diagnosis of *ankylostomisis* and attributes it to an intestinal worm. Its materia medica considers some 760 drugs. From the 12th to the 17th century, this work served as the chief guide to the medical science in the west. In the words of Dr. Osler it has remained a medical Bible for a longer period than any other work.

The greatest *Philosophers* of the eastern Islamic world were Al-Kindi, al-Farabi and Ibn Sina. Al-Kindi was an astronomer, alchemist, optician and music theorist no less than 265 works are ascribed to him. Al-Farabi (Alfarabius) was the greatest Philosopher of Islam. His system of Philosophy was syncritism of Platonism, Aristotalianism and Sufism and won him the enviable title of the "2nd teacher" al-Muallim-i-Sani, the first being Aristotle. Besides a number of commentaries on Aristotle and other Greek Philosophers, Al-Farabi composed various Psychological, Political and metaphysical works. Al-Farabi is also described as a physician and mathematician, occult scientist and musician.

About 470 A.D. there came into being an interesting academy of *popular Philosophy* in Basra called the "Ikhwan-us-Safa". Its members edited about 52 journals dealing with maths., astronomy, geography, music, ethics and philosophy.

The scientific study of *Astronomy* was begun under the influence of an Indian work, the Sidhanta brought to Baghdad in 771 and translated into Arabic. The Greek influence, last in order of time, was first in importance. An early translation of Flimys' Al-megest was followed by two superior ones, one by Hajjaj Ibn Matar (827—829) and the other by Hunain revised by Sabit. A large number of observatories were built in various parts of the kingdom, the most important one being attached to the Bayt-ul-Hikma, Baghdad. Another was at Damascus. The equipment in those days consisted of quadrants, astralobs, dials and globes. Al-mamun's astronomers performed one of the most delicate geodectic operations; the measuring of the length of a terrestrial degree. The object was to measure the size and circumference of the earth. The measurement carried out on the plain of Sinjar, north of the Euphrates and also near Palmyra, yielded 56⅔ miles as the length of a degree, a remarkably accurate result, exceeding the real length by about 900 yards only at that place. The celebrated Astronomer and mathematician of the age Al-khwarizmi produced the tables which became the basis for other works in the East and the West. The other great astronomers and mathematicians were Ablattani, Albiruni and Umar Khayyam. *Albattani* was unquestionably the greatest astronomer of his time and one of the greatest in Islam. He made several amendments to Ptolemy and rectified his calculations for the orbit of the moon and certain planets. He proved the possibility of the annular ecclipses of the sun, the obliquity of the eliptic and the length of the tropical year and of the seasons and the true and mean orbit of the sun. *Al-Biruni* was born at Ghazna in 973 is considered the most original and profound thinker that Islam has produced in the domain of physical and mathematical science. He wrote an account of the whole science of astronomy called "Al-Qanun-i-Masudi". Omar Khayyam (1038—1123), the greatest mathematician and Astronomer Royal of the Saljuq Sultan Malik Shah was the director of the observatory at Neshapur and carried on researches regarding the accurate determination of the length of the year and produced the calendar named after his patron "al-Tarikh-ul-Jalali" which is more accurate than the Gregorian calendar. The latter leads to an error of one day in 3300 years, whereas al Khayyam's leads to an error of one day in 5000 years.

Besides materia medica, astronomy and mathematics, the Arabs made their greatest Scientific contribution to *chemistry*. In the study of chemistry and other physical sciences the Arabs introduced the objective experiment a decided improvement over the hazy speculations of the Greeks. Accurate in the observation of phenomena and diligent in the accumulation of facts, the Arabs nevertheless found it difficult to project proper hypothesis and draw truly scientific conclusions. The final elaboration of a system was the weakest point in their intellectual armour. The father of Arabic *alchemy* was Jabir Ibn Hayyan (Gebir) who flourished in Kufa about 776 A.D. His name is among the greatest in the field of medieval chemical science. Legend makes the Umayyad prince Khalid Ibn Yazid Ibn Muawiya and the

Ibn Sabit Ibn Qurra was ordered by Al-Muqtadir in 931 to examine all practising physicians and grant certificates only to those who could satisfy him. Only 860 such men passed the test and the others were stopped from practising. A *hospital* was opened by Haruen Ar-Rashid in Baghdad in the beginning of the 9th century and shortly afterwards the number of hospitals rose to 34. Cairo saw its first hospital in 872. Muslim hospitals had special wards for men and each had its own dispensary. Some were equipped with medical libraries and offered courses in medicine.

The most notable medical authors who followed the epoch of the great translators were Persian in nationality but Arab in Language: Al-Taberi, Ar-Razi, Ali Ibn-Abbas and Ibn-i Sina (Avecinna) Al Tabri was a native of Tabristan and became a Court Physician. Ar-Razi (850—923) born at Ray, not far from Teheran, was the greatest and most original of all the Muslim Physicians and one of the most prolific as an author. In selecting a new site for the great hospitals at Baghdad, of which he was the chief Physician he is said to have hung up shreds of meat in different places, choosing the spot where they showed the least signs of putrifaction. The 'Fihrist' lists one hundred and thirteen major and twenty eight minor works, by Ar-Razi, of which 12 deal with *alchemy* The "Kitab-ul-asiar" after having passed through many editorial hands was rendered into Latin by Gerard of Cremona and became one of the sources of chemical knowledge until it was superseded in the 14th century by Jabir's works. While still in Persia al-Razi wrote for Mansur ibn Ishaq of Sijistan a monumental work in ten volumes, named after his patron "Kitab-ul-Mansur" of which a Latin translation appeared in Milan in the eighrees of the fifteenth Century. Parts of it have been rendered into French and German. Of his monographs one of the best known is on measles in which we find the first clinical account of small pox. Translated into Latin in Venice 1565 and later into several modern languages. This treatise served to establish al-Razis reputation as one of the keenest original thinkers and greatest *clinicians* not only of Islam but of the middle ages His most important work was al-Hawi (the comprehensive book) first translated into Latin under the direction of Charles I of Anjou by the Sicilian Jewish Physician Faraj-bin-Salim in 1279. Under the title "continens" it was repeatedly printed from 1486 onwards, a fifth edition appearing in Venice in 1542. As the name indicates this book was meant to be *encyclopaedic* in its range of medical information. Printed when printing was in infancy, these *medical works* of al-Razi exercised for centuries a remarkable influence over the minds of the Latin West.

Ali Ibn Abbas wrote al-Kitab Ulmulki in which a portion is devoted to *dietetics* and materia medica. Among its original contributions on a conception of the capillary system and a proof that in parturition the child does not come out by itself, but is pushed out by the muscular contractions of the womb.

The most illustrious name in Arabic medical annals after Ar-Razi is that of *Ibn Sina* (98)—1037). In this Physician, Philosopher, Philologist and poet, Arab Science, reaches its climax. Born near Bukhara, he spent his life in eastern Muslim World and died in Hamadan As a youngman, he cured Nuh Ibn Mansur (976—97) and was permitted to make use of the ruler's remarkable library. Endowed with extra-ordinary powers of absorbing and retaining knowledge, this Muslim Persian Scholar was at the age of 21 capable of embarking on a career of writing and systematising the knowledge of the time. Al-Qifti lists 21 major and 24 minor works of Ibn Sina (others estimate the total at 99) dealing with philosophy, medicine, geometry, astronomy, theology, Philology and art. Among his scientific works, the leading two are "Kitab-ul-Shifa" a Philosophical encyclopaedia based upon the Aristotelian tradition and Muslim theology and "Al-Qanun Fil Tib" which represents the final codification of Greco-Arabic medical thought. Translated into Latin by Gerard of Cremona in the 12th century, this 'Canon' with it encyclopaedic contents, its systematic arrangement and philosophic plan, soon worked its way into a position of pre-eminence in the medical literature of the age, displacing the works of Galen, Ar-Razi and Al-Mujusi and becoming the text book for medical education in the schools of Europe. During the last 30 years of the 15th century, it passed through 15 Latin editions and one Hebrew. In recent years a partial translation into English was made. (O. Cameron Gruner, a treatise on the canon of medicine by Avicena,

Europe and before which the Christians stood helpless, considering it an act of God, the following passage in defence of the theory of infection :—To those who say "How can we admit the possibility of infection while the religious law denies it"? We reply that the existence of contagion is established by experience, investigation and evidence of the senses and trustworthy reports. These facts constitute a sound argument. The fact of infection becomes clear to the investigator who notices that he who establishes contact with the afflicted gets the disease, whereas he who is not in such contact remains safe and how transmission is effected through garments, vessels, etc" The greatest Arab *surgeon* was Ibn Abbas Zehrawi the court physician of Al Hakam II. His work introduces such new ideas as cautrization of wounds, crushing a stone inside the bladder and the necessity of vivisection and dissection. This surgical part was translated into Latin by Gerard of Cremona and various editions were published at Venice in 1497 at Basel in 1541 and at Oxford in 1778. It held its place for centuries as the manual of surgery in Salerno, Montpeilier and other early schools of medicine It contained illustrations of instruments which influenced other Arab authors and helped to lay the foundations of surgery in Europe. Al Zahrawi's rank in the art of surgery was paralleled by that of Ibn Zuhr (called Avenzoar) who was the most illustrious member of the greatest medical family of Spain. Of the 6 medical works written by him 3 are extant, the most valuable being Al Taseer-fil-mudawa-wat-tadbir written at the request of Ibn Rushd. In his Kulliyat, Ibn Rushd hails Ibn Zuhr as the greatest physician since Galen (Jalinus).

The Arab Spain produced *Philosophers* and scientists. A few of these, namely, Solomon bin Gabirol (Latin Avencebrol, a Jew) Ibn Bajjah, Ibn Rushd, Ibn Maymun and Ibn Arabi were intellectual giants of the period and it was through their efforts that the names of Aristotle, Plato, Socrates and other Greek philosophers became household words for the people of Spain and it was due to their works that the dark ages of Europe ended with the Dawn of Renaissance.

A large number of Scientists, Philosophers and physicians belonged to Egypt The chief centres of learning were Cairo and Alexandria. A reference may be made to one only, Ali Al Hassan (Latin Al-hazen) the principal Muslim Physicist and student of *optics*. No less than a hundred works on maths., astronomy, Philosophy and medicine are ascribed to Al-hazen. The chief work for which he is noted is that on *optics* Kitab-ul-Manazir which was translated by Gerard of Cremona. The works of Roger Bacon, Leonardo da Vinci and Johan Kepler bear traces of its influence. In his work Al Hazen opposes the theory of Euclid and Ptolemy that the eye sends out visual rays to the object of vision; and presents experiments for testing the angles of incidence and reflection. In certain experiments he approaches the theoretical discovery of magnifying lenses which was actually made in Italy 3 centuries later. There were some big libraries in Cairo, one of which is said to have contained 2[illegible]0,000 Vols. The great University of Al-Azhar which is considered to be one of the oldest homes of learning was built by Jawbar in A.D.972.

A word about the scientific and literary progress made under the Umayyad and Abbasid families. During the year 750—850 A D. which were the epoch of translation, many intellectual avenues were opened and the Arabs assimilated the ancient lore of Persia and the classical heritage of Greece, and adapted both to their own peculiar needs and ways of thinking, many of the translators were also contributors. Such was the case with Yuhanna and Hunain. The former failing to obtain human subjects for dissection, had recourse to apes. A book written on the *anatomy* and diseases of the eye has recently been published with an English translation as the earliest existing text of *ophthalmology*. The position of a Physician, who also used to be a philosopher was very respectable. The Nestorian Gabriel who was the Court physician of Ar-Rashid and Almamun is said to have amassed a fortune of 89 million dirhams. In the curative use of *drugs* some remarkable advances were made at this time by the Arabs. They were the first to establish apothecary shops, to found the earliest school of pharmacy and to produce the first pharmacopia. As early as the days of Maimun and Almustasam *pharmacists* had to pass an examination. Like druggists, physicians were also required to sumbit to a test. Following a case of malpractice in Baghdad Sinan

history of Science we have from the pen of Abul Qasim Saeed Ibn-i-Ahmad (1029—70) 'Tabaqat-ul-Umam' (classification of nations). Saeed held the office of qadi of Toledo and distinguished himself as historian, mathematician and astronomical observer. Ibn-i-Khaldun (1332—1406) who has been considered as one of the greatest historians presented for the first time a theory of historical development which takes due cognizance of the physical facts of climate and geography as well as the moral and spiritual forces at work. As one who endeavored to find and formulate laws of national progress and decay, Ibn Khaldun may be considered, the discoverer of the true scope and nature of history or at least the real founder of the Science of Sociology. No Arab or European writer had ever taken a view of history so comprehensive and philosophic. By the concensus of all critical opinion, Ibn Khaldun was the greatest historical philosopher of Islam and one of the greatest of all times.

The best known *Geographer* of the 11th century was Al Bakri, but the most brilliant geographical author of the 12th century, indeed of all medieval time was Al Idrisi, a descendant of the royal Spanish Arab family who received his education in Spain and flourished in Sicily during the reign of Roger II and under his patronage. His Rogerian treatise Kitab-i-Ruja not only sums up the works of Ptolemy and Masudi but is based on reports of scholars specially sent to other lands to collect data. In his critical collection Al-Idrisi shows a remarkable breadth of view and a grasp of such essential facts as the sphericity of earth. Besides this monumental work Al-Idrisi constructed for his Norman patron a celestial sphere and disc shaped map of the world, both in silver.

In Spain *Astronomical* studies were cultivated assiduously after the middle of the 10th century and were regarded with special favour by rulers of Cardova. The leading Muslim astronomical works were translated in Spain and Alphonsine tables compiled in the 13th century were nothing but a development f Arab astronomy, Outstanding among the early Hispano-Arab astronomers were Al Majriti of Cordova, Al Zarqali of Toledo and Ibn Aflah of Seville.

In the field of natural history especially *botany*, pure and applied, and in that of Astronomy and mathematics, the Wesrern Muslims enriched the world by their researches. They made correct observations on sexual difference between such plants as palms and hemps. They classified plants into those that grow from cuttings, those that grow from seeds and those that grow spontaneously. The Cordova Physician Al Ghafiqi collected plants in Spain and Africa, gave the name of each in Arabic, Latin and Berber and described them in a way that may be considered the most precise in Arabic. Towards the end of the 12th century there flourished at Seville Abu Zakria Yahya Ibn Awwam whose treatise on agriculture 'Alfilaha' is not only the most important Islamic, but the outstanding medieval work on the subject. This book treats of 585 plants and explains the cultivation of more than 50 fruit trees. It presents new observations on grafting and the properties of soil and manures and discusses the syptoms of several diseases of trees and vines and suggests remedies. The best known botanist and pharmasist of Spain Ibn Al Batyar, a worthy successor of Dioscorides, travelled in Spain and throughout North Africa and was appointed the chief herbalist by Al Kamil in Cairo. From Egypt he made extensive trips into Syria and Asia minor. He died in 1248 in Damascus leaving two celebrated works. One of these works is on Materia Medica and is a collection of simple remedies from animal, vegetable and mineral worlds. This book was printed as late as 1758 at Cremona.

All the great Arab philosophers and scientists, *e.g.*, Ibn Rushd, Ibn Maymun, Ibn Bajjah, and Ibn Tufail were also physicians. Ibn Khitab writes in connection with the Black Death which in the middle of the 14th century was ravaging

From then on, a new era opened in the literary and scientific history of Islam. There was started an enthusiastic cultivation of the sciences, among which medicine and Philsophy occupied a prominent place. The division of the Empire of Islam into separate regions did not materially interfere with intellectual intercourse between the Muslim of the East and the West. From the ninth to the twelfth century, the Arabic West raised the dignity of learning in Europe and many works were written, mainly at Cordova, by Christians, Jews and Muslims. The period between 912 and 976 *i.e.* during the reign of Abdur Rehman III and Caliph Al Hakam II was the golden age in Muslim Spain, which enjoyed a position analogous to that of Greece in the Old world. At this time Cordova, Granada, Toledo and Seville were the chief seats of learning in Western Europe and it is due to the Omayyad Caliphs that sciences were preserved from extinction in Europe. A large number of Philosophers, Scientists and Physicians appeared in the following century, the first being Ibn Gabril or Avichron. A century later Ibn Bayya or Avempace wrote a commentary on the Physical treatises of Aristotle. They were followed by Ibn Rushd or Averroes and Abdul Kasis known as Albucasis. These two scientists exercised a great influence over scholastic medieval Europe of Roger Bacon (1214—94) Guy de Chauliac (1300—1368) and many other Arabists.

Al Hakam founded a University in Cordova which rose to be a place of pre-eminence among the educational institutions of the world. It preceded both the Al-Azhar of Cairo, and the Nizamiya of Bagdad and attracted students, Christian as well as Muslim, not only from Spain, but from other parts of Europe, Africa, and Asia also. Al Hakam invited professors from the East and made endowments for their salaries. In addition to the University, the capital housed the largest library of the time. His agents ransacked the bookshops of Alexandria, Damascus and Bagdad. The books thus gathered are said to have numbered 400,000 volumes, filling a catalogue of forty-four volumes. The general state of culture in Spain reached such a high level that the distinguished Dutch Scholar Dozy went so far as to declare enthusiastically that in Spain every one could read and write. All this, whilst in Christian Europe only the rudiments of learning were known, and that by few, mostly clergy.

Hitli writes in the history of the Arabs that the Muslim Spain wrote one of the brightest chapters in the intellectual history of Medieval Europe. Between the middle of the 8th and the beginning of the thirteenth centuries, the Arabic speaking people were the main bearers of the torch of culture and civilization throughout the world. Moreover they were the medium through which ancient science and philosophy were recovered, supplemented and transmitted in such a way as to make possible the renaissance of Western Europe. In all this, Arabic Spain had a large share.

The great accumulation of books in Andalusia would not have been possible but for the local manufacture of writing-paper, one of the most beneficial contributions of Islam to Europe. Without paper, printing from moveable type which was invented in Germany about the middle of the fifteenth century would not have been successful and without paper and printing, popular education in Europe, on the scale to which it developed would not have been feasible. The English word ' ream ' is a derivative of the Arabic word rizmah, meaning a bundle. After Spain this art was established in Italy presumably from Sicily which was also a centre of Muslim culture and from Italy and Spain it spread to France. A secretary of Abdur Rehman used to write the official communications in his home and send them to a special office for reproduction, a form of printing (tab') whence copies were distributed to various offices. In ***histriography*** Andalusia produced great men like Abu Bakr Ibn Umar, and Abu Marwan Hayyan-ibn-Khalaf who wrote 50 books, one of which Almatin comprised 60 volumes. In the

On those broad roads leading to the heart of Germany we were actually 'flying' on the ground. At a lonely place we were once held up by the points of half-a-dozen pistols. The 'Robbinhood' of the gang coming up to me said, "Sorry gentlemen, we mistook you for members of the I. P.; but you can go now." But what should we suppose you to be, my friends," asked, Makeyoulaugh. "Oh! we belong to the underground Germany," was the reply from Little John.

Berlin presented a miserable sight. In fact it had been turned into a waste land by Allies' non-stop bombing. Men of the I. P. were found everywhere. They had full powers to destroy the underground movement. Talking to a German Makeyoulaugh said, "Didn't your Fuehrer know that he who rides the tiger may, find it difficult to dismount."

S. C. S.

Arab contribution to the Advancement of Science

Islam started as a missionary religion and its first loyal adherents were mostly relatives of the Prophet, who were convinced of the truth of his message and the sincerity of his purpose, and members of the humble stratum of society as Islam preached equality among human beings and kindness towards slaves, orphans, widows, etc Though the Prophet abhorred war, yet circumstances arose which forced him and his successors to take up arms. These wars were undertaken during his own life time in defence of religion, and during the Caliphate of Abu Bakr, Umar, Usman and Ali led to the expansion of territory and subjugation of races some of whom were more cultured and advanced in sciences than the conquerors themselves. This necessitated a serious effort to surpass the subject races intellectually and created a zeal and appetite in the minds of the Arabs which resulted in changing the whole outlook of human race and brought into being a civilization which was typical of the people and of the period and is now known as Arab civilization.

During the Caliphate of Umar, a number of learned men were appointed to preach and lecture in the mosques of Basra, Kufa and Damascus. Thus the mosques became the centres of culture and education. An all-round expansion of education marked the Umayyid period and the Muslims began the study of Philosophy, Astronomy and other allied sciences. A strong impetus was given to learning during the Abbasid period which is regarded as the Golden Period of Muslim history.

Under the Caliph Walid who ruled from 705 to 715, Islam resumed its campaigns of conquest, and its forces overran the Mediterranean coastal countries, conquered Sicily and poured into Spain. Their further advance was checked at Tours (France) by Charles Martel (732) The Muslims who invaded Spain were mainly Syrians and the main body of these Saracens settled on the site of Illiberis which they named Gharnata or Granada which developed during the Middle Ages into the wealthiest and most splendid city in Europe. Many cities of Spain became centres of civilization and learning and their Colleges and Universities became the resort of lovers of learning from all parts of Europe.

could it be resorted to by a broken-hearted man like me especially when I remembered that I had given a promise to my darling that I would give up this practice for good before she consented to marry me.

Our guide book showed that there was a lake, with abundant fish, and a hunting place closeby, at a distance of about fifty miles from where we were. But misfortunes never come singly. Our fuel indicator indicated that this adventure was inadvisable.

It was getting dark and a car stopped near our camp due to engine-trouble. Friend Engineer and I rushed to the spot and there we found a Greeko-Turk merchant with his wife and a young daughter still in her 'teens and looking like a fairy damsel. Engineer jumped over the mudguard and lifted up the hood.

We were now in a palatial residence among the aristocracy of Ankara. After the dinner the damsel was at her best as she entertained us, by playing at the piano.

After receiving our money and new passports we bade good-bye to Ankara — the pride of modern Turkey. And of course Makeyoulaugh felt very sorry at having to leave that palatial residence along with that lovely flower of beauty.

The sea of Marmora glittered around us. We steered towards the port in order to arrange our passage. The next day a steamer landed us on the European soil. We moved on and after showing our papers to a Bulgarian customs officer we were now in a European country. We reached Sofia at midnight and parked in its suburbs. Early in the morning Jimmy alarmed us with a low snarl. On getting up we found some eyes looking curiously around our van. Fortunately a bald Greek could speak English as he had served in the Partisan Army under British officers. He was of a gipsy type and did not hesitate to occupy the fifth seat which was reserved for local guides. He was well-informed and proved invaluable. He was of still greater use to Historian as he could talk about history and politics. But his utility ended with the limits of the Balkan States.

We found Yugoslavia in the most ravaged condition. This was because of her resistance towards the Nazis who had in return sacked her. In Austria we received special instructions from the International Police, not to drive except on the roads shown in green on the map, as all other roads were still mined. The Nazis had apparently fortified their country very skilfully.

While in Vienna we obtained special permission for visiting the surgicla centre. Here we saw numerous "things" wrapped in cotton wool and the matron told us that they had also been like us. Most of these 'things' had lost their human features and many could neither speak, hear, eat, move, weep laugh or see. Food was injected into them Historian looked incredulous and asked the matron to which nation those people belonged. She replied that when they had been brought for the first time, many had absolutely no signs to show their nationality and this was the reason why their expenses were being borne by 'Geneva'.

In Prague we wanted to purchase a new truck, as our present one was badly broken. We had often heard the fame of Skoda Factory and so we straight-away went there. Here we purchased a seven seater jet-propelled vehicle of '47 model which was provided with many luxurious items, such as air conditioned body, an improved wireless receiver along with television apparatus, giving radio controlled information of approaching vehicles round the corners.

Good" ot *Food alone*. but by a Common Good inspired by some *higher or spiritual values*, through the inspiration of which I become all the richer. In other words. Food and wealth must be considered not as the sole value by me but something inferior to yet other values higher than it, for the sake of which alone my sacrifice of wealth would be possible and conceivable. Such higher or spiritual values must be *Religion* and its consequent "*Perfection of man*" that it seeks, must be "*Gods' pleasure*" and "*morality*" — a notion, that man is an *end in itself* and that he should never be treated as *means* for our exploitation or aggrandisement neither as means within the state by the *Capitalists*, nor as means within the world by the *Imperialists*. On such lines alone, a "giving to others" and a 'transition from my Good to thine Good" is possible and conceivable. In a word, in the name of God and morality alone should the state train or educate the people and ask for their voluntary or willing support to serve the Common Good. This and this alone would be an Ideal Institution—call it Islam or anything—in any case it is not a socialism in any form, least of all the much-trumpeted and oft-admired socialism of Russia.

MUHAMMAD IHSANULLAH KHAN.

On the way to Berlin

"Cease fire"! had been sounded. Lights were no longer dimmed. Khakis were giving place to Muftis. Buildings were rising on their old foundations. Long-parted lovers were once again in each other's arms.

I was sitting at the steering wheel of my touring van. To my left was Historian; in the rear was Makeyoulaugh—a jack in many of the European and Oriental languages—and on his right was Engineer while at their feet lay our favourite Jimmy, the pet dog.

We bade good-bye to Mother India at Duzdap. The roads in Iran were unexpectedly good, yet our engine was a bit furious at steep gradients and sharp bends.

After a short stay at Teheran we drove on to the west. Our car was much happier now and at some places the speedometer indicated 55. It was, however, a bit furious when we climbed the Armenian highland and entered Asia Minor.

Ankara presented unmistakable signs of the prosperity of the Turks. We encamped here to regain our lost energy. But naughty Jimmy, unaffected by all this toil, soon began to make love to a Turkish pet. That was perhaps his way of relaxation We then went to the British Legation to get our money and our letters. if any. But here I was greatly shocked to learn that my wife had died of heart-failure on receiving the false news of my death. It was an irreparable loss to me. I got out my revolver and emptied it into my chest, but...... Makeyoulaugh had cleverly replaced the live bullets, as he had heard this sad news just awhile before me. His efforts helped me to overcome the shock and to think calmly. The next thought in my mind was of my little baby and his future.

Another tragedy was in store for us. Our purses were at the verge of exhaustion and our money had not yet been received by the Legation. We, however, left the hotel, acting on the golden rule of cutting one's coat according to one's cloth. We got out of the town and encamped at a suitable spot. After five days of waiting when all our existing resources had been finished we called on Makeyoulaugh to make use of his wit. But he simply suggested that Alround should bring his gangsterism into practice. But how

From what we have stated, we do not really mean that the state has no right to interfere with the affairs of the Individuals and that the individuals must be entirely left to themselves, so that even the very being of the state should not exist. Rather, what we really mean, is, that the individuals, before all, must be given " a fair chance " to settle their own affairs themseles, but if they fail to avail the opportunity, the state has then every right to intervene and thus show that what they willingly and voluntarily did not realize, the state will do for them by force. In that case the fault would be their *own* and they will at least have no cause to grumble against the state for so intervening; rather, they will have had precisely the " chance " or " condition" to unfold and develop their moral conciousness, if they so desire. And such a chance or condition can be granted by no other way than to allow them their earnings for themselves and call their property their own. "*Private Property*", therefore, must be retained if there is to be any mutual " *giving*" or "*helping*" as between Individuals, in which case alone they can be truly moral to that extent.

But if yet they deny the needufl help to each other and simply refuse to be moral, rather even go to the opposite extreme and become positively immoral through exploiting each other and through becoming capitalists, ultimately, the state should then impose all necessary checks on them in the form of Taxation progressive taxation, supertaxation and these should be rigorously enforced to stop all such vices;—better still, the people should be so educated, trained, convinced and made to realize, that what the state is really doing is all for the benefit of "*common good*" and that therefore they should *willingly and voluntarily* hand over their surplus to the state for the purpose. In that case *two* Ends would be served: both "*capitalism*" and its consequent '*exploitation and poverty*' would be exterminated, as also a "*moral life*" of the Individuals would be maintained, inspite of the mediation of the state.

Strictly speaking, even the unqualified " *Common Good*" cannot be a proper end for a voluntary giving of the wealth to the state, so long as wealth is considered to be the *sole* value, as socialism would have us to conceive by implications. Because in this case two difficulties would arise, both of which cannot be readily surmounted. Either in this " Common Good " which the state represents, I am an actual '*shareholder* " or " *otherwise*". If the former, then my act of " giving ' is really motivated by my *own* ultimate benefit, which clearly is a case of Egoism or selfishness, in which morality has no share. Hence again we are resolved to the old position; we might all be well-fed or thoroughly stuffed to the ribs all-right and yet we are not moral human beings at the same time. If the latter, and I am not a shareholder in this " Common Good" and my contribution to the state is not prompted by my own ultimate gain, then though it is a clear case of selflessness, yet we know not if it is really possible or conceivable to *combine* this selflessness with the notion of wealth being the only and the sole value. For how can I be " selfless " or " part-with ", for the sake of others, precisely *that* what I consider to be the only and the sole Good After all, it is in the nature of wealth particularly when it is conceived as the sole Good, that I should retain it all for myself, indeed, even have the wealth of others unto myself, if possible. More, it is in the nature of the wealth or material value that in the sharing thereof with others I become poorer myself. If I have a material value, say, ten rupees and share five with others, then though I have enrinched others, yet I am definitely a loser by half of it Contrasted with this, if I have a spiritual value, say a certain notion of God or a piece of knowledge, e g. $2\times2=4$, and impart that to others then in so doing I have not only enriched others, but likewise remained not poorer myself, nay, even become richer than before. What then should be my compensation for the loss of five rupees, if I am to share it with others? By what method can I then part—with the sum, so that in the same act I may enrich others, without becoming poorer myself? *Not* by the " common Good " in its *nakedness*, *not* by the " Common

state and the "self" has nothing of its own to sacrifice for the sake of others; and when there is *no* sacrifice and *no* giving to others, there is no morality and no virtue to that extent.

Strictly speaking, at the bottom of all these difficulties is 'Hegels' or Hegeleans' erroneous conception of the *Identity of the "actual" with the "Ideal" and of the category of "Being" with that of the "Thought"* inspired by a Christian "*Identity of God and Man.* The "Ideal" which is only a "regulative principle" and simply "subsists", is converted into a "constitutive principle" and is said actually to "exist". This ideal, for socialism, is the "state" which is actual and is an existent fact. Evidently, all is morality, if it is simply in conformity with the commands of the state:—no matter, whether voluntarily so or involuntarily. But the "Being" is *not* "Thought" the 'existent" is *not* "subsistence", the constitutive principle" is *not* a "regulative one", the "man" is *not* "God", the "actual" is *not* "Ideal" and the "ideal" is *not* the state which is actual. Indeed, the gulf between the "actual" and the "Ideal," must be kept in mind, if there is to be any yearning" for the "Ideal, at the instance of a dissatisfaction with the actual. The distinction between you and me and the conflict between your interest and my interest must be conceived to be a stubborn fact, if there is to be any "*aspiration*" to overcome the same, at the instance of a dissatisfaction keenly felt on that account. Once the above distinctions between the conflicting notions are obliterated, there will be no progress, no yearning no aspiration for betterment and hence no morality:—all would be a state of moral "solipsism" or moral "scepticism".

(iii) Lastly, even the task of "*Happiness*" as a result of the removal of poverty likewise should be left to the Individuals *themselves* and not to the state, to provide to each other, if they are to be moral. We doubt, the state has every claim to credit in so providing "Happiness" to all, but the irony is that it is precisely in this credit that it has its discredit. For ultimately it is the "*Individuals*", the "*Persons*", and not the "state", the "Impersonal", which are really moral Where the state is moral, it is not so by its own right, but by the morality of the Individuals within its fold. The morality of the state really consists in the morality of the people and not in itself. Thus it should be the individuals *themselves*, and not the state, to provide "Happiness" to one another, if they are really to be moral. For when Happiness is provided by the state, only *one* end is served, *Happiness and Happiness alone*:—all would be animals but not moral human beings. But when it is left to the individual himself to provide, not only is the "*Happiness of others*" attained, but also the individual *himself is "reformed" and "perfected"* by the same act, hence the *sumum Bonum* " and the combination "of *Happiness of others*" together with my "*own perfection*" which two are the only true ends of morality.

To sum up, at the bottom of all the difficulties of "socialism" is yet another erroneous conception, namely, that if the task of Happiness and well-being of men were left to the Individuals themselves, they would *never and nowhere* fulfil it. For they are *essentially* vicious and the society of men in substance is really a "Kingdom of Satans", where all would run at each others' throat, if left to themselves. But this is a wrong position, for men are *not* essentially vicious, but are only *casually* so. Sometimes they are vicious and sometimes they are not; sometimes they might well be moral and inclined to help each other and sometimes they may not be so. And it is for this that a state should leave the room open and create a necessary condition thereof. But even assuming that the individuals are really vicious and that a society of men is *essentially and necessarily* a Kingdom of Satans" one and all, then socialism at least has no moral rightly to think of *feeding* such Satans and worry about their *well-being*

this or that type of a state. Thus the state is really my own creation and my own voice rebounded and recoiled on me. Hence any imposition that it makes on me. is really my *own* or *self*-imposition and is therefore autonomous and *voluntary*. But this is a wrong position acceptable neither to the "*State*" nor to the "*self*". For when I have voted for this or that kind of state, the possibility is yet there that I might subsequently "differ" with its conduct and policy, and raise a voice against it —against my original v te.

That I can *differ* with its conduct and raise a voice against it, clearly shows that now do I *disown* it—disown my original voice and, consider it no longer my own. Hence I am something *other than* the state and am free in all my subsequent acts, inspite of my so-called identity with it through my original free vote. Further, the same "difference", when it takes the form of overt act or opposition on my part, is also "resen ed and punished" by the state; and since it is "resented and punished", even the "*state*" itself is not prepared to accept that after all the state is my own reflection and it is open to me to change it as I deem fit In a word the st te is something other than myself and so is a socialistic state. Evidently, its "taki g" is only an imposition f om without and not a *self*-imposition or a *voluntary* "giving" on my part. But even assuming for the sake of argument, that the state is the people themselves and identical with you and me, the case would be no better either. For, in that case, all my later acts, through this identity, would *necessarily and compulsorily* indeed, *mechanically and habitually*, follow my original act, the state, no matter, whether I subsequently agree or disagree with it. But morality is not mechani al or habitual acts performed necessarily and compulsorily but is a *series of free acts* ever and ever *a-new*. Moreover if the "I" and the "State" are identical, then the "General Good", which the State represents, would be *identical* with "my own good", which I represent. Obviously, any "giving" that I might do at the bidding of the state for the sake of the general good would really be a "giving" unto my "*own self*" and for my *own ultimate benefit* and not a giving to "*others*" and for *their benefit*. This would be a clear case of "Egoism" and "selfishness" which is the reverse of morality.

Further, we are inclined to go to the length of maintai ing that even a "*voluntary* living", if giving there is any, wouldn't make an action of the Individual moral, in a socialistic state. For what is so given, is not really his *own* property but that of the *state* simply *returned* to the state; and in simply returning or giving the property of others back to the owner, there is no "*charity*", no "*morality*". The entire order must be reversed, if the act of the individual is t be moral The property, to start with, must belong to the Individual and then, whether he voluntarily gives it to others directly himself or indirectly hrough th agency of the state, in either case his act remains moral. In a word, it men a e to be moral, the task of "giving" must really be left to the Individuals *themselves* to pe form and not to the State to do it for them. It must orig nate from *within me and be autonomous* and *voluntary*, and not from without an be hetonomous and involuntary.

(i) The "*levelling-down*" of all distinction between the rich and the poor and the socalled "*justice*" as a result of it, too, is no credit of a *socialistic* state. That too, like all "giving", has its origin from without and is simply superimposed on us by the state. That too must be accomplished by the Individuals *themselves*, if their acts are to be moral or if they are to have any claim to the credit thereof.

(ii) Likewise is the case with the spirit of "*self-sacrifice*" and *selflessness*" in us as a result of the identity between me and Thou or Mine and Thine. That also is really of external origin and not from within me or of internal origin. That too must be *self*-initiated or *self* cultivated, if I am to be moral through it. Indeed, the very notion itself of "self-sacritice" is an impossibility in a socialistic state, for all property essentially belongs to the

all distinctions between Mine and Thine would be wiped out. There would be no Mine over against Thine, no preference unto myself over against *you*—no mine, hence nothing for myself and hence no Capitalism. "Thou" and "Thine" would be as dear to me as "Me" and "Mine" and the result would be that a most glaring state of "*selflessness*" "*self-sacrifice*" *and* "*disinterestedness*" would be the prevailing spirit.

(3) Evidently, then, if Socialism stands for the total elimination of private poverty or seeks "justice", "hapiness" and "well-being" of the people or reaches a state of clear "selfless" and "self-sacrificing" spirit of the individuals, it certainly represents a most thorough-going moral order conceivable. Our objection of the denial of morality to it has then no sense in face of the achievements so noble and formidable !

With all that, however, we hold that a socialistic state is a *non-moral* institution to a considerable extent Because, we believe that a state is just and moral only so long as it creates favourable conditions for the preservation and promotion of all human Values like (*a*) *Religion*, (*b*) *Education*, (*c*) *Morality* and (*d*) *Food-Problem* or "*Happiness*". All these together form a "*system*" and none should be torn asunder from the rest. Because each one, by itself and to the exclusion and sacrifice of others, would be both *incomplete* and *defective*. And it is in the light of this thought that we maintain that Socialism is not upto the standard.

(a) Its attitude towards "*Religion*" *and* "*God*" is hostile and inimical or at least indifferent.

(b) Regarding "*Education*", it encourages and promotes it, no doubt, yet instead of combining it with all human values and subordinating it to higher ones among them, it brings it into the service of, the *lowest* of all of them, namely, the "Food-Problem" and "Happiness' alone. This is clear from the materialistic tendency of a modern Europe which makes use of Education in the direction of *Food-seeking* alone, no matter, however *wrongly*. Hence, the *Conflict* between the "haves" and the "have-nots" and the present War and its conflagration and carnage. All laws of all sciences of all ages are working for the wholesale devastation and destruction of whatever humanity has achieved in thousands of years. And it is of this materialistic tendency of Europe, where Education has no moral or spiritual background—that socialistic Russia is the most crystallised product. In any case it is not the Product of Asia, the birth place of religions, and prophets, inspite of Hitlers' derogatory, though really complementry, assertion to the contrary.

(c) In matters of "*Morality*", its conduct is such that the very "*condition*" of a greater portion of morality it usurps to itself, thus leaving no room for the moral life of the Individuals within its fold.

(d) Regarding "*Food problem*" and its consequent "*prosperity*", no doubt, it is its sole end; and there is hardly any institution in the world which can be more enthusiastic about it than socialism. But the difficulty is that the Solution of Food Problem is not reconciled with morality and a human Happiness not combined with *human Perfection*. For what is really "given" by the Individual to the state for the benefit of others, is not so much a "giving", as it is really a "*taking*" from the individual by the state. In other words, all is "*compulsion*" and there is no "*Voluntary*" action on the part of the individuals. But morality of an action really consists in a voluntary surrendering of things and not in a forced giving, for the benefit of others.

But to all this one might object that after all the state is not something *other than* myself, of which the imposition should be *hetronomous* and involve *compulsion*. No, it is really me and my own free vote to this or that type of a person that constitutes

do a virtuous act (alms-giving, for instance) for the goodness contained in it and not for the sake of the consequences (reputation, etc.) that may result from it. But why, again, should after all almsgiving be considered a virtuous deed and not otherwise? Why and on what grounds should virtuous deed be virtue and a moral law something moral. In other words, what is the ultimate *End or Purpose* of virtuous deeds and moral laws; what actually is to be achieved, if a deed or law is to be moral? That thing is the "*Sumum Bonum*", the "*Supreme Good*", consisting of human "*Perfection*" and human "*Happiness*" combined into a harmonious whole. Thus a deed is virtue, if it promotes the "Happiness" of man, as also seeks his "Perfection". And it is ultimately to these ends and not to any fear or reward, that our motives must be directed, if our actions are to be moral. But whose Perfection and whose Happiness from among the human beings, should be the end of my action, if my action is to have any moral Value mine or yours? Not *my* Happiness, because in so doing my action would be selfish and egoistic, which is quite the reverse of Morality, and not *your* Perfection, because it is not in my power to make you Perfect. Perfection is a thing which every man is to achieve for himself, for it ultimately depends upon his motives, which are subjective and confined only to himself and thus beyond my control to rectify or purify. Hence it sould be "*your*" Happiness and "*my*" Perfection that should be the end of morality. Further, it should be clearly kept in mind that the two ends are not mutually exclusive; rather, they are interrelated and affect each other and form a unity. For when I am seeking "My Perfection" in living a life of "Sincerity" and "truthfulness", for instance, then I am also deriving "*Happiness*" as a result of it. Similarly, when I am sacrificing my own interests and thereby seeking "Your Happiness" and promoting "Your welfare", then in the same act I am also reforming *myself* and becoming *Perfect*. In a word, the two ends cannot be torn asunder, for in so doing there will be no "Sumum Bonum" and hence no morality.

(2) "*Socialism*" is simply an economic institution taking finally the form of a state—a Political institution. Its sole end is the physical or economic well-being of man or, in other words, a total extermination of poverty from all classes of people. At the basis of poverty, exploitation and sorrows of humanity, it rightly assumes, is the institution of "*Capitalism*" within the state and of "*Imperialism*" within the world. These must be rooted out, if poverty and consequent sufferings are to disappear for all time. But how? At the basis of these, again, Socialism further assumes, is yet another cursed institution, the institution of "*Private Property*". This is the sole cause of Capitalism, as also of Imperialism. For if 'Private Property' is allowed and every one is to retain his own earnings for himself, then of necessity there will arise individuals from time to time who, by sheer dint of their ability, labour, tact, prudence, cunning or what not, would earn more than the rest and become Capitalists, and ultimately resort to the exploitation of others with a view to become still bigger Capitalists. Thus capitalism and the consequent injustice and unequal distribution of wealth shall result again and again from the institution of Private Property. This too must be nipped in the bud, if justice, fair distribution of wealth, happiness and prosperity, are to be the order of the world. Thus not the Individuals but the *State* should be the sole owner of entire property. All property i.e. all "Land" and "heavy and light Industries", indeed, all "Producers' goods must belong to the State; and what should ultimately be left to the Individuals should be simply the "Consumers' goods," of which the life ceases in the very use thereof and which are virtually no goods, no wealth, for economic purposes In other words, nothing should belong to the Individuals; rather, they should entrust their all, whatever it may be, great or small, to the state; and then the state should distribute it equally among all, thus bringing about complete 'Justice", in which case every one would be equally well-provided and there would be no distinction between the rich and the poor. All inequalities would thus be "*levelled down*" and

What Happened Next

I think it was Mark Twain who once pointed out the fact that most of the famous anecdotes and stories stopped too soon and ought to have been carried on to show what happened next. It was either Mark Twain or G.B S. or somebody. At any rate the idea is a good one. (Here, for example are one or two very familiar applications of it to the famous stories of the ancient world).

Androcles and the Lion.

" A poor Christian named Androcles, once found a sick lion in the jungle with a great thorn in its paw. Moved by compassion Androcles removed the thorn, tended the lion, and restored it to health. Later on the two again met This time it was in the arena of the great amphitheatre at Rome—a great gladiatorial combat. The lion had been captured and sent to Rome, and Androcles, himself also captured into slavery, was thrown into the arena to be devoured by the lion. But to the suprise of the vast populace which crowded the arena, the lion, instead of leaping upon Androcles to devour him, came up to him, and licked his hands with evident affection." Well ; the story in the books ends here but the sequel.

"There followed a few moments of painful suspense and disappointment. After that the ring-master called out "Hei, fetch another lion."

Archimedes and his "Eureka".

" One day Archimedes, the famous mathematician of ancient Syracuse, was lying in his bath and was thinking of a profound problem in mathematical physics. He wished to find a way of testing whether a crown supposed to be made of pure gold did or did'nt contain alloy. And he wanted to find it out without melting or defacing the crown. All of a sudden the solution of the problem occurred to him, and the philosopher in great excitement leaped out of his bath and rushed down the street, shouting 'Eureka!', 'Eureka'!, 'I have found it."

Such is the story. But to make it complete, a sequel should be added, thus :—

" The ancient world, however, had its own notions of morality and public decency. Archimedes was immediately arrested by the police of Syracuse and heavily fined for 'exhibitionism'."

ANAND PARKASH

♤

Socialism and Morality

We hold that Socialism is a *non-moral* (not immoral) Institution in contradistinction to Islam which is through and through moral. This calls forth a very pertinent criticism, namely, how of all states precisely socialism which stands for a just and equitable distribution of wealth among people, and for the removal of distinction between the rich and the poor, and for a thorough eradication of poverty from all classes of people, could be justifiabely called a non-moral institution ? Before attempting to answer this objection, it appears to be necessary to exp'ain (i) what is *morality* (ii) what is *Socialism* and (iii) what is the *relation* of Socialism to Morality i.e. how far socialism is or is not a moral institution.

(1) "Morality" deals with the goodness or badness of human conduct and seeks to know what is the criterion thereof. The criterion of good or bad conduct ultimately depends upon *motive* (niyyat) and motive alone and nothing besides motive. But what should be our motive, if our actions are to be good ? It should be to

of magic and reality, of sweet day-dreams and shivering awakenings, of delicate poetry and brutal horse-play. It is a world in which all the senses feast riotously, upon sights and sounds and perfumes; upon fruits and flowers and jewels; upon wines and stuffs and sweets. It is a world of heroic amorous encounters, in which men are strong and women generous Romance lurks behind every shuttered window; every veiled glance begets an intrigue; and in every servant's hand nestles a scented note granting a speedy rendezvous. It is a world in which any bypath, and often the broad highway leads straight to unexpected, unpredictable adventure; in which fate plays battledore and shuttlecock with men and women of high and low estate; in which no aspiration is so mad as to be unrealizable, and no day proof of what the next day may be. A world in which apes may rival men, and a butcher win the hand of a king's daughter; a world in which palaces are made of diamonds, and thrones cut from single rubies It is a world in which all the distressingly ineluctable rules of daily living are gloriously suspended; from which individual responsibility is delightfully absent. It is the world of a legendary Damascus, a legendary Cairo, and a legendary Istambul, the world in which a legendary *Harun ur Rashid* walks the streets of a lengendary Baghdad. In short, it is the world of eternal fairy-tale-and there is no resisting its enchantment.

AHMAD ALI AI IQ.

*Over the Western Front

You may have discovered where I went on March 21. I was away from London till the 24th the most thrilling day of my life: I flew with the airborne army to the dropping zone in front of Montgomery's armies across the Rhine in Germany.

The assignment came suddenly and I did not like refusing it. So off I went to an air station somewhere in England. We were sealed like the rest of the army and airforce personnel involved. No one was allowed out of the camps. Telephones, telegrams and letters were stopped. We lazed around, making friends with the crews, with whom we had to fly.

At last on the 24th came the H. hour. We got up at 3 A.M., finished breakfast at 4-30 and after the final briefing were in the aircraft by 5-30. At the break of dawn we took off, each plane towing a glider. There were so many planes in this station alone, that it took an hour forming up in the air. Thereafter we headed for France, and streams of tugs and gliders from other U.K. stations joined in to make the air caravan bigger and bigger. American planes joined us over France and Belgium and then came hundreds of fighters to give us cover. Across the Rhine, there were so many allied planes that the Germans were swamped. The Germans did fire a few ack-ack rounds, but then they, almost helpless, chose to be silent. Near my plane, there was no fire at all, and I did not see a single Luftwaffe plane anywhere in the distance. Indeed, I was not at all scared. The great mass of allied planes gave a feeling of security. Moreover the chances of being hit were as thin as in London with the rockets.

A. K. QURESHI.

*Referred to in College Notes above.

non-Arab origin But these form only a small portion of the total and have been so altered that even when the scene is laid in Persia or India or China, they exhibit a picture of manners, modes of thought and language of the court and time of the *Mamlock* rulers of Egypt. If we desire to see the people, the dresses and the buildings described in *Arabian Nights*. we have to turn to Egypt, and to its capital Cairo which has been the chief Arabian city since the downfall of the Arab Empire of Baghdad. The whole local colour of the work, in point of language and as regards the manners and customs described, together with the fact that some of the tales have a historical basis, points to the conclusion that the final redaction of the voluminous matter which owed its origin to various sources took place during the reign of the later *Mamlooks*, probably about the second half of the 15th century.

But whatever the date of composition and whoever the author or authors or compiler or compilers, the tales are priceless jewels of fiction, timeless and free of all frontiers. They have been translated into scores of languages and have delighted the hearts of millions of readers—men, women and children Sindbad the Sailor, Alla Din and his Wonderful Lamp, Ali Baba and Forty Thieves are household words. People of every age, character and condition have been ensorcelled by the magic web woven by Sharzad.

The object of the book as stated in the preface has been rendered into English by William Lane in these words: "The lives of former generations are a lesson to posterity; that a man may review the remarkable events which have happened to others, and be admonished; and may consider the history of people of preceding ages, and of all that hath befallen them, and be restrained. Extolled be the perfection of Him who hath thus ordained the history of former generations to be a lesson to those who follow. Such are the Tales of a Thousand and One Nights, with their romantic stories and their fables".

King *Shahryar* received a tremendous shock over the accidental disclosure of his wife's infidelity and made a practice of marrying a woman for one night only and killing her the next morning. Once, Shahrzad, the daughter of his *Vizier* was brought to his harem. She was a wise woman, had read life-stories of numerous kings and queens, and had the talent of attractive speech. She started telling the king a fascinating story but left it unfinished at daybreak at a point that induced him to spare her life and ask her on the following night to complete it. Her tales were so highly interesting and were so cleverly interwoven into one another, that she succeeded in persuading Shahryar to spare her one after another for a thousand nights. During this period she had been blessed with three sons. On the 1001st night, she presented to the king his three sons and begged to be exempted from being put to death, as a favour to the infants. The king had already become enamoured of her purity, ingenuity and piety and now had her proclaimed as his queen. He later summoned chroniclers and copyists and bade them write all that had betided his wife and himself. So they wrote this and named it 'The stories of the Thousand Nights and a Night'. The book came to thirty volumes and these the king laid up in his treasury. One of his successors bade copies to be made and spread over all lands and climes. "This is all that hath come down to us of the origin of this book, and Allah is All-knowing".

This is the framework; but the real secret of the charm lies in the tales themselves They have cast a spell on mankind, and possessed the imagination of all who have read them. The reason for this unprecedented power of enchantment is not far to seek. They take the readers to a *new* world in which nothing is impossible to happen, in which almost everything does happen, the most delightful, the most atrocious, the most curious, things. 'It is a world

widely read books of the world, which have fascinated alike the old and the young of all nations and all times, the *Classics*, have had a story element in them, and have contained in one form or another narratives of human experience, actual as well as imaginative. One celebrated treasurehouse of tales which have held children from play and old men from the chimney corner is the Arabic book *Alf Lailah wa laila*, or a thousand nights and night, called in English the " Arabian Nights Entertainments, " or simply " Arabian Nights ".

The name " Arabian Nights ", however, gives no sure indication of the source from which these entertaining tales were originally drawn; as some at least of them are by no means of pure Arab descent. In fact, ever since the beginning of the 18th century, when Europe went into raptures over the first French rendering of *Arabian Nights*, an almost unending controversy has been going on among circles intersected in Oriental literature regarding the origin, authorship and date of composition of the book *Galland*, its first European translator, was of the opinion that the *Nights* had travelled to Arabia from India, via Iran, and that they were the product of a single author's labours About a century later, *Selvistre De Sacy* controverted both these opinions, and tried to prove that more than one writer had taken a hand in the composition of the book and that no Indian or Persian element went into its making. Shortly afterwards, *Joseph Von Hammer* pointed out a passage in the Arabian author Masudi's " Golden Meadows " referring to the existence in Arabic literature of the time of translations of Persian, Indian and Greek story-books and mentioning particularly a book called *Alf Laila* or 'a thousand nights' which contained " the story of the king and his Wazir, and of Wazir's daughter and her slave-girl : *Sherazad* & *Dinazad* ", and was a translation of a Persian book " Hazar Afsana " or a thousand tales. He consequently believed that this Arabic translation of Hazar Afsana was gradually augmented and altered during several successive ages and ultimately became what we now find entitled " 1001 Nights " William Lane, who first translated a part of *Arabian Nights* into English, tried to establish once again that the book was the work of a single author. Later a passage in Muhammad b. Ishaq's " *Fihrist* " led to an effort being made at tracing a connection between the framework of the *Arabian Nights* and the *Book of Esther*. Further, researches made by scholars like *Muller*, *Noldeke* and *Oestrup* tend to the conclusion that the tales can be grouped into "three layers, of which the first would include the fairy tales from the *Hazar Afsana* together with the framework, the sceond those which had come from Baghdad and the third the stories added to the body of the work in Egypt". The points of distinction between the various layers were stated to be that while in tales founded on Persian or Indian originals, the supernatural beings play the most conspicuous part, humorous anecdotes and love romances of the middle class form the subject matter of those of the Baghdad group, and stories having their centre at Cairo are marked by a roguish, ironical pleasantry as well as by a mechanical supernaturalism. The process of research and classification has not yet come to a final end. But this much can safely be asserted that '*Hazar Afsana*' formed the nucleus round which the whole structure of *Arabian Nights* was reared. The very first story which constitutes the framework points unmistakably to a foreign origin. The very names *Shahryar*, *Shahzaman* and *Shahrzad* have a definitely persian ring about them; and the story of the infidelity of the wives of two princely brothers leading to one of them undertaking a journey, and the interlacing of stories with one another are specifically Indian devices. Similarly the manner of telling an unending chain of tales with a view to gaining time and preventing rashness on the part of one of the chief characters, is of peculiarly Indian design; for in this way the clever parrot of Sanskrit tales hinders the wife of his master from visiting her lover until the husband returns. Thus, there is little room for doubt that some of the stories are definitely of

of his grave seem to give, in a dumb but eloquent language, a message of the vanity of human wishes. Life is a climb; man ascends it; but once the peak is reached, decline begins; and the end is fall, annihilation, death.

Chihl-Situn, Dar-ul-Aman and some other beautiful places have also left indelible impressions on our memory. In fact, it was a pleasant trip which we enjoyed thoroughly, thanks to the kindly interest taken in our comfort by the Afghan government and the generous hospitality they lavished on us

NASEEM ANWAR BEG.

*Arabian Nights

(*The first of a series of talks on "Great Classics" Broadcast from the All India Radio Station, Peshawar.*)

Somewhat like *Manu*, the ancient law-giver of India, king *Servius Tullius* divided the Roman people into five classes. The amount of property possessed by each indvidual and consequently his taxable capacity determined the class to which he was assigned. The wealthiest were placed in the first class and called *Classici*; the poorest in the last and called *Proletarii*. But, properly speaking it was only those in the first category who were the "people of the class", all the rest being simply 'infra classem' or below class. The epithet *Classicus* applied to people of the highest rank and importance. Later, by an easy analogy, it came to be employed in the realm of literature for writers of outstanding worth and distinction; and so far as can be ascertained the Roman *Aulus Gellius* was the first writer to make this metaphorical use of the expression when he contrasted what he called a *Scriptor Classicus* with a *Scriptor proletarius*. By the former he meant to describe a writer of rank and position who stood head and shoulders above the mass of the 'proletarians'. The term *Classic* was derived from 'classicus', and signified in the beginning an author whose work was regarded as a standard or a model. Now, for the early Romans, the only models to appreciate or imitate were the Greeks and for later generations the earlier Romans. Hence, 'classics' came to stand for standard authors of Greek and Latin; and in that sense the expression found its way into French literature and thence into English. In the course of time, however, countries other than Greece and Italy produced great literatures of their own; and some of the writers of these nations placed before the reading world masterpieces of exceptionally high merit easily comparable to the ancients. The connotation of *Classics* had on that account to be widened to include these works of oustanding worth. Thus the term was rid of its local or geographical implication, and began to be employed for literature of the first rank produced by any country or any nation. In its modern sense, it denotes a work which has a universal appeal and is generally accepted as a standard of excellence, one which has stood the test of time, has always remained young and has refused to grow old, much less die.

No book can have a universal appeal unless it is written in a clear, attractive language, deals with a subject of permanent human interest, and has the capacity of not only rousing the curiosity of its readers but of capturing their imagination and holding their attention. Man has always taken a deep interest in the doings and mental processes of his fellows, and has consequently developed from the earliest times an instinct for story telling. He has always found his much-needed escape from personal mundane realities of life into the realms of the comic, the romantic and the heroic. No wonder, therefore, that the most

*(Printed with the consent of the Station Director, A.I.R., Peshawar).

"Allah-o-Akbar" burst forth from every throat as we entered a region of undiluted liberty and freedom It was followed by a series of songs, some musical some otherwise The road was now a pebbly track and we occasionally received rather heavy jolts Those who were straining their musical talents found their songs being ridiculously prolonged or cut short.

At Daka, 8 miles from the border-line, we were welcomed on behalf of the Afghan Government by an official who was henceforward to look after our comfort throughout the journey. The passports were examined, and we were entertained to cold drinks and fruit. Daka is a beautiful spot near a stream. The road from Daka to Nimla where we were to stay for the night passed through a dry and barren plain, and travelling became dull and monotonous. While negotiating a climb, one of the front wheels of the lorry got loose and we had all but a nasty smash. The cleaner was unfortunately injured but the vehicle was immediately brought under control. The application of 'first aid' to the injured cleaner and the fitting and fixing of another wheel delayed us a great deal, and we reached Nimla late at night. A good dinner and clean new beds, however, soon put us into good humour again.

Nimla is a beautiful garden which was laid out according to the plans of the great Moghal King Jahangir. Nimla is also known as "Nim-lai" (half-way). and a story says that it was at this place that Jahangir and his beloved queen "met again with tears" after a temporary quarrel. The parallel lines of tall poplar remind one of rows of courtiers waiting to pay homage to their monarch

Next morning we were again on the road It passed through a hilly tract and had steep gradients and sharp corners. We went up and down and the lorry climbed and descended. After crossing a seemingly unending series of mountain ranges, we reached Kabul late in the evening. The lorry came to a stop on the bank of an artificial lake, where a number of polite and obliging officials received us From there we could see near-by vast grounds illuminated by thousands of multicoloured lights. Our hosts took us to the comfortable and well-furnished apartments which had been set apart for our lodging.

Next morning was the first day of the "Jashn". The Liberty week is celebrated in Afghanistan with great pomp and enthusiasm, and every son of the soil takes pride in participating in the great national celebration Thousands throng the capital and watch the festivities Troops march past H M. the King who receives the salute. A busy programme of matches, sports, games, and other activities is gone through for a full week and everybody seems to be enjoying himself We also took part in various competitions.

Kabul and its suburbs have many attractions for visitors from other countries. we also went round many places Istalif is like a green oasis in a desert of sand and stone. On the terrace are a number of old shady Chinar trees, which protect visitors from the blazing heat of the sun. Beautiful flowerbeds line the terrace, and clear, rippling streamlets cross and recross them. On one side of the terrace is a fruit garden and on the other tiers of houses along the slope of a hill.

Paghman is the summer capital. Nature seems to have showered all her blessings on this lovely spot. But the general charm of the place stands contrasted with a tragedy of human wishes. Half-built palaces and incomplete buildings irresistibly remind one of the ex-King Amanullah Khan and symbolise his unfulfilled plans and frustrated hopes, half-blown buds which have withered before coming into blossom.

Bagh-i-Babur is a fascinating garden built under the orders of the founder of the Moghul empire in India, who is buried in this sweet spot. The very stones

planning to go in for much more agricultural production, if necessary, with less industrial production. India, therefore, cannot rely on always finding other countries with surplus food to send her ; and if she is cut off by a war from getting surplus food, then her situation will become very serious. A condition similar to the Bengal famine might develop all over India.

What then is the solution ? Two things, I think. One is that some means must be found of limiting the huge increase of population which is going on in India — every 24 hours there is a net increase of over 10,000 in the population. What these means are I cannot say—that is a problem for you to think about, as many factors are involved, religious, social, political, economic, and others. But there can be no doubt that it will be disastrous for India to increase at this rate for the next half century. And remember, of course, that the population will increase even faster than this as the various social services expand. The other is that every possible means should be adopted to increase the area and yield of cultivation. The immediate objective of a policy of industrialisation in India should in my opinion be directed to this end as much as to any other. A secondary objective of industrialisation will be as a sort of insurance policy—to produce goods which India can exchange with other countries for food, in case her own food production cannot keep pace with the needs of the population. The first line of action will postpone the day when India can no longer feed her self and the second will be a certain measure of insurance against it.

Neither, however, solves the problem, and I am not able to suggest any cut and dried solution. Perhaps you can. But the problem is vital, and if India is ever to rise to its proper place, it is essential that it should be solved. Indeed no one could be content with the standard of living of the present population, let alone the future population.

We see, then, that the statement of Malthus is something for India to take seriously and to think about. The bad effects of the operation of his law may be postponed for some time—as in 19th century England—but the tendency is at work; and in India it is dangerously at work. The sooner India faces up to this and takes the necessary counter-measures, the better.

I. D. SCOTT.

My Trip to Kabul

In response to a kind invitation from the Afghan Government, our party of teachers and students left Peshawar on a hot July morning to participate in the 'Jashn-i-Azadi' celebrations at Kabul. We were 30 in number and included representatives of tennis, football and hockey teams of our college. As we motored up the winding road of the Khyber Pass, our hearts began to swell with an indefinably exhilarating feeling the like of which we had never experienced before during our trips to other parts of India. We were not only going to visit a land of many charms, but were looking forward to having the fortune of breathing the 'free' air of an independent country. Our buoyant spirits foun expression in joyous songs and boisterous laughter.

The stoppage of the motor-van and the appearance of the Passport Officer brought us down from the fairy land of Dream to the solid Earth. While the usual formalities were being carried out at the Passport Office, we were enteratned to a sumptuous tea by Mr. Tahmasp Khan, an old student of the college. The border-line was crossed in a tumult of emotion and a loud shout of

tion on the land is one of the biggest problems which India has to face, and the problem will exist whatever the political future of India may be.

Let us first try to think about the theory of the question, and then apply the theory to the facts in India. You will all be familiar with the saying of Malthus, the nineteenth century English economist, that the increase of population tends to outrun the increase in the productivity of the land; which has the implication that in the long run we shall all starve or at any rate not get enough to eat This saying was opposed at the time, for a variety of reasons, economic, religious, political, geographical, and so on; and in time came to be regarded as a great blunder which had been committed by Malthus. People either forgot about it, or, if they remembered it they laughed at it; and indeed th history of England in the 19th century seemed to prove him wrong. The population of England increased rapidly during the 19th centry, the amount of food produced in the country was much less at the end of the century than at the beginning, and yet the standard of life of the people went on increasing all through the century. Obviously, it seemed the statement of Malthus was not true.

I want you to notice once more the exact words I have used to describe the theory of Malthus, that the increase of population tends to outrun the increase in the means of production of food. He did not say that population always outruns food production, and he did not say that population would always increase and he did not say that the production of food would not increase very greatly. As a matter of fact, these factors do operate (as well as others), and I want to draw your attention to how they operate.

The amount of food produced in a country depends on two things—the area of cultivation and the yield per acre. I want to suggest that there is a limit to both these factors: there is a limit to the area of cultivable land in any country; although of course the existing cultivable area can generally be increased by the cultivation of marginal lands—either by new schemes of irrigation, new methods of cultivation, new kinds of crops which can grow on hitherto uncultivated land, and so on. But the limit is there, and will ultimately in effect prove an absolute limit. Similarly, there is an absolute limit to the yield per acre: in this part of India the average yield of wheat is probably 12-15 maunds per acre. It is theoretically possible to get a wheat yield of 120 maunds per care, but a yield of more than 70 has never been achieved, and then only in an experimental farm, with unlimited facilities for manuring, watering, and so on; and no need to count the cost of production. We can probably say that if the average yield of food grains in India can be increased 50% per acre, that is as much as we can expect or plan for in the next generation or two. The absolute limit in effect therefore, operates here also.

To the increase of population, however, there is no absolute limit, except the deterioration of physique to such an extent that the population was no longer able to reproduce itself—or in other words until people were so weak and ill that they could not have children, or if they did have children, the children were too weak to live. That is a horrible end to contemplate.

I have chosen this subject to speak to you about because of its practical importance in India, and because I should like each of you to think about it. Already India is unable to grow enough food for her own needs; and in India scores of millions of people live on the margin of existence: when that margin is narrowed, as in Bengal recently, vast numbers die of starvation. It is therefore an urgent and pressing problem. India might continue to import the food it needs provided other countries continue to produce surplus food. But the tendency today in all contries is towards a self-sufficient economy—India for example which used to be mainly an agricultural country is thinking about industrialising on a large scale; and England which used to have little—comparatively speaking—agriculture, is

CRICKET.—Cricket is not played in the schools of our province. Hence, few, if any, of our students ever have an apportunity of handling a cricket-ball or a bat before coming to us. One wonders how out of such unpromising material Mr. M. Sadiq succeeds in evolving and organising a 'team'. Here is his method: create an interest for the game, then enlist recruits, and then provide necessary training and practice and, of course, occasionally matches and leave from 'Composition' and 'Practicals', and.........tea.

We participated in the University tournament and reached the mofussil semi-finals. Inspite, however, of the skipper Jagdeep's excellent batting and bowling, we failed to impress the Prince of Wales players with our superiority.

Messrs Sadiq, Adil Khan, Hameed, Safdar and Abdul Ali played for the "Frontier Colleges" against the Governor's Eleven and made a fairly good contribution to their side's score.

INTER-HOSTEL TOURNAMENTS.- With a view to developing interest in games and unearthing hidden talent inter-hostel league matches in football and hockey, and knock-out matches in basket ball and volley ball, were played during the cold weather. A great deal of enthusiasm was evinced and play grounds were always crowded on match-days. Butler Hostel, and Hardinge Hostel won championship banners.

HIKING.—The Hiking Club held an open 12-mile walking competition for grown-ups and a 6-mile competition for school students on the 10th March. As many as twenty competitors including some from the Frontier police and Frontier Constabulary participated in the Senior Competition, and sixteen entries were received from various schools for the junior competition. A large number of students and outsiders watched the event which proved a great success.

VISITORS —Towards the close of December last, we were glad to welcome in our midst football and hockey teams from Habibia College, Kabul. They stayed at the College for a week, and played against various teams. A grand lunch was given in their honour in the Union Hall, when besides the staff and students of the College and the School, a large number of guests from the city and Cantonment also attended. We hope they enjoyed themselves and have carried happy memories of their visit to the Dar-ul-Ulum.

S.

Agriculture & Population

(A talk intended for the Economics Society)

I am not a professional economist, but a layman, although at one time when I was a student, economics used to be my favourite subject. I am sorry to say, however, that I grew out of that stage.

I want to say a few words about a subject which has only an academic interest to students in Europe, but has a very practical and real interest in India. Most of you probably come from families of zemindars, and you will be familiar in your own villages with the problem of agriculture and population, of how the population goes on increasing and agricultural holdings slowly become less. I have certainly noticed this in the course of my service in India: it is well known, for instance, that in Mansehra Tehsil of Hazara district the average holding of land at the beginning of this century was between 3 and 4 acres. Now it is between 2 and 3 acres, and in many places between one and two acres, In my opinion this pressure of the popula-

sports meet was held on the 19th and 20th February, and we had an easy victory, eleven of the thirteen events being won by our men. Qazi Iqbal bettered the record in high jump. Iqbal Qurashi and Ghaffar were bracketed as 'individual champions'. His Excellency the Governor gave away the R. B. Mehrchand Khanna trophy and prizes. Our friends of the Edwardes College having expressed their inability to take part in relay-races, the K. B. Kuli Khan's Challenge Shield was not competed for.

Mr. Hadow Harris's efforts have borne fruit and the sports team can justly be proud of its achievements. It is hoped that still better results will be obtained next term.

HOCKEY.—Gaps caused in our ranks by the departure of some of our veteran players after the University examinations had to be filled by the recruitment and training of fresh men; and Prof. M. Fazil took the difficult task in hand immediately after the new admissions. Regular practice and frequent matches soon brought the team to a fairly high level and we had hopes of going very far in the University tournament. But even though these hopes were not fully realized, we participated in every tournament held at Peshawar and gave a good account of ourselves. In the N.-W. F. P. Championship tournament, we defeated the well-known Rovers Club in the semi-finals by a good margin, and were bracketed as Champions with the Provincial Police after having drawn with them, on two successive days. Hamid and Nabi were selected, in the provincial hockey trials, for inclusion in the N.-W. F. P. team participating in the Inter-Provincial Hockey Tournament at Gorakhpur.

Prof. M Fazil is continuing to provide the team with frequent opportunities of playing matches with various civil and military teams of the station. Manohar, Hamid, Nabi, Arif, Ghafur, Samad and Jagdish are keeping up excellent form and Nawaz, Brij Mohan, Jabbar and Prem are shaping well. We are looking forward to higher achievements in the future.

FOOTBALL.—We have high traditions to maintain in foot-ball This is a game in which we have always excelled and have occasionally won University Championships, Hence, speaking bluntly, individual distinctions like Abrar's selection to play for the University team in Inter-Varsity matches cannot satisfy us. There is no dearth of promising material, and we hope that more strenuous efforts will be made to discover hidden talent, and greater pains will be taken to organise and train a team really worthy of the name and traditions of the Darul-ulum.

Besides playing in the University tournament, the football team entered for the Frontier Championship and the Red Cross tournaments also.

TENNIS.—The Col. Keen Cup tournament was last played in 1943 when we had an easy victory over our friends of Edwardes College. Last year, to our great disappointment, the sister institution could not put in a pair to compete for the cup. Hence, we were looking forward eagerly to having a really good game this year. Even though petrol difficulty stood in the way of players coming out to us, as in past years, from the City and the Cantonments, Prof. Anwar Beg managed to provide fairly regular practice to our men by utilizing gratefully whatever facilities the Peshawar Gymkhana Club could place at our disposal. However, only a few days before the probable date of the match, word was received to the effect that the Edwardes College pair could not play as they had not had sufficient practice on account of scarcity of balls. This came as a disappointment and our tennis world was again deprived of the great annual event and the interest and enthusiasm it used to invoke. We can only sympathise with Abdul Ali and Fazl-i-Mahmud, and wish them success in their 'match' against the University Examiners.

and schools; for it is unreasonable to expect those who are educated as egoists and self-centred individualists suddenly to become citizens aware of the public good It gladdens one's heart to find a recognition in the Sargent Report of the growing conviction that "education in the real sense should be a training in the process of social adjustment rather than the mere injection of a special dose of mental, moral or physical instruction." The school must take upon itself the task of helping children to learn group initiative and group responsibility. The group process can only be learnt by practice. Every co-operative method conceivable, therefore, ought to be used in our schools for this end We should have group recitations and group investigations to inculcate the value of collective thinking We should have dramatic clubs and school papers to teach the significance of co-operative endeavour Even recreational, manual and aesthetic activities should be conducted in such a manner that they not only have a value from the health or art point of view but they also teach the social lesson And if we believe that every child before he leaves school should have learnt to appreciate the value of genuine discussion and to meet the clash of difference--difference of opinion and difference of interest—which life brings, can we not profitably adopt some gradual plan of self-government in our schools? Let us have more faith in the ability of our pupils to plan, to make intelligent decisions, and to accept responsibility without, of course, burdening them with responsibility for which they are quite unprepared.

The democratic process is a creative process, requiring the highest and the best contribution of every individual citizen; and only an education that aims at helping every individual to realise the highest capabilities of his self and so to develop his social consciousness that he feels he has a share, a part to play, a task to perform in national progress, can be an adequate education for a free and democratic India. Only such a re-organisation of the educational system that aims at developing students who, because they feel humanely, think critically, and act creatively, are in themselves important factors in the improvement of life, can contribute to a real regeneration of Indian society. And, perhaps, the most crucial problem in such reconstruction will be the supply of properly trained and adequately paid teachers at all stages; for "teachers are," in the words of Sir Maurice Gwyer, "the linch-pin of every educational scheme" The quality of teacher service determines the efficiency of a nation's educational system; and unless we are prepared to put the teaching profession on a sounder basis by an improvement not only in the training and selection and guidance of teachers but also in their financial and social status, we shall lack one of the most efficient instruments for achieving a desirable democratic society.

E. A. PIRES.

Round the Play-grounds

ATHLETICS.—The new Captain, Iqbal Qurashi, is slowly but surely taking the place of our renowned University blue--Khwaja Rashid. He led the athletics team successfully through the Rawalpindi District Olympics in December. He himself won the first prize in 440-yards race. Jafar secured the first place in long jump as well as in hop-step-and jump. Ataullah was placed second in Discus and third in Javelin throw Iqbal Qazi was declared the winner in long jump These achievements in races, jumps and throws led to the team being declared the "best represented team" in the tournament We participated in the Punjab University sports tournament in January, when Iqbal Qurashi was selected for inclusion in the University team. The N.-W F.P. Inter-College

Is there any way in which we can bring about such a revolution in our ways of thinking, apart from improving the methods and the content of education in our schools and colleges? I believe there is Let us convert every school in the land into an active Community Centre into a centre where men and women from the neighbourhood—both young and old—foregather, both to have more life and to learn how to live Let us organise such Community Centres, providing an opportunity for adult education in the only forms in which many people, tired out with the day's work can take it: discussion, recreation, group activities and clubs. Let us remember that we all need more education, even if we have any. The world is learning all the time about health (both physical and mental), food values, care of children etc., and every scientific discovery must be propagated. Adult education means largely the assimilation of new ideas, and from this point of view no one can deny its necessity. The Community Centre, however, must aim not only at extending the knowledge of those who frequent it but also at increasing their abilities for social intercourse and co operation in every aspect of life. Besides discussion and study groups, therefore, there should be a variety of activity groups, such as a dramatic club, a knitting group, or a social service league, and recreational activities like hiking, chess and country dancing. The Community Centre would thus become a veritable school for democracy. Teachers and parents of children studying in the school, associated in a Parent Teacher Association, would naturally be the most active members of the Centre and form its nucleus. In fact, the success of a Centre would depend almost entirely upon the interest taken in it by this group of members, specially the teachers

There is one special need, however, that the Community Centre may not be in a position to meet. It is the need for a systematic resumption of study in one's later years I believe that every educated adult needs occasional opportunities when he has had some experience of life for resuming a methodical study of certain subjects like history, literature, politics, economics and philosophy, for the full appreciation and the most fruitful study of which such experience of life is fundaamental. "There is in education,' says Sir Richard Livingstone, "a law of delayed action, by which seed sown and long forgotten only grows in late years." Herein lies the supreme value of University Extension work, of Summer Schools and Refresher Courses. There is an urgent need of adult education of this kind; and I don't think that there are better agencies to satisfy it than the Universities with their highly qualified and specialist teachers, their well-stocked libraries, and above all, their tradition of research and their atmosphere congenial to deep and serious study. The organisation of adult study is a new function for the University; and we want our universities to recognise it. But more than that, we want the educated elite of our country, specially those engaged in routine or practical work, to realise the benefits that can accrue both to the individual and to society from occasional periods of methodical study for refreshing and re-furnishing and re-orientating the mind and clearing it of the crust of routine that is apt to form over it and impair its fertility unless scraped off from time to time by renewed mental activity.

The children of to-day will be the citizens of to-morrow; and, if they to are live in a democratic, state, they must all be educated for such living. The democratic principle involves an equalisation of educational opportunities; but such equalisation does not imply that every child shall have the same education or that all should go to secondary schools or universities It implies only that the test for opportunity to use such institutions should be competence, and not social or financial status: and that every child should receive the type and measure of education that is suited to his needs and his abilities. Moreover, since the best part of the average individual develops in co-operation with his fellows, the habit of co-operation must be formed before the children take their places in politics, or industry, or the professions The necessary habits of a democratic society must be established in children in homes

An important function of adult education in this country, specially in the initial stages of the national programme of educational reconstruction, will have to be the elimination of illiteracy. But illiteracy cannot be liquidated at will: it will take not less than twenty-five years even if the recommendations of the Sargent Report are put into effect. In the meanwhile, every possible effort should be made to educate the masses in all the ways of healthy, happy, and helpful living. This is a task that will require the magnanimous co-operation of every educated Indian in one form or another, the least of which, but yet one too important, will be the conduct of an effective and continuous propaganda in favour of adult education. Unless voluntary help, both individual and institutional, is immediately forthcoming to supplement the professional teachers that the state will endeavour to provide, it is futile to expect adult education for some time at least, to be effective beyond the mere reduction of the present high percentage of illiteracy. *For this prodigious task we need a multiplication of social service organisations, specially* for service in the villages; and we look up to the great employers of labour, the big commercial firms and the various workers' associations to provide all the facilities they can not only to accelerate the pace of literacy but also to educate the literate worker in everything that appertains to his vocation and to his life as a citizen of a democratic state. A condition precedent, however, for the utilisation of any such voluntary help must be an efficient organisation within each province to co-ordinate such efforts and to relate them organically to a definite programme of adult education envisaged by the provincial Education Department.

The idea of making a period of social service obligatory on all students in Universities has been mooted by some educationists and needs further consideration. The principal argument against the proposal appears to be that conscript social workers are not likely to prove enthusiastic or efficient. But this need not happen, specially if a fervent appeal is made to the minds and hearts of the students, and the urgency of the country's need for an army of social servants is impressed upon them. If this proposal were accepted and enforced, it would not only provide additional assistance in the execution of the national programme of adult education, but it would also educate the youth of our country in practical citizenship. It would provide them with that insight into the lives of their less fortunate brethren that can come only from close and sufficiently prolonged contact—an insight that is valuable for a proper recognition of the injustice of a society in which equalisation of opportunity for cultural as well as economic advancement is either an obscure, or a neglected, or a deliberately despised principle. It would help them to realise more clearly the interdependence among the various "classes" of society, and the need of providing a better social order based on co-operation rather than cut-throat competition, on mobility of social intercourse rather than on stratification of society, on equality of opportunities for self realisation rather than on the conscious or unconscious assumption that talent and capacity are the special property of the rich or the nobly born.

Adult education, however, is not a need only of the illiterate masses. All of us, however educated we may be, need more education in our life. We need education all the time. The training for democracy can never cease while we exercise democracy. That education is a continuous process is a truism. Life and education must never be separated. If only our schools and colleges could give each of us that precious attitude towards life: that life is a matter of constantly learning—that the completion of my education in these institutions of learning is really the beginning of my education which will go on as long as I live—how much richer and more satisfying our individual lives would be, and, as a consequence, how much happier and more harmonious our social relations with one another!

encouraging. It has met hardly once a month and has so far held only two 'Mushairas', one in Urdu and the other in Pushtu, and a prize debate. This is frankly not enough. Language and literature offer a wide scope for work, and we expect a good deal of solid, creative work from the Bazm. There is much hidden talent which should be discovered and encouraged. The Society can do much useful work, and we hope it will do it.

S.

*Education for a Free & Democratic India

Every patriotic Indian is looking forward to the day when he will be a free citizen of an independent and democratic India: but little does he realise the tremendous responsibilities that freedom and democracy will bring in their wake. It is, therefore, the urgent task of a widespread, national system of education to awaken every child and every adult in this country to the real significance of the democratic way of life. Every listener is acquainted by now, I expect, with the proposals of the Central Advisory Board of Education for educating the four hundred millions in this land; but I am frankly dubious as to whether every one of them realises the special part that he or she will have to play in making the experiment of democracy a real success in post-war India. As teachers or as parents, as employers or as employees, as landlords or as tenants, as citizens of a democratic state, we all need to have a thorough and proper understanding of our obligations towards others. Democracy cannot thrive in an uneducated or a half-educated community; it cannot function successfully in a caste-ridden and a highly class riven society. And it is for this reason that the Report of the Central Advisory Board of Education opens with the necessary admonition that the destiny of this country depends upon the education of the people.

But what is implied by the word "education" in this statement surely cannot be the mere acquaintance with the three "R's" nor just the attainment of a certain degree of knowledge in the subjects included in the curriculum of the school or of the adult classes. The purpose of any useful system of national eduction cannot and should not be merely to give to the poor or the ignorant what is now enjoyed by the well-to-do and the learned. The purpose must not be merely compensatory. It must be far more radical. It must be to remove the incompetence in the art of living in society, the formation of a new way of living in common with others. It must be to help to bring into play all the unused wealth of creative talents and capacities that individual men and women possess, so that social life may be enriched thereby. The education of the "people" in a democratic society cannot aim merely at the creation of better instruments for the exploitation of "the few" in politics or industry; and yet, this is a grave and real danger in a country that even to the present day has been virtually starved of adequate educational facilities and is, nevertheless, on the verge of attaining political freedom All the more reason, therefore, why education not only after the war but from this day forward should aim definitely and avowedly at making every individual an effective and efficient citizen, and why the problem of adult education in the fullest possible sense and on the widest possible scale is as urgent as the introduction of free and compulsory primary education.

*A Radio Talk broadcast for All-India Radio, Peshawar, and published with the permission of the Station Director, All-India Radio.

scheme of the post-war reconstruction of Education Mrs. Scott gave a thoughtful discourse on "Wordsworth and Education". Prof. Shaikh Minhaj-ud-Din spoke on "The Constituents of Matter'. Papers were read by Mr H. G Saigal and Mr. Gurmukh Singh on "The Place of Education in Human life", and by Messrs Sada Nand and Dwarka Nath Kaul on "The School as a Special Environment". Professors Ahmad Ali Sadiq and Bashir-ud-Din are expected to speak to the members on "Illiteracy in N.-W. F. P." and "Poetry" respectively before the end of the session.

THE ECONOMICS SOCIETY.—It is generally thought that while the students of economics exercise. as a rule, strict control over their purse-strings, they are usually very lavish in their use of words The brief report submitted by the Secretary of Economics Society, however, goes to belie that belief and to show that a true economist can at times be as frugal in writing as in spending.

This Society has held three meetings at which Prof S. M. Idris, K. S. Muhd. Anwar Khan of Mardan and Mr. Karim-ul-Wadud have read interesting papers on such important subjects as "Economic Planning", "Agriculture in the N.-W.F.P" and "Indian Economy during the present War". A promising beginning has been made and we hope that a great future of useful work lies in front of this, the youngest of our college, societies.

THE DUTY SOCIETY.—The society aims at providing promising young men with pecuniary assistance for the completion of their courses of study. The necessary funds have been raised every year by sending out deputations of students to various parts of the province during the long vacation; and every year's collections have been given away in the form of 'debts of honour' repayable by easy instalments at the borrower's convenience. Scores of students have thus been benefited, and most of them are now occupying fairly respectable positions in life. But unfortunately a large number of borrowers have never thought of returning the money which was paid to them in their hour of need. Had they kept their word of honour, the current of Duty Society loans would have swelled wider and deeper every year. But in fact, it could only just live, so to say, from hand to mouth.

Last year, a regular effort was made not only to recover old loans but to raise larger funds than ever before. The work of collection was intensified by sending deputations under the leadership of members of the staff, and that of the realization of standing amounts was strengthened by persuading the borrowers in many ways to discharge their debts. These efforts have met with great success with the result that the society has built up a reserve fund of Rs. 28,000 in addition to awarding seventeen scholarships of the value of Rs. 10 p.m. each to Intermediate students and six of Rs. 12 p.m. each to the Degree classes. This is a record of work of which the society can well be proud.

But in these hard times, it is becoming increasing, difficult for parents of or dinary means to bear the expenses of keeping their children at College. And talents not being the monopoly of rich parents only, many deserving boys come to join the college every year whose guardians are too poor to pay their college dues. Hence, we appeal to all well-wishers of the rising generations to subscribe liberally to the building up of a large capital fund of the society so that its benevolent work may be carried on on more permanent and surer lines.

THE BAZM-I-ALSINA-I-SHARQIYYAH.—In view of the fact that the Bazm claims to be one of our largest societies in point of numbers and that Oriental literature, the cultivation and development of which is the main object of its existence, has a special appeal and attraction for our young men, its record of achievement as disclosed by the Secretary's annual report does not appear to be very

This will indeed be a disappointment, but we hope that the club will make amends for this by providing some sort of entertainment during the hot weather.

THE SARHAD MATHEMATICAL SOCIETY.—This society has a proud record of past achievement to its credit. It took the lead in building up a library of its own and providing text books to all its members. But war conditions have for the past few years, stood in the way of any expansion of its activities, and no new books have recently been added to its collection. It is hoped that the termination of the War will witness a renewal of vigorous life and activity of this society.

The Secretary Mahtab Khan obtained admission to the Aligarh Engineering College in February and no successor seems to have been elected. Before going he managed to hold two meetings of the Society at which Profs. Mohd. Aslam Khan and Zia-ud-Din read papers on Ionosphere and Iteration respectively. A proposal is already a foot to invite an eminent Mathematician from outside to preside over the annual day celebration.

THE FRONTIER SCIENTIFIC SOCIETY.—The first two meetings of the Society were devoted, as usual, to annual elections and budget discussions. Since then, fortnightly meetings have been held regularly and interesting and instructive papers have been read on the following subjects:

'Nature of Light'	by	Prof. Sh. Minhaj-ud-Din
'X-rays'	"	Prof. A. Abdul Wahid
'Hormones'	"	Prof. S. Muhd. Ahmad
'Vitamins'	"	Prof. Sh. Muhd. Fazil
'Soilless Gardening'	"	Mr. M. Saleem

The Society held a competition on the 14th February at which papers were read on 'Science in the service of man". Abdul Khaliq (from the Degree Classes) and Zafar Ali (from the F.Sc. Classes) were adjudged to be the best competitors, and were awarded prizes. A competitive examination in general science was held on March 3, and Muhd. Asim and Sardar Bahadur were declared winners of the Degree and F.Sc prizes respectively

THE SARHAD AGRICULTURAL SOCIETY.—This year the members had to go on their annual tours during the months af November and December. A good part of January was devoted to House Examinations. Hence, we could not make a start with our usual activities until late in the term. But since then we have held our meetings regularly. Prof Mian Mushtaq Ahmad opened the session with a highly interesting lecture on "Post-War Reconstruction of Agriculture" It was illustrated with epidiascopic projections and was greatly appreciated. In subsequent meetings, the following gentlemen delivered useful lectures:

Prof M. Ismail Sethi	on	'Industrial Agriculture in Japan'.
Prof. Noor Ahmad Khan	"	'Manures'.
Prof. Syed Muhd. Ahmad	"	'Silk-worms'.
Mr P. C Raheja, Sugar-cane Expert	"	'Drought Resistance in Cropplants'.

At the annual ploughing competition, prizes were awarded to the best ploughers of B.Sc and F.E.A classes.

THE SARHAD EDUCATIONAL SOCIETY.—This society believes in real solid work, and has been meeting regularly throughout the session. Dr. Pires, the President, delivered the inaugural address in which he dealt with the functions and aims of the "New Education and the Teacher". He was followed by Prof. S. M. Timur who spoke on "The teaching of English in Indian Schools". Prof Q. M. Fareed gave a talk on "The Role of the Teacher". Prof. Anis-ud-Din Ansari reviewed the Sargent

The society held its annual tournaments during the last week of March 1945. The response from the young men of the surrounding villages for whose benefit the tournaments are held was more heartening than last year. Fourteen teams participated in the football competition which was eventually won by Abdara players. An althletics meet was also introduced this year, and four teams competed for the new silver cup presented through the generosity of K. B. Arbab Sher Ali Khan. The Adabi Tola of Tahkal-i-Bala won after a keen struggle. The prizes were given away by Mrs Scott, and Mr. Scott congratulated the winning teams and prize-winners and admired the sense of discipline maintained by all. He hoped to see more teams taking part in the competitions and playing with greater enthusiasm in future years. The Secretary explained the aims of the society and thanked K. B. Abab Sher Ali Khan for his kind assistance. He also commended to the notice of all present the useful work of silk-worm rearing which was being done at the College, and quite a number of villagers later visited the worm-rearing centre in the zoology department of the college.

THE KHYBER ATHENAEUM.—The Athenaeum continues to be one of the most active societies in the college. It has succeeded in accomplishing practically everything it had on its programme for the year. Although some notified talks had to be replaced by others, the Society missed no scheduled meeting. This is an achievement of which it may justly be proud.

The most outstanding feature of its activities for the session was a series of three very interesting and informative lectures on "Moghal Art" by Mr. S. D. Malik, Assistant Curator of the Lahore Central Museum. The lectures were illustrated with epidiascopic projections and were highly appreciated by the large audiences which they attracted on all three nights. Of the other lectures on Art and Literature delivered under the auspices of the Athenaeum, the following may be mentioned as the most successful:—

The Waverley Novels	by Prof. Hadow Harris
Ancient Greek Art	by Mrs. D. Scott
Imagination in Literature	by Mr G. C. Martin
Life and Literature in Victorian England	by Sq. Leader Wain-Wright
Pushtu Poetry	by Mian Syed Rasul
The Poet's Use of Words	by Mr. Bashir-ud-Din
With a Camera round Kashmir	by Mr O. G. Grace

Mrs. Scott's and Mr Grace's lectures were also illustrated with the help of epidiascopic projections, and were deeply enjoyed and appreciated.

The Arts section of the Athenaeum continues to grow steadily. The annual "All-Arts-Day" is to be celebrated on the 1st April and will include an exhibition of arts and crafts of the province and a competition in photography, painting, embroidery work, etc. Efforts are also being made to collect funds for setting up a picture gallery and exhibiting therein a collection of masterpieces of the painter's art.

Mr. Fazl Ali Razwi, the Vice-President, has been appointed Naib Tahsildar and is at present reported to be undergoing training in the Patwari's Art.

THE AMATEUR DRAMATIC CLUB.—The club came into existence in 1931. For a few years it worked quite successfully, putting up at least two shows—one in Urdu and the other in English—every year. Then, it went into hybernation and nothing was heard of it for more than a year. Later, it was revived and amalgamated with the Khyber Athenaeum. In 1943, it was again given a separate existence, which it has maintained since then with varying success. This year, it has not held a declamation contest or staged a play so far; and it is feared that our annual convocation and prize-giving function may have to go without the customary 'show'.

The two most important events of the session have been the two speaking competitions—one in memory of the founder of the College and open to all colleges and Universities of India and the other named after the ex-Honorary Secretary and open to all high schools in the N.-W. F Province. Nine teams took part in the Khan Bahadur Haji Sadullah Khan speaking competition. The number is larger than last year; and is a clear indication of the fact that the competition is becoming more popular. The subject for debate was: " Modern Western Civilisation has proved a failure " The average standard of the speeches in this competition appears to be rising slowly but steadily. The trophy was won by Islamia High School Nowshera. The entry for the Sir Sahibzada Abdul Qayyum Memorial Debate was rather disappointing, due mainly to difficulties of railway journey. The subject discussed was "that in the opinion of this House, educational development should precede industrial development in India." The standard of speaking was distinctly good. The Forman Christian College of Lahore was declared to be the best represented institution and was awarded the trophy. We hope that the response to this 'All-India' debate will be better next year and that the Frontier Colleges will also be represented.

Prizes in Various speaking competitions were won by the following:

Seniors debate:	1st—Fazl-i-Rahim	2nd—Mukhtar Ahmad
Juniors debate:	1st—Abdul Halim	2nd—Muhd. Sarwar
First Year debate:	1st—Abdul Aziz	2nd—Amjad Husain

The Union also passed a resolution strongly urging the transfer of the remains of the great founder of the Dar-ul Ulum to a suitable place on the College premises. It is also sending out a deputation for the collection of funds.

During the term, the Union had the honour of enrolling His Highness Nawab-al-Haj Sir Sadiq Muhammad Khan V. Abbasi G.C.S.I., G.C.I.E., K.C.V.O., LL.D., Ruler of Bahawalpur State, as an Honorary Life Member.

THE MAJLIS-I-ISLAMIYAT.—The *Majlis* continues to be one of the busiest societies in the College. Besides the Sunday morning sermons delivered by the College Dean, Professors Ihsan-ullah-Khan, S.M. Indris and S.M. Timur, addressed the students on different religious and moral topics with special reference to the relation of Islam with modern social and economic problems Khan Sahib Muhammad Anwar Khan of Mardan delivered an interesting and instructive lecture on. "Islamic Morality". Mr Dost Muhammad Khan Kamil, Pleader, gave a learned discourse on "Freedom of Will."

The Majlis also held the usual Provincial Schools competitive symposium The subject selected this year was "No educational curriculum is complete without religious instruction " It is regretted that despite the substantial prizes offered and the repeated notices sent to all the schools in the province only five schools participated in the competition. We hope that more interest will be taken next year by all concerned in this useful competition. The first and second prizes were won by Islamia High School, Nowshera and the Collegiate School respectively.

'Id-i-Milad-un-Nabi' was celebrated with great enthusiasm. Maulana Abul Hasan Nadwi, Professor of Hadis and Tafsir, Nadwat-ul-Ulema, Lucknow, addressed the whole College and delivered a very convincing sermon on the life of the Holy Prophet with special reference to his methods of preaching. A special feature of this year's 'Milad' celebrations was a combined lunch for all the students and staff of the college and the Collegiate School.

THE RURAL UPLIFT SOCIETY.—The members of this society are continuing their labour of love under the leadership of Mr. Noor Ahmad Khan. They take turns in going to the small school which has been set up at Gharibabad, and teach about thirty adults the rudiments of their language. Some of the pupils are reported to be making good progress.

ORIENTAL SOCIETY (Cabinet 1944-45)
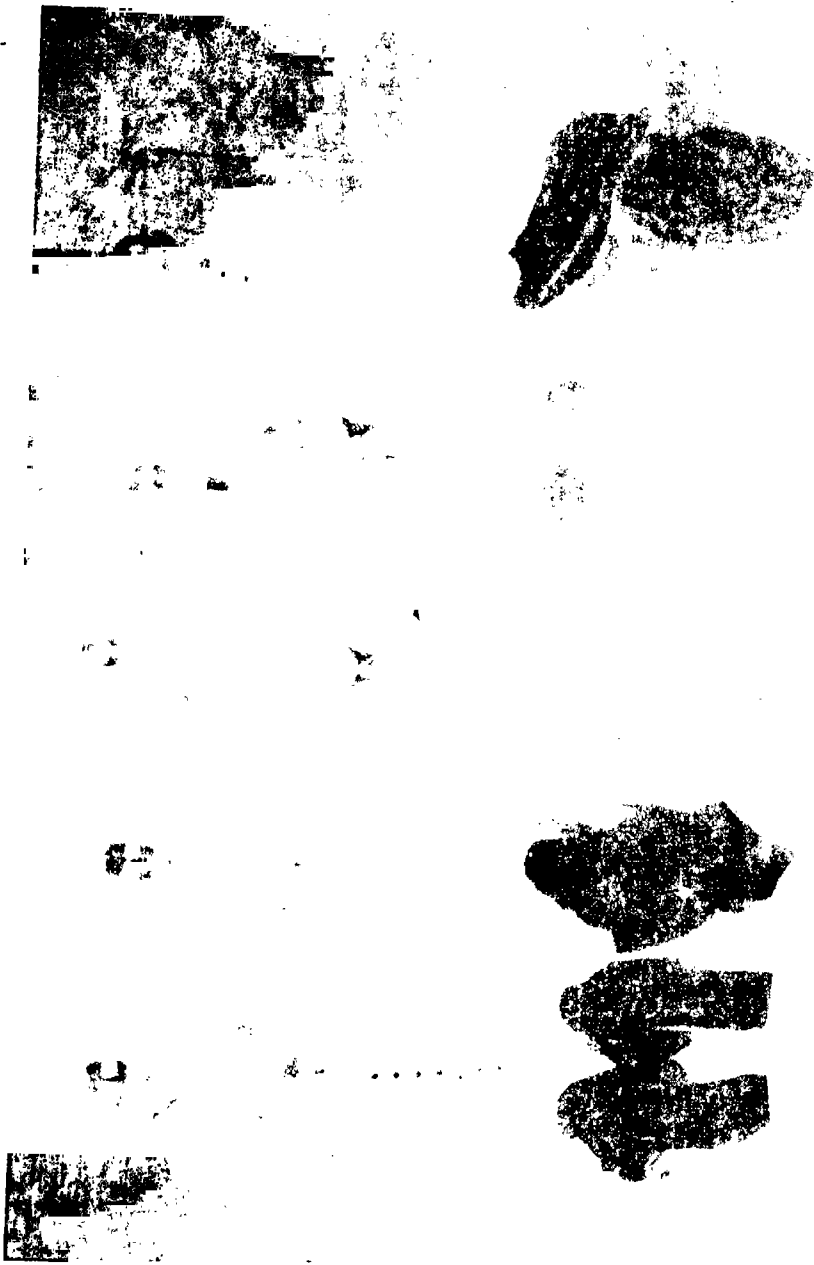
Standing :—Mohd. Jafar (*Asstt Secretary*) Hanif-ur-Rahman. Mohd. Zaman. Ghulam Muhammad. Nasrullah Jan.

Sitting : —Mohd. Saeed (*Secretary*) Prof. Sardar Ahmad (*Treasurer*) Sh. M. Timur (*Principal*) Prof. K. Sakhaullah (*President*) Fazl-i-Ghafran (*Vice-President*)

HOCKEY TEAM, 1944-45

Ground : —Jabbar, Brij Mohan.

Chairs : —Arif, A. Razzaq, I. D. Scott Esq., *Principal*, Ghafoor, *Captain*, Mrs. I. D. Scott, Prof. M. Fazil, *Superintendent*, Nabi,

Standing :—Qayum. Lal Mast, Hamid, Samad, Manohar, Nawaz, Jagdish, Om Parkash, Prem.

Anyone who is well acquainted with the development of English prose during the last few hundred years will, I think, have noticed this tendency in operation. Up till the end of the 18th. century books in England were written for a small circle of cultivated readers and on the whole prose was of high quality. During the last one hundred and fifty years the circle of readers of books, magazines, and newspapers has steadily widened and the quality of the prose employed has correspondingly deteriorated. This is particularly true of prose fiction. Compare the best sellers of the early 19th century, the mid-19th century, the late 19th century, and our own day, and note the progressive deterioration in quality of style and matter.

Wells in "Men Like Gods" reduces the population of the whole planet to a few million men, women and children. He seems to suggest in that book that on this earth the choice must lie between quantity of life and quality of life. Industrial civilisation seems to tend towards quantity of life Many of the Utopias are concerned, and rightly concerned, with the improvement of men's material conditions; but that is only part of the problem of human improvement. In Bacon's "New Atlantis" a characteristic feature is Salomon's House where every possible encouragement is given to new and useful inventions. Modern civilisation has actually invented most of the things which Bacon only imagined; and there is every reason to hope that in the course of the next two or three generations material comfort and security may be ensured to every citizen. But life and still more life, even accompanied by comfort and security, is not enough. What is wanted is the good life which must be judged by qualitative and not quantitative standards. In this matter the Morris of "News from Nowhere" is a much better guide for us than the Bacon of "The New Atlantis"; for Morris, writing in the 19th. century, saw clearly that the exclusive cult of wealth and material comfort would produce ugliness and impair the quality of human life.

So for I have said nothing of the Ancient Atlantis which some think may actually have existed. All our information is derived from Plato who ascribes the story ultimately to an Ancient Egyptian priest. It is a very circumstantial story, but the essential points are these, About 11.000 years ago there existed in a temperate region of the North Atlantic Ocean an island-continent named Atlantis, which after having attained to a very high degree of civilisation was destroyed in a vast seismic convulsion. We might have learned something from the ancient Atlantean civilisation; but, unfortunately this Dialogue of Plato's is unfinished and breaks off in the middle of a sentence Let us imagine what would happen if the lost Atl n is were to rise again from the waves. even fairer and richer than of old Here would seem to be the ideal site for the ideal commonwealth. Would Atlantis once again become the seat of a noble civilisation,higher than that of the adjacent continents and a pattern of excellence for them? I think it much more likely that the empty continent would be exploited by Europe and America for its mineral and vegetable wealth, and that the resultant civilisation would reflect the ideals not of Hellas but of Hollywood.

HADOW HARRIS.

College Societies.

THE KHYBER UNION.—The Union has had another successful year. Besides holding its weekly debates regularly, it has conducted speaking competitions for 'Seniors', 'Juniors' and 'New-Comers', and thus stimulated interest in public speaking. An elocution class has also been run during the winter for the benefit of our budding orators.

However, nearly two thousand years before Sir Thomas More, the question of the ideal state had been discussed in one of the most famous of the Platonic Dialogues. This Dialogue, "The Republic", the first and most purely intellectual discussion of the question, is the basis of all subsequent European speculation on the constitution and features of the ideal state. Besides Sir Thomas More's "Utopia" I may mention two other Renaissance treatments of the subject. These are Bacon's "The New Atlantis" and Campanella's "City of the Sun". A large Number of other Utopias, under various names, have been imagined and described in the three centuries ince Bacon's "New Atlantis" was written; and I do not propose to refer to more than a few of these, which may have some features of special interest for us today. I have in mind the brief description of the land of El Dorado in Voltaire's "Candide" and, in the 19th. Century, William Morris's "News from Nowhere" and Samuel Butler's "Erewhon". In the present century there have been some interesting books on the topic which I may mention. There are two by H G. Wells, "A Modern Utopia" and "Men Like Gods', and there is "Brave New World" by Aldous Huxley.

The world in the very remote future has also been imagined by various modern writers including Wells and G B. Shaw; but I think the pictures of the world given in "Back to Methuselah" and "The Time Machine" are too remote from reality to be of much interest or value for us. For the same reason I have not referred to the travels of Mr. Lemuel Gulliver in 1699 and the following years in "Lilliput", "Brobdingnag" "Laputa", and the country of the Houyhnhnms", the land of the virtuous and philosophical horses.

I do not propose to go into details in the examination of one or more of these Utopias; but I think that it will be of interest to note certain features which seem to be common to most if not all of them. They are all based directly or indirectly, on Plato's "Republic" and the influence of that piercing and uncompromising analysis seems to have manifested itself in certain mechanistic, in-human, and humourless impersonality in the various governments and social systems imagined as ideal. For his ideal commonwealth Plato had insisted on the abolition of property, of marriage, and of emotion and natural affection He would not admit even the poets into his commonwealth, since they are all liars. Even at the best, poets, painters, and other artists merely imitate imitations of reality and their art is thus twice removed from the truth. In order to ensure justice, the children are to be ignorant of their parents and are to be regimented in the service of the state by rulers or "Guardians" who also exist merely for the service of the state. This same belief in regimentation, in making men good by compulsion, is implicit also in the later political Dialogue, "The Laws".

This is the feature which has most struck me in most of these imaginary worlds. They may be interesting to read about; but I am not sure that I should care to live in them. I am, of course, speaking from memory; but my general recollection of most of the Utopias I have read is that the only liberty allowed to the citizen was the liberty to do what the government thought good for him, This impression, I might add, is not felt so strongly in the Utopias where the writer has imagined a more perfect humanity. In consequence, one can feel attracted towards Voltaire's "El Dorado" and Morris's England of the future, and Wells's more perfect earth as depicted in "Men like Gods".

Standardisation and regimentation, these seem to be the notes of most of the imaginary worlds, as they are today of much of the real world. Even in the great democracies, if we have not regimentation, we have yearly in increasing measure standardisation. In the future, we may assume that the average citizen will be happier and more comfortable; but there is danger that this may be bought at the price of sacrifice of individual quality and excellence, and that the process of levelling up and levelling down may result in a deterioration in quality of literature and art. Signs of this, I am afraid, are already evident.

KHYBER UNION CABINET 1944-45

Standing :— OSMAN, *Cabinet* ANWAR-UD-DIN, *Cabinet* WALI, *Librarian* KALASH, *Capt. Cabinet* HALIM *Cabinet*

Sitting :— FAZL RAHIM, *Sec.* Mr. I. D. SCOTT, *Patron* ABDUL ALI, *President* M. A. HASHIM, *Treasurer* GHULAM MOHD. *Asstt. Sec.*

President and Prize Winners
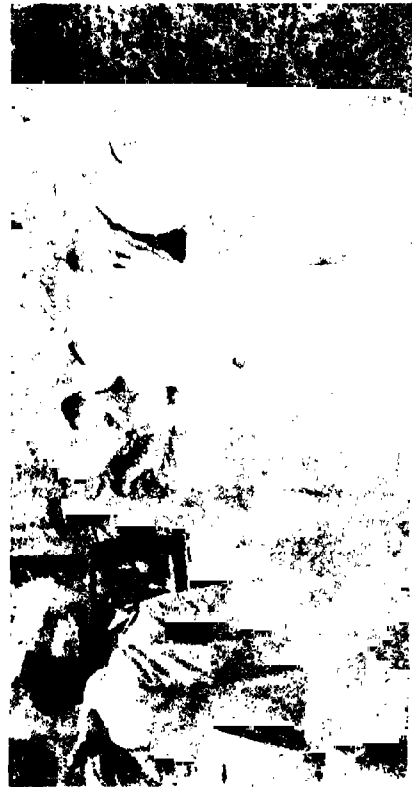
Snaps of H. H. The Nawab of Bahawalpur's Visit

courses of study. But as industrialization is going to play a prominent part in the future of the country, you would do well to also concentrate some efforts on industrial training, which undoubtedly the generations to come would expect.

Your achievements in the sphere of games and Olympics is a heritage which no one can question, and we all admire you for the good physique and the healthy outlook that your institution imparts. I would surely be lacking in my duty if I fail to impress upon you the fact that I would place more premium on character-building, and earnestly hope that side by side with physical training the building of character should not be lost sight of.

I was much impressed by the turn-out of your cadets and no wonder you can well be proud of the fine war services of your old boys from this institution and the record of 8 M.C's. and a Bar is indeed most unique I am glad that they have won such deserving distinction for their *Alma Mater* to be proud of them. They have earned indeed undying fame and added a bright chapter to the faithful and loyal record of service to their mother-land. I share your pride in this and in many other ways. I too have in my state, in employment or as subjects, many who hail from this very province. In my state forces also many are employed. In fact, since over a hundred years, men from here have been enlisting in the various units. They are always welcome and experience shows that they settle down very nicely with the local people. Both in the capacity of commissioned and non-commissioned officers, they have rendered meritorious services during this war, and world war No. 1.

I feel greatly honoured in having been invited to give away the prizes this evening, and all that I have seen here has been most interesting, I shall return to my State taking with me very happy memories of your beautiful institution, and these very delightful surroundings. It is indeed very fortunate that you have at the present moment as Governor of this Province one who is most keenly interested in your welfare. I have had the pleasure of being acquainted with His Excellency Sir George Cunningham for nearly 18 years, and I have the privilege of being counted amongst his friends. I feel confident that His Excellency will leave no stone unturned in giving his support to any scheme you may have in view, which would ultimately bring about better conditions, and enhance the already existing unique status this institution enjoys. His Excellency has already done so much towards the betterment and the welfare of this province and his name will no doubt be remembered for always as a true and sincere friend of its people.

In conlusion, I wish once more to thank you and your staff most sincerely for all the kind hospitality and extreme courtesy extended to me during this my rather very brief yet extremely interesting visit to your college.

Utopias*

The subject with which I have to deal is the concept formed by different writers at different periods of history of the ideal State or Commonwealth. It will, perhaps, be of interest to refer to and examine some of these concepts, and this examination should lead to some general reflections on the ideal.

The word "Utopia" itself goes back to the sixteenth century. Sir Thomas More, who lived in the England of Henry VIII, published in 1516 a book describing an ideal State which he called "Utopia". The word is a compound word formed out of two Greek words, "ou" and "topes", and means No Place or Nowhere. The meaning sometimes suggested, Good Place is incorrect.

*Originally broadcast from the A. I. R. Station, Peshawar and printed with the permission of the Station Director.

like this, which is, moreover so ideally situated and laid out. Discipline has been good during the year, and no serious cases occurred to mar the good name of the College.

Achievements and Possibilities.

(The presidental address delivered by His Highness Rukn-ud-Daula, Nusrat Jang, Hafiz-ul-Mulk, Saif-ud-Daula, Muin-ul-Mulk, Nawab-al-Haj, Sir Sadiq Muhammad Khan V Abbasi, G.C.S.I., G.C.I.E., K.C.V.O., LL.B., Nawab Ruler of Bahawalpur, at the Annual Prize Distribution held in the Ross-Keppel Hall. on the 31st March, 1945).

I thank you most sincerely for the very warm welcome which you have extended to me. I do feel extremely honoured to be in your midst this afternoon.

The reports that the principal and the headmaster have just now made are indeed most interesting. Though I do not wish to impose upon you a lenghty speech yet I do feel that one or two observations would not be out of place.

During the short period of its existence, this institution has made remarkable strides in its very progressive educational policy. This becomes so very obvious when one sees all that has taken place here. The stress that this institution has laid on the religious side of education, has made its position unique amongst its sister institutions in other parts of the country, and this was one of the reasons that I was so much looking forward to this visit with such great interest. What with its religious background and with its unique geographical situation, this institution has a very great future ahead in which it will be called upon to play a very important role. It is therefore only natural that this grand institution which is perhaps one of the youngest of its kind, should be expected to do great things in all nation building problems that are sure to come up in future years.

I very much welcome the idea of your introducing Urdu as a medium of instruction in your college. No words are necessary from me to emphasise too greatly this important aspect of education. The Universities in Europe and else-where have achieved remarkable progress in the various branches of learning chiefly because they adopted their own language as a medium of instruction. It would indeed be a momentous day for India if, throughout the country, those specially responsible for the educational policy of their respective units, were to come together and bring about something on such a basis as that for which you are striving with such genuine and earnest efforts.

I am very interested to learn that you contemplate having a separate University of your own. To my mind there could be no better way of preserving your ancient and historical traditions side by side with intellectual and physical culture, and above all your religious and social well-being. The future generations will thus have the advantage of receiving education in an atmosphere calculated to inspire confidence, good-will, and understanding, with a suitable background of knowledge that would equip them to face the ever-changing realities of life. If the post-War Reconstruction Schemes are to see the light of day, the only way to give them a real and solid shape is to create such an atmosphere in your educational institution, as would give future generations the necessary form of training to cope with the ever-increasing difficulties and onerous duties that future is bound to bring.

Your progress in all the different sections, especially in Physics and Chemistry, and your efforts in introducing Agricultural Training courses are all the more commendable, and your Province should stand to gain immeasureably, by such

Apart from our own inter-hostel tournaments in various games all through the year in which the Butler Hostel won both the football and hockey, we held a Provincial High Schools Tournament in the Xmas holidays, in which school teams from every district in the Province competed; and we have just concluded a successful and well-contested village football and athletics tournament for the benefit of the villages near the college. Fourteen football teams competed, and it is clear that this tournament fulfils a great need. At the end of the year we were glad to welcome football and hockey teams from Habibia College, Kabul, who stayed with us for a week and, we hope, enjoyed themselves

The U.O.T.C. has had another useful year's work, and has now the maximum number permitted to enlist in our company. I should like to see a better parade attendance by cadets, so that full value may be obtained frm the training offered. A very enjoyable camp was held for 15 days in Landi Kotal last May, and arrangements are being made for another this year in May. Captain Felstead has shown himself an able and popular adjutant in succession to Captain Cook who left us to join the parachute troops. Two more members of the staff, Messrs Hashim and Wahab, have been granted commissions in the U O T.C. This college has now got a total number of 158 Old Boys as commissioned officers in the various branches of the armed forces Of these, eight have won the M C and one, Major Ghulam Qadir, the Bar to the M.C. This fine officer has recently been killed in Burma while leading his men against the Japanese. A ninth officer, Major Hayaud Din, has been awarded the M B.E. during the War. This is a very fine record, of which the college may well feel proud.

College SOCIETIES have carried on their work throughout the year, some with greater enthusiasm and regularity than others. Abdul Ali was re-elected President of the Khyber Union, a feat which has only once before been equalled in the history of the College. Debates have been regularly held, including the All-India Sir Abdul Qayum Memorial Debate won this year by the Forman Christian College of Lahore and the Provincial High Schools Debate whice was won by Islamia High School, Nowshera. The Majlis i-Islamiyat continues its work, and also held this year a High Shools Theology Debate in which boys from all over the Province competed. The Khyber Athenaeum had an interesting series of lectures during the winter and the Scientific Society also met regularly. The issues of the College Magazine have suffered almost as much from the difficulty of getting paper as from the reluctance of contributors to come forward. The Duty Society has continued its good work and I am glad to say, has now an invested fund of Rs. 23,000/-, in addition to giving a considerable number of scholarships to poor students; donations to this fund, great or small, would be very welcome. If our collections this year are very good it might be possible to build a Duty Society Hostel, the income from which would accrue to the Duty Society. I should also like to draw the attention of visitors and students to the Art Exhibition open today in the Khyber Union Hall, which has been arranged under the auspices of the Khyber Athenaeum They can also see our silk-worm breeding activities, a very profitable hobby which I hope many students will study as it is interesting as well as profitable; in this, and also in the bee-keeping section which we are developing, I am indebted to Mr. Mohd Ahmad for the care and trouble he takes. The College Co-operative Society continues to expand, and is now in process of acquiring a bus, which will be very useful to the College. The Village Uplift Society is now running a regular school in Gharibabad, a nearby village, in which students are the teachers, and an adult education class for college servants is run by the B.T. students. I am glad to note that the Old Boys Association is now becoming a well-organised body, which is destined to play an increasing part in the future of the College.

I am grateful to members of the staff, both teaching and non-teaching, for their work and assistance during the year. Time passes quickly and happily in a college

end of the war to be put into operation and the opportunities of service to their country will be great and many for all those who are now students. I hope they will fit themselves for this service as well as they can; and I hope that the Provincial Government and the future FRONTIER UNIVERSITY will help towards this end by introducing as good a system of education as can be devised for the needs of this Province. In particular, I am firmly convinced that it is necessary to substitute *Urdu* for English as the medium of instruction in Colleges, if any real progress is to be made and any real culture developed. This is my third year in this college, and it has become clear to me that the labour spent by students in studying their subjects through the medium of English is out of all proportion to the benefits achieved; and not only that, but the mental effort required is such that most students leave the college with no desire for any further study or even any further serious reading. The same state of affairs, I am told, exists in other colleges, and yet this question appears to be completely ignored by University authorities. It is one of the main justifications for a separate Frontier University that it will give us in this Province an opportunity to introduce teaching in Urdu.

During the past year there have been only two additions to our STAFF; we welcome Mr. Mohd Ismail Sethi as Lecturer in Economics and Mr. M R Toosi as Demonstrator in Chemistry. I hope they will find in this college a congenial atmosphere for their work. Mr. A. Azeez Farooq left us to join the Provincial Civil Service where I am sure he will have a successful career.

This year we have have a record NUMBER, 235, of first year students admitted into the college, in spite of excluding those students who pass the Matriculation Examination in the lower third Division. These large admissions have put a strain on our accommodation, and students are being forced to live in conditions which are far from ideal for study; they have also meant great pressure on class-room accommodation, particularly in science subjects, where the number of students is far above what it used to be, and where it has been necessary to divide first-year students into two sections. There is urgent need for a new college hostel, and for some extension to our laboratory accommodation. I am glad to report that for the first time the number of students studying Agriculture in the First Year reached twenty.

Examination RESULTS were satisfactory, although they cannot be called very good. They were on the whole about the same as the university average, better in some subjects and worse in others. This average, however, is not a very high one, and I should like to see the Islamia College consistently above it. I have accordingly been reluctantly compelled to enforce a certain number of detentions this year. I regard detentions as undesirable in principle, but there appears to be no practicable alternative to ensure that the students do the work they are supposed to do. I think that this problem also would become much easier to deal with if the medium of instruction were Urdu.

We have had another vigorous and successful year in SPORTS. Our Hockey Eleven not only won its first round in the university tournament against our old rivals the Edwardes College, but reached and drew the final of the Provincial Hockey Championship. Our athletics team won handsomely our annual fixture with the Edwardes College, and also carried off the honours at the Rawalpindi District Olympics meeting. We had quite good football and cricket teams which have played a number of matches agasnst local sides; and both our hockey and football teams have entered for various Peshawar tournaments. Two of our hockey players, Ghulam Nabi and Hamid, were selected to play for the province, the former being also selected for the University; and our outstanding footballer, Ibrar Hussain, otherwise known as Bali, was selected to represent the University, as was out Athletics, captain, Iqbal Qureshi.

that, whatever the future constitution of India may be, 2+2, will still make 4 and the exact sciences will continue to be exact sciences, whether they are taught in Peshawar or Madras.

A complaint has also been made that the Board's Report says very little about Religion. I think, however, that what it does say is emphatic enough, as it states quite definitely that any instruction, which has not a strong ethical basis, will prove barren in the end. There was, however, a special reason why the Board did not deal in any detail with the place of religious instruction in their Report, and that was because they had appointed a Committee to examine and report upon this most important and delicate problem and clearly they could not anticipate the Committee's recommendations

What, however, concerns me more than definite criticisms of the Report which after all are open to a reply, is the underlying suggestion which I have come across in so many quarters that developments which have proved practicable in other countries cannot be carried out in India. Nothing could be more opposed to the all-out development of India's resources by which alone she can hold her own in an inter-dependent world than defeatism of this kind, and it is because yours will be the generation on which will fall probably the gravest responsibility that has ever fallen upon youth in the course of history that I want to urge you with all my power that whatever else you may become you should never become defeatist. It will be your business to re-make a world which twice within a generation has been brought to the brink of chaos My own view is that if there is to be any survival for the human race we have had our chances and we cannot afford—or perhaps I should say *you* cannot afford—to make any more mistakes. We must recognise, I think, that an entirely new approach is required to almost all human problems. Physical valour, which of old used to settle disputes, is now very much at a discount. A little crippled man like Goebbels, with his poisoned mind and poisoned pen, has been largely instrumental in sending millions of men to death! If what my scientific friends tell me is correct, we are within a reasonable reach of the atomic bombs which will enable some puny creature operating in complete safety hundreds of miles away to destroy completely a vast city. It is quite clear, therefore, that the problems of the future will have to be approached from a new angle and that, if necessary, those who would solve them must be ready to adopt a new scale of values. It is difficult to cut adrift from the past, particularly when that is associated with ideals and traditions, which we have learnt to venerate. But the shape of things to come is increasingly ominous, and if we disregard the obvious lessons of the last 5 years, we shall not be given another chance to save the human race, let alone to ensure the progress of civilisation.

The Principal's Annual Report

First I wish to extend a welcome on behalf of the college to His Highness the Nawab of Bahawalpur, who has been good enough to come here today and preside at our function. His Highness has been a benefactor of the College for many years, and we are very glad to welcome him in person in our midst.

We are coming to the and of another year's successful work of the Islamia College, which continues to play its important part in the educational life of the Frontier Province. PLANNING is in the air these days in India, and it is likely that this college will play a vital part in the schemes which are now being drawn up for educational expansion in the N.-W.F.P. These schemes await only the

2. A reasonable provision of education before the age of six in the form of nursery schools and classes.
3. Secondary or high school education for those who show the capacity for benefiting by it.
4. University education, including an adequate provision of post-graduate and research facilities for picked students.
5. Technical, commercial and art education.
6. Adult education, both vocational and non-vocational of all kinds and standards, to meet the needs of those who were denied adequate opportunities in their earlier years or recognize the importance of supplementing what they then received.
7. The training of teachers.
8. An efficient school medical service, which will see that children are made healthy and kept healthy.
9. Special schools for children suffering from mental or physical handicaps
10. Recreational facilities of all kinds for people of all ages to satisfy the craving for corporate activity and to counteract the drabness of the conditions in which so large a part of the Indian people otherwise spend their lives.
11. Employment bureaux to guide school and college leavers into profitable employment, and so far as possible to adjust the output of the schools to the capacity of the labour market.
12. An administrative system which will place initiative and authority in the hands of those who understand and care about education.

I want to make it quite clear that this Report has been prepared not by me but by a body of people with very considerable experience of education and the great majority of whom are Indians.

The Report has received a great deal of rather indiscriminate praise and comparatively little constructive criticism. I am rather concerned about this as I feel so difficult a matter as the provision of an educational system suited to a country, so vast and varied as India, is a matter which should provide ample grounds for honest differences of opinion. I shall not attempt today to deal with the criticisms that the scheme costs too much or takes too long. I have already pointed out on other occasions that both these questions depend almost entirely on the problem of recruiting the teachers required and paying them reasonably adequate salaries. I only want to refer today to the two criticisms which may be of particular interest to you here. There are some people who feel that the C.A.B. Plan, in some way or other, is not suited to Muslims. If that were true, it would, of course, be a most serious objection. But whether there is to be one India or two Indias or several Indias or whether there is to be a Hindustan or Pakistan or a number of other "Stans," I am prepared to challenge any of the critics to examine the Board's Plan and find anything which would not fit in with the future political organisation of this country, whatever it may be. The Board's recommendations are based on the assumption that good parents, wherever they may dwell or to whatever caste or community they may belong, will want their children to grow up physically fit, mentally alert and morally sound. The basic principle which the Board feel should underlie all instruction is that of learning by activity—a principle which has, I believe, been accepted by educationists all over the world. Similarly with regard to the content of the instruction, I presume

OVER THE WESTERN FRONT.- Elsewhere we are reproducing a very interesting letter from Mr. A. K. Qureshi. He is one of the very few 'old boys' of ours who has taken to journalism as a career, and has the distinction of being the only Indian Muslim to be deputed to a war theatre as a military correspondent by the most important News Agency of the British Commonwealth of Nations. He spent about two years with Allied forces in Italy and is now at the Reuters headquarters in England. We wish more of our old students on active service could let us have news about them.

S.

The Remaking of India through Education

Address delivered by Dr John Sargent, M.A., C.I.E., Educational Adviser to the Government of India, at the College, Convocation held on the 31st March, 1945.

It is a great pleasure to me to re-visit this College after 4 years, and I am very grateful to your Principal for giving me the opportunity. I am also very glad to be able to offer to those, who have graduated to-day, my congratulations and my very best wishes for happiness and prosperity in the future.

In the ordinary way I find it very difficult to speak to young men but my real difficulty is not so much what to speak about as how to say it. Now that victory seems so near, I imagine that we are all wondering what we are to do with it! It would not merely be tragic but it would probably be fatal to the survival of the civilisation if we fail this time, as we did a generation ago, to gather the fruits of victory.

There seems to be a general agreement among the Allies that what we have to do this time is to make the world safe for the ordinary man. Phrases like 'social security' or 'social justice' or 'the four freedoms' or similar ideals have become familiar during the last few years, and I am hopeful enough to believe that there is a real desire throughout the world to improve the lot of the ordinary man and ordinary woman. The question is how to do it. I need hardly say that my own answer is 'by increasing educational opportunities.' I admit that education is not only my profession but also my hobby and that I see in education the source of all happiness and of all power, if it is properly used. Moreover, my experience suggests that there is probably no country in the world where education could do so much for the ordinary men and women as it could in India, that is, if we could only discover the type of education, which is suited to Indian needs.

As you are probably aware, the Central Advisory Board of Education, during the last 6 or 7 years, have been studying carefully the question of India's educational needs in the hope that at the end of the war a determined attempt would be made to give India a system of education approximately equal to those existing in western countries before the war. I have not the time to explain in detail what the contents of this Report are and I am glad to know that some at any rate of those who are listening to me will already have read it. I will only summarise the main branches of the Board's Plan :—

1. Universal, compulsory and free education for all boys and girls between the ages of six and fourteen in order to ensure literacy and the minimum preparation for citizenship.

HOBBIES.—Mr. Muhammad Ahmad deserves sincere congratulations for the success with which he has been conducting interesting and useful experiments in bee-keeping and silk-worm rearing. The number of bee-hives is steadily increasing and more and more of students and others are getting interested in this profitable hobby. A sum of Rs. 500 is reported to have been realised out of silk-worm eggs which originally cost Rs. 5 only We do not know of any other industry that can yield such profitable results within such short time and at such small cost. In one of the zoology rooms may be seen worms in various stages of development, and eager eyes watching them with paternal care. We hope some at least of our students will introduce the industry in their villages, where mulbery-trees abound. The photography class has had to be discontinued owing to the impossibility of obtaining photo goods and paper.

PROVINCIAL HIGH SCHOOLS TOURNAMENT—was revived this year, and was held during the Christmas Vacation. All districts of the province were represented, and fairly high standards of play were displayed. The championship in football was won by Islamia Collegiate School. Hockey and Athletics both went to Islamia High School, Kohat. The prizes and certificates of merit were given away by the Hon'ble Khan Muhammad Samin Jan, Ex-Minister for Education, N.-W. F. Province, who congratulated the winners on their achievements and stressed the necessity of physical culture and of playing the game of life in an honourable manner.

STAFF STUDY CIRCLE.—The circle has held a number of meetings, at which members of the staff have discussed important subjects of educational and general interest. Prof. Q. M. Fareed initiated a discussion on 'Revaluations in Education', Prof. H. Harris read a paper on 'Pope and his poetry.' Mr Noor Ahmad Khan enumerated the remarkable inventions and discoveries made by the Arabs in the realms of philosophy, mathematics, medicine, chemistry, physics and other branches of science. Prof. Mian Mushtaq Ahmad spoke on 'Organic inheritance in man.' Dr. Muhammad Ihsanullah Khan in a thoughtful paper stressed the positive utility of philosophy as a means of developing the rational faculty and promoting the understanding of men and matters. Prof. Sheikh Muhammad Timur discussed "The Idea of God and Human freedom", and emphasized the incompatibality of the popular idea of God's omnipotence with man's free-will.

PUBLIC SPEAKING CLASS.—A 'Public Speaking' class has been meeting once a week under the auspices of the Khyber Union. Prof. Q. M. Farid has, with the assistance of Mr. Bashir-ud-Din, been training selected students in the art of public speaking. Unfortunately, attendance has not been very regular. Hence, nothing can be said just yet as to the success or otherwise of this interesting experiment. We do hope, however, that attendance will improve and some tangible results will be obtained.

HOSTEL GARDENS.—The Inspection Committee consisting of Mrs. Scott, Prof. Nawazish Ali and Sh. Said Rasul has been visiting each hostel every month. Well-kept gardens, properly laid-out plots and well-arranged flowerbeds have won praise and even prizes for the bearers of the hostel or hostels concerned. Methods of improving the general look of the hostels have been suggested by the Committee. As a result, the quadrangles now have a brighter appearance.

VISITORS.—Major Sher Khan, M. C., Capt. Amanullah, Lt. Ali Gul Jaffery, 2/Lt. Ali Muhammad visited us during the year. We were glad to welcome them once again and to know that they were doing very well in the fighting forces of the country. They appealed to the students to make themselves physically fit and mentally alert and to join the armies which were fighting for the cause of democracy and freedom.

The Association's demand for effective representation on the Council of Management of the College has been conceded to the extent that two out of the four members to be elected annually will be old boys. Another important resolution has stressed the desirability of bringing the remains of the great founder of the Darululum to the College premises This has had universal support from all sections of the Frontier intelligentsia, and the next of kin of the late Nawab Sahib are reported to be giving careful consideration to this request It is understood that funds are being collected for the eventual construction of a separate Old Boys Lodge at the College.

We have always been of the opinion that a well-organized Old Boys Association is a great source of strength to the *alma-mater* and can do a great deal of good both to the institution and to its own members. We wish the Association every success. It will have our whole-hearted support and co-operation in its efforts to serve the best interests of the Darululum.

AFGHAN MISSION.—On the conclusion of a 3-week tour of historical buildings and educational institutions of Delhi, Agra, Aligarh and Lahore, an Afghan Publicity and Cultural Mission consisting of Mr. Said Kasim Khan "Rishtya" (Vice-President, Afghan Government Press Department), Mr. Abdul Hayy Habibi (President, Pushtu Tolana, Kabul), Mr. Abdur Rahman Pajwak (Director General of Information, Afghan Government) and two other officials of the Afghan Information and Publicity Department visited our college on the 28th March. They were received by the Principal and senior members of the staff, and were taken round the college, laboratories, hostels, playgrounds and the library. They evinced deep interest in our system of education and made searching enquiries regarding the academic and hostel life of our students. Our collection of old and rare manuscripts proved a great attraction for them. The existence of the Faculties of Agriculture and Teaching at our college came to them as a pleasant surprise. The leader of the deputation thanked the Principal for his courtesy, and we hope that he and the members have taken away pleasant memories of their visit to the Darululum.

THE CO-OPERATIVE STORES.—The stores are making good progress. In 1943-44 they dealt in books, standard cloth, soap, boot-polish and a few other articles of stationery. During the last year, the business has been extended to include sports material, hosiery, 'fine' cotton cloth, woollen goods, Dalda vegetable ghee and electric bulbs. The total turn-over during the year has amounted to about Rs 16,500/-A banking section has been added during the year, and has provided valuable assistance to members who needed it. The Society has successfully completed preliminary arrangements for running a regular bus service between the College and Peshawar. This will meet a very real and long-felt need of all residents on the college premises.

ADULT EDUCATION.--Universal literacy cannot be attained unless basic education is made free and compulsory for all boys and girls of school-going age, and a widespread system of educating the adults is introduced. The technique of teaching younger pupils being in principle different from that of teaching grown-up men and women, no method of training the teachers can be considered perfect if it does not cover both the types of education. Hence, our B T. students have to devote at least one full 'period' to adult education under the supervision of a member of the staff. They teach college and hostel servants the 3 R's. Books, slates and stationery are supplied out of a fund contributed by members of the college staff. Some of the adult pupils have made fair progress in their studies but really satisfactory results cannot be achieved unless attendance at the Adult Education Class is made compulsory for all illiterate servants on the college premises.

UNIVERSITY CANDIDATES.—The difficulties of obtaining supplies of paper may delay the issue of this year's annual number of the 'Khyber' almost to the time when the University candidates will be leaving for their homes. So, we take this opportunity of saying good-bye and offering them our very best wishes for success in whatever sphere of action they may choose to adopt They are on the threshold of a new life and are leaving the College with mingled feelings of hope and fear. It will not be easy to adjust themselves to their new surroundings. But we do hope that if they 'trust in God and do the right', the mists will soon be cleared away, and the life they have lived at the College and the teaching they have received here will stand them in good stead and lead them on to paths of triumph and glory. In the midst of their worries, the college and the hostels, the laboratories and the library, the Union Hall and the playgrounds will, we are sure, come back to them in glowing colours, and their recollection will provide them with much-needed inspiration and courage—" a touch of June to their cold November."

U. O. T. C—The University Officers' Training Corps has continued to grow steadily, and has now reached a full company strength Many others would like to join, but unfortunately it is not possible at present to exceed the authorised limit of 154 cadets. Arrangements are, however, being made to start an I. A. F. training centre in the near future, and it is hoped that it will prove equally attractive and grow to full strength immediately.

The company had an opportunity of watching the R. I. A. F. Display and Flight at the Peshawar aerodrome. Transport was provided by the military, and more than sixty of our cadets enjoyed the thrills of flight in the air.

The Army class is continuing to do useful work for preparing candidates for Emergency Commissions in India's fighting forces.

UNIVERSITY EXTENSION LECTURE.—Dr. J. N. Khosla, Punjab University Reader in Political Science, delivered an interesting 'extension' lecture on "Indian States and the Federation", on March 28. He referred to the enormous variations in the size and political development of the numerous states in India, and pointed out the fact that most of them had not attained what in British India is called the Minto-Morley reform stage. The federation envisaged by the Government of India Act of 1935 gave the rulers the power to *nominate* the representatives of their states, but at the same time involved a certain amount of renunciation of sovereign rights regarding federal subjects and the federal court. The politicians of British India did not like the presence of nominated representatives of autocratic rulers in a democratically elected assembly; and the rulers were in no hurry to surrender any part of their 'sovereign' powers. The federal part of the Act consequently could not be brought into force and is to all intents and purposes a dead letter. The learned lecturer described how even though most of the states were still politically backward, the impact of modern world tendencies and progressive views of the neighbouring provinces had led to a steady, though rather slow, movement towards a democratic way of life even in these states. He expressed the view that a large number of states could be abolished without any harm to anybody; but that the remaining ones should in their own interest join the federation or confederation of the future India. In the meantime, they must introduce and develop a truly representative form of Government within their jurisdiction and agree to be represented in the federal centre by persons properly elected by their people. Prof. Muhammad Riza Khan thanked the speaker for his interesting and thought provoking lecture.

THE OLD BOYS ASSOCIATION - is showing welcome signs of life and activity. A constitution has been drawn up, passed and enforced. General elections have been held. Important resolutions have been passed. Local branches have been, and are being, established in different parts of the province.

Special prizes for proficiency in extra-curricular sphere of studies were awarded to the following students :—

H. E. Sir George Cunningham's prize for General Knowledge	Karimul Wadud
H. H. the Mehtar of Chitral's prize for Senior Essay	Ijaz Husain
K. B. Haji Sadullah Khan's prize for original Pushtu poem	Akbar Ali
K. B Haji Kuli Khan's prize for Junior Essay	Sardar Bahadur
K. B. Kazi Mir Ahmad Khan's prize for Theology	Abdur Rahman Shah
Khyber Union Senior prize Debate—First prize	Fazl-i-Ranim
Khyber Union Junior prize Debate —First prize	Abdul Halim
Khyber Union 1st year prize Debate—First prize	Abdul Aziz
Declamation contest—First prize	Ijaz Husain
Ploughing Competition—First prize	Mohd. Husain

The following students received medals :—

Roos-Keppel memorial gold medal for the best all-round student of the year.	Abdul Ali
Gold medal for the best student in Degree classes (B A and B. Sc.)	Kamal Khan
Silver medal for the best student in Intermediate (Arts) classes	Zainul Abidin
Silver medal for the best student in Intermediate (Science) classes	Sardar Bahadur

His Highness rose to deliver his address amidst loud and enthusiastic applause. He referred to the great problems that are bound to challenge the post-war world, and emphasized the need of providing the rising generation, with requisite physical intellectual, moral, and spiritual equipment to fight the sterner battles of peace successfully. He appreciated the idea of making Urdu the medium of instruction and blessed the proposal for the establishment of a separate University for the Frontier Province. His Highness's address is printed in another place in this issue.

K. B. Khan Muhammad Ibrahim Khan, Chairman of the Council of management of the Darulululm, thanked His Highness most heartily on behalf of himself, the Council of management, and the staff and students of the College, for the great kindness with which he had accepted their request to preside over the prize-giving, for the inspiring address he had delivered, and for the keen interest he had always taken in the well-being and advancement of the Frontier Province and of its premier educational institution. A munificient donation of Rs. 15,000 was announced on behalf of His Highness amidst loud and prolonged cheers.

This highly successful function was brought to a close with a grand tea party, which was attended by His Excellency Sir George Cunningham and a large number of Civil and Military officers and distinguished residents of the province.

College Notes

STAFF.—There have been very few changes in the staff. Mr. Abdul Azeez Faruq, Lecturer in Economics, left us last summer to join the Provincial Civil Service. We are glad to hear that he has already successfully passed through the stages of training as a 'Patwari', a 'Qanungo' and an 'N. T.', and is now at Mardan acting as an apprentice Engineer or perhaps a Forest Officer! He has our best wishes for success in his new sphere of work. His place on the staff has been taken by Mr Muhammad Ismail Sethi. Mr. M. R. Toosi has joined us as Demonstrator in Chemistry. We welcome both in our midst and hope that they will have a happy time here.

COLLEGE CONVOCATION.—The annual Convocation for the conferring of degrees was held this year on the "Founder's Day", the 31st March 1945. Dr. John Sargent, Educational Adviser to the Government of India, admitted the following successful candidates to the degrees for which they had qualified :—

B.A.—Mirza Naseem Anwar Beg, Amir Zaman Kundi, Nausher Khan Fazl-i-Halim Mian, Shafi-Ullah, Bashir Muntazir, Ahmad Shah Mian, Ihsan-ud-Din, Rangin Shah.

B. SC.—Syed Mahboob Shah, Rajindra Nath, Puran Chand Sethi.

He then delivered a highly inspiring address in the course of which he exhorted his young audience to come forward and make their contribution towards improving the lot of ordinary man and woman in the post-war world. The learned speaker then described how this could be achieved through the introduction of a national system of education. The Principal in his concluding remarks thanked Dr. Sargent for his kindly accepting, in the midst of his numerous preoccupations, the invitation to preside over the convocation and for his very interesting and very instructive discourse. The convocation address is printed elsewhere in this issue.

PRIZE DISTRIBUTION.—The annual prize-giving ceremony was held on Sunday, the 31st March 1945, under the distinguished presidentship of His Highness Nawab Sir Sadiq Muhammad Khan Abbasi V, G.C.S.I., G.C.I.E., K.C.V.O., LL.D., Nawab Ruler of Bahawalpur.

The proceedings were opened by a student from Bahawalpur with a recitation from the Holy Al-Quran. The Principal, Mr. I. D. Scott, presented his annual report (printed elsewhere) on the working of the College. S. Sultan Husain Shah, Officiating Headmaster of the collegiate school, read his account of the work done by the school during the year.

His Highness then gave away the prizes and medals for academic distinctions and 'colours' for proficiency in games and sports. The following students were admitted to the roll of honour :—

Academic :—Muhammad Akram—for obtaining a First Division and standing first in the province in Intermediate (Science) Examination.

Muhammad Nazir—for obtaining a First Division and standing first in the province in Intermediate (Arts) examination.

Abdul Malik—for obtaining a First Division and standing first in the province in the First Examination in Agriculture.

Athletic.

Muhd. Iqbal Qureshi	(Athletics)
Ghulam Nabi	(Hockey)
Abrar Husain	(Football)

the bitter experience He seems to have learnt a lesson, though at a terrible cost. In his opinion, there appears to be something wrong with the body-politic of world society, which ought to be remedied. The sceptic spots which are spreading poison all round should be removed or cured. Something effective should be done immediately, *now*, *before* the termination of hostilities. A *new* mould, a *new* pattern should be devised, so that when the War ends man may know how to fashion his life without the danger of being forced to drift towards another abysmal pit.

This precaution was not taken towards the end of the last Great War; and mankind has had to suffer terribly for that omission. Hence, this time all nations are making out plans to meet the peculiar conditions of post-war life, and are getting ready to overcome the difficult situation that is bound to arise when millions of people now engaged in war-work will come back to their peace-time vocation. 'Plan or Perish' is the slogan of the day, in India as in other countries. Schemes of reconstructing the political, economic and social structure of Society are being drawn up, and vast programmes of industrial and agricultural expansion are being discussed. India is looking forward to a post-war world in which she will have a national system of free and compulsory education for all her sons and daughters; a world in which the demons of disease, want, squalor, idleness and ignorance will have been slain, freedom of thought and expression will have been ensured for all, and the general economic and cultural level of the people will have been raised considerably. What contribution are the Frontier young men going to make towards bringing that happy state of affairs into being?

Planning is on every body's lips to-day. But has planning by itself any magical properties? Can mere planning transform the life and history of a nation? It has been tried in various countries before now. It solved the bread problem of Soviet Russia, but took away individual liberty. It removed unemployment from Germany but regimented human life for destructive purposes India should take care to see that her 'plans' do not aim merely at increased production and equitable distribution of wealth but also include "cultural and spiritual values and the human side of life." They should seek to promote the welfare and happiness of the whole population. But while plans have been put forward for economic, agricultural, educational, political and transport reconstruction after the war no attention seems to have been paid to the great problem of all problems. What *type of society* are we envisaging? Into what *kind* of men or women do we want to convert our population? What sort of *culture* are we aiming at? These are important questions, and deserve careful consideration. We hope our readers will ponder over them and let the province have the benefit of their considered opinions.

Should the sartorial snobbery of the town be preferred to the simple coarse attire of the village? Should the ever-widening gulf of estrangement between the urban and the rural population be allowed to grow? Should the lower economic level and higher illiteracy of the villager be permitted to increase the existing divergence in the social and cultural pattern of the city and the village? Should it be forgotten that real India lives in the 'village', and that the 'village' represents the real India. Should not the educated youth of the country then identify itself with the uplift of their less fortunate brethren in the villages? Fortunately, the antagonism between the urban and rural interests in our province has not assumed such proportions as in the Punjab. Let us, therefore, gird up our loins and go out into the country to serve and educate and elevate the good, simple folk living there, before it is too late.

A.A.S.

THE KHYBER

Vol. XXVIII] PESHAWAR, MAY 1945. [No. 2

Editorial

The last Great War was fought with the avowed object of putting an end to all war and of securing a stable peace for all time. A League of Nations and an International Court of Justice were set up for this purpose But how signally these institutions failed to perform the functions assigned to them is a well-known fact of modern history Every time their efficacy as instruments of universal peace was put to the test, wavering and vacillation set in inevitably and defeated the end in view. Japan could not be prevenred from invading and annexing Manchuria. Mussolini defied the League's feeble protests against his conquest of Abyssinia. The League conventions were flouted, and its power and authority to lead and guide was challenged Instead of the world being made 'safe for democracy', foundations were laid for the birth and growth of fascism and dictatorship Treaties were regarded as mere 'scraps of paper', and President Wilson's 14-points became mere 'pious hopes.' Humanity continued to be divided into unnatural categories of 'Superior' and 'Inferior' races. Imperialisms and 'Mandates' flourished and prospered, and the 'ruled' and the 'exploited' remained at the mercy of the 'rulers' and the 'exploiters'. The League of Nations was to all intents and purposes dead and buried.

The stage was set for a new upheaval of a world-wide character. Seeds of discontent and suspicion had taken firm root in the minds of the comparatively weaker races. Commercial rivalries had created acute tension among the bigger nations. Differing economic ideologies had come into violent clash. Political and Military power was suppressing ambition to freedom. The whole atmosphere was charged with electricity Humanity was being irresistibly driven to a bottomless chasm. The final explosion came in 1939 which sent the whole fabric of human society crashing to the ground and plunged the whole world into a most terrible blood-bath. Since then millions of lives have been lost Crores of houses have been destroyed. Civilization is still tottering under the sledge-hammer blows of an 'all-out' war. Values and standards have changed. Virtues are being put to the severest strain. And the end is not yet.

Signs are, however, visible of the approaching cessation of this wholesale carnage and slaughter, and man has started looking beyond the screen of fire and sword. Within the life-time of a generation, he has had to pass through two most destructive wars of history, and can no longer contemplate with equanimity a repetition of

COLLEGE STAFF, 1944-45
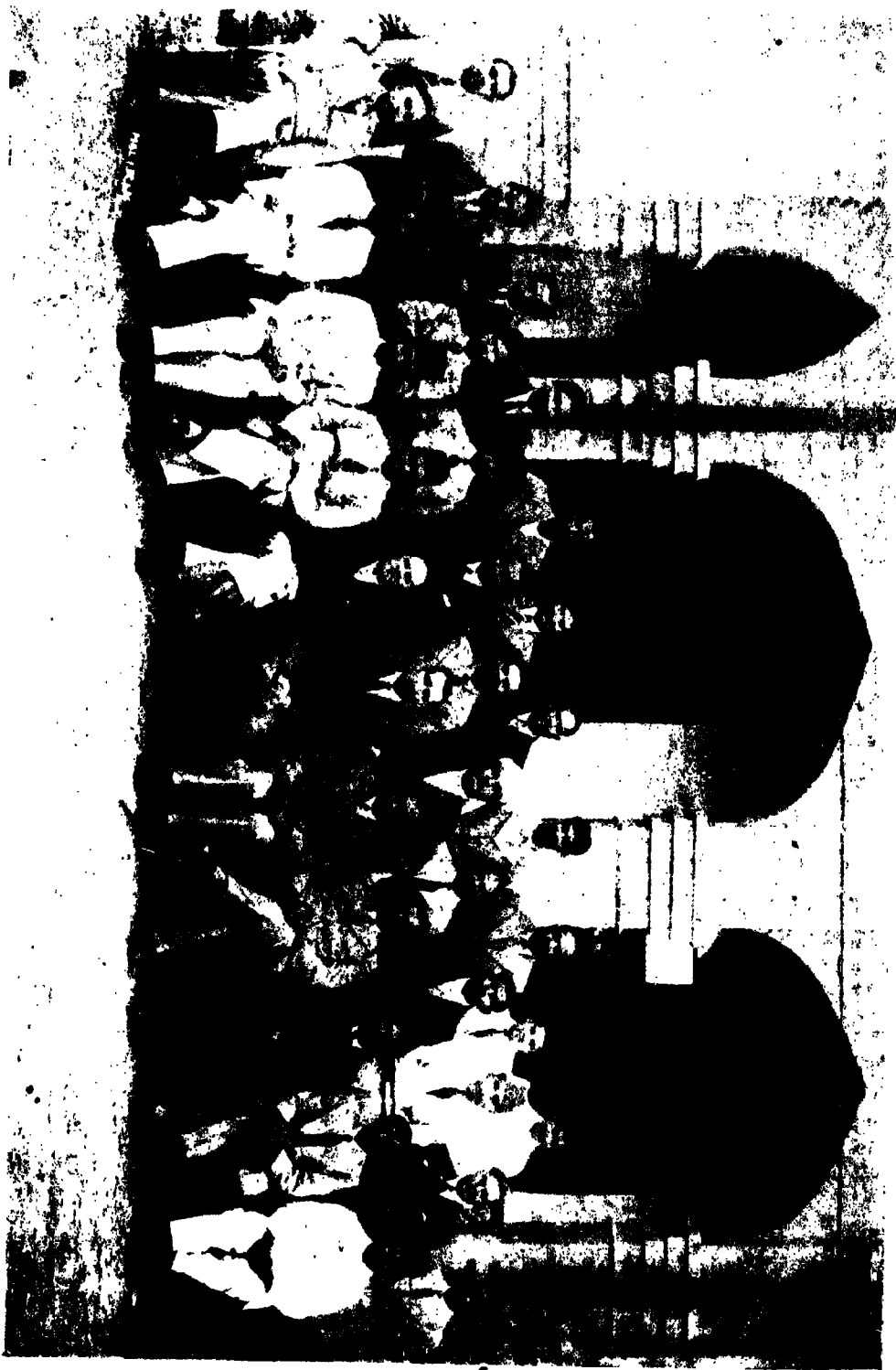
Sitting : —A. H. Qureshi, E. A. Pires, A. A. Sadiq Qureshi, Minhaj-ud-Din, H. Harris, I. D. Scott, S. M. Timur, H. M. Osman, A. Rahim, A. Beg, M. Fazil.

Standing :—1st Row —A. Razzaq, M. Adil Khan, A. Hashim, M. Ashraf, Q. I. Ullah, Nur Ahmad Khan, A. Wahid, M. Sadiq, A. D. Ansari, Nafis-ud-Din, H. Din, Mohd. Ahmad.

EDITORIAL BOARD, 1944-45
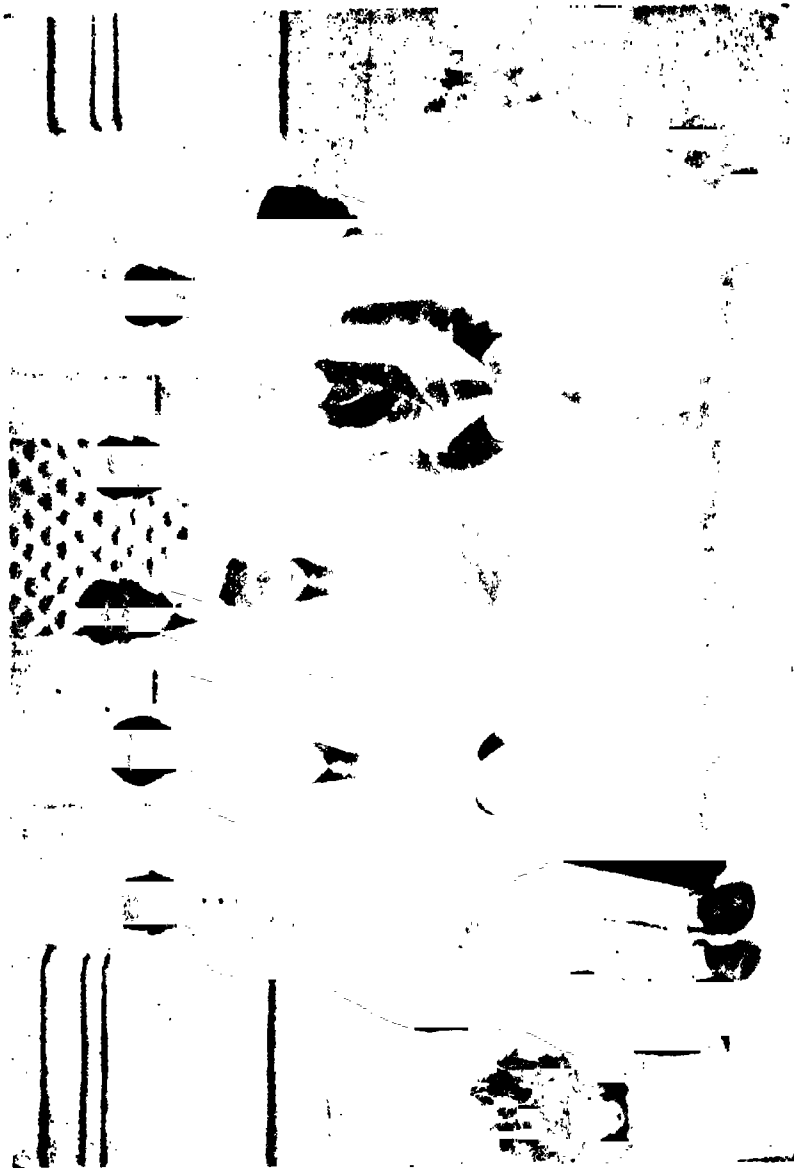
Standing :—Nasrullah (*Pushtu*), Kamal Khan (*English*), Ijaz Husain (*English*), Abdur Rahman Shah (*Urdu*), Mohd. Ahsan (*Urdu*).

Sitting : —Mr. Bashir-ud-Din (*English*), Mr. M. M. Kaleem (*Urdu*) Mr. I. D. Scott (*Principal*) Prof. Ahmad Ali Sadiq Qurashi (*Editor-in-Chief*), Mr. Nafis-ud-Din (*Pushtu*).

خیبر

دار العلوم اسلامیہ سرحد
پشاور

مدیرین
منظور احسن بی۔ اے آنرز
عبدالمجید اختر متعلم بی۔ اے آنرز

نگران
پروفیسر مفتی ایم جیبب ایم۔ اے

جلد (۲) | فہرست مضامین مئی۔ جون ۱۹۴۱ء | شمارہ (۶)

ارشادات

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

زندگی کی تمثیل ایک مغربی مصنف نے ایک پرندے کی پرواز سے دی ہے جو طوفان باد و باراں میں دریا کی طرف سے اُڑتا ہوا چند لمحوں کے لئے ایک روشن، گرم اور آباد کمرے میں سے گزرے۔ اور پھر نیستی کی اتھاہ و لامتناہی گہرائیوں میں کھو جائے۔ یعنی انسانی زندگی اتنی مختصر ہے جتنی اس کمرے کے ایک کونے سے دوسرے سرے تک اس مسافر پرندے کی پرواز! یا یوں کہہ لیجیے کہ زندگی ایک کھلنڈرے بچے کی نیند کی طرح ہے کہ آنکھ جھپکی، کروٹ بدلی اور آنکھ کھل گئی، آ کر بیٹا صبح ہوگئی۔ اور پھر تعلیمی زندگی جو اس مختصر عرصۂ حیات کا صرف ایک حصہ ہے؟ دنیا کا نظام بھی اسی طرح پر ہے۔ کہ جو تھے وہ نہیں ہیں اور جو ہیں وہ نہیں ہوں گے۔ یہ قانونِ فطرت ہے جس سے مفر ممکن نہیں ؎

فروغِ شمع جواب ہے رہے گا صبحِ محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

اگرچہ محترم برلاس مرزا۔ خواجہ نصیر۔ شگفتہ صاحب اور دوسرے اہل قلم حضرات کے چلے جانے سے خیبر کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ تاہم امید ہے کہ اربابِ خیبر اور مضمون نگار اصحاب کی کوشش و سعی سے یہ کمی بہت جلد پوری ہو جائیگی۔

موجودہ اشاعت کے لئے جو مضامین موصول ہوتے ہیں۔ وہ ہی حد تک مایوس کن ہیں علمی مذاق وادبی ذوق کے فقدان کے علاوہ بعض حضرات سلیس اردو لکھنے سے بھی عاری نظر آتے ہیں ملاحظہ ہو ایک بی اے کے متعلم لکھتے ہیں ــــ" وہ اپنی چارپائی پر پڑا خراٹوں کی بے ہنگام " غوغا آرائی میں ہمہ تن کوشش مصروف تھا " ــــ اب آپ خود ہی اندازہ لگالیں۔ کہ قابل مصنف نے اور کیا کیا گوہر افشانیاں کی ہونگی حصۂ نظم بھی کچھ کم دل شکن نہیں ہے۔ نہایت سوقیانہ اور پست مضامین، بے کیف اور عامیانہ سی طرز ادائیگی فرسودہ و بے جان سے محاورے اور عجیب عجیب ترکیبیں جنہیں پڑھ کر بے اختیار ہنسی بھی آتی ہے، اور رونے کو بھی جی چاہتا ہے۔

اسی قبیل کے افسانوں۔ غزلوں۔ نظموں، اور گیتوں کے بے پناہ انبار میں سے جو کچھ انتخاب کے قابل تھا وہ حاضر ہے۔ یاد رہے کہ مدیر کی حیثیت ایک معمار کی سی ہوتی ہے۔ جیسا مواد اُسے ملے گا۔ وہ اس

کے مطابق عمارت بنا دیگا۔

اس اشاعت میں دو مضمون ذرا زیادہ توجہ کے قابل ہیں۔ ایک ارباب دارالعلوم کے لئے اور دوسرا نوجوانانِ سرحد کے لئے۔

محترم عبدالصمد بلوچستانی نے جس حقیقت کو "بے نقاب" کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اگرچہ اہل نظر سے پوشیدہ و پنہاں نہیں ہے۔ تاہم اس کی طرف سے کچھ ایسا اجتناب برتا جاتا ہے کہ بقول شخصے

ع ا۔ وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

اور یہ تجاہلِ عارفانہ ضرورت مند اور مستحق طلباء کے حق میں زہرِ قاتل ہے۔

۵ گرگساں را دہند قند و شکر
وز ہما را جز استخواں ندہند

دوسرا مضمون شگفتہ صاحب کا ہے۔ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہیں گے۔ بہتر ہو کہ نفسِ مضمون خود قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے۔ اور اگر ممکن ہو سکے۔ تو ان کی آنکھوں کے رستے دل میں اتر کر دماغ و تعقل پر چھا جائے۔

ہمیں امید ہے کہ عبدالصمد کی صدائے احتجاج اور شگفتہ کی پکار بے نیل و مرام نہیں لوٹیں گی۔

اختر
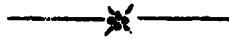
شذرات

یہ آخری شذرہ ہے جو میرے قلم سے نکل رہا ہے۔ پھر نہ جانے یہ موقع میسر آئے گا یا نہیں۔ اس لئے جی چاہتا ہے کہ میں صفحات 'خبر' پر اپنا دل کھول کر رکھ دوں یعنی ان خیالات کو آپ کے کانوں تک پہنچاؤں جو ہماری قومی زبان یعنی اُردو کی بہبودی سے وابستہ ہیں۔ اس تندہی اور سرگرمی کا ذکر کروں جس کے ساتھ اُردو کا ہمارے صوبے اور خصوصاً ہمارے کالج میں خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اور ان فدائع کی توضیح کروں جن کا التزام اس صوبے میں اردو کی ہردلعزیزی کے منافی ہوگا۔ لیکن افسوس ان سب خواہشات کی تکمیل کو ایک دفتر طولانی درکار ہے۔

البتہ چند باتیں لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں :-

اُردو سے ہمیں فطرتاً اُنس ہے۔ اسے قومی زبان بنانا ہمارا ایمان ہے۔ اور بظاہر اس کی اشاعت سے ہمیں سرمو انکار نہیں۔ لیکن فی الحقیقت ہم میں ہی جو اپنے تئیں اردو کے پرستار تصور کرتے ہیں۔ وہ جراثیم پرورش پا رہے ہیں۔ جو اُس کے حق میں نہایت مضر ہیں۔ فلمی دُنیا کے اُفق پر ہندی اپنے پرے جماتی نظر آرہی ہے۔ فلمیں بنانے والے ہندی نوازی پر تلے نظر آتے ہیں۔ ہر نئی فلم ہندی گیتوں کے لباس میں ہمارے دماغوں میں جہاں پہلے اردو کا رنگ جما تھا۔ اب ہندی الفاظ کو جگہ دے رہی ہے۔ اردو کی بیخ کنی کیلئے کیا ہی ہولناک لیکن بظاہر بے ضرر منصوبے باندھے جارہے ہیں۔ ہم اردو کے نام لیواؤں اور افغان جوانوں کے ذہن جو چند سال پیشتر ہندی کے ابتدائی الفاظ سے بھی ناآشنا تھے۔ اب ریت بریت اور پریم کے زہریلے نغموں سے معمور ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں جب ہم اردو سی میٹھی زبان کو محو کر کے ہندی کا اثر قبول کرلیں گے۔

آزاد ممالک کے جوار میں بسنے کے باعث کالج کے طلباء بھی آزادانہ روش کے حامی نظر آتے ہیں۔ بہتر تو یہ تھا کہ آزادی کے یہ جذبات کسی عملی شکل میں نمودار ہوتے۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ یہاں اب زبان کے بارے میں بھی 'آزادی' برتی جانے لگی ہے۔ اردو زبان کے حق میں جو بقول شخصے۔ ہندی کے خوف سے اسلامیہ کالج میں پناہ گزین ہے۔ یہ آزاد خیالی نہایت مضر ہے۔ تذکیر و تانیث کی غلطی تو یہاں غلطی تصور ہی نہیں کی جاتی۔ لیکن اس کے علاوہ الفاظ کی ہیئت کو بالکل ہی بدل دینا سراسر ناانصافی ہے۔ اور پھر طرّہ یہ کہ ہمارے کالج کے طلباء اردو رسالے اور اخبار چاٹنے میں بھی نہایت مشاق ہیں۔ اردو نوازی کا ثبوت دینے کیلئے ہمیں چاہئے۔ کہ اپنی تحریر و تقریر کی خامیوں کو دُور کریں۔ نہ کہ صرف اردو کی تعریف میں

گیت گانے پر اکتفا کریں۔

سائنس دن بدن مادیت کی طرف راغب نظر آتی ہے۔ روحانیت سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ اور ان علوم سے جن پر انسانی تخیل کا رنگ غالب ہے۔ اسے کوئی علاقہ نہیں۔ انسانی دماغ بھی اس اثر کے تحت قیاسات کی دنیا سے نکل کر ٹھوس اور مادی زندگی کی جانب مائل نظر آتا ہے۔ لیکن باایں ہمہ یہ امر نہایت ہی حیرت انگیز ہے۔ کہ اردو شاعری جس پر تخیل اور جذبات نگاری کا رنگ مسلط ہے نت نئے شاعر پیدا کر رہی ہے۔ یہ نئی پود کے شاعر کچھ امید افزا بھی تو نہیں۔ کہ ان کا وجود ادب کے لئے مفید ثابت ہو۔ یہاں تو وہ شاعر دیکھنے میں آتے ہیں۔ جو اردو بولنے سے ہچکچاتے ہیں۔ لکھنے سے گھبراتے ہیں، لیکن شعر گھڑنے میں وہ شیخیاں بگھارتے ہیں۔ کہ عیاذاً باللہ۔ ایسے شاعروں سے خدا دامنِ اردو کو داغدار نہ ہونے دے۔

نثر میں اردو کی تشنہ کامی ہی وہی چیز ہے۔ جس پر ہماری تمام تر توجہ مرکوز ہونی چاہئے۔ شاعری سے اردو کا دامن بھر چکا ہے۔ البتہ نثر کے میدان کی وسعت ہی خیال سے ماورا ہے۔ نثر صرف ناولوں، افسانوں یا دوسرے کثیف و لطیف مضامین لکھنے تک ہی محدود ہے بلکہ انگریزی ادب کی طرح اس میں بہت سی نئی اصناف کو معرضِ بحث بنایا جا سکتا ہے۔

عبدالرؤف شگفتہ

قصۂ امروزی کو داستاں سمجھا تھا میں! — نکہت و بو و بے سود و زیاں سمجھا تھا میں

تھیں نگاہ شوق کی رنگینیاں چھائی ہوئی، — مہر و ماہ و مشتری کو خاکداں سمجھا تھا میں

حاصلِ افسوس تشنہ کامیٔ ذوقِ جنوں — تنگنائے عشق بحرِ بے کراں سمجھا تھا میں

پردہ ہائے رنگ و بو تعلیل نظمِ کائنات — سادگیٔ شوق! ان کو حرزِ جاں سمجھا تھا میں

لذتِ ذوقِ فنا نے سب اٹھا ڈالے حجاب — "اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں"

دوریٔ منزل طلبگارِ دلِ برجستہ پا — قطرۂ طوفاں آشنا کو بے نشاں سمجھا تھا میں

تنگیٔ جادۂ منزل! انتہائے کیف میں — وسعتِ کونین کو لامکاں سمجھا تھا میں

مہر عالمتاب سے اختر ہوا رشکِ قمر — ذرۂ صحرا کو وقفِ امتحاں سمجھا تھا میں

مرحُومہ

مجھے اُس سے دیوانہ وار محبت تھی۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ آخر ہم محبت کیوں کرتے ہیں؟ تمام دنیا میں صرف ایک شخص کو چاہنا، اپنے دماغ میں صرف ایک ہی خیال کو جگہ دے دینا، دل میں صرف ایک خواہش رکھنا، ایک ہی نام لبوں پر بار بار آنا، صرف ایک ہی نام جو ہماری روح کی گہرائیوں سے اس طرح اُبلتا ہے جس طرح دریا اپنے منبع سے۔ ہم اُس نام کو دن بھر، ہر وقت اور ہر جگہ مالا کی طرح جپتے رہتے ہیں۔ کیسی عجیب چیز ہے یہ!

میں اپنی داستانِ معاشقہ بیان نہیں کروں گا۔ کیونکہ محبت ایک ہی کہانی ہوتی ہے، ہمیشہ ایک جیسی۔ میں نے اُسے دیکھا تھا اور اُسے چاہنے لگ گیا تھا۔ اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے۔ پورا ایک سال میں اُس کے گہوارۂ اُلفت میں جھولتا رہا۔ اُس کی باہوں میں لپٹا رہا۔ اُس کی اداؤں میں جھلکتا رہا۔ اُس کی نظروں میں سمایا گیا، اُس کے لباس میں اُلجھا کیا۔ اُس کے الفاظ میں گُندھا رہا، بندھا رہا۔ اور ہر اُس چیز میں جو اُس کے وجُود کا جزو تھی، جکڑا رہا، اور اس قدر مضبوطی سے جکڑا رہا کہ مجھ سے دن اور رات کا امتیاز چھِن گیا۔ یہ احساس باقی نہ رہا کہ میں مُردہ ہوں یا زندہ، اسی فرسودہ نظامِ حیات میں ہوں یا کسی دوسری دُنیا میں۔

آخر وہ چل بسی۔ کیسے؟ میں نہیں جانتا، مجھے اب کچھ بھی معلوم نہیں۔

برسات کی ایک شام کو وہ گھر بھیگی ہوئی آئی تھی۔ اور دوسرے دن اُسے کھانسی ہو گئی۔ ایک ہفتہ کھانس کھانس کر وہ بسترِ علالت پر جا پڑی۔

اُسے کیا ہُوا تھا؟ اب مجھے معلوم نہیں۔

ڈاکٹر آئے، نسخے لکھے اور چلے گئے۔ اُس کا علاج ہُوا، ایک خدمتگار عورت اُسے دوا دارو پلاتی رہی جب اُس کی پیشانی نمدار اور گرم تھی۔ اُس کی آنکھیں چمکدار اور غم آلود ہو گئی تھیں۔ میں نے اُسے بُلایا، اُس نے جواب بھی دیا، ہم نے کیا باتیں کی تھیں؟ اب مجھے یاد نہیں پڑتا۔ مجھے سب کچھ بھُول گیا ہے، سب کچھ، سراسر وہ چل بسی، لیکن مجھے اُس کی وہ ہلکی سی آہ اچھی طرح یاد ہے، نحیف ہلکی سی آہ، جو اُس نے آخری مرتبہ کھینچی تھی نرس نے کہا تھا۔ "آہ" اور میں سمجھ گیا۔ بس میں سمجھ گیا +

اُس کے بعد میری سمجھ میں آج تک کبھی کچھ بھی تو نہیں آیا۔ میں نے ایک پادری کو کہتے سُنا کہ "تمہاری محبوبہ" میں نے محسوس کیا کہ وہ اُس کی ہتک کر رہا ہے۔ چونکہ وُہ دنیا سے سدھار چکی تھی، اس لئے اس کے متعلق کسی کو بھی یہ راز جاننے کا حق نہیں تھا۔ میں نے پادری کو نکال دیا۔ ایک اور پادری صاحب تشریف

لائے، نہایت اچھے آدمی، ایک پاکیزہ انسان ۔ جب اُنہوں نے میرے ساتھ اس کا ذکر کیا تو میں رو پڑا۔
لوگوں نے اس کے کفن دفن کے سلسلہ میں سینکڑوں باتوں کے متعلق میری ہدایات طلب کیں، اب مَیں بھول گیا ہوں کہ وہ باتیں کیا تھیں۔ لیکن مجھے اس کا تابوت خوب یاد ہے۔ ہتھوڑی کی ضربیں تک ذہن پر نقش ہیں۔ جب اُسے تابوت کے اندر میخوں کے ذریعہ بند کیا گیا تھا۔ او، میرے خدایا!
وہ دفنا دی گئی۔ آہ، دفنا دی گئی! ایک پل میں وہ دفنا دی گئی! چند لوگ آئے، شاید دوست تھے۔ مَیں اُن سے پرے ہٹ گیا۔ مَیں دوڑ پڑا۔ گلیوں میں گھنٹوں گھومتا رہا۔ پھر میں گھر گیا۔ اگلے ہی دن میں نے وقت کٹی کی خاطر سفر کرنا شروع کر دیا۔

میں کل ہی پیرس واپس آیا ہوں۔
جب میں نے اپنا سونے کا کمرہ دوبارہ دیکھا، ہم دونوں کے سونے کا کمرہ دیکھا، ہمارا پلنگ، ہمارا ساز و سامان سب کچھ دیکھا، تمام مکان کو ایک نظر دیکھا جس میں ابھی وہ تمام فانی نشانیاں باقی تھیں جو موت اپنے پیچھے چھوڑ جاتی ہے، تو کرب و اضطراب میرے اندر اس شدت سے عود کر آئے کہ میں کھڑکی کھول کر گلی میں چھلانگ پڑنے پر تیار ہو گیا، ان چیزوں کے درمیان گھر کر، ان دیواروں میں زندگی بسر کرنا میرے لئے محال ہو گیا تھا۔ جنہوں نے اُسے اپنے اندر پناہ دے کر رکھا ہوا تھا۔ اور جن کی کئی نامعلوم دراڑوں میں اُس کے وجود کے ہزاروں اثرات موجود تھے۔ اور جن میں اُس کی سانس کی دھڑکنیں پوشیدہ تھیں۔
میں نے باہر بھاگ نکلنے کے لئے اپنی ٹوپی اُٹھائی۔ مکان کے دروازے تک پہنچنے کے اثنا میں مَیں ہال کمرہ کے آئینہ کے سامنے سے گزرا۔ جو اُس نے وہاں رکھا ہوا تھا تاکہ ہر روز باہر جانے سے پہلے وہ اپنے آپ کو ایڑی سے چوٹی تک اُس کے اندر دیکھ لے۔ اور اس بات کا جائزہ لے لے کہ اس کا سنگھار بالکل درست اور اُس کی زیبائش سر سے پاؤں تک عین جاذبِ نظر ہے۔
مَیں اُس آئینہ کے سامنے بُت بن گیا جس کے اندر کئی بار وہ جلوہ بار ہوئی تھی۔ اُس کا عکس ہزاروں دفعہ اُس کے اندر منعکس ہوا تھا اور عجب نہیں تھا کہ اس آئینہ نے اس کے قدِ بُت کو اپنے اندر جذب کر لیا ہو۔ اور اب بھی اُس کی شبیہ کو میرے سامنے منعکس کر دے۔
مَیں وہاں کھڑا کانپ رہا تھا۔ میری آنکھیں آئینہ پر چسپاں تھیں، نہیں، بلکہ آئینہ کی اُن ہموار گہرائیوں کے اندر گڑی ہوئی تھیں جو اب خالی پڑی تھیں۔ لیکن جن میں کبھی وہ سمائی ہوئی تھی، جنہوں نے اُسے کبھی میرے دل کی طرح اپنے اندر مُتار رکھا تھا۔ جن کا اُس کے اوپر اتنا ہی کامل قبضہ تھا جتنا کہ میری محبت بھری نگاہوں کا۔ مجھے خیال پیدا ہوا کہ مجھے اس آئینہ سے محبت ہے۔ میں نے اُسے ہاتھ لگایا، وہ سرد تھا، اُف!

یاد! المناک یاد! یہ تھا وہ خوفناک آئینہ - ہمارے تمام کرب وتعب کا باعث! کتنا خوش نصیب ہے وہ
انسان جس کا دل اُس آئینہ کی طرح ہے جس پر عکس تیرتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں۔ اُس کے دل سے ماضی
کی یاد محو ہو جاتی ہے۔ سب کچھ جو محبت اور اُلفت کے جذبہ کے ماتحت اُس کے شیشۂ دل پر منعکس ہوا، آخر
مٹ جاتا ہے۔ لیکن میں؟ میں درد و الم کا مُرقع بنا ہوا ہوں!

میں باہر چلا گیا، لیکن اپنی مرضی سے نہیں۔ بغیر جاننے کے کہ میں کیا کر رہا ہوں، بلکہ بغیر کسی ایسی خواہش
کے میں قبرستان کی طرف چل نکلا۔ میں نے اُس کی سیدھی سادی قبر دیکھی۔ اُس پر سنگِ مرمر کی ایک صلیب
ان چند الفاظ کے ساتھ لگی ہوئی تھی:-

"وہ چاہتی تھی، چاہی جاتی تھی اور آخر ابدی نیند سو گئی"

وہ وہاں موجود تھی، ہاں اسی قبر کے نیچے، لیکن مٹی کا ایک ڈھیر بن کر رہ گئی تھی! کتنا خوفناک تھا یہ منظر!
میں سسکیاں لے لے کر پھوٹ پڑا۔ میری پیشانی زمین کے ساتھ زور سے چپکی ہوئی تھی اور میں لیٹا ہوا تھا۔

میں وہاں دیر تک بیٹھا رہا۔ بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر میں نے دیکھا کہ رات ہو رہی ہے۔ ایک
عجیب وحشیانہ خواہش، ایک حسرت زدہ عاشق کی خواہش میرے حواس پر چھا گئی۔ میں رات اُس کے
قریب رہ کر گزارنا چاہتا تھا، صرف ایک آخری رات جو میں اُس کی قبر پر رو رو کر بسر کروں۔ لیکن اگر کسی
نے مجھے دیکھ لیا تو قبرستان سے باہر نکال دیگا۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں اُٹھا۔
اور گم شدگان کے اس شہر میں گھومنے لگا۔ کتنا ہی عرصہ گھومتا رہا۔ یہ شہر، دوسری بستی یعنی زندوں کے شہر
کے مقابلہ میں کتنا چھوٹا ہے! حالانکہ مُردوں کی تعداد زندوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ہمیں اُونچے اُونچے
مکانوں کی ضرورت ہوتی ہے، ہمیں بارونق بازاروں کی حاجت ہوتی ہے۔ ہمیں اتنی زیادہ زمین درکار
ہوتی ہے۔ جس میں بیک وقت ہماری چار پشتیں دن کی روشنی سے لطف اندوز ہو سکیں، چشموں کا
پانی پئیں، انگوروں کا رس اُنہیں میسر آئے اور کئی قسم کے اناج کی روٹی کھائیں +

اور مُردوں کی تمام پشتوں کے لئے، نوعِ انسانی کی ابتدا سے لے کر آج تک کی کھچا کھچ مردار سپاہ کے
لئے گویا بالکل کوئی جگہ درکار نہیں۔ اُن کے لئے ایک میدان، یعنی زمین کا ایک بے حقیقت ٹکڑا کافی
ہے۔ دھرتی اُن کا خیر مقدم کرتی ہے، عدم اُن کا حُلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ اللہ! اللہ!

قبرستان کے درخت دار علاقہ کے ایک سرے پر سے ہو کر میں یکا یک ایک اُجاڑ حصّہ کی طرف آ نکلا
جہاں پُرانے مردے اپنی مٹی کو خاک میں ملا دینے کی خدمت تقریباً ختم کر چکے تھے، جہاں کے سنگِ لحد گل سڑ چکے
تھے۔ اس جگہ سب سے بعد میں آنے والے کسی آئندہ وقت سپردِ خاک کئے جائیں گے۔ یہ غمناک اور حیرت فزا

باغ خوردہ گلابوں کے پھولوں، ورتن آور سیاہ سرو کے درختوں سے اٹا پڑا تھا جو انسان کے جسم پر پرورش پا رہے تھے
میں اکیلا تھا، بالکل اکیلا۔ میں نے اپنا چہرہ ایک سبز درخت کے پیچھے چھپا لیا اور پھر اپنے آپ کو اس کی گھنی
سیاہ ٹہنیوں کے اندر بالکل ڈھانپ لیا۔

میں اس کے تنے کو چھٹا ہوا رات کا اس طرح انتظار کر رہا تھا جس طرح ایک کشتی شکستہ انسان کسی مددگار کشتی کا۔
جب رات کافی تاریک ہو گئی تو میں اپنی جائے پناہ سے نکل آیا اور دبے پاؤں آہستہ آہستہ مدفن کی زمین
پر چلنے لگا۔

میں بہت ہی زیادہ دیر تک ادھر اُدھر پھرتا رہا۔ میں نے اُسے دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔ باہیں پھیلا کر، آنکھیں
پھاڑ پھاڑ کر قبروں کے پتھروں سے اپنے ہاتھ اور پاؤں اور گھٹنے اور سینہ بلکہ یہاں تک کہ اپنا سر ٹخ ٹخ کر میں نے
اُسے ڈھونڈا۔ لیکن وہ نہ ملنا تھی، نہ ملی۔ میں پتھروں کو، صلیبوں کو، لوہے کی سلاخوں کو، شیشے کے مصنوعی ہاروں
کو مرجھائے ہوئے پھولوں کے ہاروں کو چھوتا تھا، ٹٹولتا جاتا تھا جیسے کوئی اندھا اپنا راستہ ٹٹولتا ہے۔ اپنی انگلیاں
حرفوں پر پھیر پھیر کر میں قبروں پر سے نام پڑھتا تھا۔ یہ کیسی رات تھی! کیسی گھناؤنی رات! میں اُسے تلاش نہ کر سکا۔
آسمان پر چاند بھی نہیں تھا! کیسی بھیانک رات تھی! میرے اُوپر خوف طاری ہو گیا۔ اور اُس وقت میں
اُن تنگ جگہوں پر، قبروں کی دو قطاروں کے درمیان چل رہا تھا۔ قبریں ہی قبریں! ہر جگہ قبریں! میرے دائیں،
میرے بائیں، آگے، گرداگرد، ہر جگہ قبریں تھیں! میں ایک قبر پر بیٹھ گیا کیونکہ میرے گھٹنے اب اس قدر کانپ
رہے تھے۔ کہ میں چلنے سے عاجز تھا۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکن سنی!! اور اس کے ساتھ ہی کچھ اور بھی میں نے سنا
وہ کیا تھا؟ ایک غیر مبہم، گمنام آواز! کیا یہ آواز میرے خوف زدہ دماغ کی اختراع تھی؟ تاریک رات کے اندر تھی،
یا اس پُر اسرار زمین کے نیچے سے آ رہی تھی، جس میں انسانی لاشوں کی تخم پاشی کی گئی تھی؟ میں نے اپنے ارد گرد دیکھا۔
میں وہاں کتنی دیر بیٹھا رہا؟ مجھے یاد نہیں رہا۔ دہشت کے مارے میری ہستی گم تھی۔ خوف کے باعث
میں بیہوش ہوا جاتا تھا۔ میں چیخنے کے قریب تھا، گویا میری جان نکلی جا رہی تھی۔

یکایک مجھے محسوس ہوا کہ سنگِ مرمر کی جس سِل کے اُوپر میں بیٹھا ہوں، اُسے جنبش ہوئی ہے وہ حقیقتاً
ہل رہی تھی، جیسے اُسے کوئی دھکیل رہا ہو۔ ایک ہی جست میں میں دوسری قریب ترین قبر پر پہنچ گیا اور میں نے
دیکھا کہ جس سِل پر سے میں ابھی اُٹھا آیا ہوں، وہ واقعی سیدھی اُٹھ گئی۔ اور اندر سے ایک مُردہ نمودار ہوا، ہڈیوں
کا ایک ننگا دھڑنگا ڈھانچہ جو اپنی کُبڑی پیٹھ سے پتھر کو دھکیل رہا تھا۔ اگرچہ رات اندھیر گھپ تھی، لیکن میں نے
یہ واقعہ دیکھا اور آئینہ کی طرح دیکھا۔ سنگِ لحد پر سے میں نے یہ پڑھا۔

"یہاں جیکس اولی وانٹ پڑا سوتا ہے جس نے اکاون سال کی عمر میں اس زندگی کو خیرباد کہا۔

مرحوم نیک اور دیانتدار انسان تھا اور اپنے خاندان کا محبّ تھا۔ آخر خداوند کی حفاظت میں چلا گیا۔"

اب مُردہ اپنی قبر پر لکھے ہوئے الفاظ کو خود پڑھ رہا تھا۔ پھر اُس نے راستے سے ایک پتھر اُٹھایا، ایک چھوٹا سا نوکدار پتھر اور احتیاط کے ساتھ وہ اُن الفاظ کو کھرچ کر مٹانے لگا۔ رفتہ رفتہ اس نے وُہ الفاظ میٹ دیئے۔ اور اُس جگہ کو اپنی آنکھوں کے کھوکھلے ڈھانچے سے تکنے لگا جہاں کہ وہ الفاظ ابھی ابھی کھدے ہوئے تھے۔ پھر ایک ہڈی کے سرے کے ساتھ جو کسی وقت اُس کی شہادت کی اُنگلی تھی۔ اُس نے جلی حروف میں اس طرح لکھا جیسے دیا سلائی کے سرے سے دیوار پر کوئی سطر لکھ دی جاتی ہے، کہ:۔

"یہاں جیکس اولی دانٹ پڑا ہوتا ہے۔ جس نے اکاون برس کی عمر میں اس زندگی کو خیرباد کہا۔ اس کی تُند مزاجی اُس کے والد کی قبل از وقت موت کا سبب بنی جس کی جائداد کا وارث بننے کی اُسے دُھن سمائی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی بیوی کو اذیت دی، اپنے بچّے کے لئے سوہانِ رُوح بنا رہا، اپنے پڑوسیوں کو لوٹتا کھسوٹتا رہا اور جب کبھی داؤ لگتا، ڈاکہ ڈالنے سے بھی نہ چوکتا تھا۔ اور آخر کتّے کی موت مرا۔"

مُردے نے یہ آخری عبارت ختم کی اور جامد و ساکت اپنی تحریر پر قیاس کرنے لگا۔ میں نے مُڑ کر جو دیکھا تو نظر آیا کہ ساری قبریں پھٹ گئی ہیں۔ تمام مُردے باہر نکل آئے ہیں۔ اور سب نے اپنے عزیز و اقارب کے کندہ کئے ہوئے جھوٹ اپنی اپنی قبروں پر سے ہٹا دیئے۔ اور اُن کی جگہ اپنی زندگی کے سچّے اور صحیح واقعات لکھ دیئے ہیں۔

مَیں نے جان لیا۔ کہ وہ سارے کے سارے اپنے عزیزوں اور نزدیکیوں کے قاتل رہے ہیں وہ ظالم، فریبی، ریاکار، جھوٹے، دغاباز، چغل خور اور حاسد تھے۔ اُنہوں نے چوریاں کی تھیں۔ لوگوں کو فریب دئے تھے، ہر قسم کے شرمناک اور نفرت انگیز افعال کے مرتکب ہوئے تھے۔ یہ شفیق باپ، یہ پابند وفا اور چہیتے بیوی اور خاوند یہ تابع فرمان فرزند، یہ عفّت مآب بیٹیاں، یہ لین دین کے کھرے سوداگر، یہ عورتیں اور مرد وہی تھے۔ جن کی شُہرت کے دامن ہر قسم کی تہمت اور بہتان کے داغ سے پاک تھے۔

ایک ہم آہنگی کے ساتھ وہ اپنی دائمی آرام گاہوں کی دہلیزوں پر اُن خطرناک، خوفناک اور مقدس حقیقتوں کو لکھ رہے تھے۔ جن کے متعلق دنیا کا ہر شخص لاعلم ہوتا ہے یا لاعلم ہونے کا بہانہ کرتا ہے۔

مَیں نے خیال کیا کہ وہ بھی تو کسی ایسی ہی حقیقت کا انکشاف اپنی قبر پر کندہ کر رہی ہوگی۔ اور اب مَیں بالکل بے خطر ہو کر قبروں میں سے، لاشوں کے درمیان سے ہو کر، ڈھانچوں کو کودتا پھاندتا، اُس کی قبر کی طرف چل پڑا۔ اس امر کا یقین تھا کہ اب مَیں اُسے جلدی ہی ڈھونڈھ نکالوں گا۔

میں نے اُسے دُور ہی سے پہچان لیا۔ اگرچہ اُس کا کفن میں لپٹا ہوا چہرہ نہ دیکھ سکا۔
اُس سنگِ مرمر کی صلیب پر جہاں میں نے ابھی ابھی پڑھا تھا۔ کہ "وہ چاہتی تھی، چاہی جاتی تھی اور آخر ابدی
نیند سو گئی"، میں نے دیکھا کہ: عبارت کندہ تھی۔
"ایک دن اپنے چاہنے والے کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے خیال سے باہر جاتے وقت
اُسے بارش میں سردی لگ گئی اور آخر ابدی نیند سو گئی"
معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے مجھے ایک قبر کے پاس بے ہوش پڑے ہوئے کو دن چڑھے اُٹھایا۔

منظور احسن
(بی۔ اے (آنرز)

(ترجمہ از موپساں)

ماہِ کامل — اَور — انسان

(مکالمہ)

ماہِ کامل:-

(۱)

ازل سے صورتِ مینا ہے گردش
مجھے ساقی کا ہے ہر دم سہارا
ٹپکتی ہے مرے چشموں سے شبنم
جگر جس سے ہُوا لالے کا ٹھنڈا
جبینِ حسن کی تابش ہے مجھ سے
مری آتش سے شعلہ برگِ گُل کا

مرے در پرستاروں کی جبینیں!
مری عظمت کا ہے تجھ کو پتہ کیا؟
فضا کے پیچ و خم میں میرا رہبر
مجھے انگشتِ قدرت کا اشارہ

مَیں ہوں نبض آشنائے رازِ ہستی
مری گردش میں ہے سب راز تیرا
بھنور میں بھی میں ساحل آشنا ہوں
مری کشتی ہے خود اپنا کنارہ
یہ سارا مدّ و جزرِ نوعِ انساں
میرے ہی جاذب کا ہے اک کرشمہ
تری تاریک راتیں مجھ سے روشن
ازل سے فیض ہے انساں پہ میرا
چراغِ رہگزر ہوں - میری ضو سے ہے نورانی تعقّل راہرو کا

(۲)

انسان

مری گردش - خللِ نظمِ جہاں ہیں،
تری گردش ہے کیا؟ نظمِ جہاں ہے
بہارِ نغمہ میں - آہِ خزاں میں
مرا سوزِ جگر ہر جا عیاں ہے

ترے در پر جھکے رہتے ہیں تارے!
مری خاطر یہ سارا کارواں ہے
فروغِ مہر سے تابندہ ہے تو
ستاروں سے حقیقت یہ نہاں ہے
تو ہے مجبور اور مختار ہوں میں
مرے قدموں پہ تیرا آسماں ہے
یہ تو اور آشنائے رازِ ہستی
گماں ہے تیرے دل میں - یہ گماں ہے

نہ ہو پھر بے نشاں منزل بھلا کیوں؟
رہین راہبر جب کارواں ہے
تری کشتی کو ساحل کی ہوس ہے
مرا مقصود بحرِ بیکراں ہے

نظر میری محاسب بیش و کم کی
کہ مجھ پر فاش سرِ دو جہاں ہے
نہیں تیری بہاروں کو میسر
عجب شے میرے گلشن کی خزاں ہے
شرر اک میری ظلمت میں ہے ایسا
فروزاں جس کی ضو سے لامکاں ہے
جہاں کی پستیوں سے اُٹھ رہا ہوں
مری منزل ورائے دو جہاں ہے
نہیں ہنگامۂ منزل سے واقف   چراغ رہ غبارِ کارواں ہے

ایم۔اے۔نصیر

ایم۔اے (فائنل)

مسلمانوں میں کیمیا داں

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

(از پروفیسر نور احمد خان اسلامیہ کالج پشاور)

جس طرح مسلمانوں نے فلسفہ، علم نجوم، علم ریاضی میں کافی ترقی کی تھی۔ اسی طرح انہوں نے علم کیمیا کو عظیم الشان ترقی دی۔ جو مسائل اس علم میں گذشتہ یونانی اور رومی حکمائے نے چھوڑے تھے۔ ان مسائل کو عربوں نے اس بلندی پر پہنچایا جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ گذشتہ یونانی حکماء تجربے کرنا عار سمجھتے تھے۔ لیکن مسلمانوں نے یہ کمال کیا کہ اپنے مشاہدات اور مسائل کو تمام تجربوں پر مبنی رکھا۔ یہ پہلے سائنسدان تھے۔ جنہوں نے کیمیاوی اجسام کی فہرست بنائی۔ اور قسم قسم اجسام کو جدا جدا خصوصیات دے کر ایک منظم صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ دنیا کی تاریخ میں انہوں نے سب سے پہلے ترازو استعمال کیا۔ اور مرکبات کے آپس میں کیمیائی عمل کرنے کے وجوہات۔ اور ان کے تناسب اور خصوصیات کا مطالعہ کیا۔ عربوں سے مشاہدات اور مختلف قسم کے واقعات کے صحیح نتیجے اخذ کرنے میں عموماً غلطی نہیں ہوئی۔ بلکہ عجیب ترین واقعہ یہ ہے کہ بعض نظریئے اور قوانین جو کہ مسلمانوں نے اپنے تجربوں کی وجہ سے اخذ کئے تھے۔ اب تک صحیح اور درست مانے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ کہ بہت سے نظریئے جو انہوں نے قائم کئے۔ آجکل کے سائنسدانوں کی ایجادات اور مشاہدات کی بنا پر غلط بھی ثابت ہوگئے ہیں۔ مگر پھر بھی ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اگر زمانۂ پارینہ میں کسی قوم نے علم کیمیا کو اور اقوام کے مقابلہ میں ترقی دی اور اس علم کو صحیح رستے پر ڈالا۔ وہ مسلمان کیمیا دان ہی ہوسکتے ہیں۔ عربی کیمیا دانوں میں سب سے بلند ترین مرتبہ جابر ابن حیان کا ہے۔ جو کہ کوفہ میں ۷۷۶ء کے لگ بھگ رہا۔ الرازی کے بعد اسلام میں علم کیمیا بس جابر کا رتبہ گنا جاتا ہے۔ تواریخی قصائص میں جابر کے اساتذہ خالد ابن یزید ابن معاویہ اور جعفر الصادق المدینہ گنے جاتے ہیں۔ پارینہ حکماء مصر و یونان کے نظریے کے مطابق جابر ابن حیان نے بھی دھات کو دو اقسام میں تقسیم کیا۔ ایک قسم کے دھات وہ جو کہ ہمیشہ اپنی حالت میں رہتے ہیں اور ہوا۔ پانی اور تیزابات وغیرہ کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ یعنی سونا چاندی اور دوسرے وہ دھات جیسے قلعی۔ سیسہ۔ تانبہ جو کہ تیزاب وغیرہ میں حل ہوجاتے ہیں۔ جابر ابن حیان کا یقین تھا۔ کہ اگر اس دوسرے قسم کے اجسام میں ایک خاص روح ملایا جائے۔ تو وہ اوّل الذکر اجسام میں تبدیل ہوسکتے ہیں۔ اس خیال کو ثابت کرنے کے لئے جابر نے بہت کوششیں کیں۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ گذشتہ زمانے کے علم کیمیا کی بہت سی ترقی اس ایک کوشش

کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور نئے نئے مرکبات۔ تیزاب اور مختلف اقسام کے عمل اور اوزار اس وہمی شئے جس کو ہم سنگِ پارس کے نام سے یاد کرتے ہیں کے پیدا کرنے کے سلسلہ میں دریافت ہوئے۔ تواریخ میں سب سے پہلے جابر نے علم کیمیا کا تمام دارومدار تجربات اور مشاہدات پر مبنی رکھا۔ اور اس طرح عملی اور علمی کیمیا میں وہ کار ہائے نمایاں کئے۔ جن کی نظیر نہیں ملتی۔ جابر کی وفات کے تقریباً دو صد سال بعد جب کوفہ کے ایک محلہ کو گرایا گیا۔ تو جابر کی دار العمل یعنی لیبارٹری برآمد ہوئی۔ جس میں جابر کے تمام اوزار وغیرہ پائے گئے۔ جابر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تقریباً ۲۲ کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ جن میں سے کتاب الرحمۃ، کتاب التجمیع، کتاب الزیبق الشرقی کا ترجمہ وغیرہ کیا گیا ہے۔ مگر بہت سی ایسی کتابیں بھی ہیں۔ جو ابھی تک اس کی تصنیف ثابت نہیں ہو سکیں مگر پھر بھی چودھویں صدی تک یورپ اور ایشیا میں صرف جابر کی کتابیں علم کیمیا میں معتبر اور قابلِ مطالعہ سمجھی جاتی تھیں۔ جابر نے دھات کو ان کے معدنیات سے نکالنے کا عمل دریافت کیا۔ اور اس سلسلہ میں کافی ترقی ہوئی۔ مرکبات کے صاف تیار کرنے کے عمل اور اوزار (APPARATUS) جو کہ پہلے کسی سائنسدان نے ایجاد نہیں کئے تھے۔ سب جابر نے بنائے۔ سب سے عظیم الشان ایجاد جابر کا تیزاب کا بنانا ہے۔ یہ پہلے جابر ہی تھا جس نے گندھک اور شورہ کا تیزاب بنایا۔ نمک کے تیزاب کے ساتھ یہ دو ہی تیزاب ہیں۔ جو کہ سچ مچ کیمیا اور مرکبات کے والدین کہے جاتے ہیں۔

جابر نے ان تیزابوں کا اثر تمام موجودہ اجسام پر آزمایا۔ اور جو مرکبات ان تیزابوں کے عمل سے پیدا ہوئے۔ اُن کو ایک ترتیبی آئین میں رکھا۔ تیزاب سرکہ بھی مسلمان کیمیا دان نے ایجاد کیا تھا۔ مابعد کے مسلمان کیمیا دان ابن حیان کو اپنا اُستاد سمجھتے تھے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ یورپ کے کیمیاگر بھی جابر کو اپنا ویسا اُستادِ کامل تصور کرتے تھے۔ جیسا کہ مسلمان فیلسوف نے ارسطو کو اپنا اُستاد تسلیم کیا یعنی معلمِ اوّل کے نام سے پکارا۔ اور ابن سینا کو معلمِ ثانی کا خطاب دیا۔

ابوالقاسم العراقی اور الطغرائی جو کہ تیرہویں صدی کے آخری حصے میں گزر چکے ہیں۔ مسلمانوں کے ابن حیان کے بعد بہترین کیمیا دان گنے جاتے ہیں۔ لیکن ان کیمیا دانوں نے ابن حیان کے ایجادات اور نظریوں وغیرہ پر کوئی زیادتی نہیں کی۔ انہوں نے بھی ان دو وہمی اشیاء یعنی سنگِ پارس اور اکسیر حیات کی جستجو میں اپنی زندگی بے فائدہ صرف کی۔

جابر ابن حیان کے بعد علم کیمیا کا مسلمان اُستاد ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی گنا جاتا ہے۔ یہ باکمال انسان ۸۵۰ عیسوی میں شہر رے میں پیدا ہوا۔ اور ۹۲۳ء میں فوت ہوا۔ الرازی مسلمانوں میں ابن سینا کے بعد سب سے عظیم الشان حکیم گزرا ہے۔ دار الخلافت بغداد میں جہاں کہ وہ خلافت میں سب سے

بڑا حکیم تھا۔ جب ایک ہسپتال کے لئے مقام تلاش کرنا چاہا۔ تو مختلف مقامات میں گوشت کے مردار ہونے کے اصول سے کام لیکر جہاں کہ گوشت بالکل خراب نہ ہوا۔ وہاں پر ہسپتال کی بنیاد ڈالی۔
رازی بغداد۔ رے اور جندی سابور کے شہروں میں شفاخانوں کا مہتمم ہوا۔ اس طبیب نے سب سے اوّل دواخانوں میں لطیف اسہال لانے والی دوائیں تیار کیں۔ اور طبی کیمیا دی ترکیبیں ایجاد کیں۔ فتق کے لئے پیٹیوں کا استعمال بھی اُس کے اولیات میں شمار کیا گیا ہے۔ چونکہ فن طب بغیر ادویات کے قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لئے علم کیمیا کا مشغلہ ہمیشہ فن طب کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔
فہرست میں الرازی کے ۱۴۱ تصنیفات گنے جاتے ہیں۔ ان ۱۴۱ تصنیفات میں ۱۲ صرف علم کیمیا پر لکھے گئے تھے۔ ان میں سے کتاب الاسرار جو کہ علم کیمیا پر خصوصیت سے لکھی گئی ہے۔ اس کو گیرارڈو ساکن کریمونیا نے ۱۱۸۷ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ اور اقوام یورپ میں چودھویں صدی تک علم کیمیا میں ایک معرکۃ الآرا کتاب مانی جاتی تھی۔ اور اصل یہ ہے کہ عربوں نے میدان تمدن میں قدم رکھتے ہی علم کیمیا کو ہاتھ لگایا۔ کیونکہ کیمیا سے صرف مراد یہ ہے۔ کہ چیزوں کی تحلیل اور ترکیب کی جا سکے۔ نہ یہ کہ سونا اور چاندی بنانے لگیں۔ جس کا نام کیمیائے سیر یہ اکسیر اور حجر مکرم یعنی سنگ پارس وغیرہ ہے۔ چنانچہ معدنی اشیاء باہم ملانے اور ترکیب وغیرہ دینے سے کہ یہ کام معروف و مشہور لیبارٹریز میں کیا گیا۔ بہت سے نادر معدنی اکتشافات ظہور میں آئے۔ مختلف اقسام کے مرکبات۔ تیزابیں۔ نمک۔ جواہر الکحل وغیرہ کا ایجاد ہوا۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ حکومت اور طاقت کے سنبھالنے کے لئے بھی یہ ضروری ہے۔ کہ بہت سی ایسی کارآمد اشیاء پیدا ہوں۔ جن کو لڑائی اور حفاظت کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس سلسلہ میں عربوں نے کاغذ۔ قطب نما۔ بارود اور توپوں کو ایجاد کیا۔ اور اُن کی اس ایجاد سے تمام دنیا کی ادبی۔ سیاسی اور فوجی حالت میں انقلاب عظیم رونما ہوا۔ بعض یورپین نے اس بات سے تعصبانہ انکار کیا ہے۔ کہ یہ اشیاء عربوں نے ایجاد کئے ہیں۔ مگر ان کے اس بیان پر کوئی اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب ہی ان اشیاء کے موجد ہیں۔ اور انہوں نے ہی یورپ کو ان کا استعمال سکھایا ہے۔ یورپین مؤرخ اہل چین کو بارود کا موجد سمجھتے ہیں۔ لیکن تواریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے البتہ عربوں کی تواریخ میں اس کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ مکہ کے محاصرے میں ۶۹۰ء میں پھٹنے والے پیپے کا استعمال کیا گیا تھا۔ پھر مصر میں تیرہویں صدی میں بارود کا استعمال کیا گیا وعلیٰ ہذا القیاس۔

شمیم کے نام ......

پیارے شمیم!

گو تہذیب حاضرہ کا تقاضا ہے کہ میں نہایت پرخلوص الفاظ میں آپ کی یاد آوری کا شکریہ ادا کروں۔ اور آپ کے زور بیان اور طرز استدلال کی دل کھول کر داد دوں۔ مگر بدقسمتی سے میں ان ظاہری تکلفات کی حد بندیوں کو منافقانہ کارستانیوں کے مختلف سین پردے تصور کرتا ہوں۔ جو حق کی تلاش میں ہماری نگاہوں کی راہ میں حائل ہیں۔ اگر ہم اپنی ضمیر کی پرواز کو لبیک کہہ کر اپنے اعمال کی تشکیل کیا کریں۔ اور بجائے مصلحت آمیز جھوٹ بیجا خوش آمد پسندی۔ اور سماج کے پرفریب آداب کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے اپنی ہر گفتار اور کردار کو حق اور صداقت کی کسوٹی پر پرکھ لیں۔ تو آج ہمارے وہ تمام امراض چاہے وہ ملی ہوں یا سیاسی۔ انفرادی ہوں یا اجتماعی یکسر کافور ہو جائیں۔ جن کی بنا پر انسانی تہذیب و تمدن کا جنازہ دروغ گو اقوام کے کندھوں پر نکل رہا ہے۔ اس ڈرامہ کا ایک ہولناک سین جو حقائق سے آنکھ میچ کر تیار کیا گیا تھا۔ یورپ کے سٹیج پر دیکھو۔ جہاں پر انسانیت کے مقدس نام پر انسانی خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔

اگر میری حق گوئی آپ کی نازک خیالی پر گراں گزرے۔ تو بجائے طیش میں آنے کے اس پر تھوڑی دیر کے لئے ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ امید ہے آپ پر تمام حقائق بتدریج بے نقاب ہوتے جائیں گے۔

ہاں تو آپ نے لکھا تھا کہ غریب اور نادار طلباء کا طبعی رجحان فلسفہ کی طرف ہوتا ہے۔ اس لئے اپنی تمام تر توجہ اس کی طرف مبذول کرنے کے لئے نہ وہ مدرسہ کے ہنگاموں میں خاطر خواہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اور نہ ہی باقی طلباء کی طرح دماغی عیاشیوں میں وقت صرف کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ افلاطونی دلیل بھی پیش کی ہے۔ کہ ان کی شکل و شباہت بھی فلاسفروں سے ملتی جلتی ہے۔ اور فلاسفروں کی طرح خاموش رہ کر سوچ و بچار میں غرق رہتے ہیں۔

شمیم مجھے تمہاری کور ذوقی پر رونا آتا ہے۔ کہ اب تک تم کو یہ پتہ نہیں کہ فلسفہ ہوتا کیا ہے؟ اور فلاسفر ہوتے کون ہیں؟ لے دے کے تم نے یہ دلیل پیش کی۔ کہ جو شخص "کم سخن" یا خاموش ہو وہ ہو نہ ہو فلاسفر ہے تم نے بخدا فلسفہ ایسے بلند اور رفیق علم کو چند "صم بکم" سے منسوب کر کے اس کی توہین کی ہے۔ اس کو تم فلاسفر کہتے ہو۔ جس کے چہرہ پر زردی چھائی ہوئی ہو۔ جس کی نیم باز آنکھیں تماشا گاہ عالم کے

حیرت انگیز منظر کو دیکھ دیکھ کر غیند کی متمنی ہوں - جن کی نگاہوں میں حسرت و ارمان کی رقت انگیز داستانیں
تڑپ رہی ہوں - بال گرد سے اٹے ہوتے ہوں - ہونٹوں پر پیڑیاں جمی ہوں - اور ان پیڑیوں پر درد و
الم رقصاں ! ہاں ! جن کو چالاکی اور عیاری میں تم جیسے زندہ دلوں کی طرح ید طولے حاصل نہیں - باتیں
بنانا کسی کا مذاق اڑانا اور مخرب اخلاق قصے کہانیوں پر لوٹن کبوتر بننا انکو آتا نہیں - اور نہ ہی تمہارے
سگریٹ اور سینما کے وسیع اخراجات کو برداشت کر سکتے ہیں - اور نہ ہی تمہارے طرہ بازیوں کے مقابلہ
میں اپنے لئے موزون جگہ پا سکتے ہیں - اس لئے تعلقات کے دائرہ کو حتے الوسع تنگ رکھنے کی کوشش کرتے
ہیں - اور مجبوراً صبر و سکون سے زندگی کی ان تلخ گھڑیوں کو گنتے رہتے ہیں - جن کو تمہارے ہاں رنگینیوں
کا مہمل مگر پر فریب نام دیا جاتا ہے - اور آپ ہیں کہ ایک جست میں اس نتیجہ پر پہنچ گئے - کہ غریب لڑکے
فطرتاً فلاسفر پیدا ہوتے ہیں - دیکھا نہ میں نے کہا تھا تم سطح بین ہو - تم یہ سن کر بڑے رو ٹھ گئے تھے
اور کئی دن بات تک بھی نہ کی - آج تمہاری وہ ظاہر بینی ابھر کر سطح پر آئی - تمہاری ذہنیت کے وہ
تمام پردے اٹھ گئے - اور آپ اپنے اصلی خد و خال میں آشکارا ہوئے - غالب سچ کہتا ہے ؎

سینۂ نے پہ جو گزرتی ہے   وہ لب نے نواز کیا جانے

آؤ آج تمہیں اپنے قلب درد آگین کے نازک گوشوں میں چھپا ہوا ایک درد انگیز واقعہ سناؤں
پھر نہیں معلوم ہوگا - کہ غریب لڑکے کیوں مردہ - مریل اور یا بقول آپ کے خاموش رہتے ہیں -

رحمت کو جانتے ہو نا فتح دین کا بیٹا - جو اپنی ذہانت اور محنت کی وجہ سے ہمیشہ تمہارے
درجے میں اوّل رہتا تھا - اس بیچارے کو تعلیم حاصل کرنے کا بیحد شوق تھا - مگر موجودہ تعلیم کے وسیع
اخراجات کو برداشت کرنا اس کے مفلوک الحال والدین کے لئے مشکل تھا - اور فطرت کی ستم ظریفی
دیکھئے - کہ جس وقت وہ آٹھویں جماعت پاس کر چکا - اس کا والد ضعیف العمری کی بنا پر اپنی بصارت
کھو چکا - اب دنیا اس کے لئے اندھیر تھی - تعلیم حاصل کرنے کی تمنا اور والدین کی بے بضاعتی نے اس کی ذہنی
الجھنوں میں ایک اور اضافہ کر دیا - ایک طرف تحصیل تعلیم کی بے تابی اور دوسری جانب والدین کی خدمت کر کے
سعادت دارین حاصل کرنے کا بے پناہ جذبہ - ایسے لاینحل مسئلوں کے وقت دل کی جو کیفیت ہوتی ہے
اس کا سپرد قلم کرنا میرے بس کی بات نہیں اور نہ ہی ادب اپنی تنگ دامانی کی وجہ سے اس کا متحمل
ہو سکتا ہے - صرف محسوس کرنے سے ہی معلوم ہوگا - کہ ذہنی کشمکش کن مدارج تک پہنچتی ہے - آخر
اس کی حساس ماں نے اپنے لاڈلے بیٹے کی تمناؤں کا خون ہوتا دیکھنا گوارا نہ کیا - بیٹے کو مزید تعلیم
حاصل کرنے کا مشورہ دیکر گھر کے بارگراں کو اپنے نازک کندھوں پر اٹھانے کا ذمہ لے لیا -

بیچاری صبح سے شام تک اپنے گاؤں کے چوہدری کے ہاں چکی پیسا کرتی تھی - اور اس طرح اس قلیل مزد سے اپنے شوہر اور بیٹے کا پیٹ پالتی تھی - ایک دفعہ میں نے رحمت سے سُنا کہ وہ بیچاری ایک ہفتہ تک بیمار پڑ گئی - تو پورے ایک ہفتہ تک خدا کے یہ تین بندے بھوک اور پیاس کی وجہ سے تڑپتے رہے - رحمت نے اپنی دکھ بھری کہانی گاؤں کے مشہور "مخیر" اور "دردمندانِ قوم" کو جا کر سُنائی - اور اپنے شہر کے علماء کرام اور "محافظانِ اسلام" کے آستانوں کی خاک چھانتا پھرا - مگر خدا کے کسی نیک بندے نے بھی ترس کھا کر ان کی مالی امداد نہ کی -

وہاں سکول میں روزانہ ماہواری فیس کا مطالبہ ہوتا تھا - اور تاخیر کی بنا پر نام خارج ہونے کے احکام صادر ہوتے تھے - اس نے فیس کی معافی کے لئے کئی درخواستیں دیں - مدرسہ کے اربابِ بست و کشاد کی منتیں کیں مگر ہر طرف مایوسی ہی مایوسی نظر آئی - یہ کیوں؟ کیونکہ وہ ایک گمنام اور نادار شخص کا بیٹا تھا - اس کی کوئی سفارش نہ تھی - کسی سے جان پہچان نہ تھی - عیاری اور چالاکی کی شعبدہ بازیوں میں ماہر نہ تھا - مجبوراً "انجمن خدام المسلمین" کو وظیفہ کی درخواست دی - آپ کو تو علم ہے کہ اس انجمن کی باگ ڈور شہر کے بڑے بڑے رئیسوں کے ہاتھ میں ہے - وہاں پر بھی یہی تکالیف پہاڑ بن کر ابھریں - کہ کسی "معتمد اور معتبر" شخص کی سفارش نہ تھی - اس انجمن کے سرپرست جو چند دن ہوئے فخرِ ملت بن چکے ہیں - ان کے پاس کئی بار گیا - وہ بھی لیت و لعل کرتے رہے - آخر وہاں سے یہی جواب ملا - کہ تمہاری عرضی زیرِ غور ہے - اور ساتھ ہی چوکیدار کو یہ نادر شاہی حکم ملا کہ "دو بنگلہ سے نکال دو - ناک میں دم کر رکھا ہے"!

اب شمیم تم اندازہ لگاؤ - کہ اس کے ٹوٹے ہوئے دل میں کیا بلا خیز طوفان مچا ہوگا - اس کے دل و دماغ کے نازک گوشوں میں کیا کیا عناصر کام کرتے ہونگے - اس کی دیرینہ تمناؤں کی سلگتی ہوئی چنگاریاں کس طرح راکھ کے ڈھیر کی صورت اختیار کر رہی ہوں گی - تم اس حرماں نصیب کی ظاہری شکل و صورت کو دیکھ کر "فلاسفر اور کم گو" کے پر فریب لیبل اس پر چسپاں کرتے ہو - مگر تھوڑی دیر کے لئے اس کے دل میں اتر کر دیکھو - کہ اضطراب اور بے چینی کے جذبات کا کیا رنگ ہوگا - وہاں پر تمہیں گرم خون کے فوارے چھوٹتے نظر آئینگے وہ دل نہ ہوگا - بلکہ مردہ رازوں کا مزار ہوگا - وہاں پر آہیں ہونگیں - خون و ملال کی داستانیں کروٹیں لیتی ہونگیں - اس کی آخری کرن جو زندگی کا سہارا ہوتا ہے - مدھم پڑی ہوئی نظر آئیگی - یاس اور ناامیدی کے بادل منڈلاتے ہوئے .... دکھائی دینگے، پھر تمہیں شمیم معلوم ہوگا - کہ یہ ہڈیوں کے ڈھانچے فلسفہ کی گتھیوں کو سلجھانے کی غرض سے خاموش نہیں رہا کرتے ہیں - بلکہ ؏

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں!

میں ہوں تمہارا

....

عبدالصمد بلوچستانی

جب اور اب

وہ لمحے جن میں شوقِ آرزو پورا کیا اکثر
وہ بیتی ساعتیں جن میں محبت کا دیا
اکثر جلایا تھا۔
تیری آنکھوں میں جب تک تھا محبت کا اثر باقی
جواں تھیں آرزوئیں بھی۔
میری اُمیدیں ہنستی تھیں۔
شکستہ سازِ دل دھیمے سروں میں
جنوں میں،
سنائے جا رہا تھا اک فسانہ
اک عالم پہ تھی خاموشی سی طاری
سُنائی دے رہی تھیں دھڑکنیں دل کی

نہ جانے کس طرف سے جھونکا آیا
محبت کا دیا کچھ ٹمٹمایا —
اِدھر لپکا اُدھر لپکا۔
اک کشمکش تھی۔
بجھ گیا۔
گئی رخشندگی چھایا اندھیرا
نئی امیدیں بگڑی جا رہی ہیں۔
تیری آنکھوں میں وحشت دیکھتا ہوں
سکوں ناپید ہے اب
اور اب ویرانیوں میں شور سا ہے

خالد
سالِ دوم

بے گناہ

(ٹالسٹائی کا ایک شاہکار)

"اکسنیف! آج نہ جاؤ .... میں نے ایک خوفناک خواب دیکھا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ......"
اُس کی بیوی نے اس کے کوٹ کی آستین درست کرتے ہوئے کہا۔ اکسنیف نے ایک قہقہہ لگایا "تم اس بات سے ڈرتی ہوگی۔ کہ میں میلے میں جاکر شراب نوشی کروں گا"!

"مَیں خود نہیں جانتی کہ مجھے کس بات کا خوف ہے۔ صرف یہ کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ تم قصبے سے واپس آرہے ہو اور .... اور تمہارے سر کے بال برف کی طرح سفید ہیں ..... نہ جاؤ اکسنیف ...... خدا کے لئے نہ جاؤ"

وُہ پھر ہنسا "یہ اچھا شگون ہے ..... بے فکر رہو، میں تمہارے لئے بہت اچھی اچھی چیزیں لاؤں گا" کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

(۲)

آسمان کی بساط اور زمین کا دامن دونو آفتاب و ماہتاب کے ظاہری اثرات سے پاک تھے۔ درختوں کی سرسراہٹ فضائے آسمانی میں ہلکی سی گونج پیدا کر رہی تھی۔ جھٹ پٹا وقت تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا سبز سبز پتیوں کو گدگداتی ہوئی جا رہی تھی۔ اکسنیف ایک سرائے میں پہنچا۔ گاڑی سے تجارت کا مال اتروا کر سرائے میں رکھا۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں اُس کا ایک پُرانا دوست بیٹھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو مل کر بہت خوش ہوئے۔ چاء پی اور سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

اکسنیف زیادہ دیر نہیں سویا تھا۔ کہ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے کوچوان کو جگا کر گاڑی تیار کرنے کے لئے کہا۔ سامان لادا۔ سرائے والے کا حساب بے باک کرکے وہ چل پڑا۔ وہ بہت خوش تھا کہ صبح ہونے تک وہ کافی فاصلہ طے کر لے گا۔ پچیس میل کی مسافت کرنے کے بعد وہ ستانے کی غرض سے ایک سرائے میں چلا گیا۔ چائے کے لئے کہہ کر وہ برآمدے میں بیٹھ کر ستار بجانے میں مشغول ہو گیا۔

(۳)

یکایک ایک ٹریکا، گھنٹی بجاتی ہوئی سرائے کے دروازے پر آن کھڑی ہوئی وہ ستار بجا رہا تھا اور

خوش تھا۔ "تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟" ایک پولیس افسر نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ اکسنیف چونکا "میں ایک سوداگر ہوں۔ میرا نام اکسنیف ہے۔ اور تجارت کی غرض سے 'نیزہینی' کے میلے پر جا رہا ہوں۔ آئیے! تشریف رکھئے" اُس نے کرسی خالی کرتے ہوئے کہا "چاء پیجئے گا آپ؟"

"تم نے گزشتہ رات کہاں بسر کی" پولیس آفیسر نے اس کی باتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا، "کیا تم اکیلے تھے یا ایک اور سوداگر تمہارے ساتھ والے کمرے میں تھا۔ کیا اُس سوداگر کو تم نے صبح دیکھا تھا۔ تم اتنی جلدی وہاں سے کیوں آ گئے؟؟؟"

...... اکسنیف حیران تھا...... اُس کے سامان کی تلاشی لی جا رہی تھی۔

(۴)

اُس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ اور وہ 'ٹرائیکا' میں دو سپاہیوں کی حراست میں تھا اس کے دماغی قواء معطل سے ہوئے جاتے تھے۔ وہ کھڑکی میں سے گاڑی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ تمام چیزیں بھاگ رہی تھیں۔ کوچوان کی ٹخ ٹخ سوہانِ روح ہو رہی تھی۔ گھنٹی اور گھوڑوں کے بھاگنے کی آوازیں اُس کے دل کو چیرتی ہوئی فضا میں گم ہو رہی تھیں۔ نہ معلوم کتنا عرصہ وہ اس استغراق کی حالت میں رہا ...... اس نے ایک انگڑائی لی۔ اور پس وپیش نظر کی ...... وہ ایک تنگ وتاریک کوٹھڑی میں وزنی زنجیروں کے بوجھ کے نیچے لیٹا تھا۔ اس کی سب طاقتیں اُسے جواب دے چکی تھیں، وہ بولنا چاہتا تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کا گلا کسی نے گھونٹ دیا ہو۔ وہ سوچنا چاہتا تھا۔ مگر اس کا دماغ کام نہیں کرتا تھا۔ وہ اُٹھنا چاہتا تھا۔ مگر زنجیروں کا بوجھ مانع تھا۔ ...... اس نے اپنے پاؤں پھیلائے۔ اور دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔

(۵)

اُسے سائبیریا میں آتے ہوئے چھبیس برس ہو چکے تھے۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ کمر جھک گئی تھی۔ سر اور بھوؤں کے بال برف کی طرح سفید ہو چکے تھے۔ ڈاڑھی میں کھچڑی پک رہی تھی ...... وہ بوٹ سی رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے "خون ......" وہ کانپ اُٹھا۔ اُسے وقت یاد آ رہا تھا۔ جب وہ نیزہینی کے میلے پر جا رہا تھا۔ "آج نہ جاؤ اکسنیف! نہ جاؤ...... میں نے ایک خوفناک خواب دیکھا ہے ایسا نہ ہو کہ ......" وہ دیوانوں کی طرح ہنسا "میں تمہارے لئے بہت اچھی اچھی چیزیں لاؤنگا"۔ اتنا کہہ کر وہ پھر بوٹ سینے میں مشغول ہو گیا۔

"تم نے خون کیا - بیس ہزار روبل چرائے، اس کا ثبوت وہ آبدار خون میں لتھڑا ہوا خنجر ہے - جو تمہارے سامان سے برآمد ہوا - اس جرم کی پاداش میں تمہیں عمر قید کی سزا دی جاتی ہے" جج کے یہ الفاظ اُسے بار بار یاد آرہے تھے -

(۶)

تمام قیدی اُسے "دادا" کہہ کر پکارا کرتے تھے - سب اُسے ایک نیک اور شریف انسان خیال کرتے تھے - آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ اُسی کی ثالثی میں ہوتا تھا - ہر قسم کے مطالبات کے لئے اسی کو مجبور کیا جاتا کہ وہ داروغۂ جیل سے کہہ کر پورے کرائے - وہ اکثر چپکا رہتا - زیادہ وقت عبادت میں صرف کرتا اُسے کسی نے کبھی ہنستے نہیں دیکھا تھا -

رات کا کھانا کھا کر وہ لیٹا - اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر تھا - جب وہ 'ولیڈی میر' کی جیل میں تھا - اُس کی بیوی اور بچے اُسے ملنے کے لئے آئے ہوتے تھے "اکسنیف! کیا واقعی وہ قتل تم نے کیا ہے - مگر کس لئے؟ کیوں؟ کیوں میری - اپنی اور ان ننھے بچوں کی زندگی برباد کی؟ کس لئے اکسنیف کس لئے؟" اس کی بیوی زار زار رو رہی تھی - آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ رہا تھا - بچے بلک رہے تھے - سب سے چھوٹا حسرت بھری نظروں سے دروازے کی مضبوط آہنی سلاخوں کو دیکھ ...... رہا تھا .... "بس! اب جاؤ" داروغۂ جیل کی گرجتی ہوئی آواز سُنائی دی - اکسنیف کی تمام رات انہی خیالات میں کٹ گئی -

(۷)

تمام قیدی جوق در جوق بڑے پھاٹک کی طرف جا رہے تھے - وہ خوش تھے کہ اُس دن اُن کی تعداد میں اضافہ ہونے والا تھا - رات کو سب کے سب نئے قیدیوں کے گرد بیٹھے ان سے ان کے جرائم کی باز پُرس کر رہے تھے " بھائیو! میں 'ولیڈی میر' کا باشندہ ہوں میرا نام میکار ہے اور میرے باپ کا سیتھین، میں بے گناہ یہاں بھیج دیا گیا ہوں - میرا جرم اس قدر سنگین نہ تھا کہ ...."

ولیڈی میر! اکسنیف اپنے وطن کا نام سن کر چونکا ہو گیا اُس نے اپنی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اُوپر اُٹھائیں "کیا تم اکسنیف اور اس کے بیٹوں کے متعلق کچھ جانتے ہو؟" رقت کی وجہ سے اکسنیف کا گلا بند ہو گیا - "ہاں! جانتا ہوں" ایک مضبوط جسم ساٹھ سالہ بڈھے نے اپنی ڈاڑھی سے کھیلتے ہوئے کہا - وہ سب خیریت سے ہیں - اور ان کا باپ اکسنیف ہماری طرح سائبیریا میں حبس دوام کی سزا بھگت رہا ہے"

(۸)

اکسنیف کا زیادہ وقت میکار سے باتیں کرنے میں گزرتا۔ باتوں باتوں میں اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ اس سوداگر کا قاتل یہی میکار ہے۔ ایک رات وہ دروازے کے پچھلی جانب کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے پاؤں کے نیچے کی زمین کھسک رہی ہے۔ وہ اُچھل کر پہلی طرف ہو گیا، میکار اس کے سامنے کھڑا تھا۔ "او بڈھے دجال!" میکار نے حقارت آمیز لہجے میں کہا "خبردار! یہ راز ہرگز فاش نہ کرنا۔ میں بھاگ نکلنے کے لئے ایک سرنگ بنا رہا ہوں۔ اگر تم یہ بات پوشیدہ رکھو گے۔ تو میں تمہیں بھی فرار ہونے میں مدد دونگا۔ سمجھے! اگر تم نے ایسا نہ کیا تو جان سے مار ڈالوں گا۔" ...... "مجھے تو تم نے چھبیس سال ہوئے مار دیا تھا" کہتے ہوئے اکسنیف باہر نکل گیا۔

(۹)

اگلی صبح سب قیدی صحن میں بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وسط میں ایک کرسی اور ایک میز پڑی تھی۔ "قیدیو" چیف کمشنر کی آواز گونجی "بتاؤ وہ شگاف کس نے کیا ہے ...... جلد بتا دو ورنہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائیگا" سب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میکار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اکسنیف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اکسنیف سر کو جھکائے اپنے بوٹوں کے فیتوں سے کھیل رہا تھا ...... "جلد بتاؤ" چیف کمشنر نے پھر چلا کر کہا۔ سب ساکت و مبہوت بیٹھے تھے ...... "اکسنیف!" گورنر نے کاغذ کا ایک ٹکڑا کھڑکھڑاتے ہوئے کہا "تم سچے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ سب تم پر اعتبار کرتے ہیں۔ تم بتا دو یہ کام کس کا ہے؟" میکار اکسنیف کو خونخوار آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ "سرکار! میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے ......" میکار کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا "سچ سچ بتا دو۔ تمہیں بہت سا انعام ملے گا۔ اور شاید تم رہا بھی کر دئے جاؤ ...... بولو ...... جلد کرو ......" اکسنیف چپکا کھڑا رہا۔

(۱۰)

میکار بہت خوش تھا۔ خوش اور اپنے کئے پر نادم۔ وہ آہستہ آہستہ اکسنیف کی چارپائی کی طرف بڑھا۔ رات کی تاریکی میں اکسنیف نے محسوس کیا۔ کہ کوئی اس کی چارپائی پر بیٹھا ہے .... "مجھے معاف کر دو اکسنیف! مجھے معاف کر دو" اکسنیف کو معلوم ہو گیا کہ وہ میکار کی آواز تھی "تم نے میرا کیا قصور کیا ہے جو مجھ سے معافی مانگ رہے ہو" اکسنیف نے بیٹھے کہا "اکسنیف! اس سوداگر کا قاتل میں ہوں ...... میرا ارادہ تھا کہ تمہیں بھی موت کے گھاٹ اُتار دوں۔ مگر آہٹ پا کر ڈر گیا۔ خنجر تمہارے بیگ میں چھپا کر کھڑکی کے راستے بھاگ گیا .... [illegible] ! میری وجہ سے

تم پر یہ مصیبت آئی ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے معاف کر دو" اکسنیف نے کوئی جواب نہ دیا ۔ میکار اُس کی چارپائی سے اُتر کر نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا "مجھے معاف کر دو۔ خدارا معاف کر دو۔ میں اقرار کروں گا کہ قاتل میں ہوں، سوداگر کا خون میں نے کیا۔ اُس کی نقدی میں نے چرائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تمہیں چھوڑ دیں گے تم گھر واپس جا سکو گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" تمہارے لئے یہ کہہ دینا آسان ہے مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں کیا کروں میری بیوی مر گئی ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے بچوں نے مجھے بھلا دیا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب میں کہاں جا سکتا ہوں" میکار نہ اُٹھا اور اپنے سر کو زمین پر پٹک دیا۔ اکسنیف! مجھے معاف کر دو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب وہ مجھے باندھ کر تازیانے لگائیں گے۔ تو میں خوشی سے برداشت کروں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم نے باوجود ان باتوں کے مجھ پر رحم کھایا اور میرا نام نہیں بتایا۔ اگرچہ میں بہت گنہگار ہوں۔ مجھے معاف کر دو" میکار سسکیاں بھر رہا تھا۔ اکسنیف کی آنکھیں پُرآب تھیں "خدا تمہیں معاف کرے گا۔ میں تو تم سے بھی سو درجے بُرا ہوں" اکسنیف نے ایک روحانی مسرت محسوس کی۔ اُس نے گھر جانے کی فکر بالکل چھوڑ دی۔ اُسے جیل خانے سے چھٹنے کی کوئی خواہش باقی نہ رہی۔

میکار نے قتل کا اقرار کر لیا۔ اُسے سنگین کڑیوں میں جکڑ دیا گیا۔ جب سپاہی اکسنیف کو آزاد کرنے کے لئے آئے تو ۔ ۔ ۔ ۔ اکسنیف ہر قسم کی قیود سے آزاد ہو چکا تھا۔ اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں کمرے کی چھت پر لگی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اختر

(ترجمہ)

ذوقِ جنوں کو نذرِ بیاباں نہ کیجیے

اظہارِ سوزشِ غمِ ہجراں نہ کیجیے
شیرازۂ حیات پریشاں نہ کیجیے

میرے لیے یہ درد ہی سامانِ زیست ہے
للہ میرے درد کا درماں نہ کیجیے

میں خود ہوں اک فسانۂ آشوبِ روزگار
مجھ سے بیانِ گردشِ دوراں نہ کیجیے

ہاں دیکھیے بہارِ دلِ داغدار کی
سیرِ فسوں طرازیٔ بستاں نہ کیجیے

کچھ تو جواب دیجیے میرے سوال کا
اچھا نہیں ہی کہیے۔ اگر ہاں نہ کیجیے

یوسف ہوں میں بھی آہ مگر نامرادِ شوق
مجھ پہ گمانِ یوسفِ کنعاں نہ کیجیے

محمد یوسف

شعلے

گلزار کو شعلوں میں بسا آیا ہوں
شعلوں کی تپش میں بڑھ آیا ہوں
میں اپنی بجھانے کو لگی ہاتھ سے دوست
اوروں کو بھی اک آگ لگا آیا ہوں

ایم۔ اے نعیم۔ ایم اے
(فائنل)

ذرا ملاکنڈ تک ......!

خُدا کا کرنا ایسا ہُوا۔ کہ ہمیں "گزشتہ سے پیوستہ" ماہ میں یعنی ماہِ دسمبر میں ملاکنڈ جانے کی سُوجھی۔ ٹیوٹوریل گروپ کے ایک اجلاس منعقدہ ...... (تاریخ یاد نہیں) میں یہ تجویز پیش ہوئی۔ کثرتِ آراء سے پاس ہوئی۔ اور بایں سبب عدم ادائیگی چندہ (بقدر ہندہ) فیل ہوئی۔ ممبران نادہندہ سے بازپرس کی گئی تو اُنہوں نے بمصداق "اُلٹا کوتوال چور کو ڈانٹے" ہمیں کوسنا شروع کر دیا۔ اور ہمیں باعزت سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ کہ ہم ساڑھے تین مبلغ روپے کی ڈگری کو بالواسطہ یا بلاواسطہ ممبران اس کی تجویز بے تمیز کی نذر کر دیں

> قہرِ درویش برجانِ درویش

> ہم کو معلوم نہ تھا ...... الخ

ورنہ ہم تو اُس وقت چُپ سادھ لیتے۔ لیکن جناب! ہم نے تو تجویز کی حمایت میں اپنا سارا زورِ بیان صرف کر دیا۔ زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ کہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی کشمکش کے پیشِ نظر ہم۔ ہندوستان کے سپوتوں کو لازم ہے۔ کہ تاریخی مقامات کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ دورہ ضرور کریں۔ تاکہ کل اگر "عدم تشدد" کے اس "موذی حربے" سے انگریز ڈر کر ہندوستان کو چھوڑ جائیں یا ہم اُن سے ڈر کر پناہ لینا چاہیں (بات تقریباً ایک ہی ہے) تو تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ فریضہ جو ہم پر ایک وطن پرست کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے۔ ہمیں چاہئے۔ کہ اس کے سرانجام دینے میں ہرگز کوتاہی نہ کریں۔ چنانچہ قرار یہ پایا۔ کہ ہم جمعرات کے مبارک روز ملاکنڈ سدھار جائیں۔ تاکہ شام کو وہاں پہنچ کر کسی مسجد کے امام صاحب کے سر پر "بلائے ناگہانی" کی طرح جا نازل ہوں۔ اور ان کے اس مبارک مالِ غنیمت یعنی حلوے مانڈے میں شریک ہوں۔ جس کو وہ شام کی نماز پڑھاتے ہوئے مسجد میں ٹانگوں کے درمیان سے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ چونکہ ہمارے اس لشکرِ جرار میں اکثر اصحاب عدم تشدد کے حامی تھے۔ چنانچہ شبہ تھا کہ مبادا یہ ہندوستان کے "مستقبل کی اُمیدیں" دعا دا بولتے وقت امام صاحب کے ڈنڈے کو دیکھ کر اور اُن کے "نعرہ اللہ اکبر" کو سُن کر بھاگ نہ نکلیں چنانچہ گروپ کے ناظم محترم "ہرجائی" صاحب (ÖVALTINE) کی اَن تھک کوششوں سے چند آلوجو عدم تشدد کے لئے "اولٹین" کا حکم رکھتے ہیں۔ پکا لئے گئے۔

اس ضمن میں یاد رہے کہ فاروقی صاحب کو مع اُن کے گروپ کے ممبروں کو ہم نے "بزورِ پیسہ"

(معاف رکھئے بزورِ بازو نہیں) طفیلی بنا لیا تھا - اور وہ بھی ہمارے شریک سفر تھے -

لاری یہاں سے ایک بجے چل پڑی - اور جہاں سے یعنی پشاور سے دو بجے کے قریب ابدولت کو
(مع چند رفقا کے) لاری لینے کے بعد ملاکنڈ کو چل دی - یہ ذکر کر دینا بیجا نہ ہوگا - کہ ہم کو اعلیٰ سیٹ حاصل کرنے
کے معاملے میں یقیناً چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑا - کیونکہ بعض دخل در معقولات اصحاب کالج سے سوار
ہوتے وقت ہی فرنٹ سیٹوں پر 'براجمان' ہو چکے تھے - بہرکیف ہم نے انفرادی حیثیت سے جو کوششیں
کیں - وہ ہمارے لئے بارآور ثابت ہوئیں - اور بمصداق ے تو بھی گھسٹر گھیسٹر - گھسیٹرن - گھساٹر ہے -
(جعفر زٹلی) ہم مبلغ ایک عدد سیٹ بقائمی ہوش و حواس، حسب منشا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے،

صدر میں میلا رام فوٹوگرافر کی مشہور دوکان سے کچھ مٹھائی خرید لینے کی فرمائش فاروقی صاحب سے
کی گئی - یہ اب ہم پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتے - کہ دکان وہی تھی یا کوئی اور متصل تھی - کیونکہ فوٹوگرافر
کی دکان سے، اور پھر میلا رام کے غیر شاعرانہ چہرہ نامبارک کو دیکھ کر یہ گمان تک نہیں ہو سکتا کہ مٹھائی
کے نام کو بھی اُس 'بھلے' مانس سے کچھ نسبت ہو سکتی ہے - تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ وہ تو اللہ
والا، فوٹو میں بھی بعض 'مٹھائی نما' اصحاب کی شکل مبارک پر اپنی اُلٹی چھری (RETOUCHING)
ایسے چلاتا ہے - کہ خود اُن صاحبوں کے متعلق ایسی دکسر نفسی اکر لینے پر پشیمانی ہوتی ہے -

ہاں تو یہ کہہ رہا تھا کہ فاروقی صاحب نے وہاں سے مٹھائی خریدی - اور ہمارے گروپ
کے نائب ٹیوٹر مسٹر (محی الدین) صاحب کو اس بنڈل کے 'حمل' (عربی میں اُٹھانے کے معنی ہیں)
کے لئے منتخب کیا - ہمیں ذاتی طور پر معلوم نہیں کہ اُن سے وہ حمل (عربی میں اسم یعنی بوجھ کے معنی
میں ہی مستعمل ہے) کہاں گرا - لیکن پہاڑی سے اُترتے وقت ہمیں رستے میں چاکلیٹوں پر لپٹے ہوئے
کاغذوں کے ٹکڑے ضرور ملے - ہماری قسم کے 'مومنوں' کے دلوں کو اس 'محرومی' پر سخت صدمہ
پہنچا - لیکن محض انا للہ و انا الخ پر اکتفا کر کے اپنے آپ کو 'صبر و شکر' کی تلقین کی گئی - اور 'پسماندگان'
کے لئے دعا کی گئی کہ خدا اُنہیں ہمارے پیٹ مبارک میں جگہ دے -

رستے میں ہماری نظر لاری کے ایک کونے پر پڑی - جہاں تمام ڈیچے ہی ڈیچے نظر آتے تھے -
اور جو مسلمان کے دل کی طرح (ایمان سے) خالی تھے - اُس کے گرد و نواح میں ایک پختہ رنگ کے صاحب
تنہا (جو فاروقی صاحب کے گروپ سے تعلق رکھتے ہیں) کانوں سے سر چھپائے بیٹھے تھے - اور ہر گھڑی
ڈیچوں کے قریب سے قریب تر ہو رہے تھے ... تاکہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو کر ایسے چھاپہ ماریں
جیسے غریب مسلمان کے ایمان پر شیطان چھاپہ مارتا ہے - ہمیں پہلے تو گیان نہ ہوا کہ ہمارے ساتھ

وہاں کھانے پکانے کے لئے یہ باورچی جا رہے ہیں۔ پھر نیلی یونیفارم اور پگڑی پر نظر پڑی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ وردی تو آج کل ہر ایک کو ملی ہوئی ہے۔ "نا؛ لیکن "تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ واقعی ایک "صاحب" ہیں۔ چنانچہ فی البدیہہ، فاروقی صاحب سے درخواست کی گئی۔ کہ چونکہ اُن کی سیٹ کے اُوپر "یہ جگہ عورتوں کے لئے مخصوص ہے"، لکھا ہوا ہے۔ اس لئے وہ مجاز نہیں کہ وہاں بیٹھیں چنانچہ یہ سنتے ہی چوں وچرا کئے بغیر وہ نظریں بچا کر فوراً سیٹ سے اُن کے حق میں دست بردار ہو لئے ہمیں ——— پہنچکر محصول ادا کرنا تھا۔ (جیسے ہم کالج کے سٹوڈنٹ نہ ہوئے۔ کوئی اناج، غلہ (COMMODITIES) ٹھہرے) وہاں ہم شام کو سات بجے کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ داخلہ بند ہے کیونکہ ملاکنڈ میں قبائلی لوگ سرکار کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ یہ سُنکر پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ (اور پتھر آگئے؟ خدایا اب کیا بنے گا۔ مسجد بھی قریب کہیں نہیں معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ ملاکنڈ صاحب کی دُعائیں اُن کے آڑے آئیں۔ اور معجزات کے ٹرنوالے اُنہیں کے حصہ میں رہے۔ ناظم محترم کو سُوجھی۔ کہ پولیٹیکل ایجنٹ صاحب کی فون پر سمع خراشی کی جائے۔ وہ خود تو نہیں تھے۔ لیکن اُن کے پرسنل اسسٹنٹ خیر سے تشریف رکھتے تھے۔ چنانچہ تعارف ہوا۔ میں دُور اپنے رفقاء کے ساتھ تصویر یاس بنا کھڑا تھا۔ صرف ایک دو فقرے سُنائی دیئے۔ کہ میں کوہاٹ کا ہوں اور ہم ملاکنڈ آنا چاہتے ہیں۔ اور ہم ہیں جی ..... دھوبی۔ یا نہ معلوم کیا؟ قصہ کوتاہ اجازت نہ ملی۔ اور مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔

۵ پھر خیال آیا ....۱۰ بجے

چنانچہ ملاکنڈ کے چیف کمشنر صاحب یعنی تحصیلدار صاحب کو فون کی گئی۔ خیال رکھیئے یہ فقرہ کچھ پیچیدہ سا ہے۔ یہ درحقیقت "نسبت" (RATIO) کا سوال ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے۔ کہ ایک ڈپٹی کمشنر صاحب کو ایک دفعہ ایک گاؤں دَورہ پر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ تو وہاں اُن کو ایک ستم ظریف نے یہ دعا دی تھی۔ کہ خدا "صاب"! آپ کو پٹواری کرے۔ اس لحاظ سے میرے "حل سوالات" کا جواب ٹھیک ہے۔ کیونکہ پٹواری برابر ہے ڈپٹی کمشنر کے اور نائب تحصیلدار رضا کے اور اس لئے تحصیلدار برابر ہے چیف کمشنر کے۔ خیر.....! یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ہمیں اجازت مل گئی۔ پھر ہم کہاں کہاں پھرے۔ یہ "پرسنل" باتیں ہیں۔ (اور یہ کہ) ہم نے کہاں کہاں اور کیسے کیسے اور کیونکر فاقہ کشی کی (اور یہ کہ) یہ دو دن بیچ کے کس طرح کٹے۔ (اس کے متعلق مابدولت کی رائے کے حقوق محفوظ ہیں) یا (اس کے متعلق مابدولت اپنی داستان غم رائے اس صحبت میں محفوظ رکھنا چاہتے ہیں) کم از کم ایسی کسر نفسی سے ہمیں معاف رکھیئے!

(باقی پھر) احسان الودود

عشقِ خاموش[1]

بندۂ عشق سے جا کر کوئی کہہ دے احسن
شوق سے شمعِ محبت کا وہ پروانہ رہے

یہ روا ہے کہ بکھیرے وہ گلِ شوق بجود
اور سودائے محبت میں وہ دیوانہ رہے

"عشقِ خاموش" مگر پیشِ نظر ہو ہر دم،
خامشی مانعِ ہر نعرۂ مستانہ رہے

کشورِ عشق میں شرعِ کہن جاری ہے
کام لے ضبط سے فریاد سے بیگانہ رہے

لب کشائی سے محبت میں زوال آتا ہے
اس طرح آئینۂ عشق میں بال آتا ہے!

[1] لانگ فیلو کی نظم "SILENT LOVE" کا ترجمہ۔

منظور احسن
بی۔اے۔(آنرز)

تخلیقِ جوانی

سکوت کی پُرسکون بستی میں اضطراب کی آندھیاں اُٹھیں۔ جو امن و سکون سے بدرجہا رنگین تر تھیں۔ خزاں کی آہیں آہستہ آہستہ بہار کے سحر آفریں نغموں میں کھو گئیں۔ سازِ فطرت کی تاریں جو مدت سے خاموش پڑی تھیں کسی غیر مرئی مضراب سے چھوئے جانے کے لئے بے تاب نظر آنے لگیں۔ زندگی کا معصوم حسین مرقع اک نئے پیکر میں تحلیل ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بالکل ایسے جس طرح کسی جھیل کے خاموش نقرئی پانی کی سطح سے اپنی پیشانی کو چھوتی ہوئی کوئی سیمیں کشتی رواں ہو نئی روح اس پیکر میں تحلیل ہو رہی تھی۔

عشق کا دیوتا اس مرقع کو اپنا تحفہ دینے کے لئے اپنے ہوائی پروں پر سوار اڑتا ہُوا آیا اور اک تیر اس مرقع کے پہلو میں پیوست کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ "اے پیکرِ رنگین! محبت کی سحر آفریں وادیوں میں تری روح ہمیشہ کھوئی رہے۔ تو فرشتۂ محبت کی جستجو میں ہمیشہ سرگراں رہے۔"

دھیمے دھیمے سروں میں اک راگ الاپتے ہوئے دوشیزہ بہار رقصاں، لرزاں، پھولوں کے ملبوس میں پنہاں اس نئے مرقع کے پہلو میں آکھڑی ہوئی۔ اس کے نازک نازک پیوستہ لب ہلے "اے پیکرِ رنگین! زندگی کی حسین رعنائیاں جب عریاں ہو کر فطرتِ عالم کو گھیرے ہوئے ہوں۔ جب بزمِ ہستی رقص و سرود کی آماجگاہ بن جائے۔ جب افراطِ مسرت سے روحِ زندگی خود بھی محوِ رقص ہو۔ تجھے اک جاودان خلش سکوں سے بیگانہ رکھے۔"

دوشیزہ بہار نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ یکایک ہلکی ہلکی سیاہی پھیلنے لگی جو لحظہ بہ لحظہ گرد و پیش کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ لیلائے شب اپنی سیاہ زلفیں پھیلائے چلی آ رہی تھی۔ تاریک سائے اس کے ارد گرد ناچ رہے تھے۔ اس مرقع کے قریب آ کر فضا میں اک ہلکا سا ارتعاش پیدا کرتے ہوئے اک مسحور کن صدا میں اس نے کہا "حسین پیکر! جب تمام دنیا میری آغوش میں سر جھکائے اونگھ رہی ہو۔ جب دُنیا کی تمام رنگینیاں رعنایاں، مرے سیاہ آنچل میں کھو جائیں جب آرزوئیں تمنائیں تمام محوِ خواب ہوں۔ تیری ان درخشاں آنکھوں سے نیند دور کسی نا معلوم بستی کو چلی جائے اتنی دور کہ ترا تخئیل بھی اس تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ طویل راتوں میں تری روح قرار کو ترسے۔ تری روح تڑپتی رہے ترا دل کانپتا رہے ترا جسم لرزتا رہے تری آرزوئیں تجھے مثلِ کباب سیخ بے تاب رکھیں۔ اور اس لمحے میں تجھے کوئی غمگسار نہ ملے!"

شب کی شہزادی چلی گئی۔ اور اس کی جگہ شرماتی، لجاتی، بل کھاتی اُمید کی دیوی نے لے لی۔ اس کا

ملبوس رنگینیوں کا گہوارہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں اک جاوداں خلش اک پائندہ سی نہاں تھی۔ اس کے سبک رفتار پاؤں پر یہ گماں گزرتا تھا کہ وہ اسے دوران دنیوی آلائشوں سے بہت دور کسی معصوم بستی کی طرف لے اڑیں گے۔

اپنی حناتی انگلیوں سے اس مرقع کے بالوں کو چھوتے ہوئے اس نے کہا "خوفزدہ نہ ہو اے پیکرِ حسین! زندگی کے بلند و پست میں میں تیرا ساتھ دونگی۔ جب غم کی سوگوار تاریکیاں تجھے پریشان کریں گی۔ میں اس سیاہ بھیانک تاریکیوں کو اک پلک جھپکانے میں روشن ضیا میں بدل دونگی۔ حسین پیکر افسردہ نہ ہو"

دیوی اور دیوتا اپنے اپنے تحفوں سے اس مرقع کی تکمیل کر چکے تھے۔

"م"

زندگی آزار ہی آزار ہے تیرے بغیر
دو گھڑی جینا بھی مجھے دشوار ہے تیرے بغیر

نغمۂ بلبل صدائے نالہ بن کر رہ گیا
جلوۂ گل اک کھٹکتا خار ہے تیرے بغیر

شادکامی کا ستارہ سو گیا جب تو نہیں
دیدۂ جورِ فلک بیدار ہے تیرے بغیر

آکہ اب مجھ سے اٹھایا جا نہیں سکتا یہ بار
زندگی کا ناز بھی اک بار ہے تیرے بغیر

لٹ گیا جوشِ جنوں سرمایۂ لطفِ حیات
احسنِ خستہ بہت نادار ہے تیرے بغیر

منظور احسن
(بی۔ اے۔ آنرز)

فرزندِ کہسار

شیرخان نے جلدی جلدی قمیص اُتار کر مجھے اپنا جسم دکھایا۔ اُس کے جسم پر جگہ بہ جگہ چھروں کے نشان تھے۔ کچھ چھرے نکال لئے گئے تھے۔ اور کچھ جسم میں ابھی تک پھنسے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر میں خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگا،

"تم نے تو تمام بدن پر چھرے کھائے ہیں! تم پر کیا آفت پڑی شیرخان!"

"آفت!!؟" شیرخان کے چہرے پر سنجیدگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور اپنی ٹھوڑی کو ہاتھ کا سہارا دیکر بولا: "میری داستان عجیب و غریب ہے۔ میرے پانچ لڑکے جنگ و جدل کی نذر ہو چکے ہیں۔ بیوی دادِ شجاعت دیتی ہوئی قتل ہو چکی ہے۔ میرے سر کے بال دیکھو۔ ان کے غم سے برف کی طرح سفید ہو چکے ہیں۔ میں انتقام لے چکا ہوں۔ انتقام۔ خوفناک لیکن شریفانہ انتقام۔ لیکن بیوی اور بچوں کی یاد اب بھی ستا رہی ہے۔ اور میرے زخمی دل میں انتقام کے شعلے اب بھی بھڑک رہے ہیں۔"

شیرخان کی آواز بھرا گئی۔ اس کی وحشی آنکھوں سے سفید موتی اس کے رخساروں پر ڈھلکنے لگے۔ اور اس کی سفید داڑھی میں جذب ہونے لگے۔

میرا دل بھر آیا۔ آہ، یہ بوڑھا پٹھان کس قدر دردمند ہے۔ واقعی بیوی بچوں کا صدمہ ناقابلِ برداشت ہے جس نے اس کے پتھر ایسے دل کو پانی پانی کر دیا ہے۔ میرا دل رحم و کرم کے جذبات سے معمور ہو گیا۔

"شیرخان!" میں نے انتہائی جوش سے کہا "اپنی کہانی سناؤ۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ سننا نہیں چاہتا" شیرخان سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کی خوفناک آنکھیں دورِ گذشتہ کی یاد سے چمکنے لگیں،

وہ! ـــ بہت دور ـــ سامنے پہاڑوں کی دُھندلی تصویریں دیکھ رہے ہو۔ یہی میرا وطن مالوف ہے۔ اس دائیں جانب والی پہاڑی کے دامن میں ایک سبزہ زار ہے۔ یہاں میرا سب سے بڑا بیٹا بہادر خان بھیڑ بکریاں چرایا کرتا تھا۔ اس کی عادت تھی۔ کہ بھیڑ بکریوں کو چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیتا۔ اور خود ایک بڑے سے تودے پر بیٹھ کر ایک عجیب دلسوز ترنم سے پشتو کے ٹپّے گایا کرتا تھا

ایک دن وہ مویشیوں کو چرنے کے لئے چھوڑ کر اسی پہاڑی پر بیٹھا ہوا گا رہا تھا۔ کہ اتنے میں گاؤں کا کینہ ور اور بدکن انسان حریف خان آیا۔ بھیڑ بکریوں کو سبزہ زار میں چرتے دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ

لگ گئی۔ پہلے تو فحش گالیوں کا ایک طومار باندھ دیا اور پھر کہا "ابے لونڈے! یہ تیرے باوا کی ملکیت ہے کہ تو یہاں مویشی چراتا ہے؟" بہادر خان کے سینے میں نوجوانی کا خون جوش مار رہا تھا۔ طبعاً غصیلا بھی تھا اس نے بھی جواب میں گالیوں کی بوچھاڑ شروع کی اور کہا "حولیف خان! خبردار! زبان سنبھال کر بولو۔ تم کون ہو مجھے روکنے والے؟!"

حریف خان کے لئے یہی بہانہ کافی تھا۔ اس کا ہاتھ بجلی کی سُرعت سے اُوپر اُٹھا۔ اور قبل اس کے کہ بہادر خان سنبھلے۔ بندوق کا مُنہ اس کے سینے کو گھور رہا تھا۔ ٹھز کی آواز تمام پہاڑی میں گونجی۔ میں گھر سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ کہ کیا ہُوا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ بہادر خان چت لیٹا ہُوا ہے۔ اس کی بائیں پسلی سے خون کا فوارہ جاری تھا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہُوا کہ بہادر خان بہتے ہوئے خون میں ہاتھ ڈبو ڈبو کر چہرے پر ملتا جاتا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر جھک کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اور بڑے استقلال سے کہا "بیٹا بہادر! کیسے ہو؟" اس نے بڑی تکلیف سے آنکھیں کھول دیں۔ اور مسکرا کر بولا "اچھا ہوں بابا! کچھ تکلیف نہیں۔ صرف بائیں پسلی سے خون بہتا ہے" میرا ماتھا ٹھنکا، کہ گولی دل کے قریب لگی ہے۔ اور اب اس کا بچنا دشوار ہے۔ میرا رنگ زرد پڑ گیا۔ اور بولا "بیٹا! چہرے پر خون کیوں ملتے ہو؟"

وہ میرے چہرے سے سب کچھ بھانپ گیا اور بولا "اب میں سمجھ گیا کہ مرنے والا ہوں۔ بابا! چونکہ زیادہ خون بہہ جانے سے چہرے کا زرد ہو جانا یقینی ہے۔ اس لئے منہ پر خون ملتا ہوں تاکہ لوگ کہیں دیکھ کر یہ نہ کہیں کہ شیر خان کا بیٹا بہادر خان موت سے ڈر گیا۔ مرنے کے بعد اس کا چہرہ زرد تھا۔ ابّا جان۔ پٹھان موت سے نہیں ڈرتا۔ موت اس کے لئے ایک دلچسپ کھیل ہے۔"

میں چند لمحوں کے مہمان بیٹے کی یہ شجاعانہ باتیں سُن رہا تھا اور رو رہا تھا "بیٹا! دل میں کچھ حسرت تو نہیں رہی؟" بولا "ابا! بس یہی حسرت دنیا میں لئے ہوئے اس دنیا سے جا رہا ہوں کہ بے غیرت۔ بزدل اور پٹھان کے نام کو بٹہ لگانے والے حریف نے مجھے مقابلہ کرنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ کاش میں اس کے ساتھ دست بدست لڑ کر قتل ہو جاتا۔ کم از کم اسے پتہ تو لگ جاتا کہ شیر خان کا بیٹا بھی لڑنا جانتا ہے مگر آہ اب تو تمام گاؤں والے یہی کہیں گے کہ حریف خان نے بہادر خان کو کتے کی موت مار ڈالا۔ آہ ابا جان! یہی غم مجھے کھائے جا رہا ہے" میری آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "بیٹا بہادر! وصیّت؟" بولا "ابا! وصیت؟؟؟ انتقام! انتقام!! انتقام!!! لیکن شریفانہ افغانی انتقام! اس کی آنکھیں جوش سے اُبھر آئیں۔ سکرات کے غلبے سے کچھ دیر زمین پر ہاتھ پاؤں مارے۔ اور سانس توڑ دیا۔ مرحوم کے لالہ زار چہرے پر ایک معصوم تبسّم کھیل رہا تھا۔

اس واقعے پر دو سال بیت گئے۔ جوان فرزند کی موت سے دنیا میری آنکھوں میں اندھیر تھی۔ اس اثنا میں

میں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ کہ کہیں حریف خاں ہاتھ لگے۔ تو اس کے ساتھ دو دو ہاتھ ہو جائیں لیکن وہ بھی ایک ہی بزدل تھا۔ ڈر کے مارے گھر سے نکلتا ہی نہیں تھا انتقام کا بھوت میرے سر پر ایسا سوار تھا کہ بارہا میں نے ارادہ کیا کہ اس کے گھر پر ہی کیوں نہ دھاوا بول دوں لیکن افغانی ضمیر نے کڑک کر کہا "خبردار! گھر میں مستورات ہیں اسکی جوان بیوی ہے اس کے بوڑھے ماں باپ ہیں۔ اس کے معصوم بچے ہیں اسکی دوشیزہ بیٹی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ انتقام کے جوش میں اُن بے گناہوں کو کچھ ایذا پہنچے۔

"شیرخان! میں نے ایک جماہی لیکر کہا شیرخان یہاں تک کہہ کر خاموش ہوگیا" کیا قصہ ختم ہوگیا تم نے ذکر کیا تھا کہ میری بیوی اور میرے پانچ بیٹے بھی انہیں لڑائیوں کی نذر ہوگئے ہیں"!

"ہاں برخوردار!" شیرخان نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "میری کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی میرے پانچوں بیٹے اور بیوی اسی بزدل حریف خان کے چار بھائیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے مگر طوالت کے خوف سے ان کا ذکر پھر کسی وقت کرونگا ...... خیر! تو آگے کہانی سُنیئے!

۲۳ دسمبر کی شام تھی۔ ٹھٹھرا دینے والی سرد ہوا چل رہی تھی۔ میں کمرے میں چولھے پر جھکا ہُوا تھا۔ اور پھونکیں مار مار کر ہاتھ پاؤں تاپ رہا تھا۔ اتنے میں میرا میرا بھائی اور جانی دوست سلطان دوڑتا ہانپتا کمرے میں آدھمکا۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتمایا ہُوا تھا۔ آتے ہی اُس نے مجھے خوشخبری سُنائی کہ ساتھ کے دوسرے گاؤں میں آج رات کے دس بجے مجلس سماع ہے جس میں "مہ جبیں" طوائف (چندے آفتاب چندے ماہتاب) گائے گی۔ ناچیگی اور تماشائیوں میں حریف خاں اور اس کے چاروں بھائی بھی ہیں۔ میں یہ سُنکر خوشی کے مارے آپے سے باہر ہوگیا اُٹھ کر جلدی جلدی میں نے ایک موٹا سا کالا کمبل اوڑھ لیا۔ اور اس کے نیچے ہاتھ میں اپنا خوفناک پستول لیا۔ اور منزل مقصود کی طرف روانہ ہُوا۔

میں گاؤں کو بڑی دیر سے پہنچا مجلس سماع خوب گرم تھی۔ "مہ جبین" ایک عجب دلسوز ترنم سے نغمے الاپ رہی تھی۔ غیور اور بہادر پٹھان جن کے مغرور سر تلواروں اور توپوں کے آگے خم نہیں ہوتے تھے۔ "بازاری حسن" کے آگے سر جھکا کر میٹھے ہوئے تھے۔ آہ آہ اور واہ واہ کا بازار گرم تھا۔ کبھی کبھی پانچ پانچ اور دس دس روپے کے نوٹ بھی بائی جی کے پاس بھیجے جا رہے تھے۔

جب میں پہنچا تو طائفہ یہ گا رہی تھی :۔

ستر کے دَ محبوب کل اناردی توبہ۔ توبہ

میں نے دیکھا کہ حریف خاں نے جھٹ دس روپے کا نوٹ بھیجدیا۔ اور کہا "بائی جی یہ آپ کی نذر ہے" اس کی تقلید اس کے بھائیوں نے بھی کی۔ مہ جبیں نوٹوں پر قبضہ کر کے اور مُٹھی گرم کر کے ایک ادائے ناز کے ساتھ حریف خان کو دیکھ کر مسکرائی۔ اور نذرانہ قبول کیا۔ حریف خاں بڑا خوش ہُوا۔ اور مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔ یہ دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا

چشم زدن میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ اور کمبل کے نیچے چھپا ہوا پستول آہستہ سے اس کے رخسار کے ساتھ لگا دیا۔ لوہے کی ٹھنڈک سے حریف خان چونک پڑا۔ مجھے دیکھ کر اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اور پیپل کے پتے کی مانند تھر تھر کانپنے لگا۔ بھرا ہوا پستول خوف کے مارے اس کے ہاتھ سے زمین پر گر پڑا۔ میں نے لیکر اٹھا لیا۔ اور اسے دے کر کہا۔ "بزدل! تم نے پٹھانیت کو بٹہ لگا دیا۔ یہ پستول اور میرے ساتھ لڑو۔ مقابلہ کرو" لیکن مقابلہ کون کرتا۔ آخر جب میں مایوس ہو گیا تو اس کے سر کے ساتھ پستول رکھ کر گھوڑا دبایا۔ ایک خوفناک "ڈز" کی آواز آئی۔ حریف مرا ہوا تھا۔ راگ رنگ یک لخت بند ہوا۔ لوگ ہڑبڑا کر اٹھے۔ مہجبین کا پھول ایسا چہرہ کملا گیا۔ خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگی، ستار اس کے ہاتھ سے ایسے گر پڑا۔ جیسے معصوم بچے کے ہاتھ سے نیند میں کھلونا گر پڑتا ہے وہ تعظیم اور سنت کے طور پر پیشانی پہ دونوں ہاتھ رکھ کر بولی۔

"خان جی! خدا کے ل . . . . ل . . . . لئے۔ رسول . . . . ک . . . ک . . . کی خاطر یہ کیا" خوف اور دہشت کے مارے اس کی زبان تتلا گئی تھی "مہجبین! خاموش رہو" میں نے کڑک کر کہا اور پھر حاضرین کو مخاطب کر کے بلند آواز سے کہنے لگا: "بھائیو مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے رنگ میں بھنگ ڈال دی ہے۔ لیکن میں درخواست کرتا ہوں کہ مجھے انتقام کے لئے چند منٹ اور بھی دیئے جائیں" مجلس پر موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی میں نے پھر پکار کر کہا "میں حریف کے بھائیوں لیودل خان۔ سربلند خان، اکا فور خان اور رستم خان کو چیلنج دیتا ہوں کہ وہ باری باری آئیں اور میرے ساتھ مقابلہ کریں۔ آج ان کی پٹھانیت کا امتحان ہے" لیکن ان بیچاروں پر تو دہشت کے مارے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ مقابلہ پر کیا آتے "میرا خونخوار پستول بھاڑ ایسا منہ کھول کر آگ اگلنے لگا۔ لوگوں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ گاؤں ڈزا ڈز کی صداؤں سے گونجنے لگا۔

"شیر خان اپنا انتقام لے چکا تھا"

شیر خان خاموش تھا۔ میں نے آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور داڑھی آنسوؤں سے تربتر تھی۔ میری آنکھیں بھی نم آلود ہو گئیں۔

"شیر خان! اُف تم کس قدر بہادر اور نڈر ہو۔ پٹھان کو قدرت نے شاید موت سے ڈرنا سکھایا ہی نہیں کیا تم موت کو مانتے ہو۔ شیر خان جلال میں آ گیا۔ اور مٹھیاں بھینچ بھینچ کر گرجنے لگا: "ہاں میں موت کو مانتا ہوں۔ لیکن صرف ایک دفعہ۔ بزدل کئی دفعہ مرا کرتے ہیں مرنا تو ایک دفعہ ہے ہی۔ پھر وہ کیا موت ہو گی جس میں انسان ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے۔ حسرت سے آسمان کو تکتا رہے۔ رفع حاجت کے لئے بچارے کے واسطے چارپائی میں سوراخ کیا جائے اور ماں اور بیوی بیچاریاں خدمت کرتی کرتی تنگ آ جائیں موت! ــ شاندار موت! ــ وہ ہوتی ہے کہ انسان سینتان کر حریف کی گولیاں کھائے۔ اور اسکی چارپائی پر سفید ــ چاندنی کی طرح سفید ــ چادر بچھی ہوئی ہو اور اس پر خون کی گلکاریاں جگہ بجگہ نمایاں ہوں۔

"یہ ہے میرا شاندار موت کا نظریہ"

عبدالرزاق سیال ......

د (۳) میاشتنئ ——— تحریر نگاری ——— پښتو حصّه
تردی حده قومیت تموږنه مړه دئ ❖ چه هُم دغه دَ قومی ترقئ جمه دئ
په پښتو خبری مونږ په تحریر نه دی افغانه
ځیل وطن اوږ به پری نه دی

خیبر

طالب علم ایډیټر :- میاں محمد یوسف کاکاخیل
نګران :- مولنا عبدالرحیم صاحب مولوی فاضل منشی فاضل
اسلامیه کالج پښاور

شماره	مضمون	لیکوونکے	مخ
۱	شذرات	میاں محمد یوسف	۲
۲	دم دوس	میاں عبدالرازق	۵
۳	دَ جنت ټهکیداران	شاکرالله مهمند	۹
۴	صادقه دوستی	عبدالرؤف نوشهروی	۱۲
۵	یوه شپه په ګنړو کښ	اختر منیر مجروح	۱۴
۶	نامراد سلیم	میاں فضل مجید	۱۸
۷	جهنم		۲۰
۸	دروکوالی (نظم)	میاں محمد یوسف	۲۲
۹	" " "	محمد انور	۲۳
۱۰	انعامی نظم	میاں محمد یوسف	۲۵
۱۱	پرانړه سترګی (نظم)	اختر منیر مجروح	۲۶
۱۲	دَ یو بلبل فریاد "	سربلند صادق	۲۷
۱۳	یو نظم	ریاض	

شذرات

دَخیبر دا موجوده پرچه په داسې تنګ لنډ وخت کښې لیکلې شوې ده - چه یوُ طرفته ځما دَ یونیورسټئ امتحان په سر دے - یوُ یوُ منټ قیمتی دے - نو مجبوری ده - چه شذرات زرا و مختصر او لیکم - او خپله غاړه خلاصه کړم - بل طرف ته دَ کالج نور پښتانه رونړه چه دَ پښتو سره ئې څه دلچسپي نیشته - دَ امتحان دَ نزدیکت او په هغه دغه بهانو رانه ځان خلاص کړی - که زه ورته ډیرا ووایم نو څه ـــ

چه دَ زړګی مینه ئې نه وِی　　مین به ئې نه کړی دَ مُلا په تعویذونه

دَدی نه روښے هم څوڅو ځله دا ژړا ژړلی شویده - او زه ئې بیا سر دوباره کوم - چه ځموږ پښتانه رونړه دَ خپلې ژبې هیڅ قدر نه کوی - زه وینم چه دَ پښتنو په نامه مضمونونه دَخیبر په اُردو حصه کښې شایع کیږی - نو بیا وائی ـــ

خپل ئې کړهٔ محرومه په پردو ئې ځان تالا کړهٔ

ځما دَدی نه خبرو نه دا مطلب نه دے - چه په اُردو حصه کښې دی پښتانه مضمون نه ورکوی - لیکن دا خبره ضروری ده چه اول ځان او بیا جهان - یعنې اول پښتو او بیا اُردو

اوس چه څه را رسیدلی دِی - هغه هم غنیمت دے - په ټولو سرسری نظر اچولو سره دا معلومه شوه چه په کالج کښې دَ پښتو کافی شاعران پیدا شوی دِی - دَدوئ ذوق دَ داد قابل دے - خو یو نقصان پکښې ضرور دے - او هغه دا دے چه دوئ اکثر دَ قومی او تعمیری شعرونو په ځائ دَ حُسن او محبّت شعرونه ډیر خوښه وِی - حقیقت دا دے چه نن ورځ موږ ته داسې شعرونه جوړول پکار دی - چه په هغې کښې دَ قوم دَ ویخولو اَو څه تعمیری کار شوی وی - دویمه دا چه دَ نثر مضامین ډیر کم وو - امید دے چه آینده به دَدی خبری خیال او ساتلې شی -

فاروق افغانی افسانه ډیره ښه او په اصلی پښتو کښې لیکلې ده. البته په بعضې ځایونو کښې د پښتنو او د ډمو ناز او انداز او د معصوم دومره زر په زړا ګکو کښې زنګول غټې خامئ دی. لیکن که اِنصاف اوکړے شي نو د دینه بغیر د افسانې مزه ورکیږي.

د ناصراد سلیم په افسانه کښې مجید د ښایسته نقشې دا خکلو کوشش کړے شے. او ترڅه حده کامیاب شوے هم دے. ولې د سلیم داسې بے سوده او بے سببه مرګ کښې د انسانی مقامی رنګ نه پاتې کیږي. چونکه هغه بله طریقه د مرګ خو ښه نه کړه ځکه مجبوری وه چه هم دغسې هدیه د ناظرین شي.

"د جنت د ټهیکدارانو" د ژوند څه ټکړه شاکرالله شوکت مُهمند ډیره خوندناکه او د واقعاتو سره مشابه لیکلې ده. خو د پیرانو او فقیرانو داسې "سرپټوله" نه دُو ډیل یکا ځکه چه پښځه واړه ګټې هم برابرې نه دي. یو ځائ کښې وائي:-

خود په خپله د جنت خو ټهیکدار شوی — چه د پیرا و د مُلا په نوم نامدار شوی

"په کنړو کښې یوه شپه" تقریبًا ښه او مزاحیه طرز باندې لیکلې شوې ده. لیکن بعضې ځایونو کښې دومره د تفصیل نه کار آخستے دے چه په یو انتریش یوه پاڼه ډکه کړیده. هم دغسې د "ریښتنی دوست" لیکونکی دومره اوږدې اوږدې نقرې او د وضاحت د پاره یو یو ټکے دومره ځله لیکلے دے چه ته به وائې چه د چا نه ئې کچ اوخکې. او د سره ئې ترجمه هم کړیده. څه به ښه وه که د ځان نه ئې څه لیکلے وے.

په شعرونو کښې د سید رسول صاحب د "سپرلی سند ده" ښه مزیداره او د وخت سره موزونه لیکلې شویده. او امید لرم چه ستاسو به ډیره خوښه شي.

د سربلند بعض شعرونه د موقعې سره مطابقت نه خوری لیکن بحیثیت مجموعی ډیر ښه خیالات دی.

د مفتون شعرونه د یوبل د پاسه ښه دی. ډیر ساده او د اصلی پښتو لفظونه ئې استعمال کړیدی. او دائې حد درجه کمال دے. خو سره د دې په ځینې ځایونو کښې د خپلو خیالاتو په ښه شان سره اداکولو کښې ناکامیابه پاتې شوے. او په ځنې ځایونو

دَ دیری شوخئ نه لئ هم کار آ خستے دے۔ کہ چری غواړی نو دا خامئ په ډیره آسانه لری کولے شی۔

دَ ریاض شعر ونه ډیر شاندار دی۔ او په بعض شعر ونو کښی ئ تبدیلی دَ دُرستئ په خاطر شوی ده۔ سلیمان په شعر ونو کښی تشبیهات او یکرنګی په ښه شان نه دی اداکړی۔ لیکن دَ حوصله افزائ دَ پاره شایع کړے شو۔

په آخر کښی به دَ کالج رونړو ته دا درخواست اوکړم۔ چه معنوئ دَ خپلی ژبی دَ ترقئ په خاطر ضرور دی طرف ته توجه اوکړی۔ او په اعلیٰ او شاندار مضمونو نو دا لیکلو سره دی دَ پښتو حصی معیار اوچت کړی۔

میاں محمد یوسف
"مدیر"

سلسلہ اصلاح الافاغنہ

عـ۲ـ

"دم دُوس"

چه نه دي کيږي څوئ رب ته زاري ته په ترپوس کړي
مولاچه فرزند درکاندي ته جوړ يوي زړ "دم دوس" کړي

"خورې! داسې چا په غوږ وهلې يمه- چه ستا سړے ځان له چرته بل غم کوي- ولې څه وجه ده- ستا سو په کور کښې څه کش پش را غلے دے ؟

دَ کور دَ ميرمنې زړه دَدې خبرې په آوريدو را او ليشيدو- په ځان داسې او ښکې را روانې شوې لکه دَ ګل په ځنې چه دَ پرخې (شبنم) قطرې ښکاري- او په جړغونې آواز او وې "هو خورې- سړے لګيا دے ځان له بل کور آباده وي- ځکه چه دَ واده څلور کاله او شواو تراوسه ډکے موهم نه دے لګيدلے- داځما خپل قسمت دے"

"ولې خورې! مست بابا له نه يئ تلي؟ دَ نړمه ئې نوکے ئېمه- څوك ئې له دربارہ تشه جولئ نه دے راغلے"

"يو مست بابا پريږده- دَجهان ټول با باګان مې اوټرزول- دَهغې په دلبا دونو کښې اور غړيدم- په کانړو خکلولو مې شونډې او چاوُدې- په ټونوټوټکو مې خپلې خولې ګولې تمامې کړې- په کوړو تعويذونو مې شندې اوکړې- په دارو ګانو مې هم ځان شهيد کړو- خو مراد مې دَ سره نه شو- ځما په تندې کښې به هم دا ليکلي وو- دَ سړې غريب څه ګناه ده- ځوان جهان دے بل واده به او کړې- کور به ئې آباد شي"

درسره يوه نيکه صالحه ښځه نا سته وه- دَدوې دواړو خبرو ته ئې غوږونه تکے کړې وو- چه دکور ميرمنې خپله خبره ختمه کړه- نو دا ورته د وغونې لګيا شوه-

"خورې! ډيرِ دَ افسوس مقام دے- چه دَ دنيا ټولو قومونو تعليم او موندو- او ورځ په ورځ لګيا دي ترقي کوي- خو دا بد قسمته پښتون لا هغسې دَ جهالت په تورو تيَرو

کښې کیږدے۔ خوري! دا په کوم مذهب کښې راغلي دي چه بابا گان چاله اولاد ورکولے
شي۔ هغه غریبانان دَ منو نو خاورو لاندې پراته دي۔ ځان پورې هریان دِي۔ دَ
بابا دَ دربار کانړي خکلول شرك نه دے نو نور څه دي؟ توبي توبه کي او تعویذونه فضولیات
دي او صرف دشمنيُ کوي۔ اوۀ بوډۀ مکارو په کندوو داوځان وجل دَ جهالت انتهاده۔
خوري! تا اولاد فقط خدائ پاك ورکولے شي۔ پاسه! نیکه مسلمانه شه! خدائ
او پیچنه! نو بیا به گوري چه خدائ دربانديُ رحم کوي که نه؟ کال پس به گورې که
خیروي د سمندرخان په ځويُ به اومبارکي آخستے شي۔

"خان! زیرے مِ درباندې! اومبارك شه! خدائ تعالیٰ درله ځوئ درکړو۔"
دَسمندر دیره خدمتګاره سرتورسر څپي اهلي څپي ساه نیولي حجرې ته په دوُ دوُ راغلہ
اودائ اووي۔ سمندرخان دوستانو سره په حجره کښې ناست چلم ئې سکولو۔ چه
دَ ځويُ زیرے ئې واوریدو۔ نو دَ ډیرې خوشحالئ نه وانو تو۔ زرئ دَ جیب نه دَ لسئو روپو نوټ
رااوویستو۔ خدمتګارې ته ئې ورا و ویشتو۔ اودوه څپی څپلي اودوه پردئ کورته ئې منډه
کړه۔ د ټنه دبڅو اولسونه دَ اومبارکئ دَپاره راغلي وو۔ چه سمندر ئې اولیدو۔ نو ټول
اولس په او مبادك اومبارك سرشو۔ هر یو به تری زیرے غوښتو اودَ سمندر جیب په لګ
ساعت کښې تش شو۔ دَ سمندر ښځه په کټ کښې پرته وه۔ سمندر ته ئې په ډیره تلوسه
اووي چه هله که ډمان راوله۔ ناویاته ځوئ دِ شویدے۔ دَده پیدا کیدل خو به څه داسې
بي خاده مراده نه وي۔
ورسره هغه نیکه ښځه هم ناسته وه۔ هغه ورته دَ خوده اووته۔ او آخر ګلیا شوه!۔
" خوري! ډیره دَ افسوس خبره ده۔ چه خدائ درله ځوئ نه درکوو نو په سرو سترګو به
دي څړل۔ او اوس چه ځوئ دِ او شو نو په ځائ دَدې چه دَ خدائ شکر ګذاره شي۔ او
خیرات اوکی۔ ته ډمان راولی۔ دا نه خدائ پورې خندا کوی څه؟"
نورو ښځو دا غږ یبه په سترګو سترګو کښې وهلہ تا به وی چه خوری ئې۔ دَ کور میرمنه

هم ورته پرته شوه - اووی ویل - "زه زه ! مونږ ته د ملایانو خبری مه کوه - ما ته پته ده چه تا ډیری مُصلی الوزولی دی - د نصیحتونو پنډې دی په سر والیس کوره ته یوسه -

ډمان راو چلیدل - درز درز او دم دوس شروع شو - د پیسو روپو شرنګ شرنګ دو - ډمانو په ورخو کښ لوبی اوکړی او لاړل - اوس یاران دوستان سمندر لیسی شو چه هله که چیشتی چمن ډمه راو غواړه - د سمندر لاس تش دُه - اُدبوز ئی توبو غونډی کړو او ګیا شو -

"یارانو ! څما خو ډیرڅه زړه غواړی خوڅه اوکړم - سره پیسه نه لرم" دا آور یدل وو - چه ټول پری را سره شو -

"بے غیرته ! دومره نادیانه څوئ دی شوید ے - اوته پکښ لا شو متیا کوی - ظالمه څان خرخ کړه خو چیشتی چمن راوله - هله اوزغله د دولت رام سیټه نه په سود روپئ راواخله -

سمندر په دُو دُو بازار ته لاړ - دولت رام په ددکان کښ ناست دُه - په غټی دچاقئ اومره ګیډه باندِ ئی لاس وهلو او اوړتی ئی کول - سمندر ورغے او په کرسئ کینا ستو

"سیټه ! نن م درته حاجت پیښ شوید ے - څوئ م شوید ے - لاس م تش دے - څه روپئ به قرض غواړم"

"او نا یکه ! څوئ دی شوید ے ! او مبارك شه او مبارك شه - خدائ دی درته لوئ کړی - روپئ دی پکار دی ؟ سر په داخو ستا سو خپل دوکان دے - مونږه خو ستا سو تا بعدار یو - سمندر خان ! ستا د پاره به روپئ نه وی ؟ !! وایه څومره درکړم زر (۱۰۰۰) دوه زره (۲۰۰۰) څلور زره (۴۰۰۰)

"نه سیټه ! روپئ م لږ پکار دی - بس یو څلور سوه (۴۰۰) به کافی وی" سیټه ورته روپئ اوشمیرلی - اووی ویل "نا یکه ! سود څومره اولګوم" ؟ سمندر درته اووی "یره سیټه چه څه دی په طبعه وی - اولګوه - ستا او څمونږه څه د یوی ورزی خبره خو نه ده"

چالاك سیټهٔ دَخدائ نه دا موقعه غوښتله - ذرئ یوه نیمه[۱½] روپئ سینګړه دَمیا شتی سود اولګوو-

---

چشتی چمن راغله او ورسره دَ رقص او سرود یوه لویه دنیا راغله - دَ ماسختن د مانځه نه پرو مخے مجلس شروع شو- غیرتمند واو نورز نو پښتنو" بازاری حسن" ته سرونه ټیټ کړی وو- هار مونیم، ستار، دوکړی، په خپل خپل ساز غږیدل - په دی کښ دَ " الله اکبر" چغه شوه- کورسره دَ متصل جماعت نه اذان شروع شو- نودی بدبختو دَ اذان احترام هم اونه کړو- اولائ ورنه کړه- څه ساعت پس ملا صاحب راغے - او وی ویل چه مونږه مونځ کوو- لګ ساعت دا سرود مو بند کړئ - خوهغه غریب هم اورټلے شو- دَ مانځه نه پس دَجماعت امام صاحب راغے اوپه منت ئې او وی چه " مونږه سبق وایو- خدائ ته اوګورئ- لګ سرود بند کړئ" سمند د په دی خبره له ډیره قهره لمبه شو- خیل بینت ئې راواخستو او امام صاحب ئې بې ګناه لکه د مالوچو اوزمبوُو-

" دم دُوس،، بیا شروع شو- چُشتی چمن په کهیدوکهیدو دَ برمه پریوته- آخر کینا ستنه اولګیا شوه

سمندرخانَ اومبارك شه ‌‌ ‌ ‌ دومره نا دیانه خوئ چه خدائ دړکړے دینه

سمند ربی وقوف په دی مصرع موټے موټے غوښنه واخستنه. دَخوشحالئ نه یئ چینګی داړی را اوونی او ذرئ ورله دَ شلو[۲۰] روپو دوه نوټونه ورا ولیګل- چشتی چمن په نوټونو قبضه اوکړه او په یوناز سرہ ئې سمند دنه اوکاتل- موسکئ شوه اووی ویل

دا شل روپئ م دی منظورې ‌ ‌ ‌ خدائ درله درکه چه په مونږ ئې لګوینه

او بیوقوف سمند دورله بیا دَ څلویښتو[۴۰] روپو نوټونه ورا ولیګل- او چشتی چمن په دی مصرع بس کړه-

بس که په دغه فیصله ده ‌ ‌ ‌ چه دا بچے دی خدائ صالح اوخیجوینه

"وای ! هلك مړشو. وای ګما خدایه میرا ته شو مه. های های خلقه دا اوچلیګی"
سمندر کره ویر ګډشو. مجلس فوراً دم شو. سمندر کورته د لیونوپه شان منډه کړه.
هلك دزانګونه په بی دریغه زانګید وسرع دا پریوتے وُه. او مړ پروت وُه. په کورکښ
دیر ویرانی وی. په سمندر له غمه د ستونه اوګلید ل.

بیاڅه اوشو !!! ؟ سوودونه پری او ختل. سرع پیسه خوړ مرع وه نه. چه څه توګلی
داتوګلی نغدی وه ورسرع هغه ئی په تهلك تکور او " دم دُوس " دالوزوله. اوس ئی پونړے
لناك وُه. مزکه ئی ګانړه شوه. کور ئی نیلام شو. جا می لوخی ئی خوڅ کړل اود دولت رام
سُوودونه ئی خلاص کړل. د طورو په لاروکوخوکښ یو فقیراو یوه فقیره په بد حال پریشانه
خیرغواړی. دا سمندراو د هغه ښځه ده.

دا څمونږ د پښتنو د معاشرتی جوند یوتك تورخ دے. کاش که دوی د دی انسانی
نه عبرت داخلی او خپل جهالت پریګدی. کاش !

عبدالرازق فارق افغانی

د اوّل کال

دَجنّت ټهیکداران

د ګکنړ چیتر میاشت وه. بازانونه ډیر زور کښ شروع وو. او یخنی هم داسی
وه چه د سړی غابنونه ئی کړپول. زه هم یخنئ په تخه کړے، باران لوند کړے، لوږه
جوره ږم آخستی وه او چرته د نزدی آبادئ تلاش کښ وُم چه څه منځ لاړم نوناګاهم
نظر په یوکوتهرئ پریوتو. ډیرخوشحاله شومه او زړه کښ م اُوی چه زه که خیر
وی نو یوساعت به په آرام تیرکړم. خیرچه ورنزدی شومه نو یو مکان وُه (چه
عام خلق ورته وائی) ماهم د دُمه ملنك بادشاه ډیر تعریف آوریدلے وُه. لا ډیر
زیات خوشحاله شوم. چه زه دُعا به هم تری واخلم. او ځان به هم د باران نه بچ کړم.

ور غلم - مکان ته داخل شوم - سلام مې واچوه - نه پوهیږم چه چا واخستو او که نه - غلے یو خوا ته کینا ستم - او دَ ملنګ بادشاه په فکر کښ شوم - چه کوم یو دے - تپوس مې ځکه نه کولو ما وی هسې نه چه دوئ او وائی چه ته دا مره لوبه هستی هم نه پیژنی - نو کچه به شم - خیر دی خیال کښ وُمه چه شور چه " حکریز نه سکهه رهے نه انګریز " "چه څوکم به غواړی نو په بدو دی واوړی " دا نعرې سورې وی - حیران شومه چه ترا وسه خیروُه داخه آفت نازل شو - چه په دی کښ یو سړی آواز اوکړو چه فلانی ! ماړه نه شو - یو لوګے نور هم پکار دے - هغه وی بنه جی - هغه په خپل کار مشغول شو - ماڼړه کښ اووی چه دغه پیر صاحب دے - او مُریدان ورته لکه دَ پتنګانو دَ چیلمه ګیر چا پیر ناست دی - چه په دی دوران کښ دَ ماز یګر اذان هم او شو - لیکن هیچا څه پرواه اونکړه - هم هغسی مست خراب پراته وو - او بعُنه بعُنه لئ ګکولی وُو -

چه فارغ شوُ نو خپل خپل ځائ ته را غلل - فقیر صاحب په ګدئ کینا ستو - زه هم ورنزدی شوم - ما ته ئی وویل - چه ما خو لیدلے وی - لیکن تا مونږ سره ثواب کښ حصه وانه خستله - زه حیران شومه چه کوم ثواب ؟ هغه اُووی " چرس " ما ورته اووی چه باچا صاحبه شوق خوږ کیدو ولی دَ ګناهٔ نه ویریږمه " ځکه چه شریعت منعه کړی دی " هغه اووی چه داځه وائی شریعت خو ځمونږه " نیکه " جوړ کړیدے - جنت خو ځمونږه دے - دی ته نه ګوری چه اول درُود په " رسوُل " او بیا په مونږه دے تا سو خلق خو ړانده یئ - مونږه خو ګلونه څکو - په دی وخت کښ مونږه تار کښ یوُ - او په هوا ګرزُو - نفس باندی قابو کوُو -

ما ورته اووی چه پیر صاحب ! " شرع ظاهر ګوری نه باطن " - آوکه تا سو لئ څکه وئ - نو ستا سو مُریدان هم ګلونه څکی - سترګی را اوویستی - په قهر شو - چه تا سو خلق ځکه خوار یئ چه دَ بزرګانو عزت نه کوئ - چپ شه کنی په ز مکه به دی دننه کړم ما ورته اووی چه پیر صاحبَ ! ته هسی په ما غصه کیږی - ما خو څه ویلی نه دی

زه څه خبر نه یم - ځان خبروم - ده اووی - اوکنه دَ ډېرو په دُنیا کښې اوسی - څه خبر لې - ما ورته بیا تپوس اوکړو چه پیر صاحب ! تا سوږ ماذکر مونځ اونکړو - دهٔ اووی - "هم هغسې ناپوه خبری کوی - مونږه په باطنه کوو - دا نشه هم دَ دی دَ پاره کوو - ما ورته اووی - چه ما او منله چه تا سو لویځ بزرګ او دَ اسلام محافظ لې - نو بیا دلی تا سو میدان ته نه راوزئ - چه مونږه هم درپسې شو - او دَ اسلام هغه تېر شوے عظمت بیا قائم کړو - او دَ اسلام مخالفین دَ دی صفحې هستئ نه ورک کړو - هغه اووی - چه نابینا خلقو مونږ په وخت غذا کړو - ستړکی ئې سری کړی) - مُرید اوته ئې اوکتل اووی ویل چه دے مونږ ته تقریر کوی - ما چه بو خوا بل خوا اوکتل نو حالت خراب وُه - چه په خبرو شو - نو په څه چل ترینه راووتم -

له قلمه دَ شاکر الله مهمند - طالبعلم دَ (زراعت)

غزل

خود په خپله دَ جنت خو ټهیکدار شوی
چه دَ پیر او دَ ملا په نوم نامدار شوی

په جنت کښې به پوازې څه ګذران کړې
ته دَ دامره لویه قومه چه بیزار شوی

ته دَ نفس دپاره ځان ته امام وائې
دَ امام دَ کار نا موڅه خبردار شوی

چه مُدام په چرسو بنګو کښې غرقاب ئې
ته په مینه دَ قوم هم چری سرشار شوی

څه جواب به دَ یزدان په مخکښې ستا وی
چه دَ قوم دَ ګمراهئ ته ذمه وار شوی

زور منړی او صداقت د دَی ترکومه
په ظاهر چه "ایاز"، غوند دِلدار شوی

فقیری نامه دَ خدائ دِ په ځان کیخوه
ته بندهٔ ئې دَ هغه څرنګ غفار شوی

مختورن به د محشر په لویه ورځ وی
ته دَ فقر په جامه کښې چه خونخوار شوی

صاقه دوستي!

دَ فلك دکږ رفتارئ دَ اثرنه یو یتیم هلك چه جمال به ئې ورته وِی، هم بچ نه شو. هغه لا په بنه بده نه پوهیدو چه پلار ئې دَدارِ فنانه دارِ بقاته سفر اوکړو. او دے یتیم شو. اوځه مُده پس مورئې هم دده نه خپه شوه او دنیاګئ نه ئې سفر اوکړو. چا ځنګه بنه ویلی دِی ؎

په دُنیا مه نیازیږئ خلقه!
د شاهجهان بادشاه نه پاتې شو تختونه

جمال دَلتې خوورنه. لوږې تندې به پرې تیریدلې. آخر یوه ورځ لوږې مجبور کړو. چه بازار ته ورشي او دَ چا نه سوال اوکړي. خیر دے روان شو او دَ یو کابچي واله په دوکان دَ یو کُلچي دَ غوښتو دَپاره اودریدو. کلچه ورکول خو پریږده؟ ظالم هغه پولیس ته حواله کړو چه دا بد معاش دے.

څو ورځې پس دجمال عدالت کښې پیشي اوشوه. عدالت دے جیل ته اولیږلو او ده هلته څه لږه ډیره ترکاڼري زده کړه. جمال چه دَ قید نه راخلاص شو نو یوه کونجکه هم ورسره نه وه. ډیر په بد حال وُه. که یو وخت به ئې څه بیا موندهٔ. نو دری ورځې به نهر وو. ناچاری غټ آفت دے. آخر اِراده ئې اوکړه چه جماعت ته ځم شاید خدائ تعالیٰ څوك مهربانه کړي. جماعت کښې ئې خیال راغې چه هسې ناست ئې نو دا پیزار سم کړه. ثواب به دی اوشي. یو څو پیزری ئې سمې کړې وی چه هلکانو شور جوړ کړو" غل دے. غل دے. پیزری پټوئ" دے په ورستو خپو اوزغلید. دے مخکښې او خلق ورپسی وو. آخرا ونیولے شو. او څه وخت دَپاره بیا جیل خانې ته لاړ.

بیا راغے. داخل ئې اِراده اوکړه چه څه مزدورئ ته لاس اچول پکار دِی.

دی کښې یو سپاهي راغے څه لرګی لیٔ واخستل - جمال اووی داګه زه به لئ درسره یو سم لرګی لیٔ واخستل او روان شو - سپاهي چه کورته راغے نو ده تری د مزدورئ پیسی اوغوښتلی - سپاهي انکار اوکړو - وی چه ما درته کله وئ چه ته ما سره په پیسو لرګی یوسه - خبره څولے څیږی ته اورسیده - جمال عاجز بیا حوالات ته روان شو - او څه موده پس قید شو - په دغه موده کښې به په قیدیانو ډیر زیات ظلمونه کیدل - آخر قیدیانو بغاوت اوکړو - او د جیل نه او تښتیدل - جمال هم د دئ کښې یو وه - د ورځې خو به چرته خوشي میره کښې پټ وُه - او د شپې به لیٔ لار وهله - یو کلی ته اورسیدو او هلته یو جماعت کښې دیره شو - پخه وخته نمونځ اودس به لیٔ کولو - یوه ورځ تری نه یو سړی تپوس اوکړو چه ته د کوم ځائ یئ؟ ده ورته اووی سه

زه مسافر د بل وطن یم
پروت راغلے، نن به یم، صبا به نه

ځما به څه والیٔ - زه نن دلی - صبا به ولی - د هغه په اصرار ده خپله قصه د سره تر خپو ورته بیان کړه - د هغه سړی زړه نرم شو - او ورته لیٔ اووی چه بالکل مه خپه کیږه - زه به درله د تړکانړیٔ سامان واخلم - ته پری خپله مزدوری کوه - دا سړے هم چه افضل به لیٔ ورته وی هم د بل وطن وُه - او مزدوئ پسی د وطنه راورك شوے وُه جمال او افضل دواړه خواړه دوستان شو - او په یو سرائ کښې یوځائ اوسیدل - د جمال په قسمت کښې نوری تکړی لا هم لیکلی وی - څه موده پس ناجوړه شو - خو داسی ناجوړه شو - چه د درنګ او د ساعت شو - افضل لیٔ خدمت ته ملا تړلی وه - په خپلو پیسو به لیٔ ورله دارو درمل کول او پرهیزانه خوراك به لیٔ ورله تیارولو - د ژوند او ربشه به لیٔ لا نوره وه - خدائ تعالیٰ جوړ کړو -

د افضل او د جمال د کوټی سره د یو رنګساز کوټه وه - افضل چه به دکان نه راغے نو بس هغه سره به ناست وُه - یو ورځې رنګساز سرائ واله ته اووی چه ځما نه دلسو لسو روپو چا شل نوټونه پټ کړی دی - د هغوئ نمبرونه ما سره درج دی - دائ

هم ورته اووی چه ځما په افضل شك راځی۔ بس بیا څه وو هغه رپوټ اوکړه۔ جمال افضل ته اووی چه ستا روپۍ پکار دی۔ نو ځما د صندوق نه به دی آخستی وی۔ خو خیر که چری تهانیدار دوته تپوس اوکړو نو وایه چه زه نه یم خبر۔ تهانیدار راغی۔ دکمری تلاشی ئی اوکړه او هغه نوټونه ئی د افضل په صندوق کښ بیا موندل۔ نو روپی د دینه چه افضل څه و پلی وے۔ جمال گویا شو۔ صاحب دا روپۍ ما پټی کړی وی۔ او بیا می د ده په صندوق کښ ایخی دی۔ زه روپی هم درې ځله تید شوے یم۔ په ورستی ځل هغه قید یا نو چه بغاوت کړے وه۔ هغوئ سره د جیل نه زه هم تښتیدلے وم۔

عدالت افضل بری کړو۔ او جمال ئی ملزم اوگرز ولو۔ او د تورو او بو حکم ئی پری اوخیژولو۔ لیکن دا ځل هغه په ځائے د خفگان ډیر خوشحاله وه۔ لکه چه شیخ سعدی صاحب فرمایلی دی۔

دوست آن باشد که گیرد دست دوست — در پریشان حالی و درماندگی

جمال د افضل د ښتونے دوست وه۔ چه په سخت وخت کښ ئی پکار شو۔

عبدالرؤف نوشهروی (ترجمه)

(د دویم کال)

یوه شپه په کنز وکښ

مزاحیه —— افسانه

اگرچه زه خا صکر په ژمی کښ په ډیر و خلقو کښ شپه تیرول نه خوښوم۔ او چه څو مره یوازی یم۔ دومره خوشحال یم۔ ولی یوه ورځ د اسلم میلمه شوم۔ او ما دا مناسب نه گنړل چه خپل کور ته مجبور کړم۔ چه ما ته چرته یوا ځی ځای اوکوری او مجبوراً ځما شپه په حجره کښ دا سی راغله۔ لکه دیوسف په زندان مصر کښ۔

حُونږ جُجرې خو دَ روښنانونو وغیره نه لرلو دَپاره مشهورې دی . او سواد درواذې بکښې بل څه لار دَهوا دَ تللو راتللو دَپاره نه وې . جُجره کښې دَ چلم دومره لوګے وُه . چه ساه اخستل ګران وو . او اګرچه دَ شرشم دَ تیلو یوه ډیوه بلیده . لیکن بیا هم دَ لوګی په وجه مونږ نه دَ یوبل مخونه بنه نه ښکاریدل . او حُما دَپاره چه دَ چلم عادت هم نه یم خولبس مرلګ وُه . او بیا مزه دا چه هر یو کس چه جُجرې نه دننه را تللو . یا به باهر تللو . چلم به ئې خواه مخواه ټکولو . او دَ لوګی لوخړې به ئې جوړ ولی . یوځل حُما خو اکښې یو نن چلم او ټکوُه . او یو هلك حُما خو اکښې ناست وُه . هغه ته ئې او ویوو بس دَ بل کټ نه پرې یو کس آواز اوکړو :" مشر کشر پیژنې که نه ؟ " " پیژنم " دَ چیلم والا ورته جواب ورکړو :" نو بیا مشرته اول چیلم نیسه . دومره هم نه پوهیږې " " پوهیږم :" هغه ورته جواب ورکړو :" خو دے دلته ناست وُه . نو څه او شو که ورته م چلم او ویوو :"

روښے :- " مشروتې حُویه ! څه ښېغې ښېغې خبرې کوې . خوله او نیسه کنه :"

چلم والا :- " بس ډیر م بښه اوکړه . ستا درا بانذې څه کار دے ؟"

روښے :- داخو ډیر مست شویدے . یو څو پېزې وهل غواړي :"

چلم والا :- " که څه م کولے شې نو اوکه :"

بس بیا څه وو . هغه سړے دکټ نه راپاسیدو . او په کنځلو ئې شروع اوکړه هم دغسې به هلك ورته جواب ورکولو . او که نور وخلقو نه وو پوهه کړې . نو بس تیار جنګ وُه . لیکن شکر دے چه خبره رفعه دفعه شوه .

دَ شپې چه اوده شو . نو یو څلور تنه تاش ته کیناست . دَچلم نه ئې لوخړې ولیستلی او شور ئې جوړ کړے وُه . یو :- ولیشه ولیشه . تر ینمې شپې ولیشه . دویم :- یره که داخل م پیس او نه ولیستو نو ګورم کنه . (پیس او نه وت)

روښے :- (په زوره خاندې) ذه مرده ته پیس ولیستلے شې "؟

دویم :- خه داخل تماشه کوه . (پانړې ولیشې) " رنګ وایه رنګ . اول رنګ وایه

بیا به نوری پټی ولیشم۔
دوئم :۔ رنلړ په غصه پته۔ (داخل پیس اووت)
بس بیا دَ بل طرف نه شور و زولړ شروع شو۔ ما زړه کښې وی چه زه یمی شپې پوری خو به دوئ شور زولړ کوی۔ او پس دَ هغې نه په چرته خوب داړی۔ خو به دی کښې۔ یوُ طرف نه " دوه پنځوسی" او شوه۔ او آخری سړی شاید دَ رنلړ په پانړه کټ کړو۔ بس بیا شور او زولړ شروع شو۔
یوُ :۔ " داموبز نه منو۔ دَرنلړ توُلی پانړی اوتی وی۔ داپټه بیا تاسړو دکوم ځائ نه داغلو ؟"
دوئم :۔ " قسم دے نه وی وتی۔" دریم :۔ " ما په خپله شمارلی توُلی اوتی وی۔"
دریم :۔ زه مړده۔ چه موبز دومره لحظه پیس کوُو۔ نوخیر وُه۔ اوس چه څوموبز واسدا نوجاری۔
څلورم :۔ تاسونه دَ بی ایمانئ لوبه بنه دردزی۔ که دومره بهادرئ نو اونړه پنځه دوپې۔"
دریم :۔ " پنځه نه لس خو کیده۔" په دی کښې دومره شور جوړ شو۔ چه جڼړه ئې په سر با ندِ واخستو۔ او داخوئ اود ویل نه چه په دی جڼړه کښې نور هم څولړ شته۔ چرته دَ کلی بو سړے هم اوده وُه۔ هغه پری آواز اوکړو " غلی کیږئ که نه۔ که بل لاس مو تاش اوکړو نو درسړه به اوکوُرم۔" دی آواز سړه تاش خو لس شو۔
یو کټ کښې یوُ ناجوړه سړے پروت وُه۔ هغه به په زوره زوره زبیرګی کول۔ په بل کټ کښې یو سړے وُه چه دَ هغه دم کوتاهی وَه۔ او للړ للړ ساعت پس به په زوره زوره ټوخیدو۔ چه ځما به سترګی ورتلی۔ نو هغه به ټوخ، ټوخ، شروع کړه۔ او زه خو داسی ځائ کښې دَ اوده کیدو عادت نه وُم۔ نو خوب هم نه راتلو۔ لیکن نور خلق په مزی سره اوده وو۔ خیر چه خوب را باندی ډیره غلبه او کړه۔ نو سترګی م پټی شوی۔ لا پنځه لس میلټه نه وو تیر شوی۔ چه ځما کټ اوخوزیدو۔ او ځما خوب چونکه سخت نه دے نو زه راپاسیدم۔ څه وګو چه دَ یو سړی کټ ځما دَ کټ سره جنګیدلے هغه باندی اتڅشی

ټکيدلي وو. او هر يو اتروشي سره به څما کټ يوه دهيکه خوړه. ما هتلکۍ خو په ډيرو ټکيدلي بيدلي دي. ليکن د اتروشو دا پروبې حل ده. لږ ساعت به هغه غلې وه. او بيا به آ... آ... آ... اتروش... آتروش" شروع شو. بيا لږ ساعت پس "آ تروش..... آ... آ... آ تروش. آ... آ... آ...... تروډش" بيا لږ ساعت پس "آ... آ تروش. آ تروش ... آ... آ...... آ... آ... آتر...... آتروش.... تروش.... تروش" تقريبًا يوه ګهنټه خو هغه ټکيا وه. آ تروش آتروش ئې کول. ما خپل کټ د هغه نه لږ ګفکښ راخکو. او چونکه خوب ويړ راتلو. بيا اوده شوم.

نيمه ګهنټه لا نه وه تيره. چه دا سې معلومه شوه چه د کوټي چهت ما باندې راپريوت زه په هيبت سره راپاسيدم. نو څه ګورم چه يو ګس څما کټ سره ټقره خوړلو سره څما د پاسه راپريوتے دے. هغه باهرنه وتو. او چونکه څما کټ دروازې سره نيژدې وه هغه ورسره ټقره اوخوړه. بيا م لږ کټ دو سنتورا خکو. او اوده شوم. په دې وخت کښ چرګانو بانګونه وې. ماذره کښ وې. چه د دې ځاې چرګان هم په ماسختن بانګونه وائي. هغه سړي لا هغسې "آتروش آتروش کول"

څما د ستړي و پتهيدو به لا نيمه ګهنټه نه وه تيره چه په زوره يو دزا او شو. زه بيا را اوېدم. يو سړي د باهرنه په زوره زوره دروازه ټکوله" ورلرې کړئ. لږ چيلم څکم" يره خو ما ذره کښ وې چه" دے هم په نيمه شپه د کوره چلم پسې راغلے دے" يو کس ورته ورلرې کړو. هغه دننه راغے. چيلم ئې اوکړ. روه. او د لوګي لوخړې ئې جوړې کړې. زه بيا اوده شوم. ليکن لس ميلنه به لا نه وو تير. چه بيا يو درز سره زه را اولويدم. او بل سړے چيلم څکولو ته راغے. او بيا بل. او بيا بل. او بل. او څې دنړا خوره شوې وه. او د نما نځه وخت وه. مجبورًا د نما نځه د پاره راپاسيدم. ستړې م سولې. ولې چه يوه ګهنټه خوب م هم نه وه کړے. اسلم هم راغے. اسلم. ستا خو ستړکې سرې دي. بيګاه دې بنوړې خوب بنه نه دے کړے" زه:- "نه زه خو اد و بيګاه په اړخ هم نه يم اوړيدلے" (مجروح اختر دخلورم کال)

نامُراد سلیم

دَ غم ژوندُون!

موسم دَ بهار وُه په هر لوری جوړ شوے ګلزار وُه۔ شین کبل په لوړه جوړه ترکیدلے وو۔ او داسې معلومیده چه دَ آسمان سیالی کوی۔ ځائ په ځائ دَ سپرلی تازه شوی ګلونه داسې ښکاریدل لکه چه په آسمان کښې ستوری ځلیږی۔

ماز دیګرَی راپریوتے وُه۔ هر فردِ بشر دَ سیل په دام کیوتے وُه۔ سلیم هم دَ سیل دَپاره دَ سیند په غاړه ګرځیدو۔ دَ خلقو هجوم وو۔ څوك جوړی جوړی او څوك یوازی په سیل راوتی وو۔ رضیا هم دَ سپین مخ دَ تورو سترګو او دښکلی زلفو ددرشن دَپاره دَ سیند غاړی ته راوتی وه۔ په اتفاق سره دَدی او دَ سلیم سترګی په یو بل برابری شوی۔ یو بل ته ئې دَ محبت په سترګو اوکتل او دَ عشق غشی دَدواړو په زړه ښخ شو دَ محبت دَ اُور لمبه پری اوګرځیده۔ یو ساعت خوچپ چاپ ولاړ وو۔ او په سترګو کښې دَ عشق خبری کولی۔ لیکن آخر دَ رضیا ځان ضبط نه کړے شو۔ او دَ سلیم نه ئې دَ حال استفسار اوکړو۔ هغه په ماتو ګډو الفاظو شونډی او خوزولی او چه پاس ئې اوکتل نو دَ خوشحالئ په ساعت دَ ماښام تیاره راپریوتی وَه۔ او دوئ دواړه په مات زړه دَ یو بل نه جُدا شو۔

دَدی نه پس دَدواړو دَ دیدن مقام دَ سیند غاړه وه۔ او هر یو به دَ بل نه وړومبے دَ سیل عزم کولو۔ مګر دَ فلك په زړه دَدوئ محبت سود نه شو۔ زر تر زره دَ سلیم نتیجه را اوخته او دَ هغه دَ کالج دَ لیکلو بند وبست اوشو۔ سلیم په سرو سترګو په لوند ګریوان دَ رضیا دَ غیږی نه دَ عمل دَپاره رُخصت شو۔ دَ محبت ددُنیا نه دَ کتابونو دُنیا کښې ئې ګذران شو۔

رضیا هم دَ ژوند په خوند پوه نه شوه - زړه ئې دَ عشق په غم غوبل شو - او دَ جوړ ئې دَ عشق په جرنده دل شه - والدین دَ رضیا په نو لیدو پوه شوه - او دوی دی خیال دپاره چه دَ رضیا دَ سودا نه نرے رنځ نه شی - دَ رضیا واده ئې جوړ کړو - رضیا خو رفیق حیات بیا موند - لیکن دَ زړه تسکین به ئې نه کیدو - او بار بار به ئې دیل سه

په زړه کښې یو آشنا ځائیږی
دردمند خونه دے چه پری ځائ کړم غوبلونه

سلیم دکلی نه بی در شه - په زړه کمکر شو - سبق کښې خوند او نه موند - او دَ کالج په ژوند کښې ورته څه زنده دلی خکاره نه شوه - سبق ئې دَ عشق دَ وجه نه پوره نه کړے شو - او آخر والپس دَ کلی دَ را تلو اراده ئې اوکړه - دَ دهٔ دَ را تلو خبر په کلی کښې لکه دَ سیلی دَ اُور په شان خور شه - دَ ورو اُمید ونه تازه شو او دَ نورو اُمید ونه پوره شو - سلیم دَ رضیا دَ وادهٔ نه خبر نه وُه - خپل اوږد سفر ئې دَ رضیا په خیال ځان ته لنډ کړه - کاډی دَ کلی په سټیشن داخل شو - سلیم تری راکوز شو - دا وخت دیر بی ځنه وُه - کلی ته دَ تلو بند و بست نه شو کیدے - ولی چه دَ دهغوی کلے دَ سټیشن نه پنځه میله فاصله کښې پروت وُه - او بل دَ بی وختیٔ په وجه په لاره دَ غلچکو ویره وه - بیا هم سلیم دَ رضیا د دیدن حاصلولو دپاره دا هر څه آواره کړی وو - لیکن دسامان دَ زیاتیا دَ وجه نه دَ سټیشن په مسافرخانه کښې په قیام مجبور شو - رخت سفر ئې په یوه کمره کښې واچولو - سلیم دَ سفر ستړے ستومانه او دَ رضیا په غم کښې پریشانه وُه - کټ له ورتلو سره په خوب اوده شو - او دا سی خوږ خوب یوړه - چه دَ هغی نه دَ پا سیدو طمعه نه شی کیدے - سلیم په لوئ خوب کښې دَ رضیا خوب اولیده - او دَ محبت په لهجه ئې ورته کلی کړی وی - روح ئې دَ عمر دپاره او سپارلو - او دَ رضیا دَ وصلت داغ ئې په زړه یوړو -

دَ سحر وخت وُه - او باد نسیم دَ سلیم دَ غم سندره په غنو جاړو کښې او دَ صبا مارغانو په ونو کښې غم رازی کوله - خلق دَ سلیم استقبال ته راغلی وو - سلیم ئې اولیدو -

لیکن اوس هغه سلیم په غم لړلے لکه چه څنګه د تلو په وخت کښې وُه نه وُه ـ بلکه اوس ئې ځان سره په سرو شونډو موسکئ خندا، او اوګډ ئې کغن داد پټ ... سلیم ... غلو خو د امیدوار امیدونه پوره نه شو ـ رضیا هم خبر شوه ـ د ... شو ـ په سلیم ئې په ذوره ذوره اوژړل ـ یوه کوبکه ئې او وهله او ... ماسلو نو ... حرال کړو ـ او ځان ئې سلیم سره یو ځائ کړو ـ

میاں فضل مجید

د دریم کال

لاندې یو نظم دے چه د پروفیسر نور احمد خان د طبع آزمائی نتیجه ده ـ نظم د "دیهاتی ترقی" او د کلو دنا پوهه خلقو د پوهیدلو د پاره لیکلے شویدے ـ چه په خپل موضوع باندې ډیر اعلیٰ نظم دے ـ مونږ امید لرو چه طالبعلمان به دا نظم په ډیرې دلچسپئ سره اولولی ـ او کلو کښې به د دهغې د اشاعت پوره کوشش اوکړی ـ یعنی د کلو خلقونه به دا نظم واورئ ـ او په مضمون به ئې هم لوکوټی پوه کړی

(نګران)

جهنم

دوزخ

جنتونه دِ نصیب د سر اقبال شی
دَ دهٔ قبر دې روښان لا زوال شی

دهٔ لیکلی یو تمثیل دے په کتاب کښې
چه یوځ ورځ آسمان ته اوختم په خوابکښې

په دې سیر کښې فرښتې ځما سره وې
چه خبر د آسمانونو نه پوره وې

ځما شوق وُه چه جنت به اولیدلے
دالله دالوئ نعمت به اولیدلے

زرښتو جنت ته بوتلمه فی الحال
په لیدلو د جنت شوم ډیر خوشحال

چه په سیل م د جنت شو ذړه دے یخ
ماوې اوخائ اوس ما وته دوزخ

سر اقبال وائ دوئ بوتلم یو سحرا ته
زه حیران شوم د دهغې انتهاء ته

مسرا قبال وائي دوزخ ته حيران شوم

دي ملک و فرښتو نه په پوښتان شوم

په دنيا کښې آوريدلي مې قصې دي — چه دوزخ کښې اور لګا دے او لمبې دي

دي ښو کښې به ورتلي ګنهګار — چه په ورزي د قيامت شي هر او ار

سکروټه نه لمبې ويمه نه اوس — نه زقوم به مار لړم نه سکاره سکور

يخ يخ پيروت دے دغه ځونګ جهنم دے — په دنيا کښې دا ځمونږ د پاره غم دے

فرښتو او فرمائيل دوزخ هم دا دے — چه جوړ کړے رب د پاره د سزا دے

دا سې نه ده چه دوزخ کښې اور بليګې — دوزخيان به په دي اور کښې ځلبليګي

اور به راوړي ځان سره ګنهګاران

دغې اور کښې به دوئ سوزي هر زمان

داسې حال دے ځمونږ د وطن کوره — چه جنت خدائ پيدا کړے دا کوره

مونږ جوړ کړے دوزخ دے د وطن نه — لکه جوړه ځوک غوجل کړي د چمن نه

د شه رسولؐ د حکم نافرمان شو — خپل مذهب او قوميت نه غداران شو

د وطن هر يو سړے د بل دشمن شو — پلار د ځويه ورخيل دور وته بد ظن شو

يو طرف مړده خانو کښې مقتولان دي — بل طرف په ژړا کونډې يتيمان دي

هر سړے يا په غصه دے يا په ويري — خوشحالي د چا نصيب کښې نه شوه چري

نور قومونو وطنونه خپل آباد کړه — مونږه خلقو دا غريب وطن برباد کړه

هر سړے د دي وطن په بربادئ دے — بې خبره په کوشش د تباهئ دے

کوم ژوندون چه مونږ په کور کښې تېروونه — د هغې ژوندون به څه کړم صفتونه

په کوټه کښې مو غوجلے، غولے ويران دے — د هر کوره موجوړ کړے يو زندان دے

کور کوڅه، بازار حجره هر ځائے کښې ګند دے — بارانونو کښې يا ماشې وي يا ګرد دے

عمر څه دے يو دوزخ کښې اوسيدلے دي

يو دوزخ کښې مړ کيدلا او بل ته تلل دي

(نور)

وړوکوالیٔ!

(دا نظم په انعامي مقابله کښ اوّل راغلی دے)

راچه علم دُنیاته یوه لویه کارخانه وه دا
تیرشو وَړوکوالے څه عجبه زمانه وه دا

نه خبوله مرګه نه دژوند په اصلي راز پوهیدم　　نه زه په خزان نه د بلبل په سوز ګداز پوهیدم
مور و پلار په ما کړه مینه زه ګله په ناز پوهیدم　　نه په چا عاشق نه دَ معشوق په ناز انداز پوهیدم
خلاص له درد و غم دَ بې فکرۍ نه پیمانه وه دا
تیرشو وَړوکوالے څه عجبه زمانه وه دا

اورته به م لاس کړو څه خبر وم چه شرر لري　　نه پیژندو ما چه ماړلړم زهر و خطر لري
پوی نه وُم په قدر دَ دولت چه عزّت زر لري　　دهل ورنه څوپونه م سپوږمۍ چه سپین لښر لري
څه بنه زندګی د مصیبت نه بیګانه وه دا
تیرشو وړوکوالے څه عجبه زمانه وه دا

یو ورشکی ژړل به م په بل کښ م خندا به وه　　شوم که مرور به په هغی ساعت رضا به وُ
ګه به جنګ جدل ګه د امزولو مشغولا به وُ　　قصد کینه وو چرته دا څما سینه صفا به وه
نه پوهیدم په بغض د سُچه زړه نشانه وه دا
تیرشو وړوکوالے څه عجبه زمانه وه دا

هیڅ دَدی ژوندون د تکلیفونو نه خبرنه وُم　　لاس دَ فلک په سینه داغ سوے تهتر نه وُم
درسته ورځ به لوبې وی طلب کښ د هنر نه وُم　　لوبو کښ به هیر م شو خوراک شکم پرور نه وُم
مَست وُمه دَ لوبو په شرابو میخانه وه دا
تیرشو وړوکوالے څه عجبه زمانه وه دا

جوړیږم لخته کړه سرې چه تش سړۍ نه وو　　　　یو به بې بادشاه څه وزیران لوړلې نوځونه وو
لا ندې به دَ ددوئ یو نت قدرې مزکه لوئی ملکونه وُو　　　　بیا به موګډ ادکړه په یوبل دائې جنګونه وو

خیال کښې حمونږه دَ رستم زال افسانه وه دا
تیرشو وړوکوالے څه عجیبه زمانه وه دا

وخت کښې د سپرلی چه به هر خواته ذیړګلونه وو　　　　یا به دَ سیند غاړه یا دَ شنو شګو غوړونه وو
کړه به موکښنې "بلۍ بړی" آوازونه وو　　　　تل به په نیولی بیا حمونږه ګډ ادونه وو

کله خوږ بې د خوله په وهلو طفلانه وه دا
تیرشو وړوکوالے څه عجیبه زمانه وه دا

یادیږم دے تراوسه پورې هغه وخت پرون وهٔ ولا　　　　شوم چه مدرسې ته دَ هغې ژوند بل مضمون وهٔ ولا
هیر به رم سبق شو درسته شپه به جګر خون وهٔ ولا　　　　ګوټک به شوم په تخلکښې دَ استاد ویره افسون وهٔ ولا

لویه ورځ په مونږ دَ امتحانِ سالانه وه دا
تیرشو وړوکوالے څه عجیبه زمانه وه دا

لاس به مو په ترخ کړه دَ اُستاد په یو ګذار سره　　　　سته به مونږ را دمینځ بیت ظالم په وار سره
غوږ به مو نیولو په ناوخت دا تلو حصار سره　　　　بس نو پوره کیږی دابیان حما په شمار سره

بس د ژوند دا تلونکی مرحلی یو افسانه وه دا
تیرشو وړوکوالے څه عجیبه زمانه وه دا

محمد یوسف کاکاخیل
ددویم کال

وړوکوالے

(دا نظم انعامی مقابله کښې دویم ګڼړلے شویدے)

څنګه بنه وِی په دُنیا هلکِ وانه　　　　چه څه کړی هغه کوی آزادانه
هیڅ قانون پرِحاوِی نه وِی خلاص آزادوِی　　　　که په خاورو کښې غړیږی مستانه

اول دے دَ مور پہ غیږ کښې اُن اُدوا لګړی — مور او پلار پری وی نسکور مشفقانہ
څه موده پس دَے د مور لہ غیږی کوز شی — دَ خرپوسو پہ ده را شی نز مانہ
کلہ دِی د کټ د لاندی نښہ دتے — کلہ بل څہ ځان لہ جوړ کړی بهانہ
نہ دَ مار لړم خطر نہ دَ اُور ویرہ — نہ پیسہ غواړی لہ چا نہ نہ آنہ
نہ ادبہ څکی نہ پوړی خوری نہ بل شوق نړی — دَ مورتے دِی کل دَ ده آب و دانہ
پس لہ دی چہ شِی دَدری څلور و کالو — بیا پہ دوٌ وهلو سر شِی دیوانہ
کلہ دلتہ کلہ هلتہ غورزی پرزی — تَلک ما بنام شِی دے لاٌنہ شی ستومانہ
بوساړی تړی دَخاورو ریلک کښی پټوی — یا کوی پین پینکو ابلهانہ
مور او پلار یُ زر دا پورتہ پہ خوشی کړی — یوٌخوا بلخوا څکلوی یُ پہ شانہ
څنګہ څکلی ماتی ګوری دخولی والیٌ — خوږه لَسږی دَدویُ هره افسانہ
پہ کټ کټ چہ پہ خندا شِی پہ ډیر شوق — دَ مور زړہ شی پری باغ باغ دانہ دانہ
پہ دی حال کښی دا سی خوښ دی تہ پہ والیُ — چہ سامان ورتہ حاصل دے شاهانہ
چہ دَشپږ اتو کلو نو برابر شِی — بیا بدل کړی دے خپل خویُ هلکانہ
بیا کړی "انګے"، میرغپ، میرکنړے — پہ کو نتهیُ پنهٰدس وهِی مخلصانہ
دا وخت دے پہ هسی شوق دلوبو راشی — سراسرہ خو شحالیُ وی پیمانہ
هایُ افسوس چہ لتہ یُ پلار ظالم راګیر کړی — کړِی تباه اوس دَده قولہ طفلانہ
دَاُستاد دَ ضابطی پہ قانون بند شی — څکاری ده تہ دغہ حال ظالمانہ
طوطی خوښ پہ چوری نہ وی پہ پنجره کښی — آزاد خوښ وی دَ خپل خس پہ آشیانہ
د میوی پہ "پوټلو" خوښ بلبلان نہ وی — خورِی پہ مینہ دَ دړیُ ترخہ دانہ
دَقانون ما تحتی کرانہ ده هر چا تہ — کہ هر څو یُ وِی حالات امیرانہ

دَ انورؔ پہ کوټ پتلون خوشحالی نہ شِی
بے قانونہ عمر خوږ وِی وحشیانہ

(محمدؐ انورؔ دویم کال)

اِنعامی نظم پہ طرحِ باندِ

مصرعہ داوہ :- ←←← ماتہ اووایہ چہ تہ هم مسلمان ئې ؟

کوم دِ ثبوت دے چہ مخلص دَرب رحمان ئې
ماتہ اووایہ چہ تہ هم مسلمان ئې؟

دَ توحید نور دِ پہ سینہ کښې درخشان نہ وینم
پہ حقیقې شمع رنړا دِ شبستان نہ وینم
پہ صداقت سرہ عمل دِ پہ قرآن نہ وینم
صفا دَ شرع لہ قانون نہ روګردان ئې
ماتہ اووایہ چہ تہ هم مسلمان ئې؟

هغہ سرہ لب دِ دَ کعبې دَ خکلو لوڅہ شو
لاس پہ قرآن دی دَ سینې دَ ګکو لوڅہ شو
تندے پہ مزکہ دَ سجدې دَ کیخو دلوڅہ شو
رسمې سجدې اد اکوې بل تہ نګران ئې
ماتہ اووایہ چہ تہ هم مسلمان ئې؟

تا پہ پاک زړہ کښې دی ځایونہ دَ صنم جوړ کړي
پکښې دی څومره تصویرونہ بې قلم جوړ کړي
پہ مجازې نشتر زخمې دِ درد الم جوړ کړي
سود بہ اونہ کړې سراسر سَر پہ نقصان ئې
ماتہ اووایہ چہ تہ هم مسلمان ئې؟

چہ ئې پہ سر دِ هلالې تیغونو سوبړې کړہ
دَ شاہ ځلمو دځوانمردې قصہ دِ هیره کړہ

تاله زندگی نه دَ فیشن مینه چا پیره کړه
ژاړم په دی چه چری تیر مسردِ میدان لئ
ما ته او وایه چه ته هم مُسلمان لئ؟

زړه ستا دَ غیر په محبّت کښ چه درزونه کوی
سینه رباب دَ غم له سوز دی آوازونه کوی
په داسی زړه کښ به څه ځائ دَرب رازونه کوی
کوم دِثبوت دے چه مخلص دَرب رحمان لئ
ما ته اووایه چه ته هم مسلمان لئ؟

محمد یوسف - دَدویم کال

پرانزه سترګی له غفلت که ویخیدل غواړی ته

دَغلامئ دَ ز نخیرونو که شلیدل غواړی ته ‏ ‏ ‏ که په عزّت سره دنیا کښ اوسیدل غواړی ته
دَهندوستان که دوباره بادشاه کیدل غواړی ته ‏ ‏ ‏ رسم ورواج پریږده که بیا اوچتیدل غواړی ته
پرانزه سترګی له غفلت که ویخیدل غواړی ته

دا خوئ خصلت دِ کړه بدل ځان مهذب کړه څه خو ‏ ‏ ‏ پریږده داکی او غلا، قتل ځان مهذّب کړه څه خو
هر یو بشر ګڼړه رورخپل ځان مهذب کړه څه خو ‏ ‏ ‏ لکه دَ جمی دَ آفتاب که خوښیدل غواړی ته
پرانزه سترګی له غفلت که ویخیدل غواړی ته

دولت، ثروت دِ دواړه لاړ ته ئ اوډ غفلت کښ ‏ ‏ ‏ عزّت، حرمت دِ دواړه لاړ ته ئ اوډ غفلت کښ
عظمت، حشمت دِ دواړه لاړ ته ئ اوډ غفلت کښ ‏ ‏ ‏ دَدینه هم زیات په دنیا کښ شرمیدل غواړی ته
پرانزه سترګی له غفلت که ویخیدل غواړی ته

ملک دے دَ تا، کټه ئ نه، مزی پری بل کوینه ‏ ‏ ‏ شکره ته راوړی خوراک له ده بلبل کوینه
عطر پری ته پوهکی خوشبو کوره سنبل کوینه ‏ ‏ ‏ له دینه هم زیات په ذلت کښ غزقیدل غواړی ته
پرانزه سترګی له غفلت که ویخیدل غواړی ته

غور دَ دنیا په حالت کړه که هوښیاري غواړې ته ... حال دَ هر قوم اوګوره نن که بیداري غواړې ته
دمعمونه به پریدئ له خدای که بختیاري غواړې ته ... که دَ خپل ملک او دَ خپل قوم خوشحالي غواړې ته

پرانزه سترګې له غفلت که ویښیدل غواړې ته

بغض و کینه پریدئ خپل قوم کښې اتفاق کړه پیدا ... ځان کړه آزاد ته نور قومونو ته اسباق کړه پیدا
ته تواریخ کښې ځان ته نوې څو اوراق کړه پیدا ... لکه دَ شمع که اقوام کښې بلیدل غواړې ته

پرانزه سترګې له غفلت که ویښیدل غواړې ته

ځان کړه بیدار او کړه غور زنګ په آزادئ پښتونه ... فضول ننګ پریدئ اوکړه ننګ په آزادئ پښتونه
ځان کړه جلبل لکه پتنګ په آزادئ پښتونه ... که نن خالدؓ بن ولید بیا جوړیدل غواړې ته

پرانزه سترګې له غفلت که ویښیدل غواړې ته

همت جرأت کړه ته پیدا اوګټه نوم مُسلمه ... "اللّٰه اکبر" بیا کړه بلند ځان کړه معلوم مُسلمه
په مینې روح کړه را پیدا او شړه شوم مُسلمه ... د تلې ملک که دوباره حاصلیدل غواړې ته

پرانزه سترګې له غفلت که ویښیدل غواړې ته

کوه خدمت د ملک و قوم چه دِ وې توان مجروحه ... توان دِ لاڅه چه نه چلیګې دِ ژبان مجروحه
که دَ ذرې هم دِ جسم کښې وي ځان مجروحه ... لکه اختر که کائنات کښې زلیدل غواړې ته

پرانزه سترګې له غفلت که ویښیدل غواړې ته

اختر منیر مجروح دڅلورم کال
(زراعت)

دَ بلبل فریاد

دچمن ښائسته ګلونه ... دَ سحر ښائسته بادونه ... دَ مرغانو آوازونه ... دَ حسینو قد مونه
مئ خانې شوې تشې پاتې ... صراحي پيالې شوې ماتې
ګل به کړلو په ما ناز ... چه ئې جوړ کړلو خپل ساز ... ما به هم ګړو پرې پرواز ... زه محمود وم ګل اياز
افسانې دې ياد ومه ... په دې خيال غلط ومه

دَبهار وُه مست خمار عجب رنګ وُه دَګلزار خبر نه وُم په اغیار لیونے په عشق دَیار
اوس دَغم کړم فریاد چه اسیر شوم دَ صیاد
دهجران تنګه پنجره پکښې پروت یم بیګانه لا یم شته آب و دانه دَ ویر غمه دیوانه
نه یم آوری څوک فغان چه بیان کړم خپل داستان

سربلند خان صادق
(دَخلو سرم کال)

دَ قسمت سره به څه سيالي څماشي

دیو دوست په مصرع طرح باندی

د قسمت سره به څه سيالي څما شي — پتنګ مو ړیه وصال نه وی چه صبا شي
نه دَبل په حق کښې هم دومره ظالم ئي — که یوازي دا ظلمونه ستا په ما شي
دَچمن بنا ئیست یوازي په ګل نه وی — دَ مرغانو وی آواز دچا ادا شي
که داستان دَسوی زړه زه ور بیان کړم — لکه کاڼی زړونه هم به په ژړا شي
زه دَ ویری ګفتګو ورسره نه کړم — هسی نه چه نازک زړه ئي نارضا شي
مښنک عنبر ګنړی دَیار دکوڅی خاوری — هغه خلق چه دَ چا په مخ شیدا شي
دَ دتلو لار تری هیڅوک موندے نه شي — چه یو ځلی کډه دَ عشق په دریا شي
ژړا مکړه خوش خرم ګرزه ریاضَ
هسی نه چه یم رقیب بیا په خندا شي .

ریاضَ دَ اول کال
قیوم منزل

"The Moustaches"

Who knows not that the mustache is a bleak of long hair over the upper lip. No doubt, it is a group of few hair and in some cases only, for usually we find close shaven and shorn faces like monks; but still the web of great significance is woven round its name. It being the only outward distinguishable feature in the two sexes....'

M. L. II Year.

Terms Defined

1. A **loafer** is one who having finished his own meals tries for a third loaf.

2. A rupee which does not **"walk"** anywhere is called a counterfeit rupee.

3. An **accountant** is defined as a negative Munshiji. The former takes money from us while the later gives us money.

4. A **fiery speaker** is one whose tongue has been scorched with hot tea.

A. Q. III Agr.

College Humour

Prof Hafiz Mohd. Osman and Dr. Imdad Husain were busy conversing. What a strange contrast:—a mathematician and an English Teacher.

Hafiz Sahib: "Cinema is a mere luxury which puts a strain in my eyes."

Dr. Sahib: "It only hurts my heart."

K. L. G. IV Year.

not lock stock and barrel. Let us give it a less contemptuous and humiliating name than the Waste Paper Basket and cut out the sneering comment. Let us call it the **Purgatorial Column.** Young aspiring souls have to burn through the purging flames of this column before they attain the final beautitude. Extracts from their writings will be published (with the original spellings and grammar), but without comment. Let them 'speak for themselves'.—Ed.

From the College 'Clock Tower'

A few days ago I went to barber shop to cut my hair. As I intered the shop I was astonished to see 'Khalipha'—the barber, drooping on his knees, and sitting on the floor. I made him up. I saw that he was weeping. I asked what happened to him. He after stoping his tears with great difficulty told me, "I am ruined," and he again breathed up, "I have nothing to eat. I and my wife are starving since two days." I asked him why? He began saying very sympathetically and half weeping, "You know that this year half the population of the College is from the first year. And you will be surprised to hear that none of them is man."

I asked him how that can be. He answered me "No one from the whole lot has beard, with the exception of the two, but those also do not shave."

He then dusting his clothes began, "And you know that 75% of the remaining students of the college shave for themselves. Now think for yourself, what should I eat and my family." I told him "You are right, but why do you not increase the charges." He heaved a sigh and said, "Don't you know, that if I increase the charges the remaining are also going to shave for themselves, since they have already threatened me more than once to lower the charges." I also left the chair and coming out of the shop I said, "Why don't you move to Peshawar city", and I hastily went out without listening to him, lest he may not cut down my head in anger, because when I intered the shop. I saw all the raizors scattered on the floor and cutting one with the other in anger

R. J.

'My father's wife became the mother of a son, who was of course my brother and also my grand child, because he was the son of my daughter.

'Accordingly my wife was my grand-mother, because she was my mother's mother—I was my wife's husband and grand child at the same time—and, as the husband of a person's grand-mother is his grand-father—**So I am my own grand-father.**'

I was duly shocked but the maze of relationships intrigued me and I began to solve the tangle. The book seemed so very entertaining that I even ventured to think of buying it. But just when I was calculating the means I felt some friendly hand upon my shoulder. I turned round and saw Jehangir grinning full in my face. Being well acquaited with my queer nature, he did not make me uneasy by putting me questions, and hand in hand, we both went out of the book shop.

An hour elapsed, and I was once more preparing myself to write the article. But then, my mind was teeming with material, and I felt it a bit difficult to vomit it out agreeably. However, I did vomit it out. Agreeably or disagreeably? You can judge for yourself.

M. A. RAUF.

Purgatorial Column

Lahore, like Oxford, has become the 'home of lost causes'. Agitation against the Sales Tax and the Students Demands are not what we are thinking about. Dr. Velte of the F. C. College, not very long ago raised a justified protest against the "W.P.B. Columns" in College magazines. He said that young unsuspecting contributors are cruelly mangled and made the butt of sneering remarks by cynical Editors and thus many a young Keats is liable to be "snuffed out by an article." We live in days of expanding sympathy for man and beast and thoroughly appreciate Dr. Velte's scheme for Prevention of Cruelty to Young Contributors. "W. P. B." must go—but

Such ideas had so completely engaged my mind that I had a hair-breadth escape from being overrun by a taxi. Now observing various objects and now dismissing them with a reluctant heart, I reached the Cantonment, where I was soon lost in the hubbub of the crazy population.

Of late, some people have begun to think, and surely no one can object to their thought in this age of democracy, that College is the last refuge of a worthless young man. Probably, it was this association of our College with 'worthlessness', that had made me so worthless as not to be able to find a suitable subject for my article. I, therefore, walked straight into the London Book Stall, which, I thought, was the last resort for worthy people.

At first the amazing sight of books, written on all conceivable subjects bewildered me. I could not decide which book to read. I, therefore, kept myself busy in sauntering between the two tall shelves, which contained books on topics of general interest. All of a sudden, the alluring title of a beautiful book arrested my eyes, the title was 'Believe It or Not', and a horrible picture of a corpse hanging down from a tree, was printed on the cover.

The book was a book of wonders. Even the first line of the first Chapter startled me. **"Christ was not born in the first year of the Christian Era.** He was born about four years before the Christian era began."

I had not yet recovered from the enthusiasm of this discovery when something else caught my attention. 'The needle of the compass does not point to the North Pole. It points to the Magnetic Pole, which is 1,500 miles West of the true North Pole.' I read to my great wonder. Just below it was written in bold letters. 'A Philadelphian committed suicide and left the following note:—

'I married a widow with a grown-up daughter. My father fell in love with my step-daughter and married her—thus becoming my son-in-law, and my step daughter became my mother because she was my father's wife.

'My wife gave birth to a son, who was, of course, my father's brother-in-law, and also my uncle, for he was the brother of my step mother.

But besides this anecdote what was left in my brain? Nothing, simply nothing. I was, then, as devoid of thoughts as my reader is at this moment. (Excuse my telepathy).

I had set myself to this impending task of writing an article, nay, I had entered a mental labyrinth, from which I had little hope to come out, unless some miracle would happen; which did happen, and at the right moment, too. An idea flashed across my mind that I should better have a stroll round the cantonment to get rid of this uncreative mood. I felt I must do some thing, even commit suicide*, if no other way were open to me. So I got hold of my bike and paddled towards the Cantt. The phantom of the article was still vexing my nerves. Even the cool and soothing gusts of the breeze could not get it out of my sight.

Suddenly, I remembered something and became elated, for, I had, at last, come upon a subject. "Keen observation", said some very big man, "sets forth in our minds streams of thought, which can replenish the tributaries of whatever work we embark upon." And as I had already embarked upon the task of writing an article and as also I was in the surroundings where food for observation was abundant, I, instantly, became alive to things around me, and began to stare at an object, that first met my eyes, so intently as if I was going to stare it through. But then I had completely forgotten that I was on a bicycle, which soon overtook that object and left it far behind. I just saw that it was a gypsy. I could not recollect him very well, but his mere sight had plunged me into the pages of history. These poor homeless creatures, these paupers, whom we look down upon as the pariahs of society, had once ravaged the peace of the whole world and shattered to pieces the mighty Empires of Russia and Rome under the command of their ambitious leader, Attila. I shuddered at this thought. The more I shuddered, when I thought, that we who hold our heads so high, are, too, the descendants of the like nomadic people—the Aryans.

Now ideas after ideas rushed into my mind and their fecundity was as much telling upon me as had done their scarcity a few minutes before. I began to envy the unsedantry life of the gypsies, whom I had looked upon as the citizens of the world, for, they never stick to one place and look upon the whole earth as their motherland.

*We have no objection.—Ed.

"Vanessa entered my life as stealthily as morning breeze enters a half-aroused garden. Soon her beaming beauty had completely swept me off my feet. She was then to me all in all. I adored her; worshipped her and she too, on her part exacted this adoration as her birth right. This went on for a few months. Then came that calamity which severed me from her for ever and made me repent once for all not to fall in love any more."

While I was lamenting my inability to write a short story and to a sudden stop. My thoughts got a terrible jolt like those unwary passengers who fall upon one another, when the railway train all of a sudden comes to a dead stop. Imagination began to fail me and I could not continue the story any further. So I put down the pen with a heavy heart.

While I was lamenting my inability to write a short story and whispering to myself, all sorts of curses, the curtain of difficulty began to lift. 'I should write an article on the Pathans, amongst whom I had been living for three years! It was sheer ingratitude on my part to leave them without saying even a word about them. 'But I must speak highly of them, otherwise, I thought, I would annoy them. All the horrible stories of vendettas carried on through generations, occurred to my mind and I refrained. But I was sorry, I was leaving the only subject, in which I could safely rely upon the fertility of my mind. I could not, however, help relating a happy anecdote. It is about Pashto or Pakhto, the only language of the Pathanland.

"When God Almighty sat down amidst the assembly of his few chosen angels to select a language for each nation on earth, the proceedings came to a standstill, as soon as the question of prescribing a language for the Pathans arose. God put the question to every angel as to what should be the language of the Pathans. No one answered, for even the angels feared the revengeful nature of the Pathans. The silence was, however, broken by an angel, who was famous for his wit and humour. He said, "I have found one," and, instantly, disappeared. He soon returned with a tin-pot filled with pebbles and small stones. Before this heavenly gathering he began to rock the pot, which produced a harsh and deafening noise. He stopped rocking and said, "This should be the language of the Pathans!'

beggars twisted into permanently cringing postures, careless eager-eyed youths, intent on the next pleasure, smiles, poverty, ostentation, lank children, women, withered through excessive child bearing, pass you by in an endless procession, like the spokes of your wheel. A not so young, not so thin, not a little painted woman, with red corduroy trousers, swaying her enormous hips on the bike, while a dignified Alsatian, a much better specimen of life, trots alongside her. How grotesque and yet how pathetic! What a terrible insult to male attire! If that Alsatian ever ordered a dress for itself, one muses, it would certainly show more taste...... But paddle on.....even if the grit gets under your teeth; around the corner there is the whiff of the narcissus and the wheels roll on to the never, never land.

I. H.

In Search of a Subject......

I had promised the Editor-in-Chief an article for the Khyber Magazine, that has been suffering from a shortage of articles, of which I have found some people thrusting the whole responsibility on the present war. I wonder if there is any sterilizing effect of war on the minds of the students of this college. But when I sat down myself to write the promised article, ideas 'walked out' of my mind unnoticed and I was left quite blank. What then I had in my mind was either very unworthy of an article for the College magazine or was such nonsense as was likely to injure the soft instincts of some people.

'Why shouldn't I try a hand at some big subject, I thought?' 'The Future of World Politics', 'Hitler's Doom', or 'Shakespeare was a Fool', which of them will do? 'The second one', I said to myself. But then I was afraid of Dr. Imdad. He always looks askance at would-be-serious articles and so won't believe a student, and a student of taciturn nature like myself, writing on such a ponderous subject. 'I should better write a short story.' It was a capital idea, of course. I took up my pen; drew out a sheet of paper from the drawer; adjusted the nib; blew out my nose; wisely dipped the pen into the ink-pot and began to write.

without war. But that is too good to be true. In the meantime, while the military lorries displaying huge Ls and Vs go up and down the Jamrud road, empty, with no apparent purpose but that of training the new recruits, let us envy them their joy rides, let us swallow and inhale the fume and the dust raised by them, while we bike slowly, cursing inaudibly.

But biking is good, definitely good. Good for the soul and the body. It is not one of those machines that make machines of men. You are the master, while you sit upright against the free air, with the open road spread out beneath you, at your disposal. No mathematical "horsepower" deprives you of your masterful sense of control. It is all "man power" and in the right proportion—not so much as to fatigue you, nor so little as to make you lazy and absent-minded. You don't rush through the countryside at a speed that gives no chance of allowing some pictures to linger on the mind; nor do you trudge so slowly as to get bored with monotony. There is a gentle change of the environment and the scene, giving you time now to feast your eyes and nose on the waving sarson field and see the sweep of that gay bird in the air, while a few yards further the dreaminess of a pair of Afridi eyes sends your thoughts revolving round "old unhappy far off things." There is world enough and time to meditate on the absurdity of human life, on Wars and moonlight and old shoes. Nothing is more conducive to dreams than a good well-oiled bike when you float about the air lazily pedalling to the catchy tune of a filmsong. There is no record of the highly probable fact that Straus composed more than one of his lilting waltzes to the rhythm of the bike. And if you are a hackwriter, a poor harassed editor of a College magazine, a ride to the Cantonment on a soft winter afternoon, when the fleecy white clouds float like marble domes about the air, might result in a dicordant rhapsody like the one that you are reading.

Cycling in a town is equally enjoyable, although its joys are of a different kind than those in the country. One maintains that delicate poise between attachment and detachment which makes one feel that one is in life and yet out of it, living it and seeing oneself live it, a simultaneous liver and commentator. Life seen from the top of a bike assumes a processional, rhythmical and "wheely" quality. Faces go past you like leaves blown by the breeze, leaving a momentary residue of their uniqueness on the mind, to be rapidly submerged by newer impressions. Shops, tongas, men with anxious faces,

Why not abolish the black, funereal College Uniform and have something more colourful and picturesque in its place, say the embro dered, velvet waistcoat of the Frontier?

Why not make beards compulsory for the staff and the students? It will save time, energy, blades and soap and will also add to the dignity and picturesqueness of the institution.

I. H.

On Cycles

Prof. Hadow Harris has carefully worked out Hitler's horoscope and is of the opinion that the year of grace Nineteen hundred and forty-two will be a year of ill-omen for him (Hitler). It is a very heartening prophecy for everybody and almost the whole world is waiting for the day when Mr. Churchill will clip Hitler's moustache and puncture Dr. Goebbel's baloon. In the meantime Rationing. So let us go about on the bikes. Let us go about on the bikes, while the going is good. For a time might come when the wheels of Indian life may move again with the ancient lazy grace of the bullock cart. Not bad that bullock cart, after the hurry and scurry and thunder and bang of modern life—two deeply ruminative bullocks trudging over the peaceful, good earth to the droning and moaning of sleepy wheels! There is more food for romantic nostalgia in that harmless mechanism, well, than in most modern machines of locomotion. Tanks you will say have an elephantine grace but, even if they be Italian, are they half as innocent? War may be nasty and brutish and long but it has done one good thing already; it has revived an older and, perhaps righter, sense of values. In the forward sweep of mechanisation and fashion many a picturesque pastime, many a colourful pursuit, had been sacrificed on the altar of efficiency and speed. Many of us had almost forgotten that man was created a biped, with a pair of solid, fairly quick-moving legs, whose movements, not only transported a mass of matter in space, but were also good for a sluggish liver. Thanks to the Rationing Authority for making us realize this vital truth! Petrol! That pungent extract from the entrails of the earth, how it has altered the very pattern of human life? A world without petrol might, who knows, be a world

Basket-ball. This game has been introduced this year, and already so many enthusiasts have come round. It is hoped, our team will take part in the University Basket-Ball Tournament, next year.

Boxing. It was started about a year or so ago, and students have not yet made up their minds whether it should be looked upon as a game or a gratuitous beating in public. Out of sheer curiosity a few 'dare devils' have offered to exchange blows in the ring. Let us wait and watch till the latent militant spirits of a few more are roused to risk their limbs. We have no doubt that there is a bright future for this game. The tone of the time is propiticus.

Q. I. U.

Why Not....?

As a protest against the mechanisation of modern life, why not engage shifts of men to work the machinery of the College clock?

Why not fill up with water the lawn at the back of the College office and call it a Tank? The original tank could be used by the Zoology department as their Aquarium.

Why not make some air raid shelters by digging tunnels in the hillock adjacent to the Radio Receiving Centre? Then it could be used for a different kind of 'Emergency Evacuation'.

Why not get one's money's worth out of the New Union Hall, by converting it into a Cinema for the evenings? The profits could go to the Duty Society.

Why not create a "Society for Prevention of Consumption of Animals", with Sheikh Timur as the President, and start picketing the 'Chapli Kabab Restaurants', opposite the College?

Why not hang a placard marked "Professor", round the neck of the youngest member of the staff, to distinguish him from the Firsties? This might prevent the repetition of a Comedy (or Tragedy?) of Error, that actually happened.

rence the rival team withdrew. It was a fortuitous 'win' for the College. The second match was played against the Khalsa College, Gujranwala, on 5-12-41. Players were in their native element and exhibited excellent game. We won by two goals to nil. The third match was played against the Khalsa College, Lyallpur, on 6-12-41. We won by one love. In the Mofussil Final we put up a gallant fight, but got two goals in the last five minutes of the game. Our Team also participated in the Sahibzada Abdul Qayyum Memorial Tournament and went up to the semi-final. In this connection Habib Ullah, Inayat Ullah, Abdullah and Abdur Rahim deserve honourable mention.

Cricket. We had a really well-organised cricket Team this year, but Mohd. Nisar, the Skipper and Balbir Chandra got Emergency Commissions in the army and had suddenly to leave. The team thus deprived of two best players was considerably weakened and did not offer to play any University Match.

Athletics. We have had enough of defeats from the Edwardes College, for the last three years. Our athletes, imbued with a pardonable sense of rivalry, strained every nerve and sinew and beat the adversaries by seven events to six, although they had two All India Athletes in their teams. Kh. Abdur Rashid, Bashir Ahmad and Anwar Jan were the mainstay of our victory. Nasrullah created a new record, viz., 144 feet, in javelin throw.

A team of six athletes participated in the University Athletics. Kh. Abdur Rashid and Bashir Ahmad were selected to represent the Pb. University in the Inter-'Varsity Athletics. Rashid got the second place both in the Low Hurdles and High Hurdles, while Bashir got the second position in Long Jump. Also, we competed in the Inter-Islamia Colleges meet at Lahore and were the runners up.

Tennis. We are eagerly looking forward to the Col. Keene's Cup Match against the Edwardes College, and have high hopes of victory again this year. Our pair, Chuni Lall and Anwar-ul-Islam wrought wonders in the N.-W.F.P. Tennis Championship, and easily won the Doubles Championship. It is a matter of great regret indeed that under rules, Chuni Lal cannot participate in the University trials this year. Buck up, Chuni! We wish you the best of luck next year.

Round the Playgrounds

The College is usually in full swing during the Autumn Term and the monotony of heavy lectures in classrooms is agreeably relieved by games and sports in the after-noons. Superintendents of games and their Captains get to work in right earnest and train their teams at high pressure, owing to the proximity of various inter-collegiate contests and the University Tournaments. It should be remembered in this connection that sportsmen generally like to keep up the old tradition, despite efforts to the contrary, of relaxing their sports activities after major contests are over—partly because of the grilling heat of the tropical summer that follows and partly owing to a misconceived notion born of self-confidence that they are able to rise to the occasion when required. Well, that was a parenthetical observation! Old veterans and their 'Chiefs' look out for new recruits in order to fill the gaps made in their 'ranks' every year. Meticulous care is exercised in the selection of recruits before they are 'drafted' to various 'battalions.' Friendly matches are played against local teams until the time is ripe to send them on to the 'front' to prove their mettle.

Our record of achievements this year, if not worth crowing about, is certainly not an inglorious one, as brief notes on various games given below would clearly bear out.

Foot-ball. We won the first match of the University Tournament against the Edwardes College, played on 29-11-41, by one goal to nil. The second match was played against the Gordon College, Rawalpindi, on 2-12-41, and we beat them by three goals to one. The third match was played against the Khalsa College, Lyallpur, on 5-12-41, and we lost by one goal to four.

Q. Abdul Wahid and Aman Ullah put up a brave show in the matches and were selected for the Panjab University Foot-ball Team. Both justified their selection in every respect and brought a 'win' for the University in the Inter-'Varsity Foot-ball Tournament. We congratulate Amanullah on his becoming a University Blue.

Hockey. The first match of the University was played against the Edwardes College on 1-12-41. Owing to an unfortunate occur-

Historical Society. With the help of the funds so generously given by H.E. Sir George Cunningham, Governor N.-W.F.P., Prof. Mohd. Shafi took 25 members of the Society on an ambitious and very enjoyable tour to Aligarh, Agra, Fatehpur Sikri, Delhi and Lahore. We congratulate Prof. Shafi on his indefatigable energy.

Agricultural Society. Under the auspices of this Society Prof. Aziz Farooq read a very exhaustive paper on "The Marketing of Wheat in India and Raja Zarbakht Khan B.Sc. (Edin.), a learned paper on the "Propagation of Fruit plants". The II, III and IV Year Agriculture classes went on a tour to Punjab and Delhi.

Dramatic Society. Working together, Dr. Imdad Husain, the President, Mr. Mohd. Asghar Butt, the Secretary and Mr. Manzoor Ahsan VI Year, had translated a short English play and written an original local skit for performance. But due to certain unforeseen circumstances the plays could not be performed in the end of January as planned. Now the Society will stage a short play in English at the Prize Distribution.

Under the auspices of the Club the Preston Waif Rover Scouts, led by Mr. Grant of the Government Press, performed an Urdu play in November. The proceeds of the play went to the War Funds and the College Duty Society.

Staff. We have to welcome many new members to our staff. Prof. Hadow Harris and Mr. Bashir-ud-Din in the English Department, Dr. E. A. Pires, Mr. Ghulam Ahmad and Mr. Abdul Hashim in the Education Department, Mr. Abdul Aziz Farooq in the Economics Department and Mr. Abdus Sattar in the Physics Department—in addition to Prof. Mohd. Ashraf Durrani who came last year to institute the Geography Department—are those to whom we extend a hearty welcome and an earnest invitation for a long stay. Recently there have been some more important changes. Dr. O. H. Malik, who had officiated as Principal for more than two years, left the College at the end of January to take up an important War appointment at Delhi, as the Director of Statistics in the Supply Department. Since then Mr. Hadow Harris, M.A. Hons., Dip. in Educ. (Edin.), Senior Professor and Chairman of the English Department, has been officiating as Principal. We wish Dr. Malik the best of luck in his new job.

the opinion of this house Democracy is not suited to the genius of India." A high level of speaking was reached and the trophy was won by the speakers from Hindu College, Delhi. Romesh Thapar of the Government College, Lahore and Madan Gopal of Hindu College, Delhi were awarded the first and second individual prizes respectively. R.B. Mehar Chand Khanna, Mr. I. D. Scott, I.C.S. and Sardar Aurangzeb Khan acted as the judges while the prizes were very kindly given away by Mrs. Campbell.

Our debating team also visited Aligarh and although a great deal was expected from Mr. Akbar Shah, it was Mohd. Asghar Butt who was successful in getting a second prize in that All India debating Contest. Thanks to the efforts of Moulana Abdul Qadir and Dr. Imdad Husain, our teams have been getting a good training in elocution.

The Khyber Athenaeum. Under the Presidentship of Prof Hadow Harris and with Mr. Mohd. Yakub, B.A. and Mr. Mahmud Shaukat III Year as Vice-President and Secretary respectively, the Society has chalked out an ambitious programme of lectures and socials and have been holding well-attended meetings. On Nov. 15, 1941, Prof. Hadow Harris spoke on "Scotland, its people, language and literature", on Feb. 7, 1942, Prof. S. M. Timur on "Shakespeare on the World Thought To-day" on Jan. 17, 1942, Dr. Imdad Husain on "The Architectural Glories of Moorish Spain", illustrated by snaps and on Feb. 14, 1942, Prof. Prithvi Nath Dhar spoke on "Economic Nationalism".

The Society has many more meetings to go in which some post-graduate students of the College are speaking on interesting topics.

The Society of Islamic Theology, under the enthusiastic leadership of Qazi Nurul Haq Nadvi Sahib has been doing its usual good work which includes Sunday Sermons preached by Mr. Pir Bakhsh, Moulana Abdul Majid Daryabadi, editor, Sidiq, Dr. Ihsanullah Khan and Dr. Imdad Husain. Mohd. Ishaq II Year is the Secretary.

Oriental Society with Pro. Mufti Mohd. Habib, M.A., as President and Mohd. Anwar Jan IV Year and Faizur Rahman II Year, as Vice-President and Secretary, respectively has had a few meetings. Manzoor Ahsan, VI Year, who went to the All India Urdu debate held at Aligarh was successful in obtaining an individual prize. The Society is planning to hold Iqbal Day in an ambitious manner.

Hogg, C.I.E., O.B.E., Squadron leader, Indian Air Force, who explained to the students the requirements for enlistment as Pilot and Observer Officers. It must also be mentioned here that several of our students past and present have been taken as Commissioned Officers in the Army and the Air Force.

Let us review briefly now the activities of the various College clubs and societies.

The Khyber Union. Mr. Ali Mohd., B.A. was elected President, Khwaja Mohd. Yusuf, III Year, Vice President and Mirza Naseem Anwar Beg, the Secretary, with the following Cabinet:

Mohd. Sharif IV Year, Assistant Secretary; Wali Ullah Khan I Year, Librarian; Mohan Lal II Year, Abdul Hamid I Year, Mohd. Ghaffar I Year and Sh. Ghulam Jilani I Year, Members.

We have had a very successful session and out of the many debates held the following were particularly remarkable :

Outsiders debate on Nov 16, 1941 in which Major Abdur Rahim, R.B. Mehar Chand Khanna, Mr. F. D. Mahmood, Sardar Aurangzeb and Mian Ziauddin spoke on the proposition: "This house disapproves the war policy of the Muslim League and the Congress."

Junior Prize Debate in which Mirza Naseem Anwar Beg and Abdul Haye obtained the first and second place respectively for debating on the proposition: "Western Civilization has been a complete failure."

Inter-school Speaking Competition to award K.B. Saadullah Khan trophy. Sixteen schools participated and the trophy was won by the speakers of Islamia High School, Nowshera.

The climax of the season was reached in the **All India Debate** held on Feb. 1, 1942, when speakers from the Government College, Lahore (holders of Sir Sahibzada Nawab Abdul Qaiyum Memorial trophy), Hindu College, Delhi, Medical College, Lahore, Khalsa College, Amritsar, Islamia College, Lahore and Zamindara College, Gujrat participated. The proposition for the debate was that "In

About Ourselves

The round of college activities goes on much as usual. Elections with their spate of hectic propaganda and counter propaganda, with their triumphant victories and sullen defeats, have come and gone. Some feel that they have won their life's battle while others, poor souls, think they have been cheated of their hopes of heaven. Lectures, professors' "daily jaw," as Saintsbury called them, go on along usual placid lines, with the usual not so "wise passive-ness" on the part of the students. Tournaments have been played and trophies won and lost and now that the bogey of the exams. is approaching nearer, the boys have laid down their 'play things' and taken, we piously hope, to studies. We have had more than our usual share of winter rains and clouds (of war and rains both) have kept depressingly hovering and spoiling the prospects of many a good game. To crown all, or shall we say to uncrown all the flowers, we had a severe hailstorm the other day. A **luftwaffe** of storm clouds came unannounced one evening and found unerringly their objectives of cineraria and stocks and sweet peas of the Islamia College gardens. It must be said to the credit of their marksmanship that not a single objective of a similar kind was touched in the cantonment. The next day was a gala day for the students as they pelted each other with the unmelted hailstones of the previous evening, hitting, unwittingly, many an innocent and respectable target. It was a rare and a picturesque phenomenon, this of the hailstorm, but it shall rob the college of its usual glory of spring. All the wealth of colour and smell.

"daffodils that come before the swallow dares

And take the winds of March with beauty,"

shall, alas, be no more.

A very notable event was the visit to our College early in November of H. E. Sir Roger Lumley the Governor of Bombay accompanied by H.E. Sir George Cunningham, the Governor of N.-W. F.P. Towards the end of the same month the Members of the Defence Consultative Committee of India also paid a visit to the College. Among other distinguished visitors of this session we had Mr. H. W.

A BROKEN APPOINTMENT

You did not come

And marching time drew on and wore me numb—
Yet less for the loss of your dear presence there,
Than that I thus found lacking in your make
That high compassion, that can overbear
Reluctance for pure loving-kindness' sake—
Grieved I, when as the hope hour stroke its sum
You did not come.

You love not me,

And love alone could lend you loyalty;
—I know and knew it. But unto the store
Of human deeds divine in all but name
Was it not worth a little hour or more
To add yet this : Once you a woman came
To soothe a time torn man, even though it be
You love not me?

—Thomas Hardy.

Here, if any where, is the accent of great poetry—both in thought and technique a perfect lyric. The trivial occasion of a broken appointment is lifted by the brooding and high-sorrowful genius of Hardy to the level of tragedy and serene resignation. "Nothing is here for tears, nothing to wail or knock the breast...." Surely there is no love higher and more selfless than 'that high compassion, that can overbear reluctance for pure loving-kindness' sake.' Mark, besides the quiet and noble march of the whole and the exactly timed fall of the words and cadence and feeling in the last short lines of the two stanzas. A poem unmatched in high-seriousness and the natural magic ot style.

I. H.

if the college were poor it would have nothing to offer; competition would be abolished. Life would be open and easy. People who love learning for itself would come there gladly. Musicians, painters, writers, would teach there, because they would learn. What could be of greater help to a writer than to discuss the art of writing with people who were thinking not of examinations or degrees or of what honour or profit they could make literature give them but of the art itself?

"And so with the other arts and artists. They would come to the poor college and practise their arts there because it would be a place where society was free; not parcelled out into the miserable distinctions of rich and poor, of clever and stupid; but where all the different degrees and kinds of mind, body and soul and merit co-operated. Let us then found this new college; this poor college; in which learning is sought for itself; where advertisement is abolished; and there are no degrees; and lectures are not given, and sermons are not preached, and the old poisoned vanities and parades which breed competition and jealousy......."

Virginia Woolf "Three Guineas."

Virginia Woolf's book **Three Guineas,** discusses from a woman's point of view, the ways and means of preventing Wars. One of those ways is of education, the proper **kind** of education. She holds the Public School and the two Universities, Oxford and Cambridge, responsible for catering a kind of education that sanctions snobbery domination and exploitation. "The battle of Waterloo was won on the playing fields of Eton and Harrow." Perhaps it was; but the same cult of sport tends also to produce a thickheaded sense of false superiority and over-complacency. Proper education should be based on an imaginative understanding of life leading to sympathy and freedom for all. If the Western Universities have been too pedantic and superior in their attitude to learning, those in our country have been too slavishly imitative of their faults. The true aim of education should be to encourage the originality and creativeness of pupils through proper guidance given by teachers who should be "good livers and good thinkers" themselves. In India we have a vicious circle of teacher-parrots producing student-parrots. Courses, examinations, pass percentages......slaves breeding more slaves for future slavery.

Aldous Huxley for his extremely instructive and wise anthology **Texts and Pretexts,** we shall venture to comment very briefly on the extracts printed, taking this remarkable book as our model.

"THE NEW COLLEGE"

"Let us then discuss the sort of Education that is needed. Now since history and biography—the only evidence available to an outsider—seem to prove that the old education of the old colleges breeds neither a particular respect for liberty nor a particular hatred of war it is clear that you must rebuild your college differently. It is young and poor; let it therefore take advantage of those qualities and be founded on poverty and youth. Obviously, then, it must be an experimental college, an adventurous college. Let it be built on lines of its own. It must be built not of carved stone and stained glass, but of some cheap, easily combustible material which does not hoard dust and perpetrate traditions. Do not have chapels. Do not have museums and libraries with chained books and first editions under glass cases. Let the pictures and the books be new and always changing. Let it be decorated afresh by each generation with their own hands cheaply. The work of the living is cheap; often they will give it for the sake of being allowed to do it. Next, what should be taught in the new college, the poor college? Not the arts of dominating other people; not the arts of ruling, of killing, of acquiring land and capital. They require too many overhead expenses; salaries and uniforms and ceremonies. The poor college must teach only the arts that can be taught cheaply and practised by poor people; such as medicine, mathematics, music, painting and literature. It should teach the arts of human intercourse; the art of understanding other people's lives and minds, and the little arts of talk, of dress, of cookery that are allied with them. The aim of the new college, the cheap college, should be not to segregate and specialize, but to combine. It should explore the ways in which mind and body can be made to co-operate; discover what new combinations make good wholes in human life. The teachers should be drawn from the good livers as well as from the good thinkers. There should be no difficulty in attracting them. For there would be none of the barriers of wealth and ceremony, of advertisement and competition which now make the old and rich universities such uneasy dwelling-places—cities of strife, cities where this is locked up and that is chained down; where nobody can walk freely or talk freely for fear of transgressing some chalk mark, of displeasing some dignitary. But

He pictured her again seated in a sofa wrapped up in furs. But this time she wasn't contemplating. It was a love song that escaped through her lips, a melody which charmed every object around her. He sat dazed gazing at her with bewildered eyes. She sang how she had languished when she was away from him. How she had longed to see him. How then as if from over the blue oceans he came to her. And then her song rose and she sang of the deep love she had for him.

A knock at the door roused him out of his reverie. 'Come in' he said in a drowsy voice. Footsteps approached and came right upto him. He sat quite indifferent to the approach of the intruder. He knew it was Riaz—his room fellow. Riaz shook him by the shoulders. 'What are you thinking? he asked.

"Its all about that girl Raheel we met in the party yesterday," he replied. 'Oh she' ejaculated Riaz, 'what a coincidence! I am just coming from her. I and she rowed across the blue waters of the lake. The wind was whistling through the willow trees and all the world was bathed in the silver moonlight. There she sang such charming melodies. She loves me, you know."

Far away in the blue horizon the moon was sinking and with that all his hopes. The palace of his day dreams trembled and lo there it lay shattered at his feet. 'Damn her' he cursed and went out for a long long walk.

RAHIM.
III Year.

Texts and Pretexts

On this page we intend to give two short "texts", one from prose and one from poetry, short passages of remarkable writing, that require underlining, either from the point of view of their artistic execution or the substance of thought. With due apologies to

The Palace

He could not decide where to begin. There were so many ideas in his mind, so many plots, but all mixed up. He thought and thought but to no purpose. Then suddenly he remembered the girl he had seen yesterday. "Why not weave a plot round her" he said to himself. His pencil moved. He began—

Far away in the blue horizon the sun had sunk. Thick shades of darkness were gradually wrapping the objects all around. The hustle and bustle of the busy day was being lulled to sleep. With the fleeting day-light the glowing cinders in the fire-place assumed a brighter hue. She sat huddled up in the sofa near the fire place. The red glow of the burning cinders was reflected on her face which in turn was illuminated. Her eyes were fixed on the leaping flames and her mind was busy, contemplating? Here all at once his mind ceased to work. 'What next? What was she contemplating?' he questioned himself. 'Perhaps she was thinking of the tediousness of the monotonous day. But were the days boring to her too'? he asked himself. Then an idea struck him. 'Couldn't it be that she was thinking of him'. The idea flattered him. He fell into a pleasant reverie. Yesterday's party returned to his mind. That gay assembly of so many beautiful girls and handsome boys. His formal sort of introduction with her. And then how he had listened to her melodious voice as she sat beside him. He remembered all very distinctly. He was certain he had made a place in her bosom. It was very pleasant to think of her. That oval face, those chestnut curls, those dreamy blue eyes and those luscious lips, through which life seemed to ooze. That face, that Mary Queen of Scots beauty had, no doubt, appealed to him yesterday but now it was different. Yesterday it wasn't love, he was quite certain, which had provoked that sentiment of liking. But to-night he was bound, bound to her by unbreakable chords. The future confronted itself to him. 'Oh the romance they would have'. he thought. 'Oh some moonlit night when the winds would be sighing in the willows and all the world would be bathed in that glorious light, he would take her far far away over the blue ocean. There besides the rising waves they would pledge the sacred bond of love'. The thoughts of future danced before his eyes. How sparkling like a gem would each day be, and how glamorous each night.

males by phrases of profound political wisdom thrown in the general military conversation at opportune openings. She can distinguish a Messerschmidt 109 from a Hurricane with as devastating precision as she can criticise the other woman's frock or nose. "We are living through epic times and history is being hourly made," as the newspapers are never tired of repeating: So why should she lag behind and let her name be crossed out from the "annals of glory"?

"War has shaken us to our very depths and permeated through every fibre of our being", as the magazines insist with pardonable exaggeration. "All is fair in love and war," goes the proverb and that all includes, we presume, over emphasis and stupidity. Phraseology of War, at any rate, has enriched the language already to a considerable extent and metaphors of great force and picturesqueness are daily being used and assimilated into the common speech with an almost Elizabethan hospitality. 'Blitzkreigs' of various brands—German, English, Russian and even Italian, are being made in tennis, and in eating 'chapli kababs'. There is rumour of an American picture depicting the 'Blitzkreig technique' of loving in which it is expected the lover would make many 'encircling movements' around the heroine and force her to 'complete capitulation' by a grand 'pincer movement.' One has already heard of, and felt, this year a 'Luftwaffe' of malarial mosquitoes and it was only the other day that a rival hockey team made a 'strategic retreat to prepared positions' because, as some say, it could not, unlike London, 'take it." The professor who talked of Adam as an 'evacuee' from Paradise also modernized Shakespeare:

"When sorrows come, they come not single
But in 'Panzer divisions'."

Quislings have appeared like mushrooms in all walks of life and there are one or two in our own part of the world who are, if not full fledged 'Quislings', at least confirmed 'fifth columnists'. The whole world feels grateful to the militarists for the face-saving phrase 'gallant rear-guard action' which along with the older 'Parthian shot', is a great restorer of lost human dignity. And not only human dignity! It was only the other day that a pariah dog, while he was being thrashed by my servant suddenly decided to have recourse to 'gallant rearguard action', with disastrous results to the servant's **shalwar!**

Surely we are getting war-minded!

I. H.

the most loquacious, what could be more apt and resourceful than the mention by the wise host or hostess of the latest war communique? "Did you hear the latest bulletin from London or Berlin or Tokio or Ankara.......?" Of course some have heard one or the other or even all and in the conflicting news broadcast by the various stations there is matter enough to form the basis of conversation till domsday. Mr. Radiofiend comes out with an air of superior knowledge belonging exclusively to "well informed circles", that Japan is only 'bluffing'. But Mr. Paper-worm has scanned every word of the conversation between Mr. Cordel Hull and Mr. Kurusu is equally cocksure that Japan 'means business'. 'The Bangkok correspondent of the Nichi Nichi' says this and General Tojo has contradicted the rumours emanating from Chungking and the Japanese envoy Mr. "Yoshizawa in his luncheon speech has reiterated....." and the air is full of the exotic sounds of Chiang Kai-shek's and Chunchinchow's as if the drawing room were a Chinese restaurant! Marvellous feats of memory are performed by these specialists; whole communiques of various nations are quoted verbatim and pros and cons of military strategy discussed with Napoleonic genius or Hitlerian thoroughness. Floods of eloquence are let loose on an amazed audience with more than Churchillian oratory. The whole art of course lies in retailing what every body has read in the paper or heard on the radio, with subtle personal nuances suggesting reserve—"if it wasn't for the Defence of India Rules......" "I hope I won't be betraying a military secret...." Or with a powerful array of historical statistics..... "In the last war, you know the No. of E-boats employed....."; "Russian man-power in 1938 and 1939 amounted to...", "the American output of tanks in the month of November.....". Equally impressive is the cautious attitude of the non committal prophet carefully playing upon the fears but subtly hinting also at the hopes, an attitude of 'ifs' and 'buts' and 'most probablys'—"if the U.S.A. joins in the war and provided the Russians last out the Winter there may be hopes of ending the war in 1942—provided of course if Japan's attitude can be defined and on condition if Turkey gives up the sitting on the fence attitude......"

Women have been accounted proverbially as unpolitical creatures but the present War has brought even these sheltered souls into the arena of martial talk. No longer does the modern woman confine herself to the Fashion's page of the paper and the advertisements of Cosmetics and the 'Body Beautiful'. She is fully conversant with at least the headlines of war news and can very often astonish the

direct in expression and excels in vivid pictures of life and country, which it brings before us, without any conscious effort at description on the part of the singer. Its music is as effortless as its imagery. Its words do not encumber it, they come to it most naturally. Nimbola Fairy, a supernatural story is a wild thing of wonder, a master stroke of witchery. When I heard it for the first time, I was suddenly reminded of Coleridge's **Christabel.**

There are many religious songs and religious ballads of which the story of Moses' Meeting with God, of Shamstabrez Baba and of Pigeon and Hawk are often told. These are all famous stories and have been translated from the Arabic.

Al-Burke
(QAZI AHMAD SAEED).

Talking of War....!

"War is just mass murder organised in cold blood by a set of power-maniacs." "War is nature's pruning hook, ensuring the survival of the fittest among civilized individuals and nations." So goes on the endless debate about the merits and demerits of War. War is natural; War is unnatural! But natural or unnatural, it is the greatest promoter of conversation and argument. Where would we poor moderns be if there was no War to talk about, no 'international situation to discuss?' Slander about one's enemies loses its edge by repetition; talking about the weather is only possible by the non-committal English; intellectual subjects are pedantic and highbrow but when we come to War—well, it is different. One of the causes of War mentioned is the human desire of relief from the boredom of peace. That may or may not be true but there is no greater enlivener of conversation than War, no greater remedy, for ennui than 'international politics,' 'the new world order' and so on. High brow, middle brow, low brow all can find material in it to relieve their characteristic tedium. It has endless possibilities. When the people in a drawing room have exhausted the possibilities of conversation centring in such tame subjects as weather, food, drink, pictures, books and personalities and an embarrassing silence falls on

fighting spirit and the familiarity with the sword is obvious. Again a disappointed maiden who is tired of waiting for her lover, expresses her feelings bitterly:

"For you, my youth is gone,
My life is worn, my heart is torn;
Alas! I am love-lorn,
But to-morrow, you shall pay for my sorrow."
May your gain become your loss
You have burnt me to ashes."

The true conception of beauty, as the experience of higher pleasure, not of sensuous pleasure, and that beauty is not be touched, is marvellously brought home when the poet sings:

کاته دَزړه لیدو دَسترګو ٭ لاس لګول دَرذالو خلقو وینه

See through the eyes,
Look with the mind;
Get transported, touch it not,
That is what the lower people do.

The warlike character of the Pathans has influenced even their lullabies. The mother prays for the long life of his son; and she wishes that when grown-up he would wield a **Toora** sword, and would be ready to fight when his honour is at stake. But soon she thinks of his marriage and his beautiful bride and so on.........

However, she calls her son a war leader. Or, she may compare her son to a tiger. She introduces us to the weapons that her son would wield when he goes to **ghaza** (battle).

Very few of the romantic ballads are original. The Arab and the Persian love-stories have been given a Pushto garb with few alterations here and there. Lela Majnun, Sherina and Farhad, Adam and Durrana, Gul-o-Sanober, and Nimbola Fairy, are some of the most interesting and absorbing ballads. The minstrel with his sweet rabab and melodious voice casts as it were, a spell on the audience who sit with a devoted expression on their faces listening to and gazing at, him. With the climax of the ballad, the feelings and emotions of the hearers increase in intensity and then this tension is relieved with an occasional joke upon one of the audience by the singer. As in form, so in substance a Pushto ballad is simple and

He then requests her to come to him and live with him :

Ah, come and be
A falcon on my knee.
On pieces of my heart
Surely I shall keep thee.

But she does not respond to his love. He is heart broken and sends his message through the morning zephyr relating his pitiable plight:

"My heart is broken and
My blood is bleeding.
'Neath it a cup of
Sadness am I keeping."

"A mad man they call me
Through all the country;
Insane and silly
Your love has made me."

"When shades begin to fall,
My heart begins to 'ppal,
My quilt becomes a shroud
As if to a grave do I crawl.

How true and beautiful is this description of a lover's mind, how forceful and accurate! There are several hundreds of such couplets and as they spring deep out of the hearts of sincere lovers, they arouse in us corresponding emotions and feelings.

The lover receives no reply. He is pining away. At last a messenger comes from her but he knows what answer she will send and so is afraid to ask the messenger. A poet has it

قاصد دَیار دَلورے راغے ❋ پښتنه زهٔ ترینه دَیرے نه کومه

The lover, then, thinks of writing a letter to her relating his sufferings but the tale of a lover's woe is unending :

The fingers to the pen complain,
Ah your letter shall still remain
Unfinished.
While we become dark dust.

At last he feels hopeless and compares her love to a stroke of sword; and who-so-ever plays with a sword, shall get wounded. The

character of the Pathan. The minstrel or Dom begins his song quietly, assuredly weighing each word; later, the song turns hard and coarse and denotes vigour.

Tuppa, Doha in Punjabi, makes a popular type of folk-poetry. It consists of two hemistitchs—a couplet. Rubai, a quatrain of the Persian form; Lobha, an Ode; Charbaita; and ballad, are other types of folk-poetry. In a Charbaita each stanza contains four lines and the refrain is regularly repeated after every stanza, the refrain being sung in chorus. All these various types of poetry are usually sung by the bards or Doms as they are generally called. But every one seems to possess a personal set of Tuppas. Usually the singing of Tuppas requires two persons, who should sing alternately, in the form of question and answer, or dialogue between a lover and a beloved. Or, they sing Tuppas of similar meanings and ideas. Shepherds and farmers are often seen at dawn, going down the green valleys, and fields, with their bleating sheep and bellowing pairs of bullocks, and singing ecstatically, the ding-a-dong of the bells of the sheep keeping the timing of their songs. The usual time of merriment of the Pathan peasants, however, is night. After their meals, they gather in Hujras and their weary souls find satisfaction and joy in these songs after the day's hard work.

These 'tuppas' constitute the subjective poetry of the Pathans and some of them are the most entrancing fragments. Simple, direct, and passionate as these are, they have met the common taste of the people at large. Most of them are love songs; others belong to everyday life themes. To give an ethereal quality to their words they are sung to the accompaniment of Rabab or Sitar and an empty water pitcher. Sarinda, Saringi and Dholak are the favourite instruments of the Dom minstrels.

A passionate lover praises the beauty of his charming beloved saying :

> "You are none else but a houri, my pearl.
> Your song spreads love in my heart."
> "The cloud must pour down its water,
> And you must pour down on me the nectar of love."

Hearing this she naturally begins to smile and the lover says:

> "When you smile, Sherini,
> The flowers in the garden, too, smile."
> "Your breasts are like flowers, fresh and smooth.
> And always my heart wishes to rest on these."

The Pushto Folk-songs

Literature of a people is the mirror of their hearts; we find there a distinct and vivid reflection of their mind their character and their spirit. It is the artistic and permanent history of their soul, their ideals and aspirations, where instead of dull and drab, mawkish and morose gallimaufries are to be seen records of their deepest insight and highest imagination. English literature of any period clearly indicates the development of English mind and character in that period. So do Urdu and Persian literatures, but unfortunately there is no such literature of the Pathans. If there is any at all, it consists chiefly of poetry. At this moment I can think of only three or four books originally written in Pushto; the translations of religious books from Arabic and Urdu, are, of coure, so many. But there is no prose literature. This is due, I think, mainly to our utter ignorance, lack of education and undesirable excess of the fighting-spirit. Pathans have the uncouth nobility of Olhello; they are warriors, and warriors are seldom literary persons. One should not expect them to create a subtle and refined literature.

We have a large amount of poetry, but few poetical works. Among the poets of the past Rahman Baba, Khushal Khan Khatack and Ali Khan were really great artists comparable to the great poets of other languages. But we have only these and none else. It is very difficult to judge the present-day poets because they are so near to us and time in this case, is the best judge. It is, however, clear that to speak very highly of them will be the result of patriotism. Khadim's poetry though permeated with the spirit of independence and freedom, is but for the most part, propaganda work, at times of the Congress and at times of the League. Samandar Badrashvi is a true poet, but writes mostly religious poetry. Said Rasul is promising and original but let us hope we shall have more performance than promise.

The large bulk of our poetry consists of folk-songs, the literatu of the illiterate, and on this I wish to dilate. The Pathan folk- is full of fire, imagination and a great air of independence. rugged and coarse and high sounding but frank and sincere

have pretensions to literature but must certainly have to sense and grammar. Nonsense can make delightful literature but not of the sort we find in our would-be articles. It is not 'pure' enough to serve our purpose. Similarly the kind of disregard to grammar which our writers practice does not make ultra-modern literature of a James Joyce or Gertrude Stein but just ungrammatical writing for its own sake. The fault, we have realized with infinite sadness, lies not with our writers but with us, who expect them to write articles so uncharacteristic of themselves. Nobody can go against one's grain.

"How about the official staff of the Magazine," you might ask, "the student and staff Editors appointed by the College?" Well, if the College magazine is to consist entirely of articles by the staff, we don't think it justifies its existence. It should be mainly an affair of the students, echoing their life and chronicling their activities, as we pointed out in our last number. This is not to say that we are inundated by contributions from the staff! The few among the staff, who can and do write, are usually too clever with their excuses. Some suffer from chronic overwork, thirty periods a week and so forth; others have practicals and some too many extramural duties to perform. So the poor Editor is left to mourn and philosophise on the dearth of the creative impulse in the world. Creative impulse in the literary sphere, we mean, because otherwise we are most prolific.

As for the student Editors; it is with the heaviest of heavy hearts that we have to refer to a very unique phenomenon. All three of our student Editors of the English Section, made what "the well-informed military circles" call a "strategic retreat." Soon after their examinations they "retired to prepared positions." In plain English they absconded, bolted. But it must be said to the credit of at least one of them that he tried to wangle his exit in a somewhat tactful fashion, leaving us a legacy of incomplete College notes by way of consolation. We tried to bring the other two absconders to justice and subject them to some kind of a literary court martial but in vain. So let this vitriolic editorial of ours serve as their immortal epitaph!

Since born editors are rather scarce in our part of the world, we have had to thrust this greatness on two or three simple unsuspecting souls. We wish our new victims the best of luck and offer to our dissatisfied readers our sincerest apologies. Like the rest of the world in these tumultous times, we are trying to do our best. No man can do more.

I. H.

THE KHYBER

No. I] PESHAWAR, MARCH 1942. [Vol. XXVI

EDITORIAL

We earnestly hope that the readers of "The Khyber" wait most impatiently for its new issues. For, if they did not, the profuse apologies that we wish to tender for our better-late-than-never appearance would seem irrelevent, if not vain. However it is not for a better and keener appreciation that we make ourselves so scarce. The reasons for the delay in bringing out the magazine are more unromantic, in fact woeful. There is one very simple fact that our nobly indignant critics are apt to forget—and that is that a magazine, even if it be a College Magazine, cannot be brought out without what are called **articles.** Even the most generous reader prefers, we hope, to have the pages of his magazine darkened with some arrangements of the alphabet. Humanity has not yet achieved that ideal of self-sufficient wisdom, when readers would go into ecstacies over blank pages. One of our greatest regrets is that we have been born too soon before that era of editorial bliss, of magazines without tears. And this, indignant reader, is no mere conventional lament about the dearth of articles. It is a passionate outcry against their complete absence. The Magazines, as we said, cannot be brought out without what are called articles. But articles cannot be written without what are called editors or contributors. And we have no editors, no contributors. Under these circumstances it does not require very profound logic to see why there is delay or why certain numbers of the magazine cannot be brought out. It is too idealistic to expect your editor to be a juggler; rabbits can be brought out of hats but not magazines from the thin air. We want articles which may not

THE KHYBER

ISLAMIA COLLEGE, PESHAWAR

Contents

خیبر

دار العلوم اسلامیہ سرحد

پشاور

مدیرین

عبدالمجید اختر متعلم بی۔اے آنرز

منظور احسن۔ بی۔ اے۔ آنرز

نگران

مفتی یم حبیب ایم۔اے

جلد (25) — شمارہ (5)

فہرست مضامین ماہ اپریل ۱۹۴۲ء

ارشادات

نیاز فتحپوری کی "نگارستان" کل پڑھنا شروع کی تھی۔ آج ختم ہوگئی۔
زبان بہت حد تک ٹکسالی اور سبک نگارش اردوئے معلّٰی کی مقلد ہے۔ مگر دونوں میں ایک فرق نمایاں ہے جو ایک وجود اور اس کے سائے میں ہوتا ہے۔ تاہم جذبات کی صحیح تصویر کشی، نادر تشبیہات موزوں مگر قدرے نامانوس اور ثقیل الفاظ زبان کی الہامیت۔ محاوروں کی بندش اور تراکیب کی چستی ان سب نے مجموعی طور پر زبان میں ایک حسن پیدا کر دیا ہے جو اپنے اندر ایک پرفسوں کشش اور جاذبیت رکھتا ہے۔

قابل مصنف نے اپنا تمام تر زورِ تحریر نشاط اور زندگی ازدواج کے بعض ناقابل اظہار پہلوؤں پر مبالغہ آمیز روشنی ڈالنے میں صرف کر دیا ہے۔ فاضل ادیب نے اپنا سارا زورِ قلم اور ساری لفاظی عورت کے حسن و جمال اور اوصاف و محاسن کی مدح کرنے میں خرچ کر دیئے ہیں۔ افسانے کا عنوان کوئی ہو، افتتاحیہ فقرے خواہ کیسے ہوں۔ درمیان میں وہی شوقِ مواصلت کا قصہ۔ ہجر و فراق کی وہی رنگ آمیز کہانی۔ توسل کے لذات و جذباتِ حیوانی کی وہی دلکش و ایمان فریب داستان! اور اختتام بھی ایسے جن کے حرف حرف سے زن پرستی و ہوسناکی ٹپک رہی ہے ——— عورت کی وفاداری، وعدہ ایفائی و بے لاگ محبت کی حمد و ثنا اور مرد کی بوالہوسی پیماں شکنی، مطلب پرستی و نفس رانی کی تحقیر و تکفیر!

یہ سب خرافات کہاں تک درست ہے؟ اس کا صحیح علم تو اس خالق کو ہی ہے جس نے یہ سب کھیل بنایا ہے۔ انسان اپنی محدود و نارسا عقل سے کوئی اٹل فیصلہ نہیں دے سکتا۔ انسانی قیاسات ہی ہیں جو انسان اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر یا اپنی کوتاہ نظری، خود بینی و کم فہمی کی وجہ سے مسلم قرار دے لیتا ہے۔ اور پھر از پر کسی جائز تنقید یا رائے زنی کو "فطرت کے خلاف بغاوت" کے نام سے منسوب کر کے اسے کفر سمجھتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسانی عقل با رہا اپنی بے بسی و لاچاری ہیچ میرزی کا اعتراف و اظہار ایسے مجلی حروف میں کر چکی ہے۔ کر رہی ہے اور کرتی رہے گی کہ اعادے کی ضرورت نہیں۔ وقت اور ضرورت کے ساتھ ساتھ ان قیاسات میں ترمیم و تنسیخ و ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے ان کی صداقت پر مکمل اعتماد کمزوری ایمان و ضعیف الاعتقادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

ایک قوم کی تباہ حالی، پست فطری و دوں ہمتی کی یہ بیّن دلیل ہے کہ اس کے افراد نفس پرستی و زند

ازدواج کو حیات انسانی کا واحد یا افضل ترین مقصد سمجھ کر دیوانہ وار اس کے پیچھے پڑ جائیں اور ان کی تحریر و تقریر اسی سے متعلق اور اسی بہیت کے ماتحت و زیر اثر ہوں۔ اور ایسی چیزیں جن کا پس پردہ رہنا ہی اقتضائے فطرت و انسانیت و شرافت ہے۔ انہیں عریاں و مشتہر کردیں۔ یہ درست ہے کہ بقائے نسل انسانی کا رشتہ عورت کے وجود ہی سے منسلک ہے۔ اور بقول اقبال مرحوم

ع۔ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

مگر تاہم کسی چیز کو اس کی مناسب حدود سے نکال دینا اور پھر بہت آگے بڑھا دینا ہرگز ہرگز جائز یا منفعت بخش نہیں ہوسکتا۔ بلکہ بخلاف اس کے محرک و محروک دونوں کے لئے باعث نقصان و موجب زیاں ہوتا ہے۔ تریاق بھی اگر مقررہ مقدار سے زیادہ استعمال کر لیا جائے تو زہر قاتل ثابت ہوتا ہے۔

بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ موجودہ شعراء۔ ادباء و افسانہ نگار حضرات نے عورت کے وجود کا مقصد صرف اور صرف خواہشات جوانی کی تسکین کا ایک ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ اور جب یہ خیال کسی مصنف کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے جب وہ اس غلط نظریئے کو ہی اساسی اور ناقابل بدل تصور کر لیتا ہے تو پھر اس کی گفتار و کردار و نظم و نثر سے سوائے اس کے اور کیا امید ہوسکتی ہے کہ وہ فعل فاعل و مفعول کے عریاں ترین پہلوؤں کو خوبصورت و دلکش الفاظ میں بیان کرکے "ادب لطیف" کی آڑ لے کر اسے عین تقاضائے فطرت و اقتضائے قدرت ظاہر کرے۔ اور اپنی ہوسناکی و بوالہوسی کا مظاہرہ "پاکیزہ عشق" کے پردے میں کرکے لوگوں کو دھوکا دے ـــــــ اس قبیح و مکروہ شکل کو لفاظی کے عتاب و مخمل میں ملبوس کرکے، مصوری کے غازہ و سرخی کی تاب دے کر اسے حسین و دلکش ظاہر کرکے لوگوں کے جذبات کو برانگیختہ کرے!

سوچا جائے تو یہ بالکل وہی فعل ہے جو ایک فاحشہ و حسن فروش بھی دیواروں، چھتوں و پردوں کی اوٹ میں کرنے پر بہ تقاضائے اخلاق انسانی مجبور ہے۔ مگر ہمارے یہ ادیب صاحبان الفاظ میں ذرا سی پیچیدگی و لچک و لطافت و نزاکت پیدا کرکے اسے صاف و عریاں صفحۂ قرطاس پر رکھ دیتے ہیں اور پھر فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے ادب لطیف کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے! ع

بدیں عقل و ہمت بباید گریست

قوانین فطرت و احکام جملہ مذاہب کے مطابق مرد عورت سے ہر لحاظ سے افضل تر ہے بیوی کے لئے خاوند کی حیثیت ایک مجازی خدا کی سی ہے۔ مگر خدا غارت کرے ان علم ادب کے خادموں کو جنہوں نے دیدہ دانستہ بلکہ ایک فخریہ انکسار کے ساتھ اپنے آپ کو اس قدر گرا لیا ہے کہ تحت الثریٰ سے بھی نیچے لے گئے ہیں اور دوسری طرف عورت کو ایک قابل پرستش دیوی کی حیثیت دی ہے اور خود کو ایک اچھوت پجاری بنا لیا

جو منہ سے باہر کھڑا ہو کر چوری چوری دیوی کے درشن تو کر سکتا ہے۔ مگر اپنی نجاست کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ اس کے پاؤں کو چھو سکے! بلکہ یہ کہ دور ہی سے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ دیکھ کر اپنے "اشتیاق" "پرستش" کا ثبوت دے اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہ اپنی کہتری و پستی کا اقبال و اعتراف کرے! مگر آخر کس لئے؟ . . . . . . ایک ایسے فعل کی خاطر جس کے شرمناک تصور ہی سے انسان اپنی جبیں پر عرق انفعال کے چند موٹے موٹے قطرے محسوس کرتا ہے۔

جس قوم کی اخلاقی حالت اس قدر گر چکی ہو جس نے اپنی زیست و حیات کا مقصد ہی زن پرستی سمجھ لیا اور جو بجائے اپنے افعال مذموم پر نادم و شرمسار ہونے کے اس آلودگی کو ایک فخر محسوس کرے ایسی قوم مذہبی اخلاقی، معاشرتی یا اقتصادی ترقی کی کیا امید ہو سکتی ہے! اگر زمانہ اسے ٹھوکریں مارے تو بجا۔ وہ اسے دھتکار دے اور اس سے نفرت کرے تو درست۔ اس کی تذلیل و ہتک کی جائے تو سب جائز یہ مستحق ہی ایسی عزت و توقیر کی ہے۔ ایسے ہی کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

مدیر

ہندوستانی سپاہی کا پیغام چینی سپاہی کے نام

اے سپاہی اے حصارِ چین کے زندہ عزدر
آبگینہ آج تیرے صبر کا ہے چور چور
ظلم کے بادل ہیں تیرے سر پہ منڈلاتے ہوئے
آگ کے شعلے ہیں تیرے چرخ پر چھائے ہوئے

شدتِ آزارِ پیہم سے ترا سینہ فگار
پنج سالہ جنگ سے جیب و گریباں تار تار
پھر بھی اٹھتا ہے ترے سینہ سے شورِ ہا و ہو
ڈھل رہا ہے کیا کسی طوفان کے سانچے میں تو

اے سپاہی تیری ہر موجِ نفس ہے شعلہ بار
خون نہیں تیری رگوں میں بجلیاں ہیں بیقرار
زندگی کے راز کو تو نے کیا ہے بے نقاب
کس خوشی سے کھیلتا ہے موت سے تیرا شباب

ان مصائب کی گھٹاؤں میں بھی تو مسرور ہے
آج دنیا تیری عزت کے لئے مجبور ہے۔
تجھ کو تصویرِ وطن میں خون کا بھرنا ہے رنگ
گونجتے ہیں آسمانوں میں تیرے نغماتِ جنگ

تیرے خون کے قطرے قطرے میں ہے خوابیدہ بہار
رشک کے قابل ہے تیرا جذبۂ بے اختیار
تیری اس تخریب میں تعمیر کے ساماں بھی ہیں ! !
تیری خاموشی میں کچھ تقریر کے عنواں بھی ہیں ! !

تیرے ویرانوں میں پیدا ہے بہارِ گلستان
تیرے غم میں جھلملاتی ہے نشاطِ جاوداں

تیری ان تاریک راتوں میں ہیں پرتو نور کے
رقص کرتے ہیں اسی ظلمت میں جلوے طور کے

اس دھندلکے میں چمک اٹھنے کو ہے صبح ظفر
ان سیہ پردوں کے پیچھے مسکراتی ہے سحر

اے سپاہی! میرا ہندوستاں بھی ہے اندوہگیں
یہ غریبوں کا وطن یہ مفلسوں کی سرزمیں

سوز خوابیدہ ہے میری جنبشِ مضراب میں
بیکسوں کا درد رکھتا ہوں دل بیتاب میں

آگ لگتی ہے کسی کے خرمنِ امید میں
سسکیاں لے لے کے رہ جاتی ہیں میری حسرتیں

خوں رلاتا ہے مجھے معصوم بچوں کا لہو
ماؤں کا دکھ توڑ دیتا ہے میرے دل کا سبو

نو اسیرانِ یتیمی، دہر سے نا آشنا
مسکراتے ہیں، تبسم لوٹ لیتے ہیں مرا

بیوگی کے نوجواں چہرے کا افسردہ فسوں
چھین لیتا ہے مرے دل سے میرے دل کا سکوں

کیوں بڑھاپے میں کسی کی خواب راحت کا مزا
گولیوں کی سنسناہٹ چھین لیتی ہے سدا

یہ دھادھم سے برستے بم ہیں کس کے نوحہ خواں
ٹوٹے پھوٹے سے در و دیوار ویراں بستیاں

دیکھتا ہوں جب یہ نظارہ تڑپ جاتا ہوں میں
اے سپاہی سانپ کی مانند بل کھاتا ہوں میں

نوجوانوں کے لہو سے جو زمین گل ریز ہے
ذرہ ذرہ اس زمیں کا اضطراب انگیز ہے

کروٹیں لیتا ہے میرے قلب میں جوشِ عتاب
دوڑ رہے میرے لہو سے برزولاتِ اضطراب

انتقامی ولولہ اب روح میں بے خواب ہے
ذرہ ذرہ میری مشتِ خاک کا بے تاب ہے

آ رہا ہوں میں بھی اس ہنگامۂ خوں پوش میں
زندگی ملتی ہے مجھ کو موت کی آغوش میں

اب ترے ہمراہ اس طوفان سے کھیلونگا میں
اب ترے پہلو بہ پہلو آگ میں کود وں گا میں

ہم جلیں گے آگ اوروں کی بجھانے کے لئے
خون بہائیں گے زمانے کو بچانے کے لئے

عرصۂ پیکار سے ہے تیز تیغ شعلہ نام
آج خونی بھیڑیوں سے لینگے خونی انتقام

اپنی بندوقوں کو اب آراستہ کر کے اٹھیں
گولیوں کو ظالموں کے خون سے ٹھنڈا کریں

میری طاقت صرف ہو گی گولہ و بارود میں
میری توپوں سے اٹھیں گے اب تباہی کے دھوئیں

خوب سمجھائیں گے دشمن کو جہانبانی کا راز
سوئے گردوں مائل پرواز ہیں میرے جہاز

بن کے چھاجائیں گے طوفاں وادی و کہسار پر
آگ برسائیں گے دشمن کے در و دیوار پر

آبرو اپنی مصیبت میں گنوا سکتے نہیں
کچھ بھی ہو ہم اپنی آزادی لٹا سکتے نہیں

دفن ہے جس جا پہ تیری میری آزادی کا راز
جذب ہے اس ذرہ ذرہ میں مرا شوقِ نیاز

اپنا مسلک ایک ہے، اور اپنی محفل ایک ہے
ایشیائی بھائی! تیری میری منزل ایک ہے

اے رفیقِ کارِ ما، اے ہمدم چینی نژاد
زندہ باد زندہ باد زندہ باد زندہ باد

عبدالمنان ناہید

انتخاب از "نگارستان"

میرے نزدیک حیات نام ہے۔ صرف ان تاثرات کا جو مناظرِ فطرت کی اچھوتی فضا میں پیدا ہوں اور اسی میں تحلیل ہو جایا کریں۔

حسن کچھ چیز نہیں مگر محبت سے مل جانے کی تمنا

انتظار نام ہے صرف خلوت پسندی کا۔ وہ خلوت پسندی جس میں احساس خلوت بھی ہو۔

میں تو گناہ صرف اس لئے کرتا ہوں کہ اس سے بچنا بھی ایک طرح کی ریاکاری ہے۔

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دو نگاہوں کا اول بار مل جانا ایک مکمل تاریخ محبت ہوتی ہے مگر ہم اسے پڑھتے ہیں تھوڑا تھوڑا کر کے۔

جو شخص التجائے نگاہ کو نہیں سمجھ سکتا اس کے سامنے اپنی زبان کو شرمندہ نہ کرو۔

عورت کا شباب ایک سربند مینا ہے کہ اگر اسے کسی نے نہ کھولا تو بھی اس کا شیشہ توڑ کر باہر نکل پڑنا کچھ دور نہیں۔

اگر سو اٹھنے کے بعد انگڑائی کی مستی اور نگاہوں کی مخموریت چھین لی جائے تو میں حسن کے نام سے کانپنا ترک کر دوں۔

محبت ایک کی اذیت، دو کی مسرت، اور تین کی عداوت ہے۔

ذہانت کو محنت سے نفرت ہے۔

ساری کائنات کا سمٹ کر صرف ایک ہستی میں سما جانا، ایک تنہا ہستی کا پھیل کر الہانہ وسعت اختیار کر لینا یہ محبت ہے۔

صرف محبت ہی وہ چیز ہے۔ جس سے عبدیت معمور ہو سکتی ہے غیر محدود کو پُر کرنے کے لئے غیر فانی چیز کی ضرورت ہے۔

مرتبہ "فیلسوف"

غزل

ابھی سے سُن رہے ہیں دم نہیں ہے تیغِ قاتل میں
انا الحق کی صدا کا دم ابھی باقی ہے بسمل میں

نہ پوچھ اے ہم نشین عالم مرے غرقاب ہونے کا
یہی دو چار گز کا فاصلہ باقی تھا ساحل میں

نہ کوئی جادۂ منزل، نہ کوئی رہبرِ منزل
بڑھے جاتے ہیں لیکن دم بدم ہم شوقِ منزل میں

بلا نوشوں پہ عائد کیوں ہو قیدِ خلوت و جلوت
"کبھی پی چھپ کے خلوت میں کبھی پی کھل کے محفل میں"

انہی کی یاد سے رنگین ہے اب تک میری دنیا
وہی دو چار لمحے جو گذارے تیری محفل میں

نہیں ہیں بے سبب پیدا یہ اندازِ جنوں اپنے
کسی کی یاد پھر سے آ رہی ہے خانۂ دل میں

کمال بے نیازی ہے حریفِ امتیاز اخترؔ
تیری نظرِ عنایت میں، ترے طرزِ تغافل میں

اخترؔ

ادبِ کثیف

آ ساجن! اس ہاسٹل کی محدود و تنگ فضا سے دُور۔ بہت دُور۔ بُرج ہری سنگھ سے بھی پرے جہاں کابل جانے والے قافلوں کے اونٹ بلبلا بلبلا کر ہوا میں سیمیں ارتعاش پیدا کرتے ہیں! —— اور جہاں کی تپتی ہوئی زمین پاؤں سے سر تک ایک آگ لگا دیتی ہے —— اور یہی جی چاہتا ہے کہ اچکن کے بٹن توڑ تاڑ کر کہیں دیوانہ وار بھاگ جاؤں ——!

(۲)

موسم گرما میں شملہ اور ایبٹ آباد جا کر بسنے والے ساجن! تو نہیں جانتا کہ یہ برگشتہ قسمت کس حالت میں ہے! . . . . آہ اگر تمہیں کبھی مئی جون کی چلچلاتی دھوپ میں امتحان دینے کا موقع ملا تو جب پسینے کی نقرئی نہریں آملہ ہیر آئل میں چیکٹ بالوں سے ایک خوش خرامی کے ساتھ۔ ناک کی نوک اور ان پلکوں سے آبدار موتیوں کی طرح ٹپاٹپ ٹپک کر کچھ منہ میں اور کچھ امتحان کے پرچے پر گرتی ہیں —— تو تو جان سکے کہ اس کشتۂ ناز کے دل پر کیا گذرتی ہے؟

(۳)

اور پھر —— رات کو کھیوں کی آماجگاہ رکابیوں سے خالص چربی اور چھیچھڑے زہرمار کر کے ٹڈیوں اور مچھروں کا ماء اللحم پی کر یہ راندۂ محفل جب "ایز یو لائیک اِٹ" اپنے تھکے ماندے گھٹنوں پر رکھ کر "روزالنڈ" کا "دِلی کیریکٹر" اور "جیکس" کا "مار بڈ ہیومر" پڑھنے کے لئے برآمدے میں سرنگوں ہو کر بیٹھتا ہے اور —— پھر ہاسٹل کے کونوں کھدروں اور خصوصاً دارالطعام (DINING HALL) کے مستقر سے مکھیوں اتنے بڑے بڑے مچھروں کے ہوائی جہاز اس کی ناک، کان اور منہ کو سرزمین یونان سمجھ کر ہٹلر کی طرح حملہ آور ہوتے ہیں —— اور —— جب ٹڈیاں اتنے بڑے بڑے پروانے شمع کی مئے حسن سے مخمور ہو کر اس کے جسم کے ہر ننگے حصے پر عقاب وار یَرمارتے ہیں تو یہ بد اختر ان کے ساتھ اس طرح باکسنگ (BOXING) کھیلتا ہے جس طرح سر شام عادل صاحب شوکت کے ساتھ ——! اور آخر مجبور ہو کر —— لنڈی خانے سے خریدی ہوئی مسہری لگا کر اپنے وفادار بستر پر گر پڑتا ہے اور پھر —— آہیں —— ٹھنڈی اور گرم —— اختر شماری کروٹیں بدلنا۔ اٹھ کے بیٹھ جانا اور جستجو آمیز نظروں سے وسعت صحن میں دیکھنا کہ کہیں ہلم کا سرنگوں چہرہ نظر آئے اور بندہ

او ـــ د ـــ کرکے کھڑا ہو جائے ـــ آہستہ آہستہ پاؤں گھسٹتا ہوا پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا۔ دُم اٹھائے اور آخر ایک انگڑائی لے کر جلدی سے سلام علیکم کہہ کر چلم کی طرف منہ پھاڑ کر لپکے ـــ آہ ساجن! تو نہیں جانتا کہ اس سوختہ قسمت کی راتیں کس طرح بسر ہوتی ہیں۔

(۴)

اے ساجن! اس "چل چل رے نوجوان" اور "جینے والے ہنستے ہنستے جینا" کی بے وقت رنگینیوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے چل اس محبوس فضا سے بہت دور شاہراہ کابل کے پہنے پل سے بھی پرے جہاں مرے ہوئے کتوں کی مشام نواز ہوا کے خوش آئند جھونکے اور ـــ وجد کے نیچے کراہتے ہوئے گدھوں کے پرسرور نغمے تیرے استقبال کو آگے بڑھتے ہیں ـــ ؛ ساجن آ کہ اب انتظار کی تاب اس جان محزون میں نہیں رہی ـــ تو اپنے کھدر بھنڈار کی اچکن کندھے پر ڈالے جلد آ کہ اس ملوث و محدود احاطے سے نکل جائیں دور! بہت دور ڈاکٹر امداد حسین کے گھر ـــ پانی مانگ کر لیموں کا شربت پینے کے لئے ـــ !

"بے دلن"

غزل

وہ خود حسن پر اپنے اترائیے گا — مرے عشق پر ناز فرمائیے گا

دم رخصت اچھا نہیں منہ چھپانا — ادھر دیکھئے یوں نہ ترسائیے گا

یہ کیا زیر لب کہہ کے تم ہنس دیئے تھے — سنوں تو ذرا پھر سے فرمائیے گا

قیامت چھپی ہے نقاب سیہ میں — ذرا ایک گوشہ تو سرکائیے گا

میرے دل میں رہ کر بھی مجھ کو نہ پایا — مجھے چھوڑ کر پھر کہاں جائیے گا

میرے پاس ہوتے ہوئے مجھ سے پردہ — یہ کیا بے حجابی ہے باز آئیے گا

تقاضائے فطرت سہی میں نے مانا — مگر مجھ سے اتنا نہ شرمائیے گا

وہ پہلی ملاقات بھی ان سے کیا تھی
اور ان کا یہ کہنا "نہ گھبرائیے گا"!

عین - میم - نون

حضرت خالدؓ بن ولید

حضرت خالدؓ بن ولید بنی مخزوم کے خاندان میں سنہ ہجری سے تقریباً اکتیس ۳۱ سال پہلے پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان زمانہ جاہلیت میں معزز تھا۔ آپ کو بچپن سے ہی فن سپہ گری کا شوق تھا۔ اس طبعی شوق کے باعث آپ کے والد مکرم ولید نے بھی آپ کو اس فن کے لئے موزوں خیال کیا۔ آپ نے اپنی طبعی ذہانت سے بچپن ہی میں ان سب باتوں سے اس قدر واقفیت حاصل کرلی۔ کہ ظہور اسلام کے زمانہ اور اپنے آغاز شباب یعنی اٹھارہ برس کی عمر میں اپنے خاندان کی اہم خدمات انجام دینے لگے۔ ۲۳ برس کی عمر میں آپ نے غزوہ اُحد میں مسلمانوں کے خلاف کافی بہادری کے کارنامے دکھائے۔ اسی جنگ میں لڑکر ان کو مسلمانوں کے عزم کا پتہ لگا۔ اصلی معنوں میں یہ جنگ کفار کے لئے ایک زبردست شکست تھی۔ کیونکہ جب خالد بن ولید نے اس لڑائی میں حصہ لیا۔ تو ان کو مسلمانوں کے اس جوش وخروش کی بڑی قدر ہوئی۔ اور بعد میں مسلمان ہوگئے۔ غزوہ موتہ میں بہادرانہ کارنامے دکھانے کے بعد آپ کو رسول کریم نے سیف اللہ کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ اسی جنگ میں لڑتے لڑتے آپ کے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹی تھیں۔ اسلام لاتے ہی زندگی کے آخری سال تک آپ کی پوری زندگی میدانِ جنگ میں گذری۔ اسی پر آپ کا ہی قول ہے۔ جیسے آپ بارہا کہا کرتے تھے کہ "جہاد کی مشغولیت نے مجھ کو تعلیم قرآن کے بڑے حصے سے محروم رکھا" تاہم آپ کا دامن علم کے پھولوں سے بالکل ہی خالی نہیں تھا۔ آپ کی طبیعت ذرا تیز تھی جس کی وجہ یہ تھی۔ کہ آپ ساری عمر جہاد میں مشغول رہے۔

یہی مجاہد جو کہ جنگ اُحد میں مسلمانوں کے خلاف لڑتے تھے۔ اسی جنگ کے بعد مسلمانوں کے دوش بدوش کھڑے ہوکر معرکۂ یرموک ایسی دنیا میں مثال پیدا کرتے ہیں۔ یہی وہ معرکہ ہے جس کو یورپ کے مؤرخ بے خود ہوکر لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کی جسارت قابل تعریف ہے۔ جنہوں نے اپنے سے پانچ گنا فوج سے نہ فقط جنگ یرموک میں فتح حاصل کی۔ بلکہ رومن قوم کی عظمت مٹی میں ملادی" جنگ یرموک کی کامیابی مجاہد اسلام سیف اللہ خالدؓ کی مرہونِ منت ہے۔ اسی معرکہ کی تعریف میں بعض مؤرخین یورپ نے آپ کو خالد اعظم کا خطاب دیا ہے۔ یہ ایک ایسا معرکہ تھا جس کی مثال آج تک دنیا میں نہیں ملتی۔ دنیا کی

تواریخ میں ایسا معرکہ کہیں نہیں لڑا گیا ہے۔ اگر چنگیز خاں دنیا کے فاتح اعظم کا لقب اختیار کرتا ہے۔ تو اس کی عظمت اسی میں ہے۔ کہ اس کے پاس کثیر التعداد فوج تھی۔ اگر نپولین نپولین اعظم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ تو اس کی عظمت اسی میں ہے۔ کہ پہلے وہ کمزور ریاستوں پر قبضہ کر کے طاقت بڑھاتا ہے۔ اور پھر لڑائی میں فتح پاتا ہے۔ لیکن پھر بھی زندگی کے آخری سالوں میں شکست کھاتا ہے لیکن بہادر خالد دنیا کے ان سپہ سالاروں میں سے ہیں جنہوں نے کبھی بھی زندگی میں شکست نہیں کھائی۔ لیکن بعض متعصب مورخین نے ان کو خونخوار جرنیل کا خطاب دیا۔ افسوس ہے ان کی اس تنگ نظری پر کہ محب قوم اور مجاہد اپنے مذہب اور قوم کے لئے جان تک قربان کرنے کے لئے تیار رہے۔ اور پھر اس کو خونخوار سمجھا جاتا ہے۔ کیا ایک رحمدل سے رحمدل جرنیل بھی میدان جنگ میں خونخوار نہیں ہو سکتا۔ البتہ میدان جنگ کے علاوہ کسی اور موقعہ پر اس شجاع کی خونخواری کا واقعہ بتا سکتے۔ تو ہم کو اس برے خطاب پر یقیناً ملال نہ ہوتا۔ یہ بات ہر ایک پر اچھی طرح واضح ہے۔ کہ بہادر خالد نے نہ تو کسی ملٹری کالج میں تعلیم پائی تھی۔ اور نہ کسی قواعد دان کمانڈر سے انہوں نے فنون جنگ کو حاصل کیا تھا۔ لیکن جو جو معرکے انہوں نے سر کئے ہیں۔ ان پر آج تک دنیا کے بڑے بڑے فاتح اعظم رشک کرتے ہیں جس میں معرکہ یرموک خاص طور پر ذکر کے قابل ہے۔ آپ نے تقریباً سوا سو لڑائیوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے جسم مبارک میں ایک بالشت حصہ بھی ایسا نہ تھا جو نیزوں اور تلواروں کے زخم سے چھلنی نہ ہوا ہو۔ آپ اکثر ذوق جہاد میں کہا کرتے تھے۔ کہ مجھے میدان جنگ کی سخت رات جس میں اپنے دشمنوں سے لڑوں۔ اس شب عروسی سے زیادہ مرغوب ہے جس میں میری محبوبہ مجھ سے ہم کنار ہو۔ بعض اصحابہ بار بار حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ان کے معزول کرنے کا مشورہ دیتے رہے لیکن وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے۔ کہ "میں اس تلوار کو نیام میں نہیں کر سکتا جس کو خدا نے بے نیام کیا ہے۔"

یہی شیر مرد جو کہ روم اور ایران کی سلطنتوں کی بنیادوں کو اکھیڑ دیتا ہے جس کی شان و شوکت کا چرچا آج تک دنیا کی زبان پر ہے جس کے معرکوں سے آج تک دنیا کے بڑے بڑے فاتح اعظم رشک کرتے ہیں۔ وہ مجاہد معزولی کے وقت اُف تک نہیں کرتا۔ جبکہ اس کے سر سے ٹوپی اتار لی جاتی ہے۔ اور عمامہ گردن میں باندھ دیا جاتا ہے۔ ۲۱ھ میں آپ گورنری سے استعفیٰ دینے کے بعد مدینہ طیبہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ وہیں کچھ دن بیمار رہ کر ۲۲ھ میں آپ نے وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ملک

شجاع الزمان سال اول

یادِ رشاد

سوادِ شام میں ہلکا سا نور باقی ہے
مئے شفق کا فضا میں سرور باقی ہے
زمیں پہ رونقِ ہستی کا دن تمام ہوا
فلک پہ محفلِ انجم کا اہتمام ہوا

پسند مہر کو آئی حجاب آرائی
عدو سے نور کو بخشی گئی توانائی

پیامِ عیش نہ دے ماہِ ناتمام مجھے
رلا رہی ہے کوئی پُربہار شام مجھے
ضیائے انجم و نورِ شعاعِ ماہ بھی ہے
نگہ کو جستجو لیکن کسی نگاہ کی ہے
رشاد! تیری جدائی سے دل ملول ہوا
میرے عزیز! محبت ہی کا نام ہے کیا
نہیں خبر اسے شاید تیرے نئے گھر کی
ہے خاکِ مکتبِ سرحد کو انتظار ابھی
اس آب و گل میں فقط چند روز ہے انساں
نہیں یہ جائے بقا کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ

کھلیں گے تجھ پہ اب اسرارِ زندگی اے دوست
تجھے نصیب ہوں انوارِ سرمدی اے دوست

عبدالمنّان ناہید

ایثار

"نیچے اترو" میں نے آہستگی سے کہا۔ "وقت بہت تھوڑا ہے"۔

دو سوار سپاہی بڑی تیزی سے ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ پہاڑی پر پہنچ چکے تھے اور انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ گھوڑے سے اتر کر میں مکان کی طرف بھاگا اور دروازے کو جلدی سے کھول دیا۔ سورج کی تیز روشنی سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ جون دروازے کی طرف پشت کئے کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر وہی پھٹا پرانا لبادہ تھا جو میں اس سے اپنی پہلی ملاقات کے وقت پہنے تھا اور اس کے ہاتھ میں وہی شیشہ تھا جو میں نے اسے باڈمن کے میلے سے خرید کر دیا تھا۔ میرے پاؤں کی آواز سے وہ چونکی۔ اور فرطِ انبساط سے ہلکی سی ایک چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔ آئینہ اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور ——— ٹوٹ گیا! لمحہ بھر میں اس کی

باہیں میرے گرد حائل ہو رہی تھیں ـــــ" ٹھیک جیک! سچ بالکل سچ!! مجھے زور سے دباؤ جیک! زور سے ـــــ اف! میرا دل ـــــ"

ہماری پچھلی طرف دروازے پر ایک سایہ سا پڑ رہا تھا ـــــ یہ میری ہم سفر ڈیلیا تھی جو کواڑ کے پیچھے کھڑی جھانک رہی تھی۔" جیک!" جون نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے کہا "کل میں نے قسم کھائی تھی کہ اپنے دل کو مضبوط کر کے تمہارا انتظار کروں گی ـــــ برسوں تک اگر ضرورت پڑی تو! اف! عورت کتنی کمزور ہوتی ہے! ـــــ تمام دن میں تمہاری راہ تکتی رہی۔ غروب کے وقت میں آلیسی بیکو کے پاس گئی۔ وہ ایک سیانی عورت ہے۔ اس نے مجھے ایک جادو بتایا اور تم آ گئے! جادو کی کشش تمہیں کھینچ لائی....."

وہ مجھ سے بے طرح لپٹی جا رہی تھی ـــــ" جون" میں نے اس کی باہوں کو اپنے گلے سے ہٹاتے ہوئے خجالت سے کہا" میں تمہارے پاس پناہ لینے کے لئے آیا ہوں۔ باغی سپاہی پھر میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ بہت قریب آ گئے ہوں گے جون! ـــــ کیا تم مجھے ایک گھوڑا مستعار دو گی؟ مگر بہت جلدی!"

" نہیں" دروازے کے پیچھے سے آواز آئی" گھوڑا اسے نہیں مجھے چاہئے" یہ ڈیلیا تھی۔

جون نے مڑ کر دیکھا ـــــ دونوں کی نظریں ایک دوسری پر پڑیں۔ . . . وہ گھور رہی تھیں تنفر و استحقار آلود نظروں سے! دونوں کے چہرے رقابت و نفرت کے جذبات سے سرخ ہو گئے تھے وہ ایک دوسری کا منہ تک رہی تھیں ـــــ میں دونوں کے درمیان نظریں نیچی کئے کھڑا تھا. . . . . دونوں اپنی اپنی جگہ خوبصورت تھیں جیسے تاروں بھری رات اور ابر آلود دن! چند لمحے وہ بے نیام تلواروں کی طرح تنی کھڑی رہیں ـــــ آخر جون بولی" جیک! کیا تمہاری سواری صحن میں ہے؟" میں نے اثبات میں صرف سر ہلا دیا۔

" مجھے اپنا پستول اور چغہ دے دو" یہ کہتے ہوئے وہ باورچی خانہ کی طرف لپکی اور سوراخ سے باہر کی جانب دیکھا" ابھی بہت وقت ہے" اس نے سیڑھی کی طرف جو بالا خانے کی کھڑکی تک پہنچتی تھی اشارہ کرتے ہوئے کہا" وہاں چلے جاؤ ـــــ دونو ـــــ اور سیڑھی کو اوپر کھینچ لو۔ مگر ـــــ سپاہی تمہیں پکڑنا چاہتے ہیں یا (ڈیلیا کی طرف اشارہ کر کے) اس کی تلاش میں ہیں؟"

" مجھے" میں نے اپنے کوٹ کا بٹن ٹٹولتے ہوئے کھسیانہ ہو کر کہا۔

" جیک! تب تم اس کی نگرانی رکھو اوپر. . . . . تمہاری حفاظت کروں گی ـــــ جب باغی سپاہی ادھر سے گذر جائیں تو تم جیوز کچن میں جا کر میری انتظار کرنا" یہ کہہ کر اس نے حسرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور میرے چغے کو اپنے کندھوں پر ڈال کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

معاً میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا! میں نے اسے روکنا چاہا اور چلا کر کہا" جون!" ـــــ مگر وہ

موتی کی لگام تھامے ڈھلوان پر سے اتر چکی تھی۔ "پیچھے ہٹ جاؤ!" یہ کہا اور اچھل کر موتی پر سوار ہو گئی ——
اور ایک مدھم ستارے کی طرح آہستہ آہستہ میری نظروں سے غائب ہو گئی۔

بمشکل پانچ منٹ گذرے ہوں گے کہ مجھے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے بالا خانے پر چڑھ کر سیڑھی اوپر کھینچ لی —— وہ سوار مکان کے سامنے سے گذر گئے۔ میں خیال ہی خیال میں ان کا پیچھا کر رہا تھا اور ابھی ان کے گھوڑوں کی ٹاپ مدھم نہیں ہوئی تھی کہ تین سوار اور آ گئے —— "وہ ضرور کہیں چھپ گیا ہو گا" ان میں سے ایک نے ہانپتے ہوئے کہا۔

اس کا گھوڑا بھی صحن میں ہے!" ایک اور آواز آئی —— "تبسم! تم جا کر اسے ڈھونڈو" تیسرے نے گھوڑے کو مہمیز لگاتے ہوئے کہا۔

دو سوار جلدی سے آگے بڑھ گئے اور تیسرا جسے انہوں نے تبسم کے نام سے پکارا تھا گھوڑے سے اتر کر مکان کے صحن میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

بالا خانے میں ایک سوراخ سا تھا۔ میں نے وہ ایک پتھر نکال کر اسے زیادہ چوڑا کر دیا اور سیڑھی نیچے لٹکا دی "ڈیلیا!" میں نے آہستہ سے کہا "جلدی کرو! نیچے اتر جاؤ!"

"ڈیلیا" نیچے جا چکی تھی۔ میں اتر رہا تھا کہ تبسم کے چیخنے کی آواز آئی "اف! . . . . . او . . . . . و . . . . .
یہ سیاہ بلی! —— نہیں خونخوار دیوی —— جادوگرنی! ——" وہ بدحواسی سے بھاگتا ہوا سیڑھی کے ساتھ ٹکرایا میں اچھل کر اس کے کندھوں پر جا بیٹھا اور اسے اسی کے گلوبند سے باندھ دیا۔ بلی کے تیز پنجوں اور دانتوں کی خراشوں اور زخموں سے اس کی پیٹھ لہو لہان ہو رہی تھی۔

"ڈیلیا! ادھر آؤ —— تمہارا کیا خیال ہے؟ چھپنے کے لئے یہ اچھی جگہ ہے!" میں نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مگر ڈیلیا چپ رہی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا —— وہ چمکتی ہوئی معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی —— "آپ نے مجھ پر بے حد احسان کئے ہیں۔ اور اس کے عوض میں میں جس قدر آپ پر اعتماد کرتی رہی ہوں۔ آپ اسے یاد رکھیں . . . . میرے لئے اس کا بھول جانا ہی بہتر ہے"! اس نے نہایت سرد مہری سے کہا

سیاہی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ پہاڑیاں سیاہ لبادے اوڑھے اوندھے منہ لیٹی پڑی تھیں۔ پگڈنڈی ستاروں کی مدھم و پراسرار روشنی میں سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی شاہراہ عام سے جا کر ملتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ چٹانوں کے ناہموار سیاہ سلسلے تاحد نظر پھیلے ہوئے تھے۔ غاریں و بک کران کی آغوش میں سو رہی تھیں —— ہر طرف خاموشی تھی۔ بلا کی خاموشی ——

ہم جون کی انتظار میں چپ سادھے بیٹھے تھے۔ ڈیلیا دروازے کے قریب اپنی ٹھوڑی کو ہتھیلی کا سہارا دیئے آسمان کی طرف تک رہی تھی۔ خاموش۔ ساکن۔ بے حرکت۔ سنگ مرمر کے ایک بت کی طرح! جوں جوں وقت گذر رہا تھا مجھ پر ایک نامعلوم سا خوف طاری ہوا جاتا تھا ۔۔ شاید جون واپس نہ آئے! بار بار میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا۔

رات کے اس بے پایاں سکوں میں مجھے کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی میں جلدی سے کھڑا ہو گیا اور دروازے کی طرف بھاگا ۔۔ جون موتی کی لگام تھامے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی آ رہی تھی۔ وہ تھکان سے چور معلوم ہوتی تھی۔

میں نے کمرے میں آکر دیکھا ۔۔ ڈیلیا کسی دوسرے کمرے میں جا چکی تھی!

"جیک! کتنے سپاہی اس طرف سے گذرے تھے؟" جون نے فرش پر گرتے ہوئے کہا۔

"پانچ" میں نے جواب دیا۔

"ہوں۔۔۔۔ دوں۔۔۔ " اس نے اپنی چھاتی دباتے ہوئے ایک لمبی آہ بھر کر کہا "پھر تم محفوظ ہو۔۔۔۔ وہ دوبارہ کبھی تمہارا تعاقب نہیں کریں گے ۔۔"

"مگر ۔۔ کیسے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"بیٹھ جاؤ جیک! اور میرے سر کو اپنے گھٹنے کا سہارا دو۔۔۔۔ میں نے بڑی دور تک ان کا پیچھا کیا۔ کوئی آٹھ نو میل تک۔۔۔۔۔ راہڑ کے شمال مغرب میں ایک بہت بڑی اور خطرناک دلدل ہے او۔۔۔۔ و۔۔۔۔ر وہاں ایک بہت گہرا شگاف ہے اور ۔۔ اور وہ اس میں پڑے ہیں۔ قیامت کے دن تک وہیں رہیں گے۔۔۔۔ او۔۔۔ و۔۔۔۔ اس کے پھٹے ہوئے کپڑے پہن لو اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر ننانوے بار کہو "آؤ جیک آؤ" ۔۔ یہ مجھے اس بوڑھی عورت ایسی بیسکو نے بتایا تھا اور۔۔۔۔ بہ مشکل میں نے پچاس مرتبہ کہا ہوگا کہ تم آگئے ۔۔ جیک میرے سر کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔۔"

اس کی آنکھیں درد سے بے نور ہوتی جاتی تھیں۔ اس نے اپنی چھاتی کو پھر دبایا اور اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"کیا تمہیں کہیں چوٹ آئی ہے جون؟" میں نے اس کے چہرے پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" اس نے درد سے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ان کے بہت نزدیک چلی گئی تھی ان میں سے ایک نے گولی ماردی اور ۔۔ وہ میری دائیں چھاتی میں لگی۔۔۔۔ او۔۔۔۔ و۔۔۔۔ جیک! میں نے تمہیں

ایک مرتبہ بزدل کہا تھا۔۔۔ مجھے معاف کر دو گے جیک؟ خدا را ضرور معاف کر دو ——!" اس نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "میرے پاس وقت بہت تھوڑا ہے —— صرف ایک دو منٹ —— جیک! میں تم سے محبت کرتی ہوں ——" وہ میرے سر کو اپنے منہ کے قریب لانے کی کوشش کر رہی تھی اور میرے گالوں کو اس طرح ٹٹول رہی تھی جس طرح ایک اندھا فقیر زمین پر گرے ہوئے ان چند پیسوں کو جو اس کی کل کائنات ہوں —— "جیک! میری دائیں چھاتی میں گولی سے بہت بڑا زخم ہوا ہے —— میں نے خون بند کرنے کے لئے اس میں گھاس کا کاگ دیا ہوا ہے —— خون اب اندر کی جانب زور کر رہا ہے اور مجھے سخت تکلیف ہو رہی ہے —— اس گھاس کو زخم سے نکال دو —— اف! تم نہیں نکالو گے!؟۔۔۔۔ اچھا ——!" یہ کہہ کر اس نے خود وہ گھاس نکال کر پھینک دی —— زخم سے گرم گرم خون فوارے کی طرح پھوٹ پڑا۔

"جیک! مجھے تھامے رکھو۔۔۔۔" اس کی آواز بہت نحیف ہو چکی تھی —— "میری پیشانی پر بوسہ دو جیک! —— میں تم سے۔۔۔۔ تم سے۔۔۔۔ م۔۔۔ ح ——!" اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے اور سر ایک طرف کو لڑھک گیا ——!

۵ حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ترجمہ

"یکے از رفتگاں"

تجلّیات

خاک کو آسماں سے کیا نسبت
گرد کو کہکشاں سے کیا نسبت

شعلہ و رعد و برق و باراں کو
میری آہ و فغاں سے کیا نسبت

طور جائے نیاز ہے بے شک
پر تیرے آستاں سے کیا نسبت

گریہ آلود شمع سوزاں کو
دیدۂ خونفشاں سے کیا نسبت

دل عاشق ہے جلوہ گاہ ان کی
مسند آسماں سے کیا نسبت

اب بسائینگے اک نئی دنیا!
ہم کو کون و مکاں سے کیا نسبت

"مہجور"

رباعی

آغاز محبّت ہو تو کلفت کیسی
انجام مصیبت ہو تو راحت کیسی
ارمان اسے کہتے ہیں رہ جائے جو دل میں
ہر روز نکل جائے تو حسرت کیسی!

احسن

"گناہ"

شمع جھلملا رہی تھی سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے۔
رقاصہ کی دراز پلکیں اس کی سیاہ آنکھوں پہ سایہ ریز تھیں۔
دور افق کے قریب تاریکی کسی دوشیزہ کی الجھی ہوئی زلفوں کی مانند آ رہی تھی۔
کانپتے ہوئے ستارے آسماں کی نیلگوں گہرائیوں میں تحلیل ہو رہے تھے۔
شب کا سکوت دن کے ہنگاموں میں جذب ہو جانا چاہتا تھا۔
ڈولتے ہوئے قدموں سے بادہ خوار میکدہ کو ویراں کئے جاتے تھے۔
محفل آہستہ آہستہ سونی ہوئی جاتی ہے۔
گریزاں تاریکیوں میں سے یکایک 'گناہ' چلایا۔
"تم ساقی کی ان حنائی انگلیوں سے دور کیوں بھاگتے ہو۔
ان انگلیوں سے جنہیں تم شب بھر سراہتے رہے؟
تم چھپتے کیوں ہو ان آنکھوں سے جن کی مستی تمہارے دل میں ہیجان پیدا کر دیتی تھی؟
تمہارے ان بے جان لاشوں میں انہی نشیلی آنکھوں نے زندگی پھونکی۔
تم بھاگنا چاہتے ہو۔
اس سے جس نے تمہیں حسن کے اس جرعۂ رنگین سے لب آشنا ہونے کا پیام دیا؟
جس نے تمہاری روح میں عشق کا یہ سلگتا ہوا شرار رکھ دیا؟
جو تمہاری پیاسی زندگی کو رعنائیوں کی اس بستی میں لایا؟
جس نے تمہارے مرجھائے ہوئے ہونٹوں کو زندگی کا رس چوسنے کی دعوت دی؟
میں 'گناہ' ہوں۔
شب بھر تم میرے گیت گاتے رہے۔
اور اب سحر کی ان سفیدیوں میں تم مجھے تنہا چھوڑ دینا چاہتے ہو؟
مجھے جس نے تمہاری زندگی کے ان بہتے ہوئے سفینوں میں روح ڈالدی؟
جس نے تمہیں امتیاز نیک و بد سکھایا؟
تم دور کیوں بھاگتے ہو اس سے۔
جس نے تمہارے مرجھائے ہوئے ہونٹوں کو زندگی کا رس چوسنے کی دعوت دی؟
میخواروں کے قدم تھم گئے، وہ رکے۔ بڑھے اور پھر پلٹ کر چلدئے

رحیم

رُخصت

کتنی مایوس نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا۔
جیسے گذرے ہوئے وقتوں کا کوئی خواب ہوں میں۔
کتنی خاموش تھیں تم!
جیسے یونان کے بتخانے میں
کوئی افسردہ نگاہ دیوی ہو!!
الوداع کہتے ہوئے آنکھ سے بہتے موتی۔
سہمتے سہمتے ہونٹوں پہ وہ دھیمی جنبش
جیسے غنچوں کی زبان ہلتی ہے۔
بادِ صرصر کی سبک لہروں سے!۔
"کیا چلے جاؤ گے آج؟
خط نہ لکھو گے مجھے؟
بھول جاؤ گے یونہی — جیسے بیتے ہوئے افسانے ہوں؟"
کتنا خاموش تھا میں! جیسے تصویر بدیوار کوئی ——————— !
——— سیٹیاں بجنے لگیں گاڑی کی . . . .
"جاؤ! انجام بخیر آؤ تم!"
ہونٹ کی جنبش خاموش نگاہِ پرنم
اب ہر روز بلاتی ہے مجھے۔
سسکیاں لیتی ہوئی یاد ستاتی ہے مجھے!

"یکے از رفتگاں"

اِس روز کا واقعہ !

سچّی بات تو یہ ہے کہ اس میں قصور ہمارا بھی نہ تھا۔ اگر کسی کا تھا تو "جغرافیہ والے" ماسٹر جی کا تھا ورنہ ہم آج تک سکول سے کبھی نہ بھاگے تھے۔ انگریزی کا سبق تو خیر ہم سے کبھی کسی نے سنا ہی نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ تمام ماسٹروں میں اگر کوئی شریف آدمی ہم نے دیکھا تو وہ "انگریزی والے" ماسٹر جی ہی تھے حساب کے متعلق ساری جماعت یہ گواہی دے سکتی ہے ہم صبح سویرے سکول پہنچ کر نہایت محنت سے دوسرے لڑکوں کی کاپیوں سے سوال نقل کر لیا کرتے تھے۔ اور اگر کچھ نہ بھی جاتے تو وہ تفریح کی گھنٹی میں مکمل ہو جاتے تھے۔ باقی رہا جغرافیہ۔ تو کیا ہوا اگر یہ ہمارے دماغ کے کسی کونے میں کبھی سما نہ سکا آخر ہمیں گورنمنٹ نے کسی ہوائی جہاز پر سوار کر کے بمباری کے لئے جرمنی تھوڑا ایسے دینا تھا جو ہم راستہ بھول جاتے۔ اور اگر بھیجنا بھی تھا تو ماسٹر جی کو کیا حق پہنچتا تھا کہ ساری کلاس کے سامنے ہمیں کان پکڑنے پر مجبور کرتے۔ اور وہ بھی اس ترکیب سے کہ ہاتھ ٹانگوں کے پیچھے سے ہو کر کانوں تک پہنچیں۔ گویا جغرافیہ نہ ہوا مداری کا تماشا ہوا۔ اس پر طرّہ یہ کہ جب ہم نے ٹانگوں کے درمیان سے اپنے "ہم جماعتوں" کو دیکھا تو ان میں سے بعض ہمارا منہ چڑا رہے تھے۔ ان میں آخر ہمارے دشمن بھی تو تھے نا! ابھی کل کی بات ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے ایک سند یافتہ "صاحب" نوکری کے لئے کسی بڑے افسر کے پاس گئے اور یہ بھی نہ بتا سکے کہ برما کس طرف ہے۔ اور ہم تو ابھی ماشاءاللہ پرائمری پاس کر کے ہائی سکول میں پہنچے ہی تھے۔ اگر ماسٹر جی خدانخواستہ وہ "بڑا افسر" ہوتے تو فوراً غریب گریجوایٹ کو کان پکڑنے کا حکم دیدیتے۔

خیر! تو ہمیں اس عجیب قسم کی ورزش سے نجات اس وقت ملی جب ہماری آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اور ہمارے ماحول کی تمام چیزیں جن میں ماسٹر جی بھی شامل تھے ہوا میں تیرتی ہوئی نظر آنے لگیں ہم نے خیال کیا چلو جان بچی لاکھوں پائے۔ کم از کم سبق سے تو نجات ملی۔ مگر ماسٹر جی بھلا کب چھوڑنے والے تھے۔ فرمانے لگے کل سارا سبق یاد کر کے آؤ۔ اور وار فنڈ کے لئے دو آنے جرمانہ بھی کر دیا۔ حالانکہ اس سے قبل ہم اپنی خوشی اور امی جان کی رضامندی سے آٹھ آنے اس مد میں ادا کر چکے تھے۔

اب یہ دوسرے روز جو واقعہ ہوا تو اس کی ذمہ داری بھی ہم پر عائد نہیں ہوتی۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔ کہ ایک کاپی خریدنے کے لئے ایک "دونی" ہم گھر سے لائے تھے اور "مکہ شریف کی قسم" ارادہ بھی تھا

نہ ماسٹر جی کے وار فنڈ میں دیدیں گے۔ اور اگر وہ کم بخت خوبچے والا ہمیں نہ ملتا تو یقیناً ہم اپنے ارادہ کا
سی ثبوت بھی مہیا کر دیتے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ سبق ہم اس روز بھی یاد نہ کر سکے تھے۔ مگر اتنی امید ضرور
تھی کہ دونی دیکھ کر ماسٹر جی خوش ہو جائیں گے۔

اب آپ ہی کہئے جب خوبچے والے نے ہماری آس ہی توڑ دی یا جب اللہ میاں کی ہی مرضی نہ تھی
کہ ہم اپنے مصمم ارادہ میں کامیاب ہوتے تو اس میں ہمارا کیا قصور!

لازمی طور پر اس روز ہمارے دل میں سکول سے بھاگ جانے کی یا بالفاظ دیگر چھٹی منانے کی ایک
زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ اور ہم نے مجبوراً یہ ارادہ کر لیا کہ آج جغرافیہ والے ماسٹر جی رخصت پر نہ
ہوئے۔ تو ہم ضرور چھٹی لے لیں گے۔ اب دیکھئے اگر ماسٹر جی اس روز نہ آتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ رہا
بھائی جان والا معاملہ۔ تو اس میں ہمیں کوئی شک نہیں کہ وہ سکول کے ایک ہونہار طالب علم ہیں لیکن یہ تو اتفاق
کی بات تھی نا کہ ان دنوں وہ بیمار تھے اور بہت بیمار تھے۔ اور چھوٹے بڑے سب ماسٹروں کو ان کی بیماری
کا علم تھا۔ اور یہ بھی اتفاق کی بات تھی کہ ہمیں چھٹی کی ضرورت پڑ گئی۔ لہذا ہم اپنے اداس اور غمگین چہرہ
کے ساتھ جو ماسٹر جی کے ڈر سے پہلے ہی اترا ہوا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور
ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ بھائی جان فوت ہو گئے ہیں اس لئے رخصت عنایت کی جائے۔ یہ بھی کوئی برا
کام تو نہ تھا جو ہم نے کیا۔ آخر مرنا تو سب نے ہے۔ اور پھر چھٹی بھی تو ہم نے صرف اپنے لئے ہی مانگی تھی
ہم نے یہ کب کہا تھا ان سے کہ وہ سارے سکول کو چھٹی دیدیں۔ اور پھر سارے ماسٹروں اور لڑکوں کا جلوس
بنا کر ہمارے گھر پر پہنچ جائیں۔ اگر وہ ہم سے پوچھتے بھی تو اس بات کا ہم انہیں کبھی مشورہ نہ دیتے۔ اور ثبوت اس کا
یہ ہے کہ ہم خود عین چھٹی کے وقت گھر پہنچے تھے۔ جبکہ امی جان دروازہ میں کھڑی ہماری راہ دیکھ رہی تھیں انہیں
غالباً یہ یقین ہو گیا تھا کہ ہمیں کوئی پٹھان پکڑ کر لے گیا ہے۔ اور اب بہت سارا روپیہ دے کر چھڑانا پڑے گا۔
ورنہ ہم سارا دن کہاں غائب رہ سکتے تھے۔ اور ہمیں امی جان کی صورت دیکھتے ہی گمان نہیں بلکہ یقین ہو گیا۔ کہ آج
کی کارروائی کی اطلاع گھر پہنچ چکی ہے۔ لہذا ہم کچھ سہم بھی گئے۔ لیکن آنے والے واقعات کے مقابلہ کی بھی ٹھان
لی۔ دروازہ پر پہنچ کر سلام کیا اور جلدی سے اندر داخل ہو گئے۔ امی جان نے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی غالباً
سزا دینے کی نیت سے نہیں بلکہ پیار کرنے کی خاطر۔ مگر اس وقت ہمیں یہی خیال تھا کہ اگر ٹھیرے تو پٹ
جائیں گے۔ لہذا ہم نہایت ہوشیاری سے ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھ گئے۔ اور تیزی سے اپنے کمرے کی
طرف لپکے۔ یہ تو ہمیں یقین تھا ہی کہ اب ہم آسانی سے امی جان کے قابو میں نہیں آ سکتے۔ خدا کے فضل
سے وہ ہم ایسی پتلی دبلی تھوڑی ہیں کہ بھاگنے میں ہمارا مقابلہ کر سکیں۔ خیال تھا کہ کمرے میں جا کر اندر سے

دروازہ بند کرلیں گے۔ اور اس وقت تک نہیں کھولیں گے جب تک عام معافی کا اعلان نہ ہو جائے پیشاب بہت سخت آیا ہوا تھا۔ وہ بھی خیال تھا مجبوری ہے اندر ہی کسی کونے میں کرلیں گے۔ مگر قسمت نے یاوری نہ کی۔ پیچھے سے ایک رعب دار آواز آئی" ادھر آؤ طاہر!" مڑ کر دیکھا بھی نہ تھا کہ باجی نے ہمارے کان پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔

"سارا دن کہاں غائب رہے"

ہم بیچارے اب جھوٹ کیا سچ بولنے کی بھی ہمت باقی نہ تھی۔ پتلون نما پاجامے میں ہمارا پیشاب خطا ہو گیا۔ اور ہم اپنی ٹانگوں کی اُلٹی وی (V) بنا کر خاموش کھڑے رہے۔ ہمارا بایاں کان ابھی تک باجی کے دائیں ہاتھ میں تھا۔

"وہ دونی کیا ہوئی؟"

"خونچے والے نے لے لی باجی!"

"خونچے والے نے کیسے لے لی؟"

اب آپ ہی کہئے ہم کیسے بتاتے اس نے کیسے لے لی۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ابا جان بھی تشریف لے آئے۔ نہ جانے ہماری اس بے بسی کی حالت میں انہیں کیا خوبی نظر آئی کہ سبھی ہنس دیئے۔

باجی کو حکم ہوا اس کے کپڑے تبدیل کردو!

عبدالمنان

شاہجہان کے آخری جذبات روضۂ تاج محل کو دیکھ کر

تاج اے عہد جوانی کی میرے رنگیں بہار
اے میرے الفائے پیمانِ وفا کی یادگار

اے میرے دورِ گزشتہ کی بزرگی کے نشان
اے میرے عہد جہانبازی کے رنگین شاہکار

اے امینِ رازِ الفت۔ حاملِ سرِ نیاز
تیری صورت سے عیاں ہیں لاکھ اقرار و مدار

تاج! تجھ کو دیکھ کر ہوتے ہیں تازہ زخمِ دل
ضربِ غم سے چھیڑتا ہے کوئی سازِ دل کا تار

تجھ میں پوشیدہ ہے میرے دل کی دلکش داستاں
تو ہے میری حسرتوں کا آرزوؤں کا مزار

اک شہنشاہ کی بہارِ زندگی کا ہے نشاں
تو ہے اک شاہِ جہاں کے سوزشِ دل کا بخار

تو متاعِ قلبِ مضطر کا امانت دار ہے — تیرے ایماں پر ہے اک تلمیح کا اب انحصار

باعثِ تسکیں ہے داغِ حسرتِ عاشق کا تو — چشمِ بینا کے لئے موجبِ صدِ اعتبار

دیکھ! دامانِ کفن اس کا کہیں میلا نہ ہو — خاک آلودہ ہو جائے وہ درِ شہوار

تاج با تا روزِ ابد با ایں تب و آئین باد

"ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد"

"فیلسوف"

مہینہ بھر کی خبریں

——— معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ "بینیبر ڈارون" صاحب کالج کونسل کی آئندہ میٹنگ میں یہ بل پیش کرنے والے ہیں کہ ہاسٹل میں طلباء کو مکی کی روٹی کے ساتھ دہی بھی مہیا کیا جائے۔ ہم ان کی پُر زور تائید کرتے ہیں۔ اکثر طلباء پیچش کی شکایت کر رہے ہیں اور اگر یہی حالت رہی تو ہمیں تعجب ہے کہ "سسری گاڑی کیسے چلے گی"

——— سنا گیا ہے کہ خیبر یونین کے آئندہ اجلاس میں ریزولیوشن پیش کیا جائیگا کہ اسلامیہ کالج پشاور کا پرنسپل برہمچریہ نہیں ہونا چاہئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس وجہ سے کالج کے بعض ننھے منھے پروفیسر بھی شادی نہ کرنے میں ہی مصلحت سمجھتے ہیں۔

——— فیصلہ کیا گیا ہے کہ خیبر مہینے میں دو بار شائع نہیں ہوا کریگا۔ بلکہ دو مہینے میں ایک بار شائع ہوگا۔

——— بہار کی آمد آمد ہے۔ یہ افواہ ابھی تصدیق طلب ہے۔ کہ بجلی کی "چشمک" کے بعد کالج کی سڑکوں پر قاف کی پریاں سیر کرتی ہوئی دیکھی گئی ہیں ہوسکتا ہے حورانِ بہشتی ہی گلگشت کو نکلتی ہوں۔ درختوں کی اوٹ میں لطیف قہقہوں کا ترنم اور بسا اوقات پیرہن کی سرسراہٹ ہم نے بھی سنی ہے۔ اگر کوئی صاحب اس پر مزید روشنی ڈال سکتے ہوں تو ہمیں اطلاع دیں۔

——— مندرجہ بالا خبر کی تائید میں ابھی ابھی ایک اور اطلاع ملی ہے کہ گذشتہ چند دنوں سے غروب آفتاب سے کچھ عرصہ بعد کالج کے جنوب مغربی کونے سے گانے کی آواز سنی جا رہی ہے۔

"آوارہ"

قطعہ

بس بہا قیمت جواہر زیر آب — در نہاں از چشم مردم خفتہ است
بے حساب از لولوئے خورشید تاب — قعر دریا را بسر در بردہ است
بعض گل کہ مادر گیتی بزاد — سر بہ رعنائی و بو سر بردہ است
از تماشائی سشدہ محروم دید! — در بیابان مشک خود از رستہ است

ترجمہ
"صحرائی"

رباعی

میری حیات کی جاں کاہیاں، نہ پوچھ، نہ پوچھ
میرے شباب کی خود رائیاں، نہ پوچھ، نہ پوچھ
نہ پوچھ آب سے آتش کی رنگ آمیزی
رخِ مجال پہ پرچھائیاں، نہ پوچھ، نہ پوچھ

"صحرائی"

آرزو

چاند کی لرزتی ہوئی نقرئی کرنیں اپنی زندگی کے چند لمحے شب کی شہزادی کے قدموں پر بھینٹ چڑھا دیتی ہیں۔
ہر شب یونہی ہوتا ہے۔
یہ جانتے ہوئے بھی کہ کامرانی کا وہ عہدِ نشاط جس کی انہیں تمنا ہے ایک خواب ہے۔ اپنی عمر کے چند ہی لمحے جو انہیں مستعار ملتے ہیں وہ لیلائے شب کے سیاہ گیسوؤں میں گذار دیتی ہیں

کیونکہ آرزو ہی تو زندگی ہے۔ تو وہ کیوں آرزو کے اس رنگین آنچل کو چھوڑ دیں۔
فلک کی ان نیلگوں گہرائیوں میں تیرتے ہوئے بادلوں کے حسین قافلے جو رنگین خیالات
کی طرح فضا میں منتشر رہتے ہیں۔ ہماری اس سنہری زمین سے ہم آغوش ہونے کی آرزو اپنے پہلو میں
لئے محبت کا اک بے پناہ سیلاب اپنے دل میں چھپائے۔ ہمیشہ ان لامحدود وسعتوں میں کھوئے رہتے
ہیں۔ وصل کی سسکتی ہوئی تمنائیں اور مچلتی ہوئی امیدیں انہیں آوارہ و سرگرداں رکھتی ہیں۔ اک
ہی لاحاصل انہیں پریشاں رکھتی ہے۔ حتیٰ کہ ناکامی کے تلخ احساس سے ان کی نم آلود آنکھوں سے اشک
نکلتے ہیں۔ اشک جو ان کی زندگی کا کل سرمایہ ہیں۔
شام و سحر یونہی ہوتا ہے۔
اپنی آرزو کی تکمیل کی خاطر انہیں ہر مرتبہ زندگی کی بازی لگانا پڑتی ہے۔ یہ جدوجہد مقصود نظر کی
تکمیل کی خاطر، تمنا جس کے بغیر یہ روز و شب کی زندگی بے کیف ہو جائے۔
یہ کانپتے لرزتے سائے جو شب کی ان بھیانک تاریکیوں میں ہمارے گرد و پیش محو رقص رہتے ہیں
دوشیزۂ سحر کے عنابی ہونٹوں کو چوس لینے کے متمنی ہیں۔ ان نازک و لطیف ہونٹوں کا رس چوس لینا چاہتے
ہیں۔ تمنا کی سلگتی ہوئی چنگاریاں انہیں سکون سے بیگانہ رکھتی ہیں۔ اپنے محبوب سے ملنے کی امید انہیں
مایوس نہیں ہونے دیتی۔ سائے بڑھتے ہیں بڑھتے ہیں اپنے محبوب کی جانب۔ حتیٰ کہ آتش شوق سے
جل اٹھتے ہیں اور چمکتے ہوئے شعلے بن کر فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ آرزو کی تکمیل کے لئے زندگی کی قربانی
مگر امید کی یہ درخشاں چنگاری بجھتی نہیں ان کی زندگی کا انحصار تمنا کے اسی جگمگاتے ہوئے
ننھے سپنے میں ہے۔ ہر شب وہ اسی عقیدت سے اپنی محبوبہ کے ہونٹوں کے لمس کے لئے بڑھتے ہیں:
اور پھر اسی کی ہستی میں کھو جاتے ہیں۔
زندگی ایک قربانی ہی تو ہے۔ آرزوؤں کی تکمیل کی خاطر قربانی
یہ ستاروں کی طرح روشن، یہ تمناؤں کی طرح درخشاں، یہ تپش سے معمور شعلوں کا گہوارہ، شمع ہر
شب کتنے پروانوں کا ماتم کرتی ہے۔ جنونِ عشق میں اندھے ہو کر وہ اس کے چمکتے ہوئے زریں چہرہ کو
اپنے اندر جذب کر لینا چاہتے ہیں وہ چوس چوس کر رس بھڑکتے ہوئے شعلے کو اپنی روح کی گہرائیوں میں
چھپا لینا چاہتے ہیں۔ چند لمحوں کے قرب کی خاطر اپنی زندگی اس پر نچھاور کر دیتے ہیں۔ پتنگوں کو خواہشات
کی آگ دیوانہ بنا دیتی ہے۔
انہیں خواہشات کی تکمیل کے لئے سعی ہی تو اصل زندگی ہے وہ سعی کتنی ہی لاحاصل کیوں نہ ہو۔

میرے محبوب! یونہی جذبۂ عشق سے مجبور ہو کر میں تیری بارگاہ میں سجدہ کناں ہوں۔ میرا عہدِ وفا ابدی ہے۔ لازوال ہے۔ ہم زندگی کے بندھنوں میں الجھے ہوئے ہیں تیری ان الجھی ہوئی زلفوں کے پیچ و خم، ان عنابی ہونٹوں کی سرخی، ان درخشاں آنکھوں کی چمک، ان سیاہ پلکوں کی تاریکیاں اور تری سحر فریب مسکراہٹ سب بے سود ہیں۔ میرے دل کا اضطراب، میری روح کی بیقراری، میرے اشک میری آہ و زاریاں سب بے کار ہیں۔ میرا دل دھڑکے گا۔ اور صرف تمہارے لئے دھڑکے گا۔ تمنا کی یہ دھندلی سی شمع ہمیشہ یونہی جھلملاتی رہے گی۔ آرزوؤں کے ماتم کے لئے وقت نہیں زندگی کا یہ ٹمٹماتا ہوا دیا نہ جانے کب گل ہو جائے۔ کائنات کی ہر شئے خود پرستش ہے تو میں کیوں اپنے سجدوں میں تغافل برتوں! اپنی زندگی کے تمام تاروں کو ہم آہنگ کر کے میں ہر شب تمہارے لئے نئے نغمے تخلیق کرونگا۔ شاہ بلوط کے درختوں میں سے ہوائیں سسکیاں بھرتی رہیں گی۔ جھیل کی خاموش لہروں پر میرے گیت تیرتے رہینگے وہ گیت جو میں نے تمہارے حسن کی نذر کئے آرزو کا یہ چراغ جلتا رہے گا اگرچہ ہمارے دل کوسوں ایک دوسرے سے دور کیوں نہ دھڑکیں آرزو کے بغیر زندگی ایک بے جان لاشہ ہے۔

رشید خواجہ

"راہ گم گشتہ"

بعد فنا بھی فرطِ جنوں سے یہ حال ہے — محشر ہے مانند شورِ سلاسل کے سامنے
اللہ رے بے نیازی و ضبطِ حصولِ عشق — "بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے منزل کے سامنے"

ہم تو کرنے چلے تھے شکوہ اے ورد — اس نے پھر مسکرا کے دیکھ لیا

محبت کے دریا کا ساحل نہیں ہے — جہاں ڈوب جاؤ کنارہ سمجھ لو

ان کے وعدوں کو جو دہرایا تو فرمانے لگے — ہاں! کسی سے کچھ کہا تھا اتنا ہم کو یاد ہے

میں نے سو بار تیری مست نگاہوں کی قسم — رنگ دیکھا ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا
چاند کے ماتھے پہ جس طرح پسینہ آ جائے — اللہ اللہ وہ عالم تیرے شرمانے کا

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی — تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

ہر جلوہ اک حجابِ نظر بن کے رہ گیا — لطفِ نظر بھی لوٹ لیا حسنِ یار نے

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ ـــ وہ ہم سے آکے کہیں چپ رہو خدا کیلئے!
یہ رعب حسن کا منشا کہ آنکھ ادھر نہ اٹھے ـــ یہ شوخیوں کا تقاضا کہ دیکھنا ہوگا
کوئی منہ چوم لے گا اس "نہیں" پر ـــ شکن رہ جائے گی یونہی جبین پر
آنکھوں آنکھوں میں داستان حیات ـــ دو نو جانب ولہانیاں ! توبہ !
بندگی ؟ میری بندگی ! اللہ ـــ اور تیری خدائیاں ! توبہ !
زندگی دیکھنے میں سب کچھ ہے ـــ جب سمجھئے بغور۔ کچھ بھی نہیں
آپ ہیں آپ، آپ سب کچھ ہیں ـــ اور ہیں اور۔ اور کچھ بھی نہیں
ہے میرے قول و فعل پہ ہر بار اعتراض ـــ اک بار اپنی شان کریمی سے بھی تو پوچھ!

مرتبہ "صحرائی"

صدائے سروش

"یادداشت گذشتہ یا کچھ ضروری باتیں" (ب۔ش)

"نوٹ:۔ اگرچہ یہ سب واقعات پشتو زبان میں ہو چکے ہیں۔ خیال تھا کہ پشتو زبان ہی میں لکھدوں لیکن مجھے پشتو کا رسم الخط نہیں آتا۔ لہذا اردو میں لکھ دیئے ہیں"

خدا کا شکر ہے کہ آپ کو پشتو نہیں آتی۔ ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپنے اپنے گرانمایہ خیالات سے ہمیں مستفید ہونے کا موقعہ دیا ہے۔ فی الحال یہ "ضروری باتیں" اپنی ڈائری میں لکھ لیجئے!

"فراق یار" (م۔خ۔و)

"بہار کی رت۔ ہر طرف "ہریال ہی ہریال" ہے۔ درختوں کے سنڈ منڈ ٹہنیاں "ہری روپہلی" پتیوں سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ . . . . جوان کنواری لڑکیاں دریا کے کنارے پانی پینے جا رہی تھیں"

لڑکیاں ہیں یا گائیں بھینسیں ؟

"میری زندگی" (ن۔ ل۔ د)

"میں دنیا کی نظروں میں بے جان ہوں، "تمدن مجھے حیوان سمجھتا ہے"؛ سوسائٹی مجھ سے متنفر" میرا ہر لمحہ خدمت کا خواہاں۔ مگر وہی بہتر قدم میرے لئے ذلت و رسوائی کا موجب ثابت ہوتا ہے"۔۔۔۔"

ہمیں آپ سے انتہائی ہمدردی ہے اور آپ کی اردو سے بھی ---

"نغمۂ بلبل" (ع۔ س۔ ش)

"ندی کے تنگ بطن میں سیماب بہہ رہا ہے۔
ہے خامشی بلا کی
بھیگی ہوئی فضا میں تاریکیاں رواں ہیں۔
تارے بھی گو" مدھم" ہیں۔
" فرحت کے راز داں" یہ بجھتے ہوئے دئے ہیں"

ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ شعر کہنا چھوڑ دیں۔ نام کے ساتھ تخلص کی دم نہ سہی ۔

"ضمیر اور اخلاق" (ل۔ م۔ س)

"ہم کو چاہئے کہ ہم ہر بات میں اپنے ضمیر سے مشورہ لیں ۔ اور یہ ضروری ہے کہ" ہماری ضمیر ہمیں جو بھی مشورہ" دے گا" وہ بالکل ۱۰۰ فیصد اسلام کے اصول کے مطابق ہو گا۔۔۔۔۔"

ضمیر سے مشورہ کر چکنے کے بعد ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ اس قسم کے مضامین بغرض اشاعت نہ بھیجا کریں۔ اگر مناسب خیال فرمائیں تو" ڈین صاحب" کو" سرمن" کے لئے دیدیا کریں۔

"خوشی" (س-ج-خ)

"خوش آدمی کا چہرہ پھول کی طرح کھلا رہتا ہے اور غمگین کا کلی کی طرح مرجھایا ہوا . . . ."
یہ فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا۔
"خوش آدمی کا چہرہ پھول کی طرح کھلا رہتا ہے اور غمگین کا کلی کی طرح بند . . . . ."
جس طرح ڈاکٹر امداد حسین اور ڈاکٹر احسان اللہ خان ——— !

"نمکدان" (ق-ن)

"ق-ن ــ ایڈیٹر صاحب! آپ کو کس قسم کے مضامین سے نفرت ہے؟"
ایڈیٹر ــ "اگر میں سچ کہدوں تو آپ خفا ہو جائیں گے؟"

"تصویر درد" (ع-سا-ک)

"بہار کا ایک شام تھا . . . . دو سال ہوتے اس کا شوہر اس دارِ فانی کو چھوڑ کر اس کو اور "اس کی سات سالہ لڑکے" کو دنیا کی مصیبتیں جھیلنے کے لئے "چھوڑ دیا" دنیا میں" اس کی دل" کا آرام . . . . " اس کی آہنی پنجہ کا گرفت" . . . ."
آپ مضمون لکھتے وقت کسی تیسری چوتھی جماعت کے لڑکے کو اپنے پاس بٹھالیا کریں کہ وہ آپ کو تذکیر و تانیث کے قواعد بتاتا رہے۔

"سائنیٹ" (ع-ر-ش)

"معشوق کی بیہوشی سے جب شاعر پر بے ہوشی" سا سماں" طاری ہو . . . کسی عجوبۂ کائنات سے جب انسانی تخیل بہت متاثر ہو رہا ہو" اسے لمحے" شاعرانہ دماغ سے جو سیل معانی بہہ نکلتا ہے . . . . "

آپ لکھ سکتے ہیں۔ شوق سے لکھئے۔ لیکن تصنّع سے کام نہ لیجئے۔ محض عالمانہ الفاظ کو یکجا کر دینے سے عالمانہ مضامین مرتب نہیں ہوجایا کرتے۔ بے شک سادہ اور سلیس اردو لکھئے "خیبر" کے صفحات آپ کے لئے ہی تو ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"زندگی اور موت" (ع-س-ش)

"زندگی ایک شعلہ تھا۔ بھڑکا مگر "سہا گیا"
موت کے منظر نے ہو جیسے اسے تھرا دیا۔

. . . .

مضطرب یہ تھا کہ بادِ موت سے بچتا رہے۔
موت کو یہ فکر تھی شعلہ "کیوں" جلتا رہے" . . . .

کہتے ہیں "بھاڑ میں جائے وہ سونا جس سے پھٹیں کان" ایسی شاعری بلکہ تشاعری سے کیا فائدہ جو باعث . . . . . ہو . . امید ہے آپ ہماری صلابتِ رائے کی داد دئے بغیر نہ رہ سکیں گے
"نقاد"

پښتو ځاوره مونږ پښتون شو ښکاري. رسالہ ترد دے حده قومیت ځوانو د پښتو حصه

څه وطن او تربیه چه نړد دے افغانه ::: چه هم د غیرت قومي ترقي جمه دے

خیبر

نګران:- مولانا عبدالرحیم صاحب مولوی فاضل . منشی فاضل

ایډیټر:- طالب علم میان محمد یوسف کاکاخیل

اسلامیه کالج پښاور

د شبنم په شان دے ځکه سحر ژاړم ٭ د کالج د باغ غوټئ وینځول غواړم

کورنئ خبرے

ځمونږ کالج کښې د خدائ په فضل پولوئ تعداد د پښتو رونړو تعلیم حاصلوی. او دا به بے ځایه نه وی. که دے ته د پښتو کالج اوویلے شی. ولے سره ددے د خیبر د پښتو حصے د مضمونونو د خط په سوب دا حالت وی. چه اکثره حصه ئے د داو تو بونو نه ډکه وی. او د مطلب مضمون چرته خال خال به په مشکله سره پکښې بیا موندے شی.

دپیړو خلقو دا خیال دے. چه د رسالے د پانړو ښائیست د مدیر تړکوشنه پورے منحصر وی. دا تر ډیره حده پورے صحیح دے. ولے تپ د پولاسه خنتل گران کار دے. چه تر څو ورسره بل نه وی پوځائے شوے اړیاتر به په پوازے ځان کوم کوم کار سرته رسوی. که چا ته د مضمون د پاره اووایم. نوځوک خورا ته سکښت د ځواب راکړی. چه که ځما د پاره دِ یو مضمون اولیکلو. نو ډیره مهربانی به دِ وی. دغه خو بیا هم څه دومره د حوصلے ماتیدو خبره نه ده. خومرم دد بینه. چه زهٔ پښتانه را ته دا هم او وائی چه سړیه پښتو هم څه ژبه ده. چه تا ته په کښې مضمون اولیکو.

څومره د افسوس ځائے دے. چه خپله مورنئ ژبه ورته څه ژبه نه ښکاری. او د نورو په ژبو کښې خپل عزت لټوی. مونږ که د عقل په سترګو اوګورو. او خپل سر ګریوان کښې ټیټ کړو. نو ځمونږ قدرهم د دغے ناخوښے پښتو د لمن لاندے دے. ترڅو چه مونږ د خپلے ژبے پالنه اونکړو. تر هغے به مونږ ته هیچرے څوک د عزت په نظر او نه ګوری.

په دغه سلسله کښې زهٔ د "خیبر" د لوستونکو توجه د تیرشوی مارچ

پرچې یو انګرېزي مضمون ته ګرزوم . د خپل مضمون په یو حصه کښې لیکي
چه "الله تعالی د هر قوم د پاره د یو خاص ژبې مقرر کول غښتل او فرشتې
د مصلحت د پاره په خپل حضور کښې را وُبللې . څه ساعت پس د پښتون
قوم وار راغې . نو یو فرښتې ته حکم کښې کا ئړی وا چول . او هغه ئې او کړنګول
وئیل دا د پښتو ژبه شوه".

زه نه پوهیږم . چه مضمون لیکونکی صاحب د خپلو خیالاتو نشا نه د
پښتو ژبه ځنګه خوخه کړه . ؟ معلومیږي دا چه دا ژبه ورته د ټولو
ژبو نه مزوبه ښکاریږي . او ځکه ئې خپل تمې ردر صرف پې ئې ژبه
خودل خوښ کړل . لیکن حقیقت هم دا دے . چه څه ورانه ده . نو د
خانه ده . پښتون په پښتنو بے قدره ده . کم داسې نه وے نو د یو ژوندي
قوم ژبے پسے د ځوك داسے پچوزے اوکړي . نو بیا د ادکوری چه د مور
پیئ ورته یا دیږي کم نه . کمزوری ته خو په دنیا کښې خوله کیدل اسان
کار دے . خو چه زور آور ته د اړ په غرمو شاوله راولے پرے نه وزي نو
هله به ئې اومنم .

زه بیا دے دلته نور ژباني بحث کول نه غواړم . ځکه چه نه خو
هغه ښه او ښکاریدو . چه یو داسے بے بنیاده خبره د خپل مضمون یو
حصه جوړه کړه . او نه به ما ته څوك ښه او وائي چه د "خیبر" شذرات
په فضولیاتو ډک کړم . اصیل ته اشاره قدرے کافي وی . امید دے
چه کړا نك ضرور به پیښ نه شي . او انبده به د داسے خبرے خیال
او ساتي . چه د بل شرئ شلول خپل شال شاول وی .

ما د ړمبئ پرچې شذراتو کښې د مضمونو نو متعلق څه لږ
اصطلاحی اشارے کړے وے . چه هغې باندے اکثرو مضمون لیکونکو تبډ
او کنړل . د دے د پاره زه مجبور یم چه هغه طریقه جاري او نه ساتم
اوس چه څه تیار دی هغه ستا سو مخکښې پیش کوم .

"مدیر"

دوه خطونه

خوږه وروره حمیده !

تا سره مې لوظ وو . چه کلي ته رسېدو سره به خط درلېږم . نن خپله وعده پوره کوم . او د کلي د ژوندونه چه زه سومره متاثر شوے یم . د هغې یوه لنډه شان نقشه ستا په مخکښې را کاږم .

د کلي د صفائي او پاکۍ حال ډېر خراب دے . په لارو کوڅو کښې د غلو منیازو د بد بوئ په وجه سړے پوزه نه شي نیولے . ځائ په ځائ ډېرانۍ پراته دي . چه ټوله هوا ئې ګنده کړې ده . پرون کاکوره لاړم . چه کوټې ته ورننوتم نو سوړا بانډې او کوړزې وې . زړه دا ته کړم دونه شو . یو خو د غوشو د لوګي نه ټوله کوټه ډکه وه . چه ما پکښې ساه نشوه اخستے . بل په هغه کوټه کښې چه دوئ په کښې اوده کېدل ساروي هم تړلي وو . چه هغوئ د سوټو غوجلو په بد بوئې ځما زړه وادرېدو را وادرېدو . بیا مې د کاکا لور سپیاکے ماتولے ما خپلو سترګو اولیدې چه خانګ کښې د اغلو د پاره اوړه پراته وو . په هغې کښې د سپیاکو بوسرې پرېوتل . او د کاکا لور مې پرواه هم او نه کړه .

دا خو د صحت او صفائي حال دے . او س مذهبي کیفیت واوره . ښځې خو ښځې چه سړي هم د حد نه زیات اوهام پرست دي . بابا کا نوله د ځن ای درجه ورکړې ده . پرون په جمات کښې د ماښځ نه پس د پیر بابا ذکر کېدو . چه ته د بد قسمتۍ نه ځما له خولې نه اووتل . چه پیر بابا خو د ابوبکر صدیق او حضرت عمر رضي الله تعالی عنهما د خپو د خاورو برابر هم نه وو . په دې خبرې ټول سړي په ما راسره شول . چه هون ! تا داڅه اووے . د پیر بابا نه هم لا څوک زیات شته . دا خو د سړو حال دے او هر چه ښځې دي . نو د هغوئ را نه هر څو نیوسه کوه . چه په چپه خوله کښې کښې ده .

د تعلیم حالت دومره نه هم زیات ګنده دے. د ښځو د تعلیم خو خبره
نوم اغستل ګناه ده. خو افسوس دا دے چه سړی هم ټول جاهلان دی.
کېږه نے سپینے شوے. او په الف بے تے نه پوهېږی. هم هغه د بابا ادمؑ د زمانے
یوے جغونه دی. چه زمینداری پرے کېږی. که ورته اووایے چه سړے یه
خدائے ته اوګوره. د زمانے په رفتار نظر واچوه. د تعلیم یافته ملکونو
زمینداران چه کوم قسم یوے جغونه استعمالوی. هغه ته هم استعمالوه. نو دے
به وائی. چه ګوره ګنه په انګریزی کالج کښې نے سبق لوستے دے. کافر شو
غیرے غیرے خبرے کوی"

چه د سړو دا حال دے. نو د ښځو خو هډو تپوس مه کوه. په ګور
کښې یو ډنګر دے. چه خاوند نے په حرخ واخلی او په کور کښې نے اوتړی.

د معاشرتی ژوند ورن واویلا پاتے ده. بعضے کورنے خبرے داسے
وی. چه کول پکار نه وی. پوهېدل پکار وی. د لور خور حیثیت د غوا
میخ دے. مور پلار دے د پاره تیاره ساتلے وی. چه چرته مالداره اسامی
پرکوتو ورشی نو خرخه نے کړی په. بله واوره! پرون د شیردل دولس کاله
پس ناویا ته زویے اوشو. په ځائے د دے چه د خدائے شکر نے ادا کړے وے
کم بخت ډمان را اوغوختل. ډمے نے ګډے کړے. دهغوی ونده په سود ورله
واخستے. او په ډمانو نے اونوستلے. شپے له نے زویے مرګونے ناجوړه شو. سحر
لس بجے نے جنازه پورته شوه. او شیردل چینګے دا ړے پاتے شو. د مړی ماښام
خوړل خو پښتنو ښځو ته هډو شرم نه ښکاری. غریب کور به یو خو غم لیو نے
سپیلنے کړے وی. بل دومره لوږے اولس پے دیره شوی وی. ناچار غریب د
سیټهه نه په سود قرض روپئے اخلی او د هغوی د کیړو ډکولو بندوبست
کوی. بیا په دے مړی باندے چه ښځے کوم وېر کوی. سر شوکوی او مخ
تکوی. د هغے په لیدو سړه خو ځما زړه خراب شی.

ډیر ظالمان داسے دی. چه هغوی خپلے پیغلے لونړه خوینده په کور
کینوی. او شرم ورله نه ورزی د دے غوسیانو بېبیانو تور سرونه. د واده به

ارمان کښی سپیره شی ۔
دَ کوسنړے وادہ خو پہ پښتنو کښی دَ تولو نہ لوے لعنت گنړلے شی۔
تا تہ پتہ دہ چہ څما خور دَ دوہ کالو راسے کونړہ دہ ۔ پرون مې مورتہ اووے
چہ مورے ! دا سر تورے غریبہ دے ولے پہ کور کښی بندہ پروا نہ کړے دہ کہ
خو ښہ دے وی نو بل وادہ دے اوکړی کنہ ۔ څما مور دَ اُوریدو وسرہ دَ تورہ
لمبہ شوہ ۔ او چغہ ئے کړہ ۔ چہ وائی بے حیا ! بے شرمہ ! تہ پہ تمام کښی څوروبہ
پوزہ پریکول غواړے ۔ کنړے ہم لا بل وادہ کوی ۔ دَ هغوی خو هم هغہ پوخاوند
وی ۔ چہ لاړ شی ۔ بل دهغے پہ ښندی کښی نہ وی لیکلے ۔ ما ورتہ وے مورے !
مذهب خو کنړے دَ بل وادہ نہ نہ منع کوی"۔ مور مې وے چُپ شہ ! دَ کالج اثر در باندے
شوے دے ۔ کوشتا نے شوے جوړے ۔ دا مذهب دِ څان سرہ یوسہ ۔ مونږ دَ رواج
نہ برخلاف اوکو او پہ تمام کښی څان اوشرموو ؟
اخر تر کومے بہ لیکم ورورہ ! فیصلہ دادہ ۔ چہ دا فضا د مرہ بد بودار
او زهریلا دہ ۔ چہ زہ پکښی ساہ نشم اخستے ۔ ستا اوچت او پاکیزہ خیالات څما
ډیر خوښ دی ۔ امید دے چہ تہ بہ دَ پښتون قوم پہ دے ذهنی رنځ باندِ دَ خپلو
جذباتو اظهار اوکړے ۔ زہ ستا دَ خط پہ انتظار کښی یم ۔ نور څہ نشتہ چہ اولیکم

(ستار شید)

خورہ ورورہ رشیدہ !

ستا خط را اورسیدو ۔ اومې لوستو ۔ او بیا بیا مې اولوستو ۔ دَ خپل محبوب قوم پہ
دردناک حالت چہ تا دَ حسرت او دَ ارمان اد بنکے تیوٓلے دِی ۔ هغہ څما زړہ ډیر خوږ کړو
دَ کلی دَ گندگئے او غلاظت چہ کومہ گِلہ تا کړے دہ ۔ هغہ واقعی پہ ځائے
دہ ۔ کہ څما نہ خوک تپوس اوکړی ۔ چہ خدائے کوم ځائے دے ۔ نوزہ بہ ورلہ دا

جواب ورکړم. چه هغه نه په اسمان کښې دے او نه په مزکه کښې دے. نه په چات کښې دے. نه په دهرمسال کښې دے. او نه په ګرجه کښې دے. بلکې هغه پاک ذات په هر پاک او ستهرا ځائے کښې اوسیګی. زکه چه په ګندهٔ او غلیظ ځائے کښې شیطان اوسیګی. خیال خو اوکه چه ځائے په ځائے ګندهٔ ډیرانو نه پراته وی. نو د خلقو د صحت به څه حال وی. که ډیرے کنجنو کندے کښیني. او په هغے کښې ډیرانو نه اچولے اوسی ولے. نو بیا بوئ به هم نه خوربیږه. او ډیره اعلیٰ سره به هم نه جوړیږه.

خو ستا خیال د پښتنو کورونو ته نه دے تلے یوهٔ تنګه کوټګئ به ئے وی چه هیڅ روښندان یا کهړکئ پکښې نه وی. یوه دروازه ئے وی. چه هغه هم همیش بنده وی. په دے کښې دوی ساروی هم ساتی. د دوی به سوتوغوجلو سوه د دوی د صحت به څه حال وی؟ تا ته په اودرو کښې د سپیاکو بوسری پریوتل ګناهٔ ښکاره شوه. نادانه! تالا څه لیدلی نه دی.

تا د پښتنو د تعلیم ذکر کړے دے. زما په خیال سړے او ښځه د جونه د ګاډی دوه پائے دی. که چرے دواړه پائے سمے وی. نو هله به ګاډے خپل منزل مقصود ته اورسی. کینی نو په لار کښې به مات ګډ پروت وی. ښځے لره پکار دی. چه هغه یوه شفیقه مور. یوه محبت کونکی ښځه او یوه هوښیاره باسلیقه د کور میرمن وی. د کوم ښځے چه خپل اولاد. خاوند او کور سره داسے مضبوط تعلق وی. هغه په حقیقت کښې یوه مثالی خاتون (   ) ده. کاش که څونګه پښتنے خویندے میندے دغه خپل ځان د مثالی خاتون جوړولو کوشش شروع کړی.

پښتون قوم د دنیا د ټولو قومونو نه د ترقئ په منډه کښې وروستو پاتے شوے دے. ځکه چه دده ښځے او نر دواړه بے تعلیمه دی. لیکن زهٔ خورایم چه اوس هم وخت شته. ځوانان د پخپله میدان ته راووزی. بوډا ګان به مونږ په زوره راووباسو. د بالغانو تعلیم د دوی د پاره د قدرت د طرف نه یو اخری رعایت دے. چه دوی زاړه زاړه طوطیان اولولئ. که دا قیمتی موقع هم د دوی

دلاسه ورکړه. او څنګه چه دوی د خپل اولاد نه په ډېران ټولی خوړونه جوړ کړل هم هغسې د بالغانو تعلیم نه د هم بغاوت اوکړو. نو یاد او لرې د دوی هستی به د دنیا نه هغه فنا شی. او فرښتې به منګلے مروړی. چه نن د پښتون قوم بېړه ډوبه شوه.

څو نز مشران وائی. که ښځو نه مونږ تعلیم ورکړو. نو دوئی به بیا خپلو اشنایانو ته خطونه لیکی. په دے خبره ماله بے اختیاره خندا راشی. هلکه اِچه کومے ښځے تعلیم نه دے کړے. نو ولے هغه خپلو اشنایانو ته خطونه نه لیکی؟ هغه کم بختے خو چه پخپله نشی لیکلے. نو په دلال ئے لیکی. او چارو نا چار د هغه دلال جائز ناجائز مطالبات هم پوره کوی. نه به وائے چه زه ډېرے بې سنده خبرے کوم. لیکن دا حقیقت دے. چه د جاهلے او بے تعلیمه ښځے دا خیال وی. چه محبت د نفسانی خواهش پوره کولو دویم نوم دے. لیکن تعلیم یافته ښځه د محبت په قدر او قیمت پوهه شی. هغے ته معلوم شی چه محبت سومره پاکیزه او مقدسه جذبه ده. تا چه د سړو او ښځو د اوهام پرستئ. پیر پرستئ او قبر پرستئ کومے کیسے کړے دی. دا هم ټول د جهالت او بے تعلیمئ کرشمے دی. کوم وخت چه دوی کښې د تعلیم پیغمبر راشی. هله به دوی په اصلی معنو کښې خدا پرست شی.

افسوس دے. دنیا څومره ترقی اوکړه. د ګړ د پاره سائینس نوی نوی الات جوړ کړل. کوم کار چه ورومبے په لسو کلنو کښې کیدو. اوس په یو څو منټو کښې کیږی. په امریکه. انګلستان. جرمنی او نورو تعلیم یافته ملکونو کښې د مځکے نه سره زر راټوکیګی. خو یو څو نز بد قسمته پښتون ورور دے. چه د پلار نیکه یوه جغ نه پرېږدی. اګر چه زه پوهیګم چه غافلو پښتنو ته دا سے نصیحتونه کول سنډا ته رباب وهل دی. لیکن څه اوکړم چه د زړه د درده غلیګم.

بیا تا د معاشرتی ژوند ذکر کړے دے. او واقعه دا ده چه دا د پښتون قوم د ژوند یو تنګ تورږے دے. د لور خور د خرسیدو په سلسله کښې چه تا دوی له غوا میږو سره تشبیه ورکړے ده. هغه ډېره باموقع او موزونه ده. کاش که

ځوني وروڼه په دے نکته پوهه شي .

خه ! بیاګوره ! د پښتون نا وپانه ځوځے اوشی . دے ظالم ته پکار دي چه ځان تنده لنده کړي . او روپۍ جمع کړي . او د هغه په تعلیم او تربیت ئے او لګوي لیکن دے غه کوي . چه یا خو ئے دے ګنډے کړي . او یا ورله غوښ سورے کړي او دسه وزرد هوالے ورله پکښې واچوي . چه څوک ګنډه ګټ ئے پیځ شي نو یا خو غوالے سره غوږ تړ نه پریکړي . او یا هلړو په مرځ ورله کوتے کیدي . او ساره ژنده او باسي دا واقعات نن صبا ډیر کیږي .

په مړي باندے د ښځو ځان تهکول څنګه دي ؟ دد ے متعلق ما ته د رسول الله صلی الله علیه وسلم یو حدیث را یاد شو . فرمائي . چه په مړي باندے ځان تهکول د جاهلیت د زمانے رسم دے . او کومے ښځے چه دا عمل کوي . د قیامت په ورځ هغوئ به د دوزخ داور جامے اغوستے وي " . که ته غور سره اوګورے نو د مور - خور او ښځے نه سوا نورے تولے ښځے هرف د رُوجو غورځو د پاره جاړي ځما خه یاد دي . چه ما ما په مړک کښ زم اورریدل . چه یوے ښځے بے ښځے ته غلي غلي وے . " خورے ! سینه خه اد تهکوه . ځ سر په ځان او پرسوه . بیګاله به ځے کرے کرے زوجے غوړي ار خورے . او خه به تهکور شے " .

ځوني پښتانه ورونړه بهر خو سنه سپین رولي ګرزي . خو په کور کښ به ئے د سپي سومن په ځ اچولے وي . د پیغلو لونړو خوښین و په کور کښ بندیوالو ځومره خطرناک کار دے . او دد ے نه ځومره نا کاره نتیجے ختلے دي .

ځوني دے مردار رواج یو بل لوے لعنت داد بیا ته را وړے دے . چه د کنډو د بل واده حرام دے . سرے چه کنډ شي . نو بل واده خو کولے شي . لیکن ښځه که کونډه شي . نو بل واده ئے حرام دے . اخر ولے ؟ آیا ښځے بے حس و حرکته بتان دي ؟ آیا د دوي جذبات نشته ؟ آیا د دوي ژبه نشته ؟ بے ژبانه دي آیا د خپل درد وغم جذباتو اظهار به دوي حرام دے ؟ اُف دے مُردار دے او ګنده سوسایټی دے منحوس او نا کاره رواج به د څومره ځوانو ځوانو کنډو ارمانونه په خاورو کښ ګډ کړے وي . او د دے د جفا کار لاس څومره معصوم او نازک

زړونه چوړ چوړ به د لحد خوا ته پریوتي وي!

پښتون غریب دے. مفلس دے. د خپل سادر سره خپې نه غزوي. په غم ښادۍ به د هندو نه قرض روپۍ په سود واخلي. په خوارو خوارو به ئے غله راشي. دے به ورته خوشحالیږي. چه په دے کښې به هاراج د بلا په شان را نازل شي. او په سود کښې به ترې ټوله غله یوسي. اصل کښې دوی خپله ګټه سنبالولے نه شي. ځکه خو افغان خان عبدالغفار خان وائي "چه ځما د ټول ژوند مقصد دا دے چه زه پښتانه د دے قابل کړم. چه دوی چه څه ګټه اوکړي. هغه سمبال هم کړے شي". کاش که پښتانه د خپل رهنما په دے الفاظو عمل اوکړي.

د ترقۍ او ازادۍ په لاره کښې د همېش نه لوے بندش رسم ورواج دے. هغه زمانه لاړه تېره شوه. چه د رسم ورواج برخلاف په خوله خوزولو به ژبه پرېکړے شوه. بوډا او ټپ ټپ نظام مړ شو. د نوي چاق چوبند نظام دور دوره ده. دا ظالم او منحوس رواج یو سیلاب دے. چه مونږ ځان سره بهول غواړي. ته یو تعلیم یافته پښتون ئے. ما ته او وایه چه آیا ته به په دے شعر عمل اوکړے ؎ زمانه با تو نسازد تو با زمانه بساز

او د سیلاب د خوفناکو چپو په رحم به خپل ځان پرېکړے. چه کوم خوا ته هغه بهول غواړي. هغه خوا ته هم به بهیږے؟ نه! دا سخته نامردي ده. غیر انسانیت دے. بزدلي ده. نا ته بیکاردي. چه ته د علامه اقبالؒ په دے شعر عمل اوکړے

؎ زمانه با تو نسازد تو با زمانه ستیز.

او د سیلاب بے پناه چپو سره به جنګ شے. په خپلو فولادي سوکونو او بے پناه لتو د هغه مخ واړوے.

روره! پاسه! دا منحوس رسم ورواج د دنیا نه ورک کړه. دا ګنده او لعنتي سوسایټي تباه او برباده کړه. او پښتون قوم د ترقۍ هغې منزل ته اورسوه. چه د دنیا نور قومونه د پښتون د کاروان ګرد شي. نور څه او لیکم. ته هوښیار نوجوان ئے. په خپله به پوهیږے. ځما دعاګانے تاسره دي.

(ستاحمیدؔ)

ګل زمان:- څه یو ګرام دے .

غلام قادر:- چه څه ستا خوښه وي . موږ د خان د خلے نوکران یو .

ګل زمان:- چایے به څکئ او که کباب به خورئ -

محمد یعقوب:- کباب خوږ به بالکل د کار نه وي . پرون قرباني شوے ده . قصابانو حلال نه ده کړے . هغه بله ورځئ غوښې دي . ځان ولے ناجوړه کوئ .

ګل زمان:- زه چه ایږے نه زو . پوردل به ایره کښې دي . چائے به د هغه نه اوسکو . څه خو د هوره کول پکار دي .

غلام قادر:- زئ چه زو .

درے واړه د یوبل د ماسي کانو ځامن دي . سحر د ټوروټه رارون شوي دي . او د هوټل په بازارکښې روان دي . د لوئ اختر دویمه ورځ ده . ارسیل د پاره راغلي دي . درے واړه ځلمي او امزولي دي . د اختر نوے جامے اچولے دي . ګل زمان د سر نه نسواري لنګئ چاپیره کړے ده . او پکے پنړے په پېښو کړے دي . غلام قادر او محمد یعقوب څپلئ پخپرو کړے دي . او کړمے ټوپئ په سر کړے دي . ګرم څادرونه درے واړو سره دي . ګل زمان مخکښې او دا دواړه ورپسے روان دي . او په خبرو خبرو کښې اډے ته اورسیدل .

پوردل سره د یوبل پړاټور چه نوم اعظم دے . په موټر کښې ناست دے . او تاش کوي . پوردل د ګل زمان د تره ځوئے دے .

دروے وارہ :- السلام علیکم .

پوردل :- وعلیکم السلام . په خیر راغلئ . موټر ته را اوخیژئ بخښن سیټا کښې کینئ .

اعظم :- په خیر راغلئ .

ګل زمان :- خدائے دِ اوبخه . تاش کوئ . فلاش کوئ که هم پټه .

پوردل :- هم پټه کوو کور . اعظمه کټ کوه .

اعظم :- بادشاه دوه آنے .... راوړه دوه آنے .

پوردل :- غلام دوه آنے .

ګل زمان :- دے خوا کړه اعظمه زه هم لوبه کوم .

اعظم :- ګل زمانه ته مه کوه . میلمه ئے . مونږ دوه په دوه بنه یو

پوردل :- چه مال د رکوی نو ګوره ورساره .

ګل زمان :- لس خاله دره آنے .

اعظم :- دا واخله لس خاله . او رازه درے آنے .

پوردل :- تاسو لوبه کوئ زه رازم ...... هلکه دَ یو دره آنو چائے کیږدۀ

ګل زمان :- لس خاله څلور آنے .

اعظم :- رازه څلور آنے .

ګل زمان :- درکوم مړدہ . ختم خونه . دے خوا کړه لس خاله شپږ آنے

(ګل زمان یوروپئ بائلی . غلام قادر دوغوندے یعقوب نه وائی . چه دے نن بیاهرڅه بائلی - په دے کښې الک چائے راوړی)

پوردل :- غلام قادره تاسو چائے څکئ -

غلام قادر :- یعقوبه تا نه چائے نزدے دہ - پیالئ ډکوه .

(یعقوب درے پیالئ ډکه وی) غلام قادره واخله پیالئ - دا بله پیالئ ګل زمان له ورکړه .

غلام قادر :- ګل زمانه پیالئ واخله .

ګل زمان :- تاسو څکئ . زه ورته سم نه یم .

یعقوب:- هلک کوم دے. پرینږده نه به څکی. (ګل زمان خلور نیمې روپۍ بائلی. ځان ته ارخښتی ده. اورا پاڅیدلی ده. رنګ ئې زیړ او تر او تو ئې کتل)

پوردل:- هلکه صفائی کړے.

ګل زمان:- چه ماسره څلور آنې پاتې شوے. نو هغه تاش او سلوو له لاړ. وے ځم مونږ بیا یم. غلام قادر څه شه؟

پوردل:- هغه دے چلم څکی.

ګل زمان:- یعقوب خو به حال نه وائی. خودا غلام قادر به حال او وائی.

پوردل:- حال به نه وائی. زه بئ پو یه کړم.

(ګل زمان غلام قادر او محمد یعقوب د پوردل نه اجازت واخستو. او طورو نه واپس شو. ماښام کلی ته را اورسیدلو)

زینب:- سیل مو اوکړو. تش را غلئ او کمه څه مو ځان سره راوړه.

غلام قادر:- ګل زمان مونږ سره وه. مونږ خو هغه ته کتل. که هغه څه اغستی وے. نو مونږ به هم څه نه څه راوړی وو.

زینب:- هغه عاجز سره پیسے نیشته نو.

غلام قادر:- ګل زمان به وی. او پیسے به ورسره نه وی. څلور نیمه روپۍ ورسره وے. او هغه ئې هم د شیطان په ارواح ورکړے ماسی. ګوره دے جواری کوی دا څو مره بده خبره ده. ته هم ورته څه نه وائے.

زینب:- ولے ګل زمان تا جواری کړے ده. سر کوزئې دا څکه او تر او تو کوره نه بے. ماکو ځائی جواری کړی ده. دروغ وائی.

ګل زمان:- یعقوب نه تپوس اوکړه.

غلام قادر:- خیر جواری خوئې کړے ده. او ځامخ کښی کړے ده. ده د جواری نه منع کیږی. خوحال ویلو نه څه ضرورت وه.

یعقوب:- اوخ مونږ ه دروغ وایو. که رښتیا.

گل زمان :- خو تاسو را ته وے کنه . چه اړے ته څو . که اړے نه نه وے تلے . نو ما به جواری څه کوله .

زینب :- تاسو اړے سپیرے ته څله تللئ

غلام قادر :- ماسی ده وے چه اړے ته څو .

گل زمان :- زه خو د جوارئ نه ځان لرے ساتم . خو تاسو ورله بوتلم . بنده د بنده رحمٰن دے او هم شیطان دے . او غلام قادر ځما د پاره شیطان وه .

غلام قادر :- ما در ته وے چه جواری کوه ؟ هغه جوارگر خو هم درسره جواری نه کوله خو چه تا کوله نو ما به منع کوله .

گل زمان :- ځما په غوږ کښی د جواری کیږی . او زه د ورته کورم . په داسے ځائے کښی زه ځان چرته صبر ولے شم .

غلام قادر :- نو دا ځما گناه شوه ؟

زینب :- یو میاشت او شوه چه گل زمان د جوارئ نه توبه ایستلے وه . دے یو میاشت کښی هغه جواری نه ده کړے . خو چه تی تاسو ورسره شوئ . نو جواری اوکړه .

گل زمان :- هم د د جوارئ ځائ له بوتلم . او هم د چغلی او خوړه . چه تا نه څه کوره ملاویږی نو ؟

غلام قادر :- زه خو صاف دا وایم چه جواری مه کوه -

زینب :- او خ پریده . ولے ورپسے شوے یئ . چه بائلی نو خپلے پیسے بائلی . ستاسو ورسره څه کار دے .

گل زمان :- ده چه څو پورے چغلی نه وی خوړلے د د نه صبر نه کیږی . لقمان حکیم صاحب وائی چه "چغل خور خدا کا دشمن ہے" . جواری خو دومره گناه نه ده چه څومره چغلی خوړل گناه ده .

زینب :- هر یو سړے د بل گناه نه گوری . خپل تورے هیر وی . ځکه چه خپل بد د اولو منځ ئ .

غلام قادر:- نو دا تو له خفګان سوه؟

یعقوب:- پرېږده مړه. چه مورے پۀ خوشحالېږي. نو ته ئے خه کوے جوارۍ د هغه کار دے. او مور رضا ده.

غلام قادر:- ښه ده چه دوی پۀ خوشحاله دي. نو مونږ به ئې څه کوو.

زینب:- زه پۀ خوشحاله یم. زۀ خپلے پیسے بائلی. چه ستاسو پیسے بائلی نو بیا چغلی خورۍ. جاړو مړو. خدائی هم پرېنېکے وارېږه هغه عاجزے شوي يئ. هیڅ بس را بانې ئے اخلئ او رسکور کړو.

غلام قادر:- ښه ماسی اوخ مومعاف کړه. څمونږ دِ به نصوحا تو به وي مونږ به بیا حال نه وایو. (یعقوب زه بچه زو) (دواړه زئ)

سلطان محمود دَ پنج پیر

دوېم کال

دَ قوم مشرتَه

یونظرچه مونږه دَ پښتنو دَ کور یا دَ بهر په ژوندون اوړغلوو. مونږ ته دوئ کښې ډیرے خامۍ ښکاره شي. مونږه دوئ دَ بعض او دَ بے اتفاقۍ نه یک او وینو رور نه دَ کښندے کښتلو عادت دوئ سره لکه دَ سورۍ مل دے. بے خیاله او بے تدبیره دماغ د دوی په برخه دے. او دَ زړے زمانے زاړه رواجونه دَ دوئ میراث دے. دا ټول شکایتونه مونږه دَ پښتنو نه وله کوو؟ حقیقت هم دا دے چه دا ټولے خامئ پښتنو کښې شته دے. او یوازے پښتون کښې نه بلکه هر غلام قوم کښې دا مونږ وینو. دَ غلامئ یو معمولی اواز دَ سړی هر رګ سست کړی. ده نه دَ خپل قوم دَ باقي پاتے کیدو جَسْت وړک کړي. هر څوک مطلب پرست شي. او داسي مطلبي شي چه خپل ځان او قوم تړهیږشي.

نو دا ټول خامیتونه پښتنو کښې فطري نه ي. دَ دے نه سوا پښتنو کښې داسے نور ډیر ښه خاصیتونه هم شته. چه هغه ډیرو ازادو قومونو

کښې موندلې نشي . که چرې نور قومونه په خپل قومیت فخر کولې شي . نوموږ ته هم خپله پښتو ډېره کمه نه ده . که نورو قومونو کښې د قربانۍ ماده شته دې . نو پښتون د قربانۍ کښې ډېر نه ځکاري — نا — بلکه د دماغي خاصیتونه پښتنو کښې د نورو نه په لوئ میار دي . ښه دي او بخښونکي دي .

دا بله خبره ده چه پښتنو دے خاصیتونو نه د فائدې اخستو موقعه کمه موندلې ده . لکه څه رنګ چه او سپینه مزکه کښې په ټکونو کالو پټه پروت وي . دغه شان دا خاصیتونه د پښتون طبیعت کښې پټ دي . لکه څرنګ چه دا خاصیتونه د پښتون ازلي دي . دغه شانې نور قومونه هم لري . خو نورو قومونو دے نه فائده اخستې ده . او دغه شوې او سپينه د مزکې راایستې ده . او پښتون نه لا تر اوسه د دې ټولو پته نشته .

کوم ابادرنکې چه یو مکان جوړوي . هغه د دې د پاره د ځائې مصالحې او د مکان یوه فرضي نقشه خپل زړه کښې ساتي . دغه شان د قوم جوړونکي یعنې د قوم مشر اول دا فرض دي . چه د قوم د جنباتو - فطري خاصیتونو او عادتونو مطالعه اوکړي . او یوه فرضي نقشه ئې زړه کښې اوساتي . د ده زړه د قسما قسم ټوټکو کښې نوټ وي . او د هغوئې د ضرورتونو او د خیال مطابق دې خپل کار کوي .

د قوم د پاره هم دا پکار دي . چه د یو بل د زړه مطالعه اوکړي او د یو بل په خاصیتونو ځان پوئ کړي .

د ازل نه د ټولو بني آدمو فطرت یو دے . د دې کښې هیڅ رے شرمنده نه رازی . که چرې ځما زړه کښې د "باقي پاتې کیدو" خاصیت شته دے . نو د بل هم دغه خواهش دے . که چرې ځما د خپل قوم ترقي خوښه ده . دغه شان د بل هم دا خیال دے . فرق ځما او د یو آزاد انسان په مینځ کښې دا دے . چه هغه خپل فطري خاصیتونه یا خواهش په اصلي طرف استعمالوي . او زما خیال او خواهش په غلط طرف زي . دوا ړه سره ټوپ او ګوګه شته دے . خو آزاد قوم په دے کولې د خپل رورو زړه نه سورے کوي . او زما چاړه د خپل رورو په سینه رابنکې شي

اوزمادَ باقي پاتې کیږي د مسلمٰ زما دروردَ پاره زهرشي .

قوم شعرله پکاردي . چه هغه دِ دَ قوم فطري خاصیتونو . موړو ثي رواجونو او عادتونومطابق نه سیوا دي . موَلوخبرو اصلي استعمال دِ قوم ته اوښائي دَدې خراب استعمال کښې چه کومه بدي ده . هغه دِ ظاهره کړي . او بیا دي نورو قومونوسره مقابله کړي . دا دې موَلونه پسته دِ دَ انصاف په نظر ددې نو لوخبرو نتیجه قوم ته څرګنده کړي .

هدایت الله دَ معیار

توپې ټپقالي

روایت دې . چه ډاکټرخان صاحب دَ چا بیمار دَ پاره څه دا رُو تیار کړو . او کمپوډر ته ئې هدایت اوکړه . چه دَ شیشې خوزولونه پس به بیمار ته دې یو پوډر (خوراك) وخکوه . (کمپوډر دارو په بیمار اوځکول) ډاکټر صاحب (کمپوډر ته) او هو دا بیمار څه له رچکوي خوزوي . څه چل شوے دے .

کمپوډر . زمانه هیر شو . په شیشه کښې م دارو خوزولي نه وه ۱۰ او څ بیمار خوزوم . د رو به ښځېله په کښې او خوزي .

یو زل سب ډویژن صاحب بهادر دَ پټواري دکار پړتال کولو . کار ئې ډیر خراب وه . ورته غصه شو .

سب ډویژن :- چا دیوٹ تا ته پټواري مقرر کړے دے .

پټواري :- (د جیبه سند راخجوکړه او په لاس کښې ورکړو) صاحب ملاحظه کړي . په دے باندے خوستاسو دستخط سرکاري

یو هلک دسرو ښتره دَ وریځ دَ خانک ته ناست وو . چه ناساپه په ژړاشه سړي :- هلک ولے ژاړے .

هلک :- وږوږے تود ے دی .
سړی :- بل وار اد کوره چه سړے شی . نو بیا ا د خوره .
هلک :- که وار اد کړم خو د خانک ایمان به ناسوا غښتے دی. زه بیا خه وخورم .

یو ځل په مدرسه کښی انسپکټر د هلکانو امتحان اغستلو. یو هلک په حساب کښی ډیر کمزورے وه . او چه سوالونه ئے حل نه کړے شو. نو په پرچه ئے اولیکلو .

ہزاروں کی کنجی تیرے ہاتھ ہے
اگر پاس کردے تو کیا بات ہے .

انسپکټر صاحب دغه پا پرچه دا شعر اولیکلو . او فیل ئے کړلو .

کتابوں کی گٹھڑی تیرے ہاتھ تھی
اگر یاد کرتا تو کیا بات تھی

خداداد دردیم کال

د سحر منظر (انعامی نظم)

(۱) د مرغانو شور غوغا شوه چوړے شپه لاړه سحر شه (رسید رسول)
لیلیٰ زلفے کړلے شا ته په مجنون باندے اختر شه
د اسمان په شنه فضا کښی رڼائی د صبا راغله
وښوی کاروان دخوا به چه دالرے صدا راغله
دا آواز جوړه د جرس دے چه زغوږم ټنګار راغله
قافله به رروانی د کنګرو چه شپه نکاهر شه
د مرغانو شور غوغا شوه چوړے شپه لاړه سحر شه
(۲) نه غلط شوم سیل د پاره باغ ته راغله لیلا
چه غریب مجنون به بیا کوی په لوئی غم کښی مبتلا

کړی د زړونو سره او بے دغه دئ مشغولا
د مستئ خوری چور لکونو د پیو لوشړنګا هر شه
د مرغانو شور غوغا شوه جوړے شپه لاړه سحر شه

(۳) په تسبیح دخپل معبود هکی مخلوق گویا شه
که انسان دے که حیوان دے که طیور دے په ثناشه
څوک چه راټ په سرمین وکبن څوک سجده کبن په ژړا شه
هر یو ښځ په خپل خپل ژبه د خالق په ذکر سر شه
د مرغانو شور غوغا شوه جوړے شپه لاړه سحر شه

(۴) د سحر شبنم وریږی خوشبوئی غنچه وباسی
سوزګداز چه عندلیب کړی پردخوبه غنچه پاسی
د ګلاب سپرے کړنوان دے یو ښوا وبنکے پراسی
د بلبل بیا بیا راتړ نه جوړے دے خسته خاطر شه
د مرغانو شور غوغا دہ جوړے شپه لاړه سحر شه

(۵) نه خطا شوم دا د عشق د وه دغه کاروانۍ ده
دا کشش د محبت دے د زړه زړه ته رسائی ده
عشق د دوو زړونو راز یو کړی نو یکلی صفائی ده
د بلبل د درد وغمه خدلی په ګلاب خبر شه
د مرغانو شور غوغا شوه جوړے شپه لاړه سحر شه

(۶) نو لرشپه هجران زړلے نور پرستاځ کړنو نور ته
په ادب دے کړ سر خکته سلامی شو خپل دلبر ته
په یوه خپه اورد ین لے منتظری شه نظر ته
د مشرق د لوړو غرو نورانبکاره په جهان ټول شه
د مرغانو شور غوغا شوه جوړے شپه لاړه سحر شه

(۷) د را مبیل ګل چه غوړیږی جوړله عطر صنعت دے
په بیارو سترګو کوری نرګس هم په زړه ستی دے.

چہ لالہ غریب داغ کړے را تہ ښکاري غمجن دے

بیا خطاشوم جدای کښی داسی دے سوے نهٔ زړهٔ

دَ مرغانو شور غوغا شوه جوړے شپه لاړه سحرشه

محمد یوسف کاکاخیل
دَدوېم کال

هر بوکار دے دَ ښتے دے اے بیخوده مستانه
دَ خوانے لړه دړه جوش خوړے شاتولے چوکونه
غنه نازک دے خپرے کله خرن دانے کله چپ شے
قبیلې بازار دے خه موږه کړے خه عجب کړ مکړونه
راشه دَ هغه دنیا پوټکیده دے ښایسته جهان دا شي
لړه هر قسم عالفت دے عاقبت دے اعتکاف کښي
سپین فانوس نه به مشال وي نه به شمع نه پتنگ
نه به آه نه به فغان وي نه به جور نه به جفا
نے او چنگ ښو اکے دې بنے دسونے او ساسندے
دَ الفت به میکښي کړو زه میو ارته به ساقي ځے
په کښی زړه مَن مَن غونچگي لړه دنیا دغم لوے
تنهائي ده خاموشي ده صحرا چپه چپیه ده

کوے کښل دَ مجنونانو نازا دا معشوقانه
تونے وشتے ده دَ پیغلے ښوئی دهیر کړو مړدانه
دا کاسیر کاسیر کاته کوے عاشقان کوو دیوانه
دَ الفت خمارے ستړګے شوا بورے رندانه
نه ایوان نه ځی محل شته نه ځے درند اشنانه
نه غماز نه لي لسون شته نه کله نه بهانه
خوبونه به لئ يو به زه يم ته چراغ زه پروانه
تر قیامت به لئ ددوارو به دَ مینے یارانه
ستا دعشق په هر بوتاد به زه دا کاکم ترانه
دم په دم به نشه وَومه ستا دَحسن پیمانه
ناسنه ملاسنه يم په مزکه دکیکو کاشانه
زړدك ننزري او خوارے دا نه کوري روزانه

سحر نه دے جنون نه دے نه ساحر یم نه مجنون یم
حقیقت دے حکایت دے کورے نه ده فسانه

محمد اشرف مفتون
درزړو

نم د سترګو

ولے سترګے د ومره نم پیدا کوی ‖ ولے دومره درد صنم پیدا کوی
سترګے هله شی نمدارے چه زړه خوږ شی ‖ سترګے څه چه ماډګبنځم پیدا کوی
چه د عشق په درد دردمند شی هغه جاړی ‖ رنګ او بوی ګل په شبنم پیدا کوی
چه سپین شوی د چا زړونه دی په اوښکو ‖ هغوی څله جام د جم پیدا کوی
کش مکش دد ے دنیا غم خوشحالی ده ‖ د رباب سُر زیر او بم پیدا کوی
غم لګیا دے خوشحالی لټوی ځان له ‖ خوشحالی لګیا ده غم پیدا کوی
د زړه رنځ شی د دنیا واړه غمونه ‖ د عقبا غم زړه کښ د م پیدا کوی
یو خادم د جرابس وی چه مخلص وی ‖ هر دردمند له څوک مرهم پیدا کوی

خولے شوے دیرے اوازونه څکه ډیر شو۔
یوا وازهُم یو قلم پیدا کوی

خادم

د چارسدے

د جنګ منظر

(۱) ن دنیا کښ یو شورش دے نه په هر لور چه کور دے ‖ لوی را پاسی په کمزوری کړی د ظلم خاور بور دے
هر طرف ته جنګ جدل دے د جنګ غږ د هر لور دے ‖ یوا دچت کړی د بل پریوزی د اقبال د یو شکلی ستور دے

ظلم! ظلم د ظالم په غریب کیږی
ولے هیس نښته تپوس چه دا څه کیږی

(۲) په هر لور باندے چه ګورے د ګولو د زور زار دے ‖ غول فوجونه مخلبن کیږی په قطار پسے قطار دے
هر یو چه شی ور مخکښ وائی او ځم د مرګ وار دے ‖ په سینو رد رو خوئیږی ټک دوی لکه د مار دے

پہ یو ړ زسره د توپے شل پنځویش لسے لسے شي
د ځپے لاس ئے پنه نه وي چرته لرے سرلیدے شي

(۳) د سرو څه قدلښتنه دوي بے واره راغورزیږي ‖ څه په ډ زسره مړه کیږي څه له خاورو کښې لغړیږي
اجل فرښتے هم ئي په مړکونو ستړے کیږي ‖ چه ورانے دېل کور غوارړي هغه خپل تل ورانیږي

په منتها کښې پلارا و مورے اولاده غریبان شي
په زرګونو کندے رنډے په لکهونو یتیمان شي

(۴) لوے لوے جهازونه یو ته لرے الوزیږي ‖ وار په وار د ډیرا وچته غټ بمونه راغورزیږي
ښا یسته ښکلے ښارونه په بمونو راغورزیږي ‖ ځکلے ځکلے بلډنګونه سره لمبو ساره سوزیږي

مور د خوږے نه مخکښې کیږي ځوی د پلار نه مخکښې کیږي
هر یو په منډه منډه شکلته زمکه کښې پټیږي

(۵) یو د امن وامان ملک وے په ارام وے د جنګونو ‖ چرته لرے وے یوازے پروت په مینځ کښې د سیندونو
ناخبره وے د نو پو نو. جهازونو. د بمونو ‖ نه چه ځان وي تیار کړے خه د پاره د جنګونو

چرته داسے یو دنیا وے د ځانه نا خبره
د اشنا درد غم په زړه کښې مشغلا وي سراسره

(نوربیا)

عبد الرحمن کیف
د اول کال

داسلامي درسګاه د پوښته

اشنانه

ستا د زلفو تماشي نه! نور ولاړ پوره نه اسمانکښې ‖ کله کله قمر کوري د شپے تا ته په عنوان کښې
ستا د حسن تماشي نه! سر وے وبیمه ولاړ پے ‖ نځتر هم د غزه په ساکښې اندازه کړي عجب شان کښې
نسکور پروت په مزکه تا نه! د کوډ کړے بوټي هسي ‖ د ډ پرشرمه کتے نشي! ستا د حسن د امان کښې
ستا د حسن رعب هسي! په ما پروت له ورایه ‖ چه طاقت د کتو تا نه اخر هیڅ نه وینه ځان کښې

دشپې ستا په تصور کښې! یم د دردې ستا خیال کښې ‖ بیا اشوې جور ستا غم له! یم صنمه جهان کښې

ستا نظر دے که نشتر دے! چه م زخم د زړه بېړدے ‖ اوخے د ږولی په جوار م د ریسی په ډیر ارمان کښې

روح م تا نه په کتو دے! هسے رنګ یم په جهان کښې

لکه شاخ کښې اوېراند ه! زېړه پاڼه وي خزان کښې

د جانبه د صاحبزاده عبدالباری قاسمی

فاضل دیوبند باشنده

عمرزئ

هسے نه چه هېر د شم

ورور ته -۱-

۱ یاد ساته نقریر څما ‖ تل لوله تحریر څما ‖ اوګوره تصویر څما

هسے نه چه هیر د شم

۲ ستا تصویر له ماسره ‖ یاد د څما سا سره ‖ یا د م کړه دعا سره

هسے نه چه هیر د شم

۳ ځان له نا سته چرته ئ ‖ خیال د خلکو پرے نۀ ‖ پورته خانه پړنی ے

هسے نه چه هیر د شم

مور ته -۲-

۴ تا سره څما مینه ‖ ما سره د ستا مینه ‖ رب لرم سره جدا مینه

هسے نه چه هیر د شم

۵ پاتے شو وطن له ما ‖ ګل بهار چمن له ما ‖ څه غواړے زمن له ما

هسے نه چه هیر د شم

۶ پاؤ یمه که سیری م څه! ‖ تا د پاره شیر یم څه ‖ یاد م کاکه هیر یم څه

هسے نه چه هیر د شم

۷ مینه محبت څما ‖ تا سره الفت څما ‖ دومره خجالت څما

هسے نه چه هیر د شم

۸ څه عجب خمار لري ‖ سترګو کښې تبار لري ‖ زلفے تار په تار لري

هسې نه چه هیر دِ شم

۹ زلفې دې ماران وینم داسې هزاران وینم ځې په کښې تاباڼ وینم

بل چانه هسې نه چه هیر دِ شم

۱۰ دل د ماغ مې تالوي شکل دِ ز بیبا لیدي ګنج دِ بهالوي

هسې نه چه هیر دِ شم

۱۱ صابر دولس کالهٔ شو خلق خبر له حاله شو بند زبان مې قاله شو

هسې نه چه هیر دِ شم

۱۲ زهٔ چه په یُل تیر دِ شم پټ په خاورو زیر دِ شم غلې څهٔ چه دهیر دِ شم

هسې نه چه هیر دِ شم

۱۳ څهٔ فیروز یقین لرم نقش په جبین لرم تا بدلې د چین لرم

هسې نه چه هیر دِ شم

ارباب محمدٔ فیروز خاڼ

د لنډي

دَخوږه غاړه

خالد او ساجد دوه دوستان دي. خوږه په غاړه په یو غونډۍ ناست دي خبرې کوي.

خالد څهٔ خپه خوندې معلومیږي ۔

خالد :۔ دا هغه ځائې دې چه کوم ته زهٔ هره ورځ راځم ۔ او تقریبًا څه

ډیره حصه ورځې دلته تیروم ۔

ساجد:۔ زهٔ خو په دې نه پوهیږم چه تا دې کار وکښې څهٔ لیدلي دي

نه په کښې دَ کیناستوسم ځائې شته ۔ او نه په کښې چرته سورے

خالد :۔ دا خو ته وائې ۔ خُما دَ زړهٔ نه تپوس اوکړهٔ ۔ چه هغه څهٔ وائي

یولوئې اسویلے کوي ۔ سه

نصیبه او سوزې اېرے شې ؛ ننه یه مات شي چه په تا څهٔ لیکلي دینه

ساجن:- خالد دا سے سوراسویلے دِ ولے اوکړه . ستا دِ په خدائ قسم
وی . چه رښتیا رښتیا او وایه څه چل دے .

خالد:- سړه ده که د پرشوق دِ کیږی نو غوږ اونیسه . یو دوه کاله
کیږی چه دے پورے کلی کښی حماد زه اوسیدو . حماد ورړه کوالی ندمایانو
نیو لوساره شوق وُو . دے د پاره زه به چهیانو کښی همیشه د لندا تلم د خوړ
په ډنډ کښی به مې دام واچولو . او بیا به ورته په غاړه ناست وم . ورځو
کښی یو ورځ وه . چه ما دام اچولے او په غوږنی ئ ناست وم . چه یوه جینۍ
منګے په سر خوړ ته او په کولو د پاره راغله . دا جینۍ څه ډېره ښائسته وه
چا . رښتیا ویلی دی . سه

مخ یې زیارت خالې فقیر دی
داړوئ ورېږي پرے چهنډی ولاړ دینه

په ړومبی نظر را باندے څه چل اوشو . مګر ځان مې قابو کښی اوساتو . ما
ماهیان په دام کښی نیوه . خو دا سی رانه معلومه شوه . چه زه چا په دام
کښی ګیر کړم . دام مې او ویستو . او د ځان فکر واغښتم . د کور لاره مې
اونیوه . په لاره مې وے چه بیا به چرے هم خوړ ته نه زم . مګر زړه مې صبر نه شو
بیا دام مې واخست او خوړ په لوروان شوم . هلته کښی ناست وم . څه کورم چه
هغه جینۍ د چاموټکه په سر بیا راغله . غرمه شوه هیڅ چاے خلاصی کړے او کور ته
نه روانے شوے . مګر هغے ته لا څه زړه کے پاتی وُو . زه رو رو ګوړ ته راکوز شوم
هغے سره په چل ول سره د خبرو نه پس معلومه شوه . چه هغه د کلی د ملک لورده
او نوم ئے سلیمه دے .

او ځ حما دا معمول شو چه زه به ضرور بالضرور هره ورځ د ماهیانو
په بهانه خوړ ته راتلم . او څه ساعت به مې په خوشئ تیر کړه . خو د خوشحالۍ ورځې
د شماروی . زر ختمې شوے . کلی کښی حما او د سلیمې د مینې خبره ګډه شوه . یو خوا
سلیمې بهر ته راوتل بند کړل . بل خوا ملک حما په تره درخواست اوکړو . او هغه
هلته نه بدل شو . دغسے حماد امید ونو هغه پنګه خوره وره شوه . خو بیا هم چه

به ګله ګله موقع بیامومنه. نو زه به د لته راغلم. مګر هغه ورځ شوه او دا ورځ شوه چه ما بیا هغه او نه لیده.

په یارانه خو دِ پوے نه شوم
په حبدائی دِ لکه مانکه او به شومه

ځما خیال وُو چه شاید د سلیمه په زړه به هم د زړو واقعاتو یو چپه راشي او هغه به د دے ځائے په راتلو مجبوره کړی. مګر افسوس!

د غم دریاب دغم کشتئ د ه
دغم چپے پکښ دهم چه پورے زمه

خالد چپ دے. مګر د خیالاتو په سمندر کښې ډوب دے. د ساجد به آواز هغه راویخ شی. او دوئ دواړه بیا رروان شی.

عبدالرؤف نوشهروی
بی. ایس سی کلاس

آه له کومے ځے راغلم چرته زمه. دا دوه ورځے لنډ سفر د دنیا څه دے؟
آے کالجه .... اے د انسانی ترقیٔ رازدانه ...... اے د روحانیت مشاله ...... اے د علم بے پناه سمندره ...... اے د خوږ ژوند ون مسکنه .. زه له تاروان یم. خبر نه یم چه کوم خوا .... یوغیر انسانی طاقت ما ځان ته راکاږی
مایه دروغ دروغ ګنړله؛ د آشناکړه په رښتنیا د ملک زینه
لیکن زه ستا نه نشم تلے. ما دلته ډیرے ښے شپے ورځے تیرے کړے دی. ځما روح او زړه دلته په آرام وُو. ما د خپل ژوندون یوه حصه دلته په سکون تیره کړے ده. ځما شپے لوئ وے. لیکن بے آرام نه. زه له دے ځائے نه نشم تلے. ستا هر څیز به ما ته یادیږی ..... د کالج په منځ کښې فواره ..... د بناتاتی باغ واړه واړه بوټی .... او ستا د جماعت د ګے او لوړے منارے ... دا زه کله هیر ولے شم

دا خوښه خیال نه دے چه زه به ئې د دماغ نه لرے کړم. دا خوشحالي ځاے نه دی. چه زه به ئې او باسم. که زه هر څو مره خپله ښمن شو کوم. او که هر رنګه خپل مجروح زړه له تسله ورکوم. ولے ځما د زړه هغه خوشي نشته. ځما د روح هغه اطمینان نشته. ځکه زه نور نه شم حصار بیدے. چه ځما په ذمه یو لوئے کار دے.. جنګ... چه د انساني ژوند ورن آخري منزل دے. ټول خلق به د یو اژدها غوندے راکاږي. ځما قدمونه هم اوچت شوے دی. افسوس چه له دے ځا ئے نه دا ټول ښیزو نه ځان سره یوسم. ولے خو زه آواز ځان سره ژبه نشي وړ ورے. درباب اوازسره نارونه نه ځي. شاهین چه د آسمانونو سیل ته ځي نو جالا ته پاتے وی.

ما ته د حق اسئ به کړ وصبر تکار دے
ځما تلل ضرور دی. زه روان یم
حق اله دے تل اباد لره.

ولی الله خان

نور د لوئے ورځې سفر ئے کولو نه پس د مغرب طرف ته د آرام د پاره روان شو. او د ګلابي رنګ شعلے ئې په صفحه د مځکے خورے ورے کړے.

زمیندار د لوئے ورځے کار نه ستړے ستومانه شو. او د ماښام په انتظار کښي وه. چه نور پټ یوت. د مارغانو شور وشر شه. هر طرف ته د الله اکبر نعرے بلندے شوے. زمیندار وقلبي پریخودے. او د کلي پلوئے رخ اوکړو او د خپلو بنګو په ارمان وو. دی ورځو کښې سپوږمئ په بهار کښي وه یعني شعلے ئے هر طرف غورزولے وه. چه د ستړو زړونو درا وه. ټول زمیندار په کلي کښی داخل شو. په دوی کښی یو چه نوم ئے "بادام ګل" کاکا وو. هغه هم کورته په ډیر ارمان روان وو. د دوئ په چم کښي ن واده وو. او دغه هلک

د دې د ځوانۍ هڅوونکي ورو . شور او شر وو . هلکانو جینکو ارغواني ډنګ جامې درېدلې کړې وې . خوشحال وخرم هر طرف ته ګرزېدل . داچه ځه او لیده . نو په زړه کښې د غم تیر څخه شه . او په دلسوز آه وویل . چه افسوس ډېر غریب یم . په دې خیال کښې مستغرق په کور ننه ووت . د خان ګل مور ترې د غوایانو د ترلو د پاره ډا پا سیدله . ولې ډېره د ګیره معلومیدله خاوند ورته اواز کړ د خوشحالي پروای پراو نه کړه . غریب مجبور شو او پخپله ځه واښه غوایانو ته واچوه . ورغلو د خفګان او د نه پاسیدو سوس ئې تراو کړو . په غصه کښې ئې جواب ورکړ چه ورک ته شه . او ورک دې قلبه . څوارب دغه یو ځوئې دې . او تر او سه د هغه د واده خوشحالي موهم ونه لیده . نه او کوره د ده هڅو لو تولو وادو نه اوکړه . او موږ هم د عنی بی نصیب پاتې یو . دې پوې شو چه دا هم په دې خیال کښې غرقا به ده . ورته ئې په ډېرې نرمۍ سره جواب ورکړو . چه کم عقلې ښځې غریبان یو . که نصیب ئې وی هر څه به اوشی . صابر کوه . د خان ګل مور په ژړا شوه . چه بس نور صبر نشی . دې غریب هم مجبور شو . او د سترګو نه ئې د اسکو باران شروع شو

او بیائې ورته وویل چه خفګان مه کوه . څه چل به اوځ اوکړو . ولې د پیسو درک نشته . ښځې ورته اوویل چه فی الحال دا قلبه خرڅه کړه . او پیځې به هم په فلانی سپینګه کانړه کړو . په ډېرلږ سود بانیه به ئې رضا کړو . ولې چه موږه سره ډېر سنه دې . بادام ګل کاکا ډېرې بهانې اوکړې . لیکن څه ئې جوړ نه شوه . او دا مشهوره هم ده چه د ښځو د جادو په مخ کښې د نر جادو څه کار نشی کولې .

بادام ګل کاکا ورته وویل . چه ښه ده . ته یو د سبا کور جینځ سپې کوه . چه دا ئې تر غوږ شو نو ډېره خوشحاله شوه . ټوله شپه خوب نه ورتلو . چه کله به صبا شی . چه فلانی کره لاړه شمه . او د دوستئ ورته ووایم . سحر شو بادام ګل کاکا قلبه یو تله . او د خان ګل مور وخت د کور او وته . یو نږدې رشته دار کره لاړه . خیر څه رسم ورواج چه وه هغه

وشو ، بادام ګل کا کابیچې کا نړه کړ د . غوایانو نه سره خان خلاص کړ د. او د واده بند وبست کښې مشغول شو . لږ و ورځو کښې هم ښه تیار شو . نیته ئې مقرره کړه . په مقرره شوی ورځ جنج لاړلو . او د ولئ ئې راوړه .

څه موده پس دوئ دواړه غریبانان شول . د اد بولا س ئې ندرسیدل بیچې تړ نه پنډ د پر سود کښې ونیوه . نور څه ورک نه وه . بادام ګل کا کا په سپینه ګیره مونږ دورشو . او د ځوئے هم دغه حال وه . زمانه پرے په دی حالت تیره شوه . لیکن د بدقسمتۍ لا تر اوسه پورے په زړه نه وه سوړ شوی . یوه ورځ نقدیری د خانګل د خپلے ښځے سره څه خبره وه چه بوسرپی وړ ور ته آواز کړه . چه کمبخته ښځے سره څه عیش کوے . او پردے قرض دے هیر دے . دے ډیر په غصه شو . او ښځه ئې ډیره او وهله . چه داټول ستا د سوکا رونه دی . خانګل بیرته لاړو . او ښځه ئې مړ وره خپل پلار کره لاړه . ډیرے جرګے پرے اوکړے لیکن راضی نه شوه . په دے حالت دوه کاله ووتل . د خرڅ د خوراک دعوه ئې خان ګل باندے اوکړه . نه ورسره پیسه وه چه ورکړی او نه څه نور درک .

اخو مجسټریټ مجبور شو او جیل خانے ته ئې واستوه . اوس جیل خانه کښې پروت کړ وغړه وی ، او د اسمان ستورے شماری .

شاکو الله محمد نور

د خلورم کال زراعت

(۱) ما ته و لے ژړ و ے ګناه شاکره	زلی داچه شوم میئن دا م حطا کړه
(۲) ما په عشق کښې دا دروغ کیږد ے ښتیا شو	چه د اعشق په دم په ټول جهان رسوا کړه
(۳) ستا په عشق کښې د مجنو نه سے تیر	ندلا شفقے د ا دا ئ تا د ما ا با کړه
(۴) لیونے یم ستا په عشق کښې باور اوکړه	د وصال پیاله د ما ندمیا کړه

(۵) لیونی اسنوګند نه شي کړے له روغو ... څکه خوښه م استوګنه په بیدیا کړه

(۶) نصیحت او عاشقي دي سره لرې ... څوک په عشق کښې به قبول دا دنیا کړه

(۷) قناعت د درویشانو طریقه ده ... که ملنګ ئے د عشق ځان کښې پیدا کړه

اے شاکره بے صبري درسره مل ده
کښې پښه په ځان سره جرا کړه

شاکر الله محمند

پروازِ خیال

(۱) ولے ساتړکے دومره نم پیدا کوی ... چه عاشق له د زړه غم پیدا کوی

(۲) داکوګل م د فراق په اور لمبه شو ... تور لوګے ژکه هر دم پیدا کوی

(۳) چه پرهر د سلوکالو پرغیږ ی ... څوک نظر د یار مرهم پیدا کوی

(۴) تورے زلفے په سپین مخ چه یا خورے کړی ... په محفل کښې یو تورتم پیدا کوی

(۵) ناز اداد دلربا نه ده بلا ده ... رقیبان په هر قدم پیدا کوی

(۶) د دلدار د هغے سا نه قربانیږه ... چه سینه کښې زیر و بم پیدا کوی

(۷) سلیمان نن پرستش د خپل صنم کړی
بل به څه ځان له حرم پیدا کوی

یادګیرنه

س. سلمان متعلم بی اے کلاس

نوټ :- مضمون لیکونکے صاحبانو نه دا درخواست دے . چه هغوئ دے د کاغذ په یو مخ او خوشخط مضمون رالیږی. او ورسره دے دے ده خیال هم اوساتی . چه رسم الخط درست وی. هغه که د یو تکی لیکلو کښې ئے شک وی نو هغه هم دِ داسی لیکی. لکه چه خویئے دهغے عام تلفظ کیږی - د دے دپاره چه هغه یو مضمون به واپس نشی ورکړے خواه هغه منتخب شی یا د ردی نظر شی (مدیر)

یو لیونی شاعر

د غریبې طبقې یو قوي سرګرم کارکن د اصلاحي انجمن افاغنه ممبر ښه صیاد خو د
وخت لیونی شوی دی. په براچینې کښې لیونو سره ستنې پورې په زنځیر
تړلې ولاړ وو. زه یو ورځ د سوکسانو سره ننداره له ورغلم. ړومبی
خوږم خیال کولو هسې د لیونو په شان بې مطلبه بکواس کوي. مګر څه وخت
ور رسېدم نو بیا معلومه شوه چه څوک تعلیم یافته شاعر دی. دماغي توازن
قائم نه دی. خو شعرونه یې د حقیقت آئینه ده. د هغه د پاره زه د هغه
شعرونه چه څو مې ماته یاد دي. ناظرینو ته پیش کوم:

د لیونۍ موږ کښې یو هلک ته خیال شو او تپوس تې نه او کړه
ګله! ته سبق وایې - رفیق په جواب کښې ورته او کړل. لیونی څه
وخت خاموش شو. ګنګنړ کول بیا ګویا شو-

په زرګونو روپۍ تا خرڅ کړې طالبه ستا مطلب صرف د یو ړنده زده کول دي
د آثار به کړه زده شاید نو کړې نو ربه څه کړې ستا په کونه ځان سنبال دي
پلار دې کاکا سره هو بله تا نه کیږي او به خوړ چارې ګلونه تا ته ګټل دي
د فائدې څیزونه یو جوړ ولې نشې هر حاجت له د بل در ته ستا کتل دي
د دستکارو قومو ځکه بست نکړې تجربه ستا د فیشن فقط ساتل دي
ګټه کولې نشې خرڅ به کړې د کومه خزانه دې جوړه په پوله خوځول دي

بیا یو ساعت خاموش شو. ټک ساعت پس بیا ګویا شو

خو ستا داخیال دی تعلیم کوونه پس به لیډر شې خلق به
ووټونه درکړي. ته به د کونسل ممبر شې. د ممبرۍ تنخواه او د کونسل
کرسۍ تا له کافي دي. خو خلق او څه پوه دي. د هر سړي دا خیال دی او
ماشومان وائی:-

پیخم دے دَ کونسل کرسیٔ لیسخو لیه — ړکے حبیب نا خلے قدم پو بے دړهه
مداری یے سنبھے دَ پا سه کښے یی ه کړے — ماته خلے والیٔ چه ستا دعمد مرمنه
خپے دے کیخولے ځما په سر اوچت شوے — قوم دے هیر کړو شوے نزدے نرکنګهه
تا زما فائده چرے نه ده نظر کښ — ستا کونسل او په اختیار کښ اوس هرشو

لیونے بیا خاموش شو او څه ساعت پس .... لیونړه! ستا خیال دے پښتون قوم جاهل دے کړ یو سرمایه دار لیدنه یو ځل کونسل کښ څه دَ فائدے کار اونکړے شی. نو بل سرمایه دار دے دَ غریبو خواهشاتو سره لوبے شروع کړی. دَ دوړمې لیدنے دے به والیٔ کامیاب به شی .... ها ها ها... خر دے پیخم

خیر صلاح کښ وړاندے قوم نه زے لیدړے — چه چرب غپا شی په دوړبانے دے نه وینه
یو ځل ا سره دننه جیل کښ نه شوے — خیر صلاح کښ کړے دعوه مشر دے یمه
مشری ده په خپل مت که په دولت کښ — فلسفه دَ لیدړئ ده پوهه نه یمه
کړه غریبو خواهشاتو سره لوبے — زه پاګل یم لیونے یم غریب یمه

تا نه خوښه ځل اودیل پښتون کښ رواجی اصلاح اوکړه. مګو نه خپله لیدړے اخستے یے. ستا په قوم څه. خو یاد لره چه قوم د نوی شګے پشان دانه دانه دی. دَ شیدو دَ ختکی په شان رنګ خرخولو ته لیدړی نه والیٔ . . . .
او تر کومے په تعلیمی او اصلاحی سینمو دے یو ځائے کړے نه وی ځان له تر قلعه او بنګله جوړولے نه شے. ستا دخبرو مناتو قوم له څه ورکولے شی .... بازار کښ ستا خو سندے پښتنے خپل ځان په کرایه ورکیٔ. په کلی کلی کوڅه کښ دَ جوارئ اډے دی اجرتی قتلونه عام دی. مارک. برسند. تهر. او نیم پته. یو هم دَ شپی په ارام خوب کولے نه شی. ولے دَ په ایکمار دویرے. نه بلړ دَ حکومت په سر تپیا خیال اوکړه ستا خپله کمزوری ده. اصلاحی کمزوری او خود غرضی. خود غرضی یم دے. متعدی مرض دے. ستا خود غرض کیں لو خلق خود غرض کړه.

زه لیونے یم. په زنځیر تړلے.. تر روغ... دے کښ ناګهانه یو شیطان هلک دا غریب په کنهړ اوویشته. لیونے په کنځلو سرشو

سید سلطان محمود
شعبۂ علم الحیوانات

دَ پښتو په شاعرئ کښې دَ پښتو اخلاقي فلسفه

نوټ:- دا مضمون ما دَ پېښاور آل انډیا ریډیو سټېشن دَ پاره لیکلې او اورلې وو. اوس یې دَ هغه سټېشن دَ منتظمانو په اجازت سره شایع کوم. او لږ کوټه تبدیلي هم په کښې کوم.

بادی النظر کښې دا معلومیږي چه دا عُنوان غلط دے. ځکه چه دا اعتراض پیدا کیدے شي. چه که چرته دیو قوم دَ ژندګئ یو خاص پهلو زیر بحث وي. نو دَ هغے قوم په ټولو ادبیاتو کښې (یعني په نثر او نظم دواړو کښې) لټول پکار دي. صرف دَ شاعرۍ تخصیص څه معني نه لري. لیکن زه تا سره نه عرض کول غواړم. چه زما په خیال کښې دا عُنوان باوجود دَ دے اعتراض غلط نه دے. ولے چه دَ پښتو دَ ژبے ادبي ذخیره تر ډیره حده پورے محض تر شعر شاعرۍ پورے محدود دَ ده. نثر کښې په اصلي معنوں کښې نه دے پیدا شوے. او که بالفرض څه قدرے پیدا شوے هُم وي نو هغه ذیات نه زیات نامکمل او نیم کوړي حالت کښې دے. یا دَ مکمل کیدو په دوران کښې دے. پوره کامل شوے نه دے.

ولے دَ پښتو په ژبه کښې نثر نشته او شعر شته؟ ددے وجه داده چه هر یو قوم په ابتدائي حالت کښې (یعني په هغه وخت کښې چه دَ دوي علم، تهذیب او تمدن دَ کمال درجے ته نه وي رسیدلے) دخپلو خیالاتو۔ دَ احساساتو او دَ جذباتو تصویر صرف په نظم کښې راکاږي. دَ نثر استعمال لا نه کوي. نثر په کښې هاله پیدا شي چه دوئ رو رو صاحب دعلم او دَ کمال وګرزي. تهذیب او تمدن لئ ټولے ابتدائي مرحلے طے کړي. او دَ علم او دَ فن چرچه په کښې هر طرف ته خوره او عام شي.

اوس چونکه چه دَ پښتو تهذیب او تمدن لا ابتدائي حالت کښې دئ. او علمي فطرت لئ لاکمال درجے ته نه دے رسیدلے. لهذا ددوئ ادب في الحال صرف شعر شاعري

پورے محدود دے. نثر کښې لا په اصلی معنون کښې نه دے پیدا شوے.

لیکن آخر دا شعر څه لګه مخکې پیدا شی او نثر وروستو؟ شعر لیکل خو د نثر په مقابله کښې ډیر ګران کار دے. نو آخر څه لګه هر ادب په ابتدائی حالت کښې اول د ګران شی (نظم) نه شروع کیګی. او بیا د آسان شی (نثر) استعمال کوی؟ دد دے وجه هر څه چه وی. فی الحال دا نقطه زیر بحث نه ده. واقعه دا ضرور ده چه د هر ادب په ابتدائی حالت کښې اول شعر پیدا کیږی او بیا نثر. نو لنډه خبره دا ده چه د پښتنو کل تهذیب او تمدن لا په ابتدائی حالت کښې دے لهذا د دوی ادب صرف تر شاعری پورے محدود دے. نثر کښې لا نه دے پیدا شوے. او دغه وجه ده چه مونږه د دوی فلسفۀ اخلاق د دوی په "شاعرئ" کښې تلاش کوو. په نثر کښې بجا نه لټوو.

د هر څه روښانه چه مونږ پدے موضوع باندې بحث اوکو بکار دی چه مونږ لږه غوندې مختصراً سرسری تشریح وکړو. چه "شاعری" څه ته وائی. "اخلاق" څه شی دی. او "فلسفه" څه بلا ده

(۱) "شاعری" په ډیرو فنونِ لطیفه وُکښې یو "فن" دی. او س سوال دا دے چه فن څه ته وائی. "فن" د انسانی فطرت یعنې د انسان د خیالاتو او د جذباتو د اظهار هغې طریقې ته وائی. چه هغه طریقه د اظهار نورو انسانانو ته "نیما نُستله" سنکاره شی. او د هغې په ذریعه د هغوئ جذباتو ته یو قسم "خوشحالی" ورسی. دا طریقۀ اظهار د هر یو هنر خپل خپل وی. چنانچه "رقص کول" (ګډېدل) د لاسو پښو د خوزیدو په یو خاص ترکیب او یو خاص وزن باندې د انسان د فطرت اظهار کوی. "مجلسی" د آواز په اوچت او لاندې او په "تاوُ راتاوُ" کښې یو خاص موافقت پیدا کولو باندې دا مقصود حاصلوی او "شاعری" ی د لفظونو په داسې یو ساخت او ترکیب باندې اظهار کوی. چه هغه کښې قافیه بندی او سجع ملحوظ ساتلے شوے وی. لنډه خبره دا ده چه دا کومه تبصره چه مونږه د مطلق شاعرئ بابت کښې وکړه. دا هم هغه او مره د پښتو په شاعری حاوی کیږی. لکه چه د اُردو. انګریزی. جرمنی. فرانسیسی وغیره ژبو په شاعری حاوی ده. د خوشحال خان خټک او د رحمان بابا په شاعرئ کښې هم دومره کمال دے چه کوم د "اقبال". د "فیضی". د "ګویټی". او د "شکسپیر" وغیره په شاعری کښې دی

(۲) دویم سوال دا دے چه "اخلاق" څه ته وائی - اخلاق د انسان عمل سره تعلق لري - او بالخصوص هغه عمل سره چه هغه پس له غور و فکر نه کامله اراده بانده شوے وی - نه هغه عمل چه بغیر څوک د ارادے او بغیر څوک د شعور له موږ نه صادر شي - مثلاً که زه یے شوقیه یو کاږے اوچت کړم او په هوا کښي اوولم - او د هغه په ګذار یو ماشوم خوږ شي او یو ماد یالرم هم مړ شي - نو څما دا اولی عمل څه بدی نه ده - او دویم عمل څه نیکی نه ده - ځکه چه ما دا دواړه کارونه په اراده نه دی کړے - بلکه اتفاقاً ما نه صادر شو - لنډه ي دا چه اخلاق د انسان نیک او بد عمل سره تعلق لري - او د عمل نیکی یا بدی په اراده منحصره ده

(۳) دریم بحث دا دے چه "فلسفه" څه بلا ده - فلسفه هغه علم دے چه هغه د عالم او په عالم چه څه څیزونه دی - د هغے بنیادی حقیقت معلوم کړي - جرته يي نوزی او یو خاص اصول ته ورسی او بیا د دے اصولو په مینځ کښ یو خاص نسبت او رشته قائمه کړي - او اخر کار یوه کُلی نقشه د دے عالم په خپل ذهن کښ جوړه کړي - د فلسفے په لږ الفاظو کښ خلاصه دا ده چه دا سے سوالونه پوره ته کړي چه زه څه شي یم ؟ څما اصلی فطرت څه دے ؟ د چرته نه راغلے یم ؟ چرته به ځم ؟ او بیا دا عالم څه شي دے ؟ ایا د دے بنیادی حقیقت "ماده" ده ؟ که زندګی ؟ او که روح ؟ او که د دے ټولو نه اوچت او برتر ذاتِ مقدس دے چه ورته خدائ وائی ؟ بیا دا چه ایا دے عالم کښ څه خاص نظام سا تلے شوے دے او که نه یو سره نزول سره پورے ایا توي اولی ترتیبی ده - ایا څما په دے عالم کښ څه کار دے او زه کوم یو مقصود انجام کولو د پاره راغلے یم ؟ او که زه دا خپل کار په دے عالم کښ پوره سرته ورسوم نو په اخرت کښ د څه توقع لرلی شم ؟ د دے ټولو سوالاتو نه دا ظاهر یږی چه دا ټولے بنیادی مسئلے دی - دے کښ څوګ د روح نسبتی دے - څو پورے چه موږ دا سوالونه نه دی حل کړے څوګ زړه او روح به همیشه نا قلاره او پریشان وی که موږ غواړو او که نه غواړو - خواه مخواه به موږ په دے مسئلو سوچ کوو دا څوګ د فطرت تقاضا ده - او هم دغه وجه ده چه یو جاهل نا لوستي او یو دانا عالم دواړه دا مسئلے پورته کوی - او دواړه په خپله خپله طریقه کوشش کوی چه د ا

مسائل حل کړي. صرف فرق دا دے چه عالم يې عالمانه او نا قدانه طريقه باندې د حل کولو کوشش کوي. او جاهل يا عامي سړے يې په ټوکو ټکو او فرضي خبرو ساړه جواب ورکوي.

حاصل د کلام دا دے چه چونکه دا بنيادي مسئلے دي نو لهذا که موږ ته د دے جوابونه معلوم شي نو موږ ته به هر څه معلوم شي. موږ نه به هيڅ پټ پاتے نه شي. هر څه به را ته ښکاره او واضح شي. دے ته وائي فلسفه. اوس يو بل سوال دا پيدا کيږي چه هر کله موږ ته معلومه شوه چه اخلاق دا شئ دے. او فلسفه دے ته وائي نو دا "فلسفه اخلاق" يې لا څه شئ دے.

(۴) "فلسفهٔ اخلاق" يا اخلاقيات دا انسان د عملونو پيچراو بېخ کښې ښوئيلو ته وائي او د دے معلومولو ته وائي چه د انسان کوم يو عمل د ده د انسانيت شايان شان دے. او کوم عمل يې د غير انسانيت. له کوم يو عمل نه يې انسانيت ظاهريږي او کوم نه يې بهيميت (حيوانيت) کوم يو عمل يې نيک دي او کوم يې بد دے. بالفاظ ديګر د فلسفهٔ اخلاق دا کار دے چه هغه وجوهات او هغه بنيادي اصول معلوم کړي چه د هغے په بنا باندې موږ دا انسان يو عمل ته ښه وېلے شو. او بل ته بد. د دے اصول د معلومولو د پاره د ډيرو ملکونو فلسفه دانو د دے زده کاله راسے ډير لوي تحقيق او غور و فکر کړے دے. څوک وائي هغه عمل ښه دے چه د هغه څه حاصل او نتيجه وي. او دا حاصل او نتيجه د هغه عمل کوونکي د پاره د خوشحالي موجب وي. څوک وائي هغه عمل ښه دے چه د هغه نتيجه د قوم او د سوسائټي خوشحالي وي. يا هغے کښې د زيږه خوشحالي د ډير و خلقو وي. څوک وائي هغه عمل ښه دے چه د هغے نتيجه د خدائے پاک رضامندي وي. او بيا خدائے پاک د هغے په عوض کښې د هغه عمل کوونکي ته خوشحالي ورکوي. اوس که موږ د دے ټولو غور و فکر و نو موږ د دے نتيجے ته رسو چه دا ټولے نظرے د يو قسم دي. د دے ټولو نظريو حاصل د انسان "خوشحالي" ده (بالواسطه يا بلاواسطه) لهذا اوس سوال دا دے چه آيا دا خوشحالي او اخلاق حقيقت کښې يو شي دے او يا په خوشحالئ حاصلولو کښې د انسان اخلاق او نيکي ظاهريږي؟ د دے سوال جواب نفي کښې دے دا دواړه بالکل جدا جدا څيزونه دي. د دوئ خپل مينځ کښې هيڅ نسبت نشته. خوشحالي خوشحالي ده. او اخلاق اخلاق دي. بلکه د

دوئ بنیادی حقیقت او سرچشمه هم بیله بیله ده . خوشحالی د انسان جذباتو سره
تعلق لري او اخلاق یې عقل او شعور سره .

دا څنګه دوه جدا څیزونه دی .؟ د دے خبرے دلائل صریح او واضح
الفاظو کښې مفصله ذیل دی .

د انسان په فطرت کښې دوه متضاد پیدائشي خاصیتونه موجود دی یو
طرف ته دده په فطرت کښې عقل او شعور او انسانیت دے . او بل طرف په کښې
بهیمیت (حیوانیت یا ځناور توب) دے . دا دواړه د ده د فطرت اجزاء ترکیبی دی . او
د ده په سرشت کښې داخل دی . یو یې بلند پایه او اعلیٰ عملونو طرف ته مائل کوی . او بل
یې داپریوتی سپکو کارونو ته راغب کوی . دده دواړو د منشاء په مطابق دے وقتاً
فوقتاً عمل کوی . کله پر یو حاوی شی او کله بل . لیکن زیات حاوی پرحیوانیت دے
ځکه چه دا جزو د فطرت یې کمال ته رسیدلے دے . او دا بل جزو د فطرت یې لاکامل
او پوره نه دے . بلکه د پوره کیدو او د جوړیدو په دوران کښې دے هم دغه وجه
ده چه په بدو کارونو کښې او د جسمانی او حیوانی خواهشاتو په حاصلولو کښې مونږ ته
زیاته خوشحالی ، مزه او لطف حاصلیږی . په مقابله د ښه کارونو کولو کښې او په مقابله
د عقلی او روحانی تقاضا پوره کولو کښې . مونږ بدو کارونو ته او حیوانی او جسمانی خواهشاتو
پوره کولو ته زیات مائل یو . ولے چه د مؤخرالذکر په حاصلولو کښې یو خاص چسکه
او مزه ده . چه هغه د هغه بل په حاصلولو کښې نشته . عقلی او روحانی تقاضا پوره
کولو کښې یو تکلیف او بوجه شان محسوس کیږی چه هغه د حیوانی خواهشاتو
په پوره کولو کښې نه دی . لیکن که مونږه ښه غور وکړو . نو دا خبره صفا او واضح
ده چه په دے دواړو فطرتونو کښې ځمونږ د اعقلی او روحانی یا انسانی فطرت په
مقابله د حیوانی فطرت ډیر زیات بلند او اعلیٰ دے او س چونکه چه د انسانی فطرت
مرتبه د حیوانی فطرت نه اوچته ده او ورسره ورسره دا هم ده چه دا فطرت لا کمال
ته نه دے رسیدلے او صرف په دوران د تکمیل کښې دے نو لهذا "پکاردی"
چه مونږه دے له زیاته ترقی ورکړو . او د دے افتدارا او ضبط په ځان باندے
هغه بل ته زیات ورکړو . "پکاردی" چه مونږه د انسانی او عقلی یا روحانی

تقاضا پوره کولو نه په دے بل بانده ترجیح ورکړو. اګر چه که په دے دویم کښ (دحیوانی فطرت تقاضا پوره کولو کښی) زیاته مزه، آرام او اسانی ده. بالفاظ دیګر څونږ دا "فرض" دی چه ښه کار ونه غوره کړو او په بل بانده ترجیح ورکړو څونږدا "فرض" دی چه ځان د حیوانیت د دائرے نه راوباسو او د ځان نه یو کامل انسان جوړ کړو. او هم دے ته اصلی معنو کښ اخلاق وائی. یعنی چه څه "پکار دی" او څه "فرض" دی د هغې مناسب کار کولو ته اخلاق وائی. بالفاظ دیګر د اخلاق تعلق "فرض" او "مستحب" (بمعنی لغوی) سره دی په مقابله د دے د انسان د خوشحالی تعلق "فرض" او "مستحب" سره نه دے. دا ویل چه انسان له "پکار دی" یا د ده فرض دی چه ځان خوشحال کړی بالکل بے معنی او بے مطلبه خبره ده. ځکه چه خوشحالی خو هر یو انسان بغیر د چا د ویناخپل ځان د پاره لټوی او حاصلوی. او کوم شے چه بنده په خپله خوښه حاصلوی د هغې د پاره دا ضرورت نه پیښیګی چه هغه بنده په ځان بانده "فرض" او لازم او ګرځوی. نو ثابته شوه چه د "خوشحالی" او د "اخلاق" هیڅ نسبت او رشته نشته او دا دواړه بالکل جدا جدا څیزونه دی. لهذا دیره لویه غلطی ده چه بنده اخلاق او خوشحالی د یو بل مترادف خیال کړی

لیکن به فرض محال که خوشحالی او اخلاق یو شی وی نو بیا به په ښه او بد کښ هیڅ فرق پاتے نه شی. ځکه چه د دے دلیل په مطابق ښه کار ځکه ښه دے چه بنده ته پرِ خوشحالی حاصلیږی. مثلاً زکوٰة ورکول ښه دی ځکه چه زکوٰة ورکونکی ته په زکوٰة ورکولو کښ یو قسم خوشحالی ملاویګی. او دغه شان ته بد کار هم دومره ښه دی لکه ښه کار. ولے چه بدی هم خلق عین د خوشحالی حاصلولو د پاره کوی. نتیجه ئې دا شوه چه غلا کول هم هم‌هغه شان ښه شی دے لکه زکوٰة ورکول. ځکه چه غل هم غلا د خپلے ګټے او د خوشحالئ د پاره کوی. نو د دے نظریے په مطابق خوښه او بد کښ هیڅ فرق نشته.

دویم مشکل دا دے چه د خوشحالئ ماهیت معلومیدل ډیره ګرانه خبره ده. لکه چه مونږه مخکښ ذکر کړی دی. خوشحالی جذباتو سره تعلق لری او په جذباتو کښ د ټولو انسانانو متفق کیدل ناممکن دی. حالانکه دا اتفاق الرائے کیدل عین هغه

شي دے چه کوم په اصلي معنو کښې د حق او د باطل معيار دے - دوه او دوه څلور څکه يقيني نظريه ده چه ټول بني آدم هر ځائے کښې او هر وخت دے نتيجے ته رسي چه دوه او دوه څلور دي. ليکن جذبات يو ذاتي او انفرادي شي دے. په دے کښې اتفاق ناممکن دے او د هر يو سړي جذبات مختلف وي. څوک په يو شي خوشحاليږي څوک په بل شي. بلکه يو انسان هم هميشه هر وخت کښې په يو شي نه خوشحاليږي. نو دا ويل محض بے بنياد او بے دليله خبره ده چه د ټولو انسانانو جذبات په يو شي يوشان نه اوچتيږي. يا ټول انسانان په يو شي يوشان نه خوشحاليږي يا خفه کيږي. لهذا دا ويل ډيره ګرانه ده چه کوم يو عمل دے يا هغه کوم يو شي دے چه د هغے په کولو باندے ټولو انسانانو ته په هر وخت او هر ملک کښې يوشان نه خوشحالي حاصليږي

يو بل ګروه د فلسفه دانو دا وائي چه ښه اخلاق او ښه عمل هغه دے چه د هغے نتيجے دا سے وي چه د هغے په ذريعے انسان "کمال" ته ورسي. ليکن "کمال" ډير مبهم او غير محدود غوندے مفهوم لري. او دے هر قسم معني کيدے شي. د "کمال" په معني کښې جسماني. روحاني. عقلي او اخلاقي اوچت والے وغيره وغيره هر څه راتلے شي. او س چه د "کمال" معنی د نورو صفاتو علاوه اخلاقي اوچت والے هم کيدے شي نو صفا ظاهره ده چه دا استدلال يا دا تعريف غلط شو. ولے چه سوال خو دا دے چه اخلاق څه ته وائي او د دے ماهيت يا حقيقت څه دے؟ د دے دا جواب ورکول چه اخلاق علاوه د نورو صفاتو نه اخلاقي اوچت والي او اخلاقو کښې کمال حاصلولو ته وائي - دا خو بالکل يو "ګول مول تعريف" دے. او د هغے تشريح هم په هغو الفاظو کښې کوي چه کوم موږ پيژاندل نه غواړو. دے ته د عربو فلسفه دانان وائي "تعريف الشيئ بنفسه". او دا د تعريف يو غلط قسم دے نو دا نظريه هم صحيح ثابته نه شوه.

يوه بله نظريه دا ده چه د اخلاق يا د ښه عمل نتيجے سره هيڅ رشته نشته بلکه د نيت سره تعلق لري - نتيجه که ښه وي او که ښه نه وي خو چه يو عمل په ښه نيت باندے مبني وي نو هغه عمل به ښه وي. ولے چه د عمل نتيجه خو څوک په واک او په اختيار کښې نه ده - د دنيا مالکان او جوړونکي او

چلوونکی موږ نه یو چه د خپل عمل نتیجه ښه کړو یا ښه نه کړو. د عمل نتیجه د دنیا په واقعاتو او حالاتو باندې منحصره ده. او هغه واقعات او حالات ځوږ له نظر نه پناه دی. او که بالفرض موږ ته معلوم هم شي خو هغوئ کښې تصرف کول او هغې نه یو خاص نتیجه را ایستل ځوږ د اختیار نه بهر خبره ده. موږ هیڅ قدرت نه لرو چه د خپلې منشا په مطابق ی داسې تا ورا تاو کړو چه خپل ځان یا نور پرې خوشحاله کړو. او نتیجې ښه را او باسو. مثلاً که چرته زه سپین نه په دې نیت ورکوم چه یو ماشوم له د وبیدو نه بچ کړم. لیکن په ځلې ږدې چه زه بل بچ کړم ښځه هم غرق شم. نو دې دا مطلب نه دے چه چونکه ځما د عمل نتیجه خرابه را وختله نو ځما عمل دِ هم خراب وګڼړلے شي. بلکه دا عمل چه په ظاهر کښې یو نا کام کوشش دے عین قابلِ تعریف دے. نتیجه خو ځما په اختیار کښې نه ده. په دے مثال کښې نتیجه د اوبو په طاقت او د باؤ باندے منحصره ده. او د او بو خالق او په هغې کښې تصرف کوونکی زه نه وم. چه او به ځما د پاره خپل خاصیت پرېښې دے. زه زیاتره زیات په خپل نیت پرې یم او نیت په دے مثال کښې ښه وو. نو ځکه عمل م هم ښه وو لنډه او که ړي دا ده چه ښه عمل هغه دے چه یو تسلیم شده ښه کار د هغه کار د خاطره نې او کړے. او یو اخلاقی قانون د قانون د خاطره ېي او منے. دا نه چه په نتیجه باندے ئې نظر اوساتے د ښتیا د ښتیا و د خاطره وایه. زکوٰة ورکوه چه زکوٰة ښه کار دے. دا نه چه د معتبری یا د عوض د خاطره ېي ورکوے. بالفاظ دیګر چه یو کار په "نیک نیت" سره او یو فرض د فرض د خاطره وکړے نه چه د ویرے یا د طمع د خاطره. دا عین د اسلام سبق دے ځوږ پیغمبرؐ صاحب فرمائی چه اَلاَعۡمَالُ بِالنِّيَّاتِ دا نظریه ځما په خیال کښې صحیح ده

خیر ځوږ بحث فی الحال د دے نظریو په صحت او غلطی باندے نه دے سوال اصلی دا دے او اوس موږ خپل اصلی مطلب ته را ورسیدو. چه آیا دا سے قسم نظریئے د پښتو په شاعریٔ کښې شته دے که نه؟ ځما خیال خو دا دے چه شاعری خوي لا پریږد ده د پښتو په ټول ادب کښې (نثر کښې هم) داسے علمی بحثونه او فلسفیانه نظریئے چانه دی پیش کړی. هسے لږے ډیرے اشارے به ضرور وی. لیکن کامل طور

سره علمي بحث پرے نه دے شوے . پښتنو ته د خپل جنګ وجدل . له بغض او له کینو . او د پرو جنبو نه دومره فرصت یا اطمینان قلب چرته حاصل وو چه دوئ په دے دقیق علمي مسائلو باندے بحث اوکړي ؟ د دوئ اخلاقیات زیات نه زیات "رسمي او رواجي اخلاق" دی (لکه د جاهلیت په زمانه کښې عربو کښې وو) "نظری اخلاق" نه دی (عربي فلسفه کښې دے ته حکمت نظری وائي) زیات نه زیات چه کوم کارونه يې پلار نیکه په پیړو د سینه په سینه کړلي دی . هغه دوئ هم سنه وائي . دا سوال نه پورته کوي چه ولے او د کوم اصول په بنا باندې ځوانه پلار نیکه فلانی عمل ته سنه وائي او ود ے خلاف ته بد .

اوس سوال دا دے که چرته پښتنو کښې دا فلسفه اخلاق یا نظریه اخلاق نشته نو دا رسمي او رواجي اخلاق يې کوم دی . دا د دوئ فیاضي . مهمان نوازي . بهادري . او مردانګي . خود داري . غیرت . بغض کینه او جذبه د انتقام وغیره وغیره دی . دد ے نه د دوی شاعري ډکه ده . او قدم په قدم ټول ادب کښې دد ے ذکر کیږي . بطور د مثال او د نمونے یو څو اشعار زه تاسو ته بش کوم .

فیاضي او مهمان نوازي | د پښتو ملک الشعراء خوشحال خان خټک وائي

(الف) چه کټل خوړل بخښل کړی ځوان هغه ؛ چه توره لري د توري خان هغه
چه ته په کیږه وخوړے حبطه شي ؛ د مجلس سره چه خوړ شي خوان هغه
(ب) دولت مند سړے هغه بللے بویه ؛ چه له سینه يې جدا د چاو له شي
(ج) زه او زر سره لمځا یه غلیمان یو ؛ په جهان کښې غلیمان سره رغیږي ؟
شاه زلمی به خپل غلیم کړه ترځان وراند ؛ و نامردو نه به سل حیلے دریږی

رحمان بابا د مړنی سړي په تعریف کښې وائي

(الف) دیګ يې ایښی په دیګدان روښې تر تنغروی ؛ چه بیا سوړ په اه سره نشي نغری
(ب) خزانه په سخاوت سره زیاتیږی ؛ د کوهي او به چه و کاږے بیا شي

بهادری او مړانګی | "خوشحال خانؒ" وائی

(الف) توره به نه کړې نور به څه کړې ؛ چه دې نه د پښتنی رودلے دینه

(ب) متولد کتبه ده د تورے ؛ که کابل دے که کشمیر
مړ نه دے چه یاد یږی ؛ په سند روهم په دیر

(ج) د خوشحال خټک خوشی په هغه ستا دهٔ ؛ چه بریښنا وشی د تورو او د زغرو

(د) چه په توره ترکتازی کړه ؛ هغه هر کل کامګار دی.
چه ئې زړه نه وی د تورے ؛ هغه زړه نه څه پکار دی.
مور دې نه شی بانډې بوره ؛ چه مړه نه د کارزار دی.

خودداری او غیرت | خوشحال خانؒ وائی:-

(الف) ساز دے دروهی مال دې درومی پت دې نه ځی ؛ د سړی د چارے کل خولی په پت دهٔ
چه د ننګ په چار ورځنه دے خوشحاله ؛ کړی نوونږه په سترګو هم ماده ده

(ب) ننګیالی د ننګ د پاده ؛ په هر شی نکوی اور
چه په نام و ننګ ارزند وی ؛ که تل ژوی څوک ئې نور

(ج) د زمری یو مړستوب په لښکر نه دے ؛ مته ئې هر کله یوځے په خپل ځان شی

د پښتانه ضد او کینه او جذبه د انتقام | خوشحال خان وائی:-

(الف) که په توره ئې جواب ورکړے مړدی ده ؛ چه وجود دې څوک آزار کاندې په چوب
کړم وس ورباندې برشی هیر ئې نه دی ؛ ډیر سړی نه به جفت اپن کړم په میخ کوب

(ب) سنه ځوانان بخپل هورپے نږدی له لاسه ؛ کړی سر شی د خولی مزری تژ امه
که تل توري عشق خوری ماتے د جنګ وری ؛ مرد به سور نه شی په زړه ئې انتقامه

عالی همتی او استقلال | خوشحال خان وائی

(الف) د عالم توله خبرے لوریه لور تورے لښکرے ؛ زړه ئې نه خوږیږی لځایه غرخو هستی وی کړنه

(ب) په جهان د ننګیالی دی دا دوه کاره ؛ یا به اوخوری ګګوړے یا به کامران شی
(ج) که اسمان دے د زمری پخولے کښې ورکړو ؛ د زمری په خولے کښې مه پریکیده همت
نو مطلوبه پورے شرط د رسیدو دے ؛ که تمامه لاربه وښو شی لټ پټ
رحمان بابا وائی :-
ننګیالی چه یو ځل فخر کړی په یو لوړے ؛ نو هیڅ نه وینی که کوهی وی که کړانګ

دا دوه قومی صفات دی او د هر پښتانه په خمیر او په خټه کښې دا اخلاق او صفات شامل دی . تر دے حده پورے چه که دا صفات ښه رنګ واخلی او کړلے شی . بیا په هر حالت کښې دوی ته دا ښه ښکاریږی . مثلاً که د یو پښتون نیاضی او مهمان نوازی تر دے حده پورے اورسیږی چه هغه پر د خپل مال دولت . پولے ټپې . مینے او کنډرونه بایلی . بلکه د هغه نه پر خلاص شی او دے حال ته ورسی چه د نورو د په کوټو کښې په خدمت او چلونو د کولو باندې مجبور شی . بیا هم هغه ته خپل ځان حقیر نه ښکاری . او نورو پښتانه یو سپک سړے خیال کوی . بلکه په دے باندې فخر کوی او نوری هم عزت کوی . پښتون ته یو نیاض او سخی سړے چه هغه ټول دولت په دے کښې بایللے وی او د لوږے موړ د شوم سړی نه چه هغه په کنجوسی او بخل باندې د سرو زرو کوټے ډکے کړے وی ډیر زیات درونه او باعزت ښکاری . د غه شان که بهادری او مردانګی د غلاګانو شکوو او د ډاکو شکل هم اختیار کړی پښتون پرے نه شرمیږی بلکه فخر پرے کوی . پښتون نه غل . ډاکه ماړه او شکونکی . زړه ځله د بزدل نه زیات عزیز دی . هم دا وجه ده چه په حجره کښې ځلمی شپه او ورځ په مرکونو . غلاګانو . کنډرونو . او هر قسم خطرناک جرمونو باندې فخر کوی - او په پرېکړه خلاص نږده باندے د دے خبرو ذکر کوی . ولے چه په دے ټولو جرمونو کښې خطره وی او په خطره کښې اراده ځان اچول او بیا تر د تلو کښې یو قسم بهادری او مردانګی ده ی
دغه شان نه خودداری او غیرت که د لیونتوب او د مستئ حد ته هم ورسی دے پرے شرمیږی نه . بلکه فخر پرے کوی . او ضد کینه او بغض ته خود عین پښتو وائی . ولے چه دا خود د ده اصلی فطرت او خمیر د طبیعت دے . او د ده د ټولے زند ګی اصلی مقصد دے . په دے باندې پښتون ځکه فخر کوی چه اګرکه بذات خود دا صفات خراب دی لیکن د دے په بیخ کښې ده ته یو قسم مردانګی . خودداری . او غیرت ښکاریږی .

اوس د مطلب تکئ دا دے چه پښتون بائد د اخلاقو اصل ماهیت دا سے واضح کیدل یا واضح کول پکار دی لکه څرنګه چه مونږه مخکښې په تفصیل سره ذکر کړے دی. او دا نه دا واضح کول پکار دی چه که دا هرڅو مره هم ښه صفتونه وی خو بیا هم خود دے کښې هیڅ قسم ښه والی نشته او نه دا صفات څنداں قابل دفخر دی. دا زیات نه زیات "طبعی صفات" دی اخلاقی صفات نه دی. "رجحان فطری" یا میلان طبعی دی. اخلاق نه دی. په حیثیت د طبعی صفاتو یا د میلان طبعی دا نه ښه دی او نه بد. دا هاله ښه شی او اخلاق ترجو ړشی چه دے صفاتو له ښه "رُخ" ورکړے شی او دا دے په شا بائد "نیک اراده او نیک نیّت" ورسره مل وی. ګنے بغیر د نیک نیّت نه د فیاضی او مهمان نوازی نه "فضول خرچی" "مستی" او بربادی جوړه شی - له بهادری او مړ دا نګی نه ظلونه "قتلونه" په اکے "فسادونه" او هر قسم ادم خوري او مردم ازاری پیدا شی. او د خود داری او غیرت نه "بغض کینه" او باغی توب جوړشی - حاصل د کلام دا دی چه پښتون له پکار دی چه د اخلاقو په اصلی ماهیت باندے ځان پوه کړی. په فضول عادتونو بائد دِ فضول فخر نه کوی. دے خپل بهترین او بلند پایه میلانِ طبع له دِ ښه رُخ ورکړی ځان نه په حقیقی معنو کښې انسان جوړ کړی او یو قومی او مجموعی حیثیت دِ پیدا کړی. چه په اجتماعی ژندګی کښې یو کار اُمد فرد ثابت شی او په نورو قومونو هم دا خپل حیثیت تسلیم کړی ګنے دوی به تر قول عمر لکه څرنګه اوس دی. جاهل - غلام. خوار خسته او ذلیل پاتے شی - او اٰخرکار به شاید چه د دنیا د نقشے نه بالکل ورک شی. لیکن که دوئ دے خپل فطری صفاتو ته "ښه او اخلاقی رُخ" ورکړی نو څما یقین دے چه دوی نه به یو ډیر ممتاز سرفراز او عظیم الشان قوم جوړ شی چه داسی به د دنیا په تاریخ کښې بل یو قوم نه وی.

ډاکټر محمد احسان الله خان

ایم اے - ایل ایل بی (علیګ) ډی فل (اون) پروفیسر د فلاسفی

اسلامیه کالج د پیښاور

دَ پښتو ذهنیّت

افراد

شیردل خان :- .... دَ خیراٰباد کلی خان.

شیرعالم }
میرعالم } .... دشیردل خان ځامن

نوراحمد (نوری) .... دَ شیردل خان ورخه خور

خواجه محمّد (خوجے) }
ګل احمد (ګلے) } .... دَ نوراحمد ځامن

نثاراحمد (نثارے) .... کلات نصیرکلی او شیردل خان کاو ښړی

رحیم خان (رحیمے) }
عبدالقیوم (قیومے) } .... دَ نثاراحمد ځامن
نورحسین (نورے) }

تهانیدار - سپاهیان - ګواهان - جج - جرګه - او نورخلق ځائے - دخیراٰباد کلی او دَ کلات نصیرکلی شریک دښمن۔

اَوّل مَنظر

دخیرآباد او کلات نصیرکلی دَ پاخه سړک په غاړه پراته دی. اوروښه ئے شریکه ده دواړه په یولښتی بانښه او برکیږی. موکه ئے عموماً نهری ده. دَ ضني موسم ده دَ کانک میاشت ده. او زمینداردجوارو او به خودکوی. او سرښنوی ئے نه نکی. دَ مابنام وخت ده. دَ خوارلسے سپوږمۍ ده. کارالیتونکی خلق اکثر پښتو ته اوبه ورکوی. او

بے کاره خلق د سړک په غاړه ناست ګپ شپ لګوی - او د چلم حکومت په ډیر ادب او تعظیم سره چلیګی. نور احمد د کور نه راوزی او زوئ یعنی خوجے ادب خور لدیګی

نور احمد :- خوجیه پاسه کنه ته لا اوسه پورے د چلم په خدمت کښی لاس په نامه ولاړ یے . او د خپل کار بیکار نه بے غمه یے . تا ته نه ده معلومه چه نن د شیردل خان کا کا د نامے د بیچ د اد بو وار دے . خو خیال ساته چه چاسره جنګ جګړا او نکړے وخت نازک دے که څوک درنه او به په زور آړوی نو خان کاکا ته ورشه ګوره بچیه چه جګړه او نکړے .

خواجه محمد :- خه ده چلم څکومه نو ځم . خو ګلی ته بیلچه ورکړه چه راوړی .

نور احمد :- ګلیه پاسه زور ته دے بیلچئ یوسه .

ګلے :- لالا ! لالا راشه بیلچئ واخله .

خوجے :- راوړه دلته . هلکه زه چلم څکومه او ته ورځه نګوره .

ګلے :- لاله درزاه او به چابند ے کړے دی .

خوجے :- داچا د خوبچی بند ے کړے دی ؟ زه در ته دلته ولاړیم ته ورشه او به له د یخوا مخه ورکړه .

ګلے :- لاله درازه او به په زور آړوی .

خوجے :- دا څوک دے ؟ دا غلم —— هلکه څوک ئے چه او به اړوے ؟ وار بے وار د نه پیژنی ؟ که جرنیل ده دے د پلار ده خو په وار ده . او که جرنیل ده دے د مور ده نو بیا په زور ده

رحیم خان :- چپ خوله او نیسه . وار څه ته وائی .

خوجے :- خویره ډیر زور آور ئے نو .

رحیمے :- چپ شه ستا په مخه .... (کنځل) (یو ګذار ورد ته په کوتک ورکوی)

خوجے :- بنه ده زه خان پسے ځم چه درسره اوګوری .

رحیمے :- زه ستا د خان په مخه ....

دویم منظر

د ماسپخین وخت دے خلق په حجره کښی مجلسونه کوی . او په وار وارئی کوی . په

دے کښی خوجه په منډه منډه ځانیولے وارخطا دشیردل خان کا کاجرے ته راځغلی

خوجه :- هلک خان څه شو !

دَجرے سړی :- خوجه اخه وائے ورته په دا وخت بانډه !

خوجه :- اخر بیا ځ هم کنه ؟

دَجرے سړی :- هغه دے شیرعالم خان راغے .

خوجه :- خان ! تاسو خو دلته په ارام ناست ئے اوپه کښی م ورور دَ کلات نصیر خلقو مړ کړو .

شیرعالم خان :- هان دا څه وائے ! بے غیرتو تاسو ورته کتل ! څه رنګ دد نه جوند لاړه

شیرعالم خان :- زئ چه زو .

میرعالم خان :- هلکه الاله م په دا وخت بانډے چرته لاړه .

نوکر :- خان هغه پسے خو خوجے وارخطا راغے اوهغه په تا وُبونه .

میرعالم خان :- هلکه شابه زر توپک دا واخله .

نوکر :- سبه ده خان (دوئ ټول په منډه ځان موقع ته رسوی)

شیرعالم خان :- ورېکه ستا به هغه .... دا تا دَ ورخه او به اړولی دی تاله ترا وسه دَ شیرعالم خان نوم نه وه اوریدلے .

رحیم :- قیوم راوړه دا توپک اوس وخت دے که خیری . ما په اسمان غوښته اوخدای به مونږ ته راکړه (په دے وخت کښی میرعالم خان سره دتوپک راسی)

میرعالم خان :- شابه خوجه دیوسه ته ورته لا ولاړی . (ډز ډز)

شیرعالم خان :- هلکو تښتئ . قیوم اورحیم دواړه مړه شو . بس کړئ دکلو خلق به راشی . زر ځان دَ موقع نه په ډډه کړئ .

نورحسین :- دَ مقتولو کښرے ورور چه دا حال وینی نو په جراجړاکلی ته د ویرے نه ځغلی . او په لارکښی دَ پلار سره یوځائے کیږی .

نثارے :- هلکه چرته کښی منډے وهے ! ولے حیاری . لالہ دے جګړا اوکړه څه ؟

نورے :- آو .... هغوی .... رانه ...... خلقو مړه کړه

نثارے :- (په دېره غم کښې) ولے بے غيرتو تاسو بنځے وئ. درېره سبه اوشوه (نثار احمد واپس راځی او په شير عالم دی پسے سرې او باسی)

" :-

راپا څئ بے غيرتو خامن ﷲ د خيرا باد خلقو مړه کړه.

" :- هائے افسوس. تباه شوم. زه به چونلے یم او د خپلو خاسنو دپاره به ولځم؟

دکلی مجرې خلق :- نثاری کا کا څه چل دے؟ افسوس او نکړه. خائے د وخت نه فائده اخلی. (تول را په پتې نه په لږ ساعت کښې په دو راشی)

یوسرے :- هلکو چپ شئ څه زيرکے خبی.

نثارے :- شا بئ څوک تماشه نه کتونه یوسئ او څوک په هغو پسے ورشئ. څو چه په کورد نو کښې در نه خلاص نه شی.

دريم منظر

د سحر وخت دے خائے په خائے. کوښه په کوښه د رحيمی او د تيولی د جهګړے بحث دے. خلق شير عالم وغيره نه د غصے نه چک دی. چه نوم ئے اخلی نو تخل ورسره کوی. علم خيل خپل کار پسے روان دی. او نثارے ګواهانو پسے کوښه په کوښه ګرزی او د ناصح ګواهان په پيسو باندے رضا کوی. د مقدمے د پاره هندوانو سره بنے او کندم کانړه کوی. په مختونو باندے ئے سود دے. یوسرے ودته اواز کوی. چه تماشه دار راغے. (تهانيدار په نزدے حجره کښې شهادتونه اخستل شروع کوی.)

تهانيدار :- نثار احمده وایه څه رنګه قصه ده.

نثارے :- خان صاحب بے ګناه خامن ﷲ قتل شو. بیګاه څوونږ د او بو وار دو. دوارو خامن ﷲ او به خوردے پاره پتې ته لاړل. کشری مړی (نور حسین) ورپسے روتې يوړه. چه خبر یم نو غفوری او دليلي راغلو ويل چه دواړه خامن دے شير عالم او مير عالم مړه کړه.

تهانيدار :- وایه عبدالغفوره داوا قعه څه رنګه وه خواول د بیان نه طلاق او غورزوو

چه په تا به ښځه خوروی او په دې کانړی به طلاقه وی که دروغ وې او وې

غفورے:- یوه. دوه. درې. خان صاحب په ما به ښځه طلاقه وی که دروغ وایم. بېګاه د نثاری کاکا د او به ځور وار ور. تیوے او رحیمے دواړه - او به خور نه تلی ور په پټی باندې او به پرېښوده دے او نقش پیا در ہمیحصه پټی او به شوے وو چه شیر عالم او میر عالم دواړه راغله او میر عالم زر زر ورځ مینځ کړو. په وے کښې تیوے واغه. او ور ته دے او ویل چه خان ته ځوځ د او بو وار دے. او چه م دیرا وبه دے اولو پانی دے. شیر عالم ور ته کنځل اوکړه. او ګذارے ور ته په ځ ورکړو. دوی دواړه پرزو لو ته را پاسیدل. او چه میر عالم اولیدل. نو زر ئے توپک ډک کړ. او په تیوی باندې ئې ډز اوکړو. شیر عالم منډه کړه او په رحیمے باندے د چړے ګذار ئې شروع کړه.

تهانیدار:- هلکه خوځه چرته ده؟

غفورے:- هغه دا قصه اولیده نو کلی ته اوتختیس.

تهانیدار:- نوکوره غفوره تیوی او رحیمے هیڅ اونکړه.

غفورے:- نه جی. دوی سوکو و لو ته هم سم نه شو.

تهانیدار:- وایه دلیل خانه ستا څه بیان دے.

دلیل خان:- خان په ما به خپله ښځه طلاق وی چه د غفوری بیان بالکل ټهیک دے. دے شیر عالم خان او میر عالم خان په تیوی او رحیمی دواړو باندې ګذارونه کړی دو.

دلیلے:- جی مونږ دواړه د خپلو جوارو تماشے ته تلی وو. څکه چه خلق یې په غلا باندې رشپې اوړی.

تهانیدار:- دلیله او غفوره یا ستاسو د دواړو د خیرآباد شیر عالم او میر عالم سره څه دښمنی خو نیشته

دلیلے:- نه جی تاسو تحقیق کولے شئ. مونږ غریب خلق د چا د دښمنئ نه یو.

تهانیدار:- فوځ او په خیرآباد کلی کښې د شیر دل خان ځامن شیر عالم میر عالم کو فتار وئ.

تهانیدار:- وایه میر عالمه دا قتل دې څه رنګه کړے ده؟ رښتیا رښتیا اووایه نو خلاص به شے

شیر عالم :- خان صاحب ځوئ دا د بو وارو . برخه خوړم او د خورلو د شپې تلے وه . او په تپې بانې او به پرېښودے وے لږ ساعت پس دا قیوم راغے . او او به ئې په زور باندے واړولے ځما برخه خور په منهٔ ورته منځ ما پسے راغے او را ته ئې ویل چه . قیوم او رحیم او به په زور واړولے . زه ورسره چپ نه لاړم . بیا خیال چه منت ئې اوکړم . خو ا چه څو مره منت د قیوم او رحیم اوکړه . نو هغه ټول بے فائدے ثابت شو . په دے کښې رحیم او وے چه ما په اسمان غوښتے خداے په مزکه راکړے . بس بیا پوهه نه شوم چه څه اوشو . نوره قصه خو چې معلومه دی . ځکه چه دا خلاصے کوه .

تهانیدار :- دا په خو چیه کم وخت کښې چه رحیم راغے نو ده څه چل اوکړه .

خو چه :- خان صاحب رحیم چه راغے نو ده سره ټوپک وو . او په شیر عالم باندې چه ئې ډز کوو نو چل دردونې او نګینه . پدے کښې میر عالم را او رسید او رحیم سره په پوز ولو شو . قیوم د پوټو نه مخکښې چه په میر عالم باندے چه د چړې ګذار اوکو . نو رحیم اونګینو . شیر عالم او میر عالم چه کتلی دی چه دوئ یو بل زخمی کړه نو کلی طرف ته روان شو .

تهانیدار :- میر عالمه وا یه کنه په قیوم باندے دے څو ډزے کړے وے

میر عالم :- خان صاحب زه درته قسم خودم چه مونږه بالکل بے ګناه یو .

تهانیدار :- مظفره . شیر عالم او میر عالم ته هتکړے اولګوه . وا یه ملک کاکا ته څه وائے .

شیر دل خان :- خان صاحب زه په سپینه ږیره قسم کوم . چه که ځما ځامنو به دا قتل کړے دی ځما ځامنو خو د چا ملاسته غواهم نه ده پاسولے .

تهانیدار :- مظفره پاسیګئ نا وخته کیږی (ټول تهانړے ته چالان کوی)

شیر دل خان :- خان صاحب تباه شوم . کورم تباه شو . ځامن م بیګناه دی . په خدائے به شی او تا به ترحم اوکړ

تهانیدار :- ملک کاکا ! خفه کیږه مه . څوک چه اوږه نه خوري نو بوئ ترے نه زی .

څلورم منظر

څلور میاشتے پس د سشن په عدالت کښې د شیر عالم وغیره مقدمه پیش کیږی او جرګه کیږی .

جج :- وایه شیر عالمه وغیره ستاسو څه رنګه خوښه ده . دا مقدمه د جرګه شی او که نه عدالت کوشش اوکړو . خو با وجود د ډیر غور و خوض نه په نتیجه او نه رسید .

شیرعالم وغیره: جُوړ، صاحب مونږ به دے بانډ ډیر خوشحال یو. کہ تاسوئے جرگے نہ حوالہ کړی

جج :- رحیم خان وغیره ستاسو څنګه رائے ده۔

رحیم وغیره :- ښه ده صاحبه جرگه دِشی.

جج :- (سپاهیانو نه) دوئ واپس بوزئ او مقدمه به جرگه فیصله کړی.

پنځم منظر

(دوه میاشتی پس جرگه د شیردل خان کلی ته رازی او شیردل خان ورته دوه زره روپئ ورکوی. او ځامن د پهانسئ عمرئ نه بچ کیږی)

جرگه :- شیردل خان د اغفور ے او دنیلے دِ په ځامنو باندے ولے گواهی کوی.

شیردل خان :- څه او وایم! هغه ورځ شیرعالم په بازار کښ روان وو۔ او د اغفور ے ورته پانسیا ه. نو هغه دے پوځو کلاده او راخه.

جرگه :- کوم د کلی مشرانو ستاسو څه رائے ده. د کور په غاړه ولاړیئ رښتیا او وایئ

د کلی مشران :- خوږ په خدائے قسم دی چه دا شیرعالم میرعالم بالکل بیگناه دی.

(د په دوړی وخت کیږی او د جرگے خلق په دوړی له پاسی پڅے وخت کښ ورته دوه زره روپئ بیړے ورکیږی. او د مقدمے رخ بدلیږی)

جرگه :- پس د دوړی خوړلو نه شیردل خان ته پته رائ. ښه ده. مونږ به څه .... امید دے خدای به خیر کړی.

(دوه میاشت پس د شیرعالم وغیره پیشی کیږی او مقدمه فیصله کیږی)

جج میرعالم او شیرعالم! ستاسو مقدمه صفا ده۔ جرگے رائے ظاهره کړے ده او عدالت مجبوره دے چه شیرعالم ته د یو کال قیدِ سخت سزا ورکوی. او میرعالم بری کړی. تدے د پاڅه بل اپیل نشی کیدے. ولے چه جرگه د فریقینو په خوخه باندے مقرره شوے ده

(یو سړئ روان دے په لارے ځی او دا اشعار وائی)

چه په اول کښ عقل فکر یو انسان نه کوی: په نتیجه دے بیا هم هیڅ قسم ارمان نه کوی
کول می کوند مقد مولہ خود او لور خرسوی: دا سے کار د نه خود نیا کښ کافران نکوی

(د دینو حام)

نتیجه :- که څوک غور او کړي. نو څرګنږ د پښتنو دا ذهنیت دی. چه یو بل سړی په معمولي خبره بانده خو سره چاړه یو جرګان خو هم په پړان بانده دومره غیرت نکه څکاړ نه کوي. لکه څه رنګه چه دوی پښتانه مسلمانان ور ورڼه په پړان بانده غیرت کوي. او بل ورور مسلمان قتل کوي. نتیجه داشي چه د پړان د پاره کور او کنډر بیللو ته تیار شي.
ولے څو نږ د خپل لاسه په جرګو کښی داسی کیني. چه په مظلومانو بانده هم وخت چکونه لکوي. او ددے په وینو زورو بانده عیشونه کوي.

فدا محمد
د اول کال

دَرد

درد د عشق لرم پزړه کښی نصیبم شبګیر شو کاه د سترو روش راز کرم کڅ قلم ته رم اسا شو
خلق وائی شرابي شوزه په میو د عشق مست یم په فراق کښی د دلبر خپل ځما ستر کی په ګم سر شو
چه په خواب کښی راته راشی ما په رورور ابیدا کړي د اشنا تصویرپه لاس کښی وائی دا د عشق سیر شو
که لی پټ سا تم د خلقو درد ساتل پټ نا ممکن دی بهر توپ دهی د نذره نه د پردے شیشے ذرے شو
د عشق درد راته وارورده زه بیمار د مینے بنه یم چه م روغ د دی د زخم غواړی دا په بابه ځما خیر شو
درد د زړه د ژوندن بنابیست دے بے له درده به ژوندن څه کړي چه د زړو نو درد دی نوی د هغه په رخه ایره شوے
درد احساس د محبت دے درد د مینے تقاضا ده په بے دردو ظالمانو د غضب تورے تیاره شوے
د طاعت مخلوق نه ډیره بنی آدم دے درد د پاره رب نه پیدا کړے د ده زړه د درد د پره شوے
درد منی زړونه تل ژوندی وی درد حیات او وائی د په نااهلو بے دردخلقو په ژوند پکے ادیره شوے

ما د عشق درد ته په زړه کښی ځائے په د سبب ورکړے
چه په کل خوبو موصوف ده ځما لیک دغه قدر شوے

محمد یوسف

د دریم کال

III. FROM A CHEMIST.

Dulong and Petits Garden,
Abbottabad,
Dated, 17th March 1942.

My Chlorinated Sheela,

I am suffocated with your chlorinated ways. Your acidic nature in my "Love" produces a negative reaction. You are always oxidizing me and fusing my heart with fusion mixture in a charcoal cavity.

Believe me or just come and analyse my heart, you will find there nothing but pure and fine transparent crystals of 'Love'.

My heart is monovalent, the vapour density is 2.0567 at N. T. P. (Normal Temperature and Pressure) you can then calculate the atomic weight and the molecular formula, and I am quite certain that the result will only prove that I have got a chemical affinity for you. I beseech you not to decompose my heart any more, and do not put out the fire of love with Co_2 (carbon dioxide) and Ho_2 (water) of your beauty. Believe me as you believe in Dalton's atomic theory.

With 'love' pure as the crystals of Nacl (sodium chloride).

Your 'Oxidized' Lover,

....

NOTE.—Due to lack of space in this number we have had to keep back a few articles which certainly deserved publication. We thank our kind contributors for this unusual state of affairs and assure them that these articles will be printed in the next issue.

Editor.

You have written that I am an imposter—oh ! darling do not think so—I wish you could determine the density of my heart, and be sure you will find it possessing positive love. You can just test it with the help of Gold Leaves Electroscope ! Rest assured it will not give you any return shock.

Trust me that there is no evaporation, eblution or fusion in my love.

My heart is at the boiling point with the Bunson's Burner of your love. Oh ! please come and rescue me by throwing some freezing mixture on it, or you can place it in Carre's freezing machine if you like that way.

Failing to receive you or your letter, I shall rush on to you with an acceleration of 32 feet per second per second.

With 'love' as pure as a spectrum and as clear as a mirror.

Yours Positively,

....

* * * *

II. FROM A MATHEMATICIAN.

10, Logarithmic Road,
Islamia College,
Peshawar, 20-4-42.

My Ovel faced Kitty,

You cannot imagine, how much I am feeling the pangs of your separation. Your conical eyes, and your nose like a right-angled triangle are always hovering before my photographic mind's eye. Your love is increasing by every one-tenth of a second in geometrical progression.

I request and pray God ninety nine trillion, nine thousand, and ninety-nine times that he may send you to me within .0097675th (recurring) of a second.

It will be very easy for you to forget me, but for me it is as difficult as to forget the miscellaneous equation, the third part of Euclid's, and the eleventh theorem of Solid Geometry.

With 'love' sweetest as Binomal and Pythagorous theorem.

Yours Unparalleled,

....

new world—to remould it nearer to the heart's desire. Poetry only suggests and religion gives a detailed picture of the other world..... The greatest biography in English Literature was written by a drunkard, an idler, a lecher and a snob—James Boswell.....Shakespeare was no Shakespeare. Anyway he was the greatest plagiarist..... Milton was a stone blind man. It is said God made him blind because he had sympathies with Satan......Dryden and Swift were bitter as quinine mixture.....Wordsworth was a dullard, a dunce—nature's natural.....Byron and Shelley were the most licentious of poets.....Ladies beware, Lord Byron is coming.....Carlyle had an inferiority complex. Browning is boring.....

This was all that I could catch as he went on reading page after page. Sheela was elbowing me meaning that the period seemed unending. I began to look at my watch but ooh! somebody from behind was twisting very cruelly my soft-ear. It could not be other than the unsparing Mr. Toil. "Where is your book ?" he roared and gave me such a sharp slap on the face that I uttered a loud shriek which suddenly awakened me. Sheela was gone. It was day. Lala Jee and others had already left. The train was standing on the Peshawar Cantt. Station and this was my journey's end.

AL-BURKE.

LETTERS TO BELOVEDS!

(COLLECTED BY AYUB QURAISHI F.Sc. STUDENT).

I. FROM A PHYSICIST.

30, Galvanometric Mansions,
Joules Street,
Islamia College,
Peshawar, 29-3-42.

My dear Magnetic Paro,

I can very well see your charming face with the pin-hole camera of my heart on the love screen of my mind. Yesterday I received a letter from you which was full of complaints—When I read it my heart was vibrating as the prongs of the tuning-fork with a frequency of 512.

panion. I took out my book and began to peruse some stanzas here and there, but study was out of the question now, and I fell off to sleep. I dreamt that I was in my classroom. The beautiful damsel was sitting with me on the same desk. She was as charming as ever. Nearby on the desk was the old truant Little Daffodilly with his violin in his lap. On the other side, there were Mr. Blossom Jacob and Co., Mr. Toil, our teacher, was occupying the chair. His face was as stern and iron-grey as ever—a frown of anger, too, was seen on his face. On his forehead was written in block letters : "Work hard, Toil and sweat." Behind him to my great astonishment was sitting the Sardar Jee in the uniform of a peon, grinding his teeth upon me. The Lala Jee, the doctor, the speaker were all my class-fellows. In the adjoining room the professor of chemistry was extracting Petrol out of sand. My heart began to leap when I saw a rainbow of petrol in the next room. "Have you prepared your previous lesson ?" came the awe-inspiring resounding voice of the teacher. The doctor got such a severe thrashing that he forgot all his art of fleecing the poor people. At this moment as mischief would have it Little Daffodilly set in vibration the strings of his violin. Mr. Toil was looking daggers upon him and said, "Out of the class you go, I will never send up your name." During all this time I was exchanging sweet confidences of love with my beloved. This was the happiest moment in my otherwise sad and sorrowful life. I was touching her hair and the ambassadors of Japan and Germany were paying homage to the lean shank speaker who had become the King of India. Mr. Toil was complaining that he had never seen such an idle and careless class. And in fact it was as such. I was busy with Sheela (such was her name) ; Lala Jee was thinking of rates and interests; the doctor, of taking up some new profession and others were thinking of something else. "Open at page 119 and listen," ordered Mr. Toil. He began :

"Art is beautiful creation and beauty is the experience of higher pleasure. Beauty gives its own disinterest pleasure....Religion is the opium of the people....Coleridge became a poet because he took opium.....Manners are meant not for men but for beasts.....Be rational and reasonable. Eat with reason, drink with reason, tell lies with reason and deceive the people with reason.....The pleasure of the religious experience and the pleasure of the poetic experience are essentially the same. Both religion and poetry are dissatisfied with the present world. Both are idealistic; both want to build a

THE KHYBER

My lips two blushing pilgrims ready stand
To smooth the rough touch with a gentle kiss.

I was deep in a reverie when with a jolt the train stopped and to my great dismay, she went out with her father leaving me to muse on the evanescence of beauty and joy. Sardar Jee was looking out through the window. The storm had subsided. It was calm and cool.

As the train moved a not so old, not so good-looking, not so well-fed and not so well-dressed gentleman stepped into our compartment. There was something in his looks for which I took him for a patient of asthma. But the wonder of wonders he turned out to be a doctor having passed a full course in the science of fleecing the ignorant people—one of those touring quacks whom we often see in public gatherings. He began with a lecture on hygiene and when the people were considerably attracted towards him, he opened his box and took out some small bottles and said : "It is the precious life-blood of a master physician. It is the essence of my life-long experience. It has been prepared with rare herbs brought from the highest peaks of the Himalayas with 'kushtas' of most precious stones and metals especially gold and turquoise. All these ingredients were wisely and carefully mixed together on the day of Solar Eclipse in a big pot. "The witche's cauldron," I remarked. "Don't barge in," he said and went on, "It will cure each and every disease. It will stimulate your nervous and reproductive system, will act a tonic for your head and heart, and give strength to your lungs and liver. Plague, cholera, T. B., rheumatism, asthma, indigestion, headache will never come near you. And you will enquire the price. I charge nothing but the cost price. It is dirt cheap. Only four annas, four annas per bottle. Directions are written on the wrapper. The price is very low. The poor and the rich alike can buy it, come, come, who will buy it. . . . ." Such charlatanism, I said to myself, can only thrive in our ignorant and superstitious country. Why not pack this doctor to the front ?

At the next station the so-called doctor slipped away into another compartment to ply his trade. Many passengers had left and there was, now, sufficient room for us to lie down. Some of the passengers began to play cards while others stretched out their beds, and lay down. The Lala Jee near me was snoring like a furnace. The Sardar seemed to be suffering from narcolepsy talking namby-pamby to his com-

have died unwept. The Japanese are equally cruel. They have crushed the poor narcotic Chinese, and have trampled down many other nations, besides, the Burmese, our neighbours. Would you like to live under their barbarous and inhuman rule ?

But his voice was drowned in the former's. I was laughing in my sleeve. Every now and then he would jerk and writhe like a snake, turn from side to side, take a deep breath and croak at the top of his voice. Strange gestures and intonation! His thin long maustaches were drooping down into his foaming and fuming mouth. Now he he was going at a great velocity : "Our young men are degenerate. Their man-power goes waste. They have no proper education or training. Their past is disappointing; their future, dark. They have nothing to fall back upon; nothing to look forward to. It is all due to slavery. Shake off the yoke of thraldom, caste away the yoke of Englishmen and shatter to pieces the cold and heavy chains of foreign rule. I will lead you . . . . ."
and here my neighbouring Lala Jee, raising his enormous buttock let off a whizz of flatulence. "Symbolical," remarked another. A huge burst of laughter followed it. The speaker came to a standstill, looked sideways with blinking eyes and began to wipe the sand off his face.

I turned to another corner. My eyes fell on an extremely beautiful damsel, a human magnet, sitting there with her father. The ravishing beauty of her raven hair dishevelled over pale cheeks and her dark gypsy eyes had cast a spell of enchantment on those around her. Her bright forehead and face were gleaming in the light. She was, in fact, the cynosure of all eyes. The ecstacy and fascination of her presence had knocked silly a Sardar jee with a bushy beard and face of the same colour and having deep scars of small-pox. He was winking at her through the tails of his squint eyes. Her looks were, indeed, exciting and tempting but Sardar jee was looked more like a foil than suitor. All the same, with an air of 'never mind my beard' he was continually gazing at her. An expression of Barkis's willingness could easily be seen on his face. I was looking on one side at the paragon of beauty and on the other, at this embodiment of ugliness. Beauty and the Beast, I said to myself. Jumbled ideas and excited emotions were flashing in my mind. Shakespeare said : Whoever loved that loved not at first sight. In the films it is just the same. How untrue to life ! Was this love at first sight only a poetic truth ? I began to croon :

Meanwhile I had unfortunately attracted the attention of my fellow passengers who seemed to be eagerly looking at me. To avoid conversation with them I opened the book at another page :

> Hereditary bondsmen ! know ye not
> Who would be free themselves must strike the blow ?
> By their right arms the conquest must be wrought ?

And then came a blow. With a thump the huge hand of the massive Seth fell on my shoulder. "Hullo Mr. where do you intend to go ?" he asked. I found myself completely defeated. All my efforts to avoid the conversation had failed. I was forced to reply. "To Peshawar," I said shutting my book. "Perhaps you study there ?" "Yes." "In which class ?" "M.A." "Oh good, very good. Where do you come from ?"

"From D. I. Khan ?"

Oh nice, very nice. What is your father ? How many brothers are you ? Are they younger or older than you ? Are they married ? Are they all of them in service ? How many children have they ? Are you married or not ? How many professors teach you ? How many children have they ?

Showers of similar questions that he volleyed at me, completely bewildered me. What a catechism ! Naturally I could not and did not want to answer his questions. Fiddle-sticks ! Why should he ask me things about my family and myself ? Perhaps with a view to adopting me as his son or as his son-in-law. Both seemed well nigh impossible. It was for the satisfaction of his morbid curiosity.

Turning away my face I began to examine the compartment. Just behind me a lean shank gentleman with hollow eyes and sunken cheeks, clenching his bony fist and swelling his throat was vomitting out a harangue : "The Indians should think twice before they accept the proposals of Krupps (perhaps he was mispronouncing Cripps). He is the agent of British Imperialism. The rates of wheat have risen very high, and cloth, it is too dear for us poor people. We are almost starving to death. We have nothing to eat, nothing to wear. All this sandy and uncomfortable journey. . . ." Another sitting nearby started off like a soap-box orator : "Gentlemen ! Would we prefer Hitler, the devil's disciple, tremendous lie, naked Satanism and sheer brutality. Several thousands have been sentenced to death untried; nation after nation has been butchered unheard, millions of soldiers

In a Railway Compartment.

After a stay of five days at D. I. Khan, I was coming back to Peshawar by the passenger train. Passing through the dusty district of Mianwali as we were, a terrific sandstorm began to blow; it rose to the speed of a full gale roaring and shrieking and the gusts of sand struck right into our faces blinding the eyes and choking the throats. The windows were quickly closed. Nevertheless sand did trickle in through chinks and holes and after a while it was sand we were sitting on, sand we were breathing in and it was sand we were speaking with or through. Here, there and everywhere it was all sand annoying and repulsive. Did Longfellow want us to leave foot-prints on such swifty changing and constantly shifting tracts of sand as these ? Absurdity ! Nonsensical poetry, rather poetical nonsense. But this is going off at a tangent.

Yes, outside there was a raging storm but the inside atmosphere was close and stiff. I felt myself hard pressed literally and metaphorically, between two big bellied banias talking of interest, discount, rise and fall in rates, all uninteresting to me. The compartment was intolerably over-crowded. Passengers were packed and jammed between each other. Thanks to Petrol Rashioning ! A draught of sand blew in to my eyes as someone was trying to open a window. Could not petrol be extracted out of sand—all this sand which goes waste ?

To divert my mind I took out my book, a copy of the 'Poetical Works of Byron' and opened it at random. It was something about Wordsworth :

Thus, when he tells the tale of Betty Foy,
The idiot mother of "an idiot boy";
A moon struck, silly lad, who lost his way,
And, like his bard, confounded night with day;
So close on each pathetic part he dwells,
And each adventure so sublimely tells,
That all who view the "idiot in his glory"
Conceive the bard the hero of the story.

pare us for a constructive use of this all-important, creative life force. Specialists have worked out certain methods, through which the dormant powers are awakened and a new order of life begins. The improvement of bodily health by an ideal adjustment of sex, naturally tones up the mind; this, in turn, leads to a spiritual poise hitherto unknown.

Most people lack this poise, and thus search continually outside themselves for satisfaction in the material world, others blindly persue pleasures that ultimately blunt their senses. They are always restlessly seeking happiness, yet never find it. The proper balance is attained by scientific instruction of the individual to the end of bringing the animal appetites and passions under the sovereign control of mental and moral rules, agreed upon by the philosophers and psychologists of the various schools of contemporary thought.

Those who are diverting this sex power into destructive channels are lowered in bodily energy, their minds are like wreckage in a sea of fear; they are unnerved by indecision. The more the sex force is misused, the more materialistic people become; then ensues the mad scramble for material things and conquest of the weak nations with the object of exploiting their country's resources. Thus we have whole nations engaged in a life and death struggle of gaining satisfaction of their base desires.

The aim of the present day psychologists is to shatter the veil of sex-superstition and inhibitions; using the new technique of psycho-analysis to bring the struggling humanity to a proper balance in the four departments of life, viz., Body, Mind, Soul and Spirit.

AHMED YAR KHAN,
VI Year.

Sex has been used for personal pleasure, but its true function in this phase of life has been clouded by misunderstandings, misconceptions and widespread ignorance—so that mankind is struggling with its feet stuck in the mire of sex.

Sexual feeling is really the root of all ethics, and no doubt of aestheticism and religion. Freud has proved sex to be the pivot of our conduct and character. He says that libido or sex force is a primary motive of our mental and moral activities.

Love unbridled is a volcano that burns down and lays waste all around it, it is an abyss that devours all, honour wealth and health. So sex adjustment is a crying need of our modern life that has been made unstable by the evil influences of unbridled sexual passions.

Life is a never ceasing duel between the animal instinct and morality. Only will-power and a strong character can emancipate man from the meanness of his corrupt nature, and teach him how to enjoy pleasures of love and pluck the noble fruits of earthly existence.

The episodes of moral decay always coincide with the progression of lewdness and luxury of the nations. Exaggerated tension of the nervous system stimulates sensuality, leads to individual as well as the masses to excess, and undermines the very foundations of society.

But a healthy sexual influence as very potent in the awakening of aesthetic sentiments. From love arises that warmth of fancy which alone can inspire the creative mind, and the fire of sexual feeling kindles and preserves the glow and fervour of art.

The main purpose of the generative department of life is to bring children into the world that should be healthy, physically, mentally and morally. It is abuse of this greatest of gifts, usually through ignorance, that many sorrows of mankind arise. So in many European countries a proper sex-education is imparted to the schoolboys by the teachers who specialize in child-psychology. These instruction make a salutary effect on their future sex-behaviour. It is common knowledge, based upon experience that uncontrolled abuse of sex drains men and women of vitality, bringing about nervousness and other functional disorders. Once we have dispelled the ignorance, with which the sex functions have been so securely veiled in the past, we arrive at that point of aur consciousness, where we begin to look for enlightenment. Genuine sex knowledge can pre-

Sex in Modern Life

Few people are conscious of the deep influence exerted by sexual life upon the sentiment, thought and action of man in his social relations to others. Schiller once remarked, "So long as philosophy keeps together the structure of the universe, so long does it maintain the world's machinery by hunger and sex." The propagation of the human race is not left to mere accident or the caprices of the individual, but is guaranteed by the hidden laws of nature. Man puts himself at once on a level with the beast if he seeks to satisfy lust alone, but he elevates his superior position when by curbing the animal desire he combines with the sexual functions, ideas of morality, of the sublime, and the beautiful.

Placed upon his lofty pedestal he stands far above nature, and draws from inexhaustible sources, the material for nobler enjoyment, for serious work and for the realization of ideal aims.

Sexual life is the one mighty factor in the individual and social relations of man which disclose his powers of activity, of acquiring property, of establishing a home, of awakening altruistic sentiments towards a person of the opposite sex, towards his own issues as well as towards the whole human race. It is very essential that with the approach of a new age, men and women should develop a new attitude towards sex. Psychologists of the present age are intensely busy in developing uptodate methods showing people how to use this God-given sex-energy for the enhancement of the individual's Body, Mind, Soul and Spirit, which is precisely what the creator intended.

The new psychology of sex is positive, creative and dynamic, in that the individual is given special instruction and direction in the use of this creative force for regenerative purposes.

The new psychologists recognise that human body is a tremendous organism, which is an ever ready servant of the mind. But material body should be kept healthy and energetic, to carry out the orders of the mind and will. Then follow the logical progressive steps, in the control and constructive use of this vital energy, to regenerate the whole being.

of the burnt coals in the furnace turns to ashes and the whole frame work of the charcoals falls down with a crash, and with that with a sudden start you are roused out of your reverie and again commence your study.

There you are laughing with the hero, here you court with him. You sigh with him, weep with him, languish with him. You feel yourself in his shoes, transported to his world—a world of desires, of hopes, of passion, of sighs. You forget that you were worried about your mathematics and chemistry a few moments ago. Now it is just as if a spell had been cast over you and you have been transported away from this life—this wretched life of yours into a more pleasant, more realistic sort of life.

The dancing flames crackle and mock your thoughts with a chuckle.

Here you are in a horrible situation with the hero. The thrill makes your hair stand on end, the very life seems squeezed out of you. You feel something grips your heart. The story develops; the hero has had a narrow escape. You feel relieved, just as if a heavy load had been lifted from above your head.

You sit absorbed in your romances and adventures sometimes playing the hero, sometimes in the garb of a fool, a light step enters the room. A faint light from a flickering candle falls on your face, you raise your eyes and there the maid stands summoning you to your meals. You yawn and say, "What a life!"

RAHIM,
III Year.

The head-bearer of our hostel is our sergeant-at-arms. He is gifted with a commanding personality and one would swear he has deserted the army. He does not believe in obeying at all! You know we always ask for his 'favours' when he is in a mood

MOHAMMAD FEROZ SHAH.

Fiction

The evening is dark and lonely. The wind shreaks in the trees outside and beats its wild head against the window-shutters and the doors of your room. The weather is cold and dreary. You have drawn the blinds of your window. Your room is warm and comfortable with the fire glowing in the chimney. The Eastern rugs lie covering the ground under your feet. Wearing your light, loose garments, your overcoat spread on your shoulders, you sit besides the fire meditating over the incidents of the day you have just finished. The busy tiresome day. You reflect over your fortunes and misfortunes which you suffered during the whole day. You wish to relax your limbs and drop into a pleasant, happy reverie. You wish to forget all the humdrum of this life and enter a new world. You have struggled the whole day long, you wish to see others struggling. A book of fiction lies at your elbow. A novel with so many portraits of different people—people with different tastes, with different outlooks about life, heroes, lovers, the most notorious rogues. All lie sealed up in one volume. The passions of a lover, his sighs, his ecstasies all embodied in one man. You lose your identity among these various characters and feel yourself to be one of them. The contents of the book (if it really be a good book) charm you. You forget your whereabouts. In the hearth on the glowing coals in the flickering flames you perceive the indistinct outlines of a familiar human face—the hero of your book. He is seated, you perceive, on some rock, his hair dishevelled his eyes red with weeping. With him you feel yourself to be under a grip of grief. You feel your throat choking, your bossom heaving and gradually a tear or two moistens your eyelashes. Tears over the sad fate of your hero. One

dress almost every hour. He refuses to live in the hostel, for its food and accommodation is not up to his princely standard. First we thought he was a District Inspector of Schools, but later on we were told that he has applied for one. He is very conscious of his position, so much so that he used to go in a car to a **primary school** *of which he was the* ***Principal.*** *He always talks in English* and is very impressive and pleasing in manners.

The librarian of our association is a chap from Kashmir. He is very active and quick. He will seldom give you a chance to speak and always pretends to be another Einstein.

Amongst the cabinet members a few ought to be mentioned. The first member is very important. By sheer gift of his hypnotic look and fluency of language he can make you believe that 'black is white.' We are seriously thinking of making a strong protest against his 'lecturing habit.' Let us hope we succeed.

The second member is a man of iron will. He is calm, cool and dignified. He hates being taught. He is popularly called "doctor," but he is a psychologist. Pray to God you do not see him immediately before you go to bed.

The third member is known as "uncle." He is an old teacher, but quite young in looks and habits. He is here with some of his pupils. He is really a nice man.

Our first meeting took place soon after the first period. We were told that "in teaching corporal punishment should be the last thing to be done." This horrified us, and we moved a unanimous resolution condemning this statement and determined to carry out our own concepts of teaching as soon as we were out of the training. Further we were to forget all the teaching methods and were glad to find that some of our professors had already seconded us.

We are seriously considering the problem of P. T. in the morning and we are thinking out ways and means of avoiding it. But M. Adil Khan is much too hefty to allow any of our schemes to succeed. However, if he has the intention of measuring his strength with us, our Superintendent will be too glad to accept his challenge. That would probably make him think twice before forwarding his challenge. Besides we are going to request M. Adil Khan to take our phonetic class since the principal cannot do so now.

declare themselves as the votaries of freedom. There cannot be a better close for this essay than the words of Shakespeare in a slightly altered form :

"Who is here so base that wishes to be a slave ?
Who is here so uncultured that does not wish to be free like a Roman ?
Who is here so vile that does not love his country ?

Brutus' audience replied : "None."

Let us hope there is none in the present world too.

M. TIMUR.

Our B. T. Class

Our class is an association of the college's 'old warriors.' Our 'President' has invaded this college on many occasions since 1919, but was unsuccessfully driven out on every occasion. He, however, hopes that his conquest of the college will synchronise with Hitler's Conquest of the World. Let us hope it does not all come true. You will not be surprised to know that he has also decided to let half-of-himself appear in the coming M. T. Competition for wich the age limit is, we are told, 21, and he is already 42. This is his last chance.

Our Vice-President is a nice boy. He has relinquished his services in a local D. B. school to join us. We are told that one of his sons studies in the first year class. He is a hard worker, you know, and his fatherly advice is always appealing.

The secretary is a lad of pleasing personality. He is known by his walk. If mother Rigby were ever to see him, she would swear that she had found her scarecrow she had lost. But he is no less tricky than Mother Rigby and would easily outdo her. He occupies a very important position and we are afraid to reveal his identity further.

The Assistant Secretary joined us rather too late. But, you know he was very busy, for he was a headmaster in a certain school. Though a junior officer, he is very conspicuous. He changes his

play is that the climax is in the centre and not at the end. "It would appear to be inevitable then that the interest of the play must fall off after the successful accomplishment of the plot and the death of the great man, whose life and death have so long been trembling in the balance." (Ardent Shakespeare, Int. p. xv). This is, however, the first climax of the play. The central force which unites the different elements in the action of the play is the struggle between two principles of life. Caesar dies but his spirit lives after him and so the struggle continues and with it our interest in the play. As Cicero said, "We have taken away the tyrant; the tyranny survives." Our interest suffers a timely weakening at the death of Caesar but it gets a new life from the funeral oration of Antony which roused the revengeful instincts of the citizens of Rome against the conspirators. The struggle after a brief respite begins again with multiplied force. It is to be noted that in acts IV and V Shakespeare's attention is almost entirely concentrated on the characterisation of the republicans and he seems to ignore Antony and Octavius. The noble nature of Brutus as exhibited in Act IV scene 3, makes us completely sympathise with him and his aims. His words to his servant are worth remembering :

> "I should not urge thy duty past thy might
> I know young bloods look for a time of rest."

We forgive him Caesar's murder and wish him success, but the forces of dictatorship are too powerful for him. The second climax occurs in the defeat of the republicans. JULIUS CAESAR has thus two crises. In the first democracy scores a success against dictatorship; in the second and the final round dictatorship wins a decisive victory over democracy. But we are reminded by the poet that the right is with the vanquished. This is implied in the words of Antony who admits the righteousness of Brutus' cause :

> "He only, in a general honest thought
> An common good to all made one of them."

It is noteworthy that in the present world struggle too the dictators have been obliged from time to time to pay lip-service to the goddess of Freedom. In his latest speech which Hitler delivered a few days ago he said that he was fighting for the freedom of Europe. Human nature has thus proved to be too powerful for the most powerful dictator and democracy has already won the final victory over Hitler's dictatorial tendencies. There could be no greater victory for democracy than that both parties in the world-struggle should

final argument expressed in the form of a question : "Who is here so base that would be a bondman ," (III, 2) Antony by his clever oratory wins over the multitude to his side but loses the argument. He was successful in defending Caesar only by appealing to the principles of democracy, in other words by proving Caesar to be a lover of liberty. Antony's real attitude towards men is indicated by his remark about Lepidus :

"Do not talk of him but as a property." (IV, 1).

—that is, as a means to achieve his own ends. Here we may remember Kant's dictum that every man is to be regarded as an end in himself and not only as a means. If Shakespeare had anything to say in favour of dictatorship, he would have put his strongest arguments in the mouth of Antony. But he finishes the whole argument by making Antony admit that if Caesar was ambitious it was a grievous fault. The final argument in favour of democracy to which there is no answer not only in the play but outside it is that put by Brutus in the form of a question. Shakespeare seems to have so much faith in it that he makes Brutus repeat it thrice in different words. He says :

"Who is here so base that would be a bondman ?
Who is here so rude that would not be a Roman ?
Who is here so vile that will not love his country ?"

The condition denoted by base, rude and vile is such that nobody accepts it for himself, yet willing submission to a dictator would prove every man to be such. Dictatorship is, therefore repudiated by the highest nature of man.

The conscience of Brutus is so sensitive that he is constantly troubled by the idea of having killed Caesar wrongfully. Although he justifies it by logic yet his sub-conscious mind is not satisfied. Caesar's ghost, therefore, appears to him twice, once at Sardis and then at Philippi. Before committing suicide he says :

"Caesar now be still :
I kill'd not thee with half so good a will."

This shows that when he joined the conspiracy to kill Caesar his whole mind was not satisfied. And how could it be satisfied when he recognised the high qualities of Caesar even in his public funeral oration ? He attributes his defeat to this very cause when he says :

"O Julius Caesar, thou art mighty yet :
Thy spirit walks abroad, and turns our swords
In our own proper entrails." (V, 3).

> "Not that I loved Caesar less, but that I loved Rome more. Had you rather Caesar were living, and die all slaves, than that Caesar were dead, to live all free men ? As Caesar loved me, I weep for him; as he was fortunate, I rejoice at it; as he was valiant, I honour him; but as he was ambitious, I slew him."

Further on he says :

> "As I slew my best lover for the good of Rome, I have the same dagger for myself, when it shall please my country to need my death." (Act III, scene 2).

This is fair and frank and here Brutus rises to the same high moral plane from which he had descended when he joined the conspiracy. He openly confesses his share in the murder and boldly gives his reasons for it. The moral tone of this speech is quite in contrast with his advice to the conspirators before Caesar's death :

> "Good gentlemen, look fresh and merrily;
> Let not our looks put on our purposes,
> But bear it as our Roman actors do,
> With untired spirits and formal constancy." (II, 1).

These words seem to be unworthy of the Brutus who delivered the funeral oration.

We may now examine Mark Antony's oration. He does not defend dictatorship but tries to prove that Caesar was not ambitious and had no intention of becoming a king. He even admits that if Caesar had been ambitious it was right to punish him :

> "The noble Brutus
> Hath told you Caesar was ambitious;
> If it were so, it was a grievous fault,
> And grievously hath Caesar answered it."
> (Act III, scene 2).

Is Antony consistent in speaking these words after offering the crown to Caesar ? In order to prove that Caesar was not ambitious he says, firstly, that Caesar filled the general coffers with the ransom of captives he brought home to Rome, secondly, that he had a soft corner in his heart for the poor, and thirdly, that when he offered him a kingly crown at the feast of the Lupercalia he thrice rejected it. Mark Antony here disavows his cause. At heart he was one of the strongest supporters of dictatorship as his action in offering the crown to Caesar and his subsequent activities show. But he had not the courage to openly avow his principles. He had no reply for Brutus'

his attitude to the rabble of Rome. His vanity makes him eager for the empty honour of a kingly diadem, but he is so weak that the disapproval of the mob makes him reject the proffered honour." (Introduction pp. xxii-xxiii).

The truth about this play seems to be that the unity of its plan is not secured by chaining our attention to one principal figure. It has no hero in the ordinary sense, but is far from being destitute of heroic characters. The idea which gives unity to this play is that of struggle for freedom. The whole action moves round this pivot. Julius Caesar as represented here plays an appropriate part in this scheme. He is the tyrant or the chief barrier to freedom against whom all the action is directed. When he is removed from the scene his spirit, more powerful than himself, spreads like a dark cloud over the heads of the patriots and confounds their efforts. He and his spirit have great power like brute nature, though not the qualities which may excite the admiration of a lover of liberty. In consonance with the chief aim of this play Shakespeare could not have represented Caesar in all the grandeur of his historic position. But he did not underrate the greatness of his intellect, character and achievements as is shown by the magnificent eulogy pronounced upon him by Antony. Nor is Shakespeare guilty of any misrepresentation of the facts of history. "Every one of the defects attributed to Caesar is mentioned or implied in Plutarch. We must remember that Shakespeare is concerned with the last phase of Caesar's life and character. It is evident from Plutarch's account and still more from the pages of Suetonius that Caesar at the end of his life showed signs of deterioration in mind and body, as Napoleon did at a somewhat earlier age during the Waterloo campaign. It seems strange to hear the author of COMMENTARIES, one of the simplest and most unpretending narratives of great deeds that can be found in the autobiographical literature of ancient and modern times, speaking of himself in high flown language as if he were conscious of being exalted far above human nature. But this will cease to surprise us if we may believe Suetonius' information, that he declared that his words ought to be regarded as laws and still more that he had a golden chair in the Senate, that his statue was carried through the Circus with the same pomp as the statues of the gods, and that he had temples, altars and priests." (Arden Shakespeare, Introduction pp. xxv-xxvi).

Moulton has given a detailed analysis of JULIUS CAESAR in which he points out that the distinguishing characteristic of the

Here Brutus confesses that Caesar's spirit against which they were fighting was too powerful for them. Caesar was dead but he took revenge through those who loved him. That the consciences of the conspirators were not satisfied with the method they had adopted to remove Caesar from the seat of power is shown also by the words which Cassius speaks at the time of his death :

> "Caesar, thou art revenged.
> Even with the sword that killed thee." (V, 3).

It is a historical fact that democracy in this struggle against dictatorship suffered a grievous defeat in the Roman world. Shakespeare could not have altered it. It is one of the tragedies of life that evil sometimes triumphs over good. But Shakespeare could not have retrieved this defeat better than by making Antony confess at the end of the play, that Brutus was actuated by the idea of the common good of all. He totally admits this to be the principle by which all human actions should be judged and does not even attempt to propound a doctrine in favour of dictatorship. Democracy thus triumphs in the very defeat of its protagonist.

"The treatment of the living Caesar by the poet has been a puzzle to many of the critics. It is evident from the many allusions to the great Roman in the other plays, that his character and history had made deep impression on Shakespeare. Craik, after quoting the references to Caesar in AS YOU LIKE IT, II HENRY IV, HENRY V, the three parts of HENRY VI, RICHARD III, HAMLET, ANTONY AND CLEOPATRA, and CYMBELINE, remarks that these passages 'will probably be thought to afford a considerably more comprehensive representation of the mighty Julius than the play which bears his name.' 'We have' he adds 'a distinct exhibition of little else beyond his vanity and arrogance, relieved or set off by his good nature or affability.....It might almost be suspected that the complete and full-length Caesar had been carefully reserved for another drama.' Hazlitt remarks that the hero of the play 'makes several vapouring and rather pedantic speeches and does nothing; indeed he has nothing to do.' Hudson says : 'Caesar is far from being himself in these scenes; hardly one of the speeches put into his mouth can be regarded as historically characteristic; taken all together they are little short of a downright caricature.' " (Irving Shakespeare, volume V, page 85). The Arden editor says : "Shakespeare's Caesar is pompous, theatrical, subject to epileptic fits, fond of flattery, superstitious, and servile in

Caesar must bleed for it. And, gentle friends,
Let us kill him boldly but not wrathfully;

. . . .

This shall make our purpose necessary and not envious;
Which so appearing to the common eyes,
We shall be called purgers, not murderers."

(Act I, scene 1).

He wishes that he could destroy Caesar's spirit without killing his body but thinks it impossible. Therefore he takes the decision to kill Caesar, not however, in the spirit of envy but as a moral duty. Here Brutus falls from his high plane. His weakness lies in consenting to join the conspiracy at all. The method of assassination is against the spirit of democracy. Instead of killing the spirit of dictatorship it keeps it alive. Here democracy borrowed a weapon from dictatorship and so failed. If Brutus had faced Caesar openly and condemned his ambition on moral grounds and been put to death by the command of Caesar, he would have occupied a high place like Socrates, Christ and Husain among martyrs for righteousness. These three succeeded in destroying the spirit of evil by facing it openly and sacrificing their lives for the right. Democracy stands for justice for everyone and its strongest weapon is to state its objects clearly and openly to the world. Secret conspiracies are unworthy of its spirit.

After Caesar's murder Brutus allows Antony to make a funeral oration to the multitude. He again ignores the advice of Cassius not because he is incapabale of seeing the dangers of this course when pointed out to him, but because he feels the urge of the moral spirit to be stronger in him than worldly prudence. He is acuated by the love of liberty and cannot refuse the same rights to other men as he demands for himself. He desires that justice may be done to Caesar after his death. Therefore he says to Antony :

"Mark Antony, here, take you Caesar's body
You shall not in your funeral speech blame us,
But speak all good you can devise of Caesar,
And say you do it by our permission;"

(Act III, scene 1).

Brutus' funeral oration is worth examining. He does full justice to Caesar's great qualities but considers that he deserved to be punished with death on account of his ambition. He chooses the same punishment for himself, if he should follow Caesar's methods. He says :

death to living under a despotic rule. The words in which he expresses his conviction are worthy of a noble nature :

CASCA : "Indeed they say the senators to-morrow
Mean to establish Caesar as a king;
And he shall wear his crown by sea and land,
In every place save here in Italy."

CASSIUS : "I know where I will wear this dagger then;
Cassius from bondage will deliver Cassius :
Therein, ye gods, you make the weak most strong;
Therein, ye gods, you tyrants do defeat :
Nor strong tower, nor walls of beaten brass,
Nor airless dungeon, nor strong links of iron
Can be retentive to the strength of spirit;
But life being weary of these worldly bars,
Never lacks power to dismiss itself." (Act I, scene 3).

Shakespeare has written these lines so feelingly that I have no doubt that he fully sympatised with Cassius.

The spirit of democracy as exhibited by Cassius has an admixture of personal envy. He says :

"And this man has now become a god, and Cassius is
A wretched creature and must bend his body
If Caesar carelessly but nod on him." (Act I, scene 2).

But it is purified and raised to a higher level by Brutus when he says :

". . . . .and for my part,
I know no personal cause to spurn at him,
But for the general." (Act II, scene 1)

It has often been said that Brutus lacked practical wisdom, for he did not take Cassius' advice to kill Antony along with Caesar. The fact, however, is that it was not for lack of wisdom that Brutus did not accept Cassius' advice. Brutus stood on a high moral plane where it was not only wrong to kill Antony but even Caesar. He was permitted to destroy the spirit of dictatorship manifested by Caesar but not to kill his body. He faces this problem frankly but comes to a wrong conclusion. He says :

"We all stand up against the spirit of Caesar;
And in the spirit of men there is no blood :
O ! that we then could come by Caesar's spirit,
And not dismember Caesar. But, alas !

"Their fickleness is illustrated in the first scene of the first act of JULIUS CAESAR, and still more in the second scene of the third act. In the last scene of the third act we have a specimen of their brutal cruelty, and also of the curious fact, so abundantly illustrated by the French Revolution, that a large collection of men can be guilty of excesses that no single member of the collection would approve of if he stood alone. No one of the individuals composing the mob would have thought for a moment of killing a man simply because he happened to bear the name of a person whom they hated, and yet to do so seems a good joke to the murderers of Cinna. It is a significant fact that Shakespeare deliberately goes out of his way to add this touch of wanton injustice to the character of the Roman mob. In Plutarch's account the citizens kill Cinna because they really think him to be the conspirator of that name."*

The mob can be led to follow blindly either a dictator or a democratic leader. In scene 1 of JULIUS CAESAR the spirit of democracy has to struggle against mob-mentality which inclines with equal ease towards slavery or licence. This is why Marullus and Flavius (Act I, scene 1) rebuke the mob and Flavius says to Marullus :

> "I'll about
> And drive away the vulgar from the streets :
> So do you too where you perceive them thick.
> These growing feathers pluck'd from Caesar's wing
> Will make him fly an ordinary pitch,
> Who else would soar above the view of men
> And keep us all in servile fearfulness." (Act I, scene 2).

The true note of democracy is first sounded by Flavius when he says that Caesar would keep them all in servile fearfulness. Freedom for every man to think, speak and act as he likes without interfering with similar freedom for other men is the essence of democracy. The same note is repeated in beautiful words by Cassius :

> "Why, man, he doth bestride the narrow world
> Like a Colossus; and we petty men
> Walk under his huge legs and peep about
> To find ourselves dishonourable graves." (Act I scene 2).

What Cassius' mind revolts against is the idea of Caesar becoming King. While the mob in their servileness offered him the crown, the noble minds of Rome rebelled against him. Cassius prefers

*JULIUS CAESAR : The Arden Shakespeare.

free play of forces. Those who show the greatest courage and industry are the children nearest to her heart and they will be granted the sovereign right of existence."

It is not without reason, however, that democracies are ranged against dictatorships in the present life-and-death struggle. The democracies stand not only for their own freedom but at least profess to fight for the freedom of all nations. The dictatorships have shown by their deeds that they respect the freedom of no nation if it stands in their way. They have destroyed the freedom not only of their own but other nations.

It may be said against this that the dictatorships are fighting to have their due share of the good things of the world of which the democracies have more than enough. This may be partly true. There may also be some truth in the opposite suggestion that the dictatorsips want to dominate the world because they think themselves superior to all other nations. At any rate they have ignored the laws of justice and freedom in attacking neutral nations without warning and without any provocation on their part. Their method of gaining their rights is decidedly wrong. Without deciding how much right is on each side we may consider the abstract problem of the rights of individuals and nations. This problem confronts us in the present war in a very acute form and it may be roughly described as a struggle between democracy and dictatorship.

Shakespeare had to deal with a similar problem in JULIUS CAESAR. The only difference was that while in ancient Rome the struggle between these two principles was carried on inside a single nation, here the struggle has extended to the whole world. We have to see by the study of this play what Shakespeare thought about these principles and to which side his own sympathies were inclined.

The democracy which struggles with dictatorship in the play JULIUS CAESAR should not be identified with mob rule. "JULIUS CAESAR, CORIOLANUS, and the Second Part of HENRY THE SIXTH make it perfectly plain that Shakespeare heartily despised the multitude. If we want a direct expression of Shakespeare's opinion of the character of the many, we find it in the Introduction to the Second Part of HENRY THE FOURTH, where rumour speaks of :

> "....the blunt monster with uncounted heads,
> The still-discordant wavering multitude."

the beautiful plateau of Pahalgam. The next morning we were again in a bus which took us to Tangmarg direct. Here we camped with our Principal on a secluded site commanding an excellent view of the Kashmir valley. Immediately a lamb was killed to celebrate our arrival. We spent the afternoon at Gulmarg about 3 miles away. Next morning we were again in Gulmarg and went higher up to Khillenmarg (11,000 ft.). In the afternoon we returned to Srinagar. The next day was a Sunday and we went to the Mughal gardens once again. We visited Harven lake as well and spent the entire day in the gardens among too jolly throng of visitors in their holiday mood. On the 21st we left Srinagar and reached Murree late in the evening. We found the hotels packed and got only a miserable set of rooms. The next day we saw almost every beauty spot of Murree. On the 23rd we reached Rawalpindi, where the party dispersed.

ZIA-UD-DIN.

Shakespeare on Democracy and Dictatorship.

In some of his plays Shakespeare tried to solve some important human problems. For example, in OTHELLO he attacked the problem of the bond between husband and wife, in MACBETH that between king and subject, in LEAR that between parent and child. In the same way in JULIUS CAESAR he described the eternal conflict between the spirits of democracy and dictatorship.

The cause of the present world war is deeper than a conflict between two forms of government. The real cause is land hunger. Hitler says in his MEIN KAMPF, "As things stand to-day vast spaces are only waiting for the ploughshare. And it is quite certain that nature did not set those territories apart as the exclusive pastures of any one nation or race, to be held unutilized in reserve for the future. Such land awaits the people who have the strength to acquire it and the diligence to cultivate it. Nature knows no political frontiers. She begins by establishing life on this globe and then watches the

we had climbed the summit (14.000 ft.). From here we could see the two Gangabal lakes perched in a huge cup like formation with the lofty Harmukh (19,000 ft.) on the side opposite to us. Readily we descended for about 2,000 ft. and after fording the ice cold Gangabal stream on foot, ascended the opposite flank of the mountain in the afternoon. Although we had been all tired out by the long march our determination carried us step by step over the slope, up to the summit. It was almost evening when we camped beside a shepherd's encampment.

The next day we were up for a new start early enough, and gliding successively through flowery meadows, juniper, pine and walnut jungles and rice fields, like Clara in wonderland we "went down, down and down" from 13,500 to 5,200 ft. By two o'clock we were at the Wyle bridge with aching knees. The mail lorry carried us to Srinagar in the evening. We passed a happy hour at Ganderbal on the way. After having done a trek of more than a 100 miles we spent our next week in sight seeing. We stayed at Srinagar for two days and visited the museum, the state silk factory, the Karan Woollen Mills and many other places of interest.

On the 16th we engaged a bus and went to Verinag, the source of river Jhelum. After spending two hours in the garden and about the octagonal tank with rich azure water full of fish, we went to Achabal, singing all the way in low notes. In the well trimmed Achabal garden a musician with a rubab solicited trial. But the hearts of the party were then full of a music of a much higher order than he could play. We soon discarded him and set forth for Pahalgam where we reached in very high spirits at about 5 o'clock. The coolies demanded exhorbitant wages for carrying our luggage so all the members carried their own luggage from the bridge to the first Rajwas plateau, where we pitched our tents, prepared tea and dinner and drank and ate merrily till late in the moonlit night.

The next morning we were bound for Bisern. Ayaz wanted to stay behind to take rest. But I told him aside that we were going to a place only three miles away where a certain jolly member of our party would not help dancing. So we all went to Bisern and rolled on the velvety grass there and joked and laughed. When we were returning Ayaz looked significantly towards me when I pointed towards the centre of the meadow where the honourable member was dancing with his arms moving in beautiful curves. Doubtless it was no fault of his. The champagne-like Bisern air had made him forget himself. In the afternoon the members rode on ponies over

gathering clouds made the prospects gloomy and we had to make a forced halt. It began to rain as soon as we had pitched our tents. It was still raining when we got up the next morning. We had to remain under the shelter of our tents till 10 o'clock when we started while it was still drizzling. About two hours' stiff climb brought us to the summit of the pass (13,500 ft.). The clouds had dispersed by now and we had an exhilerating time when members of the party ate snow and gur and skided down the slopes covered with ice. Now we entered the Vishen sar valley and descended for about five miles over grassy slopes covered with patches of flowers. The brown marmots twittered merrily on boulders proclaiming the heavenly life they were living and the nectrine air they were breathing. Fat buffaloes were grazing on the rich grass of the meadows to grow still fatter and the large herds of goats and lambs were bleating out a tale of happy life. At one o'clock we reached the Vishen sar, a small beautiful lake of clear ice cold water. Then a short climb over a slope brought us to Krishen sar, where we camped.

The next day's march began with a long and stiff climb over a ridge with the two lakes affording an excellent views in our rear. At the end of the ascent we again touched 13,500 ft. Snow was in abundance and afforded another opportunity to the lively members for skidding. A descent of about four miles brought us to Hen sar, the largest among the lakes of its type. Two miles further on we halted for tea by Gad sar, known for trout fish. Here we purchased two fat lambs for Rs. 3|8|-. Then fording the Gar sar stream we climbed the second ascent of the day. The slopes of the mountain were covered for a short stretch by juniper trees. A mile's walk brought us to the most beautiful portion of the trek. The entire mountain slope, more than a mile wide, was covered with an extremely dense growth of flowers. The variety of the flowers changed after every 5 minutes and I could hear voices full of wonder and joy exclaiming : "A new and the best variety of flowers, sir." "This is the best portion indeed." How happy the flowers look under the afternoon sun ?" This lasted for three miles and we camped near Sat sar when the sun was nearly setting. Here we passed the coldest night at about 13,000 ft. The ext morning we passed by a chain of seven small lakes from which the place gets its name Sat sar. Our path was covered with high boulders. We passed Mangandob and marched across the flank of a mountain. In this ascent one of the ponies was exhausted and its luggage had to be carried by the men. Ayaz, who had wavered between two tracks, was left behind, and the guide had to be sent back to fetch him along. By 11 o'clock

cellent view of the city of Srinagar and the Dal lake with the Mughal gardens situated on its skirts. In the afternoon we rowed down the Jhelum river to visit the seven bridges connecting the two parts of Srinagar. At the fourth bridge we visited the Jumma Mosque, known for its lofty one piece wooden pillars.

On the 3rd July we engaged three shikaras and took our food and tea things with us. We passed the day on the Dal lake visiting Hazrat-bal, a Muslim shrine of great antiquity, Nasim bagh, known for its excellent tenting grounds under huge chinars, and the famous Mughal gardens Nishat and Shalamar. The next day was spent in making preparations for a hiking trip in the Sind Valley. Provisions were purchased with great care as a single omission would produce disastrous results.

On the 5th we started in a lorry for the Wyle bridge, the starting point of our journey on foot. We reached the bridge in heavy rain from which we took shelter in the tourists' hut. Here we engaged 11 pack ponies and in the afternoon made our start for Kangan, the next stage which is seven miles away. The next day's march was upto Goond, distant 13 miles from Kangan, and on the day following we reached Sonamarg covering 34 miles in all. The ascent along the road from Wyle (5,200 ft.) to Sonamarg (8,700 ft.) is almost imperceptible, and our party was all the time in excellent spirits. We thoroughly enjoyed the scenery of the Sind Valley, typical in Kashmir—rice fields rich in colour among which the Sind nullah roared and foamed with the dark green pine forests covering the mountain slopes. We camped on lovely lawns amidst groves of walnut trees on the sides of the Sind.

On the 8th we halted at Sonamarg and roamed through its excellent meadows full of velvety grass studded with flowers. The background of the landscape was formed by five glaciers on the lofty overhanging crags. Here we replenished our provisions. Manzoor and Mahbub showed signs of indifferent health on account of sudden change in the altitude. So they were sent back to Srinagar as it appeared unsafe for them to go to higher zones.

On the 9th we started our real trekking through the Nichni pass to the "Lake district." We made our start early in the morning in bright weather and were all full of stamina.

A stiff climb for about 3 hours among the juniper trees and the blooming flowers only increased our zest for walking till we reached the foot of the Nichni pass (1,200 ft.). But now unfortunately

How long will the garment of life remain torn ?
How long will you rest under earth like ants ?
Soar high and learn the ways of a hawk.
How long will you search for grain in the rubbish ?

I heartily thank you, Mr. Principal, for the opportunity you have afforded me to come into contact with your staff and students. I have laid before this audience some stray and rambling thoughts, which, though imperfect, may perchance set the young people on the path of serious reflection, which in its turn may bring their latent forces into play resulting not only in their own uplift but also in freedom of the country.

MALIK KHUDA BAKHSH,
B.A., LL.B.,
Speaker,
N.-W. F. P. Legislative Assembly,
Peshawar.

A Joyful Trek

[An account of the hiking club trip to Kashmir in July 1941 for which His Excellency the Governor donated an unsolicited gift of Rs. 400, which enabled eight deserving members to take part in the tour free of charge. It is difficult to find adequate words to thank His Excellency for the fillip which he has thus given to the activities of the club.

The following members took part in this trip : Ayaz, Ashraf, Asghar, Manzoor, Ataullah, Jadoo, Kundan, Ghafoor, Nawab, Sehatullah, Roshan, Sharif and Mahbub.]

The members assembled at Abbottabad on the evening of the 30th June. The next morning we started for Srinagar in an excellent bus, reached there at 6 p.m. and put up in a houseboat hotel called the 'Grand National.' The next morning we were standing on the Takhte Suleman peak from which we obtained an ex-

democratic nations seem to have lost sight of the dangerous potentialities of those nations, which had so far neither themselves evolved a democratic system of government nor had condescended to follow the democratic system evolved by others. Non-democratic countries either voluntarily or under pressure of circumstances succumbed to the rule of Dictators, who began to play the part of tyrants of ancient history and set a foot immense preparations with ruthless efficiency and speed with a view to obtain supremacy over the whole world. The result is that the dictators have let loose on the world such forces as are moving about like machines devoid of the milk of human sympathy. Democracy versus Dictatorship is a subject which is being discussed not in a Debating Hall but on so many battle fronts —in the air, on land and sea—where aeroplanes, bombs, parachutes, tanks, armoured cars, machine-guns, warships, submarines and instruments of like nature, are the weapons which are being used to destroy life and property. In the midst of this bloodshed and carnage the problem of India's system of government is also in a hotchpoch and is absorbing the attention of the Whitehall, Goverment of India and leaders of so many political parties in India. We cannot picture to ourselves the world of to morrow. We cannot say what the new order engendered by the war will be. Let us hope that a new era for which we are all longing will be ushered in and the reservoir of strength that India has, will come into play to surprise the whole world. Let us further hope that truth will prevail and those who want to crush the liberty of the individuals as well as the self-respect of nations will come to grief and in the new order of things there will be peace on earth and good will to mankind.

War or no war, you should never play the part of an irresponsible or indifferent spectator but put your shoulder to the wheel and plunge into the struggle, asserting yourself, voluntarily submitting to only necessary discipline and attempting to leave the world better and happier than you found it. Defeatist way of looking at the present events must be abandoned for all times. Be buoyant and brave. Stand firm and march on fearlessly having as your motto the words of the Poet of the East :

قبائے زندگانی چاک تاکے
چو موران آشیان در خاک تاکے
به پرواز آو شاهینی بیاموز
تلاش دانه در خاشاک تاکے (اقبال)

and students themselves to realize the importance of physical culture and to impose upon themselves the obligation to develop and maintain a sound body. As Muslims we must look for guidance to the Holy Quran which has prescribed knowledge and bodily prowess as a criterion for leadership. Saul (Talut) was appointed king of Israilites. The chief objection raised against him was that he was not gifted with wealth in abundance. Prophet Samuel told the objectors that God had chosen Saul above them because he was gifted abundantly with knowledge and bodily strength. Thus the combination of the two makes the man. Without knowledge man is a mere brute and without physical strength he is unable to assert himself and withstand the onslaughts of his adverseries In short I would like to see young students going out of Islamia College with a sound mind and a sound body and a spirit of self-assertion.

Man is a social being and he must so live as to promote not only his individual interest but must also promote the good of the society which means the greatest good of the greatest number. This end cannot be achieved unless he, while asserting himself, is prepared to do unto others what he would like others to do unto him. As long as he stands in need of some external pressure to compel him to act upon this principle, he cannot even maintain his individuality. If he is prepared of his own free will to submit to such laws as are made for securing this end viz. the greatest good of the greatest number he is a free man and not a slave. Freedom divorced from discipline is mere license of which the only fruit is disorder and chaos. It is thus necessary that Indian youth while learning how to assert themselves should also be taught the necessity of voluntary submission to discipline. The combination of the two qualities, viz., self-assertion and amenability to discipline make a successful citizen and a collection of such citizens makes a free nation. These two qualities, far from being the negation of each other, do entirely supplement each other. As long as they do not combine, there is no real independence but it is slavery at one time and anarchy at the other. I hope that those of you who have just graduated do realize the importance of this combination and I trust that you will so behave in the world that all, who come in contact with you will not only admire your behaviour but will also be benefited by your high example.

The world is passing through a very delicate period. Man appears to be tired of old order of things and is impatient to establish quite a new order. There were days when Democracy was an ideal. As soon as democracy was established in some parts of the world,

ducing clerks or even high officers devoid of all initiative unless these institutions instil into the students true spirit of self-assertion. It is high time that all methods, which have so far been adopted not only to subdue but in a way crush the spirit of self-assertion, be eschewed once for all and a free scope afforded to students for the cultivation of this feature of life, which undoubtedly is a positive virtue and is the very back bone of one's character. Some philosophers have from days of yore devoted greater attention to negative virtues and attempted to find the secret of salvation in what may be called self-annihilation. But Divine Revelation, which found its culmination in the teachings of our Holy Prophet (may we all be his sacrifice), has set at naught all these dogmas and taught the whole world irrespective of caste, colour or creed that the progress of humanity lies in asserting itself and subjugating all the natural forces. Man had lowered himself to the status of a mere worshipper of natural phenomena, whether sublime or otherwise; but the final revelation has directed him to realize his own position as vice-gerant of God and subjugate the universe. In the Koranic Terminology two words are used to describe the dignity of man, viz., کرامت , خلافت (vice-gerancy and high-dignity) and the third word تسخیر (subjugation) has been used to designate the supreme functions assigned to man. Let this line of study be pursued in the college and the students be guided and helped to go out armed with such knowledge as may enable them to perform true functions of humanity—namely, to assert themselves and subjugate and never to surrender ignominiously.

Self-assertion, as has already been said, is the dire need of India. There is always a danger that intellectual development may not lead to physical deterioration and thereby result in the weakening of the spirit of self-assertion. Physical culture is consequently absolutely necessary and, as long as a student does not possess a sound body, he cannot expect to have a sound mind. He may become an intellectual prodigy, but his high intellectual attainments will be only short-lived and will lead him nowhere. Physical culture must be as compulsory as the attendance in the class-room. I will go to the length of insisting on physical culture being included in the curriculum and I would require that no one should be allowed to go out successful unless he also satisfies a prescribed standard of fitness. Our universities have been at pains to encourage sports but they have not gone far enough to persuade an average student to take to sports. Things, as controlled by the University, will remain unchanged for sometime to come. It is upto the college authorities

laid truly and firmly, then there is a guarantee of success in the actual and practical struggle of life, which begins in its intense form when the college life comes to an end. Let those who are still under training take care that college life, although a paradise, should not turn out in their case to be a fools' paradise. They under the guidance of their professors should well spend their college days so that they may fully prepare themselves for actual and practical struggle. College is in a way a world in itself and one can, if he has his eyes open, find in the college life all the elements of the outside world, although on a small scale. The bane of life in our country and specially in our province is the virulent partisan spirit. It is against this evil that a young student has to guard himself. The cultivation and development of this nasty feature of life in college days leads to very unpleasant and harmful consequences in after life. Let there be healthy rivalry and useful competition. Co-operation and combination are certainly very essential elements of progress, but the trouble begins when one confuses conspiracy with combination and jealousy with healthy competition. I would like to warn my young friends against falling a prey to the fascinating and deceitful allurements, which the present-day jealousies and intrigues are holding out to young and inexperienced minds and I hope that those, whom I have the privilege to address this morning, will take to heart this one word at least and remember that it is the spirit of comradeship rather than of partisanship, which will ultimately prove of real help to them in life.

India has for centuries been under foreign domination and consequently the nationals of this country have lost those qualities, which go to enable a nation to occupy a position of power and honour in the world. In the words of a poet "self-reliance, self-respect and self-control—these three lead to sovereign power"; but to my mind a nation and for the matter of that even an individual must have one further quality which is absolutely essential for occupying a place of power and honour. One must rely upon oneself. One's own self-respect is immensely valuable; and unless one is able to control himself, he is likely to neutralize his qualities of self-reliance and self-respect. But all these three qualities must remain somewhat passive, unless one has, as I have already said, a fourth quality, namely, self-assertion. As a nation we lack this virtue to a great extent and therefore we have not been able, in spite of our pious wishes, to reach our goal. There are signs that India has shaken off her lethargy and has learnt for once in her life how to assert herself. Our educational institutions will be only machines for pro-

ideal of the establishment of the University, but are the college authorities and professors to sit still quite satisfied with the present state of affairs? No, they can do much even within the scope of the present system and prepare ground for further progress. Steps may be taken to enlarge the sphere of the subjects to be taught and by putting their heads together the professors can well improve the method of teaching and infuse into the students true spirit of learning and research. From what I know I conclude that the college authorities and the professors are conscious of their true functions and in spite of big obstacles, they are making a headway in the right direction. In view of the present circumstances they have to be slow but it is not too much to expect that they will be steady all the same.

The college is not only labouring under a disadvantage by being compelled to remain a subordinate institution of the Punjab University and to follow the time-worn methods of education, it has also got to live and move under a constitution which by its very nature does not appear to have been meant by its authors to be as immutable as the laws of Persians and Medes. It is very gratifying to observe that with a view to regalvanise the college and to bring its administration in a line with the fast changing times, there is a movement to amend the college constitution. But here one is constrained to remark that while time is fleeting and the path is a long one, progress is immensely slow and the changes which are under contemplation (and here one has to speak subject to correction) are not far reaching. All well wishers of the college are yearning for the day when the constitution will be put upon new, solid and useful basis, firstly because that will minimise the hardships which the college must experience in the absence of having a university of its own, and secondly because the new constitution, if it is in keeping with the needs of time, will certainly open a gateway for further and speedy progress. I have been closely watching the working of the college and have as its true well wisher felt it my duty to express my views quite frankly, for my failure to do so would have amounted to the suppression of the voice of my conscience.

College life is a sort of paradise where one spends the best years of the commencement of one's youth and has got the advantage of being looked after by others. Parents and guardians supply the needs of life while the professors are responsible for the intellectual nourishment of the students. But it is here that the foundations are laid for future life and "as the twig is so the tree will be." "The child is the father of the man," is as true to-day as it ever was and its truth will always be recognised in future. If the foundation is

sufficient to inspire those who are labouring in the field of acquisition of knowledge and research with a spirit of fidelity and devotion to the cause they have espoused. The invigorating breeze, which comes off and on from the Tribal Area and the self-governing territories beyond it, is a blessing which nature has denied to all educational institutions except Islamia College, Peshawar. The college whose chief aim is the propagation of oriental learning and the college which has for its motto the Koranic prayer رب زدنی علما must stand head and shoulders above all its sister institutions in the country. Its oriental library which has in its almirahs rare manuscripts of ancient and renowned authors of the East, is quite enough to create a feeling of respect for the glorious past. I am not here to take stock of the advantages reaped by the teachers and the students, who have been working in this institution for more than quarter of a century, though I hope that the unique position of the college as depicted by me just now, must not have failed to mould the character of seekers of knowledge and left a deep impression on their young and plastic minds. I have no doubt that those, who are responsible for the administration of the college and the instruction of students, will bear in mind the features of this institution which I have ventured to point out this morning and to build up such traditions as may be worthy of the Province and to send out citizens armed with high qualities—physical, intellectual and moral —to an extent that they may succeed not only to live themselves a life of honour and independence but may also serve as a beacon-light to the rest of the country. Inspite of the peculiarities of this institution it has so far as I am aware, not yet been able to come to its own; because it has to follow the stereotyped method of education which is not capable of bringing out or developing the innate potentialities of the youth of this Province. The system of education, which was devised more than eighty years ago, is not capable of producing the results which are necessary for modern society. The crying need of the Province has been and is a university of its own. It was the very first Legislative Council of the Province which passed a resolution recommending to the Provincial Government to take early steps to establish in the Province a University, which may be able to meet the present day requirements. There is no indication of any steps having been taken so far and the college has to look for inspiration, guidance and administration to the Punjab University and to follow its dictates, although the province has a very meagre representation there and has no effective voice in the formation of the policy of that body or the working out of details of that policy. At pesent one cannot expect speedy achievement of the

Convocation Address March, 28, 1942

It was with a good deal of hesitation that I accepted the invitation of your Principal to preside over the convocation this morning, because the acceptance entailed the responsibility to deliver an address to a body of people, learned as well as seekers after knowledge, and I did not consider myself competent to discharge this responsibility. I have bowed to the decision of the Principal and am before you this morning with no pretensions of learning or of such experience as may be utilized for the purpose of instructing the young people who have to tackle the intricate and baffling problems of struggle for existence. I shall say something which cannot be called new, nor will it be expressed in a language, which may bear a mark of beauty or elegance. It will be something very plain expressed in the most prosaic style and possibly in a very blunt manner.

Islamia College, Peshawar, is an institution which is unique in the country in more respects than one. It represents the life effort of a gentleman who was entirely self made and, though he could not lay claim to a high and liberal education in the technical sense of the term, yet he was so gifted by nature that by a spirit of enterprise coupled with a sympathetic heart he founded an institution of which not only the North-West Frontier Province but in a way the whole of Muslim India can well be proud. Nawab Sir Sahibzada Abdul Qaiyum Khan, who had a distinct personal character, has left his mark not only in this province but who by dint of hard work, perseverance and tactful handling of people and problems was able to extend his field of action to so many spheres of world-wide importance, the Round Table Conference, held at St. James Palace in London being one instance in point. The place, where the college is situated is historic not only because it is on the highway which connects India with Afghanistan and Central Asia but also because it has witnessed the ebb and flow of so many adventurous hosts and civilizations. The old Budhist universities and monasteries, which lie buried under ground in the college compound and its vicinity, are quite

1. Mr. Mohammad Ashraf Khan Durrani, M.A. (Alig), M.A. (London), Lecturer in Geography.
2. Dr. Mohammad Ihsanullah Khan, M.A., LL.B. (Alig.), Dr. Phil (Bonn), Dip. in German (Bonn), Professor of Philosophy.
3. Dr. Mohammad Jan Khan, M.Sc., Ph.D. (Alig.) B.T. (Pun.), Lecturer, Department of Education.

II. Clerical Staff. I have recommended that Mr. Mohammad Siraj, B.A., Stenographer to the Principal, and Mr. Gul Rahman, Clerk, Accounts Office, should be confirmed with effect from April 1, 1942.

Change of Principal. Dr. O. H. Malik, who had officiated as Principal for more than two years, left the college at the end of January to take up an important appointment in connection with the war. He had been appointed Director of Statistics in the Department of Supply. Since the 31st January I have been officiating as Principal.

In conclusion I would point out that there has been a great deal of extra work in these two months of February and March in connection with the examinations, the preparation of the Union building, the various college functions and so on. Sometimes work has had to be done hurriedly and many calls have been made on the time of individuals. I should like to thank the whole staff individually and collectively for the loyal and willing response they have made to all the calls I have made on their time and energies. The College Office, the Accounts Office, and the General Staff have been particularly hard-worked; but they have always worked with a will and have never shown any dissatisfaction, even when I have required their services late in the evening or on a Friday when they might legitimately expect a rest. If I may judge by my own feelings, they must be looking forward with great eagerness to the Spring holidays.

HADOW HARRIS,
Principal,
Islamia College, Peshawar.

the science laboratories, the Roos Keppel Hall, the Union building and the office. We have tried to get assistance from Government for the purchase of a small fire-engine, stirrup pumps and other fire-fighting equipment. Obviously, with the war coming closer to India and with the increased danger of air-raids the need of adequate equipment and preparation increases daily. The college air-raid Warden has arranged a scheme of activities in case of a raid; but for such a scheme to work effectively adequate equipment is needed. I have asked that a sum of Rs. 1,500 should be allotted for fire-fighting equipment in the college budget for the next financial year.

The Duty Society. A few words may be said about the Duty Society. This society was founded by the first Principal of the college, Mr. Tipping, to collect funds for scholarships for deserving students of the Islamia College who are unable to continue their studies of account of extreme poverty. The membrs of the society have made it a practice to try to collect subscriptions during the long vacation. The society for this session has managed to collect the sum of Rs. 1,876. Professor Shafi continues to be the Honorary Secretary of the society which is flourishing under his charge.

Majlis-i Islamiat. The Majlis-i-Islamiat has been making every effort to develop in the students a general interest in and devotion to religious instruction. Some learned scholars not belonging to the college have been invited to deliver lectures on religious subjects in the college under the auspices of the Majlis-i-Islamiat, and this year Maulana Abdul Majid Daryabadi, an eminent scholar, delivered a lecture in January.

The Tafseer and Hadees classes have been continued as usual and during the year under report about 25 students have benefited from the teaching in these classes.

To popularize these classes and to create a genuine interest in the students in the study of the teachings of Islam, four prizes, two of Rs. 25 and two of Rs. 15 are awarded at the end of the year to the most deserving students.

CONFIRMATIONS.

I. Teaching Staff. The confirmation of the following members of the staff was due on October 1, 1940. In view of their satisfactory work I have recommended that they should be confirmed in their respective posts with effect from October 1, 1941 and that their increments which will fall due on October 1, 1942 should be provided in the budget

mination was not held. The whole question will have to be gone into later in connection with the next session.

I have never been one of those people who think that examinations are unnecessary evils. On the contrary I consider that examinations are very necessary to test the progress of students and keep them up to the mark; but they should not be multiplied to such an extent as to interfere seriously with the time which is available for teaching. The system of supplementary examinations, moreover, unquestionably encourages slackness on the part of the students.

Discipline. This brings me to the question of discipline. On the whole I think that the students are amenable to discipline but naturally among nearly 600 young men there must be some who are inclined to be recalcitrant or even refractory. As Chairman of the English Department last term I noticed an extremely undesirable tendency on the part of some of the students to indicate their preference for this or that lecturer as their teacher in a particular course of study. There are certain elements in the college which, if not exactly disorderly, are at least refractory. I do not want to stress this point too much, as I am convinced that all that is required is that every student should realise that discipline will be administered with strict fairness but also with firmness and without respect of persons. The vast majority of the students, especially the senior students, are proud of the college and have a sense of responsibility towards it which will show itself if they are given a proper lead.

U. T. C. For many years past the authorities of this college have approached the Government with the request that a Training Corps should be established in order that the students should have the opportunity of receiving some military training. Now at last there seems to be a prospect of a U. T. C. being started. Four of the staff have volunteered to undertake a course of special training and they will form the Officers of the Corps, which we hope will come into existence next session. The Muslim University, Aligarh, has a very flourishing corps which I have often seen going through the evolutions of military drill. I think that the students of this college and this province should show an even greater natural aptitude for military training.

Fire-Fighting Arrangements. In this college, although there is a good deal of inflammable and valuable property, e.g., in the library, there are no arrangements for dealing with an outbreak of fire. Some arrangements should certainly be made especially for the library,

Class		*Appeared.*	*Passed*	*Pass Percentage*	*University Average.*
F.A.	..	35	30	85.7	63.4
F.Sc. (Non-Med.)	..	35	32	94.75	69.4
F.Sc. (Medical)	..	13	10	76.92	65.5
B.A.	..	44	26	58.63	54.7
B.Sc.	..	6	6	100.0	65.4
English Hons.	..	2	2	100.0	..
Arabic Hons.	..	1	1	100.0	..
Persian Hons.	..	2	2	100.0	..

Distinctions. Some of our students particularly distinguished themselves in the examinations. In the M.A. examination in Mathematics Gurmukh Singh was placed in the First Division and obtained first place in the province. In the B.Sc. examination Mirza Saleem Anwar and Abdur Rahman obtained second and third places respectively in the whole University. In the Final B.Sc. Agriculture examination Sayyed Hassan Saeed was placed in the First Division and obtained first place in the province. And, finally, in the B.T. examination Sant Ram obtained second place in the whole University.

College Internal Examinations. In my opinion there are too many examinations in this college. Besides holding a Test Examination in January and a Promotion examination in April, supplementary examinations to these two examinations are also held. There are also separate examinations for Agriculture students. Last term in addition to these there was a Mid-Term examination which served no useful purpose. One of my first actions after taking up the responsibilities of the Principal's office was to cancel the Mid-Term examination for this term. I have never before been in any educational institution, school, college, or university, where there were so many examinations. The consequence of this is that there is considerable interference with the teaching work; and the staff have hardly finished with one set of question papers and answer-books before they have to start on another set of question papers and answer-books. I note from one of Mr. Holdsworth's reports that he made a serious effort to reduce the number of examinations; but the system of supplementary examinations was apparently restored subsequently. As it is undesirable to make important changes in the middle of the session, I have let the system continue for this term apart from the fact that the totally unnecessary Mid-Term exa-

There has been a large increase in the number of B.T. students. Thirty-eight students are on the rolls at present. The Department badly needs the serv'ces of at least one more part-time lecturer. If any of the present part-time lecturers, (e.g., in Geography and Mathematics) are given extra work in their own subjects in the college next year, it is clear that arrangements for at least one more full-time Professor for the Education Department will have to be made.

The Univers'ty has suggested that a Geography room should be fitted up in the school. The library has been considerably added to during the year; but it is still inadequate for the needs of a large class. A tour of some model institutions in the v'cinity should become an annual feature. It is derisable that B.T. students should be admitted before the vacations, as is the practice in the Central Training College, Lahore.

Arab'c. There is some increase in numbers this session. Under the new regulations candidates can answer the papers either in English or in Urdu. This was intended to make things easier for the students; but it is certainly no help to the Pushtu-speak'ng candidates. B.A. Honours classes in Arabic have been working successfully since 1936. The Chairman would like to start M.A. classes, if an additional lecturer could be prov'ded.

Results of University Examinations. The Univers'ty Examination results for 1941 are subm'tted below. It may be noted that in the F.A. and F.Sc., and B.A. and B.Sc. examinat'ons, where the University averages are also given, the average of passes for students in this college is higher and often much higher than the average of passes for students in the University taken as a whole. I think these examination results may be considered very satisfactory.

Class	*Appeared.*	*Passed.*	*Pass Percentage.*	*University Average.*
I Year Agr. ..	7	3	42.85	..
II Year Agr. ..	14	9	64.28	..
III Year Agr. ..	16	12	75.0	..
IV Year Agr. ..	12	8	66.6	..
S.A.V. ..	18	18	100.0	..
B.T. ..	30	30	100.0	..
M.A. English ..	4	1	.25.0	..
M.A. Mathematics ..	3	2	66.6	..

Geography. This subject has been taught in this college only since 1940. Last October saw a marked increase in the number of first year students. At present we do not teach beyond the Intermediate standard. If B.A. classes were started there would undoubtedly be a great response from the students.

Philosophy. The number of students in the Philosophy classes is steadily increasing. In the session 1939-40, there were 10 students in all classes; in 1940-41, there were 12, and in 1941-42, this session, there are 27. We have a well qualified staff in Philosophy and B.A. Honours classes have been started and M.A. classes may come in due course.

Persian. This is quite a popular subject and the number of students is quite large especially in the first and second year. The examination results have been excellent.

Chemistry. Here again there has been a large increase in numbers in the first and second year classes and consequently the accommodation at the disposal of the Department is becoming increasingly inadequate. At least one more lecture-room is required for practical classes. The additional Demonstrator appointed to the Department this session has given some welcome relief to the hard-pressed staff of the Department.

Physics. There has been a large increase in the number of students, especially in the first and second year. There has been a corresponding increase in the total number of lectures and practical classes. Mr. Abdul Sattar, M.Sc., was appointed Demonstrator in Physics in October 1941, to deal with the additional work.

Zoology and Entomology. Here again there has been some increase in the total number of students in the Intermediate classes. Otherwise the numbers remain much the same. The Chairman's report deals mainly with technical matters relating to the work of the Department.

Botany. The Chairman reports a considerable increase in the number of students for F.Sc. Medical. There has been some decrease in the number of students in the Intermediate and B.Sc. (Agri.) classes. There has been an increase in the total number of classes. The Chairman suggests the appointment of a new Demonstrator in the Department.

Education. The Chairman reports that this session there has been only one class, the B.T. class. There has been no S.A.V. class

Some provisions must be made for the Department of English from the beginning of the session, 1942-43, if I continue to officiate as Principal next session. At present, apart from myself, there is only one Professor with qualifications from a British University in the Department. I have, therefore, suggested that a man with good qualifications from a British University should be appointed. In Mr. Holdsworth's time, excluding the Principal, there were seven Professors in the English Department of whom three had European qualifications. Next October, unless an appointment is made in time, excluding the Principal, there will be six professors in the English Department of whom only one has European qualifications. Meantime the number of students in the college, excluding B.T. students, has increased from 455 in 1938-39 to 543 in 1941-42, and the English classes are larger and more numerous. It is, therefore, most important that a man with good European qualifications should be appointed before next session.

Mathematics. There has been some increase in numbers on the whole, including a good number of students in the first year M.A. class. Mr. Abdul Hashim, M.A., B.T., was appointed lecturer in Mathematics in place of Mr. Faizullah Khattak, M.A., B.T., who had obtained a Commission in the Army. Some slight rearrangements had to be made in the teaching work of the M.A. classes after Dr. Malik's departure.

Economics. The number of students has remained nearly the same with some slight variation from class to class. The Chairman points out that the subject is a difficult one and that students find difficulty in understanding the principles. He has accordingly sometimes made explanations in the vernacular in accordance with the recommendations of the Economics Teachers' Conference held at Lahore last year. This experiment has proved a success.

History. There has been a large increase in numbers in the first year class. Otherwise the numbers are much the same as last year. The whole work is done by one professor whose duties are very onerous.

His Excellency the Governor was graciously pleased to give a donation of Rs. 400 for an historical excursion for the benefit of the students of the 4th year class. This historical tour was an unqualified success. In this tour, the students visited Aligarh, Agra, Fatehpur Sikri, Delhi and Lahore and studied the salient features of the Indian and Saracenic architectures.

the University in the Inter-University Athletics. Of these one took second place in the Long Jump. The college team were the runners-up in the Inter-Islamia Colleges Tournament at Lahore. We have retained the Shield given for the annual relay contest with Edwardes College.

Hockey. A successful season. We reached the finals in the matches against the other Colleges and the Semi-Finals in the Sahibzada Abdul Qayyum Cup. Two of our players were selected to represent the N.-W.F.P. in the Inter-Provincial Championship. Mr. Razzaq was asked to captain the side.

Football. Two of our players were selected to represent the Punjab University in the Inter-University Tournament. One has been awarded the University Blue.

Tennis. The College has won the "doubles" final in the N.-W. F. P. Championship Tournament.

Cricket. Two of our cricketers were selected to represent the N.-W. F. P. in the Ranji Trophy Tournament.

Basket ball, Volley ball and Boxing also occupied the energies of some of the students.

Hiking. Last summer H. E. the Governor generously gave a large sum to our Hiking Club and a trip to Kashmir was arranged which was a great success.

DEPARTMENTS OF STUDIES.

English. There has been a large increase since last session in the number of students in the First and Second year. This has necessitated increasing the number of sections in the First Year classes. Fortunately during this session the English Department has had its full staff; but even then the work has been onerous. I was appointed Senior Professor of English and Chairman in October, 1941 and continued in that capacity till the end of January, 1942. Since I have been officiating as Principal. Professor Timur has acted as Chairman of the Department. The University examination results in English in April, 1941 were satisfactory. As usual quite a large number of students have joined the first year M.A. class in English.

cipate in its revels. This is the most unhappy season of the college session. Then we have a normal season, that falls between the summer vacation and the examination season. During this period days 'live longer,' and nights 'die away so soon' and we have nothing to do but to kill time and to allow nothing on ourselves except a loin cloth or a pair of shorts.

In spite of these changes and variations, stagnation, too has crept in into some aspects of college life. The intellectual aspects is the most conspicuous by its inertia. But let us look to that happy day, when the sterile intellect of the Pathanland is regalvanised.

M. A. RAUF,
B.A. (Hons.)

The Principal's Report on the Progress of the College in the year 1941-42*

Colonel Campbell, Ladies and Gentleman,

General. The year has been one of steady progress in all branches of the College. This will be illustrated by detailed examination of the reports of the chairmen of the various Departments. In a general way it may be stated that there was a large increase in the number of students entering the College in the first year and this has affected many of the Departments, some of which require an increase of staff now or in the near future. Increase of prices of equipment and materials, which has been caused by the war, has led to an increase in the budget requirements of the various Science Departments.

Athletics and Games. This has been a very successful year. In Athletics the College won Rai Bahadur Mehr Chand Khanna's Cup in December, 1941, thus bringing the Cup back to the college after four years. Two of our athletes were selected to represent

NOTE.—*In view of this detailed report about the activities of the College, we have cut out the College Notes for this number.—*Ed.*

Like the president-makers, they too, have traits of their own. As for instance, they are always on the look-out for some general nuisance or for some loophole in one's conduct, which they flout and thus ever keep themselves as busy as a bee. They seldom honour the classroom, or if they do, they only take upon themselves the snoring business. Dangerous creatures they are no doubt, but in matters of keeping discipline, they are the only mainstay of the college authorities. That is why the proctorial monitorship falls to their lot. I would say without any stint or fear, that at times, they betray their own community.

A student or two in every class, though not branded as 'mushrote,' yet go by some very thrilling names. Thus we have some contagious and infectious students, such as, 'plague' and 'cholera,' the two most reputed of them.

The remaining students are the common citizens of this funny world. They form the majority but as the dictum goes, that 'it is the minority that rules,' they are like pawns in the hands of the *mushrotes. The college rules seem to have been formed only for them,* because the students of the first category, even if they defy the rules, are ignored. The proctorial monitors fine the common students exclusively, the head clerk frowns at them with his *glasses dangling on his nose and eyes bulging out;* and the accountant treats *them in a most cut and dried manner.* But in fact, it is they who infuse force in the college rules by obeying them. Had this law-abiding section of the student community been extinct, upon whom the power-maniacs would have asserted their officiousness ? I would again suggest to the college authorities to pass a vote of thanks to them, because it is they who fill the coffers of the college by paying fines; it is they who show the best academic results; and to sum up, it is they who run the college.

Enough of the crazy population of the college. Let me now tell you how the cycle of seasons revolves in this queer little world.

In the college, we have three seasons in all. Every session begins with the 'Election Season,' which is in fact the spring of the college. The regular election fighting—canvassing, handbills, speeches, promises and threats, processions and tea-parties and occasional skirmishes —creating a lively atmosphere. It is then and not in the real spring that we find decaying spirits again blooming, broken hearts again enlivened, for, when the spring comes in nature, the examination season sets in. We look at nature's face, sparkling with flowers and green verdure, but we heave a sigh, because we cannot parti-

over and that of youth even sooner, with never a hope of return; so why blight it with examinations and efficiency ?

> There is one spoilt spring to scant our mortal lot
> One season ruined of our little store.
> May will be fine next year as like as not;
> Oh ay, but then we shall be twenty-four—

or much older.

I. H

The College Panorama

Even in the college, life is like a dome of many-coloured glass, for the college is just a world-in-miniature or a magic cup like that of the great Persian king, Jamshid, in which the whole world can be viewed. There are its kings and lords, its patricians and republicans, its pariahs and untouchables, its 'mushrotes' and dandies. And most strange to say the students have created, as if it were, a family atmosphere by making many 'baba jans,' 'chachas,' 'lalas' and 'mamas' from out of their own community.

That history repeats itself, is indubitably true, for, not to speak of the bigger world of bitter realities, even in the college its chief incidents are staged from time to time, though on a much smaller scale of course. Like the Earl of Warwick in England and he was called a king-maker, we have the 'president-makers,' who are reputed to have the president of the union under their thumb.

I would here even suggest humbly to Professor Shafi that, if only he taxes his brain a little more, he will be able to illustrate every event in history with a somewhat corresponding event in the annals of the college. The playfields of this college have been the cock pit of many civil wars, the eye-witness of many revolutions and strikes.

One thing that I greatly admire in the college is the total disregard of the financial conditions of a student in connection with his social status. Being the son of wealthy parents does not make a student prominent in the college. He can be influential even if he is financially embarrassed. The 'mushrotes' of our college are an instance in point. Though small in number, they have yet a prosperous future, for, the present first year class contains many 'mute inglorious mushrotes' who are perhaps destined to make their mark felt in the future life of the college.

However that is not our concern at the moment. 'April is the cruellest month' is true in a different and more flippant sense, than that meant by Mr. Eliot. April is the cruellest month for those who have to take their examinations in spring. It was a stroke of most refined irony on the part of the University to make their examinations coincide with the best season in the year. Ours is a comparatively dull country with regard to the seasons. A none too long winter, a brief autumn, a fleeting spring and a long monotonous summer whose each blazing day is different from the other, only by further rise of temperature! Not for us, for example, the changing glories, of European seasons, where every day is touched with an individuality as marked as that of every 'human face divine.' No wonder the European can talk so much about the weather! But what we lack in variety, we perhaps make up in the richness of our brief but sumptuous spring. Our flowers smell stronger, look gaudier (though, alas, not last longer) and our nights have a magic more haunting than those of colder countries. A moonlit night in March, with a soft breeze laden with a thousand evanescent smells, is perhaps the most romantic thing imaginable, 'mixing memory and desire,' even though instead of the usual concomitant of 'Thou beside me' one were to have the spectre of a most unromantic examination looming ominously ahead. In spring the young man's 'fancy turns lightly to love,' although, as things are, it also turns heavily to books. He might well say,

> I saw around me the wild field revive
> With fruit and fertile promise, and the spring
> Come forth her work of gladness to contrive
> With all her reckless birds upon the wing,
> I turned from all she brought to what she could not bring—

the peace and leisure to behold and appreciate that beauty. The night may be flooded with the numinous moonlight but shut in ones dingy cubicle one has to mug up fourthhand notes on some thrice dead subject; the peaches and pears may be in blossom, converting the garden into the likeness of an etherial Chinese painting but one has alphas and betas and $\frac{dy}{dx}$ to throttle the imagination. Discipline and Utility are all very well but let nothing quench the delicate responsiveness of the young, the capacity to touch, hear, smell, taste, and see things in a 'wakeful anguish'—to feel one's own sap course through the veins in spring, as it does in the newly awakened twigs, shooting poignantly out almost overnight. The miracle of spring is soon

THE KHYBER

No. 1] PESHAWAR, APRIL 1942. [Vol. XXVI.

EDITORIAL

April is the cruellest month breeding
Lilacs out of the dead land, mixing
Memory and desire, stirring
Dull roots with spring rain.

Thus Mr. T. S. Eliot in the best known contemporary poem **Waste Land**. The theme here is the attractiveness of death, or of the difficulty in rousing oneself from death-in-life in which the people of the Wasteland live. Men are afraid to live in reality. Hence April, the month of rebirth, the "juvescence of the year," is not the most joyful season but the cruellest. Men dislike to be roused from their apathy, their death-in-life.

It remains for some Indian scholar to apply Mr. Eliot's diagnosis of European civilization, to the Wasteland of India and bring out the India, along with the rest of the world is suffering. That the theme may India along with the rest of the world is suffering that the theme may be fruitful, is suggested by Mr. Eliot's own quotation from the Upanishad, suggesting a remedy—'Datta, dayadhyam, damyata' (Give, sympathise, control) and the note of 'Shantih' (the peace which passeth understanding) on which this remarkable poem ends.

Editorial Board, THE KHYBER, 1941-42
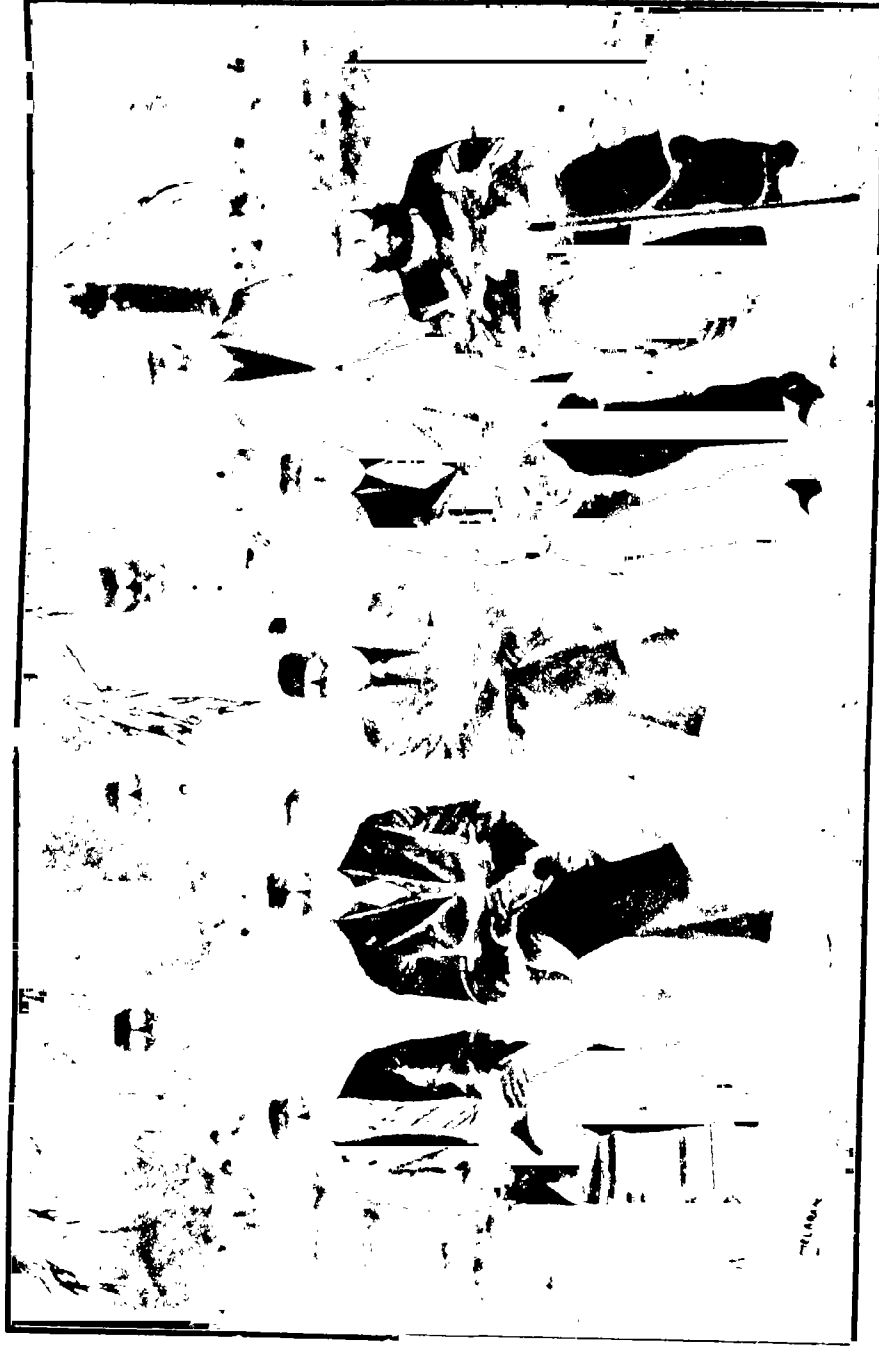
Standing.—Abdur Rahim, III Year (English). Abdul Majid Akhtar, III Year (Urdu). Mohd Yusuf, (Pashto). M. A. Rauf B.A. (Hons.), (English)

Sitting—Prof M. Habib, M.A., Edit., Urdu. Dr. Imdad Husain M.A., Ph.D. (Edin), Editor-in-Chief. Mr. Hadow Harris, M.A., (Hons), Principal Q Inayat Ullah M.A., Editor English. M. Abdur Rahim, M.A., Edit. Pashto.

THE KHYBER

ISLAMIA COLLEGE, PESHAWAR

Contents

خیبر

دار العلوم اسلامیہ سرحد

مدیر
محمد افضل بی اے

نگران
پروفیسر کلیم افغانی

نائب مدیرین
صفدر گیلانی
ایم سعید

جلد 26 — فہرست مضامین — نمبر 1

فہرست مضامین

اداریہ

سنہ ۱۹۴۲ء ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔ ہم صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ آنچہ گذشت بگذشت۔ بیتے ہوئے دنوں کی یاد دلانا عبث ہے۔ بموجب دستور زمانہ ہم اب نئے سال کا نہایت خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرتے ہیں اور تمام ناظرین کی خدمت میں سالِ نو کے ورود مسعود پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ صرف ہماری ہی نہیں بلکہ تمام اہل عالم کی امیدیں اس سے وابستہ ہیں۔ خدا کرے نیا سال ہم سب کو مبارک ہو۔

موسم گرما کی تعطیلات ختم ہونے پر بادلِ ناخواستہ دارالعلوم کی راہ لی۔ کیونکہ دلآرام ساعتوں کی یاد ابھی تازہ تھی۔ یہاں پہنچے تو ہر روز روزِ صیام اور ہر شب شب تراویح بن گئی۔ الحمدللہ۔ کہ ماہ صیام بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔ عید کا چاند دیکھا تو باچھیں کھل گئیں۔ سجدۂ شکر ادا کیا۔ سمجھے کہ شاید ع "نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو ہے"۔

کیونکہ ؎ ہم بگران سلطان زادریں میدان ہمے بیند۔ کہ پیشانی کند چوں میخ، ہمچوں نعل خم گردد

مگر افسوس ؎

اک نظر ہم بھی اٹھا کے رہ گئے — دل کے ارماں لب پہ آ کے رہ گئے

حاصلِ جلوہ یہی دو اشک ہیں — آنکھ میں جو ڈبڈبا کے رہ گئے

عید گزرتے ہی سرزمین ملت خیبر بالکل تیار ہو گئی۔ تخم انتخاب بو یا گیا۔ آبیاری کی گئی تو نخل انتخاب لہلہانے لگا۔ نت نئی کلیاں چٹکنے لگیں۔ لاکھوں جتن اس کی سرسبزی اور شادابی کے لئے کئے گئے۔ ثمر انتخاب تیار تو ہو گیا مگر خرابی موسم کی وجہ سے جلد اس کی خرابی کے آثار ہویدا ہونے لگے۔ آخر جو ہونا تھا سو ہوا۔ کمر ہمت نے جواب دیدیا۔ دوبارہ تمام جانفشانی کے اعادہ کی سکت باقی نہ رہی۔ بہرحال انتخاب ہونا تھا۔ ہو چکا۔ ہم تمام کامیاب اصحاب کی خدمت میں مبارک باد عرض کرتے ہیں۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

۲ر دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء کو اعلیٰحضرت فرمانروائے بھوپال اپنے آبا و اجداد کے وطن مالوف میں تشریف لائے۔ کالج کونسل نے ان کی خدمت میں استقبالیہ سپاسنامہ پیش کیا جس کے جواب میں انہوں نے ہمیں چند آویزۂ گوش نصائح سے نوازا اور کالج کو مبلغ بیس ہزار روپے نذر کئے ہم ان کے اس بیش بہا عطیہ کو عین نعمت ترشحِ گروانتے ہیں۔ اعلیٰحضرت موصوف کی تشریف آوری سے خیبر یونین کی قسمت بھی چمک اٹھی۔ مدت کی آرزوئیں بر آئیں "کننگھم خیبر یونین ہال" کی رسم افتتاح حضور انور کے دست مبارک سے ادا ہوئی۔ انہوں نے خیبر یونین کا لائف ممبر ہونا بھی منظور فرمایا۔ زہے قسمت۔ رسم افتتاح کی ادائیگی کے بعد کالج کونسل نے اعلیٰحضرت کے اعزاز میں ضیافت دی۔ خدا کرے دارالعلوم کے محسن و مربی کو حیات جاوید نصیب ہو۔ اور مادر وہر انہیں اپنے سایۂ عاطفت میں پرورش کرے۔ آمین۔

ہماری اقبال مندی کا دور یہاں ختم نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں پردۂ غیب سے اور کیا ظہور میں آتا ہے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات - چنانچہ "کننگھم خیبر یونین ہال میں پہلی تقریر ہم نے ڈاکٹر سید ہادی حسن صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے سُنی - ان کی تقریر کا موضوع تھا "اسلامی تہذیب"۔ تقریر اپنا جواب آپ تھی۔ گویا اسلامی تہذیب کا آئینہ تھا۔ جو ہمارے سامنے پیش کیا گیا۔ ع اللہ کرے زورِ بیاں اور زیادہ۔

صوبہ سرحد میں ہماری مشترکہ زبان اردو سے متعلق کے پہنچنے کی تمام ذمہ داری دارالعلوم اسلامیہ سرحد پر ہے۔ اور دارالعلوم کا یہ مقدس فریضہ زیادہ تر ہماری "بزم السنۂ شرقیہ" پر عائد ہوتا ہے۔ ہمیں بزم موصوف سے کافی توقع ہے کہ وہ اس کارِ خیر کے سرانجام دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریگی بشرطیکہ آپ حتی الوسع اسکے ممد و معاون رہیں۔ بفرضِ محال اگر کچھ کوتاہی ہوئی تو قوم کی تباہی کے سوا اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ کیونکہ جس قوم کی کوئی اپنی مشترکہ زبان نہیں اس کا کوئی علم و ادب نہیں اور جس کا علم و ادب نہ ہو اس کا کوئی تمدن نہیں اور جس قوم کا کوئی تمدن نہیں۔ اسے اس عالمِ شہود میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

اس مقدس فرض کی ادائیگی کا دوسرا پہلو ہم پر عائد ہوتا ہے۔ چونکہ "خیبر" آپ لوگوں کی ذہنی کاوشوں کا آئینہ دار ہے اس لئے ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کی خاطر اپنے محترم متقدم کی صدائے صحرا دُہرانے پر اکتفا کرتے ہیں "یاد رہے کہ مدیر کی حیثیت ایک معمار کی سی ہوتی ہے جیسا مواد اسے ملیگا ویسی عمارت وہ بنا دیگا" چنانچہ آپ نے اگر ہمارا ہاتھ بٹایا تو فبہا۔ ورنہ اگر آپ نے کچھ بھی تساہل کیا تو تمام قصور آپ کا ہوگا۔ آپ ہمارے لئے نہ سہی اپنی آن کی خاطر اپنی قومی شان کی خاطر اپنی قلم کو جولانی دیں تاکہ آئندہ نسلیں ابدالآباد تک آپ کے گُن گاتی رہیں۔

(افضل)

تعطیلاتِ موسمِ گرما کے دوران میں ہمارے محترم پروفیسر سید یوسف علی شاہ کا انتقالِ پُرملال ہوگیا۔ دُعا ہے کہ خداوند تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

ماہ دسمبر ۱۹۴۶ء کے اوائل میں محترمی پروفیسر عبدالرحیم نیازی کی اہلیہ محترمہ کچھ مدت علیل رہ کر اس دارِ فانی سے رحلت کر گئیں۔ ہم دست بدعا ہیں کہ رب العزت مرحومہ کو خلدِ بریں نصیب کرے اور نیازی صاحب و دیگر لواحقین کو اس سانحۂ جانکاہ کے برداشت کرنیکی توفیق بخشے۔

"ادارہ"

ایسی کوئی تحریر!

کیا پوچھتے ہو ہمدمو! تحریر کے اوصاف — تحریر وہی ذہن میں ہلچل جو مچا دے

تحریر وہی خونِ جگر سے جو رقم ہو — تحریر وہی دل کے جو ارمان جگا دے

تحریر وہی جس سے رگوں میں ہو لہو تیز — تحریر وہی رمزِ خودی کا جو پتا دے

جو حسنِ فلک سیر کو دے سوزِ جگر تاب — جو عشقِ زمیں بوس کو اک آہ رسا دے

جو نقطۂ موہوم کو دے وسعتِ افلاک — جو ذرے کو خورشید کے انداز سکھا دے

جو روحِ پُر آشوب کے سیماب سے جلوے — ہر بسملِ مشتاق کی آنکھوں میں بسا دے

اس درجہ ہو بیتاب نظر لیلیٰ معنی — ہر گام پہ خود پردۂ الفاظ اٹھا دے

محبوب ہو مجھکو مرے اس جینے کی تلخی
ایسی کوئی تحریر طرب ریز خدا دے!

(کلیم افغانی)

اقبالؔ کا جہانِ نو

چشم بکشا اگر چشمِ تو صاحب نظر است — زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است۔

جس وقت سے انسان نے بولنا سیکھا۔ اسی وقت سے شاعری کا بھی آغاز ہوا۔ شروع شروع میں تو بزم آرائی کے لئے حالاتِ رزم کو نظم کیا جاتا تھا۔ لیکن جلدی ہی اس کے بعد وہ دور بھی شروع ہوا جس میں "شعوری شاعری" عالم وجود میں آئی۔ اور شاعر محض گل وبلبل کے نغموں اور جوانی کے عشق ومحبت کی داستانوں کو قید قافیہ وردلیف میں لانے کی بجائے، انسانی حیات کے اہم پہلوؤں پر فلسفیانہ انداز سے تنقید کرنے لگا۔ ماحول کی یکرنگی اور حالات کی یکسانی سے عام انسان اکثر تنگ آجاتا ہے۔ تو شاعر جو کہ فطرت کی مخلوق میں شاید لطیف ترین دل کا مالک ہوتا ہے۔ کب چیزوں کو ان کی موجودہ حالت میں دیکھنے پر اکتفا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ وہ اس کارخانۂ قدرت کی صنعت کے متعلق ہمیشہ یہ کہتا آیا ہے کہ یوں نہیں یوں ہونا چاہئے۔ اقبالؒ نے بھی اس جہان کو دیکھا مگر کیا کہا؟

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد   گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

دورِ حاضر کے تمام بڑے بڑے شعراء ومفکرین نے اپنی اپنی اہلیت اور قابلیت کے مطابق دنیا کو کچھ نہ کچھ پیغامات دیئے۔ کسی نے اسے ایک سانچہ میں ڈھالنے کا خواب دیکھا۔ کسی نے دوسرے میں۔ کچھ تو ایک آنے والے ست جگ کے راگ الاپتے رہے۔ اور کچھ گوشے کی طرح مردہ قوموں میں حرکت و حیات پیدا کرنے میں مصروف رہے۔ لیکن بہرحال وبہر رنگ شاعر کے وہم میں مستقبل کا ایک دھندلا سا نقش ہوتا ہے۔ جس کے ذریعے وہ اپنی قوم کے مستقبل کی تعمیر چاہتا ہے۔ اور اپنی قوم کو اس مقام پر جلوہ افروز دیکھنا چاہتا ہے۔

بعینہٖ اسی طرح اقبالؔ جو مشرق کا عظیم ترین شاعر تھا اس نے بھی اپنی قوم کے لئے ایک درخشندہ مستقبل تعمیر کرنے پر غور کیا۔ اس نے مغرب کی دوسری قوموں کے حالات وکوائف کا مطالعہ کیا۔ اس نے حقیقی معنی میں اپنے "جزو پیغمبری" کا استعمال کرنا چاہا جس کے ذریعے وہ ایک مردہ غلام قوم میں حرکت پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ بالکل نہیں ہچکچایا۔ بلکہ اس نے علی الاعلان کہا ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں   کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اور اکثر یوں الاپتے ہوئے سنائی دیا ؎

فروغِ خاکیاں از نور یاں افزوں شود روزے   زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے

اس نے قوم کے سامنے ایک روشن مستقبل رکھا۔ وہ مستقبل جس کی طرف ہر فرد فطری طور پر حرکت کے لئے آمادہ ہونے لگا۔ اس نے مایوسی کو نزدیک تک نہ پھٹکنے دیا۔ اور لا تقنطو کی ضرب سے اسے پامال کر دیا۔ اس نے قوم کے اندر اس منزل تک پہنچنے کے لئے خواہش وآرزو کا چراغ جلایا۔ اور کس انداز سے کہا ؎

آرزو را در دلِ خود زندہ دار   تا نگردد مشتِ خاکِ تو غبار

دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات   غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات

اس طرح اس نے قوم کو اس منزل کا تصور ہی نہیں دیا بلکہ دلوں میں وہاں تک پہنچنے کی ایک آرزو بھی پیدا کر دی۔ اور ساتھ ہی پوری قوت سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ تو تمہاری جانبازی کا صلہ ہے دیکھئے کس زور سے کہا ؎

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث   مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اس طریق سے اقبال نے قوم کے دل میں ایک زبردست تعمیری جذبہ بیدار کر دیا جس کے ذریعے قوم اگر زیادہ نہیں، تو پنپنے ضرور لگی اور اقبالؒ کے اس آئیڈیل کو سمجھنے کی بھی کوشش کرنا شروع کر دیا جسے وہ اپنے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ پیش کر رہا تھا ؎

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے   جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

اقبال نے موجودہ حالات کا خوب غور سے مطالعہ کیا۔ وہ ایک غلام ملک میں پیدا ہوا تھا۔ اور ایک ایسی ملت کا فرد تھا۔ جو اپنے نصف النہار سے ابھی ابھی ذلت کے گڑھوں میں گری تھی۔ اس نے اپنے بچپن میں ہی اپنے پیشرووں کے نوحے سنے۔ اس لئے اس نے حالات کا اور عمیق مطالعہ کیا۔ لیکن اس نے کیا پایا؟ ایک غیر فطرتی چیز غلامی . . اور پھر انسان کی غلامی! چنانچہ وہ نوحہ گر ہے ؎

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذر قباد و جم کرد

یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

اس نے غلامی کے نتائج و تاثرات پر بھی غور کیا۔ اس نے دیکھا کہ کس طرح قوم کی نئی پود کو دین و مذہب سے دور کیا جا رہا ہے اور کس طرح تعلیمی اداروں کے نام پر قومی تہذیب و ثقافت کا خون کیا جا رہا ہے۔ اور کس طرح مغربی خیالات سے متاثر ہو کر بغیر سمجھے نوجوان مذہب سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اور اسے محض "ڈھکوسلوں کا پلندہ" سمجھتے ہیں۔ اس لئے فطری طور پر "جہان نو" کی طرف جو قدم بڑھنا تھا۔ اس میں مذہب کے عملی پہلو پر زور دینا تھا۔ اس لئے اس نے مغرب کے اثر کو کم کرنے کے لئے سنگ بنیاد سیاسی اور فکری آزادی کو قرار دیا۔ تاکہ دوسروں کے مستعار دل و دماغ کی مدد سے سوچنے میں ٹھوکر نہ کھائے۔ اور کس شد و مد سے کہا۔ ؎

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

اسی لئے اس نے قوم کے اندر محکومی اور غلامی کے خلاف ایک زبردست نفرت پیدا کر دی اور اپنی پوری طاقت سے آزادی کا اعلان کیا۔ لیکن اقبالؔ مغربی تہذیب کی آزادی کے تصور کا سخت مخالف تھا۔ اور طنزیہ انداز میں کیا خوب کہا۔ ؎

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

لیکن آزادی حاصل کرنے کی راہ کونسی تھی۔ اسے تو تمام قیدوں اور بندوں سے رستگاری کا تریاق ڈھونڈھنا تھا۔ ایسا تریاق جو جاں بلب مار گزیدہ کو ایک بار پھر حیاتِ ابدی سے نوازے۔ اور یہ تریاق اسے "اسلامی نظام" میں ملا۔ اس لئے اس نے حالات کا اس نظام کی روشنی میں مطالعہ کیا۔ اور اس طرح ہر چیز کا تجربہ اور تحلیل اسلامی اصولوں پر کی۔ جب وہ اس امر کا پوری طرح اطمینان کر چکا۔ کہ ہمیں اگر کچھ مل سکتا ہے۔ تو وہ صرف اسلام کے نظام کی پوری پابندی سے۔ تو اس نے اس امر پر زور دیا کہ قوم جادۂ مذہب سے انحراف نہ کرے۔ فرمایا ؎

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

اس طرح اس نے ان لوگوں کو جو کبھی مارکس کے نظام اشتراکیت کے پیچھے دوڑتے اور کبھی جمہوریت کے سازوں کو چھیڑ کر دل خوش کیا کرتے تھے۔ اور جو مغرب کی ہر رنگ میں نقل اتارنے کو ہی اپنا اصول بنا چکے تھے۔ انہیں ایک مکمل نظام دیا۔ وہی نظام جو تیرہ سو سال پہلے سے ان کے پاس موجود تھا اور صاف کہا۔

یہ قوم و ملت دنیا میں عزت سے رہنا چاہتے ہو۔ تو صرف یہی ایک چیز ہے جو تمہیں آفات و بلیات سے محفوظ رکھے گی۔ اگرچہ تمام مسلمان اس پر پہلے سے ایمان رکھتے تھے لیکن عملی رنگ میں کسی نے بھی اتنی قوت سے یہ اصول پیش نہیں کیا تھا۔ لیکن اقبال کا اس پر ایمان تھا۔ . . . . ایمان کامل ۔ کیا مستانہ انداز میں کہا ہے

دامنہ کہنہ بتاں راہزار بار آراست ۔۔۔۔ من از حرم نگرمشتم کہ پختہ بنیاد است

اس نے اسی طرح مختلف پہلوؤں کو بحیثیت مسلمان واضح طور پر پیش کیا۔ اور صاف صاف کہا۔ کہ اگر تم سوراج کی امید رکھ سکتے ہو تو وہ اسی راہ پر چل کر اسی نظام کے ذریعے سے تمہیں ملے گی ۔

عاشق آنست کہ تعبیر کند عالم خویش ۔۔۔۔ در نسازد بجہانے کہ کرانے دارد

جن لوگوں نے اقبال کا محض سطحی مطالعہ کیا ہے ۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ اقبال نے دین و سیاست کو یکجا کرنے پر بہت زور دیا ہے ۔ اس نے تو صاف صاف کہا کہ اگر دین کو سیاست سے الگ کر دیں تو چنگیزی باقی رہ جاتی ہے ۔ اور کیا خوب کہا ہے

این نکتہ کشائندۂ اسرار نہاں است ۔۔۔۔ ملک است تن خاکی و دیں روح روانست

اور خاص کر اسلام کی صورت میں جو کہ محض خانگی حیات سے تعلق رکھنے والا مذہب نہیں۔ بلکہ ایک ایسا منظم مذہب ہے ۔ جو کہ من المہد الی اللحد انسان کی ساری حیات پر حاوی ہے ۔ ہو سکتا تھا۔ کہ مسلمان کلیساء و ریاست کے الگ الگ شعبوں سے اثر لیتے ہوئے (جیسا کہ بعض مغرب زدوں نے کیا) اسلام میں بھی دین و سیاست کی تفریق پیدا کر دیتے ۔ لیکن اقبال نے ان کی وحدت پر بہت زیادہ زور دیا۔

جس طرح اقبال نے تمام مشکلات و تکالیف کا تریاق اسلامی نظام ہی کو پایا۔ اسی طرح وہ اسلام کو ہر ایک شعبۂ حیات پر حاوی کرنا چاہتا تھا۔ اور اسلام چونکہ بحیثیت ایک نظام، امیر یا خلیفہ کو بیک وقت کلیسا و ریاست دونوں کا سردار بنانا چاہتا تھا۔ اور وہ ببانگ دہل اعلان کرتا تھا۔ کہ مومن کا دین اور سیاست دو الگ چیزیں نہیں ۔ بلکہ بدن اور روح کا تعلق رکھتے ہیں ۔ اسی لئے اپنے "جہان نو" کے نظام کے لئے اس نے دین و سیاست کے اتحاد کو ضروری قرار دیا۔

اسی اصول کا دوسرا نمایاں حصہ یہ تھا۔ کہ وہ وطن برادری کے مقابلہ میں اسلامی بھائی چارے کو ترجیح دیتا تھا۔ یقیناً وہ وطن سے اتنی ہی محبت رکھتا تھا جتنی کہ ایک وطن پرست ہندوستانی لیڈر رکھتا ہے ۔ اور اس حقیقت کی آئینہ دار اسکی دور اول کی شاعری بھی ہے لیکن بحیثیت مسلماں کے وہ ملی برادری کو وطنی برادری کے مقابلہ میں قوی تر خیال کرتا تھا۔

حقیقت میں اس کے ذہن میں ایک بلند پایہ تخیل تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ تمام جہاں کے مسلمانوں کو یکجا کیا جائے ۔ اس کے "جہان نو" کا ڈھانچہ ہی یہ تھا۔ کہ تمام دنیا کے مسلمان قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح ایک خلیفہ کی قیادت میں۔ خدا کے قانون کے مطابق خدا کی عطا کردہ خلافت و نیابت کے فرائض سرانجام دیں ۔

اس بلند مقصد کے لئے اس نے تمام مسلمانوں کو بار بار یہ پیغام دیا۔ کہ وہ ملکی اور وطنی حدود میں اپنے آپ کو بہت زیادہ پابند نہ کریں۔ اور زیادہ سے زیادہ اپنے دلوں کے اندر اسلامی جذبات کو تقویت دیں۔ اسلامی نظام کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس طرح ایک عالمگیر اسلامی برادری کی بنیادوں پر ایک بین الاقوامی حکومت قائم کریں۔ جو یقیناً اقبال کے خیال میں جینیوا کی بین الاقوامی مجلس سے ہزار گنا زیادہ مضبوط اور پائیدار نظام والی حکومت ہوگی۔ جس کا خلیفہ خدا کا نائب۔ جس کا قانون خدا کا قانون جس کے مراسم و دستور خدا کے احکام۔ اور جس کی صلح و جنگ، خدا کے قانون کے مطابق خدا کی خوشنودی کی خاطر ہونگے۔

یہ تھا اس کے دماغ میں اس کے "جہانِ نو" کا تخیل۔ وہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے وطنیت کے بت کو بھی پاش پاش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کئی موقعوں پر اسلامی نظام اور وطنیت پر بحث کی۔ لیکن اس بحث کا ایک ناخوشگوار اور رنجیدہ پہلو مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ متحدہ قومیت اور اسلامی قومیت پر بحث تھی۔ جو جواب علامہ نے مرنے سے کچھ عرصہ قبل لکھا۔ اس میں دین کی وسیع اسلامی برادری پر زور دیا اور کیا خوب کہا ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ	ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است	چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست	اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال نے اس منزل تک پہنچنے کے لئے توشہ کیا مانگا۔ کونسا ایسا اصول اس نے بنایا جس کے تحت انسان اس بلند و رفیع مقام پر پہنچ سکتا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ وہ اقبال کا نظریۂ "خودی" تھا۔ وہ خودی کو ہر طاقت و قوت پر مقدم سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک خدا کے بعد خودی تھی۔ اس قوت کے متعلق کیا خوب کہا۔ ؎

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی	ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

لیکن ساتھ ہی اقبال نے عمل اور جدوجہد پر بہت زور دیا۔ اور کیا زوردار طریق میں فرمایا ؎

بکیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است	سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است

لیکن اس کے نزدیک سب سے بڑی چیز شاہی میں فقر و استغناء تھا۔ وہ سب سے ہوشیار ڈاکٹر تھا۔ وہ قوم کی بیماری جان گیا تھا۔ اور اسی لئے اس نے یہ نسخہ قوم پر استعمال کرنا چاہا۔ اور صاف صاف کہا

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں	زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغناء

اور ساتھ ہی حقیقی رازق کو پہچاننے اور عارضی منعموں سے بے نیاز ہونے کے لئے خوب فرمایا ؎

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک	اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

وہ تو استغناء کو انسانی ترقی کا سب سے افضل درجہ سمجھتا تھا۔ اور اس مقام تک پہنچے ہوئے

ملکوں کے متعلق کیا خوب کہا ہے ؎

چوں بہ کمال میرسد فقر دلیل خسروی است — مسند کیقباد را در تہِ بوریا طلب

لیکن اس ساری بحث سے غرض یہی نہیں سمجھ لینا چاہئے ۔کہ اقبال نے محض اصول اور نظریے قائم کئے اور عملاً کچھ نہ کیا ۔یقیناً جس چیز کو اس نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر قوم کے سامنے پیش کیا وہ اس کے دلی بھائیوں کے لئے نشاۃ الثانیہ کا تصور بہم پہنچاتی ہے ۔اگرچہ اس کے بعد بھی یہی تجویز مسلمانوں کی ایک جماعت نے "پاکستان" کے نام سے پیش کی لیکن جب وقت تک کہ اس کے نظام حکومت کی تفصیلات سامنے نہ آجائیں ۔یہ کہنا مشکل ہے ۔کہ واقعی یہ علامہ کا مجوزہ پاکستان ہے یا نہیں ۔اقبال کیا چاہتا ہے ؟ وہ سادہ لفظوں میں خدا کی دنیا پر خدا کے قانون کے ذریعے، خدا کے نیک بندوں کی حکومت ہے ۔اور مستقبل کے پاکستانی نظام کو جو ابھی عالم وجود میں بھی نہیں آیا ۔خدا ہی بہتر جانتا ہے ۔بہر حال اقبال کے خواب کا ایک حصہ تو اس طریق سے پورا ہو ہی جائے گا اور اگر یہاں خدا کے قانون کے مطابق حکومت شروع ہو جائے اور یہی سلسلہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی شروع ہو جائے ۔تو یہ امر بعید از قیاس نہیں ۔کہ ان ملکوں کے باہمی ربط اور یک نظمی سے کسی زمانہ میں علامہ کا مجوزہ نظام قائم ہو جائے

ایسے حالات میں جبکہ دنیا کے نظام تیزی سے بدل رہے ہیں ۔حکومتیں بن اور مٹ رہی ہیں علامہ کا "جہانِ نو" بظاہر ایک موہوم خاکہ کی شکل لئے ہوئے ہے ۔لیکن یہ وہ خاکہ ہے جس پر کہ اس نے تمام حیات کا فکر و اندیشہ صرف کیا ۔اور ایک غلام ۔مفلوک الحال قعر ذلت میں گری ہوئی قوم کے لئے اتنا بلند نصب العین پیش کیا ۔

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات — تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

(سید عبدالرحمٰن شاہ ترمذی)

غزل

کبھی دل کو دیکھ دل کا بھی نظام دیدنی ہے — نہیں آج سے ازل سے یہ مقام دیدنی ہے

میری صبح صبح فرقت میری شام شامِ غربت — میری صبح دیدنی ہے میری شام دیدنی ہے

میری ہر نظر عبارت تیری ہر نظر اشارت — یہ تماشا زیرِ بام و لب بام دیدنی ہے

میرے شوخ و شنگ ساقی کروں آج کیا ہے — تیرے ہاتھ میں چھلکتا ہوا جام دیدنی ہے

تیرا سرخ سرخ آنچل تیری کالی کالی زلفیں
یہ افق کے زیرِ سایہ تیرا دام دیدنی ہے

(سید عبدالرشید)

وطن پرست

(براؤننگ کی نظم کا آزاد ترجمہ)

آج کا دن
اک برس کی بات ہے
آہ! ان ویران کوچوں میں کبھی
میں نے دیکھی تھی بہارِ زندگی
اور لوگوں کا ہجوم بے پناہ
فتحمندی کی دلہن کے واسطے
اپنے ہاتھوں میں لئے پھولوں کے ہار
ضو فگن تھی ان کی آنکھوں سے شعاعِ جستجو
سب کو میری آرزوئے دید تھی
آج کا دن ——— !
اک برس کی بات ہے ——— !
آج کا دن
اک برس کی بات ہے ——— !
ہاں سُنا تھا اپنے کانوں سے کبھی
ان کلیساؤں میں گھڑیالوں کا شور
خوش گلو اور خوبصورت دیویاں
مندروں میں جیسے گاتی ہوں بھجن!
اور جب چاہتا تھا میں
ڈالتے تھے وہ ستاروں پر کمند
اور میرے تابع فرماں تھے یوں
جیسے سیاروں کا لمبا کارواں
گھومتا ہے ایک ہی مرکز کے گرد
آج کا دن
اک برس کی بات ہے ——— !
آج کا دن
وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد
میں نے دیکھی زندگانی کی خزاں

آج بگڑا ہے نظامِ کائنات
خوب بدلا ہے جہانِ رنگ و بو
ایک ویرانی سی ان کوچوں میں ہے
گھورتے ہیں ان دریچوں سے مجھے
چند فالج کے مریض!
صرف مقتل میں ہے لوگوں کا ہجوم
اور پتھر کی یہ بارش خوب ہے
آہ! خون آلود پیشانی مری
اور اس زنجیر کی کڑیوں سے بھی
میرے ہاتھوں کو بڑی تکلیف ہے
میں نے ڈالی تھی ستاروں پر کمند
آج کا دن
کچھ دنوں کی بات ہے
آج کا دن
وہ بھی اک عرصہ کے بعد
پوچھتی ہے مجھ سے اب میری ضمیر
تیری مزدوری کا یہ انجام ہے؟
اور یہی حاصل ہے تیری کشت کا؟
یہ خوشی ہے ایک سیلِ بے کراں
اسکی موجوں سے لپٹتا ہے وہی
جس کی قسمت میں ہے مرگِ ناگہاں
اور پھر اس کی نہیں کچھ بھی جزا
میں سمجھتا ہوں کہ میں محفوظ ہوں
کیونکہ عادل ہے خدائے لامکاں
آج کا دن
اک برس کی بات ہے —!

(ایم سعید)

افلاطون کا فلسفۂ شاعری

افلاطون کی تعریف کرنے والوں کے لئے یہ حقیقت نہایت تلخ ہوگی کہ وہ فلسفی جو دنیا کے سب فلسفیوں سے زیادہ شاعرانہ محسوسات کا مالک تھا جس کی رگ رگ میں اکثر نامور شعرا کا کلام رچ چکا تھا۔ اور جو بسا اوقات اپنی تحریروں میں انہی کا حوالہ دیا کرتا تھا۔ ایک ایسے نظریہ کا خالق بنا۔ جو شعرا کے وجود کو سرے سے ناجائز سمجھتا ہے اس کی مثال ایسے ہے کہ جس طرح افلاطون نے اپنے آپ سے فطرتی لگاؤ رکھنے والے ایک گہرے دوست کو اپنے حقارت سے ٹھکرا دیا ہو۔ اس نے سچ کی حفاظت کے لئے حسن و جمال کے اکثر نظریوں کا خون کیا ہے۔

بایں ہمہ افلاطون شاعری سے اپنے لگاؤ کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ اس بات کو اس طرح مانتا ہے۔ جیسے ایک شخص اپنے گناہ کو مان لیتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں "میں مانتا ہوں کہ مجھے اپنے نظریہ شاعری کے اظہار سے وہ عزت مانع ہے جو ہومر جیسے بڑے شاعر کے لئے برسوں سے میرے دل میں موجود ہے۔ ہومر ان سب خوبصورت المیہ داستانیں لکھنے والوں میں صرف ایک ہی ایسا شاعر تھا جس نے دنیا کے آگے سچے معنوں میں ایک نئی چیز پیش کی۔ لیکن یہ بات سراسر غلط ہے کہ ایک آدمی کی عزت سچ کا گلا گھونٹ کر کی جائے۔"

دنیا کے قدیم ترین شاعر یا بھاٹ (Minstrels) اس بات کے مدعی تھے۔ کہ وہ شعر خود نہیں کہتے۔ بلکہ دیوتا ان کے جسم میں داخل ہو کر ان سے اشعار کہلواتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں اس دور کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔ جو اپنے وعظ و نصائح کی عمدگی میں الہامی بتایا جاتا ہے۔ افلاطون اپنی کتاب "آئی اون" (Ion) میں اس دقیانوسی خیال کا طنزاً یوں ذکر کرتا ہے۔

"فنون لطیفہ کی دیوی پہلے پہل انسانوں کو خود الہام کرتی ہے۔ . . . . کیونکہ سب اچھے شاعر رزمیہ لکھنے والے ہوں۔ یا غزل گو۔ اپنی خوبصورت نظمیں بنانے میں فن کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ خدائی امداد کی راہ تکتے ہیں۔ وہ شعر لکھتے وقت اپنی عقل و ہوش کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ کیونکہ انہیں یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ کوئی دیوتا آ کر ان کے قلم میں خود بخود حرکت پیدا کریگا۔ شاعر اس طرح ایک غیر ارضی اور مقدس شے بن جاتا ہے۔ جس سے جدت کے دریا اسوقت ہی بہتے ہیں۔ کہ عقل و خرد اس نے کھو دی ہو۔ اور خدا اس میں بول رہا ہو۔"

افلاطون شاعری کے ان من گھڑت نظریوں کے جھانسے میں آنے والا نہیں تھا۔ اگر اس نے تحقیق کی اس راہ کو اپنا مسلک بنایا ہوتا۔ تو شاید وہ اسے بیہودگیوں سے پاک کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہوتا۔ جس کو صدیوں بعد لانجی نس (Longinus) نے اپنا بنیادی اصول بنایا۔ افلاطون شاعری میں

شدت تاثر (Impressionism) کا قائل نہیں تھا۔ ہاں عقل (Reason) کے ضمن میں اسے جائز سمجھتا تھا۔ نہ صرف شاعری کے 'الہامی ہونے' کا نظریہ اس کے فلسفہ سے مختلف تھا۔ بلکہ شاعروں کے پند و نصائح بھی اس کے نظریہ اخلاقیات سے کوسوں دور تھے۔ اسے اپنے زمانے کے شعرا کی قدردانی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ لوگ انہیں اپنا استاد سمجھتے تھے۔ ایک اچھے شاعر کا ماہر اخلاقیات ہونا ضروری تھا۔ ہومر چونکہ شاعری کی ہفت اقلیم کا بادشاہ تھا۔ اس لئے اخلاق اور قواعد زندگی میں بھی وہی بہترین رہنما تھا۔ پانچویں یا چوتھی صدی قبل مسیح کے عام یونانی شہری کی نظر میں رزمیہ داستانوں کی اتنی ہی تقدیس تھی۔ جتنا کہ ہمارے زمانے میں سعدی کی "گلستان" کی۔'

غرضیکہ افلاطون شاعری کے اچھا یا برا ہونے۔ یا اس کے جائز یا ناجائز ہونے کا اندازہ۔ شاعری کے فنی اصولوں سے نہیں۔ بلکہ اخلاقی نکتہ نظر سے کرتا ہے۔ اپنی کتاب "ریاست" (Republic) میں افلاطون نے اس موضوع پر بالتفصیل بحث کی ہے۔ لیکن اس مضمون پر قلم اٹھانے سے پہلے وہ ایک کامل ریاست (Ideal state) کا ذکر کرتا ہے پھر وہ اس "مکمل انسان" (Ideal Man) کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جو ایسی ہی ایک "مکمل ریاست" کی تشکیل کے لئے لازمی ہے۔ وہ "انصاف" (Justice) کو ریاست کے نظم و نسق کا محور سمجھتا ہے۔ اور اس کا منبع وہ "فرد" (Individual) میں تلاش کرتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ "انصاف" اور "اچھائی" (goodness) کو ان ہی دو چیزوں میں دریافت کرتا نظر آتا ہے۔ ریاستی یا سماجی نکتہ نظر سے وہ ہر شے۔ حتیٰ کہ فنون لطیفہ کو بھی اخلاق (morality) یا شہری رہنے سہنے کی خوبیوں (Civic virtues) کا رہین منت سمجھتا ہے۔ اور انفرادی پہلو سے وہ تمام موجودات عالم کو فلسفیانہ معراج' (Philosophic Ideal) یا سچائی کی خاطر تگ و دو کا غلام کہتا ہے۔

اس موضوع کو اگر سماجی پہلو سے دیکھیں تو افلاطون علم ادب یا آرٹ کو اس حد تک اچھا سمجھتا ہے جس حد تک وہ ایک اچھے شہری کی زندگی کو مکمل بنانے میں ریاست کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ یہ دلیل ہرگز قاطع نہیں ہوگی۔ کہ یہ نظم یا یہ نظم کو نہایت دلپسند یا قابل تعریف ہے۔ یہ سب جمالیات کا ذوق رکھنے والوں کی فضول توجیہہ ہے۔ اگر نظم ریاست کے ارباب بست و کشاد کے نزدیک شہری اچھائیوں کی طرف توجہ نہیں دلاتی تو وہ نظم یقیناً بری اور تلف کئے جانے کے قابل ہے۔ افلاطون نے اس طرح ریاست کے مفاد کی خاطر علم ادب اور خصوصاً شاعری پر نہایت کڑی نگرانیاں عائد کی ہیں۔

اسی اصول پر افلاطون ہومر۔ ہیسی اڈ (Hesiod) اور دوسرے شعرا پر قلم تنقید اٹھاتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کیا ایک مکمل ریاست (Ideal state) کے نگران یہ امر گوارا کر سکتے ہیں کہ شاعر خدا کے صفات کی غلط ترجمانی کرے۔ اور اسے حاسد۔ ظالم۔ اور مکار بتائے۔ کیا وہ خدا کو جو مجسم نیکی ہے۔ برائی کا خالق بتایا جانا اچھا سمجھتے ہیں۔ شاعروں کا یہ شیوہ یقیناً ناقابل برداشت ہے۔ کہ وہ آخرت کی تصویر

کھینچتے ہوئے محض جھوٹ اور تخیلی شعبدہ بازی کا اظہار کریں۔ یا ملک کے نامور مشاہیر کا فرضی مضحکہ اڑائیں۔ نہ ہی ریاست کے حکمران شہریوں کو اس بات کی اجازت دے سکتے ہیں۔ کہ وہ کمینہ صفت لوگوں کی زندگی پر کچھ رقم کریں۔ کیونکہ اچھے لوگ ہمیشہ ان لوگوں کی زندگی اپنے لئے شمع راہ بناتے ہیں۔ جن کی گھٹی میں شرف وحیا کا خمیر پڑا ہوا ہو۔

یہ افلاطونی کسوٹی اس طرح ہومر اور ہیسی ایڈ۔ کو نہ صرف مخرب اخلاق شاعر بتاتی ہے۔ بلکہ المیہ اور طربیہ داستانیں قلمبند کرنے والوں کا کھوٹ بھی صاف ظاہر کرتی ہے۔ ایک مکمل ریاست میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ افلاطون اس ضمن میں حد سے زیادہ زاہد خشک (Puritan) نظر آتا ہے۔ آرٹ جتنا زیادہ دلکش اور نفیس ہوگا۔ یونان کے اس بڑے فلسفی کے نزدیک وہ اتنا ہی زیادہ گمراہ کن اور زندگی کے غلط نظریات کا حامل ہوگا۔

لیکن افلاطون شاعری کے خلاف اس جہاد کو یہیں ختم نہیں ہونے دیتا۔ ماہر اخلاقیات کی حیثیت سے شاعری اس کی نگاہوں میں اس لئے نہیں جچتی۔ کہ وہ مخرب اخلاق ہے۔ اور بحیثیت ایک فلسفی کے شعرا کی افترا پسندی اور جھوٹ نے اسے دل برداشتہ کر دیا ہے۔ اس کا "مکمل انسان" بطور ایک اچھے شہری کے اخلاق کے معراج کی جانب اڑتا ہے۔ اور انفرادی صورت میں وہ صرف سچائی پر قانع نظر آتا ہے۔ لیکن برعکس اس کے آرٹ تو سر بسر فریب نظر ہے۔

افلاطون کے خیال میں فن کار (Artist) صرف ظواہر پر نظر رکھتا ہے۔ اس کا تعلق اس دنیا سے ہے جس کا تصور محض آنکھوں اور کانوں کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ ظواہر کی دنیا ایک ایسی دنیا ہے۔ جس میں چیزیں دکھائی پڑتی ہیں۔ اور پھر اوجھل ہو جاتی ہیں۔ کبھی بڑی نظر آتی ہیں کبھی چھوٹی۔ کبھی متقابلتہً گرم اور کبھی متقابلتہً سرد۔ ایک لمحہ اگر مٹھاس سے رچی ہوتی ہیں۔ تو دوسرے لمحے ان کی تلخی ناقابل برداشت بن جاتی ہے غرضیکہ یہ کائنات اور اس کی تمام اشیا ہمیشہ متغیر رہتی ہیں۔ اور درحقیقت ان سب کی اصل تغیر سے محفوظ اور فقط ایک ہے۔ بہت سی اشکال ایسی ہیں۔ جن پر سرخ چیزوں کا اطلاق ہوتا ہے لیکن فی الاصل سرخی ایک اور صرف ایک ہے۔ بہت سی صورتیں ایسی ہیں جنہیں ہم حسین کہتے ہیں۔ لیکن سچ پوچھئے تو حسن کلی (Absolute Beauty) صرف ایک ہے۔ فن کار انہی ظواہر کی نقل کرتا ہے۔ حقائق کی دنیا اس کی دسترس سے ماوراء ہے۔

مثال کے طور پر ایک بڑھئی جو چارپائی یا کرسی بناتا ہے۔ وہ اصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اس اصل چارپائی یا کرسی کی نقل ہوتی ہے جس کی مکمل شکل (Ideal form) صرف اس بڑھئی کے تخیل کا حصہ ہے۔ ایک بڑھئی جتنا ہی زیادہ ہنرمند ہوگا۔ وہ اتنا ہی زیادہ چارپائی یا کرسی کے بنانے میں اس انتہائی شکل (Ideal form) کے نزدیک ہوتا جائے گا لیکن یاد رکھئے وہ ہوبہو ویسی مکمل چارپائی یا کرسی نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ ہر شے کی اکملیت صرف خدا ہی سے ممکن ہو سکتی ہے اس طرح ایک ترکھان کی بنائی ہوئی کوئی چیز حقیقت سے ایک درجہ دور

ہوتی ہے۔ اور ایک نقاش کی تصویر حقیقت سے دو درجے دور ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی تصویر اس اصل کی نقل نہیں ہوتی۔ جو خدا نے اس کے ذہن میں ڈالی ہے۔ بلکہ وہ تو صرف ایک ترکھان کی بنائی ہوئی شے سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہوتی ہے۔

شاعر اسی طرح رنگوں کی جگہ الفاظ، بحر، قافیہ اور ردیف کا استعمال کرتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ نقاش کی طرح وہ بھی فریب کن ظواہر کی نقل کرتا ہے۔ اس کی تخلیق بھی اسلئے اصل سے ہمیشہ دو درجے دور ہوتی ہے۔ شاعر کا مضمون اور اس کا طرزِ اظہار بھی دونوں جھوٹے ہوتے ہیں۔ اس کی اپیل عقل سے نہیں بلکہ جذبات سے ہوتی ہے۔ وہ روح کے سب سے زیادہ نکمے حصہ کی طمانیت کے سامان پیدا کرتا ہے۔ غرضیکہ افلاطون کا یہ یقین ہے کہ ریاست کی بہبودی کے لئے ہومر اور ہیسی اوڈ جیسے شعرا کا وجود سم قاتل ہے۔ المیہ اور طربیہ کہانیاں بھی ناقابل برداشت ہیں۔ ایسی ریاست میں اگر شاعری کی اجازت ہو بھی تو وہ صرف ایسی شاعری ہوسکتی ہے۔ جو فقط خدا کی حمد اور مشاہیر وطن کی تعریف تک محدود ہو۔

تاہم یہ نظریہ شاعری خامیوں سے خالی نہیں:-

مانا کہ شاعر یا فن کار کی تخلیق بہت سے پہلوؤں میں اپنی اصل سے کم ہوتی ہے۔ لیکن جہاں وہ اصل سے کم ہوتی ہے۔ وہاں اس میں آرٹسٹ بہت سے ایسے نکات بھی جمع کردیتا ہے جو اصل یا حقیقی صورت میں یکسر ناپید ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تخلیق میں اپنا ذاتی تصور ڈال دیتا ہے۔ وہ اس میں اپنے آپ کو بند کردیتا ہے۔ وہ اکملیت (Ideal) سے دور نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی جو دھندلی سی تصویر اس کے ذہن میں ہوتی ہے اسے وہ اپنی خداداد قابلیت کی نسبت سے الفاظ میں منتقل کردیتا ہے۔

افلاطون اخلاق اور فنونِ لطیفہ کو باہم ضد سمجھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں۔ اخلاق ہمیں سکھاتا ہے۔ اور آرٹ سکھلانے کی سرے سے کوشش ہی نہیں کرتا۔ آرٹ کا اگر کوئی مقصد ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ زندگی کو ایک خاص انداز یا پہلو (Prespective) سے پیش کیا جائے فن کار جس طرح ظواہر کو خود سمجھتا ہے۔ وہ انہیں ظاہر کردیتا ہے۔ اس کے مدِ نظر یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اس کی بنائی ہوئی چیز کا عوام کے اخلاق سے بھی کوئی رشتہ ہے۔ وہ یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے "میں نے حقیقت کو جس طرح سمجھا۔ اسی طرح یہ تصویر بنائی اور نظم کہہ ڈالی۔ چاہے اب تم اسے میرا خواب کہو یا میرا فریب نظر۔ یہ تمہاری اپنی پسند ہے۔ اس میں تمہیں اگر کچھ سبق ملتا ہے۔ تو بخوشی اس سے عبرت حاصل کرو۔ میرا کام تمہیں عبرت دلانا یا سکھلانا نہیں"۔

شاید آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ "آرٹ" سے میرا مطلب محض فنونِ لطیفہ یعنی شاعری۔ نقاشی۔ سنگتراشی۔ رقص اور راگ ہے۔

ہم نے دیکھ لیا ہے کہ کن حالات نے افلاطون کو شاعری پر حرف گیری کی جرأت دی۔ اور کس طرح اس یونانی حکیم کے زمانے میں لوگ ہومر کے کلام کو نہ صرف تفریح کا سامان سمجھتے تھے بلکہ اپنی زندگی کی تعبیر بھی اسی میں تلاش کرتے تھے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ہومر اور اسکے ہمعصر شاعر صرف شاعر ہی نہیں بلکہ استاد سمجھے جاتے تھے۔ ان کے الفاظ عوام کے لئے الہامی حیثیت رکھتے تھے وہ اپنے اخلاق اور اطوار غرضیکہ اپنی زندگی کا ہر پہلو اپنی شاعری کے کلام پر تعمیر کیا کرتے تھے۔

یہ عقیدت اس درجہ بڑھ چکی تھی کہ کوئی ماہرِ اخلاقیات اسے ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ شعرا کی باتیں اصولِ اخلاق سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھیں۔ لیکن پھر بھی ان کے مستقل طور پر معیارِ اخلاق بن جانے سے جمود کا خوف تھا۔ اس جمود کی پیش بندی کرنے کے لئے افلاطون نے شاعری کے خلاف بیڑا اٹھایا۔

موجودہ وقت میں تہذیب پرانے وقتوں سے اگرچہ بہت آگے نکل چکی ہے پھر بھی وہ لوگ جو فنونِ لطیفہ پر اپنی زندگی کی تشکیل کرتے ہیں۔ پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔ افلاطون نے لامحالہ ایک ایسی حقیقت کو بے نقاب کیا جو صدیوں بعد بھی اپنی صداقت کی خود گواہ ہے۔

افلاطون اس بات میں بھی حق بجانب ہے کہ سب فنونِ لطیفہ کے اظہار کے لئے کسی نہ کسی ایسی مادی صورت (Material Medium) کا ہونا ضروری ہے۔ جو ہم اپنے حواس (Senses) سے بخوبی سمجھ سکیں لیکن عقل کو چھوڑ کر انہیں صرف شعور ہی سے سمجھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح یہ مادی ذریعۂ اظہار انسان کے جذبات کو ابھارتا ہے اور اسے لذتیت (Sensuousness) کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ آرٹ کی ترغیب سے صرف وہی لوگ بچ سکتے ہیں جن کی عقلی یا روحانی قوتیں بہت مضبوط ہوں حافظ کے ترکِ شیرازی پر عوام اس لئے مرتے ہیں۔ کہ وہاں بادہ و صبوحی اور حسن و جمال کے قصے چھڑتے ہیں۔ لیکن خدا سے لو لگانے والے ان چیزوں کی تعبیر اپنی روحانی اور عقلی قوتوں سے کرتے ہیں۔ انہیں اسی بادۂ شیراز میں تصوف کے دریا بہتے نظر آتے ہیں۔ افلاطون بخوبی سمجھتا تھا کہ یہ مادی ذرائع ایک صورت میں روح کو بھی صیقل کرتے ہیں۔ لیکن ایسی مثالیں شاذ ہوتی ہیں اسے ان لوگوں سے واسطہ پڑا۔ جو شاعری۔ رقص و سرود و سنگتراشی اور مصوری کو صرف اپنے جذبات برانگیختہ کرنے اور اپنے حواسِ خمسہ کے اطمینان کے لئے وقف سمجھتے تھے۔

جس راہ کا سالک افلاطون تھا۔ وہ یقیناً تصوف کی راہ تھی۔ ایک فن کار کے ساتھ تصوف کا لفظ اکثر غلط استعمال کیا جاتا ہے۔ سچا صوفی وہی ہے جو مادی اور جسمانی علائق سے بے نیاز ہو کر اپنی تمام قوتوں کو روح کے اصلی جوہر پر مرتکز کرتا ہے۔ برعکس اس کے ایک سچا فن کار صرف وہی شخص ہو سکتا ہے۔ جو روح کے سربستہ اسرار کی تصویر مادیت کے آئینہ میں اتارتا ہے۔ افلاطون سچے معنوں میں صوفی تھا۔ اور اس نے جو کچھ شاعری کی مذمت میں کہا وہ خالص تصوفانہ رنگ میں ہے۔

لیکن افلاطون کی غلطی کو ہم فوراً بھانپ سکتے ہیں ہمیں اس کے نظریہ سے اتفاق نہیں بایں ہمہ اس نے ہمارے بہت سے شکوک مٹا دیے ہیں۔ اس نے اشیاء میں ایک اہم تفریق کی ہے۔ اور چند ایسے بنیادی نکات بتائے ہیں جن پر ہم بہت کچھ اپنی طرف سے تعمیر کر سکتے ہیں۔

سب سے اول اس نظریہ میں کہ آرٹ اپنی اصلی ماہیت میں ایک واحد حقیقت کی نقل ہے۔ دنیا افلاطون کی رہینِ منت ہے۔ شاعر یا نقاش وہ شخص نہیں ہو سکتا جو صرف ایک خوبصورت نظم یا تصویر تیار کر دے۔ بلکہ اس نام کا حقدار صرف وہی ہے جو الفاظ یا رنگوں میں حقیقت کی حق الوسع ترجمانی کر سکے۔

افلاطون کی یہ رائے بھی درست ہے۔ کہ فن کار کا مقصد ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اوروں کو محظوظ کر سکے اور یہ احظاظِ طبع کا مقصد ہی ایک ایسی وجہ ہے جو شاعر کو افلاطون کی نظر میں مخربِ اخلاق بنا دیتی ہے۔

یہاں تک پہنچکر ہم یہ انکشاف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ افلاطون نے تمام فنونِ لطیفہ میں ایک مشترک صفت دریافت کی ہے۔ ایک شاعر ایک نظم لکھتا ہے۔ اور ایک مصور ایک تصویر کھینچتا ہے۔ دونوں کا کام ایک ہی ماہیت رکھتا ہے۔ اگرچہ وہ ایک ہی مادی ذریعہ (Medium) اختیار نہیں کرتے۔ ایک رنگوں سے کام لیتا ہے۔ دوسرا الفاظ سے۔ لیکن ان کا کام ایک لحاظ سے ہم آہنگ ہے۔ کیونکہ وہ دونوں ہی حقائق کی نقل اتار رہے ہیں۔

افلاطون پر ہمیں سب سے بڑا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے چیزوں کو اپنی جگہ نہیں پرکھا۔ اس نے اصل و نقل کی پیچیدگیوں میں الجھ کر دنیا کی کوئی شے صحیح تعریف کے قابل نہیں سمجھی۔ اس کا ذہن ہمیشہ اکملیت کی جانب پرواز کرتا ہے اس نے جس کامل ریاست (Ideal State) کی تصویر اپنی کتاب میں کھینچی ہے اس کا سچا اور مکمل شہری بننے کے لئے شاید سوائے افلاطون کے آج تک نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ ہوگا۔ لیکن ہم یہ ہرگز نہ بھولیں کہ افلاطون ایک فلسفی تھا۔ جس کا کام یہ نہیں تھا کہ وہ موجودات کو ہر لحاظ سے حق بجانب ٹھیرائے بلکہ جس کا مقصدِ حیات صرف یہی تھا کہ وہ کسی نہ کسی طریق سے چیزوں کی حقیقت اور پاتال کو پا جائے۔

(عبدالرؤف شگفتہ)

شباب

شباب کیا ہے؟ حیات آفریں کہانی ہے
شباب سرخیٔ افسانۂ جوانی ہے

شباب موجبِ سرمستیٔ طرب افزا
ہے شاعرانہ گنہ عہد کامرانی کا

شباب دل کی امنگوں کا مست ہوجانا
بہار و شعر کی رنگینیوں میں کھو جانا

شباب درد بھی ہے باعث نشاط بھی ہے
کہ اس میں ولولہ و کیفِ انبساط بھی ہے

شباب حسن کی سرمستی نشاط افزا
شباب عشق کی رنگینیوں میں کھو جانا

شباب شاعرِ رنگیں خیال کی دنیا
شباب مطربِ فطرت کا دل نشیں نغمہ

شباب اگرچہ سراسر بہار ہستی ہے
کسی کے عشق میں بے لوث زندگی بھی ہے

شباب ذہنِ مصور کا حسنِ نقاشی
دل و دماغ کی اک شاعرانہ عیاشی

شباب منظرِ فطرت کا جلوۂ رنگیں
کسی حسین کی صباحت کا جلوۂ رنگیں

غرض شباب کہ اک حور آسمانی ہے
مرے ندیم! یہی دل کی زندگانی ہے

ملا ہے جب سے مجھے عیش نوجوانی کا
ہر ایک باب ہے دلکش مری کہانی کا

(محمود شوکت)

دو بوندیں

کالج سے فارغ ہوکر ہاسٹل پہنچا ہی تھا کہ ڈاکئے نے ایک خط لاکر دیا۔ میرے دوست نے نہایت طویل القابات کے بعد لکھا تھا: "میری شادی ۲۵ ماہ حال کو ہونے والی ہے۔ میں اس دفعہ کوئی عذر نہیں سنونگا۔ پہلے بھی آپ نے منگنی کے موقعہ پر یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ بوجہ امتحان نزدیک ہونے کے نہیں آسکتا۔ اب تو آپ بی اے پاس کر کے ایم اے میں بھی داخل ہوگئے ہیں۔ دوسرے آپ کو چھٹیاں بھی ہیں ضرور تشریف لائیے۔"

دوسرے دن سے چھٹیاں تھیں۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ بس کھانا کھاتے ہی سیدھا اسٹیشن پہنچوں گا گھر خط لکھ دیا کہ میں چھٹیوں میں نہیں آسکوں گا۔ جلد جلد کھانا کھایا سامان باندھ گاڑی آنے سے آدھ گھنٹہ پیشتر اسٹیشن پر جا پہنچا۔ وقت گزارنے کے لئے اخبار خرید لیا۔ راستہ خوب مزے سے کٹا۔ لاہور کے اسٹیشن سے تانگہ کرایہ پر لیا کوچوان کو جگہ کا پتہ بتا کر آرام سے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ کہ شادی لوگ کیوں کرتے ہیں؟ جب عورتوں کی یہ حالت ہے کہ چاہے میاں بستر مرگ پر ہی کیوں نہ ہوں مگر بیوی صاحبہ کے لئے ساڑھی۔ سینڈل اور کلپ وغیرہ ضرور مہیا ہوں۔ کیونکہ اُسے سہیلی کے پاس چائے پینے جانا ہے۔ اُف! کتنی خطرناک ہیں۔ یہ عورتیں۔ مکار! دغاباز! فریبی! نہ جانے میں نے ان کو کیا کیا کہا ہوتا۔ اگر یکایک کوچوان کی کرخت آواز نے یہ کہہ کر چونکا نہ دیا ہوتا کہ "جناب بنگلہ آگیا"۔ کیا دیکھتا ہوں کہ تانگہ بنگلے کے اندر کھڑا ہے اور اندر سے ان کا نوکر محمود دوڑا آرہا ہے اس نے تانگے کے پاس آکر سلام کیا اور رک گیا۔

"یہ سامان اندر لے جاؤ اور میرے آنے کی اطلاع کر دو۔ لو یہ کارڈ دکھا دینا" میں نے کہا۔

"لیکن حضور! وہ تو سب سیر کو گئے ہوئے ہیں"۔

"کیا گھر میں کوئی بھی نہیں؟"

"جی ہاں چھوٹی مس صاحبہ ہیں"۔

"کون چھوٹی مس صاحبہ"۔

"تسلیم میاں کی چھوٹی بہن"۔

"اچھا میرے آنے کی اطلاع انہی کو کر دو"۔

"وہ سامنے باغیچہ میں بیٹھی ہوئی ہیں ابھی جاتا ہوں"۔

"اچھا تو میں خود ہی چلا جاتا ہوں"۔

میں آہستہ آہستہ باغیچہ کی طرف چل پڑا۔ سہانی رات تھی۔ چاندنی فضا کو روشن کرتی ہوئی زمین کو

متور کر رہی تھی۔ بہار کا موسم تھا۔ باغیچہ چاندنی میں عجیب سماں دکھا رہا تھا۔ ایک کونہ میں بنچ پر مس نسیمہ بیٹھی ہوئی تھی اور چند بچے ادھر ادھر کھیل رہے تھے۔ اتنے میں ایک بچہ نسیمہ کے پاس آیا اور کہنے لگا، "آپا! آپ بھی ہمارے ساتھ کھیلیں نا" "نہیں میں نہیں کھیلتی تم ہی کھیلو" نسیمہ نے کہا۔ اس پر وہ بچہ مچلنے لگا تو نسیمہ نے کہا "اچھا میں جس رنگ کا نام لوں اُسی رنگ کی چیز کو تمہیں ہاتھ لگانا ہوگا جو نہ لگا سکے گا اس پر ایک بازی ہوگی"۔ تمام بچوں نے اس بات کو مان لیا۔

"نیلا" نسیمہ نے کہا۔ تمام بچے اِدھر اُدھر نیلے رنگ کی تلاش میں بھاگے۔ پاس ہی نیلے رنگ کی بنچ تھی سب بچوں نے اسے جا کر پکڑ لیا اور چلائے "مل گیا نیلا مل گیا"

"اچھا اب سفید کو چھوؤ"

چراغ تلے اندھیرا کسی نے یہ خیال نہ کیا کہ خود نسیمہ سفید ساڑھی باندھے بیٹھی ہے۔ سب اِدھر اُدھر باغیچے میں دوڑنے لگے۔ کافی دیر تک ڈھونڈتے رہے میں یہ سب باتیں ایک بڑے سے پودے کے پاس کھڑا دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کھیل کے اختتام پر نسیمہ سے ملوں گا۔ بہت دیر تک بچے سفید رنگ کو ڈھونڈتے رہے۔ آخر تنگ آکر میں نے اپنا سفید رومال پودے کے آگے پھینک دیا۔ ایک کی نظر اس پر پڑ ہی گئی۔ وہ دوڑتا ہوا آیا۔ اور اُسے اٹھا کر زور سے کہنے لگا "سفید مل گیا" باقی سب بچے پیچھے اور وہ آگے نسیمہ کی طرف بھاگے۔ جب سب نزدیک پہنچے تو ان کا خیال نسیمہ کی سفید ساڑھی پر گیا۔ اور سب نے پکڑ کے گھسیٹنا شروع کیا۔ نسیمہ نے جان چھڑانے کی غرض سے جھٹ کہا "خاکی" سب بچے پھر بھاگے۔ میں نے خیال کیا نہ جانے یہ کھیل کب تک ہوتا رہے۔ اب چل کے ملنا چاہیئے۔ آگے بڑھا اور جونہی بنچ کے نزدیک پہنچا سب بچے مجھ سے آکے لپٹ گئے اور لگے "خاکی۔ خاکی" پکارنے۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ کیا بات ہے؟ مجھے یہ تو خیال ہی نہ تھا کہ میں نے خاکی پتلون پہنی ہوئی ہے بمشکل سے اپنے آپ کو چھڑایا۔ نسیمہ کی طرف دیکھا۔ تو وہ مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بنی ہوئی تھی۔ پاس گیا تو مجھے حیرت ہوئی۔ کہ یہ نسیمہ جو چند سال پیشتر چھوٹی سی لڑکی تھی۔ اتنی جلدی جوان کیسے ہوگئی۔ نسیمہ نے مجھے نہ پہچانا۔ اور کہنے لگی "معاف کریں۔ مجھے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں" میں نے جیب سے ملاقاتی کارڈ نکال کر پیش کیا۔ جب میں کارڈ دے رہا تھا تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ "اوہ محمد انور صاحب میں معافی چاہتی ہوں میں نے پہچانا نہیں سلیم بھیّا نے آپ کے آنے کا کہا تو تھا۔ لیکن ہمیں امید نہیں تھی۔ کہ آپ اتنی جلدی تشریف لے آئیں گے چلئے اندر چلیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ لوگ آجائیں گے، سیر کرنے گئے ہیں" میں چپ چاپ پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ برآمدہ اور چند ایک دوسرے کمروں میں سے ہوتے ہوئے ہم ڈرائنگ روم میں پہنچے "تشریف رکھیئے۔ باریک اور سُریلی آواز میں نسیمہ نے کہا۔ "شکریہ" کہہ کر میں ایک کوچ پر بیٹھ گیا۔

پہلے تو میں گھر والوں کی خیریت دریافت کرتا رہا۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اچانک دروازہ کھلا

اور سلیم اندر داخل ہوا اور حیرت سے میری طرف دیکھ کر کہنے لگا: "ارے! کیا پہنچ گئے" بہت اشتیاق سے آگے بڑھ کر ہم گلے ملے۔

سلیم۔ "آج ہم چار سال بعد ملے ہیں۔ مجھے بیحد خوشی حاصل ہو رہی ہے۔"

خوشی تو مجھے بھی ہوتی ہے مگر میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کہ تم نے یہ کیا کیا؟

"میں نے"

"ہاں تم نے"

میں نے تو کچھ نہیں کیا۔"

"تم تو اتنی ڈینگیں مارتے تھے۔ کہ میں شادی نہیں کروں گا . . . . . . تم نے تو مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا پھر اب تم یہ کیا کر رہے ہو؟"

"یہ تو قدرتی امر ہے۔"

"اس وقت قدرتی امر نہیں تھا۔ تم تو کہتے تھے۔ کہ میں ہمیشہ برہمچاری رہوں گا۔"

شادی کر کے بھی آدمی برہمچاری رہ سکتا ہے"۔

"تم نے تو کہا تھا کہ عورت خدا کی ——" میں اتنا کہنے پایا تھا۔ کہ نسیمہ میری طرف گھورنے لگی اور فقرہ مکمل کرنے کی خاطر جھٹ بول اٹھی "رحمت ہوتی ہے"۔ "نہیں۔ نہیں"۔ میں نے کہا "لعنت ہوتی ہے"۔

"نسیمہ (غصے سے) آپ سب عورتوں کے ساتھ میری بھی ہتک کر رہے ہیں"۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن یہ تو آپ کے بھائی صاحب کے الفاظ ہیں"۔

نسیمہ سلیم کی طرف دیکھنے لگی اور سلیم کی نظریں نیچے کو جھک گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگا: "اچھا یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اب ہمیں چل کے کھانا کھانا چاہئے۔ دیر ہو رہی ہے"۔

کھانے کے کمرے میں سلیم میرے دائیں اور نسیمہ میرے سامنے بیٹھی۔ اثنائے گفتگو میں معلوم ہوا کہ ان کے والدین سینما گئے ہوئے ہیں۔ ہم کھانا کھاتے رہے اور باتیں بھی کرتے رہے۔ نسیمہ اچھی اچھی چیزیں ادھر ادھر سے اٹھا کر میرے آگے دھرتی جاتی تھی۔ جس وقت میں کھانے سے نظر اوپر اٹھاتا۔ نسیمہ کو اپنے طرف متوجہ پاتا۔ جونہی ہماری آنکھیں چار ہوتیں۔ یکایک نیچے کو جھک جاتیں۔

"مسٹر سلیم! تمہیں اپنی شادی کی بابت پوری دلچسپی سے بتانا ہوگا کہ تم نے یک لخت اپنے خیالات کو کیونکر بدل دیا"۔ میں نے پوچھا۔

"میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ خاطر جمع رکھیں" سلیم نے جواب دیا۔

کھانا کھانے کے بعد مجھے سونے کا کمرہ دکھا دیا گیا۔ جہاں میرا سامان پہلے ہی سے لا کر رکھ دیا گیا تھا۔ وہاں میں اور سلیم دونوں بیٹھ گئے۔ "ہاں اب بتاؤ" میں نے پوچھا۔ "آپ جانتے ہیں محبت کرنا کسے کہتے ہیں؟" سلیم نے کہا۔ "میں

کیا جاؤں؟" میں نے جواب میں کہا۔" اچھا تو میں آپ کو بتاتا ہوں" سلیم بولا "محبت کرنا ایک ایسا جذبہ ہے۔ جو دنیا کو گلزار بنا دیتا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے۔ کہ یہ خود شیکسپئر کے الفاظ ہیں"۔

"تو یوں کیوں نہیں کہتے۔ کہ تم بھی کسی کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے"۔

"جی ہاں۔ یوں ہی سمجھ لیجئے۔ اور جو آدمی محبت کرنے لگے تو اس کا علاج تو آپ یقیناً جانتے ہی ہوں گے"۔

نہیں میں نہیں جانتا۔

"اچھا آپ ان باتوں کو جانے دیجئے۔ خدا کرے۔ آپ بھی کسی کی محبت میں گرفتار ہوں۔ تو آپ کو بھی پتہ لگے"۔

"خدا . . . . نہ . . . . کرے" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"آپ اب آرام کریں۔ رات زیادہ جا چکی ہے اور آپ تھکے ہوئے بھی ہیں۔ اچھا شب بخیر۔

"شب بخیر"۔

جونہی سلیم باہر نکلا میں پلنگ پر دراز ہو گیا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ کیا کسی سے محبت ہو جانا قدرتی امر ہے یا اپنے بس کی بات؟ جتنا میں اس سوال پر غور کرتا یہ اتنا ہی پیچیدہ ہوتا جاتا تھا۔ اس وقت کچھ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ کیا یہ ضروری ہے۔ کہ مرد کی محبت صرف عورت سے ہی ہو؟ جونہی مجھے یہ خیال آیا۔ مجھے نسیمہ یاد آئی۔ میرے خیالات نے پلٹا کھایا جس وقت میں اپنا ملاقاتی کارڈ نسیمہ کو دے رہا تھا میرے ہاتھ کانپ رہے تھے کیوں؟ اس کا جواب میرے پاس کچھ نہیں۔ دوسرے اس وقت میرا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا کیوں؟ پتہ نہیں کیوں۔ کب؟ جونہی ہماری آنکھیں چار ہوئی تھیں . . . . . . اور جب سلیم نے یہ کہا تھا کہ خدا کرے آپ بھی کسی کی محبت میں گرفتار ہوں۔ تو آپ کو بھی پتہ لگے۔ تو کتنی چوٹ میرے دل پر لگی تھی۔ اور کتنا رک رک کر میں نے جواب دیا تھا۔ کہ خدا نہ کرے" اس وقت بھی میرے دماغ میں نسیمہ کی تصویر گھوم رہی تھی۔ اس سب کا کیا مطلب ہے؟ کہیں اس کو تو محبت نہیں کہتے؟ اس وقت بھی میرا دل دھڑک رہا ہے اور نسیمہ کی صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ یہ کیوں؟ اف خدا! میرا جی گھبرا رہا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ نسیمہ کو دیکھتا رہوں اور دیکھتا ہی چلا جاؤں۔ سلیم تو کہتا تھا۔ کہ محبت کرنا ایک ایسا جذبہ ہے جو دنیا کو گلزار بنا دیتا ہے۔ لیکن میرے تو خیالات تک کی دنیا ویران، اجاڑ، اور برباد ہوتی جا رہی ہے۔ نہ جانے کب تک ان ہی خیالات میں کھویا رہا اور یہی سوچتے سوچتے سو گیا۔ اچانک ایک ڈراؤنے خواب نے بیدار کر دیا۔ خواب یہ تھا۔ کہ میں اور نسیمہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہیں۔ اور میرے لب اس کے لب کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ اور تو اسے پیارا خواب کہیں گے لیکن میں . . . . . میں اسے ڈراؤنا کہتا ہوں کیونکہ جب میرے لبوں نے اسے چوما تو میرے تمام بدن میں بجلی کی سی لہر دوڑ گئی۔ جب میں بیدار ہوا تو میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے۔ اور میں کانپ رہا تھا۔ اس کے بعد بقیہ رات مجھے نیند نہیں آئی۔ کیوں؟ اس کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

صبح صادق ہوئی کمرے میں آ کے بیٹھا ہی تھا کہ نوکر نے آ کر بتایا کہ مجھے کھانے کے کمرے میں چائے پینے کے لئے بلایا جا رہا ہے۔ وہاں پہنچ کر سلیم کے والدین سے بھی ملاقات ہوئی۔ باتیں کرتے کرتے سلیم نے پوچھا "مگر یہ آپ کی آنکھیں کیوں سرخ ہیں۔؟ کیا آپ رات کو نہیں سوتے ؟"

"سویا کیوں نہیں۔ اچھی طرح سے سویا ہوں" میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ جونہی میں نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ نسیمہ کو اپنی طرف گھورتے ہوئے پایا۔ مگر یہ کیا؟ نسیمہ کی آنکھیں بھی سرخ انگارہ تھیں۔ کیا وہ بھی میری طرح رات کو نہیں سوئی؟ یا کسی کی یاد میں روتی رہی ہے؟ یہ ایسے سوال تھے جن کا جواب میں کیا دیتا۔ رات سے میرا دماغ کمبخت ایسے ایسے سوالات پیدا کر رہا تھا۔ کہ ایک کا جواب بھی میرے پاس نہ تھا۔ اور نہ ہی سوجھتا تھا۔ یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہی میری آنکھوں نے دیکھا اور دماغ نے سوچا۔ "آپ کی آنکھیں بھی تو سرخ انگارہ ہیں"۔ میں نے نسیمہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا؟ "کیوں"؟ "نہ جانے کیوں"۔ مجھے جواب ملا۔ اور سب کی آنکھیں نسیمہ کی آنکھوں کی جانب اٹھیں۔ اور ادھر اس کی زمین کی طرف نیچے جھک گئیں۔ اس کے بعد پھر میں نے کوئی بات نہ کی۔ وہ تین روز گزر گئے۔ میں روز خاموش دکھائی دیتا۔ مجھے شکایتیں بھی سننی پڑیں۔ مگر میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کہ چند روز سے میرے سر میں درد رہتا ہے۔

نسیمہ کی یاد اب مجھے ہر وقت ستاتی . . . . . ستاتی نہیں بلکہ تڑپاتی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے ہوئے بھی دور بہت دور تھے۔ میں ہر وقت اداس اور غمگین دکھائی دیتا۔ جب بہت بے چین ہوتا۔ تو باہر نکل جاتا۔ اور دیر تک یونہی پھرتا رہتا۔ ایک دن شام کے وقت جو میں واپس آیا تو سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ اپنی تصویروں والی البم جو کہ صبح میں نے کسی کام کے لئے سوٹ کیس سے نکالی تھی اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اچانک ایک صفحے پر رک گیا۔ کیونکہ یہاں سے ایک تصویر غائب تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ کہ تصویر صبح موجود تھی اور اب نہیں کیونکر اور کیوں غائب ہوئی؟ کسی کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ اتنی زیادہ قیمتی بھی نہ تھی۔ میں زیادہ حیران تو اس بات پر تھا۔ کہ میری ہی تصویر کیوں غائب ہوئی؟ کسی اور کی کیوں نہ چرائی گئی؟ یا لیجانے والا ساری البم ہی کیوں نہ اٹھا کے لے گیا؟ لیکن یہ کیا اس سامنے والی لڑکی کی تصویر پر پانی کی دو بوندیں کہاں سے آگئیں؟ تصویر لے جانے والا یہ پانی کیوں ڈال گیا؟ اور پھر صرف دو بوندیں۔ کیا وہ زیادہ نہیں ڈال سکتا تھا؟ اس میں ضرور کچھ راز ہے۔ میں بہت سوچتا رہا۔ لیکن خاک بھی نہ سمجھا اس وقت میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں سیدھا کمرے میں آیا۔ سیر کے لئے باہر نہیں گیا۔ آتے ہی پلنگ پر دراز ہو گیا پھر میں تھا اور وہی پرانے خیالات۔ اس وقت سب سو چکے تھے۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف میں ہی ایک ناامراد انسان تھا جو کہ دوسرے کی یاد میں مبتلا تھا۔ اور یاد بھی اس کی جس نے خدا جانے بھول کر بھی مجھے یاد کیا ہے یا نہیں۔ میں خیالات کی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ کہ اچانک میں نے ساتھ والے کمرے سے رونے اور آہیں بھرنے کی مدھم آواز سنی۔ یہ کمرہ مس نسیمہ کا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ کل بھائی کی شادی ہے اور آج بہن رو رہی ہے کیوں؟ خدا جانے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ اٹھا اور بے دھڑک نسیمہ کے کمرے میں آہستگی سے گھس گیا۔ بغیر کوئی آواز نکالے

بجلی جلائی۔ میری وہی تصویر نسیمہ کی چھاتی پر پڑی ہوئی تھی۔ بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور تھوڑی دیر بعد ایک ہلکی سی آہ اس کے منہ سے نکل جاتی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور آگے بڑھا اور اس کے لبوں سے اپنے لب ملا دئے نسیمہ نے غصے سے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے تو مجھے دیکھ کر شرم سے آنکھیں نیچے جھکا لیں۔ مگر پھر جھٹ غصے میں ہو گئی اور کچھ کہنا ہی چاہتی تھی۔ کہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا۔ "چور"

"کون چور" نسیمہ نے ہوم پلٹتے ہوئے کہا۔ "میں یا آپ" "آپ" میں نے جواب دیا۔

"میں کیسے؟" نسیمہ نے پوچھا۔ "میری تصویر آپ چرا لائی ہیں۔ اور یہ موجود ہے" میں نے جواب دیا۔

"اور آپ نے کچھ نہیں کیا؟" نسیمہ نے پوچھا۔ "میں نے کیا کیا ہے؟"

"بڑے چور تو آپ ہیں" نسیمہ نے کہا۔ "میں کیسے؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"آپ نے میرا۔ ۔ ۔ ۔ دل چرایا ہے" نسیمہ نے شرماتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کا دل چرایا ہے۔ یا آپ نے میرا" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"چلو دونوں نے چرایا ہے۔ ہم دونوں چور ہیں" نسیمہ نے کہا۔

میں اب سمجھا کہ اس لڑکی کی تصویر پر پانی کی دو بوندیں کہاں سے آئی تھیں۔ نسیمہ نے اسے میری منگیتر سمجھا تھا۔

(ع۔ م۔ اسرائیلی)

خُلدِ بریں!

غریبوں کی بستی پر کارکنانِ قضا و قدر کی نظر پڑی۔ دفعتہً الہام ہوا کہ لگے ہاتھوں ان ساکنانِ خطۂ غریباں کو جنت کی سیر کرائی جائے۔ جبرائیل کو حکم ملا کہ غریبوں کی فہرست تیار کرے۔ چنانچہ جلی حروف میں اشتہار آویزاں کئے گئے کہ "ضرورت ہے غریبوں کی واسطے کرنے سیر جنت کی۔ مگر شرط ہے۔ قابل ہوں خواہشمند اصحاب سفر کی کڑی اٹھا سکیں"۔ بیدار بخت تو ہم تھے ہی جھٹ اپنی خدمات پیش کر دیں۔ کہ پھر شاید موقع ملے یا نہ۔ چند نام نہاد غریب اور بھی پیدا ہوئے تو معلوم ہوا کہ معاملہ ٹیڑھی کھیر ہے اگر نا پرسیدہ مان گئے تو خیر۔ اور اگر باز پرس ہوئی تو جنت کی سیر نہ سہی سایہ ہی بلا سے۔ اپنا مسکن تو کوئی غصب نہ کرلیگا۔

اسی بیم و رجا میں چند سے بسر کی۔ حتیٰ کہ اطلاع موصول ہوئی کہ ہم بھی ان چند خوش نصیب لوگوں میں شامل ہیں جنہیں اس نذرِ موعود سے بہرہ مند ہونے کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ احباب ہم سے، ایسے بدگماں ہوئے کہ

---

۱ وادیٔ کشمیر۔ ۲ ایم عادل خاں

دفعتہً سب کے سب آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ اور ہم بہ نفس نفیس زاویۂ بادیہ میں پڑے پڑے فردوس بریں کے خواب دیکھا کئے۔ خدا خدا کر کے معراج کی مقررہ تاریخ آپہنچی۔ جبرائیل کی معیت میں کارواں رواں ہوا۔ جونہی ہم نے اپنے قدم میمنت لزوم سے پہلے آسمان کی عزت افزائی کی۔ فرط انبساط سے اس کے آنسو ڈھلک پڑے۔ ہم نے اپنے اس خیر مقدم کا آنکھوں ہی آنکھوں میں اظہار تشکر کیا۔ لیکن زندگی مستعار چار دن اور کار جہاں دراز ہونے کے باعث اس کی دعوت قیام کو قبول نہ کر سکے۔ منتظر میزبان کو یہ بات شاق گذری۔ اس کا انبساط رنج میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

دوسرے[۲] آسمان کی سرحد میں داخل ہوئے تو عجب جان افزا سماں پایا۔ آنکھوں کو ٹھنڈک اور قلب کو مسرت حاصل ہوئی ہوا بادلوں کو اڑا لائی اور اپنی اٹھکیلیوں سے ہماری دلفریبی کرنے لگی لیکن ہاتف غیب سے ندا آئی "ہاں بڑھے چلو" مجبوراً چھچلتی ہوئی نظر ڈالنے پر اکتفا کی۔

شام ہوئی تو ایک آباد جگہ پر پہنچ گئے۔ رات گذری۔ علی الصباح ایک مسجد[۳] دیکھنے چلے۔ دشوار گزار راستہ طے کرنے کا ہمارا یہ پہلا امتحان تھا جوں توں کر کے وہاں پہنچے۔ حسین پجاری کی دید سے سفر کی کلفت معدوم ہو گئی۔ وسعت نظارہ سے وارفتہ ہو گئے۔ ایک لمحہ کے لئے دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو گئے تھے۔ کہ مناکوچ کا حکم ملا۔ طلسم خیال باطل ثابت ہوا۔ چار و ناچار وہاں سے مراجعت کی ع کاش کہ عرش سے ادھر ہوتا مکاں اپنا۔

تیسرے[۴] آسمان کی طرف روانہ ہوئے تو راستہ میں ایک باغ ارم[۵] دیکھا جو اپنے مکینوں کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ دن ڈھلے منزل پر پہنچے۔ خیمے نصب کر کے سستانے لگے۔ دوسرے دن حکم ملا کہ جھیل[۶] کی سیر کی جائے نصف راستہ طے کیا تو آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔ چند رفقا بددل ہو گئے۔ انہوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ باقی اولوالعزمان دانشمند منزل مقصود کی طرف روانہ ہو پڑے۔ درحقیقت سفر سفر کا آغاز تھا۔ راستہ اور کٹھن ہوتا گیا۔ ایک دو ہمراہی اور بھی مایوس ہونے لگے۔ لیکن جب ایک سن رسیدہ جوڑے کو وہاں سے لوٹتے دیکھا تو ان کی رگ حمیت پھڑک اٹھی افتاں و خیزاں جائے مذکورہ پر جا پہنچے۔ وہاں ایک ہو کا عالم تھا جو نیرنگئ قدرت کا آئینہ معلوم ہوتا تھا۔

چوتھے[۷] آسمان کی طرف چلے۔ تمام دن سفر میں گذرا۔ وہاں کی دنیا کچھ ناراض سی دکھائی دیتی تھی۔ ہم سر شام ایک قصر[۸] رفیع الشان میں گھس گئے۔ ہماری اس دیدہ دلیری پر آسمان برس پڑا۔ اس نے انتہائی غم و غصہ کا اظہار کیا لیکن ہمارے کانوں تک جوں نہ رینگی۔ رات تھی۔ کٹ گئی۔ لیکن صبح کو نی الفور وہاں سے چل نکلے اور دن ڈھلتے ہی اس کی سرحد کو پار کر گئے۔

---

۱ راولپنڈی۔ ۲ کوہ مری۔ ۳ تخت سلیمان۔
۴ پہلگام ۵ اچھابل۔ ۶ کلین لیک۔ ۷ لدروٹ۔ ۸ ڈاک بنگلہ۔

ملہ سدرۃ المنتہیٰ پہ پہنچے تو جبرائیل کے قدم بھی ڈگمگانے لگے۔ عروج کو زوال ہونے لگا اس لئے تمام دن گل و گلزار میں سیر کرتے رہے۔ تمام سفر کے دوران میں یہی ایک دن تھا جس کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہیگی۔ قدرت کے رنگین مناظر جو ہم نے اس دن مشاہدہ کئے ہرگز فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است — ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

بالآخر چلتے چلتے ملہ خلد بریں میں جا پہنچے۔ خوب گہما گہمی تھی۔ حور و غلماں بکثرت موجود تھے۔ مگر جو خوب دیکھا تو پایا آخر کبیدہ خاطر ہو کر رہ گئے۔ معلوم ہوا کہ وہاں کالے لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ بہت متعجب ہوئے کہ جنت ہو بھی کالے لوگوں کی ملکیت لیکن انہیں پاس بھی نہ پھٹکنے دیا جاتے۔ افسوس ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اگر فی الواقع جنت ابدی کے لئے بھی یہ تفریق روا رکھی گئی تو دوزخ جاوید ہو گی اور ہم غریب ہوں گے جو اس کا ایندھن بنیں گے۔ کیونکہ غریب بچارے کے پاس کوئی توشۂ آخرت نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی ہو بھی تو ع عصمت بی بی است از بے چادری۔ واللہ۔ ع ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے۔

حیات مستعار کا چراغ گل ہونے کو تھا۔ صبح سے شام تک روئے آب پر ٹمٹماتا رہا معلوم نہیں کس ممنوعہ پھل کو چکھا کہ بہشت خالی کرنے کا حکم صادر ہو گیا۔ آخر حضرت آدم کی اولاد جو ٹھہرے۔

ع حیف کہ در چشم زدن صحبت یار آخر شد ملہ

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

(ایم۔ افضل)

زندگی

شمع کے گہرے اندھیرے سائے ہیں
ناچتے گاتے پتنگوں کا ہجوم
جو کہ ہیں آسودۂ سیمائے حسن
تیرے دم سے تھی درخشاں میری ساری کائنات
اور اک شعلہ سی تھی تیری حیات
جس کی تابانی میں، میں جیتا رہا
زندگی تب اک سنہرا خواب تھی۔
آندھیوں نے توڑ ڈالا وہ فسوں
جیسے دو ننھے سے پتے ساتھ ساتھ
ولولہ با سرگوشیاں کرتے ہوئے۔
جھیل کی خاموشیوں میں ہوں رواں
اور اک وحشی سی لہر
دونوں کو کر دے جدا
اپنی اپنی راہ سے دونوں بھٹک جائیں کہیں۔
سوچتا ہوں بارہا
زندگی کی بے سکوں تنہائیاں
آرزوؤں کی تپش
ویران راتوں کی تڑپ
اپنی مجبوری تری لاچاریاں
ایک جھونکے سے تو ہیں؟

(رحیم)

ملہ ۱۰،۰۰۰ فٹ بلند چوٹی سن مس۔ ملہ وادی سندھ۔ ملہ گلمرگ۔

خیبر

دارالعلوم اسلامیہ پشاور

نگران:۔ حافظ محمد ادریس ایم۔ اے۔ ایچ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

مدیر:۔ میاں محمد یوسف کاکاخیل

معاونین:۔ عبدالرؤف نوښہروی، محمد اشرف مفتون

جلد (۲۶) | نمبر (۳)

فہرست

۲

خپله ژبه

اوسنۍ خبره ده - چې لوی انګرېز سفير د فرانسيسي سفير سره
د ناستې او شربکت په بابت کښې خبرې کولې . انګرېز به خپله خبره
به انګرېزۍ کښې وکړه . او فرانسيسي به ورته په فرانسيسۍ ژبه
کښې جواب ورکړ . تر منځه ئې ترجمان نه وو ځکه چې دواړه د
يو بل په ژبه ښه پوهيدل . خو د خپلې ژبې د اوچت والي خو د لو
ډېرولۍ د بل په ژبه خبرې نه کولې .

ګويا په دې مختصر مجلس کښې ښکاري دا او ښودله چې مونږ که
خپل قوم عزتمند غواړو . نو په هره موقعه کښې د خپلې ژبې
د عزت او اوچت والي خيال ساتو . او تر څو چې بالکل مجبور نه يو
د بل ژبې ته د ګوابش نه کوو . د دې په مقابله کښې چې مونږ خپل ځان
ته ګورو . نو حيران پاتې شو ځکه چې د خپلې ژبې سره مو ځبښت د
ميرې مور سلوک دے . او څومره چې مو ورس ورسی . د پښتو په
غور ځولو او کېمنو و کښې کوتاهي نه کوو .

په حديث کښې راغلي دي چې عربي د جنتيانو ژبه ده . د دې په
مقابله کښې د دوزخيانو له هم د وخت تيرولو د پاره يوه ژبه پکار ده .
لو مونږ د بدنامۍ لنګ حيله په پښتو را واړوو . او دا خپله خوږه
ژبه مو د زړه د اخلاص د دوزخيانو ته وبخښله . پخپله جنتيان شو
د خيو په ډيرۍ کښې ناستو او د علمي او ادبي دنيا قولي لانجې او د
شرخودلي کار نه مو د دنيا نورو قومونو ته پرېښودل . چې څوک ئې
زده او ترېلئ زده . څومره که بيا څه وخت د ټيلو يا ليکلو ته شوق
د شعر نو نورې ژبې ديرې دي . د خپل توفيق مناسب به په يوه
بله ژبه کښې کش پيش کوو . ګويا به يو .

هوښياران وائي . چې د خپلو خيالاتو د څرګندولو د پاره ښه او
اسانه ژبه مغزه ده . کومه چې د مور په غېږ کښې زده شوې وي . ولې
ني چې مونږ د خپل وطن قابل خلق ګورو نو پخپله ژبه کښې ورته
تقريرونه کول يا مضمون ليکل شرم ښکاري . ځکه چې د څوکو په زړونو
کښې دا ناسته ده چې پښتو هسې وحشي ژبه ده . او په دې کښې څه
ليکل هسې خپل وخت خرابول دي

په دې کښې شک نشته چې پښتو سر دست علمي ژبه نه ده . ولې
سوال دا دې چې آيا دا ژبه به د دوزخ د آباديدو نه وړسته
هيڅ ترقي ونکړي . او که څو ټک چې مونږ خپلو مشرانو په واګه
پريخودې يو . د غسې د مونږ هم خپل دا تلونکي پښتونه په سپينه
ډاګه پريکړه . چې څوک د خپل مذهب خپل معاشرت او
خپل تاريخ معلومولو کښې هم د نورو قومونو محتاج وي ؟ ځکه چې خيال
سوا د خداى بخښلي مېري نه بل څوک به هېڅوک هم دا نه
وائي . چې څومره دا تلونکي پښتونه هم لکه څومره نورو قومونو ته
تمبى د بوى . او دا تپوسونه د کوي . چې مونږ څوک يو . او څوک
وو . پلار او نيکه مو "څه" وو . او څه ئې کول څوک ئې د ورپورې
پېرد موږ د موږ خاندې . او دا د دې نه والي چې "هغه سرے
په څه دي چې د خپل ځان خبر نه وي" .

که چېرې د خپل ځان پېژندلو د پاره دا ضروري وي . چې
مونږ د خپله ژبه د نورو ژبو په مقابله کښې ودروو . نو زه ډېر
په ادب سره دا تپوس کوم . چې دا کار به څوک کوي . آيا د دې
د پاره به هم يو امام مهدي پيدا کيږي . چې هغه به پخپل کرامت
سره په سوونو المارۍ د پښتو د کتابونو نه ډکوي . او که د
الله دين ديوه به پيدا کوو . چې هغه ومرو . نو بيا به داسې

او په چوف منتو به دَ پښتو بے مثله کتابونه مونږ ته مخکښې کیږدی؟

څا وروستو ژبه په دې ترقي نشي کولے، چه قوم دِ ورته شا کړی. کوم قومونه چه خپلې ژبې ته شاکړی ده. دهغوئ ژبې د دنیا د مخ نه ورکې شوی دی. او ورسره ورسره هغه قومونه هم د دنیا د مقابلې میدان ته دی. هر قوم د بل نه د وړاندې کیدو کوشش کوی. او کوم قوم چه په دې میدان کښې همیشه سستیا کوی، هغه که په منډه کښې رسوئے نه شی نو دی. خو بیا هم د شمشتلے نه وروستو پاتې شی او د خلقو د خندا شی.

او کوم قومونه چه د ژبې ساه د خپلې ساه سره تړلې ګنړی، نو هغوئ د جادو کونتهئ (قلم) په لاس کښې داخلی او د دنیا د جهان قومونو پاکیزه پاکیزه خیالات په لوړ د وړ خوګښې د خپلې ژبې په قالب کښې واچوی. او خپله کتابونه ژبه د کندې د ویخ نه د عرش سر ته اورسوی.

عربي د دنیا یوه د ومره پوره پوتی ژبه ده. چه په ټول عربستان کښې د شمادی سړی وو. چه هغوئ هر یو کښې خط کتابت کولے شو او نبی په دَ قرآن شریف د لیکلو دَ پاره په سعی سړي پیدا کول. خو چه هغوئ ورته منې د تو پلے. نو دیری ورځې تیری نه وی. چه عربي د ژبو دانړلې شوه. او د دنیا په کتو نو کښې د هغې تعلیم دَ پاره کالجونه او یونیورسټئ جوړې شوی. جرمنئ یوه د ومره پر یوتی ژبه ده چه چاپائی تپوس نه کوو. نن هغه ژبه ده چه د دنیا د ټولو ژبو نه زیاته مالداره ده. او هر تعلیم یافته د هر علم د زدکړی دَ پاره دَ هغې محتاج دَی. انګریزي د ومره لانړ ژبه ده چه دَ شکسپیر غوندې سړي هم پکښې تپوس نه وُه. دلی نن هغه دَ دیرو ژبو نه پانړ ده او د دنیا قومونه ئې په زده کولو مجبور دی.

صیح ژبه په اصل کښې نه ښه وی او نه خرابه. البته چه نالائقو ته په لاس ورشی. نو که مرغلره وی. هم یو چرګ ته د جوار د دانې نه سپکه ښکاری. او که د لائقو په لاس ورشی نو که مشکنړه وی نو هغوئ ترېنه مرغلره جوړه کړی. نن خمونږ پښتو هم د خویلا رالو مخکښې په تره ده. که چری خمونږ لائق ځوانان د دې لرقدر نه خبر شی. نو صبا له ئې کوره چه دا به هم یو د خاپسته نا وی دی خلق به ئې په مخ کتو باندې د وېچې نه سندی. لوئې دارو بر ترینه چاپیره نامست دی او دم یو به پری هوسیږی. دلی که خمونږ قابلو خلقو اُس هم د ے ته په نیغ نظر او نه کتل. نو زمانه دَ چا حیا نه کوی. خلق مدام هغه ریبي چه څه کری. د دوئ به خپل طاقتونه د بل په مزکه خوړم کړی. نتیجه به ئې دا وی چه فصل به ترېنه مالک یو سی او د وی به نکه د بیلونکی جوادګر خرجے رودې کور ته راروان شی. نه به ئې هغه بل خرمے تپوس کوی او نه به ئې خپل کور کښې ځائې وی.

ځکه چه کوم سړی پیړ دئ ژبه باندې محنت کوی. هغه دَ اهلي ژبانړ مقابله هیچری هم نشی کولے. او دا سی دا سی غلطئ ترنه کیږی چه هغه قوم در پوری تمام عمر خاندی. دَ قاموس د مصنف قصئ مشهوره ده. چه هغه د ومره عربي زده کړه چه عرب پرې د هوکه شو. او یو سړی ورله لوړ د دکړه. دشپې ده خپلې ښځې ته و ے چه پاسه. دِ یو مره کړه تو به حالئ دَ د ے چه دامی لی ود ته د ئیلے و ئے چه اِطْفَائِي السِّرَاج. د فارسئ د چراغ کُشتن نه ئې ژر ترجمه د کړه او د ته ئې او و ے اُقْتُلِي السِّرَاج. او په د ئے چل عاجز په د رمبئ شپه د ښځې د لاسه ونیوے شه. (تعنئ غلطه ده خو نتیجه ئې سمه ده.)

نو غرض مې دا دے چه خمونږ کومو قابلو د ماغونو ته په پښتو کښې مضامین لیکل ګناه ښکاری. او د دنیا نورو ژبو ته ګواښ کوی. هغوئ که ځپل محنت میوه خواړي او خپل قوم دَ

پښتو دَ خادمانو په فهرست کښې داوستل غواړي. نو ځکه فیصله دِ بیا فکر اوکړي. امید دے. چه ځما داخبرې بهرورته حق ښکاره شي. او هغوئ به دیر ژر د پښتو ژبې محسن یا شي.

سه

ن دَ وطن د عاشقانو قدر هیڅ نشته دے
دا تلونکے نسل به ئې کانړي دَ مزار ښکلوي

شاید چه ځما بعضې ورونړه دا اووائې. چه مونږ پښتو ځکه پرېږدو چه دَ هغې خپل څه لټریچر نشته. او نورې ژبې موږ که خوښې کړې دي. چه هغه په دې حقله ما الاړې دې نو ځه به د هغوئ خدمت کښې عرض وکړم. چه که دَ پښتو لټریچر نشته نو دا څو لا ښه شوه. "ماموته بیا دِ موته" غریب له چه ګسکوړک ورکړې هم پوري شکر ګذار دې. غم خو هلته دی چه پو نواب دچا میلمه شي. پښتو باندې چه ژن نا ګ هر څه مهرباني وکړه. هغه به ئې ډېر په خوشحالۍ قبوله کړي او نورې ژبې به دد باندې ناز نخري کوي.

بعض خلق به وائي چه مونږ له د پښتو رسم الخط نه راځي نو که زړه مو غواړي چه پښتو کښې څه اولیکو. نو هم لیکلے نشو. ځه هغوئ ته وایم. چه ورونړو. اول خو د پښتو رسم الخط څه ډېر ګران نه دے. که هغه رت ئې ګنړے. نو په یو څو ورځو کښې ئې زده کولے شے. او بله دا چه که رسم الخط نه دَ رځې نو نه سهي تاسو چه په کوم طرز پښتو لیکلے شئ. او لیکئ. که د هغې نه ملک ته او قوم ته څه فائده رسیږي نو اخبار یا رساله چلونکے به ئې ځکه تصموي. او شائع کوي. او ښتیا خو دا ده چه د پښتو په رسم الخط خولا تر اوسه جګړه ده. نو راځئ یلغار پر اوکړئ. او چه هر رنګ تاسو لیکل شروع کړل. صبا به هغه د دې ښیې لیبیږي ژبې رسم الخط شي

او چا که یکښې پوزه سنډه وله. نو د هغه نوم به پوزوکینو لے شي.

بعض ورونړه به دا هم داوائي چه مونږ پښتو لیکو لو په پیځې کښې د اُردو، عربي، فارسي او انګریزي لفظونه ډېر راشي. خالصه پښتو لیکلے نشو. نو هله دلیکوئ نه. ځه به در ته عرض وکړم. چه کوم خلق تاسو ته خالصه پښتو غواړي هغه ګډ لیونی نه دي خو درو غ هم نه دی. خالصه ژبه په دنیا کښې یوه هم نشته. هره ژبه دَ بلې نه لفظونه اخلي او کومه ژبه چه ځان د دې نه بچ ادرلي نه اوباسي. هغه په لږ ورځو کښې مړه او ښخه شي. پښتو نه خالصه وه. نه اوس دَ چا پښتو خالصه ده. او نه وړاندې دا پښتو ژبه خالصه کیدے شي. کوم خلق چه د خالصې او ساده پښتو ستاسو نه طمع کوي. هغوئ ته دا نه ده معلومه. چه دا "خالصه" هم د عربي لغظ دَی او "ساده" هم د فارسي ټکی دے. رښتیا دا ده چه خلق کوم ټکو ته خالص د پښتو ټکي وائي. هغه هم اکثر د نورو ژبو ټکي وي. خو نا پوهې پرده پوخ ښیز دے. د پښتو اِساس، اَشر، اَدر، بِو، بریخ، پټیره، تبه، تیله، بیسانت، جانان او سدا په شوک وائي چه دَ پښتو خالص ټکي نه دي. خو که په رښتیا هم پوختي. نو دا لفظونه هم د عربي دَ حِصار، حشر، اُدار، بوّ، بریخ، فطیر، طبع، طِلا، فساد، جنان او صدف نه جوړ شوي دي.

نو بائد دی چه هغوئ دِ دا ټکي هم پریکدي. او که دا نه ځواني چا شروع کړه او عربي، فارسي، پنجابي او هندي لي نه ئې خپل لفظونه وایس ورکړل. نو پښتو به لس د پنځه صاحب کیږي شي. په ټولکت کښې به تقسیم شي.

د دې وجهې نه خو وايم چه څيره دے تاسو نه خالصه پښتو ليکلې نو ليکئ. ځکه که يو لفظ نا آشنا دے صبا به آشنا شي که نن پردې دے صبا به خپل شي. دغه مې دغه مې چه ځمونږ په ژبه کښې موټر، ريل، انجن، مشين، ټيسن ټيکس، سکول، بټن، لالټين، پارټي، بسکټ، کوټ او واسکټ وغيره استعماليدل نو چا وے چه دا دمصر ټوټې به د پښتو په ټوکښې داسې او به شي چه نه پيژندل شي او نه به ترنه جدا کيدلے شي. نن دغه ټکي دي. چه عام پښتانه ئې داسې ادا کوي چه نا آشنا نه ښکاري.

ژبې چا په زنځيرونو تړلې نه دي. او نو څوچه د خيال مارغه په پنجره کښې بند نشي. ژبه هيڅوک خالصه نه شي ساتلې کيدلے. ځکه چه خيالات په ذهن کښې د لفظونو په ذريعه راځي. او د خيالاتو وسعت خواه مخواه په ژبه کښې وسعت پيدا کوي. نو څوك چه د پښتو نه علمي ژبه جوړول غواړي هغوئي د دې پروا نه کوي. چه ځما ژبه خالصه ده که نه خالصه.

خدا سيد لوم چه ځما د قوم ځامې به ځما د نصيحت د زړه په غوږ کوادري او د خپل توفيق په مناسب سر د پښتو په ښه المال کښې د خپل علم زکوة داخلول شروع کړي

محمد ادريس د طورو

د ژوندون راز

جنتونه دِ نصيب د سر اقبال شي / د ده قبر دِ د ښانه لا زوال شي

ده ليکلے حکايت دے په داشان / يو ځنګل کښې اوسيدل په کوسفندان

دشمن نه وه بل خو دا ځنګل کښې ديروه / د ګيډو نسل زيات له حده تير وه

د تقدير ګشتے آخر يوې برابر شو / چه زخمي د کوسفند الو په ويرزيګر شو

د دے ځنګل کښې قيام اونيوه شيرانو / حمله ور شو د وئ په کور د کوسفندانو

د زمرو په دې ځنګل شهنشاهي شوه / د ګيډانو په تقدير کښې غلامي شوه

شيرانو په دې ځنګل کښې په ښکار شو / د رنګ په وينو د ګيډانو مرغزار شو

دې کې د الو کښې يوګډ چه ډير هوښيار وو

دوو د انديش او ديرينه تجربه کار وو

ډير غمګين د خپل قوم په تباهئ شو / ډير خفه د امزو په غلامئ شو

فريادئ دے د ګردش د تقدير شو / د علاج په جستجو کښې په تدبير شو

هر کمزوری د خپل ځان په حفاظت   مدادا کړي د خپل عقل په طاقت
چه انګار دی ذره کښې بې دانتقام   تدبر د افلاطون کوي غلام
ده دے اوس ځونږ دنسل بربادی شوه   یقیناً د ګوسفندانو تباهي شوه
ګوسفندان کله خلاصیګي په طاقت   ګله د شیر خوراک بیدا کړلو قدرت
ناممکن ده چه په زور یا نصیحت   لو ګوسفند جوړ امزری شي نطوق
ولیکن په چالاکۍ او په هنر   داممکن ده شیر غافل شي د خپل سر

جوړی ځان نه کړه صاحبِ طریقت

ده شروع کړه امزرو ته نصیحت

ده دے وادرلی امزرو ځه پیغمبر یم   ستاسو پیر یم هم استاذی د اکبر یم
ظالمانو ته م کار د سے چه تلقین کړم   ګمراهانو ته بیان اصول د دین کړم
توبه کار شئ د اعمالِ نامحمود نه   خبردار شئ عاقلانو د خپل سود نه
تند خوئ زور آوری ګناهګاری ده   کمزوری او لاچاری کښې بهبودي ده
چه نیکان دی دهغوئی خوراک ګیا ده   حرام کړي غوښه خدائے په اولیا ده
دا تیره غاخونه ستاسو رسوائی ده   تیری پنجے حقیقت کښې ګمراهي ده
یو زره شه صحرا مه شه که خبر ئے   چه د نور د نور نه بالکل منور ئے
اے چه پائی ته په غوښه د ګیا انو   ځان حلال کړه چه حساب شي له نیکانو
عمر جوړ کړي د انسان ناپائید ار   جبر، قهر، انتقام، او اقتدار
نه غافل شه له خپل ځان که فرزانه ئی   که غافل له ځانه نه ئی دیوانه ئے
ستوري بند غوړیده نه بند هم شونډې بند کړه   تخیل په آسمانونو کښې بلند کړه
د دنیا داهنګامه داره فانی ده   په دنیا غرور کول یو نادانی ده

شیر نر دو ستوړے شو سے له ښکار نه

ده د مه غوښتله لړه د خپل کار نه

دَغفلت دا نصیحت ئے دلپسند شو   ګرفتار د فریب دام کښې بند په بند شو
هغه کس چه ګوسفندان ئې کړه ښکار   ده مذهب کړه د ګیا انو اختیار
امزرو غذا شروع کړه دَ ګیاه   د شیر ئے فطرت له دوئی نه شو جُدا
تیره والے د غاښونو ئے فنا شو   دَهیبت نظر له ستر ګو ئی جُدا شو

اور د دوئ زړه او سینه کښې اخو مړشو — هم جوهر د ائینې لې اخر خړ شو

د کوشش کولو شوق لې پاتې نه شو — د عمل هم هغه ذوق لې پاتې نه شو

اقتدار هم اراده او استقلال لاړ — اعتبار هم ددوی عزت اقبال لاړ

فولادي پنجې د دوئ شولې بې زوره — زړونه مړه شو په سینو کښې ودې کوره

زور لې ورک شه بزدلي پکښې پیدا شوه — سرمایه هم د همت ترنه تباه شوه

مرضونه بې شمار د کښې پیدا شو — غریبان شو هم بې زړه شو هم رسوا شو

په پسینه به لې وانخلم هغه علم

مجاهد چه دا غافل کړي له جهاد نه

پروفیسر نور احمد خان نور

ایم . ایس . سي

د مړې ما بنام

سلسله اصلاح الافاغنه ع۳

۔ والئ چه کانړے راځي نو د یتیم په سر پریوزي : ۔

دا دنیا ډیره ناقصه او بے بوده نابوده ده . گناه به خان او کړي او خمیازه به ئې دهقان خوري ۔ شلغاتے به د مال خاوندان او باسي او گوتے به پکښې ذ او گوټکو پریکیږي . د مالدار روشاهم نه گوټکي . او د غریبانو د پاره ورځ په ورځ نوي نوي افتونه موجود دي .

نو د کلي په کلي کښې د تولو نه غریب زمیندار دوه . په ډیره تنگدستیا به ئې گذاره کیده . یوه ورځ بېگو ملا بانگ وبنت د هغه علمي خولئ پولیل د سارانو پنځا او ورو د پاره میرے ته لاړ . د گرمئ موسم ود . په سارا نو ټولو لو ټولو لو غرمه شوه . پولیل یو دوه ژند پنځا او ټولو په سر ئې کیخود او کور ته را روان شو . ټکنډه غرمه وه . او د هاړ پشکال گرمي . مزکي آسمان خولے ور کړي وي . په پولیل غریب خولې داماتي وے . سر ئې خوټکیده . د سترګو نه ئې لمبي ختي . آخر تاب ئې را نه وړو . سر ئې پېرا او گرځیده . او پنځي د اسي شا ئې وا ئولې په مزکه را پریوتو . لکه چه د دیوال نه اویزان ځادر را او غورځیګي . سارانې د نړے ونړے تس نس شو . خر خولے شوي خر خاوري په خټو کښې لیت پیت شو . عاجز بے خوده بے ځایه بے خوله پروت

"په ډېره شپه د پولیس کېښ ډرغې"

دَ پولیس دَ مور زړه ډېر زر اولوېده. "ولې خدایه په ماشوم څه چل اوشو؟ مړ تو هسې سرګند په خپله ابلې پسې هم تر دا اوزغلېدل. خاوند او ورونه ور دله ورځو دېکې ودرکړې."

"ورکړه چه پدې سړې دې دننه شه څوکۍ دې چک چوډه دي کټ کېښودې شو سړې په ټر اودړل او دې څو ده تله ګام شوه."

ماته یاد نکړې ته چه دا د کومې ژلې مثل دې چه کړه چرې خدائې مه کړه دې څو حکومت شو نو دنیا به ورانه شي. نېنځې هم څه عجیبه مخلوق دې. د ولې که په الف، بې، تې هم نه پوهېږي خوځان به په علم و فضل کښې د حضرت عایشې رض او امام اعظم رح نه زیات ګڼړي. د تېپ او دلوڅې په تمیز به نه وي خوځان به د لقمان حکیم او بوعلي سینا نه پوره ته ګڼړي. اګر چه یوې صالحې تعلیم یافته لېډي دَ پولیس مور ته اووې. "چه خوري! د هر مرض دارو شته تاسو وادرمه خطا کوئې. څوک قابل ډاکټر راولئې. که خدائې کړې جوړه به شي." د پولیس په جاهلې مور دا خبره د توپک اولګېده.

مور :- مېراث دې شي ډاکټر او ورک دې شي ډاکټرې دارو. هغه مېراث مړې خوراتلو سره په اپرېشن خوله خوږه وي. څوک نه د مېښې ورښیا کالو په لاسو لوکښې خدائې برکت اچولې دي. د مشرانو دارو د زړه به ورکوي.

او س په غریب مریض بانډې د مکارو بوډو ډاکټرې شروع شوه.

یوه بوډه ئې:- په لوړې ډېر ځوګوزن وهلی دی ګوماتې ورله پکار دي. منله ه کړه خانه لاجبره دَ ضد د پنساری نه "چنړلیشي" راوړه. لوړې إبځاد یوي نمسئې نیم وجود ګوزن نیولی وو. په علاجونو ستړي شو. چه چنړلیشي مو ورله ورکړه نو تا به وې چوړې بهانې کوله د دغه مو ته په کټ کښې کینا سته.

دویمه بوډه ئې:- په کوال شم ګورې نخ ورله څه ور نکړئ ګومې ګومې جوشاندې ورته ورواړ ولئ. په خوله کښې ئې جب جوب ساتئ.

درېیمه بوډه ئې:- دا ئې بچو ډېر دې دې خو تو د سوړه شوې دې. هله کړئې پوستنې اوشړئ پرې انباد کړئ.

څلورمه بوډه ئې:- هله دهله نظر ورله مات کړئې نو تکه درته بنایم. اد بیائې "نذر بوستان بابا" له بوځئ. او د هغه د تبو په سلې ورله تند ې اوسولوئې.

پولیس غریب دَ ګومې سوړې لوی وُه. او دجهان ګوم ګوم دارو ئې پرې ور بې سیوه کړل. پوستنې شړې ئې پرې انبادشوې عاجزئ ودیت پریت کړو د تندې نه ئې جبه ختلې وه. په کمزورې او درد ناک آواز سره به ئې "ادبه اوبه" کول. خو دې بې رحمو خانه ساز ډاکټرو ور بانډې اوبه حرامې کړې وې. پولیس په سلګو شو. په دې کښې هغې پاکې تعلیم یافته لېډې خپل خاوند ډاکټر پسې ورزغلولو. ډاکټر راتلو سره د هلک نه پوستنې شړې ئې اوډتره اوولیشتې او چه حال ئې اولیده. نو چغه ئې کړه.

ډاکټر:- "اوماتې کاډه دټ لېږې پېچ" (دَ پولیس پلار ته)

بو ظالم انسان! تاسو اخپله چپول ځوئ مو وکړیدے (خان سره) فولش ومن د پولیس پلار ته! او موږ کوه دیتحنے او به راوړه ځوئ د تندی نه مو وکیږی د پولیس موږ. - (د پودی نه) ډاکټر صاحب! ځما بچے به جوړ شی؟ ځو به خو خدائی پسی نقط ستا آسره ده.

ډاکټر: - (په دیرتهد او غصی سره) فولش! تاسو ځو خوپ اخپله ډاکټری اوکړو کنه. ځوئ د لشی بچے کیدے.

او پولیس ساه ورکوه. ډاکټر خفه زهیر د کوره اووتو او په مری باندی تول ژوندی راچیپوتل بعضو ځائے سوړان ګډ شو چه امان تر نه پکار دے. یوی مکارے ښځی به ساند ے وے چه مړے به ئی پکښ ستا ئیلو. او نورو ښځو به ورسره هسی رسماً اوهوں اوهوں کول او ژړل. په دوئی کښ که په اصلی معنو کښ غمجنه وه نو هغه د پولیس مور وه. مخ ئی تکوو. خاورے ایرے به ئی راخستی او په سر به ئی اچولی. مخ سر سینه تول ځان ئی په وهلو ټکولو جوبل کړه. رسول الله صلی الله علیه وسلم فرمائلی دی چه په مړو ویر کول او ځان تکول د جاهلیت د زمانی رسم دے او کومی ښځی چه په مړو ویر کوی. هغوئی به د قیامت په ورځ د اور جامی اغوندی. نو تاسو صابر او کړئ او خدائی سره جنګ مه کوئ"

لیکن د خپل آتا او سردار د فرمان پرواه څوک کوی نو ډکل کوه د جاهلیت تماشه جوړه وه مور پلار او ورونړه خویندی خو واقعی دردمندی دی. که هغوئی خان تکوی نو د زړه د درده تکوی. لیکن داحقیقت دے چه د دوی نه سوا نوری تول ښځی د ودیځو غوږو د پاره ځان تکوی. په دوئی کښ یوه لوډه ښځه وه. چه ځان ئی دیر په بے دریغی تکوو. یوه بله مکاره بوډئی ورله په سینه تکولو تکولو ورنزدی شوه او په غوږ کښ ئی ورته اووی: "په ځان خه او تکوه بنګاوله به کومی کومی ودیجی او غوږی اوخوری. او تکوز به شی"

په سر یه! اوس څه د بخلی هم غم کوی کنه. دا بعض اوکوره اولس داته ناست دے. نور کل غریب د ننه په کوټه کښ د غمه سر کومه په کټ کښ پروت وو. چه د ښځی داخبره ئی واوریده. نو حیران هم شو او غصه هم هوکنه دا د کیدری سپئ مونګه ته ناستی دی. هله به د پاسید د لوم اخلی چه د پولیس غوښی او خوری اُف ځمار به! آه ځما پرودګاره! هم مړه شو هم پره شو. یو د ځوئ د غمه مو زړه سوړے سوړے شو بل د دی لشمکو غم لا پاتی دے. د پولیس موری! څه داوړم؟ څنګه داوړم. او په څه داوړم؟ که دائی نو دا په تن اغوستی جامی به او باسو. خرڅے به ئی کړو او ودیجی به پری داوړو؟

سر یه! ما تر خله د تے سپودی کوی چه نه د ده خپنه نو هیڅ مه داوړه خو دا م درته اووے چه په قام کښ به مو پوزه پریکړے شی دا ښځی چه کور د نو ته تشی کیدی لاړی شی نو په تول کلی کښ به درپسی پرد ئے وهی. چه پولیس ئی مردار قبر ته او نه ور ځولو. د نور کل زړه

ډک وُه. چه دائی داؤ ریده نو ډېر ق په ژړا شو.
ښه نو نیک بختی! ته را ته څه لاره اوښایه کنه. ځما خو
مغزه په ځائی نه دی. دخولئ غم لیونے سپیلنے کړے یم
څه زړ کور دې را ته اوښایه. دروپئ دکوم ځائی نه
پیدا کوم؟

دښځې په زړه بخلی مخ لئ د ستړو ونه غتې غتې اوښکی
را روانی شوی. سرلئ دکټ په بازو اولګوو او په
ډېر درد د سره لئ اووی. څه اووایم. دغه زکی یوه
وسیله ده چه دهغه. نه په سود روپئ داواخلی.
زه سحر به سرلئ اوخوړو بیا د سود ونه را باندې خېجی.
خو چه اوس مو په تمام کښ ستړیږ او چتی شی. دائی
ځمار به هم مړه شو هم پوره شو. نورګل نسلو له دروپو
دَ پاره لاړه. وسلئ روپئ لی تو ینه راوړی.

دپښتنو خیلولی دِهم ښادئی اووهی. په غم ښادئی کښ چه
چرته دلته بسته دی هغه په ضرور شاملیږی. او دَ
مړی ما ښام له خو دَ دېرو غوړو دَ پاره ټول کلی
خپل وی. هم د ماښامه نورګل کره دښځو تپې په
کټو نو کښ ناستی وی. د ډیکو نو کوټکاره وو د ډېرو
چغې وی داشئ داخاتک یوسئ' په که خاتک تش شوے
وی نوره اووړئ' په ټول غولی کښ دَکومو کومو ډېرو
داسی بې اسو نه ختل. تا به وی چه په ځوانی مړګ پولیل
کرم کرم اسوپلی اوکاکی. د ټولو ښځو په لاسو نو کښ دَ
ډېرو لوړئ وی چه غوړی په تړیه لاسو نو مخ اومرئ
بهیدل. او د ټولو خولی وار ربے واره چلیدی.
"هله کوئ غوړی راوړئ" دیوی تپی نه به آواز راغے
مړے لړ بے دې لیغه غوړی اچوه. ته خوئ داسی
مسسوی لکه چه پولیس ستاخوئ نه وو خوک پروے
وو. د پولیس مو ره به څه جواب ورکوو. د ستړیږو
نه به لی کومی کومی اوښکی را اوبهیدی. او دغوړه
لوخی به لئ بے دې لیغه ور اوړوو. چه دالاړه. نو دا
ښځې ټولی خرت خرت په خندا شوی. وړه وړه لورے
اخله کنجری! دستونه به دربانډِ اولړی. یوی چینی
بلی ته اووے ....

افسوس! دا مړګ وو که ښادی وه؟ د مړی پلار
او مور خو دغمه لسکوره پرا ته وو خو ګی لئ دغمه د
کومی نه تیریدو. او دا دکیږی سپئ دلته دخوشحالئ
نه ټق ټق چاودی. پر دے غم دواړه دسوړ دے
دَ درولئ په نورګل غریب څه زړه سوزیلئ. او دهغه
په ښځې به لئ څه ترس خوړو. د ډېرو غوړو خوراک
له راغلی وی بکاری لئ ډکی کړی. پروئی لئ پرسه
کړل. او شاولے واولے کور ته روانی شوی.

ددی نه پس څه اوشو؟ ددی د ډیلو څه حاجت
دے؟ دَ نورګل غریب د دږمبی نه پوزے لنک وو
په بڅ دږځ په بد حال وو. شپږ میاشتی لئ سر
تندے دهلے وو. فصل لئ تیار وو. دَی به ډیر ته
خوشحالیدو. چه زه غله به راشی او مونږه به دَ
لوږ و تند و خلاص شو. خو دی خوا غله کور ته
رانه وتله. او دَ بل خوا نه سیټه صاحب خیل منحوس
شکل را ښکاره کړو." نا ښکه! ما له تر دسه خپل حق
راکړئ. باقی سره چه بیا تاسو هر څه کوئ."

نورګل عامي وو په حساب کتاب نه پوهيدو. دومره پته هم ورته نه وه چه څومره سود ورباندې ختلی دے. سیټھ صاحب ته ئې اووے چاچا! اصل خوشل روپئ دے حساب اوګوره چه سود څومره ختلی دے؟ مکار سیټھ پوه شو چه نورګل هیڅ وېه بوجږ ئې نه دے. دده نه بنه بیوقوف جوړ لیشم. څه ورمخ د شتیاڼي ورته اوځنګول او ټوله علاقه ترِ نه په سود ونوکښې یوړه.

نورګل په دداډول لاسو نو سر اوښوو او بے مجاله کیناستو. ښځه ئې د ډیرې غمه د راز په مرګله بے هوښه دا پریوته. خامن لونړه ئې په ژړا شو. او څلور د کالو ماشوم ځوئ ئے په چغو شو او په پریکړي ژبه ئے اووے.

"به بے! چاچا څه وېړ دانې ولې اوړی؟ دادا مونږ به ډوډئ د څه نه پخوو؟؟

جواب به ورله چا ورکوو؟ د زړه سترګې پکارې وې چه د غیب نوشته ئې لیدلی وے. د زړه غوږونه پکار وو چه د دغې عبرتناک آواز ئې اوریدلے وے چه بدقسمته بے ګناه بچیه! چاچا د ظالم قام د ظالمو رواجونو د کبله اوکلی ټکی پریکدې. ووداني ورانه وېړئ

آیا پښتانه به دا آواز وانه وری کاش!!!!

عبدالرازق فاروق

د چا په یاد کښې

نوراني تن مې د یار کله کله چه را یاد شی — آه د زړه نه شی را پورته جاري خولې مې فریاد شی

ول په ول زلفې د یار په جبین باندې پرتې دي — پړ ترېلي عاشقان دي خدائې خبر شه چه آزاد شی

تور سترګې وکلماته د قیامت نخښې ښکارېږي — په نیم کږ چپراته ګورې راته جوړ شور و فساد شی

زیړه بیخلي قاصد راغے جوړ آشنا د سخت رټلي — د کاغذ ټکړې په لاس کښې ئې نه خالي چه برباد شی

بختور به خپل ځان بولم ستا په یاد کښې چه فنا شم — هم ګناه دوري ستا پانه د دکښې قدمونو سره باد شی

اے وحشت دا شه زړ کړه لیونئ ځواني تیرېږي — زړه مې ژاړي دے پواځې د فرقت نه چه آزاد شی

خوب خوراک مې ستا د هجر سیلاب یوړ د راشه راشه

چه د نصر باقي ژوند په دا تلوستا یاده بنیاد شی

نصرالله خان نصر د دریم کال

دکتاب چینجی

دعام اصطلاح مطابق دکتاب چینجی هغه کس ته وائی چه د ځان نه ئی دکتابونو شپول راچاپیره کړے وی او شپه ورځ ناسبت دهغوئی سره مشغولا کوی. داشپه او ورځ مطالعه د یو بیمارئی نتیجه ده. چه ورته دکتابونو بیماری وائی. د ډاکټرانو خیال دے. چه دا ناجوړتیا د هغه جراثیمو نه پیدا کیږی کوم وتر چه روشن خیال خلق ذمه واری وائی. دامضر جراثیم د لاپرواهئی د مفید و جراثیمو سره په جنګ کیږی. که په دغه کشمکش کښ مفید جراثیم ماته اوکړی نو سړے په دې مرض کښ مبتلا شی.

د ډاکټرانو د رائے نه حکیمان څه قدرې اختلاف کوی حغوئی وائی چه دا مرض د دوړا ندیشئ نه پیدا کیږی او د سیالئی په ذریعه د یو نه په بل لګی.

دکتاب چینجی د سکول او دکالج په هلکانو کښ ډیر موندے شی. د مرض د خوریدو موسم د دسمبر نه تر آخره اپریل وی. ولی چه دا جراثیم لږه کومی حم نشی زغملے. او د اپریل په آخر کښ مړ شی

مریض په یو غونښو پیژندے شی. هغه دا چه رنګ به ئی تښتید لی وی. سترګی بوی پرسید لی دی. او تر اوتر به کوږې نه به وائی جوړی اوس دخوبه د پاسید سیل صفا تر به ئی ذره نه کیږی. لوبو او کپ شپ ته به ئی ډیری مائی وی. هر وښت به معقول معقول کیږی او ددی کوشئ په زمانه کښ به ئی هسم یو کتاب، یوه رساله یا یو اخبار د غوږه د لیوے وی

د مرض دوه درجې دی. اوله کښ د بیمارئی اثر لا په حافظه نه وی شوے. باقاعدہ علاج او مکمل پرهیز نه پس د مریض د رغیدو امید کیدیشی. ولی چه څه وښت مریض په دویمه درجه کښ ختی کیږ دی. نو د هغه علاج بیا ناممکن کنړلی شی. غټ غټ علامتونه ئی دا دی. چه دکتابونو چینجے د کمرې نه هله راوځی چه د رڼتئ بولئ پرادلګی. علاوه ددی نه تول ورځ کمره کښ وی. که د بدقسمتئ نه خولګ خیر خواه ئی پیدا شی او بیمار پرسئ له لی کمرې ته ورشی دده ترلو تندی چه او ویځی نو به خپلو تلو لیپما نه شی. او بیا په ورستو خپو راوالپس شی. اد که څولګ راوالپس نشی. نو دی ورته دمناسب تمهید نه پس د پیریانو منتر ورحوف کړی. چه سه خیر جلیس فی الزمان کتاب :.

د تیر شوی کال د راپورټ نه معلومیږی. چه مریضان په سکینډل هاستل کښ د تولو هاستلونو نه زیات وو یعنی صرف یو دیرش[۳۱] کسه دی د با دالاند کړی وو په دوی کښ صرف هغه یو دیرشم کس د ډاکټر نصیحت عمل اوکړو او د کال په دوران کښ ئی سبق پریخود

او د لوکولو په فضل او ځما په دُعا جک جوړ شو. په دویم نمبر بیا د رحیم شاه وارد دو. په هغې کښ هم د بار غلہ. او خکلی ځکلی ځلمی لی کیستل. مګر عثمانیه هاسټل کښ د ګتو او د ګکورو د باجی په برکت او د ایپ یسن بابا د رحالی توجهالو په وجه دا مرض ډیر خوړ شوے نه وو. خو دَ دی مرض په علم د عبدالقیوم منزل آب هوا ډیره خوږه ده. او مریض پکښ ډیر ذر جوړ یدے شی. آزمائش شرط دے.

-: د انسداد طریقه :-

۱:- خوب دا وستو نکی ګولئ استعمالول بکار دی

۲:- بنه نرمه بستره کښ سبق وئیل بکار دی

۳:- دَ مریض د دستانو ته بکار دی چه ترشومه تلاره ورسره تاش یا شطرنج کوی.

۴:- مریض دِ ډیره ډوډئ بنه په مزه کیښ خوری. او ډیری اوبه دِ څکی.

۵:- په مازیګری لوبو دِ بنه ځان ستړی کوی.

۶:- ترو سه دِ دوستانه تعلقات زیاتوی. او که په دی خرڅ زیات کیږی نو د لاهور ادبی رسالی دِ کوړی. ځکه چه علاج بالمثل هم دَ دی مرض دپاره مفید ثابت شوی دَی.

-: پرهیز :-

۱:- ماسختن دِ شنه چائ بالکل نه استعمالوی.

۲:- اول خو دِ د الارم ګهړئ نه اخلی. او که چرې د پلار نه ویریږی او لا جاړی لی وی. نو په ګهړئ ورل دِ وخته د الارم جوړ لا نه سیټګ

اوباسی.

۳:- دَ لوګو د چاپو د راویړو نه د ډیمې د نرمی ګرمی بستری نه د پاسیدو کوشش دِ نه کوی.

-: حفظ ماتقدم :-

۱:- کتابونه دِ د الماړئ په کوټ کښ کیګدی. البته د یو انګریزئ لغت په میز ایخود لو کښ څه باک نشته.

۲:- په کلاس کښې دِ تولو نه وړستو کښینی. او دَ تیوس په وخت دِ ځان دَ نورو شا ته پټوی.

۳:- د امتحان په وخت دِ د ډاکټر نه یو میډیکل سرټیفیکیټ واخلی او ځان د دَ امتحان دَ بلا نه خلاص کوی.

که چرې په پوره ته ذکر شوو خبرو په بنه شان سره عمل اوکړلشی. نو څه دوائ ته حاجت نه پیښیږی.

عبدالرؤف دَلونبار

دُعا

خدایه! ته حاکم ته انصاف. مالدار ته سخاوت

سخی ته دولت. شوم ته د خوانئ مرګ

مُلا ته حلوا او د ادینه دَ شپې مرغ خوراک

مکار او د لوم (برائے نام) پیرانو ته ماړه مکر ساده

مریدان مسلمانانو ته اتفاق. لویو لویو خلقو ته نیک

اولاد علمانو ته عمل سادات ته د دین تعلیم او دَ

شریعت پیروی ورکړی. سلطان محمود

محبت څه شیز دَی؟

محبت هغه یو نیا یُستر خادر دَی. چه دَ جنت حورو د نرودس د باغ دَ گلونو نه دَ بختورو د یاره جوړکړے دے.

محبت له او چتو آسمانو نه یوه دَ نور چینه ده. چه را بهیږی. او کوثر او سلسبیل کښې ځي بهیږی او هر څاڅکی ئې آب حیات دَی.

محبت سمندر دریاب دَی چه پکښې بنده ډوب شی نو هله ژوندَی شی.

دا هغه آب حیات دی چه مجنون پری ترا وسه ژوندَی دَی. دا هغه طاقت دَی چه دَ فرهاد له لاسه ئې غرو نه شیری کړل.

محبت یو خوږ درد دی چه د بنیادم زړه نرموی محبت یوه خوږه ناجوړتیا ده. چه انتهائی لیونتوب دے

یم. څما ساړه اسویلی که ستاسو په یخو تهمتونو بنه نه لږیږی نو څه به لار شم.

چه ته لوی د دی دنیا نه لوی چه هلته م نه خوک ملګری دی او نه غمخور. نه ګل دی او نه ګلزار بس څه او څما غم وی.

پیچ په پیچ خیالات او د غمونو انبار.

رنګ په رنګ وریځو! او ښکی مه تویه ولئ. څه چه درته کوم. نو ماته هم ژړا راځی. د غمونو بار م سپکیږی.

آی د امید کِشتئ دِ یکی مه خوره. تالئ مه وهه. ډوبه شه چه زړه م په یو ځل په آرام شی د ارمان ډیوی سلګئ مه وهه. مړه شه چه دا جنجال خلاص شی.

اکرم ختک دوهم کال

-: بے آرامی :-

چغیل دنګو موغو والوزلئ. ستاسو د اچغار د ابا نڊ بنه نه لږی. ستاسو سندری څما ماذغه خوری. ځئ ما مه تنګوئ. ما د خپلو خیالاتو په نشه کښې پریږدئ.

ماشوما و ګلونو څما خیری کړیوان پوری مه خاندئ څه هم ستاسو په شان مسافر یم. د چمن سیل ته نه یم راغلے. دغوی دنیا نه مخ سر نعبتونه رادوے

شاعره

داستا دلی اے شاعرہ لہ دی خلقو نہ ذرہ تورہ دے
انجمن کښې ناسته نہ کړې تنهائی دِ دلربا دہ
تل د فکر په تال زانگی پروت په گنج کو څې دُنیا کښې
کہ د خیال غوښ دې نه و ایم ناروا نہ دہ روادہ
کله ناست په میخانه کښې نے ، مغنی ، ساقی او جام دے
کله ناست د عارف خوا کښې لہ دُنیا دِ استغنا دہ
کله تول شپه خبری یاس سپوږمی ستورو سره کړے
کله تل د سمندر کښې د گوهرو تقاضا دہ
کله سور او ږد دوزخ نه بہ تو بہ تو بہ لغوی کړے
کله ناست د طوبٰی لاندِ بېر د حورو مشغولا دہ
کله بهې په غم لړلی به تهی چار بېتی وائے
کله ډوب په حقیقت کښې د قدرت حمد و ثنا دہ
کله ډنک په تصوف کښې د سرمد ، منصور صفت دے
کله ناست لی په خانقاه کښې د واعظ غوندِ تقوا دہ
کله ځان لہ دشت کښې پروت لې د صحرا چپه چپیا دی
کله ناست په گلستان کښې د بلبلو شور غوغا دہ
نه پوهیږم کوم دِ ملک کوم دِ مکان کوم دِ مسکن دے
چه د خیال شاهین کوم ځائی دی هغه ځائی دِ نشیمن دے

محمد اشرف مفتون

مُقابله

گاہے گاہے باز خوان این دفتر پارینه را
تازه خواہی داشتن گر داغہائے سینه را

د یورپ اقوام خپل حق گنړي چه په افریقه او
ایشیا حکومت اوکړي. د دې حکومت کولو اخلاقي
دلیل دا ورکوي چه د دې ملکونو خلق د تهذیب
او د علومو په درجه کښې ډیر لاندې پراته دي. او دَ
سپینو قومونو دا فرض دے چه د دے پسمانده قومونو
ته تهذیب اوښائي. چنانچه د دے عظیم الشان ذمه
وارئ ته د دوئ دهائیټ مینز برډن (White man's
burden) وائي. او حقیقت هم داد ے چه دَ ایشیا
بعض اقوام عام طور په د دومره غفلت کښې پراته دي.
چه بیل دید د امید لې هم نه ښکاري.
دا افسوس خبره خو داده چه د دنیا نور اقوام په علوم او
تهذیب کښې مخکښې روان دي او مونږ په ورو ورو ستو زغلو
د مثال په طور به مونږ د موجوده علماؤ مقابله دَ اسلام
گذشته علماؤ سره اوکړو. دا خومره دَ غم او دَ افسوس
مقام دے. چه موجوده علماؤ علوم حاضره یعنی سائنس
فلسفه ریاضي وغیره نه خومره ناخبره دي. او
عام طور دَ دوئ په خیال کښې دا علوم دومره قابل
نفرت دي چه د دې حاصل کونکو ته کله کافر وئیلے شي
کله زندیق کله څه او کله څه. او دا علوم ورته صرف دَ
کفار دَ پاره موزون ښکاري.
د دې برعکس یوه زمانه وه چه دَ اسلام هر یو عالم به
په دې خبره فخر کولو. چه د دے به د سقراط، فیثاغورث
ارسطو، افلاطون وغیره د تمامو کتابونو نه واقف وُ
او د دې کتابونو ترجمې به ئې کولے. او په دې کتابونو
کښې چه کومې مسئلې به د دے د دوی په پوره بحث نه
کولې، وغلاوه وغیره. سائینس او فلسفے به دَ دوی
په مذهبي شغلونو په خیالاتو کښې څه فرق نه راوستو
او عام خلقو به دَ د دې عزت لا نور هم د دې علمونو
په وجه زیات کوو.
د مثال په طور چه مونږ د مولنا لئ روم علیه الرحمته
د مثنوی مطالعه اوکړو. په دې کښې مونږ د مفصله
ذیل اهم مسئلو بابت ذکر وینو.
(۱) کشش ثقل (تجاذب اجسام. تجاذب ذرات)
(۲) مسئله ارتقا (۳) تجدد امثال
د دے مسئلو کښې او لنئ دوه صفحه زبردستي مسئلې
دي چه په کومو بانډې نن ورځې د علم ریاضي او دَ
علوم نباتات او حیوانات تمام بنیاد دو نه مضبوط
دي. دَ کشش ثقل قانون صفحه قانون دے چه
دَ دنیا تمام خلق پرې په دې متفق دي. چه دَ
نیوټن ایجاد دے. لیکن تاسو ته به دا عجیبه خبره
ښکاري چه دا ؤدئ چه هم دا نظریه مولنا روم رح
په خپلې مثنوی کښې په دې الفاظو بیان کړي ده

(په اولسمه صفحه اوګورئ)

جمله اجزائے جہاں زاں حکم پیش
جفت جفت و عاشقانِ جفت خویش
ہست ہر جزوے بعالم جفت خواہ[۱]
راست ہمچوں کہربا و برگِ کاہ
آسمان گوید زمین را مرحبا[۲]
با توام چون آہن و آہن ربا

د کائنات په خلا کښ مزکه څه رنګ قایمه ده د هغې مثال واورئ :۔

گفت سائل چون بماند این خاکدان
درمیانِ این محیطِ آسمان
ہمچو قندیلے معلق در ہوا
نے براسفل مے رود نے بر علا
آن حکیمش گفت کز جذب سما
از جہاتِ شش بماند اندر ہوا
چون زمقناطیس قبہ ریختہ
درمیان ماند آہنے آویختہ

یعنی په مزکې د هر طرف نه کشش د اجرامِ فلکی لګیا دے. په دې وجه دا د کائنات په خلا کښ داسې آویزانه ده. لکه چه د اوسپنې په یوې ټکړې د هر طرف نه د مقناطیسو کشش وي. نو دا ټکړه به د دې کششونو په وجه په هوا کښ آویزان پاتې وي.

(۲) مسئلهٔ ارتقا. د کائنات تمام موجودات په ځلور قسمو کښ تقسیم دي. جمادات. یعنی بے ساه اشیاء. نباتات. یعنی بوټي وغیره. حیوانات یعنی ځناور او انسان یعنی بنیادم. د دې ځلور واړو قسمو بابت کښ د علماؤ اختلاف دے. بعضې وائي چه دا هر څه الله تعالیٰ د ازل نه هم داسې پیدا کړي دي او بعضې علماء وائي چه دا هر څه د ادنی د منبا خونو پېشان د لوئي نه په جُدا جُدا عمرونو کښ جلا شوي دي.

یعنی اول جمادات او بیا نباتات شو. بیا حیوانات او آخر کښ انسان تري د ارتقا په وجه جوړ شو. دا زبردسته مسئله د ډارون ایجاد ده. او نن ورځ د علومِ نباتات او حیوانات بنیاد د دې په دې قایم دي لیکن مولانا روم هم د دې بابت په مثنوي کښ فرمائي :۔

آمده اول به اقلیم جماد
وز جمادی در نباتی او فتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد
وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چوں بحیوان او فتاد
نامدش حالِ نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آن
خاصہ در وقت بہار ضیمران
ہمچو میل کودکان با مادران
سرِّ میل خود نداند در لبان

۱ د انبوس لرګے چه په وریښمي رومال او مږي نو ځان ته ګیاه وغیره را کاږي :۔
۲ د دې مقصد مقناطیس او اوسپنه ده :۔

همچنین اقلیم تا اقلیم رفت
تا شد اکنون عاقل و دانا و زفت

دریهم مسئله د تجدد امثال ده. د دې مقصد دا
دے چه د انسان د وجود هره ذره د باهر نه فنا کیږي
او د وجود نه جلا کیږي. د دې ذرې پځائې د د ننه
نه نوې نوې ذرې [illegible] باهر ته داوځي. او
تخلیق ئې کیږي. یعنې د انسان وجود تقریباً
اوه کاله کښې د نوې سر نه ژوندے کیږي او دا دَ
فنا او د ژوندُن سلسله مدام روانَ ده. او کوم
چه حضرت مولنا روم صاحب په کومو الفاظو کښې
دا خیال ظاهر کړے دے.

پس ترا هر لحظه مرگ و رجعتے است
مصطفیٰ فرمود دنیا ساعتے است
هر نفس نو مے شود دنیا و ما
بے خبر از نو شدن اندر بقا
عمر همچو جوئے نو نو مے رسد
مستمرے مے نماید در جسد
آن ز تیزی مستمر شکل آمده است
چون شرر کش تیز جنبانی بدست
شاخ آتش را بجنبانی بساز
در نظر آتش نماید بس دراز

مطلب دا دے چه د تمام دنیا اجسام کښې هر وخت
فنا او ژوند جاري دے. چونکه د فنا نه مخکښې او
د فنا نه وروستو دواړه حالتونه مونږ په یو آن
کښې وینو. په دې وجه مونږ ته په فنا او بقا کښې
فرق نه معلومیږي. ته چه یو ماشوم دَ اور یو
د کے تاؤ وهي. نو مونږ ته د اور یو کړئے ښکاري.
اګرچه اور د صرف د دې کړئے په یوه ورکوټې حصه
کښې موجود وي. لیکن د انسان تخیل ته یوه جاري
سلسله ښکاري.

غنی روز سیاه پیر کنعان را تماشا کن
که نور دیده اش روشن کند چشم زلیخا را

دَ اخلاص ګلونه

دا څو د دولت د پاره بس دے
دَ آمد په نیمه خرڅ چه د کوم کس دے
دَ هغې سړي ځان ژړا یکار ده
چه نیمه ئې آمدن او خرڅ لس دے

ته که نن هم هغه ئې چه کوم پرون دے
نو افغانه ما ته ستا صبا معلوم شه

مخلص

ټوقه ټقاله

والي چه یو جولا یو ملا سره شه امامت ایښے وو. څه موده
پس چه دے ته ضرورت شو. نو ملا صاحب یې جماعت ته
لاړه. مولنا صاحب شاګردانو ته سبق خودلو او سر یې لي
خوزولو. ده ورته یو ساعت انتظار اوکړو. آخر یوړ ترې
نه شوه. وئې ویل چه ملا صاحب ته کومه لار په څه جاخیو
دا ورو. ستا تو د آلو په ستا ځائې څه سر خوځوم که [illegible]

طرحی نظم

تول جهان به دتا یار شی دخان یار شه
په هر ذره کښی دخائ شته خو ته دلدار شه

درد دمینی خلق والئ دده دخه دی
که د بل زړه درمند غواړی دل فگار شه

نور خوشحال کړه پخپل ځان تخنی کړه تیره
درباب په دود ته سر په هغی گوکار شه

مسافر چه دی په سوری آرام اوکړی
ځان په نور کړه شجر شکلی سایه دار شه

لکه تخم دگل خاورو کښی ځان روست کړه
مسادی دښایسته گلو د گلزار شه

دحاجت روائی تل په بدله کیږی
لا په خوا دضرورت د بل پکار شه

که په وخت دضرورت دستگیری غواړې
له اوله دبے وسو مدد گار شه

کړه ساتنه دځان غل مه وایه بل ته
جهان واړه به ساز او دیګ هوښیار شه

لکه تک که په جبین ذ انګیدۀ غواړی
تکیه لے په ستک په خوشو وار شه

په سرو وینو ځان لړلے سینه چاک کړه
بیا په رنګ دګلاب ګلو کښی سردار شه

د اخلاص کشش راکاږی خلق ځان ته
د مخلصو همنشینو طلبګار شه

له قلمه

دَ محمد یوسف کاکاخیل دخلودم کال

دَ زړه دَرد

نادانه فلسفه دَ محبّت اورو دے دلے؟
که پوه وے نو دخو لے نه به دِغو ننوو ختلے

ته ژاړی دیږدو دلاسه ولے ځما دلسه!
چه خیلو دمظلوم حُسین پشان ته ئی وجلے

که پوه وے چه کوکنې اوبکی ته به م کږ تولے
نو ما به دَ ماشوم بچی پشان ورته ژړلے

ارمان م دے چه دداړه ستړ پښو ځا بے نوره
ستا مخ ته م په دومره لیونتوب سره کتلے

زه اوګورم سپوږمئ دڅوارلسمې ته که تاته
شاید داسپوږمئ نه ده ته آسمان ته ئې ختلے

افسوس چه اوچیدے لوښاځیب کښې ته هم اوچ شوے
اے ګله دخزان ډګومه باده هم ستا تلے

په پورخے غسل ولے ودګوئے ګل لا له له ؟
په خپلو وینو سره کښې داشهید دے لنبیدلے

خطاشوم چه معصوم زه هم خپل تاپاندِ ازارکړه
افسوس دخپلے پاکی مینی ما جوګه ګنړلے

چه ستا فریاد اثر نه کړی په چا عبد الرازقه
نادانه لو د زړه درد ده بیا غوږ یوړے ولے

فاروق

دریغه دریغه چه په تا زه شیدا نه وے
چه شیدا شوم بیا له تا زه جُدا نه وے

دغلام لیشان به ستا زه خدمتګار شم
که په ورو ستو د رقیب غم نِدا نه وے

رقیبا لو به په لاد کښې نه دا پرلسم
اے دلبره که په تا زه فِدا نه وے

سپو به ولے په کوڅو کښې غپ غپ جوړ کړه
که په دړکښې دِ ولاړ خوار ګدا نه وے

لیونے به وو حبیب لکه مجنون
کله کله د جانان که خندا نه وے

لقلمه

دحبیب لوجمان سواتی د اول کال

Prom. : Ha ! ha!! What is it ? Look Momus, how great is the crowd, how grand is the building, how beautiful it is all. Why do you still hesitate to admire Man, whose civilization has wrought such wonders that even the gods will envy him ?

Momus: Shouldn't we find out what is all this about ? Come let us go inside the house.

(They go in and find a room full of police and lawyers and servants. A man is lying on a bed (with two boys to his sides). They learn that the man first shot the boys and then himself. Prometheus is again crest-fallen. Momus is, of course, highly delighted; for Prometheus' invention has once again let him down. Prometheus turns towards a footman.)

Prom. : Killed himself and his children, you say ? What terrible misfortune had befallen him ?

Footman: None that I know of.

Prom. : He had squandered all his money, perhaps, or was universally despised for something, or disappointed in love or had lost his place at the court ?

Footman: Not at all: as wealthy as you please, and very well thought of; love was nothing to him, and he stood high at the court.

Prom. : Then what made him do such a desperate thing as this ?

Footman: He was bored—tired of life, according to a letter he left behind.

Prom. : And he had no friend or relation to whose care he would have bequeathed these unhappy children, instead of slaughtering them ?

Footman: O yes, he had. In fact, to the person who was most nearly related to him he did bequeath his dog.

Prom. : Dog and not sons ! O Heaven ! Heaven ! Would that I were a mortal and could drown this shame for ever in death !

(*Curtain falls*)

ABDUR RAUF.

SCENE TWO.

A forest in the Andes, South America.

(The Chieftain of a savage tribe of aborigines is sitting outside his hut, surrounded by faithful, obedient followers. He is eating something. Enter Prometheus and Momus, disguised as savages.)

Prometheus: What are you doing? Great Chief!

Chieftain: Eating, as you may see.

Prom.: You have something good to eat?

Chief.: Passable: a trifle of meat.

Prom.: Butcher's meat, or game?

Chief.: You might call it butcher's meat: a domestic animal, anyway: my son, in fact.

Prom: What, was your son a calf?

Chief.: Calf? No, a son like any other man's son.

Prom.: You don't mean that? Are you eating your own flesh?

Chief.: My own flesh? No, I am eating my son's flesh. It was just for this I got him, and brought him up.

Prom.: In order to eat him?

Chief.: What's surprising in that? And his mother too, as she must be past child-bearing by now. I expect I shall be eating her soon.

(Prometheus' face falls and he turns away from the Cannibal)

Momus: Now see the fate of Man, in whose defence you have incurred the wrath of gods upon you.

Prom.: He was a savage, anyway. How could he know what a son means to his father. Let us go to London, where Man has raised himself above gods even in power.

—Exeunt Prom. and Momus.

(Curtain falls)

SCENE THREE.

London. Opposite a palatial house.

(A surging crowd in front of the mansion. Enter Prometheus and Momus, dressed as Englishmen.)

And kill his kind—a venomous sting
In Nature's body is your glorious Man.

Prometheus: Presiding god of Heavens all !
Thy words on me do flatly fall.
I know my Man. This moth on earth
Will rival gods who flout his birth,
Will oust from earth their jeering band,
And rule o'er air and sea and land.

Zeus: Thy woe hath so much blinded thee
Thou threaten now my gods and me,
Yet know, from pale of gods can I
So strike thee off, nor low nor high.
Thy name would ring. As cursed as Man,
Thou suffer most the eternal ban.

Momus: O great Zeus ! O King Divine !
O just and good and e'er kind !
Withhold thy curse, and change thy mind,
For who would plead the cause of Man
If not Prometheus can.
Though great he thinks of human moth,
He does not know the sinful froth,
In the hearts of men, that rule their minds.
So hard the love of Man him binds,
That threat will not prevail.
Do show him earth to see and wail
For bloody deeds of cruel Man.

Zeus: Be ever Momus just and wise !
For, justice crowns thy good advice.
Prometheus, thou shouldst go to earth,
And see how dark is human firth,
In which the sinful waters run.
Good Momus would be your escort
To show you sins that men do court.

All gods (with one voice): O Zeus, O most mighty Zeus,
Right is thy divine decree.
We, one and all, to this agree.

Man, the Masterpiece?

(With apologies to Prof. Abercrombie)

[The Muses had offered prizes in heaven for the most useful inventions. Every god, from Zeus to Prometheus, coveting for the prize, had invented one thing or the other, that now we see on earth. The prizes had gone to Bacchus for wine, to Minerva for oil, and to Vulcan for, brass-saucepan. Many gods were not satisfied with the judgment of the Muses, but most of all, Prometheus felt incensed against them. He had invented Man, for whom were made wine, oil and the sausepan. Worse still, Man was not even noticed by the Muses.]

SCENE ONE.

Heaven. The Pantheon—the gathering place of gods.

(Prometheus, ablaze with anger, enters the Pantheon, where all gods are assembled, Zeus presiding. The heavenly ushers welcome him.)

"Hail Prometheus! God of Freedom, God of Man.

(Prometheus amidst cheers takes his seat among the gods.)

Zeus: Welcome, Prometheus! We admire thee,
Thou hath suffered endlessly
To show how zest for freedom can
Bear all the brunts of circumstance,
Of heavenly wrath and cruel chance,
But, why so look you flushed with rage?

Prometheus: 'O my Lord, you honour thy page
With sweetest words and undue praise.
But woe for me! My darkest phase
Of life has come—My pride, my glory
My wondrous Man,
Has gone too low in the Muses' eyes,
And failed to win a heavenly prize.

Zeus: A miracle wrought, indeed, is Man,
But turn thy thought to how he can
And would, destroy each useful thing,

the future is the sign of unhealthy mind and leads only to misfortune.

Thinking of the latter type deadens one's mental equipment and is inimical to health and happiness. A man whose mind has become the abode of sad thoughts and unhappy recollections is never able to taste or enjoy the good things of life. Society, entertainment, pleasure—all lose their meaning in his eye, and he becomes an embodiment of sorrow and misfortune.

The human mind is so constituted that once it becomes familiar with grief and pain for a sufficiently long time it can never be without them. It follows that if they are left to flourish in the mind the door for all pleasures and happiness will be jammed for ever. Where grief exists pleasure can never venture to step in, for a soldier of grief can defeat an army of happiness and a whole army of happiness cannot beat down a single soldier of sorrow.

Morbid thinking ends only in killing a man. Such an untimely death as this is the tragedy of human life and must be guarded against at all cost.

SAFDAR ALI GILANI.

Hope

From the depths of the blue sea a voice shrieked, " 'Tis hope that keeps the surges beating along the shores."

From the heavens above a star shed a tear and wailed, " 'Tis hope that holdeth me steadfast, twinkling, twinkling, twinkling for ever."

The old dame earth, heaved a mournful sigh, " 'Tis hope," she said, "that makes me bear the burden of the east and the west."

From the green pastures of the world a melody arose, " 'Tis hope," it said, "that keeps the human heart, young, young, young for ever.

M. AHSAN.

and the rest laugh. And so it is that the school children anxiously wait for his turn, in expectation of a gratuitous entertainment.

He is religious-minded. I have often heard him say that he is one with God. Must be, no doubt, otherwise how could he give such wonderful performances ? During the night, he says, he meditates. But whether he sleeps or meditates, nobody can say. He claims to be a Sanskrit scholar, and the proof is that in the class room, in the dining hall and in the tennis court (where he goes for innocent perambulation and not for snobbish play), in short, always and everywhere, he repeats: "Sita Ram", "Sita Ram". Before taking a meal he always closes his eyes for a second or two and then opening them with alarming suddenness, at once cries for a hot dish of vegetables. He is a strict vegetarian, too, and, on his own admission, never allows his belly-god to interrupt him in saying his "Grace before meat". In this respect, he is in no way inferior to Charles Lamb.

To know what he actually is, is a problem for Psycho-analyists to solve. School children innocently call him a "Laiq Ustad".

J. N. KALLA.

On Thinking

Thinking without any purpose has always been the cause of many a mental disease and physical ailment. Some people are in the habit of thinking for hours and hours for nothing. They lose both bodily vigour and mental alertness. A thinker will always show preference for secluded life: but separated from society, his thoughts will run in a narrow groove and his vision will be distorted.

Thinking over political problems, social drawbacks, economic issues and on matters connected with health and population, science and arts is both desirable and necessary. To brood over worries of the present, miseries of the past and uncertainties of

ed *nalaiq ustad* by the school children. Poor Dobbin! Whenever he was found outside his room, a large number of school children would gather round him. all crying *nalaiq ustad, nalaiq ustad.* In order to get rid of this uncomplimentary designation he hit upon a novel plan to win over children by distributing sweets among them. In this way he hoped to bribe them off and make his own life comfortable. But instead of keeping them away he only attracted them still more because of the sweets. They had only to continue shouting their slogan and he went on buying sweets.

The 1942 model is still more interesting. He is a tall thin man with a head no bigger than a walnut. It would require a discoverer to find out if he has any cheeks, but the deficiency in this respect is made good in another way: he is gifted with a pair of eyes which are a little too big for his head. They say, he is a married bachelor and consequently mad. But his own explanation is that he is suffering from the after-effects of a recent sunstroke. Whatever the reason, he is

> "Idiotically sane,
> With lucid intervals of lunacy."

He can weep and laugh, dance and meditate, read and write all at the same time—something which is more wonderful than the fabulous rope trick of the Indian juggler. His special subject is Mathematics and, of course, he has a special knowledge of the subject. If he has to give a lesson in geometry to the V or VI class, he equips himself fully with all sorts of geometrical instruments—no matter whether they are relevant to the lesson or not. One after another, like the juggler, he brings out these instruments from his magic-box and arouses the curiosity of the class.

But that is not all. While doing algebra in the same class, he puts questions which can set all the mathematicians of the world ahinking, and then come to the conclusion that mathematics needs immediate revision at the hands of our learned juggler. One of his questions, for instance, is: "What is the negative of $(a+b)^2$?" (He means to ask the students what $(a-b)^2$ is equal to). That is his characteristic way of trying to make students think. As it happens, his questions being too learned for them, one of the boys stands up and beats his breast, another weeps

We must reduce the number of our starved and useless cattle and feed well those we decide to keep.

Cottage industries give employment to a large number of people, and if they are allowed to decay, many people will be thrown out of employment. The holding of an average Japanese cultivator is far smaller than that of an Indian but still the former is economically much better off than the latter. The reason is that during his leisure hours, he is engaged in a cottage industry, like sericulture, and supplements his income in this way.

We should wear our Swadeshi cloth and should not look down upon our weavers. In this way we shall be able to consume most of our raw cotton and will become an important industrial country too. "Do this, and we transform the face of India and make it smile." Once again our country will be a paradise of plenty.

The question is who should do all this? "We". We, the sons and daughters of India, the hopes of Morrow, alone can fit together the odd pieces of the puzzle with which this essay started. We alone can make a lovely picture out of them. After all this is our country. Though not yet, but it shall be ours in the near future. If not we, then who else will do it for us?

Therefore all of us should get up today and do, even at the cost of personal inconvenience, what our poor country needs. It is our birth-right to be free and we should leave no stone unturned to achieve our goal—the goal of freedom from political bondage and economic shackles alike.

KIFAYAT ULLAH QURESHI,
II Year.

Strange Personalities

Each year, we are told, a strange personality is found among the B.T. students. Last year there was a student, a square built man with a large head and even larger moustaches, who was call-

India is an agricultural country, seventy out of every hundred of her people live on land. This is the main cause of their poverty. In England only ten out of hundred do so.

Now let us summarise the main causes that are responsible for her poverty.

1. Cultivators. Starved illiterate, ignorant and unemployed for a third of the year.

2. Cattle. Even more starved, ill-fed, and ill-used.

3. Land is cut up into silly little strips, tilled with the same primitive implements, almost starved of manure and thus drained of its precious salts.

4. Cow-dung is used as fuel. This is an uneconomic use of dung cakes.

5. Much dependence on Monsoons. Indian agriculture is a gamble in the Monsoons. It is irregular, unreliable and full of tricks.

6. Far too many people depend on agriculture, which even under the best conditions means a lower standard of living.

Now we should think of likely measures which can remove this terrible poverty from our dear country.

First of all compulsory primary education must be enforced. Illiteracy is the curse of village life. All reforms are obstructed due to ignorance of the village folk.

Secondly land should be divided over again into big enough farms by consolidating the present tiny and scattered holdings.

More canals and wells should be constructed, so that we may be less dependant on Monsoons and the vast areas now lying uncultivated for want of water may be brought under plough.

We should look after our existing forests and plant new ones wherever possible so that we can get wood out of them for use as fuel, and thus save cow-dung for manuring our fields.

Our peasants should be taught to use improved varieties of seeds and modern implements.

We Indians are like a landlord with a big estate, but we have to ask ourselves where and how it is situated.

India is a country which has all the possible raw materials for making all the things its people can possibly want. The wealth of India was proverbial in times long past "At a time when the West of Europe, the birth-place of the modern industrial system, was inhabitated by uncivilised tribes, India was famous for the wealth of her rulers and for the high artistic skill of her craftsmen." This was the cause that fired the imagination of distant peoples and made them covet the riches of India.

Let us now make a little catalogue of our country's riches.

1. Huge population. Ruskin said, "Happy, healthy people are the most valuable things a country can possess." Think what tremendous strength and energy to make and to move things, what great man-power India has.

2. Animals. She has all kinds of animals from the elephant down to the snake and the mosquito. Her cattle are the most serviceable and we have a third of the whole world's stock.

3. Minerals. Nature has bestowed upon India varied mineral resources, which can enable her to build a number of industries.

4. The Himalayas. They are a determining factor in the prosperity of India. They shelter us from attack by other people and from the hot, dry winds of Asia which would dry up our vegetation and reduce Northern India to a desert.

In spite of the riches mentioned above the great bulk of our people are poor, terribly poor. They live huddled together in dismal dark and smelly slums, sleeping in a dark, smoky room, eating of the barest, their children denied education. The lot of our common people is dreadful. Such are the starvation and the filth and the wretched homes in which they are born that little babies die like flies. Infant mortality is four times larger in India than in Sweden. An average Indian collapses before he is thirty while a Newzealander lives upto seventy.

And so India presents a paradox. Poverty in the land of plenty. It is a puzzle, but every puzzle has a key or clue to solve it.

gold. The glow of the rising sun was reflected in the face of the river-side beauty and her charms appeared to have multiplied a thousand fold.

An artist passed by and thought, "She would make a marvelious model for a painting." A poet set his face towards the river and on seeing her said, "Her beauty can inspire immortal lyrics." A young lover happened to pass that way. The moment his eyes fell on her he gave away his heart and said to himself, "Although love is like a thorn which grows beside a rose, yet I cannot help loving her. Beauty inspires love and love enhances beauty. Love for her is my only solace. It is like an oasis in the dreary desert of life, an anchor for the storm-tossed ship of life."

A little later, a physician chanced to cross that way and an idea occurred to him, "She would bring forth a wonderful progeny of strong and healthy children."

Just then a child appeared on the scene and on seeing her cried out, "Mother, mother." Finally, a Sadhu came for his usual prayers at the river-side and said, "It is nothing but *Maya*, all *Maya*."

CHAMAN BASSEEN.
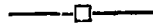
The Glory that can be Ind

India has the largest population in the world next to China. One in every five is an Indian. The geographical position of the country has given it a position of advantage so far as communication with other parts of the world is concerned. It makes us keen on taking our proper share in the ordering and settling of the world's affairs. But size or bigness alone matters very little. It is what one makes of bigness and size that is of importance.

dangling in the air. The stick meanwhile lay in the chair smiling at the great mathematician's forgetfulness.

★ ★ ★ ★

Chapli Kabab appears to be going out of favour with our students in the same proportion as *dali-nakhud* is rising in their estimation. Bad days, no doubt, for Kababis in Arbab Sahib's "Commercial Buildings" outside the College. But this is not due to any perversion of taste among the students, who still cherish the memory of the Chapli Kabab of the days gone by. The real cause of this change is said to be a tendency on the part of the 'Kabab manufacturers' to mix an undue proportion of an *ersatz* product instead of beef—and perhaps of wood dust in place of maize flour. But the kababis need not lose heart; they can win back their custom by advertising "Chapli Kabab for Health."

"ARSH GUFTA."

Maya

The day was dawning and the queen of the night was gathering her flowing robes for exit. Trees growing on the river-bank were just becoming visible in the dim light of the dawn. A gentle breeze created ripples on the surface of the water and a stir in the leaves. The silence of nature was broken only by the presence of a human figure.

Day light was increasing every moment; the human figure became more and more discernable. Lo! It was a young woman whose charms surpassed imagination and chaste beauty of whose
whose charms surpassed imagination and the chaste beauty of whose body and form was entirely unstained by any human devices for concealment. She was singing a love song and her melody appeared to have cast a spell on mature herself.

More time passed. The sun suddenly shot *up in the* east and transformed the lofty tops of pine-trees into a mass of molten

'You understand it'
'So' ...... 'Now'
'So on and so forth'
"Isn't it so ?"
"Well, gentlemen you see" (with breast erecting and a thumping on the table)
"You shee,"
'Comma' .... 'full stop' .... 'Comma' ... 'Colon' .... 'S' Capital.

★ ★ ★ ★

Students should not absent themselves from their classes, without valid reasons. If they cannot help it, they must make friends with those who can nip the evil of fi es in the bud.

★ ★ ★ ★

Our Accountant's chaprasi is a popular figure. He is so friendly with everybody, so prompt at greeting you on the way. But I don't like him, for whenever he meets me he drowns me under a flood of questions regarding the whereabouts of this student or that. I like his name instead. In fact, I love it, pay for it, and eat it with great relish. He is called Makhan—butter, which has become the classic alternative to guns—something decidely less pleasant.

* * * *

The most remarkable thing about Dr. Hadi Hassan is his overflowing wit and genial humour. Once he went to deliver a lecture somewhere. The chairman introduced him (as did our Principal the other day) as a versatile genius, an eminent scholar, a great scie tist, a second Bernard Shaw, another H. G. Wells, etc., etc. The introduction over, upsprang our witty scholar and rumbled in high-pitched voice, "Gentlemen, I am zero, zero, zero, raised to the power infinity."

* * * *

You might have heard of the philosopher who went to draw money from the bank but could not sign the cheque as he failed to recall his own name, until he had run back home and ascertained it from his wife. Here is one about a great mathematician. Every evening he came home, he used to rest awhile in an easy chair. One evening his mind was so much preoccupied that he utterly forgot who was the stick and who the mathematician. He mistook himself for the stick, caught hold of a peg and stood

we may seek to make our schools communities," continues Ross, "where individuality is not damped down, but fostered through social contacts and opportunities of service; where the distinctive contribution of each and every member is welcomed and encouraged."

RAJ NATH BHAN.

Crumbs from the Dining Table

Early this session the Darul-Ulum had become the Great African Desert. Lesser brains among you may not understand what I have said. Let me help them.

Sand in stomach because sand in bread,
Sand in bread because sand in grain,
Sand in grain because sand in air,
Sand in air is seen nowhere,
But in the African sandy plain,
So our College was a desert land.

★ ★ ★ ★

Dictators are these days as common as frogs in the rainy season. In our college these Autocrats of the dining hall (I mean the food-monitors) are no less than dictators in their bearing (or should I say, amidst their 'bearers'). The rumour goes that these belly dictators gather quite a respectable following of gastronomists around them during the hey-days of their power—on the analogy of Hitler and Goering, perhaps.

★ ★ ★ ★

May I recall to the students their class rooms where day after day they hear the following phrases and words accompanied with characteristic jerks, a hundred and one times.

'Well' ...... 'Now a word about it'
(accompanied with much cleansing of nose with handkerchief)

Herbert Spencer defined education as a preparation for complete living and he includes the duties of citizenship among its major elements. The aim of education may thus be described as a preparation for citizenship.

Perfection of nature, i.e. making the best use of all the gifts that God has given us and improving them to the best of our ability, has been frequently emphasised as the true aim of education. It includes the harmonious cultivation of a man's physical, intellectual, aesthetic and moral qualities.

Now let us come to the ultimate aim of education. "Education is an activity which is concerned both with the individual and the society, rather the individual-in-society." We cannot conceive of an individual living and developing in isolation from society. Education has a two-fold object, the perfection of the individual and the good of the society. "Education is essentially a human process," says K. G. Saidayn, "a contact of a mind with a mind, of a spirit with a spirit. And again it is certainly a conversation with the world. The teacher is not concerned primarily with instructing children in a certain number of school subjects; his primary concern is with the enrichment of their life experiences in such a way that they will realize their own powers and use them in the service of their social heritage." The school, according to Dewey, can be a preparation for social life only in so far as the school is itself a society. The theory of education must take account of both society and the individual and of the two we should take the individual first.

T. Percy Nunn says: "Nothing good enters the human world except in and through the free activities of individual men and women. Education must secure for everyone the condition under which individuality is most completely developed." But as Ross puts it, "Individuality is of no value, and personality is a meaningless term apart from the social environment in which they are developed and made manifest." The late Sir John Adams used the expression 'self-realization' as the ultimate aim of education. But self realization can only be achieved through social service. Jesus also taught that the way of personal salvation is the way of sacrifice and self-abnegation. "He that loseth his life for my sake shall find it." "If we believe in this

pect when viewed from another stand-point. The different views do not necessarily contradict but complement one another. "For our immediate purpose we may say that being educated means going to school." T. Reymont continues: "S. Brown sent Tom to school for, 'he will turn out a brave, helpful, truth-telling Englishman and a gentleman and a Christian'." In the wider and less definite sense, "education means that process of development in which consists the passage of a human being from infancy to maturity." And again quoting Reymont, "the aim of education is to make the children fit to live and fit to live with."

The aim of education is essentially practical, not in the bread-and-butter sense but in a large sense. K. G. Saidayn says: "Knowledge that cannot be turned to use in some department of practice is worse than worthless. There is perhaps no knowledge which in its nature is of no utility.... In my opinion a system of education which does not equip the people with the desire and capacity to earn their living and to pull their weight in society, stands utterly condemned." But he is equally forceful in condemning the narrow materialistic aim of education when he says: "Living relationship between education and national culture and religion has ceased to function and therefore the general feeling is that education is merely means for the improvement of one's material and economic position. This modern attitude of 'externalism', the desire to seek happiness in the possession of external things like money, titles and cheap popularity, makes us helplessly dependent on material objects, and in course of time dries up the rich and invaluable sources of joy that are embedded in our own selves."

Against the bread-and-butter aim of education there is the cultural aim. "Education should be the means of conserving the gains of civilized life and introducing the young to the achievements of the past."

According to Herbert Spencer, "the one and the whole aim of education may be summed up in the concept—morality." This view emphasises that the teacher's ultimate concern is to cultivate "not wealth of muscle, nor fulness of knowledge, nor refinement of feeling but strength and purity of character." The ethical aim is supreme here.

ed us of the glory of the great Mughals. On the way back we visited Hazrat Bal, famous for the hair of the Prophet (May peace be upon him).

Next day we went to Tungmarg in a bus. From Tungmarg we rode on ponies to Gulmarg (alt. 8,000 ft.) which is one of the most beautiful places in Kashmir. We went to Khilanmarg (alt. 11,000 ft.) where we saw a natural spring which is known for its cold and sweet water. We had our lunch there and returned to Srinagar in the evening. We spent the next day in shopping at Srinagar.

Afzal and Baloach started for their homes via Pindi, the rest of the party having decided to go to Abbottabad. We started for Abbottabad on the 11th of July and reached there at 5 p.m. Our return journey was also interesting and we enjoyed good sights on the way. At Abbottabad the party dispersed to leave for their respective homes.

KH. ABDUR RASHID.

The Aim of Education

Education has as many aims as there are people concerned with education. Each man's aim in education is a reflection of his philosophy of life, his ideals and outlook on life. The definition which will suit all the temperaments is still to be discovered. We may console ourselves with the old saying that "search for truth is better than the possession of truth" and that "to travel hopefully is better than to arrive."

Education is for life and life has different phases and aspects. According to Dewey, the aim of education may be compared to the summit of a hill from where we get a clear view of the landscape. The same landscape presents a different pros-

took an oath not to follow Ashraf again. The rest of the party, along with ponies and coolies, following the right path, did not find any difficulty and reached the valley below half an hour earlier. When we looked up at the mountains which we had crossed, we were filled with pride to have triumphed over such giants of nature. But our difficulties were not yet over.

We were told by the native *gujars* that Surakhro, our destination, was about 2 miles ahead. So we all decided to continue our march and thus we entered the beautiful Sind Valley with its multi-coloured flowers spreading on earth like a beautiful carpet. The road was in the worst condition and the going was very difficult. We had to cross five unbridged nullahs. One of the ponies dropped his luggage and consequently we lost a whole tin of kerosine oil. We asked every Kashmiri we met, about the distance ahead, and the only 'reply was two—two—two miles. These *only two* miles multiplied into so many miles that we could hardly find a grassy plot of land at the approach of night, and Surakhro was still two miles away.

We were all exhausted by a long and strenuous journey of 26 miles, walking all day long. To our surprise we found Bairam ever-ready with his *halwa*, *pulao* and chickens. We were thoroughly tired by now but all were satisfied that the labours of the day were amply rewarded by the wonderful sights we had seen during the day.

Next day we took rest, and enjoyed the day to our hearts' content. We played cards and photographed the whole party in fancy dresses.

The following morning we started for Kangan 9 miles ahead. We halted there for a night. Kangan is a beautiful place situated on the bank of the Indus.

On the 7th of July we started on our return journey, and dispensed wih our ponies at Wuyle where there is a hanging bridge spanning the river. From Wuyle we returned to Srinagar in a bus.

On the 8th of July we rowed in the Dal lake in a *donga*, singing a chorus song all the time. We were fortunate to have a good singer in Mr. Adil Khan and a good *tabalchi* in Sulaiman. We visited Shahi Chashma, Shalamar and Nishat which remind-

selling milk. Their headman told us that the route which we intended to follow was very dangerous as it was covered with snow and glaciers. He showed us a warning from an Englishman which said, "The way is fatal as my wife and I could cross the glacier only with the help of 25 coolies." So we changed our plans. Bairam was kept busy the whole night in order to prepare meals for the next day as there were very meagre chances of getting fuel on the way.

On July 2, our party of young and strong men in high spirits marched on. We hired six coolies from Sikwas. The march was *very difficult, interesting and adventurous*, as the whole day long there was *fear of death* at every step. Starting from 11,000 *feet we clim*bed up the Soumas peak (15,638 ft.). We had to walk on soft snow for about 3 miles. It was a very strenuous walk. Maulana and I took the lead and were the first to reach the summit. Between Sonmas and Sikwas the country is known as Jagimarg. On the way there was a little lake surrounded by multi-coloured, beautiful wild flowers filling the whole atmosphere with sweet fragrance.

Maulana persuaded me again to take the lead without the help of the guide. From 15,638 ft. we had to descend to 9,000 ft. It was a very steep descent. Maulana and I crossed two glaciers by slipping and luckily twice we escaped death. Ashraf was close at our heels. While trying to cross the glacier he went rolling over the stones. Our foot prints, unhappily left on snow, tempted Chuni, Sulaiman and Mr. Adil Khan to cross the very glacier which had almost knocked us out. Mr. Adil Khan attempted crossing after Chuni and Sulaiman, but due to his unwieldy weight he could not keep the balance and went rolling down the glacier and over the stones in its rocky bed. Luckily Sulaiman and Chuni caught hold of him and saved him from the jaws of death. After this unpleasant incident I heard everybody saying, "If this is paradise, may God not send us here."

There was another steep descent ahead of us. Ashraf took the lead; Afazal and I followed. After a few yards we found the descent unmanageable. Caught in a difficult situation, we crept very cautiously fearing death every moment. Imagine steep rocks with water flowing over them and we three crawling along. So nerve-shattering was the descent that Afzal and I

a pleasant picnic. Some of us took snapshots. From Baisarn a few of us led by Chuni and Maulana went to see the Tulian lake. Ashraf, Suleman, Yusuf, and myself came back as we were not prepared for hard walking. The other party was late and we became anxious about them. So we went back to Baisarn to ascertain their whereabouts. At 6 p.m. the whole party came back. Afzal told us of the perilous journey which they had taken to the Tulian lake. They had to cross three glaciers, he said. We, who were left behind, were very sorry for not visiting the Tulian lake. That night we passed in the tents.

Next morning we left Pahlgam for Liddarwart with packed ponies. The Liddar Valley through which our road lay is one of the most beautiful Himalayan valleys. We reached Aru (7 miles from Pahlgam) at about 9-30 a.m. Here we stayed for three hours and had lunch. Lofty mountains covered with pine trees, arranged in beautiful rows, provided very enchanting scenery. At 1 p.m. we resumed our journey towards Liddarwart (alt. 10,000 ft.) at a distance of 7 miles from Aru. The path was easy and the journey pleasant. There were huts of *gujars* on the way. For the first time some of us saw a glacier. We ate snow and photographed the whole party on the glacier. With Maulana and Chuni as our guides we reached Liddarwart at 4 p.m. There was a Dak Bungalow on a little green plain, which we occupied. Bairam prepared tea which we gulped down eagerly to remove fatigue. Here at Liddarwart on either side and in front of us loomed high mountains well above the snow-line. A stream nearby foamed and roared. We had a pleasant night with Suleman singing.

On the 3rd of June, we left Liddarwart for Sikwas (alt. 11,000 ft.) 10 miles ahead. The road was very bad and slippery. We had a bit of hard hiking, together with our ponies packed with provisions and tents. The snow on the way was lying in heaps and mounds and my lively companions ate it with great delight. One of the pony-walas dropped our cooked meals somewhere. As a result he and Ghani, our guide, received a good beating at the hands of Suleman.

We reached Sikwas at 1 p.m., crossed Sikwas Nullah and camped on velvety ground. On either side of us arose barren mountains covered with snow. Here some *gujars* came to us for

A Trip to Kashmir

Our party of thirteen, left Peshawar by the night train for 'Pindi on the 27th of June, 1942. Next morning it was raining when we started for Murree in a bus. The ascent is not very steep and the road goes winding like a serpent. We reached Murree (alt. 7,000 ft.) at 10 a.m., and resumed our journey after a refreshing rest in the cool, fragrant atmosphere of Murree. From Murree onwards the road descends. At Kohala we crossed into Kashmir State territory. We reached Domel at 2 p.m. where we had lunch at a road-side hotel and paid the toll. From Domel the road runs along the river Jhelum upto Baramula—a distance of 75 miles. On either side of the road are high mountains barren to begin with but covered with thick pines as one proceeds further. From Baramula onwards the scene is very charming. The road is here like an avenue flanked on each side by stately poplars. The rice fields stretched far into horizon and had a very soothing effect on our eyes which were habituated to the barren hills of the Khyber. The whole day long we sang songs in chorus and no one felt fatigued.

We reached Srinagar at 8 p.m. and stayed at the Punjab Muslim Hotel. Early in the morning the whole party left for Shankar Acharya (alt. 6,000 ft.), which is situated at a distance of 1½ miles to the east of Srinagar, with an ancient small temple at the top. From it one can have a clear panoramic view of Srinagar, the Dal, the Maharaja's palace, and the Mughal gardens lying on its skirts.

The stay in the Hotel was inconvenient as well as expensive. So we shifted to a house-boat where we could get a good deal of swimming in the Jhelum.

On the 30th of June we started for Pahlgam (alt. 7,000 ft.), 60 miles from Srinagar. On the way we visited Achabal garden which is more beautiful and lovelier than the Shalamar and the Nasim Bagh. Pahlgam is a nice place with its extensive meadowy plateaus, and air laden with pine-fragrance. We camped on a grassy patch of land on the bank of the Ladar for two days. Here we enjoyed pony rides. Next we went to Baisarn and had

come from the East; and it ill behoves us to inherit only their books, without translating their precepts into action :—

> "Let thy life be gentle so that if thou shouldst slip,
>
> The angels might rush to sustain thee with their prayers."

Therefore, I venture to think that if these three principles were actually enforced in our educational institutions then the result would be a marvellous synthesis of Reason and Religion, of Gnosis and Knowledge, and of the *mens sana in corpore sano.* And then the imperative call for the creative, the productive, the constructive intellect will have been answered.

Truly, gentlemen, you are the architects of your homelands of tomorrow, and one aspect as it were of your architectural skill is this new Cunningham Khyber Union Hall, which is associated with the name of your illustrious Governor, my esteemed friend, His Excellency Sir George Cunningham. This friend of the friendless, this man of vision and imagination, this true patron of learning, this sincere supporter of your College, has, by his administrative skill maintained harmony in the Province, and by his deep regard for scholarship lent his sympathy and his name to this magnificent Hall which it is now my proud privilege to open.

The East has always believed that an unknown hand will arise to work miracles. Behold how that miracle has been wrought, and how our dreams have been realised.

And now, gentlemen, I tender you once more my grateful thanks, and I assure you I shall always cherish the honour of having been called upon to open the CUNNINGHAM KHYBER UNION HALL.

I wish the Islamia College the best fortune and every prosperity.

and habits, and even the aims and ideals of a nation, for all these are the immediate derivatives of education; and even as education is the soul of a nation, so should this soul be sublimated in the cleansing fire of religious instruction. The world was created a paradise, but man has made it a desert. In a remarkable passage, the poet Nizami says :—

"Traverse His path without feet; behold His lustre
without eyes,
Hearken unto Him without ears, and drink to Him
without lips."

And how have we interpreted this lofty concept? Alas, by becoming all feet, all eyes, all ears and all lips. The distortion has been total, and the inevitable consequence followed. Islam, which at first had neither the strength of numbers nor of materials, but even so spread from Spain to India, is now parcelled out into a congeries of separate units lacking cohesion or co-operation. Therefore, it is a matter of faith with me that religious instruction should constitute the basis of all our educational experiments; and nothing has given me greater pleasure than to see that in this great College of yours, you see eye to eye with me in your absolute insistence on religious training and instruction.

The second cardinal principle of our education should be the imparting of physical training and culture. Weak and fragile bodies cannot endure the storm and stress of Life's competition. He who strives secures the prize; and striving demands physical energy. Man should be masculine. And it is a source of great satisfaction to me to see all these happy, healthy faces of the young men of your College who have answered the call of games, sports and athletics.

The third and final educational principle is the inculcation of ethical culture and of the faculty of thinking. Man is man by virtue of his mind and intellect. Good breeding is one thing; mere book knowledge is another. And material progress is different from culture and manners. The two of the world's greatest authorities on Ethics, Nasiruddin and Jalaluddin, both

We now request Your Highness to open the CUNNINGHAM KHYBER UNION HALL.

We beg to remain,
Your Highness's obedient servants.
Members of the Council of Management
of the Dar-ul-Ulum-i-Islamia-e-Sarhad.

The 2nd December, 1942.

Ideals of Education

(Being His Highness The Nawab of Bohpal's Reply to the Address Presented at the Islamia College, Peshawar, on 2nd December 1942.)

Let me first express my grateful thanks for your kind hospitality. I am positive that love and affection, though aesthetic emotions, are subservient to the physical law of action and reaction; wherefore even as your love for me hath no measure, my love for you is equally extremely great. God willing, these ties of cordiality will emerge all the stronger when submitted to the inexorable test of time.

"Perishable is every edifice that you see,
Save the edifice of love which is imperishable."

And to the best of my ability it shall always be my endeavour to be of some service to you; and I am deeply grateful to Providence seeing how your affairs have thrived and how the calyx of your endeavour has now blossomed into the flower of Beauty.

Gentlemen, Education is a comprehensive word which embraces not only educational institutions and text-books, but ranges also over the wide field of training and culture, discipline

prizes, medals, trophies and championships. A number of Societies have been established to assist in developing social and intellectual life amongst the students. Of these the most important is the Khyber Union, the students' Debating Society which is an excellent training ground for promising young-men in the art of public-speaking and which aims at fostering a sense of healthy citizenship among its members with a view to raising the standard of public speaking. The Union invites public-men of eminence to address the students on important problems, and holds two debates every year, one open to all Secondary Schools of the Province and the other to all Universities and Colleges of India. Several of the Union speakers have won prizes and trophies in speaking competitions held in various educational centres of the country like Aligarh and Lahore. The enthusiasm felt by the members for the Union and the keen interest taken by them in its welfare have found expression in the shape of this magnificient Hall, the entire cost of which is to be met by the members themselves. It is only in the fitness of things that the Hall of such an important and popular Society should be named after a sympathetic and popular Patron of the Dar-ul-Ulum like His Excellency Sir George Cunningham and be opened by a great benefactor of Education like Your Highness, who is not only Pro-Chancellor of the biggest centre of Muslim education in India but the son of a talented lady (May her soul rest in peace) who had the distinction of being the first and the only lady-Chancellor of a University.

Before requesting Your Highness, however, to open this Hall, we should like to offer you our most grateful and sincere thanks for your munificent donation of Rs. 50,000|- to the Dar-ul-Ulum funds and permanent grant of Rs. 3,000|- per annum towards the expenses of raising the College to the status of a University. Although we are not yet a University, we are actually providing instruction in more Faculties of Learning than some of the existing Indian Universities. We have every hope, however, that the unanimous demand of the people of this Province for the establishment of a University, as expressed in the Provincial Legislative Assembly and as endorsed by the Central Assembly, will be met as soon as the present financial difficulties disappear.

The site selected for the institution has a halo of historical romance around it. The College stands on the site of an ancient Buddhist monastery and at the mouth of the world-famous Khyber Pass which has played such an important part in the shaping of India's destiny through the centuries and which doubtless saw Your Highness's great ancestors riding past on their way to India. The humble seed sown about twenty-nine years ago has, we are thankful to say, grown into a mighty tree and has borne fruit. The Dar-ul-Ulum now has the Arts, Science, Oriental, Agriculture and Education Faculties and prepares candidates for M.A., B.T., B.A. (Hons.), B.A., B.Sc., and B.Sc. (Agr.) degrees. There are 600 students on the rolls of the College and 450 in the Collegate School. This number includes not only Muslim students but Hindus, Sikhs and Christians as well; hailing not only from all parts of the "Settled Districts" of the Province but also from the tribal territories from across the border and from other Provinces and States of India like the Punjab, Baluchistan, Kashmir and Kalat. The Dar-ul-Ulum is a residential institution and the Staff and most of the students live on the premises—a system which as Your Highness is well aware, provides valuable opportunities of personal contact between the teacher and the taught. There are seven hostels for the College and two for the School, the largest of all being the Osmania Hostel named after H.E.H. the Nizam of Hyderabad and Berar. The College Staff consists of over fifty professors, Assistant Professors, Lecturers and Demonstrators, of whom a large number are old students of Aligarh and some contemporaries and class-fellows of Your Highness. A well-stocked Library, the Oriental Section of which contains a large number of precious and rare manuscripts and a Reading-room serve to increase the general knowledge of the students and broaden their outlook on life. Not only is special care taken of the intellectual side of education, but its physical and spiritual aspects also receive proper attention. A Department of Theology looks after the welfare of the students and imparts instruction in Tafsir, Hadis and Sirat. Qualified Physical Instructors are in-charge of physical education and a University Training Corps is in the course of formation under the care of fully-trained Officers. Extensive lawns and playgrounds have been provided for the pl..ing of all major games like Foot-ball, Hockey, Cricket, Tennis, Volley-ball and Basket-ball, and our teams have given a good account of themselves in various competitions and tournaments and won

Address of Welcome

To

His Highness Sikandar-Saulat Iftikhar-ul-Mulk Lt.-Colonel

NAWAB SIR MOHAMMAD HAMIDULLAH KHAN BAHADUR

G.C.S.I., G.C.I.E., C.V.O., B.A., LL.D.,

RULER OF BHOPAL.

May it please Your Highness,

We, the members of the Council of Management of the Dar-ul-Ulum-i-Islamia-e-Sarhad, beg to offer Your Highness our most cordial and sincere welcome on your first visit to this institution.

Ever since 1939 when Your Highness was pleased to receive a deputation from this Dar-ul-Ulum and overwhelmed its members with the proverbial Bhopal kindness, hospitality and generosity, we have been eagerly looking forward to the pleasure of having you in our midst. Last winter when a rumour went round that Your Highness was contemplating a visit to this ancient homeland of your illustrious ancestors, every heart here was thrilled with the anticipated joy of meeting a worthy successor of those great warriors and statesmen of the Afghan land. But the fates decreed otherwise and important state affairs intervened to postpone the long-awaited happy hour.

Today when we have the good fortune of having in this "Home of Learning," a great patron of Learning of Your Highness's eminence, we take this opportunity of making a brief reference to our humble efforts in the cause of Education—a cause which we know is so near to your heart.

This Dar-ul-Ulum owes its existence to the realization on the part of the people of this Province of the imperative need of modern education on scientific lines with a strong background of sound religious instruction. It was founded in 1913 by the late Nawab Sahib Sir Sahibzada Abdul Qaiyum with the active co-operation and liberal support of the late Sir George Roos-Keppel.

Athletics

Khawaja Rasheed, a University blue, captains the team. The departure of players like Bashir, our ex-captain, has left gaps in the team, but there are still some 'old warriors' in whom we have great faith. Some of the new entrants also hold great promise. The team is practising fairly regularly and there is every hope of our retaining the trophies won last year. We are sending up a team to participate in the University sports.

Basket ball

This game was introduced only last year, but already many enthusiasts have gathered round its field. We have in Ghaus a very active captain. He is straining every nerve to train his comrades. The team will participate in the University tourname.t. We have great hopes in Ghaus and his team.

Tennis

Chuni, the wizard, is no more amongst us. We are deprived of Anwar, too. Without these two veterans, tennis would have deteriorated greatly had not Fazli Mahmud, the captain, and Zafar turned up. They are both trying their utmost to preserve the College prestige by retaining the Col. Keen Cup. Our best wishes are with them.

RAHEEM.

---

ed so abruptly that we could not even form our teams until the last moment. Time was short and the University matches loomed over our heads. In a hurry teams were formed, a little practice given and we entered an arena where each one of our opponents was fully prepared for the battle. But we are not dismayed. Success in the University tournament is not our only ideal. As days roll on we are putting on more and more of strength, and we are certain that in the provincial tournaments our teams will wipe off the defeats and return with flying colours.

Hockey

We won the first match of the University tournament against the Edwardes College. Our second match, against Gordon College, Rawalpindi, ended in a draw on the first day. Our captain Qazi Ghulam Mohd. was disabled by a fall in the first ten minutes of play and the team was handicapped by his absence. On the second day our defence line, put up a brilliant show. But as misfortune would have it, a ball slipped into our striking area in the last 4 minutes and was netted. We pressed hard but could not equalize. We were definitely a better side than our opponents but were handicapped by the absence of our captain. Qazi Ghulam Mohd. and Nabi have been selected to represent the Punjab University. Our congratulations to them.

Football

The session began very late. Right up to the day of the University match we had not formed our team. We were helped by Aman Ullah—a University blue, Waheed—another University player, Aziz Ullah—last year's skipper, and Abdur Rehman Awan. It would be unjust if we did not mention our little left out, the 'Chinaman'. We had the pick of men but lacked well-disciplined team work, and so could not put up a good show. Let us hope the team makes amends for that in the local tournaments. Aman Ullah has again been selected to play in the Punjab University team. We congratulate him.

Cricket

It was with the efforts of Hamid and Inayat that our team was sent up for the University tournament. We are sorry that the team received a rebuff in their very first match. Our boys, however, put up a commendable show in which Zaffar played a notable part.

The Dramatic Club

We welcome Dr. E. A. Pires and Mr. Bashiruddin as its President and Treasurer, respectively. They have set to work enthusiastically and have invited names of students interested in dramatic activities. We hope they will give us at least one play in addition to the one which is usually staged on the Founders' Day.

Nothing has been heard of the activities of the following Societies :--

1. The Frontier Scientific Society.
2. The Sarhad Agricultural Society, and
3. The Day-Scholars' Association.

If these societies are in fact as active as their secretaries in sending us reports of their activities (or inactivities), the sooner they are winded up the better.

ASLAM.

Round the play grounds

Years drift down one after another like so many yellow leaves in winter. The throbbing, pulsating life of a college shifts from one year to another. Many gaps occur in its ranks, but year after year they are filled up by new comers. Superintendants and captains of the various games put in all their energies to train these freshers. After a few weeks' labour old heroes are forgotten and new entrants step into their shoes. A team is built up, laurels are won, victories are reaped and the college once more swells with pride and throbs with activities. Year after year this process goes on.

To a casual onlooker it would seem that our current sports session is a failure. In the University Tournament our teams suffered serious defeats. But a little analysis will prove that we have reasons for this slackness. A certain amount of training is essential for good team work. Practice makes the team perfect. Due to some unhappy circumstances our session start-

The Majlis-i-Islamiyat

The College Dean has infused so much enthusiasm for the Majlis-i-Islamiyat in the students that the election of the Secretary of the Majlis this year was contested no less enthusiastically than the Union elections. Ali Husain has been elected Secretary while the Dean and Prof. Mohd. Aslam continue as President and Treasurer respectively. We have so far had only one lecture, delivered under the auspices of Majlis-i-Islamiyat, by Mr. Pir Bakhsh Khan.

The Khyber Athenaeum

The Athenaeum, which is in fact an intellectual society, has frequently been the stage of frivolous activities. We are really pleased to know that Mr. M. M. Kaleem, its new president, is determined to make the Athenaeum, worthy of its name. Already a highbrow lecture on "the Sublime in Art" has been delivered by Professor Timur, and Mr. Bashir-ud-Din has read an interesting paper on "Intellectual Friendship". The Secretary informs us that the Hon'ble Malik Khuda Bakhsh, Advocate-same when he was a student in the College. The following are the other office-bearers :—

The Oriental Society

Mr. Nafisuddin is the new President of the Oriental Society this year. Previous to this he has been Vice-President of the same when he was a student in the other College. The following are the office-bearers :—

Vice-President—Mukamal Shah IV Year.
Secretary—Saeed Ahmad III Year.
Assist. Secretary—Malik Tahsin-ullah II Year.

So far only one meeting has been held, according to the Secretary's own statement. This Society appears to be bent upon maintaining its previously record of in activity, unless there is some truth in that announcement about the *Mushaira* and the alleged invitation to Dr. Hadi Hassan to deliver a lecture "in the near future".

The Sarhad Mathematical Society

The number of mathematics students in the College has increased rapidly, due to the activities of the Sarhad Mathematical Society. No meeting has been held so far this year, and hence there is nothing to report about it except that Qazi Mohd. Afzal VI Year has been selected its Secretary for the session.

College Societies

In spite of our repeated requests we have received no reports regarding the activities of the numerous College Societies. It shows either their Secretaries have nothing to write about or they do not know how to write. The following reports are based on our personal knowledge in most cases.

The Khyber Union

This session the Union elections were delayed owing to some unforeseen circumstances. Qazi Ahmad Saeed, B.A. (Hons.) was elected President in the by-election and the remaining offices of the Union were secured by the following students :—

Vice-President—Ghaus Mohd. IV Year.

Secretary—Abdur Rahim IV Year.

Assist. Secretary—Waliullah II Year.

Librarian—Aurangzeb

Standing Committee—Jalal-ud-Din, Jamil Akbar, M. Omer and Ram Rakha.

These office-holders were installed on November 28 in the Roosekeppel Hall.

This session has been rendered unforgettable by the opening of the Cunningham Khyber Union Hall by H.H. The Nawab of Bhopal. The first lecture in the Union Hall was delivered by Dr. Hadi Hassan, B.A. (Hons.) (Oxon), B.Sc., Ph.D. (London), Head of the Persian Department, Aligarh Muslim University. We hope that we shall have many more occasions to hear such eminent persons in future.

The budget session of the Union which is usually a very stormy meeting was a rather tame affair this time. Not a single item of the expenditure was opposed, and the entire budget was passed without dissent. So far only one debate has been held, on December 13, in which students as well as eminent debators from the outside took part. The proposition was that "Hindu-Muslim disunity is due more to wrong leadership than to fundamental differences."

the following new-comers: Prof. Adrian-Vallance (who joined the English department in the middle of October and will probably leave again in a short while), Mr. Jalalud-Din, an old boy, who makes a welcome addition to the hard-pressed English department, Mr. Anisud-Din Ansari who comes from Aligarh to take Dr. Mohammed Jan's place in the Education department, Mr. Mohammed Sadiq who joins the same department as lecturer in Geography, Mr. Nafis-ud-Din, another old boy, who steps into the shoes of Mr. Habib, and Hafiz Mohammed Idris who fills the gap caused by Maulana Haji Abdur Rahim's retirement from the Arabic department. Our venerable Lala Abdur Rahim Niazi, after having taught philosophy for a quarter century, goes over to Persian as Head of the department in the vacancy caused by the sad demise of Syed Yusaf Ali Shah.

Of the outgoing members, the name of Maulana Haji Abdur Rahim naturally comes first to one's mind. He has been associated with the Darul-Ulum for so long that it is difficult to think of the one without the other. It is a consolation to know that although he has retired from the teaching staff, he continues to hold charge of the Oriental Library.

Mr. Habib has left us after eight years' service in the Persian department. Dr. Imdad Hussain who was on the College staff for a comparatively short time, has gone to Chittagong. We bid farewell to both these gentlemen and wish them the best of good luck in their new jobs.

A. A. F.

Obituary

During the last year the cruel hands of death deprived us of three persons who had a long and happy association with the Darul-Ulum. Mr. Tipping, who died in England, was the first Principal of this College. Syed Yusuf Ali Shah, our late head of the Persian department, had served the College and the School for nearly a quarter century. Mrs. Abdur Rahim Niazi passed away in December last. Our heart-felt sympathies are with the bereaved families in their grief.

session. This time the installation of monitors took place on the 26th November and that of the Khyber Union cabinet two days later.

In his presidential address Qazi Ahmad Saeed expressed his determination to make the Union something more than a mere debating club. He regarded it as an instrument for the promotion of culture and for arousing the dormant talents of the students by giving them a taste for political problems and other vital issues facing the country. Let us hope his pious wishes are translated into action and he is able to impart some of his own zeal to the students of the Darul-Ulum.

★ ★ ★ ★

After a long struggle we have at last been able to obtain permission to start a company of the University Training Corps at the Darul-Ulum. Four members of the staff have obtained the necessary training and are serving as Commissioned officers, with Prof. S. A. Muttalib as the Commandant. A large number of boys have volunteered as cadets and their training has started in right earnest under Captain Cook, the adjutant. The rifle range will be ready for practice shortly. We have every hope that with the training so obtained by our boys, more and more of them will get into the fighting forces as Commissioned officers, and further improve the already glorious record of their alma mater in war services.

★ ★ ★ ★

This year our academic session started in the middle of the holy month of Ramzan. The 'Idul-Fitr was celebrated by most of the students by going to their village homes, as usual. The majority of the staff, however, stayed in the College. The Idul-Azha came off in December when the fear of the approaching 'test' examination (which started on the 28th December) had confined most of the boys to their rooms. It was the staff's turn now to go home to celebrate the 'Id.

★ ★ ★ ★

This year, too, like its predecessor, has seen many changes in the College staff. Such changes are not always to be regretted. They are both inevitable in a large and growing institution like ours, and desirable in asmuchas they infuse new and energetic blood in the college life. We extend a hearty welcome to

function which gives us an opportunity to meet prominent public men of the Province, or the arrival of an eminent visitor from outside with its attendant spate of parties and dinners—is all the more welcome, according to the well-known psychological experience that pleasure is doubly appreciated when it follows pain.

This session we may be said to have made a good start with a visit from an eminent son of India—Sir Feroze Khan Noon, Defence Member of the Viceroy's Executive Council. Sir Feroze addressed the College on the 9th October, 1942 in Urdu —a refreshing departure from the normal practice on such occasions. The most striking feature of Sir Feroze's speech was its emphasis on truth, courage and willingness to abide by the *Ijma-e-Ummat* as guiding principles for the Muslim youth.

On the 2nd December we had the privilege of receiving His Highness the Nawab of Bhopal, the ruler of the second Muslim State in India. His Highness was accorded a rousing reception.

In an address of welcome (printed elsewhere) presented to His Highness by our Honorary Secretary, K. B. Haji Saadullah Khan, on behalf of the Council of Management, a glowing tribute was paid to the traditional association of the House of Bhopal with the promotion of Muslim education. The address referred to the activities of the Darul-Ulum in the various academic fields and thanked His Highness for the munificent donation he had made on a previous occasion.

His Highness' reply (which we are publishing elsewhere) was most illuminating and thought-provoking. It expressed His Highness' delight at the happy mixture of the physical, mental and moral ideals of education found at the Darul-Ulum.

His Highness then proceeded to perform the opening ceremony of the Cunningham Khyber Union Hall and later on attended a tea-party in the Cricket lawn at which over 500 distinguished guests, prominent public men, high officials and others were present.

His Highness has been pleased to make another princely donation of Rs. twenty thousand to the College, for which we sincerely thank him.

★ ★ ★ ★

The installation of proctorial and hostel monitors and of the Khyber Union cabinet are two of the important College functions which are celebrated with due ceremony in the beginning of each

contact, cajoling and notices all fail to attract articles from the students of the Darul-Ulum, and the poor editors are ultimately driven to write out the magazine instead of editing it. Faced with this situation we begin to suspect that either the minds of our students have gone sterile, or else their attention is constantly occupied with other attractions of the college life. But it is utterly beyond our comprehension that when even the busiest of men can find time to write articles and even books, why should the students of Darul-Ulum find it difficult to write an article once a term. Perhaps, they fear the W.P.B. or think of editors as bug-bears or look upon the whole magazine as some unearthly affair in which they are sure they cannot find any place. We assure them that we welcome contributions and try our best to find a place for them in the magazine. Let the students come forward; perhaps there may be many among them who are fighting shy now, but whom a glorious literary future awaits :

> " Full many a gem of purest ray serene
> The dark unfathomed caves of the ocean bear."

We cannot help adding a word about the secretaries of the various sports and college societies. These worthies never care to send in their reports for publication in the Khyber punctually. How amazing it is that those who are quick as lightning in playfields, in holding teas and in arranging debates should be found so slow and reluctant in scribbling even a few words about their activities. How long they would persist in their obstinacy and how long we would fret and fume against them ! Let them shake hands with us and be so good as not to give us another occasion to complain.

RAUF.

College Notes

Life in a residential institution like ours which happens to be situated at a considerable distance from the town tends to smack of dismal monotony. But it is precisely for this reason that a break in the normal routine—whether it be in the form of an exciting sports duel between the old rivals, or a grand College

if it continues to be an anglicised model of the anachronistic Indian *maktabs* which teach medicine, astronomy and logic to Indian students in the language of Arabia.

A. A. F.

EDITORIAL

The year 1942 slid past, while we were fighting against our arch-enemy—the phantom of examination. It has been a year of hopes and sorrows, of joys and regrets—a year of sweet memories and sad events. Our mixed feelings towards it are most exquisitely expressed by a poet :

"Orphan hours, the year is dead,
Come and sigh, come and weep !
Merry hours, smile instead,
For the year is but asleep;
See it smiles, as it is sleeping,
Mocking your untimely weeping."

Let us not look back towards it, and 'forget the dead, the past.' But the future too has few sweet smiles in store for us. For, there again are the examinations and there, too; the lengthening shadows of the war. Both past and future are our fears. So let us forget them, live in the present and sing with Browning:

"God's in His Heaven
All's right with the world."

★ ★ ★ ★

This issue of the Khyber is appearing rather late due to circumstances outside our control. Appointments to the editorial board were delayed till the end of November and by that time the ghost of the examination was already looming large before the students. Articles came in very slowly and but for the persistent efforts of the editorial staff the issue might never have seen the light of day.

Frankly speaking, we are not entirely satisfied with the standard and number of the contributions we receive. Personal

institution is still judged by the number of B.A.'s and M.A.'s passing out of it every year, even if these alumni are unable to earn an honest evening's meal by their own efforts !

But that is not the only indictment against our universities. An unnecessary and appalling waste of time, money and energy is being incurred in making students learn an alien language which the great majority of them can never hope to master and without which they could have done equally well in acquiring knowledge and culture. I have not been very long in the teaching profession, but I have been long enough in it to realize the sheer absurdity of making students learn an analytical subject through the medium of a difficult, foreign language. Every day I waste three-fourths of my time in making my students familiar with foreign expressions and terminology, and they probably waste nine-tenths of their time in memorizing definitions in a foreign language. I feel I could teach them far more of economics in Urdu in just one half of the time I spend now in fruitless repetitions in English, while they would probably learn it ten times better and feel far more interested in it, if the bogey of writing answers in a foreign language were removed.

Some three years back the teachers of economics in the Punjab University unanimously passed a resolution asking the University to allow the teaching of economics in Urdu. But a University which had until only the other day thought that Indian students could understand Arabic and Persian and Urdu and Pushtu through the medium of English much better than through Urdu, was evidently in no hurry to see reason. The result is that Indian students wishing to learn economics have to learn English first before they can hope to pass an examination in economics. And thus it happens that the dual task of the teacher of economics (as of other subjects) to teach both English and economics, rather more English than economics, continues. He fumbles and fumes in his place, and the students who have to swallow definition after definition like bitter pills fumble and fume in their place.

Not that there is any lack of precedents. The case of Osmania University and the more recent decision of Lucknow University both point to the maxim that where there is a will there is a way. But a University which expects Frontier students to have first-hand knowledge of the Punjab agriculture, instead of the agriculture of their own Province, can hardly be blamed

graces and lacking the aptitude for culture. It was denied higher education, representative institutions, and even the regular, ordinary law of the land, because it was considered unworthy of them. Within the Province itself, local feuds, suspicion of the *ferangi* and dare-devil adventures were regarded as more important than schooling. Caught between these two mill-stones, the education of the Province remained neglected for another decade.

Then came a few visionaries on the scene. They realised how grossly erroneous both these views were, and yet they were fully conscious of their respective strength. They felt that sooner or later even this backwater of civilisation had to fall into line with the rest of British India, and that a policy of 'do-nothing' in respect of education was undesirable even from the narrow official and administrative view-point. But, at the same time, like true realists, they could not shut their eyes to the glaring fact of an hostile public opinion to a scholastic type of western education. The founding of the Darul-Ulum-e-Islamia-i-Sarhad thirty years ago under the collaboration of the late Sir Abdul Qayum and the late Sir George Roose-Keppel was a compromise between the two conflicting views, and it remains so to this day.

Meanwhile, public opinion, here as elsewhere, has undergone a tremendous change. The old distrust of *ferangi* education has largely vanished, the *maktabs* attached to mosques are putting up their shutters, and there is a pronounced opposition to purely vernacular schools. But that is not all. There is a widespread clamour against the very fundaments of the existing system of education, a clamour which rose to its highest pitch during the 'thirties when educated unemployment had assumed very serious proportions and was becoming a menace to the entire social order.

The war has ended unemployment for the time being. Consequently, critics of the educational system are also silenced temporarily. But this state of affairs is not likely to last *ad infinitum*. As soon as normal conditions return, we shall find a vast floating mass of demobilised educated youngmenn who cannot be absorbed in suitable employments on account of their faulty education. In the meantime, our Colleges and Universities continue to turn out *baboos* on mass production lines, unrealistically adamant in their unwillingness to take heed of the menace of ultimate unemployment, and its attendant political and social dangers, ahead. What is worse, the success of an

THE KHYBER

No. 1] PESHAWAR, JANUARY 1943. [Vol. XXVI.

Education--A Retrospect and A Vision

When the twentieth century dawned, amidst the clash of the rival civilizations of the East and the West, India was experiencing the throes of a rebirth. The new India with her modern industry, large smoky cities, universities, *baboo loags* and representative institutions was yet to be born. The triumph of modernity over medievalism remained to be seen, and ***charkha*** and the bullock-cart still held the field. Muslim India was only slowly recovering from the rude shock it had received in 1857, and in spite of the strenuous efforts and persuasions of men like the late Sir Syed Ahmed Khan had not entirely reconciled itself to the new order. The consciousness of the change and the inevitable necessity for submitting to it had caught the imagination of but a few, and the universal prejudice against the 'un-Godly western education' was slow to die.

The present North-West Frontier Province was carved out of the Punjab at this period of twilight. For a long time the new Province was regarded as little better than the roving ground of a ferocious, barbarous race of men unaccustomed to social

MESSAGE

You are part of a social system, a factor necessary to complete the sum; therefore your every action should help to complete the social life. An action of yours which does not tend, directly or remotely, to this social end, dislocates life and infringes its unity.

Marcus Aurelius, the Roman Emperor.

Coming to live out here after being in Peshawar, one is struck by the way in which the College seems a small city of its own, standing in the open country, a little independent world. It is, in its way, a world of its own: it is a community which depends for its life and vigour upon the harmonious co-operation of its members, and in this way it is both a miniature of, and a training for, the larger communities outside.

The aim of a University education should be not only book-learning or a degree, important as these are, but instruction in the virtues which go to make up a happy life for the individual, and a vigorous system of democratic government for the society in which he lives. These virtues, such as honesty and integrity of mind, toleration and a sense of fairplay, justice and kindliness, are fundamentally the same in all ages and all countries. They are neither easy to learn nor to live, and I should like the Islamia College to develop and foster them, so that as each generation of students leaves the College they may take away with them something which they cannot lose or forget, since it has become an integral part of their life.

Our New Principal
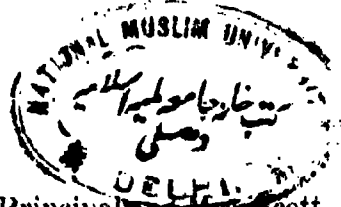
We offer a hearty welcome to the new Principal and Mrs. Scott. With their arrival, a new freshness and sunshine appears to have come over the Principal's bungalow. After having remained the abode of confirmed bachelors for years, it has just assumed the air of a 'home', and is resounding with the laughter and frolic of little children. This is a good augury, and we hope that the new regime will be marked by a predominantly human element.

Mr. I. D. Scott is the youngest Principal we have had. He was born at Inverness (Scotland) on March 6, 1909, and obtained his degree from Oxford at the age of 21. After spending a year at the London School of Economics, he took the I.C.S. examination in 1931, and came out to India in the following year. He was first posted to Sind and worked as Assistant Collector in Karachi and Sukkur for three years. He was taken into the Political Department in 1935 and has since then been in the N.-W.F.P. As Superintendent of the N.-W.F.P. Census of 1941, he made a careful study of the physical, social and economic conditions of all districts, agencies and states of the Province. For a year and a half immediately before coming to the College, he was an Asstt. Director in the Intelligence Bureau, Peshawar.

He comes to us with a reputation for scholarship, firmness and sympathy and with a wide knowledge of our people. We assure him of our whole-hearted co-operation in the noble, though arduous, task he has just undertaken—that of raising the status and tone of this great "Home of Learning". We have every hope that, with an experienced 'oarsman' like Mr. Scott at the helm, the ship of the 'Darul-Ulum' will have smooth sailing and will steer clear of the rocks and shoals that often lie hidden under the calm surface of apparently stagnant waters.

He has, at our request, given us the following message for the students of the Darul-Ulum, and with it we revive the series of "Messages to the Frontier Youth" which was started two years ago.

خیبر

دار العلوم اسلامیہ سرحد

پشاور

مدیر	نگران	معاونین
محمد افضل بی۔ اے	پروفیسر محمد موسیٰ خان کلیم افغانی	صفدر علی گیلانی، محمد سعید

جلد ۲۶	اپریل ۱۹۴۳ء	نمبر ۲

عرض حال

"خیبر" کا سالنامہ آپ کے سامنے ہے۔ موجودہ عالمگیر جنگ کی وجہ سے ہندوستانی صحافت کو جن مشکلات کا سامنا ہو رہا ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ "خیبر" کو ان مشکلات سے مجری طرح دوچار ہونا پڑا ہے۔ کاغذ کی گرانی بلکہ نایابی کے باعث ہمیں بادلِ ناخواستہ اپنے ارادوں میں ترمیم کرنی پڑی ہے۔ "خیبر" کا ایک پرچہ پیش کیا جا چکا ہے موجودہ نمبر کی ضخامت میں اضافہ کر کے اسے سالنامہ کی صورت میں حاضر کیا جا رہا ہے۔

زمانے کے موجودہ پیچیدہ حالات کے پیشِ نظر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ پرچہ کب اور کس شکل میں شائع ہوگا۔ لیکن ہم قارئین کرام کو یقین دلا سکتے ہیں کہ تعطیلات گرما سے پہلے ایک اور پرچہ نکالنے کی ہر امکانی کوشش کی جائیگی۔

ہمارے پاس اس دفعہ مضامین بڑی تعداد میں آئے ہیں۔ اور مضمون نگار حضرات کی تمنا بلکہ تقاضا یہ ہے۔ کہ انکے مضامین بلا کسی قطع و برید کے من و عن شائع کر دیئے جائیں۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موصول شدہ مضامین کا معیار عام طور پر حوصلہ افزا نہیں۔ اور ہم مجبور ہیں کہ صرف انہیں مضامین کو "خیبر" کے صفحات میں جگہ دیں۔ جو "خیبر" کے معیار پر پورے اتریں۔ اور دوسرے مضامین کو یا تو معیار پر لانے کے لئے اپنے "حقوق ایڈیٹری" کا استعمال کریں۔ یا انہیں حوالۂ طاقِ نسیاں کر دیں۔

قومی ادب اور قومی زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب کی صحیح ترقی قومی ارتقاء کیلئے راستہ صاف کر دیتی ہے۔ اور قوم کا حقیقی عروج ادب کو زندہ کرتا ہے۔ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہماری معاشرتی زندگی میں ایک مسلسل تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ اور ہندوستان میں سیاسی اور اقتصادی انقلاب کے علاوہ ایک ذہنی انقلاب کے آثار بھی نمایاں ہیں۔ اس ذہنی انقلاب کا ہمارے ادب پر بھی جو ہماری ذہنی کیفیات کا آئینہ بردار ہے۔ اثر پڑ رہا ہے اور ادب پہلے کی نسبت ہماری زندگی کی حقیقتوں کے زیادہ قریب آ رہا ہے۔ اور حیات قومی کے موجودہ اہم مسائل سے دامن بچا کر چلنا غیر ضروری سمجھتا ہے۔ ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان اردو کے ادب کی ہر صنف ڈراما۔ شاعری اور نثر نگاری وغیرہ میں ایک انقلاب بپا ہے۔ "خیبر" کے صفحات پر بھی ان "نئے ادبی رجحانات" کی ایک ہلکی سی جھلک ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے مضامین نگار حضرات میں سے

اکثر ابھی تک غزل نویسی کو شاعری کی معراج اور افسانہ نویسی
کو نثر نگاری کا منتہائے کمال خیال کرتے ہیں۔

ان کے مضامین میں افسردگی اور خیالات
میں کہنگی پائی جاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ
ہم حالات گرد و پیش کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے
ادب کا بھی نگاہ غور سے مطالعہ کریں۔ تاکہ ہماری معلومات
میں وسعت اور ذہن میں کشادگی پیدا ہو اور خیالات بوسیدہ
نہ رہیں۔ ہماری تحریریں نئی زندگی کا پیغام دیں۔ اور ہمارے
اشعار درخشندہ مستقبل کی طرف رہنمائی کریں۔

دارالعلوم اسلامیہ سرحد کو شمالی ہندوستان میں
ایک ممتاز تعلیمی ادارے کی حیثیت سے بہت بڑی اہمیت
حاصل ہے۔ یہاں افغان قوم کے غیور و جسور نوجوان تعلیم پاتے
ہیں۔ افغان قوم اپنی سپاہیانہ صلاحیتوں کے لئے مشہور
ہے۔ اس کی تلواروں کے کارنامے زبان زد خلائق ہیں۔
لیکن زمانہ ابھی انتظار میں ہے۔ کہ میدان علم میں بھی اسکے
قلم کے جوہر ظاہر ہوں۔ اور فنون لطیفہ میں بھی وہ ممتاز
درجہ حاصل کرے۔ یہ حقیقت کس قدر دلخراش ہے کہ تعلیم و
تمدن کے اس گہوارے میں دیگر فنون لطیفہ کا تو ذکر ہی کیا۔
اپنی ملکی زبان اور اپنے ادب کی طرف بھی بہت کم توجہ
دی جاتی ہے۔

اردو زبان کی بنیاد جن حالات میں پڑی اور اُسے
جن منازل سے گذرنا پڑا وُہ یقیناً حوصلہ افزا نہیں تھے۔
لیکن ان گوناگوں مشکلات کے باوجود اردو ادب نے
اس قدر ترقی کرلی ہے۔ کہ اب اس کا مٹنا محال ہے اب اردو
نہ فارسی اور عربی کی دست نگر ہے۔ اور نہ ہندی اُسے
نقصان پہنچا سکتی ہے۔ لیکن بلا مبالغہ یہ نوجوان ادیبوں
کی توجہ کی محتاج ضرور ہے۔ اور قوم کے افراد میں ادبی ذوق
کی کمی ہی ادب اور زبان کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اگر
اپنی زبان۔ ادب اور تہذیب کی ترقی کی خواہش ہے۔
تو تنگ خیالی اور فرقہ وارانہ جذبات سے بالاتر ہو کر
اپنے ادب اور اپنی زبان کی خدمت کیجئے۔

ہمارے پاس احاطۂ کالج میں رہنے والی ایک محترم
خاتون کا مضمون "عورت کی زندگی اسلامیہ کالج میں" کے عنوان
سے پہنچا ہے۔ ہم ان کی جرأت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔
اور ہماری دلی تمنا ہے کہ عورت کو ہماری سوسائٹی میں وُہ
درجہ حاصل ہو جائے جس کی وہ مستحق ہے۔ ورنہ ہماری
قومی ترقی کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکیگا۔

دارالعلوم کے اندر "مجلس السنۂ مشرقیہ" نے مشرقی
ادب کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ پچھلے دنوں اس کے
اراکین کی کوششوں سے "یوم اقبال" منایا گیا۔ جو
بے حد کامیاب رہا۔

اس سال اس کے مناظروں اور مشاعروں کا
معیار بھی کافی اونچا رہا۔ ہمیں خوشی ہے۔ کہ یہ مجلس بہترین
تقریروں اور نظموں کے لئے ہر سال کئی انعامات دیتی
ہے۔ اور اس کا ایک رکن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسے
"مرکز اردو" سے اردو تقریروں کے مقابلے میں انعام
حاصل کر لایا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ مجلس اپنی مساعی
جمیلہ کو جاری رکھے گی۔

ایم سعید

یقین و عمل

عدم سے ہستی میں آیا۔ کچھ نہ تھا۔ سب کچھ بنا۔ صفحۂ ہستی پر پہلی آواز جو مُنہ سے نکلی فریاد کا پہلو لئے ہوئی تھی۔ شاید جُدائی شاق گذری تھی۔ کیونکہ ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جُدائی ہا شکایت می کند

کچھ ایسی لوگی تھی کہ گتم عدم سے پردہ ظہور پر آتے ہی فراق یار میں بیقرار ہوگیا۔ جَب یار کا یہ عالم۔ اللہ اللہ کس قدر حیرت افزا تھا۔ تمام بواحقین فرحاں وشاداں۔ مگر اپنی حالت کباب سیخ۔ اس قدر وارفتگی کا صلہ یہ مِلا کہ افضل ترین مخلوق قرار پایا۔ خُدا گویا ہُوا کہ لقد خلقنا الانسان فی احسنِ تقویم۔

مگر دُنیا کچھ ایسا سراب تھی کہ یادِ یار بالکل جاتی رہی۔ دُنیا والوں کی اٹھکھیلیاں کچھ ایسی بھاگئیں کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اُن کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ طلسمِ سامری نے ایسا فسُوں پڑھا کہ آنکھیں پتھرا گئیں۔ آلائشوں کے شکنجہ میں جکڑا گیا کشتیٔ عمر منجدھار میں تھی۔ حالت غیر ہوئی تو احساسِ زیاں ہونے لگا۔ مگر ہائے اس نئہ دلچسپیاں کا پیٹیاں ہونا طلسم کو توڑنا بالفعل محال نظر آیا۔

کشتی کنارے لگانے کی خاطر مختلف ذرائع کی تلاش کی اپنی ذات کو فراموش کر دیا۔ گوہرِ آبدار کو خاک میں مِلا چکا تھا چنانچہ دوسروں کا دست نگر ہونے کی ٹھانی۔ کشتی ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ ہر گھڑی یہ خطرہ لاحق تھا کہ اب ڈوبی۔ امدادِ غائبانہ کے لئے ہر سو ملتجیانہ نگاہ دوڑائی۔ مگر بے سود معلوم ہُوا کہ کوئی کسی کا نہیں۔ کشتی بھنور میں مبتلا ہو کر ہچکولے کھانے لگی۔ تباہی کے آثار ہویدا تھے۔ لاچار تن بتقدیر بدست مپا ہو کر پڑ رہا۔ خیال تھا کہ ابھی تحت الثریٰ میں پہنچ جاؤنگا۔ لیکن شائد کچھ دن باقی تھے۔ ہاتف غیب سے ندا آئی ؎

اے کہ گوئی بودنی ایں بود شد
کارہا پابندِ آئیں بود شد
معنیٔ تقدیر کم فہمیدہ
نے خودی را نے خدا را دیدہٗ

مردِ مومن با خدا دارد نیاز
با تو ما سازیم و تو با ما بساز

یقین کر کے اُٹھا چپوؤں پر نظر پڑی تو کمر ہمت باندھی۔ خُدا خُدا کر کے کشتی بھنور سے نکلی۔ ہمہ تن اسے کھیتے میں مشغول ہوگیا۔ حیرت و استعجاب کی کوئی حد نہ رہی۔ جب صحیح وسالم کنارے جا لگا۔ اس لمحہ احساس ہُوا کہ ؎

از من بروں نیست منزل گہِ من

یقین محکم و عمل پیہم کا معجزہ دیکھ کر دُنیا کی ہر شے حقیر معلوم ہونے لگی۔

معلوم ہُوا کہ عملِ صالح اگر زادِ آخرت ہے تو توشۂ دُنیا بھی یہی ہے۔ بے عملی کی زندگی یقیناً مردِ مومن کے لئے موزوں نہیں۔ کیونکہ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

تدبیر دُرّانی

ایجاد

منظر۔ انگلینڈ کے ایک گاؤں میں پروفیسر کوری کی تجربہ گاہ ہے۔ دیواروں پر بڑے بڑے بموں اور ہوائی جہازوں کے نقشے آویزاں ہیں۔ پروفیسر ہنری کوری پچاس سال سے زائد عمر کے ہیں اور ایک تجربہ میں مشغول ہیں۔ اگر ان کی ڈاڑھی نہ ہوتی۔ تو اُن کے چہرے کے خد و خال اور بھی وحشت ناک شکل اختیار کر لیتے۔

اُن کے نزدیک انسانی زندگی کے مقابلہ میں چھوٹے سے چھوٹے تجربہ کی کامیابی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ وہ تجربہ میں محو ہوتے ہیں۔ کہ تجربہ گاہ کے دروازہ پر دستک ہوتی ہے۔ لیکن ان کو خبر نہیں ہوتی۔ دستک دوبارہ ہوتی ہے۔ لیکن اسی دوران میں ان کے تجربہ کا کامیاب اختتام ہوتا ہے۔ اور وہ مارے خوشی کے اُچھل رہے ہوتے ہیں۔ تیسری بار دستک ہونے پر بھی ان کو خبر نہیں ہوتی۔ آخری بار زور سے دستک ہونے کے بعد ملازمہ اندر آجاتی ہے۔

کوری۔ ہاں حنہ کیا بات ہے۔

حنہ۔ مسز میلڈن (پروفیسر کوری کی بہن ہے جس کا خاوند اور اکلوتا لڑکا گذشتہ جنگِ عظیم میں کام آچکے ہیں۔ اور وہ آج بھائی کی ملاقات کے لئے آئی ہوئی ہے) پوچھتی ہیں کیا آپ چائے پینے نیچے آئینگے یا چائے اوپر ہی لے آئیں۔

کوری۔ اچھا وُہ پہنچ چکی ہیں؟

خادمہ۔ جی ہاں۔ وُہ آپ کے لئے سٹیشن پر کافی انتظار کرتی رہیں۔ لیکن جب آپ اُن کو لینے کیلئے نہ پہنچے۔ تو وُہ خود ہی یہاں پہنچ گئیں۔

کوری۔ میرا خیال تو اسٹیشن پر جانے کا تھا۔ لیکن تجربہ کی مصروفیت میں یاد ہی نہ رہا۔ اچھا تو چائے اوپر ہی لے آؤ۔ اور اُن سے کہو کہ میں اپنے تجربہ میں کامیاب ہو گیا ہُوں۔ وُہ بہت ہی خوش ہونگی۔

خادمہ۔ حضور وُہ تو بہت غمگین سی معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کے اکلوتے لڑکے کی لڑائی میں مارے جانے کی یاد اُن کو ہر وقت ستاتی رہتی ہے۔

کوری۔ ہُوں میں تو آج بہت ہی خوشی محسوس کر رہا ہُوں۔ انسان کو ہر وقت ایسی اندوہ ناک باتوں ہی کا خیال نہیں رکھنا چاہئے۔ میری بہن کو ایڈی (مسز میلڈن کے بیٹے کا نام) کی موت کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے۔ زندوں کو ہر وقت مُردوں کو یاد نہیں کرتے رہنا چاہئے۔ وہ میری کامیابی پر خوش ہو جائیگی۔

خادمہ۔ میرا تو خیال ہے کہ وُہ زیادہ غمگین ہو جائیگی۔ خادمہ چائے لانے کو چلی جاتی ہے۔

کچھ وقفہ کے بعد مسز میلڈن جو کہ ایک چہل سالہ عورت ہے۔ سیاہ لباس میں ملبوس تجربہ گاہ میں داخل ہوتی ہے۔ اسکے چہرے سے سنجیدگی اور انتہائی غم کے آثار عیاں ہیں۔ کوری اُس سے سٹیشن پر نہ پہنچنے کی معذرت کرتا ہے اور کہتا ہے۔ کہ میں ایک تجربہ کرنے میں محو تھا۔ جس میں کہ کامیاب ہو گیا ہُوں۔ اور اب میں ایک مشہور و معروف سائنسدان

شمار کیا جاؤں گا۔ اور دولت و اعزاز مجھ پر نچھاور کئے جائینگے۔
مسز میلڈن۔ لیکن مجھے تو کوئی علم نہیں۔ کہ آپ کس تجربہ میں کامیاب ہوئے ہیں۔
کوری۔ ہاں۔ میں ایسی باتیں کسی کو نہیں بتایا کرتا لیکن آج میں تم کو کچھ بتا سکتا ہوں۔ پھر بھی میرے تجربہ کی ماہیت اس وقت تک کسی کو معلوم نہ ہو گی۔ جب تک کہ کوئی حکومت مجھے انعام و اکرام سے مالا مال نہ کر دے۔
مسز میلڈن۔ کسی حکومت کا آپکے تجربہ سے کیا کون سا تعلق ہو سکتا ہے۔
کوری۔ کیوں نہیں۔ پہلے تو میں حکومت برطانیہ کو اس سے آگاہ کرونگا۔ لیکن اگر مجھے کسی اچھے صلے کا وعدہ نہ ملا۔ تو پھر کسی اور حکومت کے ساتھ بات چیت کروں گا۔ جب وُہ میری ایجادوں کا حال سُنینگے تو خوشی سے آپے میں نہ رہینگے۔ کیونکہ یہ جنگ میں انکے لئے بہت کارآمد ثابت ہو گی۔
مسز میلڈن۔ پھر بھی آخر تم نے ایجاد کیا کی ہے؟
کوری۔ یہ ایک بہت دلچسپ اور مفید ایجاد ہے۔ (خادمہ چائے لاتی ہے۔ اور مسز میلڈن خادمہ کو پھولوں کا ہار لانے کو کہتی ہے۔ جسے وُہ آج اپنے بیٹے کے نام پر جنگ کی یادگار پر چڑھانے کے لئے لائی ہے) مسز میلڈن چائے بناتی ہے اور کوری کو پینے کو کہتی ہے۔ خادمہ ہار لیکر واپس آجاتی ہے۔ بہن بھائی کو ہار دکھاتی ہے۔ اور اُسکو یہ ہار یادگار پر چڑھانے کے لئے ساتھ چلنے کو کہتی ہے۔ لیکن اُسکو اس وقت اپنی ایجاد کی کامیابی۔ شہرت۔ اعزاز و اکرام ملنے کی اُمید کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا۔ رحم۔ انسانی غم و اندوہ کا احساس تک بھی اُس کو نہیں رہتا۔ اپنی ایجاد کا تذکرہ کرتے ہُوئے کہتا ہے۔ ہاں تو میری ایجاد طریقۂ جنگ میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دیگی۔

مسز میلڈن۔ (حیرانی سے) تو کیا آپ کی ایجاد جنگ کا خاتمہ کر دیگی (اسکو جنگ کے نام سے بھی نفرت ہے کیونکہ جنگ لاکھوں نوجوانوں کی موت کا باعث بنتی ہے۔ ہزاروں عورتوں کو بے سہارا بنا دیتی ہے۔ بے شمار خاندانوں کو برباد کر دیتی ہے۔ اور سینکڑوں شہروں کو نیست و نابود کر دیتی ہے اُس کو ہر اُس چیز سے جو جنگ میں ممد ثابت ہو نفرت ہے) جنگ تو جوانوں کا منظم قتل عام ہے۔ "میں جنگ میں اپنا اکلوتا لڑکا کھو چکی ہوں۔ میرا خاوند اُس کے غم میں مر چکا ہے۔ اور اب میں اکیلی دُنیا کے مصائب جھیلنے کو جی رہی ہوں۔
کوری۔ گو تمہارا لڑکا جنگ میں مارا جا چکا ہے لیکن تم دُنیا میں اکیلی تو نہیں رہ گئیں۔ تمہارا بھائی تو موجود ہے۔
مسز میلڈن۔ لیکن تم بھائی ہو۔ بیٹے کی جگہ نہیں لے سکتے۔
کوری۔ اچھا سنو میں تم کو اپنی ایجاد کی کیفیت سُناتا ہُوں غم کو دُور کرو۔ ہاں تو موجودہ جنگ (پچھلی جنگ عظیم سے مراد ہے) چار پانچ سال تک جاری رہی حالانکہ اس کو چار پانچ ہفتہ سے زائد نہیں چلنا چاہئے تھا یعنی متخاصمین کو ایسے اسلحہ استعمال کرنے چاہئیں جو پہلے ہی حملہ میں مخالف کو تباہ کر دیں۔ تاکہ اس میں جواب کی طاقت ہی نہ رہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنگ کے ہتھیار بہت زیادہ تباہ کن ہونے چاہئیں۔
مسز میلڈن۔ تو کیا ایسا ہو سکتا ہے۔
کوری۔ ہاں کیوں نہیں ہو سکتا۔ ابھی تو جنگ میں بہت کم خطرناک ہتھیار استعمال میں لائے گئے ہیں۔
مسز میلڈن۔ کو اپنا بیٹا یاد آجاتا ہے۔ اور

وُہ "ایڈی" "ایڈی" پکارتی ہے۔ غم والم کے آثار اسکے
چہرے پر ہویدا ہوتے ہیں۔ اور وہ بہت پریشان نظر آتی ہے۔

کوری۔ بہن تم کو چاہیئے کہ دُنیا کو سیاستدانوں
کی طرح وسیع نقطۂ نظر سے دیکھو۔

مسز میلڈن۔ ایڈی اگر سیاستدان ہوتا۔ تو
خود مزے سے گھر میں بیٹھا رہتا اور دوسروں کو جنگ کی آگ
کا ایندھن بناتا۔ مجھے قبل ازیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ایڈی کی
موت کس طرح واقع ہوئی ہے لیکن آج مجھے اس کی رجمنٹ کا
ایک نوجوان ملا۔ اور اُس نے حقیقت بتائی ہے کہ اُس کے
جسم کا ایک ٹکڑا تک بھی نہ بچا تھا۔ کہ جس کو سپرد خاک کیا
جاتا کیونکہ ایک بم اس کو لگ کر پھٹا اور اُس کے جسم کے ٹکڑے
ریزہ ریزہ ہو کر خاکی ذرات کے ساتھ جا ملے۔ کیا یہ افسوسناک
موت نہیں۔ اور کیا اس موت کی ذمہ داری تم جیسے انسانوں
پر نہیں ہے۔ جو آلات جنگ کو اور بھی زیادہ خطرناک بنانے
کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں۔ اور کامیابی پر خوشی کا اظہار
کرتے ہیں۔

سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے۔ بھائی سے پھر اسکی
ایجاد کے متعلق سوال کرتی ہے۔

کوری۔ اچھا ہوتا کہ تم مجھے اس وقت بتلانے کو نہ کہتیں
لیکن بات یہ ہے کہ جنگ کبھی بھی ہمیشہ کے لئے نہیں مٹ
سکتی۔ لہذا اس کو اس قدر خوفناک بنایا جائے کہ یا تو بالکل
ہو نہیں اور اگر ہو تو جلد ختم ہو جائے۔ اس لئے ضروری
ہے کہ ہتھیار زیادہ خطرناک ہوں۔ مَیں ایک خطرناک بم
ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میرے اس ایک بم
کے پھٹنے سے ہزاروں جانیں۔ بلکہ ایک بڑا شہر کا شہر
تباہ کیا جا سکیگا۔ (مسز میلڈن اپنے آپ سے۔ ہزاروں
جانیں تباہ۔ ایڈی کی طرح کئی نوجوان پُرزہ پُرزہ ہونگے۔
بے گناہ بچے۔ شہری لوگ اور عورتیں سب مرینگے) کیونکہ اگر
ہماری قوم اور حکومت کو اپنی طاقت و عزت قائم رکھنی ہے
تو اس کو آئیندہ جنگ جو کہ بیس پچیس سال کے عرصہ میں
ہونیوالی ہے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اس وقت میرا
نو ایجاد بم بڑے بڑے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے دشمن
کے شہروں پر گرایا جا سکیگا۔ اس سے شہروں کے شہر بلکہ
ساری مخالف قوم کو نیست و نابود کیا جا سکیگا۔ کیونکہ اس
بم کے پھٹنے سے ایک ایسی بے رنگ و بو گیس نکل کر اطراف
میں پھیل جائیگی۔ جو ہر ذی رُوح کو ابدی نیند سُلا
دیگی۔ میرا اندازہ ہے۔ کہ مانچسٹر جتنے بڑے شہر کو تباہ کرنے
کے لئے میرا ایک بم کافی ہوگا۔

مسز میلڈن۔ اس سے تو بچے۔ بوڑھے مرد
عورتیں سب ماری جائینگی۔

کوری۔ ہاں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں آجکل
جنگ میں شہری اور سپاہی میں کوئی فرق نہیں عورت اور
مرد سب جنگ میں حصّہ لیتے ہیں۔ ایک لڑکی جو شہر کے
کارخانوں میں بارود تیار کرتی ہے۔ اور ایک سپاہی
جو اسکو استعمال کرتا ہے۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے۔
دُنیا میں مَیں ہی ایسے زبردست بم کا موجد ہوا ہوں۔

مسز میلڈن۔ تو کیا اور ممالک میں تم جیسے
سائنسدان نہیں۔ اور کیا وُہ ایسی ہی چیزیں معلوم کرنے
میں لگے ہوئے نہیں

کوری۔ ہونگے لیکن مجھے یقین نہیں کہ کوئی بھی
ایسی چیز دریافت کر سکا ہو۔ اور اگر مَیں یہ بم ۱۹۱۴ء میں
تیار کر لیتا۔ تو اب تک کوئی جرمن باقی نہ رہ گیا ہوتا۔

مسز میلڈن۔ میرا خیال ہے کہ وُہ بھی تم جیسا
بے درد انسان ہوگا۔ جس نے وُہ بم بنایا ہوگا جس سے

میرا بیٹا مرا ہے۔ کیا ہی عجیب بات ہے کہ بھائی تو کتنی چالاک اور سمجھدار طبیعت کا انسان ہے اور میں تمہاری بہن ایک معمولی عورت ہوں۔ کہ جس کی زندگی میں سوائے عزیز بیٹے اور شوہر کی محبت اور یاد کے اور کچھ ہے ہی نہیں اور جب میں تم کو یہ کہتے سنتی ہوں کہ اپنے عزیز بیٹے کی موت پر سیاست دانوں جیسی وسیع نظر ڈالوں تو سمجھتی ہوں۔ کہ تم بے وقوف۔ نااہل۔ بے حس اور جذبۂ الفت و انسانیت سے مبرا انسان ہو۔ . . نہیں! ۔ بلکہ ۔ حیوان ہو۔ اور جب تم مجھے خوش ہونے کے لئے کہتے ہو۔ کہ تم نے ایک ایجاد کر لی ہے۔ اور وہ ایک ایسا بم ہے ۔ جو سارے کے سارے شہر کو شہریوں سمیت خاکستر کر دے۔ تو میں تم کو پاگل نہیں بلکہ شیطان سمجھتی ہوں۔ کوری تم ایڈی کو اس نقطۂ نظر سے دیکھو۔ جیسا کہ میں دیکھتی ہوں۔ جیسا کہ کوئی ماں اپنے بیٹے کو طفولیت سے جوان ہونے تک دیکھتی ہے۔ اور خوش ہوتی ہے اور پھر اس جذبہ سے دیکھو کہ جب وہی ماں اپنے نوجوان بیٹے کو عین عالم جوانی میں خطرناک موت کے بعد یاد کرتی ہے۔ (پھر وہ اپنی شادی کے وقت سے لیکر ایڈی کی پیدائش اور بڑے ہونے تک کے حالات دہراتی ہے) ایڈی افسر بھرتی ہو کر گھر سے فرانس تک دشمن کے مقابلہ کو جاتا ہے۔ پھر ایک دفعہ چھٹی پر گھر واپس آتا ہے۔ پھر واپس لڑائی کو جاتا ہے۔ لیکن میرا دل مطمئن ہوتا ہے۔ میرے دل میں اُس کی موت کا گمان تک بھی نہیں آتا۔ لیکن ایک ہی ہفتہ بعد وہ مارا جاتا ہے۔ اور میری محبت اور اُمیدیں اور خواہشات جو کہ اُسکی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی تھیں۔ اُسی کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہیں۔ اور پھر بھی تم مجھے چیزوں کو وسیع نقطہ نظر سے دیکھنے کو کہتے ہو۔

کوری۔ تم بہت غمگین ہو۔ لیکن ایڈی نے اپنے ملک کی خاطر جان دی ہے۔ اُس نے کئی جرمنوں کو مارا ہو گا۔

مسز میلڈن۔ مجھے ہرگز ہرگز اس بات سے کوئی خوشی یا تسلی نہیں ہوتی۔ کہ اُس نے کئی جرمنوں کو مار کر میری جیسی عورتوں کو بیوہ یا میری جیسی ماؤں کو اپنے عزیز بیٹوں سے محروم کیا ہو گا۔ بلکہ میں چاہتی ہوں کہ میں اُن اپنی جیسی غمزدہ عورتوں کے ساتھ مل کر خواہ وُہ جرمن ہوں یا کسی اور مُلک کی ہوں۔ تم جیسے انسانوں سے انتقام لوں۔ ۔ جو عورتوں کی مصیبت و غم کا باعث بنتے ہیں۔

کوری۔ تُم سے تو مجھ کو اُمید نہیں رہی کہ میرے کام کی داد دے سکو۔ البتہ مجھے اُمید ہے۔ کہ میرے ہم وطن، اگر اُن میں کچھ بھی عقل ہو۔ تو وُہ میری قدر کرینگے اور میرے بم کی شہرت کی وجہ سے میرا نام مُلک کے ہر انسان کی زبان پر ہو گا۔ اور لوگ ملز بم کی طرح اب کوری بم کو یاد کرینگے۔ میں حکومت سے اپنے بم کے بدلہ میں ایک گرانقدر رقم لونگا بہن سے پوچھتا ہے۔ اچھا مجھے کیا مانگنا چاہئے اگر تم میری جگہ ہوتیں۔ تو کیا مانگتیں۔

مسز میلڈن۔ میں ایڈی۔ اپنا بیٹا مانگتی۔

کوری۔ پھر وہی بات ہے۔ بہن تم کو ماضی کا خیال نہیں کرنا چاہئے۔ اپنے مستقبل کو دیکھنا چاہئے تم نے تو میری ایجاد پر مبارک باد ہی نہیں دی۔ ہر وقت غم کرنے سے کیا فائدہ۔ دُنیا میں اور کام بھی تو کرنے ہوتے ہیں۔

مسز میلڈن۔ ہاں جو تمہارا خوفناک بم کریگا بچوں۔ عورتوں اور نوجوان کا خون کریگا۔ لاتعداد شہر

ناشہیر۔

کوری۔ جنگ کا مطلب مارنا ہے۔ اور فریقین میں سے جو بھی زیادہ آدمی کم عرصہ میں ماریگا۔ وُہ آنیوالی جنگ جیتنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور میرا بم ایسی جنگ جیتنے میں یقیناً کارآمد ثابت ہوگا۔ اور کوئی سمجھدار انسان اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ کہ میں نے ایسا بم بنا کر ملک اور قوم کی کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

مسز میلڈن۔ تو کیا تمہارے سوا کسی اور کو تمہارے بم کے اجزا کی حقیقت معلوم نہیں۔

کوری۔ (خوشی سے) نہیں نہیں۔ صرف مجھے۔

مسز میلڈن۔ کیا اچھا ہو کہ تم اپنی ایجاد کو عملی جامہ نہ پہناؤ۔ تو ایڈی جیسے کتنے نوجوان بے خوف و خطر زندگی خوشی سے گذار سکیں۔ اور لوگوں کو اس کا علم ہو۔ تو اُن کے دلوں میں تمہارے متعلق کس قدر اچھے جذبات پیدا ہونگے۔ کہ تم جنگ کی وحشت کو کس قدر کم کر رہے ہو۔

کوری۔ اس بات سے ممکن ہے کہ چند کم عقل لوگ مجھ سے خوش ہوں۔ لیکن سب عقلمند لوگ تو مجھے بیوقوف تصور کرینگے۔

مسز میلڈن۔ میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ تم اپنی ایجاد کو تباہ کردو۔ کیونکہ تمہارے بم سے لوگوں کی زندگیاں تباہ ہونگی۔ میں دوبارہ درخواست کرتی ہوں۔"

لیکن کوری ٹس سے مس بھی نہیں ہوتا۔ مسز میلڈن تجربہ والی میز کے قریب آجاتی ہے۔ اور تمام اشیاء کو جو کہ میز پر پڑی ہیں توڑ پھوڑ دیتی ہیں۔ کوری ہراساں ہو کر کہتا ہے۔ تم نے کیا کیا ہے۔ محض فرش کو خراب کر دیا ہے۔ فرش کو صاف کرنے کے لئے بہن سے کپڑا مانگتا ہے۔ وہ پریشانی کی حالت میں دوسری میز پر سے کپڑا اٹھانے جاتی ہے۔ تو اس کو ایک بہت بڑا سا چاقو نظر آتا ہے۔ ادھر کوری اس کو پھولوں کا ہار دکھاتا ہے۔ جو آج اُسے جنگ کی یادگار پریڈ کے نام سے چڑھانا ہے۔

مسز میلڈن۔ چاقو ہاتھ میں لئے اس کے نزدیک آتی ہے۔ اور پھر اس سے کہتی ہے۔ کہ اگر تم اپنی ایجاد کو تباہ کرنے کا ارادہ کر لیتے۔ تو تمہاری نذر پھولوں کے ہار سے کئی درجہ بہتر ثابت ہوتی۔

کوری۔ (غصے میں) کہتا ہے کہ میں ہرگز ہرگز تمہارے فضول خیالات سے متاثر ہو کر اپنی ایجاد کو تباہ کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ اور اس سے کپڑا چھین کر میز کو فرش کو صاف کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ لیکن بہن کے دوسرے ہاتھ میں چاقو پر اس کی نظر نہیں پڑتی۔ مسز میلڈن آخری بار اپنی التجا دُہراتی ہے لیکن جواب نفی میں پاکر چاقو اُس کی جھکی ہوئی کمر میں گھونپ دیتی ہے۔

(محبت مادری۔ اور نوجوان بیٹے کی موت اُس کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ بعض لوگ یہ کہینگے۔ نہیں نہیں بیٹے کی موت غالب آجاتی ہے۔ کئی اور یہ کہینگے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک حساس دل رکھنے والی انسانیت کا نمونہ ایک عورت ہے۔ اور وُہ ان لوگوں سے ان خطرناک آلات جنگ کے موجدوں سے خواہ وُہ اس کے بھائی ہی کیوں نہ ہوں انتقام لینے پر تیار ہو جاتی ہے۔ جو انسانی زندگی کو اپنی شہرت اور عزت پر قربان کرنے کے لئے تلے ہوئے ہیں۔ صرف یہ سبق اس کو اپنے بیٹے کی موت پڑھاتی ہے)

کوری تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ پھولوں کا ہار اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور وُہ بھائی کی لاش کو دیکھ

دیکھ کر چیخ رہی ہوتی ہے۔
ایڈمی - ایڈمی - پیارے ایڈمی - میں مجبور تھی۔

(ترجمہ)
محمد شریف سندھی

معمّا

"میں کہتی ہوں عورت کی فطرت ایک راز ہے ایک معما ہے۔ آپ اس کو نہیں سمجھ سکے۔ آپ عورت کو فریبی مکار اور دھوکہ باز کہہ کر اس کی تذلیل کر رہے ہیں۔" یہ فقرے وہ الفاظ جو شاہدہ ہاسٹل میں میرے کرہ میں مجھ سے کہہ رہی تھی۔

میں نے جوابدیا "نہیں شاہدہ تم غلطی پر ہو مگر مجھے آجتک کسی عورت سے واسطہ نہیں پڑا۔ پھر بھی میں اپنے ان خیالات پر چٹان کی طرح مضبوطی سے قائم ہوں۔ اور رہوں گا۔ تمہاری بحث مجھے ان خیالات سے ہٹا نہ سکیگی۔"

"دیکھئے شاہد صاحب آپ نے انعامی مقابلہ میں عورت کے خلاف تقریر کر کے پہلا انعام تو حاصل کر لیا ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کے خیالات درست بھی ہوں بہرحال جو کچھ بھی ہو میں پھر بھی یہی کہونگی۔ کہ عورت ایک معما ہے۔ اُسے سمجھنا آسان نہیں ہے۔ ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ اچھا تو اب شام ہونے کو ہے۔ مجھے اجازت دیجئے۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" میں سگرٹ سلگا کر خود بخود بڑبڑانے لگا۔ "معما۔ ہوں۔ کیا خوب معما۔" شاہدہ ایف۔ اے کے دوسرے سال میں پڑھتی تھی۔ اور میں بی۔ اے کے پہلے سال میں میری بات چیت شاہدہ سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ گفتگو کا پہلا موقعہ تھا۔ دو ماہ بعد کالج میں موسم گرما کی رخصتیں ہوگئیں۔ اور سب طالبعلم اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

(۲)

گھر پہنچ کر میرا کوئی خاص کام تو تھا نہیں۔ وقتاً فوقتاً فلسفہ یا نفسیات کی کوئی کتاب اُٹھا کر پڑھ لیتا تھا۔ ایک روز یونہی مطالعے میں مشغول تھا۔ کہ ڈاکئے نے سبز رنگ کا ایک لفافہ لادیا۔ طرز تحریر نا آشناسی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا"

پیارے شاہد!

میری اور آپ کی ایک ہی ملاقات ہوئی ہے۔ لیکن اُسی روز سے میں سینے میں ایک ناقابلِ فہم سی خلش محسوس کر رہی ہوں۔ میرے والدین کا متفقہ فیصلہ ہے۔ کہ میں سلسلۂ تعلیم منقطع کر دوں۔ ہو سکے تو کبھی کبھی مجھے خط لکھ دیا کیجئے۔"

فقط آپکی ..... شاہدہ

"شاہدہ" یہ لفظ غیرارادی طور پر میری زبان پر آگیا۔ اور لفافہ میرے ہاتھ سے میز پر گر پڑا۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ حواس بجا ہوئے تو شاہدہ کے متعلق سوچنے لگا۔ وہ ہمارے کالج کی حسین ترین لڑکی تھی اسکے والدین کے متعلق مجھے کچھ علم نہ تھا۔ وہ حسین تھی اور بے حد شوخ و شریر۔ ہر ایک سے کسی نہ کسی

چھوٹے بھائی لڑکے کو "احمق" بنانا گویا اس کی عادت
میں داخل تھا۔ اور شرارتیں بھی کرتی تو ایسی انوکھی کہ
جی چاہتا کہ ایکبار جو سنیں تو ہنستے ہی رہیں۔ شاہدہ
کا رنگ روپ۔ قدوقامت سب لاجواب تھے۔
مجھے شبہ ہوا کہ وُہ شاید مجھے بھی اپنی شرارتوں کا تختۂ مشق
بنانا چاہتی ہے۔ چنانچہ مَیں نے اُسے جواب نہ دینے کا
قطعی فیصلہ کر لیا۔ ایک ہفتے کے بعد اس کا دُوسرا
خط آیا۔

"پیارے شاہد!
شاید آپ کا اب تک وہی خیال ہے کہ عورت
مکار اور فریبی ہوتی ہے۔ اس سے بچکر رہنا چاہئے لیکن
یقین رکھئے کہ میں کبھی دھوکا نہ دُونگی۔ عمر بھر آپ کی
یاد میں محو رہونگی۔
جواب کی منتظر:۔ آپ کی شاہدہ"

کسی نامعلوم خیال یا جذبہ کے ماتحت مَیں نے
اسے یہ جواب لکھا۔

"میری شاہدہ!
لکھنے کو تو مَیں لکھ گیا ہوں "میری شاہدہ" یقین
نہیں آتا کہ واقعی تم میری ہو۔ تمہاری شوخیوں سے واقف
ہونے کے باوجود مجھے تمہارے خط سے اخلاص کی " آ رہی ہے
دل کو دل سے راہ ہے" "اک آگ سی ہو سینے کے اندر لگی
ہُوئی" اگر اسی کا نام محبت ہے۔ تو مجھے بھی تم سے محبت
ہے لیکن عورت ذات کے متعلق میرا نظریہ ابھی نہیں
بدلا۔ میری خواہش اور دُعا ہے۔ کہ تم دیگر عورتوں
سے مختلف ہوگی۔ اور تمہاری محبت میں اتنا ہی اخلاص
ہوگا۔ جتنا میری محبت میں ہے۔ مَیں کسی وقت اور کسی
حالت میں بھی تم کو فراموش نہیں کر سکتا گیا ہی اچھا ہوتا
کہ تم تعلیم جاری رکھ سکتیں۔
مجبورِ محبت:۔ تمہارا شاہد"

اس کے بعد شاہدہ کے کئی خطوط آئے اور میں بھی جواب
باقاعدہ بھیجتا رہا۔ پھر کالج کھلنے کے دن آ گئے اور مَیں چونکہ
بی۔ اے کے پہلے سال سے کامیاب ہو چکا تھا۔ اس لئے
دوسرے سال میں داخل ہو کر پڑھائی میں مصروف ہوگیا۔

(۳)

مہینے۔ دو تین آخر پانچ ماہ گذر گئے۔ اور ہمارے امتحان
میں تقریباً دو ماہ باقی رہ گئے۔ ایک دن دوپہر کو میں جب
کالج سے واپس آیا۔ تو اپنے کمرے میں ایک خط پڑا پایا۔
والد صاحب نے لکھا تھا۔ کہ خوب دل لگا کر پڑھو اور
امتحان میں کامیابی حاصل کرو۔ گرمیوں میں تمہاری
شادی کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ منگنی ہو چکی ہے میرے
پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ شاہدہ کا کیا خیال ہوگا۔
مَیں تو عورتوں کو مکار اور فریبی کہا کرتا تھا۔ لیکن اب
تو مَیں خود دغا باز اور بے وفا ثابت ہو رہا تھا۔ تمام
دن انہی خیالات میں گذر گیا۔ دُوسری صبح مَیں نے
والد کو خط لکھا۔

"والد بزرگوارم۔
کیا میں لڑکی۔ اُس کے خاندان اور والدین کی
بابت کچھ استفسار کر سکتا ہوں۔ آخر شادی تو میری
ہونے والی ہے۔ مجھے بھی تو معلوم ہونا چاہئے کہ لڑکی کون ہے
کم از کم منگنی کرنے سے پیشتر آپ مجھ سے رائے تو دریافت
کر لیتے۔

فرمانبردار۔ شاہد"

دو روز بعد مجھے ایک خط ملا

"میرے شاہد۔

میری منگنی ہو چکی ہے۔ جلد ہی میری شادی بھی ہو جائیگی۔ منگنی ہو چکنے کے بعد کسی غیر کو خط لکھنا دُرست نہیں۔ لہٰذا اسے میرا آخری خط سمجھئے۔

شاہدہ"

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ مجھے خوشی بھی ہوئی اور رنج بھی۔ خوشی اس لئے کہ مَیں عورت کو مکار سمجھتا تھا اور میرا خیال صحیح ثابت ہوا اور رنج اسلئے کہ مَیں شاہدہ جیسی محبوبہ کو کھو بیٹھا۔ اور سچ پوچھئے تو خوشی سے رنج زیادہ تھا۔ مَیں پریشان تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ "قہر درویش برجان درویش"۔ تین روز بعد مجھے والد کا خط ملا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ "تمہیں لڑکی اور اُسکے والدین کے متعلق کوئی بات دریافت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ تمہارے لئے یہی کافی ہے کہ لڑکی تعلیمیافتہ ہے اور خاندان اچھا ہے۔ مَیں تمہیں آگ میں نہیں دھکیل رہا۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ تمہاری بھلائی کے لئے کر رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ تم ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح میرے احکام کی تعمیل کرو گے۔"

یہ پڑھ کر گویا میرے صبر و سکون پر بجلی گر پڑی۔ خیالات کا ایک طوفان تھا۔ جو اُمنڈ اُمنڈ کر مجھے زندگی سے مایوس کر رہا تھا۔ مَیں حیران تھا کہ فرمانبرداری کا ثبوت دُوں یا محبت میں ثابت قدمی کا۔ مَیں رات دن بےچین رہنے لگ گیا۔ کئی بار یہ بھی سوچا کہ شاہدہ کو خط لکھ کر یاد دلا دُوں کہ فی الواقع عورت مکار ہوتی ہے۔ پھر سوچتا جب اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ اور وُہ منگنی کے بعد کسی غیر مرد کو خط لکھنا دُرست نہیں سمجھتی تو آخر میری بھی تو منگنی ہو چکی ہے۔ مَیں کسی غیر عورت کو خط لکھنا کیوں جائز خیال کروں۔ ہوتے ہوتے امتحان سر پر آ پہنچا۔ اور مَیں امتحان دے کر گھر کو روانہ ہوگیا۔

(۴)

گھر آکر میں اُداس سا رہنے لگا۔ نہ مطالعہ میں جی لگتا تھا۔ نہ سیر و تفریح میں۔ آخر کار میں نے والد صاحب سے ایک ماہ شملہ میں گذارنے کی اجازت حاصل کی اور گاڑی میں سوار ہوگیا۔ انبالہ سٹیشن کے پلیٹ فارم پر پھرتے ہوئے اچانک ایک سیکنڈ کلاس کے زنانہ ڈبہ کے آگے پڑے ہوئے ایک سُوٹ کیس سے ٹھوکر لگی۔ مَیں گرتے گرتے بچ گیا۔ سُوٹ کیس پر خوبصورت الفاظ میں لکھا تھا۔ "شاہدہ"۔ یہ نام پڑھتے ہی "شاہدہ" کا لفظ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔ زنانہ ڈبہ کی کھڑکی میں سے مجھے اسی مکار اور دھوکہ باز "شاہدہ" کی صورت نظر آئی جس نے میری اُمیدوں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ شاہدہ نے جلدی سے چہرہ برقعہ میں چھپا لیا۔ مَیں اُس سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایک شخص نے یہ کہہ کر مجھے چونکا دیا۔ "ذرا علیحدہ رہئے۔ سامان اٹھوانا ہے" غالباً وُہ شاہدہ کا نوکر تھا۔ لیکن اُس کے خوش قسمت رفیقِ حیات کی شکل نظر نہ آئی۔ تھوڑی دیر بعد شاہدہ بھی ڈبہ سے نیچے اُتری۔ اور نوکر کے ہمراہ سٹیشن سے باہر نکل گئی۔ مَیں کھڑا سوچ رہا تھا۔ کہ منگنی کا تو لکھا تھا۔ اب شادی بھی کر چکی ہوگی۔ اُس کی مسکراہٹ سے مجھے یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کا شریک حیات اسے راحت و آرام سے رکھتا ہوگا۔ آخر آرام سے رکھتا بھی کیوں نہیں۔ شاہدہ بھی تو تھی۔ لاکھوں میں ایک......

دفعتاً انجن نے سیٹی بجائی اور مَیں اپنے کمرے میں داخل ہو کر لیٹ رہا۔ میرے لئے شملہ کے قدرتی مناظر کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے۔ مَیں اپنے ساتھ جو کچھ لایا تھا۔ اُس سے

صرف ایک ہی تصویر کھینچی تھی۔ اور وُہ بھی ایک درخت کے بالائی حصّے کی جس پر ایک طائر مغموم حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ تصویر کھینچ کر مَیں نے اس کے نیچے لکھ دیا "تنہائی"۔

ادھر ہمارا نتیجہ بھی نکل آیا۔ اور مَیں امتحان میں کامیاب ہوگیا۔ والد کے حکم کے مطابق ان کو نتیجہ کی بذریعہ تار اطلاع دی۔ اور وُہ سے ہی روز گھر کو روانہ ہوگیا۔

(۵)

میری شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ لیکن مَیں افسردہ سا رہنے لگا۔ مَیں دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ والدین کی فرمانبرداری کا ثبوت ضرور دُونگا۔ چاہے اُس میں میری زندگی ہمیشہ کے لئے تلخ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ شادی کا دن آیا اور رسم ادا ہوگئی۔

(۶)

کمرۂ عروسی بُقعہ نُور بنا ہُوا تھا۔ ہر طرف خوشبو ہی خوشبو تھی۔ آتے ہی فرطِ یاس و حسرت کی وجہ سے اپنا سر ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔ دُلہن دبکی دبکائی ایک کونے میں بیٹھی ہُوئی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ یہی حالت رہی۔ وُہ آہستہ آہستہ اٹھی۔ میز کے قریب آئی۔ کاغذ پر کچھ لکھا۔ اور کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ لیکن گھونگھٹ نہ ہٹایا۔ مَیں نے پڑھا لکھا تھا "سرکار کیوں مجھ سے خفا ہیں۔ مَیں گونگی جو ہُوں تو کیا بُرا ہُوا۔ مَیں آپ کی ہر خدمت بجا بھی سرانجام دُونگی"۔

"اُف میرے خدا میری شریکِ حیات گونگی ہے۔ والد صاحب تو کہتے تھے۔ مَیں تمہیں آگ میں نہ دھکیلونگا۔ مَیں جو کرونگا تمہاری بہتری کے لئے کرونگا۔ کیا اسی میں میری بھلائی ہے.... کہتے تھے۔ لڑکی تعلیم یافتہ ہے! تعلیم کا کیا فائدہ وہ بول نہیں سکتی۔ اُسے جو کہنا ہوگا۔ رقعے کے لکھ کر بتائیگی۔ اور جو مجھے کہنا ہوگا۔ رقعہ لکھ لکھ کر بتاؤں گا..... مگر نہیں۔ یہ گونگی تو ہے۔ پر شاید بہری تو نہ ہوگی"۔ میرے احساسات کو یُوں ٹھیس لگ چکی تھی۔ مَیں غصّے میں کھڑا ہوگیا۔ اور غصّہ بھری آواز میں کہنے لگا "او لڑکی تو گونگی ہے۔ کہیں بہری یا اندھی تو نہیں"۔ اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مَیں کہنے لگا "اچھا تو غور سے سُن۔ عورت مکار۔ فریبی۔ دھوکہ باز ہوتی ہے۔ میری شادی میری مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔ میں ایک لڑکی شاہدہ سے محبت کرتا ہُوں۔ لیکن اُس نے مجھے دھوکہ دیا۔ مجھے عورت ذات سے نفرت ہے۔ تم گھر میں شریف زادیوں کی طرح ہمیشہ اپنا کام سرانجام دیتے رہا کرنا۔ اگر مجھے کبھی شاہدہ مِل گئی۔ اسے وہ سبق دُوں گا کہ یاد رکھے گی"۔

"ابھی دے دیجئے"۔ ایک ہلکی سی آواز سُنائی دی۔ غصّہ میں تو مَیں تھا ہی۔ مَیں نے سمجھا کہ دُلہن کی کوئی سہیلی باہر سے جواب دے رہی ہے۔ مَیں نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ "کون ہے۔ سامنے آجاؤ"۔ اور پستول نکال کر کھڑا ہوگیا۔ اور کہا "پھر مداخلت کروگی۔ تو گولی سے اُڑا دونگا"۔

"پیارے شاہد۔ حوصلہ سے کام لو۔ عورت ایک معمّا ہے۔ شونپہار کہہ گیا ہے۔ اس کے متعلق رائے قائم کرنے میں جلدی سے کام نہ لو"۔ یہ کیا یہ آواز تو شاہدہ کی تھی۔ مَیں نے مُڑ کر دیکھا تو دُلہن کے چہرے کو سامنے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ مَیں نے بے ساختہ کہا۔ "پیاری شاہدہ تم! کیا میری آنکھیں مجھے دھوکہ تو نہیں دے رہیں۔ واقعی عورت ایک معمّا ہے۔ مَیں ہار گیا۔ لیکن اس ہار میں بھی میری جیت ہے۔ تمہیں تو پالیا"۔

قاضی الٰہ بخش۔ سال چہارم

ناکام آرزو

نتیجہ شائع ہوا۔ سعید انٹرنس کے امتحان میں اوّل درجے میں پاس ہوگیا۔ اس کے غریب والدین کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ناامیدی کی تاریکی میں اُمید کی ایک ہلکی سی جھلک نمودار ہوئی۔ سعید کی اپنی خواہش اور دوستوں کے اصرار کی وجہ سے سعید کے والد نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیجنا منظور کرلیا۔ کالج اور کتابوں کے اخراجات کا کس طرح انتظام کیا گیا۔ سعید اس سے لاعلم تھا۔ مگر جب وہ کالج میں داخل ہونے کے لئے پشاور روانہ ہونے لگا۔ تو اُس کی والدہ نے یہ ضرور کہا "بیٹا سعید خوب جی لگا کر پڑھنا۔ اور دوسروں کے محلات کو دیکھ کر اپنی جھونپڑی کو آگ لگانے کی کوشش نہ کرنا۔" اور سعید نے اپنی والدہ کی نصیحت کے مطابق عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ اور روانہ ہوگیا۔

کالج کے دوسروں لڑکوں کے امیرانہ ٹھاٹ۔ انگریزی لباس اور تقریباً مغربی وضع قطع کو دیکھ کر سعید بھلا کب تک صحرا میں ایک اونٹ کی طرح زندگی بسر کرتا۔ باپ کو تاکیدی خط لکھے۔ والد نے روپیہ قرض لے کر اُسے سُوٹ بنوا دیئے۔ سائیکل لے دی۔ فونٹین پن خرید دیا۔

کالج والوں کو سینما بینی۔ تاش۔ ریڈیو اور گپیں ہانکنے سے کب فرصت ملتی ہے کہ پڑھنے کے لئے وقت نکال سکیں۔ اور سعید بھی کالجیٹ ہونے کی حیثیت سے اب انہی خوبیوں کا حامل ہوگیا تھا۔ سعید کو کالج میں داخل ہوئے دو سال کا عرصہ ہوگیا۔ اور ایف اے کا سالانہ امتحان سر پر آگیا۔ سعید امتحان کے لئے تیار تو نہ تھا۔ مگر بیٹھ گیا۔

نتیجہ نکلا۔ سعید پاس تو ہوگیا۔ مگر انٹرنس کی طرح درجہ اوّل میں نہیں۔ بلکہ تیسرے درجہ میں۔ والد نے سُنا۔ اور اُس صدمے سے اُس کے دل پر ایک چرکہ سا لگا۔ اور اُس چرکے نے اُس کے ساتھ وہی سلوک کیا۔ جو ہوا کا جھونکا چراغ کی لَو کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ کالج میں سعید کو تار ملا۔ کہ دفعتاً حرکتِ دل کے بند ہو جانے کی وجہ سے اُس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ تار پڑھ کر سعید کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا گھر روانہ ہوگیا۔

سعید کے والد تنگدستی کے باوجود اپنا ہاتھ کھلا رکھا کرتے تھے۔ اِس لئے اُسے اپنے والد کے کفن دفن کے سلسلہ میں بھی والدہ کی ہنسلی فروخت کرنی پڑی۔ چند دنوں تک تو گھر میں صف ماتم بچھی رہی۔ کھانا پینا حرام رہا۔ دنیا اُلٹ گئی ہو۔ مگر وقت آنے پر پیٹ کو بھوک ضرور محسوس ہوتی ہے۔ اور سعید کو اپنی ماں کا ایک اور زیور بھی بھوک کی نذر کر دینا پڑا۔

سعید اچھا خاصہ جوان ایف۔ اے پاس ہو جائے اس کے کہ ماں کو کما کر کھلاتا۔ اس کو ڈھارس دیتا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بے کار بنا گھر میں بیٹھا رہا۔ مگر آخر کب تک اس طرح بیٹھا رہتا۔ اس نے ایک نگاہ غلط انداز اپنے تاریک مستقبل پر ڈالی۔ اور "نوکری" کی ایک ہلکی سی چمک اسے نظر آئی۔ مگر ٹھکانے کی نوکری ڈھونڈنا اتنا ہی آسان ہے۔ جتنا کیچڑ کو آگ لگانا۔ یا ریت کے ایک انبار میں سونے کے ذرات تلاش کرنا۔

سعید آج معمول سے قدرے پیشتر جاگا کپڑے بدلے ناشتہ کیا۔ اور نوکری کی تلاش میں گھر سے باہر نکل کھڑا ہوا۔

وہ جا رہا تھا۔ کہاں؟ اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہ جانتا تھا پھر اُسے کیا کرنا ہوگا۔ مگر وہ جا رہا تھا۔ ٹانگیں اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ مگر ہوش و خرد اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ وہ شہر کی جال کی طرح پھیلی ہوئی سڑکیں پر پھرتا رہا۔ حتیٰ کہ شام کی تاریکی ہر طرف پھیلنے لگی۔ تمام بازار بجلی سے جگمگا رہا تھا۔ مگر اُس نے دل میں کہا۔ کہ اس کے گھر میں تو چراغ جلانے کے لئے تیل بھی نہ تھا۔ اور نہ جانے یہ سوچ کر اُس کے پاؤں کیوں گھر کی طرف اُٹھنے لگے۔۔۔
اندر داخل ہوتے ہی ماں نے بلائیں لیں۔ اور پوچھا۔
"بیٹا! کیا کہیں نوکری مل گئی؟"

"نہیں اماں!" سعید نے آہ بھر کر جواب دیا۔ ماں چپ ہو رہی۔

دُوسرے دن سعید پھر قسمت آزمائی کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اور ایک دفتر سے دوسرے دفتر۔ ایک کارخانے سے دُوسرے کارخانے۔ ایک دوکان سے دوسری دوکان اور ایک کوٹھی سے دُوسری کوٹھی پر گیا۔ مگر ہر جگہ جواب صاف پایا۔ آوارہ منزل سعید ایک نہ ختم ہونے والی سڑک پر جا رہا تھا۔ اور وقت تیزی سے اپنے پروں پر اڑا چلا جا رہا تھا۔ دن کی روشنی کی جگہ اب سیاہی نے لے لی تھی۔ آہ یہ دنیا بھی کتنی عجیب چیز ہے۔ ایک وہ ہیں جو دنیا کی رنگینیوں میں ایسے کھو جاتے ہیں۔ کہ صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے۔ مگر انہیں احساس تک نہیں ہوتا۔ اور ایک یہ ہیں۔ جنہیں ایک منٹ سال کے برابر دکھائی دیتا ہے۔۔۔ سامنے سر بفلک عمارتوں کی کھڑکیوں کے پردوں سے بجلی کی روشنی چھن چھن کر مسکرا رہی تھی۔ شاید سعید کی بیکسی پر۔ اور وہ سڑک سے ہٹ کر گلی کی طرف مُڑ گیا۔ شاید اپنی بیکسی پر کسی کو مسکراتے ہوئے دیکھنے کی تاب اس میں نہ تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہُوا گھر پہنچ گیا۔

تیسرے دن خیالات کی رَو میں بہتا ہُوا سعید پھر گھر سے چل کھڑا ہُوا۔ راستے میں رشید اور ناصر مل گئے۔ یہ دونوں سکول میں سعید کے کلاس فیلو تھے۔ ان تینوں نے ایک ہی ساتھ میٹرک پاس کیا تھا۔ مگر یہ دونوں دنیا اور سوسائٹی کی نظر میں انسان تھے۔ کیونکہ دولت مندوں کے بیٹے ہونے کی وجہ سے اچھے اچھے عہدوں پر ملازم ہو چکے تھے۔ اِدھر اُدھر کی کچھ باتیں کرنے کے بعد وہ چلے گئے۔ کیونکہ دفتر سے انہیں دیر ہو رہی تھی۔ اور سعید۔ اکیلا سعید۔ بے کس سعید۔ بے سہارا سعید۔ اور بے کار سعید اپنے دماغ میں خیالات کی دُنیا بساتا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ "ہم تینوں نے ایک ساتھ میٹرک پاس کیا اور میں نے ایف۔ اے بھی کر لیا۔ مگر وہ انسان ہیں۔ سکول کی فضا سے قدم باہر دھرتے ہی وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہو گئے۔ وہ مجھ سے ذہین نہ تھے۔ میری جسمانی صحت بھی اُن سے اچھی تھی۔ وہ ردی کھا رہے ہیں۔ اور میں دانے دانے کو محتاج ہوں۔ مگر تعلیمی قابلیت کی اس دُنیا میں کوئی قیمت نہیں۔ نوکریاں آج کل نیلام ہوتی ہیں۔ وہ انہی خیالات میں غرق مایوسی کی تاریکیوں میں بھٹکتا رہا۔ آخر بھوک اور تکان کشاں کشاں اُسے گھر لے گئی۔

چوتھے دن سعید معمول سے ذرا سویرے ہی جاگا۔ آج اُسے ناامیدی اور مایوسی کی تاریک گھٹاؤں میں اُمید اور آس کا ایک چھوٹا سا ستارہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا کیونکہ کل اُس نے لائبریری میں ایک مقامی اخبار میں پڑھا

تھا کہ ایک کارخانے میں چند مزدوروں کی ضرورت ہے۔"
شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے نکل کر سعید ایک چوڑی سڑک پر ہولیا۔ وہ سائے کی طرح خاموش جا رہا تھا۔ اور دیکھنے والوں کے لبوں پر قہقہے۔ آنکھوں میں چمک۔ اور چہرے پر جلال کی کیفیتیں رقصاں تھیں۔

سعید کارخانہ پہنچا۔ دفتر گیا۔ منیجر نے پوچھا "کیا کام ہے؟"

"کل آپ کا اشتہار اخبار میں نکلا تھا میں اُسی کے جواب میں حاضر ہوا ہوں۔"

"آپ تو پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں۔ اور ہمیں بوجھ اٹھانے کے لئے مزدوروں کی ضرورت ہے۔"

"لیکن میں مزدوری کرنے آیا ہوں۔"

"آپ بوجھ نہیں اُٹھا سکینگے۔ تشریف لے جائیے۔" منیجر نے فیصلہ کُن لہجہ میں کہا۔

اور سعید نے ایک ہلکی سی جھرجھری لی۔ اور چکراتا ہوا دماغ ہاتھوں سے پکڑے دیوار کا سہارا لیکر باہر نکل گیا۔ اس کمزور انسان کی مانند جو اپنے شہ زور حریف کے مقابلے میں آخرکار شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

وہ ایک سڑک پر ہولیا۔ اُس کا دماغ مختلف خیالات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ "مزدوری کیلئے علم نہیں طاقت چاہئے۔ مگر میرا دماغ خزانۂ علم سے معمور ہے۔ مگر باہوں میں بوجھ اُٹھانے کی سکت نہیں اور یہ ہے تعلیم کا پھل۔ اب بوجھ اٹھانے کے لئے میرے بازوؤں میں قوت نہیں۔ میں نوجوان ہوں مگر ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ موجودہ نسلیں اپنی صحت۔ اپنی تندرستی اور اپنی دولت تعلیم کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیتی ہیں۔ کیا اسی دن کے لئے۔ انہیں سات آنہ روز کی مزدوری بھی نہیں ملتی۔ ناتوان جسم — بے رونق چہرے۔ عینک کی محتاج دُھندلی سی آنکھیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھ۔ تھکے تھکے سے پاؤں۔ دماغ کسی چیز کو بار بار یاد کرنے کی وجہ سے سوچنے کی صلاحیت سے عاری۔ اور رگیں خُون سے خالی۔ یہ ہیں موجودہ طرزِ تعلیم کے نتائج۔ مجھ سے تو وہ بھرے بھرے بازوؤں اور چوڑے چکلے سینوں والے ان پڑھ ہی اچھے جنہیں سرمایہ دار زیادہ سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی ہمت دیکھ کر مزدوری پر لگا لیتے ہیں۔ میں نے اپنی عمر کے سترہ سال تعلیم کی دیوی پر نچھاور کر دیئے۔ باپ کو اسی دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا۔ حتیٰ کہ اپنی ساری پونجی بھی اسی دیوی کی نذر کر دی صرف اپنے مستقبل کو روشن کرنے کے لئے۔ میں تعلیم کی سیڑھی سے بامِ عروج پر پہنچنا چاہتا تھا۔ انگریزی حساب تاریخ جغرافیہ سائنس غرض سب کچھ سیکھ لیا۔ نہ سیکھا تو صرف روٹی کمانے کا ہنر اور پیٹ بھر کھانا۔"

دُنیا و مافیہا سے بے خبر سعید خیالات کے دھارے میں بہتا ہوا آبادی سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس کا دماغ اچانک رُک گیا۔ اور اسے جب شہر سے کافی دُور نکل آنے کا احساس ہوا۔ تو دماغ سوچ سوچ کر اور ٹانگیں چل چل کر تھک گئی تھیں۔ وہیں سڑک کے کنارے تھوڑی دیر سستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ اور پھر نہ جانے یکبارگی اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ اُٹھ کر واپس شہر کی طرف چل دیا۔

شہر پہنچا۔ تو چھ بج رہے تھے۔ بازار میں خُوب رونق تھی۔ چیلوئوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سینما تھیٹر کو جاتے ہوئے دولت مندوں کے نوجوان بیٹے۔ بڑے بڑے تاجر موٹروں کی سبز رنگ کی سیٹوں پر بیٹھے قہقہے لگاتے ادھر ادھر جا رہے تھے۔ اور ان کے درمیان بے کار سعید آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے جا رہا تھا۔

سعید گھر پہنچا۔ ماں نے کھانا سامنے لاکر رکھا۔ وہ
کھانے کو کھا رہا تھا۔ مگر شدتِ غم سے نوالے اس کے حلق
سے نیچے نہیں اتر سکتے تھے۔ مصیبت زدہ ماں دن بھر
کی سرگزشت سننے کے لئے بیتاب تھی۔ اُس نے پوچھا۔
"کیوں بیٹا! آج بھی خالی ہاتھ لوٹے؟"
"ہاں اماں!" سعید نے نوالہ نگلتے ہوئے کہنا شروع
کیا۔ "میں بدنصیب ہوں۔ بدقسمتی میرا ساتھ نہیں چھوڑتی
سیہ بختی سائے کی طرح ساتھ لگی رہتی ہے۔ نوکری نہیں ملی۔ اور
نوکری تو کیا۔ مزدوری بھی نہ ملی۔ مزدوری کرنے کی مجھ میں
طاقت نہیں۔ اور نوکری —— وہ تو بکتی ہے جس کے
خریدنے کے لئے میرے پاس روپیہ نہیں۔
اماں! آج ہر جگہ پیسوں کے کھیل کھیلے جا رہے ہیں۔
ہسپتال کی چاردیواری۔ خیرات خانے۔ دفتر اور عدالتیں
جہاں دیکھو پیسے کی حکومت ہے۔"
پھر اٹھا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اور ماں مایوسی کے
اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی۔
پانچویں دن سعید صبح ہی گھر سے نکلا اور سیدھا
بک سٹال گیا۔ وہاں سے ایک تازہ اخبار خریدا۔ اور اسی
وقت گھر لوٹ آیا۔ ماں اُس کی فوری واپسی پر حیران سی
ہو گئی۔ اور پوچھا۔
"کیوں بیٹا۔ آج جلدی ہی لوٹ آئے؟"
"ہاں۔ اخباروں میں ملازموں کی ضرورت کے اشتہار
ہوتے ہیں۔ آج انہیں کے جواب میں درخواستیں بھیج کر قسمت
آزماتا ہوں۔"
ماں چپ ہو گئی اور سعید کاغذ قلم لیکر بیٹھ گیا اور
ہر ایک "ضرورت" کے جواب میں ایک درخواست بھیجدی۔
اب سعید کا روزانہ اخباروں میں ضرورت کے کالم سے
نکلے ہوئے اشتہاروں کے جواب میں درخواستیں لکھنا معمول
ہو گیا تھا۔ اُس نے بیسیوں درخواستیں لکھیں اور بھیجدیں۔
اور جواب کے انتظار میں روزانہ ڈاکخانہ جاتا۔ اور اسکے
جانے کے بعد اُس کی ماں دُعائیں مانگنے میں مصروف ہو
جاتی "یا خدا! آج تو سعید کی کسی درخواست کا جواب آ
جائے۔ آج تو اسے نوکری مل جائے۔ آج تو اُسے بلا لیا
جائے۔" سعید کو جب خطوط کے انبار میں اپنے نام کوئی خط
نہ ملتا۔ تو واپس گھر لوٹتا۔ اور ماں اُمید و بیم کی حالت میں
کتنے ہی پیہم سوال کرتی۔
"آ گیا جواب؟"
"نوکری کا حکم آ گیا؟"
"کہاں ملی؟"
"کتنے کی ملی؟"
سعید ماں کے ان مسلسل سوالات کو سنتا۔ مگر دانستہ
خاموش رہتا۔ اور پھر اپنے خالی ہاتھ ماں کے سامنے پھیلا
کر کہتا "نہیں اماں! کسی درخواست کا بھی جواب نہیں آیا۔"
اور ماں جس کو عاجزی۔ اور امید سے مانگی ہوئی دُعاؤں
کی بنا پر یقین ہوتا تھا۔ کہ آج ضرور جواب آ جائیگا۔ یہ جواب
سن کر گھنٹوں اپنے دماغ میں جلن سی محسوس کرتی۔ ناامیدی۔
مایوسی اور ناکامی کی جلن۔
وقت کے گھڑیال کی سوئی پھر اُسی تاریخ کے ہندسہ
پر آ گئی۔ جس تاریخ پر سعید پہلی مرتبہ اپنی قسمت کا دروازہ
کھٹکھٹانے نکلا تھا۔ ایک ماہ گذر گیا تھا۔ لیکن افلاس۔
غربت اور بیکاری کے جو بادل اُس کی کائنات پر پہلے چھائے
ہوئے تھے۔ اب بھی منڈلا رہے تھے۔ وہ پہلے بھی دوسروں
کا دست نگر تھا۔ اور اب بھی دوسروں کے ہی سہارے کا
محتاج تھا —— زر پرست ہندوستان کی اس سرزمین

میں ہر طرف شخصیت پرستی کی مہلک وبا پھیلی ہوئی ہے۔
بے چارے سعید کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہی بے کاری تھی
اور وہی افلاس۔ وہی مستقبل کی ہولناکیاں تھیں۔ اور
وہی تفکرات۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یا وُہ اس دُنیا کے لئے
نہ تھا۔ یا یہ دُنیا اس کے لئے نہ تھی۔

مستقبل کے آسمان پر اُمید کے جو ستارے سعید کو
چمکتے اور جگمگاتے نظر آیا کرتے تھے۔ وُہ ایک ایک کرکے گم
ہوگئے۔ اب اُس کو اپنا مستقبل بادوباراں والی رات
کی طرح سیاہ نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی اپنی ذلت اور کمتری کا احساس
اس کے دل میں اتنی شدت سے پیدا ہوجاتا۔ کہ وُہ گھٹنوں میں
منہ ڈھانک کر رو دیا کرتا۔ اور سوچتا کہ اس بیکاری اور تفکرات
سے بھری زندگی سے تو مرجانا ہی بہتر ہے۔ اور مصیبتوں اور
سختیوں کے آہنی پنجے سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ
موت ہے۔ پھر خیال آتا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی ماں
کا آخری سہارا بھی جاتا رہے گا۔ اور پھر خود ہی اپنے آپ
سے کہنے لگتا۔ کہ "مَیں زندہ ہوتے ہوئے بھی کس کام کا؟
مَیں نے زندگی میں اُسے فائدہ ہی کیا پہنچایا ہے۔ کہ میرے مرنے
سے اُسے کچھ نقصان ہوگا۔ دُنیا خوشی اور کامرانی کے ساتھ
جینے کی جگہ ہے۔ اور مسرت اور کامیابی میری قسمت میں ہے
نہیں۔ تو اس دُنیا میں زندہ رہنے کا مجھے کیا حق ہے۔ موت
کا جام جو ہر کس و ناکس کو ایک نہ ایک دن نوش کرنا ہے۔
کیوں نہ آج ہی پی لوں۔ اور اُمید و بیم کے جو سراب یکے بعد
دیگرے اُٹھتے ہیں۔ اُن سے کیوں نہ چھٹکارا حاصل کروں"۔

یہ خیالات آتے ہی وُہ اُٹھا۔ اور باہر جانے لگا۔
ماں نے باہر جانے کی وجہ پُوچھی۔ تو کہنے لگا۔ "ابھی آیا۔
اماں"۔ اور پھر ایک لمحہ کے لئے ٹھہر گیا۔ گویا وہ ماں کو جی
بھر کر دیکھ لینا چاہتا تھا۔ اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔
"ماں تیری ضعیفی میری موت کے صدمے کو برداشت
نہ کرسکے گی۔ پر اپنے بُزدل اور بدقسمت بیٹے کو معاف کرنا۔
———— الوداع ————" اور گھر سے باہر
نکل گیا۔

تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے ریل کی پٹڑی کی طرف
جا رہا تھا۔ جب نزدیک پہنچا۔ تو شام کی دُھندلی سی روشنی
تھی اور سگنل گاڑی کے لئے پہلے ہی سرنگوں ہو چکا تھا۔
اور فضا میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وُہ
پٹڑی کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ جب انجن سعید کے
قریب آیا۔ تو اُس نے اپنے علوم و معارف سے معمور سر کو
پٹڑی پر رکھ دیا۔ ایک دل دوز چیخ بلند ہوئی۔ اور
خود پرستی اور زر پرستی کے دیو نے ایک فلک شگاف
قہقہہ لگایا۔

نصیر الدین چشتی

(بقیہ صفحہ ۱۴) حاصل ہے اور میرے نزدیک اثباتِ خودی
(SELF ASSERTION) اسلامی نقطۂ نگاہ سے زیادہ مفید اور
قابلِ عمل ہے۔

آخر میں مَیں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ لفظ "اسلام"
[illegible]
میرے اس مضمون میں پرچار کا رنگ نمایاں ہے۔ بلکہ مَیں نے
زندگی کے بارے میں اسلامی تصور کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔
اور وہ اقبال کے اس شعر سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے!

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

ایم سعید

دیوی نگر

دیوی نگر طبقۂ نسواں کی کلیتہً واحد ملکیت تھا اگر کوئی مرد سیاح جو وہاں بسنے آ بھی جاتا تو مرد کسی نہ کسی حیلے ضرور غائب ہو جاتا۔ اوّل تو دیوی نگر کی تمام نشست و برخاست میں اُس کی تنہائی اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ ورنہ کہیں ملازم ہونے کے باعث یا پڑوس کے کسی بڑے قصبہ کے تجارتی کاروبار میں مصروف ہونیکی وجہ سے اسے وہاں سے علیحدہ ہونا پڑتا۔ تمام آبادی میں صرف ایک مرد معالج کی حیثیت سے وہاں اپنی شبانہ روز زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن ہر مرد چونکہ معالج نہیں ہو سکتا۔ اس لئے قصہ مختصر یہ کہ مرد خواہ بھاڑ میں جائیں۔ لیکن دیوی نگر سے دُور رہیں۔

خوبصورت باغوں کو منتخب پھولوں سے لدا ہوا رکھنے کے لئے۔ ان پھولوں کو مشتاق نگاہوں سے دیکھنے والے بچوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے، باغوں کے دروازے کھلے پاکر کبھی کبھار داخل ہونے والی بکریوں کو بھگانے کے لئے ادب اور سیاست کے تمام عقدوں کو بلا تردد حل کرنے کیلئے نگری کے تمام مکینوں کے حالات صحیح اور واضح طور پر معلوم کرنے کے لئے اپنی صاف اور ستھری خادماؤں کو پسندیدہ حالت میں رکھنے کے لئے غریبوں پر اپنی آمرانہ بخشش کرنے کے لئے اور باہمدیگر نہایت ہی اچھا برتاؤ کرنے کے لئے (بالخصوص انتہائی غم و غصہ کی حالت میں) دیوی نگر کا طبقۂ اناث بذات خود کافی تھا۔ اُن کا قیاس تھا کہ مرد بھی گھر کی چار دیواری میں اتنا کچھ ہی کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اگرچہ وُہ ایک دوسرے کے اوضاع و اطوار سے خوب واقف تھیں۔ تاہم کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ بظاہر گو ان میں سے ہر ایک فی نفسہٖ آزاد معلوم ہوتی تھی۔ نوک جھوک میں اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی تھی۔ مگر پھر بھی کافی حد تک ایک دوسرے کی خیر خواہ تھیں۔ کبھی کبھی ایک چھوٹا سا قضیہ مول لے لیتیں۔ ایک دوسرے کو خوب صلواتیں سناتیں اور دانت پیس پیس کر کھوپریاں گھمائیں۔ تاکہ ہر رونکی پرسکون زندگی بالکل بے حس نہ ہو جائے

اُن کا لباس فیشن کا مرہون منت نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس بات میں کیا رکھا ہے۔ کہ دیوی نگر میں جہاں کا ہر باشندہ انہیں جانتا ہے ان کا لباس کیسا ہے۔ اور اگر وُہ دیوی نگر کی سرحد سے پار ہو جائیں۔ تو وہاں بھی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں۔ کہ وُہ کس لباس میں ملبوس ہیں۔ کیونکہ وہاں اُن سے کوئی واقف ہی نہیں۔ بالعموم ان کا لباس صاف ستھرا ہوتا تھا۔ بڑے شہر کا متروکہ فیشن وہاں رائج ہوتا تھا۔ اور چونکہ بھیڑ چال تھی۔ اس لئے ان پر ہنسنے والا کوئی نہ تھا۔

دیوی نگر میں ملاقاتوں کے لئے خاص قوانین رائج تھے۔ جو نہایت سنجیدگی سے ہر نووارد کے گوش گذار کر دیئے جاتے تھے۔

(۱) محترمی! آج رات سفر کرنے کے بعد آپ کے مزاج کیسے ہیں؟ کل رات آپ آرام کریں۔ پرسوں آپ سے ملاقات ہوگی۔ پرسوں بارہ بجے کے بعد فارغ رہئے کیونکہ ملاقات کا وقت بارہ بجے سے تین بجے تک ہے۔

دن) دُبلائے جانے کے بعد آج تیسرا دن ہے۔ اُمید ہے
آپ کو بتایا گیا ہوگا۔ کہ مُلاقات کی اطلاع موصُول ہونے اور
اس اطلاع کا جواب دینے میں تین دن سے زیادہ عرصہ ہرگز
صرف نہیں ہونا چاہئے۔ اور ہاں یہ بھی یاد رہے۔ کہ
ہر مُلاقات میں پاؤ گھنٹے سے زیادہ وقت صرف نہیں ہونا
چاہئے۔ ممکن ہے۔ آپ کہیں۔ کیا میں سارا وقت گھڑی
دیکھتا رہوں، لیکن عرض یہ ہے کہ وقت کی پابندی لازمی ہے
آپ اثنائے گفتگو میں اِس خیال کو ہرگز فراموش نہ کریں۔

چونکہ ہر شخص کو اطلاع موصول ہونے پر یا اطلاع کا جواب دیتے
ہُوئے اِس قانُون کا علم ہوتا تھا۔ اِس لئے کبھی کسی محو کر دینے
والے موضُوع پر گفتگو نہ ہوتی تھی۔ مختصر سی گفتگو کے لئے چھوٹے
چھوٹے فقرات استعمال کئے جاتے تھے۔ اور وقت کی پابندی
کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

دیوی نگر کے چند گھرانے اتنے غریب تھے۔ کہ اُن کی گُذر
اوقات مشکل سے ہوتی تھی۔ لیکن بااین ہمہ اتنے پابندِ وضع
تھے۔ کہ اپنی عُسرت کو زیرِ تبسّم پوشیدہ کر جاتے تھے۔ وُہ مالُ
دولت کا کبھی نام تک نہ لیتے تھے۔ کیونکہ اِس موضُوع سے
انہیں اپنی فلاکت کے احساس ہو جانے کا گمان تھا۔ اگرچہ
چند فی الواقع غریب تھے لیکن تمام کے تمام عالی مزاج تھے۔
ان کو اپنی رفاقت کا اتنا پاس تھا۔ کہ جب کوئی اپنی غُربت
کو صیغۂ راز میں رکھنے کی کوشش کرتی۔ تو دُوسری اس کی
خامیوں کو سراسر نظر انداز کر جاتیں چنانچہ نجمہ نے ایک دفعہ
اپنے گھروندے میں دعوت دی۔ اور جب چھوٹی خادمہ نے
مہمانوں سے کہا "آپ ذرا ادھر کو ہو جائیں۔ کہ میں پلنگ کے
نیچے سے طشتریاں نکال لوں۔" تو ہر ایک اس پُراسرار بات کو
سراہنے لگی۔ اور اُس پر طُرّہ یہ کہ امور خانہ داری کے متعلق ایسے
پیرائے میں گفتگو ہونے لگی۔ گویا انہیں کامل یقین ہے کہ میزبان
کے پاس نوکرانیوں کا علیحدہ کمرہ۔ چوکیدار اور مطبخ کا انچارج
سب موجُود ہیں۔ حالانکہ نجمہ نے اس شام کو دعوت کی خدمات
سرانجام دینے کے لئے نزدیک کے یتیم خانے سے ایک لڑکی
منگائی تھی۔ اور لڑکی بھی ایسی کہ نجمہ اگر چھپ کر اس کی امداد
نہ کرتی تو اس کے بازو خوانِ نعمت کو کبھی زینہ
پار نہ کرا سکتے۔ نجمہ اب مہمانوں کے پاس اس طرح مطمئن
بیٹھی تھی۔ گویا اسے معلوم ہی نہ تھا کہ مہمانوں کیلئے نیچے سے کیا کچھ
بھیجا جا رہا ہے۔ حالانکہ اسے بخوبی علم تھا۔ اور مہمانوں کو بھی یہ
معلوم تھا۔ کہ وُہ تمام دن دعوت کے اہتمام میں مشغول رہی۔

اس عام لیکن نامسلمہ غربت اور مجسّم شرافت جس میں
غلطی کا شائبہ تک نہ تھا۔ اور جو ان کی سوسائٹی کی بہتری
کے لئے بہت ممد ہو سکتی تھیں کے ایک دو اہم نتائج بھی
پیدا ہوئے تھے۔ مثلاً ان کا انضباطِ اوقات رات کو بہت
سویرے اختتام پذیر ہو جاتا۔ نو بجے وُہ اپنے ڈربوں میں
گھُس جاتیں۔ اور ساڑھے دس بجے تک تمام دیوی نگر
خوابِ استراحت میں ہوتا۔ دوسرا یہ کہ دعوتوں میں ماکولات
و مشروبات مہیا کرنے پر بے حد کفائت شعاری سے کام لیا
جاتا۔ امیر خواتین بھی ساگ۔ روٹی اور مکھن وغیرہ کھلانے
پر اکتفا کرتے ہوئے کفایت شعاری کا ثبوت دیتیں۔ اُنکے
نزدیک کفایت شعاری ہمیشہ عمدہ اور خرچ کرنا ہمیشہ حماقت
اور محض دکھلاوے کے مترادف ہوتا۔ انگوروں کا کھٹا ہونا
ان کیلئے ہمیشہ باعثِ آسائش و تسکینِ قلب تھا۔ معزز خواتین اگر
کسی دعوت میں پیدل جاتیں یا واپس پیدل آتیں۔ تو
اِس وجہ سے نہیں کہ پالکیوں پر خرچ ہوتا تھا۔ بلکہ اِس لئے
کہ موسم نہایت لطیف۔ رات بھیگی بھیگی اور ہوا نہایت علی الفراد
ہوتی۔ ریشمی کپڑوں کی بجگہ چھینٹ زیب تن کرتیں۔ تو اسلئے
کہ وُہ آسانی سے دُھل جانے والے کپڑوں کو ترجیح دیتی تھیں۔

اور اسی طرح باقی امور کے متعلق کوئی نہ کوئی غلط تاثر لیتی۔ حتیٰ کہ وہ اس امر سے بالکل انجان ہو جاتیں۔ کہ وہ تمام کی تمام متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ (ماخوذ)

ایم۔ اے قیوم

تنقید نگاری

ایک انگریزی شاعر اور ڈرامہ نویس بن جانسن (BEN JONSON) کا خیال ہے کہ شاعر کے کلام پر صرف شاعر ہی قلم اٹھا سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ بیان صداقت پر مبنی نظر نہیں آتا۔ ہر شاعر چند مخصوص جذبات اور ایک خاص میلان کا مالک ہوتا ہے۔ عوام کی نسبت زیادہ حساس ہونے کے باعث جذبات کی یہ خاص رَو اس کی زندگی کے ہر پہلو کو ڈھانپ لیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر شئے پر اس مخصوص جذبے کی عینک لگا کر رائے زنی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر حسرت ساقذ طیت سے لبریز شاعر ہر مضمون کو الم انگیز بنا دیتا ہے جس خاکے پر ایک بار اس کا برش پھر جاتا ہے۔ اس سے حسرت و یاس کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ اس طرح اختر شیرانی لذتیت سے سرشار نظر آتا ہے۔ وہ ہر تصویر سے اپنی لذت اور قوتی کی طمانیت کے سامان پیدا کر لیتا ہے۔ اسی لئے جب ایک شاعر کسی اور شاعر پر تنقید کرنے بیٹھتا ہے۔ تو اپنے ہی نظریہ شاعری اور ذاتی رجحانات کو معیار بنا کر اس کے کلام کی جانچ کرتا ہے۔ تنقید منصفانہ صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے۔ کہ نقاد کے ذہن پر پہلے سے کوئی خاص رنگ حاوی نہ ہو چکا ہو۔ ایسی تنقید کی شاعر سے توقع رکھنا بے سود ہے۔ کیونکہ اس کا دماغ ایک خاص سپرٹ کے زیر اثر کام کرتا ہے۔ وہ خود ایک خاص مسلک کا مالک ہوتا ہے۔ اور اس کے نزدیک جو کوئی اس کی اپنی متعین شاہراہِ شاعری سے بھٹکتا نظر آئے شاعر کہلانے جانے کا پوری طرح مستحق نہیں۔

شعر کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے محض نقادوں کی ضرورت ہے۔ جو اگرچہ خود شاعر نہ ہو لیکن شعر کے فنی اور معنوی حسن و قبح سے بخوبی واقف ہو۔ ایسے نقاد کا دماغ قدرتی طور پر شاعری کے کسی مخصوص نظریہ سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس کی عقلِ سلیم اس کی راہبر ہوتی ہے اور وہ جس شعر کو اچھا کہتی ہے۔ وہی فی الحقیقت اچھا ہوتا ہے۔ لیکن اگر نقاد کا فرض صرف اتنا ہی ہوتا۔ تو ایک شاعر (مثال کے طور پر فراق گورکھپوری) اسے بخوبی انجام دے سکتا تھا۔ نقاد کے لئے کسی شاعر کو تختۂ مشق بنانے سے پہلے بہت سی اور باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اوّل شعر کا مضمون سمجھنا ہی بڑی دانش کا کام ہے۔

شاعر نے اگر شعر میں خارجی یا عام انسانی جذبات کا اظہار کیا ہو۔ تو نفسِ موضوع پر چنداں حرف گیری کی گنجائش نہیں رہتی۔ اور پرکھنے والے کو فنی پہلو کی جانب راغب ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اگر شعر داخلی جذبات اور ذاتی واردات کا حامل ہو۔ تو بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عام

نقد و نظر کرنے والے جھٹ اپنی رائے دے دیتے ہیں۔ شعر کا مضمون اگر اُن کی پسند کا نکلا۔ تو شعر اچھا ٹھیرا۔ ورنہ بُرا۔ ایسی بے لگام رائے زنی سے ہر زمانے میں ہر ادب کو نقصان اُٹھانا پڑا ہے۔ تنقید کا ایک ایسا ہی "اسکول" انگریزی رومانی شاعروں کے دَور میں بھی ہو گُذرا ہے۔ جس نے کیٹس (KEATS) سے نغز گو شاعر پر بھی کیچڑ اُچھالنے سے گریز نہ کیا۔

کسی نظم کی تنقید سے پہلے نقاد کو چاہئے۔ کہ اوّل تو اس نظم کی "وجہ تسمیہ" معلوم کرے۔ یعنی یہ دیکھے کہ نظم کن مخصوص تاثرات یا کس ماحول میں لکھی گئی ہے۔ اور پھر انہی تاثرات کو دماغ میں جگہ دیتے ہوئے۔ اور اُس پر اُسی طرح نظر ڈالے جس طرح کم و بیش شاعر نے خود ڈالی ہوگی۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو۔ تو پھر نقاد تنقید کے وقت اُس خاص فلسفے یا سپرٹ کو ذہن نشین رکھے جو اس شاعر کے تمام کلام میں کارفرما ہے۔ مثال کے طور پر اختر شیرانی کی اوائل کی کوئی نظم اُٹھا لیجئے۔ عریانی اور شراب و بدمستی کا مظاہرہ ہوگا ابتداء میں طبیعت کچھ ملول ہوگی۔ لیکن جب یہ خیال آجائے۔ کہ نہ صرف یہی نظم بلکہ شاعر کا بیشتر کلام اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ تو وُہ نفرت معدوم ہو جاتی ہے۔

ایک مشہور فرانسیسی نقاد سینٹ بو (ST. BEUVE) کا قول ہے۔ کہ نقاد بننا اتنا ہی ہمت طلب ہے۔ جتنا شاعر بننا۔ وُہ اس بات پر مصر ہے۔ کہ تنقید سے پہلے نقاد شاعر کی تمام زندگی کا مطالعہ کرے۔ اور ان واقعات پر خاص طور پر نگاہ رکھے۔ جن سے شاعر کے تاثرات اور تخیل پر خاص اثر پڑا ہو۔ اس سوسائٹی کا مطالعہ کرے۔ جس میں شاعر کو رہنا نصیب ہوا۔ اس کے علاوہ وہ اس شاعر کے زمانے کے رجحانات کو بھی ہرگز نہ بھولے۔ ان سب امور کی روشنی میں اگر وُہ قلم تنقید اٹھائے۔ تو سچا اور انصاف پسند نقاد کہلائے گا۔

تنقید کے یہ اصوُل نہایت صاف اور سُلجھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن نقاد جب تک فطرتاً انصاف پسند نہ ہو۔ ان پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اس میں عوام بلکہ شعراء کی نسبت بھی سخن فہمی کا ملکہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے مختلف شعراء کے مطالعے کے بعد وہ ایک مخصوص طرز کی شاعری پسند کرنے لگ جاتا ہے۔ اس کا مذاق بھی ایک سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ اور جو کلام اسے اس سانچے سے مختلف نظر آتا ہے۔ اُس سے خراج تحسین حاصل نہیں کر سکتا۔ ایسا ہی ایک نقاد ٹی۔ ایس ایلیٹ (T. S. ELIOT) ہے۔ جو شیلے (SHELLEY) کی الہامی شاعری سے نہ صرف اس لئے محظوظ نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ خود ان مافوق الفطرت احساسات سے بالکل عاری ہے۔ اسی طرح جن لوگوں پر اقبال کے پرجوش اور عمل آموز کلام کا جادو ہو چکا ہے۔ انہیں ٹیگور کی شاعری۔ جو سر بسر حسن اور سکوت سے معمور ہے شعریت سے بھی خالی نظر آتی ہے۔ اور بالکل اسی طرح جو نقاد متاخرین یا متقدین کے کلام میں اپنا دل اُلجھا بیٹھتے ہیں۔ ان کے لئے جدید شاعری کے نت نئے رجحانات میں کوئی کشش نہیں ہوتی۔

تنقید کرنے والے ایک اور غلطی کا بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ وُہ شاعر کو بحیثیت مجموعی ہر پہلو سے نہیں پرکھتے۔ بلکہ اُن کی جانچ صرف اس پہلو تک محدود ہوتی ہے جس سے انہیں خود دلچسپی ہو۔ یا جس سے کوئی خاص مطلب پورا ہوتا ہو۔ ایسی ہی تنقید ہمیں میتھو آرنلڈ (MATHEW ARNOLD) کے ہاں ملتی ہے جس نے ورڈز ورتھ (WORDSWORTH) پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے کلام کی فلسفیانہ رفعت کو صرف اس لئے نظر انداز کر دیا۔ کہ یا تو اسے خود فلسفے کا مذاق نہیں

تھا۔ یا ھذہ ذوق ورثہ کو زیادہ مقبول بنانے کے لئے وہ اس
کی شاعری کے اس پیچیدہ پہلو کو بالکل ہی حذف کر دینا
چاہتا تھا۔ ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے غالب پر جو تنقید
محاسن کلام غالب کی شکل میں لکھی ہے۔ وہ بالحقیقت صحیح
تنقید نہیں۔ بلکہ نقاد نے خواہ مخواہ اپنی علمیت دکھانے
اور غالب کی ہمہ گیری جتانے کے ارادے سے اس کے
کلام سے ایسے معانی نکالے ہیں۔ جو شاید غالب کے اپنے
خواب وخیال میں بھی نہ آئے ہوں۔ اس طریق سے شاعر
کی غلط تصویر کھنچ جاتی ہے وہ اصل سے کتنی ہی زیادہ دلفریب
کیوں نہ ہو) عوام کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن جب
کوئی منصف مزاج نقاد اسی شاعری پر قلم اٹھا کر حقیقت
کا انکشاف کرتا ہے۔ تو شاعر کے مداحین کو حق گوئی سے
صدمہ پہنچتا ہے۔

تنقید کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی شاعر کا دنیائے
شاعری میں صحیح مقام معلوم کرنے کے لئے اس کے کلام کا موازنہ
کسی ایسے بڑے شاعر سے کیا جائے۔ جو پہلے سے ہی شہرت
عام اور بقائے دوام حاصل کر چکا ہو۔ اور دوسرا یہ کہ شاعر
کا کلام خود اپنی جگہ پر پرکھا جائے۔ اس کی تنقید بالکل جداگانہ
اور الگ ہو نقاد کے پیش نظر شاعر کے مخصوص تاثرات اس کا معین
مسلک اور ماحول ہو۔ تنقید موازنے کی صورت میں تب
ہی جائز ہو سکتی ہے۔ کہ مقابلہ کئے جانے والے شعراء
کسی ایک اہم مشترک صنعت کے مالک ہوں۔ اس
نوع کے موازنے کی نظیر ہمیں شبلی کے "موازنہ انیس ودبیر"
میں مل سکتی ہے۔

عبدالرؤف شگفتہ

اسلامیہ کالج میں عورت کی زندگی

دارالعلوم اسلامیہ شہر پشاور سے چھ میل دور۔
جمرود روڈ پر تہکال سے کچھ فاصلہ پر درۂ خیبر کے دہانے پر
واقع ہے۔ اس کی شاندار عمارات۔ سر بفلک مینار
خوبصورت سبزہ زار۔ بانیانِ کالج کی رفعتِ تخیل کی یاد دلاتے
ہیں۔ یہ درس گاہ چونکہ شہر اور چھاؤنی سے دور ہے۔ اسلئے
یہاں کے مدرسوں۔ طالبعلموں اور ملازمین کی قیام گاہیں
بھی اسی شاندار عمارت کے ارد گرد۔ ہاسٹل۔ کٹیا۔ کاٹیج۔
کوارٹر اور بنگلوں کی شکل میں موجود ہیں۔ تاکہ سب دن بھر
کام کرنے کے بعد اپنے مسکن میں تھوڑی دیر کے لئے دنیا و
مافیہا سے بے خبر ہو کر پرسکون فضا میں دنیاوی تفکرات سے
نجات پا سکیں۔ چند پروفیسر ایسے بھی ہیں۔ جنہوں نے فی الحال
ازدواجی زندگی میں قدم نہیں رکھا۔ اس لئے ان میں سے بعض
کی جائے پناہ۔ طالب علموں کے ہاسٹل ہی ہیں۔ دارالعلوم
میں صرف لڑکے ہی تعلیم پاتے ہیں۔ لیکن پروفیسروں کے
ہمراہ ان کے رنج و راحت میں شریک کچھ عورتیں بھی پناہ
گزین ہیں۔ لیکن مردوں کے لئے۔ خواہ وہ پروفیسر کی حیثیت
سے ہوں یا بہرے بہشتی کی۔ طالب علم کی۔ یا چپڑاسی
چوکیدار کی۔ کلرکوں کی یا خزانچی کی۔ غرضیکہ اعلےٰ سے

لیکر او نے تک کے لئے دل بہلانے کا سامان موجود ہے۔
لیکن خداوندان دارالعلوم کو کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آیا۔
کہ اُن خواتین کی دلچسپی کا بھی کچھ سامان مہیا کیا جائے جو کالج
کے کارکنوں کی خاطر پردیس کو دیس بنائے بیٹھی ہیں۔ کالج
کے منتظمین شب و روز۔ سیاسی۔ تمدنی۔ کانگریسی۔ لیگی۔ بعض دیگر
پنجابی۔ سب ہی قسم کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف رہے۔
اور مصروف ہیں۔ مردوں کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا
کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ پروفیسروں
کے لئے کلب۔ کلب کے لئے ہر قسم کا سامان۔ اور ایک
خاص بکر مخصوص ٹینس کے لئے۔ خاص گراؤنڈ۔ اور نہ معلوم
کیا کیا دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ پروفیسروں کو چھوڑ کر۔
بہرے۔ بہشتی بھی کام سے فارغ ہو کر فٹ بال وغیرہ کھیل
کر اپنا دل بہلا سکتے ہیں۔ غرضیکہ مرد۔ جو ویسے بھی آزاد اور
خود مختار ہیں۔ ان کے لئے دلچسپی اور تفریح کے ذرائع اور
سامان وغیرہ مہیا کرنا۔ ارباب بست و کشاد نے اپنا فرض
اولین سمجھ رکھا ہے۔ یہاں تک کہ بہروں وغیرہ کی تعلیمی کمی
کو محسوس کر کے ان کے لئے بھی ایک ماسٹر مقرر کیا گیا ہے۔
جو فراغت کے وقت ان کی تعلیمی کمی کو پورا کرتا ہے۔ برعکس
اس کے عورتیں تو عورتیں کالج کے پروفیسروں کی بچیوں کیلئے
بھی کسی قسم کا تعلیمی انتظام موجود نہیں۔ اور خورد سال بچوں
کو تعلیم کے لئے چھاونی یا شہر جانا پڑتا ہے۔

وہ عورت "جس کی گود میں آنیوالی نسلیں پرورش پاتی
ہیں۔ جس کے پاؤں کے نیچے جنت بیان کی جاتی ہے۔ جو
مردوں کے آرام و آسائش کے لئے ہر طرح کی قربانی کرتی
اسکے آرام و آسائش۔ اسکی تفریح۔ اسکی دلچسپی کا اسلامیہ کالج میں
کیا انتظام کیا گیا ہے۔ کیا یہی کافی ہے کہ ان کے شوہر انہیں
اچھی خوراک اور اچھا لباس مہیا کر دیں۔ اور کبھی کبھی تانگہ
یا کار میں بٹھا کر۔ شہر میں پھرا لائیں۔ اور وہ بھی مہینہ میں
ایک یا دو بار۔ بعض اصحاب پوچھینگے۔ اس سے زیادہ
عورت کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ جواب عرض ہے کہ صرف
اچھا کھانا اور اچھا پہننا ہی عورت کی زندگی کا واحد مقصد
نہیں۔ عورتیں گھروں کی چار دیواری میں رہ رہ کر جسمانی
اور ذہنی طور پر کمزور ہو جاتی ہیں۔ پھر وہی اصحاب جو اس
صورت حال کے ذمہ دار ہیں۔ کہتے ہیں کہ عورت ناقص العقل
ہے۔ گستاخی معاف۔ عورت کی جسمانی اور دماغی قوت کو
ناقص بنانے کے ذمہ دار بھی مرد ہی ہیں۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اصحاب پر یہ امر بخوبی
روشن ہوگا۔ کہ جس زمانے اور جس ملک کی عورت کو موقع
دیا گیا۔ انہوں نے مردوں سے بڑھ کر کارہائے نمایاں کئے۔
اور آپ جیسے قابل مرد بھی اُن با لیاقت عورتوں کے اشارے
پر ناچتے رہے۔

میڈم کیوری کی تحقیقات۔ چاند بی بی کی حکومت۔
نور جہاں کی علمی قابلیت۔ اس امر کی شاہد ہیں۔ کہ عورت
بھی حکومت کر سکتی ہے۔ ریسرچ کر سکتی ہے۔ علاوہ ازیں
موجودہ زمانے کی لیڈی ڈاکٹر۔ اور وہ خواتین جو پروفیسری
معلمی یا پرنسپل کے عہدوں پر مامور ہیں۔ اس امر کی زندہ
مثال ہیں۔ کہ عورت بھی ہر وہ کام۔ جو مرد اپنے مضبوط دل
اور مضبوط دماغ سے کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے نازک دل اور
نازک دماغ سے اسی طرح سر انجام کر سکتی ہے شاید انکے
مقابلے میں چند ایسی عورتوں کی مثالیں پیش کی جائیں گی۔
جو چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی رائے دینے سے قاصر
ہیں۔ اور معمولی کام کرنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتیں۔ مگر یہ
مثالیں انہیں خواتین کی ہونگی جنہیں چار دیواری میں مقید
رکھ کر چکنی چپڑی باتوں سے بہلا کر محکوم بنا کر تعلیم سے

بے بہرہ رکھ کر۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر۔ مردوں نے
ناقص العقل بنایا ہوگا۔ یہ بھی یاد رہے۔

خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

مردوں نے خانگی معاملات کے علاوہ کسی سیاسی۔
تمدنی۔ معاشرتی معاملے میں کبھی عورت کی رائے لینی گوارا
نہیں کی۔ مرد عورت سے رائے لینا اپنی توہین خیال کرتے
ہیں۔ حالانکہ عورت جس اخلاص محبت اور نرمی سے مرد کو
مشورہ دے سکتی ہے۔ اس طریقے سے اس کا کوئی بھی دوست
اسے مشورہ دینے سے قاصر رہے گا۔ قدرتاً مرد کا دل عورت
کے مقابلہ میں سخت ہوتا ہے۔ اس سختی کے زیر اثر جو قدرت
نے اُس کے حصہ میں ودیعت کر دی ہے۔ وہ نرمی کا
سلوک کرنے سے معذور ہے۔ مرد چونکہ خود کو حاکم اور عورت
کو محکوم سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس لئے وہ عورت کے
ہر اس معاملے میں جو اس کی بہبودی کا باعث ہو۔ تجاہلِ
عارفانہ سے کام لیتے ہیں یہی وجہ ہے جس نے اسلامیہ
کالج میں عورتوں کے لئے کسی قسم کی بہتری کا سامان
پیدا نہ ہونے دیا۔

جب سے کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ پروفیسروں اور
طالبعلموں کے ساتھ ساتھ کالج کے احاطہ میں عورتوں
اور بچوں کا بھی اضافہ ہوتا گیا۔ مگر زندگی کی طرز جو پہلے تھی
وہ ہی رہی۔ اور عورتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد۔ مردوں
کی بے اعتنائی کو نہ مٹا سکی۔

خواتین نے خود اپنی دقتوں کو محسوس کر کے ایک دو
مرتبہ اپنے لئے ایک علیحدہ کلب قائم کرنے کی کوشش کی۔
مگر کسی قسم کی حوصلہ افزائی نہ ہونے کے باعث یا اور وجوہ سے
ان مساعی میں کامیابی نہ ہوئی۔ اب پھر چند خواتین کی کوشش
سے مسز سکاٹ صاحبہ (زوجہ پرنسپل صاحب) کی زیر صدارت
ایک لیڈیز کلب کی بنیاد ڈالی گئی ہے خاتون مذکورہ کی عنایت
سے انہی کے بنگلے میں عورتوں کو مل بیٹھنے اور بیڈمنٹن وغیرہ
کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کلب کامیابی
سے چلتی رہے گی۔

مسز اے۔ قریشی

یاد نہ کر دلِ حزیں ——

زمانہ نہایت تیزی سے گذر رہا ہے۔ اب تو میں فورتھ
ایر میں ہوں سینئر سٹوڈنٹ ہوں۔ فرسٹ ایروں کو فول
کہنے سے نہیں جھجکتا اور فرسٹ ایروں کو فول بنانا میرے
بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ مگر جب مجھے اپنے فسٹ ایر کا وقت
یاد آتا ہے۔ تو بے اختیار رحمت اور رحیم صاحب یاد آجاتے
ہیں۔ میرے روم میٹ تھے جنہیں شاید میں کبھی فراموش نہ کر سکوں

ہم گرانٹ ہاسٹل میں رہا کرتے تھے۔ ہمارا کمرہ کافی
بڑا تھا۔ جو شاید کسی زمانہ میں ڈائننگ ہال یا کامن روم
رہا ہو۔ ہمارا سامان بڑی ترتیب سے پڑا رہتا تھا۔ اگر
چار پائیاں کمرے کے عین وسط میں رونق افروز ہیں تو
کرسیاں بکس اور میزیں دیوار کے ساتھ جلوہ فگن۔ ایک
کھونٹی کے ساتھ متھاکو کا تھیلا آویزاں۔ دوسری کے ساتھ

رحمت صاحب کا شبخوابی کا دھاریدار پاجامہ جو کسی نو آموز درزی کا غیر فانی شاہکار تھا اور جسکا ایک پائنچہ دوسرے سے پورے تین انچ زیادہ چوڑا تھا۔ اگر ہمارے کوٹ کرسیوں کو زیب دیتے تو کتابیں چارپائی پر ہوتیں۔ الغرض ہمارے کمرے میں ہر چیز ہمارے سلیقہ کی آئینہ تھی۔

ہمیں اپنے اخراجات کے لئے نفع و نقصان۔ شرکت اور تناسب کے بھولے ہوئے گُروں کو از سر نو ازبر کرنا پڑا۔ بات فی الحقیقت یوں ہوئی۔ کہ ایک دن ہم صدر گئے۔ اور اپنے لئے ایک لوٹا۔ ایک گلاس۔ سیاہ پالش ایک ڈبی۔ چنبیلی کے تیل کی ایک بوتل۔ ایک سُوئی۔ دھاگہ کی دو گولیاں۔ دو سیر چینی۔ اور ایک چائے نماز خرید لائے۔ ہم نے یہ طے کیا کہ ہم سب چیزیں اکھٹی خریدیں گے۔

اب غضب تو یہ تھا کہ رحمت صاحب چائے پینے کے عادی نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چائے نوشی سے پورے ایک سو ایک عارضے لاحق ہوتے ہیں۔ مگر چینی خرچ کرنے میں برابر کے حصہ دار تو تھے ہی۔ جھٹ دو تین لڑکوں سے یارانہ گانٹھ لیا۔ اور بلا لحاظ موسم و آب و ہوا۔ کیا صبح۔ کیا شام جس دم دیکھو شکنجبین تیار ہے۔ خود بھی پی پی کر جھوم رہے ہیں ۔۔ اور دوسروں کو بھی ساقی بن کر دُنیا و مافیہا سے بےخبر بنا رہے ہیں۔ مگر افسوس۔ صد افسوس! یہ دَورِ شیریں زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ جونہی مُفت شربت کی شہرت عالمگیر ہوئی۔ لڑکوں نے آپ کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا۔ اور آپ کا نام "شربتی" مشہور کر دیا۔ آپ پُورے ایک سال تک اس لقب سے سرفراز رہے۔ خیر آپ نے شربت کا قضیہ چُکا دیا۔ یعنی چائے پینی شروع کر دی۔

آپ کا سر تو ماشاءاللہ سو گز کے فاصلہ سے ہُو بہُو مرغی کا تازہ انڈا معلوم ہوتا تھا۔ مطلب یہ کہ آپ بال نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ہر ہفتہ سر صفاچٹ کراتے۔ مگر سر پہ اتنا تیل لگاتے۔ کہ وہ گردن تک بہنے لگ جاتا۔ مجبوراً دھو کر اسے دُور کرتے۔ پھر تیل لگاتے پھر دُور کرتے۔ اور یونہی دن میں صرف پانچ مرتبہ یہ عمل دُہراتے۔ کیوں نہ ہو چنبیلی کا تیل۔ اس معمول سے اکتا گئے تو ایک ماہ بعد بال رکھوا لئے۔ اور اپنی تمام تر توجہ بالوں کے سنوارنے کی طرف منعطف کر لی۔ دن میں کوئی چودہ دفعہ بال سنوارنا ان کا مشغلہ بن گیا۔

جائے نماز کے متعلق تو اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ کہ ہم نے ایک ہفتہ کے بعد نماز بالکل ہی ترک کر دی اور جائے نماز تو بہرے کو "بخشش" میں دیدی۔

ایک دن سویرے جو بیدار ہوا۔ تو دیکھا کہ رحمت صاحب بُوٹ پالش کر رہے ہیں کچھ عجیب ہی منظر تھا۔ بُوٹ تو آنجناب کے سُرخ تھے۔ پالش اُن پر سیاہ ہو رہی تھی سمجھا کہ شائد میری آنکھیں مجھے دھوکہ دے رہی ہیں۔ مگر جو خُوب دیکھا تو یار آخر خُدا کی باتیں خدا ہی جانے" کسی کو کیا کہتے خود اپنی ہی جمہوریت کی نیک نامی ہوتی تھی۔

رحیم صاحب کے متعلق بھی سُن لیجئے۔ آپ وہمی طبیعت کے مالک تھے۔ جب بھی آپ صدر جاتے۔ ضرور ایک دو نئی ادویات کی شیشیاں ساتھ لاتے۔ آپ اخبار اسی لئے پڑھتے کہ کوئی دوا کا اشتہار مِل جائے۔ اور پھر اُسے خریدنے کا آرڈر دیں۔ آپ قوانینِ صحت کے پابند رہنے کی ہر ممکن سعی کرتے۔ جُون کے دنوں میں بلا ناغہ دو بجے دوپہر کو سیر کی خاطر نکلتے اور پانچ بجے واپس آتے۔ مگر پھر بھی آپ کی صحت بگڑی ہی رہتی۔ آپ کی عادت ہو گئی تھی۔ کہ آپ ہر تندرست آدمی سے پُوچھتے۔

"رشید صاحب! آپ کتنی روٹیاں کھایا کرتے ہیں؟"

"جی مَیں تو صرف ایک ہی روٹی کھاتا ہوں"۔

"ہاں! یہی بات ہے کہ میری صحت خراب ہے کیونکہ
میں ڈیڑھ روٹی کھاتا ہوں"۔ اور اس کے بعد آپ کم خوری
کی عادت ڈالتے۔ پھر کسی اور کو دیکھتے اور اس سے پوچھتے۔
"گوہر صاحب! آپ کتنی روٹیاں کھایا کرتے ہیں؟"
گوہر: "رحیم صاحب! میرا تو چار روٹیوں پر بھی سچ
پوچھیں تو گذارہ نہیں ہوتا"۔
"یہی وجہ ہے کہ آپ کی صحت اچھی ہے اور میری خراب
ہے آئندہ میں بھی چار روٹیاں کھایا کروں گا"۔
اور اس کے بعد آپ زیادہ روٹیاں کھانے کی کوشش
کرتے مگر آپ کی صحت جیسی تھی ویسی رہی۔
ہم تینوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ ہم نے "الیکشن"
سے بھی فائدہ نہ اٹھایا۔ حالانکہ الیکشن میں فسٹ ایروں کی
بڑی قدر ہوا کرتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہم تینوں تمام
سینئر لڑکوں کے مذاق کا نشانہ بنے رہے۔ نہ معلوم ہمیں فول
بنانے میں لڑکوں کو کیا مزا آتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ
میں ڈائننگ ہال میں بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ کہ ایک صاحب
آئے اور بڑی سنجیدگی سے کہا۔
"قیوم صاحب! ہاسٹل گیٹ پر آپ کے مہمان آئے
ہوئے ہیں"۔
میں نے اسی وقت کھانا چھوڑ دیا۔ سمجھا شاید میرے
بھائی صاحب آئے ہوں۔ مگر جب میں ہاسٹل گیٹ پر پہنچا
تو وہاں مہمان تو مجھے کوئی نظر نہ آئے۔ البتہ دو گدھے کھڑے
تھے۔ جو غالباً کسی دھوبی کے تھے۔ اب میں سمجھا کہ میرے ساتھ
مذاق کیا گیا ہے۔ میں واپس ڈائننگ ہال میں پہنچا۔ تو کیا
دیکھتا ہوں کہ کھانا غائب ہے۔ اور سب لڑکے ہنس
رہے ہیں۔
ایک دفعہ رحیم صاحب بیمار ہو گئے۔ میں اور رحمت صاحب
ہسپتال کو گئے۔ ہم نے کالج کا کونا کونا چھان مارا مگر ہسپتال
کا پتہ نہ لگا سکے۔ کوئی تو ہمیں برج ہری سنگھ بھیج دیتا۔ اور
کوئی ٹریننگ کالج۔ آخر ایک شخص نے ایک عمارت کی طرف
اشارہ کر کے کہا کہ یہ کالج ہسپتال ہے۔ مگر ہم وہاں سے بھی
لوٹ آئے۔ کیونکہ وہاں تو مہمان خانہ لکھا ہوا تھا۔
جب ایک دو ماہ گذر گئے۔ تو لڑکوں نے ہمیں تنگ
کرنا چھوڑ دیا۔ اب ہمیں کسی چیز کا کھٹکا نہ رہا۔ اس لئے
ہم میں شدید اختلافات رونما ہونے شروع ہو گئے۔ نوبت
یہاں تک پہنچی۔ کہ ہم ایک دوسرے سے خفا ہو گئے۔ اور
کمرے کو علیحدہ علیحدہ قفل لگانے شروع کئے چنانچہ ہمارے
دروازے پر بیک وقت تین تالے لگے رہتے۔ مگر یہ طریقہ
ہم تینوں کے لئے تکلیف دہ تھا۔ کیونکہ جب تک ہم تینوں موجود
نہ ہوتے۔ دروازہ نہ کھول سکتے۔ بالآخر چند دنوں کے بعد ہمیں
اپنی پالیسی بدلنی پڑی۔ اور ہم نے صرف ایک ہی قفل پر
اکتفا کیا۔ جس کی چابی باہر برآمدے میں ایک گملے کے نیچے
پڑی رہتی۔
اچانک بلائے ناگہانی کی طرح امتحان نازل ہوا۔
مگر ہم تینوں نے امتحان کی تیاری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت
نہ کیا۔ میں تو خیر زراعت کا طالب علم تھا۔ مگر رحیم اور رحمت
صاحب تاریخ اور اقتصادیات کے متعلم تھے۔ رحمت صاحب
کے تاریخ پڑھنے کا نرالا طور تھا۔ آپ کتاب میں سے ایک
فقرہ پڑھتے اور پھر تمام دن اسے رٹتے رہتے۔ مثلاً اکبر ہمایوں کا
بیٹا تھا۔ ہمایوں اکبر کا بیٹا تھا۔ ہمایوں اکبر کا بیٹا تھا"۔ اکثر
رحیم صاحب آپ پر بہت ہنستے۔ اور آپ کی تاریخ خوانی کو
اوروں کے سامنے ڈائننگ ہال میں بڑے مزے سے بیان
کرتے۔
مگر میں کالج یا کمرے میں نہ پڑھ سکتا۔ اکثر کالج کی فرود

سے باہر چلا جاتا۔ اور اکثر کسی درخت کے اوپر چڑھ کر پڑھتا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ میں ایک شاہتوت کے اوپر بیٹھا بڑے مزے سے پڑھ رہا تھا۔ کہ مجھے چھینک آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی میں درخت سے گر پڑا۔ خوش قسمتی سمجھئے یا بدقسمتی۔ مجھے چوٹیں تو معمولی آئیں۔ مگر اپنی پیاری عینک سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اُس دن کے بعد میں کبھی درختوں پر نہیں چڑھا۔ اور اب تو درخت مجھے بہت بُرے لگتے ہیں۔ شائد یہی وجہ ہے۔ کہ علم نباتات میں کُند ہوں۔

ہماری مشترکہ زندگی میں سب سے دلچسپ واقعہ ہمارے مطالعہ کے اوقات تھے۔ شام کو روٹی کے بعد رحمت اور رحیم تو سو جاتے۔ مگر میں بارہ بجے تک پڑھتا رہتا۔ اور اس کے بعد سو جاتا۔ مگر سونے سے قبل رحمت صاحب کو جگا دیتا۔ آپ ہاتھ مُنہ دھو کر ساڑھے چار بجے تک پڑھتے رہتے۔ اور پھر رحیم صاحب کو جگا کر سو جاتے۔ رحیم صاحب ساڑھے چار بجے سے پڑھنا شروع کر دیتے۔ اور صبح ساڑھے آٹھ بجے ہم دونوں کو جگا دیتے۔

کاش رحیم صاحب کالج نہ چھوڑتے۔ ورنہ لطف رہتا۔ مگر خیر میری تو دُعا ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

رحمت صاحب اب بھی پڑھتے ہیں۔ اب تو آپ کی زندگی کا معیار بھی بلند ہو گیا ہے۔ آپ نے پہلے حقہ پینا شروع کیا۔ مگر اب سگرٹ پیتے ہیں۔ اگر کوئی آپ کو حقہ پیش کرے۔ تو آپ یہ کہہ کر انکار کرتے ہیں۔

"مہربانی! تکلیف نہ کریں صاحب! میں نے کبھی کرلیون اسے پیا ہے؟"

اب رحمت صاحب مانیٹر ہیں۔ کبھی کبھی کسی پر جرمانہ بھی کر دیتے ہیں۔ اگر چاہیں تو کسی کو بھوکا بھی رکھ سکتے ہیں۔ ورنہ آپ کے پاس دال چپاتی کی کیا کمی ہے۔ ع

"کس چیز کی کمی ہے "رحمت" تیری گلی میں"

مگر میں تو نہ مانیٹر ہوا اور نہ پراکٹر۔ شائد اسی میں بہتری ہو۔ مگر کالج میں ایک عہدہ ضرور رکھتا ہوں یعنی کھیتی باڑی سوسائٹی کا معتمد ہوں۔ اس پر بھی میں پھولا نہیں سماتا۔ کیا میں کسی سے کم ہوں؟ فورتھ ایر ہوں سینئر سٹوڈنٹ ہوں۔ فسٹ ایروں کو فُول کہنے سے نہیں جھجکتا۔ اور کالج میں فسٹ ایروں کو فُول بنانا میرے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔

عبدالقیوم۔ سال چہارم (زراعت)

جہاد

نوجوانو! وطن کے سردارو ۔۔۔ مادرِ ہند کے جگر پارو

ملک و ملت کی شان کے وارث ۔۔۔ میرے ہندوستان کے وارث

آج تم سے خطاب کرتا ہوں ۔۔۔ ذکر عہدِ شباب کرتا ہوں

عیش و عشرت میں جھومنے والو ۔۔۔ دَورِ ماضی پہ اک نظر ڈالو

تم کو معلوم بھی ہے کیا تھے ہم ۔۔۔ کے و جمشید سے سوا تھے ہم

تھے کبھی ہم جہان کے مالک — اس زمین آسمان کے مالک
ایک عالم پہ چھا چکے تھے ہم — سکہ اپنا بٹھا چکے تھے ہم
کامرانی کی دھن سمائی تھی — فرش سے عرش تک رسائی تھی
بھولے بھٹکے کے رہنما تھے ہم — دہر میں صورتِ وفا تھے ہم
آج سب کچھ بھلا دیا ہم نے — نام تک ہی مٹا دیا ہم نے
آج حالت بدل گئی اپنی — باعثِ شرم زندگی اپنی
بیکسی کا نقاب ڈالا ہے — مردہ ہو کر حجاب ڈالا ہے
آرزوئیں غلام رہنے کی — سر فگندہ مدام رہنے کی
اور تمنا وطن فروشی کی — مغربی طرز بادہ نوشی کی
حسرت و یاس کو کیا اپنا — بھوک۔ افلاس کو کیا اپنا
کیا اسے روزگار کہتے ہیں — کیا اسی کو بہار کہتے ہیں؟

عہدِ رفتہ کو اپنے یاد کرو
نوجوانو! اٹھو جہاد کرو

خوابِ غفلت سے ہوش میں آؤ — پھر سے اکبار جوش میں آؤ
غیر کی چارہ سازیاں دیکھو — اپنی مہماں نوازیاں دیکھو
کب تلک ذلتیں اٹھاؤ گے — رعبِ دولت سے تلملاؤ گے
کیوں ہو خاموش سوچتے ہو کیا — آ رہی ہے یہ آسماں سے ندا
وقت ہے آج ایک ہو جاؤ — محفلِ آشتی کو گرماؤ
پھر سے تدبیر ہاتھ میں لے لو — اپنی تقدیر ہاتھ میں لے لو
پھر بپا انقلاب ہو جائے — عہدِ پیری شباب ہو جائے
گردشِ صبح و شام کو بدلو — دہر کے اس نظام کو بدلو
ملک میں پھر بہار آجائے — پھر وہی روزگار آجائے

شاعرِ بینوا کو شاد کرو۔
نوجوانو! اٹھو جہاد کرو

دوارکا ناتھ راز
متعلم بی۔ٹی

یہ نظم مجلس السنۂ مشرقیہ کے سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی اور مستحق انعام قرار پائی

بربادِ تمنّا

لاکھوں اُمیدوں کی شکست کے بعد ایک تمنا کی تخلیق ہوتی ہے۔ سعید نے ریت کی بُنیادوں پہ ایک گھر بنایا۔ لیکن ایسی تعمیر کا جو انجام ہُوا کرتا ہے۔ وہی ہُوا۔ وُہ اپنی عُمر کی انیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ اُس کی زندگی کا بیسواں سال شرُوع ہونے والا ہی تھا۔ کہ اچانک بیماری نے اس کی ماں کو اس دُنیائے فانی سے رُخصت کر دیا سعید کے والد اچھے خاصے دولت مند آدمی تھے۔ اور دولتمند ہونے کے علاوہ کچھ اتنے زیادہ معمر بھی نہ تھے اسلئے دستورِ زمانہ کیمطابق انھوں نے اپنی خانہ آبادی دوبارہ کرلی۔ نئی ماں نے عام سوتیلی ماؤں کی طرح سعید کو دق کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اسے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔ باپ کو اُس سے ناراض کرا دیا۔ بات بات پر اُسے جھڑکیاں کھلوائیں۔ دن کا آرام اور رات کی نیند اُس پر حرام ہوگئی۔ وہ ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان دے چکا تھا۔ اور نتیجہ کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ اُسے گھر کا جہنم زار کاٹنے کھاتا تھا۔ اور وُہ شب و روز ایسی ناقابلِ برداشت زندگی سے مخلصی حاصل کرنے کے منصُوبے باندھا کرتا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد امتحان کا نتیجہ برآمد ہُوا۔ اور سعید اچھے نمبر لے کر پاس ہوگیا۔ گھر سے تو پہلے ہی اس کا دِل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ اب اُس نے نکل بھاگنے کا تہیہ کرلیا۔ چنانچہ موقع پاکر ایک دن وہ کسی کو بغیر اطلاع دیئے گھر سے چلا گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ہمّت کرکے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو۔ اور کچھ کما کر پس انداز بھی کرلے تاکہ مفلسی کی لعنت جس کی وجہ سے اس کے دل کی مالکہ عذرا کے ماں باپ نے اُسے اپنی فرزندی میں قبول کرنے سے انکار کر رکھا تھا دُور ہو جائے۔

سعید کی والدہ نے اپنی زندگی میں ہی عذرا کی ماں کی بہت منت سماجت کی تھی۔ کہ عذرا کی شادی سعید کے ساتھ ہو جائے۔ مگر عذرا کے والدین کو یہ گوارا نہ ہوا۔ کہ ان کی بیٹی ان سے کم حیثیت کے گھرانے میں بیاہی جائے۔ اب سعید کی نئی ماں کے آجانے کے بعد تو اس رشتہ کا تصوّر کرنا ہی ناممکن ہوگیا۔ سعید خود سوتیلی ماں کے ہاتھوں نالاں تھا۔ عذرا جیسی تعلیم یافتہ لڑکی کے ماں باپ کب منظور کرسکتے تھے۔ کہ وُہ ایسی اذیت بخش دُنیا میں جاکر سعید کی شریکِ حیات بنے۔ عذرا اور سعید ایک ہی محلہ میں پیدا ہوئے۔ ایک ہی مکتب میں پڑھتے رہے۔ اکٹھے کھیلتے کُودتے رہے۔ اور بچپن سے ہی ایک دُوسرے سے مانوس ہوگئے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اُن کے اُنس میں بھی ترقی ہوتی رہی۔ چنانچہ اب وُہ ایک دُوسرے کو دل و جان سے چاہنے لگے تھے۔

اوائلِ عمر کے سب واقعات سعید کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ اور اُس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ وُہ اپنی روزی کمانے لگے۔ اور ہر امکانی کوشش کرکے "کم حیثیتی" اور "بے روزگاری" کے داغ کو اپنے چہرے سے دُور کردے۔

تلاشِ روزگار میں اُسے بمبئی جیسے صنعتی مرکز کا خیال
... اُس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہاں جا کر اپنی بگڑی
... تعمیر کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ بمبئی
... پر سے اُترتے ہی اُس نے ایک اخبار خریدا۔
... کو پڑھنا شروع کیا۔ ایک جگہ لکھا ہوا
... ایک نوجوان کی۔ جو کم از کم میٹرک پاس
... ایک بڑے کارخانہ کے دفتر میں کام کرنے کی
... رکھتا ہو۔ درخواست اصالتاً پیش کی جائے۔"

سعید کے دل میں اُمید کی جھلک نمودار ہوئی۔ اور وہ سیٹھ محمد ابراہیم کلاتھ مل کے دفتر میں گیا۔ مالک کارخانہ نے سعید کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ اور اس کی طرزِ گفتگو۔ عام واقفیت اور مستعدی سے متاثر ہو کر اُسے ملازمت میں لے لیا۔ سعید کی اُمیدیں بر آئیں۔ اُس نے اپنا کام بڑی محنت اور جانفشانی سے کرنا شروع کر دیا۔ منیجر اس کی دیانتداری اور قابلیت سے بے حد خوش رہنے لگا۔ اور سعید کی ترقی بھی جلد جلد ہونے لگ گئی۔ اب اُسے بظاہر دُنیا کی راحت و آسائش حاصل ہونے لگی۔ ایک خلش اُس کے دل میں پوشیدہ رہ گئی۔ جو بار بار اُسے ستاتی تھی۔ اور جس کا مداوا اُس کے بس سے باہر تھا۔ سعید کو تنخواہ ہر ماہ وقت پر مل جایا کرتی تھی۔ کوئی اور نوجوان ہوتا تو اپنی آمدنی کو بے دردی سے بلا دریغ خرچ کر دیتا۔ مگر سعید اپنی آمدنی کا ایک حصہ لوازماتِ زندگی پر خرچ کرنے کے بعد باقی سیٹھ محمد ابراہیم مالک کارخانہ کے نام جمع کرا دیا کرتا تھا۔ بھلا ایسی غیر معمولی حرکت کب تک پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ سیٹھ کو پتہ لگ گیا کہ یہ وفاشعار لڑکا اپنی قلیل آمدنی سے بھی کچھ بچا کر میرے نام پر ہی جمع کرا دیتا ہے۔ ایک دن ابراہیم نے سعید کو اپنے پاس بُلا کر ہمدردانہ لہجہ میں دریافت کیا۔ کہ "سعید یہ روپیہ اپنے ماں باپ کے نام کیوں جمع نہیں کراتے؟" سعید کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے درد بھری آواز میں جواب دیا۔ کہ "میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ میں تو آپ کو ہی ماں باپ سمجھتا ہوں۔"
سیٹھ ابراہیم کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اُس کے دل پر سعید کی محنت۔ قابلیت۔ دیانتداری۔ وفاشعاری کا گہرا نقش قائم ہو چکا تھا۔ اُس نے بے اختیار سعید کو گلے سے لگا لیا اور کہا کہ آج سے تم ہی میرے بیٹے ہو۔ سعید کو مدت کے بعد کسی کا سہارا ملا۔ اُس کی ہچکولے کھاتی ہوئی ناؤ کنارے پر آ لگی۔ مگر اس کو رہ رہ کر عذرا کی یاد تڑپا تی تھی۔ عذرا کے خطوط اس کی زندگی کا بیش بہا ترین خزانہ تھے جسے وہ ہمیشہ سینہ سے لگائے رکھتا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد بوڑھے سیٹھ ابراہیم نے چاہا۔ کہ جیتے جی اپنے لے پالک بیٹے کی شادی کی خوشی دیکھ لے۔ چنانچہ اُس نے سعید کے لئے دُلہن کی تلاش شروع کر دی۔ سعید اب ایک مالدار شخص کا بیٹا تھا۔ اب اُس کے رشتہ کو کوئی شخص "کم حیثیتی" کی بنا پر نامنظور نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ سعید کا نکاح سیٹھ ابراہیم کے فیصلہ کے مطابق سیٹھ مذکور کے ایک پُرانے دوست کی لڑکی سے ہو گیا۔ لڑکی کا والد کسی زمانہ میں بہت مالدار تھا۔ لیکن اب انقلابِ زمانہ نے اُسے معمولی حیثیت کا سفید پوش انسان بنا دیا تھا۔ سعید نے ابراہیم کی خواہش کے احترام کی وجہ سے رشتہ قبول کر لیا لیکن اسکے دل میں رہ رہ کر عذرا کی یاد چٹکیاں لے رہی تھی۔ وہ زندگی سے بیزار سا ہو گیا۔ شادی اس کیلئے پیامِ مرگ بن کر آئی۔

شادی کی رات سعید یاس و اضطراب کی حالت

اپنے کمرے میں کھڑا ٹہل رہا تھا۔ اُس نے عذرا کے ایک
ایک خط اور فوٹو کو بار بار دیکھا۔ رہ رہ کر عذرا کی یاد
اُسے ستا رہی تھی۔ اُس کے دماغ میں تلاطم بپا تھا۔ وُہ
اپنی اس ناکام زندگی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتا تھا۔
اُس نے تین بار زہر کی بوتل اٹھائی۔ . . . . . پھر سوچا
. . . . . . پھر رکھدی . . . . . . مگر . . . . . . آخر کار زہر
کے دو گھونٹ پی لئے۔ اور عذرا کی تصویر پر ایک حسرت
بھری نگاہ ڈالی۔ اُس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اور وُہ
سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں دُلہن کمرے میں
داخل ہُوئی۔ اُس نے اپنے خط اور فوٹو سعید کے قدموں میں
بکھرے ہُوئے دیکھے۔ اور اس کی زبان سے بے ساختہ
چیخ نکل گئی۔ سعید نے عذرا کو پہچان لیا۔ لیکن وُہ حالتِ
نزع میں تھا۔ عذرا نے اصل حقیقت کو بھانپ لیا۔
اور بوتل میں جو باقی ماندہ زہر تھا۔ وُہ پی لیا۔

صفدر علی اسمٰعیلی

ایک تاریخی ورق

خاموش چاندنی میں پہرے دار کھڑے اُونگھ رہے
تھے۔ جہاں چند گھنٹے پہلے جدال و قتال کی گرم بازاری
تھی۔ اور توپوں کی گرج نے شورِ قیامت برپا کر رکھا تھا
وہاں اب ایک سناٹے کا عالم تھا۔ شیر جنگ اپنے خیمے
کے اندر تنہا بیٹھا دُنیائے تخیل کی سیر کر رہا تھا۔ چہرے پر
فکر کے آثار ہویدا تھے۔ سامنے کے خیمے میں شیر جنگ کا
بھائی شیر دل بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کا
وفادار غلام انور اُس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یکایک شیر
جنگ کے کمرے میں غیر معمولی روشنی نمودار ہوئی۔ اور ایک
بوڑھی عورت سفید لباس زیب تن کئے خیمہ میں داخل
ہوئی۔ اس کے چہرے سے متانت۔ راست بازی اور
شرافت ٹپکتی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ترازو اور
بائیں ہاتھ میں ایک تازہ گلاب کا پھول تھا۔ داخل ہوتے
ہی شیر جنگ سے یوں ہم کلام ہوئی۔ "اے شاہزادے!
دنیا والے مجھے نیکی کے نام سے پکارتے ہیں۔ میں طالبانِ
حق کی غمگسار ہوں۔ میرا کام دُنیا والوں کو راہِ راست پر
چلانا ہے۔ جو شخص میرا طالب ہے۔ اُسے خُدا کا دیدار حاصل
ہوتا ہے۔ آج تک تیری عمر زُہد و سخا میں گذری ہے۔ تو نے
کڑے وقتوں میں بھی سچائی کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ آج تیرے
پائے استقلال کو لغزش کیوں ہے۔ آج تیری کشتیٔ حیات
گرداب فنا کی طرف کیوں بہی جا رہی ہے۔ آج تیرے
خُدا شناس دل پر شیطان نے کیوں قابو پا لیا ہے۔ مَیں
تجھے نصیحت کرنے آئی ہُوں۔ کہ ان خیالات کو چھوڑ اور
میرا طالب ہو۔ دُنیا پر لات مار اور جان لے کہ یہ
فانی ہے۔"

شیر جنگ کے دل پر اس تقریر کا اس قدر اثر ہُوا
کہ وُہ مارے شرم کے پسینہ پسینہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے
بعد وُہ عورت پھر بولی "اب مَیں تجھ سے خوش ہوں۔ تیرے

چہرے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ میری نصیحت کارگر ہوئی ہے۔
اُٹھ۔ یہ پھول اور ترازو میں تیرے لئے تحفہ لائی ہوں"۔
شیر جنگ نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ عورت نے ہاتھ آگے
بڑھایا۔ شیر جنگ تیار تھا کہ اُس کے ہاتھ کا بوسہ لے۔
مگر معاً دل میں کچھ خیال آیا۔ اور وہ رُک گیا۔ عورت ہنس
کر کہنے لگی "مَیں خیال کرتی تھی کہ تو دانا اور تیز فہم ہے۔ مگر تو نے
ترازو اور پھول کا مطلب نہیں سمجھا۔ دیکھ یہ ترازو انصاف
کا ہے۔ اور یہ پھول عیش ابدی۔ اگر عیشِ ابدی چاہتا ہے۔
تو انصاف کر"۔ شیر جنگ نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور ترازو
اور پھول لے لئے۔ عورت غائب ہو گئی۔ شیر جنگ کی زبان
پر الفاظِ تشکر ہی تھے۔ کہ دروازہ پھر کھلا۔ شیر جنگ نے مُڑ
کر دیکھا۔ کہ شائد نیکی پھر آئی ہے۔ مگر اس دفعہ اُس نے ایک
خوبصورت جوان سال عورت کو دیکھا۔ کہ مرصع لباس زیب
تن کئے۔ دروازے کے پاس کھڑی ہے۔ اس کے دائیں
ہاتھ میں ایک خنجر ہے۔ اور بائیں ہاتھ میں تاج۔ کچھ دیر
تک یہ حسین دیوی خاموش کھڑی رہی۔ بالآخر یُوں گویا ہوئی
"شیر جنگ! دُنیا والے مجھے بدی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔
زاہد اور متقی میرے نام سے گھبراتے ہیں۔ عارف مجھے حقارت
کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر مَیں نوعِ انسان کو ایک نظر
سے دیکھتی ہوں۔ اور اُن کی طعن و تشنیع سے ذرا نہیں
گھبراتی۔ یہاں تک کہ سب میرے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔
پھر آہستہ آہستہ جوشِ محبت بڑھتا ہے۔ اور وہ میرے
سچے عاشق بن جاتے ہیں۔ مَیں زر و جواہر اُن پر نثار کرتی
ہوں۔ بادۂ محبت سے سرشار کرتی ہوں اب چاہتی ہوں کہ
تیرا نخلِ تمنا بھی سرسبز و شاداب ہو۔ کیا تو چاہتا ہے کہ یہاں
کی حکومت تیرے ہاتھ آجائے؟" شیر جنگ "ہاں"۔ بدی:-
"تو پھر کیوں اپنے ارادے سے منحرف ہو رہا ہے۔ کیوں
بھائی کے گلے پر خنجر چلانے سے ہچکچاتا ہے؟ اگر تو تاریخ
کا قائل ہے۔ تو تاریخ کے اوراق اُلٹ اور دیکھ کہ بادشاہانِ
سلف کے ساتھ اُن کے بھائیوں نے کیا سلوک کیا"۔
شیر جنگ کا حال دگرگوں ہو گیا۔ مگر وہ خاموش رہا
بدی بولی "اب مَیں تجھ سے خوش ہوں۔ اُٹھ اور میرے ہاتھ
کا بوسہ لے"۔ شیر جنگ نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ بدی نے
اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا۔ تاج جو کہ خنجر کے ساتھ پیوستہ تھا۔
ہوا میں لٹکنے لگا۔ بدی بولی "دیکھ یہ تاج اور خنجر آپس میں
پیوستہ ہیں۔ اگر تاج حاصل کرنا چاہتا ہے تو خنجر کو لے"۔
اب اس نصیحت پر جو نیکی نے کی تھی۔ پانی پھر گیا۔ شیر جنگ نے
ہاتھ بڑھایا اور خنجر لے لیا۔ اور بدی غائب ہو گئی۔
شیر جنگ بھائی کو موت کے گھاٹ اتارنے اُٹھا۔
دل میں خیال آیا کہ پہلے بھائی کے وفادار خادم انور کا
قلع قمع کرنا چاہیئے۔ اپنے چند نوکروں کو اُسی وقت حکم دیا۔
کہ جس وقت انور باہر نکلے اسے فوراً قتل کر دو۔ پہلے تو
اُن کے دلوں نے ایسا مکروہ کام کرنے سے انکار کرنا چاہا۔
مگر شیر جنگ کی ہیبت غالب آئی۔ اور وہ فوراً تیار ہو گئے۔
شیر جنگ آہستہ آہستہ شیر دل کے خیمے کی طرف بڑھا۔
شیطان اس وقت خیمے کی آڑ میں کھڑا سب تماشا دیکھ
رہا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا۔ فوراً راز فاش کرنے پر تیار
ہو گیا۔ مگر بدی کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا۔ چاہا کہ شیطان
کو سزا دے۔ مگر وہ اُچھلتا کُودتا شیر دل کے لشکر کی طرف بھاگ
گیا۔ اب شیر جنگ عین دروازے کے مقابل پہنچ گیا
تھا۔ اور کوئی حریف نہ تھا۔ عین دروازہ کے سامنے
جا کر انور کو اشارہ کیا۔ کہ باہر آئے۔ انور نکلا ہی تھا کہ
اُسے موت کے فرشتے ہاتھوں ہاتھ سوئے عدم لے گئے۔
شیر جنگ دل میں بہت مسرور ہوا۔ کہ خدا نے

آج اس کا نخلِ اُمید ہرا کیا جُونہی ایک پاؤں کمرے کے اندر رکھا۔ شیر دل کی شجاعت سامنے آ گئی۔ اِس کے پاؤں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ ہاتھ تھرتھرائے۔ دل پر خوف چھا گیا۔ ہوس اور محبت میں جنگ چھڑ گئی۔ تخت کی محبت آگے دھکیلتی تھی بھائی کی محبت روک لیتی تھی۔ اتنے میں بدی پھر نمودار ہوئی۔ اِس کے دیکھتے ہی محبت غائب ہو گئی۔ بدی پُرجوش لہجہ میں بولی۔ "شیر جنگ! مَیں تجھے تدبیر کا پکا اور بہادر سپاہی سمجھتی تھی۔ تیری کوتاہ فہمی اور بُزدلی پر افسوس آتا ہے۔ اِس ادنےٰ سے کام کے سرانجام دینے میں اس قدر تشویش؟ قدمِ شجاعت کو آگے بڑھا۔ برادرانہ محبت کو کوئیں میں پھینک۔ دیکھ میں تیری تاجپوشی کے انتظار میں کھڑی ہوں"۔

شیر جنگ آگے بڑھا۔ مگر سر چکرانے لگا۔ خنجر ہاتھ سے گرا جاتا تھا۔ دل بیٹھا جاتا تھا۔ بدی یہ حالت دیکھ نہ سکی۔ اور فوراً بولی: "جس جگہ ہمت کام نہ دے۔ تدبیر کو عمل میں لانا چاہئے۔ جو شکار خنجرِ شجاعت سے بچ نکلے۔ اِس کو دامِ تدبیر میں پھنسا کر گرفتار کرنا چاہئے۔ حرم سے ننھے بچے کو بُلا۔ کیا تو سمجھ گیا"؟ یہ کہہ کر بدی غائب ہو گئی۔

ننھا بچہ انعام کے شوق میں دبے پاؤں گیا۔ اور شیر دل کی تلوار اٹھا کر شیر جنگ کے پاس لے آیا۔ شیر جنگ نے پھر لالچ دیا۔ اور بچے نے خنجر بھی لا حاضر کیا۔ اِس معصوم کو یہ علم نہ تھا۔ کہ وُہ اپنے چچا کے حق میں زہرِ قاتل کا کام کر رہا ہے۔

اب شیر جنگ نے حکم دیا۔ کہ شیر دل کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ جلّاد بیڑیاں لئے شیر دل کے گرد جمع ہو گئے۔ غریب شیر دل بڑی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ فوراً بیدار ہو گیا۔ چاہا سب کو موت کے گھاٹ اُتار دے۔ مگر افسوس تلوار کہاں؟ ناچار انور کو پکارنا شروع کیا۔ انور کہاں تھا کہ حکم کی تعمیل کرتا۔ وُہ بیچارہ حقِ نمک ادا کر چکا تھا۔ انور کی عدم موجودگی نے شیر دل کو اور بھی تڑپا دیا۔ اُس نے ایک سرد آہ کھینچی اور کہا:۔

سلطنت کی خواہش نے بھائی کا لہو سفید کر دیا۔ کہاں ہیں۔ وُہ قسمیں جو قرآن پہ ہاتھ رکھ کر کھائی گئی تھیں۔ کہاں ہیں۔ وُہ وعدے۔ جو قبلہ رُو ہو کر کئے گئے تھے۔ آہ! تو نے بھائی کے لباس میں قصاب کا کام کیا۔ کاش مَیں اِس سے واقف ہوتا ....!"

دُوسرے دن صبح سویرے شیر جنگ کی بادشاہت کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔

مرزا اصلاح الدین اختر
فرسٹ ائر

آ

صبر و سکوں نے عشق میں اپنا دیا نہ ساتھ
کوئی نہیں رفیق۔ غمِ دل فگار۔ آ

آنکھیں کھلی ہیں بعدِ فنا انتظار میں
جاں لے کے بھی گیا نہ ترا انتظار۔ آ

تجھ کو بلا رہا ہوں تو بنیہ بگوش ہے
او بھول جانے والے فراموش کار۔ آ

گُل ہو نہ جائے دیکھ چراغِ حیات۔ آ
کیا اعتبار ہستیٔ ناپائیدار۔ آ

سید عبدالرشید گیلانی

ادائے فرض

"ابا۔ یہاں ایک شمالی پلٹن آئی ہوئی ہے۔ مَیں اس میں بھرتی ہونا چاہتا ہوں۔" یہ الفاظ مغربی ورجینیا کے ایک نوجوان کارٹر ڈروز نے اپنے باپ سے کہے۔ یہ وُہ زمانہ تھا جب اضلاعِ متحدہ امریکہ کی شمالی اور جنوبی ریاستوں کے درمیان خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ جنوبی ریاستیں رُوئی کی کاشت کے لئے افریقہ سے حبشیوں کو غلام بنا کے لایا کرتی تھیں۔ شمالی ریاستیں رسمِ غلامی کو دُنیا سے معدُوم کرنا چاہتی تھیں۔ یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے ایک ہولناک جنگ کی شکل اختیار کر گیا۔ ریاست ورجینیا جنوبی ریاستوں کے ساتھ تھی۔ کارٹر کا باپ غلامی کا حامی تھا۔ لیکن کارٹر اور اس کی ماں شمالی ریاستوں کے ہم خیال تھے۔

باپ نے سر اٹھایا۔ اور تھوڑی دیر بیٹے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بھرے دل سے کہا: "جاؤ کارٹر۔ لیکن اپنا فرض کبھی نہ بھولنا۔ تم اپنی ریاست ورجینیا سے غداری کر رہے ہو۔ لیکن خیر۔ اگر زندہ رہے۔ تو جنگ کے بعد اس معاملہ کے متعلق بحث لیں گے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ تمہاری والدہ دو تین ہفتے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے اسے رنجیدہ کرنا بے فائدہ ہے۔"

چنانچہ کارٹر جا کر بھرتی ہو گیا۔ اور جلدی اپنی بہادری جرأت اور فرض شناسی کی بدولت اپنے تمام ساتھیوں اور افسروں میں مشہور ہو گیا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ آج وُہ ایک خطرناک مقام کی حفاظت پر مامور تھا۔ لیکن تکان اور گرمی کی وجہ سے اس وقت اس کا آہنی ارادہ نیند کے بے رحم ہاتھوں سے شکست کھا گیا تھا۔ اور وُہ اپنے فرض سے غافل خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ وُہ زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ اور اُس کا سر بائیں بازو پر رکھا تھا۔ اُس کا دایاں ہاتھ بندوق کے کندے پر تھا۔ اُس کے گرد درختوں کا جھنڈ تھا۔ جو ایک چٹان کے سرے تک چلا گیا تھا۔ چٹان سیدھی نیچے وادی تک جاتی تھی۔ یہ وادی درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اور اس میں اس وقت پانچ شمالی پلٹنیں چھپی ہوئی تھیں۔ جو اندھیرا ہوتے ہی دُشمن کی فوجوں پر حملہ کرنے والی تھیں۔ شمالی افواج کا سپہ سالار چاہتا تھا۔ کہ دُشمن کو اُن کی موجُودگی کا علم نہ ہو۔ یہی وجہ تھی۔ کہ اس نے وادی کو آنے والے تمام راستوں پر پہرے دار مقرر کر دیئے تھے۔ کارٹر ڈروز بھی اُنہی پہرہ داروں میں سے ایک تھا۔ اگر کوئی اُسے سویا ہوا دیکھ لیتا تو اُسے یقیناً سزائے موت دی جاتی۔

اچانک اُس کی آنکھیں کھُل گئیں۔ اور اس کے ہاتھ کی گرفت بندوق پر مضبُوط ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ اور اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اُس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سامنے چٹان کی چوٹی پر ایک گھوڑا کھڑا تھا۔ گھوڑے کی پشت پر ایک سپاہی بیٹھا تھا۔ جو دُور سے یونانی دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ کارٹر نے آنکھیں ملیں۔ گھوڑا اور اس کا سوار ایسے بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ کہ اُسے خیال آیا کہ شاید میں "اصحاب کہف" کی طرح اختتامِ جنگ تک سویا رہا ہوں اور یہ میرے

سامنے جو بُت کھڑا ہے۔ وُہ جنگ کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اچانک سوار نے حرکت کی۔ اور کارٹر پر واضح ہو گیا۔ کہ یہ سوار دُشمن نے اُن کی نقل و حرکت دیکھنے کے لئے بھیجا ہے۔ اس نے بندوق اُٹھائی۔ اور کندے تک لے گیا۔ اتنے میں سوار نے منہ موڑا۔ اور اس کا چہرہ کارٹر کی طرف مڑ گیا۔ کارٹر کا رنگ فق ہو گیا۔ اور اس نے بندوق ہاتھ سے رکھ دی۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے کہ شاید اس سوار نے ابھی کوئی چیز ایسی نہ دیکھی ہو۔ جو ہمارے لئے خطرہ کا باعث ہو سکے۔ لیکن معاً اس کی نظر نیچے وادی کی طرف گئی۔ جہاں کوئی عاقبت نا اندیش افسر اپنے سپاہیوں کو کھلے میدان میں ورزش کروا رہا تھا۔ کارٹر کو اپنے باپ کی آخری وصیت یاد آئی۔ کہ "کارٹر اپنے فرض کو کبھی نہ بھولنا"۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بندوق اُٹھائی۔ اور بجائے سوار کے اس کے گھوڑے پر نشانہ باندھا۔ اُس کی انگلی کو جنبش ہوئی۔ گھوڑا اُچھلا۔ لیکن سوار نے اپنی نشست قائم رکھی اور نہایت اطمینان سے گھوڑے کے ساتھ ہلاکت کے منہ میں چلا گیا۔ دھماکہ ہوا۔ اور پھر خاموشی چھا گئی۔

کارٹر ڈرُوز نے بندوق بھری۔ اور پہرا دینے لگا۔ بمشکل دس منٹ گذرے ہونگے۔ کہ ایک سارجنٹ جھاڑیوں سے نکلا۔ کارٹر نے اُس کی طرف توجہ نہ کی۔ اور ویسا ہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اُس کی نظریں اس مقام پر جمی ہوئی تھیں جہاں کچھ دیر پہلے گھوڑا کھڑا تھا۔ سارجنٹ نے آہستہ سے پوچھا۔ "کیا تم نے گولی چلائی تھی؟"

کارٹر نے اس طرف دیکھے بغیر جواب دیا "ہاں"۔

"کس پر؟"

"ایک گھوڑے پر۔ جو سامنے چٹان پر کھڑا تھا"۔

کارٹر کا چہرہ سفید تھا۔ لیکن اُس کی اور کسی بات سے اُس کے جذبات کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ سارجنٹ نے کچھ دیر کے بعد کہا۔

"دیکھو۔ ڈرُوز۔ پہیلیاں نہ ڈالو۔ صاف صاف بتاؤ۔ کیا گھوڑے پر کوئی سوار آیا تھا؟"

"ہاں"۔

"کون؟" "میرا باپ"۔

(ماخوذ از امبروز بائیرس) محمد یوسف ہزاروی سال دوم

پھول

حسبِ معمول سہ پہر کی چائے کے بعد میں سیر کو نکل گیا۔ عام طور پر تو اندھیرا ہونے سے پہلے ہی ہاسٹل کو لوٹ آیا کرتا ہوں۔ لیکن جب کبھی آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں۔ اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہو۔ تو میں تصورات کے عالم میں کھو جاتا ہوں۔ اور بحرِ تخیل میں غوطہ زن ہو کر بہت دور نکل جاتا ہوں۔

کل بھی قدرت اپنے جوبن پر تھی۔ موسم بہار تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ پرندوں کے سُریلے نغموں سے

... ہوا جارہا تھا۔ ہوا کے ہلکے جھونکوں سے نازک ... عجب سماں پیش کر رہی تھیں۔ مگر قدرت ... حسین نظارے سے بھی پوری طرح لطف ... ہو چکا تھا۔ کہ ایک نرم ونازک پھول میرے پاؤں ... نیچے آتے آتے بچ گیا۔ خدا جانے کس بے درد نے ایسے خوبصورت پھول کو یوں کس مپرسی کی حالت میں زمین پر پھینک دیا تھا۔ میں نے پھول کو زمین سے اٹھا لیا۔ اور جھاڑ پونچھ کر اپنے کوٹ کے کالر میں لگا لیا۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لئے میں نے ہاسٹل کو لوٹ جانا ہی بہتر سمجھا۔ اور آہستہ آہستہ ہاسٹل کی طرف جانا شروع کیا۔ مگر اچانک اس خاموشی اور تاریکی کے عالم میں مجھے ایک آواز سنائی دی "ٹھہریئے" میں ڈر گیا۔ کیونکہ میرے خیال میں اس گردو نواح میں اس وقت کوئی انسان موجود نہ تھا۔ کچھ حوصلہ کر کے ادھر ادھر دیکھا۔ تو کوٹ کے کالر سے یہ الفاظ آتے سنائی دیئے۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں"

میں نے کالر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"آہا حضرت! آپ ہیں۔ میرے تو ڈر کے مارے اوسان خطا ہو چلے تھے"

پھول یوں گویا ہوا۔ مگر پرسوز لہجے میں۔ "آپ شاید اپنے دل میں خوش ہو رہے ہونگے۔ کہ آپ نے اپنے کوٹ کے کالر میں جگہ دے کر مجھے عزت بخشی ہے۔ اور چند لمحات کے لئے ایک نئی زندگی عطا فرمائی ہے۔ میں آپ کی اس مہربانی کا دل سے ممنون ہوں۔ مگر آپ شاید یہ نہیں جانتے۔ کہ میری زندگی تو اس وقت سے ہی ختم ہو چکی ہے۔ جب مجھے شاخ سے الگ کیا گیا۔ مجھے اس شاخ سے بے حد محبت تھی۔ اور میں اس کی آغوش میں مرنا چاہتا تھا۔ مگر وائے بدبختی۔ کسی کے ظالم ہاتھ نے مجھے اس شاخ سے جدا کر دیا۔ اور وہ رشتہ جو اس کے اور میرے درمیان قائم ہو چکا تھا۔ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ میری سب امیدیں جو اس رشتہ سے وابستہ تھیں۔ خاک میں مل گئیں۔ میرا اس دنیا میں پھلنا پھولنا فلک کو شاید منظور نہ تھا ؎

وائے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اسے
ہم نے جس ڈالی کو تاکا آشیانے کے لئے

دوسروں کی زندگی بھر کی خوشی تم انسان اپنی لمحہ بھر کی خوشی پر قربان کر دیتے ہو۔ میں بھی دل رکھتا تھا۔ اس دل میں امنگیں تھیں۔ اور ان امنگوں پہ تیرتی ہوئی امیدیں۔ مگر آہ اب تو کچھ بھی نہیں رہا —— اف کتنی منحوس گھڑی تھی۔ وہ جب اس بے درد نے مجھے شاخ سے توڑا۔ توڑ کر سونگھا اور سونگھ کر پھینک دیا۔ کچھ پہلے میں کہاں تھا۔ اب کہاں ہوں اور کیا ہوں۔ شاید اسی کا نام انقلاب ہے۔

میں نے آپ سے جو کچھ کہا وہ میرے دلی احساسات کا صحیح اظہار تھا۔ تاکہ آپ میرے بھائیوں کے حق میں دنیا سے کچھ کہہ سکیں۔ مگر کیا بھروسہ آپ بھی تو دنیا والوں میں سے ہیں۔ خدا حافظ"۔

یکایک گھنٹی کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ جیسے کوئی خواب دیکھ کر جاگ اٹھتا ہے۔ یہ ہمارے ہاسٹل کی گھنٹی تھی۔ میں ہاسٹل کے دروازے کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے پھول کو کالر سے نکال کر میز پر رکھ دیا۔ دوسرے دن جب اسے دیکھا۔ تو وہ بالکل مرجھا چکا تھا۔

راجکمار شاداں سال سوم زراعت

زندگی کی دوراہیں

خداوند تعالیٰ نے اپنی قدرت سے کائنات کی تخلیق کی اور اسے ہر طرح سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ زمین کا فرش بچھا دیا۔ اور آسمان کی نیلی چھت کھڑی کر دی۔ نظامِ شمسی کی تشکیل ہو گئی۔ موسموں کا تغیر و تبدل عمل میں آیا۔ دن اور رات پیدا ہو گئے۔ پہاڑ عالمِ وجود میں آئے۔ دریاؤں کا جال بچھ گیا۔ غرض ہمارا کرۂ ارض جب ہر طرح سے مکمل ہو چکا۔ خالق نے حضرتِ انسان کو خلیفہ بنا کر دنیا میں بھیجدیا۔ اور اسے مختارِ کل بنا دیا۔ تاکہ وہ دُنیا کی بادشاہت کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اُس نے انسان کو ذہنِ رسا عطا کیا۔ اور اس پر فطرت کے بہت سے چھپے ہُوئے راز افشا کر دیئے۔ اور فطرت کی طاقتیں اُس کے ہاتھ میں دیدیں۔ تاکہ عملی طور پر سارے کائنات پر حاوی ہو جائے۔ اُس نے انسان کو ذہنِ رسا کے ساتھ اور بہت سی قابلِ قدر صلاحیتیں ودیعت فرمائیں۔ جنکی وجہ سے اسے تمام ارضی و سماوی مخلوقات پر فوقیت حاصل ہوئی۔ اور اسی طرح اس نے اشرف المخلوقات کا لقب پایا اور فرشتوں کو حکم ہُوا۔ کہ وہ انسانی عظمت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ یہ تمام باتیں اسلئے واقع ہوئیں کہ خداوند تعالےٰ اپنی حکمت بزرگی اور قدرت کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔ اسلئے اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان جسے خدا نے اتنی بڑی شخصیت کا مالک بنا دیا ہے۔ اور اس کی ذات میں اتنی قابلِ قدر اور مفید صلاحیتیں رکھدی ہیں۔ اس دُنیا میں کیونکر زندگی بسر کرے۔ کہ انسان اور کائنات جس مقصد کے لئے عالمِ وجود میں آئے۔ وُہ پُورا ہو۔

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شخصیت ہے کیا اور اس کا انسانی زندگی پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ اور سماج کو ترقی یافتہ شخصیت سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ مختصر الفاظ میں شخصیت ان بیشمار انسانی صلاحیتوں کی جلا اور ترقی کا نام ہے۔ جو اسے قدرت نے ودیعت فرمائی ہیں۔ اور انکی موجودگی اسے باقی مخلوق سے اور انکی تکمیل سے اپنے دیگر ہمجنسوں سے ممتاز بناتی ہے کہ وُہ ایک کامیاب انسان کی صُورت میں زندگی گذار سکے۔ مثلاً ایک شخص کی طبیعت میں مزاح کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن وُہ اپنی اس خوبی کو ترقی دینا نہیں چاہتا۔ بلکہ زندگی کے سنجیدہ مسائل اور زہد تقویٰ کی طرف متوجہ ہو کر اپنی اس صلاحیت کو دبانا چاہتا ہے۔ تو ضروری ہے کہ اس کی شخصیت کے اندر نقص واقع ہو جائے۔ اور اسکا زہد و تقوےٰ خشک زُہد کی صورت اختیار کرے۔ اور اس کے تمام اعمال کے اندر غیر ضروری سنجیدگی کے باعث پھیکاپن آجائے۔

اس کے علاوہ جو شخص اپنی ان خوبیوں کو جو اس کی ذات میں قدرت نے ودیعت کی ہیں۔ نہیں سمجھتا اور انہیں ترقی دینے کی بجائے محض مذہبی یا وطنی اور قومی جذبات سے متاثر ہو کر مسمار کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو کسی صورت میں بھی دُنیاوی حوادثات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لہذا سے ناموافق حالات میں بلا وجہ ہتھیار ڈال دینے پر مجبُور ہونا پڑتا ہے۔ اور اس کمزوری کے نتیجہ کے طور پر شخصیت کے اعتبار سے اس قسم کا آدمی صفحۂ ہستی سے جلد مٹ جاتا ہے۔

اسی طرح وہ لوگ جنکی طبیعت میں قدرتی سنجیدگی موجود ہے غیر سنجیدہ امور کی طرف مائل ہو کر اپنی شخصیت کھو بیٹھتے ہیں لیکن ان مثالوں سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ مزاح اور سنجیدگی ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔ اور اپنی انتہائی معنوں میں استعمال ہوئی ہیں کیونکہ پھر افراط و تفریط کا خطرہ ہے۔ اگر کسی شخص کی طبیعت میں مزاح موجود ہے۔ تو یہ لازم نہیں کہ زندگی کے سنجیدہ سے سنجیدہ مسائل اس کے نزدیک مذاق بن جائیں اور وُہ انہیں کوئی اہمیت ہی نہ دے۔ اور اگر اسکی طبیعت میں سنجیدگی ہے۔ تو وُہ ہر معمولی مسئلے کو غیر ضروری اہمیت دے اور بلکہ پہلی صورت میں زندگی کے اہم سے اہم اور سنجیدہ سے سنجیدہ مسئلہ کو اسی طرح حوصلہ کیساتھ حل کرے کہ اسکی طبیعت پر کوئی بوجھ ہی نہ آئے۔ اور دوسری صُورت میں زندگی کے معمولی مسائل کی طرف اسکا اسقدر سنجیدہ نہ ہو کہ دُنیا اسکے لئے مصیبتوں کی آماجگاہ بن جائے۔

اور اسے زندگی کی دوڑ میں تھک کر ہار ماننے پر مجبور ہونا پڑے۔

سماج اور سوسائٹی کا دارو مدار افراد پر ہے۔ افراد اگر شخصیت کے اعتبار سے تکمیل یافتہ ہوں تو سوسائٹی اور سماج کا معیار بہت بلند ہو جاتا ہے۔ وہ ہر پہلو سے ترقی کرتا ہے۔ اسکی تہذیب و تمدن کا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ اس کے ادب اور فن میں ہر قسم کی شائستگی آجاتی ہے۔ اور زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہوتا۔ جس میں وہ ترقی نہ کرتے ہوں۔ عربوں کو لیجئے۔ جہانتک قدرتی ذرائع کا تعلق ہے۔ عربستان ایک بنجر علاقہ ہے۔ ایک بہت بڑا صحرا ہے۔ یہاں آب و ہوا شدت کی ہے۔ اس لئے اس میں بہت کم ذہنی اور جسمانی ترقی کی امید ہو سکتی ہے۔ مگر جب عربوں نے انفرادی اور اجتماعی طور پر انسانی صلاحیتوں کو جلا دینے کی طرف توجہ کی۔ تو نہ صرف انہوں نے دنیا میں ایک وسیع اور دیرپا سلطنت قائم کر لی۔ بلکہ دنیا کے سامنے وہ نظام پیش کیا۔ اور علم و فن میں وہ ترقی کی۔ جسکی مثال آج کے ترقی یافتہ زمانہ میں مہذب سے مہذب قوم کے اندر بھی نہیں مل سکتی۔ لیکن اس کے برخلاف ہسپانیہ اور فرانس کی رومن کیتھولک قوم کو لیجئے۔ اس قوم کے افراد زندگی کے ایک ہی شعبہ کے سنجیدہ مسائل میں اس قدر غرق ہو گئے۔ کہ نہ صرف اپنی حکومت کھو بیٹھے۔ بلکہ اپنے مذہب کو بھی کمزور کر کے رکھدیا اور زندگی کے کسی شعبہ میں بھی کوئی خاص ترقی نہ کی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ شخصیت ہر طرح سے تکمیل پانے کے بعد کونسا راستہ اختیار کرے۔ تاکہ اس سے صحیح معنوں میں سوسائٹی اور سماج کو فائدہ پہنچے۔ اور ایک متمدن اور مہذب قوم تشکیل پا سکے۔

دنیا کے سامنے اس وقت دو ہی نظریئے ہیں۔ اثبات خودی (SELF ASSERTION) یا نفی خودی (SELF NEGATION) اوّل الذکر نظریہ سے مراد اپنی شخصیت کو کائنات اور اسکے اندر جو کچھ بھی موجود ہے۔ ان سب پر فوقیت دینا ہے۔ اور اپنی تمام ذاتی صلاحیتوں کو جلا دیکر انفرادی حیثیت میں سوسائٹی اور سماج پر اپنی شخصیت کا سکہ جمانا ہے۔ موخر الذکر نظریہ سے برخلاف اسکے مراد یہ ہے کہ انسان نہ صرف اپنی شخصیت کو سماج کے اندر کھو کر اپنا آرام و آسائش بھول جائے اور اپنے ذاتی حقوق اور دنیاوی فوائد سے دستبردار ہو۔ بلکہ اپنے آپ کو اس وسیع کائنات کا ایک حصّہ سمجھکر صرف اس ہستی کی بندگی کی طرف متوجہ ہو جسکے ہاتھوں نے کائنات و مافیہا کی تخلیق کی ہے۔ یہ نظریہ ان لوگوں کا ہے جن کا مطمع نظر محض رُوحانی ارتقاء ہے اور جنکے نزدیک انسانی ترقی محض اخلاقیات پر مبنی ہے۔

موخر الذکر نظریہ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ آج سے سینکڑوں سال پہلے مہاتما بُدھ نے اسی نظریہ پر بدھ مذہب کی بنیاد رکھی تھی۔ اس مذہب کے نزدیک انسان کی حیثیت ہیچ ہے۔ دُنیا ہیچ ہے۔ اور دُنیا سے بیزار رہ کر ہی نروان حاصل ہو سکتا ہے۔ بُدھ مت سے پہلے ہندو مت میں اس نظریہ کو کسی قدر اہمیت رہی ہے۔ آج بھی ہندو سوسائٹی کے ہر ایک شعبہ پر اسکی تہذیب و تمدن اور اسکے ادب اور فن پر گہری طرح اثر انداز ہے۔ یہاں انسان کی حیثیت کائنات سے کم ہے۔ چاند اور تاروں سے بھی اس کا درجہ کم ہے۔ تیاگ نروان حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے۔ یہی حال عیسائیت کا ہے۔ رہبانیت عملی طور پر ہے ہی۔ نفی خودی (SELF NEGATION) جہاں انسان دنیا و مافیہا سے بیزار اور اسکی گہما گہمی سے منہ چھپائے خدا کے دھیان میں لگا رہتا ہے۔

اسی طرح اول الذکر نظریہ کی تاریخ بھی بہت پُرانے زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ اور سب سے پہلے رومیوں نے اس نظریہ پر عمل کیا جن کے نزدیک عوام کی حیثیت ایک غیر تربیت یافتہ ہجوم یا بھیڑ کی تھی اور ان کا خیال تھا کہ صرف اونچے خاندان کے لوگوں کو ہی اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ عوام پر حکومت کریں۔ اس نظریہ کو موجودہ دَور میں غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ چونکہ یہ زمانہ مادہ پرستی کا ہے۔ اسلئے اقتصادیات کے مسئلہ کو اس نظریہ سے گہرا تعلق ہے اور آج تو کوئی ایسا ملک نہیں جہاں اس نظریہ کے آثار نمایاں ہوں مشرق اور مغرب کے جمہوری اور غیر جمہوری ممالک میں وطنیت پرستی کا جو جذبہ کار فرما ہے۔ وہ اسی نظریہ کا کسی حد تک مرہون منت ہے۔

دُنیا کے اندر اسوقت دو اہم تحریکیں جاری ہیں جو اصولی اعتبار سے ایک دُوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ ان دونوں تحریکوں کے اندر اگر کوئی اصُولی موافقت ہے تو وہ صرف یہ کہ انکی بنیادیں عملی طور پر اثبات خودی (SELF ASSERTION) پر رکھی گئی ہیں۔ موافقت کا ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ یہ دونو تحریکیں رُوحانیت کے منافی ہیں اور یہاں اخلاقیات کا درجہ اقتصادیات سے مقدم نہیں بلکہ موخر ہے۔

نیشنلزم دُنیا کی سب سے بڑی تحریک ہے جسے قوم نے اجتماعی اور انفرادی حیثیت سے اثبات خودی (SELF ASSERTION) کے اصول پر قبول کیا ہے اس تحریک کی سب سے بڑی حامی جرمن قوم ہے۔ جس کا لیڈر اڈولف ہٹلر کہتا ہے کہ جرمنی بحیثیت نسل اور صفات کے

دنیا کی بہترین اور مکمل ترین قوم ہے اور یہ حق صرف جرمنی کو پہنچتا ہے کہ وہ دنیا پر حکومت کرے اسکے نزدیک دنیا کی دوسری چھوٹی قوموں کو جینے کا حق ہی نہیں اور دنیا کی پیداوار کو صرف جرمنی ہی استعمال کر سکتا ہے۔

جرمنی کے فلاسفروں کا عقیدہ ہے کہ جہد للبقا حیوانات و نباتات کی مانند انسانوں میں بھی موجود ہے اور چونکہ حیوانات اور نباتات کے اندر اس جہد للبقا کے نتیجہ کے طور پر وہی زندہ رہ سکتا ہے جسکے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہو۔ سو دنیا کی اقوام اور افراد میں بھی صرف اسی کو زندہ رہنے اور حکومت کرنے کا حق حاصل ہے جو ہر طرح سے تکمیل یافتہ ہو۔ اور کمزور قوموں نے رحم کا جو اصول (DOCTRINE) دنیا کے سامنے پیش کیا ہے وہ اپنے بچاؤ اور طاقتور قوموں کو کمزور کرنے کا ایک بہانہ ہے یہ عقیدہ بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کہلاتا ہے۔ وطن پرستی اس شعلے کی ایک چنگاری ہے جس نے جمہوریت پرست ملکوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

اسکے ساتھ ساتھ دنیا میں اس نظریہ پر مبنی ایک دوسری تحریک بھی موجود ہے جو سوشلزم یا اشتراکیت کہلاتی ہے۔ یہ تحریک مقاصد اور اصولوں کے اعتبار سے اول الذکر تحریک کی ضد ہے۔ یہاں جہد للبقا کا سوال ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کو نہ صرف انسانی حیثیت سے مساوات کی طرف بلاتی ہے بلکہ اقتصادی حیثیت سے بھی ایک معیار پر لا کھڑا کرتی ہے غریبی اور امیری کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ البتہ اس اشتراکی نظام میں اخلاقیات سے اقتصادیات کا درجہ مقدم ہے مزدکیت جدید کے حامیوں کا خیال ہے کہ انکی تہذیب و تمدن اور ادب و فن کا مدار ہی اقتصادیات پر ہے اور اسکے بغیر ذہنی، سماجی، معاشی اور اخلاقی ترقی ناممکن ہے۔ ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی نفی خودی (SELF NEGATION) کارفرما ہے "لا سلاطین لا کلیسا لا الہ" اشتراکیت کا بنیادی اصول ہے یہاں افراد اور اقوام اپنے حق برتری سے دستبردار ہیں اور تمام اختیارات سماج کے ہاتھوں میں سونپے گئے ہیں وہ انکے جائز حقوق و ضروریات نہیں پورا کرتی لیکن دراصل یہاں بھی اثبات خودی (SELF ASSERTION) کا جذبہ کام کر رہا ہے کیونکہ فرد نے ہی اپنے لئے معیار زندگی مقرر کر رکھا ہے اور وقعت اس پر مصر ہے اور کسی نہ کسی صورت میں انفرادی رائے کی برتری کا مظاہرہ کرتا ہے۔

مندرجہ بالا تحریکوں کے علاوہ ایک اور نظام بھی ہے جو اثبات خودی (SELF ASSERTION) کی بنیادوں پر قائم ہے اقبال اسلام کے اندر اس نظریہ کو یوں ایک رباعی میں پیش کرتا ہے ؎

انا الحق جز مقام کبریا نیست　　سزائے او چلیپا ہست یا نیست

اگر فردے بگوید سرزنش بہ　　اگر قومے بگوید ناروا نیست

قرآن شریف سے یہ بھی ثابت ہے کہ اسلام کے اندر اثبات خودی (SELF ASSERTION) کا جذبہ بہت زیادہ ہے۔ اور خدا وند تعالے فرماتا ہے کہ میں نے مسلمانوں کو ایک بہترین دین عطا کیا لیکن اسلامی نظام اور اشتراکیت اور فسطائیت کے درمیان بہت بڑا فرق ہے فسطائیت انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے اثبات خودی (SELF ASSERTION) پیش کرتا ہے اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے قوم کے اندر افضلیت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو لا انتہا ترقیوں کا سنگ بنیاد ہے مگر یہ نظام عالم انسانیت کیلئے کافی خطرناک ہے۔ اس میں ایک فرد کی ترقی دوسرے کے تنزل اور ایک قوم کی زندگی دوسرے کے بغیر ناممکن ہے۔ اور اس سوسائٹی کے افراد باوجودیکہ انسان کے اندر بہت سی خامیاں ہو سکتی ہیں اپنے حکمران مطلق کو فوق البشر کا درجہ دیدیتے ہیں۔ اور اسکے خلاف کسی بھی صورت میں احتجاج نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کے وضع کردہ قوانین سے انحراف کر سکتے ہیں اسی طرح سوشلزم بحیثیت اجتماعی تو عالم انسانیت کیلئے مفید ہے مگر یہاں بھی اثبات خودی (SELF ASSERTION) کے معنی غلط سمجھے گئے ہیں۔ اور یہاں افراد "لا سلاطین لا کلیسا لا الہ" کا نعرہ لگا کر عالم انسانیت پر روحانیت کے دروازے کو بند کر دیتے ہیں۔

حالانکہ اقتصادیات ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ اور اگر مقصد کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ روحانی ارتقا ہے۔ اخلاقیات ہے نہ معاشیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قومیں اسوقت باہم دست و گریباں ہیں اور دنیا میں جنگ و جدل کا بازار گرم ہے۔ تیسرا مطمع نظر اس نظریہ کے بارے میں اسلام کا ہے۔ یہاں رہنما آمریت بھی ہے لیکن ساتھ ہی عاقلانہ جمہوریت بھی۔ یہاں قانون انسان وضع نہیں کر سکتا۔ بلکہ ایک خدائی قانون بھی موجود ہے جس پر سوسائٹی عمل کرتی ہے۔ یہاں اقتصادیات کا مسئلہ بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے مگر اخلاقیات سے اس کا درجہ مقدم نہیں اور سوسائٹی کا اہم مقصد روحانی ارتقاء ہے دنیاوی وجاہت نہیں یہاں تہذیب و تمدن کی بنیادیں معاشیت پر نہیں۔ بلکہ اخلاقیات پر رکھی گئی ہیں۔ یہ نظام ایک آمر کے زیر اثر ہے لیکن اسکے رویہ کے خلاف سوسائٹی کا ہر فرد احتجاج کر سکتا ہے یہاں مساوات بھی موجود ہے۔ اور جہد للبقا (COMPETITION) بھی کارفرما ہے جو انسان کے ذہنی اور قوائے جسمانی کی ترقی کیلئے از بس ضروری ہے غرضیکہ اسلامی نظام میں اثبات خودی (SELF ASSERTION) کا جو تصور (CONCEPTION) ہے۔ وہ بہت سی خوبیوں کا

(باقی آئندہ)

دارالعلوم اسلامیه پشاور

نګران: ـ حافظ محمد ادریس. ایم. اے. ایچ. پی. ایچ. ډی
مدیر: ـ میاں محمد یوسف کاکاخیل

مُعاونین

عبدالرؤف نوشهروی
محمد اشرف مفتون

جلد ۲۶	فهرست	نمبر ۳

چه دخزان ویره باقی ده خوشحالی مه کوه ګلابه تاته دا په ډکه خوله خندا منم دی

کوزنئ خبری

دیو طالب علم دَ ژندګئ بهترینه حصه هغه ده ـ چه په کوم وخت کښ د مے علم حاصلوی ـ ددی ژوند په دوران کښ په ده باندِ دَ هیڅ قسمه تکلیف نه وی ـ او د مے د دنیا د نورو کومی نه خبراتو نه وی ـ دده مثال جُنت د هغه تیا د خوړ پشان وی کوم چه دَ خپل خوراک سکاک د پاره هیڅر لاس خپی نه خوزوی ـ په تیاره ورته راځي او په بے دردئ سره الوزوی ـ ولے افسوس دا دمے ـ چه دَ خوشئ دغه ورځ ډیر زر تیر مے شی ـ او د ستر کو په رپ کښ سوړ مے د دغی جنت نه او ویستے شو ـ او عملی دنیا ته چه درد غم او مصیبتونو نوم دَی ـ راوُځی ـ

ځما مثال هم هو بهو دغه دَی ـ په کالج کښ د څلورو لنډو کلونو تیرولو نه پس ما ته هم ددی ځائے د بیرته پیښو د حکم کیدُنکے دَی ـ ددی حکم په کیدو سره ځما دوستان او د خیبر لوستونکو ته خفګان نه دَی پکار ـ بلکه دا خبر د خوشحالئ دَی چه دخدای په فضل او مهربانئ زه د دی خبرو قابل شم ـ چه د مقرره میعاد د ننه ما هغه کار سر ته او رسولو ـ دَ کوم د پاره چه زه دی ځائی ته راليږلے شوی و مه ـ د لے دَ دی سره ملته یدی خاوه افسوس هم راځی ـ چه د دی تګ په سبب به زه نور د دی قابل پاتی نشم ـ چه په اصلی معنو کښ دَ خیبر هغه خدمت اوکړ مے شم ـ کوم چه ما په تیر د شوو ددوه دوه نیمو کالو کښ تر خپله وَسه کړ مے د مے زه دا نشم وئیلے چه د کامیابئ تر کومه حده زه په دی کوشش کښ رسید لے یم ـ ولی سره د دی ټولو ما ته پلدی ضرور فخر حاصل د مے چه زه د خیبر لو خدمتګارهغه ورَم ـ ددی نه علاوه د خیبر لوستونکو سره دا لوظ هم دَی چه د خیبر په ذریعه د خپل مونئ ژبې خدمت کول به زه هیچری هیر نکړم ـ او تر خپله کوشته به زه د خیبر هر خدمت په سر ستر کو قبلوم ـ

په کالج کښ پښتو سره مینه لرونکی ډیر شته ـ او ځما دا خواهش د مے چه کم از کم د دی حصی ایله یتمدئے وا ګکے دِ هغه سری ته به لاس ور کړ مے شی ـ چه کوم په ربښتنی زړه سره د دی د معیار او چتولو او د پښتو ژبې خدمت کولو خواهشمند دی ـ ځه پخپله دا محسوسه وُم ـ چه دَ تسا قسم مجبور د په وجه ما د خیبر پښتو حصی بنا ئیست او اوچتوالے تو هغه حده او نه رسولے شه کوم چه د سید مدلی په وخت کښ وه ـ ولے سره د دی د راتلونکو مدیرانو سره ځما دا امید نه دا لبسته دی چه هغوئ به په هر ممکن کوشش سره ددی اوچتوالے خپل پیسې فرض اوګنړی ـ ددی نه بده صیبے دا ژړا خو ځوزلجر پیالے

شوی ده. او ځنې بیا تازه کوم چه تېپېچوی دیوه لاسه نه ښېږی. تو څو پورې چه د کالج تول پښتانه هلکان په جمعه د دی پاړه د ښایسته کولو کوشش ونکړی. مدیر په یوازې ځان به کوم کوم کار سر ته اورسوی؟

په دغه سلسله کښې ځه د خیبر لوستونکو توجه د دی حقیقت طرف ته کوزوم چه څو نوره د امتفقه تجویز دے. چه د دی نه پس به عشقیه افسانې او نظمونه ډیر کم اغشتې شی. او د دی په ځائې د لویو لویو خلقو د عمر حالات تاریخی او دلچسپ واقعات او دغه شان نور ادبی او علمی مضمونو نو او نظمونو به په خوشحالئ سره قبلو لے شی.

د دی قسمه مضمونو نو او نظمو نو لیکلو کښی به ګران او مدیر د هلکانو هر قسمه ممکن امدا د کوی.

مونږ ته دا ډیره د حالاتو مطابق حسب توقع مضمونونه او ډیر نظمونه دارسیدلی دی. مونږه پدی خبره چه ډیر په کښی ښه نه وو. د هلکانو حوصله نه ماتوو ولے د دی نه دا معلومه شوه. چه د کالج فضا د شاعرانو او د شاعرانه خیالاتو پیدا کولو په باره کښی ډیره ښه معلومیږی. او دغه وجه ده. چه مونږ ته نظمونه ډیر زیات راورسیدلی. د یو ژبې اصلی خدمت دا دے. چه زیات زور په نثرواچولے شی. او په صفا ستره پښتو کښی د علم مو غلوی په خلقو اوزلی.

دی د پاره مونږ ته هم بکار دی چه آئینده د نثر طرفته ډیره توجه اوکړے شی.

په مرادسیدلی مضامینو او نظمونو کښی ځائې په ځائې اصلاحی اشاری شوی دی. او امید دے چه لیکونکی دو نوره به د دغی خبرو د یر خیال اوساتی.

د عبدالرحمان کوفتار مونږ دیر ممنون احسان یو چه د کالج اد کالج په زمانه کښی دوئی د وهی شعرونه راځونو په وخت کښی درکول. د شعرونو په میدان کښی دا د وصبئ سپاهی به ډیر زر ښه شهسوار شی. که دے لږ شان نوره توجه دی طرفته اوکړی. او ورسره ورسره ورته دا هم بکار دی. چه د ګل و بلبل د شاعرئ په ځائې د بنیادی شعرونو لکه د لطیف او حبیب الرحمان سواتی ته زیاته خپله طبعه مائله کړی.

" مدیر "

دانا دَ راز

لاندې نظم جناب سمندر صاحب د اوږتیین سوسائټۍ په کالینه جلسه کښې اوړولے وو۔ موږ یې لې دېره په خوشحالۍ سره دَ خیبر لوستونکو ته پیش کوو۔

پرون یو دم خه پړ کالی په کټ بستره ولویدم
دَ دنیا غم که وه یو غر خه تر دې غر نه ولویدم

نه وم بیدار هم داخوب نه وه پړ کاله غونډې شوم
که وه آرام هم آرام کښې بے حاله غونډې شوم

شو تن تصویر او روح لاړو بره سما نه تر آسمان
لیدل ما داچه یو تک شین چمن هر طرف ته کل خندان

نظر معلوم نکړے شو ددې ګلشن د وسعت حد
صفت ته ئې عقل نابالغ زبان قاصر وه کم ابجد

ډ ګل مخ ګل ته یو دنیا په هر خوا دنګ خیوی دی
شمیم او سودې شورې هم شراب شهد میوې دی

پکښې یو خوشنما خوشرنګ او زیبا محل دَ سرو
محل دَ سرو کښې ذنګا دنګ محلګا رڼې د ننګ دو

په در کښې ښکارې یو روشن ضمیر بزرګ بنیادم
په یو دیدن ددې بشر هم بن بعضې شو غم غم

خه شوم ورمخکښې دَ مسکے شو ما وې السلام اے یار
خه قسمت خه قسمت بلا دولت دِ تا دیده او

جهان آګاه اے صاحب چه ده ستا لویه دانائي
ته ئې دانا د راز او هم لوې بیشا نه بینائي

سمندیم په حیثیت د یو قطرې په مخکښې ستا
دې تل زړ لیمو رسید خه غونډې له اوښکې ستا

دتا ګلکو دې دَ ستایل ته ئې صاحب دَ کوندې
مخالف باد او سرو تکه دَ خوږلن کښې خندیدے

بدخشان او عدن دِ کول دَ مشرق شهر بهرو با
دکوه آواز تا اے تولې دنیا لعل هے تا لا

دِ تا دخولې الف بے تے ودې دودې دعیسٰی قُم
مکر داقُم نه دې بے دخته چه ستا قام دې مرحم

مودې وشوې چه ئې خاموش اے دشمن کړ خاموشئ
مودې او شوې چه ئې ره پوش اے دشمن دَ ره پوشئ

صدف دخولې نه اے دانا وما یو پند کوهر را
ته ئې صاحب د راز او نن سبق د ژوند بهتر را

په دې وینا پسې خاموش شوم مسکے شو دا دانا
مکو داغو ږم نا آشنا دې صاحب له وه او نا

اشارې وکړې دې حضرت د یو تختې په مخ وو ښکل
سبق وه ذوږ اتر تازه چه ما دا تورې ولوستل

خودی کو کر بلند اتنا که هر تقدیر سے پہلے۔
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

شعر و شاعري

د لويو لويو شاعرانو او ددانايانو وينا ده چه شاعري د ژوندکي تعبير دی . چه ژرنګه د ژوندکي د ماهيت متعلق دانئ قائميد ممکن نه شي دارنګه د شاعري صحيح تعريف کول ډير ګران دے . دغو خلقو په نزد د تخيل د اظهار نوم شاعري ده . يو امريکن اديب ايمرسن وائي چه شاعري د څيزونو د روح د اظهار کولو مدامي کوشش ته وائي . يو مشهور انګريز نقاد د شاعري متعلق دا خيال لري . چه د شاعرانه صداقت او د شاعرانه ښايست د شرطونو ماتحت د ژوندکي تنقيد شاعري ده . ليکن دائي نه ده واضحه کړي چه شاعرانه ښايست څه دي . شاعرانه ربتيا څه ته وائي . او دغه شرطونه کوم څه دي . يو انګريزي فلاسفر کارلائل چه دخپلي زمانې حقيقت شناسه هستي وه . دائي ګڼړي ستاسو په کلام کښې د خيالاتو اوچتوالي موجود دی . او دخيالاتو په ژور ربتيا کښې او دغو په اظهار کښې ترنم او موسيقي وي نو ستاسو کلام شاعري ده . ورنه نه . لنډه دا چه د شاعري نه مطلب سرودي خيالات وي . د دے ټولو تعريفونو کښې يو هم ځان له د شاعري په خاصيتونو باندي حاوي نه دے . ځاځيل خيال کښې شاعري د جذباتو دخيالاتو د ښايسته او سرودي اظهار نوم دی .

د شاعري نه مُراد هغه کلام موزون دی . چه کوم څوک په جذباتو باندې اثر لري . دا يو فن لطيفه پښان د شاعري مقصد هم څوک په خوشحالولو او مسرور کول دي .

د شاعري څلور پهلو کيدې شي . اول اخلاقي پهلو د شاعر کلام داسې نتيجه ګکاد چه د لوستونکو اخلاق پرې خرابيکي . برعکس که د اخلاقي خوبيا زنګ کښې ځليږي لو بنه ده . مګر د شاعر کار وعظ ونصيحت نه دی . بعضي خلق دائي چه شاعر معلم وي مګر دا غلطه ده د شاعر اول کار څوک په خوشحالول دي . دا بيله خبره ده که دهغه کلام څوک په د پاره درس عمل شي . او مونږ دهغي نه يو خاص اخلاقي يا معاشرتي فائده واخلو محض هدايت ورکول او د يو هيول د اخلاقيانو په ذمه دي . شاعري د ژوندکي يو تصوير دی . شاعر دائي ما د حقيقتونو اظهار او کړو . قبول کړي لا پريکيدی . که تو ييه سبق اخستل غواړي واخلئ . ما چه ځرنګه دنيا او ليده هغه شان بيان مي کړو دغه ځما کلام ځما مشاهده ځما خوب دی . که چري څه سبق پکښې موندی کيږي د هغه اخستل ستاسو فرض دے د هغې تبليغ ځما کار نه دی ع

د شاعري دويم مخ صداقت دی . د اعلیٰ شاعري بنيا په حقيقت باندې دی . خو ولی شاعر تخيل کلام کښې نوم دی .

ع۵ دا دي نه مُراد مطلب نه دی چه شاعر دخلقو دخوشحالولو کوشش کوي . نو دهغه څه نفس مضمون نوي هغه مطلب دا دے . چه اګرچه دهغه په شاعري کښې به اخلاقي . معاشرتي خبري وي . خو دهغه کوشش به دا وي . چه دهغه په ذريعه هغوئ خوشحاله کړي .

محض حقیقتونه نه بیانوي . دا همیشه د سائنس کار دے . شاعر د حقیقتونو تأثرات څرګند ؤ مخکښې یو ښکلی طرز کښې پیش کوي .

د شاعر قابل قبول دا یو ډیر اوګړ بحث دے . چه شاعرۍ کښې رښتیا تر کوم حده پورې لازمي دي آخر اتفاق په دې دا ځے د چه شاعر کوم نقطه نګاه چه پخپل کلام کښې پیش کول غواړي هغه د قابل قبول وي . د هغه د کلام که بنیاد په حقیقت بانې ایښود شوې وي . مثلاً د رحمان صاحب رباعیات یا د خیالاتو زور تیزې ښائي . مثلاً د سمند رخان" د ایم ثوکه" په هر حالت کښې پکار دي چه د اسې کلام قدرتي ښکاري . او موږ نا اعتباري پرې نه کوو د اسې کلام په اصلي معنو کښې شاعري ده . او دغه "شاعرانه رښتیا" دي .

خوشحالې سره د دې قبلولو ته تیار یو . او هیڅ کله د دې په باره کښې په خپل زړه کښې شک ځائې نه ور کوو .

د شاعرۍ دریم مخ حسي سرور دې . دا خو ډیره ضروري ده چه د شاعر کلام څرګند دماغ او ذهن بانې بنه لري . خو دا هم ضروري ده چه د هغه لفظونو او د لفظونو آواز کښې یو داسې سُر موجود وي . چه موږ له حسي سرور کوي . د اسې اعلیٰ اعلیٰ او ښائسته ښائسته منظر را ښکلے شوي دي . چه په د ښیلولې سترګو تر او تازه کې اوړسي . او دا ګمان غالب دائې چه رښتیا هغه ځائې کښې موجود یم .

مثال د پاره د سمند رخان" د ایم ثوکه" و لے د شاعرۍ اصلي مقصد د ځه د یو زیات خوږوالی نه تریخوالے پیدا کوي . د دیم چه د شاعرۍ د اخلاقي پهلو خرابېد و خطره وي . یو څو شعرونه واورئ .

سه

ښائسته زنه لې سیب د جنتونو
په زنبیل لې عاشق هیر قند و تو یکله
سپین ګردن لې صراحي ده د شرابو
له د غه شرابو څوك پر هیر ګاري که
په خنجر د سپینو لیچو مې زخمي کا
بیا پخپله د مرهمو تیاري که
لځوږ و میوو لې پور د سیني باغ د ې
په شکل د د نخور ود که بیماري که
وه پښلو ته د عاشق خولني پریوځي
ور ښکاره چه پښکې سپینې مرمرې که

دې شعرونو کښې دومره خوږوالے دی . چه د سړي خوله اوبه اوبه شي . لیکن عامو خلقو ته خلورم او پنځم شعرونه د حسي سرور په ځائې شهواني لذت ور کوي او دا یو نقص ګڼلې شي .

د شاعرۍ څلورم او د ټولو نه ضروري پهلو حسن دې . د حسن عنصر پوره ته بیان کړي عنصرونه په داسې موزون طریقه بانې او په داسې مناسب ترتیب سره ملاوې چه نتیجه ئې ښائسته تخلیق وي . دا عنصر یو ازې نه دی بلکه د نفس مضمون په ژوره کښې موجود وي . اعلیٰ قسم شاعرۍ کښې ټول عنصرونه یو شان وي . په کوم شاعرۍ چه دا عناصر په

بنه شان سره ملاوُ شوی نه وی لا برابر
برابر نه وی ۔ لو هغه شاعری ناقصه وی
ګڼیا شاعری نه وی ۔ اوس د ټولو نه مشکله
مسئله داده ۔ چه د شاعری تنقید د پاره صحیح
اصول کوم یو دی ۔ دا یو داسې بحث دے ۔
چه اوسه پورې د لویو لویو خلقو اتفاق پرې
نه دَی داغلے ۔ هر یو نقاد هر یو استاذ هر
یو شاعر خپله خپله نظریه پیش کوی ۔ د هر چا
خپل خپل خیال دَی ۔ عموماً لاندې بیان شوی اصول
د نظر لاندې ساتلے شی ۔

د شاعر په کلام کښې د حد درجې موسیقی پکار
ده ۔ د وزن او دَ بحر لحاظ سره چه هم څه کمی
دالنګی ۔ د تل د تی نند ادو نفتنی ۔ دَ لفظونو
ترتیب ۔ محاورې ا پکښې ډېره خوشحالوونکي وی
د ژبې د دالئ او نزاکت ۔ تشبیهونه او مثالونه
ډېره راخکونکی وی ۔ او د لفظونو په آواز کښې
یو داسې سوزونکي نغمه جاری وی چه دَ زړه
نازک تارونو کښې د پیدا ل پیدا کوی ۔ او دَ
زړه په رباب کښې یو لطیف سُر او نګی ۔
د مضمون انتخاب د شاعر د ذاتی واقعاتو
او دلچسپیو نه بالاتر پکار دَی ۔ دَ ګوئټې وینا
ده ۔ چه د شاعری بلند ترین او یکتا مقصد
نمائش دے ۔ اعلیٰ قسم شاعری "خارجي"
وی ۔ هر هغه شاعر چه محض د خپل محسوسات
اظهار کوی د شاعر د لوم اهل نه دے ۔ دَ
"فنی تخلیق" جوهر دادی چه د انسان د دلچسپی

دائره د هغه خلقو نه زیاته وسیع کړی چه
کوم هر یو کس محسوس کړی وی ۔ د شاعر په
مخکښې ټوله دنیا وی او د خپل ژور نظر په
ذریعه کښې د هغې نمائش کوی ۔ د شاعر خیالات
آفاقی وی ۔ نه ذاتی ۔ د اعلیحدګی فقط دَ
مضمون په انتخاب کښې نه بلکه طرز بیان کښې هم
پکار ده ۔ شاعر له خلقو ته خطاب کول په
بکار یوری ۔

دریم څیز د خیالاتو ژورې والے دَی ۔ سره
چه څو پورې یو زبردست فلسفی نه وی اعلیٰ
شاعر نشی جوړیدے ۔ شاعری د بنیاد دَ
علم، د عقل، د خیالاتو د جذباتو او د احساساتو
یو مکمل کل دَی ۔ د شاعر د خیالاتو دائره دَ
نورو خلقو نه زیاته وسیعه او ژوره وی ۔ دَ
شاعر د خیال مارغه ډېر اوچت اوچت کړی
او دومره چه د آسمان د مینځه الوتل ورته
د ټولو نه بنکته الوتل ښکاری ۔ سه
لکه نامت په علیین لټول عالم دے دا ته پست
د شاعر نګاه ډېر ژوره وی ۔ نظریې دَ ژدن په
مسئلو بنخ وی ۔ هر وخت سوچ و فکر کښې غرق
وی ۔ لیکن دَ دې دا مطلب نه دے چه شاعری
عقلی د فلسفیانه جنجال دَی ۔ بلکه د شاعر په
ذهن کښې د سوچ ماده دومره زیاته او
باقاعدګی شی چه دَ شعر د لیکلو په وخت ورته
د سوچ ضرورت نه پریوځی ۔ اعلیٰ اعلیٰ خیالات
پخپله ورله راشی ۔ د هغې ته "آمد" "دالئه" والی

خوتکه چه غالب فرمائی۔ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں۔

بلکه خبره دا ده چه محض خيالاتو سره هم شاعري نه جوړيږي۔ د فلسفې يو کتاب که چرې په شعرونو کښې هم وليکلے شي نو هغې ته مونږ شاعرانه کلام وئيلی نشو۔ د شاعر کمال دا دے چه هغه خيالات او محسوسات د خپل تخيل په زور سره داسې ملاؤ کړي چه يو ښکلی کلام ترې نه جوړ شي د اکثرو شاعرانو په کلام کښې د لفاظۍ زياتره وي۔ خيالات خو وي خو محسوسات ورسره نه وي۔ که وي نو ډير لږ۔ او لا خيالات او محسوسات سره ملاؤ شوي نه وي۔

د شاعر کلام کښې هم آهنگي "يو والی" ضروري جزو دے۔ د تخيل زور او تاؤ سره مختلف تأثرات او رنګارنګ مشاهدات يو شان کول ډيره ضروري ده۔ شاعر مونږ ته د ژوندګۍ نه متضاد او منتشر قطعات نه پيش کوي۔ بلکه هغه يو داسې واقعه بيانوي۔ چه هغه د ژوند کو نو واقعاتو نچوړ وي۔

د شاعر کلام د دنيا يو ځلک دے۔ چه د ژوند په مخ باندې پرېوځي۔ او هر يو واقعه خپل خپل مخصوص حالت کښې بے نقاب کوي۔

د هر يو نظم نفس مضمون چه مونږ ورته وئيلی شو۔ او د شاعر روح د واړو کښې يو شان او يو مفهوم وي۔ د نظم اصلی قوت باهمی ارتباط کښې پټ دے۔ افسوس چه مونږ غزلو نو کښې دا بنيادي ربط بالکل نشته۔ د هر يو شعر جُدا، جُدا معنی وي۔ دا نقص او سنی شاعرانو کښې دومره زيات نه دے۔ ځکه چه د غزل ورځ لاړه

د شعر و شاعرۍ متعلق ما خپل خيالات ستاسو په خدمت کښې پيش کړل۔ او مطلب هم زيات دا وو۔ چه کالج ته راتلو سره چه کوم دوستان خواه مخواه ځان پورې د شاعرۍ ملګي او تړي هغوی دې هم دا مضمون څو څو کرته اووائي۔ او خپل کلام دې په دې معيار باندې اوتلي۔ که چرې برابر راشي نو ډيره ښه۔ لا دې د خپل ذهن مطالعه اوکړي۔ که چرې پوره نه ذکر شوي څيزونو کښې ده سره څه نه څه وي نو شاعري دې جاري اوساتي۔ او دې خاصيتونو له دې ترقي ورکړي۔ اميد دے۔ چه يو ورځ به کامياب شي۔ او که چرې د دې خاصيتونو درک نه لري۔ نو زه به د هغوی د فائدې د پاره هغوی ته درخواست اوکړم۔ چه د شاعرۍ خون کول هم ګناه ده نثر ليکل شروع کړئ۔

قاضی احمد سعید البرق سرحدی

ایم۔ اے۔ فائنل۔

مزدور

لاندینی شعر نه د حبیب الرحمان سواتی د اول کال دی . ددوی د گل د بلبل چه د خاموشاعرانو برخه ده نه یو بل طرفته دخپل خیال مرغے الوزولے دے . حقیقت داد ے چه دیو ژوندی اصلی خدمتگار دخے نه والی . چه په هغی کښ بنیادی شعر نه جوړ کړے شی . او قوم ته سبق واخلی . مونږ امید کوو چه دوی به هم دغه رنګ دخیبر پانړی په داسی شعرونو خائسته کوی . مدیر

یوه ورځ دومره روان یو سړے رما په نظر شه
بهړی او چتے ملا تړلی په خولو کښ تر بتر شه

مادی څوک ئی اسے بدبخته رنګ توره سر غرمو شه
ده وی ماته غریب والی دا م کار چه مقرر شه

دَ نائیک په کار لګیا یم د هغه دیره جوړیږی
کته . ختله ورکومه ځما برخه داهسې شه

مادی مزد اغلی که مفت کړو دَ نائیک دِ دغه کار
ده وی خره دهغه لوکویم په دوو ډولی جامه ګزد شه

دغریب داستان چه واوریدو ستړی ډکی شوی دَ اوښکو
چه څوک کار کوی هغه خوار دی چه آرام کوی افسر شه

په دنیا کښ ئی حق نشته عقل نشته ناموس نشته
دغه لول دهغه چاوی چه مالک دسیم و زر شه

اے غریبه احساس وکړه دخپل حق شه طلبګار
په سوالونو کار نه کیږی د طالب حوصله کوشه

حبیب الرحمان سواتی

غیبی سزا

اوله نظاره : ——

د کریمی حجره ده . نمر په غرغره دی چه سیان په اوږدو لی کټ کښ چپے وهی کنکس سړ . او پوسید لی ستړی ناسته دی . په لواره شپاړه ژبه کښ د انګابنګا خبری کوی . غرپه سمه او سم په عنر ودلی . رحیم ګل په حجره راتیریږی چه داعجیبه مجلس واوری . خیه نیولے شی . او غوږ ورته کیږدی .

کریمی : . هلکه او ځمی (افضل) سمند دخان دِ خدائی اولبنی . او خدای دِ هلکه په جنت

کړی ـ په صدرکښې د نمانځکو ځائ د صفتپهیکه ده ـ د تلی تنا کو خود صفه په ځائ کښې هلته څه حساب نه وؤ ـ ماشومانې کښې به دا بانړ یوځ نرسے لونګے هم دا ښکو ـ که به پکړ شو ـ نو به ودکړه کښې ده چړی نه نه ود کړی ـ یواه! څه ښه سړی وو ـ داسی خلق ډیر زر د مرګی ظالم لوړسے شی ـ

اوضلی :ـ یوه ـ آمین خدائ دِ اولبنی ـ ډیر ښه سړے وه ـ ماهم د سلطانی دی سره یوځل فلاش کولو ـ شیږ شلی دوپیٔ داسره وسے ـ تمولی هم اوبیالی ـ بل هیڅ د سړک نه وو ـ کالی هم خو پړی وړمبیَ نه ور داوُکړی وو ـ داغلم سمند دخان لهٔ ـ ود ته هم اوویل ـ خان! په سلطانی د دُوس هم هر څه بیالی دی ـ بل څه د سړک هم نشته ـ بوتش روپیٔ داکړه ـ که هم اوګټلی ـ نوستا شربت به هم پکښې دی ـ او که هم اوبیالی ـ نو سر دِ دا پالی سمند خان اوویل ـ بچیه! چه سمندر ژوندی وی ـ ستا سو د څه پروا ده ـ د ده سر ته دعا کوئ ځه به ژوندی یم او سلطانی بے غیرته ته برستا هیله په پیسوبانډِ سترِږ تیتې وی ـ ځکه ولغله د سلو په ځائ دا یونیم ^۱۵۰^ سل ماوی یره خان آباد اوسی ـ د دی بعضی بعضی دوسالو دَ یارۀ دِ خدائ تا تر ډیره ژوندی لری ـ

خیرځه لاړم ـ او په دوو چالوکښې هم توری هرڅه دا اوګوخول ـ داغم ـ ورله هم یونیم سل سر اونیمواس ^۵۰^ شربت ودکړو ـ وی ویل چه نه خیر دے بخیر دے

اوضلیه! ماخو تا له څه قرض نه وی دی کړی ـ ما خو ویل چه سلطانی ته د سترږی هسکی شی ـ ما اوویل چه نه خان ـ داخو ستا د انسان (انسان) ځکښې هیڅ نه دی ـ او دا به هم نه اخلی ـ خیر صفه هم په ډګر ودکړی ـ یواه څه ښه سړے وو ـ خو د غریب هلی د نوغے اودو ـ

ملحیتے :ـ یوه دښتیا ـ د ښاد چکو کښې به ځما شراب اوسیلما په صفروه ـ نو هم سخی سړے وو ـ

اکومی چرته :ـ پوکیدئ یاد! دا څه پو دی غمونه ژاړئ ـ داخپل غمونه هم لږ دی څه ـ پریکدئ یا لږ خان خوشحاله کړئ ـ نیم کړی دنیا ده ـ او نیم کړی به پاتی شی ـ څه له غمونه کوئ ـ نن د شے که صبا دَی دا ملک د ذوغون شاه دی (او په دی کښې تو په شی) ـ

دنیا د غم په ورځ پیدا ده
کم عقل خلق پکښې ما نړئی آباد وینه
(تپې شروع شی) یو بل چرمی ـ
په دنیا مه نیاز یږئ خلقه
دُ شاهجهان بادشاه نه پاتی شو تختونه

دویمه نظاره : ——————

واحد ګل د قلبی نه ستړی ستوما نه دا غلے د مشر رلس کالیز) خوئ رحیم ګل ـ د دو کوټی خوئ صمد ګل ـ او دَ وړی لور کیشئ سره د نغزی په غاړه ناست دی ـ مورئ آنګولے پخه وی ـ مشر خود ئ په تبئ ردتهئ پخه وی ـ او نیائ د ما ښام ۲ مونځ نه پس په مصله ناسته وظیفه کوی ـ

رحیم ګل :- دادا! نن د کومې بدمعاش په ځائے راتېریدم. هلته سړو د سمندر د ډیر صفت کولو ویل چه موږ نه به ئې چرې. تماکو اوریسي دا کولے. او سېل به ئې هم دا بانډ کولو. دا څوک وو؟ او په رښتیا بد سړي وو؟

واحد ګل چه د سمندرخان نامه واورېدې. نو یو سوړ اسویلے اوکړي. خو چه بیائې د خوئي صغر طرفته ټک ته ئې فکر شي. نو په قهر شي. او وائي. رحیم ګله! که بیا ځه خبر شوم. چه تا د کوم صحبري ته قدم اغښتې دې نو په هغه دم به د ماته سا اوباسم ته د بدمعاش ځوئې؟ که د جواړګر ځوئې؟ چه د کومې د دوس ځائې له ځې. خبردار پوه شه. ګني پوستکي به دې د بھوسو ډک کړم.

د رحیم ګل مور درخانۍ :- بس دې یو خو ته. خواره. هر وخت په قهر ئې. ماشومان خواران دي تکي. په ماشومانو خوارانو دا د هوپ د مرکې ستا عادت دې. هغه غریب خو ما هسې له استولے وو. که په هغه لار لاړ و نو ګډ او شو څه. نشته. که هغه خواران په هغه طرف لاړه. نو بدمعاشان شو څه. یا جواري او کړه څه. که.....

واحد ګل :- بس دې غم مه خوره. یو تا هر وخت تر تر چود کړې دی. خو له کښې د سمه خبره نشته کله دې د کور ت او کړه. نو دا د قلبي چوکه د ما بانډ ګودم.

رحیمه چپیا شي. د ماشي بھنګ خېژي. او د دوی کښې دیو نه خېژي. ډیره شیبه پس چه واحد ګل ته بیا د سمندرخان قصه یاده شي، نو بیا یو سوړ اسویلے اوباسي. په دې کښې دوئي له بیا موقع په کوتو د شي او د دوی کوتو زړه صبر نشي. او تپوس کوي.

صمد ګل :- دادا! دا تا سوړ اسویلي ولې اوکړو. په رښتیا دا سمندرخان بنه سړے وو. او ته هم د هغه په مرګ خفه یې.

واحد ګل :- یره ځویه پریږده څه به د ماته اوس پخوانۍ قصې یادوم. خو یو ظالم وو نو. هم د دغسې خلقو دوست وو. او هم د دوی په سر ئې په ما نه شوکه تا نه شوکه ډیر زیات دولت جمع کړے وو. دا د هغه بنه سړیتوب وو.

صمد ګل :- او د دوئ وړه خور کیشئ :- دادا مونږ ته خو ئې ټوله قصه او کړه. چه قصه خلاصیږي. نو دوتوئې به پخه وي.

واحد ګل :- یره یو ټکي ئې د هغه ظالم قصې. خدائې دوی له هلته هم سزا ورکړي. او شکر دې. دلته ئې هم سزا ورکړه. حرام او د شوکې مال د چا نه نصیب کیږي.

درخانۍ :- درخانۍ ژړ شا کوي. تو یو ژک سم کړي: یو خو نه هر وخت د مرچو په سته ناست ئې. خوشحاله ود ځو خدا یر! ځو نو په قسمت کښې

خوشحال خان خټک

لاندنی شعرونه دخوشحال خان خټک متعلق دی. نصر ترخپله وسه پوره ډیر کامیاب او د واقعاتو سره موافق شعرونه جوړ کړی دی. امید دے چه د پښتنو نور و شاعرانو ته به هم بلهٔ پېښی دغسی برخه ورکړی

"مدیر"

په زړه کښی م بیشا نه محبّت دخوشحال خان
عزّت دپښتنو دے لویٔ شهرت دخوشحال خان

د توری شرنګ خوږ دی په عالم کښی نه ودکیږی
دنم غونډ ځوکند دے شجاعت دخوشحال خان

نه حج، روژه، زکوٰة شو په ټول عمر یه ده فرض[ع]
حاتم دی ورستو کړے سخاوت دخوشحال خان

په مړونی دمغل له لاس لاړو دغره سرته
ټول اوکړه دپښتو او دعزّت دخوشحال خان

خانان لی په خانئ کوی لویٔ مودشوی تیری
پونشته دصورت او دسیرت دخوشحال خان

داسی میړه مړ نه دے ژوندی دغه روح دی
نن هم په یاد کښی کړم دے صحبت خوشحال خان

دولت د نصر نشته چه پری جوړی منادی کړی
نمسو نکیا لو جوړ نه کړو زیارت دخوشحال خان

نصرالله خان نصر درېیم کال

ع تول عمر په جهاد کښی مشغول وهٔ .

عبدالعظیم رانړیزی

دَ پښتو مشهور شاعر عبدالعظیم په سوات کښې د سنه ۱۱۶۶ھ خواوشا پیدا شه. دی لا وړوکے وو چه پلار ورله ترې لوړ مړ کړو. او بیا دده په تلاش کښې شو. مګر دَی خپل نیا خان سره هغې ته را اوتښتوو. او په بوتهکال کښې د حاجي خیلو په کندی کښې استوګن شه.

سرفراز نومې یو مُلا ورله لوی ورکړو. او دغه د مرګه ورستو دغه په ځائې د جماعت امام شه ښه عالم او پرهیزګاره سړے وو. د کونړ یو پیر مهربان صاحب نه ئې لاس نیوه هم کړې وه ښه سُنی مسلمان وو. د رحمان بابا همعصر وو. د شعر نه ئې دا معلومیږی. چه تر اتیا کاله ژوندَی وو. دا هغه زمانه وه چه په پښاور د سکهانو (مهاراجه رنجیت سنګه) حکومت وو. او د ظلم بازار ګرم وو. عظیم یو ځائې کښې وائې

پَه حیا کښې تری خپې او باسه عظیمه
عاقبت به پېښاور کړه سکهان کلہ و پہ

دوه ځامن ئې وو. د یو نوم محبوب ګل او دَ بل حبیب ګل وو. دواړه واده کړی وو. او دَ ده په ژوندا مړه شو. یو یو ځوئې د دواړو نه پاتې شو. دیوان کښې د دوئ دیر ذکر راځی

دیوان

دده یو وړوکے غونډ دیوان دَی چه په سنه ۱۳۳۳ھ کښې چهاپ شوی دی. ژبه ئې ساده او روانه ده. عام طور باندې ئې غزلیات، رباعئ، او مخمس وغیره شکلې دی.

دوختنه نه شاعر وو. عشقیه اشعار به ئې لیکل لیکن دځامنو د غمه به ئې صغریت ساتل چرګله چه صغولې حق رسیدل. نو ده ته هم میدان صفا شه. په پیرالسنی زړه ئې اشعار لیکل او ځان سره به ئې ساتل. چه څوک تری فائده واخلی. لکه چه وائې.

پَه دی عمر مې شکل کوم غزل لکه
چه تری واخلی لس لمانه منفعت څوک

د دیوان تاریخ دا سی لیکی.

دا تاریخ د مخمس واوره سامع
سن یو زر دوه سوه دری پنځوس و وایه
سنه ۱۳۵۳ھ

خصوصیات

(۱) شعر یې ډیر فطري دی. وجه یې دا ده چه د ځامنو د مرګ په سر ده بیا ډېره نه لګیده.

(۲) اشعار ساده ښکلو طرز ادائی اعلیٰ ده.

(۳) عشق او ډمیني په دنیا کښې حقیقت سره سره کړې.

(۴) د تکلف او لګوان ګوان تشبیهاتو نه یې پرهیز کړی دی.

(۵) تصوف کښې یې عملی پهلو خوښ کړو. مادي سره یې نه لګیږي. د شعر مضمون یې یا خو عشق. یا د ځامنو مرګ یا سلوک او یا وعظ ونصیحت دی

نمونې

د کلام نمونې اوس د مختلفو سرخو ماتحت پیش کول غواړم.

عشق

(۱) ما به هیڅ پته ستا نوم اخستې نه وې
که یاري کیدے په غلا اعلیٰ نسب
(۲) ځما یار پښتانې یار به پیدا نه که
که څوک ټوله دا دنیا که لټ په لټ
(۳) رنګ زیړی، اسویلې سوړ، سترګې نوسکې
دا درې واړه د عشاقو علامه ده
(۴) دیړا و سره په عاشقانو توره شپه که
د غماز د مکارۍ نه توبه، توبه

سلوک او وعظ ونصیحت

شاعر حقیقت غوړه ګڼوي هم د غم وجهه ده چه وائي

خدای که یم اوسا ته له کبره له لوئی نه
په اظهار کښې یم بیان د حقیقت دی
(۲) ځان فنا کړه سراپا په حقیقت کښې
د مجاز دردکې د نن کښې غرقاب مه شه
(۳) دا رفتار به یې سبب د حقیقت شی
چه چا یون چوی او نه کړه په مجاز کښې

---: صحبت اثر لوی :---

عاقبت به خوئی خصلت د صحبت نژده که
چه او سیږي د بدالو په محلت څوک

---: نیک خوئی داسې ستائي :---

د نیک خویو په دکان عالم را درومي
په ځنګ درومي د بد خویو خلق له هټه

شاعر د مستقل مزاجی او صبر طرفدار دی.

وائي :---

لوئی مقام ته رسیدل په ډیر محنت شي
نظر وکړه په اشجار وکښې تجوس تله
دولت به د هغه یکار شي چه مخکښې لے اولیږي. د دنیا
نه دوه لاس او دوه پښې تلی دي :---
ستا له ماله له دولته که د خدائي که
بے نصیب به یې دوه نیم ګزه کفن شي

د دنیا بد په دې الفاظو بیانوي :---

دل و دین عقل و شعور لاسه لاړشی
د دنیا ټګی ګنجرے نه توبه ـ توبه

د مرګ متعلق وائی :ـــــــ

مرګ که شته خلاص ے توی نشته د ے یارانو
خبر نه یو چه به نن وی که سبا له

مذهبی رنګ

پنځه بنا د اسلام داسی بیانوی :ـــــــ

کلمه، نمونځ، روژه څلورم حج دی
پنځم کړه ادا ذکوة په احتیاط
خلق وائی ځمونږ په عبادت او دعا کښ ثواب نشته

شاعر جواب ورکوی :ـــــــ

اثر پاتی د چا څه لو کښ نشه ځکه
چه د خدای د پاره نکړی عبادتونه

شاعر د ځامنو غم کښ ډیر ژاړی یو ځائے کښ وائی

چه محبوب ګل حبیب ګل د دالرو وفات شو
ځکه شعر هم آغاز شه د هیجات
سینه کیږی هم په خاورو کښ ور سته شو
چه بے ځویو په دنیا کړ ختم حیات
هسی رنګه خوارو زار دی کړم مرګ یه
چه د خدا دی کړم د دوا ره مخلوقات

—— : —— : —— : ——

متفرقات :ـ

شاعر ځائی په ځائے متل هم استعمال کړی دی
مثلاً متل د ے "د باران تبنتید مه د ناو ے

لاندی هم شپه شوه :ـ سه وائی :ـ
د ناوی لاندی شپه شوه عبدالعظیم
تبنتیدی به ته په زوده له بارانه

متل دی چه د ګوره شپه په ګور کیږی نه شاوائی
د ګور شپه چری د چا نه په ګور کیږی
غم د چا په خوشحالئی کله بدلیږی

متل دی چه چرته ډب وی هلته ادب وی
نو وائی ـ سه

هر چه وائی چرته ډب هلته ادب وی
دا متل د کمینه په باب کښ کیږی

یو ځائی کښ عبدالعظیم په مختلفو شاعرانو تنقید
کړی دی، وائی سه

خدایه وبخښی مهمند عبدالرحمان
پری نازل کړی خپل رحمت لکه باران
څه بنا لښته کتاب کړی عجیبه دی
دا شعارد په پښتو ژبه عیان

—— : —— : —— : ——

رحمت بیا په ماشووال عبدالحمید شه
چه جوړ کړی ده کتاب دی بنه دوستان
بحث د عشق د دی کتاب د ے بیر ه بیتا کښ
د باران په دود پری ژاړی عاشقان

—— : —— : —— : ——

بیا رحمت په محمدی صاحبزاده شه
ډیر غزل دی ده ساز کړی په ښه شان
په ګلشن د غمکنو کښ مشه مراد ی
دا خوشبویه معطر ګل د ریحان

واعظیم د اشنغر خو شاعر نه دی

په پردو غزلو بولی شاعر ځان

ولی دیوبنه غزلی او مجلسی دی

په آواز یې دیر مین دی سرداران

رباعی، غزل، اشعار دی دیر غلا کوی

غزلی عظیم له مانه څو چنده ان

په آخوکښی هم د شاعر خیالات د دښتنی او

دو مجنو پیرانو متعلق خو دل غواړم. دد دو مجنو

پیرانو پوده داسی اوچتوی. سه

اوس هم ونږ په زمانه کښی بزرگان

دد دو غو پیدا کیږی دیر تکان

چه یې خولی خصلت عمل وته لی کوری

ته به وائی منتر دوری دی دشیطان

داصلی پیر تعریف او مثال داسی وړکوی سه

پیر صغه دی چه په شرع مستقیم وی

کل عمل یې موافق وی له قرآن

لکه شه اخون پنجو د اکبر پودی

یا کاکا صاحب چه وو ددین پاسبان

یا خو مله اخون بابا خدائی موحوم که

یا خوم شیخ حبیب صاحب بنه پهلوان

یا محبوب رم د ماشو عبدالمؤمن شه

چه مدام په شریعت وو دی روان

یا خوشو بابا صاحب رم د شیخانو

بل حاجی د ګمکنو شه دریاخان

بل صاحب شه د اټک چه حضرت جی دی

بل صاحب شه میان عمر د علم کان

عبدالرؤف مخلص

ټوټی ټقالی

یو مسخره له اتفاق سره یو وړه جماعت له لاړ. د او داسه له ارکانو نه نابلده وو. اول یې لینی ویښځل شروع کړه. خلقو ورته وویل چه دا څه کوی؟ ده ورته جواب ورکړه چه بانګ دی. چه اول د لینو خدمت وکړم. چه په ټول عمر کښی یې من جماعت ته راوستم.

---

(۲) دوه کوچیان کلی ته روان وو. له یوه چینړی او کوړه وه. بل ورته ووی چه ما په ټول عمر کښی دری ځله چینړی خوړلی دی. هغه ورته وی کله کله. د ده وئیل یو ځل په کور کښی. یو ځل په بازار کښی او یو ځل به یې اوس تاسره وخوړم. هغه ورته ووئیل. هم خولی نه درکوم وی وئیل. چه بیا دی دوه ځل وی.

عبدالحمید فاروقی

د اول کال

دَعاشق خوب

شرنګا شرنګ پېنزېب ئې پښو کښې، رنګارنګ لباس کښې پټه
دلفریب حسن لو ونګے ، دلربا ترانه ګډیګي

ما دعشق په میو مست کړي، داته نوي جهان ساز کړي
عقل وهوش نه م ویزار کړي، په چم چم چیر داتلیږي

هسک غاړه راروانه ، اُف دَ تینګ مکیز میرمنه
په شاهتو لوچور لکونو ، پټ په سترګو کښې خندیګي

تور ذلفې په خم خم کښې، په وَلُوَل دي راویزاندي
چیچماړ هسې له سره ، تورکیتهو لوړي ذنګیږي

شاو لے واو لے ځاځواله ، دا له دېرې مینې راشي
څه ئې دلیچو نه کوم کلکه ، وائیمه اوس به څه چل کیږي

دا تښنول په ما شروع کړي، لوخی پوخی به کړي سازي
خو یو واد لومه کښې ګیره ، مونږ بیا کله خلاصیږي

دواړه ذر تو ذره پخولا شو، دَ ګلشن په لوړی ووځو
باغ باړے دي چمنونه، شنې وَلې داته بهیګي

د کاغذ کشتئ کړو جوړے ، د ولے په جڅے ئې بهیګدو
چه دَ باد لهر پېراشي ، د اولو په سر تاویږي

کله سرانکي دغه و لے ، ځان له تپال کړو پکښې ځانګو
کله ناست دسر و لاندې ، دنګینه پیتلئ کړیږي

د نسیم په هوا دد دو ، ګُل موسکَی شي را بیدار شي
لکه پیغله دَ مستئ نه ، په یوه خندا خندیګي

د شبنم قطرې که مئ دي ، چه د ګل لمن پرې تو ده .
ته خطا شوم دا دِ اوښکې ، د جانان فراق کښې تویګي

د ژړا فریاد نه بیرته ، غریبي جهان نه لري
پاس په ونو کې چاپېره ، بلبلان داته چغیږي ــــــ

د قدرت حمد و ثنا کښې ، د چمن مرغۍ مشغول دي
لوی چنګ لوی رباب دی ، د وحدت سرو دغږیږي ــــــ

یو عجیبه تماشه ده ، سره شراب صنم ساقي دے
پیمانه د میوه که ، د انسان د زړه پرې مستیږي ــــــ

پټ پټ ونه سره کاندو ، کله هلته کله دلته
چه څه پټ د بڼه په تماشه ، دا د انبیلو کښې پټیږي ــــــ

څه د غلو په قدم ورشم ، ناګهانه پرې لیو با وکړم
سا نیولې حق حیران ، دا بیماره دو غږ ځلیږي ــــــ

څرنګ په غلي اوچته واخلم ، د چمې په خوا کښې کیږدم
چه د ګلو بوټي پرې لګي ، دا په هوش دا اولتیږي ــــــ

تک د پاسه مابنامے شي ، په ګلشن خاموشي راشي
پاس سپوږمۍ سنګار کښې راشي ستارې ورته شرمیږي ــــــ

په آسمان نوره وریږه ، چپان چپان اوبنان ده
دا نوري نوري پونه تري ، په مزه مزه وریږي ــــــ

کله ځان سپوږمۍ له شرمه ، د ورېځ نقاب کښې پټ کړي
کله لوی لوپټه کړي ، دیره په ناز ادا خندیږي ــــــ

د صنم په تور و سترګو ، کښې سپین پلشم داسې ښکاري
لکه تور د کانړو ټکټو ، کښې ګوهر د شپې ځلیږي ــــــ

رعد ، څول ، شغا ، پریښنا ده ، په شیبو شیبو باران شي
هم ګلې رنګي هم سیلۍ شي ، په غضب فلک پرتیږي ــــــ

ناګهانه پکښې ګوذ شي ، یو لوئي تندر له وریځې
ما عاشق او معشوقې ته عین په سر د اوغږ ځلیږي ــــــ

څه د ونې دا بید ادشم ، کیرچاپیره چه نظر کړم
پاس په تاخ کښې د شړشمو ، صرف د یوه داته بلیږي ــــــ

نه رباب نه ترانه شته، نه ساقي نه پیمانه شته
نه بلبل نه آشیانه شته، نه صنم را ته خندیږي

محمد اشرف مفتون

رښتینی تعلیمیافته

تعلیم یافته څوك دی؟ کوم کس چه د زمانې رفتار سره په هر حالت کښې په ښه شان سره ګوزاران کولے شی، هغه تعلیم یافته دی. د علم په برکت انسان خپل ژوندون ښه تیرولے شی. مونږ د علم تمدنی او روحانی پهلو بالکل هیر کړے دے. او داسې خیال کوی دی چه علم خو د روزئ ګټلو یوه ذریعه ده. او بس. مونږ تعلیم ځکه حاصلوو چه مونږ باندې ذرائع آمدنی پرانستې شی. او مونږ په مختلفو ناسازو حالاتو کښې روستو پاتې نه شو. حقیقت دا دے چه یعنی غیر تعلیم یافته کس هغه انسان دے چه د هغه نه په نابلده حالاتو کښې زړه خطا شی. خو لوی تعلیم یافته سره علم یو داسې وسله ده چه د دې په زور هغه د اسې قسم حالات هر وخت ځان دپاره سازګار جوړولے شی. علم یو داسې دولت دے. چه هغه په خرچ کولو سره زیاتیږی. لیکن چه پټ ئې او ساتی. نو زنګ ورته اولګی.

د علم مدعا دا ده. چه د دنیا هر قسم حالات مونږ ځان دپاره موافق جوړ کړے شو.

د ما شوم هلك د سکول تعلیم د دې خبرې پیش خیمه دی. چه هغه په دغه لږ وړ وړو کښې د تعلیم په برکت د دې خبرې قابل شی چه په راتلونکی باهرنئ دنیا کښې د هغه ورځ ږګار او ناسته پاسته ښه او درست شی. د تعلیم یافته کس دپاره دا لازمی ده. چه هغه د تعلیم په زور د دې خبرې قابل وی. چه یو کس چه هغه کښې ښې خوبئ وی په څه ذریعه په دې باندې آماده کړی. چه د هغه نه ټوله دنیا ته فائده اورسی. کوم تعلیم کښې چه دا خوبئ نه وی چه طالب علم نه د نورو سره د ګزران چل او ښائی. هغه هیڅ تعلیم نه دی. په داسې حالت کښې د تعلیم مقصد پوره کیدې نشی.

کوم دار العلوم چه طالب علمانو ته د انسان باهمی تعلقاتو سبق او نه ښائی. د هغه دار العلوم هیڅ حاجت نشته د تعلیم لوئ مقصد دا دی. چه طالب علم د نورو ملکونو د حالاتو نه واقف شی. او پوهه شی. او د دغه سی د هغوئ تر مینځه یو لوی ضروره تعاون پیدا شی. طالب علم ته دا اوښودلی شی. چه د یو عزت کول د

ځان عزت کول دی ۔ او دا دی د پاره ښکار دی ۔
چه د ځان نه د بل عزت زیات کوی ۔ او د هغوی
متعلق د هغه خیالات هم ښه دی ۔ نورو سره محبت
کول او د هغوی عزت کول خدای سره د محبت کولو
د رښتیا مرحله ده ۔

د مذهب، تجارت، سائنس او علم و ادب د موجود
ګمی راز په تعاون کښی پوشیده دی ۔ او تر څو پوری
چه دا په کښی نه وی نو د هغه تول هیڅوک کامیاب او
کامرانه نشی کیدلے ۔ د انسان د وجود داسی نه دا
فطرت دی ۔ چه د یو بل سره په یو ځائی اوسیدلو
خوشحالی محسوس کوی ۔ چه څومره دنیا ترقی کوی ۔
نو خلق چیں کار په ځائی د زور دنیاتی په د ماسره
اوباسی ۔ او صرف د هغه طریقه په آخو کښی کامیاب
کیدلے شی ۔ انسان ته هله حقیقی خوشحالی نصیب کیدے
شی ۔ چه هغه په خلقو کښی ځان اوګڼری ۔

تعلیم د حکومت جوړه ده ۔ او د تعلیم یافته کسانو اثر
د ښه حکومت په جوړولو کښی ډیر زیات دی تعلیم
یافته خلقو ته ښکار دی ۔ چه هغوی د یو مصیبت زده
سری مدد اوکړی ۔ لیکن په زړه کښی دِ دَ انعام
او د تعریف تمنا نه ساتی ۔ دوی دِ دَ یو بل داسی
لحاظ ساتی ۔ او دا دی دنیا داخو وړګی ژوندون
په ښه شان سره تیرولو کوشش کوی ۔ ځلمو ته ښکار
دی چه د ژوند میدان ته په ارت زړه اوځی ۔
او د هر قسم خلقو سره دِ مدد او همدردی ته تیار
وی ۔ د یو دارالعلوم اصلی مقصد تو هغه پوری سر
ته نه دی چه څو پوری د هغی فارغ التحصیل طالبعلمان

دَ شهریت د حقوق پروا او نه ساتی ۔
هغه کسان چه دَ ژوندون دَ د STRUGGLE FOR
EXISTANCE کښی کامیاب دی ۔
هغوی په ژوندون کښی کامیاب کیدلے شی ۔ لیکن بل
طرف ته دا کامیابی نیم کړی پاتی کیږی ۔ که چیری
دوئ په وجود د ضرورت یو بل سره مدد اونکړی ۔ کوم
کس چه د نورو دَ پاره قربانی کوی د هغه اخلاق
ډیر اوچت دی ۔

د اصلی تعلیم کار دا دی ۔ چه انسان ته دِ ښه او د بد
فرق اوښائی ۔ او بیا چه ښه معلوم شی ۔ نو د هغه
ښو نه په ښه فائده څرنګه اخستی شی ۔ د دی
دواړو خبرو حاصلولو ذریعه یوه ده ۔ کوم تربیت
چه بنی آدم ته د زړه خوشحالی ورکوی ۔ هغه تربیت
بنی آدم دَ نورو دَ خدمت دَ پاره هم تیار کوی ۔
دَ مکمل او د حقیقی تعلیم یافته کس خیالات پاخه او
احساسات ښه وی ۔ هغه ته دا ښه معلومه وی چه
هغه کوم کار کولے شی ۔ او کوم نه ۔ کوم کار د هغه ته
فائده رسولے شی او کوم نه ۔ او د دنیا د رواج
نه خبر وی ۔ هغه ته دَ ډیرو خبرو مکمل او مفصل
حالات معلوم وی ۔ او په سوسائټی کښی ځان ګذاران
په ښه شان کولے شی ۔ هغه د پخوا زمانی د تجربو نه
ښه واقف وی ۔ او نور خلق تری هم خبرولے شی ۔
او د دغی تجربو په بنا هغه د موجوده واقعاتو په
اصلیت ښه پوهیږی ۔ هغه د دنیا په ښه خبرو کښی
اضافه کولے شی ۔ او د تهذیب په ترقئ کښی شپه
او ورځ کوشان وی ۔ هغه په یو خبره ځان ښه

پو یو لے شی . او دا معلوم و لے شی . چہ پہ دی وُسو کبنی د دښتیا غم څومره دی . دا د هغه فرض دی چہ د پیوه خو لو مالک دی . او د هغی د لوړو خو لو حاصلو لو کوشش کوی .

تعلیم یافتہ کس لہ دی پکار . چہ خپل تعلیمی لیاقت نہ صرف ځان ډ پاره فائده لټوی . پہ دی وړ ځو کبنی ځینی ھم لغیره د بل تہ فائدی د سولو نہ لغیره توقی نشی کولے . دنیا دا غواړی چہ انسان دِ دُ خپل اصلی لیاقت استعمال پہ ښه شان سره او کړی د ھر چا پہ تعلیم یافتہ کس باندی دا حق دے . چہ دے دِ خپله توقی او کړی . خو د ھر سړی و د سړی دِ لوړه تہ فائده ور کړی . او لوړ دِ ھم ځان سره او چت کړی . ھر یو تعلیم یافتہ کس لہ پکار دی . چہ هغه دِ با اثر وی . او خپل دِ نمونه پیش کولو ډ پاره عمل کوی . کہ چری هغه ځان د پاره علم و ادب لوستل خوښه وی . لو هغه دِ دنیا تہ او ښائی . چہ پہ دی باره کبنی د هغه زړه څه محسوس کوی . کہ چری هغه سائنس خوښه وی لو هغه تہ ډ تجربے د پاره لوئی میدان موجود ډی . او دنیا د هغه نہ دا توقع لوی . چہ هغه بہ یا یو لوی ایجاد او کړی . یا بہ د معلوم شده قوانین لوړ ښه استعمال دنیا تہ پیش کوی . کہ چری هغه د تدریس کار پہ سر اخستی دے لو پہ هغه دا ذمہ واری پر یوځی . چہ هغه دِ دَ دُنیا د او ښیار د خلقو خیالات عام خلقو تہ او رسوی او خلق د هغه نہ دا طمع لوی چہ هغه بہ دا فرض پہ ښه شان سره ادا کړی . ماشومان بہ د هغه د دعنه

خدماتو د پیژند لو یو ذریعه دی . چہ د هغوی پہ لیډ کتو سره او د هغوی پہ ناسته پاسته بہ لوړ خلق توی دا انداز لگولے شی . چہ د دوی ملازمت یا استاذی ډ کومی پائی او څومره او چت خیالاتو مالک و و .

د تعلیم یافتہ کس نہ دا امید کیدے شی . چہ هغه دِ د دنیا ھر یو کار پہ خوش اسلوبئ سره د سولو قابل وی . او ھر سړی و د سړی د هغه کار لوړه کول ډ هغه یا د لوړ خلقو ډ بے عزتئ سبب او نہ گرځی د دنیا د تعلیم یافتہ ډ سره د یو امید نہ وابسته وی او هغه وجه ده چہ خلق د هغوی نہ دا طمع لوی چہ دوی بہ ډ خلقو خدمت لغیره د خود غرضئ نہ کوی .

بے غرض خدمت صرف پہ دی ښه نہ ډی . چہ خلق دا غواړی . بلکہ پہ دی ښه ډی چہ د بنی آدم قدر قیمت ھم پہ دی باندِ ډی . چہ هغه دِ د خلقو ډ ښیگړی ډ پاره ھر وخت تیار وی .

مکمل انسان هغه دی . چہ هغه د لوړ د فائدِ خپله فائده او گنړی .

د قوم د هوښیارانو دا لازمی فرض دی . چہ هغوی دِ قوم تر ښه او ښغه لار او ښائی . او قوم دِ ښه او د بد پہ تمیز باندِ پوه کړی . کوم تعلیم یافتہ کس چہ ډ قوم ناموس او عزت او چتو لو کبنی نا راستی او ښائی . هغه د دی قابل دی چہ د قوم ھر یو مشر کشر پہ هغه بد او وائی . او هغه پہ دی نا راستئ ملامتہ کړی او پہ داسی کو لو کبنی د قوم داسی مشران کشران حق بجانب دی . او دوئ د اصول سره

مطابق کار کوی۔

د تعلیم یافته کس دا فرض دی چه هر چرته او هر کله چه انصاف او دیانتداری په خطره کښې پریوځی۔ هغه دِ د دی بچ کولو دپاره هر ممکن طریقه اولټوی۔ او هر هغه پادشاهٔ یا توکی سره دِ مل شی۔ چه کوم د دغی خبری دپاره اوچته شوی ده۔ چه انصاف انصاف دَی۔ او دیانتداری دیانتداری ده۔ او په هر رنګ چه وی۔ دے دِ انصاف او د دیانتدارئ حفاظت خپل اولین فرض اوګنړی۔ څه وخت چه دے د دی قابل شی چه د دیانتدارئ او د انصاف حفاظت د خپل ژوند یو اصول کار اوګنړی۔ نو هغه وخت او بیا د هغه نه دا توقع کیدے شی چه هغه دِ د خلقو سره په داسی طریقه رو رنګار اوساتی۔ چه ټولو ته په یوه سترګه کوری۔ او ټول دَخان نه خوشحاله ساتی۔ او هم دغه ته موږ دَ ژوند اصلی مقصد وئیلی شو۔ دَبنیادم د ژوندون اصلی نصب العین خپل اخلاقی پهلو مضبوطول دی۔ ځکه چه ښه اخلاق هر یو کس پخپله په دی مجبوره دی چه هغه دِ دَ فطرت د قانون مطابق خپل ژوند تیر کړی۔ او داسی ژوندون حاصلیدے شی۔ چه هغه کس د دی خبری پوره کوشش وکړی۔ چه خپل خیال و فکر او عمل و کردار درست کړی۔ د دی د درست کولو ذریعه تعلیم ګنړلے شی۔ پس رښتیا تعلیم یافته کس هغه دے چه هغه د عمر دپاره د رښتیا، دیانتدارئ، انصاف پاکبازئ او هر چا سره د مینه محبت ساتلو خیال او فکر کوی۔

دعقلمندئ او د هوښیارتیا دا هیڅ دلیل نه دے چه هغه کوم کار د ښه ګڼړی۔ د هغی په ښه ثابتولو کښې دِ دے خپل تعلیمی جوهر ښکاره کړی۔ بلکه هغه سړے هوښیار او روشن دماغ دے چه هغه په دی پوه وی چه رښتیا رښتیا دی او دروغ دروغ۔ او صرف دَ حق خبرې حق ثابتلو باندِ خپل زور ښکاره کوی۔ مطلب دا چه هغه د رښتیا او حق په وخت کښې خپل ذاتی مفاد هیڅری مدّنظر او نه ساتی۔ او دَ رښتیا په حق کښې خپله فیصله اوکړی۔ او دغه شان دَ یو بے بنیاده او دروغ کار دَ درست ثابتولو دَ پاره خپل تعلیمی جوهر بے ځایه خرڅ کوی۔ هم دغه د اصلی قابلیّت او هوښیارتیا نښه دا۔

په دی باره کښې به موږ دا او وایو چه هر یو وکیل ته موږ په اصلی معنو کښې تعلیم یافته نه شو وئیلے ځکه چه دوئ عام طور سره د ناحق حق ثابتولو دَپاره خپل زور بیان صرف کوی۔ ښه او بد کښې خو فرق کول په ظاهره یو آسان او معمولی کار ښکاری۔ خو که څوک د دی اصلیّت ته اوګوری نو دو ته به ظاهره شی۔ چه دومره آسان کار نه دے۔ چه څومره دَ خلقو ګمان دے۔ دَ انسان دغه جوهر چه هغه په ښه او بد کښې تمیز اوکړی۔ د تعلیم اصلی او ضرور دی جُز دے۔ (مخلص)

سلطان محمود د پنج پیر

نور تهٔ ایر

غزل

بے دیاره که بهاروی بهار نه دے — بے بلبله که گلزار دی گلزار نه دے

عاشق په سر و مال لوبې کول دي — ځکه ګل ته مخکښ خار دی دلعار نه دے

دا دی زلفې د آشنا په مخ چه وینې — که وير لږی چه خامار دے خامار نه دے

دمجنون په نوم هم ځکه خلق بولی — چه ګویوان کښې هم پریښی یو تار نه دے

عاشق خومره چه مئين بخپل آشنا وی — دومره هغه مئين په مور پلار نه دے

عشق بخپله دخپل ځان استادی کاندی — په دا دوړ د هیچا منت وبار نه دے

که هر خو هم تسلی ناصحه اوکړے — غوږ د زړه که هم لی قرار دے قرار نه دے

که آشنا زه په کښې څما د سر تیروی — د خپل سر خو ما کړے انکار نه دے

چاچه تا د عاشقۍ دی لوټ تیر کړے — د دوزخ د تاؤ دے تو به کار نه دے

د وفا خواست هم کو په دے مجرم شوم

ګرفتار په بل تقصیر ګرفتار نه دے

اے ۔ آر ګرفتار

د چینې په غاړه

د بهار موسم وو ۔ چار چاپیره سبزه وه ۔ هر طرف ته د ګلونو بوټیں خور وو ۔ پاس په آسمان ګوړے ګوړے وریځې خورې وی ۔ نوړے نوړے باد چلید ۔ چار چاپیره خاموشی وه ۔ او په دې میره کښې جلیل او آمنه دواړه د چینې په غاړه ناست وو ۔ دواړو خپې په او بو کښې ایښې وی او به ړو ړو په قلارۍ بهیدې ۔ دی دواړو د مینې محبت خبرې کولې ۔ ګړو په میره کښې به مزه مزه سرکو ۔ دی کښې یکدم آمینې پاس اوکتل وے اُن جلیل ۔ نا وخته شه ۔ بابا جی به خمونږ

لاړ کوړی۔

جلیل:- نا وخته خو نه دی۔ لاخو به لې دا بنام بانګ هم نه دی دلی۔

آمینه:- اوکوره جلیل تورة تیار شوه۔ زه چه واپس شو۔ مونږ به خبرو خبرو کښې خوره دښت تیر کړو۔

د آمینې ګلبهار پلار په لار کښې ولاړ وو۔ کله لاړی تر کوری اوکله آسمان ته۔ د کتو نه لې دا معلومیدو چه د چا په انتظار کښې دے۔ د زړه کښې خیال کوی چه جلیل دی وړے دومره ناوخته کړو۔ د باد باران شپې ته کوره۔ او د دلی نا وخته دا تلو نه۔ خیر دے آخوا دیخوا کوری۔ چه کړی په نظر راشی۔ خوشحاله شی۔ او جلیل سره کړی بهادر نه د شنه کړی۔ او بیا د ریواړه په مزه مزه کورته روان شی۔

فقیر (د آمینې پلار) جلیل بچیه۔ ماخپل فرض ادا کړو۔ اوس ته خیره د اولسو اتلسو کالو ځلمی لې۔ او په منه بلا بچیله بنه لوهیږی۔

جلیل:- باباجی ستا مطلب څه دی۔ چه د افغیر کوی۔

فقیر:- بچیه۔ ته ما ته د دوو کالو حواله شوی وی۔ ځکه چه ستا پلار ځما ډیر دوست وو۔ ما ته لکه د بچی پښتان لوی کړی۔

جلیل:- باباجی۔ ستا دی خبرو نه څه مطلب دی۔

فقیر:- بچیه۔ څه اوس بډها یم۔ ځما شپې قبر کښی اوریدانده دی۔

جلیل:- نه باباجی۔ خدائی دې تا تول عمر ځمونږ د پاره ژوندی لری۔

آمینه:- ځان سره۔ آمین!

فقیر:- نه بچیه۔ مونګ هر چا له شته۔ او آخو به څه لیوه ورځ مو م۔

جلیل:- باباجی۔ ستا دی خبرو نه څه مطلب دی۔ ماخو پوه کړه۔

فقیر:- بچیه۔ څو پورې به ته دا بودلی کلی سره۔ څه خو هم د کاد کسب نه اوو تم۔ ماسره چه څه وو۔ هغه خو ستا په بیادلی اولګیدل۔ اوس ته د خدائی په فضل سره جوړ یې۔ او بنه تکړه یې۔ اوس ته اوکته۔ او مال د اکړه۔ اوس خو څه د کار د کسب نه یم۔

جلیل:- باباجی۔ پروا مه کوئی۔ څه به د الله په فضل سره ځان خوځوم۔ وړے تاسو له به پیدا کوم۔ که څه حلالی یم۔ نو څه به ستاسو مهربانی هیره نکړم۔ چه کوم ځائی کښی ستاسو او بنه وړه څه به خپله وینه بهوم۔

فقیر:- شاباش بچیه۔ ما تا نه دغه اراده ساتله چه ته حلالی یې۔ خدائی دې تا کامیاب کړی آمین۔

بله ورځ جلیل د باباجی نه اجازت واخلی۔ او د هرتیې د پاره روان شی۔ په لاره کښی ورته آمینه ولاړه وی۔

جلیل:- آمینې۔ ته د لته څنګه دا غلې۔ ماخو ته هلته کتلې۔

آمینه :- صبی مادی چه تا تلو کښې یواځې اووینم

جلیل :- څه خو ځم آمینې خو چه ما صبر نه کوې -

آمینه :- څه تا لشم صبر د لې - څو ځرې نشم صبرولې

۵

جانان د لاړې نه صبر نکې

څه به د غم جانان ښکلې صبر و مه

جلیل :- چاره مه - کورې ته ما به تلو کښې خفه کړې

مه ژاړه - مه ژاړه -

آمینه :- دا به ژړا کښې ته به بیا کله راځې -

جلیل :- څه به ډیر زر راشم خو ته مه ژاړه -

آمینه :- راوبنې او چیځې اکورې تلو سره د خیر خیریت

خط راولیکه - ما سره به فکر وی -

جلیل :- څه به د رسیدو سره خط راولیکم - خو ته مه

ژاړه - باباجی به څه وایې -

آمینه :- ته به ښار ته لاړ شې - بیا به لویه هوا

شې - مونږ به دِ هیر شو -

جلیل :- دا مه وایه - ځما نه هیڅرې نشې هیریدې

بس دے څه ځم - ناوخته شو -

دوایه دُ اُښکو نا ولو سترېو سره بیل شو - او جلیل

د جدایې په لار روان شو -

بهرتي په زور شور سره کیده - جلیل تلو سره واخستې

شو - او د ډنګرو تهتیا د پاره او لیکلې شه - شپږ میاشتې

ډنګرو تهتیا نه پس جلیل بیا خپلې جهونګړې ته راشې

جلیل فوجي وردې اچولې وې - او ځان سره دَ آمینې

د پاره رنګارنګ سامان راوړې - جلیل باباجي له

مرچې ورکړې - او باباجي ډیر خوشحاله شي - جلیل او

آمینه بیا سحر وختې د چینې په غاړه ناست دی -

نرمے نرمے باد چلیږی - جلیل خپله فوجي ورد دی

اغوستې ده - او آمینې د جلیل راوړې جامې اغوستې

دی - چه صفې کښې دَ خولسم سپوږمۍ ښکاری -

جلیل :- آمینې - تا څه چرې یاد کړے وُم -

آمینه :- څه او وایم ؟ د زړه نه تپوس او کړه -

جلیل :- زړه خو ما ته څه نه وایې -

آمینه :- تا څه چرې یاده کړې وم -

جلیل :- آو - هر وخت - هره شپه به مې خوب کښې

لیدلې -

آمینه :- دروغ -

جلیل :- قسم دَی -

آمینه :- د غم شان هم ما اوګڼړه -

آمینه :- دا ډاکې څه له راځې ؟

جلیل :- څه او وایم - ما ته خو هیڅ پته نشته -

ډاکې راشې - جلیل له تار ورکړې - او ورته او وایې

چه تار کښې لیکلې دی - چه زر والیس راشه -

جلیل فوځ ته والیس د تلو تیارې کوی - آمینه ژاړې

او د خوشحالۍ او ښکې غم کښې بدلې شي - دوه کال تیر

شي - نه ده جلیل خط راشي - او نه څه خبر - آمینه ورځ

او شپه ژاړې - خپل د خوشحالۍ عمر غم کښې تیروی -

صرف د جلیل د راتلو په امید کښې - د جلیل خط راشې

چه څه د ر روان یم - ولې دی کښې هم دوه میاشتې

تیرې شي -

دَ آمینې پلار په جهونګړه کښې ناجوړه پروت دی - او

آمینه یې خپو ته ناسته ده -

فقیر:- آمینې بچې - څما آخری سلګئ دی - که جلیل
داشي - نو ورته دا ووایه - چه ته یې یادو لې - خو ته لږ
آمینه :- ژړا کېږي - باباجي خدای به تا جوړ کړي - او
هغه به هم راشي -
فقیر :- بچې - دا سرم لږ خو کیږی چاپې لې کړه -
آمینه :- ښه باباجي - په سر یې زور کړي -
فقیر :- دا ته ولې ژاړې -
آمینه :- ژاړم خو نه باباجي -
فقیر :- څما په مخ او ښکې را پړیوتې -
بهر سخت باران وریږی - سیلئ په زور شور سره
چلیږی - تورې تیارې یې جوړه کړې ده - چه په دی
کښې یو سړی جهونګړی ته را ځی - باران سره لوا
لونډ خوشت وو - لیکن دعه دچا مو نه ښکاریږی
چه لوئ خان دی - باباجي ماله لږ ځائ راکړی -
څما دیر ساړه کیږی - ځکه چه څه باران وهلې یم -
فقیر :- آمینې بچې - خان ته اور بل کړه - چه ګرم شی -
آمینه :- خه جي - بلوم ورته -
خان داتلو سره په آمینې مئین شی - او آمینې ته په
غور غور ګوری - او دسخه کیږی -
فقیر :- خان موږ عاجزان یو - خفه کیږی مه -
ستاسو موږ څه عزت اونکړے شه -
خان :- بابا - ستاسو مهربانی ده - چه ما له مو ځائ
راکړو -
فقیر :- خان - خان -
خان :- ولې بابا -
فقیر :- څه خو مړه وان یم - څه دخپلی لور ..... لاس

ستا ..... په ..... لاس ..... کښې درکوم -
خان :- ډیره خه ده بابا - ما ته منظوره ده - تا ما
سره مهربانی کړی ده -
فقیر :- شکر دے .... خدایه .... شکر .... دی
په مرګ .... د .... خوشحاله .... کړم -
ساه ورکړی -
خان او آمینه دواړه واده شی - آمینه بیګم شی -
ولې دجلیل مینه یې دزړه نه نه اوځی - همیشه دَ
شپې دعغه به یاد کښې ژاړی - دلی دنیا نه پته -
جلیل چهتی واخلی - جهونګړی ته راشی - دلی جهونګړه
خالی وی - جلیل خفه دکلیو والس شی - دواده پته
ورته اولګی - او د آمینې باغ ته ورشی - آواز اوکړی
آمینې ! وا آمینې !!!!
آمینه : جلیلَ جلیلَ ته یې - کله راغلی - په خیر راغلی
جلیل :- خه پرون راغلم - خو جهونګړه خالی ده - دلته
راغلم -
آمینه :- جلیلَ ته ما نه مه خفه کیږه - باباجي ستا دیر
انتظار اوکړو - ولې ته رانغلی - په څنګه ن کښې یې
څما لاس ده له ورکه -
جلیل :- څه نه یم خفه - خیر دی - خو شکر دی - چه ته
خوشحاله شوی - څه به تا بیا کوم ځائ وینم -
آمینه :- په زړه جهونګړه کښې -
جلیل :- خه وعده ده -
آمینه :- او وعده ده - دواړه یو بل ښکل کړی - او
جُدا شی - دغه وخت خان ددی خبری واوری - او
ځائ ته والس لاړ شی - بله ورځ جلیل جهونګړی ته لاړ

شي ـ دلې چه آئينه جهونګړې ته اودې ـ نو جهونګړه کښې لمولې ويې دی ـ جليل مړ پروت دی ـ آئينه چغه کړه ـ او وائي ـ جليل ځه هم د رغلم ـ په جليل باندې راغورځيګي ـ او ساه يې اوځيږي ـ
چه خان راشي ـ نو جليل او آئينه دواړه مړه دو ـ او د يو بل د پاسه پراته دو ـ

جليل د خان نوکوانو مړ کړے دی ـ او آئينې د جليل د محبت د پاره ؟ ـ

محمد شير د اوّل کال

يوخيال

يوه ورځې ګورځيد مه په ګلشن کښې
ما ذيکر و ونمر شو ښه د غزلون کښې

د مرغو شور د غوغا وه هر طرف ته
بلبلا نو راک ويلو په سوزن کښې

ناګهانه شو ما بنام تيار ه خوره شو
پرځې تولې کړې ملغلرې په چمن کښې

ګرځيد مه هيڅ ته څوړ ته زه يو اځے
چه سپوږمئ او خنديد لخيل مسکن کښې

دنګ لي ذير دو لکه دا چه دي نارغه
مړ زلې بيت کړلو د ورځې په کفن کښې

چه ورځځ ده مځے نه پيناه شوه
نه وه وينه يو ذره د دی بدن کښې

ما توې اوکړلو تيوس اسے نازنينې
ته د ميني اور لوی جوړ په لمن کښې

دا په هسې دنګ ژړا کښې شوه ګويا نه
چه وفا لشته دی نن په مردو زن کښې

ځا زړه د محبته ځنې ډک دے
دلی لشته وفادار په ټول وطن کښې

خکه دنګ ږم د زعفران پيشان زير دے
نه ږم شته دی يو ذره وينه په تن کښې

دائې او وئيل نا سا په په ژړا شوه
نيوهيکم ځه لې خيال د وبه باطن کښې

تسلي ږم وړله ړو ړو ورکوله
ما وئيل چه دواړه يو يو دی تحن کښې

ځه هم ستا پشان سرګ په بيابان يم
چه اسير شوم د دلبر چاه ذقن کښې

هسې دنګ لې په ستروبو کښې کشش دی
لکه څنګه مقناطيس راځ په آهن کښې

مونګه دواړه عاشقان يو راته ښکاری
دواړه اور د محبت لوو بدن کښې

تل جفا او نزاکت کړی عزيز خانه
معشوق دِ ده استاده هر يو فن کښې

عبدالعزيز

لاندني اوپیژنئ

(۱) چېرته ډېر غوښن وي. لږ شک به ورکوي. په ظاهره د هرچا سره ظاهرداري. په زړه کښې ئې څنې څنې خوښ. سلام چټک اخلي. او ټک ئې شاهانه دی. ډېر کارونه ئې پیسا اعنشتې دي. او هر کار ترسره د سوی.

د بعضو د پاره د رحمت باران. او د بعضو په حق کښې د عطرو تماشګے. په دی پالیسئ کښې کامیاب دی. او ډېر خلق پرې خوشحال دی

(۲) د هرچا دوست خو په وښت د موقعې کښې د خوش نصیبو دوست. ساده کارونه او ساده لباس. د شپې نه د ورځې جوړونکی محکمې افسر خلق ئې ډېر خوښه وي. او خاص کر د مغتبري

(۳) د هرچا سره پستي او خوږې خبرې. د تکلفاتو ډېر پابند د نصیحتو ډېر مرینه. او د مذهبي اصولو په هر یو کار کښې وضاحت کونکے. ډېر کم ئې پیژني. او کم پیژني. خو چه څوک پیژني. ډېر ښه ئې پیژني.

(۴) د بادشاهانو طبیعت. کله په معمولي خبره خفه او کله په ډېر څه ئې پرواه نه. په ظاهري لب ولهجه کښې سخت. په زړه کښې د هرچا همدرد. د علم او ادب د ذخیرې څوکیدار. او په دې باره کښې د هرچا تابعدار.

"عالم باعمل"

جهانګیر خان وزیر
د اول کال

چاه وي پخپله

—: اول منظر: —

دریخانې واده دی. حجره کښې جنج راغلے دی. ډمه ګډېږي. او نقلي نقلونه کوي. د اودرا ښځې دادیالونه کوي. او سندرې وائي. سه

صغه جوړي به جنتي وي — یله جانانه
چه یو مئین دی بله ښځه سخت شینله
دلېښتنو دی لیښتو ته کوره — یله جانانه
چېرلوړ او خوږ لکه د میني خوشخوینه

—: دریم منظر :—

ریحانه کوټه کښې ناسته ده. شهلۍ، میمونه، بسوکۍ او شاه سلطان وغیره ورسره ټوقې کوي

شاه سلطان :- میمونې. یره دا ګنج خو هم یو قید خانه ده کنه. جیلۍ غریبه یکېنې او درې ټبرې بند ناسته دي. ریحانې ته ګوره. کواښې ستورې لې راوتي دي.

بسوکۍ :- حلالولو نه ړومبې ګډه تنده ښه دي. (د ټوټو د ټنګ کښې) د میړه کور کښې خوب نه ورځي ناګهانه په کرس خندا شي. ټولې جینکۍ خاندې. د خندا او د لوی ګکیدنګی د دورا د ساز په دوران کښې میمونه وائي.

میمونه :- جینکو! چپ شئ متهیزې شئ. یو خوشخبري ضروري کوو.

بسوکۍ :- زه نامردې. ستا خو سوا د اوچ کلک نصیحت نه صبر و لوړ خه زده نه دي.

میمونه :- خوارې لږ غوږ کېږده. بیا به درته پته اولګي. ما دا ویلي. چه جینکۍ د خپلې خوښې نه سیوا ولې ودیږي. د جینۍ د خوښې قدر ولې نه کیږي؟

شاه سلطان :- جینۍ د مور پلار نه زیاته خوښیا نه وي. او د یو جینۍ د مور پلار هم دا نه دي خوښه. چه خپله لور په کوهي کښې واچوي.

بسوکۍ :- لعضې قبیلو کښې به اوچو کلکو درد یو حرځو لو دستور دی. خوک چه زیاتې پیسې ورکوي. جینۍ د هغه ده. لعضې جینکۍ مور پلار د خپل بدو په بدال کښې سوره ورکوي. د هغې جینۍ عمر د میړه په کور کښې څونګه وي. دا درته معلومه ده؟ لعضې جینکۍ د خپل قام یو خلمي له په دې وجه نه ورکوي. چه د هغوی د مینتوب او محبت پلار مور ته حال معلوم وي مونږ خو څه کوو. د ملکانو نه هم تپوس نه کیږي

میمونه :- او کنه جي. ځکه خو دنیا کښې سول میوچ د متهیز توب پیدا شو.

ریحانه :- دا د صیږ و جلسه ختمه کړئ. پکار دا دي چه د کومې جینۍ واده د هغې د رضا نه سیوا جوړ شي. صغه د د نکاح واک نه ورکوي. چه دې سیږو ته پته اولګي. چه خوره هم دنیا کښې څه خیز دی.

شاه سلطان :- ته به څه کوې. رحیم الله خوار په اور سوزي. او درنګ ساعت له به د رفیق د پاره د راله څپې لاسونه سره کړي.

ریحانه :- خبر به شي. خو چه صبا شي......

بسوکۍ :- څرنګه خورې؟

ریحانه :- یا خو به رحیم الله ته واده شم. یا به د لوی چل کوم. چه رفیق کره مړه یوسي. په ما رفیق حرام دی. صغه ما ورشه ردے

بسوکۍ :- نن شپه که خدائ خیر کړي. صبا نه به ړومبې ړومبې که خیر وي څه او میمونه...... کوئیم او د ولنې کره ناستې یو.

شاه سلطان :- نه خوارې. حائې توبه او باسه. خلق به څه وائي. څومره شرم دی.

میمونه :- د تول عمر ژړا نه بنه دَی . د خلقو په په نظر کښې هر څه جهریم . خدای ته خو یم غا ړه خلاصه ده .

د داریالو نو ساز او د خزو ګنړی خبوی را نزدی شی . د ور ټکار دَی . خوږی چیغی وهی .

ښځې :- ادری ښلوس په یوځائی ، ور لوی کوټی خوار دا ګنج دَی که جیلئ نه ؟ ....

لسوکئ :- جیلئ نه ده دا نه لوی کیږی .

ښځې :- (دَر په زوده زوده ګرځوی) دد لوی کئ . کئی ور ماته دد . (ناکها نه ور لوی شی یوغټ کرب آواز دا شی دَور لوی کیدئ . او په زوره زوره خندا شی ، ښځې خپلو کښې هنوی کوی . او یو ښځه نالئ ګنړی ته آواز کوی .

یو ښځه :- وا پیټوکئ :- خوا ری نکویزی زر پورې کوه مچی به را ته ژاړی . دا خرنګه نالئ ګنړه لئ ؟ صبی وښتی تیوبڅی .

پیټوکئ :- دلی دا منې ده څه ؟ خمونږ هم دا ورا ځ وی چرته دیل وال . اینه دآئینه آخو څه خوا وشی کنه . هله هله دجوړ کویدی . مچی دِ ژاړی . نو ده کنه . منع کړی چائیځ .

بله ښځه :- پیټوکئ ! چپ شه . زر زر خپل کار شروع کوه ....

لږ ساعت پس د ښځو شور شی . ځنی چه خو .... ښځی بهر ته لاړی شی . نالئ ګنړه ځان سره وړی . څه خوا واده دی دده ښي دوپئ ټول دیل داغے .

—: دریم منظر :—

رحیم الله (د دیهاتي یار) دولت (دَ میمونے یا) کوم او لسوکئ یار) پټي پټي پس لیپٹے هنوی کوی ......

رحیم الله :- کریمه . یار ډیر وښت اوشو.....اُف ...راوګډ اسو یے او کړی انتظار دَ موږک نه هم زیات دے .

لوی یو ر نړا او شی او لږ ساعت پس ډزهم واوریدے شی . رحیم الله خپل تقریر جاری ساتی .

رحیم الله :- اوه .....ګوره هغه ر نړا .... ډز..... اُف....کمبخته ګولے څه په ښر ګکار په دی لاړ لاړه غوټه خمونږ د سر دَ پاسه لاړه .

دَ لسوکئ آواز دَی میمونی ته څه وائی .

لسوکئ :- میمونے . کافره تیاره ده .... ډزهم او شو دَ یار لو بیته نه لږی .

میمونه :- ګوره هغه د باغ خوا کښې ولاړ دَی . دری غلور تنه تور تور ښکاریږی کنه .

لسوکئ تیکی ور او لی . او آواز کوی :-

لسوکئ :- رحیم الله کاکا !

رحیم الله :- اوهو .... ایله دا ښکاره شوه . ګورے آباد شه ـــ

یاری دشنی لختی ګذار دَی

خدای دِ جمله مسلمانان تو بینه ساتینه

لسوکئ :- کاکا ! ماسره میمونه هم ده . دولت لالا او صغر بل هم شته که نه ؟

رحیم الله :- هوشته دی .... ګوره ګوره .... لږ لږ دِ څه شوه ....

میمونه :۔ کاکا ابی جی خوګیره شوه ۔ د رفیق د کوربلحی را غلي
او د تختو ټکوالی ئې شروع کړو...... بسوکئ ! دادشا سلطان
ورانسے و دو غږ ګړه هن ؟
بسوکئ :۔ کیډ مے شی ۔
دولت :۔ سنه نو هغه نشي راتلے ۔
بسوکئ :۔ کرانه ده ۔
کریم :۔ خئ چه بیا خو...... نو...... نو...... رحیم الله
څه اوکړو...... نو...... ؟
رحیم الله :۔ خئ چه داجینکئ او رسوو ۔ خالقین دي ۔
ریحانه رفیق وډو لے نشي ۔

—: څلورم منظر :—

د ډولئ ساز ګډیږي ډ لا لا ته لا آوازونه د رسوره
خیژي ۔ د رفیق کور ته ډولئ راځي ...... د رفیق
ترور مشو بي بي د ډولئ له راځي ۔ جینئ نوزلی ......
جینئ ډیره زیره ده ۔ او بار بار دقي کولو کوشش کوي
...... دوینو الټي رقے ، اوکړي ۔
ریحانه شکر دے ۔ الله شکر دي ...... بیا الټي اوکړي
مشره بي بي :۔ یا الله ! یا الله ! غرقه شوم ۔ تباه شوم ۔
یا الله د لخه بلا اوشوه ۔ دالی ریحانی بچے داغه در باندې
اوشو ۔ (ناګهانه د بنځو شور شي) ۔
یو بنځه :۔ مشرے بي بي ! ذیفل در کړو ۔ په تندي در ته هم
اوکه ۔ ډیوبي بي قیسر شوه ۔ اثے له ځوک واستوه ۔ چه
ذیفل تر ینه را دري کوړ چه دستر بند دې کښ جوړ شي
بله بنځه :۔ خوارې د نداسه د ډ رله اوولیشئ اوکوه کوه
ډ در کوي ۔ یا ډ ځکلو ګنګو ۔ خلاص بلے ۔ مړ پرے در کړي

حکه جوړه به شي ۔
شاه سلطان :۔ ریحانے بي بي ! دا ډخه اوکړو ۔ ځائ ۔ ځائ
نامرد ی ۔
ریحانه :۔ (په ډیر فریاد سره) بنه د اوکړو شاه سلطانه ۔ ستا
زړه یخ شو ۔ ستا د شیطانئ نه هم دا مطلب وو ۔ خو کیدا دے
د راستو لے ۔ بنه ده چه تاسو رفیق ته واده کوم څو اختیا
...... او...... او...... اوق ...... وائ الله ما زړه اوبلے ...... وائ
زړه مې اوچاوده ...... توبه ...... توبه ...... او...... او......
اوق ...... اوق ...... حق حق ...... اف ...... پښتو......
پښتو ناکاره پښتو ...... اف ...... حق حق ...... توبه ......
(د ډیر یو تو آواز)
شاه سلطان :۔ مشرے بي بي ۔ تو تکی ۔ تو نزي بویکس لي ځله
تجري ته خبر اوکړئ چه ډاکتر راولی ۔ ریحانے زیره خوره لی
دي (خپل ځان ته) یا الله ما معاف کړې دا بې ګناه ظلم
ما اوکړو (په ژړا شي)
ریحانه په بالښت سر کیږدي ۔ او بس کیخو ده پاتی
شي ۔

فقط

سید سلطان محمود
سپلینه وړئ

انعامي نظم په دارالعلوم

ته ناپوهٔ په هر فن پوهٔ کړې آباد اوسې په کلونو
تا کښې جوړ آدم انسان شي په اصلي معنو لفظونو

کښې ژوند دې ژوند خودادې چې پرېسوړې دې وسېتا — بس کتاب قلم کاغذ یې مشغولا دې له دفتر ستا
سلامې د هر سحر کړي که شاګرد دے که افسر ستا — شم له هرې شکې ذاتې ډېر ښکلې خو بوده دا منظر ستا
په دنیا کښې جنت ته یې تا کښې خلاص دې له غمونو
ته ناپوهٔ په هر فن پوهٔ کړې آباد اوسې په کلونو

ته هغه کوهر مقدسله چې خوبن کړې دب اکبر یئے — تا ته ځکه خلق راشي چې خیرخواه د هر بشر یئے
د دنیا په سمندر کښې ته صدف د لک له کوهر یئے — ستا په کیږه کښې ځلېږي مرغلرې دې اکثر ے
له سخا ستا مجره مند شي د آدم خوئے په لکھونو
ته ناپوهٔ په هر فن پوهٔ کړې آباد اوسې په کلونو

د وطن بچې حاصل کړي د تهذیب تعلیم لتا نه — مور و پلار د آداب ته یې زده کوي تعظیم لتا نه
ځز د ژوند د کامیابۍ یې کیږي دا تقسیم لتا نه — د قام مړي د ژوندي کړه چه داځي نسیم لتا نه
ته الله مسیحا دم کړې د آدم تردې وختونو
ته ناپوهٔ په هر فن پوهٔ کړې آباد اوسې په کلونو

ستا په کتو شکو الېي برکت الله کبیر دې — یې د قوم د بهبود ځائې بل یو کوم د تا نظیر دې
تشنه لب د تول سیراب کړه تعلیمي حوض د بهیر دے — د قومي رنځ دوا ته یې تاسره علاج اکسیر دې
بلندي ستا په معنو ده نه لوا ځے په چتونو
ته ناپوهٔ په هر فن پوهٔ کړې آباد اوسې په کلونو

تا ځائې کړې په سینه دې مخلوقو نه د جهان — شاه ګدا امیر فقیر ته نظر ستا دې یک ځان
ستا د ترپه د ودېزه عروج دینم د انسان — ته د علم وزر ورکوې پورته خیژي په آسمان
ملنګي ستا په دلبار کښې بادشاهي ده د ملکونو
ته ناپوهٔ په هر فن پوهٔ کړې آباد اوسې په کلونو

بهتري ستا بیان کړي په قرآن کښې رب معبود　　حاصلیږي ستا په کور کښې د آدم د زړه مقصود
غولک چې را نشي ستا غیږ ته زندګي لي دي بې سود　　په معنو حیوان سیوری شي که څه وي په وجود
شمار په صف کښې د چا نشي که دي لوئي په نسبونو
ته نا پوئ په هر فن پوئ کړې آباد اوسې په کلونو

چاچې ایښې ستا بنیاد دی تر قیامت به روښانه وي　　یوځل نه په هزار ځله د خمونږه پرې سلام وي
ښوچې ده دنیا آباده د علوئ د احترام وي　　بلبلان به پرې چغیږي پدې باغ سیرلې مدام وي
تخم یوئ برباد نه شه چیرئ کړئ کړو د ګلونو
ته نا پوئ په هر فن پوئ کړې آباد اوسې په کلونو

میاں محمد یوسف
د خلوزام کال

مرور آشنا ته

دا بیا د لې اے محبوب ته لما نه مرور شوې　　څه دې د خبر د خفګان ده رانه شوې څه خطا ده
دا ته چا پئې لسولې چه د بې څودم په غم کښې　　غمازي د کوم غماز ده چه پرې اېښې م تاخوا ده
هر چه در شم ته رو ان شې را نه مخ د اوړې بل خواه ته　　دا سزا د کوم قصور ده را نه شوې څه ګناه ده
ستا د عدې لوظونه څه شو هغه قول د اقرار څه شو　　تا بنو ویلې "د وفادار یم" ستا د وفا جوړه جفا ده
هر چه ستا سنګ له به راغلم لکه ګل به بې خندا شوې　　اوس چه در شم ته لې مراد مې نه د تینګ نه بیخند اده
چه لیوځان به ماخفه کړو نو سلګئي به تا د هلی　　اوس پرواه بې اوړ نکړي که هر څو څما ژړا ده
چه رقیب به در نه راغو تا به وړې سپوږي ویلې　　اوس رقیب نه زار قربان کړې جور ستم غصه بیا ده
اوس ته څو مره زر بدل شوې ته به څه لما ویزار شوې؟
جور جفا د اوس پیشه کړه دا به څه تحفا کار شوې؟

محمد یونس خلیل
د تهکال

کاشکې

کاشکې جادوګر وی چې هم خوره بیړه کولې شوې
کاشکې څه لیډر وے چې هم قوم دهوکه کولې شوے

کاشکې څه شاعر وی چې هم قول وی له عمل ځنې
کاشکې څه امین دی چې هم فنډ کړې د قوم صفا

کاشکې څه هلک وی چې له کاره بې خبره وی
کاشکې پروفیسر وی چې په لوړ علم غاوړه وے

کاشکې څه هندو وی چې له مونږ نه ژر نه خلاص وے
کاشکې مسلمان وی چې د تول جهان نه یاس وے

کاشکې څه انګریز وی چې ممتاز وی په قومونو کښې
کاشکې افغیې وی چې غرقاب وی په خوبونو کښې

کاشکې څه ښکاره شوے د نیا کښې په مثال د نور
کاشکې دا مقصد هم شوی بې درده بې کوششه سر

کاشکې څه عالم وی او د علم هم معیار نه وے
کاشکې کتابونو . سر درد و سره هم کار نه وے

نقّاد

د هجران سرود

ناستایم په خاوره د مرغ دل په ثریا وینم
دا څونک مستی ده په غربت کښې ځان بادشا وینم

سوز کښې هم یو ساز دی د غم ساز نوی انداز لری
نن چې څوک وفا کوی جفا د ځوړلې سزا وینم

خوب کښې د وصال ګلونه باغ کښې لمولم هم څه
تک چې مرا بیدار شم په هجران کښې ځان تالا وینم

ورک د عاشقانو دِ دا ژوند شی چې کوی کی تل
ګورځې په فراق کښې لکه ګل نه چې بهورا وینم

پریخوده تختونه بادشاهانو! معشوقو لیسی
چنګ رباب په لاس کښې په صحرا او په بیدیا وینم

نه به شی پردی چوی اخپل که ځان تالا کړی هم
داسی غواصی کښې عاشقان تل په ژړا وینم

هیڅ نشته وفا خلقه د نیا په میخانه کښې نن
ځکه اوس لسمې د خپل آشنا نه بې نوا وینم

سلیمان دربری
د غلو رام کال

'My Love in the garden'

Once in a garden
I went wandering like a bee.
To suck honey ? nay, but to see
If my love was there.

She came every morn,
For the Queen of the flowers was she.
The buds at her sight did free
Themselves into blooms.

She came, like a breeze,
Unseen, and yet every flower
Preserved her shape in the mirror
Of crystalline dew.

Ah me ! She was gone.
I turned to the flowers to see
Her face, but unhappily,
It was there no more.

The sun had, perchance,
Felt jealous of the flowers, so,
Evaporated all dewy glow
To efface her shape.

RAUF.

In Memoriam

In Khan Bahadur Maulavi Ghulam Hasan, one of the members of the Darul Ulum Foundation Committee, for many years a member of the Council of Management, and father of Prof. Abdur Rahim Niazi

passed away

a pious and God-fearing

man

Mourned by all.

ment is set up to scrutinize reports intended for the newspapers. During the last Great War (1914—18) an official censorship of a far-reaching and rigid type was in operation, and at times gave rise to much resentment because of its tendency to cause delay in the dissemination of news. Occasionally literary censorship has "banned" books and thus given them and their writers exaggerated prominence.

A. RAUF.

Science and Civilization

We live in a scientific age. Modern civilization owes a great deal to Science. Our yesterday's faith in superstitions has totally faded away, even though "men's fear of each other" has been considerably enhanced.

Science had to fight against both theology and humanity but it soon acquired ascendency over the minds of educated men. It was foreseen by great thinkers like Huxley that Science would replace even God Himself

How deeply Science has influenced civilization is clearly visible all around us. It has successfully conquered distance. A distance which took months to cover in the nineteenth century is traversed within a few days, by the aeroplane. The journey itself has become more comfortable.

Science has enabled us to send our messages more speedily than ever before. We can not only write to our friends but speak to them on the wireless. Television, telegraphy and telephony have facilitated communication of news and messages to the ends of the Earth.

The invention of machinery has economised human labour and made it possibly for man to manufacture goods at an incredibly low cost and at a larger scale than could ever be dreamt of before.

Medical Science should be thankful to the scientists of the 12th century especially. In the olden times surgical operations caused excruciating pain to the patient. But now-a-days, the percentage of deaths on the operation table has been greatly reduced, and pain and shock reduced to the minimum. Anaesthetics and antiseptics have proved very useful: chances of infection have been minimised by the adoption of the under-ground system of drainage.

Electricity is another great blessing of Science. It has not only been used for lighting purposes but also for cooking, heating, floor sweeping. The radio has made the dull evenings at home, bright. Many a machine and factory is worked by electricity. Electric trains and electric engines and tramcars are also conducive to the comfort of man.

But unfortunately Science has occasionally been applied to warfare. The present war is a war of Science. Poisonous gases, bombs, tanks, destroyers, torpedoes and other machines of destruction owe their existence to Science. So, it may be said, broadly that Science has simultaneously, and in equal measure, increased man's power and diminished his pride.

CHANDAR PRAKASH.

While the early Tudors had punished the publication of treasonable, seditious, heretical and blasphemous books as crime, the later Tudors found a readier instrument for regulating the press than the courts had proved to be in the incorporation, in 1557, of the Stationers' Company, with wide powers to monopolize and control the printing trade. In order to facilitate the suppression of objectionable literature, two detailed ordinances were issued by the Star Chamber in 1568 and 1637; the latter going so far as to lay down rules for the protection of the copyright.

The disorder of the Civil War led to the publication of a large number of polemic books, pamphlets and journals. The Long Parliament forbade by an ordinance in 1643 the publication of any book without a license. As a protest against this ordinance, there promptly appeared without licence a famous defence of the liberty of the press, remarkable not only as a masterpiece of style and of persuasion, but as a symptom of the change in the public opinion

Milton in one of his pamphlets called "A speech for the Liberty of Unlicensed Printing" selected for his text a verse from Euripides.

> This is true liberty, when freeborn men,
> Having to advise the public, may speak freer.

While pleading with the Parliament to repeal their ordinance, Milton admitted that it was a matter of public concern to keep a vigilant eye upon books, for books 'are not absolutely dead things, but do contain a potency of life in them to be as active as their author...... . A good work is the precious life-blood of a master spirit embalmed and treasured up on purpose to a life beyond life.' However Milton's effort for the removal of the sheckles of censorship failed and ever severer ordinances and acts were issued by Parliament in 1647, 1649, and 1657.

With the Restoration, the old system of licensing was revived in a law of 1662 which declared that the 'regulation of printers and printing presses is a matter of public care', and that "many evil disposed persons have been encouraged to print and sell heretical, blasphemous, seditious and treasonable books and pamphlets." This statute provided that all books must be licensed.

In the matter of the freedom of the press the New World was no more advanced than was the old. A 17th century Governor of Virginia thanked God that there were no 'presses to corrupt the manners of the settlers in that colony'.

The first press in British America was set up at Cambridge under the supervision of the president of Harvard College. As he failed to exercise sufficient vigilance to satisfy the demands of the theocracy, two licensors were appointed in 1662, without whose consent nothing could be printed. Twelve years later the General Court of Massachussets permitted the setting up of presses elsewhere than at Cambridge

The history of press censorship becomes more involved with the advent of drama into English literature. There still exists in England a form of censorship of plays, which is in the charge of an officer called the Examiner of Plays. By a new regulation issued in January 1912, the Lord Chamberlain grants licences for the performances of stage plays. In times of war, a special depart-

In 1546 the Council of Trent prohibited the printing without license of anonymous books and of books on religion. The first document to bear the name of *Index of Prohibited Books* was issued by Pope Paul IV in 1559. It divided forbidden books into three categories :—those totally condemned, those partially condemned and anonymous. Pope Pius V instituted a special congregation which issued more than forty Indices Librorum Prohibitorum. One of the duties of the congregation was to prepare an Index or list of passages to be deleted from books, which might, when so corrected, be read. The only such index ever issued by the Roman Congregation was the one prepared in 1607.

'To protect her flock from poison and to give them salubrious fodder', as Sextus V put it, the Church strictly banned all the important works of modern science, philosophy and learning. Among books on religion, most versions of the Bible were forbidden to the faithful Among the forbidden philosophers we find in Indices the names of Montaigne, Bacon, Hobbes, Descartis, and Spinoza; among the scholars, Scalinger, Walton, Erasmus; among the scientists, Copernicus, Galileo, Pascal and many anatomists; and among the poets and novelists: Milton, Dante, Rebelais, More and Boccaccio. Dante was expurgated for his reflections on papacy in the Divine Comedy and Boccaccio was expurgated chiefly for his satire on the clergy. That servile faith and bigotry were fostered and science, philosophy and liberty were long hampered in Catholic lands in the 16th and 17th centuries is due to the Indices even more than to the Inquisition. 'The censorship', said Sarpi, 'is a dagger drawn against all writers.' 'The expurgating indexes', Milton said, 'rake through the entrails of many an old good author with a violation worse than any that could be offered to his dead body.'

Early in the 16th century the Spanish Inquisition asserted the right of condemning old books. Under the authority of guarding literature against heresy it issued various indices of its own. Interesting enough, there is a considerable difference in the Roman and the Spanish indices. Works included in the one are omitted from the other. Censorship in France was as rigid as in Spain or in Italy and as much directed against heresy. Some edicts forbade the printing of any book on religion not licensed by the Sorbourne. While the religious purpose was never lost sight of, the political purpose became more and more pronounced. The decree of 1630, regulating the book trade of Paris declared that experience has shown the King of France how prejudicial to the State is the liberty of the press." In the middle of the 17th century so alarmed was the government by the rise of newspapers that in the years 1660—65 all of them were suppressed except a few semi-official gazettes.

Not less rigid was the regulation of the press in most of the other European countries. The comparative freedom of the press in Germany was due not to the liberal intention of her princes but to their divided and weakened rule. The famous fair at Frankfort remained the Centre of Europe's book-trade and the pecuniary profits derived from it doubtless persuaded the authorities to favour liberal press laws.

Particularly interesting is the censorship of Press in England, because in that country was issued the first and the noblest defence of the freedom of the press ever written: Areogpagiticus by Milton.

nom-de-plume. One can only hope that if he lives long enough he might be able to turn out verses in some form of rythm. I have always advised him to remember the good old example of water drops causing a dent in the hard surface of a stone by mere perseverance, but whenever I thus advise him, he turns very serious and retorts that he is a poet already and that he could write better than Iqbal or Ghalib any time, only that his verses wouldn't be as vulgar

G——'s room in the Osmania Hostel has been recently named 'The Cage', and he himself is the imprisoned bird. This, incidently, throws light on his nom-de-plume.

My narrative would be incomplete without referring to my friend R——, who makes a lot of friends by virtue of his good looks, but loses them just as quickly by the unfortunate, appreciable lack of manners in him. Always *lackadaisical*, he thinks he knows English better than the professors. Whenever I have the occasion to talk to him, which is rarely—he being always surrounded by his multiple admirers—he points out the professors' mistakes, which are no mistakes at all However in his own English I can detect grammatical flaws and wrong use of words now and then but I never allude to them, lest he should talk of me to others as he talks of others to me. Before I close his account I would advise him to consult S—— before boasting because my friend, more often than not, contradicts himself in doing so. S—— has acquired so much practice in this art that it is rarely that one can say whether what he say is right or wrong. You'll hear more of this artist, S——, in the next issue.

In the end I would like the reader not to take this seriously and even if he recognizes himself in these pages, he should take *it* in the spirit in which it is written.

TAHIR S. JAN.

The Beginnings of Press Censorship

Perhaps no invention in all history except that of the alphabet has so altered the cultural environment of humanity as typography. As knowledge is power, the art that cheapened knowledge vulgarised power. And as literate opinion of the world became the supreme court of appeal, the press as the moulder of this opinion became the most powerful instrument of education and propaganda.

With eyes sharpened by fear for her threatened authority and by jealousy for her invaded privileges, the Church led the way in curbing the press. The first edict for licensing books to be printed was issued by the Archbishop of Mainz in the city of Gutenburg in 1485. A few years later Pope Alexander VI enforced the institution of papal censorship throughout Christendom: The first list of prohibited books was that promulgated by the English government in 1526, drawn up by Wolsey, and other relates to obviate the dangers of Lutherian infection.

The next person in the order of merit is my non-Asiatic friend K——. Who has not noticed him, the dad of the College? Very few know his name or anything about him, but nobody can fail to come across this *replica* of an English insurance-agent, with his *reticule* in his hand, wearing an immaculate coat of Scotch home-spun and an equally unimpeachable pair of trousers of the best worsted flannel to be had in the market before the war, because since the war broke out this gentleman has begun to consider economy as the most elegant thing in the world. Not only is his appearance like the agent, but he also has the boldness, the tact and the language which are so essential for a successful insurance man. That he has enough of all these qualities is clear from the points-of-order he raises in the K. U. meetings. Class or no class, this hero is always standing in front of the College fountain or sauntering leisurely in the cricket field, looking out for people to talk to and, consequently, keep from their classes—the philanthropy of it!

Some days back, we were astounded to see K—— come to College with a uniform on. This unexpected transformation of a thorough evadist who had successfully eluded the proctors throughout his stay of eight years in the College on C.S. (Casual Student) basis, filled us all with wonder. We learnt later that it was because of an order of the principal declaring the C.S. excuse no longer valid. K—— is a quick thinker and the next day we found him again in his old habit—this time on the D.C. (Dry-cleaning) basis. We have never after that seen him in uniform, showing that the D.C. is extending itself indefinitely. On special occasions such as a visit to the Hardinge Hostel, our insurance-agent applies to his Moustache Hongorized Pomade which, as he says, gives him the airs of a field-marshal.

I would wish K—— a very happy and prosperous College career, which unfortunately has the prospect of extending over the whole of his life. He has been in this institution for the last eight years and has managed to come up to the fourth year class. He tells me of an uncle of his who spent thirteen years here but, the University having repeatedly refused his requests for a degree, had to leave. I wish K—— could break his Uncle's record and set up a new one for the family. It is only another five years and he will equal; and still another, and he will—God willing—break and set up a new, invincible record. Our best wishes!

Writing about K——, one is perforce reminded of his companion and friend G——. Though they are inseparable friends, one is struck by the vast difference in their apparel. K—— is an immaculately dressed up figure but his friend is equally careless about his personal appearance and dress. This variation is accounted for by the fact that G—— is a poet, or, at least, considers himself to be one. He thinks himself possessed of an uncommonly strong imagination, for, is it not the height of imagination to call himself a poet? The verses that he composes are too poetical to be quoted here, but he compares very favourably with 'Chirkeen', the well-known Urdu poet. He is always disputing the existence of God and is for this reason occasionally seen in a sort of a *nympholepsy*, during the course of which he gesticulates and shakes his head in a way which reminds people of Mussolini, informing the Italian Civil Service of a twelve per cent. cut in their salary. He calls himself a born poet and has a very high sounding and a highly original

Robert was desperate. He was excited. Was Fate so cruel as to trample his life and life-long hopes and not to wipe the stigma of sin from his forehead. Why did Fate not smash society, when she saw two lives left to die sighing and sobbing only because they possessed no paper or tin.

He rushed into the street. His quick pace could be noticed amongst the people. Suddenly he stopped at the door of Enita's house. The beating of his heart increased and he then holding his breath knocked at the door. It was opened. He entered. The beautiful white garb of Enita and the flowers in her hand were enough to tell him that the time of their final separation had arrived and that he was to hope no longer to make her his own. Church waited for her and along with her a lucky young man but not Robert. Both Robert and Enita stood like statues. At last Robert looked at her. His looks were of utter disappointment and desperation that charged her with breach in love. While in reply to these looks a helpless tear trickled down her cheek —like a dew drop on a petal of rose —perhaps entreating him for forgiveness.

Once and perhaps for the last time Robert's eyes looked into Enita's and then he turned.

NASEEM.

My Friends

O, Wad some power the Gittie gee us
To see ourselves. as others see us.

Writing a commentary, as it is, on 'My friends', I cannot help starting off with my cherished friend I—, who is a believer in non-violence, not because he really believes in it, but because he is constitutionally weak, and has to resort to passive measures. Nevertheless he is one of our best cricketers. This reminds me of an incident that took place in one of our recent cricket matches. He was the fifth man to go in, but he put on his pads and gloves as soon as the first pair went in. For two hours he sat waiting in the pavilion and when, eventually, his turn did come he walked slowly up to the crease, looked about at the fielding arrangement, took the leg-stump, removed an imaginary splinter from the pitch, pulled up his trousers, adjusted his cap, set his abdominal guard, took the leg-stump a second time, swung the bat a couple of times in the air to open out his arms, and bent down in a very elaborate style to face the bowler. The bowler ran up and delivered a very short length ball. Our batsman, after all the preparation, thought it prudent to stop the ball, in which venture he failed and was clean bowled. We were depending on I— to give us some runs and were very much disappointed at his immediate exit We were, however, consoled by a remark of one of the on-lookers who shouted, "Not his fault. He was not set yet." All burst into hysterics, but I—— could not or did not catch the joke, nor did we explain. I—— is a careful *dresser* and it was some time before he came back to us and when, at last, he did come he explained that the reason for his getting out so quickly was a defect in the pitch. More of light humour!

It is inconceivable to many what lasting pangs of misery attend a broken heart and how baffling are the words 'fate' and 'hope'. How strangely fate ......the coward......presents evasive and vibrating hope in bright and attractive colours to entice man to its blazing finery! How when Man—a mere plaything of it—is lost in those colours of hope like a child dallying with a toy—there comes Fate slowly—calmly on tiptoe and stabs him in the back. Thus she—with a boisterous laughter makes an end of her game. This is her pleasure—this is her hobby!

Thus lay Robert Fate-stricken. There was a sadness over him that you could not explain, an aching of heart you could not ease, a gloom you could not ward off. Who would console this fallen man, who would take him out of the clutches of this echoing pain of his heart. Enita! Yes Enita might restore his spirits.

In his chain of thought, he could see in that darkness, the fairy-like face of Enita, the beauty incarnate, the paragon of innocence whom fate had mocked and hope had cheated. He remembered how Enita's eyes reflected gratitude for his timely help in rescuing her father who had been knocked down by a car. He had carried Enita's father to her house and rendered all possible assistance. He could picture Enita coming to him in the sad dim light of the setting sun and saying "How noble you are! I wish the whole world could share with you, your sympathy for the pain-stricken." He remembered how he had come out of her house with a beating heart, how late one day Enita met him on the way and took him to her house and how warmly she expressed her gratitude. Robert seemed to be lost in thoughts when the door opened and Mellor entered. He was wonder-struck at the sight of his master staring vacantly as if in a dream. Robert gathered himself and took the cup of tea from his hand.

It was morning. After a few moments Robert was sitting at the table dressed but weary and worried. He was absent-minded. His eyes fell on the watch which once again led him into dreamland. "How swift is the passage of time and how sadly are my hopes disappointed! How would I live when I have nothing to do. The little that I had is spent. Mellor is faithful but he has also to live. I am taking undue advantage of his faithfulness. If I cannot pay him I should advise him to go and find some other work. He has still to stay with me for two months. Oh what has happened to me! I cannot live myself and yet cherish high hopes!" In such tormenting thoughts, Robert sat there at the table.

"I wish the whole world could share with you your sympathy for the pain-stricken." These words of Enita re-echoed in his mind but could do no more than produce a sad, cynical smile over his dry lips. Could she not wring out some pity for him from her father's heart? But a sudden impulse turned the direction of his thoughts. Perhaps there was a sudden realisation. Yes, her father was in adverse circumstances and wanted Enita to marry a rich man who could remove misery of their lives. Robert could not accomplish that. His heart ached. No, he could not do that, because he was a **sinner......a great sinner......the greatest of sinners.**

before him. The future looms large over his head. He leaves behind him the grave of his pleasures and joys.

Slowly he lifts his weary head. It is darkness all around—black and terrible. The hostel lights glow. The wind shrieks. The little ripples of the stream rise and fall unseen. The faint music with its melancholy tunes still fills the air. He casts a sorrowful glance over the College. 'Adieu', 'adieu' he slowly breathes and two little warm tears trickle down his cheeks.

RAHEEM.

A Sin?

One......two......three. The clock broke the silence of the room which had possessed Robert in its awful grip. Cruel fate had treated him no better than a useless tear on the cheek of an indigent orphan. His life was yearning to meet death. The march of time appeared to be slow—too slow Soon after Nature itself went into a deep slumber But a wave of restlessness seemed to surge through the dead stillness of the room.

Suddenly a light was put on, only to be put off the next moment.

"Any service, my master?" a hoarse voice stirred the silence.

Robert's eyes more sleepless and pensive than the weary morning stars —were turned towards the door. "Is it you, Mellor," he asked.

The grave-faced, white-haired old butler, with wide open wondering eyes filled with pity and worry paused a little and replied, "I have been noticing the light of your room going on and then suddenly off for two hours. I feared something might be ailing my master. Are you not well, Sir?"

Mellor went near the bed of Robert.

"I am all right, Mellor, it is just absence of sleep."

"What keeps my young master awake? Can I do anything for you Sir? Why are you not asleep at this hour of night, Sir?

"Nothing, Mellor. You go to your place," ejaculated Robert in a pang of suppressed misery.

The poor faithful servant paced out clumsily and with the last echo of his footsteps the door closed and silence resumed its tiresome sway.

The words "Why Sir" were revolving in Robert's mind. He smiled cynically. But how could poor Mellor know that many a time in life a "why" cannot be replied by a "Because"; often a 'why' about a weeping eye in the lonely hours of a sad moonlit night under the mocking stars, cannot be definitely answered by a "Because".

Adieu

The winds moaned and sighed in the tall cypress trees. The cataract beat its wild, wild head against the stones and rolled on its way. The soft and sad tunes of a distant melody pierced through his very veins. He listened, dumb and silent. Far away in the horizon the sun was sinking. A purple hue lingered on the blue sky. A gloom pervaded the whole atmosphere. The huge tall trees, with their bare arms wide spread, stared mournfully. The trampled and faded fields, with their bronze coloured grass seemed lifeless. Slowly the shades of darkness began to close in. The solitary, lonely road became alive with moving indistinct figures returning from a walk to their hostels.

He sat heedless of all this. His eyes gazed upon these moving statues, in a blank. This was his last night in the College. Tomorrow with the rise of the sun he must bid farewell. His stay at this home of learning had come to an end. Here was an end to all those busy, carefree and jolly days. The different aspects of the life he had known, like a forgotten dream, began to light upon his mind. The huge, massive domes with the dignity of ancient monarchs lay asleep, grave and silent. How often he had climbed upon these to look around! His gay friends chattering by his side. There lay the field and there the course. Here was it that among, cheering, shouting crowd of pals he had won his laurels. These long winding corridors and their capacious rooms........a picture of the class room came back to him. How blushing, fearing he had entered it on the first day! With what respect he had gazed upon the grave, serious, professor! And then all at once his 'mischief' lit up his face. How afterwards he used to cheat and tease these reverend grey hair—these strangers who had now become affectionate friends.

In the distance glimmered the hostel lights. They appeared like so many snug little villages, quiet and hushed surrounded by mute shadows. The throbbing, pulsating life of the hostel returned to his memory and saddened him. All those plots, schemes, frets, stealths, loves and hates in which he was often mixed up stood before his eyes. 'Oh God', he thought, 'could the corpse of the past be fired with the glowing cinder of life'? Every loss that he had suffered, every grief that he had known, every ache of the heart, body or mind that had come to him, was now forgotten. He remembered nothing but the happy old days, the joys that he had known, the pleasures that he had experienced, the happy dreams and ideals that he had seen and built. There was a life before him hard, arduous and toilsome. There was a life behind him happy, carefree and full of love. The future glorious and glamorous as it had appeared to him now looked dark and dreadful. He had now to revolve round the wheel of life and pay for all the comforts that he had enjoyed and pay his debt to the last penny. Like a melting dream the past stood fading

of a young man who, after he had been jilted by his girl, immediately proceeded to burgle a shop. Some children steal not because they need the thing but because the possession of the thing gives them a sort of satisfaction. In reality they are stealing love. The teacher should therefore discriminate between these two kinds of stealing before he resorts to the severe punishment he is notorious for.

(*b*) "Delinquency is nearly always the result of failure to solve a problem in the individual's life." A boy, for example, finds himself out of work or in a group of bad companions or attracted to a girl who wants presents and a good time, and he is unable to deal properly with the situation. He does not have it in him to solve such problems in a skilful way. This lack of preparedness is often due to faulty early training and always to a mistaken conception of life. We forget in our education that social learning is as important, if not more important than, intellectual learning.

(*c*) The craving for social recognition is another cause of delinquency. This instinctive desire is so forceful with some that they are even prepared to commit crime to make people focus their attention on them. Society should, therefore, provide adequate satisfaction for this desire of theirs.

(3) *Low intelligence* predisposes children towards delinquency. Ignorance of the results of their actions gets them into trouble. Also the consciousness of their intellectual shortcomings makes them become anti-social

(4) *Difficult Jobs* in which one fails and proves a misfit make one discouraged and fill one with a sense of failure. This discontent and frustration tends to lead to anti-social behaviour.

(5) *Physical and physiological disabilities* also act as predisposing causes of delinquency.

It is clear that both home and school life are responsible for the trouble. In almost every case where the home is responsible for a pupil's delinquency it will be found that there is, to be brief, need for greater parental understanding, affection, sympathy and kindness. As regards the school, the attitude of the teacher is an important factor in a pupil's mental health. "Teachers need to learn the art of genuine praise and encouragement and how to provide for responsibility as important ways of helping pupils to gain satisfactory life adjustments. Teachers should cultivate such qualities as sympathy, patience and firmness which may lead to better understanding of pupils and their problems."

Delinquent children are a nuisance and also social problems of the future. "If the state does not spend money on them in their early youth, it will have to spend many times as much later on in trying to deal with them as adult criminals." The child guidance movement is spreading in our country and it is hoped to do a lot in this direction.

J. N. KALLA.

Note :—Quotations are from E. G. Malherbe's paper on "Delinquency as an educational problem" read in the New Education Fellowship Conference held in Australia in 1937.

fidence in parents. Let us take an example. John is a boy of 10. Both his parents as well as his teachers say that he is a liar. Every time he speaks a lie and every time it is detected he is punished by his parents. Teachers preach him sermons and yet there is no improvement in John. Now in such a case, we are required to make a retrospective inquiry into the child's past history with special reference to those situations in which lies were told, both at home and in the school. As regards his home we find that his mother always locked the pantry in which she stored sweatmeat. But John would somehow or other succeed in stealing the sweets. His mother finding the pantry unlocked and the sweetmeats missing, would rebuke and thrash John. At first John would plead ignorance but ultimately confess the truth. This state of affairs and the incidents which led to it repeated themselves periodically; each time the lie was told and each time retribution followed guilt. At school his teacher, we find, was very particular to see the home task in Arithmetic done completely. The home task being too much for John, in order to save himself from a thrashing, he would tell his teacher that he did not find time to do the work as his father was ill. In short we find, in the first instance, that John was denied his legitimate share of the good things of life with the result that the instinct of hunger asserted itself most violently on each occasion which was too strong to let the element of moral consciousness come out triumphant. In the second instance the instinct of fear played its part. In other words John's case is one in which the instincts have got a grip over the sentiments or emotions. Now it is the task of the teacher to convince John's mother (the task is easier if the mother is young), by a process of moral persuasion that the instincts and natural impulses of her son are to be sublimated and not repressed. As regards the teacher himself, he has to see that his attitude towards John is no more unsympathetic and that he is not sarcastic in dealing with the boy. He should realize the effects of his attitude on the child's mental and moral development. This is a positive suggestion for constructive treatment.

Some of the other predisposing causes of delinquency are mentioned below, and suggest their own remedy :—

"The school and the courses of study and the methods of teaching should be adapted to meet the needs of the individual child—otherwise the school is not really educating. To say that a child does not fit a school is just the same as saying that a badly dressed man does not fit the clothes."

If school life is full of censure, criticism, failure and punishment, it is impossible for it to cultivate genuine social interest in the mind of the child.

Corporal punishment is no remedy for delinquency. If resorted to at school it is nearly always a sign of failure on the part of the teacher and of the school.

(2) *Repression of instincts*—Children desire approval of their actions and security. These desires are instinctive in them. *"That is why good family life is the foundation of the proper development of personality."*

(*a*) When the sex instinct is repressed and not properly sublimated, it results in stealing during the early adolescent years. Burt quotes the instance

Delinquency and Education

"The delinquent is one who has made a mistake in emotional learning just as a pupil may make a mistake in a multiplication sum in the field of intellectual learning". Every school possesses children who show incipient abnormal or delinquent tendencies. This problem of delinquency is not a modern one. What we find to-day is that crime is becoming more and more precocious.

But why ? The increased pace at which modern civilization is changing makes it more and more difficult for young people to find themselves and to make the adaptations required of them. Young people to-day are living in a most difficult transition period. Both ethnic and individual stages are fraught with danger. Through contact with an alien civilization, our primitive sanctions of home and religion are gradually breaking down. On the other hand, as the sanctions of morality and tradition of the West have not yet been established firmly we find ourselves drifting towards instability of conduct and consequently crime. In the life of an individual the period of adolescence is the age of delinquency and criminality.

In order to discover the causes of delinquency, we must take into consideration the effects of both nature and nurture. Some people believe that criminals are born. They seem to think that there is a correlation between physical features and psychological traits. "It is on record that a Judge of the Supreme Court of New York stated, as a result of his experience, that there were eight physical characteristics which marked the criminal—receding chin, protruding jaw, wide unwinking stare, droop in the left eye-lid, low brow, bumpy brow, thick hair, and ears set at right angles to the head and that where as many as four of these characteristics were present in an individual, there could be no doubt as to his criminal nature. The strange thing, however, is that half a dozen well-known men—the president of a leading University, a great English preacher, a French general, a Russian statesman, a leading Spanish writer and one of the world's greatest inventors —have at least five of the eight physical characteristics named." The belief, therefore, is not sound and there is no criminal class as such. Every crime represents the failure of society to control the individual and also the failure of the individual to adapt himself. This leads us to examine the question of nurture

(1) *Faulty Home and School Life*—It is wrong to believe that home is the only place and the parents the only persons responsible for misbehaviour and delinquency. A faulty school atmosphere is also a cause. Cases of delinquency are found in the homes of the rich as well as of the poor. It is by no means confined to the poor (where, of course, economic factors also play some part). It is, therefore, as much the concern of the teacher as of the parents to watch the moral progress of the individual child. This can be done only if parents have confidence in teachers and teachers have con-

the view that the Cosmic Rays are the origin in the process of the creation of complex atoms in the stars and thus energy is conserved.

Age of the World.

The age of the world calculated from the disintegration period of the Radio active substances is 5,000 million years.

Radium or the Modern Philosopher's Stone

A ton of the most productive Pitchblende (ore of Uranium and Radium) yields less that 3 grains of Radium. The price of Radium is about £25,000 per gramme.

Perpetual Youth of Radium.

Every two days radium emits more energy than can be obtained from the same weight of any combustible or explosive substance in the most energetic chemical change known, and even after a quarter of a century a given specimen of radium shows no apparent sign of change or exhaustion

Temperature, Pressure and Speed of Explosions.

The time taken by the explosion of 1 gramme of nitrocellulose is about 25 thousandth part of a second, the temperature of the reaction is 2,500C and the pressure exerted per square inch surface is about 20 tons (1 ton=28 maunds).

Base Materials of Explosives Abundant.

Most of the explosives are manufactured from the constituents of air, water and coal. The destruction of human life is therefore always possible on a "Commercial Scale".

Over-Populated Soil.

A regularly manured plot contains about 4,000 millions of bacteria per gramme of the soil.

Crowded Population of Our Blood !

Man possesses on the average 5.2 million red corpuscles per cubic millimeter of his blood while a woman has 4.9 million corpuscles in the same volume of blood.

All-Mighty Steel

The tenacity (power to hold) of Nickel Chromium Steel is 110 tons per sq. inch. On the basis of this scale determine the tenacity of the four cables of steel used in the 'Golden Gate' suspension bridge of San Francisco when each cable has a diameter of 36 inches.

NOOR AHMAD.

Believe It or Not

Mass of Electron

The mass of one electron is 1.66×10^{-24} or 0.00000000000 000000000000166 gram.

All is a Vacuum!

The space occupied by the Protons and Electrons is ten millionths of the total volume of the atom. The "matter" is therefore all a vacuum except its ten-millionth part.

Matter is Concentrated Energy!

The energy liberated by the complete disintegration of one drop of water will be sufficient to drive a big steamer from Europe to America.

Size of Molecules!

The number of molecules in one drop of water is roughly equal to the number of drops in all the oceans of the world.

A Huge Hell!

The volume of the Sun is a million times the volume of the earth. The temperature of the sun is about 20,000 degrees Centrigrade.

What is our Mother Earth?

Sir James Jeans says that we can construct an imaginary model of the great nebulae system by taking about 50 tons of biscuits and spreading them so as to cover a sphere of a mile radius, and spacing them about 25 yards apart. The sphere will represent the range vision of the 100 inch telescope (the biggest Astronomical telescope of Mount Wilson Observatory). Each biscuit will stand for a great nebula of some 4,000 persecs diameter (1 persec=19,000 billion miles). A few nebulae of exceptional sizes will be represented by a flat cake 13 inches in diameter and $2\frac{1}{2}$ inches in thickness. *On this scale* our earth will be far below the limits either of vision or of imagination, for it will be little more than an electron in one of the atoms of our walnut-sized models and we shall have to multiply its dimensions many millions of times to bring it up to the size of even the smallest particles which are visible in the most *powerful microscopes.*

The Sun losing Weight!

The Sun is losing 360,000 million tons of matter every 24 hours on account of emission of radiation. This Mass Energy has been travelling in space at the rate of 186,000 miles per second since the birth of the Sun.

Is the Universe dying down?

A great English astronomer says that the Universe is losing energy and will ultimately stop like a clock which is not winded. But Dr. Milikan holds

of man, it has also perpetrated untold miseries on him through chemical warfare and the use of poison gases, inspite of a unanimous rejection of gas warfare at the Washington Congress in 1921. A healthy and harmonious outlook of life has not been aimed at by co-ordinating science and religion. The one deals with spirit as the other deals with matter. Religion has been and still is one of the most powerful influences in the world. But man has pursued the ostrich-like policy of shutting its eyes to the one and becoming a slave of the other.

It may be argued that religion breeds intoleration, a danger we want to remedy and guard against. But the possibility of this danger can be envisaged only when a particular 'form' of religion is advocated. What is actually needed is not any particular variety of religion, or even a comparative study of all religions, because that too is a risky path, but the essence of Religion. After all the basic principles of truth and morality of all doctrines are the same. Religions are different roads aiming at and reaching the ultimate reality --Allah, God, the Cosmic Force, Spirit or Law controlling this universe, or whatever name we might choose to give it. The relationship of the subscribers to various faiths is essentially that of brotherhood irrespective of caste, colour, creed, sex, name or form. A second requisite for achieving that toleration in our international politics is an Absolute Freedom of Thought; not the freedom of thought which obtains in some of the Totalitarian states of today, but one which is not intolerant even to Atheism as a personal belief if it is arrived at after the study of the science of matter and the science of Spirit. Thus can we lay a better foundation for the Reconstruction to which the world is looking forward.

An article like this can hardly have scope for a discussion of the details of the question. And hence it would suffice to pass on to the method of an approach to this objective—toleration in our international politics. That approach can be made through education. All the Universities of the world should provide for the study of religion on the proposed lines, steering meticulously clear of all controversial matter. A central or International University should coordinate the efforts, provide matter and recommend books on the subject. The League of Nations has failed miserably in its object, because it tried to tackle the symptoms, and that too ineffectively, rather than the causes. Arms have failed to obviate the use of arms. Let us hope that an appeal to Spirit can save humanity.

J. D. KHILJI.

In Memoriam

Shafi Ullah VIII Class, Collegiate School, met a tragic end in March 1943.

loss of life was : Napoleonic Wars—10,000,000 killed, American Civil War—800,000 killed and the Great War—10,000,000 killed, 20,000,000 wounded and 10,000,000 swept away by the epidemic that followed and was a consequence of the conflict.

The present war breaks all previous records. According to eminent authorities, war does not tend to disappear with the growth of civilisation, but grows in its destructiveness. War chariots have yielded place to tanks; smoke and flame thrown into the enemy lines to harrass him have been substituted by deadly poison gases; and cannon balls of stone used to batter fort walls have been succeeded by steel shells weighing tons and raining destruction on enemy positions miles away. Every major war is said to be undertaken 'to end all war'. But men like children seem to forget the horror and havoc of war as soon as it concludes.

During the period from 1469 B.C. to A.D. 1930, only 287 years were blessed with peace as against 3,112 that were cursed with war. Between 1500 B.C. and A.D. 1860 some 8,000 treaties meant 'to last for all times' were signed, but the average life of these inviolable agreements was two years. Since the thirty years war of 1618, 1700 major wars have been fought. The longest war of modern History was Hundred Years war between England and France.

Today again the gods are having their sport with the lives of men. The world is heading towards another of such catastrophes, greater than any known to man. But already there is a loud talk about the finality of this war. It is being described as a war to end all future wars. And already post-war reconstruction schemes are engaging the attention of the people. But one is often constrained to doubt the effectiveness of war as a means to end war. After the last Great War, a League of Nations was brought into existence; Disarmament Conferences and Moral Rearmament Conventions were held and a number of other vain attempts were made. But the proof of the futility and inefficacy of these remedies is furnished by the present Titanic struggle. Arms and Munitions have evidently failed to achieve the object. We have consequently to look for help elsewhere. One such method that often suggests itself is Religion. Yes, religion; not this, that or the other religion but a reorientation of the idea of God, a theistic attitude of mind in our international politics and a non-materialistic—not anti-materialistic—outlook on life. One often listens to the fanatics' point of view of the utility of one Universal religion. But that hardly seems practicable. The adoption of one religion, to the exclusion of all others, would raise a Frankenstein whom it would be hard to lay. What is needed perhaps is a theistic attitude of mind towards all problems of life. Nations and their outlook on life have become so materialistic and 'scientific' that all moral values and higher ideals have been relegated to the background. This world is looked upon as a fortuitous adjustment of matter brought into existence by an accident and marching on towards an unknown end. But the Creator of that matter is totally left out of account. Nations are guided by the ideas of national prosperity, higher standards of living, 'Superior Races' and all the concomitants of such Babble. Science has failed in her promise. Its progress has not made this world a happier place to live in. If it has harnessed the forces of nature into the service

made men unequal yet because men that think themselves equal will not enter into conditions of peace but upon equal terms such equality must be admitted.'' Here the reason for equal treatment is that men would not make peace if they are not treated as equals. But if there are a people who are not conscious of their rights as many subject races are, they according to Hobbes's system may be treated as inferiors.

Honour and the Laws of Honour

''Honourable is whatsoever possession, action or quality is an argument of power.'' He further says: ''And in all places where men have lived by small families, to rob and spoil one another has been a trade and so far from being reputed against the law of nature that the greater spoil they gained the greater was their honour and men observed no other laws therein but the laws of honour; that is to abstain from cruelty leaving to men their lives and instruments of husbandry''. Hobbes does not develop this idea of the laws of honour, which may provide a truer foundation for a moral system than self-interest. They show at least that men even in a wild state were capable of rising above considerations of self-interest.

Conscience and Virtue

Conscience according to Hobbes is the name which men 'vehemently in love with their opinions' give to those opinions. Virtue is ''somewhat that is valued for eminence and consisteth in comparison. For if all things were equally in all men, nothing would be prized.''

Value

''The value or worth of a man is as of all other things, his price; that is to say so much as would be given for the use of his power and therefore is not absolute, but a thing dependent on the need and judgment of another.'' Hobbes is not conscious of moral values which are independent of economic values. A man may be paid highly by society, but that is not his real worth. Similarly a capable man may be neglected by society. His worth will not be reduced by this neglect.

M. TIMUR.

Note.—The quotations are from Hobbes's Leviathan.

HOW TO END WAR

The world is in the throes of a deadly struggle. Civilisation is annihilating itself. The war gods are having their sport from on high and humanity is bleeding. A dreadful abyss is gaping before it and everything that men cherish as sacred and valuable—society, culture, art and heritage—is at stake. The losses of the belligerents in men, material and money are appalling. If we look at the history of war, we find that every war is deadlier, costlier and more devastating than its predecessor. The Napoleonic wars, the American Civil War and the last Great War, to name only three major struggles, cost mankind £1,250,000,000, £7,440,000,000 and £80,000,000,000 respectively. The

by Mahmud Ghaznavi to Firdausi had no evil effect upon Mahmud except that he acquired a bad name in history. To balance this evil reputation or the loss of credit with some scholars he had the satisfaction of saving a huge sum of money. In this way a clever and plucky man can often balance the evil resulting from the breach of covenant with good. From the point of view of self-interest justice is a safe rule for timid and cautious men; but is not binding on those who are clever and bold enough to run risks for riches or power.

Although Hobbes considers that covenants would not be fulfilled if there were no fear of the consequences of breaking them, he is compelled to admit in one place that some men may be just by a nobleness of temper and not by the thought of the consequences of injustice. He says: "That which gives to human actions the relish of justice is a certain nobleness or gallantness of courage (rarely found) by which a man scorns to be beholding for the contentment of his life to fraud or breach of promise." It is this nobleness of character which he overlooks in his moral system and which is its chief defect. Even if this nobleness is rarely found as he says, these rare examples of nobleness may be employed to elevate other men to their level and to fix a standard of moral height.

The nature of moral obligation according to Hobbes would be obvious from the following quotation :—"And when a man hath......abandoned or granted away his right then is he said to be obliged, or bound not to hinder those to whom such right is granted or abandoned, from the benefit of it: and that he ought and it is his duty not to make void that voluntary act of his own: and that such hindrance is injustice and injury as being sine jure; the right being before renounced or transferred." Moral obligation is thus based on a man's word and the force which binds him to fulfil his word is the fear of the consequences of breaking it, which is retaliation by the man who has suffered by the breach. As I have already remarked above where there is no reasonable fear of retaliation a man according to Hobbes's system, in spite of what he says to the contrary, has no obligation to fulfil his promises.

Gratitude

According to Hobbes, gratitude is a virtue in the receiver of a benefit because it encourages the benefactor to repeat the gift. If, however, the benefactor is dead or poor or too old to give any more gifts or to withhold them, gratitude does not serve a man's self-interest. If a man is in a position not to suffer from the reputation of ungratefulness he may be ungrateful with impunity. A man may maltreat his parents and make provisions for his old age so that he may not be in a similar plight and be maltreated by his own children. Thus gratitude too rests on a weak foundation in Hobbes's system.

Forgiveness of Sins and Equality of Treatment

He also advocates the forgiveness of sins and equality of treatment. His plea for the forgiveness of sins is that it will help to keep peace in society. It may be urged against this that if peace is not disturbed by taking revenge from a weak opponent there would be no reason against it.

For equality of treatment Hobbes's reason is as follows :—"If nature— have made men equal that equality is to be acknowledged or if nature have

manner *i.e.* 'make an equal distribution to each man what in reason belongs to him'. The laws of the commonwealth now determine what is right or wrong, good or evil as in the state of nature every man's desire determined what was good or evil. There are no common laws of right or wrong, good or evil, just or unjust before the existence of a commonwealth. Every thing is just and good in a state of nature, even killing one another to gratify one's passions. What are commonly called the moral laws are the creation of the commonwealth. As wars are the result of the state of nature in which every man's private desire is the measure of good and evil and all men agree that peace is good which is secured by the agency of the commonwealth, therefore "the way or means of peace which are justice, gratitude, modesty, equity, mercy etc. and the rest of the laws of nature" *i.e.* reason are "good, that is to say, moral virtues; and their contrary vices, evil."

The Laws of Morality

All the laws of nature or reason are summed up in the following precept : 'Do not that to another which thou wouldst not have done to thyself'. Each man for the preservation of his own life and happiness should act upon this principle and restrict his natural liberty, to do whatever he likes in exchange for similar surrender of their natural rights by other men. A man can transfer his rights or renounce them by a covenant. "The force of words being too weak to hold men to the performance of their covenants, there are in man's nature but two imaginable helps to strengthen it. And those are either a fear of the consequence of breaking their word or a glory or pride in appearing not to need to break it. This latter is a generosity too rarely found to be presumed on especially in the pursuers of wealth, command or sensual pleasure, which are the greatest part of mankind."

Justice

Justice is the performance of the covenant. Without a covenant no action can be unjust. "Therefore before the names of just and unjust can have place there must be some coercive power to compel men equally to the performance of their covenants by the terror of some punishment greater than the benefit they expect by the breach of their covenant and to make good that propriety which by mutual contract men acquire in recompense of the universal right they abandon: and such power there is none before the erection of a commonwealth".

A man may object that if the self-interest of a person is his sole reason for being just, he may be unjust without breaking any rule of morality when he can secure his interest better by injustice. Hobbes replies that it is never to the interest of any man to be unjust. In the extreme case of obtaining a kingdom by rebellion he points out that the successful rebel would be setting an example to others to gain sovereignty in the same manner. But it may be said in reply to Hobbes that a powerful and rich man can safely break his promise with a poor and weak dependant without suffering any injury from him or from others. The utmost injury that he may be conceived to have sustained would be that his dependant would consider him a false man, but as the dependant would still have to depend upon him for his living, he would not declare his opinion to anybody by word or action. The breach of promise

reputation of charity or magnanimity, to deliver the mind from the pain of compassion or to gain a reward in heaven. Pleasure accompanies every desire and is the sign of good and pain every aversion and is the sign of evil.

Love of Power

Men desire power, riches, knowledge and honour. All these may be reduced to the desire of power; for riches, knowledge and honour are several kinds of power. The object of gaining power is to procure and assure a happy life. The object of man's desire is not to enjoy once only and for one instant of time, but to assure for ever the way of his future desire. As every man regards himself superior to the other and each suspects the other of designs on his own life and happiness, self-preservation requires that he should forestall and not be forestalled and should by force and wiles secure the persons of all men he can till there is no power great enough to endanger him

Nature of Happiness

Happiness which is the supreme aim of every one's life does not consist in the repose of a satisfied mind. There is no summum bonum (greatest good) as the old moral philosophers imagined. "Felicity is a continual progress of the desire from one object to another, the attaining of the former being still but the way to the latter". There is no single desire in which the mind finds rest. It wants a variety of delightful experiences which it is not possible to foresee or bring under a general rule. Hobbes does not anywhere in the Leviathan identify the enjoyment of life with the enjoyment of sensual pleasures From his silence it appears that he attaches equal value to sensual, intellectual or spiritual pleasures.

State of War among Men

Hobbes thinks that all men are nearly equal in bodily strength and mental capacity so that no man can be absolutely secure against the power of another. Each also believes in his own superiority and would not willingly submit to be ruled by another. "Therefore if any two men desire the same thing which they cannot both enjoy they become enemies; and in the way to their end (which is principally their own conservation and sometimes their delectation only) endeavour to destroy or subdue one another." "So that in the nature of man we find three principal causes of quarrel. First, competition, secondly diffidence, thirdly glory. The first maketh men invade for gain, the second for safety and the third for reputation. The first use violence to make themselves masters of other men's persons, wives, children and cattle; the second to defend them, the third for trifles as a word, a smile, a different opinion and any other sign of undervalue either direct in their persons or by reflection in their kindred, their friends, their nation, their profession or their name."

The Institution of the Commonwealth

In this state of war there is no security for any man's life. Therefore by the use of their reason men have found out the way of organising themselves into a commonwealth the object of which is to establish peace and secure to every man his life and happiness. The sovereign makes laws which are equally binding on all subjects and which define their rights in an equitable

The people of this region too had many qualities which appealed to Wordsworth's imagination. The shepherds with their long and lonely work on the mountains in mists and storms had elements of grandeur in their everyday life which struck him forcibly. The life of farm and village among these mountains was one which bred independence and hardy originality, and Wordsworth in his poetry has drawn many of the characters he knew there in whom he found elements of poetic interest, such as Michael and the Leech gatherer. In both these characters, which are typical of many others, the solitude of the mountain country where they lived forms a setting or stage which imparts grandeur and a sense of infinity to their human lives.

Walter Raleigh has said of Wordsworth that "He brought the background of human life into true and vital relation with the smaller interests and incidents that monopolize most men's attention. He emancipated the eye from the utilitarian preferences that have been imposed on it by the necessities of the struggle for existence, whereby things in motion, things near, things whose behaviour cannot be certainly predicted, are allowed to annul all consideration of the great visions and presences which stand around, and watch and judge."

For this quality of Wordsworth's poetry, the country in which he grew up must be partly responsible. To that country, and to his sister Dorothy—of whom he wrote "she gave me eyes, she gave me ears" and from whose journals we can see that she fully shared his deep love of the Lake district—we owe much of the greatness of his poetry; since these two influences gave his poetic imagination exactly the stimulus that it needed to make it flower most fully.

DRUSILLA SCOTT.

Hobbes's Theory of Morals

All Desires are Good

There is no criterion of good and evil except a man's desire. Whatever a man desires is good; what he hates is evil. The tastes of men and the customs of nations vary; so that what one people may call good may be regarded as evil by another. The judgment of the same man too is different at different times. What he praises and calls good at one time, he condemns and calls evil at another.

Self-Preservation and Happiness

The desires of men differ according to their differences of temper, customs and doctrines; but there is one supreme aim which all these desires have and this is the preservation of a man's own life and the security of his happiness in it. No man is capable of desiring anything which is not directed towards this aim. The object of 'the voluntary acts of every man is some good to himself'. He cannot desire another man's happiness except as a means for securing his own. Even what are called free-gifts from one to another have some selfish aim to serve, such as the hope to gain friendship or service; the

Wordsworth and the Lake District

It was a wonderful chance or providence that placed Wordsworth as a child in the English Lake District. Never can there have been so close a bond between a poet and his surroundings, nor a country so perfectly suited to a mind. It became so much a part of him and his poetry that it is impossible to imagine what Wordsworth would have been had he grown up in a different place.

The two north-western counties of England, Cumberland and Westmorland, form the Lake District. It is a strangely formed region, its mountain ridges originally created, geologists say, by a pressure which forced England against the now submerged continent of Atlantis, and crumpled up this edge of the country which was afterwards worn and moulded in the course of successive submergings under the sea. The result is a whorl of deep narrow valleys, many of them cradling lakes, between craggy hills. The scenery is all on a small scale, the highest mountain being just over 3,000 ft. and the whole area only about sixty miles long and fifty miles broad. But it gives an impression of grandeur and spaciousness out of all proportion to its size, both because of the shapes of the mountains and also because of the climate. There is rain all the year round, and the soft misty air and clouds make all distances seem greater, besides making the valleys green and filling the lakes and little mountain torrents all around.

Such is the country in which Wordsworth was born and grew up, and to which he returned later to live. This therefore was how Nature appeared to him both in the hour of 'thoughtless youth' and later when in a different mood he turned back to her 'hearing often times the still sad music of humanity.'' In many of his poems, and especially of course in the Prelude, he tells what this country meant to him when he was young, and the part that it played in 'the growth of a poet's mind'. He spent much time in his school days roaming freely in it, alone or with his school-fellows, and he has told many times in his poems of the deep impressions that were then made upon his spirit. The country is a wild one, not tamed or completely civilised by man, and the qualities that it showed to him, to which his mind responded so strongly, were those of mystery and sublimity. Wordsworth's feeling for Nature was a very different one from the modern fashionable cult of beauty spots, it was a passionate absorption with all his senses of the power and grandeur around him.

'The sounding cataract haunted me like a passion', he says; and he thanks the 'wisdom and spirit of the Universe' that

> '—Thus from my first dawn
> Of childhood dids't thou intertwine for me
> The passions that build up our human soul:
> Not with the mean and vulgar works of man,
> But with high objects, with enduring things—
> With life and nature—.'

muscles. So, we entered the contest with a handicap. Rashid who was scheduled to take part in as many as seven events actually participated in two, but succeeded in equalizing the previous record in high hurdles and creating a new one in low hurdles. Ghafur secured two first places, in putting the weight and javelin throw. Raheem established a new half mile record. But the initial handicap told in the long run, and we lost the championship.

In the relay races the Edwardes sent in a definitely superior team, and although our men displayed marvellous courage and it was only a "hair-breadth" victory which the Edwardians won, our opponents deserved the success they obtained.

Rasheed, Raheem and Umar Hayat represented the College in the University matches, and did very well indeed. Rasheed who is already a University blue secured first places in low and high hurdles in the University Sports tournament. He played for the Punjab University in Inter-Varsity competitions and won first positions in 120 yards and 440 yards hurdles. Rasheed has secured a place on the College Roll of Honour, Raheem, Omar Hayat and Iqbal have been awarded College colours.

BOXING

A team was sent up for University boxing tournament and is reported to have done well. Alamgir has won College colours.

FOOTBALL

Aman Ullah Captain was once again selected to play for the University. Recently he and Akhtar were included in H.E. the Governor's Eleven which defeated a select Military team. Amanullah's name has been placed on the College Roll of Honour, and Akhtar and Ali Husain have been awarded College colours. But, frankly speaking, we cannot be satisfied with individual distinctions in a game in which we have always excelled and occasionally won University Championships. There is no dearth of promising material and we do hope that we shall have much better achievements to record next term.

CRICKET

Cricket does not appear to be as popular among our students as it should be. This is possibly due to cricket having been practically abolished from schools. Hameed the skipper is doing his best; but mere practice matches do not carry us very far. We should like to see a team being entered for the University tournament again. Inayat Ilahi has been awarded College colours.

HIKING CLUB

Its annual ten miles walking competition open both to the military and the public, attracted quite a number of entries from outside. Raheem secured the second place, and Afzal was awarded the prizes for the Best Hiker.

INTER-HOSTEL TOURNAMENTS have been played during the term and have, we hope, enabled the Sports Committee to make new "finds".

RAHEEM.

Round the Playgrounds

The long dreaded moment has at last arrived. The phantom of the examination which has been haunting our dreams (by day as well as by night) stands glaring before us. We feel the end is come. There must be nasty partings, a few tears (sincere or crocodile it matters little) and then a departure, perhaps for good. It is as if we are standing upon the edge of the world, a step farther and there will be no more of us, we shall be hurled down a bottomless abyss. So naturally we gaze fondly upon the profuse beauty scattered all around and try to imbibe as much of it as we can in our last draught.

These beautiful green fields, lawns and grounds—as we think of them, a bitter grief grips at our heart. It was here, on these areas that we spent the best of our energies, and laboured and sweated to add to the glories of the College. Here it was that with pulsating, throbbing hearts we watched our heroes win laurels or suffer defeats. With what ecstasy we used to 'shout' and 'cheer' up our warriors. But now as we look back, it comes to us as the fragments of a long-forgotten dream. Let us recall the dream and immortalize these fragments as they are. Let us once again roam with our heroes and rejoice or shed tears, as the occasion may demand

HOCKEY

We had on the whole a successful year. Innumerable practice matches were played. As many as six of our players were selected to play for the best known clubs of the province.

We entered our team in the Handyside tournament. In the very first match we closed in with one of the strongest clubs of the Frontier, the "Brothers". After a drawn game on the first day we beat them in the replay. We had to meet redoubtable opponents in the "Rovers' Club" in semi-finals. But after a drawn game with them too, we scored off a victory on the second day. In the finals we had the Khan's eleven as our adverseries. The day was wet and cloudy, and a penalty bully decided the day against us. The Captain G. M. Qazi and Raheem were selected for the University team and displayed good form throughout the session. Janab Shah, A Ghafur, Mohan and Dwarka Nath were awarded College colours.

TENNIS

Fazli Mahmood and Hamid represented the College against the Edwardians in the Col. Keen Cup match. Our opponents didn't give us much trouble. Taking the lead we won off three straight sets. Both the players were awarded College colours.

ATHLETICS

Before the Provincial Inter-College Athletics meet, our Captain Rashid and another good athlete Ghafur were practically disabled owing to sprained

The Iqbal-Day Message

"DARE and LIVE"

"Dare and Live" is Iqbal's message. Optimism, industry, faith, self-confidence and courage are the principles on which Iqbal bases his philosophy and which he believes are the essential factors for the purification of human soul and for the elevation of human character. The obstacles and setbacks in life, according to him, make the life worth living. The sacrifices and losses made and incurred in the service of a right cause and for noble principles elevate a nation and make life more glorious and worth living.

Iqbal never believed in failure. He believed in the superiority of mankind over all the rest that God created. In fact he was convinced that man is a collection of all that is best in God's universe. Only man does not know himself. Man has but to utilise his great potentialities and to use them in the right direction for the realisation of that "self" which finds itself so near to God; and Islam is the code which has prescribed easy ways and means for that realisation.

Iqbal was not only a philosopher but also a practical politician. He was one of the first to conceive of the feasibility of the division of India on national lines as the only solution of India's political problem. He was one of the most powerful though tacit precursors and heralds of the modern political evolution of Muslim India.

Iqbal, therefore, rises above the average philosopher, as the essence of his teachings is a beautiful blend of thought and action. He combines in himself the idealism of a poet and the realism of a man who took practical view of things. In Iqbal this compromise is essentially Islamic. In fact it is nothing but Islam. His ideal therefore is life according to the teachings of Islam with a motto "Dare and Live".

I wholeheartedly associate myself with the efforts of the Iqbal Day Committee in celebrating the Poet's Day on his birthday and I hope and pray that every one of us may be able to live up to the ideals Iqbal preached by his beautiful national poems and which have now embedded the doctrine of Pakistan into the heart and soul of Muslim India which is now burning very brightly, never to be extinguished.

M. A. JINNAH.

Gentlemen! Our session is going to end as it began (because it may perhaps be the last meeting). Our session started with a visit of H.H. the Nawab of Bhopal and it is ending with a visit of H.E. Sir George Cunningham, the Governor of N.W.F.P. During the session we had the honour of making these two eminent persons, our Honorary Life Members

I shall be failing in my duty if I don't mention here the services of the Patron and the College Staff to the Union. Our Patron whom we welcomed exactly two months ago has carved within so short a period, an everlasting niche in the temple of our hearts by his nobility of mind, loftiness of soul and kindness of heart. There is indeed a charm and geniality round his personality which make everyone admire him. His indefatiguable and sincere efforts have brought an enormous change in the College. He has always been my guide, my philosopher and my friend. The deep debt of gratitude that the Union and I owe to him is too great to be expressed in words.

My ministry has to offer very many thanks to the members of the Staff particularly to Sheikh Taimur Sahib, Dr. E. A. Pires, Sahibzada Mohd Idris Sahib, Qazi Inayat Ullah Sahib, Prof. A. Ansari Sahib, and Prof. Bashir-ud-Din Sahib for coaching our students and acting as judges on various prize debates.

I call myself most fortunate in having Prof. A. R. Niazi as the Treasurer of the Union. His company is an intellectual treat and for me it has always been providing comfort and solace in hours of depression and worry. His soothing words, his friendly advice and his fatherly counsels have always proved of great help to me.

I must thank Prof. Hadow Harris M.A. (Hons.), Vice-Principal, our former Patron, for his indispensible guidance and keen interest in the activities of the Union. Last but not the least, I am grateful to Dean Sahib and to Qurashi Ahmad Ali Sadiq Sahib for the valuable suggestions thehy were kind enough to give me from time to time. I should also express my indebtedness to the members of the Union for their hearty and full co-operation with the ministry.

In the end I may say a last word to the members of the Union because, as I said, it may perhaps be our last meeting for the session. Dear Friends, you are members of a backward nation. Establish solidarity, equip yourself as trained and disciplined soldiers. Cultivate a feeling of *esprit de corps* and of comradeship among you. Work loyally and honestly for the cause of your people and your country. No individual or people can achieve anything without industry, suffering and sacrifice. There are forces which may bully you, tyrannise over you and intimidate you, and you may even have to suffer. But it is by going through this crucible of the fire of persecution and by facing hardships and maintaining your true conviction and loyalty that a nation will emerge worthy of its past glory and history and will live to add lustre to the future history and glory not only of India but of the whole world. Lastly, let your actions be such as never to bring a slur on the fair name of the Alma Mater and the Union. Let the Islamia College be always proud of you!

QAZI AHMAD SAEED,
President, Khyber Union.

January. As usual it attracted a large number of competitors from all over the province, despite the difficulties of conveyance. The standard of speeches was fairly high. The trophy was won by the Islamia High School Nowshera, while the 1st individual prize went to a student of the Islamia High School Peshawar city. My thanks are due to Begum Iskandar Mirza for giving away the prizes, and to Messrs. Faridullah Khan, Khawaja Mohd. Ashraf and S. A. Bokhari for acting as judges on that function.

We sent two speakers to take part in the All-India Debates at Delhi and Aligarh Unfortunately one of the speakers fell ill at Delhi and could not proceed to Aligarh. But for his loss, our team would in all probability have brought the trophy from Aligarh. Mirza Naseem Anwar Beg won the second best prize there.

On the 31st of January, we held the A.I. Nawab Sir Abdul Qayum Memorial Trophy debate. The entries received were many but actually very few teams turned up. The trophy was won by the Lahore Govt. College team while Mr. Riaz of the F.C. College won the 1st individual prize. I have to thank in this connection the Hon. Qazi Mir Ahmad Sahib for distributing prizes and Major G. C. L. Crichton, the Hon. Malik Khuda Bakhsh Sahib and R.B. L. Dina Nath Sahib for acting as judges on that occasion. The senior prize debate, the junior prize and the First Year students prize debate were held at short intervals. A large number of students took part in these debates. Mr. Tahir, Mr Fazal-i-Raheem and Mr. Mukhtar Ahmad were adjudged the prize-winners in the three events. Of the budding speakers Mr. Mukhtar Ahmad and Mr. Shaukat Ali Shah are the most promising. Besides these prize debates, there were many ordinary meetings of the Union at which all sorts of subjects—humorous, intellectual, social and political were discussed.

The Common Room Tournament was a special feature of our programme. It went on for over a fortnight and was a source of great entertainment, recreation and amusement for the students who were in a post-examination mood at that time. Mr. Rahim the efficient Secretary and Mr. Mira Khan Afridi, the energetic Asst. Secry. were mostly responsible for the successful conduct of the tournament. The various thought provoking political debates which were arranged, stirred the students out of their mental slumber and set them thinking for themselves. A new zeal and a strong enthusiasm for politics was aroused. A good-will Mission of the Panjab Muslim Students' Federation paid us a visit in the first week of February. One of the members of the delegation Mr. Hamid Nizami gave an address on "A Muslim Student's views on the Solution of Hindu-Muslim Disunity". A few stray remarks in his speech were resented but they evidently were not based on malice. His speech brought a new awakening among the students; and as a result a "Sarhad Muslim Students' Federation" has been formed and the establishment of the Sarhad Students' Federation is being contemplated. This may be considered perhaps the greatest achievement of the session.

The Day Scholars of the College always complained of the indifference of the Union towards them but this time we have allotted one of the committee rooms for their office etc. and also lent them some indoor games from the Common Room.

Education is the foundation on which is to rise the fabric of future India, and we would like to see non-B.T. students being invited to, and taking interest in, the meetings of the Sarhad Educational Society. The "Master-Sahiban", as the members are called by other students, seem to be too deeply engrossed in their studies. We would recommend to them the desirability of shedding some of their 'isolationist' mentality and of cultivating friendly relations with other members of the Darul Ulum, so that others may also benefit from their experience and erudition.

THE DAY-SCHOLARS ASSOCIATION. The only meeting which this Society has held, according to the report of the Secretary, was the one in which Prof. Nawazish Ali Qazilbash was elected President and Rajindra Secretary. We would like to hear more about the activities of the Day Scholars.

President's Report

"It is a hard and nice subject for a man", said Cowley, "to write of himself: it grates his own heart to say anything of disparagement, and the readers' ears to hear anything of praise from him". This was even the state of my mind when I sat down this morning to write the Annual Report. However, I have tried to view the session just concluded in an objective attitude. With self-criticism I have endeavoured to look through these few months impartially to determine whether I have succeeded in fulfilling the promises that I made and whether I have justified the confidence you were kind enough to repose in me. In my inaugural address I had chiefly stressed the promotion of the art of public-speaking among the students and the creating in them of a political awareness. "Besides many other painful things prevalent here", I said, "what pains me most is the students' deplorable indifference to Indian politics. How pitiable and paradoxical to find the youth of the Pathan Land lacking in the qualities they were known for—the spirit of daring, the adventures of the soul in uncharted regions". The arousing of these qualities was another object in view of the Khyber Union. Judging by the activities of the term just ended, you will see for yourself that the Union did succeed to a large extent in achieving its objects. It has not been 'more promise and less performance'.

Gentlemen! Our session had a very happy start. It began with the long-cherished opening ceremony of the Cunningham Khyber Union Hall performed by H.H. the Nawab Sahib of Bhopal. This was followed by a wonderful oratorical address delivered by one of the best speakers of India, Dr. Syed Hadi Hassan of the Muslim University, Aligarh. Soon afterwards, a model debate in which many of the outstanding lawyers of Peshawar participated, was arranged for the benefit of the young speakers.

In order to promote the art of public-speaking among the school students of the province and to establish with them a friendly contact, we held the K.B. Saadullah Khan's Inter-School Trophy Debate in the third week of

duction of the play and we trust that with their continued assistance and encouragement and with the Examinations out of the way, the Club will be able to put up more plays before the Summer Vacation.

THE SARHAD MATHEMATICAL SOCIETY meets occasionally to listen to lectures on interesting subjects by our own professors and by distinguished visitors from outside. A large audience was attracted by Prof. Zia-ud-Din's talk on "Mathematics of Life Insurance". The speaker initiated the members into the mysteries of premium calculations. The Annual Day of the Society was held on February 27, when Prof. S. A. Hamid, Curator of Punjab University Observatory spoke on "Stars"; and explained in simple non-technical language how maps of the sky were being drawn like those of the Earth. The lecture was illustrated with slides.

THE FRONTIER SCIENTIFIC SOCIETY started its activities rather late this year, but has tried to make up for lost time by holding meetings at regular intervals. Lectures were delivered at these meetings on such important and topical subjects as "Explosives", "Television Simplified", and "Paternal Care among Animals". The Epidiascope was used to good purpose in connection with these talks. The "Photography" hobby-class is again functioning, and we are looking forward to seeing many Mela Rams being turned out of our scientific mill. The Principal is reported to be thinking of entrusting the whole of College photo-taking 'business' to the Science department.

THE SARHAD AGRICULTURAL SOCIETY. This society seems to have come out of its hibernating period. Under its auspices, Raja Zarbakht Khan, B.Sc. Agr. (Edin.), Horticulturist, Tarnab Farm, N.W.F. Province delivered a lecture on "Fruit Propagation". Being mainly based on the personal observation and research of the speaker it contained a good deal of interesting and instructive information. Another useful talk was given by Prof. Mian Mushtaq Ahmad, B.Sc., Agr. (Edin.) on "New Developments in Agriculture". The Society proposes to hold a ploughing competition shortly.

THE SARHAD EDUCATIONAL SOCIETY has had a busy term. Like its president, it has been active in its own unostentatious way. Its activities have been many and various, as a glance at the statement given below will show :—

(*a*) A paper on "Freud's Contribution to Psycho-analysis", by Jagan Nath;

(*b*) A debate on "Co-education is conducive to the national development of India";

(*c*) A debate on "Modern pedagogy is soft";

(*d*) A symposium on "The Ideal Teacher";

(*e*) A paper on "School and the Parents", by Dr. E. A. Pires;

(*f*) Symposium on "Trends in Modern Education"; and

(*g*) A paper on "Literature in Education", by Prof. Bashir-ud-Din.

the best Urdu poem went to Dwarka Nath "Raz". The Society sent two of its members to participate in the All-India Urdu debate at Aligarh, and one of these Abdur Rahman Shah succeeded in securing the third position.

THE KHYBER ATHENAEUM remained a victim to frivolity for a year or two, but seems to have turned a new leaf during the current session. Even though at times its meetings still have the air and atmosphere of picnic parties and members are provided with "midnight" tea, the papers that have of late been read under its auspices tend more and more to gravitate towards the real aim an "Athenaeum" should have in view, that of promoting learning. This is as it should be. For, was not Athena from whom the Society derives its name the goddess of wisdom and patroness of useful and elegant arts ?

The reformist movement was led by the President, Prof. M. M. Kaleem, who read a thoughtful and informative paper on "Whither Painting?" Lantern slides illustrating the points made by the speaker lent a peculiar charm to the subject and succeeded in eliciting a response from even the most prosaic minds among the audience. Mr. G. L. Chhrai, Bar-at-Law delivered a brilliant address on "Mythology of Race", in the course of which he demolished the myth of racial superiority and succeeded, we hope, in dispersing 'inferiority complex' based on that theory. Prof. S. M. Timur spoke on the "Sublime in Literature" and Mr. Bashir-ud-Din on "Educative Value of Literature". Both stressed the importance of Literature as a subject for study and as an essential requisite of culture and civilization. The old-time "social" of the Society was also reformed this time by the introduction of a prize "symposium" in which competitors had to declaim a suitable piece of their own selection dealing with one of the three subjects : "War", "Love" or "Man". S. A. Raheem was awarded the prize.

THE AMATEUR DRAMATIC CLUB has once again been separated from the Khyber Athenaeum, and seems to have gone about its business in right earnest. The first meeting held during the session elected the following office-bearers :—

Dr. E. A. Pires : *Director* and *President.*

Prof. Bashir-ud-Din : *Joint Director.*

Abdul Qayyum Niazi : *Secretary.*

With a view to discovering hidden talent, a declamation contest was held in the Rooskeppel Hall on the 18th February. The competitors were required to declaim dramatic passages of their own choice. Mirza Naseem Anwar Beg was awarded the first prize and Tahir Salim Jan the second. Fida Muhd. and A. Qayyum Niazi were bracketed for the third.

As stated elsewhere, the Club staged "The Good and the Bad", a one-Act play by Philip Johnson, on the occasion of the annual prize-distribution held on the 20th March 1943. Khalid Qasim (as Abel Gunter), Tahir Saleem Jan (as Riah Holls), and A. Qayyum Niazi (as Rod Kentish) played their respective parts extremely well. The success of the play reflected credit on the individual gifts of the actors and the careful coaching given to them by the Directors. Both Mr. and Mrs. Scott took a good deal of interest in the pro-

and H.E. Sir George Cunningham. Both the distinguished visitors were enrolled as Honorary Life Members. His Excellency, who is the Patron of the College and after whose name the Union Hall is called, gave yet another proof of his love for the Frontier Youths by presenting a wireless set to the Union.

THE MAJLIS-I-ISLAMIYYAT has continued to do substantially useful work. Maulana Abdul Majid Daryabadi's learned discourse on "Modern Versions of the Stories of the Prophets" (*Jadid Qasas-ul-Ambia*) was printed in book form and distributed among the members of the Majlis. Opportunities were afforded to young men to come into contact with well-known students of religion and to profit by their views on vital problems of life. Mr. Peer Bakhsh, Advocate of Peshawar, spoke to the College on December 13, 1942 on "Islamic Organisation" (*Nizam-i-Islami*); and Malik Khuda Bakhsh, Advocate-General N.W.F.P., delivered an address on "Decline of Nations" (*Ziwal-i-Qaum*) on the 21st January 1943. The two gentlemen described to their youthful audience the Islamic conception of life and character and explained to them the causes of the rise and fall of nations. Mr. S. M. Idris traced, in a series of Sunday lectures, the origin and growth of mysticism in Islam. The president of the Majlis, Maulana Nur-ul-Haq continued to deliver weekly sermons and hold classes in 'tafsir'.

The outstanding event of the term was the holding of a speaking competition open to all High schools of the province. "The secret of human progress, material as well as spiritual, lies in following the teachings of the Holy Quran" was the subject, and ten schools from various parts of the province sent representatives to participate in the competition. The following competitors were awarded prizes :—

1st prize, Rs. 20|- cash and a scholarship of Rs. 10|- p.m. : Zahur-ul-Haq, Islamia Collegiate School.

2nd prize, Rs. 15|- cash and a scholarship of Rs. 5|- p.m. : Mohd. Husain Shah, Islamia High School, D. I. Khan.

3rd. prize, Rs. 10|- cash : Abdul Basit, Islamia High School, Nowshera.

4th prize, Rs. 5|- cash : Muhd. Sarwar, Govt. School, Bannu.

The prizes were given away by K.B. Haji Sadullah Khan, Honorary Secretary of the College.

THE ORIENTAL SOCIETY has shown signs of greater activity since we made a rather sceptical reference to its programme in the last issue of the Khyber. A prize debate was held and Mukhtar Ahmad was awarded the first prize. The most notable achievement of the term, however, was the successful holding of the Iqbal Day under the presidency of S. Abdur Rabb Khan "Nishtar" Advocate. A number of well-known poets from the city and the cantonment also took part and recited their masterpieces. Professors Kaleem, Shafi and Timur spoke on the life and work of the great poet-philosopher of the East. In the prize competition which followed and which was open only to student competitors, Prof. Anis-ud-Din's prize for the best speech in Urdu was won by Fazl-i-Rahim, and Prof. Mohd. Sadiq's prize for

PROCTORIAL BOARD.
1942-43.

Standing :—Pran Nath. Abdul Qaiyum. Mukammal Shah. Niaz Ali. S. Zafar Ali. Kundan Lall. Mehtab Khan.

Chairs :—M. Muzzaffar Khan. Prof. Mushtaq Ahmad, (*Proctor*). Mr. I. D. Scott, (*Principal*). Prof. A. H. Qureshi, (*Proctor*). Safdar Ali Shah.

COLLEGE. You can point with pride to your Duty Society, your newly-started U.T C. Company and now your Co-operative Society as places where each of you thinks first of the community and each other and of himself only in the second place.

What of the future? We have met the challenge of the War, and I agree with your Principal that the ISLAMIA COLLEGE has no need to be ashamed of the part it has taken in meeting that challenge. Immediately after the War we shall have to meet the challenge of the peace. Post-war problems are going to be grim. Mr. Henry Kaiser, the famous American shipbuilding record-breaker, has recently said: "To put it badly, war alone has thus far accomplished full employment. Vast numbers of workers to-day dread the thought that it will come to an end". Here on the Frontier as elsewhere things are not going to be the same, on either side of the Border. Even without the generative heat of war there have been great changes since I first saw the N.W.F. in 1921—mostly I think for the better. After this war we shall have to tackle, and tackle urgently, problems of rural reconstruction, of health, of employment, extension of tillage, of education, of co-operation, of law and order. Outside the Province and India the whole world will be calling out for reconstruction, not only of buildings, roads, and bridges, but of political systems. In all this rebuilding the present students of the ISLAMIA COLLEGE will have to take a hand. What have they to bring to this task? They have their Pukhtu: courage, generosity and manliness, which are their birthright. If the ISLAMIA COLLEGE teaches its students to add to these great virtues not only knowledge but discipline, simplicity and faithfulness, and to contribute them all to the happiness of the Frontier and of the world at large, it will have taught them also the secret of happiness and upheld the ideals of its founders.

College Societies

THE KHYBER UNION has had a successful session. Its magnificent hall has after all been completed and formally opened, and all its meetings are now held there. Being primarily a debating society, its chief aim is to develop the powers of public speaking; and this it has tried to achieve in various ways. It has conducted speaking contests for junior as well as senior students, and awarded prizes to the best speakers. It has held debates on some of the most important topics of the day, and provided opportunities for students of not only profiting by the knowledge and experience of eminent thinkers but of learning the art of public speech from the actual performances of well-known speakers. Its representatives have won laurels in speaking competitions at such centres of learning as Aligarh, Delhi and Lahore. An account of its various activities is given in the President's report which we publish elsewhere in this issue.

During the term, the Union has had the honour of welcoming such eminent persons as H.H. Major Nawab Sir Md. Hamidullah Khan of Bhopal

certainly wrong, and the inexact may possibly be right. The fact is that there is no finality of knowledge short of heaven; and that the poet is more likely right than the mathematician.

These same doubts passed through the mind of an unhappy poet some hundreds of years ago, namely, OMAR-I-KHAYYAM, Neshapuri, and I would remind you that he was not only a poet, but a mathematician; indeed he is more respected in the East as a mathematician. He said :—

یک چند بکودکی به اُستاد شدیم — یک چند به اُستادی خود شاد شدیم
پایان سخن شنو که ما را چه رسید — چون آب در آمدیم و چون باد شدیم

"Myself when young did eagerly frequent
Doctor and Saint, and heard great argument
About it and about, but evermore
Came out at that same door where in I went;

With them the seed of wisdom did I sow
And with mine own hand wrought to make it grow
And this was all the harvest that I reaped
I came like water and like wind I go."

Poetry, no doubt, but very bad citizenship! Omar's whole point of view is wrong :

"Ma ra che rasid"
"all the harvest that *I* reaped".

He thinks in terms of receiving or getting instead of giving, and his gaze is directed inward instead of outward. We have heard this cry too loudly and too often in recent times : "What did we get out of it?" "What can we get?" The Italian cry of "Tunis—Corsica—Nice!" and the Japanese "China, India, Australia" and the German "The World!"—the cries which drove these misguided nations into the present war in which we hope and believe their cry will, before long, be not "what can we get out of the war" but "*how* can we get out of this mess?" How long it will be till the end depends largely on how *tough* we can be, how you and I can learn to *live hard and tighten our belts,* and how we lay to heart Shakespeare's words: "Those friends thou hast, and their adoption tried, *grapple them to thy soul* with hooks of steel." The enemy's chief hope now—although a desperate one—is to estrange us from our friends.

I often think--though the view may be heretical—that what is taught does not really matter much so long as it teaches unselfishness and the love of truth; so long as it is taught thoroughly; and so long, as your Principal has said, as it is realised that a College exists not only for the dissemination of knowledge but for its advancement, that knowledge is a living and growing thing and not a dead thing, "and with mine hand wrought to make it grow". Education is largely learning how to learn. Happiness is to be had by giving rather than by taking, by loyalty and faithfulness rather than by playing to the gallery. I am glad to see that this aspect is not overlooked in the ISLAMIA

that the Government of India have now spared, at a time when there is a heavy call on the Political Service for officers for ex cadre duties, the services of a distinguished officer of that service as Principal of the College. That is a clear recognition of the close connection between the welfare of the College and the welfare of the people of the Frontier, and I am sure that in Mr. Scott Government have chosen the right man. They have also, and I gather with the hearty approval of the College, broken the tradition whereby the Principals have always been 'confirmed bachelors', or should we say bachelor addicts? "Amurath" shall no longer "Amurath succeed". I take this opportunity of expressing the appreciation of Government and I believe also of the staff and students of the College, of the public spirit and ability with which Mr. Hadow Harris stepped into the breach and conducted the affairs of the College during the difficult transition period.

The criticism is sometimes made that Government has tended to consider the problem of education on the Frontier as quantitative only and not as qualitative—that is, they have been solely concerned with how much education to give, or how much money to spend on education, and have not given their mind to the question 'what kind of education is best suited for the Frontier'. This criticism may have been true at one time, but it no longer holds good. The qualitative aspect of the educational problem has for some time been to the fore, and is being constantly kept in view.

You have no doubt—not only students but professors—asked yourselves this question : "What is the use of all this stuff we are learning—or teaching"? The question of the best kind of instruction to give a child or young man or woman has occupied the minds of thinking men since PLATO's time and before. Everyone agrees that the question is one of enormous importance; but there agreement ends. To this day there is war to the knife in Europe between those who think that a knowledge of the dead classical languages of Greek and Latin is essential to the education of a gentleman and that persons without a knowledge of Greek and Latin are only fit for the outer darkness, and those who are convinced that it is simply a waste of time. We can easily see the usefulness of direct technical education, that is, the teaching of trades and practical professions, and the usefulness of elementary sciences such as arithmetic. It is when one goes beyond that stage to advanced abstract sciences, especially inexact sciences, that more faith is required to see their uses. It is, for instance, easy to see the application of mathematics to such works of direct practical use as bridge building, or of chemistry to agriculture, (to which your Principal has rightly directed your attention). But how is one to apply philosophy and poetry to the everyday art of living ? How are we to apply History to the problem of statecraft, for instance, to the making of the peace after this war ? How far can philosophy be taken as the last word of truth, as the final guide ? Philosophy is surely the highest form of applied science, for it deals with life itself and the art of living; but unfortunately it is also one of the most inexact. I used to think "blessed are the mathematicians, for they are never wrong"; but then came along Einstein and proved, so far as my poor brain can understand it, that the mathematicians had been wrong all along. Indeed a cynic might say the difference between the so-called exact sciences and the inexact seems to be that the exact sciences are almost

The College is in the process of acquiring an additional area of about 80 acres to the east of its present site. A part of this area is at present being used by the Civil Pioneer Force, and the remainder is being devoted to the needs of the Government Buffalo Breeding Farm and Dairy which has been established.

I cannot end this report without a reference to the impending departure from the College of Mr. Shafi, the Professor of history. Mr. Shafi has been a member of the staff for twenty nine years, and has served the institution well and faithfully during all this long period. Our best wishes go to him for long life and happiness in his retirement.

Finally, I wish to thank Mr. Acheson for so willingly consenting to come and preside over our function this afternoon. He has many calls upon his time, and we are grateful that the Islamia College has been given this priority.

I. D. SCOTT.

Islamia College, Education and Post-War Problems

(Presidential Address delivered by Mr. J. G. Acheson, C.I.E., C.S.I., Advise to H. E. the Governor, N.W.F.P., at the annual Prize distribution of the Daru'-Ulum held in the Roos Keppel Hall on the 20th March 1943).

The ISLAMIA COLLEGE was founded in 1913—the year before the outbreak of the first Great War—by two men of courage and vision: one a Pathan and one an Englishman—ABDUL QAIYUM and ROOS-KEPPEL. They believed that the key to the Frontier problem is education, and the College was the visible expression of their belief.

Since then other theories have from time to time tended to thrust aside this belief, for instance, the idea that the peace of the border is best secured by the development of communications, on the ground and also in the air. And doubts have been cast, not without some show of reason, on the suitability of the standard Indian type of education for the needs of the Frontier. Of this criticism I notice an echo in the last number of your College Magazine, the "Khyber". Be this as it may, I do not think your GOVERNOR has ever doubted, and it is my own belief, that the educational problem, whatever its answer, lies very near the heart of the Frontier problem as a whole—that is broadly stated the problem of ensuring the well-being of the people of both sides of the Border, and the ISLAMIA COLLEGE is very near the heart of the educational problem. I have had many years' close contact with SIR GEORGE CUNNINGHAM and I know how he always has in mind the welfare of the College, in which his first interest dates back to the days when he was Personal Assistant to SIR GEORGE ROOS-KEPPEL. The latest proof of that interest is

The various College Societies have done another successful year's work. The new and splendid Cunningham Khyber Union Hall was formally opened by H.H. the Nawab of Bhopal in December 1942, and the Union has continued to hold regular and occasionally unruly meetings, a sign of its vigorous hold on the student population. The Majlis-i-Islamiat are holding a speaking competition open to all schools in the province, and this society is awarding scholarships at the College as some of the prizes. The Duty Society has many calls upon it these days, but its funds have been entirely exhausted; efforts are being made to recover from past students some of the 40,000 rupees which have been distributed to them as help in the 30 years of the College's existence.

The supply of food in the hostels has as usual been an important question, which occasioned in October a strike by the students. The chief cause of this unfortunate episode was the mismanagement of the then Steward, whose services have since been dispensed with, and it was necessary also to expel two students who had taken a leading part in organizing it; but apart from this period, discipline in the College has been satisfactory. Constantly rising prices have made it necessary to increase the feeding charges for boarders in the hostels twice in the year: they were first increased from Rs. 12|- p.m. to Rs. 12|8|- p.m. and then from Rs. 12|8|- p.m. to Rs. 15|- p.m. from the 1st of this month. It is only possible to keep the expenses within this figure if the scale of rations which has hitherto been followed is somewhat curtailed. It is necessary for us to consider carefully where the line is to be drawn betwcen higher charges and a lower scale of food, remembering both the physical needs of the students and the fact that very many of them can ill afford further increases in these charges. The College has its own flour mill which ensures a supply of pure flour, obtained from a large stock of wheat which was purchased last summer; and we shall continue this bulk purchase of wheat until conditions return to normal. A supply of pure milk is now being obtained from the government dairy on the premises, at a concessional rate which is of great advantage to the College. The only other main item of food whose supply is unsatisfactory is ghee, and efforts are now being made to remedy this.

A very tragic occurrence has recently marred the peace and good comradeship which exists in this institution: two days ago a quarrel arose between two boys in the school and knife wounds were inflicted which caused the death of one of the boys. The background of Pathan culture includes unfortunately a cheap valuation of human life, and one purpose of education in this province must be to inculcate a proper sense of civilised values; the offence is therefore to be regretted not only in itself, but because it is an outrage against all that this institution stands for.

Last year the incidence of malaria was even worse than usual in the College, and we are now trying the experiment of putting all public health matters and sanitation under the control of the medical officer, and hope to prevent such a heavy incidence in future. Thanks are due to the Civil Surgeon, who is the College Medical Adviser, for the interest he is taking in this matter. The chemistry department is making experiments to discover an alternative method of preparing flit which will be used for the spraying of premises, and our scientists are assisting as usual in a number of experiments at the request of different government departments and outside bodies.

poor results in the examination, but it is an essential part of the process of weeding out the unfit and thereby eventually raising the general standard of the College.

On the whole the College has not had a successful year in games, and we lost both the Athletics Cup and the Relay Shield to our old rivals, the Edwardes College, to whom a word of congratulation is due for their athletic achievements during this year, both locally and at Lahore. The only trophy which we secured in competition with them was the Col. Keen Tennis Cup, though we also won the inter-collegiate hockey match. A number of teams were sent to compete in the University Sports at Lahore, when the College obtained the fourth place in competition with all the affiliated Colleges of the Panjab University. One of our athletes, Abdur Rahim, created a new record in the half-mile and another, Abdur Rashid, won two of the events and afterwards represented the University in the Inter-University Athletics Championship where he created a new record in the High Hurdles. We entered a Boxing team in the University trials at Lahore for the first time, and they put up a creditable performance. Amanullah, the Captain of our Football, obtained his University Blue, and two of the Hockey XI, Qazi Ghulam Mohd and Ghulam Nabi, were selected to play in the University team. Inter-hostel tournaments in Football and Athletics have been held during the year, and it is hoped that we shall be able to raise the standard of our Athletics as a result of this experience. The College stands in great need of a gymnasium, but in view of certain other building projects which must have priority, it is unlikely that we shall be able to achieve this in the near future, however desirable it may be. The Cricket XI has played practice matches against a number of clubs in Peshawar, and Abdul Hamid the Captain, was selected to play for the N.-W.F.P.

After a long period of negotiations, started by the late Sir Abdul Qaiyum, it was at last possible to establish a Company of the University Training Corps in this College during the year, and we have been given the services of a whole-time Adjutant and a Sergeant-Instructor. The number of students who have joined is 93, and they are divided into three platoons. It is intended to hold a camp for them later in the year, and from the next session it will be possible for students to take Military Science as a subject for the University examinations. An Army Class has also been started to prepare candidates for Emergency Commissions, and is directed mainly towards improving their general knowledge by listening to and discussing the daily radio news, as well as by hearing short lectures on subjects of general interest. The U.T.C. is in my opinion an important part of the College, and I hope that it will be a permanent feature of College life. This province supplies a very large number of recruits to the Indian armed forces, and probably will always continue to do so; it is therefore fitting that the Islamia College should supply a regular stream of officers for the Services. Before the war began, there were seven old students of the College who had Commissions in the army, of whom three have since won the Military Cross; since September, 1939, a further sixty-eight members of the College have obtained Commissions, of whom four are in the Indian Air Force, and the remainder in the army. This is a very creditable record, of which the College may justly be proud.

Our New Principal.

Mr. I.D. Scott, M.A., (Oxon), I.C.S.

matriculates, many of whom are only wasting their own time and their parents' money by coming to the College. Furthermore, too high a percentage of such persons acts as a general drag on other students and causes a disproportionate strain on the teaching staff. It may not be possible in a province as educationally backward as N.-W.F.P. to set the standard of admissions too high, but it is clearly undesirable that the numbers of third division matriculates should be unduly large. There was a drop in admissions last year which brought the total number on the rolls of the College from 614 to 467, a number much more suited to the capacity of the institution, both in the matter of teaching establishment, lecture rooms, and hostel accommodation. This was perhaps due in part to increased opportunities for employment on leaving school, and is to be welcomed also on other grounds. A few individual results in the examinations were excellent, notably Chela Ram Chopra who stood first in the province in the F.Sc., in which he obtained a first division, and Mool Chand Kathial who came first in the B.T examination.

The number of students who take up Agriculture is disappointingly small, due apparently to the dislike of many of them for the manual work which is a part of the course, and in spite of the inducement of a number of good scholarships. We are trying at present to increase the number of candidates offering this subject by starting agricultural classes in the 10th class of the Collegiate School. In this province, as elsewhere in India, agriculture is the main occupation of the people, and there is great need for the development of scientific cultivation.

One effect of the admission of backward students is that the general standard of English, which is not as high as it should be, is further lowered; and on this special point a scheme is being worked out to devote many more periods to the teaching of English during the first months of a student's career in the College. This is not only important in itself, since all students have to offer English in the University examination, but also because English is the medium of instruction for all subjects, and therefore a poor standard of English keeps back the progress of the students in all their other subjects. It will therefore be well worth while to concentrate on improving their English in the beginning, and I should also like to make a recommendation to the Education Department of the province that greater attention should be paid to the teaching of English in High Schools.

As a newcomer to educational work, I have been struck by the number of lectures which the students are expected to attend, a number which would have horrified me in my own student days. This may be necessary up to the F.A. examination, for which the work may be considered as an extension of School; but I am sure that more responsibility should be put on the B.A. students to work for themselves in their own time under the guidance of their teachers.

As an experimental measure this year it has been decided that no student will be detained from sitting in the University examination, but students who have done little work, and who are unlikely to pass, have been warned that if they fail badly in the University examination, they will not be allowed to return to the College. This may well have the effect of giving the College

course the rule of particular laws) there can be no real basis to society. There can, in fact, be no justice or security without the rule of law and there can be no planning in either social or economic matters without the basis of the rule of law. Law cannot ensure these things, but can only provide the framework within which they can develop. That is the importance and these are the limitations of a legal system.

The Principal's Annual Report

I have on several occasions sat in the body of this hall and listened to the Annual Report of the Principal, little thinking that it would ever be myself who should be reading it. I have always liked coming to the College, and I find now that I very much like living here. My way has been made both pleasant and easy by the friendly welcome which I have received from the staff and students, the Honorary Secretary and members of the Council of Management, as well as by letters and visits from a number of parents and old boys with whom I had already become acquainted during the seven and half years which I have spent in the Frontier Province. It will be my constant effort while I am Principal of the College to do all I can to raise its status in every possible way, bearing in mind that in academic matters it is quality and not quantity which counts.

There have been several changes in the staff during the year: Messrs. Anisuddin Ansari and Mohd. Sadiq have joined the Education department, Mr. Jalaluddin Khilji the English department, Mr. Nafisuddin Ahmad the Persian department, and Mr. Hafiz Mohd. Idris the Arabic department. The College suffered a loss by the departure of Dr. Imdad Hussain to an appointment in Bengal; and benefited from the services of Mr. Adrian-Vallance for a few months. I myself took over as Principal early this year when my predecessor returned to his substantive appointment as Chairman of the English department. The various departments in the College are now fairly adequately staffed so far as numbers and subjects go, with the exception of the Botany department where another Demonstrator is required. In the History department there is only one Professor for the whole of this important subject, which is not a desirable state of affairs, since in the case of illness or leave a suitable substitute cannot readily be found. The College exists not only for the dissemination of knowledge but for its advancement, and it is my hope that many members of the staff will contribute to this by undertaking some sort of original research, on however modest a scale. This is being done in some cases, but it is an important feature of academic life and I hope that the habit will grow.

The results of the University examinations last year were on the whole not satisfactory, and the pass percentage in a number of subjects was below the University average. One reason for this, I believe, is the fact that too many students are admitted into the College who are totally unsuited for a University education, and it is my intention to limit the admissions of third division

principle in the drawing up of India's constitution, the methods by which laws are made, changed, and enforced, must be those which are suited to India and which are not necessarily those which may suit other countries or other ages. This is a matter to which a great deal of thought and discussion will have to be devoted in the near future in this country, and I should therefore like to commend to you the necessity of devising a machinery for working this rule of law in accordance with the true nature and characteristics of the people for whom it is designed. Failure to harmonize the people and the law may lead to disastrous results: Germany provides a conspicuous example of this. In that country a naturally gifted and progressive people have allowed themselves to fall into a worship of the State as an end in itself instead of as a means to the fulfilment of the individual lives of the people. This wrong conception of the State is due in part to the fact that Germany was never included in the Roman Empire, like most of the rest of Europe, and never therefore benefited from the wonderful system of Roman Law which has left its mark down the centuries on the legal system of western Europe. There are only two approaches to the relationship between the Law and the State; Germany, like Japan, has accepted the unquestioned authority of the head of the State, be he Fuhrer or Emperor, in contrast with democratic countries where the ideal at which the State aims is that its machinery should be as responsive as possible to the needs and desires of the people.

And now a few words in regard to the maintenance of the law. Everyone in a community must agree as to the fundamentals of the law if the community is to live peacefully together. That is to say, there must be equity before the law for rich and poor, for educated and uneducated; without this no community could maintain a stable existence, but would rapidly disintegrate into civil war. In every community the best minds or the best people will always act in advance of the law: they will not simply refrain from doing those things which the law prohibits, but they will also refrain from acts which are undesirable although not illegal, and they will at the same time do things which the law does not demand. They will themselves go a little further than the bare legal requirements of the law in many directions, and thus the force of their example affects other people, so that in time the body corpus of the law itself is brought a step forward, and the remaining people who have not hitherto joined in will be compelled to fall into line with the rest of the community. Then the leaders of the community in thought and action—this by no means is the same thing as the political leaders—will again go ahead of the law and find the way to progress. There may be occasions when the best minds in a community will consider it their duty to go against the law, and this is also a part of the progress of a country's liberty. All governments from time to time tend to pass ill-considered acts, or to place too much power in the hands of the executive; and it is well that leading spirits of a community should constantly be on their guard against this tendency, and be ready to oppose it; and that they should constantly seek to make the machinery of government ever more careful of the rights of the people. That is why also the freedom of the press or the right of public criticism is a necessary condition of good government, but again unless the criticism is of a particular law and not of the fundamentals, there could be no stable community; that is to say, unless the critics agree on the desirability of the rule of law (though not of

That is what the law seeks to do, to provide the reinforced framework of society, but it will only be possible for it to do so if it has the assent of a large part of the community. The relationship of law to public opinion is a very definite one: I do not mean that laws should reflect public opinion all the time, because there are often short-lived gusts of opinion which move over a particular community or country, and which it would be undesirable to embody in the form of permanent laws; nor do I mean that the law should wait until everybody is convinced that a certain enactment should be passed, as in that case there will probably be never any progress. But at the same time it is also necessary that the law should not act, or be made, too much in advance of general public opinion, or else it will be doomed to failure. If the law-making authority is truly representative of the public for which it makes the laws, this probably would not happen, though the example of prohibition in America is a warning that even in the country which is said to be the most democratic, it was possible for a law to be passed which was objected to by so large a proportion of the people that after some years of attempted enforcement it had to be repealed. The law-makers, whether they happen to be—as in some provinces of India, the Governor, or if they are an Assembly of the people, must seek to enact laws which, though not necessarily demanded by the people, will be generally approved by them. The law can therefore act in advance but only slightly in advance of general public opinion, and the main purpose of a political constitution should be to devise such a system of law-making as will ensure that laws are made according to this principle.

I have said that the rule of law is the basis of civilisation, and have explained what the law should do and what it should not attempt, and how it should be made. The function of the State, or the machinery of government, in all this is simply to see that the laws are maintained, and that the system of law provides in the best manner possible for the inclusion of new laws and changes in old laws. The State may in a way be compared with the duties of a referee in a football match: the laws of football are devised and changed by representative associations of people who play football, and the rules which they draw up are the ones which a referee enforces. A referee in a match is therefore simply carrying out the rules which the players in the match, along with all other players, have drawn up, and that is why it is very desirable that a referee who has been selected with a reputation for fairness should never have his decisions questioned by any player, even though at the moment a particular player or team may feel aggrieved by the result. If the decision was, in fact, a wrong one then the remedy lies in a more careful selection of referees, which in turn will be a matter in which the representatives of the players are concerned; so that the fault committed by a bad referee is really the fault of the players themselves. In India there is too great a tendency to believe that the machinery of a constitution can be copied exactly from elsewhere: now while the principle of democracy, or the rule of law, is certainly of world-wide application and holds good for all time, the method by which it is worked out in particular countries must be adapted to the conditions of those particular countries—just as the system which produced the rule of law in ancient Greece was quite different from the present political structure of England, which in return is quite different from its offspring the United States of America or any other country, and so on. While therefore the rule of law must be a guiding

The Place of Law in Society

(Address delivered by Sir James Almond, Judicial Commissioner, N.W.F.P., at the College Convocation held on the 20th March 1943).

First, I should like to thank you, Mr. Principal, for the honour which you have done me in inviting me to preside over your convocation this morning. Secondly, I should like to congratulate those on whom I have conferred degrees on behalf of the Punjab University. The letters which they are now entitled to put after their names are a symbol of the learning which they take with them from this College, and which I hope will be an inspiration and a guide to them all their lives.

The subject which I have chosen for my address this morning is the place of law in society, that is to say, the importance of the rule of law in the life of a nation. I propose to say something on the question of what laws are meant for and how they should be made, the procedure by which they should be changed, and the method by which they are maintained. I propose to maintain that law is the basis of civilisation, and that the degree of advancement of a community or a country can be known by the state of its legal system, and is reflected in that system.

It happens that I am the head of the judiciary in this province, but lest you suspect me of the purely legal approach to this question, I hasten to assure you that I am interested in the rule of law not only as a judge or a lawyer, but as a citizen like any one of you. It is important then to realise what a legal system should be and what it should not be: laws cannot make men happy or make them good, nor they can really attempt to do so. There was a period in England about a hundred years ago when it was believed that parliamentary reform bills would make it possible to legislate happiness for the masses, but those who believed this were speedily disillusioned. What a system of laws can do and should do is simply to create and to maintain the conditions in which individuals can develop. There is a famous essay on liberty by John Stuart Mill in which he discusses the rights of society, or the people as a whole, to make rules and regulations for each individual member of the community; and he comes to the conclusion that society or the nation should make laws regarding those matters which are the concern of many people, but should not seek to interfere with those things which are the concern of the individual. We may, therefore, take the first requisite of a good legal system to be that it should simply seek to provide the broad framework within which individuals should be left free to develop their own lives--it creates in short the conditions of freedom and happiness for the individual, but it does not and cannot compel him to use those opportunities. The law, for example, lays down that a man should not beat his wife, but it does not enjoin that he should love his wife. The negative conditions are laid down, since any breach of these would injure not only the individual but society as a whole; the positive conclusions or developments are left for each individual to work out for himself.

College population, milk is being supplied somewhat on the 'rationing' lines. But the Government Veterinary Department is trying to increase the number of cattle in the dairy, and the College has acquired more land with a view to producing more fodder. It is expected that before long we shall have all we need by way of milk and curd.

OLD BOYS ASSOCIATION.

We are glad to learn that once again efforts are being made to bring into being an Old Boys Association worthy of the name of the Darul Ulum. We wish Mr. M. F. Rahman and his band of co-workers all success, and hope that not only will a strong central association be formed at the headquarters but branches will also be established in *all* districts. We, on our part, assure the sponsors of the scheme of our hearty co-operation and support, as we believe that an old boys association run on sound lines can be of immense advantage both to the College and the old students themselves

DUTY SOCIETY LOANS.

The Duty Society has been rendering very useful service to the cause of education by helping needy students with loans. But unfortunately a large majority of the borrowers have failed to repay the amounts which were advanced to enable them to complete their courses of study. We understand that a sum of about Rs. 45,000 is at present outstanding against old students some of whom are holding fairly high positions in society and can easily pay back the 'debts of honour' which were given to them at the time of their need. If borrowers keep their word of honour and return the loans, the Society would be in a far better position to support many more deserving candidates than it can at present when fresh collections have to be made every year. We appeal to all those who have benefited by these loans not to forget their 'pledges of honour' simply because no pressure is being brought to bear on them. Even comparatively well-to-do parents are finding it increasingly difficult in these hard times to meet the College expenses of their children. And talents being in no way the monopoly of the rich, quite a number of *promising* young men come to join the Darul Ulum every year whose guardians are too poor to bear even the mess charges of their wards. How we wish that the Society had ample funds at its disposal and met the *full* College expenses of *really deserving* students !

OUR LADY CORRESPONDENTS.

We gladly find room for contributions from two ladies living on the College premises. Mrs. Scott has discussed in the course of a thoughtful paper how far the Lake District was responsible for shaping the genius and work of Wordsworth. Mrs. A. H. Qureshi has stressed the need for the provision of facilities for a Ladies Club worthy of the great name of the Darul Ulum. We understand that the need has already been anticipated by Mrs. Scott and a Club has been established which provides its members opportunities of meeting and taking part in the 'Home-front' part of war work.

Khan Bahadur Haji Saadullah Khan, Honorary Secretary of the Darul-Ulum, paid a warm tribute of thanks to Mr. Acheson for having, in the midst of his many and important preoccupations, found time to come to the College and deliver such an inspiring address to the members of the Darul Ulum. The Khan Bahadur Sahib assured him that the Islamia College would never be found wanting in loyalty to the cause of freedom and justice.

Then followed a one-Act play "The Good and the Bad" by Philip Johnson, staged by the College Dramatic Society. A reference to the play is made under 'College Societies'.

Everything went off smoothly except for the weather, which necessitated arrangements for tea being made in the Cunningham Khyber Union Hall instead of on the Cricket lawn as originally planned.

UNIVERSITY EXTENSION LECTURE.

Dr. L. C. Jain, the Punjab University Professor of Economics, delivered a highly instructive University Extension Lecture on the afternoon of the 13th March on the subject of "War Economics".

THE TURKISH PRESS DELEGATION.

During their tour of India, the representatives of the Turkish press paid a visit to the College. They were entertained to tea at the Principal's bungalow where they were brought into contact with some members of the Staff. They were then taken round the College buildings, Union Hall, Library and hostels and met some of the students. They appeared to be keen on studying the system of education at present in vogue in this part of the world, and asked many questions about the people and their ways of life; and gathered as much information as language difficulties would let them collect.

SUMMER UNIFORM.

The black coat of the College uniform is not a suitable wear for the hot weather. Hence the standing rule requiring the wearing of uniforms has had to be relaxed during the summer in past years. The Principal has now ruled that the best way out of the difficulty is to prescribe a different uniform for the Summer term. This has been done, and students will now be required to be dressed in the summer uniforms after the spring vacation. The uniform consists in white or *khaki* sports shirts with open collars and white shalwars.

DAIRY.

The College dairy has, after rather protracted negotiations, been handed over to the Government. The old unsatisfactory system of obtaining milk supplies wholly or partly through a contractor has been brought to an end, and a supply of pure milk has been guaranteed. The number of buffaloes at present in the dairy being inadequate to meet the total requirements of the

Sports :

Amanullah Khan Gandapur : Captain of Football Eleven, colour-holder, University blue.

Kh. Abdur Rashid : Captain of Athletics, colour-holder University blue.

Special prizes for proficiency in extra-curricular sphere of studies were awarded to the following students :—

H.E. Sir George Cunningham's prize for Original research in Pushtu :	Mian Mohd. Yusaf.
K.B. Haji Sadullah Khan's prize for Original Pushtu Poem :	Mian Mohd. Yusaf.
The Hon'ble K. B. Qazi Mir Ahmad Khan's Prize for Islamic Theology :	Syed Abdur Rahman Shah.
K.B. Sardar Mughal Baz Khan's prize for Urdu Research :	Malik Mohd Saeed.
K.B. Sheikh Mahbub Ali Khan's prize for Senior English Essay :	Qazi Ahmad Saeed.
K. B. Mohd. Kuli Khan's prize for General Knowledge :	Mohd. Khalid.
K.B. Mir Alam Khan's prize for Junior English Essay :	Mohd. Khalid.
Prize for Junior English Essay :	Tahir Salim Jan.
Khyber Union Prize Debate—First Prize :	Tahir Salim Jan.
Declamation Contest First Prize :	Mirza Naseem Anwar Beg.
Khyber Union Junior Prize Debate—1st Prize :	Fazle Rahim.
Prize for best speech on Iqbal Day :	Fazle Rahim.
Khyber Union 1st Year Prize Debate 1st Prize :	Mukhtar Ahmad.
Oriental Society 1st Prize for Urdu Debate :	Mukhtar Ahmad.
Prize for Urdu Poem :	Dwarka Nath Sarhadi.

Mr. Acheson rose to deliver his presidential address amidst loud and enthusiastic cheers. He emphasized the importance of education in the solution of what is called the 'Frontier Problem', and the great role which the Islamia College is bound to play in shaping the future destiny of the province. The correct attitude of a student should be to assess what he can contribute to the general life of the institution rather than what he can take out of it. For this reason, team play, U.T.C., and Co-operative Shop are steps in the right direction because in each of these the members have to think of 'all' and not of 'self'. The world is passing through hard times, but post-war reconstruction is going to be harder still. It is upto the young students of Islamia College to get ready to tackle the problems of Peace as confidently as they have rallied to the call of human liberty. For, Islamia College has no cause to be ashamed of the contribution it has so far made in men and money to the joint efforts of democratic nations. We are printing the full address of Mr. Acheson in another place in this issue.

"improve his physique". It will also permit of his taking up Military Science as one of the alternative optional subjects for the University examinations. While the cadets will have no legal liability for military service, such of them as decide to make the army their career will evidently have better chances of selection for Commissions.

An army preparatory class has recently been started to coach students who may be thinking of applying for commissions in the Land, Air or Naval services. It meets every night (except on Fridays) and listens to news broadcast from Delhi and London Mr. Scott, and Capt. Cook discuss daily developments with the students, and occasionally Military officers and members of the College staff speak to them on matters of general interest and topics connected with the war.

College Convocation.

The annual convocation for the conferring of degrees was held in the Roos-keppel Hall on Saturday, the 20th March 1943. The Hon'ble Sir James Almond, Judicial Commissioner, N.W.F. Province admitted successful candidates to their respective degrees, and delivered a highly thought-provoking address on "The Place of Law in Society". The Principal in his concluding remarks thanked Sir James Almond for his kindly accepting the invitation to preside over the function and for his learned discourse. The Convocation Address is printed elsewhere in this issue.

Prize Distribution.

The annual prize-giving ceremony was held on Saturday, the 20th March, 1943 in the Roos-keppel Hall. Mr. J. G. Acheson, C.I.E., C.S.I., Adviser to H.E. the Governor, N.W.F. Province presided.

The proceedings opened with a recitation from the Holy Quran. The Principal, Mr. I. D. Scott presented a very interesting report (printed elsewhere) on the working of the College. S. Sultan Husain Shah, offg. Headmaster read out an account of the work done during his stewardship of the Collegiate school.

Mr. Acheson then gave away the prizes and certificates of merit for academic distinctions and 'colours' for proficiency in games and sports. The following were admitted to the roll of honour :—

Academic :

Mool Chand Kathiai · For passing the B.T. Examination in the First Division and standing first in the N.-W. F. Province.

Chela Ram Chopra: For passing the F.Sc. examination in the First Division and standing first in the N.-W. F. Province.

province was compiled by Maulana Sahib on the 'Direct Method' of teaching languages. He has retired from lecturership, and has become whole-time Librarian of the Oriental 'Maktaba'. We are glad that the College has not been deprived of the wide knowledge and deep erudition of a great scholar like Maulana Abdur Rahim. We wish him a long and happy life, and hope that now that he can devote all his time and attention to his studies, some kind of research will be taken in hand under his guidance and supervision.

Prof. Muhammad Shafi came to the Darul Ulum in 1914, full of knowledge and experience of teaching; and has been in charge of the department of history ever since. The generations of students that have come and gone during these thirty years remember him with affection and respect. His geniality of temper, courtesy and kindness have endeared him to all his colleagues and pupils. His impending departure will leave a void which it will not be easy to fill. Every College function, particularly one at which speeches are to be made or at which tea and delicious dishes are to be provided, will remind us all of Mr. Shafi. He has been patient as a teacher, forgiving as a warden, generous as an examiner, courteous as a tutor and obliging as a colleague. We wish him many years of well-earned rest and happiness.

FAREWELL PARTY.

The staff and 'non-University' students bade farewell to the outgoing students of the 6th, 4th and 2nd Year classes at a grand party on the 25th February. Mirza Naseem Anwar Beg read the farewell address on behalf of the hosts. In the course of it, he expressed regret at the impending departure of "loving friends, close acquaintances and jovial companions" and wished them all good luck and god-speed. Abdur Rahim replied on behalf of the University students and thanked the hosts for their good wishes and hearty send off. He said the outgoing members of the College will always remember the happy days they had passed at the Darul Ulum and will ever look back to the College with a sense of love and pride. After a few more speeches had been made, the Principal spoke to the guests of the evening and reminded them of what high expectations were entertained of them by their alma-mater. The honour and reputation of the College depended on how its sons acquitted themselves in life. He wished them all success and expressed a hope that they would remember the College and the duties they owed to it. In the end, he said goodbye to Prof. Shafi who was to retire during the year and wished him a long life of rest and happiness.

U. T. C.

The U. T. C. has now been firmly established, and about a hundred students are undergoing a regular course of training. The headquarters, the stores, and the rifle range are located "somewhere" round about the Khyber House. The Pathan is a born soldier, and training in U.T.C. is designed to provide him with "valuable means for training in the principles and practice of military science", to give him instruction in leadership of men and dealing with emergencies, to "strengthen his spirit of patriotism and sense of discipline" and to

"COLLEGE STAFF 1943"
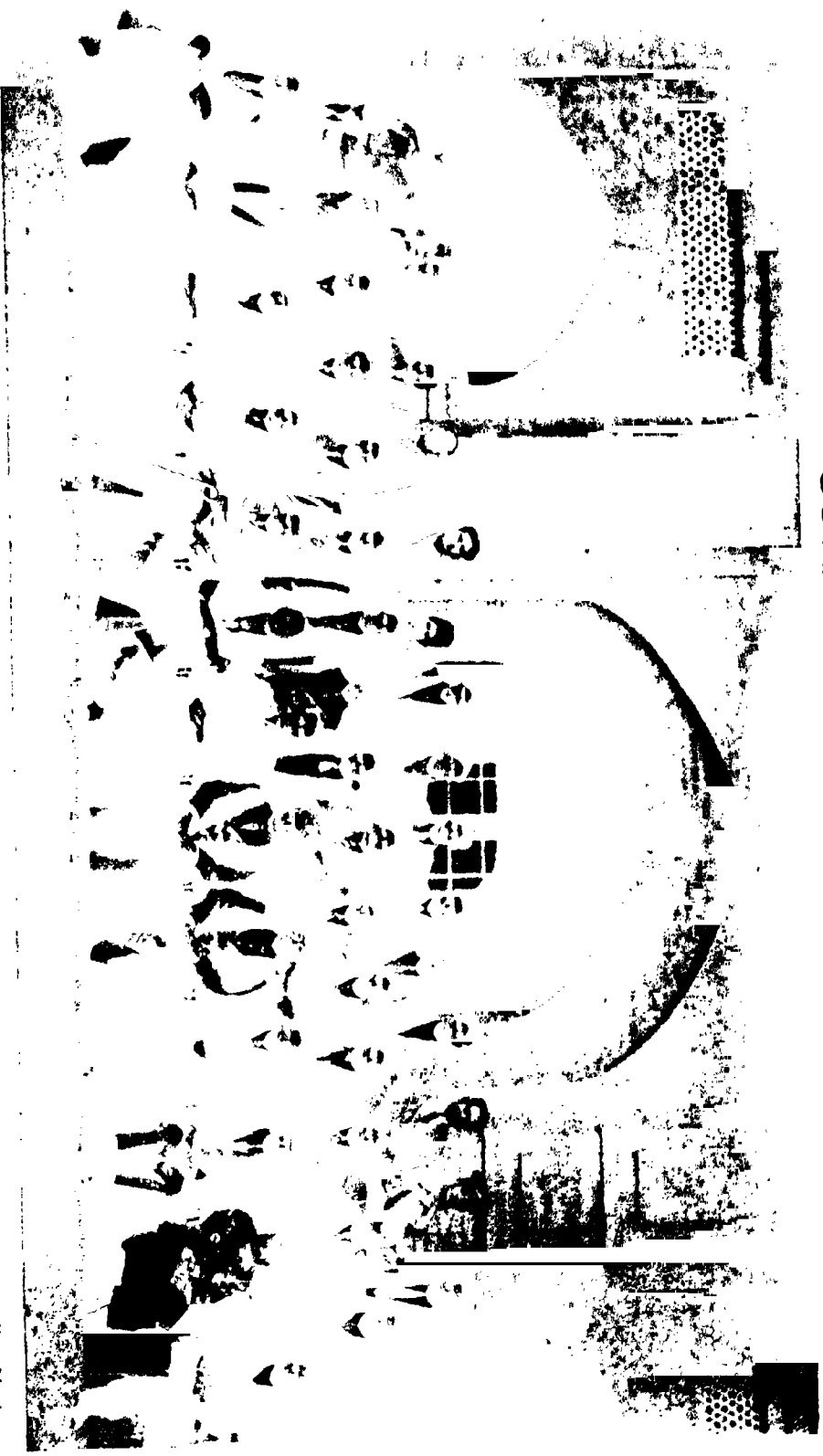
Seated: E. A. Pires ; Q. Nurul Haq ; M. Shafi ; Minhaj-ud-Din ; H. M. Osman ; H. Harris ; J. D. Scott (Principal) ; M. Timm ; A. A. Sadiq ; M. Anwar Beg , F. M. Fazil , Abdur Rahim ; S. M. Idris.

Standing, 1st Row: M. M. Kaleem , H. M. Idris ; M. Aslam ; A. Haq Qureshi ; M. Raza Khan ; Q. Inayatullah , Ghulam Sarwar ; M. Ashraf ; M. Sadiq ; S. A. Muttalib ; A. Hashim ; Nafis-ud-Din ; A. A. Ansari , Hassan Din , A. Wahid ; Nur Ahmad.

2nd Row: Howe ; J. D. Khilji ; A. A. Farooq ; Ghulam Ahmad ; A. Sattar ; Sakhaullah , Zia-ud-Din ; Sher Ahmad ; Bashir-ud-Din , Nawazish Ali ; S. M. Ahmad ; M. Tufail ; Adil Khan ; Captain Cock ; Ahsanullah Khan

who fail badly in the University Examinations will not be readmitted. A warning to that effect has already been issued. This will, it is hoped, guard against the coming in of unsuitable material from outside. Efforts will at the same time be made to keep the new entrants up to the standard. Their promotion to the II and IV Year classes will depend on their regularity in attendance and studies and on their doing well in the Annual examinations. Absence from an examination, for whatever reason, will count as failure, and no 'Supplementary' Examinations will be held. English being the medium of instruction as well as of examination for all subjects, special steps will be taken to improve the students' knowledge of that language. We hope that these measures will raise the general tone and standard of the academic side of the Darul Ulum considerably.

STAFF.

Dr. O. H. Malik, Chairman of our department of Mathematics, is still with the Government of India Mr. Adrian Vallance, who was with us for a short time during the autumn and winter terms, has also been taken away by the Government of India. Mr. A. Aziz Farooq is engaged at the Punjab University Library in conducting researches into economic problems, and collecting material for his thesis for a doctorate.

RETIREMENTS.

One of the oldest members of the College Staff has retired during the year, and another is shortly retiring.

Maulana Haji Abdur Rahim comes of an old family of the 'Ulema', and is himself a great Oriental scholar. Having been educated on the "dars-i-Nizamiya" lines by well-known Maulavis of the time (including his own father) and completed his course of studies in Arabic, Persian and Religion—tafsir, hadis and fiqah—, he passed with distinction the highest examinations held by the Punjab University in Arabic and Persian (Maulavi Fazil and Munshi Fazil). He worked on the editorial staffs o the 'Vakil' of Amritsar and the 'Zamindar' of Lahore in 1911 and 1913 respectively, and was entrusted with the duty of translating and editing select articles from Arabic journals of Egypt and Beyrout. On the establishment of the Darul Ulum in 1913, when a large library of valuable books and rare manuscripts was presented to the College, the late Nawab Sir Sahibzada Abdul Qaiyum selected Maulana Abdul Rahim as the most suitable custodian of that priceless treasure. Since then, the Maulana Sahib has been in charge of the Oriental Library; and has in addition worked as Lecturer in Arabic and Pushtu. His chief achievement is the compilation on the model o the ' Kashf-uz-Zunnun" of a detailed catalogue of Oriental Works in the Library. This has involved a critical study of thousands of books and manuscripts and is perhaps the only catalogue of its kind in India. His translations of the writings of Ibn-i-Taimiyah, Ibn-ul-Qayyim, Rashid Riza, Tantavi, Syed Ali Fikri, Imam-i-Rabbani, and Jalal-ud-Din Afghani have made the works of these eminent scholars and savants available to Indian students. He has also written the biographies of Imam-i-Rabbani and Syed Jamal-ud-Din Afghani. The set of Arabic Readers at present in use in the schools of this

'A social order which does not command the moral loyalty of its people, which is sustained not by their convictions but by their satisfactions, is inherently unstable and unreliable.'

That a society based on convictions is more durable than one based on satisfactions alone is the one great consideration which impels me to tell my countrymen that even if *Akhand Hindustan* is economically a more desirable objective than the splitting up of the country into small states, the real interest of the country lies in conceding the right of separate homeland to Muslims. And lest I am accused of chauvinism on this count, I hasten to state that my conception of a Muslim state is not identical with that of a national state. Here the tyranny of geographical boundaries and political frontiers is eliminated altogether. The doctrine of racial superiority finds no support and the glorification of one country at another's expense is simply impossible. The society which is thus evolved is largely international in character but national in administrative organisation and sentiment of unity. And it is remarkable that this society, while not neglecting material development of its members, places the greatest emphasis on convictions rather than on satisfactions.

When the Armageddon comes to an end, we must be determined to see that the old order in which the guiding principles were: "Each for himself and God for all of us", and "Patriotism and public service are fine things, but of course a man has to look out for himself" is never reviewed in its brutal, shameless individualistic selfishness euphemistically called "laissez faire". The new society must be sustained by the moral loyalty of its people, by their convictions no less than by their satisfactions.

A. A. F.

College Notes

NEW OUTLOOK.

The new year has brought us a new Principal, and the new Principal has started looking at things from a new standpoint. Being a believer in 'quality' rather than in 'quantity' of the results of one's labour, Mr. Scott would much rather have a smaller college with comparatively fewer 'really keen' students than a big institution with a larger roll of 'indifferent' pupils. Unfortunately, a perceptibly large percentage of matriculates who obtain admission into our colleges at present are unfit to derive any benefit from a course of higher study. They do not possess the requisite intellectual background, retard the pace of progress of their class-fellows for some time, and have finally to give up in despair. The enormous waste of time, energy and money involved in such hopeless experiments can only be avoided by diverting these third divisioners to avocations more in keeping with their individual capacities. The Principal has consequently decided that new admissions will be restricted to those only who are likely to benefit by college education, and that those of the present students

life. All this damage will have to be repaired. In many countries men, women and children have been brutally starved by an aggressor. They will have to be fed and clothed on a generous scale to restore their vitality. In all countries the problem of absorbing demobilised soldiers into normal civilian employment and of changing over production from war-time to peace basis will give a terrible headache to statesmen. The question of international relations, war debts and restoration of trade between countries will probably cause much bad blood at post-war peace conferences. In our own country, the administration will have to employ all its ingenuity to provide for the flood which will be let loose into our villages by the demobilisation of lakhs of men from the army. These men will have seen better days, better life and better environment than their villages can offer them. Uncared and unprovided for, they will prove a great source of embarrassment, and may even become instruments of a revolution just as the demobilised soldiers of Italy did after the last Great War when they played into the hands of Fascists.

These are vital issues, no doubt, and the sooner we started thinking earnestly about them the better. But beyond these immediate problems are certain questions of far-reaching and fundamental importance, and if the politicians in their notorious attachment to momentary issues forgot them, the world might once again be plunged into a bloody war in the not too distant future.

Speaking, in 1926, Field Marshal (then General) Smuts once said :

> 'From the ruins of the Roman Empire arose the great ideal of Christian brotherhood, binding together serf and nobleman, Jew and Gentile, Roman and barbarian, which became the basis of our European civilisation—so from the ruins of our time should arise a new spirit of human brotherhood.'

Had that "new spirit of human brotherhood" arisen after the last Great War, there would have been probably no occasion for the present war. But the tragedy is that the very people who wanted others to show a 'spirit of brotherhood' would themselves never feel the necessity of showing it in their own homes. The splendid opportunity which the British Empire afforded of welding different peoples into a real Commonwealth of Nations was never properly availed of, because of the lack of the spirit of 'brotherhood' among the various component units of the Empire. We blame Nazis and Fascists for their rank, almost inhuman, chauvinism. But do we ever realize how many amongst us are no less chauvinistic in their outlook ? This new idolatory, the creed of jingoism, has polluted the milk of human kindliness in all countries (including our own) and unless it is given up and the baneful tendency towards autarchy is severely checked, the spectre of recurrent wars must continue to stalk the earth.

The advocates of autarchy usually attract following by constantly dinning into the ears of their countrymen how the economic policies of other countries are keeping their country on the starvation level and how free trade and open competition in international markets are depriving their industries of the chance to stand on their feet. I am no advocate of empty-stomach spiritualism, nor do I minimise the importance of material requisites of well-being. Nevertheless, I very frankly recognise with Walter Lippmann that

THE KHYBER

No. 2] PESHAWAR, APRIL 1943. [Vol. XXVI

After the Armageddon

After three years of unremitting warfare nations are slowly awaking to the consciousness that war is not merely an episode and that the eggs which are being scrambled now will not be automatically unscrambled when peace is restored to a war-wearied humanity. The wounds received during this internecine strife will not heal themselves untended. The ravages of the war will not be repaired by a policy of drift. Nor will a bleeding civilisation be restored to vitality by indifference. Lest we are caught unawares when the storm has spent up its fury, the prophets of post war reconstruction are already urging the preparation of "blue prints" of the whole plan well in advance Maybe, our plans do not exactly fit into the situation which arises after the war. Maybe, we are even accused of

Lecturing on navigation while the ship is going down.

But, withal, it is undesirable to postpone the discussion of how we are going to put our house in order when the hostilities end.

The ball was set rolling at an early stage in the war, and the new catchwords which are coming into fashion, such as "New Order", "a world fit for heroes to live in", "freedom of thought, speech and religion and freedom from want", are all very alluring, indeed. But many such catchwords found currency during the last world war without ultimately bringing a jot of comfort and sunshine to the dark and dismal homes of the world's suffering millions. And the man in the street, however prone to be swayed by shibboleths, has too vivid a memory of their hollowness to be deluded by them now. This time he insists on a clean-cut definition of policy and wants to know what precisely the government of his country is going to do to usher in the promised millennium.

The first concern of all governments after signing the peace treaty would, of course, be to make good the losses inflicted by the war. In many countries warfare and bombing have resulted in untold devastation of towns and villages, factories and fields, railways and shipping and a paralysing of the normal civic

EDITORIAL BOARD.
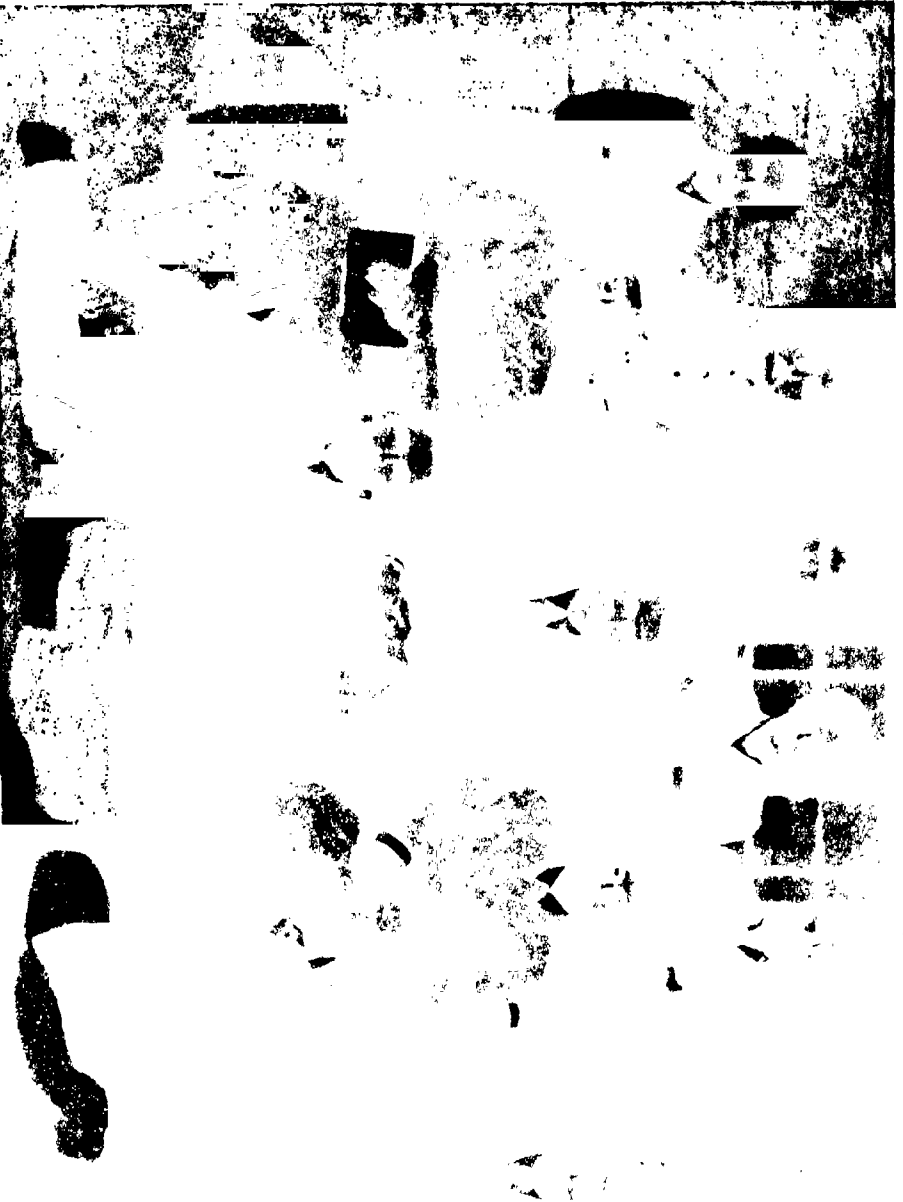
Standing :—A. R. Shigafta, (*English*). M. Yusuf Kakakhel, (*Pushtu*). M. Ashraf, (*Pushtu*). S. A. Gilani, (*Urdu*) M. Afzal, (*Urdu*). M. Saeed, (*Urdu*).

Chairs :—Prof H. M. Idris, (*Pushtu*). Mr. I. D. Scott, (*Principal*). Prof. Ahmad Ali Sadiq, (*Editor-in-Chief*). Prof. A. Aziz Faruq, (*English*).

Sitting :—A. Rah[illegible]n, (*English*) A. Rauf, (*Pushtu*) M. Aslam, (*English*).

خیبر

دارالعلوم اسلامیہ سرحد

جلد ۲۷ — جنوری ۱۹۳۳ء — نمبر ۱

حصّہ اُردو

حصّہ پشتو

عرضِ حال

نئے سال کا پہلا پرچہ آپ کے سامنے ہے۔ ہم نے اس دفعہ خصوصیت کے ساتھ کوشش کی ہے کہ "خیبر" کا
معیار صوری اور معنوی حیثیت سے بلند ہو۔ "خیبر" کے ہر شمارہ کی لکھائی، چھپائی اور کاغذ پر زر کثیر صرف ہوتا ہے۔
اگر ان مضامین، افسانوں اور نظموں میں سے جنہیں خیبر کے صفحات میں جگہ دی جاتی ہے کوئی ایک بھی ادبی معیار
پر پورا نہیں اترتا تو اس کا یہ مطلب ہے کہ جہاں یہ روپیہ، محنت، اور وقت ضائع جاتا ہے۔ وہاں ہمیں اپنے
فرض منصبی کا بھی احساس نہیں۔ ان حقائق کی بنا پر اس بار ہم نے ان مضامین اور افسانوں کی ترتیب اور انتخاب
میں ذرا زیادہ محنت اور احتیاط سے کام لیا ہے۔ ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ کہاں تک اپنے مقصد میں کامیاب
ہوئے ہیں۔ یہ فیصلہ ہم سے زیادہ آپ کر سکتے ہیں۔ البتہ ہم صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ خیبر کے
اس پرچہ کا پچھلے شماروں سے موازنہ کریں گے تو ادبی لحاظ سے اسے کمتر نہیں پائیں گے۔ ہماری حیثیت
درحقیقت ایک معمار کی سی ہے اور ہمیں جس قسم کا گارا چونا مہیا کیا جائیگا۔ اسی قسم کی عمارت کھڑی کریں گے
البتہ اس عمارت کو دیدہ زیب، پختہ اور مستحکم بنانے میں ہماری ذاتی قابلیت اور فن کو ضرور کچھ دخل ہوگا۔ ہم نے
اپنے اس فرض کی بجا آوری میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔

ہمارے پاس اس دفعہ ہماری امیدوں سے بڑھ چڑھ کر مواد پہنچا ہے۔ ایک دو مزاحیہ مضامین بھی آئے
ہیں۔ ان مضامین اور افسانوں کا معیار خاصہ اچھا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم ان تمام مضامین اور افسانوں
کو اس اشاعت کے محدود صفحات میں جگہ نہیں دے سکتے۔ باقی ماندہ مضامین کو "خیبر" کی آئندہ اشاعت میں
جو سالنامہ کی صورت میں شائع ہوگی جگہ دینے کی کوشش کریں گے۔

ہمارے پاس نظمیں اور غزلیں بہت کم آتی ہیں۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ سرے سے آتی ہی نہیں کیونکہ
ان موصول شدہ غزلوں اور نظموں میں سے کوئی ایک بھی اس قابل نہیں کہ اسے شائع کیا جائے۔ ٹھوس قسم کے
تنقیدی مضمون کم موصول ہوتے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ ادب کے ان اصناف سے کیوں بے اعتنائی برتی جاتی
ہے۔ حالانکہ ٹھوس مضامین ہی ہماری علمیت میں اضافہ کر سکتے ہیں اور ادب میں مستقل جگہ پا سکتے ہیں۔ اردو
ادب کو خصوصیت کے ساتھ تنقیدی مقالوں کی ضرورت ہے۔ اور انہی کی وجہ سے ہمارا ادب زندہ رہ سکتا ہے
اسی طرح شاعری بھی ادب کا ایک ضروری جزو ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ان اصناف کو بھی نظر انداز نہیں کیا جائیگا۔

ہمارے دارالعلوم میں بزم السنۂ مشرقیہ ہی ایک ایسا ادارہ ہے جو سالہا سال سے فارسی عربی اور
پشتو زبان کے علاوہ اردو زبان کی خدمت بھی سرانجام دیتا رہا ہے۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام اردو زبان
میں انعامی مشاعرے اور مناظرے ہوتے رہے ہیں۔ لیکن اس دفعہ معلوم نہیں کیوں اس بزم کے اراکین

نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی سرگرمی نہیں دکھائی ۔ مقام حیرت ہے کہ گویہ بزم اردو اور پشتو پڑھنے والے طلباء کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہے۔ اور اس کے مشاعرے اور مناظرے بھی انہی دو زبانوں میں ہوتے ہیں ۔ لیکن اس کے ارکان صرف وہ طلباء ہیں جو اُردو یا پشتو کے علاوہ عربی یا فارسی بھی پڑھتے ہیں۔ اس انجمن کے اراکین اپنے فرض کی طرف سے غفلت برتتے ہیں ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اس کی رکنیت میں تمام اردو اور پشتو پڑھنے والے طلباء شامل نہ ہوں۔ امید ہے کہ بزم السنۂ شرقیہ کے اراکین نہ صرف اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھائیں گے ۔ بلکہ مناظروں اور مشاعروں کا سلسلہ شروع کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی اور علمی مضامینِ نثر لکھنے کے لئے بھی انعام مقرر فرمائیں گے ۔ اس ضمن میں ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ہمارے محترم نگران پروفیسر محمد موسیٰ خان کلیم نے ارادہ ظاہر فرمایا ہے کہ نوجوان طلباء کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک انعام پیش کریں گے ۔مقابلہ افسانہ یا ڈرامہ لکھنے کا ہوگا تفصیلات کا بعد میں اعلان کیا جائیگا۔ ہم ان کی ادب نوازی کا تہ دل سے اعتراف کرتے ہیں ۔

"اُردو ادب کا تاریخی پس منظر" کے عنوان سے جو تنقیدی مقالہ شریک اشاعت ہے۔ وہ اردو ادب کے تاریخی ارتقاء پہ روشنی ڈالتا ہے۔ اور فاضل مقالہ نگار کی وسعت مطالعہ کا آئینہ بردار ہے۔ "ستارہ" ایک نفسیاتی قسم کا افسانہ ہے جس میں ہمارے نوجوان ادیب نے مردوں کی فطرت کا جائزہ لیا ہے۔ "ٹوٹا ہوا دل" کم وبیش اسی قبیل کا افسانہ ہے۔ زبان اور اسلوب بیاں کے ساتھ تخیل بھی اچھا ہے ۔ "اندھا" ایک انگریزی افسانے کا مختصر مگر کامیاب ترجمہ ہے +

ایم ۔ سعید

اردو ادب کا تاریخی پسِ منظر

ان دنوں جس معیاری رسالہ کو اٹھا کر دیکھا جائے ۔ اس میں ترقی پسند اور قدامت پسند ادب پر کوئی نہ کوئی مضمون ضرور مل جائیگا۔ قدامت پرست ۔ پرانے زمانے کی یادگاریں نئی پود کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں کہیں ترقی پسند ادب کی فحاشی اور عریانی کا سدِ باب کرنے کے لئے جلسے ہو رہے ہیں کہیں مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ تو کہیں آجکل کے نوجوانوں سے استدعا ہو رہی ہے کہ وہ جنسی جذبات کو اتنی بے باکی سے منصۂ شہود پر نہ لائیں۔ یہ آوازیں ہمارے نوجوان ادیبوں کے کانوں تک پہنچ کر ان کے دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا کر رہی ہیں۔ وہ بھی قلم اٹھاتے ہیں اور اپنی بریت ثابت کرنے کے لئے قدما پر فحاشی و عریانی کا الزام لگاتے ہیں۔ اور اس کے جواز میں ان کے دواوین سے اشعار چن چن کر پیش کرنے لگتے ہیں مگر وہ

بھول جاتے ہیں کہ برائی ہر حال میں برائی ہے۔ فحاشی و عریانی ہر حال۔ ہر رنگ۔ اور ہر زمانے میں فحاشی و عریانی ہی رہتی ہے۔ خواہ وہ قدما کی موشگافی ہو۔ یا ہمارے نوجوانوں کے افکار کا نتیجہ۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ ان دو گروہوں میں حق بجانب کون ہے۔ بلکہ مجھے تو یہ کہنا ہے کہ یہ جھگڑا ہی فضول ہے اور یہ تفریق ہی غلط ہے۔

ہمارا ادب پرانی لکیروں کو پیٹے یا نئی شاہراؤں پر گامزن ہو۔ اس کا فیصلہ نہ قدامت پسندوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور نہ نئے ادیبوں کے بس میں۔ قصور نہ پرانے ادیب کا ہے۔ اور نہ نئے ادیب کا۔ اگر ہے تو زمانے کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا۔ اور ظاہر ہے کہ اس تغیر اور انقلاب کی روک تھام ہمارے ادیبوں سے نہیں ہو سکتی۔ اور پھر یہ زمانہ آج پہلی مرتبہ تو نہیں بدل رہا۔ یہ انقلاب ایک دن میں تو ظہور پذیر نہیں ہوا۔ بلکہ ابتدائے آفرینش سے لیکر آج تک آدم کا ماحول بدلتا رہا ہے۔ اس کے معاشرتی۔ سیاسی اور سماجی حالات انقلاب پذیر رہے ہیں۔ اس کا لباس۔ طرزِ بود و باش۔ طرزِ گفتار۔ غرضیکہ اس کا تہذیب و تمدن زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے۔ آج کا انسان وہ نہیں جو آج سے ایک ہزار برس پہلے تھا۔ اور پھر تغیر کا کلیہ صرف اس کے خارجی پہلو پر ہی حاوی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی داخلیت بھی اس کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

چونکہ ادب ہمارے ماحول اور ہمارے ذہنی ہیجان و افکار کی پیداوار ہوتا ہے۔ شاعر یا ادیب زمانے کی حالت سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے ادب کو بھی پرانی ڈگر کو چھوڑ نئی ڈگر پر چلنا ہی ہوتا ہے۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ نیا ادب ماضی سے یکسر رشتہ توڑ بیٹھتا ہے۔ قدیم روایات کا اثر ضرور باقی رہتا ہے مگر کچھ دھندلا دھندلا سا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ادب زندگی کی نئی تحریکوں سے ہم آہنگ ہونا چاہتا ہے۔ کسی قوم کسی ملک کی ادبی تاریخ پر اگر عمیق نگاہ ڈالی جائے۔ تو ہمیں پتہ چلیگا۔ کہ ادب ہر دور میں بدلتا رہا ہے۔ ہر زمانے میں نئے اور پرانے ادب کے درمیان کشمکش رہی ہے۔ ترقی پسند اور قدامت پسند ہمیشہ دست و گریباں رہے ہیں۔ دور نہ جائیے۔ اردو ادب ہی کو لیجئے۔ اس کے تاریخی اوراق کو پلٹیے۔ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ ہماری قدامت پرستی کے باوجود ہمارا ادب وقت و زمانہ کے لحاظ سے آہستہ آہستہ نئے قالبوں میں ڈھلتا رہا ہے۔

اردو شاعری کی بنیاد ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاتھوں پڑی۔ اس لئے ان کی سیاست۔ ان کے ماحول۔ شاعر کے ذاتی حالات۔ اور افتادِ طبع کا اس پر گہرا اثر پڑا۔ اس وقت مسلمان حکمران تھے۔ ان کی زبان فارسی تھی۔ ان کے دل و دماغ پر فارسیت کا رنگ غالب تھا۔ چونکہ اردو شاعری نے فارسی کے سایۂ عاطفیت میں جنم لیا۔ اس لئے اس کے عروض۔ اصناف کلام۔ تلمیحات و تشبیہات سب فارسی کی مرہون احسان ہیں۔ فارسی کی بدولت امرد پرستی۔ گل و بلبل۔ شیریں فرہاد۔ کعبہ و بت خانہ۔ خنجر و مقتل۔ قفس و آشیاں۔ شراب و ساقی اور اسی قبیل کی ہزاروں رموز و تمثیلات سے اردو شاعری کا دامن بھر گیا۔ لڑکا معشوق قرار پایا۔ اور فارسی کی تقلید میں ہمارے شاعر اسی لڑکے سے فرضی عشق کی پینگیں بڑھانے لگے۔ اور اسی ترکِ جفا پیشہ کے ظلم و ستم اور جور و بیداد کے چرچے ہونے لگے۔ ماحول اور حالات کا نفس مضمون پر اتنا ہمہ گیر اور گہرا اثر پڑا کہ آج تک نئی صنعت نکالی

دوسری کے باوجود کلی طور پر زائل نہیں ہو سکا۔ مغلوں کے عہد میں ہندو مسلم ملاپ بڑھ گیا۔ فارسی اور ہندی کا امتزاج ہونے لگا۔ اور ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑنے لگی۔ شروع شروع میں فارسی کا عنصر زیادہ اور ہندی کا بہت کم تھا۔ مگر آہستہ آہستہ فارسی ہندی کا میل جول بڑھ گیا۔ اور ولی کی زبان جس سے حقیقتاً ہماری شاعری شروع ہوتی ہے۔ بہت کچھ صاف اور ہمارے روزمرہ کے قریب ہے۔ ولی کے ہم عصر ناجی۔ آبرو۔ مضمون۔ اور یکرنگ۔ ایہام گوئی۔ لفظی قلابازی اور کھوکھلی تک بندی کو اپنا کمال سمجھتے تھے۔ ان میں وہ سادگی نہیں جو ولی میں ہے۔ اس لفظی تک بندی کے خلاف میرزا مظہر آواز بلند کرتے ہیں۔ بغاوت اور تغیر ابتدا ہی سے شروع ہو جاتے ہیں جس کے زیر اثر حاتم جیسا استاد بھی اپنا آدھا دیوان کاٹ ڈالتا ہے۔ زمانہ گذرتا گیا۔ اسلوب بیان بدلتا گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے کانوں میں میر کی سریلی اور درد و سوز سے بھری ہوئی آواز پڑتی ہے۔ اور ہمارے دل تک اتر جاتی ہے۔ میر۔ ولی۔ آبرو اور حاتم کی آواز میں فرق ہے۔ ان کا لہجہ ایک جیسا نہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب بیاں ایک جیسا نہیں۔ وہاں اثر ہے اور یہاں اثر مفقود۔ پھر یہ فرق کیوں آیا۔ ظاہر ہے کہ میر کا زمانہ۔ میر کے حالات اور میر کی داخلیت ولی اور ان کے ہم عصروں سے مختلف تھی۔ اب اردو شاعری اپنے بچپن کی کئی منزلیں طے کر چکی تھی۔ اور اب اس میں جوانی کا حسن اور بانکپن آنے کو تھا۔ سودا اور درد میر کے ہم عصر تھے۔ شاعری کو نکھارنے سنوارنے میں وہ میر سے پیچھے نہیں رہے گو ان کے لہجہ میں وہ وسعت اور گہرائی نہیں۔ جو میر کے لب و لہجہ میں ہے۔ مگر پھر بھی صنفِ قصیدہ میں سودا میر سے بازی لے گئے ہیں۔ اور درد اردو تغزل میں فلسفہ و تصوف کو جگہ دے کر اپنے لئے نہ مٹنے والا نام پیدا کر گئے ہیں۔

اب دلی اجڑتی ہے۔ لکھنؤ آباد ہوتا ہے۔ میر و سودا کو بھی دلی چھوڑنا پڑتی ہے۔ مگر لکھنؤ کی ہوا انہیں راس نہیں آتی۔ ان کی آواز کو زیادہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ اب میر و سودا کا دور گزر گیا۔ پھر مصحفی۔ انشاء۔ ناسخ اور سعادت یار رنگین کا دور آتا ہے۔ حکومتِ مغلیہ کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ حکومت کو زوال آ رہا ہے۔ مرکز سے صوبے الگ ہو کر خود مختار ہو رہے ہیں۔ اجتماعیت کا جنازہ نکل رہا ہے۔ نوابوں اور رئیسوں کا زور ہے۔ غرضیکہ مسلمانوں کا قومی زوال شروع ہو چکا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم عیش و عشرت میں کھو گئی۔ انہیں اپنی زبوں حالی کا خیال نہ رہا۔ اور وہ اپنے اس سیاسی اور معاشرتی انحطاط کو طاؤس و چنگ کے نغموں میں بھول جانے کی سعی کرنے لگی۔ اس معاشرتی ماحول نے جو شاعر پیدا کئے وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے نوابوں کے در پر جا پڑے۔ میر و سودا پرانی وضع کے لوگ تھے۔ ان سے درباداری نہ ہو سکی اور اس ماحول میں ان کی شاعری پنپ نہ سکی۔ مگر مصحفی۔ انشاء۔ ناسخ اور رنگین زمانے کی رو کے ساتھ بہہ گئے۔ نوابوں کو خوش کرنے کے لئے قصیدہ خوانی شروع ہو گئی۔ زمین و آسمان کے قلابے ملائے جانے لگے۔ مبالغہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اور مدح میں انہوں نے اپنی تخلیقی قوت اور خداداد جوہر کو ضائع کیا۔ فارسی رموز و تمثیلات اب صرف نواب کے دربار اور اس کے لوازمات تک ہی محدود ہو گئیں۔ نواب معشوق ٹھیرا۔ رقیب کامیاب درباری۔ اور عاشق بیچارہ شاعر نامراد۔

غرضیکہ اس زمانے کی شاعری محض تفننِ طبع کی خاطر تھی اور اس میں اصلیت کو ذرہ دخل نہ تھا۔ اس لئے اس میں اثر نام کو بھی نہیں۔ سو متوسطین کا کہا متقدمین سے مختلف ہے۔ ناسخ و انشاء لفظی الٹ پھیر اور لفظی گورکھ دھندوں میں الجھ کر رہ گئے۔ نوابوں اور امیروں کو خوش کرنے کے لئے انہوں نے وہ کچھ کہا اور کیا۔ جو ان کے شایانِ شان نہ تھا۔ بہرحال ان کی شاعری ان کے ماحول سے لگاؤ کھاتی تھی۔ یہ تو تھا نفسِ مضمون کے متعلق۔ رہی زبان۔ سو وہ بھی اب تک بہت کچھ بن بگڑ چکی تھی۔ ناسخ کی اصلاح نے میر کے بہت سے الفاظ کو متروک قرار دیا۔ جدید محاورے تشبیہیں اور استعارات رائج ہوئے۔ جس کی وجہ سے زبان میں وہ سادگی نہ رہی۔ جو میر کی زبان میں نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ متوسطین کے زمانہ میں قافیہ کی بنا صوت پر رکھی گئی۔ انشاء کے چند قافیے ملاحظہ ہوں۔ چوں۔ غوں۔ سنحوں۔ دوں۔ فوں۔ شبِ دیجور کی گردن۔ لنگور کی گردن۔ امچور کی گردن۔ وغیرہ۔ ان قوافی میں صوت کے سوا اور کچھ بھی مناسبت نہیں۔

میں نے جان بوجھ کر ابھی تک ایک اور انقلاب کا ذکر نہیں کیا۔ جو زمانہ کے ساتھ ساتھ ہماری شاعری میں برپا ہوتا رہا۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ فارسی کی تقلید میں لڑکا ہی ہمارا معشوق ٹھہرایا گیا تھا۔ کچھ فارسی کی تقلید بھی تھی۔ اور کچھ زمانے کا اقتضا بھی۔ اس زمانے میں شاعروں کو اتنی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ کہ علانیہ عورت کو اپنا معشوق قرار دیں۔ اور کسی پردہ نشین کے ہجر و وصال کے قصے سنائیں۔ اس لئے مجبوراً انہوں نے لڑکے کے پردے میں ہی عورت سے خطاب کیا۔ میر اتنی خدا پرستی کے باوجود بھی انسان تھے۔ اور یہ عالمگیر جنسی جذبہ ان میں بھی تھا۔ اس زمانے کے لوگوں میں بھی تھا مگر کچھ دبا دبا سا۔ دبے ہوئے جذبات کبھی کبھی اظہار چاہتے ہیں۔ اور میر بھی بیماری کے بہانے عطار کے لڑکے سے دوا خریدی لیتے ہیں۔ وہ بھی ان رُکے ہوئے۔ دبے ہوئے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ گو کہ ایسے اشعار ان کے ہاں گنتی کے ہیں۔ مگر ہیں ضرور۔ اور آج انہیں پڑھ کر مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ وہ میر کے قلم سے نکلے ہوں۔ میر کے بعد مصحفی۔ انشاء۔ جرأت۔ رنگین اور ان کے مقلدین کا دور آتا ہے۔ وہ میر سے ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ اور جنس پر وہ بھی لڑکے کے پردے میں بہت کچھ۔ عریاں۔ فحش طور پر کہہ جاتے ہیں مگر ابھی بہت کچھ کھلنے کا زمانہ نہیں آیا۔ اور جرأت صرف واقعہ پردازی اور معاملہ بندی پر اکتفا کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ زمانہ گزرتا ہے۔ لکھنؤ میں لڑکے کے خلاف علمِ بغاوت بلند ہوتا ہے۔ شاعر کا دم اس مذکر معشوق سے گھٹنے لگتا ہے۔ وہ اسے مؤنث میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ مگر سماجی پابندیاں اسے ایسا نہیں کرنے دیتیں۔ وہ عورت کو اپنا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ وہ صنفِ نازک ہی سے عشق بازی کرنا چاہتا ہے۔ مگر وہ ایسا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ جھنجھلا کر اس "لڑکے" پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور اس سے خنجر و تلوار چھین لیتا ہے۔ اب اس کا مقتل میں اکڑ کر آنا اور عشاق کو بے رحمی سے قتل کرنا بڑی حد تک بند ہو جاتا ہے۔ اس کے عوض دلی پیاس بجھانے کے لئے اسے عورت کا لباس پہنایا جاتا ہے۔ خنجر و تلوار کے بجائے ناز و غمزہ و نزاکت کا ذکر ہونے لگتا ہے اور اب کنگھی چوٹی مسّی زلفوں کی درازی اور کمر کی نازکی کے چرچے ہوتے

ہیں۔ اور اس طرح سے ان شاعروں کا معشوق کچھ عجیب مخلوق بن جاتا ہے۔ بہرحال ان کی کوششیں قابل داد ہیں۔ انہوں نے منزل کی طرف قدم اٹھایا۔ اور آنے والے ان کے نقش قدم پر چل کر منزل کے قریب پہنچ گئے۔

اب زمانہ ایک اور کروٹ لیتا ہے۔ سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ اور ایک ہی جھونکے کا منتظر ہے۔ ظفر خاندان مغلیہ کا آخری برائے نام تاجدار ہے۔ انگریزوں کی گرفت مضبوط ہو چکی ہے۔ ہماری اجتماعیت کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ انفرادیت کا رنگ ہر جگہ غالب ہے۔ ہمیں اپنی زبوں حالی، غلامی اور بے چارگی کا احساس نہیں ہوا۔ بادشاہ خود شعر کہتا ہے۔ ہر جگہ شعر و شاعری کا چرچا ہے۔ پرانی لکیروں کو پیٹا جا رہا ہے۔ اتنے میں ایک نئی آواز ہمارے کانوں میں گونجتی ہے۔ غالب پرانی طرز سے بغاوت کرتا نظر آتا ہے۔ مگر اس کی قنوطیت اور تشکک اسے بہت کچھ نہیں کرنے دیتے۔ بہرحال اس کی رفعت تخیل، طبیعت کی اپج اور شان خودداری نے ہماری شاعری کو ابتذال سے نکال کر ایک بلند مقام پر پہنچا دیا۔ نئے الفاظ، محاورے، ترکیبیں، استعارے اور جدید تشبیہیں ایجاد کیں۔ اردو زبان میں فارسی کے پیوند لگا کر وسعت پیدا کی اور اسے اس قابل بنا دیا کہ اس میں مختلف النوع مضامین حسن و خوبی سے ادا ہو سکیں۔ اس نے پہلی بار غزل کی تنگ دامانی کو محسوس کیا اور فارسی رموز و تمثیلات کو وسیع معنی میں استعمال کیا۔ یعنی وہ بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کرنے لگا۔ مگر اس سب کچھ کے ہوتے ہوئے بھی غالب شاعری میں ہمہ گیر انقلاب پیدا کرنے میں ناکام رہا۔ اس لئے کہ یہ زمانے کا اقتضا نہ تھا۔ ان کے ہم عصر مومن اس اجتہاد میں ان سے کسی صورت پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے جرأت کی تقلید میں قدم اٹھایا مگر ان کی طرح کھل کر نہیں بولے پھر بھی ان کے "واسوخت اور ہا نیتے جانے میں کا نیتے جانا" اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ کہ ہمارے شاعروں کے دل و دماغ پر جنسی جذبہ کا کافی اثر رہا ہے۔ وہ خود نہیں کھلتے مگر کبھی کوئی اندرونی جذبہ انہیں کھل کر بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ذوق اس زمانے میں ملک الشعراء اور بادشاہ کے استاد تھے۔ مگر انہوں نے اردو شاعری کو کوئی نئی یا دیرپا چیز نہیں دی۔

انقلاب۔ تغیر۔ بغاوت۔ یہ فطرت کا اصول ہے۔ کمپنی کی حکومت کے خلاف ایک طوفان اٹھتا ہے حکومت مغلیہ کا مدت سے ٹمٹماتا ہوا دیا اس تیز و تند جھونکے کی تاب نہ لا کر بجھ جاتا ہے نواب و رئیس لٹ جاتے ہیں۔ درباروں کا نقشہ یکسر بدل جاتا ہے۔ امارت امیروں سے چھن کر درمیانی طبقہ کے ہاتھ آ جاتی ہے۔ اب شاعر کو دربار سے نکالا جاتا ہے۔ اسے پیٹ بھرنے کے لئے کسی رئیس کی منت پذیری اور مداح خوانی نہیں کرنی پڑتی۔ غرض کہ اب شاعر اپنی بقا کی فکر میں الجھ جاتا ہے۔ وہ اپنے ماحول پر نگاہ ڈالتا ہے۔ اسے چاروں طرف مایوسی اور ناامیدی دکھائی دیتی ہے۔ بے بسی و لاچاری اس کے پاؤں میں بیڑیاں پہناتی ہے۔ مگر وہ ان کے حلقے ایک ایک کر کے کاٹنا شروع کرتا ہے۔ وہ اپنی سیاسی بیچارگی اور معاشرتی زبوں حالی پر نگاہ ڈالتا ہے۔ اس کا دل قوم کی بے عملی پر کڑھتا ہے۔ وہ اب مغربی ادب سے

استفادہ کرتا ہے۔ مصحفی و میر کی پیروی چھوڑتا ہے۔ اور غزل کے محدود و تنگ دائرہ سے نکل کر نظم کے وسیع میدان میں قدم رکھتا ہے۔ اور آزاد اور حالی کے رُوپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ گو ابھی تک داغ و امیر اور جلال میں گزری ہوئی بہار کے نغمہ خواں موجود ہیں۔ مگر اب پانی کی دھار کسی اور ہی سمت کو بہہ رہی ہے۔ زمانے کو ان کی شاعری اور زبان و محاورہ کی صفائی کی ضرورت نہیں رہی۔ اب آزاد و حالی کا دور ہے۔ انہیں اپنی قوم کی پستی کا خیال دن رات ستاتا ہے۔ وہ اسے پستی سے نکالنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ مگر ان کی یہ کوششیں پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھی جاتیں۔ قدامت پسندوں کی نظر میں وہ ترقی پسند تھے۔ انہوں نے رسمی تکلفات اور قدیم روایات سے قدرے انحراف کیا۔ اس پر بہت لے دے ہوئی مگر انہوں نے جو کام کرنا تھا۔ لوگوں کی نکتہ چینی سے بے نیاز ہو کر کیا۔ اب یہ بھی جدید شاعری کا سنگِ بنیاد رکھ کر نئے آنے والوں کے لئے جگہ خالی کرتے ہیں۔

مغربیت کا اثر دن بدن بڑھ رہا ہے۔ سرسید کی کوششوں سے مغربی تعلیم عام ہو رہی ہے۔ مگر قوم خُذ ما صفا کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کی بجائے مغرب کی اندھی تقلید کر رہی ہے۔ اکبر الہ آبادی کو ملک و قوم کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ وہ چلا چلا کر قوم کو آنے والے خطرہ سے آگاہ کرتے ہیں۔ مگر قوم نہیں جاگتی۔ وہ اسے طعنے دیتے ہیں۔ اس پر آوازے کستے ہیں۔ اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے نیا ڈھنگ نیا طرزِ بیان اختیار کرتے ہیں۔ اور اسے خوب نبھاتے ہیں۔ اور خاموش ہو جاتے ہیں۔

آزاد، حالی۔ اسمٰعیل۔ چکبست اور اکبر کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں۔ ان کی کوششوں سے اردو شاعری کا موضوع اور اسلوبِ بیان بڑی حد تک بدل گیا۔ حسن پر عشق کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ مگر قوم کی بے حسی۔ احساس بے بسی و بے چارگی۔ خود شکنی اور ترکِ عمل بدستور رہا۔ جس کے ردِ عمل سے اقبال پیدا ہوا۔ اقبال کا زمانہ حالی و آزاد کے زمانہ سے مختلف تھا۔

مغربیت کا اثر زیادہ ہو چکا تھا۔ عوام کے ذہنوں میں بیداری کی کرنیں پہنچ چکی تھیں۔ زبانیں آزادی کا ورد کر رہی تھیں۔ اشتراکیت وجمہوریت مزدکیت اور سرمایہ داری کا چرچا عام ہو رہا تھا۔

اقبال کی حساس طبیعت اثر پذیر ہوئی۔ اور انہوں نے اپنے کلام سے اردو شاعری میں ہمہ گیر انقلاب پیدا کر دیا۔ اقبال کے ہاتھوں فرضی عشق کی دھجیاں اُڑ گئیں۔ نفسِ مضمون یکسر بدل گیا۔ خودی اور عمل کی تعلیم دے کر اقبال نے اپنی قوم کو جھنجھوڑا۔ اپنی بلندی فکر۔ وسعت نظر تخیل اور افتادِ طبع کی مدد سے اردو زبان کو نئے نئے الفاظ۔ جدید تراکیب محاورے۔ استعارے اور تشبیہوں سے روشناس کر دیا۔ مگر پھر بھی شاعری قافیہ و ردیف کی بندھنوں سے آزاد نہیں ہو سکی۔ اقبال کے دن بھی بیت گئے۔ زمانہ نے ایک اور پہلو بدلا۔ لوگوں کو اپنی سیاسی معاشرتی پستی کا خیال ہوا۔ اپنے افلاس نکبت و ناداری پر نگاہیں پڑنے لگیں۔ مزدور و سرمایہ دار کی کشمکش تیز ہو گئی۔ مغربی تعلیم عام ہوئی۔ غیر زبانوں کے تراجم اردو زبان میں ہونے لگے۔ مغربی لٹریچر کا ذہنیتوں پر گہرا اثر پڑا۔ اور نتیجے کے طور پر ہمارے نئے ادیبوں نے ایک نئے ادب کی داغ بیل ڈالی۔ اب ادب خواص کی بجا

عوام کی ملک ہوگیا۔ دہلی اور لکھنؤ کی تفریق مٹ گئی۔ درباری اور روایتی شاعری نہ رہی۔ خیال ملک کی آزادی اور مغربیت کے اثر نے رٹ کے کو ہماری نئی شاعری سے نکال باہر کیا۔ موجودہ دور کے غزل گو شعراء نے گو اپنے انداز بیان میں تنوع پیدا کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ مگر اب زمانہ غزل کا متقضی تھا۔ اس لئے جلیل حسرت۔ فانی۔ جگر۔ اپنی شاعرانہ سرمستی متغزلانہ ربودگی کے باوجود پھل پھول نہ سکے۔ بہت سے شاعروں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ مگر وہ حالات زمانہ سے مجبور ہو کر نظم کہنے لگے۔ جوش۔ سیماب مرحوم۔ احسان۔ علی اختر اختر۔ ملا اور روش یہ سب غزل چھوڑ کر مسلسل نظم لکھنے لگے۔ مگر نظم بھی زمانہ کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہ دے سکی۔ اب قافیہ و ردیف کی قید طبع آزاد پہ بھاری ہونے لگی۔ بلینک ورس کا رواج انگریزی شاعری کی تقلید میں عام ہوا۔ اب علانیہ عورت کو اپنا معشوق قرار دیا گیا۔ کیونکہ اب زمانہ میر و ولی کا نہ تھا۔ اب فرضیت کی بجائے حقیقت نگاری نے لے لی۔

ن۔م۔ راشد۔ فیض۔ مجاز۔ ندیم اور میراجی منظر عام پر آئے جنہوں نے نئی تراکیب۔ استعارے تشبیہیں۔ نیا اسلوب اور نئے مضمون اردو شاعری کو دئے۔ جذبات احساسات کا اظہار کھلے الفاظ میں ہونے لگا۔ جنسی بھوک کی تسکین لفظوں کے ذریعے حاصل کی جانے لگی۔ اور ہمارے نوجوان ادیبوں نے کچھ بھی لگی لپٹی نہیں رکھی۔ غرضیکہ اب ہر لحاظ سے ہماری شاعری پچھلے تمام اردو سے مختلف ہے۔ اور اسے ہونا بھی چاہئے۔

یہ تو سب کچھ اردو شاعری کے متعلق تھا۔ اب لگے ہاتھوں کچھ نثر کے متعلق بھی سن لیجئے۔ نثر بھی شاعری کی طرح زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی۔ میر امن دہلوی اور رجب علی بیگ سرور کی نثر کو سرسید احمد۔ حالی آزاد۔ اور شبلی نے بڑی حد تک بدل دیا۔ اور اب نثر شاعری کے دوش بدوش چلنے کے قابل ہوگئی۔ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد اردو نثر میں ایک بہت بڑا انقلاب آیا۔ تبصرے اور افسانے اردو ادب میں رواج پا گئے۔ اور افسانے نے اس تھوڑے سے عرصہ میں اتنی ترقی کی۔ کہ آج بجا طور پر ہم انہیں دوسری زبانوں کے مقابلے میں فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔

جنسی جذبہ انسان کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دبے ہوئے جذبات بعض اوقات اُبھر آتے ہیں۔ شاعری کے ذریعے اس جنسی بھوک کا اظہار تو بہت کم شاعروں نے کیا۔ اب افسانے کے ذریعہ کھلم کھلا ان جذبات کا اظہار ہونے لگا۔ ہمارے ادیب اپنے دل کی بات دوسروں کی زبان سے کہنے لگے اور عریانی و فحاشی اس حد تک بڑھ گئی کہ ذوقِ سلیم پر بار گذرنے لگی۔ ہمارا ترقی پسند ادیب جب جنس پر قلم اٹھاتا ہے۔ تو کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھتا۔ اور یہ بھول جاتا ہے۔ کہ اس کا یہ ادب جسے وہ ادب برائے زندگی کہتا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کے اخلاق بگاڑنے میں ممد ثابت ہوگا۔ بہرحال زمانہ کافی ترقی کر چکا ہے۔ اور اب وہ زندگی کی ہوبہو صحیح تصویریں چاہتا ہے۔ اور آنکھ جو کچھ دیکھے۔ ادیب جیسا کچھ بھی محسوس کرے۔ وقت

سے لب پہ لانے کا تقاضا کرتا ہے ۔ اور ہمارا ترقی پسند ادیب اس تقاضے کو بخوبی پورا کر رہا ہے ۔

ان حقائق کے باوجود اردو ادب کو ابھی بہت سی منزلیں طے کرنا ہے اور بقول میراجی اس کی منزل مقصود کا ابھی تعین نہیں ہوا۔ ترقی پسند ادیب ایک چوراہے پر کھڑا ہے ۔ اپنی منزل کا تعین کرتے کرتے اس سے غلطیاں ضرور سرزد ہوں گی۔ اس لئے ہمیں ان غلطیوں سے گھبرانا نہیں چاہئے ۔ بلکہ اس دن کا انتظار کرنا چاہئے جب ہمارا ادب صحیح راستہ اختیار کریگا ۔

رشید خواجہ

"سارہ"

اس سال مجھے اکیلے ہی کشمیر جانا پڑا سلیم نے ساتھ چلنے کا وعدہ کیا تھا مگر اُسے اچانک کوئی ضروری کام پیش آگیا۔ اس لئے وہ میرے ساتھ نہ جاسکا۔ پچھلے سال سلیم کی ہمراہی میں چھٹیاں خوب لطف سے گذری تھیں ۔ اس لئے میں حیران تھا کہ بغیر سلیم کے یہ دن کس طرح گذریں گے ۔

جھیل کے کنارے بید مجنوں کے ایک درخت تلے کھڑا میں جھیل میں تیرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے "شکاروں" کو دیکھ رہا تھا۔ خوبصورت ساڑھیوں اور خوشنما سوٹوں میں ملبوس جوڑے "شکاروں" میں بیٹھے جھیل کی سیر کا لطف اُٹھا رہے تھے۔ کچھ "مانجی" اپنے "شکارے" "کنارے" سے لگائے سواریوں کی آس میں بیٹھے تھے۔ مجھے پچھلا سال یاد آنے لگا۔ جب میں اور سلیم ہر روز یہاں آکر ننھے رمضان اور اس کی نوجوان بہن سارہ کے چھوٹے سے شکارے میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کیا کرتے تھے۔ سلیم کی عادت ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ ہر وقت کسی نہ کسی موضوع پر گفتگو کرتا ہی رہتا ہے۔ وہ اکثر ان لوگوں کا مضحکہ اُڑاتا ہے جنہیں گفتگو کے لئے کوئی موضوع نہیں ملتے۔ اُس کی باتوں میں کشش ہے۔ وہ کچھ اس طرح دلچسپ ہوتی ہیں۔ کہ اگر کوئی ذرا دیر کے لئے بھی اس کے پاس بیٹھ جائے۔ تو پھر اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ میں تو اپنی دور بین لے کر مناظر قدرت دیکھنے میں محو ہو جاتا اور سلیم سارہ اور رمضان کے ساتھ باتیں شروع کر دیتا۔ چند ہی دنوں میں مجھے محسوس ہونے لگا کہ سلیم سارہ میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگا ہے۔ اور سارہ اس کی طرف خاص التفات کرنے لگی ہے۔

سارہ بلا کی حسین تھی۔ وہ اپنے خوبصورت نازک نازک ہاتھوں سے چپّو چلاتے وقت ہمیں اپنے گاؤں کے قصے سناتی ۔ اور سلیم اپنے شہر اور کالج کی باتوں سے اس کا دل بہلاتا۔ سارہ اور ننھا رمضان سلیم کی دلچسپ باتیں بڑے غور سے سنتے۔ جب سلیم شہر کا کوئی واقعہ اپنے دلچسپ انداز میں سناتا۔ تو رمضان جوش سے چپّو اٹھا لیتا۔ اور کہتا "حضرت جب میں بڑا ہو جاؤں گا۔ تو ضرور آپ کا شہر دیکھنے آؤں گا۔ بابا کہتا ہے تین سال

بلکہ تمہیں جمال کاکا کے ہمراہ وطن سے باہر بھیجوں گا۔" اور پھر مسرت سے اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں۔

"تم بھی آؤ گی۔ سارہ؟" سلیم پوچھتا۔

"میری ایسی قسمت کہاں۔ بابوجی" سارہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہتی "ہم کشمیری لڑکیاں وطن سے باہر نہیں جایا کرتیں"۔

"ہم تمہیں زور سے لے جائیں گے"۔ سلیم مسکراتے ہوئے کہتا۔ سارہ بھی مسکرا دیتی۔

یونہی ہر روز ہم جھیل کے کنارے جاتے۔ رمضان اور سارہ شکارہ کنارے سے لگائے ہمارے انتظار میں بیٹھے ہوتے۔ وہ کئی کئی سواریوں کو جھیل کی سیر کرانے سے انکار کر دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ سارہ اور سلیم کی باتیں عشق و محبت کی باتوں میں تبدیل ہوتی گئیں۔ ایک دن میں نے سلیم کو ٹوکا بھی مگر وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم نہیں جانتے خلیل! مجھے سارہ سے کتنی محبت ہے۔ کیا کروں۔ اپنے آپ کو اُس سے بہت دُور رکھنے کی کوشش کرتا ہوں مگر ایسا نہیں کر سکتا"۔

"مگر تم نے کبھی سوچا بھی ہے۔ کہ تمہاری اس محبت کا انجام کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"محبت میں انجام نہیں سوچا جاتا۔ خلیل"۔

سلیم نے یہ جواب دیکر مجھے خاموش کر دیا۔ جی میں آئی کہ اسے برملا کہہ دوں۔ تم تو آج تک دس بارہ لڑکیوں سے عشق کر چکے ہو۔ گھر جا کر اس کو بھی بھلا دو گے۔ مگر اس بیچاری کی زندگی کیوں برباد کرتے ہو۔ پھر میں نے سوچا۔ سارہ پر اس کا کیا اثر پڑیگا۔ جس طرح سلیم کا وقتی جوش ہے۔ اسی طرح اس کا بھی وقتی جوش ہوگا۔ ان لوگوں کا تو کام ہی یہی ہے کہ جو سواری بھی آئے۔ اس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کریں۔ اس کا دل بہلائیں۔ اگر یہ ایسا نہ کریں۔ تو ان کا کاروبار کیسے چلے۔

محبت کی گفتگو شاید بہت پُرپیچ ہوتی تھی۔ جسے رمضان کا ننھا دماغ نہ سمجھ سکتا تھا۔ "شکارہ" اکثر کہیں جھیل کے کنارے کھڑا کر لیا جاتا۔ رمضان شکارے ہی میں بیٹھ کر ہماری کتابیں دیکھا کرتا۔ میں ادھر ادھر کے مناظر کو دُوربین سے دیکھتا رہتا۔ مگر میرے کان سلیم اور سارہ ہی کی گفتگو کی طرف لگے رہتے۔ سلیم سارہ کو ساتھ لیکر بید مجنوں کے ایک درخت تلے بیٹھ جاتا۔ میں ان دونوں کی باتیں اور سارہ کے ہلکے ہلکے قہقہے سنتا رہتا تھا۔ سلیم اکثر اُس سے محبت کے مضبوط پیمان باندھا کرتا تھا۔

اور پھر وہ ہماری واپسی کا دن۔ جب سلیم نے سارہ سے کہا۔ کہ کل ہم واپس اپنے شہر کو جا رہے ہیں۔ چپو چلاتے چلاتے ایک دم سارہ کے ہاتھ رک گئے۔ جیسے ان میں دورانِ خون بند ہو گیا ہو۔ سلیم اُسے بہت تسلی دیتا رہا۔ "میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ سارہ۔ تمہاری یاد ہمیشہ دل میں رہے گی۔ میں وہاں پہنچ کر تمہیں برابر خط لکھونگا تم بھی اپنی خیریت کی اطلاع کسی سے لکھوا کر مجھے ضرور بھیجتی رہنا۔ اگلے سال میں ضرور آؤں گا۔ اور تمہارے لئے

بہت سے کپڑے بھی ساتھ لاؤں گا تم بھی مجھے بھلا تو نہ دو گی۔؟ . . . . اربے تو بولتی کیوں نہیں . . . .
. . سارہ نے مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ راستہ بھر خاموشی سے بیٹھے افق پر ٹکٹکی باندھے کچھ سوچتی رہی ۔ شکارہ کنارے سے آلگا ہم اترے۔ میں نے سارہ کی طرف دیکھا۔ اس کی لانبی لانبی پلکوں سے آنسوؤں کے دو قطرے موتیوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ ننھا رمضان بھی بہت اداس تھا ہم نے الوداع کہی۔ اور جب کچھ دور جاکر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ تو سارہ اور رمضان بت بنے حسرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ایک سال پہلے کے یہ واقعات ایسے ہی معلوم ہوتے تھے جیسے کل ہی کے روز گزرے ہوں۔

کنارے پر ایک چھوٹے سے شکارے میں ایک لڑکا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ مجھے کچھ شک ہوا۔ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا قریب گیا۔ اور پہچان لیا وہ رمضان تھا۔

"رمضان" میں نے آواز دی۔ وہ اپنا نام سن کر مڑا۔ اور حیران تھا کہ ایک اجنبی اس کا نام کیوں کر جانتا ہے مگر تھوڑی دیر بعد وہ مجھے پہچان گیا۔

"آپ بابوجی . . . . آپ آگئے بابوجی" مسکراہٹ اس کے معصوم چہرے پر کھیلنے لگی۔ اس کی نگاہیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس نے جھٹ پوچھا "سلیم بابو کہاں ہیں"؟

"وہ نہیں آیا . . . . سارہ کہاں ہے رمضان؟" میں نے پوچھا۔ مسکراہٹ ایک دم اس کے چہرے سے غائب ہو گئی

"سارہ عرصے سے بیمار ہے" اس نے نہایت مغموم انداز میں کہا۔

"کیا بیمار ہے وہ؟" میں بے صبری سے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"اسے کھانسی ہوتی ہے۔ بابوجی۔ اور روز بخار بھی ہوتا ہے۔ بابا ہر روز حکیم جی سے دوا لاتا ہے۔ مگر سارہ ٹھیک نہیں ہوتی۔ وہ بڑی کمزور ہو گئی ہے۔ بابوجی سلیم بابو کیوں نہیں آئے؟ اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی کہنے لگا: وہ تو کہتے تھے میں ضرور آؤں گا۔ . . . انہوں نے کوئی خط بھی نہیں بھیجا۔ سارہ ان کو بہت یاد کرتی ہے وہ بہت بیمار ہے بابوجی"۔

میں خاموش رہا۔ میں تو سمجھا کرتا تھا۔ جیسے سلیم شہر واپس آکر سارہ کو بالکل بھول گیا ہے۔ اسی طرح سارہ بھی اسے بھول چکی ہوگی۔ مگر میرے اللہ۔ اس کھیل کا انجام کتنا خوفناک ہو رہا ہے۔ میں آگے بڑھ کر شکارے میں جا بیٹھا رمضان میری خاموشی سے مایوس ہو کر چپو اٹھاتے ہوئے بولا "کس طرف جائیں۔ بابوجی"۔

"اپنے گھر لے چلو مجھے"۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اسے شاید میرے الفاظ پر یقین نہ آتا تھا۔ اس کی معصوم نگاہیں مجھ سے میرے الفاظ کی تائید چاہتی تھیں۔

"چلو رمضان" میں نے کہا۔ ننھے ملاح نے چپوؤں سے پانی کو دھکیلنا شروع کیا۔ شکارہ جھیل کے سینے پر دوڑنے لگا۔ رمضان تیزی سے چپو چلا رہا تھا۔ اس نے پھر مجھ سے پوچھا "سلیم بابو کیوں نہیں آئے؟ . . .

سارہ ان کو بہت یاد کرتی ہے۔ اگر وہ آجائیں تو سارا بہن بہت خوش ہو گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بہت بیمار ہے۔
بابو جی "۔ مگر میں نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں اُسے کیا جواب دے سکتا تھا۔ سامنے ہی بید مجنوں
کا وہ درخت نظر آنے لگا جس کے نیچے بیٹھ کر سلیم سارہ سے محبت کے مضبوط پیمان باندھا کرتا تھا۔ اور
کہتا تھا کہ میں تمہارا ہوں اور تمہیں کبھی نہ بھولوں گا۔ مرد کا پیمان محبت ؟ ——— مرد کتنا ظالم ہے۔
جھوٹا فریبی ——— وحشی ! بڑے بڑے وعدے کرتا ہے اور بھول جاتا ہے۔ شہد کی مکھی کی طرح ہر ایک
پھول پر بیٹھ کر اس کا رس پیار سے چوس لیتا ہے لیکن لگاؤ ایک سے نہیں رکھتا۔ عورت ——— بھولی بھالی ———
معصوم ہمیشہ مرد سے دھوکہ کھاتی ہے۔ مگر پھر بھی سبق حاصل نہیں کرتی۔

اچانک ہی مجھے خیال آگیا۔ کہ سارہ کے گاؤں والے اور والدین کیا کہیں گے۔ کہ یہ نوجوان اجنبی کیوں
سارہ کو دیکھنے آیا ہے۔ کوئی بہانہ بنانا چاہئے۔

"رمضان"۔ میں نے کہا

"جی"۔ وہ چپو کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

"اگر تمہارے بابا یا کوئی اور تم سے میرے متعلق پوچھے۔ کہ یہ تمہارے ساتھ کون ہے۔ تو تم انہیں کیا
کہو گے "

وہ کوئی جواب نہ سوچ سکا۔ میں نے کہا

"تم اپنے بابا سے کہنا۔ کہ یہ ایک ڈاکٹر ہے میرے شکارے پر بیٹھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میری بہن بیمار
ہے۔ اور ہم بہت غریب ہیں۔ تو اس نے کہا۔ چلو تمہارے ساتھ چل میں اُسے دیکھتا ہوں۔

"اچھا جی" رمضان میری تجویز سُن کر خوش ہو گیا۔

سامنے چنار کے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رمضان نے مجھے بتایا۔ کہ اُن کا گاؤں ان
درختوں کے عقب میں ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہماری کشتی کنارے پر جا لگی۔ ہم چاول کے کھیتوں میں پگڈنڈی پر
سے گزر رہے تھے۔ رمضان مجھ سے آگے آگے تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے رُک جاتا۔ اور کہتا۔
"بس تھوڑی دُور رہ گیا ہے بابو جی"۔ وہ شاید ڈرتا تھا۔ کہ میں راستے کی طوالت سے گھبرا کر واپس نہ لوٹ جاؤں۔
کھیتوں میں کام کرتی ہوئی کشمیری عورتیں سر اٹھا کر مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ سامنے کشمیریوں کے چند
شکستہ اور بوسیدہ مکان نظر آنے لگے۔

"وہ ہمارا گاؤں ہے" رمضان میرے چہرے پر نظریں ڈالتے ہوئے بولا۔ سارہ آپ کو دیکھ کر بہت
خوش ہو گی۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔ " وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ میں سمجھ گیا وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ کچھ فاصلے پر چند لوگ
ایک بوڑھے کشمیری کو بیدردی سے پیٹ رہے تھے۔ بوڑھا درد سے چلا رہا تھا۔ مگر اس کی دلدوز چیخوں کا اُن
ظالموں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ رمضان نے مجھے بتایا۔ کہ اُس کا بیٹا لاہور مزدوری کے لئے گیا ہوا ہے

وہ ہر سال زمین کے لئے مالیہ بھیج دیتا ہے۔ بوڑھا کچھ کام نہیں کر سکتا۔ ابھی تک اس کے بیٹے نے مالیہ نہیں بھیجا۔ یہ سرکاری پیادے ہیں اور اُسے پیٹ رہے ہیں۔ کہ اُس نے ابھی تک مالیہ کیوں نہیں ادا کیا۔ دنیا ہی جنت میں انسانیت کے ساتھ وحشیانہ سلوک کے اس مکروہ منظر کو دیکھتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔ چند کشمیری بچے ٹخنوں تک لمبے لمبے کُرتے پہنے کھیل رہے تھے۔ وہ رمضان کے ساتھ مجھے دیکھ کر حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ رمضان اپنے ہمجنسوں کو دیکھ کر میرے آگے اکڑ اکڑ کر چلنے لگا۔ ایک ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا: "یہ ہمارا گھر ہے" اور دوڑ کر مکان میں گھس گیا۔ میں باہر انتظار کرنے لگا میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک بوڑھے کے ہمراہ باہر نکلا۔ بوڑھا بڑے تپاک سے ملا۔

"آپ نے ہم غریبوں پر بہت کرم کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔ خدا آپ کو سلامت رکھے" بوڑھا عاجزی سے بولا: "میری بچی بڑی مدت سے بیمار ہے حکیم کا بہت علاج کیا۔ پیر جی نے بہت تعویذ لکھ کر دئے مگر اُسے بالکل آرام نہیں ہوتا" الفاظ اس کے حلق میں اٹک اٹک جاتے تھے "ہم بہت غریب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب۔ اتنی طاقت نہیں کہ اُسے سری نگر لیجا کر کسی ڈاکٹر کو دکھائیں۔ میری پیاری بچی۔ اُسے بچا لیجئے۔ ڈاکٹر صاحب میں ساری عمر کے لئے آپ کا غلام بن جاؤں گا"

"تم فکر نہ کرو۔ بڑے میاں! میں مریضہ کو دیکھتا ہوں۔ انشاء اللہ جلدی ہی ٹھیک ہو جائے گی" میں ایک ڈاکٹر کا پارٹ ادا کرتے ہوئے بولا۔ ہم مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ بوڑھا مجھے ایک کوٹھڑی کی طرف لے گیا۔ اندر ایک کونے میں چارپائی پر سارہ پڑی ہوئی تھی۔ بوڑھا رمضان کو میرے پاس چھوڑ کر خود کسی کام کے لئے باہر نکل گیا۔

میری آنکھوں کو یقین ہی نہ آتا تھا۔ کہ کمبلوں میں لپٹا ہوا یہ بے گوشت کا ڈھانچہ وہی پچھلے سال والی حسین شوخ سارہ ہے۔ اُف ——— میرے اللہ! ایک سال میں اتنا تغیر ——— اُس کے سُرخ موٹے موٹے گال اب زرد ہڈیوں تلے دب چکے تھے جسم پر ہڈیوں اور زرد چمڑے کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔ محبت کے کیڑے سارا گوشت کھا چکے تھے۔ سارا خون چُوس چکے تھے۔ گلاب کی پتی جیسے سُرخ پتلے پتلے ہونٹ سیاہ خشک ہونٹوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ کمبل کے باہر ہڈی پر رگوں سے لپٹا ہوا ایک بازو پڑا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ کیا یہ وہی پچھلے سال والے گوشت سے بھرے ہوئے خوبصورت مرمریں بازو ہیں۔ جن کی اداؤں سے مست ہو کر شکارہ پانی کی سطح پر دوڑتا پھرتا تھا۔ اس شکستہ کھنڈر میں صرف وہ نرگسی آنکھیں ہی یہ نشان دے رہی تھیں۔ کہ وہ سارہ ہے۔

"سارہ" میں نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میری طرف دیکھا۔ اس کے بے نور چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے سارہ؟ اس نے شاید میری بات سنی ہی نہیں بمشکل سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں کوٹھڑی

میں کسی اور کی تلاش کرنے لگیں۔ مایوس ہو کر حسرت سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں مجھ سے سوال کر رہی تھیں "وہ نہیں آئے"۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔ میں اُسے کیا جواب دیتا۔ کہ جس ظالم کے پیچھے تمہاری یہ حالت ہوئی ہے معصوم لڑکی اس نے تو تجھے کبھی بھول کر بھی یاد نہیں کیا۔ میری زبان بند ہو گئی۔ میں ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ اس کا سر دوبارہ تکیہ پر جا گرا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور پھر نہ بولی۔ مگر اس کی آنکھوں سے نکلتے ہوئے آنسوؤں کے دو معصوم قطروں نے مجھ سے وہ سب کچھ کہہ دیا۔ جو وہ شاید زبان سے بھی نہ کہہ سکتی وہ دوست جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ پیارا تھا۔ اس وقت اس کے لئے میرے دل میں نفرت کا ایک شدید جذبہ پیدا ہوا۔ میں وہاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا۔ جائے قیام کو واپس چلا گیا۔ لیکن میری طبیعت اس قدر مضمحل ہوئی کہ دو دن تک باہر نہ نکل سکا۔ تیسرے دن جھیل کے کنارے گیا۔ مگر وہاں رمضان نہ تھا۔ میں بہت دیر تک ٹھہرا رہا اور اُسے تلاش کرتا رہا۔ مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ شام کو نا اُمید ہو کر واپس لوٹا طرح طرح کے وسوسے میری طبیعت کو پریشان کر رہے تھے۔ دوسرے دن سویرے سویرے وہاں پہنچا رمضان سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"کل کہاں تھے۔ رمضان"۔ میں نے تیزی سے بڑھ کر اُسے پوچھا۔

"سارہ بہن . . . . ." وہ رونے لگا۔

"کیا ہوا سارہ کو؟" میں نے بیقراری سے اس کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"مر گئی" وہ بڑی مشکل سے رونا روکتے ہوئے بولا۔

رمضان بیچارہ بڑی بے قراری سے رو رہا تھا۔ اس کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ اس کو اپنی بہن سے بہت محبت تھی۔ اور اس نے جب میری آنکھوں میں بھی آنسوؤں کے قطرے دیکھے۔ تو وہ بے اختیار ہو کر رونے لگا۔ میں اُسے تسلی دینے کی کوشش کرتا رہا۔

میں کشمیر سے واپس لوٹ آیا۔ سلیم ملا۔ وہ مُسکراتا ہوا مجھ سے ملنے کے لئے آگے بڑھا۔ میرے جی میں آئی۔ کہ ایک مُکا اس زور سے اس کے منہ پر ماروں کہ سڑک کے کنارے والی گندی نالی میں جا گرے۔ مگر میں اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے اس سے ملا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اُس سے کہا۔

"سلیم! تمہاری سارہ مر گئی بیچاری"۔ اور اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"اوہ . . . . ." سلیم نے اس طرح کہا۔ گویا سامنے سڑک پر کوئی کتا کسی کار کے پہیئے تلے کچل کر مر گیا ہو۔ پھر تھوڑی دیر بعد موضوع تبدیل کرتے ہوئے بولا

"خورشید کی تان سین آئی ہے۔ چلو دیکھیں"۔

انور میر

اندھا

وہ اندھا تھا۔ ۔ ۔ پیدائشی اندھا۔ یہ اندھاپن اس کو ورثے میں نہیں ملا تھا۔ اُس کی ماں خوبصورت آنکھوں والی خوش مزاج عورت تھی۔ اور اس کا والد ایک ایسے خاندان کا فرد تھا جس میں پہلے کوئی اندھا نہیں گزرا تھا۔

سورج کی روشنی اس کے لئے سوائے حرارت کے کچھ معنی نہ رکھتی تھی۔ پھول سوائے خوشبو کے کچھ نہیں تھے اُجالا اور اندھیرا۔ رات اور دن۔ رنگ اور شکل۔ فاصلہ اور قامت۔ یہ سب چیزیں اس کے فہم سے بالاتر تھیں۔

اگر روپیہ ہی دولت ہے تو اندھا ایک امیر آدمی تھا لیکن اُس کی سب سے بڑی دولت اس کی ماں اور بہن تھیں۔ جن کے ساتھ وہ زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا باپ اس کے بچپن ہی میں مرچکا تھا۔

چوبیس سال گزر گئے اور یہ اندھا ایک خاموش اور خوبصورت نوجوان بن گیا۔ وہ موسیقی کا دلدادہ تھا اور کبھی کبھی دھیمی مگر سریلی آواز میں گایا کرتا تھا۔ پیانو اور وائلن بھی بجا لیتا تھا۔ شہر کے شوروغل سے دُور وہ سمندر کے کنارے ایک حویلی میں رہتا تھا۔

وہ اب دُنیا کے عجوبات کو دیکھنے کا خیال دل سے نکال چکا تھا۔ بہت بڑے بڑے ڈاکٹر آئے۔ مگر اس لاعلاج بیماری کو دیکھ کر مایوس واپس چلے گئے۔

اندھا ڈاکٹروں کی باتیں سنتا اور سہتا رہا۔

اندھے کی عمر کے پچیسویں سال ان کو ایک ایسے ڈاکٹر کا پتہ چلا جو بہت سے اندھوں کو آنکھیں دے چکا تھا۔

ڈاکٹر کو تار دیکر بلوایا گیا۔

"گھبراؤ مت تمہاری نظر تم کو مل جائے گی اس کا مجھ کو یقین ہے ۔ ۔ ۔ مگر ممکن ہے تھوڑی دیر کے لئے ہو۔ کیا تم برداشت کر سکتے ہو؟

"بہت مشکل ہوگا ڈاکٹر صاحب ۔ ۔ ۔ ۔ بہت مشکل مگر میں برداشت کر لوں گا"!

"کیا تم سمجھتے ہو؟ کیا تم جانتے ہو؟ کہ تمہاری نظر تم کو تھوڑی دیر مل جانے سے کیا مطلب ہے۔ تم نہیں جانتے۔ کیا کھو رہے ہو۔ اگر اچانک تم دیکھنے لگ جاؤ۔ شاید چند منٹوں یا گھنٹوں کے لئے اور پھر ۔ ۔ پھر تم اندھے ہو جاؤ۔ بالکل اندھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"مجھے منظور ہے ڈاکٹر میرا خیال ہے میں برداشت کر لوں گا"

علاج شروع ہو گیا جو بہت تکلیف دہ تھا۔ چھ ہفتوں کے لئے اندھے کو ایک تاریک کمرے میں پیٹھ کے بل لٹایا گیا۔ اس کی آنکھوں پر پلستر اور ماتھے پر تنگ پٹیاں رکھی گئیں۔ اس کو خاص قسم کی خوراک

دی جاتی اور ہلنے جلنے سے باز رکھا جاتا۔

لامبی ڈاکٹر ایک دوسرے مریض کا علاج کرنے بغیر اطلاع دئے چلا گیا اور ایک خط چھوڑ گیا۔ جس میں پٹیاں اور پلستر دُور کرنے کا دن لکھا ہوا تھا۔

آخر وہ سخت گھڑی آ پہنچی۔ وہ پلستر دور کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ دنیا کے عجوبات کو دیکھنا وہ کیسے برداشت کریگا۔ اور اگر پٹی کھولنے پر بھی وہ اندھا ہی رہا۔ تو . . . .

"نہیں میں برداشت نہیں کر سکتا ماں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ تجربہ مجھ پر نہ کیا جاتا بغیر آنکھوں کے بھی میں خوش تھا۔ بالکل خوش۔ اگر ان تکالیف کے باوجود بھی دنیا میرے لئے اندھیری رہی تو میں کبھی خوش نہیں رہوں گا ماں۔ میں یہ کیسے برداشت کرونگا"۔

"دنیا کی وہ محبت کرنے والی ہستیوں کو پچیس سال کے بعد اچانک دیکھ کر میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکوں گا ماں۔ تم دونوں باہر ٹھہرو ——— اور یاد رکھو جب تک میں نہ بلاؤں اندر نہ آنا"۔

آخر اس نے لرزتے ہوئے آنکھوں سے پٹیاں اور پلستر دور کرنا شروع کر دیا۔ اس کشمکش میں اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ بچوں کی طرح بلبلا اٹھا۔

اُس نے پلستر دور کر دیا . . . . .

اُسے روشنی معلوم ہوئی . . . . وہ دیکھ سکتا تھا . . . . اسے کچھ دھندسی نظر آئی اور اُس کے بعد چیزیں اپنی اصلی حالت پر آنی شروع ہو گئیں۔ دھندلی لکیروں نے چیزوں کی شکل اختیار کر لی۔

وہ کھڑا ہو گیا مگر لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ وہ خوفزدہ تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ دروازہ کھولے مگر نہیں جانتا تھا کہ دروازہ کونسا ہے۔

ابھی دن اور روشنی سٹیاتی تھی۔

کمرے کے عجوبات کو دیکھنے کے بعد وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ سمندر کو دیکھا ایک بادبانی جہاز کو دیکھا اور سمجھا شاید یہی پرندہ ہے۔ ایک مڑے ہوئے اخبار کو جو کہ ہوا اس کی کھڑکی کے پاس اٹھا لاتی تھی۔ نہایت غور سے دیکھا مگر نہ سمجھ سکا۔ ایک بچے کو دیکھا مگر نہ سمجھ سکا۔

ایک گھنٹہ گزر چکا تھا . . . . . . دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔

"ٹھہرو ماں . . . . ابھی نہیں۔ گھبراؤ نہیں میں اب دیکھ سکتا ہوں . . . . مگر ابھی نہیں"۔

اس نے پھر کمرے کی چیزوں کو دیکھنا شروع کیا۔ پاگلوں کی طرح اس کے ہاتھ کمرے کی ہر چیز کو چھو رہے تھے۔ کرسی۔ میز۔ پھولدان سب پر اس کے ہاتھ بار بار پڑ رہے تھے۔

آخر وہ ٹھیک ہو گیا . . . . . پھر کھڑکی کے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے اُس کی

آنکھیں دکھنا شروع ہو گئیں
وہ لیٹ گیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر سمندر کو دیکھنا شروع کر دیا۔ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔
"یہ کیا؟".. اُس نے اپنے ہاتھ اٹھائے۔ آنکھوں کو ملا۔ کیونکہ وہ دُکھ رہی تھیں۔ وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ اور باہر غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔
کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ پھر اندھا ہو رہا ہو۔ اس نے جلتی ہوئی آنکھیں بند کیں اور پھر کھول دیں۔ سمندر اور آسمان پر سیاہی بڑھ رہی تھی چیزوں کی ظاہری شکل بدل رہی تھی۔
تھوڑی دیر پہلے وہ سب کچھ صاف دیکھ رہا تھا۔ مگر اب چیزیں بدل رہی تھیں۔ سمندر کے کنارے کی کاہی اب ایک سیاہ لکیر بن کر رہ گئی تھی۔ اور وہ لہریں۔ وہ ان کا اتار چڑھاؤ دیکھ سکتا تھا۔ مگر اب . . . .
وہ گر پڑا اس کی نگاہیں کمرے کی ہر ایک چیز پر پڑ رہی تھیں۔ دیوار گیر۔ قالین چھت۔ کرسیاں۔ پردے میز۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ سب چیزیں سیاہی میں تبدیل ہو رہی ہیں۔
ڈاکٹر کے الفاظ "تمہاری نظر تم کو مل جائے گی۔ اس کا مجھ کو یقین ہے مگر ممکن ہے تھوڑی دیر کے لئے ہو"
وہ اس تھوڑی سی دیر کی خوشی میں یہ الفاظ بھول چکا تھا۔ مگر اب یہ خوفناک سیاہ بادل کی طرح اس کی روح پر چھا رہے تھے۔ وہ پھر اندھا ہو رہا تھا۔ اس کا روشن مستقبل تاریک ہو رہا تھا۔ دنیا کی ایک جھلک . . . پھر خاتمہ . . . . . . بالکل خاتمہ۔
اس نے زور سے چیخ ماری۔ اٹھا اور اپنے ہاتھ دروازے کی طرف بڑھائے۔ اس نے چابی دباتی۔ اور دروازہ کھول دیا۔ وہ لرزا اس نے آنکھیں زور سے بھینچ رکھی تھیں۔
"ماں۔ ماں تم کہاں ہو۔ میں تم کو نہیں دیکھ سکتا۔ میں ٹھیک ہو گیا تھا۔ مجھے صاف نظر آنے لگا تھا۔ میں نے بہت کچھ دیکھا مگر اب پھر اندھا ہو رہا ہوں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ دنیا کی ہر شے سیاہی میں تبدیل ہو رہی ہے۔ ماں اب پھر ساری عمر تم کو نہیں دیکھ سکوں گا خدایا۔ مجھے صرف ایک گھڑی کے لئے بینائی دیدے تاکہ میں اپنی پیاری ماں اور بہن کو دیکھوں". . . .
وہ سر کرا کر بیٹھ گیا۔
"سیاہی پھر رہی ہے۔ نہیں میرے بچے تم اب پھر اندھے نہیں ہو سکتے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ کہ شام ہو رہی ہے۔ اس وقت روشنی کم ہو جاتی ہے۔ اور یہ رات ہوتی ہے۔
کافی دیر کے بعد وہ اس کا مطلب سمجھا +

(ماخوذ)

اقبال قریشی

ٹوٹا ہوا دل

سورج دنیا پر اپنی آخری نگاہیں ڈال رہا تھا۔ اور آخری بار اپنی سنہری روشنی سطح زمین پر بکھیر رہا تھا چہچہانے والے پرندے اپنے آخری نغمے بلند کر رہے تھے۔ کاروباری دنیا کا شور و غلغلہ خاموشی کی گہرائیوں میں دب جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ سنہری روشنی کا یہ ٹھنڈا سماں ہر دیکھنے والے کے جی کو بھاتا تھا۔ اور ہر دل کو پیغام سکون دیتا تھا لیکن اس روح پرور وقت میں بھی ایک روح بے قرار و مضطرب تھی۔ وہ اپنے وسیع گھر کے کونے میں چارپائی پر لیٹے۔ بھیانک خیالات کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن تھی۔ فطرت کی نیرنگیوں سے اسے کیا کام؟ وہ تو خود اپنے غم و اندوہ اور فکر و تردد کے شعلوں میں لپٹی جل رہی تھی — آہ! وہ ایک بے کس مظلومہ تھی — اپنے بازو پر سر رکھے۔ اُس کی آنکھوں سے پُر حسرت آنسو ٹپک ٹپک کر تکیہ کے دامن میں جذب ہوتے چلے جا رہے تھے — آہ! اُسے اپنی ساری عمر میں مسرت اور شادمانی کی ایک جھلک تک بھی دکھائی نہیں دی وہ اسی خیال میں غرق تھی — اور آج بھی وہ اسی طرح دکھ اور درد جھیل رہی تھی — یہ گھر اس کا اپنا تھا — وہ اس کی مالکہ تھی — لیکن نہیں۔ وہ یوں محسوس کرتی تھی۔ کہ گویا گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ گھر کی وسعتیں اس پر تنگ ہو رہی ہیں۔ گھر کی ہر ایک چیز مہیب پتھر بن کر اس کے پیکر نازک کو روندڈالنا چاہتی ہے آہ۔ اور آج اس کی زلفیں بھی جنہیں وہ پیار سے سجایا کرتی تھی۔ ناگ بن کر ڈس لینا چاہتی تھیں۔

اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کے دلی جذبات کی غمازی کر رہی تھیں۔ — دلی پریشانی اور اضطراب بے قرار جسم کی خفیف سے خفیف حرکت سے نمایاں ہو رہا تھا — غم و اندوہ اُسے تڑپا رہا تھا۔ دل کی گہرائیوں سے دبی آہیں نکل نکل کر اس کے لبوں پر رک رک جاتی تھیں — آہ! اُسے اب محسوس ہو رہا تھا۔ کہ وہ ایک شمع ہے۔ لیکن کیسی؟ جس کی روشنی پھیکی پڑ چکی ہو۔ — جس کا نور کافور ہو چکا ہو — ہاں کسی وقت اس کی جاذب نظر تابانیوں پر ہزاروں پروانے شہید ہونے کی تمنائیں دل میں لئے ہوئے اس کے گرد جمع ہو سکتے تھے۔ لیکن آہ — اب وہ ایک شمع بے نور ہے۔ جس کی روشنی سے لطف اندوز ہونے والا کوئی نہیں — ایک پروانہ بھی اس کے گرد چکر نہیں لگاتا۔

"وہ آخر اتنی سرد مہری کیوں برتتے ہیں"؟ وہ سوچتی۔ شاید انہیں مجھ سے قطعی محبت نہیں ہے۔ ان کے دل میں میری جگہ نہیں ہے۔ مجھے بے کار عضو سمجھ کر دور پھینک دینا چاہتے ہیں — وہ مجھے پیکر بے حس سمجھتے ہیں۔ لیکن شاید بے خبر ہیں۔ اس سے کہ اس دل میں بھی نازک جذبات کی تحریک ہو سکتی ہے لیکن اس بات کا انہیں کوئی احساس نہیں۔ وہ انہیں کچل دینا چاہتے ہیں — جانتے نہیں کہ جذبات

سینے سے وابستہ نہیں کرتے بلکہ اور زیادہ ابھر آتے ہیں — پانی وبا نے سے دبتا نہیں بلکہ چھلک جانا چاہتا ہے!
آہ! مجھ یتیم لڑکی کو جس وقت میری ظالم سوتیلی ماں نے — اپنی آنکھوں سے دور پھینکنے کیلئے —
ان کے دامن تمہے ساتھ میرا دامن باندھا تھا — اس وقت میرے دل کی کیا کیفیتیں تھیں؟ — میری جوانی
کی بہاریں جوبن پر تھیں — میرا خون جوانی اور شادمانی کے جوش سے موجزن تھا — میرے دل تاریک کے
آسمان پر خوشنما امیدیں اور حسین آرزوؤں کے دمکتے ہوئے ستاروں نے جگمگاہٹ پیدا کر دی تھی —
میں ان کی حسین ٹھنڈی چھاؤں میں ناچتی — گاتی — اور مسرت اور شادمانی کے قہقہے فضائے بسیط میں
تیرتے پھرتے — میں عالم خیال میں تصور باندھتی — کہ اب میری بدبختی کے دنوں کا خاتمہ ہے — اب میں کسی
کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی نہ رہوں گی — کسی کی خوشنما چیزوں کو میں حسرت بھری نگاہوں سے کبھی
نہ دیکھوں گی — اب مجھے تحکمانہ لہجوں میں آوازیں نہ دی جائیں گی — کسی کی حقارت آمیز نظریں مجھ پر نہ
پڑیں گی — کسی کے بے جا احکام میری گردن پہ بار نہ ہوں گے — بلکہ میں آزاد فضاؤں میں سانس
لوں گی — اور آزاد پھروں گی — گلشنِ آزادی میں آزاد بلبل بن کر چہچہاؤں گی — جس شاخ پہ جی چاہیگا
بیٹھوں گی — اور جو نغمہ جی چاہے گا بلند کروں گی — کسی قسم کی کوئی روک میرے راہ میں حائل نہ ہو گی — اور بلا
روک ٹوک فضائے بسیط میں پھڑ پھڑا پھڑا پھڑا کر چکر کاٹوں گی —

میں دیکھتی ہوں کہ میری جھولی آرزوؤں کے موتیوں سے بھرپور ہے — اور میں ان سے کھیل رہی
ہوں — میرے کانوں میں ننھی اور پیاری پیاری آوازیں گونج رہی ہیں — میں دوڑ کر انہیں اٹھاتی — پیار کرتی
سینے سے لگاتی — اور بار بار ان کے چاند سے مکھڑے کو چومتی ہوں — اور میری نئی نئی امیدیں اور نئی نئی
تمنائیں ان کے گرد چکر لگاتیں — میں بیحد خوش تھی — شادماں تھی — لیکن آہ — فلکِ کج رفتار — ہائے یہ
ایک حسین و جمیل خواب تھا — جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوا — ایک حسین طلسم تھا — جو ٹوٹ چکا ہے —"

اس کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی — اُسے کسی پہلو چین نہیں پڑتا تھا — وہ بار بار کروٹیں بدلتی بستر کی
شکنیں اس کے اضطراب کی عبارت تھیں — میں انجان تھی — وہ پھر غرقِ تخیلات تھی" بے خبر تھی — مجھے کیا معلوم
تھا کہ میری ظالم ماں مجھے موت کے تاریک کنوئیں میں دھکیل رہی ہے — مجھ گرفتار قفس کو صیاد کی عادتوں کا
کیا علم تھا —؟ کیا پتہ تھا؟ کہ یہاں بھی حقارت آمیز نظریں میرا پیچھا نہ چھوڑیں گی — کیا علم تھا؟ — کہ یہاں
بھی تحکمانہ لہجے تیر بن کر میرے جگر خستہ کے پار ہوں گے اور سنگ ہائے ستم میرے نازک دل کے ٹکڑے
اڑائیں گے — اف! میرے اللہ — آخر کب تک میں یہ ظلم سہتی رہوں گی — ابھی تھوڑی دیر کی بات ہے —
کہیں بھول کر آوارہ ہوتے — پوچھا تھا اتنے دنوں باہر کہاں رہتے ہو؟ کہیں رات یہاں بھی بسر کیا کرو گھر تو اپنا ہی ہے
یہ سوال میرے دل کا آئینہ دار نہ تھا — بلکہ سلگتی ہوئی آگ پر تیل تھا جو فوراً بھڑک اٹھی — اور مجھے بھی اپنی لپیٹوں
میں لے کر بھسم کر ڈالا —

تمہیں ہمارے کام سے کیا مطلب؟ ہم جانیں اور ہمارے کام۔ تمہیں ہماری مرضی میں دخل اندازی کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں" — آہ ان کی جلی کٹی باتوں نے دل جلا ڈالا۔ اور ترچھی ترچھی نگاہوں نے دل توڑ ڈالا ساکت و خاموش رہ گئی۔ کیا جواب دیتی! بات کرنے کا حق ہی جو حاصل نہیں۔ ظالم خاوندوں کے جواب میں جب مظلوم بیویاں بات بھی کرنا چاہتی ہیں۔ تو آہنی پنجے انکی گردن کو دبانے اور گلا گھوٹنے کیلئے تن جایا کرتے ہیں۔ آخر کبتک جور و تعدی کا یہ لامتناہی سلسلہ چلتا جائیگا؟ — دنیا میں ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ لیکن کیا یہ ظلم لامحدود ہے؟ — اب میرا دل ان ظالم بندھنوں سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ کیونکہ انکے دل کی بستی میں اب میری گنجائش نہیں رہی۔ میرے جسم کا رواں رواں اس ظلم کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے تڑپ رہا ہے — آہ۔ اب میرے صبر کا پیمانہ چھلک چکا ہے۔

میں نے انکی خاطر کیا کیا نہیں کیا؟ متواتر دو سال خوب خوب خدمت کی۔ اپنے جان و تن انکی خدمت کیلئے وقف کر دئے محض اس لئے کہ شاید میری طرف کوئی نگاہ غلط انداز ہی پڑ جائے — لاکھ بناؤ سنگار کیا۔ اپنے مرمریں جسم کو خوب آراستہ کیا۔ لیکن۔ سب آہ۔ بیسود۔ رائگاں۔ اب میرے سارے حربے بیکار ہو چکے ہیں — ان ظلم و جور کے پردوں کے پیچھے ضرور کوئی راز کار فرما ہے ناممکن ہے کہ بیوی تو اپنے خاوند کی خوشی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنی ساری خوشیاں قربان کر دے لیکن خاوند بلا وجہ اسکی طرف ملتفت نہ ہو؟ — ہاں ہوسکتا ہے کہ کسی کے حسین دام میں گرفتار ہو چکے ہوں۔ اور کسی آنکھوں کو چند صیاد نیوا نے ظاہرا حسن نے ان پر ڈورے ڈالے ہوں — اگر یوں ہے۔ انہیں میری کیسی ضرورت ہوسکتی ہے؟ کسی شوخ چشم کی موجودگی میں مجھ بے زبان مظلومہ کی جگہ کہاں ہوسکتی ہے؟ ہاں اب میری جگہ نہیں ہے۔ یقیناً۔ ہائے اب میری سیاہ بختی کے دنوں کا اک نیا آغاز ہونیوالا ہے۔ مجھے یہاں سے ٹھکرا دیا جائیگا۔ اور — آہ! میں بے یار و مددگار دنیا کی چٹان سے ٹکریں کھا کھا کر اپنا سر پھوڑ دونگی۔ اسکے آنسو تیزی سے بہنے لگے مستقبل کی خوفناک تاریکیاں بھیانک شکلوں میں دوڑی چلی آرہی تھیں۔

وہ غیر ارادی طور پر اٹھی۔ اور اسکی لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگیں اسے اس کھڑکی کی طرف لے گئیں جو وسیع میدان کی طرف کھلتی تھی — شام کے دھندلکے فضائے بسیط پر چھا چکے تھے۔ پرندے گھونسلوں میں خوابیدہ ہو چکے تھے —— وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے باہر دیکھنے لگی۔ جیسے کوئی دیوانہ — دور سے پر مسرت قہقہوں کی آواز اس کے کانوں میں گونجی — ہاں شاید وہ اس آواز سے نا آشنا تھی — ٹکٹکی باندھ کر آواز کی سمت دیکھتی رہی۔ دور سے ہلکی ہلکی تاریکی میں سفید دھندلے دکھائی دئے۔ وہ دیکھتی رہی۔ اور وہ قریب آتے گئے — اس پر خوف مسلط ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے حسرت ٹپکنے لگی — دل سینہ میں دھک دھک کرنے لگا۔ ٹانگیں ڈگمگانے لگیں۔ اور لڑکھڑاتی ہوئی ایک طرف گر پڑی —— بے ہوش — آہ اس کا قیاس صحیح تھا ——

رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ستارے آسمان پر آنکھیں ٹمٹما رہے تھے۔ دنیا ساکت و خاموش تھی —— پرندوں نے گھونسلوں میں بیٹھ کر چپ سادھ لی — لیکن پپیہا درخت کی شاخ پر بیٹھا "پی کہاں" کی صدائے پر درد بلند کر رہا تھا۔ اور وہ — کون؟ ہاں وہ ٹھکرائی ہوئی — اپنے سینے میں ایک ٹوٹا ہوا دل لئے آگے بڑھے چلی جا رہی تھی کہاں؟ — شاید دنیا کی چٹان سے ٹکریں کھانے کے لئے ؛

محمد احسن

نګران۔ نفیس الدین ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔
مدیر۔ عبدالرؤف خان نائب مدیر نصرالله خان نصر

افتتاحیه

که دُنیا ځائ دَ خوشحالئ وی۔ دَ غم ائ دوستان
په یکښې تړل تله وو نه دَ خیبر لوستونکو ته به معلومه
شوی وی چه تیر کال کالج دَ دوی دوستانو نه دَ
همیشه دپاره جدا شو۔ اول دَ کالج هردلعزیز
پرینسپل سر سیّد حاجی محمد نامدار الملک کے۔
سی ایس آئی مهتر چترال او دویم خان بهادر
مغل باز خان او۔ بی۔ ای ممبر پبلک سروس
کمیشن۔ چه دَ کالج دَ انتظامی مجلس یو وفادار
رکن وه۔ او دریم خان بهادر ارباب محمد ایوب
خان دَ لنډئ ی۔ انا لله وانا الیه راجعون ه
انګریزی حصی واله به ددوئ په ژوند بنه په
تفصیل سره ولیکی۔ دے دپاره زه به په ویر مختصر
بیان اکتفا اوکړم۔ مهتر صاحب دَ کالج اووری
لاوف پرینسپل او زوړ طالبعلم وو۔ انګریزی
تعلیم نه ملا وو فارسی۔ عربی مطالعه ئی وسیع
وه۔ مرحوم دَ فارسی نازک خیال شاعر او
اعلیٰ مصنف وه۔ په ۱۹۳۸ سنه کښې ئی خپل
اول کتاب صحیفة التکوین او بیا دویمی
مشرق الانوار چهاپ کړل۔ دواړه دَ فارسی
ادب قابل قدر تصنیفات دی۔

خان بهادر مغل باز خان متعلق به زه صرف
دومره اووایم چه دوی دَ صاحبزاده صاحب
په خوږو دوستانو کښې وه۔ او لکه دَ هغوی
ئے ځان له ژوند (لائف) خپله جوړ کړی وو۔
سرکښې دَ معمولی سپاهی په حیثیت فوځ کښې
داخل شو۔ جنګی خدمات په وجهه دَ پولټیکل
ایجنټ لوی مربتی نه هم اورسیده و۔ او دَ
پبلک سروس کمیشن ممبر هم اوټاکلے شوے وو۔

اهوکښې مونږ دعا کوُ چه خدائ دَ دوئ روح ته جنت الفردوس کښې ښه اعلیٰ مقام ورکړی او دَ دوی پس ماندګانو ته دِ صبر ورکړی۔

دریم ارباب صاحب حُمونږ دَ کالج دَ بورډ ممبر وو۔ پنجاب پولیس کښې دَ کپتانی په عهده سرفراز وُ۔ دَ ریټائرډ کیدو نه پس دِ خپل کلی کښې ئې استوګنه شروع کړه۔ دوئ به دَ کالج په خیرو کښې ډیره دلچسپی اخستنه۔ مونږ دَ دوی په بے وخته مرګ دَ افسوس اظهار کوُ او دَ دوی رشته دارانو او خاص دَ دوئ فرزند ارجمند ارباب نورمحمد خان سره چه حُمونږ دَ کالج طالبعلم دی همدردی اظهار کوو۔

اوس به زه دَ خیبر دَ موجوده پرچې متعلق یو څو خبری اوکړم۔ حُونږ دا پرچه ډیر لږ وخت کښې رته دی۔ حُما خیال دی چه دا حُل به مونږ ته ښه مواد پلاس راشی۔ لیکن دَ کالج پښتنو حُلمو ما دا خیال دَ خپل قلم په زور غلط ثابت کړو۔ شکر مقام دی چه دَ کالج پښتانه هم دَ ادب نه دا بیدا ارشول او دا ئې محسوس کړه چه هغوی پښتانه دی۔

موجوده مضمون نوکښې دَ پښتو ترقی شعرو شاعری متلونه۔ او بایزید انصاری خه ادبی او تاریخی مضمونونه دی۔ په نظمونوکښې دَ مفتون۔ نصر او حبیب الرحمان سواتی کلام حسب معمول قابلِ تعریف دي۔ په افسانوکښې دَ محمد اقبال ښکنښی افسانه ډیره خوږه ده۔ ځیکو نکی ښکنښی دي۔ لیکن ژبه ئې پیښاوری ده دا شاید دَ هغه دَ پېښاور دا ته نیږه کاله استوګنې اثر کیدی شی۔ بله افسانه دَ سلطان محمود ده۔ زه منم چه هغه دَ کالج دَ هلکانو سپکه ویلی ده۔ لیکن دِ نه دَ هغه مطلب سپکاوی نه دی بلکه اصلاح ده۔ دَ نظم و نثر نور ے هم ډیری نسخی مونږ ته را رسیدلی وی۔ زه موغو ښتل چه بعضی مضمونونه چهاپ کولو دَ لیکونکی بے حوصله افزائی اوکړو۔ لیکن دَ صفحو کمی مونږ پدی مجبوره کړو۔ چه هغه پریږدو۔ دغه حضرات ته پکار دی چه هغوئ دَ موقع نه فائده واخلی او دَ سالنامی دَ پاره ښه ښه ادبی تاریخي او مذاقیه مضامین پخپل اول فرصت کښې اولیکی۔

حُمونږ به دا کوشش وی چه دَ رسالی معیار اوچت کړو۔ که اوچتولی نه شو۔ نو کم از کم چه وي نه غورزوُ۔ خو تپ دَ یو لاس نه نه خیږی دا کار مونږ بے دَ تاسو نه شو کولے۔ وے چه حُمونږ مثال خو دَ معمار دی۔ معمار ته چه څومره مصالحه ورکړی شی۔ هغه شان عمارت به

جوړ کړي - خو دا ذمه واري هم تر ډيره حده
په تاسو ده - ليکن ځما په خيال روڼړه دا سي هم
شته - چه خوی والی ابو يتهر پوره شه او کا دې
پوره شه - نه به وائي جوړي نيبرد ابو يته
ذاتي ملکيت دي - دوئ دا نه دي خبر چه
دَ قوم ترقي علاوه دَ نورو خبرو په ژبه هم
موقوفه ده - مثلاً که دَ انګريزانو مثال
واخستي شي نو معلومه به شي چه دَ دوی
دَ ترقۍ ذمه وار تر ډيره حده ليکونکي يا په
نورو لفظونو کښې دَ هغوی ادب دي - زه
اُميد کوم چه ځما پښتانه رونړه به دَ ذړه
سترګی او غوږوی - او څنګه چه دوی روس
تر بوره دَ ځان نه زيات نه شي کتلی هم دغه
شان دِ ځان دَ ژبې لحاظ هم دَ نورو ژبو ويونکو
سره برابر کړي - ولې چه خر دَ خونه کم شي نو
غوږ يې دَ پر يکولو وی + (عبدالرؤف مدير)
نوټ - مونږ افسوس کوُو چه دَ ځا ئے دَ کمی په وجهه
دَ سلطان محمود افسانه او هغلونه مونږ چهاپ نکړی شو -

مخلص

"آشنائه"

دا نازک ښائسته بدن دِ په مثال دَ ګلولښته
لکه لښته دِ با شره کښې ته دَ نازه نل ژنګيږے
ستا مثال دَ سپين پيروی په کهه چه راشي
چه څوک لاس ورته نژدے کړی ترې په زوره تر زوره وړانيږے
په مرئي کښې دِ ښکاره شي هغه چه ګټ کله او به کړے
دَ حسين شفاف مرمرو يو پيکر دا ته ښکا دي ږے
زيب تن چه سپين لباس کړے په خندا الوېږے کوته بوږے
يې سپرږ مئے دَ څوا ولسے په ادر يحو کښې پړکيږے
په درياب کښې چه ښکاره شي ته دَ سپينے سپوږمۍ عکس
دَ هوا غوټه چه راشي ته په بانده وړانيږے
دا دَ کيف يوه نغمه ده چه دَ روح په کهدا يو کښې
دَ رباط لو پيدا کړی چه دَ نازه ته خندا ږيږے
وا چه رقص کړی په او بو کښې جوړے دا ګل دَ کنوا
نه خطاشوم دا خو ته يې په او بو کښې چه خندا ږيږے
دَ شبنم يوه قطره يې چه په ګل باندې پرته وی
دَ ګوهر هسے لطيف ته دَ لرے نه ژ ليږے

محمد يونس خليل دَ اول کال

شعروشاعري

(دَ مضمون شروع ښکلی شوی ده - وے قابل
ليکونکی مضمون سر ته نه دی رسولی - ولې دی ته م
او کوو چه دا دَ سکول دَ يو طالبعلم دَ نبه جيب با تو
بتيجه ده نو مونږ دالبرخه په خپل اوکنټرل او
زيرقه ره په نظر ور ته کوو - اميد لرو چه دا ماه

به دَغه کښې دَ پاره هم په میګزین مضمون ورکول جاري (وساتي)

دَ پښتو شعرو شاعري مونږ لا تر اوسه پورې چا درست نه دې معلوم کړې. البته دَ کابل دَ پوهانو لیکونکو رائې ده - چه دَ پښتو ژبې پرومبنے شاعر شیخ بیټنې وه - دا شاعر دَ شاهان غور په زمانه کښې کښې تیر شوے دے - استوګنه به ئې دَ کسي په غره کښې چه اوس دَ کوه سلیمان په نوم یادیږي. کوله - په دغے حساب څو نږ دَ ژبې دَ شعرو شاعرۍ شروع دَ ښکلے اوښکلے په مینځ شوې ده -
شعرو شاعري ایته اهم کله چه شوې ده - دا دومره اهمیت نه لري - ولے دا چه دَ شعرو نو جوړولو بنی آدم ته څه ضرورت وه یا دے؟ او شعر څه ته وائي - څه قدرے دَ بحث قابل سوالونه دي په لنډو کښې شعرونه جوړول یوه مشغوله ده - چه یوه لحظه پرِ شاعر خیال غلط کړي - او ورسره راتلونکي نسل ته یادګارئې پاتې شي - که یو شاعر دَ خپل شعر متعلق دا سے وائي چه
دے کرښو نوره هیڅ مه عاینشته

سرے ورک شي ذلک بی صبرتی نوم ئې یادئي

شعر دَ بني آدم دَ پښتو جذباتو صفه فصیحه او ښکلې ځپانی ده - چه صر یو لوستونکے او اوریدونکے دَ شاعر دَ زړه په رازونو پوهیدے شي - هم په دغه خیال زیبُ النساء په خپل دیوان مخفي کښې په یو ځائې کښې وائي -

در سخن پنهان شدم مانند بو در برگ گل
هر که دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

شعرو شاعري دَ خوږ زړه ژړا ده - چه شروع ئې اکثر دَ عشق یا دَ محبت نه کیږي - خواه که هغه حقیقي وي یا مجازي -

دَ هر یو سنه شاعر په کلام کښې دَ عشق سوز موندلې شي - ولے چه تر څو دَ زړه جذبات ئې په څه درد نه وي لرزیدلي. تر هغې پورے هغه (شاعر) دَ نورد خلقونه دَ شاباشي حقدار نشي کرزیدلے - نور خلق چه دَ دُنیا دَ غمونو نه تنګ راشي - نو دَ خپل زړه براس دَ اوښکو په شکل کښې او باسي. ولے شاعر دَ خپلے شاعرۍ په پایاوه سینه کښې ځان خوږه کړي - او دَ دُنیا دَ غمونو فکرونو نه ځان دَ څه وخت دَ پاره بے خبره کړي.

شعرو شاعري هغه لطیف او کار آمد فن دے - چه په هیڅ زمانه او په هیڅ وخت کښې دا نه بے کاره کیږي -

(سلطان بهادر دَ نهم جماعت اسلامیه کالجیټ سکول)

پسرلے

دَ تیرو کې ه روانه دَ مغرب په لوری زغلي
سور دَ نمر په جولان راغے پلوشې ئې غشي اولي
نمر ښکاره چه شوله ورایا هر کلي ته غلق پاسید
پرخه هم په پاسید وشوه چوړ مخے له ور زغلي
په زانګو کښې دَ بلبل بور اخوب دَ خوانئ ویښي
توله شپه ئې په سپوږمئ کښې لمتئ نه وو زنګے
دَ پسرلي سحر ته ګوره چه به څه جوړ که له خاورو
شنین هادرئ دے خور کړے پر ګلونه دی شنه لی
کلي ور وستو کې پرانیزي تماشه دَ ګلستان که
غنچو هم دی خپل غوږونه بلبلانو ته نیولے
نسیم ورک دَ خوشبوئی نشه بے خوده غونی راغے
او وه کیف ئې راسید ار ګرو خوب دَ غل پتانے زغلي
لاله ځان لاوو کړو جام کښې چه زیاتي ئې څکلے نشو
په نرګس هم سر چوړ ښکې راته ښکاري زیاتي ئې څکلي
رنګینئ کړې غزونے نوے نوے م په خیال کښې
دَ سخن ښکلي خوبونه نه واته دی راغلي
په ړولا یې کښې دَ فطرت دَ پسرلي ناوے دَ ناسته
دی پنجیان سره ګلونه څه سواره ښکاري څه پلي
دَ خزان دَ سپیره باده جو ګلان و اره خبر شو
هر بلبل چه لخکانه په سرو سترګو دی ژړلي
دَ پسرلي خوبونه و نیم تعبیرونه ئې رنګین دی
دَ خزان دَ مرګ دپاره کیا غشي راویستلي
دا زه و سے پریشان شوم کوم بلبل م په زړه او
نه دَ چا سره خندا کوم او نه ماته چا خندلی
دا په هره خوا ګلونه دا په هره خوا تلونه
دادی ښکلي سرو تونه نصر و ته دی ږنګیدلی

نصرالله خان نصر

دَ پښتو ترقي

پښتو ژبه یوه داسې ژبه ده چه دَ هغې نورو ژبو سره څه ډیر تعلق نشته۔ دَ خوشحالی مقام دی چه پښتانه اوس لږ ویښ شوی دی ۔ وے بیا هم ویلے شو چه پښتو ژبے کافي ترقي کړیده۔ لکه نن ورځ چه دَ دهلي رساله "نن پرون" او دَ قندهار نه طلوع افغان شائع کیګي او خلق ئې د ډیر په شوق سره ګوري او مطلب تر اخلي

لیکن بیا هم دَ پښتو ژبے ترقي په نسبت دَ نورو ژبو کمه کړیده۔ ډیره ممکن ده چه پښتو ژبے کافي ترقي کړی وی۔ دَ پښتنو جهالت په دے باره کښې یو لوے رکاوټ دے۔ که چرے پښتانه تعلیم یافته وے نو ډیر به په کښې مترجمان پیدا شوی وو۔ او پښتو ژبه

بہ هم د نورو ژبو په شان ډیره وسیع شوی
ده -
افسوس دے د پښتنو په پرواز بانډې! نور
قومونه په هوا کښې گرزي مگر د پښتنو مصور
ترا وسه د هغې نقشه هم نشي را ښکلی - نور
قومونه په هوا کښې جنگونه کوي د پښتنو
بهادران هغه په خوب کښې هم نه ویني
د پښتو ژبے د ترقي د پاره ځما په خیال د لاندې
څلور څیزونه ډیر ضروري دي

(۱) تالیف و تصنیف یعنی نوي نوي کتابونه
لیکل او باد نورو ژبو لیکلی شوی کتابونه په
پښتو کښې ترجمه کول -

دا یو دا سے طریقه ده چه که د دے چرے په اخلاص
پیروي او کړی شي نو ضروري ده چه پښتو
ژبه د څه نا څه شي به . دے ذریعے سره به د
پښتو ادب کافي ترقي او کړي و لے چه قابل
خلق به پیدا شي او هغوی به کوشش
کوي چه پښتو ادب له ترقي ورکړي
کوم چه د خیالاتو نه ډک کتابونه وي هغه
به پښتو رونړو ته مخکښې کیخودے شي او
هغوی به تر نه فائده واخلی -

د دے طریق عمل ژوندی مثال حیدر
آباد دکن دے - تقریباً هر تعلیم یافته
ته معلومه ده - چه حیدرآباد دکن کښې
تعلیم د مدرسے نه تر کالج پورے ټول په اردو
ژبه کښې ورکړے دے شي - دا هم هر چا ته
معلومه ده - چه اردو ژبه څومره مقبول او
عام ژبه ده - د دے محض وجه دا ده چه
دفتري ژبه ده - او بل نظام صاحب ورله
کافي ترقي ورکړے دی -

د دکن په کالجونو او مدرسو کښې الجبرا -
سائنس - اقتصادیات - علم نباتات - و
حیوانات په اردو ژبه کښې خوے کیلی - او
طلباو په کښې هیڅ قسم نه تکلیف نه محسوس
کوي -

د الفریډ اعظم د بادشاهت د زمانے نه
پرونبے د انگریزانو عدالتي ژبه لاتیني
او فرانسیسي ده - دوی ته به هر قسم مشکل
پیش وه - ځکه چه د ډیرو لږو خلقو نه علاوه
بل چا ته به لاتیني یا فرانسیسي نه ورتله -
کوم وخت چه الفریډ په تخت کیناست نو
هغه د لرے لرے ځایونو نه لوی لوی
عالمان را وغښتل او خپل تعزیرات څه
چه نور ډیر کتابونه ؤ په خپله ژبه یعنی
انگریزی کښې ترجمه کړل - پس له هغے نه
انګریزانو خپله ژبه په شوق سره ویله او

د سلطنت د هر کار نه به یې ځان خبراو۔ په دے وجه
سره انګریزی ادب کښې هم کافی ترقی اوشوه او
خلقو ته هم هر قسم فایده اورسیده نو ځکه څه هم
وایم که چرے په پښتو ژبه کښې داسی کتابونه
اولیکلی شی یا د نورو ژبو کښې د لیکلو شوو کتابونو
په پښتو کښې ترجمه اوشی۔ نو ضروری ده چه
د پښتو ژبے لمن به هم ارته شی او پښتنو ته به
معلومه هم شی چه نورو قومونو کوم ځای ته اورسیدلے
او دوی د کوم ځاے خوب وینی۔

(۲) رسالے او اخبارات۔

تصنیف شوه کتابونه مستقبل کښې هر وخت
پکاریږی شی۔ لیکن رسالے او اخبارات
صرف د لږ وخت د پاره وی د اخبارات
او رسالو هم د ژبے په ترقی کښې ډیر لاس دی.
د اخبارانو او رسالو په وجه څومره چه یو ژبه
مخکښې کیدے شی دومره په بل څه باندے نه
شی کیدے۔ کوم ژبه کښې چه ډیر اخبارات
او رسالے اوځی نو پوهه شه چه دا ژبه ډیره مقبوله
ده۔ داهم د شکر مقام دے چه حکومت هم دی
طرف ته خیال شوی دی۔ او هغوی پښتو
کښې رسالے او اخبارات شایع کوی۔
څه چه کله لائبریری ته لاړ شم او د پښتو رسالے
او وینم نو زړه مې باغ باغ شی او شکر اوباسم
چه خدایا پښتو دِ هم تر دے حده واورسوله
چه د نورو ژبو په شان په لائبریرئ کښې دِ دے
هم رسالے پرتے دی۔

(۳) شعر و شاعری۔

شاعری هم د یو ژبے د اوچت والی نخښه ده
کومے پورے چه یو ژبه کښې شاعران نه وی هغه
پورے د هغه ژبے د مخکښې کیدو هیڅ امکان
نه شی کیدے۔ د شاعرانو په وجه د ژبے ترقی
خو په ځاے پریږده چه ملکونه هم آزادی په دی شی
اخلاق سِنه کیدے شی۔ مذهب اوچت
شی۔ حتی چه ټول د دُنیا نظام خوریږی شی
زه ډیر افسوس کوم چه څو موږ صوبه کښې هم ډیر
بلند پایا شاعران موجود دی لیکن هغوی
د خپل خدا داد تحفے (یعنی شاعری نه)
څه فایده نه اخلی۔ دوی له پکار دی چه خپل
خدا داد لیاقت (شاعری) سره خپل قوم
اوچت کړی۔ او د خپلے ژبے د ترقی د پاره
لاس پښے اُووهی۔ او خپلے ژبے نه یوه ژبه
جوړه کړی۔

(ادبی مجلسونه او جرګی)

د پښتو خدمت موږ په دی طرف هم کولے
شو۔ هغه داسی چه هر هغه تعلیم یافته
پښتون چه پښتو سره دلچسپی لری او یا

د ترقۍ خواهش لري خپل کلي یا خیل
کښې د یو ادبي جرګې اجرا اوکړي۔ مقاصد
دې داوي۔

(۱) چه د پښتو ادب پټې خزانې رابرسیره
کړي۔

(۲) غیر تعلیم یافته خلقونه د پښتنو لوستل
اولیکل اوښائي۔

(۳) د پښتو مروجه ټپې۔ لوبې ۔ چاربیتې
اومتلونه جمع کړي۔

د شبتو حصې کښې ایپې یا تور نصرالله خان
نصر ذکر ہ دلته بے ځایه نوي وے چه هغه
په خپل کلي (بزتهکال) کښې او نورو بعضو
کلوکښې ادبي ټولې جوړکړې دي چه ډیر په کامیابۍ سره
چلیږي۔

نورو پښتنو نه هم پکار دي ۔ چه هغوی د
نصر صاحب د مثال نه عبرت واخلي او خپل ماحول
کښې هم دغه شان کار شروع کړي۔ اوځان
په اصلي معنو کښې پښتون او خپله ژبه پښتو
ثابته کړي

سمندرخان صاحب د پښتو په موجوده ادیبانو
کښې د هیرولو سړے نه دے ۔ د پښتو په
نثري دنیا کښې سمندرخان د پښتو ژبے اصلي
خادم دے ۔ هر طالب العلم له پکار دي چه
د سمندر د ایلم ثوکه، او د قران ژباړه
مطالعه اوکړي چه ورته معلومه شي چه
پښتنو کښې هم د اسے هستۍ شته لیکن موږ
ترخبرنه یو ۔ کوم (Nalume) چه
سمندرخان صاحب بیان کړے دے
ورو زور ته د هغه ځاے نشي اخستے ۔ زه
اکثر په دے خبره خپلو ملګرو سره بحث
کوم چه سمندرخان د "ورو زور ته" ته ډیر
زیان دے ۔ لیکن افسوس دی چه مغربي
تعلیم سره ځمونږ دماغ هم مغرب زده شوی
دی ۔ نو انګریزي انګریزي ده او پښتو پښتو
د ایلم ثوکه، چه کوم الفاظو کښې سمندرخان
بیان کړے ده ۔ ورو زور ته
په هیڅ یے نه ده بیان کړے ۔ که څوک هغه د پښتو
شاعر وے ۔

(۵) فلمونه ۔

هر تعلیم یافته او غیر تعلیم یافته سړي ته
معلومه ده چه د یو ژبے د شهرت د پاره
فلمونه څومره زور اثر شے دے ۔ د اردو
ژبے د ترقۍ یو وجه فلمونه هم کیدے شي ۔
تا سو ته پته ده چه اردو ژبه نن ورځ څومره
ترقي په یرده ۔ د هغې وجه دا ده چه په
اردو فلمونو کښې اکثر د هندي الفاظ

استعمالیږی۔ کوم چې نه ځما محض دا مطلب
دے چه کومه ژبه چه په پرده (Screen)
خو لے کیږی۔ ځنه مشهوره ژبه وی۔ نو
دا سے علم که چرے پښتو ژبه کښې فلمونه اوم
ئ۔ نو ضروری ده چه پښتو ډیره ترقی
اوکړی۔ په دے سلسله کښې رفیق غزنوی
هر مونږ همیشه دپاره یادلرو۔ رفیق غزنوی
دَ لیلی مجنون، فلم جوړ ونو کښې کافی تکلیف
اوبیت کړے وه۔ دَ نورو فلمونو دَ جوړولو
وعده کړے وه۔ لیکن نه پوهیږم چه په
څه وجه نشی کولے۔ دلته سوال پیدا
کیږی چه دَ فلمونو دَ تیارولو دَ پاره روپئ
پکار دی۔ دا یو بالکل آسانه خبره ده که
چرے څوک دَ رفیق غزنوی په شان اقدام
اوکړی او دهر یو مالدار سړی دروازه
اوټکوی نو ممکن ده چه هر سړے دَ خپل
توفیق مطابق څه نا څه ورکړی۔ اول څه
ورپسے بل۔

احسان الدین څلورم کال

نوټ۔ دَ ژبے دَ ترقئ په باب کښې دَ ریډیو
هم څه نه څه ذکر پکار دوو۔
مخلص

ارمان

چه سپرلے وے او سپوږمئ وے
نیمه شپه وے نرے باد وے
دَ ولے په غاړه ناست وے
دَ یار یاد کښې ژړیدے
دَ اُوبو سرود سره وے
خپل دَ غم سرود را ښکلے
اُو بره هلته په چوړ لك وے
او زه دلته چوړ لیده لے
دَ سپوږمئ عکس واله کښې
خوریدلے نو لیده لے
چار چاپیره دَ ونو ښېږ وے
شین کیل وے سره ګلونه
چه دَ باد نرے چپې کښې
یو تر بله زاریدے
او دَ شپے دے شومه دم کښې
ما دَ غم سندرے وئیلے
چه دَ خوا وشا ونے غنے
له خفګانه شرنګیدلے
ګله سوے لوے لوسبے
ما ښپیلئ کښې اړ ووے

چه آشنائی کوي له خوبه — په فریاد را ویښیږے

کله دغه دَ غم لوبو — دَ آشنا راهبري کوے

چه دَ شپے سپینه سپوږمۍ کښي — تروے دراس سیږے

زه ترزر ږ په تیته تیته — دَ شمر شموزیر پټي کښي

دَ نرسے پوے دَ پاسه — غلے غونډے پټیږے

او شپیلۍ رانه هیبت کښي — دوے په چیغې وے هیره

چه آشنا را وچته وے — ما پورے لله خندیږے

بیا په مشو منډ اخوا دیخوا — کله یو خوا کله بل خوا

له ډیر قهره سر کردانه — رو په رانده کرزیږے

ما ترلا له ډیرے مینے — ځان پټي تر خوایو ے

خوزیږ وسره عندے — دَ شړ شمو سره قیږے

په نظر دَ زر کوسترکو — اشارے دَ زیږ و کلو

سلامي دَ شنو عنډ لو — ناکهانه لکیږے

دسے په ډیر قینږ و ملیز کښي — په درومینجقو په غړو انکو

هوا کبر له ډیره نازه — نیغ په ماس اتیږے

ما غلے شان په لار کښي — ودته خپه خپله ایښو ے

چه بے فهم نا خبره — سر دَ لاندے رالوئیږے

بیا مے زر په هله هله — چه دَ بنا ودو پا کوے

په خوبږ و پښتو خبرو — دوبا سره پغلا کیږے

لاس نه لاس کوتے نه کوتے — دَ ویے په مینځ کښتے کښي

سنلک په سنلک چه دوارهٔ ماستے — په مزه روانیږے

دَ آسمان پیغلے دَ ستوسرو — سره پټ پټو نه کوے

[illegible] غود سکو کښي — له یو بل پټیږے

کله پاڼو د خرو لو — کښې ئې سپین مخ ځلیده لے
کله ښکته پړا وبو کښې — را ته نا ښ کښې خندیده لے
کله ښه ځان ته غاوره — د خپل حسن په نشه کښې
کله تور داغ ئې تطر کښې — دا ځمونږ ه ښر میده سے
د تیتاری سوے سایئ و — ځمونږ زړه غټ غټ ریلے
لے پلے د یار تلاش کښې — سر کردانه کرز یده لے
زه او یار وے حسن وعشق وے — حسن ئے عشق میخوار وے
عشق د حسن نه قربان وے — حسن عشق نه زاریده لے
دواړه ډوب ناز و نیاز کښې — دواړه مست د عشق مستی کښې
چه یو بل مو تبښنا و سے — د خندا نه تتق چوئیده لے
تل د پاسه صبا وون وے — تو رانئے سر په ثنا وے
د سحر ښائسته رنړا وسے — په مژنیار اخوریده سے
چه صبا د شپے د مخه — تورے زلفے سر کوے
پاس په غره د سر وله تخته — ورته نمر مسکن کیده سے
مونږ ه هم خپل خپل کاله ته — نیغه نیکه آ غستلے
په آفسوس او په ارمان کښې — له یو بل رخصتیده لے

محمد اشرف مفتون

زبا او شاهِ عراق

(تاریخی افسانه)

د عرب د شکلوړی جزیری په سیلاؤ قبلیزی طرف د یمن شین او سر سبز ملک

دی - دَحسن عیسوی په شروع کښ دَ دیو
بند دَ ماتیدو وجه دا علاقه زیر آب شوه
نو یمنی قبایل قطب پله لاړل او په شام
او عراق کښ دیره شول - په عراق کښ
ئې دَ خیره سلطنت قایم کړو - رومنی
بادشاه ئې مالك اسدی وُو - وائی
چه یو ورځ ده مشر ځوی خدیمه بانډی
دَ تیر اندازئ مشق کولو چه یو غشی په
سینه جنی شه - او هم په دَ هغه نه ئې لټے
او تکولے او مړ شه - او س خدیمه پښتت
کیناست - دی یو جابر او مغرور بادشاه
وُو - خوك به ده هم دَ ځان سره سم نه
گڼړل - سخت بت پرست وو - دَ سرو زرو
دوه بتان به ئې جوړ خت ځان سره
سائل -

دَ خیره نه په قبیله دَ بنی لخم دسردار نصر
بن ربیعه حکومت وو - عدی نومے یو دیر
ښائسته ځوی ورلوره خدای ورکړی وو -
خدیمه چه دَ عدی دَ حسن حال واوریدو
نو دی را وغبتلو - خو عدی پلار پری نخوده
خدیمه په دے ډیر غصه شو - یو لښکری
ځان سره کړو او په بنی لخم ئې حمله اوکړه
دواړه بتان ئې هم ځان سره یوړل - دښمن
په علاقه چه ورداخل شو - نو خیمے ئې واچولے
او نوځ ته ئې دَ آرام حکم ورکړو - دواړه بتان
ئې یوه ښکلی خیمه کښ کیخودل او پهره ئې پرې
اوکوله - نصر یو څوکسه دَ دښمن نوځ ته اولیږل
هغوی دَ بتانو محافظانو سره لاړل - شراب
ئې پرې اوسکول - چه نشه شول نو بتان ئې
تر را وتښتول - سحر چه خدیمه عبادت له لاړ
نو بتان نه وو - وار پارئې خطا شو - یو ساعت
پس دَ نصر دَ لوری قاصد راغی چه ستاسو بتان تا نه
خپه شوی مونږ سره راغلی دی - او تا به زر
ترزره تباه کړی - بیا ئې خدیمه دَ جنګ اراده
ترك کړه - او نصر سره په ملاقات راضی
شو - نصر خپل ځوی عدی ورسره کړو -
عدی دَ بادشاه مصاحب شو په دربار کښ
به اوسیدو - دَ خدیمه پیغله خوره په ده مینه
شوه - دَ کومئ موسم او دَ څوار لسمی شپه
سپوږمئ - فرات سند دی وائی روان
دی - عدی په کوټه یوازی پروت دی - غواړی
چه څوك ورسره دَ مینه خبری اوکړی - په
دی کښ دَ پښو چغار واوری - حرم سرای
نوکره راشی او دی ځان سره بوزی - دَ خوش
په رنګینه کناره بانډ یو جنئ ئې ترنظر شی
چه اوږدی زلفی ئې لکه دَ مار پیچ و تاب خوری

او په اوږدوی زورندی دی. غټو غټو سترګو کښې یې لکه دَ شرابو خمار دی. دَ ځوانۍ په نشه دکه ده پله قدم واخلی او خپل نازک لاس دده په اوګه کیږدی.

دَ عدی زړه په زوره زوره درسیدو او وژبه یې اونښته "زه دَ خدای یه خور زهرا یم" هغه ګویا نه شی.

عدی چه دَ حسن او دَ شباب دی مجسمې ته یو نظر اوکتل نو خاموش پاتې شو. دو قلې (خاموش) رضا دې یې"، زهره مسکئ شی او تپوس اوکړی. مګر دَ زهره دَ حسن څه داسې رُعب پرې پریوتې وی چه هیڅ ترې جوړه نشوه.

"دَ بادشاه تاسره مینه ده. هغه او س دَ شرابو په نشه کښې دی پاسه، ورشه او خپل سوال ترې اوکړه." عدی په سترګو سترګو کښې دهغې شکریه ادا کړه. شاندار مستقبل یې دَ سترګو وړاندې راغې. خوشحاله دَ بادشاه محفل ته لاړ. یو کچه حسینې په بادشاه شراب څکول. چه خدای یه شبه په نشه شه نو ده ورته دَ زهره دَ پاره درخواست اوکړو. بادشاه منظور کړو. هم هغه وخت دَ زهره او دعدی نکاح اوتړلے شو. بله ورځ سحر چه خدای یه عدی دَ واده په جامو کښې اووینی نو حیران نه شی تپوس ترې اوکړی. دی ورته جواب کښې اووائی چه بیګاه دِ خور راسره نکاح کړیده. خدای یه پوه شه چه دَ مار بچی مار بچو ږی وی بادشاه زر دَ قتل اراده اوکړی مګر هغه دَ میدانه خپې اوبیتی. خپل وطن ته لاړ او بیا یو جنګ کښې مړ شی. دَ زهره یو څوی اوشه. خدای یه هغه دیر په محبت اوپاله عمر بن عدی دَ عرب به بهادرانو کښې یو شمارلی کیده. دَ جنګ په فن کښې دیر ماهر وو. او خپل یو بیل فوځ یې تیار کړی وو.

دَ موصل په علاقه دَ عمر بن طرب حکومت وو. یو ځل به خیره حمله اوکړه. خو خدای یه ورله شکست ورکړو. په دی جنګ کښې عمر طرب مړ شه. دده نارینه اولاد نه وو. صرف دده لونړه یې وی. یوز با او بله زینب. زبا دَ پلار په مرګ دَ حکومت واګے په لاس واخسته او دَ پلار دبدل آخستو له تیاره شوه.

دیره بهادره ښځه وه. دی غوښتل چه دبعد نه دَ خپلی توری زور اوښائی. مګر زینب خوښه نکړه. او مکرنه ی کار آخستل غوره وګڼړل دوی په مشوره زبا خدای یه ته دَ نکاح پیغام ورکړه چه زه ښځه ذات یم. ځما دَ

دَ چا روسره څه دی - ته ما په خپلی غلامۍ
کښې قبوله کړه - دلته راشه له ما سره واده
اوکړه -

خنډ یمه دَ بتاع په قلعه کښې وو - دواده پیغام ي
قبول کړو - مصاحبو ډیر اوبیرولو مګر ده بامنې
د واده پیربان داسی سواره وو - چه دَ چا ي
هم وانه وریدل - یو معتبر سړی دا قصیري ځان
سره کړو - اوموصل ته روان شه - چه دَ زبه
ځاے ته نژدے شو نو څه کوری چه دَ زبا فوځونه
دی چه راپیښ ی - قصیر بادشاه ته دوایی
تاوصلاح ورکړه - مګر هغه ونه منل - لږ
ساعت پس بادشاه ي راګیر شو مګر قصیر تری وتښتید
خنډ یمه دَ زبه په دربار کښې پیش کړی شو -
زبه ډیر په شان په تخت ناسته وه - لری پوری
سپاهیان برېنډی توری پلاس قطار قطار
ولاړ وو - زبه خنډ یمه ته حقارت سره اوکتل اووی
وی چه اوس به دَ پلار بدل روڼه په اسانتیا
واخستی شم - ته دلته کښې ي ستاد وینی یوه
قطره به هم نه ضایع کیږی - خیر خو خنډ یمه
ي اوترلو او بیا ي ډیر په بے دردۍ قتل کړو

دَ دے نه پس زبه دَ فرات په دواړه طرفه د ده
محله جوړ کړه - اودواړه ي دَ سمیډ لاندې
په یو سرنګ یو ځاے کړل - یو کښې به دا

اوسیده او بل کښې دوے خور زینت - دَ سرنګ
مطلب دا وو - چه دَ خطری په وخت زبا دَ دُښمن
په سترګو کښې خاورې واچوی او دَ سرنګ په
بله خوله ځان بچ کړی -
قصیر ډیر په ګرانه خیره ته اورسیده - عمر بن
عدی تخت نشین شه - اوقسم ي اوخوړ چه
تر څو دَ خنډ یمه بدل وانخلم نو آرام به اونه کړم
یو زبردست فوځ ي تیار کړه - مګر قصیری
مخالفت اوکړو - هغه دَ مکر بدله په مکر ورکول
غوښتل - څه مُده ترمینځ تیره شوه - او
دَ خنډ یمه قصه دَ خلقو هیره شوه - نو قصیر
خپله پوزه پری کړه - خوابے جامے واغستی
او زبا سره لاړ - ده دَ عمرو دَ ظلم داسی فرضی
قصی ورته جوړی کړی چه هغې هم اومنلی -
قصیر هلته اوسیده - چه دَ زبه پری پوره
اعتماد راغے - یو ورځ قصیر تری څه روپۍ
اوغوښتلی - دَ تجارت سامان ي سم کړو او
دَ شام په بهانه روان شه - چه څه مینځ لاړ نو
مخ ي خیره بله واړولو - دَ عمر عدی ډیری
روپۍ را واخستی - او زبه سره لاړ - قصیر
یو څو ځله هم دغه شان لاړو راغلو -
یو ورځے قصیر زبه ته وائی - زه دَ بادشاهانو
دربار کښې ډیر اوسیدلی یم هو یو بادشاه دَ

معیبت په وخت دَځان بچ کولو دَپاره څه انتظام کړی وی - زه غواړم چه تا دپاره هم یوه قلعه جوړه کړم - زه به دَ هغه دَ هوکه کښې راغلم - او هغه سرزلمی ي ورته اوخودلو - قصیر چه دا اولیدلو ډیر خوشحاله شه او دَ ذباء دَ زړات تعریف ي په پراسې زړه وکړو -

څه مُده پس قصیر بیا تجارت دَپاره لاړ - خیره نه زره ځلې ي ځان سره کړل عمرو بن عدی هم ورسره وو - ټول په کجاوو کښې کېناستل - مابنام تیاره دا قافله دَ ذبه محل ته رااورسیده - زباء چه داو ښانو لوی قطار اولید - نو خوشحاله شوه - لږ ساعت پس قصیری سلام له حاضر شو - او دَ ډیری نفع خوشخبری ورکړه - تالاره شو مه عمر بیځه سره سپاهیان راخستل او دَ قصیر دَ هدایاتو مطابق دَ محل نه راچاپېره شول - زبا چه شور واورېدلو دَ زینب محل پله اوزغلیده مګر هلته هم دښمن محاصره کړی وه - بیا خپل محل پله واپس راغله - په دې کښې قصیر او دَ هغه ملګرو دروازه ماته کړی وه او په محل راننوتی وو - زباء دَ دښمن دا ځ کښې راغله دَ قصیر سپاهیان ډیر خوشحاله وو - او لکه دَ سیلاب راخوځیدل - مګر زباء

معمولی ښځه نه وه چه کم همته شوی وی - او واری خطا شوی وی - دَ ګوتې نه ي ګمی راوبیستو او وی خوړو - او په خوشحاله خوشوالئ ي روح اوسپارلو -

رښتیا دی چه کوهی ملګنه دَ بل سړی په لار کښی چری نه به د کوهی په غاړه لاړ نسی -

خانزاده محمد اقبال دَ هنګو

بوآرزو

کاش!!

نه ساقی او پیمانه وے
زه په ذوق شوق کښې درتللے
ستر کے جام کا ته شراب وے
ما په غرت اُوکوتلے
بیا مخمور دَ عشق نشه کښې
زه له تا رخصتیدے
نه له ما سره جیلب کښې
په رو روخواکښې م تللے
مست نشه کښې ستا دَ مینه
له دنیانه بے خبره
پریوتے - او چتید لے
غورزیدے - زنګیدلے -

مختار احمد دَ دویم

غیبي ندا

په تیر شوی جنګ کښې چه څه وخت
دښمنانو ترکۍ د ټولو رواړوډو ونړولوکیږه
کړه - او ترکۍ ته خطره پیدا شوه - هم دغه
زمانه کښې کمال اتاترک یوه داسې سړی
وه چه په سینه کښې د وطن د مینې نه
ډک زړه وه - هغه دا محسوسوله چه که
ترکي یو ځل ددوئ له لاسه او وتله نو
ترقیامته پورې یا دآزادۍ اُمید نشته
دکمال اتاترک دادې خواهش وه
چه ترک یو آزاد قوم پاتې شي - لیکن
په هغه حالاتو کښې دا بالکل ناممکنه
معلومیده - دغم او نا امیدۍ په حالت
کښې یو شپه کمال پاشا د ښهر نه باهر
په یو کټه ناست فکرا وړی وه چه
څه طریقه اختیار کړی چه ترک د
دښمنانو مقابله کامیابي سره اوکړی
او ترکي به ستور یو آزاد ملک پاتې
شي - ده لا دا فکر کوو چه ناساپه یې

یو غیبي آواز تر غوږ و شه چه
پاسه - پاسه فکر مه کړه دعمل جامه د د بر کړه
چه سرې پر ماته کیږي هغه تول سوچ نه لرکړه
په درغوی[1] کښې سرکیږه، دعمل په میدان کښې شه
یا په وینو سالو سرشه یا د فتح تاج په سر کړه
نیم مړده ترکي زنده کړه - ته په وینو د ځوانانو
یا قبوله آزادي کړه، یا غیرت له رخصت ورکړه
د زمری پښتان راسورشه، ومې وشکه د دښمن
تیره توره دې ورخینه د اغیار د زړه په کړه
په نیک نیت او په خلوص، ته خدمت وکه د قوم
چه څوک نیت وی هغه بریږه، چه غلط وی غوځ[2] یې سرکړه
خودغرضۍ او په نفاق کښې، وی ذلت د هر اُمت
ته مومن یې کرکس شه د ډ دوا ړه نه حذر کړه
د ملکونو قافلې شوې ستانه وړاندې، ته ورسته یې
د شاهین که پرواز غواړې - د هغه شان جوړ وزر کړه
د همت غښتې وریږه د رجاسیند نزدې دی
چه قسمت ته ځان پرینګدې په عمل باندې باور کړه
که په دې د عمل وکړه ستا بېیا روطن به جوړ شي
په طوفان کښې ورلاهو شه د قوم جاز[2] را بهر کړه
کمال اتاترک دا آواز د زړه په غوږ و واورید، عمل
یې پرې وکړه - او نتیجه یې ټولې دنیا ته معلومه شوه.

[1] تلې [2] جهاز

(حبیب الرحمن)

بایزید انصاری (تاریخي)

پیدائش - اصلي نامې بایزید انصاري دہ او په پیر روښان بانې مشهوري د پلار نوم عبدالله او د مور نوم ئې بنین وه - د صوبه پنجاب په جالندهر ښار کښې په ۱۵۲۵ء کښې پیدا شه - والدین یې د اصله پښتانه وو - خو چه بابر ابراهیم لودهي له ۱۵۲۶ء کښې د پاني پت په میدان کښې شکست ورکړو - او د پښتنو خاندان ئې ورکول شروع کړل - نو دوی د قندهار غرسنې علاقې کانیګروم ته لاړل - په وړوکوالي کښې یې مذهب او صوفیت سره ډیره مینه وه - و ئیلې شي چه هغه په خپله ځواني کښې د اصلي اسلام پابندي په سختي سره کوله زړه حده پورې چه قدم یې کیخوده - نو خیال یې کاوُ چه میږې چرته د خپولاندې را نه شي او مړه نه شي - او شنه کیاه ورته ډیر گناه ښکاریده - ځکه چه په دغو کښې هم ژوند ون شته دې - او د دې ریبل د دې قتل دې - لیکن وروستو عمر کښې ئې چه بیا د پیرې او د پیغمبرې دعوي وکړه - او خپل قانون یې جاري که - نو ده هغه نه منونکي بې [illegible]

حال په ابتدا کښې هغه ډیر متدین او د مذهب پابند او - او پابندئ ئې د حد ته راووسیده چه د قدرت تماشه او مظاهره به ورته په هر څیز کښې ښکاریده - او د هغه دا محکم یقین پیدا شه چه په دُنیا کښې د خدای نه بغیر بل هیڅوک نشته - ("همه اوست")

دعوي - هغه د خپلې پوره پیرې دعوې کړې وه - او د هر هغه چا د نجات او خلاصۍ ضامن وه - څوک چه د هغه مریدان وو هغه د تبلیغ یې ډیره مزیداره سلسله قایمه کړې وه - چه هغه خاص کر په پښتو کښې ترډیره کامیابه وه - د ده په دعوي کښې دوه مختلف بیانونه او روایات شي مخالفان یې وائي - چه د پیغمبرۍ دعوي یې کړې وه - او عنې زندیق او - مریدان یې وائي - چه د خپل وخت مهدي او د مسلمانانو امام او کاشف چه د هغه حالنامه یا خیرالبیان مونږ ته شوې چه مونږ د هغه متعلق څه قطعي فیصله کړې و. خو چونکه د هغه خپل تحریر باقي پاتې نه دې نو مونږ به په دې بتیان مذهب اعتماد وکو - ځکه چه د دې کتاب مصنف د تاریخي حالاتو نه [illegible]

صفہ نہ بعض واسے خبرے وانقل کرے دی. چہ
کا اخون درویزہ دَ بیان تصدیق پرے کیږی
هغہ وائی ۔
الهام ۔ چہ پیر روښن تہ بہ الهام کیدہ ۔ یوځل
ورتہ الهام وشہ چہ وو ایہ ذَ ایتكَ بكَ وَعَرَفْتكَ
بكَ ۔ ما ستاذات پہ تا ولیدہ ۔ او پہ تا م وپیژندہ
یوځل ورتہ خدائے ووے ۔
فضوح الدنیا اهون من فضیح الاخرة دَ دُنیا
شرم دَ آخرت دَ شرم پہ مخکښی هیس هم نہ دے
استعملوا بالحسنة ولا تستعملوا بالسیئة ۔ نیکی زر
زر کوے او بدی مکوے ۔
یو الهام ورتہ اوشہ ۔ چہ ظاهرا و باطن دواړه
عبادتونہ فرض دی ۔ خو ظاهری عبادت وقتی
فرض دے ۔ او باطنی عبادت دَ همیش فرض
دے ۔ پہ دے خبرہ بایزید حیران شہ چہ کہ
مونځ کوم نو مشرک یم کہ نہ کوم نو کافر یم ځکہ
چہ نبیؐ وائی ۔ الصلوة تـ لك وان لم اصل
کفرت الهام ورتہ وشہ ۔ چہ نہ اوس نہ پس
دُ نیا نو مونځ کوہ ۔ یعنی دَ معبود صفت بیانوہ
دَ دے نہ پس یے دغہ مونځ اختیار کہ (یعنی
اسلامی مونځ یے پریخود ۔ مترجم)
روښن ۔ وائی چہ هغہ تہ آواز راغے ۔ او نور مو ښانو
یے خوب هم اولیدہ ۔ چہ بایزید دَ همیش

جونہ ون اومونده ۔ او هغہ تہ پیر روښن
خطاب ورکړے شہ ۔ دَ دغے ورځے نہ بایزید
انصاری دَ پیر روښن پہ نوم مشهور شہ ۔
تاریك ۔ هرکلہ چہ دده س دَ پیر بابا
اخون درویزہ صاحب او دَ نورو ملا یانو مباحثے
وشوے ۔ او دے یے پر کړو ۔ نو ملا ئمں یا پینی چہ
پہ ملا زنگی مشهور دو ده لہ یے دَ پیر تاریك
خطاب ورکړہ ۔ او دَ هغہ ورځے نہ دے دَ تاریکی
پہ نوم مشهور شہ ۔
دَ پیغمبرئ دعوی ۔ دلبستان کښی وائی
چہ خدای هغہ پیغمبر کہ (نعوذ باالله) کلہ
بہ ورلہ حضرت جبرائیلؑ راتہ ۔ او کلہ بہ ورتہ
خدای بے دَ جبرائیلؑ د واسطے نہ پہ فیلہ
خبرے کولے ۔ پہ دغہ زمانہ کښی بہ هغہ سوا
دَ خپلو مریدانو نہ دَ بل چا دَ لاس حلال شوے
څناور غوښہ نہ خوړلہ ۔ او دَ نورو مسلمانانو
ذبحہ بہ یے مردارہ گنړلہ ۔ دَ مونځ دَ پارہ
یے قبلے تہ مخ کول ضروری نہ گنړل ۔ ویلے
بہ چہ خدائے هر طرف تہ شتہ ۔ فاینما
تولوا فثم وجہ الله)
دَ غسل دَ پارہ یے دَ اوبو ضرورت نہ گنړہ ۔
وے یے چہ ځما پہ مذهب کښی سرے دَ
پلیتیٔ نہ پہ هوا پاکیږی ۔ ځکہ چہ دا هم

دَعنا صبر او یعه وو یو جز دے۔ نو هغه نا پاك
سړے بانړ چه باد به اولګیده۔ د هغه په نزد
به هغه پاك شه۔ هغه به وے چه کوم سړے ځان
اوخدا اے نه پیژنی۔ هغه سړے نه دے۔
دَدے وجه نه ئے عالم هند ولهٔ نبا هل مسلمان
بانړ ترجیح ورکول۔ دَدے نه صفا معلومیږی
چه دَ تاریکی متعلق د (عبد الکریم) المعروف
اخون درویزه بیان دَ دښمن بیان نه دے
بلکه په واقعاتو مبنی دے۔

حاضرجوابي)۔ تاریکي به وے چه دَ زړه نه
خبریم۔ مولانا ذکریا ورنه په دے باب کښ
تپوس اوکړه۔ چه که ته چرے دَ خپلے دعوے
مطابق په رښتیا دَ زړونو نه خبریې۔ نو
ته مانه اووایه چه ځما په زړه کښې څه دی
که دے اووے نو زه ستا مرید یم۔
تاریکی ورته اووے۔ چه زه دَ زړونو نه خبردار
خو یم۔ خو ستا زړه بالکل تشته دی نه۔ او ته چه
کوم زړه یاد دے۔ دا خو به ځنا ورکیتی هم
نشته۔ زه هغه زړه یاد دوم چه هغه دَ عرش
او دَ کرسی نه هم لوی وی۔ بیا ورته مولانا
اووے۔ چه که ته چرے دَ خپلے دعوی مطابق
دَ مړو په خبرو پوهیږے نو ما سره قبرستان
ته لاړ شه او مانه اووایه۔ نو زه به ستا
مرید شم۔
هغه ورته وے چه زه هر کله ستا دَ قبر (جسه)
نه خبر اوریدے شم نو دَ مړی نه نه شم
اوریدے ځکه چه نه زه هم په مړو حساب
دَ تحریك اثرات۔ اګر چه دده تحریك فنا
شه۔ خو بیا ترننه په پښتو دده آواز بازګشت
نشته۔ او خلیلو کښ ترا وسه دده مریدیان
پید اکیږی۔ اګر چه هغوی دَ تاریکی متعا
دَ پیغمبرے وغیره منلو نه تیار نه دی۔ خو دَ
زمانے په لوی مصلح او مجدد ئے ګنړی۔
کښلی وته۔ دَ تاریکی په نوم په دے وطن کښ
ځاے په ځاے کښلی وته ولاړ دی۔ پښتانه
قبرونو ډیر معتقد دی۔ ځکه چه دَ هغه مرید
دَ هغه په نوم ځاے ځاے سلی او کښلی ور
جوړ کړی دی۔ خو مونږ دَ هغې دَ حقیقت
نه خبر نه یو او دے باره کښ صحیح
فیصله نه شو کولے چه دا ولے جوړ شوی
او چا جوړ کړی دی۔ خلاصه دا چه دَ
تاریکی دَ تحریك یادګار به ورته ووایو۔

دوست محمد بی۔ایس۔سی فائنل

"گل ته"

اے گل زه دا منم - چه نه ډیر ښائسته یے ستا حسن دَ قدرت دَ کمال رنګینی ښائی - قدرت تا سره ډیره مهربانی کړی ده - چه تا ته یے ښائسته بیں اکړے ی - ډیر عاشقان ستا په مینه مست او بیقرار دی - بلبلان دَ سترګو اوښکے ستا په مخ پرتوزی - څنګه شبنم ویلی شی - لیکن ته هم په آرام نه ئے - لیوخو دِ عمر ډیر لږ دی - او بل څسینه دی دَ بلبلتا نه ظالم اغزی خښ دی - نو زه داویلے شم - چه لتانه به زیات بے قراره هیڅوک نه وی - آه افرین په تا شه - چه ته سل ژبے لری - او بیا هم خاموشه ئے -
دَ بلبل او پوڅ به ده - څومره شور کوی - ستا ژوند او مرګ دواړه په خاموشئ کیښ دی په سپرلی کښ ستا حسن کمال ته رسیدلے وی - د سپرلی هوا تا ډیره خوزوی را خوزوی لیکن ته ذره کښ پټه خندا کوی - او په جار هیڅ نه وائی - کاش که څوک دَ خاموشئ نه عبرت واخلی - او کم از کم دا یے نا یید سے خندا پریږدی - او په عمل کوتے پوری کړی -

اکرم ختهك دَ دویم کال

آذروئ کیف

له دُنیا شور و شغب نه چرته لرے په بیدیا وے | بل بشر هلتا کښ نه وے خوزه یوم آشنا وے
دَ دُنیاله رنج و غم نه دَ غریب له آهِ سرد نه | په میلو لرے پروت وے چه نه آه وی نه ګاوے
چه دَ ظلم دَ دُنیا نه دَ مظلوم دَ درد ژړا نه | دَ دُنیا دَ قیدِ و بند نه مونږ له هر څه مبرا وے
چه په دے کوخه بیدِ یا کښ نه حاکم وے نه محکوم وے | دَ څه غم را سره نه وے ستا په سر به لیوخندا وے
له فریب او له دهوکے نه دَ ملا دَ شیخ و دنیا نه | نا خبره لګه کانړے پروت په مینځ کښ دَ بیدیا وے

A list of some of the titles under publication is given below :—

(*a*) Byron's Platonism.
(*b*) Browning's Pessimism.
(*c*) Newton's Emotionalism.
(*d*) Karl Marx's Capitalism.
(*e*) Drake's Stay-at-homeism.
(*f*) Newman's Liberalism.
(*g*) Huxley's Philistinism.
(*h*) Hitler's Humanitarianism.

M. I. H.

My School Life

My school life has like every other thing two sides, the bright and the dark. If I look at the bright side of it, then I think it is very fine. But when I look at the dark side, it seems to me rather sad. That is why I cannot judge whether my school life is happy or not.

First I turn to the dark side of my school life. When the bell rings, I come to my school. I look at the ground on which we have to stand to listen to Sermons. If it is wet, I am glad because I dislike standing in the open when the cold winds blow. I congratulate my freinds, saying, "There will be no Sermon to-day". At times Maulvi Mohammed Idris tells us a story about truth in the course of his sermon which we very much like. When it is over, the next trouble begins. It is the drill! In this period other students do their physical exercises. For me it is the hospital period. I become ill for a few minutes and go to see the doctor. After this the greatest trouble approches: It is the mathematics period! I do not understand what the teacher tries to prove on the black-board, and I am very happy when this period is over.

Now let us look at the bright side of my school life. I do not like English Grammar. The analysis into clauses always makes me sad. The teacher explains the noun clause. But when he questions me, I call it the Pronoun clause. I am very happy when he teaches us prose. 'The Great People of the Past' is a good book. It is full of interesting stories. The teacher talls us how to become great. I like his talk very much. He makes poetry also interesting. He reads, and we all follow as in a chorus. I am fond of this method. I like it. When the school time is over we go to our hostels. I am very happy in the play ground. We run, jump and laugh. Nothing troubles or worries us. I wish these hours could last longer.

At night I sleep soundly. Next morning the bell rings and I go to the school again.

SALAH-UD-DIN.
9th Class.

---

of themselves. They have a firm belief in their national cause and are ready to make sacrifices for it. In the same way whatever people may think of Nazi-ism and Hitler, the bravery and courage of the Nazis cannot be denied. They possess those moral qualities which are necessary for making a nation great.

I must reiterate that it should not be understood that material resources do not contribute to national strength and prosperity. Material resources are also necessary for the strength and prosperity of a nation, but since the individuals of a nation have to use and handle those resources, the fate of the nation largely depends upon the individuals' moral character.

KAMAL KHAN.

Where?

How happy he was! He imagined as if he were floating in a vast ocean of joy and glee, while he was packing his luggage to leave for his home by the next train. He had already sent a servant for a taxi. "Alas!" he exclaimed as he heaved a deep sigh "If I could only fly away to my Kanta," and the pale but beautiful face of his loving Kanta began to dance before his eyes. "Kanta!" he shouted, but who was there to reply? He broke the silence once again by saying "You are ill, Kanta but I must see you."

Just then there was a knock outside. He picked up his suit case and opened the door believing that the taxi had arrived, but to his great disappointment he found the College postman with a telegram in his hand. A chilling horror ran through his entire frame and the suitcase dropped from his hand. "Kanta dead!" he hurriedly read the message, "Alas!" he exclaimed "If I could only see her," but he saw nothing except darkness all around. He fell down unconscious and never rose again.

He met his Kanta; but where?

SAMARENDRA.

A Boon

In order to meet the demands of the intellectual acrobats of our institution and to save a lot of energy now spent in extensive reading we are starting a new book-shop as soon as possible. Books of different kinds will be available, and students of all subjects will find our book-shop a valuable treasure-house of literary gems which have never been published before. We are confident that this enterprize will definitely create the "Alma-mater complex" amongst the students. A few outstanding issues are listed below :—

1. Gandhi—the apostle of Power—Politics.
2. Bernard Shaw—the romancer and poet.
3. Shakespeare as a novelist.
4. Hardy—the Optimist.
5. Budha—the gay.

We are also issuing some literary and scientific pamphlets. We hope they will be welcomed most cordially by our customers.

survive ; it must, before procuring the material requisites of greatness, make its individuals moral. Only then will the nation as a whole, as a unity, be able to achieve success,

By emphasising individual character I do not mean to under-rate collective spirit. On the other hand I believe that the individuals in addition to being honest, brave, stead-fast, unselfish, truthful, determined--possessors of all the moral qualities necessitated by the nature of the national cause, should have a sense of solidarity ; for a sense of solidarity is also a necessary ingredient of the individual moral character. My real point, therefore, is that the moral character of a few leaders by itself cannot bring success to a nation. For instance the prominent Indian leaders of the day may have a very high moral character, but if we desire national strength and prosperity every one of us must have the moral qualities of our leaders.

The leaders of any social organization, or programme or philosophy, do not remain contended with the fact that they have enough of material resources and a good system of regulative laws and principles. They know that the real force which puts into practice those laws and principles and which makes use of material resources is man ; and not a mere man but a man of good moral character. Whatever the type of Government, be it democracy, dictatorship or socialism, it is not due to its principles, laws and theories alone that it is successful ; Its success is principally due to the moral character of the individuals who translate those laws and theories into action. In practical world it is not the laws and principles underlying one system of Government which fight against the laws and principles underlying another, but the individuals who accept those laws and principles. Consequently, it is for the individuals to determine the fate of a nation. Like individuals nations also have to struggle for existence and it cannot be denied that " the crucial test of a nation, as of an individual, is its conduct under hardship and adversity." In such a struggle as this each individual's moral courage, determination, patience to bear hardship and hope to conquer, firmness, belief in the national cause and readiness to sacrifice his all for its sake are severely tested. It is, thus, in the hands of individuals to make or mar the nation.

The present war with all its horrors and disasters has taught many useful lessons to a forgetful humanity. The most useful of these is the reminder that individual character is one of the most important factors in the successful prosecution of a war. Superficial minds call this war a war of resources, factories and materials. But we have seen that Italy had a well organized form of government, large scale industries, well equipped armies and other material requisites which are regarded as th foundations of a nation's strength. But she collapsed and even the powerful support of Hitlerite Germany could not save her from destruction. As long as Mussolini was successful, the Italians helped him. But when the Allies threatened them and bombed their cities constantly their morale collapsed and with it the Fascist State. The Italians lacked not so much in material resources as in those moral qualities which are absolutely necessary for the strength of a nation. Hence their failure. The same was the case with Iran. The mere threat of attack by the Allies demoralized the Iranians and they surrendered praccally without firing a shot. It may be said that Iran could not fight against such heavy odds, but subsequent events showed that the Iranians did not even try to fight.

There is a vivid contrast between these two countries on the one hand and Great Britain and and Germany on the other. The latter have been bombing each other for four years, but each air raid makes their people more determined. Whatever we may think of the British Imperialism we have to acknowledge the fact that the British people possess those moral qualities which are necessitated by the spirit and nature of their national cause. They are loyal to their leader and country. They are confident

professor sat reading the paper while his wife wrote some letters. She asked him the date, but he said he did not know. "You have the paper--just look it up." "But my dear, this is yesterday's paper," he countered.

Another professor put a knot in his son's handkerchief not to forget to post the letter and then himself forgot to give the boy the letter. The story of the professor who hunted through the whole house for his glasses while the article in question was on his forehead, is too well known to bear repetition. Professors' wives—those sorely tired creatures—do not let their academic consorts go out, especially for shopping unescorted. When a passerby told a professor that he had a brown shoe on one foot and a black one on the other, the latter was heard muttering that he had an exactly similar pair at home! At a shop a professor was heard asking for a large handkerchief—one that could take in at least six knots—six knots to memorize six things.

*There was also the one who, catching a midnight prowler in his house, took up a revolver and rang up the police station, but somewhat spoiled the effect by pointing the receiver at the burglar and putting the revolver to his ear. History is silent on the further happening, but I should not be surprised if the revolver was unloaded after all!

Hence I say won't somebody start a Memory Training School with reduced rates for professors—and soon?

CHANDAR.

Individual Character and National Strength

Whenever man tries to trace the cause of a certain effect in nature, he usually picks up one of its many antecedents which has a more dominant appearance than others and calls it "the cause." The remaining antecedents are then clean forgotten. For example: a man's foot slips on a ladder he falls down and is killed. His death will be ascribed to slipping. Take another instance, the success of a political movement is supposed to be due to the personality of a great leader. This may be partly true, but it is not the whole truth. In the same manner material resources, large scale industries, well equipped armies, etc., are considered to be the causes of national strength and prosperity. Obviously, this is again a case of over-simplifying the matters. A deeper insight into the real causes of national strength and prosperity will show that although factors like material resources are necessary for the strength of a nation, yet if the individuals—the stuff of which the nation is made—have a low moral character the material factors by themselves will not make the nation great and strong nor save it from destruction. After all, a nation is but the sum total of all the individuals occupying a territory. Consequently, the quality of a nation will be judged by the quality of its component parts—the individnals. We can never think of a building holding out against the ravages of weather for a long time if it is constructed of shoddy material. The strength and durability of everything depends upon the stuff of which it is made. We do not find any example of a nation or civilization to have existed for a considerable period with individuals of a low moral character. If a nation wants to have a place in the world—order where only the fittest

*Passages marked with an asterisk are acknowledged to P. S. Vaidya's article in *Sarem World*.

Professors Innocent

Daily I scan the advertisement columns of newspapers in the hope of running across something like this :—

" Memomary Training School : The only correspondence school of its type—12 easy lessons on the art of Remembering—highly spoken of by Ministers, Matric Students, Film Directors etc, etc. Write to-day for our free literature, including first sample lesson.

N. B.—Special Concession for Bona fide Professors."

Meanwhile, see what havoc is perpetrated in the ranks of those who have a tendency to forget. Charity begins at home ; let us take the case of Professors.

Newton, of course, tops the list. That he placed his watch in the boiling water and sat staring at the egg, is a legend. In the same category is another professor whose hobby was gardening. Once he purchased a mango plant and as soon as he reached home out he marched into the garden, equipped with a spade to dig the earth. A few minutes later everybody was surprised to see him return beaming with glee with the newly bought plant on his shoulder and the spade planted firmly in the garden ! On another occasion where the same mango plant was bent by a severe storm he went out with a bamboo pole to prop it up. There was still a fine drizzle ; and this time he returned home with the bamboo held up like an umbrella. Indeed the umbrella was helping to keep the mango tree straight.

While on this subject of umbrellas, I am reminded of a glorified member of this fraternity who was seen walking in the rain with a closed umbrella under his arm. He told a friend he had forgotten his umbrella at home. The friend humorously asked when had he discovered that. Said the Professor, " When the rain stopped, I put up my hand to close the umbrella, but there was no Umbrella over my head and so I discovered that I had forgotten it." And all the while, mind you the umbrella was hanging from the crook of his elbow.

Another member of this absent-minded profession once came home bare-headed. His wife sent him back to find out where he had left his hat. He spent the rest of the day going from shop to shop inquiring whether he had been there that day previously. Next day, the story goes, the boy from the barber's shop brought in his hat.

*Still another worthy gentleman of the same calling visited the Lost Property Office to claim an umbrella which he had left in a train. He got it, thanked the man incharge, paid the dues and walked out—this time forgetting his rain coat.

Professors' families have to put up with a tough proposition. One professor was roused from his reveries by his wife reminding him that it was exactly twenty five years from the day he proposed to her and they got engaged to be married. The children stopped play and looked curiously but the old man's reaction was, "Good God ! then let's go and get married." At a party a professor met a lady who said, " Do you remember we ....you once asked my hand in marriage ?" " And did you accept me ?" The professor naively asked. Going to a friend's house for dinner another such wool-gatherer was asked by the hostess, "But why didn't you bring your wife along ?" " O " said the guest, "I *thought* I had forgotten *something*."

At a game of tennis a day-dreaming gentleman of this species was full of praise for his partner. " Do you know," he at last remarked, " I have an idea, I have seen you before somewhere......" His partner was his only daughter. After dinner one

everything is subordinated. Education must regard man as a spiritual entity, an individual creative force in the world, a soul and not merely as a biological entity, a social animal or a thinking machine, an object of wonder as Hamlet says, "What a piece of work is man! How noble in reason! How infinite in faculty. In form and moving how express and admirable! In action how like an angel! In apprehension how like a God! The beauty of the world! The Paragon of animals!"

Buddha, Jesus, Muhammad—all the great founders of religions were whole men. They had a contribution to make to their own and succeeding generations. Guru Arjun refused to save his life by conforming to the accepted dogma. The courageous stand of these noble souls against reactionary forces was one of the most potent factors in the progress of humanity. The world needs prophets and torch-bearers—inspired leaders who will stand for the forces of spirit against extreme materialism, who will reinforce the soul of man and enable him to act up to the possibilities of his nature. We need them now more than ever and a vast field of activity awaits them so vast that everyone can have a place there and play the game of life!

Man may be conceived in many ways. As a physical organism he forms a part of the organic and inorganic natural realms. As a human being he belongs to the realm of persons. As an intelligent being he has his part in the realm of mind, finally as an immortal soul he belongs to the realm of the supernatural. Thus body, mind and soul is what goes to make a whole man. Education makes teaching a great spiritual adventure. It teaches manhood-forming instead of knowledge-mongering or wrestler-making. It would be imaging the whole and not the parts. We apprehend the wholeness of man as we apprehend the wholeness of a symphony and not by hearing the instruments in the orchestra one by one. In the same way the wholeness of human music needs the whole orchestra of human sciences to reveal it.

Analysing is simple and every one can efficiently do it, but when one comes to synthesise this whole man seems to baffle him. Greeks were good at synthesis, but the material they could command was insufficient. The division between material and spiritual is the result of analysis. It splits the world between God and Mammon, between the Kingdom of Heaven and the Kingdom of Earth. The synthetic idea would be a United Kingdom of Heaven and Earth. Jack defines this whole man as primarily and essentially a citizen in the United kingdom of Heaven and Earth, his body, mind and soul inseparably one and never to be independent of one another.

We cannot leave the whole man without assigning him some work, for then he will be restless, unhappy and discontented, craving for something to do, for self-expression. We must always remember that the self he craves to express is the whole self. Only by creation can he express it. But what will he create. "The real value," is Jack's answer, "as a born Creator, then, education will take him in hand. To train him for his grand vocation as Creator of Value—that will be the loadstar of practice, the final standard to which all our methods must contribute." For this creative activity there should be a driving power and that can be found in the love of beauty, innate in everyone, but suppressed smothered, thwarted in most of us—a deep hunger which is tendering millions of unsatisfied lives utterly miserable at the moment.

There is no other type of education better than this as it emphasises and objectivates the sense of proportion and beauty, the heroic temper, the philosophic mood, the keen relish for high enterprise and the joyful love of life, the realization of the Good, the True and the Beautiful—as the Creator in the realm of United Kingdom of Heaven and Earth.

N. N. DUTTA.

multitudes I include myself as one of the most needy." We all agree with Mr. Jacks that all this misery, ugliness and unhappiness can be replaced by the good, the true, and the beautiful, if we educate the individual as a whole man and not as a jumble of conflicting aspects and incoherent parts. We must aim at the whole man. At present we operate upon our pupils in sections. We have subjects but no unifying object—just like uncoordinated chapters of knowledge. There is one responsible for training the mind in the class room. For the training of our muscles, we have trainers more ignorant than the trainees. Then there is the Chaplain, the Mulla or the Pandit to look after our souls, and so on. In all this piece-meal procedure one thing is constantly lost sight of—the whole boy, who is mind, body and soul all in one. Mr. Stephen Reynold in his book 'Seems So' writes, "you may learn summut at school, or may not; precious little o'its any use; but I reckon, you learn manhood and womanhood after you leave school and the sooner you begin to learn this the better. Education is the biggest fraud ever forced upon us.' So we must find out the true education!

Dewey's main concept of education is that reconstruction of experience which adds to the meaning of experience and increases in us the power to control its future course. Over and above this there is the regeneration of spirit. It is the development from the original nature of man with its tendencies, urges, drives formed and disciplined by experience of life under the control of principles formulated in accordance with the highest conception of his nature and destiny, but the principal agent in this reconstruction is the individual himself—the whole man. He is the master of his own fate, the captain of his soul and so all this takes place by self-activity.

L. P. Jacks was once impressed by a profound remark made by a speaker: "We will not keep our beautiful England until we get beautiful people to live in it." Jacks in explaining the remark says, "He meant simply a people whose bodies had been liberally educated to correspond with the liberal education of the mind and to support it at every point. The eye trained to see the beauty and to value it, the ear trained to hear harmony and to resent discord, the hand trained to a fine craftsmanship. The whole man, mind and body together to creative activity—along the lines of the True, the Beautiful and the Good.

To multiply 'beautiful' persons on the face of the earth, to people our native land with them and to help other lands to people theirs is the final aim to which our lesser aims should lead us. This is Socialism. The Socialism as worked out in Russia or elsewhere is bound to fail unless it is preceded by socializing education, and unless we get the whole man and the whole woman. And unless we evolve this wholeman, happiness will not be realized and the suffering of the world will increase by the overgrowth of misfits. In this case the Creator Himself will have a difficulty in recognizing his own image. "Let us turn our thoughts," says Jacks, "to the whole man and take him or at least the idea of him, as the loadstar of educational practice and fairly tackle the problem of multiplying beautiful people on the face of the earth."

A sound mind in a sound body is alright but is it actually found? We don't want gymnasts in the extreme sense, whether mental or physical. What we want to aim at is a proper blend of the two.

Education will lose itself in futility and educational practice will lose itself in mere devices or techniques, if the nature and destiny of man is not frankly faced. Man is the supreme being in this world, for whom everything exists. He is an end in himself and not a means. Kant's advice should be welcomed by all teachers, "So act as to treat humanity whether in thine own person or in that of any other, in every case an end withal, never as a means only." Civilization cannot be the final end of education, nor social efficiency, nor knowledge, nor culture. To man

One can realize how happy and free a boy feels the moment he is out of the school. Having been subjected to the tyranny of the cane and constant reproach for ten years, the boy, when he comes out of the school, wants to be good and kind to all. But when he goes out into the streets in pursuit of this aim the most he can do is to stop children playing marbles, or to separate two kids at fight. This makes him see the uselessness of his philanthropy and he turns to the more interesting affairs of life. In most cases what happens afterwards is like this. Our young hero, who is wandering about, moodily, in quest of chances and places where he can show his generosity and goodness, all of a sudden bumps against a girl. He comes back to himself. All thoughts vanish, and the thing that he can see is a woman, at least ten years, older smiling (maternally) at him. He instantly falls in love with her and may be often seen going about or standing at the place where he had collided with her. Unfortunately the dame never passes that way again. In utter despair he stops thinking of her. But he has got into the habit and having got into the habit, he falls in love with another good looking girl who comes across him. From one thing to another, and if the young gentleman is not sent to a college, you soon find him a philogynist, not to say a philanderer. This is one way in which a fellow out of school behaves. But there is another way also which, is with due deference to the Dar-ul-Ulum, another way of putting the good old phase, 'Out of the frying pan into the fire.' Not that it is fire for him, but for his parents it definitely is. This conflagration consumes all the financial resources of the family but the boy must be kept at the college. The self-denying generosity of the father cannot keep pace with the squanderings of the son for long. The father decides to put him into some trade. The son, who is about twenty by this time, is very much depressed and threatens to leave the home. The father seems delighted and so the son has to give it up He begins to lose his faith in God and writes poetry against Him, cursing Him in his compositions for being so unkind to him. He turns atheist.

So from a philanthropist to a philogynist, and from a philogynist to a philanderer and thence on to nympholepsy. Whither next? Much as I would like to discuss it—I feel that I have already over-taxed the reader's patience. So I close the account in the hope that our hero will not turn a political leader in the end.

A. HAMID.

Education of the Whole Man

If humanity ever wanted help it needs now. If you care for the suffering multitude, if you have any pity for the down-trodden people, it is time for you to come forward. In the good old days it was different but the twentieth century stands with its mouth wide open, with hungry red eyes emitting fire, ready to devour the misfits. It is very hard to live, to breathe in a peaceful atmosphere. Life is complicated, and it is growing all the more intricate with an unending series of diverse problems. The pace of events is so fast that only the ever-alert can hope to keep themselves in a steady poise. 'Let the unfit perish and the fit survive' is the world slogan, but despite the scientific appearance of this creed it is the unfit who survive. The main factor responsible for this unfortunate development is the present educational system. As Mr. Coldwell Cook says ; "The educational system has in fact not been evolving at all. It has been congealing and now it has become clogged, stuck fast. The educational system has ceased to be educational; consequently we cannot look for reform through minor adjustments. The suggested improvements of which we have heard do not go to the heart of the matter. We must have an upheaval." Hence a revolution in education is inevitable.

"Who needs education more than the educator? Who needs it so much?" says L. P. Jacks, "whose education has been neglected at the vital points? Among the

A few female names here and there serve only as exceptions to the general rule of the subordination of women. It is true that a woman's real field is her home, but she can make her home comfortable and charming only when she has had some connection with the world in which she lives. A few brilliant female names will never make up the deficiency of the whole female sex. We must emancipate and enlighten our womanhood by restoring them their lost position and status. It is time we got rid of unnecessary restrictions and gave woman a say in the government for which she has been asking for long. The joint rule will surely prove more successful when the country wins her freedom.

S. P.

On Leaving School

It is related in one of the legends which illustrate the history of Buddhism that a disciple once presented himself before his master, Buddha, to ask permission to go out into the world and preach the message the world needed so badly. The compassionate master drew a graphic sketch of the obstacles in the way and the risks to be run. Pourna, as was *the name of the disciple*, tried to answer every question and Buddha being satisfied as to the fitness of his disciple sent him into the world with these memorable words: "Go then, O Pourna, having been delivered, deliver; having been consoled, console; having arrived thyself at the farther bank, enable others to arrive there also."

It was eminently a moral deliverance of which this great prophet of the East spoke. It was a deliverance from the evils of pride, sloth, anger, greed and selfishness, which bring about the moral degradation of man. But there is another deliverance hardly less important—the deliverance which provide us an escape from the cane, the harsh language and the 'stand up on the bench'. Such a deliverance which is so necessary for a full and free life is to be had only when one leaves the school.

I know, as all do know, that schools are the training ground for childern, but in practice schools are not only the training ground but also the firing range. Training is all right inasmuch as it makes the boys do what they should and teaches them not to shirk work, but firing is no part of the agreement; and in contravention of all humane principles, young boys are beaten so cruelly in schools that a weak-hearted man like me must necessarily collapse.

Goldsmith has said in one of his poems that a teacher knows little but pretends to be a scholar. This little knowledge that he has, he tries to force into the immature brain of the boy all at once. In this venture he fails and in consequence the poor student receives a hard beating. The school teacher often reminds me of the story of a German doctor who once happened to visit England. He was sitting in a train when a lady came in. There being no vacant seat in the train, and the doctor being very courteous by habit, got up from his seat and very politely offered it to the lady, saying at the same time 'shut up'. All other fellow passengers started laughing, and asked the doctor how he had picked up those words. He told them that once an Englishman had visited him in Germany and when his (the Englishman's) dog started barking the Englishman had said 'shut up,' and the dog sat down. From this the doctor concluded that 'shut up' meant sit down. This amusing explanation brought another fit of hysterics over the tram.

Similar is the case with the school teacher. He knows so little that he would be laughed at even by a man of average intelligence. But at his school he passes as a clever man and is happy in the fool's paradise of his own making.

The Influence of Women Upon Indian History

If we cast a glance at the ancient and medieval history of the world we shall find that women had but little influence upon the course of history. It is only in comparatively recent times that we come across female personalities whose names will go down in history with respect and admiration. England can rightly be proud of her Queen Elizabeth and Queen Victoria, and the part played by Florence Nightingale in the Crimean War may be compared with the highest achievements of some of the greatest of men. The French women can hold up Joan of Arc as the supreme example of determination and patriotism, while the Russians may regard Czarina Catherine as the greatest woman who ever graced a throne. The twentieth century has brought the women in Europe to the front and they are working as hard as ever to win fame and glory for their respective countries.

The influence of women upon the course of Indian History has been practically nil. In India the people have always believed that womam has only one duty to do and that is to look after her home and children. She as a member of the fair sex should never trouble herself with the coarse work of government or bother herself about the not-always-clean game of Politics. In ancient times the people did not shrink even from killing their daughters, as they were considered as something to be ashamed of. During the Vedic Period women did have a little voice in the government, and the girls were allowed a little freedom in choosing their husbands, while widows had the right to remarry, if they desired. At the hey day of Buddhism, there were many women who went out as missionaries of the new cult. Asoka the Great sent his own daughter to preach Buddhistic doctrines and convert people. In fact during the early Hindu Period women enjoyed very real freedom and were not subjected to many of the restrictions which became so common later on. But the record of the Muslim Period is very dismal in respect of granting liberty to women. Muslim women hardly played any part in the government of the land and the number of eminent Muslim women whose names have come down to us is disappointingly small indeed. Razia Begam was the first Muslim woman who had the opportunity of succeeding to her father's kingdom. No Indian woman can forget her name. She was no less able than any of the ablest men of her time. Her bravery has become a by-word and women may be legitimately proud of her. But fate, and the jealousy of men, did not allow her to display her talents for long. Her only fault was that she was a woman, and the Indians especially the Muslims could never bear the rule of a woman. She was ruthlessly stabbed to death by her own officers.

The Mughal Period has produced some notable women who are a pride for their country. The name of Rupmati in the reign of Akbar is unforgettable. She did her best to save the throne of Malwa but could not stand against the might of the Mughal Emperor. Her end was as heroic as her life; she committed suicide when there remained no alternative left to her to save her honour. Nur Jehan and Chand Bibi are two other names which have left a lasting impression upon our history. Nur Jehan played an important part in the reign of Jehangir. The policy of the state was entirely directed by her. She appeared in the court along with her husband and sometimes decided very difficult cases of law. The name of Chand Bibi will ever be remembered for the brave and gallant way in which she defended the Bijapur fort which fell only when she was killed. Since her time we find no Muslim woman whose name is worth mentioning. The History of India closed its pages to women.

ascending up a shoulder of a maintain we camped at Kamri rest-house (10850). Next morning the sky was clear and we started for the Kamri top very early for we were told that after 10 o'clock clouds gather round the Nanga obscuring it from view. The continuous ascent taxed our energies considerably. To reach the summit of the pass (14,000 feet) a narrow path on snow over a steep cliff had to be crossed. When the first fright was over we found walking on the soft snow quite safe and kept walking up and down the slope for sheer fun. The mighty, unconquered Nanga, all covered with snow, was glistening in front of us under the bright sun. Now a speck of cloud marred its beauty. The spectacle was magnificent; the snow-covered ranges which had so far loomed high and large now appeared to be but meaner heights as we looked down at them from the Kamri top. We lingered as long as we could till the breeze from Nanga grew fierce and cold and drove us back down to our camp at the Kamri rest-house.

Then retracing our steps we reached Srinagar on the 9th July. At Srinagar we camped in the Chinar bagh for 3 days. On the 11th we visited Gulmarg (8200 feet), 26 miles away, but the visit was marred by an untimely shower. On the 12th we again visited the Moghal gardens of Srinagar. This time we went through the Dal in a donga boat which moved in a slow but fascinating way. There is a sense of comfort in the journey as the whole house is moving along and the food is being cooked on the way. Next day we visited the Karan Singh Woollen Mills and other workshops of Kashmir craft.

On the 14th we proceeded to Pahlgam (7200 feet)—62 miles from Srinagar, where we stayed in an hotel for three nights. Life at Pahlgam was enjoyed immensely by the whole party and we were able to see all the routes that diverge from Pahlgam. On the 15th we went to Bisern. The following morning we made an early start for the Twilian lake (about 12,000 feet). We did the ascent of over 4,000 feet in seven miles in a remarkably short time and reached the Twilian village in good spirits. For about 200 feet of its length the bend of the road leading from the village to the lake was covered with a sloping mass of hard snow, out of which gurgled forth a stream. We passed an exhilarating hour over it, cutting steps in the snow under a peltering shower and moving inch by inch forward dangling between life and death. But none of us lost courage, and we felt immensely superior to a party of Americans who gave up the attempt. After passing the snow we climbed up huge boulders with the feeling of a victorious detachment, though we looked like tiny specks in the wide expanse of white snow. The lake presented an unforgettable spectacle to the eye: the water was of a rich azure hue with icebergs floating in it against a back ground of dark glaciers. On the return journey Qaiyum, unwisely attempting the snow without cutting steps into it, slipped down the slope and escaped death by a narrow margin. We had another anxious hour on the downward journey when Faqir Hussain was lost in the thick jungle for a while. The day had been full of real adventure.

The next day we were in a bus bound for Jammu. The journey to Qazi Kund (6000 feet) was along the Liddar up to Islamabad and thence on along the foot of the Pir Panjal range which we climbed. We had the feeling of being in an aeroplane from which we were looking down the entire valley right up to Srinagar, 40 miles away. After attaining an altitude of 9000 feet we descended to Banihal. The road now wound between mountains along the Chenab the beauty of which has inspired the Panjabi bards with many a sweet song. Leaving the Chenab behind at Ramban we climbed up to Batote, a beauty spot with houses scattered about in the jungle. We passed the night at Kud, a similar place on the other side of the mountain. In the morning the bus had simply to roll down from Kund to picturesque but sultry Jammu where the party broke up and everyone proceeded to his destination by rail with its usual discomforts and problems of entraining at junctions like Wazirabad.

ZIAUD DIN.

and his lively talk during our stay at Srinagar will haunt our memories for a long time to come. We hastened to the Mughal gardens—the Nishat, the Shalamar and the Chashma Shahi, which are crowded with holiday makers on Sunday afternoons. We had a lively time amidst a gay but decent throng of people from all over India. Next morning we climbed the Takht-i-Suleman, a hillock near Srinagar which has an ancient Shankra Acharia temple. From here one can have a panoramic view of the whole city and the valley on all sides, the lakes—Dal and Anchar—glittering in the bright sun and the Jhelum curling smoothly down the valley to rough beds beyond Baramula.

In the afternoon we went in Shikaras (small boats) down the Jhelum from Amirakadal to Chattabal below the seven bridges which connect the city. At Zainakadal, the fourth bridge, we stopped to visit the Juma mosque, a magnificent building erected by Sultan Sikandar, the Iconoclast and dating back to the Mughal period.

The next day was spent in purchasing provisions and making other preparations for the trek. On the 30th June we started by bus for Bandipura. We skirted the beautiful Mansebal lake near Sunbal and had a delightful view of the expansive waters of the Wular along whose banks we travelled for more than ten miles. In the afternoon we camped at Bandipura and made arrangements for pack ponies.

Next morning we started merrily, and passing Sonarwain, two miles beyond on a level road, we reached the foot of the Tragbal mountain which was to be climbed. The climb along the short cut was very hard. We had to go up four thousand ft. in 3½ miles. As we climbed to the top the Wular appeared to be lying at our feet; but the ascent was hard and we were out of breath and geatly tired when we reached the Summit, Tragbal (9840 ft. above sea level). We camped here, but were informed that thieves visited the spot at night. So, we were on the alert, but a theft did take place in the camp of some Englishmen nearby. A coolie was relieved of his blanket and the Englishman was deprived of a bag of rice. An alarm was raised and we hastened towards the place of occurrence, but the clever rascals had made good their escape into the thick jungle before we could be of any assistance. The next day's march was up an incline covered with thick jungle for four miles and then for a couple of miles over a flowery meadow covered with patches of snow. We cleared the Rozdani pass (11936) in good spirits, cheered by a cool breeze and gathering clouds. The next nine m es down to Khoragbal (8408) were an easy slide down steep short cuts. We camped at Khoragbal under a brisk shower. A short walk next day brought us to Kazalwan where the road meets the Kishenganga and runs along it for serveral stages. To the right side of the road are thick groves of poplars, walnuts and pine trees, and on the left flows the lusty stream. After three miles when we cleared a bend we were surprised by the excellence of the scenery which was too good to be watched in passing. So we stopped for a while to marvel at its beauty. A crystal clear spring poured its waters into the turbulent Kishenganga. The rainbow trout could be seen curling their supple bodies in playful pranks. Before us was a large grove of stately poplars followed by a meadow, unrivalled in the richness of its verdant grass and studded with yellow cineraria. This was Badwan, an emerald set amidst lofty mountains. One of us described it as a "corollary" to paradise. After a short halt we reluctantly pushed forward in the valley which now widened. We passed Gurais Fort and bridge and camped at Chorwan after covering nineteen miles that day.

From Chorwan the route into Telil valley diverges from the main Gilgit route. But we were informed that this route was not open yet and we would have to return the way we had come after completing our programme of seeing the Nanga Parbat. Next day we went up to Zain. After covering two miles of level ground and then

to each group. At that time people were obsessed by the new wonders of machinery, and so they were very much pleased with this idea which as they said was to 'apply the principles of the steam-engine to education'. But of course you can't do that. If you could, we could do it much better now by means of wireless and the gramophone. We could eliminate the teacher altogether and have a complete course of instruction on gramophone records. But this is impossible because the personal relation of teacher and pupil is the most essential part of education.

When we have grasped the fact that the teacher is the most important factor, and theories are no good unless he can make them come alive, we can consider what really is the use of educational theories to the teacher. I have said that the teacher's personality and enthusiasm are all important. But personality and enthusiasm cannot live on nothing, they are liable to die if the teacher's life is a monotonous grind with no new interests. To know new theories of education is bound to help the teacher to keep alive his interest, to broaden his view and stimulate him by showing him new possibilities in his work. I think that teaching can be either the dullest or the most interesting work in the world, and the thing that makes the difference is whether the teacher is able to keep alive his interest and never settle down into a groove.

I have said that the teacher must have interests of his own and be mentally alive if he is to kindle any spark in his pupils. The conditions of a teacher's life sometimes make it difficult to keep alive one's interests. After being in college where there are discussions and new ideas, a teacher perhaps goes to some small town or village where there is little educated society and no interest in intellectual matters. It may be very hard in such a place for the teacher to keep his interests alive. Yet it is vital that he should do so, and worth a good deal of effort. It will help him to have studied educational theory so that he can think about his work and take a real interest in it. Also he should regard it as part of his work to contribute to the life of the community in which he lives. There are few places where there is not some possibility of an interesting social life, though you may have to start to make it yourself. You may be one of the few educated people in that community. So it will be up to you to see if you can stimulate any sort of mental interest among the people there. If you can, you will be rewarded by finding that it keeps your own mind alive. There are also various ways in which you can make the school become a real part of the community, and make the children feel they are members of it, and the other people feel that the school is part of their town and they should feel interest in its welfare.

So the gist of what I want to say is this ; use theories, use the books you read and the discussions and lectures, and after you leave college use any means you can, to keep alive your interests and go on developing them. By doing this you can be a most valuable element in the country's life.

DRUSILLA SCOTT.

A Glimpse of the Nanga

This Year's Hiking party consisted of Faqir Hussain, Sajjad, Quyium, Firdaus, Nabi, Dost Mahmud and Quddus and myself with Madari as the servant.

The party was scheduled to start by bus from Havelian on the 26th June, 1948. The train arrived punctually and we took our seats in a comfortable bus. On the first day we stopped for about an hour at each stage—Abbottabad, Mansehra, Ram Kot, and Domel—and passed the night at Uri, an open spot at this end of the Kashmir valley. The next day being Sunday we made an early start. As we were enjoying the drive on the road past Baramula, with its lovely avenue of stately poplars, we met Mr. Abdul Qayum Khan, Bar.-at-Law, who was good enough to take us to his house at Srinagar. He entertained us sumptuously

When you read the history of education, you find the great educational reformers gradually discovering the importance of the child's own personality and his own spontaneous activity. This has to a large extent revolutionized and greatly improved teaching methods. But now all this is common knowledge, and anyone can talk about freedom and self-expression in education, and about letting children develop freely, as though this were quite an easy thing which had only to be known to be applied. Then these theorists may criticise teachers and call them old-fashioned because they don't seem to understand all this about freedom and self-expression. On the other hand the teacher may feel that all that sounds very fine, but he wonders what it has to do with the actual tiresome children he has to teach.

The teacher may feel more inclined to listen to Dr. Johnson, who can be trusted to state the plain matter of fact without any fine theories. This is what he said about education. 'Everyone that has ever undertaken to instruct others can tell what slow advances he has been able to make, and how much patience it requires to recall vagrant inattention, to stimulate sluggish indifference, and to rectify absurd misapprehension.'

This feeling of the teachers about the theorist is sometimes justified. I think some theorists on education have not enough experience of the actual difficulties of teaching. There are other theories of education you will read about, which have been tried out in practice, but in rather special conditions. They are like experiments done in a laboratory with carefully arranged conditions of temperature and so on. This does not mean that they are not valuable; they may give very valuable indications of the ways in which education can develop, in the future. But it does mean that they cannot be applied immediately in the ordinary conditions in which most teachers work.

To take an extreme example of this kind of experiment. there was an experimental school once started, with the idea of letting the children learn by free self-expression. I was told of a day at that school when at the midday meal one child started throwing food about. At once the teacher, instead of stopping him, encouraged the others to do the same, and there was a competition to see which child could throw a potato high enough to hit the roof. Well, that may have been a valuable experiment, but the teacher who tried it in an ordinary school would lose his job.

Well, we have seen various ways in which theories of education seem rather far from practice. But we have not got to the point of why you can't have theories of education which you can just learn and apply. Why can you not be taught how to do your job? The answer is of course the personality of the teacher. This is the most important factor in education, and this is chiefly what comes between theory and practice. If someone is designing an article to be made in a factory, he can reckon that if his design is workable the finished article will be turned out exactly as he intends. But the designer of theories of education has to reckon with the teacher, who is not like a factory hand doing mechanical work. The teacher who has to put the theory into practice has to translate it into terms of his own personality, and if he cannot do that the theory is useless.

The new idea that the child must learn from his own spontaneous activity clearly has much truth in it. The same sort of thing has been said by Iqbal, who believed that the aim of education must be to awaken the self, to start it off on its own quest, so that it grows by its own initiative. This is true but it is a difficult truth which each teacher has to rediscover for himself. It is not a magic formula which at once changes the nature of the teacher's work.

If the teacher's task is to awaken the child's own personality, this can only be done by a teacher who has personality himself. There is no mechanical means of doing it.

You may have read about a system of education which was invented in England in the early 19th century. The idea was to enable one master to teach hundreds of boys at the same time, by arranging them in groups with a monitor to pass on the instruction

on 'Plant Life' and Prof. Minhaj-ud-Din spoke on "Things are not what they seem". Another useful talk was given by Dr. Macpherson on 'Moral Hygiene.'

The Sarhad Educational Society.-- Dr. E. A. Pires and Mr. Ghulam Ahmad continue to be the President and the Treasurer respectively. Messrs S. S. Bedi and Shyam Lal Bangru have been elected Vice-President and Secretary. The society is busy doing its usual work unostentatiously. Several symposiums and debates have been held. Some of the subjects for debate were

1. 'Teaching is an Art and not a Science'.
2. 'All Teachers should be married'.

Amongst the speakers from outside, the most prominent was Mr. K. G. Saiyedain—Director of Education, Jammu and Kashmir State. His extremely interesting and illuminating lecture was very much appreciated by all. Our new Professor of History, Qazi Mohammad Farid gave a discourse on 'Mental Culture in Education', while Mrs. Scott read a learned paper on 'Educational Theory and the teacher' (published elsewhere in this issue in an abbreviated form).

The Oriental Society continues to have Mr. Nafis-ud-Din as its President. Messrs. Ihsan-ud-Din and Bahadur Shah are the new Vice-President and Secretary respectively. Apart from holding two mushaiars which produced more noise than poetry, this Society which was once second only to the Khyber Union in activity and popularity, has done precious little.

The Day-Scholars Association has as usual gone into deep slumber after holding the annual elections with great celebration. Mr. Nawazish Ali and Khalid Qasim are this year's President and vice-President respectively. The Secretary is Abdur Rashid. We hope that the Society will try to do something more useful than the mere holding of periodical elections to justify its existence.

The Sarhad Agricultural Society appears to have met only once to hear a lecture from Mr. A. A. Farooq on "Credit in Agriculture". Presumably, the *Kheti Bari* people have no taste for evening lectures after the day's heavy work, and they are, therefore, contented with the minimum of activity.

IJAZ.

Educational Theory and the Teacher

(A talk given to the Sarhad Educational Society)

I want to talk about the connection between the everyday work of a teacher, and the theories of education which you study as part of your training course. One might think that the connection is obvious enough ; here you learn how to teach, there you go and apply what you have learnt. But it is not so simple as that. In most subjects there is some gap between theory and practice, and in education I think the gap is a wide one. It is not always easy to see how some of the theories of education which you study are related to your own work at all, and because of this the teacher may lose interest in theories altogether.

What is the nature of this gap between theory and practice in education? There are several things that cause it.

Switzerland. Khalid Qasim played Hitler with astounding success, and was easily the most outstanding performer of the evening.

We are glad to say that two of our speakers, Nasim and Bedi, who participated in intercollegiate debates at Delhi won the trophy at the Hindu College. We trust others will be encouraged by their success and some at least of the freshers will make a bid to capture the Union platform.

Majlis-i-Islamiyat.—The Majlis has been very active this year. Kamal Khan a member of our editorial board is the new Secretary, while Maulana Nur-ul-Haq and Mr. Mohammed Aslam continue to be the President and the Treasurer respectively. A series of sermons on 'The Appeal of the Holy Quran,' was arranged in which Mr. Pir Bakhsh Khan, Malik Khuda Bakhsh, Advocate General, N.-W. F. P. and Mr. S. M. Idris were invited to express their respective points of view. Another series of sermons is now proposed on "Islam and Socialism" for which some well-known speakers of the Province are being invited to address the students.

In order to promote interest in Islamic theology, the Majlis has offered a scholarship of Rs. 10/- p.m. for a year to the student who stands first in the theology competition. The scholarship has been endowed by K. B. Haji Kuli Khan.

The Khyber Athenaeum is maintaining its last year's tradition of brisk activity under the Presidentship of Mr. M. M. Kaleem. Habib-ullah and Firdaus Khan have been elected as Vice-President and Secretary respectively for the session. At the instance of the President, the Society has started a separate Art Section comprising a picture gallery and a Curio-museum, and in view of her special talents for fine-arts. Mrs. Scott has been elected President of this section. With such happy patronage the Art Section holds promise of a bright future; and we can hope to see, at an early date, a museum in one of the side-rooms of the Cunnigham Hall decorated with specimens of the Frontier arts and craft. The Athenaeum has planned a busy programme of lectures and socials, too. We have already had three very interesting lectures, one by Prof. Hadow Harris on Scottish Poetry, another by Prof. S. M. Timur on 'The Organic Unity in Art', and the third one by Mr. G. C. Martin on 'The Novel'. All these lectures were very successful and drew large audiences.

The Dramatic Club has already set to serious work. At the very outset, a Declamation Contest was held to discover hidden dramatic talent amongst the students. The response to this move, however, was not very encouraging, as very few students came forward to compete. Naseem was awarded the first-prize in the contest.

This year the defunct Urdu Section of the Dramatic Club has been revived and placed under the experienced charge of Mr. Inayat-ullah who will no doubt, revive the old glory of Urdu drama. Mr. Bashir-ud-Din, the director of the English section, has started in earnest after last years' somewhat discouraging experience. A reading of Shakespeare's Julius Caesar was recently arranged which attracted a big audience. It is proposed to stage this play sometime, and at least one more.

The Sarhad Mathematical Society.—Pir Mohammed has been elected to the secretaryship of this useful society which encourages the study of Mathematics by providing all the students with free books on the subject. The Society proposes to hold a series of debates in which the votaries of Mathematics will speak on various aspects of the subject to dispel the "ghotoo" impression which others have of them. The Secretary promises a grand annual function. Let us hope for the best.

The Frontier Scientific Society. - The office bearers for the current session are:

Mr. Sher Ahmad Lodhi : President
Mr. Mohd. Ahmad : Treasurer
Mohd. Hussain : Secretary

The Society, according to the Secretary's statement, has arranged several talks by different speakers on interesting topics. The President, Mr. Sher Ahmad, gave a talk

best local teams. The departure of Amanullah, Aziz and Azizullah was a sad blow to our side but Bali and Latif, two newcomers, have made amends. With Abdur Rehman Gariftar as the new Captain, we had a pretty strong side and were confident of reaching the finals very easily. We made a good beginning and won the first University match against the Edwardes College by 3 to 1. Unfortunately we lost the second match against the Gordon College, Rawalpindi, most unexpectedly. Two of our players Akhtar and Abrar have been selected for the University A and B teams respectively.

Hockey.—Our Hockey team played very well and made an excellent show against the Edwardes College on the first day. But unfortunately we lost the replay on the second day after a very contested game. Jagdish Singh, our full-back, Arif and Nabi, our forwards, and Shamshad our goal-keeper played well. Janab Shah is captaining the side this year.

Tennis.—It is rather curious to find only first year students in the tennis lawns these days, as if the game were specially reserved for the freshers. But their enthusiasm for the game encourages us to hope that when the veterans have gone out, they will be fully qualified to take their place. Mr. Abdul Ali, the captain, and Mr. Fazli Mahmood are likely to constitute the pair against the Edwardes College in Col. Keen Cup Tournament, and we hope to win the match as usual.

Cricket.—This year our Cricket team played many friendly matches on the College ground and won most of them. We played our first University match against Government College, Lyallpur and won it by an easy margin of five wickets. Safdar a new member contributed 46 runs and was the top scorer. We played the zone final at Lahore against P. O. W. College, Jammu and unfortunately lost. Hameed our Captain, has done uniformly well in all matches. The annual match between the Cricket XI and the staff club was a great success and the Arts vs Science match, a new event produced such a good fun that it is perposed to retain it as an annual feature.

Athletics.—Mr. Iqbal Qureshi takes over the captainship from Khawaja Rasheed. All the athletes turn up for daily practice on the field where they get useful instruction. We hope they will do well against the Edwardians in the forthcoming Provincial Inter Collegiate Athletics meet. Khawaja A. Rasheed participated in the Rawalpindi Olympic meet and won the 120 yds. high hurdles.

Boxing.—S. A. John is the new Captain. This year we have a good team and we hope that it will do well in the forthcoming University Tournament.

KAMAL KHAN.

College Societies

The Khyber Union.—The elections of the Union helped us a lot in dispelling the dreamy atmosphere which had prevailed during the summer vacation. Messrs. Abdul Ali, Dost Mahmood and Abdur Rehman Shah were elected as President, vice-President and Secretary respectively. The new cabinet was installed in office on 24th October. In his inaugural address the President praised the excellent manner in which elections had been conducted this year, and promised to provide ample opportunities for bringing out the hidden oratorical talent. Unfortunately, due to the illness of the President the Union has not been very active this year. So far we have had only one debate, the subject for discussion being: "It is better to be educated than to be rich". The Union has also staged a mock trial of Hitler which was a very interesting feature. Apart from the somewhat boring and flat speeches of the pleaders for and against Hitler, the decision given by Lord Humanity was very amusing; the verdict passed against Hitler being that he should get married and settle down peacefully somewhere in

like you to be concious of this fact all the time that you are in the College. The character and virtues which men have looked up to in all ages and countries are the simple and straightforward ones which are known to all of you—honesty, truthfulness, generosity, kindness, and justice. These things require learning just as much as your text-books, and it is my hope that you will acquire them while in this College.

I would recommend also to you the opportunities which the U.T.C. affords you of training your minds and bodies to the habits of disciplined and cooperative effort. Whatever the future constitution of India may be, there will always be a need for officers from this province in the armed forces; and even if you do not seek a career in the army, navy, or air force, it is well that you should know something of military science and it is very desirable that in these days and in the future you should learn the elements of self-defence and national defence which the U.T.C. will teach you.

Finally, this is an Islamia College, and the great majority of its students are Muslims. I hope they will be good Muslims and live by the highest tenets of Islam. You should not only visit the mosque to say prayers, which I hope that all Muslims will regularly do; but you should pay heed to the sermons which are preached in this place each Sunday and try your best to grow up into good Muslim gentlemen. The results of Theology examinations will be considered a part of your College record.

Before I close it is proper to remember in this meeting of the staff and students His Highness Sir Nasir-ul-Mulk, Mehtar of Chitral, who died suddenly during the summer vacation. He was the most distinguished old boy of this College, and was an honour to the institution where he studied. He was Chairman of the College Governing Bodies, and in him the College has lost a true friend and his country a good and just ruler.

Round the Play grounds

The Summer is over and we have returned to the College after an absence of three months. A change seems to have come over all things in the College, especially the students. We regret the absence of many heroes who had previously represented our College and kept its prestige high both in scholastic as well as athletic fields. We welcome newcomers because among them we hope to find fresher and, maybe, better substitutes for our veterans. But the loss of our heroes who fought the battles of honour in the past is more painfully felt when all of us cry out with enthusiastic spirits, "Islamia College, well-played." We have been deprived of Raheem our best half-miler who established a new half-mile record last year in the Provincial inter-College Athletics meet. We also miss one of our best hockey players, Qazi Ghulam Mohd. last year's skipper, and Aman Ullah, a University blue and former Captain of our foot-ball eleven. These are but a few of the outstanding champions who have left us. Many others besides these have bidden us farewell. But this is natural. Such changes are inevitable and indeed, without them fresh talent would find no scope for expression. We should, therefore, not be disappointed. On the contrary, we should try to unearth hidden talent and keep the standard of sport flying high.

Inter Hostel League Tournament.—The Winter Inter-Hostel League Tournament in Football and Hockey has been played as usual in an atmosphere of keen rivalry. This year the championship in football has gone to Qayum Manzil and in hockey to the combined team of Oriental Hostel and Rahim Shah Ward. We congartulate the winning teams on their remarkable achievement.

Foot Ball.—Our football team is very fortunate in having a zealous superintendent in Dr. Pires who never misses an opportunity of arranging practice matches against the

Principal's Address to New Comers

(Delivered in the Roos keppel Hall on the 10th October, 1943)

I wish to speak mainly to those who have just joined the College, but my remarks will have some value for the rest of you also.

First I want to welcome you to the Islamia College. You have come from all over the Frontier Province, and in some cases from the Punjab and beyond, and I hope that you will do all you can to benefit from your years in the College, and to contribute what you can to the life of the institution. I hope that you will find friends here whom you will value all your life, and that by taking part in the various activities of the College you will live a richer and fuller life than you have hitherto had the opportunity of experiencing.

You will naturally want to do well in your work and get good results in your examinations : the College staff will do their best to assist you, and I shall not hesitate to discourage slackness by taking away scholarship and fee concessions from those who show bad results. For example, no scholarships or fee concessions will be continued to those who fail in 2 or more subjects in the forthcoming test examinations in January next. The college offers you, so to speak, the apparatus of learning : it is up to you to experiment with it and make yourselves masters of whatever subjects you study.

I do not, however, wish to speak primarily of the academic side of College life. Important as that is, it is less important in the long run to you, to your province, to your country and to the world than the kind of person you are when you leave the College. Many years hence when you look back on your College days, you will find that you have forgotten almost all of the books which you will read here; but your own happiness in life and your usefulness to the society of which you form a part is something which concerns you closely, and which will depend in large part on the way in which you use your time in the years which you will spend in the Islamia College. You are now in a College and not at school. You have left behind you the time when you could be treated as children; and the responsibility for your future now rests on you. The College will help you in every way as much as it can; and I and every member of the Staff will always be ready to advise and assist you whenever you care to ask us. But yours is the main responsibility for what you make of your time here, and for the way in which you lay the foundations of your life. Enjoy your time here, therefore, but do not waste it and so waste not only the resources of your parents or guardians, and the opportunities which the College offers, but, more important. spoil your own future prospects and happiness in life.

I do not of course mean that you should try to study all the time. That is not possible nor is it desirable. I hope that very many of you will take part in the games which are played in the College, and for which life in the College offers such splendid opportunities. You should not think that you have to be very good at a game before you play it; everyone has to begin sometime, and even though you may never become very good, you can, if you try, learn to enjoy playing games and learn how to play the game in every sense of the term. When you apply yourself to your studies, therefore, study as well and as conscientiously as you can; when you play, play as well as you can. This is your opportunity to learn the capacities of your mind and body, and it is up to you to exert yourself to develop both as well as you can. The aim of education is not only the passing of examinations, important as that is, and I should

their election and expressed the hope that full advantage will be taken of the opportunities which the Khyber Union provided of training its members in the art of public speaking and of teaching them the value of being tolerant, fair-minded and polite to debating opponents.

The installation of hostel and proctorial monitors was also held with due ceremony. These dignitaries were sworn in and presented with the badges of their office at a meeting of the whole College.

Tutorial Classes.—The system of small tutorial classes in each subject has been introduced for all Degree students with effect from this term. It has been felt for a long time that big, unwieldy classes prevent intimate contact between the teacher and the students and do not allow proper individual attention. They may help turning out graduates on mass production lines, but they positively check any lasting and real impression of the teacher's personality being left on the boys. We have made a beginning in the right direction by introducing small tutorial classes consisting of a maximum of ten boys each meeting once a week. In these classes the students themselves do most of the work through questions and answers, discussion and paper-reading. The tutor simply guides and directs.

Another useful innovation introduced this year was the teaching of applied grammar in the first year class. This together with a system of weekly dictation tests in all subjects to make the freshers more careful of their spelling and punctuation, appears to have had a very favourable effect on their standard of English.

The Staff Study Circle.—Another important venture is the Staff Study Circle which was started sometime ago and has already held four fortnightly meetings at which Prof. S. M. Timur, Prof. Q. M. Fareed, Prof. Hadow Harris and Mr. A. A. Farooq have spoken on "The Organic Unity of Ghazal as a literary form," "Mental Culture," "Scottish Poetry," and "The Future of the State," respectively.

Bengal Relief Fund.—As a mark of sympathy towards the suffering people of Bengal, the staff and the students collected a sum of Rs. 867 for contribution to the Bengal Famine Relief Fund. Three-fourths of the collection was utilised for the purchase of wheat which was despatched through the Bengal Government Agent at Lahore. The rest of the money was sent to the Vice-Chancellor for inclusion in the Punjab University Bengal Relief Fund.

The Co-operative Bookshop and Stores.—The Darul-ulum has probably the unique distinction of being the only College in the Punjab University with a registered co-operative stores of its own. This enterprise which owes its origin to Mr. Scott's enthusiasm was promoted in April last with the object of providing books for the College library, the staff and the students and for supplying general requirements of the residents of the Darul-ulum. It is gratifying to note that during the short period since April last the Bookshop has attracted a paid up capital of over Rs. 1,500, all contributed by members of the staff, and the volume of turn-over already exceeds Rs. 8,000. Further expansion of business is expected in the near future.

The Old Boys' Association.—We are glad to say that our repeated suggestions for the establishment of an Old Boys Association appear at last to be bearing fruit. On the 19th December a meeting of the old boys of the College was held in the Khyber Union Hall and was attended by a large number of old students. The meeting started at 11-30 a. m. and after passing the constitution adjourned for lunch which had been arranged in the various College Hostels. At the lunch, the old boys met the new boys with whom they spent a very pleasant hour in chatting over the students' favourite dishes. The meeting was resumed at 3 p. m. and after deciding that elections should be held in November next, it broke up for sports contests between the old boys and the present students. The old boys won the hockey match, amidst great cheering, thanks to the regard shown by the youngsters, but the tug-of-war ended in a draw, each side winning one pull. At the end a "Standard" tea was served which was very much appreciated because it set up a high standard of austerity in conformity with the needs of the hour.

organiser, and a generous friend, and will be long remembered as the inspirer of many a useful measure. The All-India and Provincial speaking competitions, the Provincial High Schools tournament, the institution of the 'Rolls of Honour', the establishment of a faculty of Education and the Department of Geography and the introduction of a "Beautification Campaign" are some of the outstanding achievements of his foresight and initiative. That the myth of Muslim students in general, and the Pathans in particular, being averse to Mathematics as a subject, stands exploded to-day is mainly due to his untiring efforts as head of the department of that subject. We wish him all success in his new sphere of work at Lahore.

Maulana Hafiz Muhammad Idris who was in the Arabic department for about a year has gone over to the Collegiate School. During his all too brief stay with us, he created a deep and lasting impression on the minds of both his pupils and colleagues by his wide sympathy, great learning and genial personality. We wish him the best of luck. Another outgoing member of the staff is Mr. Abdus Sattar Saggu of the Physics department who has joined the I. A. F.

The void caused by Mr. Muhammad Shafi's retirement has been filled by the appointment of Prof. Qazi Muhammad Farid, B. A. (Cantab). He has had a distinguished academic career and is an experienced teacher, having been Professor of Economics at M. A. O. College, Amritsar and Principal of Islamia College, Jullundur. Hafiz Muhammad Idris's place has been filled by Mr. Sardar Ahmad, M. A., who also comes from Islamia College Jullundur. We accord a hearty welcome to both these gentlemen and wish them a very happy career at the Darul-ulum.

Commander-in-Chief's Visit.—On the 21st December, we had the privilege of welcoming to our College His Excellency General Sir Claude Auchinleck, Commander-in-Chief of His Majesty's Forces in India. Having been Commander of the Peshawar Brigade from 1988 to 1936, he is not a stranger to Peshawar or to the Darul-ulum. In fact, the establishment of a U. T. C. unit at the College is due mainly to the sympathetic interest he took in the matter after his first visit to the College as C.-in-C. in 1941.

His Excellency was received by prominent Trustees of the College and inspected the cadets on parade in the Cricket lawns. 2nd/Lt. S. A. Muttalib Jaffery, Commandant of the N.-W. F. P. Company stationed at Islamia College presented him with an address welcoming His Excellency to the Darul-ulum, thanking him for his great interest in the formation of the Darul-ulum company of the U. T. C., and asking for its expansion to a battalion. His Excellency, in his reply, paid a tribute to the smartness and general turn-over of the cadets and trusted that the training they had received would make them sturdy and tough soldiers. He said that modern warfare demanded hard work and perseverence, and believed that the youngmen of the Frontier would come up to the high standards demanded of officers and men in the Army, the Navy and the Air Force. He was glad that the N.-W. F. P. had been playing its part, and sending out large numbers of recruits for the defence of India and of freedom. He promised to give a sympathetic consideration to their request for the expansion of the U. T. C. Company into a full battalion.

After this, His Excellency and party attended a big tea party at which H. E. had a chat with some of the trustees, professors and students. Then he was taken round the Cunningham Khyber Union Hall and the Osmania Hostel.

'Installation' Ceremonies.—The newly-elected office-bearers of the Khyber Union were duly installed on the 24th October. The President Mr. Abdul Ali read out his inaugural address, in the course of which he complimented all concerned on the way in which the elections had been conducted and promised to do his very best to maintain the honour and prestige of the Union. After the administration of the oath of office, the Patron congratulated the President and his colleagues in the cabinet on

whole world as our country, as that great warrior Tariq said when he burnt his boats after landing on the Spanish coast and thereby cut off the last chance of returning to his homeland in the event of defeat:

Every country is my country since it is my God's country.
—*Iqbal.*

At the same time, our new patriotism should, like charity, begin nearer home. We must aim at more and more decentralisation of administration. Greater powers must be given to provinces and to district boards, municipalities and village panchayats. It is only in this way that we can make democracy real by arousing the interest of the largest number of people in communal affairs and by associating them in a very real way with the administrative machinery of the state. And when we have succeeded in creating this local patriotism, as against national patriotism, we shall have found the most potent check on the spread of bureaucratic tendencies as well as on the periodic outburst of aggressive nationalism.

A.A.F.

College Notes

Back to the College.—The College has re-opened and we are back to its cares, and joys and honours. Some of us have been climbing mountain tops and enjoying the bracing air of the upper strata; while others have just tasted the 'lotos' and "drowsed" away the summer months on the plains below. Very few, we are sure, could have burnt the midnight oil (it was rationed); but that we were all looking forward to the re-union as a happy event is very certain. Consider the contrast between the 'slow motion' existence during the vacation and the brisk tempo of activity at College. Verily, life is now much fuller, richer and variegated than in the dog-days of July and August.

Back at the College, once more we behold an active bustle and a busy hum in the corridors and the class-rooms. Moments seem to be precious now, for there is the consciousness of a precipice ahead, however much one would like to blink it. We must cast aside romantic trappings and face realities; it is high time to begin everything in earnest. This cyclic order of inertia and renewed activity reminds one of the finale of Shelley's famous 'Ode to the West Wind':—

'If Winter comes, can spring be far behind!'

Principal's Address.—On the first Sunday after the reopening of the College the Principal addressed the students in the Roosekeppel Hall. He welcomed the new students to the Darul-ulum and explained to them the many and various opportunities for study, play, friendship and social life, which the Darul-ulum offered them. While emphasising devotion to studies as their main concern he advised them not to neglect games and other extra-mural activities for which such splendid opportunities exist at this residential institution. He impressed upon the students the need for being good Muslims and reminded them of their duty to maintain perfect discipline and uphold the noble traditions of the Darul-ulum. The address is printed elsewhere.

Staff.—Since the publication of our last issue, Dr. O. H. Malik has accepted the Principalship of Islamia College, Lahore. He came to us in 1926 as Senior Professor of Mathematics, was Vice-Principal for four years and officiated as Principal from 1939 to 1941, when his services were requisitioned by the Government of India for employment as Director of Statistics in their department of Supplies. He has left an imperishable mark on the life of the Darul-ulum as an excellent teacher, a capable

neighbouring states must be promoted by a group of self-seekers who pull the wires from behind the scenes. We have seen the horrors of such misdirected patriotism in the shape of the two bloodiest wars history has on record—the wars which in a single generation have cost more in men, money and materials, which have broken up more families, destroyed more homes, erased more cultural centres and created more international ill-will and bitterness than did all the wars in any one century put together. And strangest of all, the youth of the world—the motive force of human progress, the champion of new ideas and the breaker of old images—enthralled by propaganda machinery, actually delights in being a martyr for the cause of this inhuman, irrational, narrow-minded sort of patriotism.

Such patriotism as this is the greatest obstacle in the way of human civilisation. A patriotism which ends with certain arbitrarily marked frontiers and which regards persons living that side of a certain mountain or river as enemies, actual or potential, and people living this side of it as loveable angels, is surely in no way intended to promote a spirit of comradeship and co-operation among the international brotherhood of states and communities. Science, mechanical progress, culture—all tend to be international in character. But our chauvinistic outlook which owes its origin to the existing notions of patriotism keeps our minds in a narrow groove, with all channels of speedy progress choked up by the silt of mutual suspicions. The unfortunate capitalistic system of reckless competition in economic field has its counterpart in politics, too. I do not mean to say that competition is altogether bad. Some competition among individuals is necessary for progress, just as a sense of healthy rivalry is necessary among nations. But individual competition and international rivalry both must be based on the firm foundations of co-operation. Otherwise the result would be victory for the centrifugal forces and disaster in the end.

But just as this antiquated type of nationalism limits the horizon of our minds to certain politico-geographical frontiers, it also makes us forgetful of our duties towards the local community—to our native village, town, district or province. The Great Leviathan, the national state, absorbs so much of our attention and demands so much of our loyalty that very little of either is left for the community in which we were born, with which we come in daily contact and in which we spend the best part of our lives. The real thing is forgotten for the sake of a fiction and the result is that more and more power is concentrated in the hands of the central administration of the state. The individual gets remoter and remoter from the business of directing the community's affairs and democracy becomes a mere farce, with a vast bureaucracy with all its inefficiency and irritating redtapism firmly installed in the saddle. This condition reflects in the political world yet another contemporary economic tendency which the economists somewhat importantly style as integration, concentration or monopolisation of industry. It is very strange that although the public has such a deep-seated fear of economic monopolies and large firms which have their tentacles spread far and wide over the entire field of economic activity, yet it does not display much uneasiness over the far more widespread tentacles of the modern state. But perhaps this is just another instance of our growing credulity under the influence of the modern arts of propaganda.

I reiterate that our existing idea of patriotism is not only extremely narrow and dangerous but also highly inadequate. Let us love our country by all means, but not by wishing ill to others. Let us raise our people without trying to pull down others. Let us organise our community and make it strong, but not for militant aggression. In short, our common bond should be mutual love, not the hatred of a common enemy and we should not pin down all our attachments to a narrow group nor base them entirely on arbitrarily fixed politico-geographical frontiers. We should regard the

THE KHYBER

No. 1] PESHAWAR, JANUARY 1944. [Vol. XXVII

The New Patriotism

May I speak the truth, if you don't mind, O Brahmin,
The icons of your temple have become out of date.
—*Iqbal.*

OURS is the age of shibboleths. We are living in times when conduct is governed not by independent thinking, not by any thinking in fact, but by a certain set of catchwords which are broadcast and rebroadcast and constantly dinned into our ears through the modern means of misleading —the press and the radio, till we come to believe in them as though they were nothing but hitherto unnoticed aspects of eternal truth. As John Dewey points out in an illuminating passage in his book *Freedom and Culture*, opinion is now influenced not by appealing to reason and intellect, but by playing upon imagination and emotions. What is worse, the gigantic propaganda machine of today makes public opinion a matter of mass production, like material goods. Somebody somewhere says a thing and the following day everybody is found repeating it in a parrot-like fashion. Evidently, under the soul-crushing nervous strain and rush of work which are the characteristics of our age, men feel too tired to think for themselves, and whatever purports to be coming from higher sources is readily accepted. Even universal education which was expected to develop a critical faculty among men has only made them more credulous. and thus we find that the youth which has always challenged old dogmas and preached, fought and even died for new and progressive ideas has now become a willing dupe in the hands of reactionary forces like Nazi-ism and Fascism.

One of the shibboleths which have been exploited most by modern propaganda machine is patriotism. Now patriotism is a good thing, even a necessary thing for certain purposes. But it is a very dangerous thing, particularly when it degenerates into blind, unquestioning loyalty to a set of catch-words which have been given wide publicity by an unscrupulous band of zealots backed up by strong vested interests. I have always suspected that a so-called patriotism which seeks 'glory for the Fatherland' at the expense of others and which lulls opposition to a reckless programme of expansion intended to satisfy the craze for *lebensraum* by flattering a people on its supposed racial superiority and by feeding its anger on imaginary grievances against
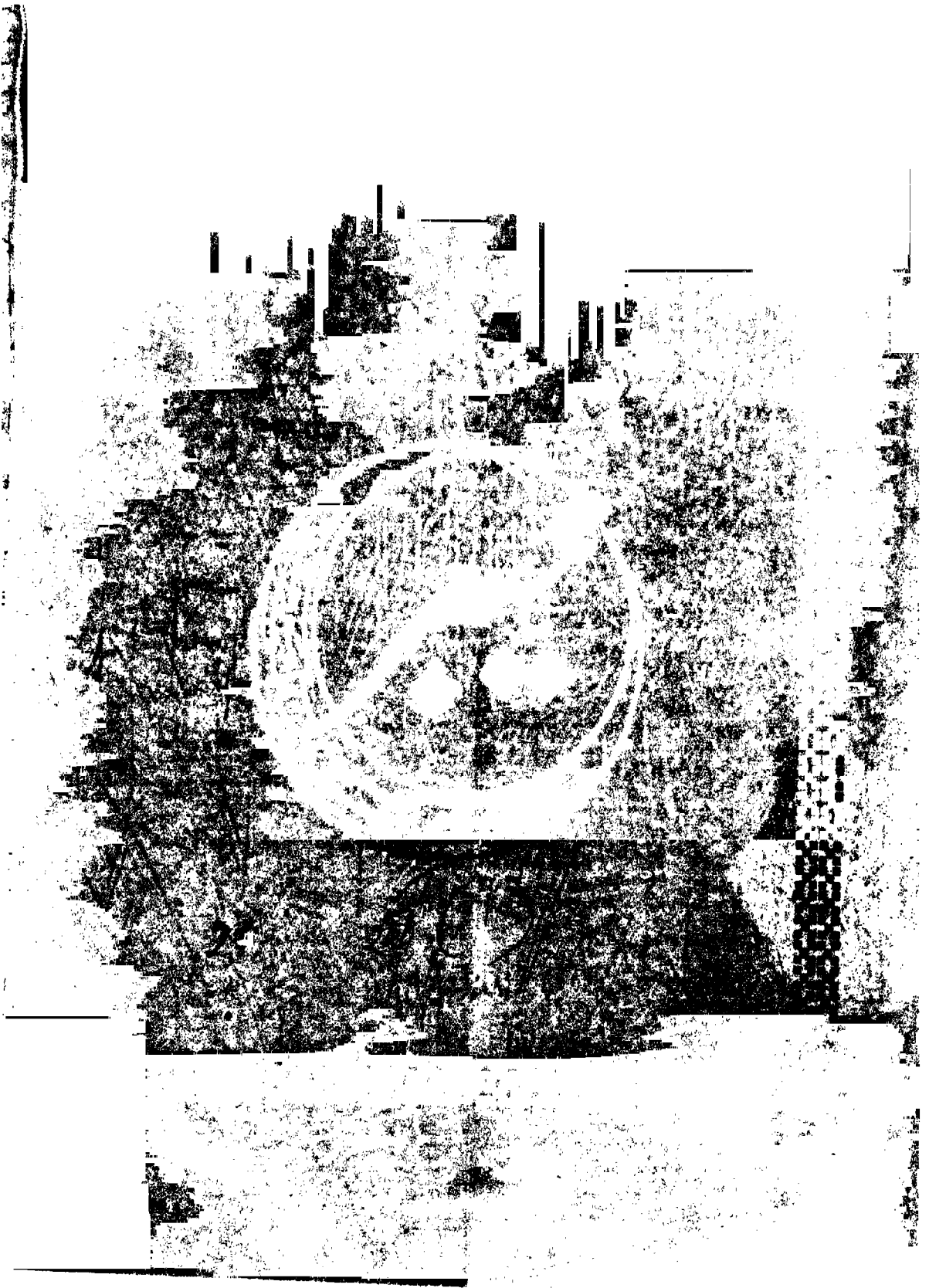
خیبر

بابت ماہ جنوری ۱۹۴۵ء

شذرات

اس عالمگیر جنگ کی اور کوئی چیز یاد رہے یا نہ اس کا نظام نو کا تخیل ہرگز نہیں بھول سکتا۔ آخر اتنی میٹھی چیز تو ہے کہ لیپن کے دہانے اسی کو ترس رہے ہیں۔ ہوائی جہازوں کی پرواز اسی کی سمت ہے۔ آبدوزوں کے چکر اسی کی تلاش میں ہیں۔ بولنے والوں کی زبانیں سوکھ گئی ہیں۔ لکھنے والوں کے قلم ٹوٹ چکے ہیں۔ مغربی آنکھ پر نیند حرام ہو گئی ہے۔ اور مشرقی پہلوؤں کو کروٹ بدلنا دشوار ؛

دنیا پانچ برس سے اس نظام نو کا استقبال "آتش بازی" اور "ہولی" کے چکیلے اور رنگین انداز میں کر رہی ہے لیکن بقول غالب۔ ع کوئی صورت نظر نہیں آتی !

شاید اس لئے کہ ہٹلرانہ سنگباری جاپانی کھلونوں سے زیادہ ہلکی ہو چکی ہے۔ اور جاپانی کھلونے اس قدر بھاری کہ انہیں اٹھانے کو اتحادی طیاروں کی ضرورت ہے۔ مگر خوش قسمتی ملاحظہ ہو ابھی کہ نہ تیر نہ تفنگ، ہم بن گئے فیروز جنگ! دنیا میں نو نظام نو آتا آئیگا۔ ہمارے یہاں خیر سے آ بھی چکا۔ تیغوں کے سایہ میں پلنے والوں کو ایک اور سایہ بھی حاصل ہو گیا ہے۔ اللھم زد فزد۔

دیوجانس کلبی اور سکندر کی ملاقات کا قصہ تو اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ لیکن بڑے بوڑھے کہتے ہیں۔ کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ خدا کرے کہ ایسا کبھی نہ ہو اور ہمارے سر پر سکندر کا سایہ بھی رہے اور خورشید علم کی روشنی بھی۔ ہم تو مدت سے کہا کرتے تھے ع طرح نو افگن کہ ما جدّت پسند افتادہ ایم

ہاں تو اسی نظام نو کی مسیحائی کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ ہماری اولڈ بوائز ایسوسی ایشن (بوڑھے لڑکوں کی انجمن) اگلی دنیا سے لوٹ کر پھر آ گئی ہے۔ اور اس سال ۱۹ ر نومبر کے روز روشن میں اپنے نوجیون کا ثبوت صرف انتخابات ہی سے نہیں دیا۔ بلکہ لاری سوار ہو کر آنے، اپنی ہی بات منوانے (بوڑھے بچے جو ہوئے)، دو ایک معنی خیز یا بشاش ریزولیوشن پاس کرانے، لارحمت کے مذاق اڑانے، کھیلنے، کودنے۔ کھانے پلانے اور مختصر سا چندہ فراہم کرانے سے دارالعلوم میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ منتخب شدہ عہدہ دار حضرات بلا تمیز رنگ و نسل ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سنا گیا ہے کہ آئندہ جلسہ کسی قریبی تاریخ پر منعقد ہو گا۔ مجوزہ قرار دادیں سال بھر تک سیکرٹری صاحب کے پاس پہنچ جانی چاہئیں ؛

نظام لو کا تخیل آخر بنگال کی آہوں اور جاپان کی توپوں میں آنچ پا چکا ہے۔ اس کی گرمی پرواز کیوں نہ تیز ہو۔ سرحد ہمیشہ سے سرد ہی سرحد کے دماغ تو سرد نہیں ہو چکے۔ وہ تو نظام لو کے تخیل سے متاثر ہو سکتے تھے۔ ہوئے اور ڈھنگ کی چوٹ ہوئے۔ چنانچہ "اردو سبھا" نے اردو کی ترقی اور توسیع کے لئے ایک شاندار جلوس نکالا۔ اور سرحدی سپرد بنا ڈالے۔ اور دائرہ ادبیہ نے انجمن ترقی اردو کی ایک شاخ کھول دی۔ اور گیسوئے اردو کو منت شانہ سے بے نیاز کرنے کو چندہ فراہم کرنے اور تعلیم یافتہ ان کا بیڑا اٹھانے کے دو اہم ریزولیوشن پاس کر ڈالے۔ لیکن ایک ہماری اورینٹل سوسائٹی ہے کہ اپنی ہوشمندانہ خاموشی کی روایات کو قائم رکھنے کی خاطر نظام لو کے خوبصورت جھانسے میں نہیں آئی۔ اور اللہ کرے کہ نہ ہی آئے۔ ورنہ نہ جانے ہمارے دو انعامی مشاعروں اور ہنگامہ خیز "اقبال ڈے" کا کیا حشر ہوگا۔ قومیں روایات ہی کے سہارے تو زندہ رہتی ہیں۔ دیکھا نہیں یہودی زر اندوزی کی سنت دیرینہ سے کس طرح زندہ تر اور پائندہ تر ہو چکے ہیں۔ ہٹلر نے دست درازی کی بھی تو اس کا انتقام رائٹر نے لے ہی لیا تھا۔ اورینٹل سوسائٹی کو بھی یہی ورد کرتے رہنا چاہیئے ؎ ساقی نہ رسم ترک ہو شرب مدام کی

مگر ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ نظام لو کے تخیل نے ہمارے مضمون نگار حضرات کو کیوں متاثر نہیں کیا۔ کاغذ بیشک بلیک مارکیٹ میں پہنچ چکا ہے۔ قلم تو ابھی یہیں ڈپٹی صاحب کی اشتہا انگیز کافی شاپ سے مل سکتے ہیں۔ اور وہاں سے نہ سہی انگلش سٹاف روم کا قلمدان صوبہ سرحد کا قلمدان وزارت تو نہیں کہ اس کے لئے دنیا ترستی رہ جائے۔ نوجوان یوں بھی کمیونسٹ ہوتے ہیں۔ اور ایم۔ اے میں پہنچ کر تو بڑے کٹر کمیونسٹ۔ آپ بھی اپنے ایم۔ اے والے دوستوں کی طرح انگلش سٹاف روم کے قلمدان کو قومی امانت سمجھئے۔ اور سرپرستان اوقاف اسلامی کی مانند اس سے جائز فائدہ اٹھائیے۔ البتہ اس بات کا خیال رہے کہ آپ کا کمیونزم کہیں آپ کو دوسروں کے خیالات کا مشترکہ مالک نہ بنا دے۔ اس میں آسانی اور شہرت تو دونوں ہیں۔ لیکن فائدہ کم۔ خیبر کا ادارۂ تحریر یہ بھی گوارا کر لے گا۔ اگر آپ ان خیالات کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنانے کی تکلیف گوارا کر لیں ؎

سوانح نگاری

اردو میں سوانح نگاری کو فن کی حیثیت سے ترقی دینے اور عروج پر پہنچانے کا سہرا مولانا حالی کے سر ہے جن کے دوش بدوش مولانا شبلی نے اس فن کی تکمیل میں حصہ لیا۔ حالی نے جمع شدہ مسالہ سے ایک ہیولیٰ تیار کیا۔ اور شبلی نے اس میں روح پھونک دی۔ حالی پیغمبر سیرت تھا۔ جس نے اردو میں معیاری سوانح نگاری لکھنے کا نمونہ پیش کیا۔ حالی کی سب سے پہلی کتاب حیاتِ سعدی پرانے طرز تحریر کے خلاف ایک بغاوت تھی اس کتاب نے نہ صرف اردو بلکہ سارے مشرق کے ادب میں ایک سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد یادگار غالب۔ حیات سعدی کی ہی طرز پر لکھی گئی۔ مفصل سوانح عمری کے ساتھ ساتھ دونوں کتابوں میں ہر دو شعرا کے کلام پر تنقید اور تبصرہ بھی کیا ہے۔ کتابیں ادبی کارنامے ہیں۔ لیکن سوانح نگاری کے اعتبار سے ان میں ایک کمی ہے۔ جسے مولانا نے خود محسوس کرتے ہوئے یوں لکھا ہے "میں نے ان سوانح عمریوں میں کسی کو جیسی نہیں لگنے دی" اور کیسے لگنے دیتے۔ شیخ سعدی کی مقبولیت کا تو یہ عالم ہے۔ کہ کلام آج بھی مسجدوں میں

جاتا ہے۔ اور قریباً ہر شخص کو صحیح سے عقیدت ہے۔ بھلا اُن پر تنقید کون سنتا۔ مرزا غالب مولانا کے
اُستاد تھے۔ احساسِ کمتری یا پاسِ ادب یا محبتِ اُستاد نے مولانا کے جذباتِ تنقید کو دبائے رکھا۔ اور وہ اپنے اُستاد
کی کمزوریوں پر علانیہ نہ کھل سکے۔

لیکن اس کے بعد اردو زبان کی مکمل ترین اور اس صنفِ ادب کی معیاری کتاب حیاتِ جاوید آتی ہے۔
یہ کتاب سرسید کی ذاتِ گرامی کا تذکرہ ہے۔ مولانا سرسید کے مشیر کار تھے۔ انہیں اُن کے اخلاق، طبیعت
اور کام کا مکمل تجربہ تھا۔ ۱۸۹۶ء میں خالص سوانح نگاری کی غرض سے علی گڑھ گئے۔ اور چند ماہ قیام کیا۔ اگرچہ
بظاہر سرسید کی سیرت لکھنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید کی ہر سرگرمی اخبارات اور رسائل
میں موجود تھی۔ اور غدر سے پہلے کے واقعات بھی مستند ذرائع سے مل سکتے تھے۔ لیکن سوانح نگاری کے نقطۂ نظر
سے وہی مصنف کامیاب ہو سکتا تھا۔ جو سرسید کی مختلف حیثیتوں میں سے ہر حیثیت پر اُن کی شان اور منصب
کے مطابق لکھ سکتا۔ یہی کارِ عظیم مولانا نے کیا۔ مولانا نے سرسید کے ہر واقعۂ حیات کا پورے طور پر پوسٹ مارٹم
کیا ہے۔ وہ خود دیباچہ میں لکھتے ہیں "اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کا ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اُس
کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ یہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی کریٹیکل بائیوگرافی لکھی جائے۔
اور خوبیوں کے ساتھ کمزوریوں اور غلط خیالات کے ساتھ لغزشوں کو ظاہر کیا جائے۔ لیکن ہم کو اس شخص کا
حال لکھنا ہے۔ جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے بڑے بڑے
علما اور مفسرین کو للکارا ہے۔ مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے۔ قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے۔ اور اُن کو کڑوی
دوائیں پلائی ہیں۔ جس کو تعصب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا تو دوسرے نے زندیق کہا ہے۔ جس کو
پالیٹکس کے لحاظ سے کسی نے "ٹائم سرور" سمجھا ہے تو کسی نے راستباز "لبرل" جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف
چپ چاپ کیسے لکھی جا سکتی ہے۔ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر پرکھا جائے۔ اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا
کے دیکھا جائے۔

اس دیباچے میں خود مولانا نے تنقید کی وضاحت کر دی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہر واقعہ میزانِ عدل میں
تولا ہے۔ اُنہوں نے صاف کہا "اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے۔ اور نہ ہم ثابت کرنے کا ارادہ
رکھتے ہیں۔ لیکن اس بات کا ہمیں خود بھی یقین ہے۔ اور اوروں کو بھی یقین دلانا چاہتے ہیں۔ کہ سرسید کا کوئی کام
سچائی سے خالی نہ تھا۔" بہت سے ناقدین نے اس آخری فقرہ کو قابلِ احتساب سمجھا ہے۔ اور اسی کو بنیاد قرار
دے کر ہر واقعہ پر نکتہ چینی کی ہے۔ اُن کے لئے مہدی حسن کا ایک فقرہ کافی ہوگا: "ایک شریف انسان نے ایک
شریف تر انسان کی سوانح لکھی۔ اور پوری تفصیل سے لکھی۔"

مولانا شبلی نے بہت سی سیرتیں لکھ کر صحیح سیرت نگاری میں بیش بہا اضافہ کیا۔ المامون۔ سیرۃ النعمان۔
سوانح مولانا روم۔ حیاتِ عالمگیر۔ الفاروق اور سیرۃ النبی میں سے ہر ایک کتاب ایسی ہے جو مصنف کو شہرتِ عام
اور بقائے دوام دینے کے لئے کافی ہے۔ مولانا شبلی کی تصانیف بلحاظ عالمانہ استدلال و انداز کسی مستند
یورپی مصنف کی تصانیف سے کم نہیں۔ آپ کی کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیت مضبوطیٔ رائے اور منطقی
استدلال ہے۔ ان میں ایک قسم کی جدت ہے۔ اور طرزِ ادا میں دلاویزی اور عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے۔
عالمانہ عبور، غور و خوض، قوتِ تجسس، درایت، جانچ پڑتال کی عادت، اپنی طبیعت سے کسی نتیجہ پر پہنچنا،
پیچیدہ و تاریک مسئلے کو تاریک جھاڑیوں سے نکالنا اور سلجھانا۔ پھر تقسیم و تحلیل کرنا۔ اور آخر میں پھر اس کی
حالت پر ترتیب دینا۔ یہ وہ باتیں ہیں۔ جو مولانا شبلی کو درجۂ امتیاز بخشتی ہیں۔ اور طرزِ تحریر میں کمال یہ کہ بے ہودہ

کی شخصیت سارے ماحول پر چھا جاتی ہے مولانا نے ہر کتاب کے لکھنے میں انتہائی تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے مثال کے طور پر آپ نے الفاروق کے لئے بلادِ عربیہ مصر و شام و روم کا سفر اختیار کیا۔ الفاروق کے چھپنے پر ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ بعض نے کہا کہ مولانا پرستارانِ الفلسفت کی آڑ لے کر اخلاق اسلام کو ڈھا لتے ہیں۔ اور بعض نے کہا کہ الفاروق درجۂ حزم و احتیاط سے محروم ہے مولانا نے بیشمار اعتراضی مضامین میں سے صرف ایک کا جواب دیا۔ جس میں لکھا ہے

رسی آنگہ بہ دردِ ما کہ چو ما بگیری خامہ و حرفے نگاری

لیکن اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو مولانا شبلی مشرق کے سب سے بڑے محقق مورخ تھے۔ ایک جرمن مستشرق نے کہا ہے "اہلِ مغرب کے محققانہ اور عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی ہندوستانی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں۔ تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں۔ گو یہ ایک گونہ اسلامی رنگ لئے ہوئے ہیں"۔

سوانح نگاری کا آغاز حیاتِ جاوید کی خواہش اور ابدی شہرت کی غرض سے ہؤا۔ رفتہ رفتہ مذہب کی اہمیت نے پیغمبروں، ان کے خلفا اور مصلحین کی زندگیوں کے حالات کو ضروری قرار دیا۔ اس طرح سیرت نگاری کے ذیل میں ایک مقدس ادب پھولتا پھلتا رہا۔ جس کا مدعا ادب کے ساتھ ساتھ اخلاق سنوارنا اور زندگی کے کامل نمونے پیش کرنا تھا۔

سوانح نگاری کی لوگوں نے مختلف تعریفیں کی ہیں۔ کارلائل کے خیال میں "انسانی تاریخ اس کے سورماؤں کی تاریخ ہے۔ اور اس تاریخ کی صحت کے لئے ان سورماؤں کے چہرے سے گرد ہٹاؤ۔ اور انہیں ان کے صحیح مقام پر بٹھاؤ"۔ سرسٹنی نے ۱۸۹۶ء میں سوانح نگاری کا جو نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ یہ ہے "سوانح نگاری اُن لوگوں کی باعزت یاد تازہ کرتا ہے۔ جنہوں نے اپنے آپ کو کیرکٹر اور کارناموں میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں اور کروڑوں ہم وطنوں میں ممتاز کیا"۔ سر ایڈمنڈ گوس کی نظروں میں "سوانح نگاری ایک روح کو زندگی کی مہمات میں سے گزرتے دیکھنے کی وفادارانہ تصویر کا نام ہے"۔ سوانح نگاری کی ایک جامع تعریف یہ ہے "کہ وہ ادب کی ایک شاخ ہے۔ جو افراد کی زندگیوں کی تاریخ بیان کرتی ہے۔ ادب۔ تاریخ۔ فرد یہ اس کے ضروری اجزا ہیں۔ سیرت میں ایک چھا جانے والی شخصیت ہو۔ اس کے متعلق صحیح حالات ہوں۔ اور ایسے کمال سے ترتیب دئے جائیں۔ کہ آرٹ کا ایک نمونہ ہوں۔ اور ان کا یکجا کرنا صحیح ادبی تخلیق ہو۔

صحیح سوانح نگاری کے راستہ میں تین بڑی رکاوٹیں رہی ہیں۔ اول چونکہ سیرت کسی بڑی شخصیت کی لکھی جاتی ہے۔ اس لئے مصنف اس کے ہر فعل سے بزرگی اور بڑائی ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاریک پہلو سامنے نہیں لاتا۔ اور جہاں تک ہو اُسے عظمت دیتا ہے۔ جو فنی لحاظ سے صحتِ مضمون کے لئے مہلک ہے۔ دوم مذہبی رہنماؤں کی سیرتوں میں مبالغہ آمیزی کی جاتی ہے۔ سیرت سے مذہبی بحثوں کے لئے دلائل پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور کئی فوق الفطرت اعمال و تصوّرات اُن سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ سوم مصنف کو اپنے ہیرو کی ذات سے ایک والہانہ شغف ہوتا ہے۔ جس سے وہ غیر ارادی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اور اس لئے اس کے اعمال و افعال کی صحیح قدر و قیمت جاننے میں ٹھوکر کھاتا ہے۔

اصل میں سوانح نگاری کا فن ذہنی ہے جذباتی نہیں۔ جب تک سوانح نگار سبب، علت، وجہ اور دلیل کا لحاظ رکھتا ہے۔ تب تک کامیاب رہتا ہے۔ لیکن جونہی ہیرو کی محبت اخلاقی اصولوں کی تبلیغ یا مذہبی اعتقادوں کے جوش کے جذبات کی رَو میں بہہ جاتا ہے۔ تو ساتھ ہی صحت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ بعض اعتقادوں کا

لاتعداد ہیں جو کہ مذہبی جوش سوانح کے لئے مہلک ہے۔

دورِ حاضر کے ایک انگریز مصنف کا قول ہے۔ کہ ابھی انگریزی سیرت نگاری بالکل بچپن کے دور میں ہے اور ۱۶۸۳ء سے پہلے بائیوگرافی کا لفظ موجود نہ تھا۔ اور ۱۷۹۱ء سے پہلے کسی شخص کے حالات کو بائیوگرافی نہیں کہا گیا۔ جہاں انگریزی جیسی قدیم و وسیع زبان کا یہ حال ہے۔ تو وہاں اس کے مقابلے میں السنۂ جدید اور بالخصوص اُردو کی بساط کیا ہے۔

اُردو کی ابتدائی تاریخ میں سیرت کی کتابیں تو بہت کم ہیں۔ لیکن کچھ تذکرے ملتے ہیں۔ جن میں مختلف لوگوں کے حالات درج ہیں۔ ان میں سب سے ابتدائی کتابیں مرزا علی لطف کا تذکرۂ گلشنِ ہند اور منشی بینی نرائن کا دیوانِ جہان تمام ہندوستانی شعرا کا تذکرہ ہے۔ ان کے علاوہ رہنمایانِ دین کی بہت سی سیریں لکھی گئی ہیں۔ رفتہ رفتہ لیڈروں اور مصلحین کے ساتھ عام لوگوں کی سوانح عمریاں بھی شروع کی گئیں۔ سید سلیمان ندوی نے سفرِ یورپ کے بعد ایک مضمون بعنوان "انڈیا آفس میں اُردو کا خزانہ" لکھا۔ جس میں آپ فرماتے ہیں کہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں اُردو کتابوں کی فہرست تین سو صفحات پر ہے۔ پھر سید صاحب نے کتابوں کے مضامین کی فہرست دی ہے۔ جن میں کئی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ ائمہ اور عام لوگوں کی ایسی سوانح عمریاں ہیں جو ہندوستان میں کمیاب ہیں۔ اس کے بعد نامۂ غالب۔ ماسٹر رام چندر کا تذکرۃ الکاملین اور منشی امیر مینائی کا تذکرۂ شعرائے رامپور قابلِ ذکر ہیں۔

اس دور میں انگریزی تعلیم عام ہو رہی تھی۔ طرزِ تحریر بدل رہی تھی۔ آزاد۔ مولوی ذکاء اللہ اور شرر نے کچھ کتابیں لکھیں۔ آزاد کی "دربارِ اکبری" سیرت نگاری کا اچھا خاصہ مجموعہ ہے۔ آبِ حیات شعرائے اُردو کا تذکرہ ہے۔ مولوی ذکاء اللہ نے ملکہ وکٹوریہ اور مولوی سمیع اللہ کی سوانح لکھیں۔ شرر نے "سیر رجال" اور "سیر نسواں" کے علاوہ کچھ رسالے لکھے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس وقت تک سوانح نگاری کی طرف عام رجحان نہ تھا۔ بزرگانِ دین کی سوانح عمریاں جذبات و عقاید کی روشنی میں لکھی جاتی تھیں۔ اور تذکرے ذاتی تعلقات پر۔ انگریز افسروں اور دیسی نوابوں اور راجاؤں کی سیریں ذاتی منفعت کی غرض سے لکھی جاتی تھیں۔ نہ سوانح عمریوں اور تذکروں میں کردار کی تدریجی نشوونما دکھائی جاتی۔ اور نہ ہی لغزشوں کو ظاہر کیا جاتا تھا۔ البتہ اگر مصنف کسی سے ناراض ہو تو معائب پر زور دیتا تھا۔

حالی نے اس قسم کے تذکروں اور سیرتوں کو مغرب کے جدید علم کی روشنی میں دیکھا۔ اور صحیح سوانح نگاری شروع کی۔ شبلی نے ان کے دوش بدوش کام کیا۔ اور ان دونوں بزرگوں کے کام کے بعد اردو سوانح نگاری کی کایا ہی پلٹ گئی۔ حالی نے جس واقعیت اور تنقیدی سیرت نگاری کی بنیاد ڈالی شبلی نے اس میں جس تحقیق و تدقیق اور روایت و درایت کی رُوح پھونکی اور آزاد نے جس طرزِ نگارش کا ادب پیدا کیا۔ اُس نے ملک کے کونے کونے میں اہلِ ذوق پیدا کر دئے۔ اس دور میں سب سے بڑا کام دارالمصنفین اعظم گڑھ کر رہا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے بالکل شبلی کی طرز پر سیرت النبوی کی تکمیل کی ہے۔ اور سیرۃ عائشہ، حیاتِ مالک اور خیام لکھی ہیں۔ عمر خیام کی سیرت کے علاوہ اس کے فلسفہ اور تصنیفات پر تنقیدیں اپنے مخصوص انداز میں سپردِ قلم کی ہیں۔ مولوی عبدالسلام ندوی نے سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ اسوۂ صحابہ (دو حصوں میں) اور صحابیات لکھ کر ادب اردو میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ مولوی سعید انصاری نے سیر الصحابہ، سیر الصحابیات اور سیر الانصار (دو حصص) لکھے ہیں۔ آپ کی طرزِ تحریر میں سرسید اور شبلی کا ملا جلا رنگ ہے۔ حاجی معین الدین صاحب نے خلفائے راشدین اور مہاجرین حصہ اول و دوم کو لکھ کر بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ ساکنینِ شبلی منزل سب لکھنے والے ہیں مگر ان کا دائرہ تصنیف مذہبی

سوانح عمری محدود ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ مولانا شبلی مرحوم نے ادب اور زبان کے علاوہ سوانح نگاری کے لئے کتنا بڑا کام کیا۔ اور کتنی مضبوط بنیادیں چھوڑ گئے ہیں۔ جن پر آج نہایت شاندار عمارت کھڑی کی جا رہی ہے۔

اس کے علاوہ ایک قابل قدر سلسلہ علی حیدر نوتی بلگرامی نے رسول اللہ اور آن کی اولاد کی سوانح عمریوں کا شروع کر رکھا ہے۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی رحمۃ اللعلمین، اصحاب بدر، اور تاریخ المشاہیر بہت مشہور کتابیں ہیں۔ جو زبان مضمون اور سوانح نگاری کے اعتبار سے بلند مقام رکھتی ہیں۔ دو اور معیاری کتابیں نیاز فتحپوری کی صحابیات اور اسلم جیراجپوری کی سیرت عمرو بن العاص ہیں۔

موجودہ سیاسی بیداری کی وجہ سے سیاسی قائدین اور لیڈروں کی سوانح عمریاں کثرت سے بازار میں ملتی ہیں۔ قاضی عبد الغفار نے سوانح سید جمال الدین دس بارہ سال کی کوشش و کاوش کے بعد لکھی ہے جس میں مشرقی دنیا کے جلیل القدر انقلابی رہنما کے حالات کا ایمان افروز تذکرہ ہے۔ بیداری مشرق میں سید صاحب کا مقام نہایت بلند ہے۔ کے۔ اے۔ حمید کی مصطفےٰ کمال، رضا شاہ پہلوی اور جعفری کی سیرت محمد علی فنی لحاظ سے کامیاب کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ اور چھوٹی چھوٹی سیرتیں پیشہ ور مصنفین کی کثرت سے ملتی ہیں۔

موجودہ دور میں اردو میں غیر ممالک اور دنیا کے مشاہیر کی سوانح عمریوں کے ترجمے بھی چھپ رہے ہیں۔ ابراہام لنکن اینڈریو کارنیگی۔ مسولینی کی خود نوشت سرگزشت۔ ہیلن کیلر کی میری داستان حیات اچھے ترجمے ہیں۔ خود نوشت سوانح حیات میں گاندھی جی کی "تلاش حق" اور جواہر لال نہرو کی "میری کہانی" کافی دلچسپ ہیں۔

مغرب میں اس وقت مختصر سوانح نگاری کا دور دورہ ہے۔ مشینوں کی تیز رفتاری کے دور کی مصروف زندگیوں کے لئے وقت کی بچت نہایت اہم مسئلہ ہے۔ بڑے بڑے حجم والے ناولوں اور طویل قصوں کی جگہ مختصر کہانی نے لے لی ہے۔ زندگی کے ہر پہلو میں اختصار کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ لٹن سٹریچی وغیرہ کی تقلید میں مختصر سوانح نگاری اردو میں بھی شروع ہو چکی ہے۔ کے۔ اے۔ حمید کی مشاہیر عالم اس ذیل میں بنیادی کامیاب کوشش ہے۔ موجودہ دور میں سوانح نگاری کا رحجان کسی قدر وسیع ہو گیا ہے۔ سیرتیں شخصی تاریخ اور علم نفسیات گہری دلچسپی سے مطالعہ کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ اردو سوانح کا معیار انگریزی سے لگا نہیں کھا سکتا۔ تاہم اس وقت اردو میں سیرتوں کا سرمایہ ہندوستان کی کسی اور زبان کے سرمائے سے کم پایہ نہیں۔ اور فن کے اعتبار سے تو سب کی رہنمائی کر رہا ہے۔

سید عبد الرحمان شاہ۔ سال چہارم

مزدوری

میں جب بھی وہاں سے گزرتا۔ وہ اپنے دروازے میں گھٹنوں پر ڈالے ہوئے کپڑے پر سر جھکائے کچھ کاڑھ رہی ہوتی۔ میرا کئی بار وہاں سے گزر ہوا۔ مگر اس نے کبھی سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ میں سوچتا۔ عجیب لڑکی ہے۔ کہیں اس پر بھی کسی نے لیڈی آف شیلٹ کی طرح جادو تو نہیں کر رکھا۔ مجھے اس سے کچھ خاص لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ جب کبھی کسی کام کے لئے باہر جانا ہوتا۔ تو میں جان بوجھ کر اسی لمبے راستے سے جاتا۔ حالانکہ دوسرے راستوں سے بازار قریب پڑتا تھا۔

وہ اپنے پرانے سے تاریک گھر کے دروازے کی چوکھٹ میں بیٹھی ہوتی۔ اس کا نکھرا ہوا سفید رنگ اور ترشے ہوئے باریک نقش، یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا کسی ماہر سنگ تراش نے اس حسین بت کو بنانے میں اپنی ساری زندگی

[illegible] ہوتا پھر اسے کسی وحشی نے اٹھا کر اس پرانے کھنڈر میں لا رکھا ہو۔ وہ حسین بُت اور اس کے عقب میں تاریکی کا وسیع سیاہ پس منظر ایسا معلوم ہوتا گویا چغتائی کے شاہکار کو کسی کور ذوق نے اس پرانی سی دیوار میں لٹکا دیا ہے۔ میں وہاں سے گزرتا اور نہ معلوم کیوں تھوڑی دیر کے لئے غیر شعوری طور پر میرے قدم رُک سے جاتے۔ میں ٹھہر جاتا۔ کچھ کھویا کھویا سا، سہما سہما سا۔ حتیٰ کہ کسی راہگیر کی ٹکر مجھے اچانک جھنجھوڑ دیتی ؛

مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ کیونکہ اگر کوئی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ تو وہ عموماً اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کی خواہش سے بے قرار رہتا ہے۔ مگر مجھے یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ وہ میری ہو جائے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اکثر اس کا خیال رہتا ہر وقت اس کا تصور میرے خیالات کی دنیا پر چھایا رہتا۔ میں کرسی پر بیٹھا کتاب کے صفحے الٹتا رہتا۔ لیکن مضمون کی طرف توجہ ہی نہ جاتی۔ صفحے آگے پیچھے پلٹتا، بار بار پڑھتا۔ مگر خاک بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آخر تنگ آ کر کتاب میز پر پٹخ دیتا۔ "کیا مصیبت ہے"! میں اکثر سوچنے لگتا۔ "امتحان سر پر آ پہنچا ہے۔ اور ایک حرف تک سمجھ نہیں آتا۔" اور پھر وہی چغتائی کا شاہکار خود بخود تصور کے پردوں پر نمایاں ہو جاتا۔ آخر اس اُلجھن سے چھٹکارا پانے کے لئے مجھے باہر نکل جانا پڑتا۔ نامعلوم طور پر میرے قدم پھر اُسی راستے پر اٹھ رہے ہوتے۔ میں بالکل اس کے قریب کھڑا تھا۔ اُس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اور سر جھکا لیا۔ لیکن پھر سر اٹھایا۔ میں بدستور کھڑا تھا۔ "کیوں"؟ اُس نے حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات سے پوچھا۔ میں اپنی خطرناک پوزیشن پر پریشان سا ہُوا۔ "زرینہ" اندر سے کسی کی آواز تاریک فضا کو چیرتی ہوئی سنائی دی۔ "آئی اماں" اور جیسے کوئی چمکتا ہوا ستارہ ٹوٹ کر رات کی تاریکیوں میں غائب ہو جائے، چغتائی کا شاہکار بھی اپنے تاریک پس منظر میں جذب ہو گیا ؛

آخر کسی نہ کسی طرح میری اُن سے واقفیت ہو ہی گئی۔ وہ اور اس کی ماں سرحد پار کے ایک گاؤں سے آئے ہوئے تھے۔ ان کے گاؤں میں سخت ہیضہ پھیلا تھا۔ اس کا باپ اور بھائی اسی کی نذر ہوئے تھے۔ گاؤں کے تمام لوگ موت کے خوف سے گاؤں چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ ماں بیٹی نے بھی اپنا سامان خچر پر لاد کر گاؤں چھوڑ دیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ ایک دن راستے میں سیلاب آیا۔ جو ان کے خچروں کو اسباب سمیت بہا لے گیا ؛

"شکر کرو تم بچ گئیں!" میں نے کہا۔

"اس مصیبت زدہ زندگی سے تو اگر موت آجاتی تو اچھا تھا۔" وہ خلا میں گھورتی ہوئی بولی۔ جیسے اس کی تمام مصیبتیں وہاں بکھری پڑی تھیں ؛

اس کی ماں اور وہ اب مجھے اپنا دلی ہمدرد سمجھنے لگیں۔ ماں تمام دن شہر سے باہر فروٹ خشک کرنے کی فیکٹری میں کام کرتی رہتی۔ اس تھوڑی سی مزدوری سے دونوں ماں بیٹی کا بڑی مشکل سے گزارا ہوتا تھا۔

ایک دن دوپہر کو جب میں کالج سے واپس آ رہا تھا۔ وہ سڑک پہ مجھے ملی۔ اس تپتی دوپہر میں سڑک پر اُسے دیکھ کر میں حیران سا رہ گیا۔

"کہاں گئی تھی زرینہ"؟

"اماں کی طبیعت خراب تھی۔ وہ سویرے کام پر نہ جا سکی۔ اب طبیعت کچھ سنبھلی ہے۔ اور کام پر گئی ہے۔ میں احتیاطاً ساتھ چلی گئی۔ کہ راستے میں کوئی تکلیف نہ ہو جائے۔"

اس کی ماں کو دل کی کمزوری کا مہلک عارضہ تھا۔ اور اسے اکثر اسی وجہ سے غش آجایا کرتے تھے۔ جس سے وہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ زرینہ نے مجھے بتایا کہ خاوند اور بیٹے کی موت کے صدمے سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے ؛

"آج اُسے کام پر نہیں جانا چاہیئے تھا۔" میں نے کہا۔

"مگر خرچ اتنی ضروریات کا پیٹ کہاں سے بھرتے؟" پہلے بھی مجھے کئی بار خیال آیا۔ اور میں سوچتا۔ کہ ماں بوڑھی ہو چکی ہے محنت کے قابل نہیں رہی۔ اور زرینہ خود کوئی کام کیوں نہیں کرتی۔ اب پوچھنے کا اچھا موقع تھا۔

"زرینہ! تمہاری ماں بہت کمزور ہو گئی ہے۔ بیچاری زیادہ محنت کے قابل نہیں رہی۔ اس کی جگہ تم ہی فیکٹری میں کام کرنے کیوں نہیں چلی جاتیں؟" میں نے سنبھل کر کہا۔

"تو آپ کا کیا خیال ہے میرا دل نہیں چاہتا کہ میں کچھ کام کر کے اپنی ماں کی خدمت کروں؟" وہ بولی "مگر کیا کروں۔ رشید بابو! اس دنیا میں غریب کو کسی کروٹ چین نہیں ملتا۔ . . . غریب عورت کی بھی عجیب زندگی ہے۔ جدھر جائے آوارہ مرد بھوکے کتوں کی طرح پیچھے پڑ جاتے ہیں۔" میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اور پھر خود بخود میری نظریں جھک گئیں۔ وہ بات کو جاری رکھتے ہوئے بولی "پہلے میں بھی ماں کے ساتھ فیکٹری میں کام کرنے جایا کرتی تھی۔ وہاں کا منشی بار بار کسی نہ کسی بہانے میرے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ اور مجھے عجیب عجیب نظروں سے گھورا کرتا۔ ماں نے بھی اُسے دیکھا۔ ہم نے پرواہ نہ کی۔ مگر وہ پیچھا چھوڑتا ہی نہ تھا۔ اُسے سبق سکھانا مشکل بات نہ تھی۔ مگر غریب جب بھی انتقام کے لئے ہاتھ اُٹھانا چاہتا ہے۔ تو اُسے اپنے سامنے تباہی کے بڑے بڑے بھیانک غار نظر آنے لگتے ہیں۔ ہم ذرا سی بات کرتے۔ تو مالک سے شکایت کر کے ہم ماں بیٹی کو ذلیل کر کے نکلوا دیتا۔ اور پھر ایسی مزدوری کہاں سے میسر آ سکتی تھی۔ آخر ماں نے فیصلہ کیا۔ کہ میں گھر پر رہوں۔ اور وہ کام کے لئے اکیلی ہی جایا کرے گی۔" پھر مجھے خاموش پا کر بولی "کیا سوچ رہے ہو بابو؟" "کچھ نہیں۔" اور میں سامنے سڑک پر ایک خشک پتے کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ کہ غریب عورت کی زندگی بالکل اس پتے کی مانند ہے۔ جو ہوا سے اُڑتا ہوا گندی نالی میں جا گرے گا۔ اور اس گندگی میں بہتا ہوا شہر کے بڑے نالے میں جا شامل ہو گا۔ اور پھر وہاں کی غلیظ اور متعفن فضاؤں میں ہمیشہ کے لئے نابود ہو جائیگا۔

اب میں ہر وقت یہی سوچتا رہتا تھا۔ کہ کسی طرح زرینہ کو کہیں اچھا سا کام دلوا دوں۔ کئی بار خیال آیا۔ امی سے کہوں۔ پھر سوچتا۔ ماں کیا کہے گی۔ بیٹا کیوں اس نوجوان لڑکی کی سفارش کر رہا ہے۔ اور پھر یہ اُس کی واقف کہاں سے ہو گئی ہے۔ اور نہ جانے ماں کے دل میں کیا کیا انوکھی بدگمانیاں اُٹھیں گی۔ ماحول ہی جو ایسا ہوا۔

آخر یہ خیال چھوڑنا ہی پڑا۔ پھر سوچا۔ کمال نے بھی کئی بار کہا تھا۔ کہ اس کی امی بیمار ہے۔ ڈاکٹر نے گھر کے کام کاج سے انہیں منع کر دیا ہے۔ اس لئے اُنہیں کسی خدمتگار کی سخت ضرورت تھی۔ اگرچہ کمال میرا سب سے عزیز دوست تھا۔ اور مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ زرینہ کا وہاں جانا ہم دونوں کے لئے موجب ہلاکت ہو گا۔ کیونکہ کمال اکثر اپنے رنگین تجربے مجھ سے بیان کرتا رہتا۔ وہ کئی دفعہ مجھے زرینہ کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ اور اس کا خیال تھا۔ کہ میں بھی اس کی طرح کسی پلاٹ کی تکمیل میں مشغول ہوں۔ حالانکہ میں نے اسے کئی بار نہایت سنجیدگی سے سمجھایا بھی کہ اس کا یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ مگر وہ مذاق میں ٹال دیتا۔ اور وہ اسی خیال میں تھا۔ کہ میرے تیار کردہ پلاٹ میں اُسے بھی شرکت کا موقع ملے گا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زرینہ کے لئے کہاں کام تلاش کروں۔

میں اسی شش و پنج میں تھا۔ کہ لاہور سے آپا کا خط امی کے نام آیا۔ مجھے فوراً لاہور جا کر آپا کو لانا تھا۔ کیونکہ اصغر بھیا اپنی امی کو کسی رشتے دار کی موت کے سلسلے میں دہلی لے جا رہے تھے۔ چنانچہ مجھے اسی دن کی گاڑی سے لاہور جانا پڑا۔

تیسرے دن میں آپا کو لے کر واپس آ گیا۔ سب سے پہلے زرینہ کو دیکھنے کا خیال آیا۔ اس کے مکان کی طرف گیا۔ لیکن اُسے خلاف معمول اپنی اُس مخصوص جگہ پر نہ پا کر کچھ حیران سا ہوا۔ یہ سوچ کر کہ شاید اندر ہو۔ میرے

[illegible] گئے۔ اور دل میں عجیب طرح پریشان کن خیالات آئے۔ شاید اس کی ماں گھر میں موجود ہو۔ اگر کسی نے مجھے
اس کے ساتھ تنہائی میں دیکھ لیا تو نہ معلوم نتائج کیا ہوں! لوگوں کی باتیں گھڑنے میں مزا آتا ہے۔ یہ بھی ان کی
طرح افسانہ بن جائے گا۔ اسی میں جذبۂ ہمت ابھر آیا۔ اور لاحول ولا قوۃ پڑھ کر سوچنے لگا۔ میں بھی کتنا
بزدل ہوں۔ اگر میں سچا ہوں۔ اور اپنی سچائی کا مجھے یقین ہے تو پھر ان بزدل دنیا والوں سے کیا ڈرنا! دنیا
[illegible] پڑے ہوئے اس کتے کی مانند ہے۔ جو ہر راہگیر پر بھونکتا ہے۔ چاہے کوئی اس سے کتنا ہی دور ہو کر
نکلنے کی کوشش کرے۔ یہ سوچتے ہوئے میں اندر داخل ہو گیا۔

دیے کی ٹمٹماتی روشنی میں مجھے چند غریب لوگوں کے اداس چہرے ایک چارپائی کے گرد نظر آئے۔ بجلی
کی سی تیزی کے ساتھ میرے دل میں کئی خوف آمیز خیالات گذرنے لگے۔ میں نے پریشانی سے آگے بڑھ کر پوچھا
"کیا ہوا ہے؟"

"مر گئی بیچاری" کئی زرد اور اداس چہرے ایک ساتھ بول اٹھے۔

"ابھی دم توڑا ہے بیچاری نے۔ توبہ! غریبی بری بلا ہے۔ خدا کسی کو غریب نہ کرے" ایک بڑھیا نے
ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ اور نعش کے چہرے پر سے کپڑا اٹھایا۔

"نیک بخت کے چہرے پر نور برس رہا ہے" وہی بڑھیا بولی۔

"اس کی بیٹی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

معلوم نہیں بیچاری کہاں گئی ہے۔ کوئی گھنٹہ بھر ہوا اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اب کہیں باہر
چلی گئی ہے۔ بڑھیا نے جواب دیا۔

دیے کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ تاریکی بار بار حملہ کر کے اس المناک منظر کو ڈھانپ
لینا چاہتی ہے۔ میں باہر نکلا۔ زرینہ کہاں گئی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں یونہی بلا ارادہ چل دیا۔ دوسری
گلی کے موڑ پر کمال کا گھر تھا۔ اس پریشانی میں اس سے ملنے کا ذرہ بھر خیال نہیں تھا۔ مگر اس کے مکان کے
سامنے پہنچا ہی تھا۔ کہ دروازہ کھلا۔ کمال کا چہرہ نظر آیا۔ اور پھر ایک طرف سرک گیا۔ جیسے کسی کو اشارہ کر رہا
ہو۔ اور پھر ...... پھر آہستہ سے زرینہ باہر نکلی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ چاہتی تھی کہ لپک کر بھاگ جائے۔
مگر مجھے اچانک سامنے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

"زرینہ" میرے منہ سے نکلا۔ اور وہ کانپ رہی تھی۔ اس کا رنگ مردے کی طرح زرد تھا۔ پھٹی پھٹی سرخ
آنکھوں کے نیچے خشک آنسوؤں کی دو لکیریں۔ بکھرے ہوئے بال اور کھلا گریبان۔ میں سب کچھ سمجھ گیا۔ اس
کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر بات اس کے منہ سے نکل نہیں سکتی تھی۔ میں بالکل
بے حس کھڑا تھا۔ خاموش! آخر وہ بولی:-

"رشید بابو! ماں! ــــــ میری ماں بڑی بیمار ہے۔ وہ کل سے بھوکی ہے۔ پیسے بالکل نہیں تھے۔ کچھ نہیں
تھا۔ اب سب کچھ ہے" چاندی کے دو روپے زمین پر گر پڑے۔ جنہیں وہ پاگلوں کی طرح اٹھا کر بھاگ گئی۔
خدا جانے اس میں یہ حیا سے عاری جرأت کیسے آ گئی تھی۔ اور میں سوچنے لگا۔ کہ زرینہ سڑک پر گرا ہوا درخت کا
ایک سوکھا پتا ہے۔ جسے ہوا نے اڑا کر گندے پانی کی نالی میں گرا دیا ہے۔ اور وہ بہتا ہوا بڑے نالے میں
[illegible] گا۔ اور ہمیشہ کے لئے اس غلیظ بھنور میں پھنسا رہے گا۔ اور پھر وہیں گل سڑ کر ہمیشہ کے لئے نابود ہو جائیگا۔

(انور میر)

بہار

ہاتھوں میں جام مے لئے دامن میں لالہ زار
ہر غنچۂ چمن میں نکھرنے لگا شباب

ہر شاخِ گل صبا کے ادب کو جھکی ہوئی
چھینا ہے گلستاں نے شبِ ماہ کا جو نور

شبنم کے روئے گل پہ ہیں قطرے پڑے ہوئے
دامن میں اپنے مہرِ منوّر لئے ہوئے

ہر شے کی زندگی میں پھر آیا ہے انقلاب
ہونے لگا مسرتِ جاوید کا نزول

اپنی حیات و موت کا ساماں کئے ہوئے
چھوٹا سا شاخِ گل پہ بنایا ہے آشیاں

ہونے لگا ہے گل سے عنادل کا پھر وصال
دامن میں خار خار گلستاں لئے ہوئے

ہر قلب کو بہار مسرت سے بھر سکی
کچھ بھی اثر ہوا نہ دلِ بے قرار پر

آئی بہار دے کے گئی سوزشِ دوام
آئی بہار نشترِ پنہاں لئے ہوئے

کوئی خیال و خواب کی دنیا پہ چھا گیا
اک یاس چھا گئی مرے اجڑے دیار پر

وہ چوٹ جس سے جاگ اٹھی سوزشِ حیات
وہ چوٹ جس نے خوابِ گراں سے جگا دیا

رو رو کے سب نقوشِ گلستاں کو دھو دیا
اُف سب بہار آہ و فغاں میں گذر گئی

اُف کس خرام ناز سے آئی ہے پھر بہار
پھر صحنِ گلستاں میں برسنے لگی شراب

گلشن میں ایک نور کی ندی رُکی ہوئی
گلشن کا ذرہ ذرہ بنا ہے چراغِ طور

جس طرح تاجِ زر میں ہوں موتی جڑے ہوئے
ہر ذرہ انبساط کا ساغر لئے ہوئے

گل کا ہر اک ورق ہے کہ آئینۂ شباب
کس ناز سے چٹک کے کلی بن گئی ہے پھول

آئی ہے عندلیب وہ تنکے لئے ہوئے
بیتاب ہو گئی ہیں جلانے کو بجلیاں

تقدیر کی جبیں پہ نمایاں ہوا جلال
ہر چیز ہے نشاط کا ساماں لئے ہوئے

لیکن مرے نشاط کا ساماں نہ کر سکی
شبنم بھی ٹھہر نہ سکی نوکِ خار پر

ہاتھوں سے اپنے چھوٹ گیا عشرتوں کا جام
پردے میں گل کے خنجرِ براں لئے ہوئے

گلشن میں خار دیکھ کے کچھ یاد آ گیا
اک چوٹ سی لگی دلِ بے اختیار پر

وہ چوٹ جس سے کانپ اُٹھی روحِ کائنات
وہ چوٹ جس نے خون کے آنسو رُلا دیا

اشکوں میں زندگی کا سفینہ ڈبو دیا
یارب مری نشاط کی دنیا کدھر گئی

یہ دن ہوں اور تڑپ ہو دلِ بیقرار میں
جی چاہتا ہے آگ لگا دوں بہار میں

سید کیفی رضوی

افتتاحیه

شاه محمود ابن صبا داسې وخت راغلی دے
چې څه ستاسو سره دي. قومونه داسې
تیزۍ سره د ترقۍ په لار روان دي. چې
اندازه ئې نشته. کوم قوم که سستي اوکړي
نو هغه به د خلقو د خندا څه چې هستي به ئې
د دنیا نه ورکه شي. اوس په دومره لنډ
تنګ وخت کښې نه خوشحالان څه کولې شي.
او نه بدحالان. سواله تاسو نه. او که تاسو هم
همت بائیلو نو د افغان قوم نه لاس اووینځئ
تاسو نه پس به په نورو تاریخونو کښې د افغان
قوم تاریخ صرف د قصو په طور ویلې شي. ځکه
چې په دنیا به ئې هستي نه وي.

پکار دي چې خپلې ژبې له ترقي ورکړي. او پکښې
زړه ورو ځوانانو ته تعلیم ورکړي. ځکه چې خپلو
خیالاتو او جذباتو سره ګنډلو د پاره د مورنۍ
ژبې نه زیاته ښه او آسانه بله ذریعه نشته.

بعض رونړه دا وائي. چې پښتو ژبه یو علمي ژبه نه
ده. ولې سوال دا دے چې پښتو ژبې له ترقي
ورکول او علمي ژبه جوړول د ننګیالي پښتون
کار دے. او که د بل قوم. یقیناً دا څمونږ فرض
دی. مونږ له پکار دي. چې خپل ځان پېژندلو د
پاره څپله پښتو د نورو علمي ژبو په مقابله کښې

اُردوو. ولې چې پښتو داسې ترقي نشي کولې
چې پښتون قوم ئې ورته شا کړي. کوم قومونو
چې خپله ژبه هیره کړې ده. د هغوئ ژبه او قومي
هستي د دنیا نه ورکه شویده. یاد لرئ چې قومي
ادب او ژوند د داسې سره یو تر بله نږدې څه چې
په یو بل ډیر دارومدار لري

تاسو ته معلومه ده. چې په هندوستان کښې د
سیاسي او اقتصادي انقلاب نه علاوه یو ذهني
انقلاب هم را روان دے. ذهني انقلاب څمونږ
په ادب بانډې ډیر اثر لري. علم او ادب یو داسې دولت
دے. چې هیڅ کله زوال نشته. یو داسې خزانه
ده چې د هغې څه حد نشته. دیکښې څه فرق نشته
چې ستاسو کور ډاک پرې کړو دے. داسې تنګدستي
کښې سیالي کول ګران کار دے. لیکن بیا هم که
لاس مو په توره کړو. نو که نور څه نه ئې نو یادو
کښې خو به داشو. لاس په توره نه ځما مطلب دا
دے. چې ورو ورو زړه بانډې مورنۍ ژبه کښې تعلیم
شروع کړئ

خو موږه چې دا لاسه مو کېدے شي. نو نورو ژبو
د علومو فنونو کتابونه خپله ژبه کښې ترجمه کړئ.
د ترجمو کولو د پاره د هوښیارو ادیبانو انجمنونه
جوړ کړئ. او د هر انجمن په ذریعه ...

بل ځای ته به کول حواله کړی . دی کښې شک نشته چه دے ټک کار دَپاره به پیسو هم پکار وی . دد دے دَپاره وطن کښې یو داسې ټولے هم جوړ کړی چه څوک دَ مالدارو نه پیسے ټوله وی . او په هغو پیسو د واترجې چهاپ کړے شی .

قومی ارتقا یا لوړوالی دَپاره علم . عمل ښاسته ښه اخلاق . تجارت . زراعت او فوجی تربیت هم ډیر ضروری خبرې دی . غذای ته نزد دے هغه کس دے چه دَهغه اعمال او اخلاق ښه دی . اسلام موږ ته د اخوت تعلیم راکوی . موږ له پکار دی . چه موږ دَذات پات جګړے د نکے کړو . یو منګل شو نه چه یو بل نه ویناره ځکه چه دخت داسې راغلے دے . چه "پدرم سلطان بود" مسئله بانډ کار نه کیږی . که د خه هنر زده وُ . خو ښه په ښه . کنې بیا دِ پوختنه نشته . سه

هغه نا دے چه په ځان بنا ئیستله نه وی
څوک چه ئې څه کاندی بنا ئیستا دَ مود او نیا
څه د ټک چه ما اوس ذکر کړے دے . کسب او تجارت هم د ترقئ په لاره کښې ضروری پوړسئے دی . په دی وجه دا ډیره دَ زړه نو نه اوباسئ . که تجارت مو شروع کړو نو خلق به ورته پواچه یا بنیا وئیل شروع کړی . او دَ ګنهتون وسلئے نه به هم اوباسی . قومونه په پیشه پیا نه ځی . څمونږ پیغمبر محمد لوئے تجار وُه . هغه خو هیڅ دَ قریش نه او ندیستو او سه پورے ورته خلق دَ قریش قوم لوئے سردار وائی .

زراعت هم دَ ژوندُن دَپاره ضروری جُز دے . او چونکه هندوستان یو زراعتی ملک دے . مزکه ئې سوبه ده . او به په کښې پریمانه دی . آب وهوائی دَ هر قسم پیداوار دَپاره موزون ده . دے دَپاره زراعت ته هم توجه ورکول پکار دی . که نور څه نه وی خلق خو به ئې پلمخیته ماره او په بدن پټ وی . بل ملک ته به مشتاق نه وی .

دَ امیرانو طبقے توجه کار خانو طرف ته مائیل کړی . دوی سره په لکهونو روپئ چه خوندی پرتے دی . هغوله پرې باد ورکړی چه په کار خانوئې اولګوی . دَ دی لویه فائده خو به یو داشی چه دَ وطن نه به بے روزګاری څه حده پورے ورکه شی او بل به ملک آباد شی .

داهم څه خو به اوکړئ . خو هسې نه چه دَدی په بدله کښې د ملا نه دَ مشرانو میراث یعنی جهاد دی او شجاعت لاړ شی . که دُنیا ورانیږی او که ورانیږی . خو دا صفت به نه پریکدئ

عروس ملک کسے در کنار گیرد چست
که بوسه بر لب شمشیر آبدار زند

مُلا یز

پیوستون

له قلمه د سمندر بدرشوی!

موزونه شاعري

پیمانه چه مخکښې کړه سیخ دوغه لار
نو هر کوبه ناپوهه شو ناقرار

شو آخر د حضرت عمرؓ عونی نیغ
بلا ورپسې لوړ هم هوښیار

د نا آشنا چا دو تل اختلاف
چېرې پاتې نکړو د ښه کوچنی کار

په دنیا کښې ما یو قدم مخکښې یوړ
د پښتو درد ته کړو ما وزن تار

که پښتو وه بې قافیې بې عروض
پما لوړ ژوړ واړه کړو دبځ هوار

مخالف که شي شخړه یم بې نیاز
د بابا قدم، دم، ښه لار او هار

کهو لوړ کول نن. سمندر ته پلتې
نه بس خاکبازۍ دي دا طفل وار

که چا وې چه دا بحر کم دې روان
"تقارب" مثمن دې مقصور" یار

څونک حالت (ماخوذ)

په سنګلر کښې د سلطنت مغلیه نامود سلطان اورنګ زیب عالمګیر د دې فانی دنیا نه سفر اوکړو. او هم د هغی ورځ نه د دے زبردست د اسلامی سلطنت په هندوستان کښې د زوال نخښې شروع شوې. دا مشهوره خبره ده. چه د بعضې لوئ خلقو اولاد د خپلو مشرانو د صفاتو او د خصلتونو نه محرومه وی. هم دغه شان د عالمګیر اولاد هم د تاتاری او هندی وینې ګډون په وجه خپل زور تیموری خوئ بوی پریښودے وه. او د عالمګیر نه پس د بیر شهزادګان د تخت د پاره قربان شو. د مال د زیاتې په وجه د مغلو له تجمل عیش و عشرت نه واوړید له. هر هر مهرو دی مقابلې ته تیار شو ولے چه کوم خصلتونه په

ټیټه قومونو کښې وی هغه ددوئ نه ډیر
لږی وو. د جهاد ماده ددوئ نه تلې وه. او
که څه باقی وه. خو صرف شراب و کباب او د
سرود و ساز مجلسونه وو. بادشاه به په نشه
کښې خوبیدلے ښکیدۀ او که چا به څه کول هغه
به کول. دغه وجه وه. چه فرخ سیر د سید
برادرانو په اشاره چلیدۀ. او د هغوئ په حکم به
ئے هر یو کار کولو

بیا د محمد شاه په زمانه کښې نادرشاه په دهلی
حمله اوکړه. او هغه قتل عام ئې اوکړو. چه
د دهلی په کوڅو کښې د وینو ویالے روانے کړے
او دے حملے د سلطنت مغلیه په تابوت باندې یو
آخری میخ ټک وهو.

په سنه ۱۸۵۷ء کښې یو زبردست انقلاب خور شو
او د هغې نتیجه دا شوه. چه د انګریزی سلطنت
سکه جاری شوه او تر اوسه پورې خه باقاعده
دا سکه جاری ده.

د انقلاب نه پس مسلمانان بیدار شو. ولے دا
بیداری فضول وه. ولے چه په تش میدان
ولاړ وو. او مکو به ئے مروړلے. دا بیداری
هله داغله چه ملک ددوی د لاسو وتلے وو. او
د یو زبردست قوم په اختیار کښې وه.

په دغه وخت کښې مسلمانان بے یار و مددګار وو.
او دغه وخت سر سید احمد خان او د هغه دوستانو
دا غلطه غوره اوکړله چه د موجوده مشکلاتو
د لرې کولو د پاره د مسلمانانو ته تعلیم ورکړے
شی. او په دے وجه د سر سید ډیره مخالفت
اوکړے شوه. ولے هغه د لیسے غوږ نه ونیو. او په
علیګړه کښې د ایم. اے. او کالج بنیاد کیښود. چه
هغه تن زمانه کښې د یونیورسټی په شکل کښې
موجود دے. او دے کالج په هندوستان کښې یو
داسی ځوانان پیدا کړه چه هغوئ د هندوستان
په مختلفو ځایونو کښې قابل فخر اسلامی خدمتونه
کړی دی. او هم د دغے وجے نه په نورو صوبو
کښې هم اسلامی کالجونه قایم شول.

د سنه ۱۸۵۷ء د انقلاب په وجه د هندوستانیانو نورو
قومونو له هم هوش ورکړے او مغربی تعلیم
هندوستانی خلق د نوے نوے علمونو نه خبردار
کړل. او د مغربی علمونو په وجه هندوستانیانو
د خپلو حقوقو د پاره کوشش شروع کړو. او د
مغربی حالت نه چه خلق خبر شو نو هغوئ ته د
بد حالئ او غریبئ پته اولګیده. په دے وجه په
ملک کښې تمام قسم تحریکی جوړ شو او د خپلو حقوقو
د حاصلولو د پاره جد و جهد شروع کړو. او خاصکر
د جنګ عظیم په وجه خلق لږ هم را بیدار شو. او
ډیر اصلاحات هندوستانیانو حاصل کړه.

قومونه په جد و جهد سره ژوندی پاتے کیدے
شی. او کوم قوم کښې چه د جد و جهد ماده نه وی
هغه د نورو قومونو د خپو لاندې شی. او د دنیا
نه ئې نوم ورک شی. ولے په موجوده وخت کښې

مسلمانان دَ جنګ و جهد ماده نه لري او جهالت
پکښې تېره ده.

هېڅ جماعت له جنګ جهد څخه پکار ده. که چېرې
دغه قوم خلق لړ وي. او هغه د نورو قومونو په مقابله
کښې د تعداد په لحاظ لږ کمزوري وي. ولې
سره د دومره کمزورۍ هغه قوم کښې د جنګ
جهد ماده وي. نو هغه هېڅ کله فنا کېدے نشي
دغه قوم زیلتي هغه دَ فنا کېدو نه نشي بچ کولے
کچرې هغه قوم کښې دَ جنګ جهد ماده نه وي
اسلام یو شاندار مذهب دے. او دُنیا دې په حق
ایجود شوے او دَ نورو مذهبونو نه اوچت
دے. د دې دَ پاره نور مذهبونه په هغه جذب
کېدلے شي. دَ اسلام فنا کېدل او یا دَ مسلمانانو
په نورو قومونو کښې ننوتل هېڅ کله ممکن نه دي
په هندوستان کښې نهه کروړه مسلمانان یقیناً
یو زبردست قوم دے. چې هغه د ډېرو اسلامي
ملکونو دَ اباد‌ۍ برابر دے. او دَ هندوستان نورو
قومونو باندې کافي اثر غورزولے شي. ولې
څو نن دَ بے لښۍ لویه وجه داده. چې څو نن د
مشران دَ نورو قومونو پشان اوچت نه دي.
څو نن مشران اکثر دَ خپلے فائدے دَ پاره تماشه
چلونه جوړه وي. څونکه دَ مشرانو خیالات دومره
اوچت نه وي. چې هغه خیالات دوئ دَ قربانۍ
او یا خلقو نه دَ فائدې د سولو دَ پاره تیار کړي
څونن عام خلق ساده دي. دې دَ پاره هغوئ

اکثر دَ مشرانو په ظاهري خبرو باندې دهوکه خوړي
او بیا دَ غلطۍ جنګ جهد نه نه رانه مات شي.
څو نن امیران دَ دولت په نشه کښې مست دي
او په دوئ کښې هغه جذبات چې کوم قومونه اوچته
وي اکثر نشته دے.
یو زمانه وه چې څو نن جماعتونه په دعالمانو نه
ډک وو. او وړے جماعتونو سره مدرسې هم
شامل وے. چې هغې مدرسو له په دې عالمانو
نه دَ فائدې اخستلو دَ پاره د ډېرو لرې لرې ځایونو
راتلل او فائدے به ئې تري اخیستلے. د هندوستان
په لویو لویو ښارونو مثلاً لاهور. دهلي. آګره.
بدایون. دادانګر. رامپور. الٰه آباد. فرخ آباد
جونپور. بنارس غازیپور. ډهاکه. مرشداباد
ګولکنډه. او بیجاپور کښې عظیم الشان مدرسې وې
او په هغو کښې به خاص عام تولو له تعلیم ورکېدلو
ولے څو نن په دے موجوده زمانه کښې دَ تعلیم
خصوصي انتظام نشته. موجوده تعلیم دَ دماغ او
دَ زړه ده بیدارۍ دَ پاره موزون نه دے. او
ددې تعلیم په وجه طالب علم دَ موجوده ژوندګۍ
دَ پاره تیار نشي کېدلے.
دغه ملک دَ ترقۍ دَ پاره دَ عامو خلقو دَ اصلاح
دَ پاره اوچتول اصلي کار دے. ولې چې دَ ملک
ټول دارومدار په عامو خلقو دے. او دَ
اصلاح دَ پاره دا ضروري ده. چې صحیح تعلیم
د عام کړے شي. ولې ددې دَ پاره دَ حکمت

ذ اصلاح ضرورت دے ـ ځموږ د عامو خلقو
د ټولو نه دیره لوئ مصیبت غریبي ده ځموږ
خلق بږیږي دي ولے چه دوئ سره جامې نشته
صحتونه ئے ځکه خراب دي چه دوئ ته په
موقعه کیدو دوړے نه ملاویږي ـ د بچو د تعلیم
او تربیت نه دوئ ځکه معذوره دي چه پیسه
ورسره نشته ـ غوا مېښے ځکه د اوسیدو کوټو
کښې تړي ـ چه صوبئ د کرموئ په وجه د
یخنئ نه بچ شي ـ جهالت د علم په مقابله
کښې د دوئ ته آرام ورکړه دی ـ مطلب دا چه
د عامو خلقو مشکلات د غریبئ په وجه دي
د دوئ اصلاح صرف د دیر لو پړوګرامو
نښتي کیدے شي.
د یو قوم د خلاصي د پاره د اصلي تعلیم انتظام

یکار دے ـ چه هغه تعلیم د قوم د هغې حالت
پشان ورکولے شي ـ چه هغه تعلیم د قوم ټول
ضرورویات پوره کړے شي ـ یقیناً د هندوستان
موجوده تعلیم د مسلمانانو ضروریات نشي پوره
کولے ـ په پردئ ژبه کښې تعلیم په قومي جوش
او په دماغ باندے ډیر خراب اثر غورزوي
سره ددی ټولو غلبو مسلمانان هم هغه
شان بے غمه پراته دي ـ او هیڅ فکرونه
د خپل قوم نشته دے ـ د داسي قوم د
خدائ مل شي ـ

ع

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

تاج محمد ـ ایف ـ ایس ـ سی

رمیډیکل، سټوډنټ.

پردہ نشین (سانیټ)

ته د بوئ حجاب کښې پټ ئے په محفل کښې د ګلولو
ته شوخي د معصومیت ئے د نسیم د ناز جونو کښې

روح پروره لطافت ئے د شبنم ویده قطرو کښې
مدهوشي ئے د بلبلو د نغمو د سرودو لو

سبزه زار کښې د شنو غړو لو د شنې حجاب کښې پټ ئے
د نغمو په رقص کښې پټ ئې د آبشار د ساز پرده کښې

پیچ و خم د ناحجاب دے د کوهسار ندئ وله کښې
د کوهسار د باد نغمو کښې په لطیف سبيلو کښې پټ ئے

په معصوم کشش کښې پټ ئې د شفق په رنګینو کښې
د چپیا د لوړ نیلئ کښې د خولو لو په جهان کښې

د مرمرو ګرد کښې پټ ئې په خاموشه کهکشان کښې
د مستئ شوخئ کښې پټ ئے د سحر په ستورو کښې

دا د ناز دے که شوخي ده یا حیا ده که نخرې دي؟
تل و سوله مې د زړه دی چه پټان الیسي پردې دي

محمد یونس خلیل

شاعر دَ خدائ تعؐ په دَرګاه کښ (نظم)

ته خالق د دوو جهانو، زه بنده یم ګنهګار یم
ته خالق دَ کائنات یئے، زه ذره دَ کائنات یم

ستا په لوئ جهان کښ زه هُم، یو دَ خیال جهان لرمه
ستا په ملک کښ خلق اوسی، ډیر بے دَردَه ظالمان دی

ستا دَ ملک خلق بندی دی، خوږ ژوندون ورله بیکار دے
ستا په ملک کښ خلق سیزی، دَ هجران په سرو لمبو کښ

ستا په ملک کښ ډیر ډلوګے، ډیرے تندی ډیر غمونه
ستا دَ ملک سامان دَ ذرو، یا دَ زمکی یا دَ زن دے

ستا په ملک کښ حملے دی شته، او نه دَ ترشنه نه دَرمان شته
ستا جهان شکسته زړونه، فریادونه، شور غوغا ده

ستا په ملک کښ بربنډ، اوږی نادنپوره بندګان دی
څما ملک کښ نه څوک اوږے، نه څوک تږے، نه مظلوم دے

ستا په ملک کښ اور ځه لګیدلی، خوګُشتن او زدن کوم
ستا آباد جهان پوهیږم، په معنیٰ کښ ډیر ویران دے

بو یه ستا جهان به کله دَ عشق لوئے تکمیل حاصل کړی
ستا آزاد جهان بندی دے، دَ مکان زمان پابند دے

ستا جهان ته خلق وائی، دَ غمونو غم خانه ده
ته صانع ئے ستا صنعت څه، یو دَ بیچاره ویرانه ده

ستا په ملک کښ څه کوشش دے، څه محنت دے، څه قسمت دے
ستا په ملک کښ هر څه ډیر دی، خو لوکم ځلته بندیان دی

څما ملک کښ ډیره مینه، خلق مست په جی قربان دی
ستا دا ملک دِ عشق خالی دے، په سودا کښ دَ تالی دے

زه دِ تا دَ جواب نه یم، که خطا کړم خطا کار یم
مکان ستا لامکان ستا دے، ستا کوم چه زه خیال یم

بے ادبه ربه نه یم، خو زه هُم سامان لرمه
څما ملک کښ محبت دے، دَ خلق تول حوری غلمان دی

څما ملک دَ جنت ملک دے، هر یو کس ځلته دلدار دے
څما ملک کښ خلق پائی، دَ وصال په مشغلو کښ

په قدم قدم نګیری، څما ملک کښ ربا پونه
څما ملک دمنه پاک دے، بس خواهش یو دَ دیدن دے

څما ملک کښ داشه کوره، په قدم قدم جانان شته
ستا وطن ظلم آباد دے، دَ ستم خونی دُنیا ده

په هر ځای کښ فریادونه، په هر ځای کښ مظلومان دی
نه څوک ژاړی نه فریاد کړی، نه بربنډ دے، نه محکوم دے

مرګ او ژوند یو ځنګا نه ده، سور میدان دَ سوختن کړم
څما ملک څما دَ یاره دَ سرو ګلو ګلستان دے

څما ملک کل مکمل دے، چه پیدا شی ځان کامل کړی
څما بند جهان آزاد دے، بس څما په خیال کښ بند دے

څما ملک کښ عیش عشرت دے، دَ ظهور دے خانه ده
زه شاعر یم څما خیال کښ تل آباده مے خانه ده

څما ملک کښ نه کوشش شته، نه تلاش دوخت انجنت دے
بنیادم ستا په وطن کښ، بنیادم نه دی لیوان دی

دا خو ستا وطن چه ځلته، جمع شوی شیطانان دی
څما ملک دَ دیدن اوښکے، څما زړه دَ عشق مالی وسے

ستا جهان شو برخے برخے ، یو ملکونَ ډیر قومونه ... ډیر ښارونَ ډیر خیلونَ ، ډیر جنګونه فسادونَ

ځما ملک نه یو ځکے نه دے هلته تول وطن د عشق دے ... ګل د عشق ، بلبل د عشق دے هلته تول چمن د عشق دے

ځما ملک د عشق وطن دے ، ځما ملک د عشق چمن دے ... هر یو ګل د عشق نه ساز دے ، که لاله دے که سوسن دے

ستا د ملک پښتان نه هلته په کوځه کوځه خدایان دي ... نه د اهل قوم مذهب ، نه د اسل قمه بندیان دي

هلته عشق مذهب د خلقو . هلته عشق د خلقو قام دے ... عشق د خلقو حکومت دے ، عشق د خلقو یو امام دے

نه انسان شته ستا جهان کښې ، نه د عشق آباد جهان شته ... صداقت چه د عشق نشته ، هلته څه خو کورستان دے

چه دا نه خومره بناؤسته ئے ، هومره ستا جهان بدرنګ دے ... ستا جهان د ملنګانو ، هر یو کس هلته ملنګ دے

ځما ملک ابدی ژوند دے ، ژوند کښې ډیر ډیر محبت دے ... محبت په زړونو خور دے ، محبت در ته رحمت دے

ستا جهان په تا ته ښه دی ، ستا جهان ستا مبارک شه ... دا چمن ستا مبارک شه ، دا بوستان ستا مبارک شه

ما د خپل جهان کښې پریږده ، ستا کوم زه منت یادیم ... نه د خپل وطن کښې اوسم ، ستا د ملک نه توبه کاریم

دا ځما ملک دے ، دا مے ګلون دے ، ځما ملک کښې ژوند رحمت دے ... ستا نه زار شم ، ستا جهان کښې خدا لګو ژوند یو مصیبت دے

که جنت دے که دوزخ دے ، خوزه خوښ په خپل جهان یم
ما ته د جنت پریږده ، آخو زه هم مسلمان یم

میاں سید رسول رسا

عمر خیام

(ترجمه)

عمر خیام د خراسان په نیشاپور نوم ښار کښې د یولسمې صدۍ په آخر کښې پیدا شوے وه . او د دولسمې صدۍ په آغاز کښې وفات شو . د هغه د ژوندون حالات د هغه یو دوست نظام الملک طوسی لیکلی دے . هغه وائي په نیشاپور کښې امام موفق رح یو بزرګ او د قابل احترام عالم وه . د هغه د شاګردانو بابت دا مشهوره وه چه هغوئي به د منت او د خوشحالۍ ژوندون تیروه . یګ وجه سوه عمر خپل والد بزرګوار د هغه نه د علم زده کړے د پاره د طوس نه نیشاپور ته او لیږلم .

امام صاحب ما باندې ډیر مهربانه وه . او ځما هم هغه سره ډیر محبت وه . ما د هغه په خدمت کښې تقلو کاله تیر کړي دي . او چه څه وخت لارم نو ما هلته کښې دوه نور هلکان هم او لیدل چه نوی داخل وه . د یو نوم حکیم عمر خیام وه . او د بل حسن بن صباح د دواړه ډیر ذهین او لایقان د ځونږ ډیره ښه دوستانه وه . چه امام صاحب به څه وخت پاسیدو نو مونږ به یو ځائے خپل سبق یادولو

يو ځل حسن ما او خيام ته او وئيل . "دا منلې شوې خبره ده . چه د امام صاحبؒ شاګردان هميشه د عزت او د خوشحالئ عمر تيروی . نو مونږ ته پکار دی چه مونږ کښې هر يو کس وا د ملا او کړی . چه که څوک سلطنت کښې مونږ ته ښه ځائ ملاؤ شو نو هغه به نورو دوؤ ته پکښې حصه ورکوی د څه حجت نه و د کوی" . مونږ ټولو په دے باندِ اتفاق او کړو . او قسمونه مو او خوړل

Transoxiana

کلونه تير شو . او څه د خراسان نه تر السو کنسيا نه تلاره . او د هغې ځائ نه په غزنی او په کابل چه واپس راغلم . نو ما ته د الپ رسلان (Alp Arslan) په سلطنت کښې د وزارت عهده او سپارلے شوه .

هر کله چه ځما ملګرو ته دا پته او لګيده نو هغوئ د وعدے مطابق ځما نه د حصے غوښتلو د پاره راغلل . حسن ته ځما د سفارش په وجه ډيره ښه ځائ ورکړے شو . خو خيام د ملازمت نه انکار او کړو . او وے وئيل "چه ما ته دِ يو داسې ځائ راکړلے شی . چه زه په دُنيا کښې د علم سائنس خدمت او کړم" . چه ما ته څه وخت معلوم شوه . چه

عمر لوړی بالکل نه کوی . نو ما هغه ته د نيشاپور د خزانے نه د دولس سوو مثقالو سالانه وظيفه مقرر کړه . چنانچه عمر خيام په لږ وخت کښې په علم نجوم کښې ډير لوئ کمال حاصل کړو . د ملک شاه په زمانه کښې هغه مرو ته راغلو . او د علم سائنس په وجه مره د بادشاه ډير خوښ شو . عمر په خپله زمانه کښې د اتو عالمانو نه يو وه .

عمر خيام نيشاپور کښې په ٥١٧ سنه مطابق ١١٢٣ سنه وفات شو د خيام يو شاګرد نظام خواجه سمرقندی د خيام په باره کښې داوائی . چه هغه به اکثر ما سره په باغ کښې ګرزيده . او خبرې اترې به يے کولے . يو ورځ ما ته او وئيل چه ځما قبر به داسې ځائ کښې جوړ کړے شی چه چار چاپيره ترے نه د ګلاو بوټی وی . څه موده پس چه زه بيا نيشاپور ته لاړم نو ما اوليده چه د هغه مزار نه چار چاپيره د ګلاو بوټی وه . د ايران اکثر شاعرانو د عمر خيام د شاعرئ تقليد او د هغه د خيالاتو پيروی کړيده . د هغه رباعيات کښې اکثر د شرابو ذکر موندلے شی . او هم د هغه وجه ده چه څه وخت د هغه رُباعياتُ ترجمه فتز جيرالډ په انګريزئ کښې او کړه او د يورپ اقوامو ته يے پيش کړه . نو ددې قسم خيالاتو خلقو د هغه رباعيانو ته ډير د قدر په نظر او کتل . چنانچه په امريکه او انګلستان کښې عمر خيام ته اوسه پورې ډيره شهرت لری . ولے واقعات دا دی چه عمر خيام نه صرف يو شاعر بلکه يو لوئ عالم او سائينسدان هم وه . هغه د خپلے زمانے يو لوئے فلسفی او د علم حساب الجبر، علم هندسه او علم نجوم يو لوئے عالم تير شويدے .

تمر علی شاه دوديم کال

دَ ژلی بیلتون (یو لطیفه)

دَ باسول نه دوه تنکو هویان دَ کیتے په نیت پیښو
مو تردادوان شو. دَ هر یو په ترخ کښی یو جوړ جامے دے
او په اوکمسئے ریښت وه. او په لاس کښی ئے دیلئی وو
ودیو سر یو چاینډانئ هم وه. او ستړی ستومانه مازیګر
کښی کال ته را اورسیدل. سبان ګل شابرهان ته
یئ ویئلی. هن دا دوه آنے واخله او دهتئ نه د دوو
کرپیسو چائے، دَ آنے شوده او د دوو پیسو بوره راوړه
دَ شابرهان په تیوس تیوس هتئ ته اورسیدو. دَ
هندو نه ئے چائے او بوره واخسته. شابرهان
نه تر چائے لګے نهکاریدے خو چونکه بوره ډیره وه لو
دَ تګسئے اونکړو. دلو کوچونه ئے شوده هم واخسته
او وا روان شه.

(چائے پخے دی. دواړه ورته په مزکه پړلتنو ولے
دے او خبری کوی)

سبان ګل: شابرهانه ایله په مو پیدے چایو سا
صورت پیځائے شی.

شابرهان: رشتیا دِ اوو ویئلی. یو ستومانه یو. او
بل چایو کښی بوره شوده ډیره دی.

(سبان ګل د چایو دپیالے نه کوټ اخلی خو بیه
بیرته ئے غړ زدی)

سبان ګل: اسے په کوروں چه دا خو داسی تریخے
دی لکه زهر.

شابرهان: دا څه وایئے؟ بوره خو کښی ډیره
ده. ګلاچه هندو هم غولولے وه.

(چائیدانئ کښی لږکے وهی)

سبان ګل: ولئے . . . . په دَ ربابا چه
دے کښی خو الواده .

شابرهان: بنا . . . .

(دواړه هندو له سر د چائیدانئ ځی)

سبان ګل: هندو! او ګوره خوار شی. دا ډِ ډیره
دا کړے ده:

(هندو په چوکئ دَ خندا نه لغړی خو آخر ځان
قابو کوی او ترس خوری)

هندو: (په خندا کښی) خر هن واخله دا چینی. بیا
بوره مه وایه. چینی وایه

فضل حمید د ودهمبی کال.

FROM THE WOODLANDS

Awake ! arise ! to fare afield
To seek the joys the meadows yield ;
The air is blythe, the sky is blue,
The hedgerows sparkle rich with dew
While fragrant zephyrs breathe around
The lark to heav'n her matin sings,
And hill and grove and brake resound
With subtile blossom-whisperings.
Come ! I shall lead you by a way
Close-sheltered from the open day
Through dappled gorges where the rill
Comes frothing, leaping down the hill ;
Through matted woods, past gurgling brooks,
That slowly work their sedgy way ;
Through sunny glades, past noisy nooks
Where gorgeous birds of song delay.
There midst the buzz of busy bees
Shall Nature teach her secrecies ;
And birds and buds and blossoms fair
Divine and gladsome news shall bear.
There, stretched upon some grassy isle
We'll chant a ditty, sweet and gay,
Unrest and cares forget awhile—
And live all lifetime in a day.
Anon our hearts shall freely share
A purer joy, a larger air ;
A heav'nly ray, benign and bright,
With sacred peace our souls shall dight.
And having been uplifted thus,
When coldly shines the moon sublime,
To town we'll bear this gleam with us—
A solace for the aftertime.

E. A. PIRES.

PARADISE

In the course of a letter to the Editor-in-Chief, an Old student on active service writes from "Somewhere" :

"When I was at the College I used to be disgusted with life. Now, after I have seen most of the Colleges of Bombay and Sindh, I think our College is a paradise as compared to the dirty hovels one finds over here. E.... College, for example, is just like a dungeon. The sun rays never manage to enter it the whole year round. One always has to work in artificial light."

where we met two Englishmen of the R.A.F. who had stayed there for two nights. They showed us the different tracks on which they had moved about. Then we went about two miles ahead to see the glacier. The glacier produced a sense of grandeur and awe as the stream rushed just beneath it. We carved figures on the glacier, ate ice, washed our faces in the ice-cold water, took some snapshots, and returned to our halting place. We rested for some time and bought a sheep,—because no meat was available, and then returned to Liddarwat in the evening.

Next morning we walked on from Liddarwat to Sikhwas (alt. 12,000 ft.). It was at a distance of eight miles ; on the way it began raining. The rain caused us anxiety as we were to cross difficult passes which cannot be crossed in wet weather. In the evening a very strong chilly air blew which dispersed the clouds and also our worries. We passed the night in this place. After passing through Tajimarg valley, which was covered with fold after fold of beautiful pink flowers, we reached the highest point of our trek (alt. 14,000 ft.) from where we were to descend. The descent at many points was very steep. That day we covered more than 24 miles' distance and at last came to a place in the Sind Valley one mile from Gumbal. The altitude of the place was 6,000 ft. and we were back in a fertile valley. We were now on the road which led to Laddakh and next morning we started towards Kangan. Near Kangan we saw a depot of supplies for China which are carried along this road. We had not yet reached Kangan, when fortunately we got a lorry for Srinagar. At the arrival of Ponywalas we put our luggage into the lorry and reached Srinagar, and pitched our tents again in Chinar Bagh. The next day being Friday we went to Hazrat Bal mosque in a shikara. There were thousands of Mussalmans who had come to offer prayers here. Several Maulvis were addressing the groups from different places. We offered our prayers and returned to Chinar Bagh in the same Shikara. The next day we spent visiting the bazaars, and doing some shopping and enjoying ourselves in various ways. The 9th July was a Sunday and we visited the Mughul gardens. The Chashma-i-Shahi is in a Baradari of the Mughul style. The Harwan lake is used as a reservoir for the supply of water to Srinagar. It is a very beautiful small lake and on its bank we took our meals. On our way back we visited the government fishery. Then we visited the Nishat and Shalimar gardens. Perhaps due to the shortage of water in the reservoir, there was no water in the gardens and so the visitors were not many. We met the Edwardes College hiking group in Nishat and exchanged snapshots with them. In Shalimar we made our own tea. On the way back we visited the match-box factory at Baramula. We reached Murree late at night and occupied two rooms of a hotel. The next day we spent in seeing every beautiful spot of Murree, and the following day we reached Rawalpindi, where the party dispersed.

SYED ABDUR RAHMAN,
IV Year

Chinar Bagh where we found two tents pitched. We took our meals in a hotel, and being tired we went to sleep.

The next day we went to see the main bazars and Professor Sahib obtained permits for flour, kerosene oil, wood, and other necessities. In the evening we went to see "Shankar Acharya", a temple built on a hill 6,200 ft. high. The temple-hill, known as "Takht-i-Sulaiman" is a place which gives a very fine view of Srinagar. It gives a bird's-eye view of the Maharaja's palaces, Shahi Chashma, the Mughul gardens—Nishat, Shalimar, and Nasim—the Dal lake, Char. Chinar—a small island in the "Dall", the Hari Parbat—a huge-old fort on a hill, the main city, Renawari—an outskirt Mohalla. Badami gardens and a distant aerodrome.

The next day we visited the city in 'Shikara' boats. Srinagar is a city of seven bridges, with the Dall Lake beyond it. So one can easily move from one place to another in Shikaras. At every place one hears the confusing noise of "Shikara Sahib, Shikara Sahib". After enjoying boating we went to see Srinagar Jami Mosque. This mosque was built by Subedar Malik Haidar, the Kashmir Governor, in the days of emperor Jehangir. It is beautifully-built and covers a large area. We climbed the minaret, from where we had a very good view of the city.

Next morning we left for Gulmarg. The road passes through a very beautiful valley. We reached Tangmarg (alt. 7,200 ft.) at one o'clock. We hired a coolie and marched on foot up the hill. The track on foot is two-and-a-half miles upto Gulmarg (alt. 9,200 ft.) but is very strenuous as the slope is very steep. The hill is covered with pines. Then we went upto Khillanmarg (alt. 11,200 ft.) At Khillanmarg, we felt sudden cold. We sat by the side of a "Chashma" famous for its sweet and cold water. The snow is at only a mile's distance from here. We lit the fire, heated our bread and curry, and took meals. Just then we started back. Wular Lake and Lolab valley were far in the mist. The descent was fairly easy. We rushed through Gulmarg and reached Tangmarg. One of us fell ill. We hired a pony for him and reaching Tangmarg we went back by lorry to Sirinagar. All of us were very much tired, but the energetic Madari gave us tea and food, and we went to sleep.

Next day we started for Pehlgam. The valleys on the way presented a wonderful scenery. The Pampur safferon fields, the Awantipura ruins of an old Kashmir capital, the Matan water tanks containing fish in profusion, and Aish Maqam Baradari on Saint Nuruddin's tomb, are wonderful sights on the way to Pehlgam which we reached in the evening. Pehlgam is a very fine place. Here meet two streams from two valleys which open out at Pehlgam. Just on a hillock amidst the two streams we pitched our tents The next day we enjoyed a ride on ponies. After taking our evening meals we walked about in the club area, in the moonlit night. with the two streams murmuring on either side of us.

Next day we went to Bai Saran (alt. 8,500 ft.) but later decided to go back and proceed to Aru. Aziz having been ill till now, was sent back to Srinagar. The way to Aru is a pleasant course of seven miles. It is the last village in those huge mountains—with green fields of wheat and barley in July. Aru was the place which each one of us liked most. We pitched tents in a beautiful meadow. The scene in the moonlight created a hundred fancies, and poetic thoughts. Unfortunately none of us was a poet, otherwise he would have composed his best poem there. It left a permanent impression on every heart.

Next morning, we moved on to Liddarwat, a valley full of natural beauty. At Lidderwat there were only a few Gujar-huts, and a small house for visitors. Next morning we decided to see the Kolhai glacier. We got up early in the morning. The way, though not a very difficult ascent, is all overspread with huge stone boulders, and is very rough going. We reached the first stage at 10

that is, towards the stick. It is an experimental demonstration of the thinking power of a plant and show how it takes the present pain of going sideward in order to secure the future pleasure of going up in an easier manner."

After all this, I did not know what to say, for the distinction I had drawn between a man and a beast had proved untenable. I remained silent for a moment and then said "In man there is morality—another sense which differentiates between good and evil ; our conscience tells us that an act is evil and we are not to do it though our reasoning may ascribe numerous benefits to [illegible]

The professor replied by giving another of the huge stock of examples he seemed to have handy. In Hardawar, a monkey had taken away the clothes of a traveller. After some time the monkey came back and returned the clothes to the traveller. This shows that he felt remorse ; his conscience pricked him and so he returned the clothes to the traveller.

I understood the meaning and in order that no more examples should come. I interrupted him and said, "There may be two more senses peculiar to man—the sense of beauty which tells us what is beautiful and what is ugly and the mystic sense which gives man everpresent fear of God." The professor replied. "How can you conclude that a beast does not possess these senses when we see every day that animals do not eat the dry or rotten grass or fodder when they are not hungry. They know that it is not beautiful and not good for health."

All my reasoning failed. Now tell me, brothers! *what should I say.* I again felt sad ; only the variety of sadness was changed by my revered professor.

PREM PARKASH KAPOOR, IV YEAR.

A trip to Kashmir

As previously arranged we assembled at Abbottabad on the 24th June The party consisted of eight students, Prof. Ziauddin, and Madari. Early on the 25th, we started for Sirinagar. The road lay before us like a serpent, ascents and descents being very frequent. The Batrassi Jungle covered with camps of the army proved that man's work was a compliment to the art of Nature. We passed through Garhi Habibullah, a place on the bank of Kunhar Naddi which was named *Nain Sukh* (Eye-balm) by Queen Nur Jehan. The cold water of the stream had helped in healing the sore eyes of the Queen. Two and a half miles further we reached Ramkot, on the border of Kashmir. Here we paid the road toll, and moved on ; passed through Muzaffar Abad and reached Domel where the roads from Abbottabad and Murree meet. As the custom officer at Domel was very busy, we had to wait for a long time. When our turn came, we paid the custom duty, and were permitted to proceed. From Domel onwards, the road runs along the Jehlum river, and has no abrupt ascents or descents. At Chauri we took our meals by the roadside. Then we proceeded further. The valley which in the beginning was very narrow was now opening out. The water canal built for the production of electricity is a wonderful feat which cannot escape the eye of one taking his first visit to the valley. The lorry moved through the rice fields. There was rice on both sides, and rice stretching into the distance as far as eye could see,—in a valley bordered with pine-covered green hills—unlike the barren Khyber hills to which our eyes are accustomed. We reached Baramula in the evening—a big town on both banks of the Jehlum river. There is began drizzling. We reached Srinagar at 8, and went to

available assistance from voluntary public organisations should be welcomed. Campaigns similar to the one that was inaugurated by the popular ministry in the U.P. in 1938 and literarcy programmes as initiated in Kashmir State should be adopted on a wide scale. Group teaching as well as individual teaching of adults may be resorted to liberally with the help of University students.

The Royal Commission on Labour in 1930 deplored "the disastrous effects of the whole mass of industrial labour being illiterate—a state of affairs unknown to any country of industrial importance." If Adult Education, coupled with universal primary education, is taken seriously, it will prove highly beneficial to the nation as a whole. Literate labourers are always efficient and able to command better wages. This will obviously raise the standard of living of the people, which will be a distinct advantage to our motherland.

Adult Education among women should not be neglected. The role of women in the life of a nation is very important. Indifference towards the fair sex can only be detrimental to the national cause. Literate women are an asset to the nation. A wider and saner outlook on the part of women will inevitably have a happy and pleasant effect on the future generation.

H. C. SAIGAL.

What Should I Say

One day one of my professors saw me walking alone in the garden and enquired from me the reason of my melancholy mood. For the moment I did not know what to say, and so I kept mum. At this he said, "All right tell me the difference between a man and a beast". I was wonder-struck to hear a strange question so suddenly, but still I replied patiently, "the main distinction between a man and a beast is the sense which may be termed the sense of reasoning."

The professor said, "How do you say that animals do not think, they sometimes think better than men. I give you a few examples of their intellect. Recently in the jungles of Madras, a party of hunters was trying to catch elephants. One fell down into the pit and the other's brain warned him of danger and he ran away. He could not bear the loss of his friend. The next day he brought a bamboo, and chewed one end of it. Holding it in his trunk, he went to the same place the following night, and seeing the sleeping men in the machan, he put the brush of the bamboo into one's hair, twisted it, pulled him down and killed him. In this way the elephant took revenge for his friend's death.

Take another example. The champanzee acts like a child and is generally kept by American ladies as a pet. He just sits like a child beside a man to take his tea and meals. One day a lady put on new clothes to go out when her chimpanzee wanted to sit in her lap. When she did not permit him to do so, he at once guessed that she had put on new clothes and was worrying about them. Suddenly he went to the reading room, brought a paper, put the paper on her lap and then jumped into it. How marvellously he gratified his feelings of love." Then the professor gave me another example of how a camel remembers his enemy to take his revenge. When the professor saw me amazed and incredulous he told me that even plants can think. "See a creeping plant", he said, "it will always go up in a circular form. Take a stick and fix it in the ground to the right side of the plant. The curly growth of the plant will be towards that stick and it will ultimately reach the stick. Take the stick out and fix it to the left of the plant ; the plant will then move towards the left,

Adult Education

India has a large illiterate population. The curse of illiteracy has been, since the advent of provincial autonomy, engaging the attention of educationists, statesmen and politicians. They all seek to attain a befitting status for India among the nations of the world. Different schemes are being put forward to achieve the complete liquidation of illiteracy with a view to enhancing the country's prestige and ameliorating the miserable condition of its ill-clad and ill-fed millions. That the public in general has begun to take interest in this very essential aspect of the nation's life is indicated by what are called 'literary campaign' and Adult Education schemes. Adult Education implies the imparting of education to adults who have been neglected in their childhood and denied opportunities of receiving education. They have an inherent right to be educated to become "effective and efficient" citizens of the state, and thus to help promote the cause of democracy. The solution of the problem of illiteracy lies in free, compulsory and universal Primary Education. But universal primary education can only be accomplished after illiterate parents have been transformed into literate ones. They would automatically feel responsible and begin to appreciate the immense value of literacy in others and specially in their own children. The lack of stimulus amongst the parents is undoubtedly one of the greatest obstacles in the way of universal primary education. But literacy among them will certainly prove conducive to the rapid and effective progress of primary education.

"Literacy is a means and not an end in itself." The more literacy there is among the adults, the better for society. It would indeed be a step forward in the right direction. The goal of education is, however, to promote and improve an individual's personality and develop his inherent physical, moral and intellectual qualities and thus elevate him to the status of a good citizen.

If a society wants to achieve effective and beneficial results, it should make arrangements for adults to undergo a thorough literacy course by learning not only the 3 r's, but also elementary principles of everyday Science, Hygiene, Economics and General Knowledge. Of course public attention towards adult literacy has increased tremendously, yet the progress has not been satisfactory. It requires a continuous and powerful campaign through the joint efforts of the Government and the people, if the desired results are to be attained. The Government should encourage and assist by providing Adult Education experts in every province to formulate schemes, to tour the different districts, and to set up Adult Education centres and appoint Adult Education officers to look after the proper execution of those schemes.

Adult Education Libraries should be started and equipped with adequate and necessary material for the teacher and the taught. Adult Education Committees, consisting of official as well as non-official members, should be formed to propagate the purpose and usefulness of Adult Education. These committees are bound to evoke a profound interest and to attract public attention if their propaganda machinery is tactfully handled. There is every reason to believe that the masses will soon begin to take full advantage of this opportunity. Only in these ways can illiteracy be abolished.

"The real India", as one very prominent Indian once said, "can be found in the rural areas." It is therefore essential to focus our energies on the rural areas as well as on the industrial centres.

Adult Education clubs and societies should be started. Lectures on subjects of general interest and on the utility of education should be arranged. All

"What shall be done". Suddenly an old doctor rises and speaks to the audience : "Gentlemen, I have read innumerable books at the Berlin University. British Museum, the Paris Library and at several other libraries of the world. Today I have come to know that the scheme presented by Prof. Zahir is not his own creation."

A wave of surprise runs throughout the audience, and people look at one another with amazed faces. But the doctor continues. "There is nothing new in Prof. Zahir's plan. 1375 years ago a message called the Quran was revealed to Mohammad, the prophet of Arabia, which contains this scheme."

The audience now disperses and everyone goes out in search of a copy of the Quran. Those people in the audience who call themselves Muslims have no difficulty in finding it. for everyone of them on going home discovers a small bracket built high up in a wall of the innermost room. On the bracket lies a book wrapped up in a number of satin covers. The covers seem to have been very beautiful once but they are now all covered over with dust. The Muslims begin reading the Quran again and find it a wonderful book. They pass it on to other people and everyone begins reading it. The more people act upon it the happier they become. The old doctor's allegation against the origin of Prof. Zahir's scheme is found to be true, but he only receives another Nobel Prize for re-introducing to the world a book which has brought so much happiness to mankind.

A. R. CHOHAN

MORNING

The day is at hand :
The stars haste to fade :
Night's blanket of shade
That covered the land
In the grey, eastern sky
Lies scattered and torn.
The Sun leaps on high :
A new day is born.

H.H.

A CHILD'S SONG

O, my God ! I pray to Thee.
My heart and soul in Thee to be.
Give me the Strength by which I can
By deed or thought help weak man.
Teach me to treat my friends always
In humble, good and truthful ways.
Land of my birth, I worship Thee.
Thy soil is Paradise to me.
Give me the Strength by which to give.
Unity to Nations where I live.
I'll be ready if need arise
For Mother-land my life to sacrifice.
My parents suffered for my gain
They strove for my good and strove again
Give me the grace and strength to give,
For their love, obedience while they live.

M. SIDDIQ, KARDAR.
I Year (Agr.).

(7) There should also be a common President for the whole world who should be elected by common franchise and I think his headquarters also should be in the desert.

(8) There will be trade co-operation among the different countries of the world and no tariff will be enforced.

(9) Murder, adultery and theft are the three main crimes which cause disturbance in the world. There is no need of jails. To imprison a man and then release him after sometime does not prevent him from repeating that sin. One who has committed adultery must be whipped a hundred times. The murderer must be murdered and the hands of the thief must be cut off.

(10) All education should be based on the following two great hypotheses :

(a) Man is helpless. Lord created him to lead a simple and pure life. He has to keep ready for a trial after his death That examination does not consist of science or mathematics but of deeds which the has done in his worldly life.

(b) He should not covet money, lands or riches, because these are the central causes of wars. He should be contented with whatever he possesses.

(11) Nobody in any country of the world should try to invent weapons harmful for human beings. If found, these weapons should be destroyed and the inventor punished.

(12) The meat of dirty animals should not be eaten and the use of wines should be forbidden.

(13) Woman is a weak creature and can be caught easily in the traps of evil. Her character should be moulded in such a way that she may become the embodiment of gentleness and modesty. She must be faithful to her husband.

(14) The last point is about religion. The religion which is based on the commandments of one and only one God and into which no human brain has introduced his wisdom should be adopted by everyone. It should teach respect for all the prophets."

The world pondered over the Professor's scheme ; the League thanked him and admitted him to be the Greatest thinker of 1950. He was awarded the "Nobel Prize" for such a marvellous thought. The professor spent the prize-money in getting his speech printed and distributed.

★ ★ ★ ★

A sudden change has taken place in man's life. Everywhere is peace. The first world-President elected is a curly-haired black negro of Africa. The white men of Europe, the yellowish Chinese and the wheatish men of Asia all accept him as their Head. His capital is in the deserts of Arabia. No tongue in the world speaks of his blackness, wildness or inferiority. Men, women and children have begun to assemble five times in the day. There are no military departments. The industries which used to make weapons have been destroyed, because the people have begun to realise that there will be no need of wars in future. Literature which formerly used to rouse wild instincts and hatred for nations has been burnt. Propaganda against drinking has been carried on so widely that Society itself has begun to hate wine. Peace and prosperity have spread all over the world once again.

People are gathering in the desert for the first time. Only the blue horizon can encircle them in the desert. About two lakhs of men of different complexions, speaking different languages, wearing different dresses, have gathered. At this time the scholars hold a debate for discussing the scheme

The Dawn of Happiness

(1950)

Now at this time when the world had seen air-raids, destruction by guns and tanks, deaths of millions of its inhabitants by poisonous gases and magnetic fences, it was in need of peace. Prof. Zahir of Egypt wrote a book called 'What Shall Be Done' in which he chalked out a programme for peace. Every newspaper of France, Germany, England, Turkey, Belgium, Holland, Russia and Asia printed the message of Prof. Zahir, but still the demand for the book was undiminished.

The world did not want to see the bones of millions of creatures heaped up again as it had seen for several years. It had met hunger, thirst, famines, nakedness, epidemics and was now seeking for peace. Every church, mosque and temple was echoing with the cries of men that could only be satisfied with peace. In such a state a copy of "What Shall Be Done' was lying on every table in every corner of the world. Scientists, Philosophers, Ministers and Politicians had once again concentrated their attentions upon the establishment of peace.

The Government of Egypt on the invitation of the League of Nations sent the Professor to Switzerland to broadcast his message from there. The airfield from which he had to fly was crowded with people of all nations, and the view was even seen by Churchill Hitler, Roosevelt, Gandhi, Jinnah and the Japanese King through Television.

At last Prof. Zahir broadcast the following scheme for peace from Switzerland :

"Now when each and every administration has failed to give peace to the world and every member of the human race is tired of wars ; for this tired world I am offering a scheme which, if acted upon will not allow any man to dye his hands with human blood. There will be no wars, no conspiracy, no parties, no enemies Nations will unite, rulers will embrace one another and the leaders will not rouse the feelings of one party against the other. I request you to think, read and listen to my 'Peace Gift' to the world.

(1) In every country of the world, in every province of the country, in every district of the province and in every village of the district, there should be a committee consisting of the occupants of that territory, men and women, old and young. This committee should meet four times during the day and once at night at a fixed place to repeat the promises they shall make.

(2) Once in a week all the people of that village or town should gather to lisen to their promises again.

(3) Then twice a year all the citizens must assemble in some open place where they should embrace one another and remove their grievances which might have emerged during the year.

(4) Every individual should visit once in his life a place where there is no difference of nations, religion and colour. But for such a grand gathering we need some big open place that should be free from the temptations of the present world. I would prefer some desert for this purpose.

(5) No body should claim to be a king and every nation shall consider God to be her King.

(6) Every country shall be free and shall not make its neighbour a slave. People shall elect their president who will be the guardian of the orphans, beggars and the cripple. Every beggar shall have the right to check the president if he is in the wrong and the latter shall have to admit his fault or remove the beggars' misunderstanding.

Round the Play-Grounds

Hockey.—Mr. Ghafoor has been appointed captain of the team. The First Year admission in last May brought some good players of hockey and an excellent team was formed after the re-opening of the college in October. Regular practice matches were played and a high standard of game was maintained. The team had also the privilege of going to Kabul and playing matches on the occasion of 'Jashan Celebrations' there.

In our first university match against the Edwardes College our team, played exceedingly well and won a victory for the college by two goals to nil.

With great confidence we looked forward to the result of our second match against the Government College, Campbellpur, but unfortunately our expectations did not come true. Although ours was the stronger side, we lost by the single goal scored in the match.

Football.—Mr. Abdur Rehman continues to be the captain of the team. With Akhtar and Abrar as members of the team we were confident of going far but unfortunately Akhtar was unable to play the University matches. This was a great loss to our team. Dr. Pires did his best in organising the team and arranged regular matches against different teams in Peshawar. In our first University match against the Edwardes College we lost by one goal to nil after a drawn game.

Abrar has been selected to play for the Punjab University team in the Inter-'Varsity matches. We congratulate him on his selection. He displayed a very good game in the match against the Lucknow University in the semi-finals.

Cricket.—The team had a paralysing blow by losing a player like Hameed who had been awarded the Roll of Honour in Cricket last year. It was all due to the efforts of Mr. Sadiq that the team has survived the loss. The team played some matches against different clubs and went to Lahore to play their University match against Prince of Wales College, Jammu with Mr. Jagdip as the captain. Unluckily we lost the match after a contested game.

Tennis.—Mr. Fazli Mahmood is the new captain. Last year the Edwardes College could not find a pair to compete for the Col. Keen Cup and so the trophy remained with us for the fourth successive year. We expect to win the trophy this year too. In this field, too, Mr. Hameed's loss has been greatly felt. Hameed and Mahmood displayed a very good game at Kabul when the pair won their matches against the British Legation and the 'Wizarat-i-Maarif there.

Athletics.—Mr. Iqbal Quraishi continues to be captain. Our great athlete and University Blue—Khwaja Rashid—has left us and his loss is irreparable. Prof. Hadow Harris and Mr. Adil Khan are taking great pains in giving the athletes regular practice and we hope to give a good account of ourselves in the coming Inter-College Athletic Meet. We hope to win again the Military District Championship trophy.

Ten of our athletes are going to participate in the Rawalpindi District Olympics. We wish them good luck.

Other Games.—Mr. Razzaq seems to be labouring hard for creating an interest among the students for other games like Volley Ball and Basket Ball, and he has been successful in his endeavours to a considerable extent. Boxing continues to attract the attention of a few.

K. K.

(7) *Use of Library.*—By insisting on students to read books, current papers and periodicals. In tutorial groups, ordinary classes and mental culture work periods, teachers should advise students on what and how to read. Hints on the use of books and on what a reader must look for in different types of books should form an important feature of college and school libraries. Through the 'Book Circle', divided into groups, a selected number of choice books may be given to students to read and give short talks on, the best criticism and presentation being awarded a prize. In this way, each student gets to know about many books, even if he himself has read one.

(8) *Scholarship.*—For every subject of study there is to be a 'scholar', usually the best student in it. He is to encourage, even compel by his own example, other students to work hard, and do well in their respective subjects of study. These scholars are in respect of students' duties what their leaders are in respect of securing rights and privileges in the general life of the institution.

(9) *Use of Dictionary.*—By exhorting students to consult a dictionary, when in doubt. This can be done better by example set by teachers, if they themselves send for dictionaries in class-rooms, when they are in doubt.

(10) *Common Sense.*—An effort should be made to develop students' common sense. This can be done in many ways, for instance, by consulting a railway time-table, university calendar, encyclopaedia or dictionary, and solving common riddles, small problems of arithmetic, cross-word puzzles, chess and bridge problems, etc.

(11) *Psycho-Analysis*—of some students may be undertaken in order to understand their tendencies, so that a proper guidance may be given to them on their studies and activities.

(12) *Some aspects of Journalism.*—Training in news-reporting, editorial writing, correspondence, and caption and head-line writing should be given to students as an adjunct to the work in connection with the college magamine. A work of this kind may be very useful, particularly when formal instructions are given by the teacher undertaking it.

(13) *Written and Oral Examination in Mental Culture.*—This examination should include some practical work also, by means of which students' efficiency can be tested. In the theoretical test, questions may be asked concerning every-day science, current politics, problems of world and Indian importance, observation, memory, initiative and intelligence, etc.

Of course, there are several other aspects of the teaching of mental culture which I have omitted here, and which are included in the course published by me in a booklet entitled "Towards Better Education". How can this course be fitted into the scheme of our present studies is the next question? It can be done by curtailing formal lecture work in most of the present subjects of study. Some of the time thus saved could be treated as leisure in which students and teachers could think over the problems agitating them, and some devoted to the work on mental culture, both in formal classes and outside. And to give to this work a seriousness that alone can make it effective and useful, it should be included in the general college time-table.

This is my scheme in rough outlines. I invite readers' attention with a view to seeking their assistance in improving upon it. Their criticisms, favourable or adverse, with or without suggestions for improvement, will be most welcome. May I hope these will be forthcoming?

Q. M. FARID.

and fully conscious of her destiny in the world. There are some who oppose a separate course on the ground that what, according to them, is needed is improvement in methods of teaching and in the system of examination, not to speak of those who simply refuse to do anything unless the whole system of education is completely revolutionized. It does not take one long to dismiss this last policy as defeatism and excuse for not doing anything, for the obvious reason that the system of education cannot be revolutionized as easily as they seem to think. As for the suggestion that improved methods of teaching and examination will meet the desired object of mental culture, it seems to me that those who make it have not a correct appreciation of the aims of mental culture, nor, I venture to think, are they fully aware of the enormous difficulties of the present economic system, and conditions of service and status of teachers in society. To ignore these problems and to expect the final improvement, referred to above, is to aim at doing what appears to be impossible. Even if these problems are solved, the permanent question of developing students' mental culture in a new India requiring alertness of mind, personality and character in them will still remain, unless the curricula of education are changed.

I suggest that a 'Course of Mental Culture' is a step in that direction, and that it will go a long way in producing whole men and not incomplete ones as are turned out in hundreds by our Universities and colleges. I am not quite sure if the much discussed report of the Central Advisory Board of Education poses the problems of citizenship in a free India in their right perspective, and offers by its various suggestions a prospect of substantial improvement in the type of young men and women to be produced by our post-war educational institutions. The question now arises: "How can the Course of Mental Culture achieve this object ?" This can be done by training students in :—

(1) *Memory.*—By writing figures and words on the blackboard in class-rooms, rubbing them off, and asking students to repeat them. Passages, poems and facts may be memorized. By these and many other devices memory can be trained. And memory plays an important part in one's mental make-up.

(2) *Observation.*—By asking students to repeat figures and words, at times whole sentences, on the board in their proper sequence. Objects may be shown in class-rooms, and students called upon to repeat their names, number, sequence, colour, size, etc. Questions may also be asked on the daily rounds of their lives, their surroundings at home, at college and on the roads, etc. The work of memory and observation can be done both individually and in combination.

(3) *Public Speaking.*—By means of public speaking classes based on the technique of public speaking. (This work has already been commenced by me here).

(4) *Taking Notes of Lectures.*—By insisting on students to take notes of class lectures which should be seen from time to time by teachers, who are also to instruct them in this art. (I have been trying to persuade students to do so in my classes, though unfortunately with little success).

(5) *Taking Notes of Readings, etc.*—By insisting on students to take notes of whatever they may come across as instructive and interesting in books, papers, in conversation with others, and in their own observation or reflection. They should keep records of these with a proper index to be examined by teachers from time to time. Students may be asked to read and explain to the class what they have recorded every week.

(6) *Improvement in Hand-writing.*—By deducting marks for bad writing in the House Examinations, and offering prizes in hand-writing competitions. It may be objected that this is a matter for the schools to tackle, but I think it could be pursued with advantage even at colleges.

. . . . . .

Adult Education

Now while the history of the human race is in the melting pot and there is hope for the liberation of all the subject nations of the world from poverty, ignorance and slavery, and the golden age of freedom and advancement with the termination of the war is in sight, it is highly regrettable that our country is still plunged in the mire of conservatism, ignorance and poverty. We are just like the forlorn sailors of a wrecked vessel resigned to the mercy of the waves and have even lost sight of the guiding star of hope. The cancer of ignorance is eating into our social, economic and political life and our maximum efforts should be directed to the eradication of this enemy of ours.

Let the Islamia College become the beacon star of our country. Let the students of this college become the missionaries of culture, education and tolerance towards the masses.

In response to this appeal, we have started a Village Uplift Society in the college. A number of professors and students have volunteered to carry on the work in villages. Last summer the society visited several neighbouring villages and delivered lectures in hujras and mosques against the evils of ignorance, unhealthy living and destructive social habits. All these visits were very successful and our advice was gratefully listened to by the villagers.

Another achievement of the Society was the starting of a village Football tournament in order to encourage healthy games and social intercourse. A large and beautiful cup was presented by the college. The programme of the matches was broadcast by radio and ten teams from Tehkai, Adali Tolai, Khalil Comrades, Abdara, Sufeddheri and Paukai participated in the tournament. These matches were played in the best sportsmanlike manner. In the final match played on May 11, 1944, Abdara beat Paukai and the Cup was presented to the winning team by Mr. I. D. Scott, after a congratulatory speech in Pushto. We hope to start this year an athletic tournament in addition to the Football tournament.

A model Adult Education class has been opened in Gharibabad and a number of students have volunteered to act as teachers. As this is only on an experimental basis, we hope to extend the Adult Education work to the other neighbouring villages also in future provided we find that the villagers are really benefited and appreciate our efforts.

It is earnestly hoped that the present students and old boys of the institution will also open such centres in their villages and thus add to the good name of their alma mater.

NOOR AHMAD.

Mental Culture in Education-II

In my article last April, I mentioned the directions in which a course of mental culture can develop students' mental efficiency. There are many who agree with the ideas this mental culture 'movement' sets forth. Others differ only on the manner of their realization. On my own part, I am convinced that, under the special circumstances obtaining in Indian education, a separate course of mental culture will be very useful. It is no argument against it to say that with the introduction of our mother tongue as medium of instruction and examination the problems to solve which a course of mental culture is recommended will disappear, because, with the struggle for existence becoming keener than today, the need for attaining a higher mental efficiency through a special suitable course will never be greater than in the India of the future, independent

I am glad that the election propaganda ran very smoothly this year and that we all behaved like really educated young voters. If there were any mistakes made by any one of the parties, I hope we will excuse one another and will now settle down to work collectively for raising the dignity of the Islamia College and the Khyber Union.

I have taken a lot of your time. Thank you very much for hearing the opinions and advice of an unmatured mind. God bless you all !

ABDUL ALI.

Principal's Remarks at the Installation Ceremony of the Union Cabinet

First I wish to congratulate the President and the members of his Cabinet on their election to office in the Khyber Union. Mr. Abdul Ali has equalled the college record in being re-elected as President, and I hope that he will have a tenure of office which will be even more successful this year than it was last year. The Khyber Union is the most important of our student societies, and I wish strongly to urge all members to take a keen and active interest in its working, for it provides opportunities for learning the art of public speaking. The speaker's audience is generally a large and critical one, which has a good effect on the speaker by making him talk sense as briefly and as well as he can. The quality of being able to express one's meaning in a few words is a very useful one ; and speaking on the Khyber Union platform teaches also much that will be valuable to many of you later on in your careers. It will teach you that there are two sides to every question, and that it is your duty as an intelligent human being to listen to both sides before making up your mind which is the right one. It will teach you to give a fair hearing to your opponents, and to give them the same chances of expressing their views as you claim for yourself. In that way the Khyber Union can perform an essential duty in teaching you how a democratic assembly should function.

I wish to take this opportunity of saying something which is quite unconnected with the Khyber Union. Last year a Village Uplift Society was formed in the college for the purpose of doing something to bring a wider outlook to the villages which lie close to the Islamia College. A place like this college has a duty to perform to its neighbours who are less fortunately placed, and it is the intention of this society to start an adult education class in a nearby village. That, however, is only one of its activities : it will also conduct sports tournaments for these villages, and give lectures in villages in order to try and bring some culture into these backward areas. All students who are willing, and I hope there will be many, to take part in this work, should give their names in to Prof. Nur Ahmad, who is the secretary of the Uplift Society.

I now declare the Khyber Union Cabinet duly installed in office and once more I offer my congratulations and good wishes to the new cabinet, and wish them a very successful year of work.

I. D. SCOTT.

The Society has already held some meetings. Dr. Pires' inaugural address dealt with "The New Education and the Teacher". Prof. Timur gave a highly instructive talk on "The Teaching of English in the Indian Schools". Prof. Q. M. Fareed gave a talk on "The Role of the Teacher". Prof. Ansari reviewed the Report of the Central Advisory Board of Education on "Post-war Educational Development in India" and a long discussion followed, which proved that the B. T. students are keeping themselves in touch with the recent developments in Education in this country. The following B.T. students read papers :

Mr. H. G. Saigal and Mr. Gurmukh Singh — "The Place of Education in Human Life."

Mr. Sada Nand and Mr. Dwarka Nath Kaul — "The School as a Special Environment".

M.I.H.

Presidential Address

(Delivered by Mr. Abdul Ali, President of the Khyber Union, at the Installation Ceremony of the Union Cabinet.)

I rise this morning to thank you for the honour that you have done me by electing me as the President of the Khyber Union for a second time. This, as we all realize, is a very responsible post in the College and I hope I shall not let you down.

I was very glad to see the keen interest taken by members in the elections this year. The habit to side with the majority party was given up and students were with that party which could give them better arguments in favour of its own candidate. After having received this training here in our College for three or four years, it is not likely that we will be easily led away by political demagogues. Training of this type is given by only a few institutions because many do not possess societies like our Khyber Union.

While we are here in College our first duty is to educate ourselves. By the word "educate" I do not at all mean that we should try and pass one or two examinations. We should have our eyes and ears open and there is a lot to be learnt from the people that may be around us. We should talk to other people and listen to their opinions. It is a very bad habit always to express and force your opinions on other people and never to listen to theirs. If one has got anything to say and the other does not believe him or does not listen to him there should not be a fight. On the other hand, one should always try and influence the other by persuasion and if he fails he must go on trying, and if the other man does not listen to him then he must give it up very quietly as a hopeless case. After going away from this institution it is every one's own sweet will to do whatever he likes.

The Pathans are backward, we all know this and we know why. There was no education a few years ago and we had very few educated people among us ; while on the other side of the Indus school and college education was in full swing. For the little education that we are getting now we must thank the two founders of the Islamia College, namely, the late Nawab Sir Sahibzada Abdul Qayyum Khan and the late Sir George Roos Keppel. But when we go away from this institution, we must give some of the little knowledge that is gained here to the poor people in our villages. They have a right to know something about the world and we should think it our duty to let them know it,

will find the museum a place of great attraction and enjoyment, and that they will generously present to the Museum samples of the Arts and Crafts carried on in their native places.

Mrs. Scott is thinking of setting up a picture gallery in the Museum and a sub-committee comprising six members has already been formed for collecting funds. A Sketching Class is also going to be started in the near future.

The Annual Exhibition is to be held in March in which Prizes for Photography, Painting, Embroidery work, etc., will be awarded

The Frontier Scientific Society.—Prof. Aziz Ahmed, M.Sc., Prof. Mohd. Ahmed, M.Sc., and Mr. Abdul Malik are the new President, Treasurer and Secretary, respectively. A meeting was held in which Prof. Minhaj-ud-Din gave a very instructive and entertaining talk on the Nature of Light. The Society has set aside a fairly big sum for prizes to be given on the result of Competition Examinations in 'General Science'.

The Sarhad Mathematical Society.—Mr. Mahtab Khan is the new Secretary. The Mathematical Society is doing substantial good to the students of mathematics by providing them with books from their own library. The Society also intends holding regular meetings and an annual day.

The Oriental Society.—Prof. Sakhaulla has been appointed President, Mr. Fazle Ghufran Khan and Mr. A. Saeed are the new Vice-President and Secretary, respectively. The Society has so far held one debate in which Prof. Timur and Prof. Ansari took part. The debate was very interesting and was largely attended. The Society has drawn up the following programme for this session :—

1. Two 'Tarhi Mushairas' in Urdu and Pushto.
2. A Prize Debate open to all students in Urdu as well as in Pushto.
3. An 'Arshi' Mushaira.

The Sarhad Agricultural Society.—The Society is doing great service to the Agriculture students by holding frequent meetings in which talks by great Agriculturists are given. Mr. Mohd. Hussain is the Secretary of the Society.

The Economics Society.—This society has been started this year by Prof. S. M. Idris for the benefit of the students of Economics. In the first meeting Prof. S. Idris gave a very useful talk on 'Economic Planning'. Another talk was given by K. S. Mohd. Anwar Khan on 'Agriculture in the N.-W.F.P.' We hope that under the guidance and control of Prof. S. M. Idris the Society has a bright future. Mr. Mukhtar and Mr. A. R. Kaif are the Vice-President and the Secretary, respectively.

The Majlis-i-Islamiat.—The Majlis has been among the busiest societies in the college. Sermons have been preached every Sunday in which the College Dean, Prof. Timur, and Prof. S. M. Idris addressed the students on different religious topics. The Majlis is also going to hold the usual Prize Debate open to the students of all the schools in the N.-W.F.P.

The Day Scholars Association.—Prof. N. A. Qazilbash continues to be the President. Mr. Qayyum Niazi and Khawaja Sajjad are the Vice-President and the Secretary, respectively. The day scholars have asserted their existence in the college by securing a room in the Cunningham Union Hall to be used by them as a Common Room. The Common Room has been furnished and different indoor games have been placed there.

The Dramatic Club.—The Dramatic Club is now under the control of a Committee consisting of Prof. Hadow Harris, Prof. Inayatullah, Prof. Jalal-ud-Din, and Prof. Bashir-ud-Din. The Society proposes to stage a scene from "Julius Caesar" on the Annual Prize Distribution Day.

The Sarhad Educational Society.—The Society is doing its work in its usual silent and unostentatious manner. Dr. Pires is the President, with Mr. H. G. Saigal and Mr. Mahbub Khan as Vice-President and Secretary, respectively.

These are days when there is much talk of democracy in the world, and you will all realise that in the next few years there are bound to be great changes in the system of Government in India. You young men will be expected to play your part, and I hope it will be a worthy part. You can train yourselves here in this college in some of the chief qualities which any system of government requires of its people—you can, if you try, learn the virtues of fair play and toleration, of friendliness, kindness and honesty. Above all you can learn to think for yourselves, so that you can form your own opinions of men and affairs. Make good use of the College library to improve your general knowledge, and practise discussing and arguing about all sorts of topics.

Finally, remember that this is an Islamia College, and that those of you who are Muslims are expected to be good Muslims, and to live up to the beliefs of your religion. Religious teaching is regularly given in the college · it is for you to put that teaching into practice.

I. D. SCOTT.

College Societies

The Khyber Union.—Mr. Abdul Ali has once again been elected President of the Union. The new Vice-President and the Secretary are Mr. Abdur Rehman Shah and Mr. Fazl-i-Rahim, respectively. The union has had a good start this year. Debates have been held regularly every Sunday, and members have taken great interest in them. Some of the subjects discussed were :

1. Modern Education produces Baboos only.
2. The teachers are and have been responsible for the backwardness of the Indian people.
3. Western Civilization has proved a complete failure.

We hope the Union will continue its activities with the same amount of zeal and enthusiasm.

In addition to these debates the Union arranged a lecture on 'Public Speaking' by Prof. Q. M. Fareed, which was highly appreciated. A regular Elocution Class has been opened under the care of Prof. Fareed. We wish that his endeavours may be crowned with success and that he may achieve the cherished end of the Union, which is to inculcate among the students of this Province a keen desire to speak in public and to shake off all unnecessary shyness and 'stage fear'. The President's inaugural address is printed elsewhere. So are the Patron's remarks.

The Khyber Athenaeum.—The Athenaeum under the Presidentship of Mr. M. M. Kalim has a highly commendable record of past achievement, and it is expected that under the care of Mr. M. M. Kalim it will rise to still greater heights. Mr. Fazal Ali Razvi is the new Vice-President. Mr. Akhtar Ali has been elected as the Secretary. The Athenaeum being in such efficient hands, will provide a really interesting programme for this session. During the course of this session Squadron Leader Wainwright, Mrs. Scott, Mr. G. C. Mastid, Mr. O. G. Grace, Dr. Abdur Rahim, Captain M. F. Rehman, and Mr. S. D. Malik, Assistant Curator, Lahore Museum, are expected to address the students.

The Arts Section of the Athenaeum continues to make progress. Mrs. Scott's untiring efforts have brought into being an amply-furnished Museum and collected exhibits of different arts and crafts of our Province. All the books on Art which were available in the College library have now been placed in the Museum which will remain open on every Tuesday regularly. Several magazines and journals on Art will also be placed in the Museum. It is hoped that the students

Gymkhana ground. Mr. Hamid of the Islamia College has been selected to captain the college side. The match was originally arranged before the Summer Vacation but owing to rains on four successive Sundays it had to be postponed.

Jashn-i-Azadi at Kabul.—The Afghan Government was kind enough to invite three of Islamia College Teams to take part in sports at Kabul on the occasion of the Independence Day Celebrations. We sent Football, Hockey and Tennis teams which left for Kabul on the 20th July, 1944. Prof. M. Anwar Beg and Mr. Ashraf accompanied the teams and they stayed in Kabul for about a week. The team put up a very good show and the College was awarded a fine carpet as a present on behalf of the Kabul Government. We are looking forward to welcoming a team from the Habibiya College, Kabul in the near future.

M.I.H.

To New Comers

I want to say a few words to the new students who are just beginning their life in the Islamia College. You have come here with high hopes of a successful career, and I wish you all every success. The College on its part has high hopes of what you will achieve, not only during the years you spend here, but afterwards when you leave the college and take your part in the life of the country. I want to impress upon you that it depends mainly on you yourselves what you make of your life here. You are no longer schoolboys ; you have become young men and must learn to be responsible for your own lives. All members of the staff, and in particular the tutor in whose charge you have been placed, will always do their best to help you and to advise you ; but the main responsibility is yours.

This college offers excellent opportunities for you to lead a full and happy life ; and I should like you to take every advantage of them. You will have to work—some of you perhaps will consider that a pity ; but there is no room in this college for students who only wish to waste their own and other peoples' time, as well as their parents' money. There are many scholarships and fee concessions available for poor students; they will be given to deserving students, and will be taken away in case of failure in examinations. The university examinations which you have to do are in English, and I therefore advise you to take a lot of trouble and try to master the language. There are only two ways to learn English, or any other language —one is to speak it, and the other is to read it. Practise speaking it as much as you can, make use of the College library, which exists for your benefit, and attend and take part in, the debates of the Khyber Union.

I don't expect you, and I don't want you to spend all your time working. We are fortunate in this college in possessing good playing fields, and each one of you should resolve to take part in some game or another. You will enjoy good time here all the better, and experience shows that the playing of games is one of the best ways of developing the body as well as the character. Don't think that you have to be good at a game before you can play it : everyone has to start some time, and since the college provides you with such plendid opportunities to play a number of games, it is up to you to avail yourselves of them. I wish to bring to your notice also the University Training Corps, of which we have a Company in the College. By joining it you will learn something of the military life, with its valuable lessons of discipline and training ; and it will greatly help those of you who wish later on to get a commission in the Army, Navy, or Air Force.

their reminiscences of the good old time. In the afternoon, the Old Boys played Football, Hockey and Tug-of-War matches against the present students, and presented amusing scenes of weight and age struggling against energy and youth The never-to-be-forgotten day ended with a 'standard tea' on the staff club lawns.

Adult Education.—Prof. Noor Ahmed Khan has taken over work of Adult Education in the neighbouring villages. Some senior professors with the collaboration of student volunteers will visit the neighbouring villages and teach illiterate adults. Primers in Urdu and Pushto have been distributed in one of the villages and classes will be taken in the mosques daily.

Changes in the Staff.—Prof. A. A. Farooq, the Staff Editor of the English Section of the 'Khyber', has left the college and entered the Provincial Civil Service. We had feared this ever since we heard of his sitting for the competitive examination. Our loss is, however, the gain of the province in general and we are not so selfish as to grudge it. We congratulate him on his success and wish him all success in his new sphere of action. Mr. M. Ismail Sethi has come to join us in Mr. Farooq's place We welcome him in our midst and wish him a successful career. We also welcome to the college Mr. Toosi as demonstrator in Chemistry. Mr. Toosi is an M.Sc. (Honours) of the Punjab University and has had teaching experience at two of the Lahore colleges and the Punjab University Institute of Chemistry.

The Bursar.—We welcome Mr. Ghulam Ishaq Khan, P.C.S., who has been appointed Bursar of the Darul Ulum and has taken up residence at the college premises. He is an old student of our college; and has had a successful career in the P.C.S.

The Citrus Garden.—The garden presents a very beautiful spectacle with all the plants loaded with fruit. It extends over a big area between the two rows of Hostels. The yield this year has been unexpectedly good.

The Co-operative Stores.—The Co-operative Stores are rendering valuable service. They have been selling latha, standard cloth, soap, boot-polish, etc., at reasonable prices. The shop has at times been able to sell soap on rates cheaper than the Control Rates. Exercise books, second-hand and new books have also been available at the shop. The question of obtaining some more latha and a few varieties of woollen cloth are under consideration.

B. T. Scout Camp.—The B. T. students went to Takia, Abbottabad, for their annual Scout Camp in the third week of November. They were accompanied by Prof. Ansari Our students took very great interest in the life under canvas. They pitched their own tents, cooked their own food and had experience of self-help in many other ways. They enjoyed mountain-climbing with Dr. Pires, who was also at the camp for part of the time. Mr. Tota Ram, King Scout, was elected troop-leader and created an interesting life for the party. The Principal provided many facilities to the B. T. students, particularly in the conveyance of provisions to the camp.

College Adult Education Class.—While the adult education campaign is being carried outside the college under the supervision of Prof. Noor Ahmad, the B. T. students are doing similar work inside the college It is interesting to see college students teaching their bearers and other servants with great enthusiasm. The progress is slow but not disappointing. A whole-time teacher formerly did this work, but when he left for war-service and no proper substitute was available, the Principal entrusted the B. T. students with the task. This will obviously mean an excellent training for them, particularly because they are teaching the illiterate adults under the expert supervision of Prof. Ansari.

Governor's XI vs. C. C. Club.—A match has been arranged between the Combined Colleges Team and H. E. the Governor's XI. The match is to come off on Saturday and Sunday, the 16th and 17th December, on the Frontier

general questions which are asked in the interviews for Emergency Commissions. Many students have applied for Commissions.

Farewell to K. B. Saadullah Khan.—On the 17th October a meeting was held in the Roos-Keppel Hall to bid farewell to the ex-Honorary Secretary of the college, K. B. Saadullah Khan. H. E. the Governor was also present at the function. H. E., in his brief speech, thanked Khan Bahadur Sahib for his conscientious and meritorious services rendered to this institution. The Principal too thanked Khan Bahadur Sahib on behalf of the staff and the students for his valuable services to the institution.

Poppy Day.—Poppy Day was celebrated in the College on the 11th November. Poppy flowers were sold and a sum of Rs. 72|5|6 was collected, and was sent to the Organisation of the Poppy Day Appeal for wounded soldiers and their families.

Visitors.—Flight Lt. Elliot from the General Headquarters, Delhi, paid a visit to our College and addressed the students in the Roos Keppel Hall. He gave details of the vacancies in the Air Force and described the possibilities of post-war Civil Aviation.

A band of officers headed by Major Richards came to the college to address the students. An old boy of the college Major Sher Khan, M.C., also accompanied them. Major Richards addressed the students and told them the advantages which accrued from the 'Personal Contact Scheme' under which they were touring the whole of India. He appealed to the students to make themselves fit enough to join the armies which were fighting against the aggressive Axis States, whose insatiable thirst for power could never be quenched except by a complete overthrow.

Old Boys Day.—The Old Boys Association held its meeting on the 19th of November. It was attended by a large number of Old Boys from all parts of the Province. The following gentlemen were elected to the Executive Committee :—

President.—Mirza Fazal-i-Rahman, B.A., LL.B., Registrar to the Court of Judicial Commissioner, N.-W.F.P.

Vice-President.—K. Sher Bahadur Khan Badrashi, B.A., LL.B., Advocate, Nowshera.

Secretary.—S. Abdul Hassan, B.A., D. S. Police, Peshawar.

Asst. Secretary.—Mr. Mohd Ayyub Khan Khattak.

Members :— Peshawar—Mr. M. Aslam Mohmand, S. I. Police.
Mardan—Mian Abid-ul-Haq, B.Sc.
Kohat—Mr. Gulzar Husain Kayani, B.A., S. P. Additional Police.
Bannu—Mr. Faizulla Khan, B.A., LL.B., D. S. Police, Nowshera.
D. I. Khan—Mr. Ashiq Salim, Ward Officer, Rationing, Peshawar.
Hazara—Nawabzada Mohd. Farid Khan, S. P. Additional Police, Peshawar.

After the newly elected office-bearers had taken the oath of allegiance the following resolutions were passed unanimously :— (a) that the Council of Management of the Darul Ulum be approached with the request that at least 75% of the elected seats on the future Council of Management be reserved for the Old Boys ; (b) that a request be made to the College authorities to allot two rooms on the College premises for the use of the Old Boys Association.

The members had their lunch in their old hostels. The Dining Halls of the different hostels resounded with sounds of great hilarity and merriment when some of the elder brothers related stories of their adventures and escapades and

a better understanding of the grammar itself by observing the concrete application of the abstract rules. This is particularly true of a living language and should be borne in mind by Indian students of English.

But I have said enough about the utility of reading. Let me now turn to a more stimulating and congenial topic—the pleasures of reading. It is better to read for information than not to read at all. But the devotee of books reads not so much for instruction or edification as for enjoyment ; and by a seeming paradox the more he reads for enjoyment the greater will be his profit from what he has read. It is the same in the sphere of ethics : he who acts virtuously because it is right to do so does well ; but he who acts virtuously because he loves virtue does better. His state is the more gracious. Literature like virtue should be loved for its own sake and the love of literature is its own reward.

The lover of books, equipped with natural taste and training, begins after a time to exercise some choice or selection in his reading. He reads with enjoyment but also with discrimination. His sensibilities become keener and more refined and his judgment sounder and more just. He learns to distinguish what is good in literature from what is bad or meretricious. Ultimately, by continual reading and the constant exercise of judgment and comparison, he should develop the faculty to discriminate between the good and the best—a far rarer critical capacity and more difficult of attainment.

Meantime he has discovered that peculiar enjoyment which the literature of power—especially pure poetry—affords, that aesthetic pleasure which is possibly the keenest and purest pleasure which the human mind can experience. He has now within himself a perennial spring of disinterested enjoyment which is increased and not diminished when shared with others.

And all the while he should unconsciously have been acquiring that intellectual quality which is so hard to define and yet so unmistakable when seen, that culture which is not a mere accumulation of knowledge but a mental power, a particular attitude of mind.

Let me sum up what has been said above by a quotation from the autobiography of a great English historian and man of letters :— "Every man who rises above the common level has received two educations : the first from his teachers ; the second, more personal and important, from himself." This second education is acquired by the habit of reading and reflecting on what one has read.

HADOW HARRIS.

College Notes

U.O.T.C.—There have been some changes in the staff of the U.O.T.C. Captain Falstead has joined the U.O.T.C. as the Adjutant Commander in place of Captain Cook, who has gone on Active Service. Captain Falstead belongs to the Green Howards and is a seasoned soldier. He served in Belgium and France during 1939-40 and also took part in the Madagascar campaign. He has also served on the Burma Front. Sergeant Major Syke, who has been in India for over ten years, has joined the U.O.T.C. as the C.S.M. Prof. Abdul Hashim and Prof. Abdul Wahab have been attached to the U.O.T.C. as Second-Lieutenants.

In June, 1943 a camp was held at Landi Kotal. The Shooting Competition for the Gen. Denning Shield was won by Platoon No. 3. A prize is to be awarded to the student cadet writing the best essay 'On The Camp'.

Since the reopening of the College in October weekly Shooting Competitions have been held. The students meet the Adjutant frequently and talk about

No. 1] PESHAWAR, JANUARY 1945. [Vol. XXVIII

Ourselves

The purpose of a college magazine is three-fold : it has to record the activities of the college : it has to produce good reading material ; and, most important of all, it has to train the students of the college in the art of self-expression. The work of the editor of such a magazine is necessarily difficult ; for, while these three aims are not exactly incompatible, they are not easy to attain simultaneously. The English section of the present issue of "The Khyber", we admit frankly, fails to achieve any one of these aims except the first. Much of the reading matter is not of a high quality, and the best part of it is not the work of students. The Editors are prepared to bear part of the blame for this and to put another part upon an educational system which expects students to adopt a foreign language as a medium of self-expression. But the largest share of it must go to the lethargy of the students themselves.

B.D.

The Habit of Reading

The habit of reading like other good habits is best formed in childhood. If not formed in childhood, it can usefully be begun in later years ; for it is never too late to begin a habit which is at once useful and pleasurable.

Some of the uses of reading are immediately obvious. "Reading maketh a full man", i.e., reading gives one information. The well-read man has a store of knowledge available which may at any time be put to use, especially if he is well-read in some particular branch of knowledge. The well-read student and the well-read professional man stand out from among their fellows. Again, the habit of reading gives one interests and resources in oneself. So long as books are available, the lover of books need never be bored or lonely.

Forty or fifty years ago in Great Britain, schoolboys and schoolgirls learning French, or Latin, or other foreign languages, were drilled almost wholly in grammar and comparatively few texts were read in or out of class. In consequence, most of the pupils on learning school promptly proceeded to forget what they had learned. Today, the intelligent pupil is encouraged to realise that in grammar are found only the dry bones of a language and that these dry bones live in the literature. By reading widely, one gets a far better knowledge of the idiom and spirit of a foreign language than by confining oneself to the study of text-books of grammar and composition. Indeed, one should ultimately obtain

مئی ۱۹۳۹

خیبر

دارالعلوم اسلامیہ سرحد

پشاور

مدیر محمد احسن سال سوم — نگراں پروفیسر محمد موسیٰ خان کلیم افغانی — نائب مدیر بشیر احمد ملک سال چہارم

جلد ۲۹ | اپریل مئی سنہ ۱۹۴۶ء | نمبر ۱

شذرات

"افسانہ" - کس قدر جاذب توجہ لفظ ہے اس نے چند سال کے اندر اندر حیرت انگیز مقبولیت حاصل کرلی ہے معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ وقت کے مذاق نے اسے ادبی ہر دلعزیز کردیا ہے - آج کل تو جہاں نظر ڈالیئے جس ادبی رسالہ کو اٹھا کر دیکھئے اس میں افسانوں کی ایک خاصی تعداد موجود ہوگی بلکہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ بہت سے رسائل کی زندگی کا انحصار محض افسانہ پر ہی ہے اور اب تو روزانہ اخبارات کے صفحات میں بھی افسانہ نظر آنے لگا ہے وہ بھی عوام کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا پاس رکھنے پر مجبور ہوگئے ہیں -

افسانے کی روز افزوں مقبولیت کے ساتھ ساتھ لکھنے والوں کی تعداد کا بڑھنا ناگزیر تھا - چنانچہ کئی نئے نام رسائل میں دکھائی دینے لگے ہیں لیکن اس تعداد کے اضافہ نے ادبی ترقی کی رفتار میں کوئی اضافہ نہیں کیا کیونکہ افسانہ کی مقبولیت کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض نااہل لوگ بھی ادب میں اپنا مقام تلاش کرنے لگے ہیں اور ادب میں بعض گھٹیا عناصر بھی شامل ہوگئے ہیں - سیلاب کے اٹھتے ہی قسم قسم کی گندگیاں اس کے ساتھ بہنا شروع ہوجاتی ہیں - ہمارا نوجوان طبقہ خصوصاً اس صنف میں خاص دلچسپی لیتا نظر آتا ہے شاید وہ اسے آسان سمجھے ہوئے ہے - بعض افسانہ نگار تو اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے حالانکہ حقیقت یہ ہے ان میں سے اکثر صحیح افسانہ نگاری کی قوت سے محروم ہونے کی وجہ سے زندگی کی چند بھونڈی تصویریں پیش کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتے - ان کے کارناموں میں نہ کوئی ندرت ہوتی ہے اور نہ ہی تخیل و تجربہ کی جھلکیاں - بلکہ ایک نقالی دکھائی دیتی ہے ظاہر ہے کہ یہ کوئی ادبی خدمت نہیں - بلکہ اسی قسم کے گندے عناصر کا اضافہ ادب کے معیار کو گرا دیتا ہے اس سے یہ مطلب بھی نہیں کہ آج کل کا سارا ادب محض نقالی ہی نقالی ہے بلکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس بحرانی دور میں بھی کئی نوجوانوں نے اپنی تخلیقی قوتوں کو جلا دے کر ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے اچھا ادب ! انہی کاوشوں کا رہین منت ہے لیکن مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو ادب اور زندگی بہت قریب دکھائی نہیں دیتے - دونوں کے درمیان اب بھی ایک وسیع خلیج حائل دکھائی دیتی ہے - ادیب شاید زندگی میں ڈوبا نہیں -

"اردو کے سارے نئے ادب میں سے صرف ایک افسانہ ایسا نکال کر دکھا دیجئے جس میں ہندوستان کی زندگی اور ہندوستان کی روح اپنی پوری شدت کے ساتھ نظر آتی ہو اور کوئی غیر ملکی آدمی یہ کہہ سکے کہ ہاں اس افسانے میں ہندوستان سما گیا ہے"، ابتداً حسن عسکری کے ان الفاظ کو مقبول کرنے میں کچھ تامل ہوتا ہے - کیونکہ بعض جزوی کامیاب کوششیں دیکھ کر ہم سمجھنے لگتے ہیں - کہ ہمارا سارا ادب اب اپنی صحیح راہ پر چل پڑا ہے - لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ کچھ بہت بے معنی سی نظر آتی ہے اس میں شک نہیں کہ ہمارے نئے ادیبوں نے مغربی ادب سے متاثر ہوکر اپنی ادبی دنیا کو بہت وسیع کرلیا ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ اب ہم اس ماحول سے نکل چکے ہیں - جہاں زندگی چلچلاتی دھوپ میں ایڑیاں رگڑا کرتی تھی - اب ہم نے زندگی اور ادب کو قریب تر کردیا ہے لیکن ان کا دعویٰ سو فیصدی درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا خود ہی دیکھ لیجئے پچھلے چند سال کے افسانوی سرمایے کی کل کائنات کیا ہے - یہی کہ ادیب مزدور کا ہم نوا ، اشتراکیت کا دلدادہ ، سماجی قوانین کا دشمن شعور و تحت الشعور کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا اور جنسی بھوک کا شکار ہے - ظاہر ہے کہ وہ زندگی کے

قریب آنے کی کوشش میں جذبات کی رَو میں بہہ گیا ہے اور اُس کی یہی اُلجھنیں اُسے زندگی کی پگڈنڈی سے بھٹکانے کا باعث بن گئی ہیں۔ یقیناً اشتراکیت وغیرہ کا پرچار اور جذبۂ جنسیت کو اُبھارنے والے افسانے زندگی کی مکمل تصویریں نہیں۔ زندگی انہی تک محدود نہیں بلکہ بہت وسیع ہے۔ اس قسم کے مواد کو لیئے نئے افسانوی ادب میں نمایاں جگہ پاتے ہوئے دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ادب نے ابھی تک ہماری زندگی کی مکمل تصویریں پیش نہیں کیں۔ اور واقعی ایسے افسانوں کی تلاش بے سود ہے جن میں ہندوستان کی روح اپنی پوری شدت کے ساتھ سمائی ہوئی ہو۔

وقت کی تیزی سے بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ اب چاہیئے کہ ادب کو ان آلودگیوں سے پاک کر دیا جائے "ادب برائے زندگی" کے نظریہ کو عملی طور پر درست ثابت کر دیا جائے جنگ کے اختتام پر شاید ذہن جذباتی دھاروں میں بہنا بند کر دیں اور سنجیدگی سے زندگی کے مسائل کو سلجھانے میں لگ جائیں۔ اور اگر موجودہ بڑھتی ہوئی سیاسی بے چینی نازک صورت اختیار کر کے ہماری سماجی اور اقتصادی زندگی پر اثرانداز نہ ہوئی تو ہوگا بھی یہی۔ وقت گندے ادب کا گلا گھونٹ دے گا اور وہی ادب زندہ اور پائندہ رہے گا جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہوگی۔ ادبی ماحول میں اس کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں۔

ایم۔ احسن

کرما

میرے نتھنوں میں کسی جلتے کپڑے کی بدبو داخل ہو رہی ہے۔ نجانے مجھے اس بدبو سے کیوں اتنی نفرت ہے اسے سونگھتے ہی میرے تخیّل کے سامنے ماضی کے دھندلکے صاف ہو جاتے ہیں، اور چند تصویریں اُبھر آتی ہیں۔ اور کرما بھی مجھے اُن میں جھلکتا نظر آجاتا ہے اور ان تصویروں میں میں گھنٹوں کھویا رہتا ہوں۔ کرما کون تھا؟ مجھے یاد آنے لگتا ہے ہمارے قریب ہی رہنے والا تیرہ برس کا ایک شوخ سا لڑکا تھا۔ ہمارے چچا کے گھر میں رہا کرتا تھا۔ نام تو شاید اُس کا کرم دین تھا لیکن ہر چھوٹا بڑا اُسے کرما ہی کہہ کر پکارا کرتا۔ شروع میں تو میں اُسے اپنا چچا زاد بھائی تصور کرتا تھا۔ کیونکہ گھر میں اُسے چچا اور چچی جان کو ابا اور اماں کہہ کر پکارتے سُنتا تھا۔ جیسے گھر کے اور بچے پکارتے تھے۔ لیکن جب میں ذرا بڑا ہوا تو کئی دفعہ سُنا کہ کرما تو میرے چچا کے گھر میں ملازم تھا۔

میں نہایت معصومانہ شوخی سے کہنے والوں کو جواب دیا کرتا، "کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔ دیکھتے نہیں کہ وہ چچی جان کو اماں اور چچا جان کو ابا کہہ کر پکارا کرتا ہے۔ وہ بھی عموماً اُسے پیار سے بیٹا اور بچہ کہہ کر پکارتے ہیں کیوں! ملازم بھی بھلا کبھی گھر میں اتنا گھل مل سکتا ہے"۔ مجھ سے ذرا بڑے ہمجولی قسمیں کھا کر مجھے یقین دلانے کی کوششیں کرتے لیکن میں نہ مانتا۔ مگر آہستہ آہستہ مجھے بھی یقین ہو ہی گیا کہ میرے دوست جھوٹ نہیں کہتے تھے۔ بلکہ وہ واقعی چچا جان کے گھر ملازم تھا۔ اور ہاں یہ بھی سُن لیا تھا کہ کسی وقت ہمارے گاؤں میں طاعون کی زبردست وبا پھیلی تھی۔ لوگ موت کے خوفناک پنجوں کی گرفت سے بچنے کے لئے بھاگ کر کہیں پناہ گزین ہو رہے تھے۔ اور کرما انہیں دنوں پیدا ہوا تھا۔ لیکن اُس کی ماں غربت و تنگدستی کی وجہ سے

اس وبائی جہنم سے کسی محفوظ مقام تک نہ جا سکی اور بیچاری اپنے دو بچوں کو دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ کر لقمۂ اجل ہو گئی۔ اور پھر کہیں کسی ذریعے سے کرما بھی ذرا بڑا ہو کر وباؤں کے بعد ہمارے چچا کے گھر میں آیا انہیں اس کی حالتِ زار پر ترس آ گیا اور میری چچی نے اُسے رحم بھرے دل سے پالا پوسا۔ اور آج وہ میرے چچا زاد بہنوں اور بھائیوں میں گھلا ملا تھا۔

میری اور اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اور میں اکثر گرمی کی خاموش دوپہروں میں... گھروں سے نکل آیا کرتے تھے اور کٹی ہوئی گندم کے بڑے بڑے انباروں کے سایوں میں پتنگ اُڑایا کرتے تھے اُن دنوں اُس کے پاس ڈور سے بھری چرخی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے خوبصورت پتنگ بنا لیا کرتا تھا اور مجھے بھی بنا دیا کرتا۔ اور ہم دونوں گھنٹوں اُڑایا کرتے تھے۔ ڈور ٹوٹ جاتی تو سورج کی حدتوں سے بے نیاز ہو کر طویل کھیتوں میں دوڑنا شروع کر دیتے تھے۔ یا خاموش بیٹھے دُور تھرتھراتے اُفق کی تھرتھراہٹوں میں ہماری نظریں جذب ہو جاتیں۔ یا کنوؤں کی سُریلی آوازیں ہمارے لئے نغمہ ہائے دلکش ثابت ہوتی تھیں یا پھر پتنگ ہی کو کبھی نیچے اور کبھی اوپر کی طرف اُڑا لطف حاصل کیا کرتے تھے۔ اور شام کو بھی جب کرما اپنے بیلوں اور بکریوں کو چارہ وغیرہ دے کر فارغ ہو جاتا تھا۔ اور ہم ارد گرد کے سارے بچے ٹولیاں بنا کر گلی ڈنڈا، آنکھ مچولی وغیرہ کھیلنا شروع کر دیتے تھے۔ وہی ہماری ٹولیاں بنایا کرتا اور وہی ہمیں مختلف کھیلیں کھلایا کرتا تھا۔ اور ہاں ان یادوں کے ساتھ ہی یہ تصویر بھی میری نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ کہ ہمارے ہمجولیوں میں سے صرف گیارہ بارہ برس کی میری چچی زاد بہن زرینہ ہی ہوتی تھی جو سب سے الگ تھلگ خاموش بیٹھی ہماری شوخیوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی یا اگر کبھی کبھار کھیل میں حصّہ لیتی بھی تو عموماً اپنی جسمانی کمزوری کی وجہ سے کھیلوں میں سب سے کمزور ہی ثابت ہوتی تھی۔ اور اکثر کرما اُسے بڑے پیار کے ساتھ کھیلنے سے روک دیا کرتا تھا کیوں کہ اُسے بہت فکر ہوتی تھی۔ کہ کہیں بیچاری کو کوئی جسمانی صدمہ نہ پہنچ جائے۔ ان کھیلوں ہی پر بس نہ تھی۔ بلکہ چھٹکی ہوئی چاندنیوں کی خاموشیوں کے طلسم کو ہمارے طویل معصوم قہقہے عموماً توڑ دیا کرتے تھے ہم کسی کھلیان میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور ہر ایک اپنی طبیعت کے زور سے دوسروں کی دل نوازی کا سامان مہیا کیا کرتا تھا۔ کرما بڑی بیباکی سے مجھ پر انگلی اُٹھا کر میرے سادہ سے نام کے ساتھ یونہی سنگھ کا دم چھلا لگا دیا کرتا تھا۔ جونہی اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے تھے ہر ایک کے پھیپھڑے پھیل جاتے اور ہر گلے سے بیباک قہقہہ بلند ہو جاتا تھا۔ میں خفیف سا ہو کر خاموش ہو جاتا۔ لیکن جی میں آتی تھی کہ اس شریر کو بھی دُنیا کے ہزاروں گندے نام لے لے کر پکارتا رہوں حتیٰ کہ خود ہی کھسیانا ہو کر رہ جائے۔ یا اگر بس چلے تو کھیت سے ایک بڑا سا ڈھیلا ہی اُٹھا کر سر پر دے ماروں اس شیطان کے۔ تاکہ مجھے دوبارہ تنگ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ لیکن پھر بھی باوجود اس کی چھیڑ بازیوں کے میں اُس کے قریب ہی رہنا چاہتا تھا۔ اُس کی اُڑائی ہوئی پتنگ کی ڈور اپنے ہاتھوں میں لے کر ہلانے میں مجھے بے حد لطف حاصل ہوتا تھا۔ نہ معلوم کیوں؟

ہم کتنی مدت تک اکٹھے کھیلتے رہے۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ ہماری حسرت بھری کھیلوں میں زرینہ کی بیماری نے رکاوٹ ڈال دی تھی۔ تھی تو وہ پہلے ہی کمزور سی اور اب شام کے ہلکے ہلکے بخار اور بے حد تھکاوٹ کے شدید احساس نے آہستہ آہستہ بستر مرض پر جا لٹایا۔ گاؤں میں ہسپتال کہاں تھی؟ اور گھر میں کام کرنے والا کرما ہی تھا۔ چنانچہ اب اُسے ہر روز دُور دوسرے گاؤں

سے دوائیاں وغیرہ لانی پڑتی تھیں لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہسپتال جانے سے وہ کبھی اُکتاتا نہیں تھا۔ حالانکہ اُسے ہر روز تپتی دوپہر میں دو دو تین تین میل پا پیادہ چلنا پڑتا تھا۔ اُس کے ہونٹوں تک شکایت کا ننھا سا حرف بھی بھول کر نہیں آیا تھا بلکہ مجھے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان مشکل مرحلوں کو بڑی خندہ پیشانی سے نبھایا کرتا تھا اور اکثر میں سویرے اُٹھتا سورج کی اولین زرین کرنیں نیلی فضاؤں میں سنہری جال پھیلا رہی ہوتی تھیں تو درختوں اور مکانوں کے طویل سایوں میں کرمے کو کندھے پر چھوٹی سی قدرے میلی سی چادر ڈالے دوسرے گاؤں کی طرف جاتے دیکھتا تھا۔ اور دوپہر کو جب سورج کی حدت بار کرنیں جلائے دیتی تھیں وہ پسینے میں شرابور لوٹا کرتا تھا اور میری نگاہیں اسے اس مسافر کی شکل میں دیکھتی تھیں جو تھکان سے چور منزل تک آپہنچا ہو۔ لیکن حصول منزل کا مسرت آگیں تصور اسے اپنی تھکاوٹوں سے قطعی بے نیاز کئے ہوئے ہو۔ اور میں خیال کرنے لگتا تھا کہ کتنا ہی اچھا ہے کرما بیچارہ۔ زرینہ کی جان بچانے کے لئے اُسے اپنی زندگی، تکلیفوں اور مسرتوں کا احساس تک نہیں رہا۔ کس سنجیدہ تابعداری سے وہ اپنے فرائض سر انجام دے رہا تھا۔ اور اب تو ہماری کھیلوں اور محفلوں میں بھی اُس نے آنا کم کر دیا تھا۔ اور کبھی کبھار آ بھی جاتا تو مجھے احساس ہونے لگتا تھا۔ کہ کرما وہ پہلا سا کرما نہیں رہا بلکہ کچھ بدل گیا ہے۔ اُس کی پہلی بیباک شوخی کچھ مدھم سی پڑ گئی ہے اور یہی نہیں وقت کے ساتھ ساتھ وہ اور بھی مدھم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اُس کی شوخ کلامیاں کہاں تھیں؟ اس نے مجھے بھی تنگ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن نہ معلوم میرے دل میں یہ ننھی سی خواہش کیوں بیدار ہو جاتی تھی۔ کہ اب وہ پھر اپنی شوخیوں سے مجھے ہی تنگ کرنا شروع کر دے تاکہ وہ بھی کچھ خوش ہو جائے اور ساتھ ہی اوروں کے پھیپھڑے بھی قہقہوں سے پھیل پھیل جائیں۔

ڈاکٹر کو اُس نے کئی دفعہ بلایا تھا۔ وہ زرینہ کا علاج تن دہی سے کرتا رہا کبھی تو وہ کچھ اچھی ہو جاتی لیکن پھر بھی اچانک اس کے زرد چہرے پر مزید خوفناک زردی پھیل جاتی تھی۔ ڈاکٹر نے چچا جان کو تو بتا ہی دیا تھا کہ اُسے چھوٹے دکھ کی بیماری ہے۔ البتہ عورتوں کے کانوں تک یہ بُری خبر نہیں پہنچائی گئی تھی زرینہ کو مکمل افاقہ کبھی نہ ہوا تھا بلکہ دن بدن اس کی صحت گرتی چلی جاتی تھی۔ ہر ایک اُس کے پھیکا پڑتے ہوئے بھولے بھالے چہرے کو دیکھ کر ترس کھا جاتا تھا۔ اُس کی ہڈیاں خوفناک حد تک اُبھر آئی تھیں۔ بانہیں سوکھ کر کانٹا سی ہو گئی تھیں گو چوڑیوں سے بھری ہوئی تو تھیں۔ لیکن ان چوڑیوں کی کھنکھناہٹ ہی سے پچھلے کا سا شور اُٹھتا تھا۔ مجھے تو بعض اوقات یہ خیال آجاتا تھا کہ یہ آواز بھی تو گویا کسی چلنے والے کی آخری مایوس مضمحل صدا ہے۔ گھر کی فضاؤں میں عموماً سناٹا چھایا رہتا تھا۔ ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود اُس کی ماں اور دوسرے گھر کے آدمی اُس کے قریب بُت سے بیٹھے رہتے تھے اور اُن کی خاموشی بھی گھر کے سناٹے میں اضافہ کئے ہوتی تھی۔

کرما بلا کسی تاخیر اور جھجک کے اپنا کام سر انجام دے رہا تھا۔ اُسی طرح وہ ہر روز پا پیادہ دور دوسرے گاؤں جاتا اور بے شمار شیشیاں دوائیوں سے بھر کر لاتا تھا۔ اور وہ دن اور وہ منظر مجھے کبھی نہیں بھولتے۔ جب میں کرمے کو ڈاکٹر کی گھوڑی کے پیچھے پیچھے گرمی میں پھولے ہوئے سانس کے ساتھ دوڑتے دیکھتا تھا۔ بہتے پسینے کی دھاریں ٹھوڑی پر جمع ہو جاتیں۔ اور پھر کپڑوں میں جذب ہو کر اُن کی چمکتا ہٹ میں اضافہ کر دیتی تھیں۔ میرے سینے میں میرا ننھا سا دل لرز جاتا تھا کہ کیونکر ایک انسان حیوانوں کے سے کام کر رہا ہے؟

اور کسی جذبے کے ماتحت لیکن ان باتوں سے بے
پرواہ وہ اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ زرینہ کے آخری
دنوں اس کی حالت دگرگوں ہو چکی تھی۔ اس کے
گالوں کو میں نے غور سے دیکھا تھا۔ ان کی سُرخی
غائب ہو چکی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ سیاہ
حلقے بنے تھے اور چہرے کی پہلی بشاشت اور
جاذبیت نے شاید وہیں اپنی قبر بنالی تھی۔ اور
جب زرینہ آخری ہچکیوں میں اس کی طرف تکتی
سی نگاہیں ڈالتی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی
تو میں نے دیکھا کہ وہ اوروں کی طرح چیخا چلایا نہیں
تھا اس کی آنکھوں سے ظاہری طور پر آنسوؤں
کے دھارے نہیں پھوٹے تھے۔ لیکن مجھے محسوس
ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں عظیم طوفان برپا ہے
جو پھٹنے کے لئے بیتاب ہے اس کی تھکی انتہائی
مایوس نگاہوں سے خون ٹپکتا دکھائی دیتا تھا
سر جھکا تھا اور شاید پھر کبھی نہیں اُٹھا تھا اور میں
سوچتا کہ ایک زندگی تو موت کی نذر ہو گئی لیکن
کرنے کی شوخیاں کہاں چلی گئی تھیں۔ اور پھر مجھے
خیال آجاتا تھا کہ شاید وہ زرینہ کی موت سے
پہلے ہی گھر کے اس کرب آمیز سناٹے میں
تحلیل ہو کر رہ گئی ہوں۔

ہماری محفلوں اور کھیلوں کے سلسلے ٹوٹ
چکے تھے۔ ہماری گلیاں سنسان سی تھیں اور پھر کریا
۔۔۔ وہ تو اب ہر وقت کسی گہری سوچ میں غرق
بیٹھک کے کونے میں چارپائی پر پڑا رہتا تھا۔ کام
کرنے کو اس کا جی شاید نہیں چاہتا تھا۔ اور یوں
معلوم ہوتا گویا اب وہ ہر چیز سے اُکتا چکا ہے
ہمیں تو کچھ سمجھ ہی نہ آتی تھی۔ کہ اسے ہو کیا گیا
ہے اس کے قریب آنے سے ہمیں کچھ خوف
سا آجاتا تھا اور جرأت ہی نہ ہوتی تھی کہ اسے
کھیلنے یا کسی اور دلچسپ چیز کا کہیں بلکہ یہ ڈراؤنا
خیال آجاتا تھا۔ کہ وہ خاموش بیٹھے یکایک کسی
جانور کی طرح بھڑک کر ہمیں جھنجھوڑ ہی نہ ڈالے دِن
گذرتے جا رہے تھے۔ اور وہ یونہی پڑا سُوکھتا
جا رہا تھا جیسے اندر ہی اندر اُسے کوئی آگ پگھلا
رہی ہو ۔۔۔ اور پھر آخر ہم نے یہ بھی سُن ہی لیا
کہ اُسے بھی زرینہ کی سی بیماری ہو گئی ہے ۔۔۔
ڈاکٹر نے اُس کے قریب جانے، اُس کی چیزیں
چھونے، اور استعمال کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اور
یہ احتیاطی حکم ہمیں بھی سُنا دیا گیا تھا۔ مبادا ہم بھی
کہیں اس موذی مرض کے پنجوں میں گرفتار ہو جائیں
اور ہم بزرگوں کے ڈر سے دُور ہی رہا کرتے تھے
اور میں نے اکثر دیکھا تھا کہ ہر سیانا آدمی اُس کی
بیٹھک کے قریب سے گزرتے ہوئے آہستہ سے
اپنی ناک پر رومال رکھ لیا کرتا تھا کوئی یہ کہتے گزر جاتے
تھے۔ کہ چھوکرے دِق کا مریض ہے۔ ہوا جراثیم سے
بھری ہو گی۔ اور میرے دماغ میں یہ حیرت آمیز
خیالات یونہی بھٹک آتے تھے۔ کہ زرینہ کے لئے
اُس نے خون پسینہ ایک کیا تھا۔ اُس کے آگے
پیچھے ہونے والے بہت تھے۔ بے شمار دوائیاں
آتی ہی رہتی تھیں۔ لیکن اُسی مرض کا مریض کریا یونہی
چھت کی طرف خالی خالی نگاہوں سے ٹکٹکی باندھے
دیکھتا رہتا ہے۔ کوئی اُس کے قریب نہیں آتا
اُسے دوائیاں پلانے والا کوئی نہیں اور تیمارداری
کے لئے کوئی ہاتھ نہیں بڑھاتا۔ اور واقعی کوئی بھی
تو نہیں تھا۔ وہ یونہی خوف انگیز تنہائیوں
میں دن رات پڑا رہتا تھا۔ اور پڑا ہی رہتا تھا۔
اور ٹکٹکی باندھے چھت کی طرف مسلسل گھورتا ہی
رہتا تھا۔ اور اسی طرح لیٹے لیٹے دیکھتے دیکھتے
اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ خون منجمد ہو گیا جسم
خاموش ہو گیا۔ اور پھر دو چار آدمی جمع ہوئے اس
کے کپڑوں اور گندے پھٹے بستر وغیرہ کو نذرِ
آتش کر دیا میں نے انہیں جلتے دیکھا تھا۔ اُن کی
بدبو نے میرے دماغ میں داخل ہو کر مجھے تنگ کر دیا
تھا۔ بعد ازاں کرمے کی یاد دماغوں سے مٹ گئی
لیکن جب کبھی کسی جلتے چیتھڑے کی بدبو میرے

نتھنوں میں داخل ہوتی ہے تو میرا تخیّل کرمے کی دردانگیز تصویریں میرے سامنے لے آتا ہے اور میں اُن میں محو ہو کر رہ جاتا ہوں۔ گھنٹوں کھویا رہتا ہوں۔ اور سوچتا ہوں — کرما کون تھا —؟ اس دنیا میں وہ کیوں آیا —؟؟ ۔اور پھر اُس پر کیا بیتی —؟؟؟ ۔اور اب بھی میرے نتھنوں میں کسی جلتے کپڑے کی داخل ہوتی ہوئی بدبو نے میرا تخیّل اُکسایا ہوا ہے — اور میں بہت کچھ سوچ رہا ہوں —!

محمد احسن

سالِ سوم

نوائے مزدور

(کالج کے ایک غیر طرحی مشاعرہ کیلئے)

اک تو صاحبِ وقار سہی
اور میں بینوا و زار سہی

تجھکو حاصل ہے صد لباسِ حریر
مجھکو اک دلق تار تار سہی

تو سدا محو لالہ پاشی ہے
میں رہینِ آشنائے خار سہی

تیری ہر مصیت پہ ہے تعریف
میری ہر بات ناگوار سہی

دورِ ساغر ہے تو کیف فراغ
میری قسمت میں رنج کار سہی

ہر متاعِ گراں ہے تجکو نصیب
میں گرفتارِ انتظار سہی

میری سرمستیٔ شباب سے ڈر
میری فریاد انقلاب سے ڈر

اک طرف فخرِ جاہ و مال بھی دیکھ
اک طرف شوکتِ خیال بھی دیکھ

بادِ صرصر کریج سے کے روشن ہے
شمع مزدور کا جمال بھی دیکھ

میرا آغاز یاس خیز سہی
میرا اندیشۂ مآل بھی دیکھ

کنج پستی میں کٹ گئی، لیکن
اب علاجِ غمِ زوال بھی دیکھ

تجھ پہ میرا جمود بھی ہے عیاں
میرا اب رنگِ حال و قال بھی دیکھ

یوں ستاروں سے کہہ گئی شبنم
ذوقِ رم ہے تو پھر کمال بھی دیکھ

گردشِ بخت سے جو بچ نکلوں
مجھ سے تفسیرِ ماہ و سال بھی دیکھ

اپنی ہمت سے کام لوں گا میں
دہر سے انتقام لوں گا میں

سرور

اقبال کا فلسفۂ تعلیم

یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو سٹیشن پشاور سے نشر کیا گیا ارباب ڈائریکٹر صاحب کی اجازت سے شائع کیا جا رہا ہے

اُنیسویں صدی کا نصف آخر وہ ناقابلِ فراموش زمانہ ہے جس میں نہ صرف ہندوستان کے نظامِ حکومت میں ایک انقلابِ عظیم واقع ہوا۔ بلکہ قدیم تہذیب و معاشر اور جدید تمدن و ثقافت کے درمیان ایک زبردست معرکۂ کارزار بھی برپا ہوا۔ روایاتِ قدیم کا مضحکہ اُڑایا جانے لگا۔ رسم و رواج کو خرافات کا نام دیا جانے لگا۔ نئی قوتیں برسرِ اقتدار آنے لگیں اور نئے اوضاع و اطوار اختیار کئے جانے لگے غرض اس وقت ملک پر ایک بحرانی کیفیت طاری تھی۔ مشرق اور مشرقی اوصاف و اقتدار سے بے اعتنائی برتی جا رہی تھی۔ اور مغرب اور مغربی خیالات و آراء کا خیر مقدم ہو رہا تھا کورانہ تقلید کا طوفان آیا ہوا تھا۔ اپنی نیکی بدی معلوم ہوتی تھی اور غیروں کی بدی نیکی نظر آتی تھی۔ انسان خود اپنی نظروں میں حقیر ہو رہا تھا۔

اس عالمگیر انتشار اور اضطراب کا خود دار اور حساس طبیعتوں پر بہت گہرا اثر پڑا۔ حالی کے تاثرات نے ان کے لافانی مسدس کی شکل میں بزرگانِ سلف کے کارناموں کی یاد کو زندہ کیا اور مایوس دلوں میں اُمید کی لہر دوڑانے کی کوشش کی۔ اکبر الہ آبادی کے دلی جذبات کا اظہار ظرافت کے رنگ میں ہوا۔ اُنہوں نے تہذیبِ مغرب کی نظر فریب جلوہ سامانیوں اور اُس کی اندھا دھند نقل کی ہنسی اُڑائی ایک نے ناصحانہ انداز میں "داستانِ پارینہ" سنا کر واقعاتِ ماضی سے استفادہ کرنے کا سبق دیا۔ تو دوسرے نے زندہ دل چارہ گر بن کر زمانۂ حال کے بظاہر خوشنما مگر دراصل تلخ و ثقیل حقائق سے پرہیز کی ہدایت کی۔ سننے اور دیکھنے والوں نے اپنے بزرگانِ سلف کے عظیم الشان کارناموں کے قصے بھی سن لیے اور اپنی موجودہ پریشانی اور بدحالی کا نقشہ بھی دیکھ لیا۔ لیکن مرض کی تشخیص نہ ہو سکی صحیح علاج کا کوئی نسخہ ہاتھ نہ آیا۔ مستقبل کے لئے کوئی کارآمد لائحۂ عمل دستیاب نہ ہوا۔ قدرت نے یہ کام اقبال کے لئے مقدر کیا ہوا تھا۔ اور اُنہوں نے اسے بوجہ احسن انجام دیا۔

اقبال نے ہندوستان کی پامال شدہ عظمت کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا۔ اُنہوں نے مُلک کے طول و عرض میں زوال و بربادی کے تباہ کن اثرات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ وہ مشرق کی روایتی تعلیم کے علاوہ مغربی علم و تمدن سے بھی بہرہ اندوز ہوئے۔ اُنہیں اپنے ملک کی سیاسی، مجلسی اور اخلاقی حالات کا موازنہ اقوامِ مغرب کے حالات کے ساتھ کرنے کا بھی موقع ملا۔ اُنہوں نے اسلام اور اسلامی تہذیب کے زندۂ جاوید اثرات صقلیہ اور اندلس جیسی دور افتادہ سرزمینوں میں دیکھے۔ اُن کا دل مشرقی ممالک کی سقیم الحالی پر خون کے آنسو رو دیا۔ اور وہ اُن کے زوال و انحطاط کے اصلی وجوہ و اسباب معلوم کرنے کی مسلسل مساعی میں مشغول ہو گئے اُنہیں حیرت اس بات کی تھی کہ اُن کے خیال کے مطابق تو اسلامی فلسفہ اصلاح و ترقی و عروج کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پھر یہ اسلامی ممالک کیوں اس ذلت اور مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اسلام تو علوم و فنون کی دنیا میں کامل آزادیِ خیال کی تلقین کرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے قرونِ اولیٰ

کے مسلمانوں نے دنیا کو علم و حکمت کے بیش بہا خزائن سے مالا مال کر دیا۔ اب اُن کے جانشینوں پر جہالت اور اوہام پرستی کا غلبہ کیوں ہے ایک عرصہ کی غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اسلام نے تو استحکامِ خودی کا درس دیا تھا لیکن زمانہ کے ہاتھوں آفتابِ حرّیت پر نفئ خودی کا تاریک بادل چھا گیا۔ یونانی تہذیب اور افلاطون کے فلسفے نے خودداری اور بے باکی کے جذبات کو شکست خوردہ ذہنیتوں میں تبدیل کر دیا۔ اور غیر اسلامی تصوف نے دماغوں میں گوسفندی روح بھر دی۔ انقلاب و تصادم کی متلاشی ہستیاں کشمکشِ حیات سے دور بھاگنے لگیں۔ قوتِ عمل مفقود ہو گئی جسم و روح پر مُردنی چھا گئی اور عالمِ اسلام پر غفلت و جمود کا زمانہ آگیا۔

تشخیصِ مرض کے بعد انہوں نے تکرمداوا کی سعی کی بیماری کی ابتدا نفئ خودی کے فلسفہ سے ہوئی تھی۔ اس لئے خود فراموشی کا علاج خود آگاہی اور استحکامِ خودی کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اسی سے اُن خارجی اثرات کا ازالہ ہوتا ہے جو فلسفۂ یونان اور غیر اسلامی تصوّف کی وجہ سے حیاتِ ملی میں داخل ہو گئے ہیں اور اسی سے صحیح راہ اور طرزِ عمل کا تعیّن ہوتا ہے۔ اُن کی رائے میں ہر فرد کے اندر بے شمار اظہار طلب قوتیں اور صلاحیتیں موجود ہیں۔ جن کے ارتقائے امکانات کی کوئی آخری حد مُقرّر نہیں ہو سکتی لیکن انفرادی صلاحیتوں کا اظہار اور ارتقاء صرف اُسی حالت میں ممکن ہوتا ہے جب فرد ماحول کے ہر قسم کے اثرات کی زد میں آئے۔ اُن کا مقابلہ کرے اور اُن پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے کیونکہ اگر دنیائے کشمکش سے گریز کیا جائے۔ تو زاویۂ نگاہ تنگ ہو جاتا ہے اور خودی پر زوال آجاتا ہے۔ اسی لیئے اقبال کا کلام سخت کوشی کی تعلیم دیتا ہے۔ اُن کی شاعری جرأت آموز اور اُن کا فلسفہ ہمّت آفریں ہے اُن کا کلام خودی کے استحکام اور بے باکانہ اظہار کے پیغام کا حامل ہے۔ اُن کے نزدیک مجلسی اور تعلیمی مساعی کا منتہائے نظر خود آگاہی اور خودی کی نگہداشت اور نشو و نما سے بہتر نہیں ہو سکتا اور یہی نظریہ تعلیم علم الحیات۔ علم النفس اور علم التعلیم کے ممتاز ترین ماہرین کا ہے۔ شخصیت نتیجہ ہوتی ہے۔ اس مسلسل اور زبردست جد و جہد کا جو انسان بیرونی ماحول کی طاقتوں اور اپنے اندرونی ناموافق رجحانات کے خلاف جاری رکھتا ہے۔ ماحول کا اثر فرد پر پڑتا ہے اور فرد اپنا اثر ماحول پر ڈالتا ہے۔ اثر پذیری اور اثر اندازی کا یہ سلسلہ لامتناہی انسان کی حقیقی زندگی کا ضامن ہے۔ ترقی پذیر انسان اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور بوقتِ ضرورت اُسے اپنے مقاصد کے مطابق نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے جو خام کار انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہتا ہے اُس کی اندرونی صلاحیتوں کو زنگ لگ جاتا ہے۔ اُس کی رُوحِ عمل کے پر و بال شل ہو جاتے ہیں۔ اور اُس کی زندگی زندگی نہیں رہتی۔ بلکہ سنگ و خشت کی طرح بے حس اور بے جان جسم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ عمل کیمیا ہے۔ اور بے عملی زہرِ قاتل۔ تخلیقِ مقاصد و آرزو سے شخصیت کی تربیت اور ترقی ہوتی ہے محض تقلید شخصیت کی تباہی اور بربادی کا موجب بنتی ہے۔

ملّت مجموعہ ہے افراد کا۔ افراد کی خودی محکم ہو تو ملّت بھی زندہ اور مضبوط ہو گی اور اس کی تہذیب اور روایات پائندہ و مستقل افرادِ ملّت کی ثقافت اور کارناموں سے جرأت اور قوت حاصل کریں گے اور ملّت افراد کے عملِ تخلیق۔ جذبۂ تحقیق اور آرزوئے وحدت سے استحکام پائیگی۔ اس میں خود اعتمادی ہو گی وہ منّتِ غیر سے بے نیاز ہو گی۔ اس کے خیال میں ندرت ہو گی

اور عمل میں آزادی۔ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے اور دوسروں کی کورانہ نقالی کو وہ انسانیت کی توہین خیال کرے گی۔ بادشاہی بھی جدوجہد کئے بغیر ہاتھ آئے تو اُسے باعثِ "ننگ" سمجھے گی۔ ایسی تعلیم کو جو اُسے اپنی تہذیب و معاشرت اور تاریخ سے بیگانہ بنائے اور اُس کی خودی اور ندرتِ خیال کو نہ اُبھارے وہ ہرگز قبول نہ کرے گی۔

اقبال کے خیال میں مغرب کی کورانہ تقلید نے اقوامِ مشرق کی روح کو برباد کر ڈالا ہے۔ اور اس کی تخلیقی قوتوں کو پامال کر دیا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ تعلیمی نظام کی بنیاد غیر ملکی تہذیب، غیر ملکی زبان اور غیر ملکی خیالات و حالات پر رکھی گئی ہے ہندوستانی نوجوان دنیا اور ماحول کو مانگی ہوئی عینک سے دیکھتا ہے اور نقالی اور تقلید کی مسموم آب و ہوا میں پرورش پاتا ہے اس لئے نہ اس کے ارادوں میں بلندی اور نہ اُس کے خیال میں آزادی ہے نہ اُس کے عمل میں بے باکی اور نہ اُس کے دل میں جذبۂ تخلیق۔ اس کی قدرتی صلاحیتیں خوابیدہ ہیں۔ کیونکہ اُن کے ارتقاء اور جذبۂ تخلیق کی پیدائش اور پرورش کے لئے صرف آزادی کی آب و ہوا ضروری ہے اور وہ انہیں میسر نہیں جب تک فکر و عمل کی آزادی میسر نہ ہو۔ انسان پیہم تبدیل ہونے والے ماحول پر اثر انداز ہونے کے لئے مؤثر قدم اُٹھا نہیں سکتا۔ اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پرانے خیالات اور پرانے طریقوں کے خلاف جہاد کرنے میں دقتیں برداشت کرنی ہوتی ہیں۔ غلطیاں کر کے اُن سے سبق حاصل کرنا اس کے لئے محال ہو جاتا ہے حالانکہ تعلیم کی حقیقی روح یہی ہے۔ کہ طالب علم اپنے عمل کے ذریعے علم حاصل کرے۔ جو علم عمل کے ذریعے حاصل نہ ہو وہ قوت میں تبدیل نہیں ہو سکتا اور ماحول کی تعمیر اور تجدید کے لئے کام میں نہیں لایا جا سکتا۔ اقبال عمل پیہم اور سخت کوشی کو اصلِ حیات قرار دیتے ہیں۔

بدر ریا غلط و با موجش در آویز ۔ حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

گوشہ نشینی، ترکِ دنیا اور عافیت پسندی اُن کے نزدیک پسندیدہ اشتغال نہیں۔ مجادلۂ حیات سے دور رہنا شیوۂ نامردی ہے۔

بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

طوفانِ حیات میں مجاہدانہ داخل ہو کر ثباتِ قدم کے ساتھ ہر قسم کے حادثات کا مقابلہ کرنا استحکامِ خودی کے لئے ضروری ہے "اگر خواہی سلامت بر کنار است" کی تعلیم خودکشی کی تعلیم ہے۔ رازِ زندگی ۔ "اگر خواہی حیات اندر خطر زی" میں مضمر ہے۔

اگر تعلیم زندگی کی تیاری کے مترادف ہے۔ اور زندگی ہمہ تن عمل ہے۔ تو لامحالہ تعلیم بھی عمل پر مبنی ہونی چاہیئے۔ عمل مادی دنیا میں بھی اور روحانی میدانوں میں بھی۔ مادی دنیا کی تسخیر کے بغیر روحانی ترقی اور اعلیٰ مقاصد کا حصول ناممکن ہے۔ لیکن انسان تنہا نہیں رہ سکتا۔ اُسے سماج میں زندگی بسر کرنا ہے فردِ واحد کی قوتیں منتشر اور مقاصد محدود اور غیر واضح ہوتے ہیں۔ زندہ ملت میں شامل ہو کر اُس کی طاقتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اور اُسے عظیم الشان مقاصد مشترک کا احساس ہو جاتا ہے جس سے اس کی خودی میں اور زیادہ استحکام پیدا ہو جاتا ہے

فرد مے گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد مے یابد نظام

لیکن بنائے ملت ملکی حدود اور نسلی امتیازات پر قائم نہیں ہو سکتی۔ اقبال کی نظر میں ملت کا مفہوم بہت وسیع اور ملک۔ قوم۔ نسل۔ رنگ کی حدود سے بالاتر ہے ہم دلی اور یک نگاہی اصل ملت ہے

ملت از یک رنگی دلہا ستے
روشن از یک جلوہ ایں سینا ستے
قوم را اندیشہ ہا باید یکے
در ضمیرش مدعا باید یکے
ملت ما را اساسِ دیگر است
ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است

ملت کی زندگی بھی افراد کی مانند ایک مسلسل عمل ایک متواتر حرکت ہے۔ نئی نئی منازل میں سے نئے نئے مقاصد کی طرف اور نئی نئی فتوحات کے لئے۔

اقبال اس قسم کے افراد اور اس قسم کی ملت پیدا کرنے کے خواہشمند ہیں جن کی زندگی کوشش اور کشاکش کی زندگی ہو

یک دم شیری بہ از صد سال میش

جو ماحول کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی قابلیت اور "تلاق بہار تازہ" ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں عقل کے ذریعے فطری طاقتوں پر قبضہ کرکے ازدیاد علم وقوت وعمل کے لئے استعمال کریں اور پھر اپنی قوتوں کو "عشق" کی رہنمائی میں نوع انسان کی بھلائی کے لئے وقف کردیں۔ جن کا دل جرأت سے معمور ہو اور خوف خدا کے سوا ہر قسم کے خوف وہراس سے پاک لیکن بد قسمتی سے ہماری سماجی زندگی اور نظام تعلیم کی جو حالت ہے اُس سے خوف بچوں کی رگ رگ میں سما جاتا ہے۔ بچپن میں جاہل مائیں انہیں دیوؤں اور بھوتوں کے فرضی افسانوں سے ڈراتی رہتی ہیں۔ مدرسہ میں سنگ دل استادوں اور شریر ہم جماعتوں کے خوف سے اُن کی جان عذاب میں رہتی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انہیں اپنے جذبات واحساسات کو جبراً دبائے رکھنا پڑتا ہے اور اُن کی اندرونی کشمکش کے ساتھ کسی کو ہمدردی نہیں ہوتی۔ مذہب، سیاسیات اور سماج کے تمام رسم ورواجات کے زیر اثر انہیں آزادانہ اظہار رائے سے باز رکھا جاتا ہے۔ اُن کے دل میں حاکم کی برتری کا خوف بیدار کردیا جاتا ہے۔ اس لئے آج کل کے تعلیم یافتہ نوجوان تنگ خیال اور کم ہمت ہوتے ہیں تعصب اور خود غرضی اُن کے رگ وپے میں سرایت کرجاتی ہے۔ "وہ زیستن اندر خطر ہا زندگی است" کے معنے تک سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اُن کا مطمح نظر آرام دہ ملازمت اور کثیر المنفعت غلامی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ وہ اپنی خودی اور روح تک کو بیچ دینے پر تیار ہوجاتے ہیں حالانکہ:-

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی ومرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر وسیم

جو فرد اپنی خودی کو مستحکم رکھتا ہے وہ دوسروں کی خودی کا بھی احترام کرتا ہے۔ وہ وسیع المشرب ہوتا ہے اُس میں قوت برداشت ہوتی ہے۔ ڈر یا کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ طاقت اور جرأت کے احساس کے باعث

بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
مے شود بر کافر ومومن شفیق

لیکن گو اُس کی عملی زندگی اُسے دنیائے ہست وبود کو مسخر کرلینے کی طاقت بخش دیتی ہے۔ تاہم وہ سمجھتا ہے کہ اُس کی زندگی کا واحد مقصد حصول زر وسیم نہیں۔ وہ دنیاوی کشمکش میں شامل تو ہوتا ہے۔ لیکن صرف مادی اسباب وفوائد حاصل کرنے کی خاطر نہیں بلکہ انہیں اعلیٰ ترین مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی غرض سے۔ اُس کا "فقر" تمادیت واقتدار کے وقت اُسے غرور اور حکومت کے نشے میں چور ہونے سے باز رکھتا ہے۔ اور غلامی اور محکومی کے وقت اس کا استغنا اُسے رشوت اور غداری کے انعامات سے بے نیاز کردیتا ہے۔

اُس کی امیدیں قلیل اُس کے مقاصد جلیل
اُس کی ادا دلفریب، اُس کی نگہ دل نواز

اس قسم کے دل ودماغ رکھنے والے انسان اور اس نوع کی ملت پیدا کرنے کے لئے ایسی تعلیم کی ضرورت ہے۔ جو انسان کی تخلیقی قوتوں کی نشو ونما کرے اور اُس کے دل میں نئے نئے علوم وفنون اور نئی نئی طاقتیں حاصل کرنے کی اُمنگ پیدا کرے جس کی بنیاد عمل پر ہو اور جو انسان کو قدرت کی طاقتوں کو مسخر کرنا سکھائے۔ ایسی تعلیم میں سائنس کو یقیناً اہم درجہ حاصل ہوگا۔ کیونکہ سائنس مادی دنیا پر غالب آنے کا بہترین ذریعہ ہے اور سائنس ہی کے ذریعے قوموں کی سیاسی اور اقتصادی حالت سنورتی ہے۔ تعلیم میں مذہب کو بھی ممتاز جگہ دی جائیگی

کیونکہ سائنس حقیقت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں
کی تصویریں پیش کرتی ہے اور مذہب تمام دکمال
حقیقت کو بیک نظر سامنے لے آتا ہے۔ اس
لئے سائنس کی تعلیم مذہب کے بغیر نامکمل رہتی ہے
مذہب وہ نتائج پیدا کرسکتا ہے جو صرف منطق
اور عقل ہرگز نہیں کر سکتی۔ تاریخ عالم میں مذہب
نے افراد اور اقوام کی قسمتیں پلٹ دیں۔ لیکن
مذہب سے مراد محض ظاہری رسوم، رہبانیت یا
کہانت نہیں۔ مذہب وہ چیز نہیں جو تعلیم گاہوں
میں دینیات کے نام سے مروج ہے۔ اور حیات
افروز روح سے محروم ہے۔ سماجی، سیاسی
اقتصادی مسائل کے سمجھنے یا حل کرنے سے قاصر
ہے۔ بلکہ مذہب وہ حیات بخش طاقت ہے جو
خدا کی راہ میں نیک بے لوث اور جد وجہد کی زندگی
بسر کرنا اور دنیا و عقبیٰ میں کامیاب و سرخرو ہونا
سکھاتی ہے۔ علم تاریخ کو بھی شامل نصاب کرنا
ضروری ہے۔ کیونکہ قوموں کے ارتقائے عمومی
میں تاریخ نے ہمیشہ اہم حصہ لیا ہے لیکن تاریخ
سے مراد صرف قصہ کہانی نہیں۔ صحیح قسم کی تاریخ
ماضی کو زندہ کر دیتی ہے۔ ملت کو اپنی تہذیب کی
تدریجی ترقی کی تصویر دکھا دیتی ہے اور یہ بتاتی
ہے کہ اقوام عالم میں اُن کا مقام کیا رہا ہے اور کیا
ہونا چاہیئے۔ تاریخ پڑھنے سے اپنی عظمت اور
قوت کا احساس ہوتا ہے اور خودی کو قوت
پہنچتی ہے۔

چیست تاریخ اے ز خود بیگانۂ
داستانے قصۂ افسانۂ

نہیں بلکہ

ایں ترا از خویشتن آگہ کند
آشنائے کار و مرد رہ کند
ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو
سر زند از ماضی تو حال تو
خیزد از حال تو استقبال تو

زمانۂ حال کی مصوری رقص اور موسیقی کو اقبال
"فنون لطیفۂ غلاماں" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔
ان کے اندر انہیں موت نظر آتی ہے موسیقی کے
متعلق فرماتے ہیں:

"المحذر ایں نغمہ موت است و بس"

یا "در بم و زیرش ہلاک آدم است"

ناتوان و زار مے سازد ترا
از جہاں بیزار مے سازد ترا

اُن کے خیال میں

نغمہ باید تند رو مانند سیل
تا برد از دل غماں را خیل خیل
نغمہ مے باید جنوں پروردۂ
آتشے در خون دل حل کردۂ
نغمہ گر معنی ندارد مردہ ایست
سوز او از آتش افسردہ ایست

مصوری کی نسبت ارشاد ہوتا ہے

مے چکد از خامہ ہا مضمون موت
ہر کجا افسانہ و افسون موت

زمانۂ حال کا مصور

کیش او تقلید و کارش آذری است
ندرت اندر مذہب او کافری است

اقبال کی نظر میں آرٹ کے حسن کی نسبت اس کے معانی
موضوع اور مطالب زیادہ اہم ہیں جو آرٹ خودی
کی تکمیل اور ذہن و قلب کی بیداری کے کام نہ آئے
وہ قابل اعتنا نہیں۔ جو ادبیات اس اہم مقصد کی
بجا آوری میں ممد نہ ہوں۔ وہ قابل قبول نہیں۔
جن مضامین کا مقصد تکمیل خودی نہ ہو وہ
داخل نصاب تعلیم نہیں ہو سکتے "ہندی مکتب" کا بڑا
نقص یہی ہے کہ اس میں خودی کا درس "پیام آدمیت"
نہیں دیا جاتا" دیدۂ شاہیں" میں نگاہ "خفاش"
رکھ دی جاتی ہے۔

مدرسے نے تیری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اساتذہ "کہنہ روایات" کے پھندوں میں گرفتار ہیں۔

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

کتابیں پڑھنے والوں کو کورِ ذوق بنا رہی ہیں چنانچہ طالب علم کے لئے دُعا ہے۔

خدا تجھے طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

صحیح تعلیم کا مقصد خود آگاہی۔ بلندیٔ آرزو۔ جوشِ عمل۔ زورِ بازو پیدا کرتا ہے۔ تاکہ زندگی اس درجہ مستحکم و استوار ہو جائے۔ کہ بڑے سے بڑا خطرہ اور مہیب سے مہیب حادثہ اس میں تزلزل پیدا نہ کر سکے۔"

ا۔ ع۔ ص۔

سردار ہری سنگھ امرتسری

ص ۲۱ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سردار ہری سنگھ کو پشاور کا صوبہ دار بنا کر بھیجا۔ روانگی کے وقت مہاراجہ نے صوبہ دار کو نصیحت کی کہ ہوشیار دشمن سے ہر وقت خبردار رہنا۔ پشاور پہنچ کر ہری سنگھ نے اہلِ شہر کو انعام و اکرام سے خوب نوازا اور رعایا کے پاؤں میں اس نے سونے کی زنجیر ڈال دی۔ اس کی سخاوت کا شہرہ کابل تک پہنچ گیا۔ کابل میں خان حاجی ایک نامور شخص جو وزیر تو نہ تھا مگر حقیقت میں کسی وزیر سے کم بھی نہ تھا اس کے دل میں ہری سنگھ نے نفاق کا بیج بو دیا اس کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کے بعد ہری سنگھ کے دل میں کابل اور پھر ایران کو زیر کرنے کا خیال پیدا ہو گیا۔ اس خیال نے اسے امیر دوست محمد خاں کے نام یہ خط لکھنے پر مجبور کیا

"بنام امیر دوست محمد خاں۔ واضح ہو کہ خدا نے مجھے تیز تلوار دے کر رستمِ دوراں بنایا ہے میرا ارادہ تمام جہان کو فتح کرنے کا ہے۔ اور اول قرعہ تمہارے نام نکلا ہے۔ اس لئے۔

"بخدمت کمر بندیا در گریز۔ وگرنہ من و کابل و تیغِ تیز"۔ میرے پاس اسلحہ اور سپاہ اس قدر حاضر ہے کہ تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ اور تمہارے پاس

"چو شطرنج بازان نیرنگ و رنگ
پیادہ ستنے چند داری بجنگ
ترا طاقت جنگ د پیکار کو
زرت کو سپہ کو سپہدار کو"

اس امر کا خوب لحاظ رکھو کہ یہ سب ملک میرے قبضہ میں آئیں گے اور یہ ہمارے نوشتوں میں پہلے سے لکھا ہوا ہے۔ اس لئے اطاعت قبول کرو۔ ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اور

"بہ بینی تو جنگ تہنگان من
پلنگان کوہی تلنگان من"

اس خط کا جواب جلد دینا اگر صلح کی خواہش ہے تو صلح اور اگر جنگ چاہتے ہو تو جنگ

"از طرف ہری سنگھ"

جس وقت یہ خط امیر کابل کو پہنچا تو اس نے فوراً جواب دیا۔

"بنام ہری سنگھ"
حمد اُس خدا کو لائق ہے جو قادرِ مطلق ہے جس نے ضحاک جیسے سفاک کے ملک پر فریدوں جیسے مسکین کو قابض کر دیا۔ اور یہ اس لئے تھا کہ سب پر واضح ہے کہ وہ ہر بات پر قادر ہے۔ ملک اور دولت کوشش سے نہیں ملتے خدا نے مجھے جو ملک دیا ہے اس کے متعلق یاد رکھو کہ خدا کے دیے ہوئے کو کوئی نہیں چھین سکتا۔ جب تک خدا میرا دوست ہے۔ مجھے پرواہ نہیں اگر سب جہان دشمن ہو جائے۔ اے ہری سنگھ امرتسری! تمہارا خط ملا۔ اُس چوہے کی طرح جو شراب سے مدہوش ہو تم تیز پنجے والی بلی سے مقابلہ کرنا چاہتے ہو۔ ہوش میں آؤ تمہارے ہوش زائل ہو چکے ہیں اور عقل پر پردہ پڑ گیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قضا نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری "شمشان" کابل میں ہو یا خیبر کے کوے تمہارے کباب کھائیں لیکن کیا پنجاب میں لکڑی کا قحط پڑ گیا ہے کہ تم اپنی "شمشان" غیر ملک میں چاہتے ہو! تم مال و دولت چاہتے ہو۔ یہ بھی کوئی چیز ہے کیا مخنثوں کے پاس تھوڑی دنیا ہوتی ہے۔ میری خواہش تم سے جنگ کی نہ تھی۔ کیونکہ میں عہد کا پابند تھا۔ اور مجھے رنجیت سنگھ سے یہ امید نہ تھی کہ عہد کرتے وقت اُس کے دو دل اور ایک زبان تھی۔ بہتر ہوا کہ تم نے پیش دستی کی۔ آؤ کہ دو دو ہاتھ کریں مجھے اپنی بہادری سے کیا ڈراتے ہو۔ فرنگی نے اور شجاع نے کیا بگاڑ لیا کہ اب تم پیدا ہو گئے خدا کی قسم شمشیر کو نیام میں نہ کرونگا جب تک اسے تیرے خون سے نہ رنگ لوں۔ تم میرے اس خط کو مکمل پڑھ بھی نہ چکے ہو گے کہ میرے بہادر تمہارے سر پر آ پہنچینگے۔

ہری سنگھ کو جب یہ خط پہنچا تو اُس نے فوراً فوج کو اکٹھا کیا جس میں چالیس ہزار سوار تھے اور پیادہ فوج کا تو اندازہ ہی نہ تھا اس مجمع کثیر کے ساتھ جو اسلحہ اور سامان سے خوب آراستہ تھے کوچ کر کے وہ خیبر میں جمرود کے مقام پر پہنچا۔ جس وقت امیر کو ہری سنگھ کی آمد کی خبر ہوئی تو اُس نے سردارانِ لشکر کو بلا کر مشورہ کیا۔ خان حاجی جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے آگے بڑھا۔ اور کہا کہ ایک راستے سے جبار خان کو روانہ فرماویں اور دوسرے سے افضل اور اکبر خاں کو میں لشکر کو لے کر گھات میں بیٹھ جاؤں گا اور ہری سنگھ جب اس قلیل جماعت کو دیکھے گا تو فوراً اپنا حملہ کر دے گا۔ اس وقت میں باقی لشکر کے ساتھ اس پر حملہ آور ہو جاؤں گا۔ یہ رائے امیر کو پسند آئی لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ اس میں دغا ہے چنانچہ اسی مشورے کے مطابق ایک لشکر پہاڑی راستہ سے روانہ کیا اور

"براہ دگر اکبر شیر مرد
بہ لشکر سپہدار و سالار کرد
مخالف شکن اکبر پہلوان
بخصم افگنی تنگ بستہ میان"

بڑے جوش و خروش سے اس لشکر نے خیبر پہنچ کر مناسب مقام پر ڈیرہ لگا دیا۔ دشمن کا لشکر تعداد اور قوت میں بہت زیادہ تھا۔ لیکن افغانوں میں مایوسی بالکل نہ تھی۔ کیونکہ فتح اور شکست کو خدا کے ہاتھ میں تصور کرتے تھے صبح ہوئی۔ ہری سنگھ اپنے خیمہ سے نکل کر مجلس میں بیٹھا۔ ایک زرد پوش قاصد آیا۔ اور ہری سنگھ کو خان حاجی کا پیغام دے گیا بگل بجا اور سکھوں کی فوج حملے کے لئے چل پڑی۔ افغانی فوج کے میمنہ پر افضل خاں میسرہ پر اکبر خاں اور قلب پر جبار خان تھا ہری سنگھ نے حملہ کا حکم دیا۔ اور لشکر کے قلب پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے توپ خانہ نے آگ کا دریا بہا دیا جبار خاں اس کی تاب نہ لا سکا لیکن میدان چھوڑنا بھی اس نے مردانگی کے خلاف تصور کیا۔ اکبر خاں نے جب یہ حالت دیکھی تو مدد کے لئے اپنے لشکر کے ساتھ آ پہنچا۔ اور جوش و غضب سے بھرے ہوئے شیر کی طرح اُس نے حملہ شروع کر دیا۔

اس بہادری اور دلیری سے لڑا کہ میدان کو قابو
میں لے آیا۔ اور شکست کھانے والی فوج کو بچا لیا
ادھر ہری سنگھ نے بھی خوب زور لگایا۔ قیامت
کا نقشہ بندھ گیا۔

۵ "چناں شد ز شاہین و توپ و تفنگ
در نگا درنگ و زرنگا ز زناگ"

اس حملہ میں اکبر خان کے ساتھ جو فوج تھی اُن
میں سے اکثر دغا کر کے اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے
اور وہاں اُس کے ساتھ صرف چند آدمی رہ گئے
یہ معلوم کر کے ہری سنگھ فوراً آگے بڑھا اکبر خان
بھی یہ تاڑ گیا۔ دشمن کثیر تعداد میں تھا لیکن پسپا
ہو کر بھاگنے سے موت بہتر نظر آئی۔ ساٹھ سوار
ہمراہ لے کر آگے بڑھا۔ اور یکبار حملہ کر دیا۔ اکبر خان
نے عجیب تلوار میان سے نکال لی تو اللہ اکبر کا نعرہ
بلند کیا۔

"بلند آنچناں بانگ تکبیر شد
کہ در گوش من ہم بکشمیر شد"

اب سوائے آگے بڑھنے کے اور کچھ نہ تھا۔ اسی
ساعت جبّار خان اور شمس بھی آن پہنچے گھمسان
کی جنگ شروع ہو گئی۔

"ز یکسو کمان در ترنگا ترنگ
دگر سو طراق در نگا درنگ
ز یکسو شکا شاک شمشیر بود
دگر سو چکا چاک گرز و عمود"

اکبر خان اور اُس کے ساتھیوں نے وہ جوہر
دکھلائے کہ دنیا حیران رہ گئی۔ ادھر ہری سنگھ
بھی کم نہ تھا۔ تمام جسم زرہ سے ڈھکا ہوا خوب
مردانگی دکھلا رہا تھا۔ لیکن آخر قضا اسے اکبر خان
کے مقابل لے آئی۔ دونوں نے خوب جوہر دکھلائے
نیزے ٹوٹ گئے۔ اور خود ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے
دونوں سوار پسینہ میں ڈوب گئے۔ اور اُن کے
سانس پھول گئے۔ لڑائی کا کوئی فن ایسا نہ رہا
جو ان دونوں نے نہ آزمایا ہو۔ لیکن کوئی بھی اپنے
مقابل پر غالب نہ آ سکا۔

آخر اس غازی نے شہسوار کے کندھے پر
ایک ایسی ضرب لگائی کہ مدمقابل زمین پر گر کر
دم دے گیا۔ لیکن۔

"در آں مرگ انبوہ کس را خبر
نگردید از مرگ آں نامور"

+

ماخوذ و مترجمہ از اکبر نامہ۔ قاسم اکبر آبادی
اکبر نامہ ۱۸۴۴ء میں لکھا گیا۔ سکھوں کی جنگ
۱۸۳۷ء میں ہوئی۔ مصنف اسی زمانہ کا ہے اور
ہمعصر ہونے کے لحاظ سے اس کی بات آسانی سے
رد نہیں کی جا سکتی۔ تفصیل کیلئے دیکھیں اکبر نامہ
قاسم اکبر آبادی جس کا قلمی نسخہ کتابخانہ ہذا میں
موجود ہے۔

احمد حسن

ہمارے جلسے اور جلوس

جلسہ کرنے اور جلوس نکالنے کی رسم اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود آدم کی سرگزشت۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلا جلسہ وہ تھا جس میں فرشتوں کو میلادِ آدم کا مژدہ سُنایا گیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ فرشتوں میں سے کتنے صاحب صدر کی اس تجویز کے حامی بنے اور کون معترض ہوئے اس کے بعد بقول ملٹن جلسے کرنے کی ایک ایسی ہوا چل گئی۔ کہ آسمانوں کے کسی نہ کسی کونے میں روز ہی تو ایک نہ ایک جلسہ ہوجاتا۔ اور ان میں سے اکثر کی صدارت مسٹر عزازیل فرماتے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ روز کے ہونے والے جلسے کوئی خوشیاں منانے کو تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ خوشی منانے کو دردِ سر کون مول لینے لگا۔ یہاں تو کسی چیز کے نہ ملنے کا یا کھوئے جانے کا ماتم ہوتا ہے تو گویا عزازیل صاحب کی صدارت میں جو احتجاجی جلسے شروع ہوئے تو بس ایک رسم ہی پڑ گئی۔ آج بھی اگر آپ ذرا غور فرمائیں تو اس احتجاجی قسم کے جلسے باقی ہر قسم کے جلسوں سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

میں نے جلسے اور جلوس کا نفسیاتی تجزیہ آج تک تو نہیں کیا البتہ آپ کی خاطر سے چند منٹ کے لیئے فرائڈ آنجہانی کی شاگردی قبول کر لیتا ہوں۔ اور اس سُنت پر چلنے کا ثواب خود اینٹھنے کی بجائے نہایت بے طمع ہو کر آنجہانی کی روح کو بخشتا ہوں آپ نفسیاتی تجزیہ کے الفاظ سُن کر شاید گھبرانے لگے ہوں سو میری عرض یہ ہے کہ اس محمل کی لیلےٰ اپنی جھلک دکھلانے کو خود ہی بے قرار ہے بیجئے دیکھیئے! یہ لیڈر قسم کے لوگ پہلے تولتے ہیں پھر بولتے ہیں حالانکہ ہم آپ اکثر اس کے برعکس کرتے ہیں اور آج کل عوام کی آراء کا احترام کرتے ہوئے جمہوری خیال کے لیڈر بھی پہلے تولتے اور پھر بولتے ہیں تو خیر آپ یہ پوچھیے کہ بولنا تو ہر ایک جانتا ہے یہ تولنا کیا ہوا! میں بجواب عرض کروں گا حضرت یہ نون، تیل، ادرک نہیں تولتے۔ یہ سبحان تیری قدرت کے مجسمے یعنی بنی آدم کو تولتے ہیں۔ اور ایکدم پتہ لگا لیتے ہیں کہ آپ کا وزن شریف کتنا ہے۔ چنانچہ ان کا تجربہ ہے کہ یہ جنس جتنی زیادہ ہو تول میں اتنی ہی ہلکی ہوجاتی ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ بھائی یہ کیا پہیلیاں بجھوانی شروع کر دیں تو میں یہی کہوں گا کہ حضرت یہ پہیلی نہیں واقعہ ہے۔ آدمی ایک سے دو ہوجائیں تو اتفاق اور شعبدہ بازی کے نقطۂ نظر سے گیارہ ہوجاتے ہیں لیکن سوچ بچار کے لحاظ سے ½ اور ماشاءاللہ تعداد جتنی بڑھے اتنی عقل کم ہوجاتی ہے نعرے جتنے بلند ہوں سمجھ اتنی پست ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اس مجرّب کایا پلٹ سے فائدہ اُٹھانے کو جلسے بلائے جاتے ہیں اور اسے دو آتشہ سہ آتشہ کرنے کو جلوس نکالے جاتے ہیں۔ میرا مدعا بیان ہوچکا ثواب پہنچے اس کا فرائڈ آنجہانی کی روح کو۔

یادش بخیر:- ہمارے نرالے ملک میں ان جلسوں جلوسوں کا رنگ بھی نرالا ہوتا ہے۔ سمندر پار کے ملک تو میں نے دیکھے نہیں کہ آپ کو بتا سکوں وہاں بھی یہی نرالاپن پایا جاتا ہے یا نہ۔ کتابیں اور اخبار یہی بتلاتے ہیں کہ آدمی ہر جگہ آدمی ہی ہے سینگ کہیں بھی اس کے سر پر نہیں۔ لیکن حماقت کا بوجھ ضرور اُٹھائے چلا جاتا ہے تو ہمارے ملک میں جلسوں کی کئی قسمیں ہیں۔ سیاسی جلسے، اصلاحی جلسے، ادبی جلسے، تفریحی جلسے،

تعلیمی جلسے، خواتینی جلسے، تقریری جلسے وغیرہ وغیرہ
کہاں تک گناتے چلا جاؤں، دس ہی تو منٹ ہیں
اور ایک ہزار ایک قسم۔

ہاں تو سیاسی جلسہ وہی ہے جیسے ہم پہلے
احتجاجی جلسہ کہہ چکے ہیں اور جس کی بنا مسٹر عزازیل
کے نامسعود ہاتھوں پڑی۔ اپنی جلسوں کی آج کل
بھرمار ہے، خوش قسمتی سمجھئے کہ ہمیں آج تک
کسی ایسے جلسے میں یوں شریک ہونے کا موقع نہیں
ملا کہ عقل کو سرہانے چھوڑ کر گئے ہوں اور گلے کو
ٹکور یا مالش کی ضرورت پڑی ہو یا خدانخواستہ دماغ
کوا لیئے بیٹھے رہے ہوں اور بعد میں اگر کسی لال بجھکڑ
سے پوچھنے کی نوبت آئی ہو۔ کہ تقریر کرنے والے
دیوبند میں حدیث پڑھاتے ہیں۔ یا علیگڈھ میں۔

ہم جب کبھی بھی ایسی کسی بزم یاراں میں شریک
ہوتے ہیں تو اپنا پیمانہ ساتھ لے گئے ہیں۔ اور
دور کھڑے یار لوگوں کی بولی ٹھولی اور لیڈر حضرات
کے ارشادات سُنا کیے ہیں۔ سٹیج پر تو ہمیں اکثر
کمہلائے ہوئے چہروں پر چمکتے ہوئے پھول نظر
آئے ہیں اور سٹیج کے ارد گرد دمکتے ہوئے
چہروں پر جھلکتے ہوئے گرد و غبار۔ ایسے جلسوں
میں دور کھڑے ہوئے لوگ اس لئے فائدہ میں
رہتے ہیں کہ مقرر صاحب کی آواز تو ویسے بھی کسی
کو سنائی ہی نہیں دیتی۔ کیونکہ تقریر سے زیادہ اہم
چیز "انقلاب زندہ باد" اور "جے ہند" کے نعرے
سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن وہ مقرر کے اشاروں
سے کچھ اتنا پا لیتے ہیں کہ جو کچھ وہ فرما رہے ہیں
بہت اہم اور ملک کی نجات کا واحد ذریعہ ہے اور
جلسہ ختم ہونے کے بعد جبکہ اکثر حاضرین، سٹیج
کی ساخت، لیڈروں کے گاڑھے کے لباس
اور اسی قبیل کی اور ضروری اشیاء پر بحث کرتے
ہوئے عش عش کرتے گھروں کو چلے جا رہے ہوتے
ہیں۔ ہمارے دل میں قوم اور وطن کا درد چٹکیاں
لینے لگتا ہے اور ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ آئندہ ایسے

جلسوں میں اگر تقریر نہیں تو چندہ جمع کرنے کا ٹھیک
کام تو اپنے ذمہ ہی لینا چاہیئے۔ اور دراصل
یہ دوسرا کام زیادہ ضروری ہے، دیکھا نہیں چندے
کی اپیل خود صاحب صدر نے کی اور تقریروں کا
کام دوسروں کے سپرد رہا۔ اور پھر چندہ! خدا کی قسم
وصول ہوتا ہے۔ تو بس اسی طریق سے دروازے
دروازے مارا مارا پھرنا بیکار ہے وہاں کون دیتا ہے۔

ہمارے ادبی جلسے کچھ اور ہی طرز کے ہوتے
ہیں۔ شاعر کلام سناتے ہیں، نقاد اپنے تنقیدی
مقالوں سے آپ کے ذہن کو جلا بخشتے ہیں اور
افسانہ نویس اپنے تخیل کی جولانیوں سے آپ کی
تواضع کرتے ہیں۔ ایک مدت تک مجھے ایسی مجالس
میں جانے کا اتفاق ہوتا رہا ہے۔ اور میں اُن
سے خوب خوب واقف ہوں۔ اب کچھ عرصے سے
ایسے جلسوں میں شریک ہونا چھوڑ دیا ہے یہ نہ
پوچھئے کیوں؟ میں خود ہی عرض کرنے لگا ہوں۔
ایک صاحب کلام سنا رہے ہیں، مصرعہ پورا نہیں کیا
کہ اودھم مچ گیا، واہ وا، سبحان اللہ، کیا کہنے، مصرعہ
کہہ دیا، بھئی کمال کر دیا، مکرر مکرر اور خدا جانے
کیا کیا حاضرین کے منہ سے نکل رہا ہوتا ہے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بند ٹوٹ گیا اور سیلاب ہر
چیز کو بہائے لئے جاتا ہے۔ اور جب تک وہ شاعر
حضرت تنگ آ کر خاموش نہیں ہو جاتے یہ گولہ باری
شروع رہتی ہے۔ میرے خیال میں اس گولہ باری
سے بچنے کے لئے کوئی ادبی بلیک آؤٹ کا
طریقہ بھی وضع ہونا چاہیئے۔ ورنہ بیچاری شاعری
کے سارے قلعے اور شہر تباہ ہو جائیں گے۔
اب تنقیدی مقالہ شروع ہوا، لوگ پہلو بدلنے
لگے مقالہ نگار پڑھتے بھی جاتے ہیں۔ اور ادھر
ادھر نظر ڈالتے جاتے، اکثر نگاہیں تو اُن کی
نگاہوں سے ملنے ہی نہیں پاتیں، وہ کچھ اپنی
ہی اُدھیڑ بن میں محو ہوتی ہیں۔ اور جو ایک آدھ
نظر مل بھی جائے تو سر ہل جاتا ہے، مگر یہ نہیں

کہا جا سکتا کہ یہ سر داد دینے کو ہلایا گیا ہے یا داد پانے کو۔ تھوڑی دیر بعد کلاک کچھ بجا دیتا ہے اور چاروں طرف پریشانی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اتنک نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اب پڑھنے والے صاحب پر گڑ جاتی ہیں۔ پہلے پڑھنے والے حضرت ان نگاہوں کے دیکھنے کے خواہشمند تھے اب خود کترا رہے ہیں۔ کھسر پھسر شروع ہو جاتی ہے مقالہ نگار تیز تیز پڑھنے لگتا ہے کھنکھارنا شروع ہو جاتا ہے اور مقالہ ختم ——— ادبی جلسوں میں لوگ بڑی خوشی خوشی جاتے ہیں لیکن نہایت مایوس شکلیں بنائے لوٹ کر آتے ہیں جیسے وہاں کسی نے لوٹ لیا ہو۔ قیاس ہے کہ واقعی لٹ کر آ رہے ہوتے ہیں۔ اپنے خیال میں جو دولت علم و سرمایہ فضل اُن کے حصے کا تھا۔ وہ لوگوں نے شاید اُن سے چھین لیا ہے۔

جلسے کی تیسری قسم جس کا بیان ضروری سمجھتا ہوں، خواتین کا جلسہ ہے۔ سب سے پہلے خواتین کے جس جلسے میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا وہ میلاد النبی کا جلسہ تھا۔ ملتان سے ایک سیدانی صاحبہ تشریف لائی تھیں اور ایک رئیس کے گھر اُتری تھیں وہیں یہ جلسہ بھی ہوا بڑے بڑے تخت پوش جوڑ کر بچھائے گئے تھے اور اُن پر چاندنی سجا دی گئی تھی۔ بڑے بڑے تکیے چاروں طرف رکھ دیے گئے تھے۔ بی بیاں ڈولیوں اور تانگوں سے اُتر کر داخل ہو رہی تھیں۔ مگر کیا تھا زرق برق لباس۔ عطریات کے جھونکے، آنکھوں میں عقیدت، چہروں پہ وقار، ہاتھوں میں رُومال، گلے میں پھولوں کے ہار، پازیب کی جھنکار، چوڑیوں کی کھنکار۔ اور پھر بچے اور اُن کا سنگار، بس ایک ہنگامہ ہی تھا۔ میلاد نامہ بیٹھ کر پڑھا گیا۔ گلاب دانی سے گلاب چھڑکا گیا، اور رومالوں سے روپے نکل کر جھنا جھن سیدانی صاحبہ کی گود میں پھلنے لگے۔ اور پھر دُعائے خیر ہوئی۔ بوڑھیوں کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اور جوانوں کی نگاہوں میں آرزوئیں جھلک رہی تھیں۔ سیدانی صاحبہ نے جو کچھ کہا اُس کا کتنا حصہ بیبیاں سُن سکیں یا سمجھ سکیں یہ میں کیا بتاؤں۔

ایک وہ دن تھا اور پھر ایک وہ روز جب کہ بمبئی میں ایک زنانہ کانفرنس کی رونق دیکھی، اب نہ پھول تھے، اور نہ رومال، نہ پازیب نہ چوڑیاں، ہاتھوں میں خوبصورت بیگ، اور چہروں پہ غازہ و پوڈر بات بات پر ہنسی۔ بچوں کی کیا مجال جو ساتھ آ سکتے البتہ کہیں کہیں کُتا دکھائی پڑتا تھا۔ اور وہی پیار اس سے ہوتا دکھائی دیتا تھا جو بچوں کا حصہ ہوا کرتا ہے اس جلسے میں شریک ہونے والیوں کے انداز سے یہی معلوم ہوتا تھا گویا نمائش میں جا رہی ہیں یا تفریح کے لئے نکلی ہیں۔

اور جلوس کا ذکر میں نے اس لئے تفصیل سے نہیں کیا کہ جلسوں میں جو کچھ چھوٹے پیمانے پر ہوتا ہے وہ وہاں اپنی پورے جلال سے سامنے آتا ہے فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ جلوس کا انحصار اشتعال انگیز نعروں پر ہوتا ہے اور جلسوں کا زور دار تقریروں پر ——— کوشش یہ ہوتی ہے کہ پہلی صورت میں لوگ صرف نعرے سُنیں اور اشتعال نہ دیکھ پائیں۔ دوسری صورت میں زور دیکھیں اور تقریر نہ سُن پائیں۔

(باجازت آل انڈیا ریڈیو پشاور)

م۔ م۔ ک

صاب!

دریائے جہلم کی پُرسکون سطح پر شکارا نہایت خاموشی سے بہتا چلا جا رہا تھا۔ "ذرا شکارے کو تیز کرو" شکارے میں بیٹھے ہوئے پستہ قد شخص نے حکم دیا "اچھا صاب"، زرد رو ملاح نے چپو سنبھالتے ہوئے کہا اور شکارے کی رفتار تیز ہو گئی۔ ملاح ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔

"کوئی گانا سناؤ" پستہ قد شخص نے اپنے پاؤں پسارتے ہوئے حکم دیا۔

"اچھا صاب"، کشمیری ملاح نے کھنکھارتے ہوئے کہا اور وہ مرتعش آواز میں گانے لگا۔

"باگِ نشاط کے گلوں"،
نازکراں کراں ولوں
باگِ نشاط کے گلوں"......

کشمیری کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔ اُس کی آواز بتدریج بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اور اُس کا گانا اب مسلسل چیخوں کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ لالٹین ادھر اُدھر جھول رہا تھا۔ کبھی اُس کے چہرہ پر لالٹین کی روشنی پڑتی اور کبھی اُس پر تاریکی چھا جاتی۔ اُس کے دونوں ہاتھ جن میں وہ چپو سنبھالے ہوئے تھا نہایت آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔ اور شکارے کی رفتار مدھم پڑتی جا رہی تھی اور کشمیری ملاح گا رہا تھا۔

"بس بس بند کرو یہ گانا" پستہ قد شخص نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "نازکراں" کی آواز گلے ہی میں رہ گئی۔ "آ... اچھا صاب" اُس نے سہمگیں ہو کر کہا۔

پستہ قد شخص بڑبڑایا "یہ بدتمیز نے 'اچھا صاب' کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔

بس اب واپس چلو" اُس نے کشمیری ملاح کو حکم دیا "اچھا صاب"، مدقوق کشمیری نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کہا۔ اور وہ پستہ قد شخص چلا اُٹھا، "مت کہو "اچھا صاب" حرامزادے

کشمیری کا چہرہ سنجیدگی اور خوف کی وجہ سے سیاہ پڑ گیا۔

"اچھا صاب" اُس نے سر جھکاتے ہوئے مری ہوئی آواز میں کہا اور وہ پستہ قد شخص تلملا اُٹھا

ہر سال ہزاروں لاکھوں سیاح کشمیر جاتے ہیں۔ مصور کشمیر کو رنگ اور برش کی مدد سے پردۂ تصویر پر اُتارنے جاتے ہیں شاعر اس لئے جاتے ہیں کہ وہاں کا ماحول شاعرانہ ہے بعض کو وہاں کی سینریاں ادھر کھینچ لاتی ہیں۔ بعض کو وہاں کی آب و ہوا اور بعض کو وہاں کی عورتیں، اور انگریز وہاں اس لئے جاتے ہیں۔ کہ گلمرگ میں گالف کھیل سکیں۔ اور بعض تپ دق کے مریض اپنی روحوں کو ہڈیوں کے پنجر میں کچھ عرصہ اور محبوس رکھنے کی خاطر وہاں جاتے ہیں۔

لیکن ظفر نہ تو مصور تھا، نہ شاعر اور نہ ہی مطالعۂ قدرت کا شائق۔ عورت اُس کے لئے ایک بند کتاب تھی جسے پڑھنے کی جسارت ہی اُس میں نہ تھی۔ وہ کشمیر آنے کو تو آ گیا تھا۔ لیکن یہاں آ کر وہ اس سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کہ اُسے یہاں آ کر کرنا کیا چاہیئے۔؟ اب بھی جب کہ وہ شکارے میں پاؤں پسارے پڑا تھا اور شکارا نہایت تیزی سے دریا کے بہاؤ کے رُخ بہتا چلا جا رہا تھا۔ اور زرد رو ملاح سامنے رات کی تاریکی میں کسی چیز کو گھور رہا تھا۔ ظفر کا دماغ نہایت

سرعت سے گذشتہ واقعات کا جائزہ لے رہا تھا ایک مہینے کے عرصہ میں اُس نے کشمیر کا ہر قابلِ دید مقام دیکھ لیا تھا۔ چند دنوں سے وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے کہ اُس کے حواس پر ایک کثیف اور بھاری پردہ پڑا ہو جیسے کہ اُسے کچھ ہو گیا ہو اُس کے دماغ میں ہر چیز، ہر خیال اور ہر احساس بے طرح گڈ مڈ ہو گیا تھا۔ وہ کسی چیز کی کمی کو بُری طرح محسوس کر رہا تھا۔ لیکن وہ چیز کیا تھی؟ یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ اُس نے کئی بار گھر سے روانگی کے وقت سے لے کر اب تک کے سب واقعات کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن ہر بار یہ سب واقعات ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر رہ جاتے اور اُس کی بے قراری اور بھی بڑھ جاتی۔

ایک دن زرد رنگ کی ایک بس اُسے کشمیر کی طرف بھگائے لیئے آ رہی تھی۔ غوں۔ اوں اوں۔ "بس فریاد کرتی ہوئی چکر پہ چکر کاٹ رہی تھی ہر موڑ کے بعد آنکھوں کے سامنے ایک نیا منظر آ جاتا۔ بس بلندی پر چڑھتی جا رہی تھی۔ نیچے کھڈ اور زیادہ تاریک، عمیق اور وسیع ہوتی جا رہی تھی دونوں طرف کے پہاڑ چیڑ کے سربفلک درختوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اور کھڈ کے عین بیچوں بیچ ایک نالہ شور مچاتا، پتھروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جھاگ اُڑاتا بہہ رہا تھا۔ اور اس میں چھوٹے بڑے شہتیر اُچھلتے کودتے پتھروں سے ٹکراتے بہتے چلے آ رہے تھے اور پھر بارہ مولا سے سری نگر تک کی بظاہر نہ ختم ہونے والی سیدھی سڑک ختم ہونے لگی۔ سڑک کے دونوں طرف تکونی اور مستطیل شکل کی دھان کی کھیتیوں پر سورج آخری بار مسکرا رہا تھا اور ہوا میں دھان کی سوندھی خوشبو ملی ہوئی تھی۔ دور ایک کھیتی میں دو کسان جھکے ہوئے اپنے کام میں مشغول تھے اور ایک عورت سُرخ رنگ کے شوخ کپڑوں

میں ملبوس ایک ہاتھ میں ایک ٹوکری لیئے دوسرا ہاتھ پیشانی پر رکھے بس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ دھان کی کھیتوں کا رنگ سیاہی مائل سبز ہوتا گیا۔ ہوا میں خنکی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد سورج نے اچانک غوطہ لگایا۔ اور دُور ایک پہاڑ کے پیچھے ڈوب گیا۔

سری نگر پہنچتے ہی اُسے ہوٹلوں اور ہاؤس بوٹوں کے ایجنٹوں اور کشمیری قلیوں نے گھیر لیا جب ظفر نے ایک ہاؤس بوٹ کے ایجنٹ کے ہمراہ چلنے کا فیصلہ کر لیا تو کشمیری قلی ستوں کی طرح اُس کے سامان کی طرف جھپٹے۔ ظفر کے سُوٹ کیس اور بستر کو کئی میلے اور کھردرے ہاتھ اپنی اپنی طرف کھینچ رہے تھے اور کئی زبانیں ایک ساتھ چلا رہی تھیں۔

صاب! ہم لے جائیں گا صاب! صاب!!

کشمیری چیخ رہے تھے اور چلا رہے تھے اور کشمیری زبان میں ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے کئی ملتجیانہ نگاہیں بار بار ظفر کی جانب اُٹھ رہی تھیں اور کئی زبانیں چلا رہی تھیں

"صاب کا سامان ہم لے جائینگا صاب! صاب!!

"کتے" ظفر بڑبڑایا۔

وہ سری نگر کے پلوں: امیرا کدل، چنار باغ۔ چشمۂ شاہی، نشاط باغ۔ نسیم باغ۔ نگیم باغ اور تختِ سلیمان سب کو جی بھر کر دیکھ چکا تھا کئی روز وہ سری نگر کی گندی اور متعفن گلیوں میں گھومتا رہا جب بھی اُن گلیوں میں سے گذرتا تو نیچی چھتوں والے چھوٹے چھوٹے اور تاریک گھروں میں سے زرد زرد عورتیں اُسے جھانکنے لگتیں۔ ننگے اور غلیظ بچے کیچڑ اور خاک میں لوٹ رہے ہوتے جہاں کہیں بھی وہ گیا اُسے ایک احساس بُری طرح ستاتا رہا۔ وہ یوں محسوس کرتا جیسے وہ کسی بلند پہاڑ کی چوٹی پر الگ تھلگ کھڑا دنیا کا تماشا دیکھ رہا ہو جیسے اُس کا کام دُور سے اوروں کو دیکھنا ہو

اور بس - کاش وہ اوروں کو دُور سے دیکھنے کی بجائے اُنہی لوگوں میں سے ایک ہوتا! کاش وہ تماشائی ہونے کی بجائے اوروں کی توجہ کا مرکز ہوتا! اور یہ خواہش دن بدن زور پکڑ رہی تھی۔ سری نگر کے بازاروں میں اُسے عجیب طرح کی وحشت سی ہونے لگتی۔

جب ساڑھیوں میں ملبوس خوبصورت عورتیں بدصورت شوہروں کے ہاتھ پکڑے راہ چلتے نوجوانوں کو حسرت آمیز نگاہوں سے دیکھتی ہوئی اُس کے سامنے سے گزرتیں اور وہ ایک تماشائی کی طرح انہیں دیکھتا رہ جاتا تو اُس کے جی میں آتی کہ دوڑ کر خوبصورت عورت کا ہاتھ تھام لے اور اکڑتا ہوا دیکھنے والوں کے سامنے سے گزر جائے۔ جب کشمیری پنڈت ہاتھوں میں چھاتے سنبھالے سر پر ململ کے تھان کے تھان لپیٹے ماتھے پر کیسر کے تلک لگائے کشمیری زبان میں زور زور سے باتیں کرتے ہوئے اُس کے پاس سے گزرتے تو اُس کا جی چاہتا کہ ایک کر اُن میں سے کسی کا چھاتا چھین لے یا پگڑی اُتار لے یا بازار کے عین بیچ میں ناچنا شروع کر دے یا زور زور سے قہقہے لگائے تاکہ سب لوگ اُس کی طرف دیکھنے لگیں اور وہ اوروں کا تماشا دیکھنے کی بجائے خود اوروں کا تماشا بن جائے۔ سری نگر سے تنگ آ کر وہ گلمرگ گیا۔ سُرخ اور زرد کپڑوں میں ملبوس انگریز عورتیں اور مرد گاف کھیل رہے تھے اور کشمیری لڑکے گاف کی چھڑیاں سنبھالے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے اور سامنے بلندی پر نیڈوز ہوٹل کی چمنیوں میں سے نیلا دھواں اُٹھ رہا تھا۔

پھر وہ پہلگام گیا۔ وہاں پہنچ کر پہلی چیز جو اُس کو نظر آئی وہ آدم اور حوا کا ایک جوڑا تھا جو جھولا جھول رہا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا اور چنار کے درخت تھرتھرا رہے تھے پہلگام میں خوبصورت لڑکیوں کو اِدھر اُدھر بے باکانہ گھوڑے دوڑاتے اور سیر کرتے دیکھ کر اُسے اپنی منگیتر کا خیال آ جاتا جو ظفر کو دیکھتے ہی چھوئی موئی کی طرح اپنے آپ میں سمٹنے لگتی تھی اور جس سے آج تک وہ بات تک نہ کر پایا تھا ایک دن جب۔۔۔۔ ”صاب ہاؤس بوٹ آگیا“ ملاح نے دفعتاً کہا اور ظفر کے تخیلات کا تانتا ٹوٹ گیا۔ شکارے سے اُتر کر وہ اپنے ہاؤس بوٹ میں آ رہا۔ اُجرت وصول کر لینے کے بعد ملاح نے سلام کیا اور چپو سنبھال کر جانے ہی والا تھا کہ ظفر کو دفعتہً کچھ خیال آیا۔

”سبحاناں“ ظفر نے کہا۔

”جی صاب“

”ہم تمہارے گھر آئینگے کل۔ ہم بھتہ کھائینگے سمجھے“؟

”ہمارے گھر صاب“؟ سبحاناں نے حیران ہو کر پوچھا

”ہاں“ ظفر نے کہا

”اچھا صاب“، سبحاناں نے کہا۔ اور وہ کسی سوچ میں غرق اپنے شکارے کو کھیتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ اور دوسرے دن ظفر ایک بوسیدہ اور تکریک کشتی کے اندر بیٹھا بھتہ کھا رہا تھا۔ یہی سبحاناں کا گھر تھا۔ سبحاناں کی نوجوان بیوی سامنے بیٹھی ہوئی چولھے سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کا سینہ نیم برہنہ تھا اور ایک مریل سا زرد بچہ اُس کے سینہ سے چمٹا ہوا دودھ پی رہا تھا۔

جس طرح وہ ظفر کے آنے سے پہلے بیٹھی تھی اُس کی آمد کے بعد بھی وہ اُسی طرح بیٹھی رہی اُس نے ظفر کی پروا تک نہ کی۔ اُس نے اپنے نیم برہنہ سینہ کو ڈھانپنے کا خیال تک نہ کیا۔ ظفر کی نگاہیں اُس کے جسم کا طواف کرتی رہیں۔

دوسرے دن ظفر کی طبیعت خراب تھی چنانچہ وہ اپنے بستر ہی میں پڑا رہا۔ حسب معمول صبح کے

وقت سجاناں نے آکر اطلاع دی کہ وہ دن ڈھلے تک ایک انگریز اور اُس کی بیوی کو اپنے شیکارے میں سیر کراتا رہے گا۔ چونکہ ظفر خود باہر جانا نہیں چاہتا تھا اس لئے اُس نے اُسے حسبِ معمول اجازت دیدی۔ سورج غروب ہونے والا تھا

"ہم بھتہ کھائیگا" کسی نے بوسیدہ کشتی کے دروازہ کے قریب آکر رُکتے ہوئے کہا۔

سجاناں کی بیوی زہراں دروازہ کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی تھی اُس نے ہڑبڑا کر دروازہ کی طرف دیکھا

"ہم بھتہ کھائیگا" نووارد نے دوبارہ مسکراتے ہوئے کہا اور دوسرے لمحہ وہ اندر آکر سامنے بچھی ہوئی پھٹی پرانی چٹائی پر جا بیٹھا۔

زہراں بت کے مانند خاموش، حیران نگاہوں سے نووارد کی طرف دیکھتی رہی یہ شخص ایک بار پہلے بھی سجان کے ہمراہ بھتہ کھانے آیا تھا۔

زہراں نے پاس ہی پڑے ہوئے زنگ خوردہ کٹورے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر ایک چھوٹی سی دیگچی میں سے بھتہ نکال کر اُس نے کٹورے میں ڈالا۔ زرد مریل بچہ چھپکلی کی طرح اُس کے سینے سے چمٹا ہوا دودھ پی رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے بچہ کو سنبھالے، دوسرے میں کٹورا لیے وہ مہمان کے قریب آئی۔ مہمان نے اُس کے ہاتھ سے کٹورا لے لیا اور جھپٹ کر ایک ہاتھ سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور دوسرے سے ماں کی چھاتی سے چمٹے ہوئے بچہ کی زرد پتلی ٹانگ کو پکڑ کر وہ بچہ کو ماں کی چھاتی سے جدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ زہراں کے مُنہ سے ایک مدھم سی چیخ نکلی۔ نووارد کا تنفس تیز ہوتا گیا۔

بچہ ایک پلے کی مانند بلبلا اُٹھا اور ماں کی چھاتی سے چمٹنے لگا جو اپنا ہاتھ چھڑانے کی ناکام کوشش کرتی رہی اور پھر بچہ کشتی کے فرش پر آ رہا اور پتلی زرد ٹانگیں اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر پلے کی طرح بلبلانے لگا اور زہراں ایک بے جان جسم کی مانند فرش پر آ رہی۔

اب ظفر تماشائی نہ رہا تھا بلکہ خود تماشا بن گیا تھا اُس کے جی میں آئی کہ بے اختیار اور دیوانہ وار قہقہے لگائے۔

"صاب"! مذبوحہ بکری کی طرح کوئی باہر سے چلایا

ظفر کا دل دھک کر کے رہ گیا زہراں کا جسم کشتی کے فرش پر پڑا رہا ظفر کو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ کشتی کی چھت، یکبک سے سر پر سے اُڑ گئی ہو اور کشتی کا فرش پیروں تلے سے سرک گیا ہو اور وہ خلاء میں معلق کھڑا ہچکولے کھا رہا ہو۔

سجاناں دروازے میں کھڑا کانپ رہا تھا اُس کی آنکھیں پھٹی پڑتی تھیں۔ اُس کا مُنہ کھلا ہوا تھا اور اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"صاب"! وہ پھر مذبوحہ بکری کی طرح چلایا۔ اور اندر آکر دھپ سے کشتی کے فرش پر آ رہا۔

"صاب"! وہ اپنی بیوی اور ظفر کی طرف دیکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں چلایا۔

"صاب!" وہ پھر چلایا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ظفر کانپ رہا تھا اُس کے جسم کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اُس کا سر چکرانے لگا۔

"کوں اوں۔ کوں اوں"! بچہ فرش پر پڑا بدستور رو رہا تھا۔ اُس کا باپ رو رہا تھا۔ اور اُس کی ماں پڑی سسک رہی تھی۔ چھ آنکھیں رو رہی تھیں۔ اور دو حیران و پریشان آنکھیں کبھی اُن کی طرف دیکھتیں اور کبھی کشتی کی سیاہ چھت کی طرف۔ ظفر کو اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ تصور ہی تصور میں اُس نے سجاناں کو اُچک کر کھڑے ہوتے اور کونے میں پڑے ہوئے چپو کو اُٹھاتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر سینکڑوں کشمیریوں کی چیخیں اور نعرے کسے سُنائی دیئے اور وہ اپنے انجام کا تصور کر کے لرز اُٹھا

"سجاناں بدستور رو رہا تھا۔ اُس کی بیوی کشتی کے فرش پر پڑی سسک رہی تھی اور بچہ اُس

پہلے کی طرح جس کا دم نکل رہا ہو "کوں اوں - کوں اوں" کر رہا تھا - اور دوسرے لمحے ظفر ایک ہی جست میں کشتی سے باہر آ رہا اور پھر ایک طرف منہ اٹھا کر دوڑ پڑا اُس کی رفتار تیز تر ہوتی گئی اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ سبحاناں بہت سے کشمیریوں کی معیت میں اُس کے پیچھے بھاگا چلا آ رہا ہے اور سب کشمیری چیختے، چلاتے، اپنے اپنے چپو اور بانس کے ڈنڈے ہوا میں لہراتے اُس کا پیچھا کر رہے ہیں۔

کئی راہگیر ظفر کو بھاگتا دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئے۔ ایک موٹر سائیکل پھٹپھٹاتا ہوا نہایت تیزی سے اُس کے پاس سے گزر گیا لیکن وہ منہ اٹھائے بھاگتا چلا گیا۔ اپنے ہاؤس بوٹ کے قریب پہنچ کر ظفر نے پیچھے مڑ کر دیکھا - سبحاناں یا دیگر کشمیریوں کا نام و نشان تک نہ تھا - اور وہاں کوئی ہوتا بھی تو کیونکر؟ - کیونکہ اس وقت تک سبحاناں اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے اپنی کشتی میں بیٹھا بدستور رو رہا تھا - اُس کی بیوی سسک رہی تھی اور بچہ اب پاؤں کا انگوٹھا چوس رہا تھا۔

ہانپتا کانپتا وہ اپنے ہاؤس بوٹ تک پہنچا وہ پسینہ میں شرابور تھا - نہراں کی سسکیاں بچہ کی کوں اوں، کوں اوں، اور سبحاناں کی چیخ، صاب! ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی، اُس کے دماغ کے کسی کونہ میں کوئی مذبوحہ بکری کی طرح چلاّ رہا تھا۔

"صاب! صاب!!

کانپتے ہاتھوں سے وہ قفل کھولنے لگا چابی اُس کے ہاتھ سے گر کر دریائے جہلم کی لہروں کے سپرد ہو گئی۔ ظفر جھنجھلا اٹھا - پاس ہی پڑا ہوا پتھر اٹھا کر اس نے قفل پر دے مارا - قفل ایک ہی ضرب سے ٹوٹ گیا اور ساتھ ہی چھن سے دروازہ میں لگے ہوئے سبز شیشہ کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔

"صاب!" ہاؤس بوٹ کا چوکیدار دُور سے چلاّیا اور ظفر کو یوں محسوس ہوا جیسے کہ سبحاناں چلاّ اٹھا ہو اندر پہنچ کر وہ اپنے بستر پر گر پڑا "اے خدایا!"

اُس نے اپنا سر تھام لیا - یہ میں نے کیا کیا! یہ میں نے کیا کیا!! یہ میں نے کیا کیا!!! ساری رات وہ اپنے بستر پر لوٹتا رہا - قریب سڑک کے کنارے ایک خارش زدہ کتا رات بھر بھونکتا رہا اور کسی ہاؤس بوٹ سے رات بھر کسی بچہ کے رونے کی آواز آتی رہی - اور ظفر صبح تک جاگتا رہا صبح کے وقت اُسے ہلکا سا بخار تھا اور مارے درد کے اُس کا سر پھٹا پڑتا تھا - اُس نے گھڑی کی جانب دیکھا - پانچ منٹ کم دس بجے تھے - ہر روز دس بجے کے قریب سبحاناں اپنا شکارا لے کر اُس کے ہاں آیا کرتا تھا - لیکن آج ——— آج وہ ہرگز نہیں آئے گا۔

ظفر نے سوچا - اور آنکھیں بند کر لیں - دو گرم آنسو اُس کی آنکھوں سے بہہ کر اُس کی ٹھوڑی تک جا پہنچے -

"صاب!" "شکارا والا آیا" باہر سے کوئی پکار اُٹھا۔

ظفر چارپائی سے اُچک کر نیچے آ رہا - حیرت کے مارے اُس کی آنکھیں پھٹی پڑتی تھیں - مدقوق کشمیری سبحاناں ہاتھ میں ایک چپو لیے استفہامیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

———×———×———×———

بشیر احمد ملک

اے ظالم

اے ظالم ......؟
میں جوان تھا ....
شہوارِ شباب بھی ....
میرے شباب کا توسنِ سنجیدہ ... متین بھی
اس کی عنان ... مضبوط ... پائیدار
اور میرے بازو ... طاقتور اور سیمیں بھی
جن کی گرفت ... اُف ... فولادی گرفت
شب دیز اور اُس کے عنان کے لئے،
جس کی چال متوالی ... انداز نرالی،
بیشۂ حیات میں ....
جہاں فلک پیما اشجار ...
پُر از خار ... اور بے شمار
درندے، مہیب اور خونخوار ....
ہر سو نمودار ..
نہ رُکا ... آگے ... آگے اور آگے
بڑھتا ... بڑھتا اور بڑھتا گیا
پر ... "تو" نے ... اے ظالم ... تو نے
اُسے مجروح کیا اور تعاقب کیا۔
میری نگاہ ... بے چین ... مضطرب
تلاش میں ... تجسس میں
مصروف ..... اچانک ....
ناگاہ پڑ گئی ....
ایک خوش رنگ .... خوبصورت
تازہ ... مسحور کن ... نازک
مخمور کن ....؟ پر ... جسکی شمیم سے
فضا معمور ... اور مدہوش ہوائیں
ہم آغوش ... آہستہ رفتار،
خراماں ... رقصاں۔

اور خیزاں ...
محبت کی شیریں موسیقی میں سرشار
مثلِ موسیقار ..... سوز و گداز سے
نغمہ سنجی میں ... مشغول اور مسرور
مگر ..... وہ ...؟ خود
اُس موسیقی میں مدہوش
خودی سے بیخود ..... کسی کی خودی میں، محو
قرب و جوار سے بے خبر ... مطمئن ...
دُنیا و مافیہا سے بے نیاز
وجد آفریں جنبش میں جھوم رہا۔
کیا ..؟ ... عندلیب کا مقصود
جس کے قلبِ مجروح میں
وہ ..... شبانہ روز موجود .....
اور وہ ...... اسکے جلوۂ جمال کے سامنے
سر بسجود ..... بحضور و خشوع،
آہ ... تو نے ... اے ظالم! تو نے
اُسے
میری نگاہوں سے ...... محجوب کیا۔
پر میں نے ... صبر کیا ... اور انتظار بھی
خاموش رہا ... زبانِ قال سے
گویا رہا ... زبانِ حال سے
"تو" نے اے ظالم! تو نے سنا اور دیکھا
میری داستان ..... میرا رقص بسمل
اور سوچی بھی ... میری بربادی کی
تدبیر ... مصمم ارادہ سے
میں محتاط رہا .... اور کوشش کی ..
میری کوششوں کا، میرے ارمانوں کا،
"تو" نے اے ظالم! "تو" نے مقابلہ کیا

خموشی سے ...... اور سدّ راہ بنا ...... تو"
میرے مطمعِ نظر ...... میرے مقصود"
حاصل کرنے کی راہ میں ...
آہ وزاری ...... منت سماجت ..
ساری ...... بیکار گئی۔
کوشش ہار گئی۔
میں مطمئن تھا ..... مجھے اُمید تھی
خوددار تھا ، اور اولوالعزم بھی
مجھے بھروسہ تھا - اور یقین بھی
زورِ یزداں پر ، اُس کے بیان پر
جس نے جنبش دی ، میرے ارادوں کو
سو گیا ...... آخر آگیا ...... وقت تحریک
دونوں مصروف تھے ...... کشمکش میں
آس پاس دونوں تھے طاری ...... باری باری
چھائی تھی ہر سو ...... انتظار ...... بیقراری
دل مضطرب تھا ...... میرا
تھک گئے ...... پر
آخری وار ...... "میں" نے کیا
وہ کاری ہوا ......
پھر کیا تھا ؟ ...... کامیابی

"ہاں" کامیابی مظلوم کی
اور "ہار" تھی ظالم کی
پھر بھی ...... تو نے ...... اے ظالم
ہارنے سے ...... انکار کیا
اور مدافعت میں تکرار کی
کوششوں سے ، تدبیر سے
پر بے سود ...... رائیگاں
تم ظالم تھے اور ہار گئے۔
یہ تھا فیصلہ ...... حق کا۔
انصاف کا۔
پھر بھی تیری کوششوں نے
اے ظالم ! ہمیں ایک دوسرے سے
مستور رکھا ...... اور مجبور ...... مجھے اُمید ہے
اپنی سرخروئی کی
اگر اُس نے چاہا جس کا ...... شاکر ہوں ..

اے ۔ ایم ۔ ایف ۔ مُخلِص

لاہوری سیر

پچھلی گرمیوں کی چھٹیوں میں میں گھر گیا ہوا تھا ہمارے شہر میں پہلی بار فلم "چوہدری" آئی - رنگا رنگ کے اشتہارات بانٹے گئے - میرے ایک مہربان دوست سرمست خان جو میں چچا چکن مرزا جی اور لال بجھکڑ تینوں کا تھوڑا بہت رنگ پایا جاتا ہے - ان کے ہاتھ بھی ایک اشتہار لگ گیا - دوڑے دوڑے میرے پاس آئے چونکہ پڑھے لکھے کچھ زیادہ نہ تھے . پوچھنے لگے کہ اس میں کیا ہے - میں نے اشتہار پڑھ کر سنا دیا - کہنے لگے بھئی آج شام کو چلیں گے میں نے ٹالنا چاہا - مگر جب اُنہوں نے کہا کہ ہم دکھلائیں گے تو میں نے اُن کی دل شکنی مناسب نہ سمجھی -

دوپہر ڈھلی نہیں تھی کہ خانصاحب آ دھمکے زری جوتی . پشاوری لنگی ، اونچا کلاہ - مخمل کی واسکٹ - اس طمطراق سے آئے جیسے سسرال جا رہے ہوں - خیر ہم دونوں سینما گھر پہنچے اور

تصویر دیکھنی شروع کی۔ تصویریں منشی صاحب نے کہا "جنے لاہور نہیں دیکھا او تے جمیا ای نیں"
خانصاحب پوچھنے اور کہنے لگے۔ کیا کہتا ہے یہ؟ میں نے بتایا
پوچھنے لگے۔ "واقعی"؟
"تو اور کیا"

بس سرمست خان میرے پیچھے پڑ گئے۔ کہ ہمیں لاہور دکھاؤ۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ میں وہاں تعلیم پاتا تھا۔ تماشہ ختم ہونے کے بعد پیر تسمہ پا کی طرح میرے گلے کا ہار ہو رہے کہ بھائی ہمارا یہ کام کر دو تو عمر بھر غلام رہیں گے۔ میں نے سمجھایا کہ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ (یعنی کچھ کم پچاس برس) اور پھر لڑائی کا زمانہ ہے۔ اور سُنا نہیں آپ نے "(TRAVEL ONLY WHEN YOU MUST)"
مگر ان کے موٹے دماغ میں جو ایک خیال آگیا تو نکلے کیسے
چنانچہ یہ صلاح ٹھہری کہ جب میں چھٹیوں کے بعد لاہور واپس جاؤں تو وہاں سے خان کو ٹو نامہ بھیجوں۔
لاہور آئے مجھے ایک مہینہ ہو چکا تھا ایک دن خدا جانے میں نے کسی کلمو نے کا منہ دیکھا تھا۔ کہ ڈاکیہ خط لایا۔ کھولا تو معلوم ہوا کہ سرمست خان نے یاد فرمایا ہے۔
دوسرے ہی دن خانصاحب خود آنازل ہوئے بڑی کوفت ہوئی۔ بہر صورت ایسی خندہ پیشانی سے اُن کا استقبال کیا کہ انہیں دعوت نامہ کا خیال تک نہ رہا۔
چنانچہ پروگرام یہ ٹھہرا کہ لاہور کی سیر اگلی صبح سے شروع کرنی چاہیئے۔ منگل کے دن بزرگوں کا قول ہے کام شروع نہیں کرنا چاہیئے۔ سرمست خاں الارم لگا کر سو رہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن ضائع ہو جائے۔ صبح سویرے ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ کہ خانصاحب نماز وظیفہ سے فارغ ہو کر میرے کانوں میں بجنے لگے۔
"کیا ظلم ہے۔ تم تو گھوڑے بیچکر سوتے ہو"
"کیا کہا حضور نے" میں نے نیم غنودگی حالت میں کہا
"یعنی اللہ اللہ کرو۔ اُٹھو۔ منہ ہاتھ دھوؤ لاہور کی سیر کرنی ہے نا۔ تم اس طرح سوتے رہے تو مہینے بھر میں لاہور کی سیر نہ ہوگی۔ بہت بڑا شہر ہے سُنا ہے ہم نے"
مہینہ کا لفظ اُن کی زبان سے نکلا ہی نہ تھا کہ نیند ہرن ہو گئی۔ اور ہم اس پھرتی سے غسلخانہ میں پہنچے کہ "ٹارزن" بھی عش عش کرتا۔
چائے پی کر ہم گھر سے باہر نکلے کچھ دور ہی گئے ہونگے۔ کہ خانصاحب ہانپ گئے۔ اور ہانپتے بھی کیوں نہ۔ خدا کے فضل سے موٹاپے کا یہ عالم تھا کہ دُرگا موٹے کا مقابلہ کرتے تھے۔ میں نے صلاح دی کہ ٹانگہ کرایہ پر لے لیا جائے۔ مگر ان کی جیبیں ذرا بھاری تھیں۔ یہ تو میں بتانا ہی بھول گیا کہ خانصاحب اپنے وقتوں کے رئیس زادے یا صاحبزادے کی قسم کے انسان تھے۔ ٹانگے پر بیٹھنا نہ وہ خود پسند فرماتے تھے۔ اور نہ ہی ٹانگہ والا۔ ایک دفعہ آپ ٹانگے میں سوار کہیں جا رہے تھے۔ کہ "بیرحمی" والوں نے کوچبان کا چالان کر دیا۔ چنانچہ ایک موٹر کرایہ پر لی گئی۔
ہم تھوڑی ہی دور چلے ہونگے کہ کچھ فاصلے پر کالج کی لڑکیاں سائیکلوں پر جاتی نظر آئیں۔ پہلے تو سرمست خان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ پھر آنکھیں ملتے ملتے کہنے لگے۔ "لاحول ولا قوۃ"۔ کیا ظلم ہے یہ کافر لڑکیاں کون ہیں "کرستان" ہیں یا کافر کی بچیاں" ان کے برقعے کدھر ہیں۔ کیا ظلم ہے مردوں کی طرح یہ بے شرم سائیکل چلاتی ہیں
"خانصاحب یہ کوہاٹ نہیں لاہور ہے لڑکیاں کالجوں میں سبق پڑھتی ہیں۔ ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے"
مگر خانصاحب لال بھبھوکا ہو رہے تھے۔ لاحول ولا پڑھتے گئے۔
موٹر میئو روڈ پر سے گذری راستہ میں

(SKATING-RINK) آیا میں نے کہا "خان دیکھو" خان بغلیں جھانکنے لگے۔ پہلے تو بڑی دیر تک دیکھتے رہے۔ پھر کچھ جھجکتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"دیکھو تو بھائی یہ کیا ہو رہا ہے ان لوگوں نے پاؤں کے نیچے سائیکلیں باندھی ہوئی ہیں۔ کیا؟ کیا ظلم ہے مرد عورتیں اکٹھے دوڑ رہے ہیں۔"

خیر انارکلی پہنچے۔ تعریف تو خان صاحب پہلے ہی سے سن چکے تھے۔ صرف دیکھنے کی ہوس باقی تھی۔ سو وہ بھی پوری ہو گئی۔ بازار کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کتا بلی کو ۔۔۔ یہاں آپ نے جیبیں ہلکی کیں۔ جس چیز کو دیکھتے رال ٹپک پڑتی۔ ان دنوں انارکلی میں سیوریج سکیم کیلئے نالیاں وغیرہ کھودی جا رہی تھیں۔ خان مجھ سے پوچھنے لگے۔

"بھائی یہ سڑک کے عین درمیان سرنگیں کھودنے کا کیا مطلب"

"حضرت سیوریج سکیم ہو رہی ہے"

"سکیم کیا ہوتا ہے"

"سکیم کے معنی تجویز"

مونچھوں پر تاؤ دے کر بولے "تیر تو سورج کو زمین پر لانے کی تجویز ہو رہی ہے۔ یہ سائنسدان بھی عجیب کافر لوگ ہیں۔ کبھی کہتے ہیں زمین سورج کے گرد گھومتی ہے کبھی کہتے ہیں زمین گول ہے۔ اور اب سورج کو زمین پر ۔۔۔۔۔ نہ بابا نہ۔ یہ کیا ظلم ہے۔ میں تو اس تجویز کے خلاف ہوں یہ مشرکوں کا کام ہے"

اول تو میری سمجھ میں خاک نہ آیا، لیکن مزید بحث سے معلوم ہوا کہ خانصاحب سیوریج کو سورج سمجھ رہے ہیں۔ میں نے بتایا کہ سیوریج انگریزی زبان میں نالیوں کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ لاہور میں گرد و غبار کی کچھ کمی واقع ہو گئی تھی۔ اس لئے سرکار نے باہر سے لانے کا انتظام کیا ہے۔ یہ سرنگیں دور دور سے آتی ہیں۔ اور جا بجا ان میں نکاس رکھے گئے ہیں۔ تاکہ جس محلے میں گرد و غبار کی کمی محسوس ہو وہاں کا ڈھکنا کھول دیا جائے"

"اچھا ہماری طرف تو مٹی اور گندگی کی کوئی قدر نہیں کرتا"

"یہ لاہور ہے، گرد و غبار اس کا خاص۔ پورے پچھلے دنوں ہوائیں تیز چلنی شروع ہو گئی تھیں اور خطرہ ہو گیا تھا کہ سارا گرد و غبار کہیں اڑ کر باہر نہ چلا جائے۔ اس لئے یہ انتظام کیا گیا ہے"

اتنے میں پاس سے ایک موٹر کار گذری اور گرد کا وہ طوفان اٹھا کہ خان نے واسکٹ کے اندر سر چھپا لیا اور بولے۔ واقعی سچ کہتے ہو

دوپہر کے کھانے کے بعد شالامار باغ کا پروگرام قرار پایا۔ خان اور میں بس میں بیٹھ گئے۔ آپ چپکے سے بولے "یار کیا ظلم ہے۔ ادھر بسیں بھی وکیل ہیں؟"

"آپ کو کس طرح معلوم ہوا" میں نے پوچھا

بس کے اوپر ایل۔ ایل۔ بی (لاہور لوکل بس) نہیں لکھا ہوا۔ ؟ اتنی انگریزی تو ہم بھی پڑھے ہیں

میں نے کہا۔ اس میں کونسی بڑی بات ہے یہاں کا ہر تلی بی۔ اے پاس ہے۔ اور ہر بابو ایم اے لڑکوں کے ساتھ مسیں بھی روزانہ کالج جاتی ہیں انہیں نوکری نہ ملتی تو اور کیسے ملتی؟"

بس ابھی روانہ نہ ہوئی تھی سرمست خان نے جو آنکھ اٹھائی تو دیکھا کہ اگلی سیٹ پر عورتیں بیٹھی ہیں۔

کیا ظلم ہے، عورت ذات آگے اور مرد کا بچہ پیچھے۔ لاہور میں عورتیں مرد ہو گئی ہیں اور مرد عورتیں۔ ہم ایسی لاری میں بیٹھنا نہیں چاہتے"

بمشکل خانصاحب کو ٹھنڈا کیا اور بس روانہ ہوئی۔ شالامار باغ آیا۔ ہم اترے اور باغ کے اندر گھسے خان کو باغ خوب پسند آیا۔ تعریفوں کے پل باندھ دیئے دن گذرتے گئے ایک دن ہم لارنس گارڈن میں چہل قدمی کر رہے تھے میں نے کہا خان یہاں ایک (OPENAIR THEATRE) بھی ہے

"وہ کیا ہوتا ہے۔"

"باہر کھلی ہوا میں زندہ ڈرامے ہوتے ہیں" اُن کو شوق ہوا کہ زندہ ڈرامہ اور زندہ ڈرامے کی جگہ ضرور دیکھنی چاہیئے۔ اتفاق سے انہیں دنوں ایک ڈرامہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ دوسرے ہی دن ہم وہاں پہنچے لوگوں کو سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھ کر خانصاحب بولے۔

"یہ لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہیں۔ کس کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"یار یہ سیڑھیاں اس سینما ہاؤس کی کرسیاں ہیں"

"میں سیڑھیوں پر بیٹھ کر تماشہ نہیں دیکھنا چاہتا میرے باپ دادا آج تک سیڑھیوں پر نہیں بیٹھے میں کوئی گداگر ہوں یا مجھے حکیم نے کہا ہے کہ میں یہاں بیٹھوں۔"

"خانصاحب سڑی مت بنو تم سے کئی یہاں بیٹھے ہیں"

جوں توں کر کے ان کو سیڑھیوں پر بیٹھایا۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد بولے

"وہ کنواں کیا ہے"

"کہاں" میں نے پوچھا

سٹیج کی طرف اشارہ کرتے بولے "وہ دیکھو"

حضرت سٹیج کو کنواں سمجھ رہے تھے۔ کیونکہ جہاں آپ بیٹھے تھے وہ جگہ سٹیج سے اونچی تھی۔ ڈرامہ شروع ہوا۔ خان دلچسپی لینے لگے کہ اتنے میں بوندا باندی ہونے لگی مطلع پہلے سے ابر آلود تھا۔ اب تو خان شش و پنج میں پڑے اور لگے اپنی مشہدی۔ لنگی سنبھالنے کہ کہیں طرّہ نہ خراب ہو جائے۔ فوراً پگڑی اپنی واسکٹ میں چھپالی اور تھیٹر والوں کو کوسنے لگے کہ بیوقوفوں نے چھت تک نہیں بنایا۔ مجھے کہنے لگے چلو اس ڈرامے کو لات مارو۔

خیر ڈرامے کو چھوڑ ہم گھر کو لوٹ آئے۔ اسی طرح روزانہ ادھر اُدھر کی سیر کرتے کرتے سات آٹھ دن بیت گئے۔ مگر خان تو لاہور سے جانے کا نام تک نہیں لیتے تھے۔ انہی دنوں اخبار میں آیا کہ ریلوے ۲۵ ٪ کرایہ بڑھا رہی ہے۔ سیدھا خان کے پاس گیا اور باتوں باتوں میں خبر سنادی۔ بولے کب سے کرایہ بڑھ رہا ہے میں نے جواب دیا یکم اپریل سے۔ کہنے لگے ابھی تو بہت دن ہیں کوئی فکر کی بات نہیں۔

دوسرے ہی دن اخبار میں آٹا راشن ہونے کی سرکاری اطلاع چھپی۔ اب تو میں واقعی گھبرایا کیونکہ سرمست خان حضرت بقدر جثہ کے مطابق تین چار آدمیوں کی خوراک کو زیادہ نہ سمجھتے تھے میں نے خبر سنائی تو خان کو خود احساس ہوا۔ اتنے خود شناس ضرور تھے۔ کہنے لگے بھائی دل تو چاہتا ہے کہ کچھ دن اور لاہور میں رہوں۔ مگر کیا کروں گاؤں میں میرے بہت کام اٹکے ہوئے ہونگے اس لئے میں اب جاتا ہوں۔ پھر کبھی آؤں گا تو آٹا بھی ساتھ لاؤں گا۔

چنانچہ اُسی شام کو خان کو گاڑی میں بٹھادیا سرمست خان نے جاتے ہوئے کہا کہ اب تو میں "جم" گیا ہوں۔ مطلب (پیدا ہو گیا ہوں)

سعید ابراہیم

بیتے ہوئے دن

۱۔ ہائے بیتے ہوئے دن رات وہ ارمان بھرے
یادِ تنہائی کے لمحات میں یوں آتے ہیں

۲۔ جس طرح اُٹھتے ہوئے مست ہوا پہ بادل
کسی ویران خرابے پہ برس جاتے ہیں

۳۔ یا کسی سوکھے ہوئے پودے پر
یک بیک پھول نکھر آتے ہیں

۴۔ میری ہستی بھی یونہی ڈھونڈتی پھرتی ہے تجھے
جس طرح شمع پہ پروانے گرے جاتے ہیں

۵۔ جس طرح روح کی گہرائی سے اُٹھتے نغمے
بربطِ دل کے ہر اک تار سے ٹکراتے ہیں

اختر علی۔ سال چہارم

دُنیائے غریباں

"بس بیٹا! روؤ نہیں۔ ابا تمہارے دوائی لا رہے ہونگے۔ دیکھو تو تمہاری چھوٹی سی بہن بھی بیمار ہے کیا خاموشی سے لیٹی ہوئی ہے"

"ماں! میرا سینہ درد کر رہا ہے۔ کھانستا ہوں تو سارا بدن کانپ اُٹھتا ہے۔ میں یونہی تو نہیں روتا" اور یہ کہتے ہی وہ چھوٹا سا معصوم پھر رونے لگا اُس کی گھگھی بندھ گئی۔ اور اشکوں کا سیلاب آنکھوں کی راہ سے بہنے لگا۔ بھائی کی یہ حالت دیکھ کر اس کی چھوٹی بہن جو بمشکل چھ سال کی ہوگی۔ سسکیاں لینے لگی۔ اُس نے کہا "امی۔ بھیا کو کیا ہوا؟"

"والدہ نے کہا! کچھ نہیں بیٹی! یونہی لیٹا ہوا ہے" اور ننھی اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھما گھما کر بھائی کو دیکھنے لگی۔ وہ اپنے بھائی کو چاہتی تھی۔ بیحد وہ بیمار ہوتے ہوئے بھی بھائی سے کھیلتی تھی اُس کی سب باتیں مانتی۔ اگر کبھی وہ ناراض ہوتا تو رونے لگتی۔ اور اپنے آنسوؤں کے قطروں سے بھائی کی ناراضگی دھو ڈالتی۔ جب صلح ہو جاتی تو معصوم قہقہوں سے گھر کی فضا گونج اُٹھتی۔

اُن کی والدہ ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھی غمگین صورت بنائے مستقبل کی دنیا میں بھٹک رہی تھی بچوں کی بیماری اُس کے دل میں کانٹوں کی طرح چُبھ رہی تھی۔ اُن کی ایک ہلکی سی آہ بھی اسے بےچین کرکے رکھدیتی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو شبنم کے قطروں کی طرح تھرانے لگے۔ اور پھر آہستہ سے پلکوں تک ڈھلک آئے۔ اُس نے دوپٹے کا دامن سنبھالا اور اُن کو پونچھنے لگی۔

"ماں! تم رو تی کیوں ہو؟۔ کیا ہوا ہے!! بتاؤ ماں!!!" ننھے نے بےچین ہوکر پوچھا۔

"نہیں بیٹا! میں کہاں روتی ہوں۔ تمہاری طرح پگلی تھوڑی ہوں جو رونے لگوں"

"نہیں نہیں! بتاؤ کیا بات ہے۔ بتاؤ نہیں تو میں روتا ہوں۔" اُس نے دوبارہ پوچھا

ماں کی محبت نے جوش مارا۔ اُس نے لپک کر اُسے چومتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں بیٹا! - تم خاموشی سے لیٹے رہو۔ بیماری میں زیادہ باتیں کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ اور ننھا محبت بھری نظروں سے اپنی ماں کو دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ اور اُس کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت دانت آبدار موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔

دن گذرتے گئے۔ مگر ننھے کو کچھ افاقہ نہ ہوا اُس کی حالت بد سے بدتر ہوگئی وہ غریب مفلس و نادار والدین کا چشم و چراغ تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر تکلیف اور مصیبت کے دن کاٹ رہا تھا۔ وہ امیر نہیں تھا۔ کہ دن رات ڈاکٹروں کے زیر علاج گذرتے اب تک صرف ایک پڑیا ہی نصیب ہوئی تھی۔ جو اُس کا باپ کسی بازاری حکیم کی منت سماجت کرکے لایا تھا۔ اُس کا علاج صرف اُس کی ماں کی دُعائیں تھی۔ صرف اسی کی آغوش میں اُسے قدرے سکون حاصل ہوتا ورنہ سوائے کھانسنے اور آنسو بہانے کے اور کچھ نہ ہوتا۔ والد نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ جنگ میں سخت زخمی ہوا تھا۔ اس لئے وہ بیکار تھا۔ ایک طرف غربت دوسری طرف بچے کی بیماری۔ جو اُس کی اُمیدوں اور تمناؤں کا مرکز تھا جس کی آس اُسے جینے پر مجبور کر رہی تھی۔ اُسے ایسے معلوم ہوتا کہ وہ ایک جنگل میں، رات کی تاریکیوں میں، تھکا ماندہ مُسافر بے یار و مددگار جارہا ہو۔ آندھی اور طوفان اُسے ہر طرف سے گھیر لیں۔ ایسے میں دُور سے اُسے کوئی ٹمٹماتا ہوا چراغ ایک کٹیا میں جلتا نظر آجائے۔ اور یہ بےاختیار اُسی طرف لپکتا کر چلا جائے۔ اور یہی ایک کٹیا اُس کی جائے پناہ ہو۔

شام کا وقت تھا۔ رات کی سیاہی اپنا آغوش وا کیے دُنیا کو اپنے دامن میں سمیٹ رہی تھی۔ کائنات پر ظلمت کا پردہ چھا رہا تھا۔ ننھے کی حالت آج بہت خراب تھی۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں کے گرد سیاہ رنگ کے حلقے پڑ چکے تھے۔ جسم کھانستے کھانستے اچھا خاصہ ڈھانچہ بن چکا تھا۔ جس میں ایک روح پھڑک رہی تھی۔ اُسے کسی کروٹ چین نہ آتا تھا اُسے سانس رُک رُک کے آنے لگا۔ آنکھوں کی بینائی کمزور ہونے لگی۔ وہ بےاختیار چلا اُٹھا۔

"ماں! ادھر آؤ۔ مجھے کچھ ہوگیا ہے۔ میں سانس نہیں لے سکتا۔"

ماں نے دوڑ کر پوچھا کیا ہوا بیٹا" اُسنے چیختے ہوئے کہا:"

"کہاں ہو تم ماں۔ میری آنکھوں کو کیا ہوگیا۔ اُف اللہ میں کیا کروں"، اُس کی زبان تھتھلا گئی۔ ماں کا بُرا حال تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بال بکھر کر پیشانی پر چھا گئے۔ دل پر غبار آنے لگا۔ اُس نے لپک کر اُسے ممتا کی آغوش میں لے لیا اور چومنے لگی۔ وقت گذرتا گیا۔ اور ننھے کی حالت بہت نازک حالت اختیار کر گئی۔ اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اُس کی ماں چلانے لگی۔

"میرا بچہ! یا اللہ اسے کیا ہوگیا ہے۔"

اُس کا والد رات کی خوفناک تاریکی میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ

اپنے لختِ جگر کی یہ حالت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُسے
دنیا کا سب سے بڑا دکھ یہی تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح
ڈاکٹر کے مکان پر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔
"ڈاکٹر صاحب! خدا کے لئے رحم کیجئے۔
میرے بچے کی حالت بہت نازک ہے چلئے۔ میں
آپ کا ساری عمر احسان مند رہونگا۔ ڈاکٹر صاحب!
میں آپ سے بھیک مانگتا ہوں۔ رحم کیجئے! رحم کیجئے!!
ڈاکٹر صاحب!!! چھوٹا معصوم چند گھڑیوں کا مہمان
ہے۔ میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔"
"ڈاکٹر نے کرخت لہجے سے اُسے دھتکار دیا
جاؤ یہاں سے۔ یہ بھی کوئی وقت ہے جانے کا۔ جاؤ
مجھے پریشان نہ کرو۔ ورنہ پولیس کے حوالے کردونگا
بچہ مرتا ہے تو مرنے دو۔ جاؤ"
"ڈاکٹر صاحب۔ رحم" اُس نے التجائی
نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"ارے جاتے بھی ہو یا نہیں مردود!" ڈاکٹر
نے غصے سے جواب دیا اور دروازہ بند کرکے اندر چلا گیا
اُس کی آنکھوں میں غصے کی شدت سے آنسو جھلک آئے
مردود! مردود!! کیا صرف غریب ہی مردود ہوتا
ہے۔ میں مردود ہوں اس لئے۔ کہ غریب ہوں۔
میرے پاس دولت نہیں۔ عزت بھی نہیں۔
اُف! غریب کی بھی عزت ہوتی ہے؟ امیروں
کا دکھ دکھ ہے۔ اور غریبوں کا دکھ کچھ نہیں۔ وہ
درد سے تڑپتے ہیں اور غریب نہیں؟ غریب کچھ
بھی نہیں دنیا میں؟

بس صرف بے عزت اور رُسوا ہونے کے لئے ہے۔ کیا
دنیا کی تمام راحتیں روپیوں کی جھنکار میں بسی ہوئی ہیں؟
روپیہ صرف امیروں کے لئے ہے۔ غریبوں کیلئے
نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں تو ہماری چیخ اُن کے قہقہوں
میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔" اُس کے پاؤں
ڈگمگانے لگے۔ اُس کا دماغ خراب ہوگیا۔ وہ سر سے
پاؤں تک غصہ کے مارے کانپ رہا تھا۔
"یہ ظلم ہے۔ ہم مظلوم ہیں۔ زنا انصافی۔ بیرحمی۔
سفاکی یہی دنیا ہے۔" اُس کی آواز رات کی خاموش
فضاؤں میں پھیل کر ختم ہوجاتی۔ اس کی یہ حالت دیکھکر
درختوں کے پتے ہوا کے جھونکے کے ساتھ آپس میں سرگوشیاں
کرنے لگتے۔ وہ دیوانہ وار دوڑ پڑا۔ بغیر کسی ارادے کے
اُس نے سر کے بالوں کو اپنے ہاتھ سے جکڑ لیا۔ وہ بھاگتا گیا
تیزی سے۔ — نمعلوم کہاں۔
صبح ہوئی سورج کی سنہری کرنیں ایک چھوٹے سے بوسیدہ
مکان میں ایک چھوٹی سی نعش پر ماتم کر رہی تھی۔ اور پھر لوگوں
نے دیکھا کہ ایک کمزور عورت نے لاغر ہاتھوں پر ایک معصوم
کی نعش چند چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی قبرستان میں داخل
ہو رہی تھی۔ اور ایک دیوانہ دروازے پر کھڑا زور زور سے
ہنس رہا تھا۔ جس کے قہقہوں سے نفرت کی صدا آرہی تھی
اور جو قبرستان کی خاموش فضاؤں، خواب جاوداں میں
پڑے ہوئے انسانوں کو جگا رہی تھی۔

کامران شاہ۔ سال اول

جامعۂ عثمانیہ

جناب ناظم صاحب سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ
عثمانیہ حیدرآباد کی طرف سے دارالعلوم کے کتب خانہ
کے لئے گزشتہ ماہ مندرجہ ذیل مطبوعات عثمانیہ ہدیۃً
موصول ہوئی ہیں۔ اردو داں اصحاب کیلئے یہ کتب یقیناً
بہت مفید ہوں گی۔ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جن کے
اصل عربی متن کو حاصل کرنا بہت دشوار ہے۔

جامعہ عثمانیہ نے ان کا اردو ترجمہ شائع کرکے ملک، قوم زبان اور ادب کی بے انتہا خدمت کی ہے۔ اللہ تعالے اس کے نیک کاموں میں برکت دے۔ موجودہ زمانے میں جو علمی کتابیں اردو زبان میں جامعہ عثمانیہ سے شائع ہو رہی ہیں وہ گذشتہ زمانہ کے "بغداد" کی یاد کو تازہ کرتی ہیں۔

۱۔ نصاب ذیلی ریاضی حصہ دوئم مؤلفہ محمد عبدالرحمٰن خان

۲-۳۔ اصول قانون شہادت۔ جلد اول و دوم۔ (بسٹ) مترجمہ سیادت علی خاں۔ کتب کے آخر میں اشاریہ بھی ہے۔

۴۔ معلق ابتدائی (ڈکریشن) مترجمہ احسان احمد۔ کتاب کے آخر میں فہرست اصطلاحات انگریزی و اردو ہے۔

۵۔ نظریات سیاسیہ جلد اول (ڈننگ) مترجمہ قلمنذ حسین

۶۔ حکایات فلسفہ (ڈیورنٹ) مترجمہ احسان احمد۔ کتاب کے آخر میں فہرست اصطلاحات بھی ہے۔

۷۔ اصول علم سیاست۔ (گلکرسٹ) مترجمہ قلمنذ حسین

۸۔ قرون وسطی کا اسلامی فلسفہ (گولڈزیہر) مترجمہ حمید الدین (طبع والوں کی غلطی سے "تمہید" کا لفظ کتاب کے آخر تک چھپ گیا ہے حالانکہ صفحہ نمبر ۳۰ سے اصل مضمون شروع ہوتا ہے اور یہ لفظ صرف صفحہ ۱ اور ۲ پر ہونا چاہیئے تھا)

۹-۱۴۔ (ابن سعد واقدی) طبقات کبیر جزو اول تا چہارم جزو پنجم حصہ ۱-۲۔ جزو ششم۔ ہفتم مترجمہ عبداللہ عمادی

۱۷۔ فصوص الحکیم (ابن العربی) مترجمہ عبدالقدیر صدیقی

۱۸۔ مبادی نباتیات (لوسن اور ساہنی) مترجمہ محمد سعید الدین

۱۹۔ اسفار اربعہ (ملا صدر الدین شیرازی) مناظر احسن گیلانی

۲۰۔ تاریخ دکن عہد عالیہ۔ مؤلفہ یوسف حسین خان

مشرقی زبانوں کی اکثر کتب میں ایک بہت بڑی خامی اشاریہ (انڈکس) کے نہ ہونے کی وجہ سے رہجاتی ہے اور ادبی کتابوں میں انڈکس کا نہ ہونا یقیناً ایک بہت بڑی خامی ہے۔ جامعۂ عثمانیہ نے اس بات کی طرف توجہ ضرور دی ہے۔ اور کئی ایک کتابوں میں اشاریہ لگایا گیا ہے لیکن پھر بھی اکثر کتب اس سے خالی ہیں اگر اشاریہ ہر کتاب کے ساتھ لگانا ضروری تصور کر لیا جاوے تو یقیناً یہ بھی ادب کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ اُمید ہے جامعۂ عثمانیہ اس امر کی طرف خاص توجہ دیگی۔

احمد حسن۔ ایم۔ اے

یہ ہمارا میگزین ہے!

لیجئے! اب آپ ہندوستانی میں خبریں پڑھیئے

یہ خبریں ہمارے میگزین کے ذریعے فرسٹ ایر۔ سیکنڈ ایر۔ تھرڈ ایر۔ فورتھ ایر۔ کی خدمت میں ایک ساتھ پیش کی جا رہی ہیں۔ اِن کا کاپی رائٹ محفوظ ہے۔

اس بولیٹن کی خاص خاص خبریں یہ ہیں۔

۱۔ پشاور شہر میں مکانوں کی قلت

۲۔ موسم برسات میں بارش سے پیدا شدہ تکالیف سے بچنے کے لئے پشاور میں اگن بوٹوں کا انتظام۔

۳۔ کالجوں کے لڑکوں کے تبادلہ کے متعلق سکیم۔

۴۔ کالج کے لڑکوں کی آنکھوں پہ کنٹرول

لیجئے! اب آپ پوری خبریں پڑھیئے

پشاور میں مکانوں کی تکلیف دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اس لئے حکومت نے حکم جاری کیا ہے کہ آئندہ باہر کا جو شخص پشاور میں آئے وہ اپنا مکان یا کم از کم زمین ضرور ساتھ لائے۔ ورنہ اُسے پشاور میں آنے کی اجازت نہ دی جاوے گی۔ اس لئے اب پروفیسر صاحبان سے ہماری درخواست کر دینا فرض ہے کہ وہ جب کبھی تبادلہ کے بعد پشاور تشریف لائیں۔ تو ساتھ ساتھ گاڑی میں کم از کم اپنا مکان ضرور لیتے جائیں۔ تاکہ اُنہیں وہاں مکان وغیرہ کے متعلق کسی قسم کی تکلیف کا سامنا نہ

کرنا پڑے

۲

عام طور پر موسم برسات میں بارش کی وجہ سے پشاور کے بازار پانی سے بھر جاتے ہیں اور ٹریفک بند ہوتے کا خطرہ رہتا ہے پشاور کنٹونمنٹ بورڈ اور میونسپلٹی نے اس بات سے متاثر ہو کر ایک درجن اگن بوٹ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاکہ بارش کے دنوں میں جب بازار نہروں کا منظر پیش کریں تو اُن کو استعمال میں لایا جا سکے۔

۳

کالجوں کے لڑکے عام طور پر آوارہ گرد اور فضول خرچ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس پرائمری سکولوں کے طلبہ کم خرچ اور محنتی ہوتے ہیں۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ کالجوں کے لڑکوں کو سکولوں میں ٹھونس دیا جائے ... یاد رہے کہ ان کا کوئی عذر نہیں سنا جائیگا۔ عنقریب لڑکیوں کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔

۴

حکومت کی طرف سے ایک خاص آرڈیننس جاری ہوا ہے جس کی رُو سے کالج کے لڑکوں کی آنکھوں پر بھی کنٹرول کر لیا جائے گا۔ تاکہ اُن کا جائز استعمال روکا جا سکے۔ جو صاحب ان کا کنٹرول سے زیادہ استعمال کریں گے اُنہیں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے ماتحت صرف چھ ماہ کے لئے پھانسی پر لٹکا دیا جائیگا۔

اچھا جناب اب ہمارا وقت ختم ہوتا ہے۔ اب اجازت دیجئے۔ پھر کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہونگے

آداب عرض

پربھجدت سال اوّل

غزل

تنِ مُردہ سے پیار ہے مجھکو — تری اُلفت کی یہ نشانی ہے
میں نے تیرے لئے مرے محبوب — کوچہ کوچہ کی خاک چھانی ہے
آزمایا ہے بارہا ہم کو — حُسن کو پھر بھی بدگمانی ہے
کتنے دل اور توڑنے ہیں ابھی — حُسن ہے اور پھر جوانی ہے
لُٹ گیا سب جو پاس تھا اپنے — اور جو ہے فقط کہانی ہے
مائلِ لطف ہو کے اس بُت نے — میری بربادیوں کی ٹھانی ہے

محمد ایاز۔ سال دوم

د رسالۂ اسلامیه کالج پښتور

خیبر

میګزین

جلد ۲۹ — نمبر ۱

پښتو حصه

نګران:- پروفیسر لفیض الدین احمد ایم-اے-ایل ایل-بی (علیګ)
مدیر:- محمد شیر خان د خلورم کال — نائب مدیر:- عبدالرحمان کیف د خلورم کال

فهرست ← د → مضمونو
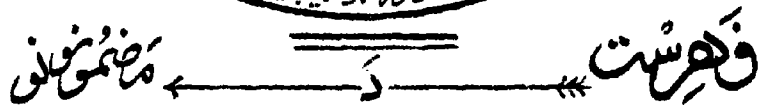
شماره	مضمون		لیکونکی	مخ
۱	افتتاحیه		مدیر محمد شیر د خلورم کال	۲
۲	غابنونه	(نظم)	نصرالله خان نصر د خلورم کال	۳
۳	نثر	(نظم)	محمد اشرف مفتون	۴
۴	فلسفۂ اخلاق		صاحبزاده عبدالباری فاضل دیوبند	۴
۵	دکائنات بیلی		محمد یونس خلیل د دویم کال	۷
۶	شاعر ترخطاب		عبدالرحمان کیف د خلورم کال	۷
۷	د لیکوالو نه		غلام اسحاق برشر	۸
۸	سپرلے	(نظم)	سید صفدر علی شاه	۱۱
۹	ژوندون		تاج محمد بی-ایس-سی	۱۲
۱۰	پرون او ن		ایم دلنواز	۱۳
۱۱	ګپ شپ		امیر محمد خان د اول کال	۱۴
۱۲	په کالج کښ د پړو میاشتو درځ		غلام قادر د اول کال	۱۶
۱۳	د دردمند زړه آرزو	غزل	عبدالعزیز خان عزیز بی-اے آنرز - ثناء دوران د دویم کال	۱۷
۱۴	دمتو در ژوند		عبدالخالق تهانوی د خلورم کال	۱۸

افتتاحیه

دَ خیبر چه ستاسو وړاندې دے ـ مونږ ته چه څه په لاس راغلل هغه مو تاسو ته پیش کړل ـ دَ ښه او خراب فیصله به اوس تاسو کوئ ـ دَ دے فیصلے نه اول دا عرض کول ضروری گڼړم چه خیبر دَ کالج دَ هلکانو دَ خیالاتو یوه آئینه ده ـ دوئ چه دَ طالبعلمئ په زمانه کښې څه لږه ډیره تجربه حاصله کړی دَ هغے عکس دَ نظم یا نثر په شکل کښې دَ خیبر په آئینه کښې اوغورزوی ـ دَ دے هلکان بیا هم هلکان دی ـ نو که چرے دَ دوئ په مضامینو کښې څه خامی وی ـ نو زه اُمید لرم چه دَ دے له به تاسو دومره لوئ اهمیّت نه ورکوئ ـ

اوس به زهٔ دَ پښتنو رونړو و پښتنو سره دَ سلوک په باب کښې څه اووایم ـ مونږ دا خبره ترا وسه شانته غورزوله ده، چه دَ هر قوم دَ ژبے مرګ او ژوند دَ هغه قوم مرګ او ژوند دے ـ هر قوم په دُنیا کښې په خپل لباس، رسم عادات او ژبه ښه ښکاری او ژوندے پاتے کیدے شی ـ ځکه چه ژبه دَ خیالاتو او احساساتو څرګندولو یوه ذریعه او آله ده ـ په کومے آسانتیا سره چه سړے دَ زړه خیالات په مورنئ ژبه کښې ښکاره کولے شی هغه په بله ژبه کښې نه شی کولے ـ غرض دا چه :-

که وطن ډک دَ مرغونو په دړانا شی — چه دَ علم دړانه وی، دړانه وی ـ

که ئے مړوله ژبے زده وی په دنیا کښې — چه خپله ژبه نه زده کویا نه وی

هر کله چه دَ ژبے پالنه دومره ډیر اهمیت لری نو ظاهره خبره ده چه دَ پښتنو ترقی دَ پښتنو ترقی ده ـ او دَ ترقئ دا امید نه زیږه هده تعلیمیافته ځلموسره تړلی دی ـ دَ دے دَ پاره مونږ له پکار دی چه خپل وخت کښې دَ خپلے مورنئ ژبے هم پرشه اوکړو ـ شاید چه بعض خلق دا اووائی چه پښتو هیڅکله یو علمی ژبه کیدے نه شی ـ دَ دے دوئ په خدمت کښې به څه دا عرض اوکړم :-

اگر یار خار ست خود کشته — وگر پرنیان ست خود کشته

ځما په خیال دا هسے یو بهانه ده ـ چه پښتو یوه تنګه لنډه ژبه او په یوه محدوده علاقه کښې ویلے شی ـ او بیا په تیره رسم الخط خو ئے ډیر ګران دے ـ نو ځکه لیکل په کښې نه شی کیدے ـ دے هغه متل دے چه " دَ ابئے زړه وی نو په سمسئ کښې هم تیے کوی " که پښتو ښه ده او که بده ځمونږ ژبه ده او ځمونږ دَ عمالو نتیجه ده ـ باقی شوه دَ رسم الخط خبره نو دَ دے مطلب دا نه دے چه دَ رسم الخط دَ فیصلے دا سے ډکی سړے په پښتو کښې هیڅ لیکی نه ـ چه هر ډنګ وی په پښتو کښې لیکل پکار دی ـ ځنګه چه سړے په اُردو او انګریزئ کښې خپل خیالات ظاهره وی ـ نو هم دغه شان پښتنو له پکار دی چه خپله ژبه کښې هم خپل خیالات څرګند کړی ـ ځکه که چرے مونږ پښتو نه علاوه په پردی

[illegible]

شو۔ دَ غالب مثال هم ځوانان وړاندې دي۔ هر کله چې ځوانان سره ده نو پکار دی چې مونږ خپلې ژبې له اهميت ورکړو دَې کښې وسعت پيدا کړو۔ او دَ نورو ژبو سره يې په صف کښې اوکه په اوکه او دَروُو۔

دا خبره خو څرګندونه ښکاره ده چې دَ پښتو نظم حصه کښې خو څه نه څه شته۔ او بيا موجوده نوو نوو شاعرانو خو ځوانانو حوصله نوره هم زياته کړه۔ خدائ تعالی دِ دَ دوئ قلم کښې نور هم زور او اثر پيدا کړي۔ دَ افسوس دا چې دَ نثر په حقله مونږ ډير وروستو يو۔ پکار دا دی چې دَ نثر ليکلو مونږ ډيره کوشش اوکړو۔ او شهرت يې ځوانان ده کوشش هم کم ادَنګ عملی صورت اختيار کړي چې دغه افسانه ده۔ خو دې کښې يوه خبره ده۔ هغه دا چې اکثر مواد دَ افسانو دَپاره دَ اُردو يا انګريزئ نه اخستې کيږي۔ حالانکه دا هم دومره بده خبره نه ده۔ ځکه چې اِبتداء ده ولې بيا هم که مونږ خپل کير چاپيره اوګورو نو دَ افسانو دَپاره څه ډير څه اخستې شو۔ نو بيا پکار دَ چې په افسانو کښې دَ خپل ماحول او رسم ورواج خيال اوساتو۔ خو نۀ يې افسانو هم نه ده پوره۔ ادب، فلسفه، تاريخ، سائنس او نورو ډيرو چيزونو هم خيال کښې راوستل پکار دی۔ او په مزه يې قلار دَ وخت مطابق نوو پښتو په لمن کښې راغلاړل پکار دي۔

په آخر کښې زۀ دَ خيبر لوستونکو نه په ډير ادب سره معافي غواړم ځکه چې دَ خيبر۔ اپريل چې ډيره وروستو اوو دَرې يوه وجه خو دَ مديرانو ډير وروستو مقرريدل او بل هلکان هم دَ صوبائي اسمبلئ دَ انتخاباتو په وجه څه ډير ناوزګاره وُو۔ خدائ دې پښتنو ته ځلمو ته نور هم همت ورکړي چې دَ خپلې مورنئ ژبې خدمت په ښه شان اوکړي۔

(نه مدير۔ محمد شير دِ خلو ... کال)

غاښونه

سرو لبانو کښې هر غاښ هسې ښکاري لکه نمر چې په افق کښې دَ صبا که
چې غاښونه او بڅېږي که غصه کښې پنه بکر په دود دَ اور لمبې پيدا که
سپين زر چې ځکه بريښي که په انکار کښې هسې بريښي سپين غاښونه دَ آشنا که
تورې زلفې چې خورې کړي او مسکئ شي دَ وريځې دَ بريښنا غوندې بريښنا که
په سره خوله کښې يې هر يو غاښ هسې شعاع که لکه پرخه چې سره خوله کښې دَ لالا که
بلوشې له خولې نه زغلي لکه غشي چې غاښونه دَ ليندۍ شونډو جدا که
که الماس هم څرنګه راشي دَ دوئ لاندې هغه دم يې لکه دوړه دَ آسيا که
هزار شکر دَې چې پټ دي په پرده کښې په ښکاره به دوئ بيهوشه دا دنيا که
نصرو! اته خوبې صفت بانډې موړ نه شې که آشنا ورته په ټوکه خوله خندا که

(نصر الله خان نصر دَ خلورم کال)

نظم

(سانيټ)

پټه د ژوندون رباب کښې ښکلې ترانه ئې ته

بحر د اُلفت کښې پېش قيمته مرغلره ئې — د هر د ښائيست کښې ته ساحره جادوګره ئې

فکر د اديب کښې يو رنګينه فسانه ئې ته — نقش د مصوّر کښې مرمرينه پيمانه ئې ته

سيل د ښاپيرو کښې نازنينه نازپروره ئې — رقص د موسيقۍ کښې ته د سوز و ساز سندره ئې

خيال کښې د شاعر د خدائۍ د لوړې ننداره ئې ته

ناوې د فطرت د ږولئ ژوند رنګين رومال لرې — ته رانږۍ د نازئې په دُنيا د ناز فرمان لرې

ستورې د آسمان درسره خوب کښې پټ پټونه کړي — باد د نسيم سحر په هر ګل کښې لټونه کړي

پريوتې ستاره ښکلته په مزکه د آسمانه ئې — شعر و شاعرۍ کښې بشارت د شعرستانه ئې

(له مفتون نه)

فلسفهٔ اخلاق

هر ذی علم او ذی بصيرت په دې پوهيږي. چه په اِنسان کښې دوه[2] قوتونه دی. چه يو د سوچ او فکر کولو قوت دې. چه هغې ته د عربۍ په فلسفه کښې قوّت نظرې ويلې شي. دا قوت د تمامو موجوداتو حقيقت دريافت کوی. او د دې د ماهيّت "کُنه" معلومه وی. بيا د مختلفو اعمالو او افعالو، په تماموا طرافو باندې د غوز کولو نه پس دا فيصله کوی چه کوم عمل ښه دې، د کولو لائق دې. او کوم عمل بد دې چه قابلِ ترک دې. د قوت نظرې د دې فيصلې نه پس دويم قوت يعنې قوت عمليّه ته حرکت ورکوی. او هغه د قوت نظرې د فيصلې مطابق د يو کار کولو يا د نه کولو تحريک دې. د دې دواړو تعلق د انسان د نفس سره دې. يو مبدأِ ادراک دې. او دويم مبدأِ تحريک. بيا د دې دواړو قوتونو ما تحت نور مختلف قوتونه دی. چه پخپل خپل دائرهٔ اثر و عمل کښې کار کوی. د تمام فلسفهٔ اخلاق بنياد هم د دې دوؤ قوتونو په محرکاتو او د دې د مقتضياتو په بحث کولو باندې قائم دې. د دې دوؤ قوتونو د بې اعتداله نه هر کله چه دا په افراط و تفريط کښې مبتلا شي، اخلاقِ رذائل پيدا کيږي. او هر کله چه په دې کښې اعتدال راشي نو د دې نه د اخلاقِ فضيلو ظهور کيږي. د فلسفهٔ اخلاق په اِصطلاح کښې چه کوم شئ ته حکمت ويلې شي. هم هغه د دې دوؤ قوتونو د اِستکمال نوم دې. او دا حکمت د اِنسان د

اشرف المخلوقات جوړيږي و بنياد دے. له دے وجه نه ژوند انفرادي وي يا اجتماعي، بهرحال د دے د کامیابۍ او ترقۍ دارومدار په دے خبره دے چه شخصي او انفرادي، قومي او اجتماعي قوت نظري او قوت عملي دواړه دے تندرست وي. د افراط و تفريط نه دِ خالي وي. او په اعتدال باندے د باقي پاتے کيدو سره دے په يو شئ د حسن يا د قبح يا د يو کار په کولو نه کولو کښ هم هغه رويه اختيار د کړي کوم چه يو معتدل قوت د پاره اختيارول پکار دي.

لکه څرنګ چه په هر انسان کښ يو قوت نظري او بل قوت عملي وي نو همدارنګ د هر قوم يو مزاج وي. او په دے اعتبار سره د پوره قوم يو قوت نظري وي. چه د هغے په آئينه کښ د تمام اشياء عالم حُسن و قبح کوري. او بيا په دے شان سره د هر قوم يو قوت عملي هم وي. چه د هغے په وجه د قوم د افراد د منفق او متحد کيدو نه پس څه کار اختياره وي. نو په دے وخت د هغه قوم د افرادو په عقايدو اعمالو کښ يو شان والے او يکسانيت موندلے شي. د هغو مرکز نګاه يو وي. د يو مقصد او د يو جذبے ماتحت د هغوي ټول حرکات وي. ظاهره ده که چرے د يو قوم په مزاج کښ فتور نه وي د اعلے د هغوي دماغ او اعضاؤ جوارح تندرست وي نو د هغے قوم هر اقدام مستحسن او د هغوي هر کار به نيک وي. او د دے قوم وجود به د دنيا د تمام انسانانو د پاره رحمت او برکت وي. دا قوم چه هر سمت او طرف ته رُخ کوي نو د باطل او شر و فساد ټول ظلمتونه به په خپله رخصت کيږي او د حق وصداقت آفتاب به ساعت په ساعت خپلے شغلے خوره وي.

د دے مختصر تمهيد نه پس د اسلام په تعليمات باندے غور کول پکار دي. نو دا به معلومه شي چه تمام اسلامي تعليمات اصولي او بنيادي طور باندے صرف د دوو څيزونو سره تعلق لري. يو انساني عقيده او دويم انساني عمل وکردار. د عقيدے تعلق قوت نظري سره دے. او د عمل و کردار تعلق قوت عمليه سره دے په صحيح او واضح الفاظو کښ داسے پوهيدل پکار دي چه اسلام د دے دواړو قوتونو حدود عمل او د هغے فرائض او د واجباتو تعين کړے. د انسان په لاس کښ ئے داسے يو دستور محکم ورکړ چه د هغے په رڼا کښ په صفا طريقه سره معلوميدے شي چه قوت نظري د کوم څيز متعلق د حُسن او د کوم متعلق د قبح حکم لګول غواړي. او د دے نسبت په وجه قوت عملي د مرغوباتو او مکروهاتو په دنيا کښ د څه عمل کولو يا نه کولو څه فيصله غوښتل کوي.

د اسلام دستور اساسي يعنے قرآن مجيد د اول نه تر آخره پورے د دے امورو تشريح او توضيح او د هغے حدودو او قيودو په بيان او تفسير باندے مشتمل دے. نو له دے وجه نه داويل به مبالغه نه وي چه د اسلام منشا د

دَ اِنسان قوت نظري او قوت عملي کامل او مکمل جوړول او هغې ته دَ حکمت بالغه درس ورکول او په دے شان هغه اشرف المخلوقات تیارول دي۔ چنانچه الله تعالیٰ دَ خپل حبیب بعثت دَ مؤمنانو په حق کښ ډیر لوئ احسان ګرځولے او ارشاد فرمائي:-

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

(بیشکه خدائ تعالیٰ په ایماندارو احسان کړے دے چه په هغوئ کښ ئے یو رسول ع لیږلے دے چه هغه په هغوئ دَ خدائ تعالیٰ آیتونه لولي، او هغوئ پاکوي او هغوئ ته کتاب او حکمت ښائي۔ اګرچه دوئ د مخکښ نه پوره ګمراهئ کښ وو۔)

هم دا هغه حکمت دے چه کوم ته د قرآن مجید په آیت کښ "وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا" خیر کثیر فرمائیلے شویدے۔ حکمت ته دَ کثیر فرمائیلو په وجه علماء اخلاق وئیلي دي۔ چه حکمت صرف دَ علم نوم نه دے۔ بلکه عمل هم دَ هغې مفهوم کښ داخل دے۔ ولے چه کوم علم بے عمله وي نو هغه سراسر وبال او مُصیبت دے۔ خیر کثیر خو لا لویه مرتبه ده۔

لکه چه حدیث شریف کښ راغلي دي۔ "کوم علم چه بے عمله وي۔ نو هغه وبال دے۔ او کوم عمل چه بے علمه وي نو هغه ضلال دے"

غرض دا چه قرآن مجید یو دا دستور العمل دے۔ او د انتظامنامهٔ اخلاق و عقاید لري۔ که چرے دَ قوت نظري او قوت عملي دواړو حرکت دَ دَ دستور په رڼا کښ استعمال شي نو دَ هغې تو تو نو په مالک کښ به حکمت پیدا شي که چرے څوک فرد "شخص واحد" دَ خپلو تمامو عقایدو او اعمالو بنیاد په هغې قایم کړي۔ نو دَ هغه ژوند به په ټولو وجوهو سره کامیاب شي۔ هم دارنګ که یو قوم دا قرآن مجید خپله عقیده او عمل دواړو کښ چل خوئ جوړ کړي نو هغه به بلاشبه دَ دنیا په ټولو قومونو کښ صالح او کامیاب ترین قوم وي۔ او دَ هغه به دا حق وي، چه په ټوله دُنیا کښ دَ بلند او ارفع ژوند تیر کړي۔ هم دا وجه ده چه رسول اکرم صلعم په ډیره لږه موده کښ په سرزمین عرب باندے دَ اسلام سکه قایمه کړه۔ هر کله چه هغه جاهلو او ناپوهه خلقو دَ محمّد علیه السلام نرم مزاجي، نیک او پاسته خوبونه او لیدل نو خپله ورته دَ امن و اِصلاح ډک تحریک اِسلام ښکاره شو۔ او مشرف په اسلام شو۔

اِسلام زنده باد

(له صاحبزاده عبدالباري فاضل دیوبند عمرزي)

د کائنات لیلیٰ

د نګهت چې بېتابه ستا لټون کښې بې قراره
تل طواف کوي له صحرا نه له ګلزاره له کهسا

نرۍ باد په تته زبه ستا پتوس کړي فضا ته
ستا لټون کښې آواره دې له مود نه پرېشانه

دا چې د سیند بېتابه ستا د عشق جنون کښې ورځي
نامعلوم ځای ته روانې ستا پر د لټون کښې ورځي

د آفتاب نه چې چاودلې بې قراره خوز انشا نه
د مغرب لمن کښې پټ شي تلاش تلاش ستو مانه

تته تته غلې په آسمان ستورې بې تابه
ستا لټو کښې د که ورکه له ازل نه د بې خوابه

په سلګو سلګو خاموشه تر سحره بې تابه ستوري
له ډو نه د ژړه لاړې په نمجنو سترګو ګوري

د شبنم قطرې په وښکو ستا پتوس کړي له ګلو نو
ستا د خیال جفا کښې ورکې په زړه لړزوي په یارو نو

نه محبوب د ټول فطرت یې، نه خیال د حیات یې
ټول وجود خمار رقیب دې، نه لیلیٰ د کائنات یې

(از محمد یونس خلیل اډ دویم کال)

شاعر ته خطاب

د دنیا او توسمند یې په چیو چیو شور پرې
حکمران په تصور یې، ډوب په د دنیا ګرزي

ته یو دا سې مصور یې چې د ټکو تصویر را ښکلې
هر یو ساز کښې ستا آواز دې په نغمو کښې ته ناډېږي

د فطرت روح روان یې د فطرت بنه راز دان یې
ته معنی یې د فطرت، د فطرت په تال چلېږي

ته په جوش او په مستۍ کښې تخیل کښې چې پرواز کړې
سراسر سوز او ګداز شې هر یو ساز کښې ته غږېږې

د ټول هر یو آواز د فطرت د ره ته پیغام دې
ته یو کان د جوانو یې چې ورته په زړه زیاتېږي

ته د هر زړه کې آرام یې، ته د هر آواز یو سازه
ته د غیبو آواز یې چې په ډېرو کښې کوږېږي

ته د سوز و ساز نه ډک یې، جفا سوره جفا آباد یې
یو ځای ګل یې بل ځای خار یې څه عجب ته ښکارېږې

دا ژوند د بېدارۍ ده، ستا نه نا صحو یو خوب د
ته که مړ شو هم مړ نه یې، هم همېش به ته یادېږې

دا شعر و نه د خبره، ستا ګفتار کښې رنګینی ده
د رنګینۍ د کیف او د چې همېش پکښې بهېږي

ته د قوم مضبوطه ستن یې قوم په تا د فخر کاندي
قوم چې پېر شي په ظلمت کښې ته مشعل وې ته بلېږې

(نعیم الرحمان [illegible])

دَ لیکلو فن!

هغه خو هر سړے چه لږ ډیر تعلیم یافته وی، دَ خپل نه څه لیکلو قابل وی. خو ښه تحریر دومره آسان کار نه دے څومره چه په ظاهره ښکاریږی. خصوصًا هغه تحریر چه ادب په دائره کښې د شمارلو قابل وی.

اَدب دَ یو قوم دَ اجتماعی خواهشاتو او دَ صحت بخش تصوراتو خزانه وی. دَ قومی ژوندون او دَ خپل ماحول یو صحیح عکس وی. دَ ژوندون دَ ترقئ او انحطاط، دَ ژوندون دَ انقلاباتو، دَ ژوندون دَ نشیب فراز، غرض دَ قومی ژوندون، دَ اجتماعی او انفرادی ارتقاء یو پیمانه وی. یو ادیب دے دَ پاره دَ قوم یو ډیر ذمه دار فرد وی. او څرنګه چه دَ یو مشر نه حمونږ دا امید وی چه دَ هغه په خبرو، دَ هغه په جامه کښې یو قسم پاکیزګی یو خاص ښایست یو خاص شان، یو کونه دَ موقع و محل سره مناسبت وی، دغسے حمونږ دَ یو ادیب نه هم توقع وی. چه هغه هر څه لیکی دَ یو خاص مقصد دَ لاندے دِ لیکی. هر یو لفظ چه استعمالوی درست وی، هره محاوره ئے په ځائے وی. غرض چه هر څه وائی یا لیکی دِ هغے دَ هغه ذمه دار حیثیت منافی نه وی. امید دا دے چه ستاسو به راسره اتفاق وی چه دا دومره آسان کار نه دے. خو سوال دا پیدا کیږی چه آخر دَ دے علاج؟

ز به یو لفظ کښې خوئے جواب دا دے چه مشق پکار دے. نثر دے که نظم بغیر دَ مشق نه ئے سرته رسول ګران نه څه چه ناممکن دی. خو دَ مشق دَ پاره هم څه اصول څه قواعد پکار دی. دَ ټولو نه اول ضروری یو ادیب دَ پاره دَ ژبے انتخاب وی. خیله خوم دا ایمان دے چه یو سړے تر هغه ادیب یا ښه لیکونکے نه شی کیدلے څو چه هغه په خیله مورنئ ژبه (په هغه ژبه کښې په کومه ئے چه دَ مور پیئ رودلی وی) ښه نه شی لیکلے.

حمونږ ډیر تعلیمیافته داسے شته چه وائی چه دَ پښتو لمن ډیره تنګه لګیږی ده. او "کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیان کیلئے" خو دوئ نه دا پتوس کول پکار دی چه آخر په دنیا کښې څومره کسان دی چه په یو اجنبی ژبه کښې دَ څه او چتے پایه ادب پیدا کړی دی. خوشحال خان او رحمان بابا چه ئے ادب په دنیا کښې کوم قابل فخر میراث مونږ ته پریښے دے هغه په فارسئ یا په بله ژبه کښې نه دے. ولے چه دوئ پښتانه وو. شیکسپیر به لاطینی یا یونانی کښې څه نه دی لیکلی، وے چه مورنئ ژبه ئے انګریزی ده. غالب دَ اردو یو مایه ناز شاعر دے خو په خیله وائی چه "بگذر از اردو که این مضمون بے رنگ من است" دَ اقبال فارسی ادب شاید چه دَ اردو نه او چت دے خو دَ هغے کلیه مستثنیات دی. په آخر دنیا څو اقبال پیدا کړیدی، یا به پیدا کړی.

"نه هر که سر بتراشید قلندری داند" پښتو لمنه تنګه نه ده بلکه حمونږ په برخه رسیدلے ده. دَ یو ژوندی قوم ژبه ده

پکاردي چه ژوندۍ وي. او ژوندۍ او ساتلې شي. او د ژبې ژوند و بقا د ژبې د خاوندانو په غاړه ده. د احمونږ ذمه واري ده چه خپلې ژبې ته ترقي ورکړو. خپله ژبه وسیعه کړو او د دې قابله ئې کړو چه خپل ټول خیالات د اموجود علوم و فنون ئې په لمن کښې ځای کړو. نو که دا خبره فیصله او کړو چه دلې لیکل به مونږ ژبه کښې پکار دي نو باقي قواعد د ادبي تحریر تقریباً د ټولو ژبو یو دي. او هغه واضح لیکل. ټهیک لیکل، مؤثر لیکل. او د حال د مقتضیٰ سره مطابق او موافق لیکل دي.

واضح او ټهیک لیکل څه د ډیر بحث محتاج نه دي. لیکل یا و اُنا د خپلو خیالاتو یا ذهني تصوراتو په الفاظو کښې اداکول دي. مونږ خپل خیالات خپل ځان له هم په لفظونو کښې ترجمه کوو. هر څو مره مونږ په ځیان په مغزو کښې ګرځي چه تر څو ئې د لفظ شکل نه وي اختیار کړے مونږ پرې نه پوهیږو. نو چه کوم ځای مونږ د یو بل سره پوهیدل غواړو. دا غواړو چه هغه هم د هغې جذبې نه هغه شان متاثر شي کومې نه یې چه مونږ په زړه کښې هغه خیالات پیدا کړي وي. نو دا څومره ضروري ده چه مونږ هغه خیالات په درست او واضح الفاظو کښې اداکړو. د الفاظو انتخاب لوګران دے. الفاظ پکار دي چه فهم ته نزدے وي. استعمال کښې مانوس وي. د لغوي قیاس څخه مخالفت نه لري. معنیٰ ئې څرګندې وي. عامیانه نه وي. چه په غوږونو بد او درانه لګي. او استعمال ئې بے ځایه نه وي.

ما سره دومره وخت نشته چه د ټولو مثالونه درکړم. خو غواړم چه د مانوسو الفاظو استعمال متعلق لږ نور څه هم اووایم. زمانه مخ په وړاندے روانه ده. ډیر نوي څیزونه او ډیر نوي خیالات میدان ته راغلي دي. لکه چه څرنګ ما اول عرض کړیدي. پکار دي چه دا مونږ په پښتو کښې ځای کړو. څرنګ چه د نورو ژبو ځای کړیدي. د لته دا وئیل ضروري ګڼم چه یوه ژبه هم مکمله پیدا شوے نه ده دے د پاره الفاظ پکار دي او د الفاظو پښتو ته راګرځولو کښې احتیاط لازم دے. د مثال په طور په تیرو شوو کلونو کښې د هوائي جهاز د پاره "الوتکه" ډیر ښه لفظ ایجاد شویدے خو (Sub marine) یعنې آبي وزکشتۍ د پاره چه دا څنې خلق ډوب ماکو استعمالوي ځما په خیال د دے په ځائے "اب تل" ډیر معقول لفظ دے. چه په غوږونو خوږ لږي او پکار دي چه د ډوب ماکو په ځای راج شي. مطلب دادے چه کوم خلق ته چه د دے نوو او غیر مانوسو الفاظو د استعمال ضرورت وي نو هغه دے (د مثال په طور) د ډوب ماکو او اب تل ترمنځه تمیز ضرور کوي.

حمونږ دریم شرط مؤثر لیکل وو. د لته هم ځما امید دے چه به تاسو راسره اتفاق لرئ چه دا څومره ضروري ده د دنیا په هره شعبه کښې، خپل سیاسي، معاشرتي، او اقتصادي ژوندانه نظر اوکړي د هر چا دا خواهش دے

چه دَبل نقطهٔ نظر ارمې - دغه حال په ادبي دنیا کښې دے - هر څوک چه قلم اوچتوي، داغواړي چه لوستونکو متأثر کړي - او مؤثر لیکلو کښې علاوه دَ ژبې د ښائسته خوبيو "توازن" پاکیزګي "اوچتوالے" "رواني" بنائیسته او دَ ټو نه آخیري خو ضروري دَ "حال دَ مقتضا سره مطابقت او موافقت" پکار دے - یعني چه دَ "موضوع" دَ "لوستونکي" دَ "ځائې" دَ "موقع" دَ "ماحول" د دنیا په هغه وخت سره حالاتو" دَ ټولو رعایت پکښې وي - داحال نه دے چه خطاب عام و خلقو ته وي - او وَئیلې دومره مطلوب وي "چه هغه خلق چه خدائې ته نه سجده کوي" او نه شروع شي چه "هغه بندګان عجز و تزلل چه د چا جبین نیاز و عبودیت دجناب خالق باري دَ آستانه جلال و جبروت دَ وړاندے سجده ریز وي" او یا یو معمولي دَ جنګ خبر وي - او نه ئې داسے پیش کړے - چه "شاهي عسکرو ته دَ تعرض حکم صادر شو - او چه آخر به یو یرغل کښې دشمن پست پائے شو - نو په ولایت کښې بیشیره امنیت قائم شو" دا مې چه دَ دے نه علمیت ظاهر یږي خو په دَ حالاتو کښې بنه پښتو ئې څه کوے چه پښتو وئیل دَ دَ نه ګران دي -

دَ پښتو یو پیر مشر و بزرګ یو برخوردار ته په یو خط کښې لیکلي چه "بنا علی اخلاق چه خالق اکبر ستا په سرشت کښې ودیعت کړیدي، در مبارک دِ وي - د فطرت آئینه دِ مکدره مشه - چه د کائینات سیر پکښې کړے - او دَ مخلوق نه د خالق سراغ مومے - والله چه اهل دل به دِ قدر کوي - ستا د عنصري جسم نه، بلکه دَ هغو خوبیو چه ستا پیکرے حامل دي" دا هم پښتو به عربي یا فارسي کښې وَئیلې ده - خو چونکه موقع و محل ئې بیل دي - او شاید چه مخاطب ئې هم دَ دے بدیع انداز نه لطف اندوز کیدے شي سړے به ورته بنه انشاء او وائي - خو دَ طرز تحریر دَ دے لفاظي او لساني وخت یا تیر دے یا به تیریږي دے - دَ سوزون الفاظو تلاش به نه دے - خو قصداً د داسے الفاظو تلاش دَ وخت ضائع کیدل دي - په تحریر کښې تصنع او آورد داولي او دغه څیز دے چه په انداز تحریر کښې نه دے پکار - که سړے پښتو لیکي نو بکار دي چه پښتو ئې لیکي سلیسه او با محاوره - دَ زړه سره سوچ پرے اوکړي - او دَ مغزو سره ئې اولیکي - اوس چه دے مضمون ته ګورم نو محسوسوم چه ما هم به دَ دے پر عمل نه دے کړے - خو زهٔ دَ بنے انشاء دعوے نه لرم - ستا سو دا خیال صحیح دے چه وَئیلې آسانه ده خو عمل ګران کار دے"

(له غلام اسحاق خان برسرینه)

ټکونه:- (۱) چه ورته وَ دے راځه نو نه راځي چه ورته وائي مه راځه نو راځي - (۲) غوښه یاسه څرمن دَ لاندے - (۳) دوه پلار دې دوه ځامن - ډیر انا ردي هر یوله یو یو ورکړې - (۴) په لاره تلم مرونا ردے کړے - په کهټ کښې اوبه راوړے په غولوے خوره کړے - (۵) په غار کښې غار ودے - چه باراو ړي بادي دے - چه آلوزي کار دغه دے -

(عبد القادر شکال وږیږ)

جوابونه:- (۱) ... (۲) ... (۳) ... (۴) ...

یو ته شه خبر کړه ځان، زیرے د بهار راغے — بار د نوبهار راغے، نغمه خوان هزار راغے
ګل لکه نګار راغے — حسن کښې سرشار راغے — مست په کیف ګلزار راغے

یو ته شه خبر کړه ځان — زیرے د بهار راغے

زیرے د سپرلی واوره، ځان کړه ته خبره دا — یو ته شو نرګس په ناز، کوری په ښایسته انداز
پک لاله د سوز و ساز — زلف د سنبل دراز — ډکے د نغمو نه ساز

زیرے د سپرلی واوره — ځان کړه ته خبر په راز

ګوره د سپرلی وږمه، یو ته په صحرا وینم — دشت و در زیبا وینم، هر او سم رعنا وینم
تاک کښې نن صهبا وینم — ډکه ئے مینا وینم — څه ښکلے دنیا وینم

ګوره د سپرلی وږمه — یو ته په صحرا وینم

واخله د لیسرلی مزے، مه کښېنه په کنج کښې نور — او ګوره د ګلو زور، باغ ګڼیدلے اور
اور کښې د چمن سمسور — جوړے د خلیل د کور — بیا پرے د بلبلو شور

واخله د لیسرلی مزے — مه کښېنه په کنج کښې نور

حسن جلوه ګر دے نن، ننداره ده د ګل نن — مست په کیف د عشق بلبل، دلته ګل د هلته ګل
تشنه وینم ستا منګل — یو حو امل او بل خوا قُل — وائی ساقی واخله مُل

حسن جلوه ګر دے نن — ستا ډیوه ده د ګل

سر چه په صحرا ونه شے، داجنون دے خام دے لا — عشق دے ناتمام دے لا، هم خرد د دام دے لا
ابتدا دے په دام دے لا — تنګ د حسن جام دے لا — داده الف لام دے لا

سر چه په صحرا نه شے — داجنون دے خام دے لا

ګوره د دنیا نیرنګ، زه به ئے نرخ وایمه — ما ته وائی ستا یمه، تا ته وائی ستا یمه
هر چا ته رعنا یمه — عین کښې د هر چا یمه — خوږه، نه د هیچا یمه

ګوره د دنیا نیرنګ — زه به ئے نرخ وایمه

(له سید صفدر علی شاه)

ژوندُون

بچے پیدا شی پیدا کیدو سره سمدستی پہ ژړا شی۔ یعنې د ژوندُون مُصیبتونه هغه ته ښکاره او د راتلونکے زمانے مصیبتونه د هغه د معصوم زړګی نه د کړیکو پہ شکل کښې را اوُزی۔ هغه ته قدرتي او ښودلے شی چه د ژوندُون هر قدم د مصیبت او ډېره لاره د اغزو ډکه پرته ده۔ ژوند د غمونو یوه ډکه پیاله ده۔ چه ساعت پہ ساعت پہ رضا یا بے رضا د هغے نه یو دنا ګولے ګوټ کوی۔ او پہ هیڅ حالت کښې د هغے نه مخ نه شی اړولے۔

بچے پہ زانګو کښې پروت وی د ماشوم پہ ماغزو کښې صرف معصومیت وی۔ او نور هیڅ هم نه۔ د دنیا د غم و درد نه ناخبره د بل پہ اسره پروت وی۔ ولے بیا هم هغه د ژوند د اصلي غمونو نه خلاص نه وی۔ کله ژاړی او کله خاندی او هم دغه ژړا خندا د ژوندون پہ هره حصه کښې سره سره روانه وی۔ ورو ورو کوچنے د مور پہ مینه او د هغے د خپل وجود پہ خوراک د لښینا ستوشی۔ د خړ پو سوشی۔ او بابا۔ کاکا، دادا وینا هم زده کړی۔ او آخر یو وخت راشی چه مور پرے خپله وینه یعنی پئ پرے بندکړی۔ او هغه د دنیا د نورو خلقو پہ شان د دنیا خوراک واخلی او ورځ پہ ورځ ئے معصومیت کمیږی۔ او د معصومیت ځائ اندیښنے او فکر آخلی۔ او آخر د ځوانئ پہ پوړے قدم کیږدی۔ چه د ورو ستو کوری۔ د وړو کوالی هغه ښکلے زمانه ورته یادیږی۔ او چه مخکښې نظر کوی۔ نو دنیا ورته یو لویه بلا ښکاری۔ ګیر چاپیره کوری هر طرف نه ورته تیارهٔ او خطره ښکاری۔ ولے دے بیا هم د لیونی پہ شان بے سوچه او بے فکره روان وی۔ مست او د دنیا پہ ظاهری ښایست غُولیدلے۔ دا هغه وخت وی چه انسان د دنیا پہ قوانینو ډیر کم چلیږی۔ هغه پہ خپل خیالاتو کښې مست او خوښیدلے روان وی۔ د راتلونکے زمانے څه فکر نه کوی۔ او اکثر داسے ټکره او خوری چه یا خوږه شی او یا هوش ئے پہ ځائ شی۔

غرض یو یو قدم هغه د مرګ خولے ته ساعت پہ ساعت لنډه وی۔ او هغه روان وی۔ پہ دے سمندر کښې هغه مخکښې کوری چه د هغه د سترګو وړاندے کشتئ پہ سمندر کښې بے درېغه لګیا ده ډوبیږی۔ او دے غمه بے دړده هم هغسے روان وی۔ حتی چه د زړخت پہ پوړے د ناخوالئ یو قدم کیږدی۔ د مخ بیماری ئے راګیر کړی۔ د مصیبتونو حال کښې ګیر شی۔ او اکثر پہ تیرو شپو کښې هغه ته د قبر هغه سخته تیاره مخکښې کیږی۔ او د سپوږمۍ پہ رڼا کښې د وړو دلو شور او د خوګو نڅو آوازونه هغه ته خپله تیره شوے زمانه یاده وی۔ او هر یو اسویلی سره د ده د سر یو یو ویښته سپینیږی۔ او پہ مخ باندے ئے یو یو ګونجے زیاتیږی او څومره چه د ده وړاندے تلونه ټوټیږی هم هغومره دے مخکښې د هیکه کیږی۔ د ورو ستو کوری او د ارمانونو ناخوا

او ښکلے دَ کیږے په سینو ولیښتو کښې لکه دَ مرغلرو په شان اوپیکے شی۔ او هم دغسے یوه ورځ به پهیلو شو نهٔ او به پوستو کو دَ خپلو خپلوانو نه اجازت واخلی۔ او دَ امید تو ډک زړه سره د دنیا نه آخرت ته سفر اوکړی۔ دغه عمر دے او دغه ژوندون۔ په ژړا پیدا شی او په ژړا ننا۔ دَ دنیا به مال دولت ئے مرخت نه وی زړه ئے د حرص ډک وی۔ په دولت پیسے لیونے وی۔ په عزت پیسے بے سوله۔ وے چه دَ آخرت لاروا خلی نو دَ معمولی کفن نه نور هیڅ هم ورسره نه وی۔ تش لاس راشی او تش لاس لاړ شی۔ دغه دَ ژوندون آغاز دے۔ او دغه انجام " په ژړا پیدا شی او په ژړا ننا "

(تاج محمّد بی۔ الیس سی۔ سهتو پښتا)

پرواز اونږ

دَ قدرت اصول دی چه ترکو مه یو قوم دَ ترقئ په یوه خاصه لار روان وی نو دَ دښمنانو زاره ئے تق چوی ولے هر کله چه دا لار ورنه پریږدی نو دَ ذلت او رسوائی په کندو کښې پریوزی۔ او دَ غریبئ او مفلسئ په توره تیاره کښې ورک شی۔ هم دغه حال نن حمونږ دَ قوم دے۔ په خیټه اوګی او په تن بربنډ یو۔ نه دَ دین یو او نه دَ سادین۔ ژوندی یو ولے دَ مړو نه بدتر۔ نه مونږ نیک نیتی پاتے شوه او نه لوئ زړه۔ نه دَ پلار نیکه په شان ایمان لرو او نه عمل۔ څه وو او څه شو؟ آخر دا دومره لوئ فرق ولے؟ قدرت راسره ظلم اوکړو او که زمانے دهوکه؟ قسمت بے وفا شو او که تقدیر نا آشنا؟ دنیا پریږده او دو لت بے شمار۔ تعلیم عام، مدرسے ډیرے۔ نه دَ وسلے کمی ده او نه دَ سامان۔ ریلونه چلیږی او الوتکے الوزی۔ سائینس په ترقئ دے۔ دا هر څه شته۔ او موجود دی۔ رجا دَ پاره؟ حمونږ پکښې څه حصه ده؟ په دے پسرلی کښې حمونږ کوم نخی سری۔ مونږ دَ خدائ تعالیٰ بندګان یو۔ سرونه او دما عونه لرو۔ لاس و پښے مو شته۔ بیا هم دَ بل محتاج یو۔ دبل اِحسان ته موکاته دی۔ او دَ بل په مخکښې مو د سوال لمن خوره کړے ده۔ دَ دے وجه تقدیر نه دے۔ بد قسمتی نه ده۔ دَ خدائ تعالیٰ نا انصافی نه ده۔ دَ دے وجه حمونږ خپل عمل دے۔ دَ خدائ تعالیٰ دَ احکامو نه بے پرواهی ده۔ مونږ پخوا دَ خدائ تعالیٰ وو۔ ځکه خدائ تعالیٰ او دَ هغه دنیا حمونږ وه۔ اوس دَ ځان شو ځکه خدائ تعالیٰ را نه لاس واخستل۔ مونږ دَ خدائ تعالیٰ قانون هیر کړو خدائ تعالیٰ مونږ هیر کړو۔ ایمان مو شته عمل پرے نشته۔ قرآن مجید لولو دَ معنو پته نشته۔ نمونځ کوو خو دَ حقیقت نه خالی دے۔ خیرات ورکوو خو دَ ریا دَ پاره۔ غزا کوو خو د خپل ورور سره۔ دَ بل خدمت دا باندے بار او دَ بل غم را نه بنا دی ده۔ دَ دولتمند غلامی را ته عزت او دَ غریب آزادول را ته مړانه ښکاری

یا به مو دَ بل دَپاره سر ورکولو او یا بل ته کوږه کړو - یا به مو دَ غریب دَپاره نهرے شپے تیروَلے او یا دَ غریب کُلے لاړکاړو - یا خو به مو دَ خدائی تو په لار کښ هرڅه قربان کړل او یا دَ الله تو په نوم یو کوټ اوبه نه ورکوو - یا خو مسلمانان وو او یا به اسلام پیرے خاندو - کاش چه مونږ خپل ځان او پیژندلے - دَ خدائے تعالیٰ او دَ رسول صلعم په لاره سم شوے - پښتانه شوے، مسلمانان شوے با عمله او با عزته مسلمان آزاد او توریالی ننګیالی پښتانه - همدردمند کان -

(ایم - دلنواز)

ګپ شپ

دَ جمعې ماښام وو - او دَ یو کلی په حجره کښ دَ ډیوے نرۍ نرۍ رڼا خته - په دغه شپه دَ یو نابلد مسافر هم په دے حجره کښ شپه وه - چه دَ لیدو کتو نه دَ غرونو او سیدونکے ښکاریدو - دده نه کیږ چا پیره هلکان راغونډ شوی وو - او ورته یے دَ یو قصے ویلو دَ پاره بیا بیا ویل - آخر مسافر کاکا مجبوره شو او دا رنګ کویانه شو - چه :

" دَ یو بادشاه او سیدونکے پښتون شاه خلے او دَ یو بل کلی یو بډا هندو دوکاندار به یو پیاده منزل کښ ملګری شو نز ځه منځه خوچپ چاپ روان وو - خو آخر هندو اوویل چه نیکه ! چرته به زړه - دَ ورته یو کلے یاد کړو - چه هلته خو یو ضروری کار مے - هندو اووے چه خان ! زه هم هلته ځم خو په ځائ دده چه دواړه کونګ سونګ روان یو که ته خبرے اترے کوو نو په منزل به آرو پوهه نه شو - ولے شرط دا دے چه زه څه خبرے اوکړم نو به هغے به یقین کوے - او که هغه نه منے نو شل روپئ به دا کوے - او هم دغه شان بیا ته څه قصه اوکړه نو زه به ئے منم او که نه ئے منم نو زه به شل روپئ تاله درکوم آخر دَ لوظ قول نه پس هندو یو داسے قصه راواخسته - چه عقل نه منله - یقین یے وو چه شل روپئ به ددے ساده پښتون نه اوکټم - ده ووے چه مونږ یو خر کے وو - چه ځان له ئے شاپه دیوال سره په کږو لو کږ لو خوک کړے وه - نو مونږ به هغه کښ دَ پیسو په اوده او کرله او دَ هغے سانګے دومره خوږے او اوکدے شوے چه یو سانګه ئے په کابل او بله ئے په کشمیر او ګیده - دَ کابل جینکو دَ کابل هغے سانګه کښ او دَ کشمیر جینکو دَ کشمیر سانګه کښ تالونه واچول - او زانګل ئے بے - چه ناسا په مونږ خر کے را او چورلید و او دَ کابل جینکئ کشمیر ته او دَ کشمیر جینکئ کابل ته را او رسیدے - او س وایه نیکه چه ته ئے منے که نه ؟ ځلمی دَ یرے او ویل چه زه خو ئے منم - خو اوس ځما داوره :-

"حوُنږ یو کنجے وُرددرووَ۔ موږ یوُ ورځ یوُ څو قلبه او غوښتے اود هغه سره موُ دُ ډاله کړه او یکښ غوښتم اوکړل چه فصل پوخ شو او غوښت تیار شو نوستا پلار موږ له راغے او وے وئیل چه دا تول غوښت په ما خرڅ کړئ خو څما لاس تن صبا تنګ دے۔ څه موده به دا نه کوړئ۔ نو موږ هغه تول غوښت چه شل سیرے وُو ستا په پلار د بانډے په پور خرڅ کړل۔ چه تر او سه پورے مو پرے روپۍ پورے دی۔ ولے سیټهه! دامنے! لاله صاحب په دوه کښں پریږو نو چه څه جواب ورکړم۔ که اوُ کوُم نو د شل منو غوښتو رقم به ورکوُم۔ او نه کوم نو صرف شل روپۍ به ورکوم۔ آخر په ډیر مشکل سره د سیټهه صاحب د خولے نه نه اوخته او شل روپۍ ئے هغه خلمی ته ورکړے۔ د دے هندو ساده لیښتون سره د تلکئ نیت وو۔ خو په خپله ورنکلے شو۔ ریښتیا دی۔" چاه کن را چاه در پیش"

مسافر خپله قصه خلاصه کړه او هلکان په خندا خو شحالئ کور ونو ته لاړل۔

(له تلمهٔ امیر محمد خان زیدوی د اول کال)

(پاتے له ۲۰ مخ نه)

دلته کښں د ده ډیر مُریدان پیدا شو۔ چه یوُ پکښں مشهور و معروف محمّد عبدهٔ دے۔ سیّد صاحب په یوُ میاشت کښں دننه دننه د "محفل وطنی" نوم یوُ جماعت جوړ کړو۔ او شپږ شلے عیسایان او یهودیان ئے مُسلمانان کړل۔ د مصر نه درے اخبارونه جاری کړل۔ په ۱۸۷۹ئ کښں سید صاحب هندوستان ته راغے۔ او په حیدرآباد (دکن) کښں ډیره شو۔ دے د سرسید احمد خان د تحریک ډیر سخت برخلاف وو۔ او د لئے کوشش وو چه اردو د هندوستان د پاره ذریعه تعلیم شی۔

په ۱۸۸۳ئ کښں دے اول لندن ته او بیا پیرس ته لاړو او هلته ئے ایم ارنسټ رینان سره په "اسلام و سائنس" باندے بحث اوکړو۔ او هغه ئے قایل کړو۔ چه اسلام هیچرے د سائنس برخلاف نه دے۔ دلته ده یوُ اخبار "عروة الوثقیٰ" جاری کړو۔ دا اخبار اول په مصر کښں او بیا په هندوستان کښں بند کړے شو۔ او په آخر کښں د پیرس خو لو چهاپ خانو د دے اخبار چهاپ کولو نه انکار اوکړو۔ بیا په لندن کښں د سید صاحب ملکم خان نوم ایرانی سفیر سره دوستی جوړ شوه۔ دلته ده دا کوشش وو چه ایران، افغانستان او ترک د روس برخلاف متحد شی۔ د لندن نه دے روس ته لاړو۔ او ۱۸۸۶ئ په آخر کښں ایران ته لاړو۔ د ایران نه ئے بیا روس ته لاړو۔ او هلته ئے دوه کاله تیر کړل۔ په ۱۸۸۹ئ کښں دے میونخ ته لاړو او هلته ئے د ایران بادشاه او لیدو۔ بادشاه ده ته د وزیر اعظم عهده پیش کړه۔ لیکن د درومبی وزیر اعظم ورسره حسد پیدا شو او دے په یوُ مشن روس ته اولیږلو۔ د سید صاحب په غیر حاضرئ ده د بادشاه غوږونه د ده برخلاف ډک کړل۔

(خالد خان د شاه پسکار) (نور بیا)

په کالج کښې ورومبۍ ورځ

د لسم جماعت د نتيجې په انتظار کښې م ستړګې سپينې شوې ـ يوه يوه ورځ د کال په شان تيريدله ـ آخر يو ورځ نتيجه هم ښکاره شوه ـ زه پخپله کړنځ کښې په يو ګنټه کښې ځائ ورکړو ـ دوستانو باندې شيرينئ وويشلې شوه ـ يو تر تکلف دعوت ورکړې شو ـ او دغسې يو څو ورځې په خندا خوشحالئ تيرې شوې ـ اوس د اګرانه مسئله پيښه شوه چه "حوالدار کلرک" جوړيدل پکار دي او که کالج کښې داخليدل ـ والد صاحب دا مشوره راکړه چه حوالداري کلرکي فضول خبره دي، تعليم پوره بنودل نه دي پکار ـ مخکښې خو ما ليس و پيش اوکړو ځکه چه آورېدلي م دو چه کالج کښې نوي هلکانو سره توقے تقاضے کيږي ـ ليکن چه هغوئ ډير زور اوکړو نو مجبور شوم ـ ما وې ـ څه د زړه ويو کوټ دې په څه چل به تيرشي ـ

بله ورځ سحر وختي پاسيدم، جامې م بدلې کړې ـ ناشته م اوکړو او د ضروري سامان تهيک کولو نه پس د اسلاميه کالج په نيت پيښاور ته روان شوم ـ تور و خلقو لاري کښې کپ شپ لګولو او ځما په مازغو کښې پته نشته کوم کوم خيالات ګرزيدل ـ په دې خيالاتو کښې زه دا سې ډوب وم چه د وخت تيريدو هډو څه پته او نه لګيده ـ او پيښاور راغے ـ دا پيښاور ښهر ـ دا پيښاور کالج، چهاونړئ، او دا اسلاميه کالج، ځما د آستوګنې ځائ ـ لا د هيډ کلرک صاحب دفتر ته ورننوتے هم نه وم چه هلکان را نه چاپيره شول ـ لکه چه فول ځما په انتظار کښې ولاړ وو ـ ما لا دا سوچ کولو "خير دې څه چل دے" چه يو صاحب درانګلو سره چغه کړه "ونست ريږه!" ما په دے څه غور او نکړو او دفتر ته ننوتو کښې وم چه يو بل صاحب ډير په نرمئ تحقيق اوکړو "ولے جي فسټ اير کښې به داخليږئ؟" ـ "جي ـ خيال خو م دے" د پريشانئ په حالت کښې م جواب ورکړو ـ دا الفاظ څه داسې طرز کښې ځما د خولې نه اووتل چه نا سا په تولو په برق برق خندا راواخسته ـ اوس صاحب اينم د هيډ کلرک په دفتر کښې اينم دد دفتر ته ورولاړيم ـ څوک م د کوټه دا کاږي ـ چا م د قميص لمن نيولې ده ـ ورسره ورسره د سوالونو يو باران دے ـ او زه يم چه ګونګ سونګ ولاړيم ـ خولے نه م خبره نه خيژي "جناب څه سوچ کښې ډوب يئ؟" يو هلک په لسه اوکړم لاس کيښو "اسم شريف موڅه دے؟" بل سوال اوکړو "کالج يوڅه په تانګه کښې راغلي يئ ـ که ويل مادرچ موا اوکړو دې؟" "سوله سوې؟" يو حساب دان تحقيق اوکړو ـ جواب م ورکړو "دوسو چهپن" د جواب په آوريدو ډير خوشحاله شو ـ او وې ويل دې "سټ پنجه" ما چه پوهه ورکړه چه تحقيق کړئ ـ زړه م اووېل "تين سو" د خولے نه م د تين سو" وتو دو چه هلکانو په خندا کوله شنې کړې ـ زه يو ساعت زياره پريشانه چپ چاپ اودريدم ـ ځما د بدحواسئ نه يو زنده دل

بنه قائمه او چته کړه ـ دَ کړپ آواز او ختو ـ او چه یو شیبه پس م تمیص ته خیال شو نو یوه عجیبه تابه م پرې اولیدله ـ چه لوړ غوښه هوره م اوکړه نو دَ انګریزۍ لفظ "فول" تهې جوړیدو ـ غُصَّه خو پیره راغله خو خندم کړے دے ـ "قهر درویش بر جان درویش"

آخر په څه چل م د هلکانو نه ځان خلاص کړو ـ او دداخلے فارمونو د کولونه پس د غلو په ثنا بیت یو عثمانیه هوسټل ته لاړم سامان م په یوه کره کښ کیښودو ـ او ځان پسے م دَ کوټے ورَدونه مخے پورې کړو ـ ځان پوهم خندا راتله او هغه هلکانو پرې هم ـ دَ دے نه دا اندازه مه لګوئ چه پس دَ غه هومره خاطر وو چه ځما او شو ـ هیڅ ره هیڅ رے نه ـ

" ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" مخکښ دَ خدائ نه خیر کړی ـ

(غلام قادر متعلم سال اوّل)

دَ دَرد مند زړه آواز

ستا په یاد کښ م دَ سترګو جاری آب دے ! — نه دَ شپے م په نصیب دَ آرام خواب دے !

زۀ یوازے مُبتلا یم په دے غم کښ — که نه ستا په زړه بنه هم دغه عذاب دَ ے

په قسم نه لږی زړۀ م هیڅ لوُستو ته — لوښ په او ښکو هر ورق م دَ کتاب دے

په سجده چه م کوم ځائ کښ تندے کیښود — نه پوهیږمه ستا دړ دے که محراب دے

زۀ چه پټے کړمه سترګے راحضور شے — دَ "نظر" ځما او ستا مېنځکښ حجاب دے

نه پوهیږم چه سجده کړم عـزیز خان !
نوم په خوله م دَ آشنا که دَ وهاب دے

عبدالعزیز خان عزیز بی ـ اے (آنرز) متعلم بی ـ ایس ـ سی ـ انجنیرنګ (علیګړه)

غزل

شاه دوران ← ← دَ دیږم کال

مَدرُور دِ خواله راغلم له دُنیا نه — مکرزاهم څه اوکړه آه له ما نه

بے له سوز له حد رنه له ارمانه — نو رته څه دے دعشق دَ غم سامانه؛

نه به کله یو شاد ابه حقیقت شے ؟ — اے ځما په خیال کښ بند رنګین جهانه

دَ نبالیت وَ نیا تر دَ یلو ی محدود دۀ — نو رم څه زده ستا دَ مینے له پیمانه

نن م دکه صراحی به شو نه دکین ده ! — اے ساقی زړه کړم ویرده پریشانه

دَ مزدُورُ ژوند

چاته رزق ورکوی په خپل کاله کښې — دَچا رزق په پښتنه په جرګه کړی

په دې چه لاړا غلی دے مرد شپه تیره شوه. او نه اوس کورته راستون شوے. زبیده روشانتے رحیم

تپوس وکړو.

رحیم :- څه دی. اروا م څما زړه متو چوی. چه سوچ کوم دا هم لاژوندے. شپه او ورځ تکه دَخو چلیږم.

رومزدوری دَ میاشتے نه پس صرف لس دولس روپۍ راکړی. نکر آخسته یم چه څه اوکړم؟ خو خیال م دا دے

چه داخل دَ سیټهه نه تنخواه واخلم او جرته کور قسمت آزمایئے له ځم.

زبیده :- دَخدای د پاره دَ کور نوم مه آخله. څو بن قسمت کښې چه څه وی دغه به راته رارسی. که په کور

تلو کښې نه دی. په دراو کړه به دَ قسمت نه زیاته به ورله په لاس درنه شی. دخپل کور سکرک دَ کور پلاوُنه

بنه دے.

وے رحیم دَ ښځے خبره په یوغوږ واوریده او په بل ئے اُو ویسته. بن دَ هغه دَ سیټهه د نوکرئ نه دَ استعفے

ورکولو دریمه ورځ وه. سحر وختی ئے جامے بدلے کړے. خادرئے تر ملا کړه. اودَ نژدے سټیشن نه په ګاډی کښې

لاهورته روان شو. دے هغه چا متل کړیدے "هله به خبرشے چه تارو جے له ورشے" تر دَرے هفتو پورے ناکامه

او نامراد دریه در او کړزید. یو سیټهه ورسره دَ نوکرئ وعده اوکړه لیکن په دے شرط چه دَ خپلے نیک چلنې ضمانت

ورکړی. دکلی نه یے څوک وو چه دَ ده ضامن شوے وے. آخر دَ هغه ځایه ئے هم طمع قطع شوه. دولس پاروس

روپۍ کومے چه دکوره راخستے وے. هغه په خلاصیدو وے. څو بړے ورئے پیسے ورسره په جیب کښې پاتے

وے. اوس که ئے کورته والپس کیدل غوښتل. خو دَ ګاډی کرایه چرته وه. رحیم په دے خیالاتو کښې ډوب روان وو. چه

یو جماعت ته راورسیدو. مخ لاس ئے اووینځل. او بدے ئے اوڅکلے. او دَ آرام په نیت جماعت کښې پریوت.

"په کلی کښې م دَ سیټهه نوکرئ پرے ښوده. دوه درے هفتے په مسافرئ کښې تکلیفونه م تیر کړل. اوس که خالی

لاس کورته والپس شم نو ښځه به راته وائی ادخا مخابه راته وائی چه ماخو درته مخکښې وئیلی وو چه دکورنیمه دَ کورد دردهستے

نه بنه وی. خو تا نه منله. یره مرګ راله بنه دے. خو دے هنرو آوریدو ته تیار نه یم" دا خیالات وو چه دَ رحیم په

ماغزو کښې بار بار راتلل.

یوه ورځ زبیده دَ غم او ارمان په دنیا کښې خپلے کوانهی ته اووئیل. خورے نه پوهیږم چه سړے به په څه

حال کښې وي. مانه خوشه غذر د پښې پرېښودې ده. تر او سه پورې خو په هيڅ گذاره و شوه. پرون د ميټه نوکر داته نبل زيرې وا ورولو. چه د شپېږ و سامونه ئې د وېډ ه مسول کړېږي او لا داخلې کړې ئې نه دي. دا لابېل غم ئې راته پر ليښه دے.

دَ رحيم په څخ خوشحالي خانه ي. دَ ښهر نه پنځه ميله لرې يو لوئ محل د خېد وې ود. دَ شپې دَ درې بجو ما د و رحيم دَ خو په رامباد شو. دَ خلورو نورو مسافرانو هم خپلې خونې اننهې کولې. دَ ده دا خيال راغئ چه سحر دې. نو دا پاسيد و. دَ ښهر نه دُ هر ماهرا دې اوښوله. سل تال قدم هيله تللې و چه دَ ورستو نه غلدې غلدې آواز شو. رحيم په خپلو خيالاتو کښې ډوب نور هم تيز شو. ليکن ناڅاپه ورپسې د پوليس سپاهي ودننه په لاس راورسېدل. بدمعاشه! دَ شپې چرته ځې؟ رحيم دَ ځان بېلګناه ثابت کولو کوشش اوکړو چه صاحب! زه مسافر يم دَ ښهر نه لرې چه فلانکے محل جوړېږي دَ مزدورۍ دپاره هلته ځم. ليکن پوليس هغه يو خبره هم وانه وريده. او دَ ځان سره ئې تهانړې ته روان کړو.

رحيم چه تهانړې ته اورسيدو، دلته دَ حوالات نو په کښې بند کړے شو. دَ فوجدارۍ د دفعه ۱۰۹ لاندې پرې مقدمه شروع شوه. دَ چال چلن دَ ثبوت دپاره کاغذات دَ هغه دَ کلي تهانړې ته راوا ستولے شو. ځکه چه دَ ده دَ نيک چلنئ ثبوت هلته پيدا نه شو.

دَ سيټه نو چه پتوس اوکړے شو. هغه خپله بدله پېره سخته واخسته. صفائيان ئې ورکړو چه دَ رحيم چال چلن خراب دي. ځما نوکر وو. دَ سامونه ئې روپئ وصولے کړے او اوتښتيدو. چه کاغذات لاړو او تحقيقات تر پېښ شو نو هغه دَ شپږ و مياشتو سزا ورته واورولو.

دَ خاوند دَ قيد خبر په زبيدې لکه دَ سپين آسمان تند دراپريوت. تر اوسه پورې په ايماندارۍ شپه او ورځ ئې مزدوري کوله. ليکن اوس چه دَ رحيم دَ جېل نه راخلاصيدو نه درے مياشتے پاتے وے. دا غريبه په يو جنجال کښې اخته شوه. په دې ورځو شپو کښې دا دَ يوے بلے جيبي مور شوه. دا ځلو يښت ورځے او دا حالت. دَ رحيم کوانړه چا بيځي به چه پرے زړه او سوزېدو نو څه خوراک به ئې ورله ورکړو. او کنې نو دَ خدائي تر په آسره به پرته وه. آخر تر څو پورې؟ تبه ئې شوه او ورو ورو تبې ئې دَ نرۍ رنځ شکل اختيار کړو.

رحيم دَ قيد راخلاص شو. دَ ډير و تکليفونو نه پس يو ځل بيا کور ته راورسيدو. زبيده په کټ کښې پرته وه. شکلي ئې دَ پېژندګلو نه وتے وو. ده دَ ورسره خپرے کول غوښتل خو هيڅ کښې دَ خبرو توان چرته وو. دَ حالت يو بے بودئ ورته دَ زبيدې دَ مرض قول حال او وئيلو. ځکه دَ بيو نو دَ حکيم صاحب د دکان ته په دو لاړو. او په عاجزۍ ورته حال تير کړو. رحمدل حکيم ته داروو مناسب هدايات ورسره ورکړل.

عزيزه پروتو وه. رحيم دارو په لاس کور ته را ننوتو. دَ مريض وروستنئ سلګئ وے. يو ځل دوه ئې دَ بنيکے

اُووهلو۔ اودَهمیش دپاره دَمرګ په خوب اُوده شوه۔ دَ آسمان په لمن هم تهیک په هغه وخت درحیم دَ ستوری ځری او ښیلی دَ سرو وریږو په شکل کښی اوس هم لیدے شی۔

(عبدالخالق تقانوی دَ تلوسم کال)

سیّد جمال الدّینُ اَفغانی

سید جمال الدین افغانی په سنه ۱۸۳۹ء کښی دَ کونړ په علاقه کښی په اسعد آباد نوم ځای کښی سید صفدر دَ کره پیدا شو۔ امیر دوست محمد خان دَده دَ پلار دَ اثر په وجه دَ هغه جائیداد ضبط کړو۔ دے وخت دَ سید صاحب عمر صرف اته کاله وو۔ لیکن په سنه ۱۸۵۶ء کښی دوئی ته خپل جائیداد بیرته ورکړے شو۔ او هم په دغه کال دَده پلار حق ته ورسید و۔

دَ پلار دَ مرګ نه پس سید صاحب حج ته لاړو او په سنه ۱۸۶۱ء کښی افغانستان ته راستون شو۔ په سنه ۱۸۶۳ء کښی امیر دوست محمد خان هرات فتح کړو۔ لیکن دَ دے فتح نه یو څو ورځے پس مړ شو۔ شیر علی خان دَده جانشین شو۔ او دهٔ سید صاحب خپل درباری مقرر کړو۔ دَ سید صاحب یو وزیر سره چه محمد رفیق نوم وو، اختلاف راغے۔ دے په سنه ۱۸۶۵ء کښی دَ افغانستان نه هندوستان ته راغے۔

دَ محمد افضل دَ مرګ نه پس محمد اعظم دَ افغانستان بادشاه شو۔ دهٔ سید صاحب را او غوښتو۔ او خپل وزیر اعظم ئے مقرر کړو۔ سید صاحب یو نیم کال په دے عهده فائز وو۔ دے په سنه ۱۸۶۹ء کښی بیا دَ حج دَ پاره لاړو۔ او دَ ده خیال ئے افغانستان دَهمیشه دَ پاره پرینبودو۔ دهٔ په خپل وزارت کښی په افغانستان کښی ډاکخانے، سکولونه او هسپتالونه جوړ کړل۔ او په بهرنی ملکونو کښی ئے نمائندګان مقرر کړل۔ او وړومبے سړے وو چه په افغانستان کښی ئے یو اخبار جاری کړو۔ دَ هغے اخبار نوم "شمس النهار" وو۔

سید صاحب مصر ته لاړو۔ او هلته ئے په ازهر کښی دَ تقریرونو یوه سلسله جاری کړه۔ بیا دَ مصریانو تلوسه ورځے پس ترکی ته لاړو۔ او دَ هغه ځای وزیر اعظم سره ملاو شو۔ هغه دے دَ انجمن معارف او انجمن دانش ممبر مقرر کړو۔ دهٔ هلته کښی یو تقریر او کړو چه دَ هغے په وجه دَ ترکی نه اُو ویستے شو۔ او په ۲۲ مارچ سنه ۱۸۷۱ء کښی بیا مصر ته لاړو۔ په دغه ورځو کښی دَ مصر بادشاه اسماعیل پاشا وو۔ دَ سید صاحب دَ پاره دَ وزیر اعظم په سفارش مصری حکومت زر ۱۰۰۰ قروشه (یو مصری سکه ده) دَ میاشتے وظیفه مقرر کړه۔

(پاتے مضمون په ۱۵ مخ اوګورئ)

IN MEMORIAM

We deeply mourn the deaths of

Prof. Muhammad Shafi, our Professor of History for over thirty years;

The Hon'ble Sir Kazi Mir Ahmad, Additional Judicial Commissioner, N.-W.F.P., a distinguished Member of the Council of Management of the Dar-ul-Ulum;

Muhammad Yusuf, a promising student of the College, who met his death at the hands of an assessin while on his way back to the college after the vacation; and

Muhammad Rafiq, a member of the 1st Year (Agr.) Class, who met a tragic death by drowning in the swimming tank.

We offer our sincerest sympathy to the members of the bereaved families.

STOP PRESS

Mr. S. MUHAMMAD TIMUR, who has been officiating as Principal since May, 1945 has been confirmed in his appointment.

Mr. Q. M. FAREED, Professor of History, who has been on medical leave, has left College service.

Mr. MUHAMMAD TUFAIL of the Department of Agriculture has gone to take up an appointment in the Punjab Agriculture Department.

Mr. A. HASHIM, Lecturer in Mathematics has been selected for further studies overseas, and may be leaving us before long. We hope to welcome him back to the Dar-ul-Ulum in 1948.

(iii) He who does not know and does not know that he does not know, is a fool. Do not go near him.

(iv) He who knows and knows that he knows is the wise man. Follow him till the last sand of your life.

DWARKA NATH ANAND,
II Year.

Ism's in Conflict

The world has emerged out of six years of the most disastrous war in history, but Peace has not come yet. Western Imperialism and Russian Communism stand face to face, and Fascism which served as a bulwark between the two exists no longer. With the absence of that steel wall which Nazism had set up, the two extremes are up to anything while settling their accounts. In fact the world we are living in is definitely in the melting pot, and we are passing through a very strange epoch.

What the world needs now is a spirit of compromise and accommodation. Men cannot indefinitely go on fighting wars which once ended, sow the seeds of further disputes and conflicts The war just ended has produced a new awaken-in the East, the ideal of self-determination has spread to the farthest ends of the earth. New nationalisms are rearing their heads everywhere. On top of it all has emerged the Atom bomb. One fine evening writers and statesmen put a temporary full stop to all the topics they were writing or thinking about when they learnt with horror that a new weapon had laid waste the entire city of Hiroshima. A new race for Atomic supremacy thus began.

There will be no end to this unless reason and goodwill assert themselves. Without these the world will be only heading towards destruction.

Atomic energy is reported to have such potentialities that left to itself it can obliterate the entire population of the earth. It is not yet too late. The real race has not yet begun in right earnest. To establish and bolster up their various isms world powers may, it is feared, fall over the precipice *en masse* leaving not even a trace to mark the place where once a wicked race of men existed.

Representatives of different nations are meeting to devise means once for all to avert this impending disaster. The different Isms have, however, taken too deep roots in the human mind to let the policy of forgive and forget flourish.

Let wiser counsels prevail, let men for once realise that they should have as much respect and regard for others as they expect for themselves. Only thus can this mad race for supremacy be stopped.

SAYED CHIRAGH SHAH,
3rd Year.

Fortunately enough our Masterjee, with all his serenity, also could not keep firm in his saddle in the teeth of this rebellious outburst in educational spheres. He could no longer help admitting the importance and encouraging the practice of these pursuits. As a result we find most of the schools and colleges providing for some, if not all of these activities—a step towards the modernization of education.

The results so far obtained fall considerably short of expectations. The reason is not very far to seek. The activities' are not carried out in the true spirit and on desirable democratic lines. Only a selected few monopolize them and no serious effort is made to encourage general participation. Even these heroes and their sponsors value the prize more than the game, quite the reverse of what is desirable. This patronisation of the few is often-times carried to extremes, and favours are showered on these "stars" in the academic spheres. Thus one faculty is developed at a heavy cost of the others. The net result of such an attitude is that most of the students lose interest in these valuable pursuits. Examples are not far to seek, one has just to look about to find groups of young students whiling away their evenings in idle gossip or taking walks like old men. These idle minds provide good workshops for the Devil, who makes the "best" of these. How many out of the whole lot of our graduates or would-be graduates can express themselves either in speech or in writing? How many more can handle a hockey stick or kick a football? Students there are who but for a short story or a poem will not worry themselves about studying literature or even the 'Khyber'. Such is the show put up by the master-pieces of the educational wheel and its cogs.

Hence the present attitude of our educational institutions towards extra-curricular activities needs thorough reorientation. Every effort should be made to encourage mass participation. Better and enthusiastic supervision must be provided in order to ensure the true spirit of games and athletics. Better still, credit should be given for participation in such pursuits, in the matter of promotions.

Other countries are already on the move and have carried out such experiments with remarkable success. We are far behind others and cannot afford to plough a lonely furrow and stick to the weary old rut. We must keep pace with others if we want to be abreast of the times.

M. DIL NAWAZ.

Dream !

Scene: *Day of Judgement. Morning slowly breaks. Ethereal music, proceeding from nowhere, fades into silence as trial begins.*

Bearer: *(Pointing to a youngman in a black, high neck coat)*......And he treated me as if I was his creature.

Thunder.

Voice! Oh!

My sleep was disturbed. I got-up. Karim, the hostel bearer, was knocking at my door. He came in, tea tray in hand, tear in eyes.

KIFAYATULLAH.

A Famous Proverb

Among Arabs there is a famous saying meaning :—

(i) He who knows, and does not know that he knows, is asleep. Wake him up.

(ii) He who does not know and knows that he knows, is ignorant. Teach him.

The Lot of a Science Student

What is this life if full of care,

We have no time to stand and stare.

The Marriculation Examination was over and I was framing in my mind the picture of pleasures and enjoyment of a happy College life about which I had heard so much during my school days. But on joining the College all those pleasant dreams and rosy ideas proved imaginary. I am an F.Sc. (non-medical) student. I come to College at 9 o'clock in the morning and return to my house at 4-30 in the evening. The whole time I pass in stiff dullness confined in the stifling atmosphere of science theatres and laboratories. It seems I am destined to remain buried in books. Intense heat or chilling cold, showering rain or scorching sun, furious storm or calm weather, I have to go on with my usual work in the laboratories. This tedious business of antheredia and archigonia has sucked up my blood. Day in and day out you see me always busy, now working in laboratory, then struggling with problems of Physics, now mugging up the notes of Physics, then pondering over the theories and laws of Chemistry. A pleasant shower follows a furious storm; victory follows defeat but the headache and nausea which follow my whole day's troublesome occupations make my life uneasy.

We hear that College life affords opportunities for cultivating right habits and forming enduring friendships, and that it provides a carefree and enviable life. This may be right. But for whom ? only for the Arts students who have plenty of leisure to refresh their minds. Neither do the irksome problems torture them nor the nasty atmosphere of the laboratories get on their nerves. It is they only perhaps who have a right to sit under the shade of a tree and indulge in random amusement. They enjoy the charm of life. They get ample time to refresh their minds and develop their bodies.

What a contrast do I present when I walk with my friend Azam, an Arts student, who is a stout fellow. He is gaining flesh day by day but I am already ageing in books, and find myself 5lbs. less every week. In this way I wonder how I shall be able to pull through.

PRABHJOT,
1st Year.

Off the Books

The importance and usefulness of what the educationists term as extra curricular activities, and which comprise all the literary, dramatic, athletic and hobby activities, can hardly be over-emphasized. Those interested in the child and his welfare are fully alive to the social, moral and physical values of these " extras." The child is after all receiving due attention from those responsible for his education. With this focussing of the spot-light on the child, the education could take a closer and more comprehensive view of his ward. He could observe and study his subject from different angles and in different shades. The hitherto neglected and probably the more important aspects of the pupil's personality attracted his attention. And the development of the moral, intellectual and physical aspects of the student's personality through participation in the social life of the school, came to be the end of education.

To the worst disappointment of the good-old-teacher the very disciplinary ills, which he hated most, were found to be the best and most suitable means to that end. The poor fellow had not only to spoil the child by sparing the rod, but also to leave him, almost entirely to his own initiative.

The South of the clock-tower echoes in the mornings and evenings, more in mornings. The most frequented shouts are—

" Atan ... tion "

" Ten ay teese "

followed by " class : Dass ... mass."

There are many more personalities but I have no time at present to place them before you. I shall introduce them to you next time. Goodbye for the present, but remember one thing—you may find truth in the clock-tower.

A. SAEED IBRAHIM.

The Red Umbrella

When Butt finished his day's work and closed the accounts, he noticed a red umbrella lying beside a chair. It was six in the evening and he was to close his shop. So he thought that he would carry the umbrella to his house and send out a notification about it the next day. When he reached his house, he found his wife seriously ill. It was drizzling outside and so he carried the same umbrella to the doctor's shop. When he returned, in hurry he took away the doctor's umbrella instead of his own. He realized his mistake when he reached his house. The doctor saw the umbrella and put it on one side of the table

The next moment a seth entered the doctor's shop He came there in a taxi. On his return he forgot his own umberalla and carried away the red one.

The owner of the red umbrella had in the meantime got small posters distributed throughout the city. One of these was thrown into the doctor's shop. It read :

" Dewan Bahadur Chaman Lal lost a red umbrella while he was out for shopping. The umbrella carries a small photo of his deceased son. The finder will be given a reward of Rs. 500/-."

The doctor became happy. He started making castles in air. He thought of buying another shop and ordering new kinds of drugs and medicines. " I shall be very rich in a short time" he thought. " I shall send for new drugs from Calcutta, drugs which no doctor can afford to buy. I shall send for new books on medicine and become the most popular doctor of the city " he thought. " And now I must go to the Dewan Bahadur and return him his umbrella " he said to himself. He looked towards the umbrella—it was not there and a black one was lying at the floor—the doctors' hopes were dashed to the ground.

When alighting from the car, the Seth forgot the umbrella on the seat and the car went away.

The next day when Butt went to his shop, he was given a poster about the same umbrella—but alas, he had lost it. He was very sad.

Some guests had arrived at Dewan Bahadurs' house and he had to see them off at the railway station. He sent for a Taxi and when he got into the back seat of the car, he saw his own umbrella with the photo of his deceased son lying there. The Dewan Bahadur took out a Rs. 500 currency note from one pocket and smilingly put it into the other.

MAQSUD AHSAN
2nd Year.

Five years ago, our subscribers in India preferred a straight service from us. Today they want us to give them everything angled to India. This may be helping India's political struggle, but the preference of the majority of the Indian papers to have angled stuff has definitely lowered the standard of Indian papers. Whereas five years ago a student of politics in India could get a fair picture of what was happening in the world, today all he can get from the papers in this country is a very distorted view; in all probability his impression is that India is the one topic that is being discussed in most countries today. Even in Italy, I noticed the dangers of this narrow national bias in the presentation of the daily news. War reports were turned and twisted in each country to make them give the impression that everything in the battle was done by the men from that very country. Inverted presentation of the progress of the fighting did create bad blood among the united nations. As the late war was largely global, so is peace. The world has to emerge as a family, otherwise the fear of war will still remain. It is a global perspective so vital for the future of mankind that all newspapers and newsmen should now acquire and cultivate. Indian papers are, steadily degenerating into mere propaganda organs. If you have a searching mind, you have to be very clever to find out the truth for yourself, in the bundle of lopsided stories that are dished out to you in your newspapers today.

From the College Clock Tower

Time marches on and history repeats itself. Once again our readers will find the editor sitting up above in the College clock-tower, having a general view of the Dar-ul-ulm and its inhabitants.

From the tower, the inhabitants of this institution appear to be like talking automatons, each with its own distinguishing characteristics. One of these whose voice I could hear more distinctly than anybody else's, was crying at the top of his voice, "I say, you say, say for exaaample......," "as a mat.t.ter of fact." Soon after I heard a very low voice which appeared to be coming from a class-room. This came five minutes after the ringing of the bell, "Attend to your class numbers, please! One, two, three, char, panch, chhay......... tera, chowda; "bas", that's all. "Next came another feeble voice which was in all probability trying again and again to wake the students up from the eternal sleep of un-attentiveness as it said, "Wake up, wake up." After a number of repetitions I could hear the sound of a piece of chalk striking the nose of a victim. This must have drawn tears from the eyes of the victim who is one of the large number of "babies" we have in the junior classes.

Now I take you to a personality whom I could hear as well as see. As I saw him walking, I was for some time doubtful whether he was walking or running. When I heard him I was doubtful whether he was speaking or shouting. There is a rumour afloat in the College that this great personality has been offered a king's commission in the Indian Air Force and there he will act as a speedo-meter—in simple language when the aeroplane is flying at full speed above in the sky he will walk on the ground in the same direction simultaneously in order to gauge the speed of the aeroplane.

Next we have a look at a really great person who knows a lot about definitions of words. One is quoted by way of illustration—"A physician is one who know a lot about *physics*." Now I take you towards a place where you will always hear—"Gentlemen. The Doom's day is near. Be pious and amend thyself. The angels won't come from Heavens for you. Make your surroundings correct and always do Volenteeerly Sacrifiiic." Such voices you hear if you move towards the East. If you move towards the North you are sure to hear, "thin the potential in thit case is viry viry high." This is the characteristic of North-East. North-West brings you sounds like, "We have done away with chlorine, then we come to Gentlemen."

I mixed with the troops quite freely and sitting around a fire I have heard them relate many a droll story about themselves. Near a village the people saw some Indians every morning cut little sticks of wood and then bite on them. The use of such sticks as tooth brushes was unknown to the Italians, who thought that the Indians were dying of starvation or reverting to jungle life. The owner of an orchard pointed to his ripe pears and invited the Indians to help themselves. In one village an Italian took pity on the Sikhs and offered a packet of blades. He thought a shave was what they were looking for.

And thus I moved from sector to sector on the Italian front and also stayed with troops of other nationalities. This was an invaluable experience and it helped widen one's outlook. When winter came again and there was lull in the fighting, my superiors took me out of the front and sent me to London to work at Reuters Head Office for sometime.

London in December 1944 and January 1945 was not a healthy place in view of the German attacks with V_1 and V_2 i. e., the Flying bomb and the Rocket. In some respects, it was more dangerous to be in London than to work at a war front. But I was happy that I was going to Fleet Street, the home of British journalism, not merely as an observer, but as a man of the profession.

It was in December 1944 that I left Rome and flew across France to the South coast of England and took a train to London. It was again a frontline life, but of a different character. Living under constant fear, their nerves strained, the people of London carried on, and when I joined them, I had to do the same. In my office, I was transferred to the Editorial side, and began tinkering with stories sent in by other correspondents. Only once did I leave London on duty, and that was in March 1945, when I went in a stirling Bomber, towing a glider to the dropping zone behind the German lines across the Rhine, in support of Field Marshal Montgomery's final blow against the Germans. I do not propose to dwell on this at length because, I find that an extract from a letter that I wrote to my brother, has already been published in the College Magazine. It was one of the greatest sights of the late war, and more than 5,600 planes took part in the show. Hitler was on that day delivered a blow ten times more grievous than his biggest effort against England during the war.

You will be interested to know how Reuter organisation ran in London, during the war. The workers in London had narrow escapes innumerable. The Reuter building in Fleet Street survived the long bombardment by a miracle. Many times the German radio announced the total destruction of the Reuter bureau.

In order to ensure that its world news service stayed on the air for reception by Reuters receiving stations all over the world, we had elaborate arrangements to cover all eventualities, even the possibility of all radio stations in Britian going out of action. In that case transmission was to be carried on from a number of selected stations overseas and trial transmission and reception tests were actually carried out from points in the Middle East, the Far East and America.

News pours into Reuters office in London by radio, cable and telephone, all hours of the day and night. It comes from all parts of the globe. In London it is sifted and edited and is then put over radio transmitters beamed to various countries. A lot of cutting and trimming has to be done in London. For instance, our biggest subscriber wants us to give him only 20,000 words of foreign news daily. In London, we have about 75,000 words of good publishable stories every day. This will show you how much material is thrown away without your ever having a chance of seeing it in print.

had was on July 30, 1944, when I took a BBC war correspondent and Mr. Eric Linklater, the novelist, in my jeep to the front and accidently came upon the chateau of a dead English noble, Sir George Sitwell, in the Pesa river valley, six miles south of the famous Tuscan city of Florence. Five enemy tanks were reported a thousand yards away as we entered the massive countryhouse. But we soon forgot all about them, for in front of us were the world famous masterpieces of art, such as Botticelli's Primavera and Giotto's Madonna, lying most casually in a room. Lovers of art would spend fortunes to live that dramatic moment and see those priceless art treasures present a pitiable picture of war's worst side.

Before the Indians came, people in Italy, especially in the villages, believed that they were cannibals. Doors were barred in their face. Children shrieked with fright on the mere sight of a Sikh. The false belief was soon exposed, except in the enemy ranks. Germans went on believing that Indians kill all enemy captured. They had particular fear of the kukri-wielding Gurkhas. One German, who was later captured, had a note in his diary saying : "I am very worried about sentry duty here, because there are Indian troops opposite us. One must keep alert and watchful the whole time, because they creep upon us slying and unobstrusively, their knives between their teeth and kill us unawares."

That Indians did worry the Germans, there can be no doubt. The enemy always referred to them as "shock troops" and such they were. But it was not a one-sided story. Italy, the stronghold of nature and art, was also the stronghold of some of the crack German troops. Fighting against these and the other foes, the weather and the terrain, was the main task of the Indian soldier. On mountains such as men dream of in good dreams or see in the works of painters, the Indian soldier dodged death and danger in hastily improvised trenches, in the folds of the rocks or behind stones piled loose like sangars here on the North West frontier.

The soldiers for their part had many thrilling adventures. Some got into situations where death seemed relaxation and wound a luxury. Others became part of the Italian earth. Many were mangled, lamed or disfigured, with the colour and taste of life taken from them. On the far bank of rivers, on wooded precipices, in narrow gorges, around village and town cellars, they had to strike down the Germans. They went through the snows they never liked, and slept in the mud in pouring rain, but struck at the enemy with amazing freshness the next morning and inflicted more losses on the Germans than they themselves suffered.

In spite of the obvious hardships of the campaign, I am one of those who regard that the despatch of Indian troops to Italy has been helpful in obtaining a world wide appreciation of India's cause. In Italy, the Indians got a chance of meeting the whole world. "Johnny" was the usual term of endearment used for the Indian soldier by Britons, Americans, Canadians, South Africans, French, Poles, North African Arabs, New Zealanders, Greeks, Yugoslavs, Italians and many other nationalities that formed the united nations armies there. The Indian soldier in Italy knew the meaning of friendship, understanding and sympathy and equally well he knew how to express his hatred and enmity. His valour in the field and his soldierly discipline and smartness in camp were admired by all other united nations.

No other Indian has been lionised more than sepoy Kamal Ram, war's youngest and India's first Victoria Cross winner in Italy. He was resting in a Reinforcement Camp, 600 miles behind the battle line, when rumour went round that he was to receive the highest gallantry award. Curious Americans dashed in jeeps scores of miles to have a look at the kid. He was not a Goe Louis. He did not know even how he smashed three German strong points singlehanded. He admitted he had never seen an enemy die of a bullet before. Everyone thought all the more highly of the 19 year old Sepoy.

My journey from India to Italy in an aeroplane was itself a thing to remember, but as it was December 1943 the weather made me think ? The 'plane sped northwestward and I woundered if I were in reality going to the "Garden of the World", as Byron would describe Italy. Was I going to the land of the smiling sun and the green countryside and charming half-drowsy people, rolling in the wealth of all the best gifts of nature and art ? Or might I believe in the reports filed by my European and American future colleagues, painting an altogether different picture of Italy. They said Italy was a cold hell, and even personified Weather into General Winter, a more menacing character than the German commander, Field Marshal Albert Von Kesselring.

On landing at Bari on the East coast of Italy where the Allied commander-in-chief, General (now Field Marshal) Alexander had his headquarters, I found that as regards weather in Italy, the reports of my colleagues were correct. Indian troops, whose activities I was to report, I argued, would be out of their element in such atrocious climate. But their actual performance belied all theories. I went forward to the front to live with the men of the 8th Indian division and when I joined them, their sector was covered with heavy snows. One of the worst blizzards had just swept over. To may amazement I found the Indian troops still as cheerful as ever. They even had their daily baths, with water obtained by filling a tin with snow and heating it over petrol. Eight months later, while going over the troops medical attendance figures, I discovered that Indian troops in Italy had had the lowest sickness rate among all the allied troops fighting on that front.

India's share in the Italian campaign increased with each passing month. The fighting fourth, India's most famous division, was there before the end of 1943. The 10th came along in the following March. Large numbers of ancillary units came in constant stream, until the whole Indian army buildup in Italy far exceeded the normal strength of an army corps and was the largest force ever brought to Europe to crush the enemies of the British Empire.

All the allied generals recognised the prowess of the Indian soldier and consequently employed the Indian divisions to crack all the hardest nuts. I found I could live with the Indian divisions and still be in the hottest part of the front, as a correspondent would like to be. Early in the morning I would visit the divisional headquarters, usually five to ten miles behind the front and there obtain a rough picture of the progress of the previous night s fighting. Then I would drive right upto the front to the most news-worthy spot and meet the very people who had been through the worst of the battle a few hours before. Most of the fighting on that front took place during the night ; the days were usually quiet, though shelling and bombing went on all round the clock. Thus it was comparatively safe to move about in day time. Casualty rateamong the press correspondents has for that very reason been very low. On return to my camp in the evening I would write my story and despatch it over the army signals to the nearest cable-head, where it was censored by military censors, before going to London and other parts of the world.

My stay in Italy was packed with thrills—and among them was the thrill of exploring the unknown or of victoriously entering a city like the flower-bedecked Rome on June 5, 1944 or dodging sniper's bullets in Florence on August 4. I had the honour of being invited on Id day in Rome to the house of ex-King Amanullah of Afghanistan. Later on the 8th army front, His Majesty King George VI gave an audience to British and Dominion correspondents and I was among those who were introduced to His Majesty. Back in Rome, I had my other desire fulfilled, of seeing Mr. Winston Churchill, then Prime Minister, and putting questions to him regarding India. I travelled with Mr. Leopold Amery, former Secretary of State for India and met a number of Indian princes, including the Maharaja of Kashmir and the Nawab of Bahawalpur, who came to see the Indian troops in Italy. But the greatest thrill I

of him. We hope others will follow in his footsteps and make journalism their profession. The nation and the country need many efficient and honest journalists.)

For the student, college life is a period crowded with great opportunities, a period in which preparations are made for the battle of life. When I look back to the days I spent here, in these class rooms and playing fields, I always repent why I did not exert myself to the maximum and get the utmost benefit out of all the opportunities before me. There is no doubt, our college is a great institution. The corporate existence and close relations between the students and the teachers give this college a distinction among the educational institutions in India. I have been to Oxford and Cambridge and to many other universities in Europe and I have found that the architects of our Alma Mater have striven to follow closely the pattern of those great universities. Materially, Islamia College does not lack much of what those universities have. What we do seem to lack is a sort of condition, a peculiar atmosphere or, shall I say, an attitude of mind on the part of the students, that compels them to keep alive their old time traditions and to seek knowledge in the true spirit of an explorer adventuring into unknown realms. The students in those universities will do everything, not only to preserve and maintain their traditions, but to contribute to them, if possible, something that will go to make a more progressive posterity.

Though I regret I did not make the most of my life at this College, yet, I have the satisfaction of exploiting at least one of the opportunities before me. I first felt the urge to become a journalist when I was a student of 3rd year. For full two years I had listened to Union debates and had attended sports and other functions in the college, but not once did I see any mention of these activities in the English language newspapers that come here from Lahore. One day a provincial celebrity was on visit to the college and with pen and paper in hand I took down notes and sent a brief summary of the day's speeches to one or two newspapers. This was published and that is how my career as a journalist began. This kind of reporting, which was incidentally beneficial to the college, lasted through all the remaining four years of my life here. It brought me a handsome pocket money, and that was quite a great prize in itself, for, who among college students does not like to see his pockets bulge? Whenever my contributions were published I felt a little elated, but when the editors threw them into the waste-paper basket, I refused to be discouraged.

Thus on leaving College after my MA, I was already almost half-trained for my career. The college magazine, which I edited for three years, was another excellent training ground for the kind of work that I was to take up later on. Passing out of the College, I secured an appointment with Reuters Indian branch, the Associated Press of India, and I joined this news-agency in Bombay a few months before the outbreak of the late war. I am still with Reuters, but now I am one of its foreign editors in London with authority and control over the circulation of news throughout the world. No Indian has held that position before and in any statement of my progress from Peshawar to London I will be failing in my duty. if I do not pay a tribute to this College and to the learned teachers, whom I owe so much both directly and indirectly.

Soon after the beginning of the war, I was transferred to Peshawar, where for three years, I acted as a Correspondent for the Associated Press of India. Then I was shifted to Delhi where may field of news reporting extended from the Assembly and the Federal Court to the communiques on the Burma front. It was while I was in Delhi that I was selected by my organisation for a job abroad. The Military were asked to accredit me and I was appointed the first Indian war correspondent overseas assigned to the Italian threatre of war. It is of my experiences from then onwards that I will like to talk to you today.

judge and Anwar as the Counsel for defence. Anwar pleaded in vain. The wise judge sentenced the mouse to death. The orders were carried out by Abdul Rahman who, being a medical student, was an expert executioner. So, another thief was accounted for in this way.

Now we were vigilant. During the X-mas holidays my younger brother came to see me. I ordered milk for two. The bearer brought it in a "gudvi" and placed it on the table. As I was preparing to go to bed, I heard the noise of the 'gudvi' falling on the ground. I got up, switched on the light and found a cat, with its head caught in the gudvi, running about in the room, I was over-joyed to catch the thief red-handed. My room-mates also woke up. We took pity on the poor cat. removed the gudvi and let it go.

MIRZA MOHD. ALI.

3rd Year.

DON'T BE SELF-CONSCIOUS.

Many people are seriously handicapped in life by undue self-corciousness. People so afflicted are generally at their ease and well-poised when they are in familiar surrounding and in the midst of their close friends and associates, but become paralysed when thrown among strangers. They can never think of the right thing to say, are at a loss what to do, and are constantly aware that they are looking awkward and ridiculous.

I know of a friend who is hag-ridden by a large measure of self-consciousness. He always has a nightmare that he is looking ridiculous and consequently is ridiculous He fears the company of those whom he does not know well, as children fear going into the dark. Another victim of self-consciousness whom I knew once came out with a new pair of trousers on. He was burning with a desire to wear them. But as soon as he stepped out in them, he was siezed with a fancy that he was the focus of innumerable mocking eyes. He looked right and left and wished that he had not been seen in his new sartorial outfit. He blushed, stammered and stumbled as if he was stalking abroad in an entirety of nakedness. At last he could not stand this self-imposed torture and rushed back home to get rid of that reminder of his follies.

People suffering from this morbidity are seldom a success in life. Their fear in the presence of strangers is generated usually from a feeling of inferiority and is more often than not without foundation. If one had a seeing eye and could look deeper than the faces, the persons one recoils from will probably be found suffering from a similar feeling of self-consciousness. The only remedy lies in taking the bull by the horns, facing every situation boldly and squarely, having a well-poised and confident mind and assuming that you are inferior to none. If you can do this, your troubles will be over, for you will be able to act as freely and naturally as you do when you are with your friends. And, besides, by doing this, you will put those you meet at their ease.

AKHTAR ALI,

4th Year.

FROM "THE KHYBER" TO REUTERS.

(We have great pleasure in presenting to our readers some extracts from a speech recently delivered at the College by Mr. A. K. Kureishy. He is a distinguishsd 'Old boy' of the Dar-ul-ulum and an enterprising journalist. He was the first Indian to be selected by Reuters as their war correspondent on the Italian front, and is the only Indian to be raised to the Editorial desk at the London headquarters of the largest news agency of the world. He started his journalistic career on the Editorial Board of the "Khyber" and we are proud

members; and I propose with your support to intensify our efforts in this direction. Debates will be held regularly on subjects of topical interest. Renowned speakers will be invited to take part in these debates or to speak to the members on important topics of the day. This will not only place before our budding orators models of public speaking but will provide us all with opportunities of benefitting from the views and opinions of great leaders of thought in the country. Endeavours will be made to discover and develop hidden talent, and new-comers will be encouraged to come to the stage and take part in debates and competitions. Apart from open competitions for senior students, separate prize debates will be held exclusively for junior members in order to enable them to overcome stage-shyness and inferiority complex. I hope to receive whole-hearted co-operation from you in my efforts to raise the standard of public speaking among our members, and to inculcate in their minds by example as well as by precept the value of proper expression of their thoughts and of toleration of the views of others.

Khyber Union is the premier student organisation of the Darul-ulum and should, as such, command the respect and love of all of us. It should be a symbol of light and learning, and an embodiment of the hopes and aspirations of the youth of the Frontier. Its members should have a wide outlook and be able to form their own opinions on all important subjects. In this connection I would like to see much greater use being made of the Union library than has been the case hitherto. I propose to re-organise it and add more books to it.

Youngmen sometimes have wild dreams and as I stand before you I am envisaging in the near future a free and independent India, a completely autonomous border-land and a great university at the foot of the Khyber. I visualize the sons and daughters of that University going out into the world with a distinct mark of culture and with a definite message of uplift, reform and progress. Let us all work together to bring that dream to fruition.

MUKHTAR AHMAD.

HOSTEL THIEVES

I live in the capital of the College otherwise known as Butler Hostel. Within the first month of my stay, I began to find things disappearing mysteriously from my room—cotton from my pillow, sugar from my sugar-pot and milk from my milk-jug. Inspite of my best investigations I failed to get a clue of the thief. I brought these thefts to the notice of the hostel superintendent, but he brushed them aside with a shrug of his shoulders.

On an 'Id' day, I left the sugar-pot full of sugar on the table, locked the door and went out. On my return I found the sugar-pot minus all the sugar. The door was locked, so no body could have got in. After all who had taken the sugar? I made up my mind to detect the thief. During these days my pillow was also becoming thinner.

One morning I got up early and found a team of about half a dozen sparrows, engaged in transporting sugar to their nests. So I had after all detected the thief.

At about midnight on the 10th of December, I was awakened by a sound resembling a knock at the door. I got up, opened the door and found a dog rubbing his nose against the door. I drove him away, and returned to bed without switching the light off. I could not sleep a wink after that. The college clock struck two and I peeped out of my quilt to look at my time-piece. To my amazement, I found cotton running across the floor. Lacking the courage to get up, I hurled a book at it, and was surprised to see a small mouse run out of it. I closed the door tightly and awakened my room-mates. With their assistance we caught it alive. A Court Martial was held with Aziz as the

"The life of Prophet Ibrahim," by Mr. Pir Bakhsh Khan, Public Prosecutor and a very learned talk on "Islam" was given by Maulana Amin-ul-Hassan.

Maulana Nur-ul-Hassan, the College Dean and Mr. Qamar Ali Shah are the President and the Secretary respectively.

THE DAY SCHOLARS' ASSOCIATION.

Prem Nath Khera, Alamzeb Arbab and Khairullah Arbab were elected Vice-President, Secretary and Assistant Secretary respectively last October. The Day-Scholars have been provided with a furnished common room, a retiring room and a reading room in the Khyber Union Hall. Its members are making a good use of indoor games provided for them. Some of them are good sportsmen and take part in all the major games of the College.

J. D.

Union President's Inaugural Address

delivered at the Installation Cernmny on 14th October 1945,

I am deeply grateful to you, for the great honour you have done me by electing me as your president. You have elevated me to the highest position to which a student of the Darul-ulum may aspire; and I hope and pray that I may come up to your expectations and prove worthy of the trust you have reposed in me. For my part I can assure you that I shall do my best, but it will not be possible for me to discharge the heavy responsibilities of my office successfully and to maintain the noble traditions of the Khyber-Union unless you also do your part. So I shall look up to you for full co-operation, and I hope I shall not be disappointed.

A good beginning has been made. Elections have been fought and won or lost in the best of spirits, no untoward incident has occurred, and nothing unpleasant has happened. Everything has passed off smoothly, with proper restraint, and dignity. We were in rival groups till yesterday. Today we are all one. Let us remain united thoughout the year, and work together for the honour and good name of the great institution to which we have the privilege to belong.

The world is passing through a critical period of its history. Mankind has had to take a plunge twice into terrible bloodbaths during the space of a single generation. No wonder it is fed up with this wholesale destruction of life and property, and is working feverishly to build up a permanent and lasting peace. How far the invention of atomic bombs and other engines of destruction and man's love of power will permit the setting up of any really effective machinery for the maintenance of universal peace remains to be seen. But a war-weary world is busy making out plans for post-war reconstruction of national resources and systems, and like other countries, India is also out to secure a durable peace, raise the self-respect and living standards of her sons and daughters and win an honourable place among the nations of the world. It falls to the lot of the youth of today to make a worthy contribution towards the realization of this great ideal. Our motherland stands in need of scores and hundreds of first-rate scholars, scientists, industrialists, statesmen and organisers. The Darul-ulum has been sending out an unending stream of zealous youngmen to fill the ranks; but much more remains to be done With the establishment of the Khyber University which is, I am glad to say, already in the offing, our *almamater* will make a still larger contribution towards the regeneration and development of the Frontier; and the Khyber Union, as an integral part of the institution, will certainly do its bit.

India is on the threshold of great constitutional changes and the art of public speaking has always played a very important part in the running of a democratic state. Our Union devotes its attention to the cultivation of that art among its

THE FRONTIER SCIENTIFIC SOCIETY.

President	... Mr. Mohammad Salim.
Treasurer	... Mr. Mohammad Ashraf.
Secretary	... Mr. Mohammad Yaqub.

The Society has been holding its meetings at regular intervals when lectures on scientific subjects were delivered and discussions held. More important of these lectures were the following: "Nature of Light," by Prof. Minhaj-ud-Din ; "Vitamins," by Prof. Mohammad Fazil ; "X" Rays and their uses," by Prof. Abdul Wahid ; "Soil-less gardening, by Prof. Mohammad Salim. The hobby section of the Society has been equally active. Photography and silk worm rearing have been popular as usual.

THE SARHAD MATHEMATICAL SOCIETY.

President	... Prof. H. M. Osman.
Secretary	... Nazar Mohammad.
Assistant Secretary	... Sher Mohammad.
Auditor	... Abdul Wahid.

This Society provides the students of Mathematics with free books. Due to increase in the number of students books worth nine hundred rupees were purchased this year for the Society's library. Lectures were delivered from time to time in the meetings of the Society. Prof. M. Hashim's lecture on "Why should Mathematics be taught " was very much appreciated.

THE ECONOMICS SOCIETY.

Mr. M. I. Sethi, Ghulam Samdani and Sher Ali Beg are the three wise men of the Society. The Society has done some really useful work in the study of economic problems of the Province. The excursions to the Takht Bai Sugar Mills, Central Co-operative Bank, Mardan, and Meat Dehyderation Factory, Nowshera, and the study of Marketing of Agricultural Produce at Charsadda, and the living conditions of the railway men at Peshawar Railway Station were the special features of its activities during the term. Lectures by Prof. S. M. Jaffar on Tax system in Mediaeval India, and Mr. Mohammad Amin of Aligarh University on "the Influence of Environment on human activity " were appreciated very much as interesting and instructive.

THE SARHAD AGRICULTURE SOCIETY.

In the hands of Prof. Mian Mushtaq Ahmad, Abdul Malik, and Khan Bahadur the Society is rendering useful service to the Agriculture students of the College. Lectures were delivered on " D. D. T. the wonder insecticide " by Prof. M Mushtaq Ahmad, " The Degeneration of Improved Seeds " by Mr. Mohammad Suleman, Economic Botonist to the N.W.F.P. Government and on " Milk and its Products " by Prof. M. Sarwar.

MAJLIS-I-ISLAMIYAT.

The Society for religious and moral upliftment of the students and for bringing them into contact with well-known religious scholars. The outstanding feature of the Majlis in the past years has been its annual speaking prize-competition on some important religious subject, open to all High Schools in the Province. This competition, however, could not be held this year. A lecture was delivered on

the debate was that for the first time since the institution of this competition a team of girl students from Municipal Girls High School, Bannu, participated and won the trophy and the 1st prize.

Sir Sahibzada Abdul Qayum memorial All-India College debate on the proposition that "Democracy is not suited to the genuis of India." Eight teams from various colleges and universities competed. The debate was a great success and a high standard of speaking was reached. The team representing the Muslim University Aligarh won the trophy and Mirza Naseen Anwer Beg of Government College, Lahore got the first prize.

The inaugural address of the President is printed elsewhere in this issue.

THE ORIENTAL SOCIETY.

President	... Prof. A. R. Niazi.
Secretary	... Mohammad Jaffar.

This society is reported to have held three *mushairas* during the term and two prize debates, one Urdu and the other Pushto.

KHYBER ATHENAEUM.

Prof. M. M. Kalim	... President.
Mrs. E. J. G. Latimer	... President, Arts Section.
Habibullah Khan, B.A.	... Vice-President.
Ali Gohar	... Secretary.
Azam Jan	... Assistant Secretary.

The Society has been doing useful work in creating and developing a taste for fine arts and literature among the students by holding talks and discussion on literary and artistic subjects, some of which are given below :—

William Penn, by Rev. Jardine.

Reading and Self-Culture, Prof. H. Harris.

Artist and the Common Man, Mr. Altaf Gauhar.

A trip to Sikim and Tibet, Major Gibson.

Western Music, Major John Furnis.

A Provincial Arts and Crafts exhibition was arranged by the Society in the last week of March in the Khyber Union Hall and the Victoria Memorial Hall Peshawar. Exhibits of different arts and crafts of the Province, besides articles of historical interest, like old and precious coins, collections of stamps and a vast range of embroidery were displayed.

In the arts section a large number of paintings, drawings and photographs were exhibited.

THE SARHAD EDUCATION SOCIETY

Prof. Anis-ud-Din Ansari, Mr. Khushal Khan Jadun, Prof. Mohammad Sadiq and Mr. C B. Taneja are the President, Vice-President, Treasurer and Secretary respectively.

The Society's activities in the field of education have been various and many. More important are a talk on heredity by Prof. Mian Mushtaq Ahmad and a speech on Mr. Gandhi's Principles of Basic education by the Principal.

College Societies

The editor, whose lot it is to review the activities of the College Societies, has a pretty stiff job of a business to do. He has not only to edit the reports of the various societies, but in some cases, like the antiquarian, he has to dig up information about societies which once existed, but are now for the most part stubbornly inactive and exist only in name. With the advent of spring, however, and under the shadow of the approaching examinations, all the societies start a hectic round of activities and functions, some of course legitimately to round off a busy term, but others to justify their existence only and claim a mention in the pages of the Khyber.

We have before us a large number of reports, a majority of which show a commendable record of useful work done during the term, but there are some reports, for which none is any the wiser. It appears that such societies conduct their business *in camera* and are extremely reticent in their reports. In other cases, happily they are very few,—the reports are no more than epitaphs.

Eschewing all judgment, however, we give here some facts and figures about the more important of these :—

THE KHYBER UNION

The elections to the Khyber Union came off in October last. The entire student population of this colony was divided up into two rival camps. Great enthusiasm was shown. All the tactics and strategems of politicians were employed to woo the voters. A spirit of healthy rivalry prevailed all round, among the candidates and the election was won and lost in the friendliest spirit.

The following were elected to the cabinet :—

Mukhtar Ahmad Khalil	... President.
Abdur Rahman " Kaif "	... Vice-President.
Mohammad Ayyub Awan	... Secretary.
Abdul Halim	... Assistant Secretary.
Syed Jamal Shah	... Librarian.
Salah-ud-Din Khurshid A. Beg Abdur Rauf Altaf Ahmad	} Members.

Besides the usual weekly debates speaking competitions were held during the session on the following subjects :—

Senior Prize debate on " Politicians should be replaced by scientists, philosophers and thinkers. Q. Abdul Aziz and Dil Nawaz won the 1st and 2nd place respectively.

Juniors Prize debate on "Hitler was justified in waging war against the Allies." Fazlur Rahman and Khurshid Anwer Beg won the 1st and 2nd prize respectively.

First Year's Prize debate on " Science has done more harm than good to humanity Hafeez Ibrahim and Khursheed Anwer Beg won the 1st and 2nd places respectively."

The New Comers' Prize debate, on " India cannot get her Independence through non-violence." Fazlur Rahman and Q. Aziz were judged the 1st and 2nd best speakers respectively.

K. B. Haji Saadullah Khan's Provincial High Schools speaking competition on " There should be co-education in the Lower Middle Schools in this Province." Over a dozen teams from all over the Province competed. A special feature of

quick victory. The absence of winter equipment confirms this beyond doubt, even if we ignore the inevitable predispositions in the minds of the German General Staff in favour of quick returns and their unbounded confidence in the Wehrmacht's capacity to achieve them. The Germans firmly believed that space could be beaten by speed. Napoleon? Bah! He could only crawl. The winter was bound to catch him. But petrol and wagons were seven league boots reducting miles to yards. "We will" said the generals "cut into the unwieldy Russian masses with fire and steel, and chop them to pieces in a few months." And great converging thrusts were indeed driven in and closed, and vast masses of men and material were destroyed or captured. Yet behind and still farther behind there were more and more Russian men and materials and the great Bear refused to yeild. "Bloody but unbowed." Russia retired into her vast spaces, growling and defiant. She could not be brought to bay. Winter swept down from the frozen North. With that winter came the first grave crisis for German arms. Timoshenko turned on his pursuers outside Moscow as the first snows fell As did Varashilove in the greater cold around Leningrad.

"We should retire to the west and regroup" the General staff is reported to have pleaded. "The German Army never retires" said Hitler. A great Army was almost frozen to death. The German Army weakened. The Russians laughed secretly and waited until the foe was caught down severely by winter and worn out by the desperate Stalingrad defence. Then they lashed out at POULUS'S discomfitted the sixth Army and destroyed it, and there was nothing for the German Army to do but to scurry out of the Caucassus and hurry back with the mere shaft of the spear the spoint of which was lost in the ruined, city that had so stoutly resisted its thrusts. That was the end of the Eastward moving campaign. Hitler was finally baulked in Russia. Blunders seem to be accumulative. In November of that year as the German Army marched blindly into the Stalingrad trap a new development occurred elsewhere. An Anglo-American Army landed in Northwest Africa to threaten Rommel's rear as he recoiled from Montgomery's blows at El Alamein and to open a way to the under belly of the Axis which proved in the event less soft than expected. This new Allied initiative was a brilliant conception. It was the essential first step in a move against Germany's Italian partner. There was only one pissible flaw in it. It was open to a master countermove.

The same number of troops used to occupy unoccupied France if it would have been posted at Gibraltar it would have been a complete checkmate. Remember too, that Franco was in command of Spain, not by right of his own might but because Hitler and Mussolini had given him the troops and arms that turned the Civil war in his favour. Spain was Pro—Axis, there was need to fight a way across it. The road to the Straits of Gibraltar was open. The failure to take that road is one of the great mysteries of the war. Below these major errors there were many others of a smaller nature.

But over and above all these considerations, Germany was ultimately destroyed because she was brought face to face with an overwhelming deployment of power. She had planned to fight the world in a succession of campaigns in a series of separate bites. She started to swallow the nations one by one. But Russia was too big to be eaten quickly and as she chewed at the indigestible mass, Britain and America armed and trained at last fell on her rear. She who was determited to fight on one front at a time had to fight on three fronts at the same time. And this at a juncture when her manpower had been seriously weakened, her industries disrupted by air attack and her Luftwaffe eclipsed.

Defeat was inevitable when the maritime powers forced the Atlantic wall. But her own blunders were far from unimportant in the factors that sealed her final doom

S. ABDUL JALIL JAN,
III Year.

And he got up. There was no music in his steps, no whistling, no singing, no staring at his dress by envious people. With his head bent low, and a few drops of sweat on his fore-head, staggering and stopping, stopping and staggering, he moved forward and before long reached his dwelling. The whole night he kept rolling in his bed.

The next day his feet did not take him to the cold cement bench, but to a hot iron-sheet furnace that got its coal perhaps from Russia. He joined the Communist Party. The boat found the crew and the tossing became controlled. But did he know his aim?

(Sd.) VISHWA NATH KAKAR,
V year.

WHY GERMANY LOST

How did Germany lose the war? How and why did the great Wehrmacht after startling the world in its opening series of impressive victories fail ultimately in its mighty attempt at world mastery?

The first great error of judgement on the conduct of war was made by German leadership when at the crisis or turning point after the fall of France, Fate posed a vital question and demanded from Germany an irrevocable decision. At that stage the German Empire was inspired by an unbounded selfconfidence based on its victorious course in three swift campaigns. Poland, Denmark, and Norway, the Low countries and France had been conquered in swift succession. The German Empire was invincible. Anything seemed within its reach should it but stretch its hand.

The question was now " do we go further west across the water gap to Britain or east against the Russians"? This was no question for mere generals, only Hitler himself and his advisors were competent to answer it Hitler reasoned thus " I have the power to conquer Britain. She is now practically disarmed. Her Navy dare not operate within range of my Luftwaffe which is supreme where-ever it reaches. True, I have lost many bombers in trying to teach them a smart lesson, but even this has seriously depleted their last reserves. Under cover of my coastal guns and my air power, and with the flanks of the Channel crossing held by fast Mosquito craft and submarines I can force a landing. If once I get ashore there will be nothing except underamed levies to bar my way. But that is not my line, I never wish to smash them. And with no allies on the Continent they are now powerless for mischief. In the East however there is an enemy who is rapidly becoming more powerful. He will strike dangerously when he is ready and if I allow him the time. Against that enemy Britain and I have common aims. I will strike down Russia and while doing so make approaches to Britain. Tell Britannia to get ready for Russia." This is not an unreasonable transcript of Hitler's thought. Nor is it a seriously exaggerated estimate of the position as it presented itself to him at that time. Britain in any cold military analysis of the position in the autumn of 1940 was a practical proposition for German arms. But the estimate was wrong. Firstly, in the underlying assumptions that Britain without Continental allies would not have the will to stage a recovery; secondly, in the calculation that America was too far away, and would never face the military prospect of intervention or run the commercial risk of rearming Britain.

But Hitler's major error, his truly gigantic blunder. was in the estimate that Russia could be vanquished in a quick campaign. This was either due to an inexcusable failure of the German Intelligence Service or to a vainglarious over-estimate of German Power. But there were other errors to follow, and these robbed Germany finally of her chance of victory. The first of these has been, with what truth we are unable to say, at Hitler's feet. The plan of campaign in Russia postulated a

The chill of that cement bench on that cold winter night failed to cool down his imagination. He entered the dream-land and found him—self on one of the many roads before him. With hands in his pockets, the collar of his short coat turned up, he walked on the road slowly, when lo! a car came from behind and he was run over! The next moment be opened his eyes in a richly decorated drawing room, with his head resting in the comforting lap of a young girl on whom nature had bestowed all that was called beautiful. They looked into each other's eyes. She nursed his wounds. He recovered They made love. And just then he thought that it could not happen but on the screen—retraced his steps and took another road.

He was selected for foreign studies. Three years at Oxford—the very thought made the road smooth and pleasant, and slowly he stepped forward. He reached England. He was brilliant. He passed his examination, came back to India and was appointed a lecturer at a College, a nice life! But was it nice? Was he a lecturer? Could he be one? He paused, thought, smiled and found himself on yet another road.

Attired in a dinner-suit with the latest-designed summer-shoes on, a 999 cigarette between the two long fingers of his left hand and a delicate cane in his right, whistling and puffing, he marched on in a gay princely mood. There was music in his steps. Passers-by looked at his dress admiringly. He stopped and entered the Paradise Restaurant. A warm reception by the manager and four other gay birds; wine, woman and cards; colour, round, first, second, third, three aces and all that—he found his pockets full. The same majestic steps took him back to the road. A song came to his lips......and then the thought dawned that he had always lost in gambling! An un-suitable road! quit it! And he was yet on another road!

A literary genius! A story writer! The road had an atmosphere of romance—orchards and flowers on one side, a canal on the other, white and gray clouds above, sailing on a blue sky towards mountain-tops clad with white snow! He walked and never knew that he walked. Perhaps he flew. A plot came to him...............

The Lala gets a son; invites all his friends; friends ask for Potato chops; Lala himself kneads the potatos, prepares chops and just when the friends begin to eat, Lala finds his ring missing. The ring is precious; Lala becomes suspicious and perturbed; the Police is called in; a case is registered and the friends go back with angry faces. Then his wife persuades the Lala to take his meals, and in a potato-chop the Lala finds the ring. Perplexed and repentant is the Lala......................... and the rest he will leave to the reader and so thinks out another plot.

The road is the same. He goes on .... The Lala goes to a friend's house; pinches his pot of face-cream; puts it into his pocket; thinks he is unnoticed and returns home. The friend with 'an other' visits the Lala; the other takes away Lala's only child playing on the carpet. Lala is in; comes back but does not know of the mischief. Two hours later, he finds the child missing; a search is carried out but in vain. The Lala is troubled; meets the friend in the evening and says, "I have lost the child". "Oh. I too have lost my face-cream", says the friend. Lala returns the face-cream, the friend the child. A party is given and.. and he thought of many other plots. But he had chalked out plots before too and poor fellow! there was never a story written. He retraced his steps, went back, left the dream-land, and found himself, a man of flesh and blood sitting on a cold cement bench on a cold winter night The wind was blowing. It was late. The chowkidar shouted and the dog barked—perhaps at each-other perhaps at the sleeping people, and perhaps at the never-coming but ever seeming-to-be-coming thieves!

not care to see even the greatest dream of his life—independence of India—realised by violent methods.

He has had ample opportunities of putting his theories to the test. He led a lengthy campaign of non-resistance against cruel restrictions placed on trade, immigration and civic rights of the Indians in South Africa. This was, as Tolstoy observed, the first attempt at applying Satyagraha to masses or bodies of men on a large scale. It was a great experiment and led the way for similar struggles which have since been carried on in India for thirty years. These have not always been successful and Mahatma Gandhi has on more than one occasion confessed his mistake and done penance for it. His search for and experiments with truth are still continuing. In Satyagraha, he claims to have presented to an age of diplomacy violence and war, a spiritual remedy for all mental, moral and social ailments o humanity.

Tolstoy's doctrine of Non Resistance held that the use of physical force between man and man is *always* wrong and *always* indicates malevolence and that all politicalf social and economic questions can be solved on that basis. But to an ordinary, mortal it appears that while malevolence is always bad, the use of physical force may sometimes be the best thing that can be done. To shake ourselves completely, free from all recourse to violence is hardly possible. We mav use force to a man, under certain circumstances, not because we wish to hurt him, but in order to prevent a greater evil being done. Our aim should be to promote "harmony, good-will and good order among all men". The true contrast should, therefore, be not between injuring our fellows or renouncing the use of physical force but between wishing to *injure* and wishing to *aid*. Mahatma Gandhi's Satyagraha claims to aid the opponent to improve himself and is to that extent ahead of Tolstoy's conception of Non-resistance.

His philosophy of complete non-violence under all imaginable circumstances cannot, however, always serve its purpose. It is for instance, hard to understand why a horse with a fractured backbone should not be killed to relieve it of excruciating agony, or why a man dying of a failing heart be not given an injection to revive life. Real suffering may melt a feeling heart; but how will it affect an armed dacoit bent on murder and plunder. Non-violence may be all very well in a society which not only believes in, but acts upon, the principle of turning the other cheek (and is there any such society in existence today?); but it disregards the stern realities of the modern materialistic world, which believes in punching the nose of the smiter on the cheek; and to a common man of today sounds like the proverbial "Counsel of Perfection".

AHMAD ALI SADIQ

On The Cross Roads.

In pursuit of an aim he did not know, with the vagaries of his mind he wandered recklessly from this city to that wasting bit by bit almost all that his late father had bequeathed him. He had lost his way, and was now like a crew-less boat tossing on the waves of a vast ocean.

One cold winter night found him seated on a forlorn cement bench on a deserted road. The night was calm. There were no intruders. He was the monarch of the bench and perhaps of the road too.

He looked into his past. It was not bad. He was a graduate. He used to be a popular figure at college—took equal interest in politics, literature, love-making, gambling, drinking and many other diversions that some called good, others bad. He had met no great failure so far. What should he do now?

man feels he ought to use it; for a single exception to the rule may break it to pieces and all sorts of violence may come to be practised in the world. For similar reasons he rules out all war; and the method of stopping it which he commends is that each conscientious man should refuse to serve as a soldier or pay taxes. This, if successful, would disintegrate the state, and if attempted by all humane people, would throw the control of affairs into the hands of those who are not humane. One cannot readily accept Tolstoy's utter rejection not only of war but of all government and even patriotism. The length to which he carried his theory of non-Resistance is well illustrated by his reply to the question "May I kill a wolf that attacks me"? 'No, you must not" he said, "for if we may kill a wolf we may also kill a dog, and a man, and there will be no limit"! No wonder that his movement collapsed under the test of experience. He did not spare himself either in formulating what he thought to be true or in trying to practise it. But his code of non-resistance resulted not in better and more friendly and humane relations but in as much suffering and distress as may be caused by the ordinary penal codes.

This doctrine of turning the other cheek has not been confined to Tolstoy and his followers. It has played an important part in the history of many groups in other lands and ages. While Tolstoy gave it a systematic expression, Mahatma Gandhi made it the central principle of a great movement first in South Africa and then in India. Being a firm believer in the efficacy of spiritual methods he has raised the doctrine of non-violence to a higher plane. In fact he has made it synonymous with soul force pure and simple. Non-co-operation with evil is, in his opinion, as much a duty as co-operation with good. Non-co-operation in the past has, however, found expression in violence to the evil-doer. But violent non-co-operation breeds evil and evil can only be sustained by violence. Hence, withdrawal of support from evil requires complete abstention from violence. Non-violence therefore, implies voluntary submission to penalty for non-co-operation with evil.

Violence implies hostility and a determination to crush hostility by force. It creates hate, and hate is demoralising. The instinct of SELF—preservation, however, lends an attractiveness to violence. But Love is the power of devotion to something not our-SELVES. If therefore, love is great enough, it will over-ride the instinct of self-preservation and man, identifying his life with love, will be willing to lose his life to save it. He will accept non-violence, not for its own sake (since it appears to be contemptible to natural instinct) but for the sake of what he loves i. e. a life which finds a higher use for instinct than self-preservation. He will be willing to sacrifice himself without resistance for the sake of what he loves. Non-violence can only find its validity in a positive factor which stands beyond the argument of natural instinct: it must exhibit a love for some thing greater than the self.

Mahatma Gandhi has consequently given the name of 'Satyagraha' i.e. force of truth or soul force to his creed of non-violence which, according to him, is born of Love and Truth. There is no place for hatred in his Satyagraha, and it can be offered even to one's nearest and dearest ones. It does not aim at embarrassing the adversary, but seeks to win him over by suffering in one's own person. It is not a weapon of the weak; it is born of the strength of conviction A Satyagrahi is fearless and can even trust his opponent. He fears none and nothing but God. He has implicit faith in the righteousness of his cause and has complete self-reliance. He bears no ill-will towards his enemy and seeks no revenge. These are noble ideals and it is not at all easy to convert millions to such high standards of life. But Mahatma Gandhi seeks to build up the character of the pople so that they may desist from returning madness with madness. He believes that no end, however noble, is worth achieving through questionable means. Hence, he would

Non-Violence.*

Self-preservation is one of the most primitive and strongest instincts of animal life Worm and insect, fish and bird, beast and man—have all instinctive dread of injury and all try in their own peculiar ways to avoid danger to their safety. Danger can be averted either by the intended victim removing himself beyond the reach of harm or by evercoming and annihilating the source of apprehended danger. The determination of the method to be adopted generally depends on the relative strength-mostly poysical—of the parties to a dispute. For this reason, the chief test of manhood in the eyes of the primitive man was the possession of power and readiness to express that power in the form of violence. Violence has consequently had an attraction of its own throughout the ages. Suffering without resistance has generally been looked upon as something contemptible while the employment of utmost violence in a noble cause has usually been applauded as 'bravery'.

But there have been individuals and groups of individuals in different periods of world history to whom violence has appeared as something repulsive and derogatory to the dignity of a moral being. They have held the view that recourse to violence ignores ethical values and reduces man to the level of the beast They have condemned the use of force under any circumstances and have preached the doctrine of suffering and non-resistance Among these can be counted some great world teachers But to Tolstoy belongs the credit of formulating the message of the sermon on the Mount into a systematic creed and of propagating on a wide scale the gospel contained in the words "Resist not him that is evil: but whosoever smiteth thee on thy right cheek, turn to him the other also".

He was morally in advance of his generation. The society in which he was born was steeped in ingorance and the masses were victims of ruthless persecution. Efforts at amelioration were put down with a heavy hand. Hence, physical force came to be identified in his mind with oppression of which it was the chief instrument. He felt called upon to raise the standard of revolt against the use of force in any shape or form. Naturally in a warfare of this kind he had to exclude carnal weapons and to rely entirely on appeals to reason and conscience. In his opinion, the goodness of a cause could be judged by the type of means employed to forward it. The use of physical force in support of a cause proved the cause to be wrong, and could not be too strongly condemned. No one should be compelled to do what he does not want to do, or to desist from doing what he likes. This view of the doctrine of Non-resistance naturally led to Tolstoy's denunciation not only of the Orthodox Church, but also of the Government that supported it, and the entire system of military service. Carried to logical conculsions, it included the disapproval of all legal proceedings—civil or criminal—and of all collection of rates and taxes not purely voluntary, as well as of the defence of life or property by physical force No one was to use or cause others to use physical force, to prevent a man even from committing crimes likely to plunge a whole community into confusion and misery. Evidently, the principle thus enunciated presupposed a society very differently constituted from any that we know of.

Doutless, Tolstoy went too far. He looked to the *action* but attached no value to the *motive.* He would not strike a man even to prevent his committing an outrage because the use of violence is evil and the man in question may *possibly* repent and desist at the last moment from executing his evil intention. One should not knock down a drunken man who is kicking a child simply because there is a possibility of the child not being seriously hurt after all or of the man himself falling down dead. Thus even the desirability of 'doing one's best' under the circumstances in which one finds oneself and using one's God-given faculties is denied. Tolstoy is firmly convinced that physical force should *never* be used, even in cases in which a

---

*Originally Broadcast from the Peshawar Radio Station. Now reproduced with the consent of the Station Director.

My mind flashed back to those little farms, perched on the slopes of the Welsh hills, where green crops slowly ripen beneath the grey, forbidding buttresses of the Snowdon Range which has protected them for hundreds of years, to the herds of shaggy goats nibbling at the short turf of the hills, to the mountain oaks and the pines of Machynlleth. At that moment I almost hated Pope for making the picture so vivid and yet so simple. Yes, that was the trouble—the very simplicity of it. It underlined the rustic simplicity of our Cambrian way of life—the long walks on the, hills, the little villages nestling in the valleys, the lazy warmth of the sun in summer, the howling snowstorms, and the shelter of the little grey stone farmhouses in winter, the singing of the choirs and the haunting melodies of the harpists. Nor were our human contacts less simple Our friends the farmers, the shepherds and the village blacksmith still had time for leisurely and dignified conversation, they had not at that time been *infected with the sophistication and the cynicism of the cities And —how here was this man Pope, who had been dead for more than two hundred years*- rising up and taunting me with all that I was missing. It was really most unfair.

Here was I, separated from wife and child, an exile in a foreign land where even the language was different, and Pope had to bridge two centuries to remind me of it. *How* I wallowed in my selfpity !.

But wait a moment—"where even the language was different". How many times had I remarked on the similarity of the intonation and pronunciation of Pushto to my own Welsh. Had I not, on numerous occasions, been amazed at the rapidity and ease with which some of the students had picked up a few welsh phrases I had taught them ? Viewed like that things did not seem quite as black as I had allowed myself to think, and it appeared to me that if I followed this line of thought a little further, and—like Plato—followed where the argument led me, I might find that I was not being too badly treated after all.

Were there not hills enough here within a few miles of me? Hills just as bleak and forbidding as my own? Indeed there were. Were there not lakes and green valleys? Yes, there were. Were there not shaggy, smelly goats, just as shaggy and smelly as the goats at home ? Undeniable! Was there not singing and dancing, and music—also in a minor key ? There was, (I admit that it took a long time for my western ears to appreciate the music.) Was not my conversation still—in the main —of the unsophifticated side of life? Here I hesitated a little. Politics will intrude so into the scholastic peace. However I could say with perfect honesty and pleasure that the *friendships* that I had made were just as true and satisfying as those I had made at home.

By this time I had extricated myself from the "Slough of Despond" and had given myself a mental shake : the last of the slime of selfpity had fallen away from me.

Alexander Pope had given me a most uncomfortable half hour, but he had also enabled me to see things in a truer perspective. For this last, friend Pope, sleep on —forgiven.

R. G. FELSTEAD

this new appliance, which was scattered in various parts of this area, was not destroyed The Indian Government would not agree to these demands and so a very tense situation arose ; but finally the problem was solved and a most drastic war averted ;—the area was put under the control of a U.N.O. committee comprising of all nationalities.

Today when Atomic wave transmission has brought us into contact with the people of Mars, we thank God that things took the shape they did in 1971. Since this incident, no other situation has arisen to challenge the competency of the U.N.O.

The youth of today have a renovated conception,—they cannot comprehend the mentality of men of the early 20th century. Reason and its employment in every action is a natural procedure to them ; but during my youth it was not so ;—it was amongst us, we realized its sublime presence but we shunned it. I remember how I spent long hours brooding over this human folly and how I longed for its eradication but my ideas seemed to be " a voice crying in the wilderness " like,

" An infant crying in the night !
An infant crying for the light ;
And with no language but a cry."

Although we have been able to settle International disputes, and have thus entered an era very near sublimity in our Civilization, till we have not yet attained perfect harmony, I mean, completely unselfish understanding between individuals. The whole has been perfected ; but the parts have still to be perfected. My advice to man is to look within himself and understand his inner actions and their causes --and modify these, so that they may not cause hurt to other individuals but lead humanity on to its zenith.

There is still a vast scope for improvement, and colossal truth is to be expounded. The fundamental one has yet to be revealed,—I still feel like Wordsworth when he says

" To seek thee did I often rove
Through woods and on the green ;
And thou wert still a hope, a love.
Still longed for, never seen."

KHALID QASIM, IV year.

Was Pope To Blame?

"Happy the man, whose wish and care
A few paternal acres bound,
Content to breathe his native air,
In his own ground.
Whose herds with milk, whose fields with bread,
Whose flocks supply him with attire
Whose trees in summer yield him shade,
In winter fire."

It was after reading the two verses that I have just quoted from Alexander Pope's "Ode on Solitude" that I was overwhelmed by an unaccustomed feeling of nostalgia, which took possession of my mind and set off a train of bitter-sweet memories.

That much ridiculed organisation known as the United Nations Organisation whose foundations were laid with such doubting and yet optimistic hands in 1945 has emerged as the Torch of the world and judging from the recent discussions carried out under its auspices,—we may expect a World State next year;—I only hope to live, to see this most cherished desire of my early childhood at last in actual existence.

Let us recapitulate the incidents, since the formation of this glorious organisation and see exactly how this epitouth of human endeaver has risen from strength to strength. In the early part of the year 1946, when this Organization held its first meeting in Westminster Hall, London, it was rudely confronted by the perplexing problems of Greece, the Levant and Indonesia. They were solved but in their solutions lay the diabolical shadow of Power-politics, and the smaller nations could only look to each other in despair. Gossip, justified gossip, spread throughout the length and breadth of society, and men looked towards posterity picturing it as engulfed in chaos; who could blame them living in an era of gross selfishness and narrow foresight.

We Indians paid little heed to the functioning of the U.N.O. We knew it did not concern us, and expected it to exist for a few more years and then crumble to dust—O! this human misconception. The year 1949 dawned and with it the great pent up flood of India's will to independence. Nothing could withhold the forward thrust of the will of four hundred million people who had now come to an understanding. February came, all was quiet, and then the gates were burst open, and the whole year there was turmoil, ending up with the Russian intervention followed by the country's fate being placed in the hands of the U.N.O. a pause of two months and its final decision to recognise India as a free and independent State, and to ask it to become a partner in the Organisation.

This decision of the U.N.O. in May 1950 is in my opinion the true foundation of the U.N.O. and because of this humanitarian act, it convinced the peoples of the world, that it did really stand for world peace and for the removal of race and colour prejudice from the minds of men. Six months later Indonesia was declared an Independent state by a similar decree followed by the Independence of Burma, Malaya and Ceylon, in the year 1953.

In the year 1954 the U.N.O. met at Delhi to celebrate its anniversary. I was one of the officials representing India, and can still feel the enraptured state that I was in, when I realized that now at last, men of every nationality, regardless of colour or creed could face each other, with complete equality and mutual respect. To me that day was one of the happiest, and the future looked like the Dawn: the light of truth had descended upon man and " spoke in diverse languages, and tongues."

World peace was secure, and men turned to the arts and sciences,—to use their genius and power no longer for the destruction of their fellow beings, but to enhance their comforts and to enrich their minds. The period 1955—70 was a period of great development and during these years we all know, how Mohammed Akram constructed the first space-ship and visited the Moon along with Doctor Vanelia and Mr. Hood. We were stunned when our wireless stations received the first messages of these three brave men from the moon. Now of course a colony has been formed on the Eastern continent of the Moon and a trip to it is no great wonder.—but the foundation was laid by Mohammed Akram, and to him goes our tribute.

All was well,—but then the unfortunate incident occurred which is faimilar to us by the name, " The Frontier Plot",—in August, 1976,—the famous Physicist Mohammed Akram was experimenting on Atomic Wave transmission, when unforeseen facts attached to this new phenomenon—caused a serious explosion in the city of Leningrad. Soviet Russia was all aflame, protesting strongly to the U.N.O. and threatening to attack if the whole of Northern India were not either put under her control, or

We hope that the news of the Football Superintendent, Mr. M. Tufail's impending departure is incorrect. He takes such keen interest in the game.

HIKING CLUB

Once again the generous donation of H.E. the Governor enabled a number of students to undertake an enjoyable trip to the world-famous valley of Bliss and to climb the Kolohi Glacier. Our best efforts to secure an account of the trip from one or other of the participants have unluckily failed.

BASKET BALL, VOLLEY BALL AND BOXING

We have had no reports from these clubs and consequently cannot say much about them. We hope their hybernating period will soon be over and they will come into the field soon and give a good account of themselves.

PROVINCIAL HIGH SCHOOLS TOURNAMENT

A successful tournament was again run this year during the Christmas vacation. All districts of the province sent in teams and fairly high standards were achieved in various events. We are sure that such meets do a great deal of good to High School students by broadening their outlook of life.

RURAL UPLIFT FOOTBALL TOURNAMENT

This tournament is admirably serving the useful purpose for which it was started. Twelve teams from the surrounding villages took part, and had a happy time. A sense of sportsmanship is being slowly instilled into the minds of village boys who are slowly but surely learning the value of esprit de corps and joint effort for a common cause.

How world war was avoided during the last fifty five years.

(*1st January 2,000*)

" The day in his hotness,
The strife with the palm;
The night in her silence,
The stars in their calm".

These words instil in me a sense of continuity—as if this whole cosmic system were racing with ever-increasing speed to some goal of bliss or woe which we still have not been able to comprehend although we have now entered the 21st century. With a flash I visualize my youth and recall the same deep-felt frustration that enveloped me then, and how through all the long years I have struggled and raved to uncloak this enigma but without success. I remember clearly the events of the world war of 1939-45; the lightning successes of Hitler; his gradual decline, and the final victory of the Anglo-American coalition, culminating in the Atom Bomb.

In those days all the world was ringing with the music of the Atom Bomb,—we thought that humanity had at last entered on the last chapter of its existence, unless mankind eradicated power-politics and racial discrimination from the face of the Earth Some dreamt of another Noah's flood to wipe out the evil minds of our planet. Politicians realizing the imminence of the catastrophe worked feverishly to form a world federation of States; but nobody believed in their success;—we cannot blame them; considering the exploits of " the League of Nations, " that powerless institution which evolved after the 1st World war of 1914-18. But today we know that man has eventually controlled his animal instincts and chained them down with the iron bands of reason,

RUNNERS-UP IN THE PUNJAB UNIVERSITY FOOTBALL CHAMPIONSHIP

Islamia College, Peshawar

1945—46
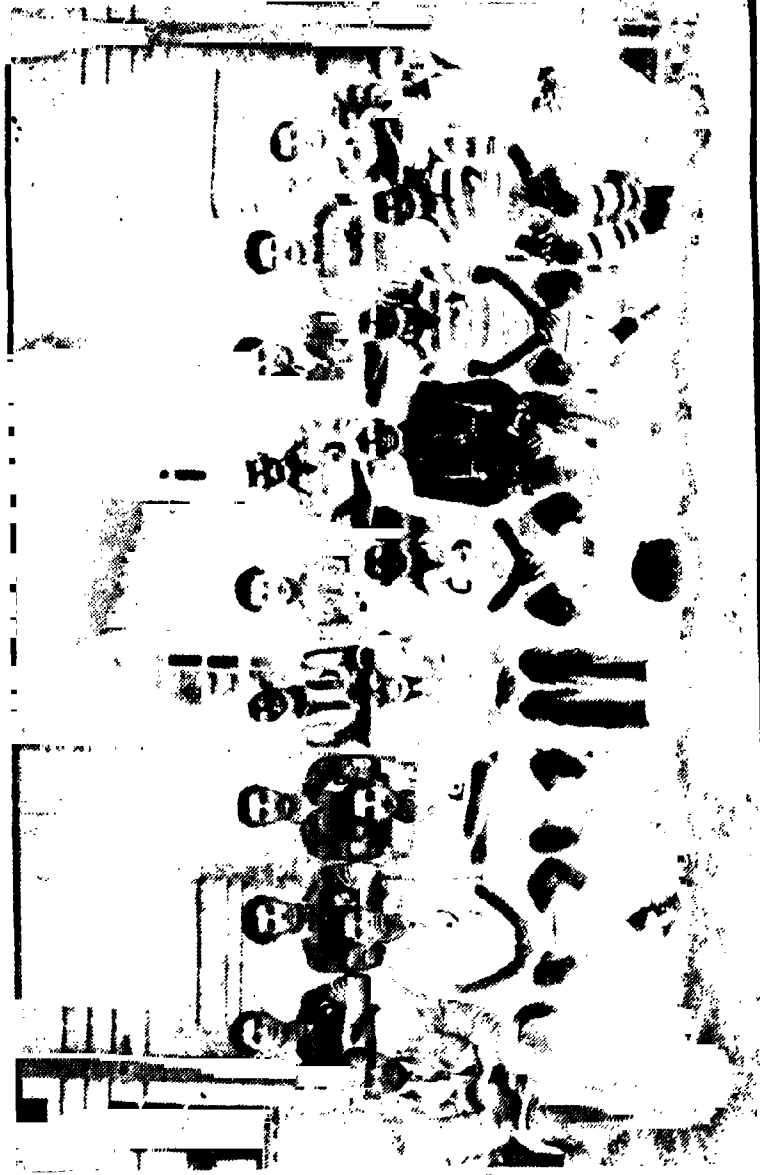
Standing: —M. Akram, M. Afzal, M Jaffar, Haider Zaman, M. Zaman, Sardar Shah, Taimur Havar Abdur Rahman, Siraj-ud-Din

Chairs :—Adil Khan, Abdus Samad, A. R. Girdhar. S. M. Timur, *Principal* G. Jilani, *Captain* M. Tufail *Supdt.* I. H. Bial

A. Aziz. Abdur Razaq, P T.I

Hockey Team, 1945–46
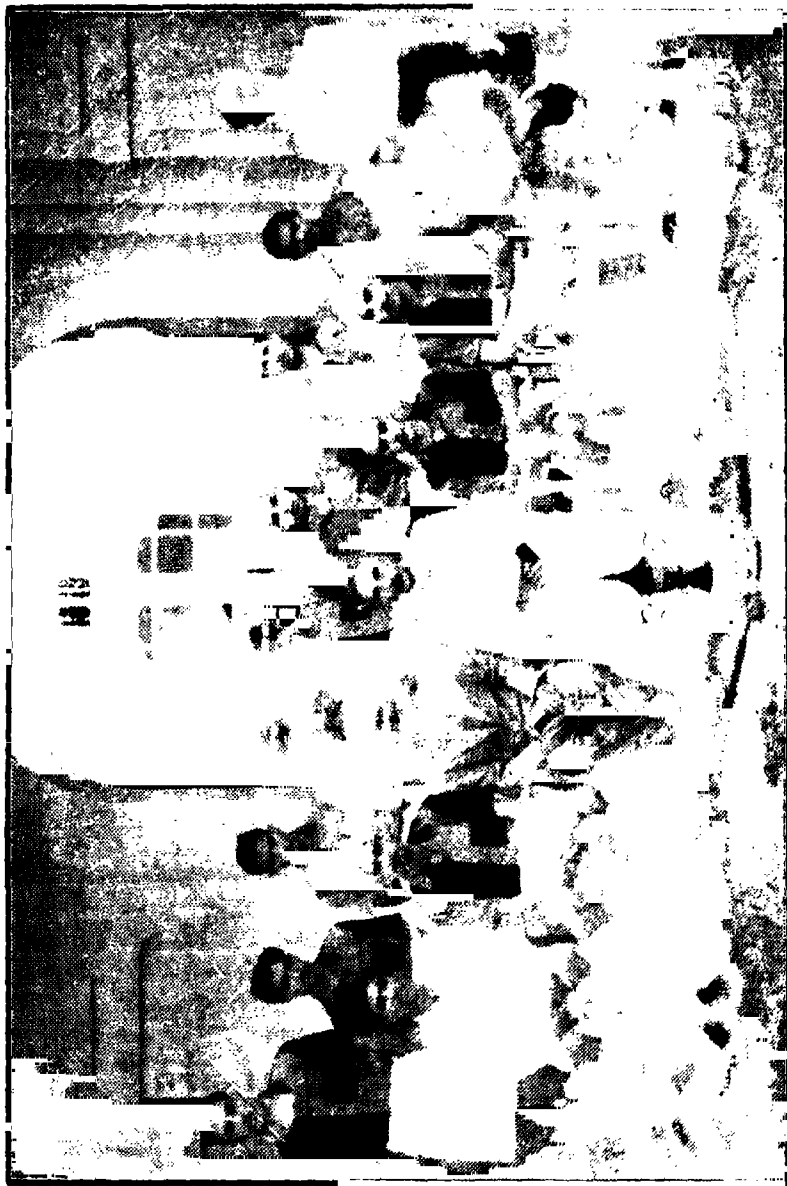
Sitting :—Manohar, Ghafoor, M. Fazil (*Supdt.*) M. Taimur (*Principal*) Arif (*Captain*) Hamid, Jagdish.

Standing :—Nawaz, Khurshid, Qayum, Jabbar, Qayum, G. Mohd., Lalmast, Mumtaz, Fazal-i-Rahman.

SWIMMING

The swimming tank has as usual been the centre of evening activities. New figures have been seen daily; some with "Landau bodies" and others with "fords". A moonlight swimming gala was held in June and interesting events were competed for. Our team was sent to participate in the Punjab University Swimming tournament under the captaincy of Murad. But we did not have much luck there, although Khatra, Murad and Khalid did quite well. Syed Safdar Ali Shah is now said to be stepping into the shoes of Murad and is looking forward to a successful acquatic season.

ATHLETICS

The leading athletes of the College started regular practice rather late in January. The N. W. F. P. Inter-College Athletics tournament was held at the Shahi Bagh on the 20th and 21st of February. Our old friends proved more accommodating than ever before and we won the trophy by a wide margin. Jafar won the individual championship cup. But our great victory was somewhat marred later by our unexpected defeat in Relay Races. After all, we did not want to be rude to our "rivals." Our College team participated in the All-India Islamia College Athletics Meet, and were runners up this year again. Jafar was again declared the Champion competitor and awarded the trophy. He was awarded the College Roll of Honour (Athletics) also this year. So was Ghafoor who captained the team this year. Tufail, winner of 440 yards race in the N. W. F. P. Inter-collegiate Meet, Attaullah and Jamal Shah were also awarded College colours.

We had unfortunately to play without our veteran hero Iqbal Qureshi. He sprained a muscle and was incapacitated from participation in the two meets.

TENNIS

Tennis is becoming more popular every year. All courts are crowded in the afternoon—some playing, some watching and waiting. We lost the Col. Keen's Cup Match against Edwardes College. Faqir Fazli Mahmud is the captain this year.

HOCKEY

We had on the whole an unlucky year. Good practice and valuable instructions of the Superintendent failed to defeat fate. We lost against our "old rivals" in the first varsity match by one goal.

Arif, who captains the team is a good centre-half. Hamid is a well-known player and was selected centre-forward of the Punjab University XI and played for it in the Inter-Varsity Tournament. The form he has displayed in the Championship Tournament held at Lahore can be judged from the fact that all the four goals that were scored for the University XI in one of the matches were scored by him. He has been awarded the College Roll of Honour in hockey.

Ghafoor, the captain of the last year, Jagdish and Qayum did well in the Varsity Match.

FOOTBALL

Our football team beat the Edwardians by two goals to nil in the Punjab University Football Tournament. We proceeded to Rawalpindi and had an easy win against Gordon College. This took us to the semi-finals against the Khalsa College, Lyallpur, who proved more than a match for us. We played an interesting game against a selected team from Afghanistan.

Jilani, the captain, is a good organiser. Griftar is the solitary remnant of the once famous old brigade. Bali is a well-known footballer and has played in many provincial and All-India tournaments. Samad, Jafar and Timur are promising well.

A Message

Bombay,
7 March, 1946.

I am asked by the Editor to send a message or some other contribution for the annual number of the Khyber. I am afraid it cannot be more than a message now, and a farewell message, as I write this from Bombay, on the eve of making my final quittance from India. This seems appropriate as a last act before leaving India, considering that my first act, on arriving here in India as a young man in November, 1915, was to take the train to Peshawar to take up my appointment at the Islamia College, then in its infancy, and very different from the College as we now see it. Now I think of it. I might have been able to write an interesting article on the College as it then was. But time does not now permit. I was glad to see that so late as April, 1945 three of my old colleagues were still to be found on the staff in the persons of Professors Timur, Minhaj-ud-Din and Abdur Rahim. But alas, time is no respecter of persons, and it can only be a very short time now before the last member of that staff of the early years will have disappeared. It is perhaps fitting, as we belonged to a period in India which is now about to close for ever. I can only now send a message of faith and hope for the College, for a yet greater College in a greater new era. I was very happy in my three years at the College, and am proud to think that I had a part, however humble, in building it up from its early beginnings to its present condition. My name must be almost entirely forgotten there now. But, to preserve it yet a little longer, I am sending the Principal, for the College Library—of which I was once Librarian—a little volume of my poems, entitled "Poems of India", which I am publishing at this time of my departure, the early poems in which were written at the College, and which, in token of my affection for them, I have dedicated to my old pupils and colleagues in India. Hail and farewell!

A. C. C. HERVEY,
Professor of History and English, Islamia College,
Peshawar, 1915-18.
Indian Educational Service, 1918-42.

Round the Playgrounds

CRICKET.

The first half of the season was uneventful. Attendance at the 'nets' was poor. Very few matches were played and we didn't have much of practice. But time marched on and before we knew what's what, the University tournament was staring us in the face. We mustered courage and employed all the 'improvised' skill of which we were capable; but the fates were against us. We tried our luck several times again against powerful local teams, but met with no better luck. One of us then made a discovery that what our team lacked in bowling was more than amply made up in batting. So, we entered the Cunningham tournament with high hopes of success. But 'over-confidence' proved our undoing; and we were again defeated.

Safdar is a careful skipper. Hameed is an efficient "all-rounder" and was selected to play for the Northern India XI against All-India Services team. Saeed is a new-comer and believes more in his 'funny jokes' than looking after the ball and the bowler. But three cannot make a cricket team. Can they? We hope Mr. Sadiq will find a solution for this difficulty.

will open up to him. He will look upon the welfare of the pupil as his principal obligation, and will respect his individuality and train it according to its requirements. He will have a clear conception of the type of young citizen he wishes to produce, and will not only become that type himself but *live* it before his pupils. One of the strongest characteristics of young children being their love of imitation, the example of a cheerful unselfish, resourceful, energetic, truthful and courageous teacher will not fail to make a deep and lasting impression on their minds. He will be sympathetic and courteous towards his pupils and will secure their regard and affection by gentleness and respect rather than by fear and punishment. He will lead and guide by example as well as by precept. His method will be one of persuasion and not of coercion. He will be neither dogmatic nor impatient. His chief objective in life will be the creation and development of rich, well-integrated personalities, firm of will, informed about a wide range of affairs, imbued with the highest aspriations of the human race, equipped with practical knowledge and inspired by ideals which enable them to make their way and fulfil their mission in an ever-changing society. It is to such high-minded persons that the sacred task of guiding the youth of the world should be delegated, if wars and strifes are to be ended before they end humanity. A nation which permits ineffective inefficient and soulless teachers to undertake the education of its son and daughters commits intellectual suicide.

The future of the world is in the hands of the Teacher, but unfortunately the importance of his work has not been generally recognised. Both the parents and the state have failed to do justice by this architect of the future destiny of mankind His profession is not infrequently held up to ridicule and derision. It is supposed that any and every body can make a teacher, and that only those drift into the profession who fail to make good anywhere else. "Every one who is incapable of learning has taken to teaching" says Oscar Wilde. "The vanity of teaching often tempteth a men to forget he is a blockhead" is the opinion of another writer. "How can one imagine an intelligent man engaging in so puerile an avocation", asks a third? But the blame does not lie with the teacher. It is the circumstances in which he has been placed that detract from his usefulness, and lower him in the estimation of the wordly wise. The present status and renumeration of the teacher is deplorably low, and the ridiculously unsatisfactory prospects in the profession fail to attract the best talents. How can men of real capacity—capacity in scholarship, knowledge, abilities, interests, health, personal and social qualities, character and ideals—be expected to accept starvation wages and humiliating social status ?.

The pay and prospects of the profession must be considerably improved before men of the right type will consider it worth their while to enter it. Once it is brought on a par with the other civil services, men possessing the right kind of personality and attitude will adopt it as their life career, and only then will true foundations be laid for the building up of a really new world order.

AHMAD ALI SADIQ

The New Teacher

World War I was fought with the avowed object of putting an end to War for all time. A League of Nations and a supreme Court of Justice were established to see that all international disputes were settled by peaceful means. But unfotrunately the high hopes entertained by the founders of these institutions were not realized and within the space of a single generation mankind forgot the terrible lessons of the 1914-18 cataclysm, and the world was again plunged into bloodshed, arson and destruction of a magnitude the like of which had never been witnessed before in human history. This time the slogans were "fight aggression" "suppoit human right against brutal might" "make the world safe for democracy" and other similar high-sounding phrases. But it remains to be seen how far these noble resolutions are actually carried into effect and how long they continue to command universal admiration and respect.

A frightfully heavy price has had to be paid to being the terrible carnival of Death and Desolation to an end. Thousands upon thousands of lives have been lost. Millions of promising young people have been maimed for ever. Numberless houses have been destroyed. Numerous towns and villages have been laid waste. Economic and social conditions have deteriorated all over the world. Bitterness and hate have taken the place of toleration and fellow-feeling. Art and science have been yoked into service for what is termed an All-out-struggle. Not only have those in the fighting services had to undergo untold hardships and suffering but the entire civilian population - men, women and children—also has had to make tremendous sacrifices. Daily amenities of life had to be curtailed considerably. Food was short, clothes scare and shelter lacking. In many ways the battle at the home front was more trying than that on the field.

With the invention of the atomic bomb and other terrible engines of destruction and with the practical annihilation of space and distance, the very thought of another war sends a shudder through the bravest heart. It is bound to be a matter of unimaginable horror. Its effects will be felt in all corners of the world and the forces let loose by it will be beyond human power and intelligence to combat. It will deal mortal blows to human society and remove all traces of civilization from the surface of the Earth. Surely, man cannot view such a prospect with equanimity. Hence, he is out again to set up an organisation to out law war and to maintain universal peace. Efforts are being made to reconstruct the world on an entirely new footing. It is being realized that the future of humanity cannot but be gloomy unless the mentality and outlook of the human race is cast into a different mould. Thought and habit being the mainsprings of action, it is proposed to direct them into the right channels by training the minds and lives of the rising generations along right lines. The future of the world rests entirely on the type and methods of education adopted. That is why the old systems of education in Germany and Japan which sought to turn the individual into an unthinking automaton and impressed the youth of the country into the service of the autocratic god-state are being eradicated and replaced by others.

But no system of education, however well-planned it may be, can ever achieve its objects unless it is entrusted to teachers of the right type-men and women who know their business and realize their duties as builders of a new world order. The teacher of the future will therefore have to be a person with a definite aim and message. He will be proud of his mission in life and will devote all his time and attention to the great cause entrusted to his care. He will select education as a career not as the last resort of a disappointed seeker of a living but out of a sincere desire to utilize the many and varied opportunities of serving his fellowmen which it

Originally broadcast from the A.I.R. Station, Peshawar, and now printed with the permission of the Station Director.

Bruce-Scott who was kind enough to distribute the prizes. We won the challenge cup from the Edwardes College in the Inter-Collegiate Athletic tournament held on 21st February 1946.

THE HIKING CLUB—The Hiking Club is every year indebted to H. E. Sir George Cunningham for his generous donation. This year he was even more liberal and his handsome donation made it possible for poor students to visit Kashmir. The farthest point reached by our team was Kol Hoi Glacier.

THE COLLEGE LIBRARY. The number of books in the college library is 22,655. Out of these 2,000 are Persian and Arabic Manuscripts. A collection of 110 old coins has been presented to the library by M Dilawar Khan of Jahangirpura, Peshawar City on behalf of the late Sh. Ghulam Mohd to whom they belonged. The coins are being deciphered and it will take some time to complete this work. Some of the coins belong to the Greek kings of Bactria, some to the Umayyads and the Abbassides and some to the Mughal and Pathan Kings. Our thanks are due to the late Sh. Ghulam Mohd and M. Dilawar Khan We are also thankful to the Osmania Univesrity which has presented twenty of its Urdu publications to the library.

A library should be regarded as the nucleus of an educational institution, If this college is ever to be raised to the status of a university we should build up a respectable library before starting the university. A hundred thousand well-selected books are not too many for a modern university. It was the ambition of the late Sir Abdul Qaiyyum that this province should have a university of its own. His thoughts have been echoed again and again by the press of the province. The first difficulty is money which may possibly be overcome by a sympathetic government with the help of private donors. The spirit of a university, however, cannot be purchased with money. It can only be produced by a number of teachers devoted to learning and working together in brotherly co-operation for the enlightenment of their country. Our experience shows that such teachers must be produced by the country itself before it can have a real university. The number of Pathan students who show a desire for higher learning is very small. There are 7 students in our M. A. classes out of whom only two are Pathans. A university teacher must be capable of self-effacement and lifelong hard work without expectation of reward or recognition. An association of such men is a real university and this is what we should aim at producing before any thing else in order to realize the late Sir Abdul Qaiyyum's dream.

We have passed through a very disturbed period owing to the elections to the provincial Assembly. Politicians of all parties tried to make the maximum use of the students' energy and ability. In my opinion, if all parties by mutual agreement abstained from disturbing the calm atmosphere of academic life, it would serve the national purpose better than putting students in the first line of political activity. What the country needs most is the largest number of highly efficient scholars and scientists To produce these an absolutely calm atmosphere is needed in the educational institutions.

FAREWELL TO SIR GEORGE AND LADY CUNNINGHAM—Before I finish I wish to bid a hearty farewell to Sir George and Lady Cunningham. Sir George's patience and wisdom secured peace for this province in the midst of the bloodiest war the world has seen. A single hasty step would have disturbed the peace of the province. He goer home full of honours and I wish him and Lady Cunningham every happiness in theis well earned retirement.

In the end it is my duty to thank Khan Bahadur Mohd Ibrahim Khan, Chairman of the Council of Management and Mr. Ghulam Ishaq Khan the College Bursar without whose courtesy and willing co-operation I could not have discharged the duties of my office in these troublous times.

M. TIMUR.

UNIVERSITY OFFICERS TRAINING CORPS.—This year the U.O.T.C. is as popular as ever. The unit is up to its full strength of 159 and several applications for admission had to be temporarily refused. The camp was held at Landi Kotal during the second half of May. The attendance was quite good and a lot of good work was done by the cadets who attended. At a map-reading examination set by Brigadier Langlands who was at that time commanding Landikotal Brigade, the first place was taken by Cadet C. S. M. Abdul Ali Khan with 100% marks. No cadet failed in this examination. The response to the appeal for officers in all branches of His Majesty's forces was good. From January 1945 to January 1946 over 38 cadets applied for commission. Parades have been taking place twice weekly with a few interruptions and our thanks are due to the Commanding Officer of the K. O. S. Bs. for the services of instructors sent down from time to time. My thanks are also due to Capt. Abdul Muttalib of this college, the O. C. of the Unit and Capt. Falstead, the Adjutant for the efficiency and ability with which they have organised the Unit. It would be regarded as a good news by every cadet that Captain Falstead's departure for home has been postponed for sometime. His tact and intimate knowledge of the student's mind have greatly contributed to the success of the Unit.

So far more than 150 Commissioned Officers from this college have served in His Majesty's Forces during the war.

VICTORY CELEBRATIONS IN THE COLLEGE — After Germany's surrender the U. O. T. C. held a Victory parade on the afternoon of 14th May 1945 in the college cricket ground. His Excellency Sir George Cunningham took the salute. Sweets were distributed among the boys of the Collegiate School. The poor employees of the college were served with food In the evening the college main building and the hostels were illuminated and the staff and students were invited to a special Victory dinner.

I A.T.C. - Elevan students of this college attended the Summer Vacation Course of the I. A. T. C. in July and August 1945. Six of these were recommended for commission to the Services Selection Board, Dehra Dun but all were rejected. Seventeen students joined after the vacation Every student is given three hours flying in a Tiger Moth Aircraft in addition to training on the ground. The object of the Course is to make students air-minded and to prepare them for commissions in the Air Force. I hope the enthusiasm of Fl/Lt. Mir will prove infectious and our students will take the same interest in this service as they do in the land services.

GAMES AND SPORTS.—Our first football match in the University Tournament was played against the Edwardes College. We won it by 2-0. We were also successtul against Rawalpindi and Campbellpur but lost the Mufasil final at Lahore. We lost the first match in hockey against the Edwardes College. However, one of our players Abdul Hamid of Bannu has been selected to play for the University. We lost the first Cricket match of the Tournament against the Edwardes College. One of our players Abdul Hamid of Peshawar was selected to play in the Governor's Eleven and scored 94 runs against the District Commander's Eleven. Our athletic team won the Runners-up cup at Lahore in the Athlètic Tournament of Islamic Institutions.

We held a football tournament for the village teams of the province in May. Fourteen teams entered the Tournament, Abdara won the trophy.

In December last a football, hockey & athletics tournament was held on the college grounds for the High Schools of the province. The winning teams of all the districts participated. My thanks are due to the Director of Public Instruction for encouraging us with funds to run the tournament and to Prof. Mohd Fazil and Mr. Adil Khan our Physical Director for doing their best to make the tournament a success. We are also grateful to H. H. the Mehtar of Chitral who as usual invited the teams and other guests to tea on the final day and to the District Commander Major General

kept under a shed for this purpose and students are given demonstration in bee-keeping

THE DUTY SOCIETY.—The Duty Society collected the record amount of Rs. 29,777/3 this year. Out of this Rs. 11,599/- were collected by Maulana Nurul Haq, Dean of Theology from Biluchistan. Mr. Nafis-ud-Din, M. A. came up second with Rs. 6,816/-/- The Society has now fixed deposits amounting to Rs. 55,000/- More than 2,000 rupees have been given in stipends to poor students this year. My thanks are due to Maulana Nurul-Haq, Mr. Nafis-ud-Din and other workers.

THE CO-OPERATIVE SOCIETY.—The Co operative Society was organized last year under the guidance of Mr. I. D. Scott with a capital of Rs. 5,700/-. The business transacted by it last year amounted to Rs. 10,000/-. This year it has already amounted to Rs. 50,000 and may touch the figure of Rs. 70,000 before the end of the financial year. It has undertaken to distribute cloth among the residents of the college under the rationing scheme. It sells books, sports materials and other necessaries of life to the staff and the students. Perhaps the most prominent feature of its activity is the college bus wich was constructed at a cost of nearly Rs. 10,000/- last November. A regular service has since been started between the college and the city. The day scholars do not find it a painful duty now to attend the college Our thanks are due to Professors Minhaj-ud-Din, Hassan Din and Anis-ud-Din who are taking the most active part in managing the Society.

THE DAIRY FARM.—The College Dairy Farm was handed over to the Government B. B. Farm two years ago. By an agreement between the Government and the Council of Management the B. B. Farm is to supply milk to the residents of the college, while the college agricultural farm is to supply fodder for the buffaloes at a fixed rate The stipulated quantity of milk which the B. B. Farm will try to supply daily is 500 lbs. The present daily yield, however, is 360 lbs. I hope the farm will make every effort to increase the yield to the stipulated quantity.

HOSPITAL.—The college hospital has been efficiently managed by the medical officer Dr. Mohd Shuaib under the supervision of Major Graham, the Civil Surgeon of Peshawar. There were 80 indoor patients during the year but, I am glad to say, there were no deaths. In the autumn session malaria appears among the residents of the college in a more or less epidemic form. All the preventive measures which we have been able to take so far have failed to check the disease. The college provides an ideal colony for the Health Department of the province where to make its experiments. If they could concentrate their attention on the college and succeed in banishing malaria and other diseases from this colony, it would provide them with useful knowledge which might be applied for the benefit of the whole province.

AFFORESTATION.—Under the Government Afforestation scheme 16 acres of college land is now covered with flourishing saplings which will have the appearance of a real forest in ten years The college is indebted for this to Mr. I. D. Scott at whose suggestion the Forest Department agreed to plant the trees and take responsibility for their upkeep for a number of years. I hope the new Government of the province will support the policy of its predecessors in this matter.

THE DRAMATIC SOCIETY. The Urdu section of the Dramatic Society staged a play in May. The show was very much appreciated by the students. My thanks are due to Professor Q. Inayatullah and Sakhaullah who produced the play at great personal inconvenience. The English section of the Society is staging today a One Act Play in English which the audience will see after the prize-giving is over. Mr. Bashir-ud-Din M. A. of our English Department and Captain Falstead, Adjutant of the U. O. T. C., are responsible for its production. Captain Falstead had experience of acting and producing plays before coming out of India. One of the persons in the cast is Miss Eva Reid, the daughter of the Sergeant Major Hughes of the U. O. T. C.

the V. B. College, Dera Ismail Khan and there may be about 200 in the Bannu and Abbottabad colleges. In our own college the hostels and the laboratories are overcrowded. If the number increase at the same rate next year we shall require a new hostel, two new lecture rooms and two laboratories for Physics and Chemistry. In spite of the fact that the Edwardes College has opened Physics and Chemistry laboratories the pressure on our laboratories is very great. Most of the students study these subjects to prepare themselves for the Engineering professsion In my opinion the public demand should be satisfied and laboratories and equipment should be provided for the largest number of suitable youngmen to study these subjects.

RESULTS.—Our examination results in the year under review were not entirely satisfatory The chief reason seems to be that many students prepared for emergency commissions and could not give their whole time to the university studies. The F. A., F. Sc. (Medical) and B. A. results were below the university average. The F. Sc. (Non-medical) and B. Sc results were above the university average. The Intermediate (Agriculure) result was good. The B. Sc (Agriculture), B T. and M. A (Maths.) results were excellent In the B. Sc. (Agriculture) both students passed. In the B. T. 28 passed out of 34. In the M. A. (Maths.) all five passed, four securing 1st division and one standing first in the University. I wish to congratulate Professor H. M. Osman for the excellent work done by him and his department.

SOCIETIES—The literary and scientific societies of the college provide an opportunity for the teachers and the students to discuss interesting problems in science and literature. The Khyber Debating Union holds two speaking competitions every year in addition to its ordinary debates. This year two Hindu girl students of the Bannu Municipal High School won the trophy in the competition held for the schools of the province on 21st January The girls spoke excellent Urdu. A boy student of the Islamia High School Peshawar who also spoke in Urdu won the first prize. A boy student of Charsadda High School who spoke in Pushto won the third prize. The annual debate for the colleges was held on 28th January. The trophy was won by the team representing the Muslim University, Aligarh. The first prize went to Mr. Naseem Anwar Beg of the Govt. College, Lahore who is an old student of this College.

The Athenaeum, the Scientific Society, the Mathematical Society, the Agricultute Society, the Economics Society and the Oriental Society are all doing useful work. The usefulness of these societies would, however, increase immensely if teachers took a more active interest in them

The Athenaeum organises an exhibition of art and crafts in March every year. Last year 500 exhibits were received out of which there were 117 paintings, 129 photographs and the rest handicrafts The President of the Athenaeum Mr. M. M Kaleem, M. A. is taking keen interest in this work. His ambition is to expand his small room of exhibits into a respectable museum for which he is trying to collect funds from private donors. The Industries Department of the province has sanctioned a grant of Rs. 500/- for this year's exhibition. Our thanks are due to the Director of Industries Mr. M. Aslam Khattak.

SILKWORM REARING—Mr. Mohd Ahmad, M. Sc. is specially interested in silkworm rearing. This year he was successful in producing 2 maunds of raw silk cocoons. Owing to a fall in price we could only realize Rs. 700/- for the two maunds. As there is no department of sericulture in this province great difficulty is experienced in obtaining eggs from the Punjab and also in the disposal of the produce. H. E. Sir George Cunningham was kind enough to pay two visits to see the worms at different stages of their life. It is desirable that the department of Industries should introduce silkworm rearing in the province.

BEE-KEEPING.—Mr. Mohd Ahmad is also interested in bee-keeping. He received special training in bee-keeping last summer at Lyallpur. A number of bee colonies are

NEW PRINCIPAL

Prof. S. M. TIMUR, M.A.

Bahadur Shah Alam Khan, Director of Public Instruction to fill the place vacated by Dr. Pires. My thanks are due to him for his willing co-operation in the cause of higher. education. Mr. Karamatullah Khan is a keen educationist and the work he has already done shows that he is a worthy successor to Dr. Pires.

Mr. Q. M. Fareed fell ill during the Summer Vacation and is still in sick-bed at Patna. When I received Mr. Fareed's telegram two days before the opening of the college I was very much upset. Peshawar is not a place where scholars wander about in the streets looking for jobs. The only person I could think of at the time who could teach history to our college classes was Mr. S.M. Jaffar of the Judicial Commissioner's department. My thanks are due to Sir James Almond and Mirza Fazli-Rahman, Registrar of the Judicial Commissioner's Court for the promptness with which they responded to my request and lent Mr. Jaffar's services to the college. Mr. Jaffar's clear exposition of historical facts has already won the hearts of his students and I think this experience will have a decisive effect on his future career. My thanks are also due to Mr. Raza Khan of our own college who has given an undoubted proof of his love for the institution by sharing with Mr. Jaffar for about two months the teaching of this important subject

Mr. Sher Ahmad Lodhi, M. Sc. was awarded a scholarship for the advanced study of Plant Pathology in America and he left us in October. Mr. Abdul Wahab, M. Sc was awarded a scholarship for the study of the Chemistry of Fruit Preservation by the Provincial Government and left for America in November. Both of them were efficient and painstaking teachers. I hope their knowledge will be useful to the country when they return to India. Mr. M. Salim, M. Sc., Demonstrator of the Botany department has been promoted to the grade of lecturer in place of Mr. Sher Ahmad Lodhi. Mr. T. H. Jaffery, M. Sc. has been appointed a lecturer in the Chemistry departmet in place of Mr. Toosy, M. Sc. Demonstrator in the Chemistry department left in November to take up the post of lecturer in the M.A.O. College Amritsar. Mr. A. K. Qureshi, M. Sc. has been appointed in his place. As Mr. Jaffery has not yet been able to join, M. Salim Anwar Beg, B. Sc. has been employed as a Demonstrator on a temporary basis.

Mr. Mohd Aslam, M. A., M. Sc. of the Mathematics department accepted an offer from the Maclagan College Lahore and left in January. No suitable candidate has yet been found to fill his place. The posts of demonstrator of Geography and Botany are still vacant. No suitable candidates are yet available. As the number of students in the English and Urdu classes increased Ch. Mohd Sarwar, M. A. and Maulvi Mohd Idris, B. A., H. P., H. A. of our own school had to be appointed as part time lecturers.

The great rise in the prices and the award of scholarships for study overseas have unsettled the minds of teachers in most colleges. At the same time an adequate number of University men has not been trained during the war period. Owing to these causes it has become difficult to get good teachers to fill vacancies. I hope the situation will become easier after a few years.

STUDENTS.—The number of students on the rolls of the college this year is 620. Last year the number was 576. Out of the 620 students 354 study science in the Intermediate and 38 in the Degree classes. There are 32 B T. students and 53 in the Agriculture department. There are only seven students in the M. A. classes out of whom two are Pathans.

We can have some idea of the expansion of higher eduction in the Frontier Province by comparing these number with those in the year 1913. In that year there were 35 students on the rolls of this college, 7 in the III year and 28 in the I year. The only other college in the province at that time was the Edwardes College, Peshawar. If the number in the Edwardes College was the same there were 70 students in all studying in colleges in this province. This year there are 324 students in Edwardes College, 250 in

every member of the community, and dynamic forms of legislation, all of which combine to bring home to the poorest as well as the richest a consciousness of full membership in the corporate body of the state, a membership that carries with it rights as well as duties, and equal opportunities for all.

The Principal's Annual Report

First of all I have to thank His Excellency Sir George Cunningham for finding time in the midst of his various activities to preside over this function today. As the Patron of the Islamia College Sir George has always taken a keen interest in its welfare. His name will be remembered in the history of the college along with those of Sir George Roos-Keppel and Sir Abdul Qaiyyum. It is exactly 33 years since this college was founded by the joint efforts of these two men and it would not be out of place to say a few words about them before presenting the past year's report Their portraits hang in this hall reminding every student and teacher of the debt they owe to them. When Sir George Roos-Keppel was the Chief Commissioner of this province, a common sight in this college was Sir George watching a football or hockey match and talking to the students or the teachers, often sitting on the ground. I had only one opportunity to see him in private and then I realized the secret of his power. I was a youngman and naturally felt uneasy in his presence but he at once put me at ease and began to talk as if we were of the same age and status and had been on familiar terms for years. When Sir George was going to leave India for good Sir Abdul Qaiyyum wanted to present silver-plate to him as a token of their life-long friendship. Sir Abdul Qaiyyum asked me to suggest a motto which might be inscribed on it. I suggested the well-known words which Napoleon spoke about Goethe: "Here is a man". Sir George appreciated it very much.

Sir Abdul devoted 28 years of his life to the service of this college, the organisation being started in 1909 although the first buildings were erected in 1913. When he was in Peshawar he came to the college almost every evening and was found roaming about the compound, watching a match, talking to a teacher or a student, giving instructions to the malis or the overseer, always attended by the late Ramzan Khan who was called the General Manager. He understood very little about games, but his chief pleasure was to see the boys playing. He came to the literary, scientific and debating societies, could make an impromptu speech on almost any subject and took a keen interest in the political debates of the Students' Union. He had no great book knowledge, but his strong commonsense commanded the respect of every one. His chief merit was his great love for his people and the conviction that he could serve them best by imparting modern knowledge to them. His efforts have been crowned with success for we find the old boys of this college successfully competing in almost every sphere of life.

STAFF—I will now turn to the year under review. There were many changes in the Staff during the past year. Mr. I. D. Scott, M. A, I. C. S. went home on six months' leave on 5th April. I was due to retire by the end of June 1945, but was persuaded by the Council of Management to stay till Mr. Scott's return and was asked to take over charge of the college. Soon after his return, however, Mr. Scott was appointed Deputy Private Secretary to H. E. the Viceroy and left for New Delhi. I had my own plans for spending my time after my retirement, but a series of unforeseen circumstances have kept me here and they are responsible for the fact that I am standing in this hall today and reading the annual report. Mr. Scott took charge of the college at a critical time in its history. He worked with untiring energy for more than three years for the welfare of the institution. His friends inside and outside the college are glad that he has been raised to the high position which he now occupies. His great capacity for work, his tact and charming personality will be remembered by every one

Dr. Pires, M. A., Ph. D. the head of our Teachers' Training Department accepted the principalship of the Nagpur Training College and left us in November. He was a good scholar and an excellent teacher. He is very much missed by his colleagues and friends. The services of Mr. Karamatullah Khan, M. Ed. (Leeds) were readily lent by Khan

Again, when human intelligence was just dawning, men would generally have made their own rough implements for fighting or possibly for agriculture, but as time went on it would be discovered that some men could make them better than others, and a few experts would produce new implements far superior to the old ones. Such men would be employed in making implements for others, and the community at large would be conscious of cooperative effort in the scientific field.

Let me turn for a moment to the Elizabethan Era in the history of Britain, when the nation was facing one of its greatest dangers from foreign invasion. If you have read some of those fascinating stories of sea battles between British and Spanish ships of those days, you will be struck by the amazing superiority which enabled British ships to take on successfully more than twice their number of Spanish ships in a square fight. Now the British sailors of those days were proud, as they were entitled to be, of their fine seamanship, courage and skill at arms; they also gave thanks as pious men to Almighty God for what seemed to them the intervention of Providence on their side. But one is seldom told in popular history books of the important part that naval construction played in these battles. There was at that time a great controversy in naval circles between the relative advantages of ships built high out of the water and ships built low. The Spanish experts favoured the former and built them high, but the British experts favoured the latter and built them low. Had this position been reversed, the whole course of history might have been changed, for in the close fighting of those days the low-built British vessels had the undoubted advantage of being able to fire broad-sides into their opponents at the water line, while the Spanish canon were usually set too high to do more than fire harmlessly through the British rigging.

A more recent example of cooperation between the research worker, the skilled craftsman and the fighting man is to be found in the famous air "Battle of Britain" in 1940. We pay the homage, which is justly due, to the courage, skill and self-sacrifice of the pilots who fought and won this battle against overwhelming odds, but we must not forget that but for years of research in aircraft design and unsurpassed skill in craftsmanship, the planes which gave those pilots the mechanical superiority they needed to counteract the numerical superiority of the enemy, would never have been made, and again the course of history might have been changed.

I may perhaps be permitted to draw three inferences from the illustrations I have just quoted. The first is that just as in war so in the great peace-time battle against poverty, want and disease, the part to be played by science and scientific research may be decisive. The second is that unless the research worker combines high academic standards with self-discipline, a real sense of devotion to duty and a passion for the truth, the results of his experiments will not stand a practical test. The third is that the pure air of free criticism, which is only to be found under a democratic regime, is conducive both to the highest standards of scientific research, and to the spread of a scientific outlook among all sections of the community.

It is upon this scientific outlook that I have my hopes for a new era of universal prosperity in India. It is the only sure foundation for true cooperative effort; it provides a meeting ground for the composition of differences; it is the light which will lighten the darkness of apathy, prejudice, idleness and ignorance; it will restore dignity to all forms of human endeavour, and inspire a new faith in the power of man to master his destiny.

Let me commend to you, finally, as worthy of careful study, the new pattern of democracy which is now being forged in England. Socialistic in character it purports to create the most scientifically ordered existence that any nation has hitherto voluntarily accepted. Apart from purely state activities, some of the most striking features of this experiment are the promotion of cooperative effort between management and employees in industry, a vast scheme of social security reaching down to

plan as it is on a good one. Professor Archibald Hill recently said that the post-war slogan for India should be "scientific development or disaster", and so, when some people try to press me to plan to a figure, or in other words to cut my coat according to my cloth, I say firstly that no tailor would ever think of doing such a foolish thing, and secondly that it is not sound economics. The starting point is not the amount of cloth immediately available, but the number, size and shape of the bodies to be clothed; the starting point is not the physical number of rupees in the Government treasuries in India, but the essential needs of the population as a whole; the starting point is not the cheapest plan that can be devised, but the surest most scientific means of achieving the desired results. Finance then like all the other component parts of development must serve the common purpose.

Now, supposing that we have a scientific plan for meeting substantially our essential needs, and the money to finance it by gradual stages, this plan has still to be implemented. You have to remember too that money, like cloth, is subject to economic laws; it is limited in quantity, and its value is dependent on the use you make of it. You may put it into an engineering scheme for the construction of a high dam, for an irrigation system for electric power, for a road or a railway. That is the easiest form of development, because your engineers can prepare exact plans, which will be executed by a few skilled men under close supervision, and the results will be visible to the naked eye. But there are other forms of development still more important, but far more difficult to achieve, because they are dependent for success, not upon a few experts dealing with an exact science and limited objectives, but upon the combined and coordinated efforts of many different kinds of experts, and upon a ready and active response from the whole population. Examples of this kind of development are education, medical facilities, public health, agriculture, animal husbandry, forestry, industries etc. Now you may have all the necessary conditions for success, plans, money, equipment etc., but if public response is lacking, you will achieve little and your money and your effort will be wasted. Money once wasted may never become available again, and effort unrequited may produce a psychological depression which may lead to despair. It is this danger which has driven reformers in the past to the most drastic measures to ensure the success of their plans, measures which no democratic government could adopt and still retain any loyalty to democratic ideals.

Now that two great wars have been won and much blood shed in the name of democracy, we are entitled to ask what the democratic solution of this problem is. I believe that the answer will be found in a new technique of cooperative effort; but I put it to you that the first step must be an immediate change in the conception of democratic government from the static to the dynamic. The agriculturist must not be left to toil alone and unaided in his fields, children must not be born to starvation and ill-health and to grow up in ignorance and squalor, mothers must not be left to suffer the toils of child-birth only to swell the figures for maternal and infantile mortality, we must not stand by and allow disease and poverty to fill the minds of the masses of the people to the exclusion of almost everything else. The initiative must come from government to invoke a great awakening from the public at large; there must be a concerted drive to lift the scourge of poverty, to substitute knowledge for ignorance, to tend the sick, and to give honourable employment to all. We need the conviction that these things are possible, given cooperative effort and a faith in the discoveries of science.

I would ask you to look back over the pages of history to the earliest days of the human race, and you will find our ancestors of ten thousand years ago and more cooperating with one another in the chase and in the fight for survival against the animal world. There is no instinct in human nature deeper or older than the co-operative instinct, because without it man could not have survived to the present day.

BRITISH PARLIAMENTARY DELEGATION. On their way back from the Khyber· the members of the British Parliamentary delegation paid a visit to the College. They split up into small groups and met members of the staff and students. They went round the College, the Science Block and some of the hostels and had frank and free talks about the existing conditions and future aims and ambitions of the Frontier youth.

S.

Co-operative Effort as a Means of Prosperity

(Convocation Address Delivered at The Islamia College, Peshawar, on 23rd February, 1946

by Lt Col G. L. Mallam, C.I.E., Bar-at-law.

Commissioner and Secretary, Development Departments, N.W.F.P. and Tribal Areas

Planned prosperity is as much the hall-mark of the age in which we live, as the atom itself. If the two have been thrown into an apparent contrast by war, peace may yet bring them together for the salvation of mankind. But while the techique of the atom may be said to have reached the effective stage, the technique of universal prosperity is so imperfect that cynics may still cast doubts upon the capacity of human ingenuity to achieve it.

I think that these doubts are related not so much to the idea of mass prosperity as being an impractical aim, as to the means which are open to democratic countries to attain it. Modern history provides examples of the vast power of mass effort directed towards a common purpose both in peace and war. The great question before the democratic world today is how to induce every individual citizen without the use of force or of those totalitarian methods that have called forth the condemnation of the world, to strive for the common good rather than for selfish gain. It is possible in fact to reach the common good by voluntary co-operative effort ? If you believe that human nature is responsive to a moral law which is as much a part of the Universe as the law of gravity, then the answer to this question should logically be in the affirmative; but experience has taught us that human-beings though conscious of this moral law, are constantly breaking it. It is evident therefore that unless we invoke the aid of man-made controls and directives that the world will recognise as legitimate and humane, a few selfish people will successfully obstruct all our efforts to obtain the common good.

Even so, the cynic will say, with all your nice and respectable and democratic legislation to coerce the active enemies of society, how are you going to deal with the more passive forms of obstruction such as, apathy, prejudice, idleness, ignorance ?

Now you can see that here is a problem which looms very large to anyone like myself who has been responsible for preparing plans for the future prosperity of the Frontier and is now required to execute them ; and, when I find myself as I do today speaking to the probable future rulers of this country in a great seat of learning, my mind naturally turns to what I believe to be the greatest problem of the future, not only for India, but for the world at large. Let me try in a few words to state this problem in the practical form in which it present itself today. A short acquaintance with the subject of " development" will convince you that if you limit your objectives to a few schemes of obvious beneficial value, they will only reach a small section of the population, and the money spent on them will by the very reason of its inadequacy be largely wasted. True prosperity, like security, is indivisible. You cannot hope to solve the great problem of poverty unless your plans aim, at benefitting every man woman and child in the country. Again, no plans can give you maximum results, unless they are ***scientifically*** conceived ; it is just as easy to spend money on a bad

The function came to a close with a grand tea party in the Cunningham Khyber Union Hall.

MUSLIM STUDENTS' FEDERATION.—A largely attended public meeting was held at the Star Ground of the College under the auspices of the N.W.F.P. Muslim Students' Federation. The Principal who presided extended a hearty welcome to the distinguished guest, Qaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah, President of the All-India Muslim League. He briefly referred to the educational and economic backwardness of the people of the Frontier and stressed the necessity of equipping their rising generations with scientific and technical training. He was glad to notice signs of awakening and believed that these were mainly due to the daily-growing struggle for existence and the activities of the Muslim League.

An address of welcome on behalf of the Federation was then read by its President, Mr. Mukhtar Ahmad Khalil. "We have been, he said, looking forward most eagerly to having you in our midst not only because you are a brilliant lawyer or a capable legislator or an accomplished orator, but because in you are centred the hopes, aspirations and ideals of our nation. It was through your untiring and selfless efforts that our national political body was transformed from a somewhat ghostly and inane existence into a robust and formidable organisation. It was your dynamic personality and miraculous lead which converted a disorganised and ambitionless crowd into a disciplined and self respecting nation with a definite platform and definite goal. You kindled the flame of freedom in the hearts of 100 million souls, and turned a poet's dream into a hard, tangible reality. Your brave fight for the weak and the down-trodden, your strong and unflinching opposition to exploitation and your strenuous efforts to secure freedom for India and justice and fair-play for Indians at home and abroad, place you in the forefront of fighters for human liberty. You have always taken a keen and abiding interest in the youth of the nation and have set to them a noble example of strength of character, honesty of purpose, courage of conviction, and industry and perseverance. Your charming personality, transparent sincerity, kind-heartedness and sense of honour have won the hearts of the rising generations, and the youth of the nation love you as they have never loved a leader before. They look upon you as their beau-ideal and as the greatest national hero of the time".

The Federation assured the Qaid-i-Azam of their loyal support and readiness to make every sacrifice for the great cause which was so dear to his heart.

After thanking the Principal and the Federation for their cordial welcome, Mr. Jinnah in a characteristically forceful speech gave a brief resume of the events since 1936 and described the evolutionary process by which a disorganised crowd had been converted into a disciplined nation throbbing with life and energy. He referred to the constructive work which the League was planning to undertake for the educational, social, economic and political uplift of the Muslims of India. He explained what the ideal of Pakistan stood for. Given unity, discipline and sacrifice, he had no doubt that they were within reach of the goal. He hoped the Frontier youth would not fail their nation.

INDIAN HISTORICAL RECORDS COMMISSION.—At the invitation of the Frontier Government, the Indian Historical Records Commission held its twenty-second session at Peshawar. H. E. the Governor opened the proceedings and the Hon'ble Sir Jogendra Singh delivered a thoughtful presidential address. The members were invited to a lunch at the Islamia College. One of them Mr. R. V. Paduwal, Director of Archæology of the Travancore State, delivered a very interesting lecture to the College on "Muslim Patronage in the Hindu courts of South India."

K. B. Haji Ghulam Haider Khan's prize for standing I in II Year F.A. ... Abdul Shakur.

K B Sh. Mahbub Ali Khan's prize for standing I in I Year F.Sc. Med. ... Muhd Anwar.

K. S. Muhd. Aslam Khan's prize for standing I in I year F.Sc Non-Med. ... Muhd. Ataullah

Khan Fateh Mohd. Khan Khattak's prize for standing I in I Year F.A. ... Abdur Rahim.

Prince Jahanzeb Wali-Ahad-i-Swat's prize for standing I in IV Year Agr. ... Abdul Malik.

Major S. H. Khurshid's prize for standing I in III Year Agr. Opindra Nath.

Major S. B. Shah's prize for standing I in II Year Agr ... Muhd. Siddiq.

K. S. Mohd. Aslam Khan's prize for standing I in I Year Agr. ... Daulat Ram.

His Excellency received a loud and enthusiastic ovation when he rose to speak. This being his last visit to the College before leaving the province for good he had said His Excellency, come to say good-bye rather than to deliver an address He congratulated the prize-winners and reminded them and other students that the real good and prosperity of the College depended entirely on how they made use of their time at the College and how they put what they learnt here into practice. Things were happening in India. as in other parts of the world, which should not have happened. Troubles arose for no apparent reason. Things were done not only in defiance of an alien government but of decency itself, and of the principles of morality and conduct for which this College was founded, and against the real good of the people. The character of the young Pathan was being tested. Pathans had qualities which were owned by very few races in the world—qualities of courage, independence, and leadership. It was upto the young men whom he was addressing to lead themselves, their villagers, their people and, all who trusted them into the right paths. Within a few years, they were going to be the leaders of their province and to have the destiny of the people in their hands. He hoped that they would make a right use of the training received at the College and will do their best to make N.W.F.P. a nice province. He was going home, and hoped to be continually hearing about the College and the province. If he heard that all was well with the College, he would be sure that all was well with the province. He wished the Darululum the best of all success, and concluded by saying in Pushtu *Ta so tolo ta pa makha de kha wayam khudae de khushal sa te.*

K. B. Khan Muhammad Ibrahim Khan, Chairman of the Council of Management of the Darululum, thanked His Excellency for the keen interest which he had always taken in the welfare of the institution, for the ready kindness with which he had accepted the invitation to preside over the function, and for the inspiring address he had delivered. He wished Their Excellencies Sir George and Lady Cunningham a comfortable voyage home and a healthy and happy life in Scotland.

After a brief interval, the College Dramatic Club staged W. W. Jacob's one Act play "The Monkey's Paw." The production, left little to be desired. The general standard achieved was high and acting displayed considerable dramatic talent. Captain Felstead of the U.O.T.C. played the Sergeant-Major admirably. Mr. Bashir-ud-Din as Mr. White, and Miss Eva Reid as Mrs. White received tremendous applause from the audience.

activity during the year. His Excellency then gave away the prizes and medals for academic distinction and ' colours ' for outstanding merit in games and sports. The *following students were admitted to the ' roll of honour ' :—*

ACADEMIC : –

Diljit Singh Taneja --for standing first in the University and obtaining a I Class in M.A.

Muhammad Ahsan · for standing first in the province and obtaining a I Division in Intermediate (Arts), 1945.

Muhammad Nazir – for standing first in the province and obtaining a I Division in Intermediate (Arts), 1946.

ATHLETIC : —
Abdul Ghafur.
Jafar Khan.
Abdul Hamid.

Special prizes were awarded to the following students :—

H. E. Sir George Cunningham's prize for Genl. Knowledge ... Brij Lal.

K. B. Muhammad Ibrahim Khan's prize for Senior Essay ... Khalid Qasim.

K. B Haji Kuli Khan's prize for Junior Essay ... Abdul Halim.

Principal's prize for setting a good moral example (making peace with fellow students after a quarrel ... Muhd. Ashraf Maftoon.

K. B. Arbab Sher Ali Khan's prize for returning lost money to its owner ... Ishaq Noor.

K. B. Arbab Ahmad Ali Jan's prize for returning lost money to its owner ... Ahmad Saeed Ibrahim.

Mian Abdul-Haq's prize for best speaker ... Dil-Nawaz.

Mr. K. A. Gai's prize for best actor ... Mr. Bashir-ud-Din.

First prize for the best conversationist ... Khalid Qasim.

The following students received prizes for proficiency in studies :—

K. B. Ghulam Samdani Khan's prize for Theology ... Muhd. Ashraf Khattak.

K. B. Arbab Sher Ali Khan's prize for standing I in VI Year Maths. ... Jawahir Singh.

K. B. Haji Sadullah Khan's prize for standing I in V Year Maths ... Muhd. Hayat.

K. S. Miran Fazli Rahman Khan's prize for standing I in B.T. Class ... Oudh Behari.

K. S. Malik Gulzar Hussain Khiani's prize for standing I in IV Year B.A. Bashir Ahmad Malik.

Prince Jahanzeb Wali Ahad-i-Swat's prize for standing I in IV Year B.Sc. ... Anand Parkash

Major S. M. Khurshid's prize for standing I in III Year B.A. Muhd Ahsan.

Major S. B. Shah's prize for standing I in III Year B Sc. ... Abdus Sattar.

K. B. Arbab Ahmad Ali Jan's prize for standing I in II Year F.Sc. Med. ... Abdul Aziz.

Khan Fateh Mohd. Khan Khattak's prize for standing I in II Year Non-Med. ... Hari Kishan.

COLLEGE STAFF, 1946
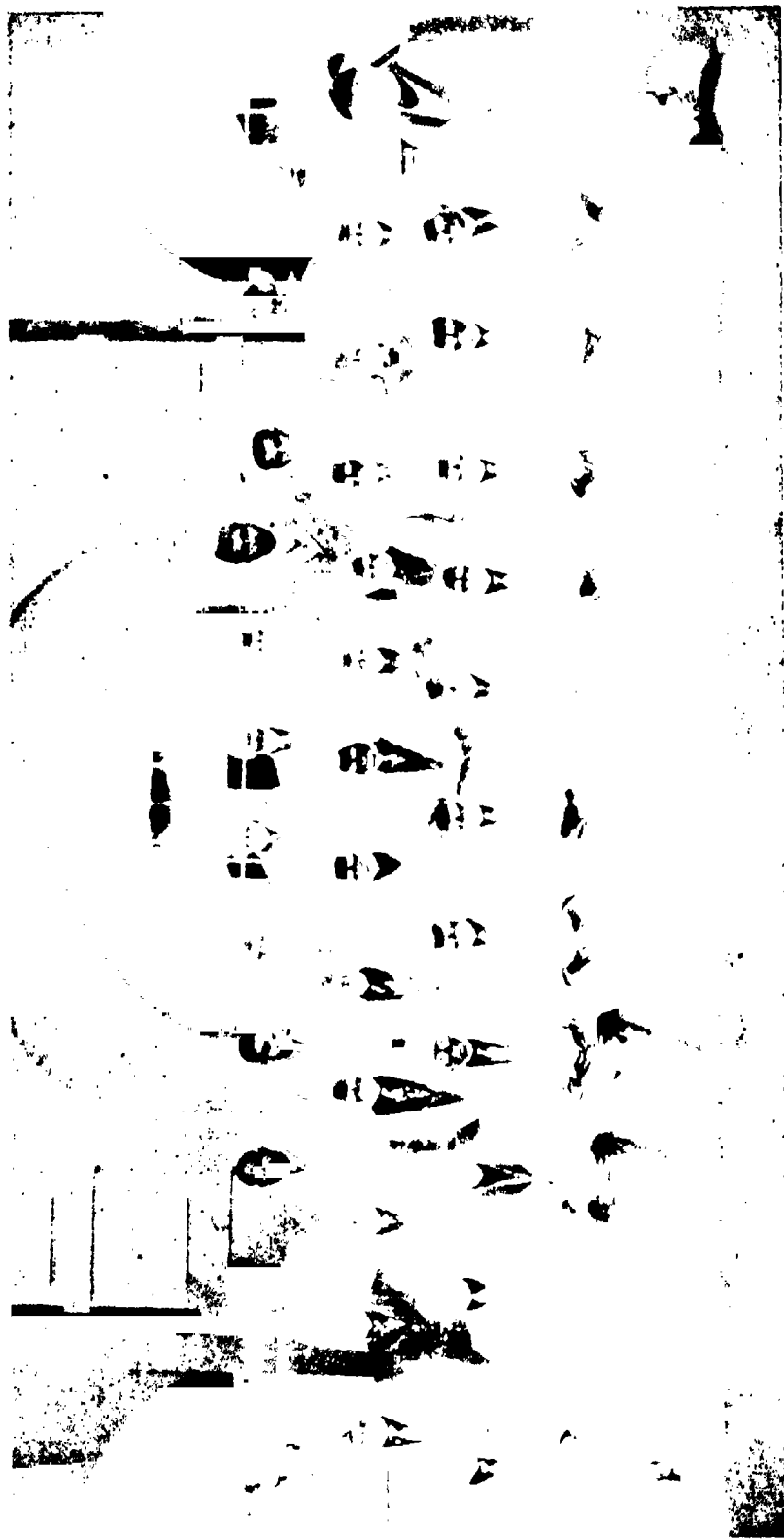
SITTING:—M. M. Kaleem, M. Mushtaq Ahmad, Sh. M. Fazil, A. A. Sadiq Qureshi, H. M. Osman, S. M. Timur (*Principal*), Sh. Minhaj-ud-Din, Anwar Beg, Karamatullah, Nawazish Ali, M. Ashsaf Durrani.

2ND ROW:—M. Sadiq, Tufail Mohd., Anis-ud-Din, Aziz Ahmad, G. Sarwar, Nur Ahmad Khan, M. I. Sethi, Nafis-ud-Din, Hassan Din, S. M. Jafar, Riza Khan, K. Inayatullah, A. A. Wahid.

3RD ROW:—A. Razzaq, G. Ahmad, Jalal-ud-Din, Sardar Ahmad, Adil Khan, Bashir-ud-Din, M. Sarwar, H. M. Idris, M. Amin, A. Hashim.

Messrs. Sher Ahmad Lodhi, Lecturer in Botany, and Abdul Wahab, Lecturer in Chemistry were awarded Government scholarships for study overseas and left for America in November. Their places have been filled by the promotion of Mr. M. Salim, Demonstrator in Botany, and the appointment of Mr. Tufail Husain Jafri. Mr. Muhammad Aslam Lecturer in Mathematics, accepted a post in the Punjab P.E.S. at Government College of Engineering and Technology, Moghalpura, and left us in January. Messrs. Nazar Muhammad, Muhammad Husain and Hans Raj, students of the College, have stepped into the gap thus caused and are assisting in the teaching of Mathematics to Intermediate classes. Mr. Toosi, Demonstrator in Chemistry, has gone to the M.A.O. College, Amritsar, and has been replaced temporarily by Mr. Salim Anwar Beg (an old student of the College and son of Prof. Mirza Anwar Beg). Mr. Muhammad Amin has joined as Demonstrator in Geography. The number of students in the English classes having risen considerably, one more part-time lecturer has been added to the department in the person of Ch. Muhammad Sarwar, M.A. of the Collegiate School. Messrs. M. Raza Khan, M. I. Sethi, and Sardar Ahmad also continue to work as part-time lecturers in English. Mr. Hafiz Muhammad Idris, B.A., H.P., H.A., H.U., of the Collegiate School has come to the rescue of the Urdu section of the Oriental Department as a part-time worker. We welcome all new-comers and hope they will all have a happy and successful career at the College.

COLLEGE CONVOCATION.—The annual convocation was held on the 23rd February. Lieut.-Col. G. L. Mallam, Commissioner and Secretary, Development Departments, N. W. F. P., admitted the following successful candidates to the degrees for which they had qualified :—

B.A.—Abdul Aziz, Muhammad Khurshid, Shah Nawaz, Muhammad Nawaz, Abdullah Jan, S. A. Rahman, Chander Prakash, Abdul Malik, Tali Muhammad, Said Hasan, Abdur Raziq, Abdul Ali Khan, Kamal Khan, Ram Nath Talwar, Kuldip Chander.

B.Sc.—Hot Khan, Chaman Lal, Lal Chand, Lajpat Rai, Hari Krishen, Abdul Qayum Niazi, Manohar Lal Nangia, Mohinder Singh, Om Prakash, Fazl-i-Amin, Ghanisham.

After the conferment of degrees, Lieut.-Col. Mallam delivered a highly thought-provoking and instructive address during the course of which he stressed the need of a new technique of co-operative effort in winning the great peace-time battle against poverty, want and disease and emphasized the decisive role which science and scientific research was going to play in it. He warned his youthful audience that no results of lasting value can be obtained unless the research works combined high academic standards with self-discipline, a real sense of devotion to duty and a passion for truth. He also pointed out the fact that the pure air of free criticism, which is only to be found under a democratic regime, is conducive both to the highest standards of scientific research and to the spread of a scientific outlook among all sections of the community. The Principal in his concluding remarks thanked Lieut.-Col. Mallam for his kindly accepting at short notice the invitation to preside over the convocation and for his highly instructive discourse. The convocation address is printed elsewhere in this issue.

PRIZE DISTRIBUTION.—The annual prize-giving was held on the afternoon of Saturday, the 23rd February in the Roos-Keppel Hall. His Excellency Sir George Cunningham, Governor of the N. W. F. Province and Patron of the Darululum, presided over the ceremony. The Principal presented his annual report (printed elsewhere) and the Head Master of the Collegiate School gave an account of the general improvement which had taken place in the different spheres of school

education. Education, universal education is the crying need of our masses. Given that, there is a bright future ahead of us. Let us hope that the sons of the Darululum will not bring a slur on the glorious name of their illustrious almamater, but *will prove worthy of the glorious traditions of their resplendent past and the noble* heritage of courage, straight forwardness and sacrifice of their face.

We cannot close these desultory remarks without a word of apology for the great delay in bringing out this issue of the Khyber. We have no intention of going through a tedious narration of the causes that held in abayance the publication of the Magazine, but we venture to suggest that the fault was not entirely our own. The paucity of suitable contributions was more than we could remedy. Some of the editors had to hunt out writers and wake them up out of their lethargy. In the matter of collecting reports of the college societies and games clubs we had to wage a veritable crusade against the apathy of the secretaries. May we hope that we shall. receive greater co-operation in the future.

J.D K.

College Notes

STAFF.—There have been many changes in the staff during the year. Mr. I. D. Scott who had gone home on leave returned in October but left shortly afterwards to take up his new post as Deputy Private Secretary to H. E. the Viceroy. He was with us for about 3½ years, and will be long remembered as an energetic administrator, a firm disciplinarian and a tactful teacher. We wish him well in his new sphere of activities and hope that he will not forget the Darululum and the many friends he made here. Mr. Sh. Muhammad Timur who officiated for Mr. Scott last summer, has been persuaded to continue as Principal. He has served the College for over thirty years, and is a scholar and thinker of repute. Generations of Pathan students have passed through his hands, and he is held in high esteem by a wide circle of admirers as an efficient teacher and a sympathetic friend. We wish him all success and assure him of loyal support in every effort he makes for the good of the institution.

Mr. Hadow Harris, Chairman of the Department of English, has left us for good. With his departure, the College has lost an excellent teacher of wide experience and great learning. His highly developed critical faculty, his sound literary judgment and his knack of inspiring among his pupils a love for literature in general and poetry in particular made him so successful in his work with the post-graduate and Honours classes. He is carrying home with him the best wishes of all his colleagues and pupils. Prof. Ahmad Ali Sadiq Qurashi has taken over as Chairman of the department.

Earlier in the year, the resignation of Dr. E. A. Pires, Chairman of the Department of Education, deprived the institution of a profound scholar and a conscientious teacher. He was a general friend of his pupils and a charming companion of his colleagues; and as such, was loved and respected by all. We have no doubt that he will make a very successful Principal of the Teachers Training College, Nagpur. His place has been taken by Mr. Karamatullah M.Ed., a distinguished old boy of the Darululum and a keen and experienced teacher. We extend to him a hearty welcome and wish him a successful career here.

Mr. Q. M. Fareed, who came to us two years ago as Professor of History. had to proceed on long leave for reasons of health. He is reported to be still in bed, but is making steady progress towards recovery. We hope he will be soon restored to perfect health. The vacancy thus caused has been filled by the appointment of Mr. S. M. Jafar on deputation from Government service. We hope he will have a happy time here.

Counil of the United Nations Organisation has been meeting in England and America

But whether the U.N.O. is to meet a happier fate than the League of Nations, is hard to predict. However, signs and portents already visible irresistibly lead to the conclusion that the claim that this war was fought to end war is an unwarranted optimism. War appears to be inherent in the relations between sovereign states. Whenever the interests or rights of sovereign states clash they resort to arms; and the interests of sovereign states, as long as they remain sovereign, are bound to clash. Co-operation and collective action is hard to maintain for any considerable length of time, without compromising some of the 'vital interests' of one state or another. And hence permanent world peace is a dream. Already the international situation is explosively tense. The talk is loud in some quarters that the cessation of hostilities is but a temporary lull before a storm of even greater magnitude and that that would not be a war to end war but to wipe out humanity from the surface of this luke-warm bullet whizzing through space.

These world events have had wide repercussions in India. She has played an honourable part in this great struggle and is now bearing the full burden of her share of the resulting distress and responsibility. Her own political aspirations and struggles, dwarfed by the wider issues facing the world, have again come into relief. Her future is in the melting pot. She is on the threshold of a new era. But at the same time she seems to be under the influence of some malignant stars. The National Congress and the Muslim League, the two major political parties representing the two major groups inhabiting this vast sub-continent are at logger heads and do not see eye to eye with one another. Unity--the sine qua non of independence is wanting.

The Viceroy's consultations with the White Hall, followed by H. M. G.'s simultaneous declaration in England and India, Lord Wavell's Simla Conference with the leaders of Indian political thought and the visit of the Parliamentary Delegation have accentuated the tension rather than finding an amicable solution of the problem. The recent elections to the Central and Provincial legislatures have been lost and won only to widen the gulf between the two major parties in the land and to whet hatred. Some political leaders have exploited for their election purposes the youthful energy and enthusiasm of students. Colleges and Universities have been largely drawn upon and batches of students have been thrown into the vortex of the electioneering campaign. Opinions differ. Far be it from us to doubt the bonafides of political leaders. We do not blink the fact that India is passing through a critical period of her history and students must play their part. But theirs is a worthier and more constructive part than shouting slogans and bandying invectives with rival parties. They must not shun politics; but their points of view should be more or less academic to acquaint themselves with what is going on in the country and abroad, to study things and to get ready for the future. They are the hopes of the motherland, her future leaders and citizens, and as such can more worthily acquit themselves of their duties by equipping themselves with modern scientific knowledge. The India of tomorrow, if she is to occupy an honorable place in the comity of nations, must have an army of trained industrialists, technical experts, thinkers and scientists. Above all she must have enlightened and well-disciplined citizesn worthy of her great past and her greater future. And these cannot be created by magic over-night. Even England during the darkest days of this war did not close down her colleges and universities.

The youth of our own Province has played its own part in the recent elections. But what has been said of the youth of India, is more true of the youth of this Pathan land. "The Pathans are second to no other race in the world in qualities of leadership, intelligence and understanding," said Sir George Cunningham, the ex-Governor of N. W. F. P. "They have it in their power to make this Province a fine province if they so desire." And we fully endorse this view. But they lack knowledge, organization and discipline. We are backward in politics because we are backward in

THE KHYBER

Vol. XXIX] PESHAWAR, APRIL, 1946 [No. 1

Editorial

Since we last went to the press the world has gone through a whirlgig of great events and changes. Powers have risen and fallen, nations have undergone vicissitudes the like of which pages of history fail to present, and streams of blood have flown to propitiate the Gods of War. The Frankenstein, which the civilized nations of this enlightened age had raised six years ago, has at last been laid low after enjoying a Roman holiday with millions of human lives. Nazism has been brought to its knees sooner than could be prophesied by any estimate of human forecast. Hitler, the incarnation of German Philosophy of a super-race, has gone, with his dream of world domination, rudely disappointed His war lords have either followed him out of the world or are awaiting their fate in the docks at Neuremberg.

In the eastern theatre of war the curtain has dropped even more suddenly than in Europe. With the fall of Germany, the collapse of Japan had become inevitable. The one was a corollary to the other. But even the most optimistic estimate could not date it earlier than somewhere in 1947. The catastrophe was precipitated by Russia's declaration of war on Japan followed immediately by the invention of atomic bomb as the most destructive instrument of destruction. The prosperous city of Hiroshima was blown to pieces and obliterated from the face of the earth. The glory of the sun dynasty was brought to dust in the twnkling of an eye and the land of the rising sun, was trampled by men of the grosser mould.

For all practical purposes the biggest war of all ages has came to a close, but peace real peace, is not yet. The all-enveloping flames of the conflagration have been put down, but the smouldering fire has not yet been completely extinguished. Sporadic flames are flaring up here and there to singe out of shape what remains of humanity. The world horizon is still overcast with gloom streaked with blood. The whole atmosphere is fraught with fear and distrust. Civil strife and anarchy, resulting from the lust for power of stronger nations and their desire to impose their will upon their weaker neighbours, are rampant. Indonesia, China, Iran, Palestine, Egypt and Turkey are either being torn by civil war or are being threatened with subjection and extinction. The air is yet dense with the smoke of canon, the clang of arms is still echoing, and the monsters of famine and epidemic have reared their heads to claim their toll of human life. It appears that the sins of man are too black to be washed away with the blood that has been shed.

And what next? A new world order is evolving with a new sense of values and outlook on life. The world's best statesmen and politicians, representing fifty-one nations are putting their heads together to bind up the wounds of suffering humanity. Ambitions plans for rehabilitation of the war-shattered economics of the world, and the re-orientation of a world-society, conceived in hope, faith and toleration and dedicated to peace and security of all the nations of the world, are being drawn up. Planning, planning for a better and a happier world is the talk of the day. The Security

Editorial Board, 1945—46
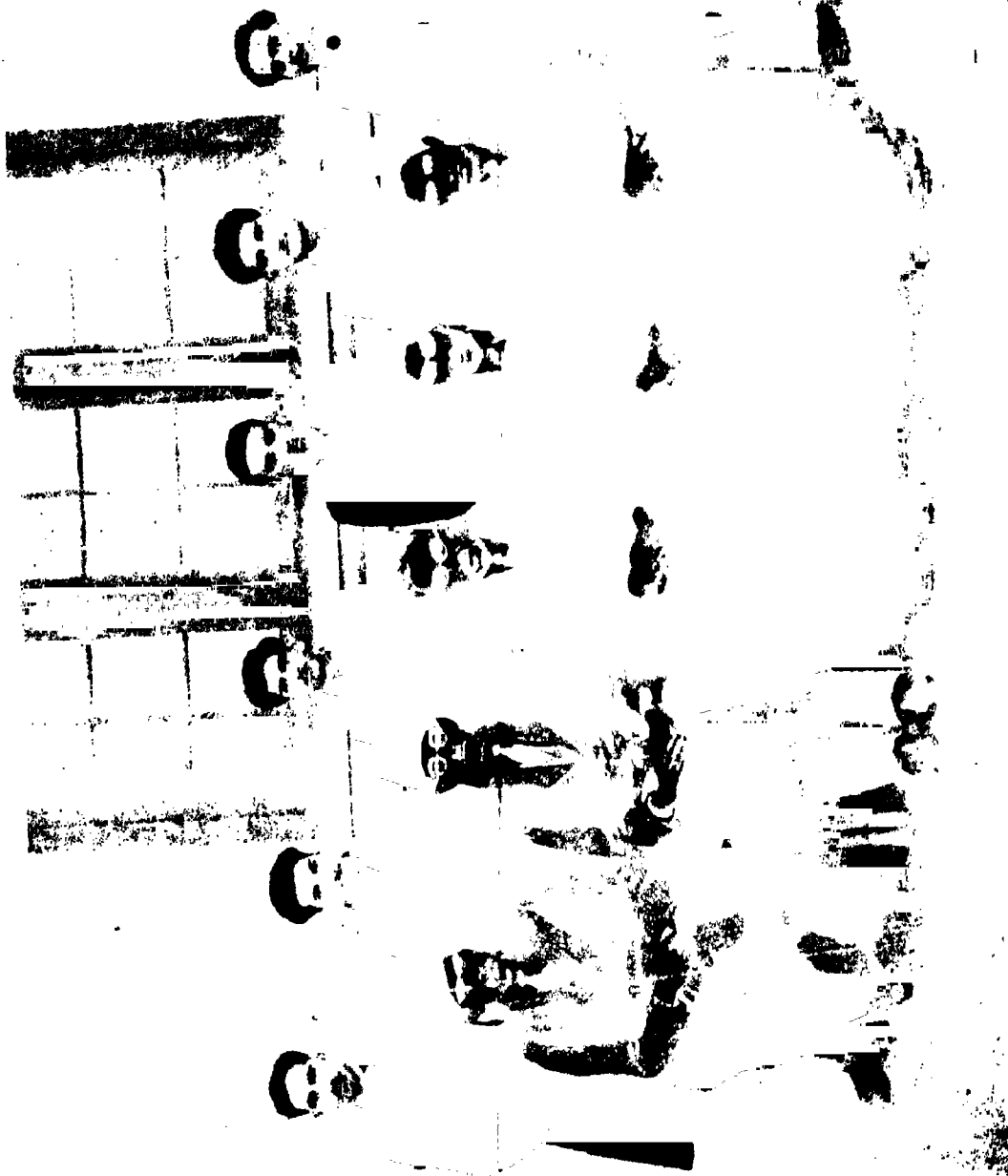
SITTING (L to R) :—Mr. M. M. Kaleem, (Urdu) — Prof. Ahmad Ali Sadiq Qurashi, Editor-in-Chief — Principal S. M. Timur. — Mr. Nafis-ud-Din, (Pushtu)

THE KHYBER

CONTENTS

Printed by Al-Haj M. Abdul Hameed Khan, Manager, at the Feroz Printing Works, 365, Circular Rd., Lahore and Published by Prof. Ahmad Ali Sadiq, M.A., B.T., LL.B., Chairman, Ed. Board, Islamia College, Peshawar.

The Khyber

Islamia College Peshawar

★ **May, 1946**